عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

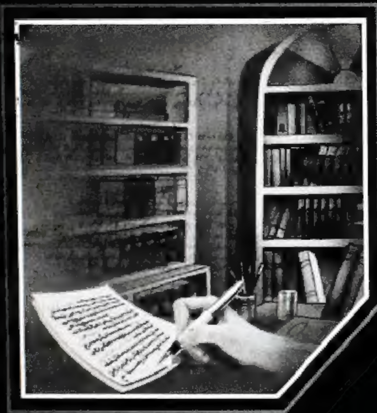
جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ عُلمائے کرام

۲۲

- حدیث ضعیف - اصول و احکام / ضعیف احادیث تعارف اور احکام
- قرآن کریم کے متن اور ترجمہ کی اشاعت اور بریل کوڈ اور اس سے متعلق بعض جدید مسائل

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارُالاشاعت

اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 22

ضعیف احادیث تعارف - اصول واحکام
قرآن کریم کے متن اور ترجمہ کی اشاعت
اور بریل کوڈ - احکام ومسائل

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات:
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات و کمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے ۔ جزاک اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

﴿........ملنے کے پتے........﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی
مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد
دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کررہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہوکر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کردیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کرسکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کردیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کردیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار ومقاصد کے مطابق ہوجائے بہرحال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کرکے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کرلیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱...... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲...... پورے علمی ذخیرے کو از سر نو بڑے سائز میں کمپوز و سیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳...... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ نمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴...... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵...... بحمد للہ! اب "سلسلۂ جدید فقہی مباحث" کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶...... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنا دیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کرسکے...... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کررکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کرکے اس بات کا اندازہ ہورہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کرکے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ!

"اذا جاء نا امر ليس فيه أمر و لا نهي فما ذا تأمرنا فيه"

یارسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه براى خاص"

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہوگیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگادی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

"کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔"

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تونے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کردیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کرلیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہوجانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہوجانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہوجاتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگادی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کرسکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کرسکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کرکے میں علاج کرسکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کرکے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کردے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ بھیجا تا کہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کرکے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ، جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں در آمد ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے در آمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کرلیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعتِ نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور وشغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کرلینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کرلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہوگئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط وتفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کرلینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کرلی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کرلیا...... اتباع ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباع ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا...... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاهب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہوی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعۃً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہوی، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیر اور تکرار اً عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلهن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروه فی سنبله..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمد للہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

ضعیف احادیث
تعارف اور احکام

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیرِ سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پیش لفظ

دین کے تمام احکام کو جاننے کے بنیادی ذرائع دو ہیں: کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب اللہ میں الفاظ بھی اللہ کی طرف سے ہیں، حدیث میں معانی تو من جانب اللہ ہیں اور الفاظ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، حفاظت قرآن کے اس وعدہ میں الفاظ بھی شامل ہیں اور معانی بھی پس اہل ہوس کے لیے قرآن میں تحریف وتصحیف کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اس لیے حدیث میں خود ساختہ مواد داخل کرنے کی ناپاک کوششیں ایک زمانہ تک ان کی طرف سے ہوتی رہی ہیں، ایسا کرنے والوں میں بعض کا مقصد ہی اسلام کو بدنام کرنا اور اسے عقل وفطرت سے متصادم ثابت کرنا تھا، فتح ایران کے بعد دوسرے مذاہب کے ماننے والے کچھ لوگوں نے ایک منصوبہ کے ساتھ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اس طرح کی ناشائستہ حرکت کرنی چاہی، اور کچھ لوگوں نے یہی کام اچھے جذبہ سے بھی کیا، انہوں نے ایسی روایتیں گھڑیں جن کے ذریعہ نیک اعمال کی ترغیب اور بری باتوں سے ترہیب میں مدد ملے؛ لیکن ہر دو صورت میں یہ عمل نہایت غلط تھا جس کے نادرست ہونے پر امت کا اجماع واتفاق ہے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کی نسبت کرنا دراصل اللہ کی طرف اس کو منسوب کرنا ہے:

"ومن اظلم ممن افتری علی اللہ الکذب"۔

اس پس منظر میں محدثین اور ناقدین رجال کے ایک گروہ کو من جانب اللہ تحقیق حدیث کی توفیق میسر آئی، انہوں نے اس کے لیے مستقل ایک فن "اسماء الرجال" کی بنیاد رکھی، جس کی مثال مذاہب عالم میں کہیں اور نہیں ملتی، انہوں نے حیرت انگیز ذہانت اور محنت کے ساتھ پورے ذخیرۂ حدیث کو کھنگال کر دودھ اور پانی کو الگ کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی: کیونکہ حدیث کی حیثیت قرآن مجید کے شرح وبیان کی ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کو کوئی شخص خاطر میں نہ لائے تو پھر اس کے لیے قرآن مجید کے الفاظ سے اپنے من چاہے مفاہیم کو اخذ کرنا چنداں دشوار نہیں ہوگا، اسی لیے امام اوزاعی فرمایا کرتے تھے کہ جتنی ضرورت سنت رسول کو کتاب اللہ کی ہے، اس سے زیادہ کتاب اللہ کو سنت رسول کی ہے:

"ان الکتاب أحوج إلی السنة من السنة إلی الکتاب"۔

حدیث کو پرکھنے اور راویان حدیث کے بارے میں نقد وتحقیق کا مقصد یہ تھا کہ جو باتیں حدیث نہیں ہیں، وہ حدیث کا جز نہ بن جائیں، اور جو باتیں حدیث ہیں، وہ حدیث کے دائرہ سے باہر نہ چلی جائیں؛ اسی لیے فقہاء نے جیسے احادیث کو قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے، اسی طرح انہیں رد کرنے میں بھی احتیاط سے کام لیا ہے؛ چنانچہ جن چیزوں کا حدیث نہ ہونا ثابت ہوگیا، ان کو "موضوع" کہا گیا، جن کا حدیث ہونا ثابت ہوگیا ان کو "صحیح" کہا گیا اور جو روایتیں زیر تحقیق تھیں، ان میں سے جن کے لیے صحت کے قرائن واضح ہوگئے، ان کو "حسن" قرار دیا گیا، اور جن روایات کو یہ بات حاصل نہ ہوسکی، انہیں "ضعیف" کہا گیا، پس ضعیف سے مراد موضوع نہیں ہے؛ بلکہ ضعیف زیر تحقیق روایتیں ہیں اور عام طور پر فقہاء ومحدثین نے حسب موقع ومحل ان کو قبول

بھی کیا ہے، جیسے فضائل کی ترغیبات میں، احتیاطی احکام میں، مستحب احکام کے ثبوت میں، بلکہ اگر کسی شرعی مسئلہ میں کوئی اور روایت موجود نہ ہو تو بعض اوقات وجوب یا اباحت کے ثبوت میں بھی ایسی روایت کو معتبر سمجھا گیا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں اس مسئلہ میں افراط وتفریط سی پیدا ہوگئی ہے، بعض حضرات نے ضعیف کو موضوع کا ہم معنی سمجھ لیا، وہ ہر ضعیف روایت کو قابل رد سمجھتے ہیں، اور بعض حضرات نے فضائل ومستحبات کے لیے موضوع اور ایسی ضعیف روایتوں کو بھی قبول کرلیا، جن میں وہ شرطیں نہیں پائی جاتی ہیں، جن کو محدثین نے فضائل کے باب میں ضعیف احادیث کے معتبر ہونے کے لیے شرط قرار دیا ہے۔ انداز فکر کا یہ اختلاف بعض اوقات انصاف اور اخلاق کی حدود کو پار کر جاتا ہے، اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے گیارہویں فقہی سمینار منعقدہ ۱۷-۱۹ / اپریل ۱۹۹۹ء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے لیے ایک موضوع "احادیث ضعیفہ" کا بھی رکھا گیا تھا؛ تاکہ اہل علم پوری تحقیق اور دیانت کے ساتھ اس سلسلہ میں غور کریں اور افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ الحمدللہ سمینار کی مناسبت سے اس موضوع پر بڑی اچھی اور بصیرت افروز تحریریں جمع ہوگئیں، نیز مصنف "التحفۃ المرضیۃ" کے علاوہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ اور مایۂ ناز محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ وغیرہ نے اس موضوع پر جو داد تحقیق دی ہے، اس کا عطر وخلاصہ اضافہ کے ساتھ اس میں جمع ہوگیا ہے۔

یہی مجموعہ اب قارئین کی خدمت میں پیش ہے، جو چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب تمہیدی امور یعنی تجاویز، مقالات کی تلخیص اور عرض مسئلہ وغیرہ پر مشتمل ہے، دوسرے باب میں مفصل مقالات اور تیسرے باب میں مختصر تحریریں ہیں، چوتھا باب سمینار کے دوران ہونے والے مناقشہ پر ہے، اس طرح اپنے موضوع پر اردو زبان میں یہ غالباً سب سے مفصل تحریر ہے۔ جس کی ترتیب وتصحیح کا فریضہ محب عزیز مولانا محمد سراج الدین قاسمی رفیق شعبہ علمی نے انجام دیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور ہم سب کو صواب وسداد پر قائم رکھے۔

واللہ ھو الموفق۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری)

۸ / جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ / ۲ / جون ۲۰۰۹ء

پہلا باب: تمہیدی امور

سوالنامہ بابت احادیث ضعیفہ

احکام شرعیہ کے بنیادی مآخذ دو ہیں: کتاب وسنت، لیکن سنت نبویہ، یعنی احادیث جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں، راویوں کے استناد واعتبار کے لحاظ سے وہ سب اک درجہ کی نہیں ہیں، اس لیے اصولی طور پر احادیث کے قابل عمل ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے دو قسمیں کی جاتی ہیں مقبول اور غیر مقبول، غیر مقبول کو مردود وضعیف بھی کہہ دیتے ہیں۔

پھر مقبول کی چند اقسام کی جاتی ہیں جیسا کہ معروف ہے، یعنی صحیح وحسن، جو احادیث صحیح یا حسن قرار پائیں ان پر عمل اور ان کے حجت ودلیل شرعی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ جن احادیث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے ان کے بارے میں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا وہ بالکل ہی قابل رد ہیں؟ یا بعض حالات ومؤیدات کے پائے جانے کی صورت میں ان پر عمل کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا فضائل میں ان کا اعتبار ہے؟ اس سلسلہ میں بھی موجودہ دور میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، اسی پس منظر میں اس سمینار کے لیے ایک موضوع "احادیث ضعیفہ کی استدلالی حیثیت" بھی رکھا گیا ہے، جس کی اہمیت اہل علم اور اصحاب نظر کے لیے محتاج اظہار نہیں؟ اس سلسلہ میں درج ذیل سوالات آپ کی توجہ کے مستحق ہیں:

الف۔ ضعیف:

۱۔ حدیث ضعیف کی تعریف کیا ہے؟

۲۔ ضعف احادیث کے اہم اور بنیادی اسباب کیا ہیں؟ اور بالخصوص محدثین وفقہاء کے درمیان اتفاقی واختلافی نکات تحریر کئے جائیں تو مناسب ہے؟

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم کیا ہے؟

ب۔ موضوع:

۱۔ موضوع کی تعریف کیا ہے؟

۲۔ حدیث موضوع کا کیا حکم ہے؟

۳۔ کیا کسی واضع حدیث اور کذاب فی الحدیث راوی کا کسی سند میں شامل ہونا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی ہے، اور ایسی ہر حدیث موضوع تصور کی جائے گی جس میں ایسا راوی آ گیا ہو، یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

حدیث ضعیف متلقی بالقبول:

۱۔ بہت سی ضعیف احادیث ایسی ہیں جن کے لیے ہم کو "تلقی بالقبول" کی تعبیر ملتی ہے، تو حدیث ضعیف کے متلقی بالقبول ہونے سے کیا مراد ہے؟ اور کن لوگوں کے قبول کرنے پر "تلقی" کا اطلاق ہوگا؟

۲۔ ایسی ضعیف حدیث کا کیا حکم ہے؟ اس پر کس حد تک عمل اور اعتماد کی گنجائش ہے؟

۳۔ تلقی کی ایک صورت روایت کی ہے کہ علماء اس کو آپس میں روایت کرتے ہوں اور ایک یہ ہے کہ اس کے موافق عمل کرتے ہوں، کیا حکم کے اعتبار سے دونوں صورتوں کے درمیان فرق کیا جائے گا؟ یا دونوں کا حکم یکساں ہے؟

حدیث ضعیف مؤید بقرائن:

کچھ احادیث ضعیفہ وہ ہیں کہ ان کے لیے تلقی تو نہیں پائی جاتی، البتہ ان کے ساتھ ایسے قرائن پائے جاتے ہیں جن سے حدیث کے مضمون کو تقویت پہنچتی ہے، اور ان امور کو اس کے ضعف کے لیے جابر (دور کرنے والا) قرار دیا جاتا ہے، ایسی حدیث کو "ضعیف منجبر" یا ضعیف مؤید بقرائن کہا جاسکتا ہے۔

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے کیا مراد ہے؟ ایسی حدیثیں اصلاً مقبول ہوتی ہیں یا غیر مقبول؟

۲۔ کیا فضائل کے علاوہ مسائل واحکام میں بھی ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ وہ کیا امور ہیں جو حدیث کے ضعف کی تلافی کا ذریعہ بنتے ہیں؟

۴۔ تعدد طرق حدیث کا ایک سے زائد سندوں سے مروی ہونے کا اس سلسلہ میں کس حد تک اعتبار ہے؟ کیا کسی ضعیف حدیث کے لیے محض ایک سے زیادہ سند سے مروی ہونا کافی ہے، جبکہ وہ دوسری سند بھی ضعیف ہو، اور اسی صحابی کے واسطے سے مروی ہو جس سے اصل حدیث روایت کی جارہی ہو، اور اس میں مضمون ولفظ کی موافقت کی شرط ہوگی یا نہیں؟

۵۔ تعدد وغیرہ سے ہر قسم کی ضعیف حدیث کو فائدہ ہوتا ہے یا یہ کہ اس میں تخصیص وتفصیل ہے، اس بابت ضابطہ ومعیار کیا ہے؟

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال:

۱۔ ایسی ضعیف احادیث جن کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں کیا کسی صورت میں احکام ومسائل کے باب میں ان کا بھی اعتبار ہے، اس بابت ائمہ مجتہدین اور اصولیین کے نظریات کیا ہیں؟

۲۔ بعض ائمہ جیسے امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ سے جو احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش نقل کی جاتی ہے تو ان کے کلام میں ضعیف کا مصداق کیا ہے، حسن لغیرہ یا وہ حدیث جو متاخرین کے نزدیک ضعیف کا مصداق ہے؟

۳۔ اگر احکام میں بھی ایسی ضعیف احادیث کا اعتبار ہے، تو کیا اس سلسلہ میں کچھ شرطیں بھی ہیں؟ اور ہیں تو کیا ہیں؟

مناسب ہوگا کہ اس سلسلہ میں جو بھی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے، اس کے لیے ان فقہاء کے نزدیک ایسی احادیث ضعیفہ کے مقبول ہونے کی مثال سے بھی واضح کیا جائے۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال واعتبار

۱۔ کیا فضائل کے باب میں "ضعیف احادیث" پر اعتماد درست ہے؟ اس بابت حضرات محدثین اور اصولیین کے کیا نظریات ہیں؟

۲۔ کیا اس پر اعتماد واعتبار کے لیے کچھ شرطیں بھی ہیں؟ اگر ہیں تو وہ کیا ہیں؟

اکیڈمی کا فیصلہ

۱۔ اس موضوع پر غور کرتے ہوئے سمینار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ فی زمانہ اہل علم کے یہاں اس باب میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ بعض حضرات کا حال یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی معتبر ونا معتبر روایات کو صحیح وثابت روایات کا درجہ دے رکھا ہے جو کسی بھی طرح "من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار" کے تحت مطلوبہ احتیاط سے ہم آہنگ نہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو محض کسی حدیث کے سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس کو یکسر ناقابل اعتبار اور لائق رد سمجھتے ہیں، حالانکہ ضعیف احادیث بھی بعض مواقع پر مقبول ہیں، اور حدیث کا سند کے اعتبار سے ضعیف ہونا اس کے متن ومضمون کے مردود ونامقبول ہونے کو مستلزم نہیں۔

۲۔ جو روایات موضوع ہیں وہ قطعاً غیر معتبر ہیں، نہ ان سے استدلال کی گنجائش ہے اور نہ ان کے موضوع ہونے کی صراحت ووضاحت کے بغیر ان کو نقل کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر کسی سند میں واضع حدیث راوی آجائے تو جب تک متن حدیث کے دوسرے طرق کی تحقیق نہ کرلی جائے محض اس سند کی وجہ سے حدیث کے متن ومضمون کو موضوع قرار دینا درست نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ کسی ایسی سند سے بھی یہ متن منقول ہو جس میں واضع حدیث راوی نہ آیا ہو۔

۳۔ اگر کسی حدیث کو متعدد فقہاء ومجتہدین اور محدثین نے بطور استدلال نقل کیا ہو یا اس روایت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہو یا اس حدیث کو رد کرنے کے بجائے اس کے متن میں تاویل کا راستہ اختیار کیا ہو، اور ظاہر ومتبادر معنی کے بجائے دوسرا معنی متعین کیا ہو، تو یہ "تلقی بالقبول" ہے۔

۴۔ تلقی بالقبول کی وجہ سے سنداً ضعیف احادیث بھی مقبول کا درجہ حاصل کرلیتی ہیں۔

۵۔ تلقی بالقبول کے علاوہ احادیث صحیحہ سے اور صحابہ کے فتاویٰ سے مطابقت کی بنا پر بھی احادیث ضعیفہ درجہ اعتبار حاصل کرلیتی ہیں۔

۶۔ جن احادیث کے رواۃ متہم بالکذب اور فاسق نہ ہوں، لیکن راوی کے خفت ضبط کے باعث روایت ضعیف ہو، ان کے لیے تعدد طرق مفید ہے، اور ایسی روایت "حسن لغیرہ" کے درجہ میں آجاتی ہے، بشرطیکہ دوسرے طرق میں بھی راوی پر خفت ضبط ہی کی تہمت ہو نہ کہ کذب وفسق کی۔ ایسی ضعیف حدیثیں جو دوسری نصوص ثابتہ سے متعارض ہوں یا جن میں ضعف راوی کے متہم بالکذب یا فسق کی وجہ سے ہو، تو یہ نہ فضائل میں معتبر ہوں گی اور نہ احکام میں۔

۷۔ ترغیب وترہیب میں ضعیف روایات معتبر ہیں، بشرطیکہ ان میں ضعف شدید نہ پایا جاتا ہو، اور وہ شریعت کی کسی اصل عام کے تحت آتی ہوں، اور ان پر عمل کرتے ہوئے اس میں بیان کئے ہوئے ثواب وعقاب کی امید تو رکھی جائے لیکن یقین جازم نہ ہو۔

۸۔ موجودہ علمی انحطاط کو دیکھتے ہوئے مناسب ہے کہ اہل علم اپنی تحریروں اور تقریروں میں صحیح وثابت احادیث کے نقل کا اہتمام کریں، اور جہاں ایسی ضعیف حدیثیں پیش کرنی پڑیں وہاں مناسب انداز پر ایسی حدیث کا درجہ اور مقام بھی واضح کردیں، تاکہ ضعیف وبے اصل روایات کے نقل کرنے کا چلن نہ ہو جائے۔

۹۔ ایسی احادیث جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہوں، لیکن ان میں ضعف خفت ضبط کی وجہ سے ہو نہ کہ فقدان عدالت کی وجہ سے، اور کسی نص صحیح وثابت سے متعارض نہ ہوں، ان سے احتیاطی احکام یعنی کراہت واستحباب ثابت کئے جاسکتے ہیں۔

۱۰۔ نیز جن احکام میں کوئی دوسری دلیل شرعی موجود نہ ہو، ان میں ایسی ضعیف الاسناد احادیث سے دیگر احکام بھی ثابت کئے جاسکتے ہیں۔ ایسی احادیث علت غیر منصوصہ پر مبنی قیاس سے اولیٰ ہیں، یہی جمہور سلف کا مسلک ہے۔

نوٹ:...... مولانا عبد اللہ جولم صاحب کو شق ۹ اور ۱۰ سے اتفاق نہیں ہے۔

تلخیص:

احادیث ضعیفہ

سوال نمبر۔۱:

حدیث ضعیف کی تعریف کیا ہے؟

تقریباً تمام ہی مقالہ نگار حضرات نے اصول حدیث کی مستند کتابوں کے حوالہ سے حدیث ضعیف کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ حدیث ضعیف وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کی شرطیں نہ پائی جاتی ہوں۔

(مقدمہ ابن الصلاح مع الایضاح ۶۲، مقدمہ مشکوٰۃ ۵، الخلاصۃ للطیبی ۴۸، الدرایۃ فی اصول الحدیث ۸۷۵، الترغیب والترہیب ۷، التعلیقات الحافلۃ والاجوبۃ الفاضلۃ ۲۲۸، اعلاء السنن، مقدمہ ۱/۲۶، علوم الحدیث لابن الصلاح ۳۷، قواعد التحدیث ۱۰۸، منہج النقد فی علوم الحدیث ۲۸۶، ارشاد الفحول ۴۸۔ دیکھئے: مقالہ مولانا عبدالواحد قاسمی، مولانا شیر علی، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا محبوب علی وجیہی، مولانا اسعد فلاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا انیس احمد مدنی، مولانا خالد صدیقی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبدالرحیم قاسمی وغیرہ)۔

مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے "تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی" میں امام نووی کی تعریف "مالم یجتمع فیہ صفۃ الصحیح والحسن" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام نووی نے ابن الصلاح کی تبعیت میں حسن وصحیح کو جمع فرمایا ہے، حالاں کہ اگر وہ صرف حسن پر اکتفا کرتے تو بہتر ہوتا، کیوں کہ جس میں حسن کی صفات جمع نہ ہوں اس میں صحیح کی صفات بدرجۂ اولیٰ نہیں ہوں گی۔ (تدریب الراوی، ۱/۱۷۹)۔

مولانا ارشاد احمد قاسمی صاحب کے بقول یہی رائے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے بھی ظاہر کی ہے کہ جس میں حسن کی صفت نہیں ہوگی اس میں صحیح کی صفت بدرجۂ اولیٰ نہیں ہوگی، مولانا خالد صدیقی کا خیال ہے کہ اسی وجہ سے مقدمہ تحفۃ الاحوذی ۱/۴۰۴، مطبوعہ دار الفکر میں: "واما الحدیث الضعیف: فھو ما لم یجتمع فیہ صفۃ الحسن" کے ذیل میں "صحیح" کے ذکر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں مولانا خورشید احمد اعظمی نے حدیث صحیح اور حسن کی تعریف بھی نقل کی ہے، ان کے بقول حدیث صحیح وہ حدیث ہے جس کی سند ابتداء سے انتہاء تک تام الضبط، کامل الحفظ، فسق وفجور سے بری، اخلاق کریمہ سے متصف راویوں کے ذریعہ متصل ہو، اور اس میں کوئی ایسا مخفی سبب بھی نہ پایا جائے جو صحت حدیث میں قادح ہو، اور حدیث حسن وہ حدیث ہے جس میں صحیح کی تعریف میں مذکور شرائط پائی جائیں، صرف راوی کے حفظ وضبط میں کمی ہو (بشرطیکہ قلت ضبط فحش اور کثیر نہ ہو)۔

۲۔ ضعف احادیث کے اہم اور بنیادی اسباب اور محدثین وفقہاء کے درمیان اتفاقی واختلافی نکات:

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک ضعف احادیث کے اہم اور بنیادی سبب دو ہیں:

(۱) سقوط از سند، (۲) برراوی۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات نے سقوط از سند اور طعن برراوی کے اعتبار سے احادیث کی مختلف قسمیں ذکر کی ہیں، جیسے معلق، مرسل، معضل، منقطع، مرسل خفی، مدلس، متعلقات مدلس، معنعن، مؤنن، موضوع، متروک، منکر، معلل، مدرج، مقلوب، مضطرب، مصحف، محرف وغیرہ۔

(مقالہ مولانا ابوالحسن علی، مولانا انیس احمد مدنی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا اسعد فلاحی)۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے مطابق اگر راوی ساقط العدالۃ ہو تو اس سے پانچ بنیادی کمزوریاں لاحق ہوتی ہیں، کذب، تہمت کذب، فسق، جہالت، بدعت، اسی طرح اگر راوی کامل الضبط نہ ہو تو اس سے بھی پانچ کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں، فرط غفلت، کثرت غفلت، مخالفت ثقات، وہم، سوء حفظ۔

(مقالہ مولانا خالد صدیقی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

۱۴۰۸۷۲

مقالہ نگار حضرات کے بقول اس قسم کے راوی کی روایت ضعیف تصور کی جائے گی۔

ضعیف احادیث کے مذکورہ بالا اسباب محدثین اور فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہیں، تاہم فقہاء کے نزدیک مزید کچھ ایسے اسباب ہیں جن کی بنا پر روایت ضعیف قرار دی جاتی ہے:

ا۔ عقل کا ناقص ہونا، ۲۔ معتوہ ہونا، ۳۔ سماع کے وقت کما حقہ نہ سننا، ۴۔ سننے سے ادا تک کسی بھی وقت نسیان کا طاری ہونا، ۵۔ معنی کا نہ سمجھنا، ۶۔ غیر مسلم ہونا، ۷۔ راوی کا غیر فقیہ ہونا، ۸۔ راوی کا عمل روایت کے خلاف ہونا۔ (مقالہ مولانا شیر علی، مولانا خالد صدیقی)۔

مولانا خالد صدیقی کے بقول صاحب کشف نے کہا ہے کہ قبول روایت کے لیے فقیہ اور غیر فقیہ کی تفریق ایک نئی چیز ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ (التوضیح مع التلویح، ۱/۴۳۱)

مولانا محبوب علی وجیہی کے بقول فقہاء کے نزدیک فقیہ راوی کی روایت کو غیر فقیہ راوی کی روایت پر ترجیح دی جائے گی، ان کی بقول خلفاء اربعہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، اور عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ حضرات فقیہ ہیں، مولانا خالد صدیقی کے بقول غیر فقیہ کی روایت کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ روایت قیاس کے مطابق ہو، دوسرے یہ کہ ایک قسم کے قیاس کے مطابق اور دوسری قسم کے قیاس کے خلاف ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ روایت بالکلیہ قیاس کے خلاف ہو، اول الذکر دونوں صورتوں میں روایت مقبول ہوگی، اور تیسری صورت میں روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ (التوضیح مع التلویح، ۱/۴۳۱)

اگر راوی اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف عمل کرے یا اس کے خلاف فتویٰ دے تو وہ روایت حجت نہ ہوگی (مولانا عبدالرشید قاسمی اور مولانا خالد صدیقی)، مولانا عبدالرشید قاسمی کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ روایت کے ساتھ ساتھ تواتر عمل ثابت نہیں ہوسکا، حضرت امام اعظم تواتر عمل کے اس حد تک قائل تھے کہ وہ اس کی تائید میں ان روایات وآثار سے مدد لیتے تھے جو اپنی جگہ مرسل ہوں، مگر عملاً متصل ہوں (مولانا عبدالرشید)۔

مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال کرنا اس کی تصحیح ہے، یہی احناف کا نقطۂ نظر بھی ہے، چنانچہ ائمہ فن کا اپنی کتابوں میں احادیث ذکر کرنا اور ان سے استدلال کرنا بھی ان احادیث کی تصحیح ہے، لہٰذا جس حدیث کو امام محمدؒ یا محدث طحاوی استدلال کرتے ہوئے ذکر کریں اس کا مطلب ہے کہ وہ حدیث قابل استدلال ہے، (مولانا ابوسفیان، مولانا خالد صدیقی، مولانا ابوالحسن علی)۔

اس کے برعکس محدثین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی عالم کا حدیث کے مطابق یا خلاف فتویٰ دینا یا اس کے خلاف عمل کرنا نہ تو اسے صحیح قرار دینا ہے اور نہ ضعیف، نہ ہی اس کی تعدیل ہے اور نہ اس کی تجریح، کیونکہ اس کا امکان ہے کہ حدیث کے مطابق ان کا عمل احتیاط کی بنا پر ہو، یا کسی دوسری دلیل کی بنا پر ہو جو صحیح اور موافق حدیث ہو، یا یہ کہ وہ حدیث ضعیف سے استدلال کو درست سمجھتے ہوں، یا انہوں نے کسی معارض کی بنا پر اس حدیث کی مخالفت کی ہو، جیسا کہ امام مالک نے اپنی مؤطا میں حدیث "الخیار للبیعان" نقل کی اور اس پر عمل نہیں کیا، حالانکہ اس کی سند بھی صحیح ہے (مولانا ابوسفیان، مولانا خالد صدیقی)۔

بالفاظ دیگر محدثین و فقہاء مجتہدین کے درمیان اختلاف اتنا ہے کہ محدث صرف راوی کے احوال کو دیکھ کر صحت وضعف کا فیصلہ کردیتا ہے، اور مجتہد راوی کے اندر شرائط کے اعتبار کے ساتھ ساتھ راوی کی روایت کردہ خبر اور حدیث کو بھی دیکھتا ہے، تو مجتہد کے نزدیک صحت اور ضعف کا مرجع اس کی رائے ہے۔

مقالہ نگار حضرات کے بقول محدثین کے نزدیک حدیث ضعیف کی شناخت کے مندرجہ ذیل اصول ہیں:

ا۔ وہ حدیث جو عقل اور اصول کے خلاف ہو۔

۲۔ مشاہدات، قرآن وحدیث متواتر کے مخالف ہو۔

(مولانا خالد صدیقی نے اسے انقطاع کی ایک باطنی شکل قرار دیتے ہوئے اس کی مثال میں ایک گواہ اور قسم کی وجہ سے قاضی کے فیصلہ والی روایت پیش کی ہے، ان کے بقول احناف کا اس سلسلہ میں استدلال یہ ہے کہ یہ روایت آیت: "واستشهدوا شهيدين من رجالكم" نیز مشہور حدیث: "البينة على المدعي واليمين على من انكر" کے خلاف ہے جو کہ شہادت اور قضا کے باب میں شرعی ضابطہ رکھتی ہے)۔

۳۔ اجماع قطعی کے خلاف ہو اور قابل تاویل بھی نہ ہو۔

۴۔ جس میں معمولی سی بات پر دھمکی ہو۔

۵۔ مختصر سے کام پر بڑے بڑے انعامات کا وعدہ ہو۔

۶۔ روایت یا مضمون سے متعلق اس کا سلسلہ قابل اعتراض ہو۔

مولانا عبدالرشید قاسمی کے بقول امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم کرتے تھے۔ علامہ ابن حزم نے اس پر فقہاء عراق کا اجماع نقل کیا ہے، ان کے بقول فقہ حنفی میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، جیسے حدیث وضوء بالقہقہہ فی الصلوٰۃ، حدیث وضوء بنبیذ التمر وغیرہ۔

امام شافعی ابتداء میں استفاضۂ عمل کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے، لیکن آخری دور میں آپ بھی امام صاحب کی موافقت کرتے ہوئے توارثِ عمل سے استدلال کرنے لگے، بیس رکعت تراویح کے ثبوت میں آپ کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں تھی، آپ نے اہل مکہ کے استفاضۂ عمل سے استدلال کیا (ترمذی، ۱/۱۳۹)، اسی فکری تبدیلی کی باعث اکثر مسائل میں آپ کے دو قول ملتے ہیں قول قدیم اور قول جدید۔ امام بخاری صحیح بخاری میں استدلالاً اقوال صحابہ اور تابعین لائے ہیں، نیز ان کی عدم موجودگی میں قیاس بھی کرتے مثلاً حدیث: "اذا امن الامام فامنوا" میں مسئلہ یہ پیش آیا کہ مقتدیوں کو امام کے آمین کہنے کا پتہ کیسے چلے، کیوں کہ امام کے بلند آواز سے آمین کہنے کی تصریح نہ تھی اور آمین بالجہر کی دوسری حدیثیں شرائط صحت کے مطابق نہیں تھیں، لہٰذا امام بخاری نے آمین بالجہر کو قیاس سے ثابت کیا (فتح الباری، ۲/۲۷۹) (مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

اور اگر ایک دور کے دو راوی ایک حدیث روایت کریں تو تو اسے امام مسلم متصل الاسناد سمجھتے تھے، امام ابوداؤد بھی حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے، امام نسائی کوئی ایسی روایت نہ قبول کرتے جس کے ترک پر اجماع ہو، امام ترمذی کے یہاں بھی بکثرت ضعیف احادیث ملتی ہیں، معلوم ہوا کہ ان سے استدلال درست ہے۔ (فتح الملہم، ۱/۵۸)۔

مولانا ارشاد احمد اعظمی کے بقول متقدمین علماء احناف کے یہاں حدیث ضعیف کا ذکر نہیں ملتا، ان کے یہاں حدیثیں مقبول یا مستنکر ہوتی ہیں اور مستنکر پر عمل موجب گناہ تصور کیا جاتا ہے، ان کے بقول علماء احناف نے جن احادیث کو قبولیت کا درجہ عطا کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ مراسیل قرون فاضلہ۔

۲۔ احادیث متواترہ۔

۳۔ احادیث مشہورہ۔

۴۔ خبر آحاد (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے مرسل روایت کی حجیت اور عدم حجیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، مولانا انیس احمد مدنی کے بقول مرسل کی تعریف میں محدثین اور اصولیین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، محدثین صرف تابعین کی ارسال کردہ روایات کو مرسل کہتے ہیں، جب کہ فقہاء سند میں واقع ہر قسم کے اسقاط کو ارسال سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تیسیر مصطلح الحدیث، ۱۷۲)۔

مولانا انیس احمد مدنی، مولانا شیر علی، مولانا اسعد فلاحی اور مولانا خورشید احمد اعظمی کے بقول جمہور محدثین کے نزدیک مرسل حدیث حجت نہیں ہے، سوائے مراسیل صحابہ کے، جب کہ اصولیین کے نزدیک مرسل حدیث حجت ہوتی ہے، یہی رائے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد، اوزاعی، سفیان ثوری اور زیدیہ کی ہے۔ (فتح المغیث، ۱/۱۶۲)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا انیس احمد مدنی کے بقول امام شافعی کے نزدیک کبار تابعین کی مراسیل حجت ہیں، بشرطیکہ مرسل صرف ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہو، اور ثقات کی کبھی مخالفت نہ کی ہو، نیز اس مرسل کی تائید کسی صحابی کے قول یا اہل علم کے فتویٰ یا کسی دوسرے سلسلہ سند میں بھی مروی ہونے کی وجہ سے ہو رہی ہو۔ (الرسالہ ۴۶۱)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی کے بقول امام سیوطی نے قبول مراسیل کے سلسلہ میں نو اقوال نقل کیے ہیں۔ (تدریب الراوی، ۱/۲۰۲، نزہۃ النظر ۸۰)۔

مولانا خالد صدیقی، مولانا ارشاد احمد اعظمی، مولانا انیس احمد مدنی نے خبر واحد کے اعتبار و عدم اعتبار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان حضرات کے بقول اگر خبر واحد کا تعلق ان مسائل سے ہے جو عموم بلویٰ سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ خبر واحد غیر مقبول ہوگی۔

مولانا خالد صدیقی نے اس کی مثال میں نماز میں جہراً بسم اللہ پڑھنے والی روایت پیش کی ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل میں روایت کا علی سبیل التواتر یا کم از علی سبیل المشہور نقل نہ کیا جانا عقلاً محال ہے۔ (التوضیح ۱/ ۴۳۲)۔

مولانا انیس احمد مدنی نے اس کی مثال میں مس ذکر کے ناقض وضو ہونے کے سلسلہ میں وارد حضرت ابن مسعود کی روایت پیش کی ہے، اسی طرح نیند سے بیدار ہونے کے وقت ہاتھوں کے دھونے کے حکم سے متعلق روایت جس کے راوی طبقہ صحابہ میں صرف حضرت ابو ہریرہؓ ہیں، مولانا انیس احمد مدنی کے بقول یہ رائے امام سرخی اور بعض احناف کی ہے (الاحکام للآمدی، ۱/ ۳۴۹)۔ امام مالک اہل مدینہ کے عمل کو بعض اخبار آحاد پر ترجیح دیتے ہیں المدارک ۴۱، مالک، حیاتہ عصرہ ابوزہرہ ۲۸۰)۔

ان کے بقول اخبار آحاد سے حدود کا اثبات نہیں ہوسکتا ہے، یہی رائے امام کرخی اور ابو عبد اللہ بصری کی بھی ہے (روضۃ الناظر وجنۃ المناظر، ۱/ ۳۲۸)۔

اسی طرح اگر خبر واحد قیاس کے خلاف ہو تو عیسیٰ بن ابان کے نزدیک غیر مقبول ہوگی، بشرطیکہ راوی غیر ضابط، روایت کے مضمون سے بے خبر، اور متساہل ہو اور اگر راوی ضابط عالم غیر متساہل ہو تو ایسی صورت میں قیاس وخبر واحد کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے میں اجتہاد سے کام لیا جائے گا (الاحکام ۱ر ۳۴۹)۔

امام جبائی نے حدیث کی مقبول ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے نبی کریم ﷺ سے روایت کرنے والے ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہوں، یہی رائے امام حاکم اور عبد اللہ کی بھی ہے (نزہۃ النظر ۱۱، وروضۃ الناظر، ۱/ ۲۷۹)۔

مولانا ارشاد احمد اعظمی کے بقول خبر واحد کے مقبول ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اگر راوی غیر معروف ہے تو دوسرے صحابہ کا اس سے اتفاق یا روایت پر خاموشی ہو یا کم سے کم کچھ صحابہ نے اس کو اخذ کیا ہو اور ثقات نے بعد میں اسے نقل کیا ہو، اسی طرح ان کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ راوی کی عدالت اور ضبط حدیث میں شہرت کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ اور سنت مشہورہ سے خبر واحد متصادم نہ ہو اور نہ ہی صدر اول میں اس سے اعراض کیا گیا ہو۔

اس اعراض کی مثال میں مولانا خالد صدیقی نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کی ہے: "طلاق العبد ثنتان" (دار قطنی بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۳۸۷)۔

انہوں نے التوضیح مع التلویح ۱/ ۴۳۲ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس روایت کو فقہاء احناف نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ صحابہ نے اس سے اعراض کیا تھا، اس ضمن میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ طلاق کے بارے میں عورت کا اعتبار ہوگا، اس کے برعکس بہت سے صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہؓ کا مسلک یہ ہے کہ طلاق میں اعتبار مرد کا ہوگا اور یہ شوافع کا مسلک ہے، لیکن مولانا خالد صدیقی کی اپنی رائے یہ ہے کہ احناف کے اس حدیث سے استدلال نہ کرنے کا سبب اعراض نہیں بلکہ ایک دوسری روایت "طلاق الأمۃ ثنتان وعدتها حيضتان" (ابوداؤد، ترمذی وابن ماجہ) ہے۔

مولانا خالد صدیقی کا کہنا ہے کہ بظاہر یہ اصول درست معلوم ہوتا ہے صحابہ کرام کا اعراض ضعف حدیث کا باعث ہے، لیکن اس طرح کی احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مذہب کا ادعا کہ فلاں حدیث میں اعراض صحابہ ثابت ہے محل نظر ہے۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک فی الجملہ ضعیف حدیث کی روایت کی بھی اجازت ہے اور اس پر عمل کی بھی گنجائش ہے، لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں:

۱۔ اس کا ضعف شدید نہ ہو، یعنی حدیث کا راوی کاذب یا متہم بالکذب نہ ہو۔

۲۔ حدیث کا مضمون شریعت کے کسی اصل کلی یا قاعدہ کے تحت آتا ہو۔

۳۔ حدیث ضعیف پر عمل حدیث کے ثبوت کے یقین واعتقاد کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ احتیاطاً عمل کیا جائے۔

۴۔ اس کا تعلق عقائد یعنی صفات باری تعالیٰ سے نہ ہو۔

۵۔ اس کا تعلق حلال وحرام سے نہ ہو۔

۶۔ اس کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ قوی دلیل موجود نہ ہو۔

(مختصر الجرجانی مع ظفر الامانی ۲۰۹۔ ۲۲۲، مقدمہ ابن الصلاح ۴۷، التقریب علی التدریب ۱/ ۲۹۸، القول البدیع ۲۱۵، منہج النقد فی علوم الحدیث ۲۹۱، تیسیر مصطلح الحدیث ۹۶۵)۔......... (مفتی نظام الدین صاحب، مولانا ابوالحسن علی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا اسعد فلاحی، مولانا عبدالواحد قاسمی، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا شیر علی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا خالد صدیقی، مولانا مبارک حسین ندوی وغیرہ)۔

مولانا حبیب اللہ قاسمی کے بقول دوسری اور تیسری شرطیں ابن دقیق العید اور عزبن عبدالسلام سے بھی منقول ہیں (الاجوبۃ الفاضلۃ ۴۳۔ ۴۴، اعلاء السنن ۱/ ۴۶)۔

مولانا خالد صدیقی کے بقول علامہ سیوطی نے امام احمد، ابن مہدی اور ابن مبارک کی طرف منسوب کیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک قصص، فضائل اعمال اور نصائح وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کرنا جائز ہے، احکام میں بھی بعض صورتوں میں ضعیف احادیث پر عمل کیا جاسکتا ہے اور ایسا احتیاطاً کیا جائے گا، مثلاً کوئی ضعیف حدیث خرید وفروخت یا نکاح کی بعض صورتوں کی کراہت سے متعلق وارد ہو تو ان سے بچنا مستحب ہے، لیکن واجب نہیں، مولانا صدیقی کے بقول نواب صدیق حسن خاں نے اس مسئلہ کی تفصیل بیان فرمائی ہے (الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ/ ۱۲۵)

مولانا مبارک حسین ندوی اور مولانا خالد صدیقی کے بقول قاضی ابوبکر اور ابن العربی مالکی کی طرف منسوب ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً جائز نہیں ہے (منہج النقد فی علوم الحدیث ۹۱۔ ۹۴) مولانا مبارک حسین ندوی کی بقول یہی رائے عمر بن حسن عثمانی فلاتہ کی بھی ہے (الوضع فی الحدیث/ ۶۸)۔

جناب شمس پیرزادہ، مولانا انیس احمد مدنی، مولانا خورشید احمد اعظمی نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ مولانا عبدالریم قاسمی لکھتے ہیں کہ ضعیف حدیث کو متواتر کے درجہ میں رکھ کر قطعی کو اس سے منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے، ان کے بقول اسی وجہ سے امام شافعی نے لا وصیة لوارث کو آیت وصیت کے لیے ناسخ مانا ہے، اس لیے کہ عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔

مولانا ارشاد قاسمی کے بقول ضعیف حدیث کو سنداً ضعیف کہا جائے گا، متناً ضعیف نہیں کہا جائے گا۔

مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی اور مولانا ارشاد قاسمی کی رائے یہ ہے کہ حدیث ضعیف میں صیغۂ جزم کے ساتھ آپ کی طرف نسبت نہیں کی جائے گی، بلکہ صیغہ مجہول یا اسی کے مشابہ لفظ اختیار کیا جائے گا، مثلاً روی عنہ، یا بلغنا عنہ، یا ورد عنہ یا جاء عنہ وغیرہ۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کے بقول روایت کی تصحیح وتضعیف ایک اجتہادی معاملہ ہے، لہٰذا کسی مجتہد نے اپنے اجتہاد سے کسی حدیث یا کسی راوی کو صحیح جانا تو دوسرے کے لیے اس کو ملامت کرنا جائز نہیں ہے۔

مولانا عبدالرشید قاسمی کی رائے ہے کہ حدیث ضعیف میں اشکالات وارد ہوں تو انہیں رفع کرنے کے لیے اتنا واضح کردینا کافی ہے کہ یہ روایتیں ضعیف ہیں، تاویلات کرنے اور جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے بقول یہی رائے حافظ ابن حجر کی بھی ہے۔ (فتح الملہم ۱/ ۵۸)

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف کے مقبول اور غیر مقبول ہونے میں معیار یہ ہے کہ اس کے سب راویوں کو دیکھا جائے پھر کسی نص شرعی سے تصادم محسوس نہ ہو تو اس کو قبول کرلیں گے ورنہ رد کردیں گے، اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ دیکھنا ہوگا کہ اگر اس میں کوئی راوی مجہول واضع حدیث بھی ہو لیکن اس کا اندمال دوسری محفوظ ومستند روایت سے ہوجاتا ہے تو اس کو قبول کرلیں گے۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے حدیث: "من حدث عني بحديث يرى أنه كذب فهو احد الكاذبين" (مسلم ۱/ ۶۷)

اور حدیث: "من كذب على متعمدا فليتبوأ مقعده من النار" (بخاری، احمد ۱/ ۶۵، مسلم ۱/ ۷) اس ضمن میں ذکر کی ہیں۔

جناب شمس پیرزادہ کے بقول موضوع حدیث دراصل اللہ پر افتراء ہے، کیوں کہ یہ دین میں اپنی طرف سے ایسی بات شامل کرنا ہے جو ثابت نہیں، اور اللہ پر افتراء کرنے والوں کے لیے وعید آئی ہے: "فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا ليضل الناس بغير علم" (الانعام/ ۱۴۴)۔

پیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک وضع حدیث سب سے بڑا گناہ ہے (شرح الکامل علی مسلم ۱/۸ للنووی، الموضوعات الکبیرہ ۸، احیاء العلوم ۳/۱۲۱)۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول بعض جاہل صوفیاء اور فرقہ کرامیہ کے لوگ ترغیب وترہیب میں وضع حدیث کے جواز کے قائل ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ آپ کے الفاظ بعض روایات میں ایسے ہیں جن سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ممانعت اس مضمون کے متعلق ہے جو مخالفت اور نقصان پر مبنی ہو، اور جو موافقت اور مصلحت پر مبنی ہو اس سے متعلق ممانعت نہیں ہے، مقالہ نگار حضرات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ عقلاً ونقلاً ہر طرح بے بنیاد اور جمہور علماء اور محدثین کے اجماع کے خلاف ہے (نزہۃ النظر/۵۸-۵۹، لمعات ۱/۲۵۳، شرح الکامل ۱/۸)۔ مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا اسعد فلاحی، مولانا ابوالحسن علی اور مولانا خالد صدیقی وغیرہ)۔

مولانا مصطفیٰ قاسمی لکھتے ہیں کہ یہ استدلال کلام عرب اور شریعت کے انداز تخاطب سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اس لیے کہ یہ سب محاورۂ عرب اور اصطلاح شرع میں کذب علی الرسول ہی ہے، مولانا انیس احمد مدنی اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ موضوع کے کذب ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ حدیث ضعیف میں فی نفسہ صحیح ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے، کیوں کہ حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حدیث صحیح یا حسن کی کوئی شرط نہ پائی جائے۔

مولانا عبدالرشید قاسمی اس سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ کذب خلاف واقعہ بات بیان کرنے کو کہتے ہیں، خواہ عمداً ہو یا سہواً مگر چونکہ بھول چوک میں گناہ نہیں ہوتا، اس لیے حدیث پاک میں متعمداً کی قید بڑھائی گئی ہے (فیض القدیر ۲/۵)۔

مولانا موصوف فرقہ کرامیہ اور بعض صوفیاء کے خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسند بزار اور سنن دارمی میں "من کذب علی متعمدا لیضل به الناس" آیا ہے، جس سے یہ استدلال کرنا کہ ترغیب وترہیب کے لیے کذب بیانی جائز ہے چند وجوہ سے غلط ہے:

۱۔ اس لیے کہ یہ زیادتی باطل ہے، کسی صحیح روایت میں یہ زیادتی نہیں ہے۔

۲۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اگر یہ زیادتی صحیح مان لی جائے تو وہ بطور تاکید ہے، جیسا کہ قرآن کی آیت: ومن اظلم ممن افتری علی الله کذبا لیضل الناس بغیر علم" میں ہے۔

۳۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ "لیضل الناس" میں لام تعلیلیہ نہیں بلکہ لام عاقبت کا ہے، یعنی کذب بیانی جس کا انجام گمراہی ہے (فیض المنعم/۶۶)۔

مولانا حبیب اللہ قاسمی اور مولانا ارشاد احمد اعظمی کے بقول اگر موضوع حدیث کے ذکر کا مقصد لوگوں کو اس کے موضوع ہونے سے واقف کرانا اور اس پر عمل سے دور رکھنا ہو تو ایسی صورت میں موضوع حدیث کا ذکر کیا جاسکتا ہے، مولانا ارشاد قاسمی نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ وضع کے ذکر کے ساتھ موضوع کا بیان اہل علم کے لیے ہے، عوام کو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول احادیث ضعیفہ کی سب سے بدترین قسم حدیث موضوع ہے (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ارشاد احمد اعظمی، مولانا خالد صدیقی وغیرہ)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں کہ موضوع روایت میں جب تک اس کے تمام راوی بالاتفاق موضوع نہ کہہ دیں اس پر موضوع کا حکم لگا دینا ضروری نہیں، اس لیے کہ ان راویوں میں سے اگر ایک بھی کوئی ایسی روایت نقل کردے جس سے اس راوی کی روایت میں احتمال ناشئ عن الدلیل کسی وجہ میں بھی حدیث ہونے کا ہوجائے تو اس کو غیر حدیث کہنا جائز نہ رہے گا، بلکہ ایسا شخص اس عذاب ونکال کا مستحق ہوگا جو حدیث "من کذب علی متعمدًا . . . الخ" میں مذکور ہے اور یہ حکم ایک اصل شرعی سے مستفاد ہے یعنی

"قولا بمساوقة النتيجة بين المقدمتين وقولا لمعرفة المجهول بمعرفة المعلوم" (قواعد الفقہ/۴۷)۔

حضرت مولانا موصوف کے بقول یہ بات حضرت امام مالک اور خلیفہ منصور کے درمیان ہونے والی گفتگو سے پوری طور پر ثابت ہوچکی ہے۔ خلیفہ منصور نے حضرت امام مالک سے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں مؤطا کو سارے قلمرو میں قانون اور لازم بنادینا چاہتا ہوں تاکہ سب لوگ اس پر عمل کریں، تو حضرت مالک نے منع فرمادیا اور فرمایا: بے شمار صحابہ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہوں نے جو حدیث یا اس کا مفہوم ومنشا حضور ﷺ سے سنا ہے اور اس کے حدیث ہونے کا احتمال ہوگیا ہے، اس کو غیر حدیث کہہ دینا کسی طرح درست نہ ہوگا، یہ سن کر خلیفہ نے اس کا ارادہ ترک کردیا، بعد میں یہی خواہش خلیفہ ہارون رشید کی بھی تھی مگر اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے قول یا فعل یا تقریر جو ناشئ عن

الدلیل ہو، اس کو غیر حدیث کہنا یا اس کا انکار کرنا ہرگز جائز نہ رہے گا۔

۳۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول کسی واضع حدیث یا کذاب فی الحدیث راوی کا کسی سند میں شامل ہونا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ وضع کا حکم لگانے سے پہلے اس کے تمام طرق کا تتبع واستقصاء کرنا ضروری ہوگا، اور یہ دیکھنا ہوگا کہ اس حدیث کو اس راوی کے علاوہ کسی نے روایت کیا ہے یا نہیں؟ یا اس کا کوئی متابع یا شاہد ہے یا نہیں؟ اگر اس روایت کو کسی اور نے بیان کیا ہے یا اس کا کوئی شاہد ہے تو اسے درست قرار دیا جائے گا، ورنہ موضوع (قواعد فی علوم الحدیث/ ۴۳، مقدمہ ابن الصلاح/ ۱۴۸، فتح المغیث، ۱/ ۲۹۷)۔

مقالہ مولانا ارشاد قاسمی، مولانا شیر علی، مولانا ارشاد احمد اعظمی، مولانا انیس احمد مدنی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔ مولانا ارشاد قاسمی نے اس کی دلیل میں یہ روایت پیش کی ہے: "لا مهر اقل من عشرة دراهم" اس میں ایک راوی مبشر بن عبید ہے جو کذاب ہے، اس کے باوجود اس حدیث کو ضعیف تو کہا گیا مگر موضوع نہیں کہا گیا (ظفر الامانی/ ۲۱۲ مطبوعہ بیروت)۔

مولانا انیس احمد مدنی کا خیال ہے کہ تتبع اور استقصاء نہ کرنے ہی کی وجہ سے علامہ ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات میں متعدد حسن احادیث بھی آ گئی ہیں (تدریب الراوی، ۱/ ۲۸۷، فتح المغیث، ۱/ ۲۹۷)۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول امام الحرمین ابو محمد الجوینی واضع حدیث کو کافر قرار دیتے ہیں (نزہۃ النظر/ ۵۹)۔

مولانا عبد الرشید قاسمی کے بقول امام ابوحنیفہ اور امام شافعی روایت کو شہادت کے اقسام میں مانتے ہیں، مولانا شیر علی اور مولانا عبد الرشید قاسمی کے بقول امام نووی نے ان تمام ائمہ کی آراء سے اختلاف کیا ہے، امام نووی کی رائے یہ ہے کہ اگر کذاب فی الحدیث توبہ کرنے کے وقت تین شرطوں کی رعایت کرے تو توبہ کے بعد اس کی روایت قبول کی جائے گی، ورنہ نہیں:

۱۔ گناہ سے کنارہ کش ہو جائے، ۲۔ گناہ پر نادم ہو، ۳۔ مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم کرے۔

امام نووی کی دلیل یہ ہے کہ کفر سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے، مگر اس کے باوجود توبہ کرنے کے بعد ایسے شخص کی روایات قبول کی گئی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "الاسلام يهدم ما كان قبله" اور آپ ﷺ نے فرمایا: "التائب من الذنب كمن لا ذنب له"۔

امام نووی کے بقول یہی قاعدہ شہادت کے باب میں بھی اختیار کیا جائے گا (تدریب الراوی، ۱/ ۳۳۲)۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول وضع کا حکم ظن غالب کے اعتبار سے لگایا جائے گا، قطعی طور پر نہیں (النکت علی نزہۃ النظر/ ۱۱۸، میزان الحدیث/ ۷۵)، (مقالہ مولانا شیر علی، مولانا حبیب اللہ قاسمی)۔

مولانا محبوب علی جیہی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، جناب شمس پیرزادہ کے نزدیک کسی واضع حدیث یا کذاب فی الحدیث راوی کا کسی سند میں شامل ہونا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی ہے اور ان حضرات کے نزدیک یہی احتیاط کا تقاضا بھی ہے۔

۳۔ حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔ تلقی بالقبول کا مفہوم:

تقریباً تمام ہی مقالہ نگار حضرات کے بقول احادیث کو جو اگرچہ سنداً ضعیف ہوں، مگر علماء کے مابین راویۃ یا عملاً مقبول ہوں، متلقی بالقبول سے تعبیر کیا جاتا ہے (قواعد فی علوم الحدیث/ ۴۰، تدریب الراوی، ۱/ ۶۸)، (مقالہ مولانا ابوالحسن علی، مولانا اسعد فلاحی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ارشاد احمد اعظمی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا شیر علی وغیرہ)۔

جناب شمس پیرزادہ کی رائے یہ ہے کہ تلقی بالقبول متاخرین کی اصطلاح ہے اور یہ اصول حدیث میں اضافہ ہے اگر قبول حدیث کا یہی معیار ہے تو امام بخاری اور امام مسلم نے ہر حدیث کی اسناد پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ کیا اس زمانہ کے علماء کے قبول حدیث کو وہ معیار بنا کر سند سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے؟ مولانا محمد امین کا رجحان بھی اسی طرف ہے اور ان کے بقول محققین کا بھی یہی مسلک ہے، مولانا ارشاد احمد اعظمی

کے بقول مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے بھی محض تلقی علماء کی وجہ حدیث کے مستند ہونے کی شدت سے تردید کی ہے۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول فقہاء کرام، ائمہ مجتہدین جرح وتعدیل کے قبول کرنے پر تلقی کا اطلاق ہوگا، مولانا ابوالحسن علی، مولانا خالد صدیقی اور مولانا ارشاد احمد اعظمی کے قول امام مالک کی رائے یہ ہے کہ اہل مدینہ میں اگر کسی روایت کو قبول عام حاصل ہو تو سند کی صحت یا ضعف کو دیکھنا ضروری نہیں ہے (فتح القدیر لابن ہمام، ۳/ ۳۴۹، مقالہ مولانا خالد صدیقی)۔

مولانا انیس احمد مدنی اور مفتی نظام الدین اعظمی صاحب نے حدیث "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" (ابن ماجہ کتاب الفتن/ ۸) سے تلقی بالقبول کے اعتبار پر استدلال کیا ہے۔

۲۔ حدیث ضعیف متلقی بالقبول کا حکم اور اس پر عمل کی گنجائش

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے بقول ایسی حدیث حکماً صحیح اور حسن کا درجہ حاصل کر کے قابل استدلال ہو جاتی ہے، ائمہ مجتہدین نے اسے باب الفقہ والاحکام میں قبول کیا ہے، بلکہ امام سخاوی، امام ابوبکر جصاص رازی نے اسے متواتر کے درجہ میں رکھ کر آیات احکام کے لیے اسے ناسخ قرار دیا ہے۔

مولانا خالد صدیقی کے بقول یہی مسلک حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حسن بصریؒ، شعبی، سالم، سفیان ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام ترمذی اور مولانا خورشید احمد اعظمی کے بقول علامہ عبدالبر، ابواسحاق الاسفرائینی، ابن الحصار، علامہ کشمیری، مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر محققین نے بھی اختیار کیا ہے۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے حدیث ضعیف متلقی بالقبول کے قابل استدلال ہونے کی مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے:

"البحر هو الطهور ماؤه... الخ" (الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۲۲۹، قواعد فی علوم الحدیث/ ۶۰، تدریب الراوی، ۱/ ۶۷، فیض الباری، ۳/ ۴۰۹)۔

مولانا انیس احمد مدنی نے اس کی مثال میں حضرت عمر فاروق کا وہ رسالہ پیش کیا ہے جو انہوں نے نظام قضاء کے سلسلہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پاس بھیجا تھا (السنن الکبریٰ للبیہقی، ۱۰/ ۱۵۰، اعلام الموقعین، ۱/ ۹۲، منہاج السنہ، ۳/ ۱۴۶، اخبار القضاۃ، ۱/ ۷۰، سنن الدارقطنی، ۴/ ۲۰۶)۔

ان کے بقول عصر حاضر کے محقق احمد شاکر اور شیخ البانی نے بھی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، (رسالۃ الشافعی/ ۱۳۹۔ ۲۴۲، تحقیق احمد شاکر، ارواء الغلیل ۶/ ۸۷، ۹۸)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول سے آیت قرآنی کے نسخ کی مثال میں بیشتر مقالہ نگار حضرات نے حدیث "لا وصیۃ لوارث" پیش کی ہے، ان کے بقول حضرت امام شافعی نے آیت وصیت کو اس سے منسوخ مانا ہے (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۳، الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۵۲، مقالہ مولانا انیس احمد مدنی، مولانا ابوالحسن علی وغیرہ)۔

مولانا عبدالرشید قاسمی نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ امام نووی کے یہاں ایسی حدیث پر عمل واجب نہیں مستحب ہے (تدریب الراوی، ۱/ ۶۷)

مولانا خالد صدیقی لکھتے ہیں کہ بسا اوقات عدم تلقی کی وجہ سے روایت سنداً صحیح ہونے کے باوجود فقہاء کے نزدیک قابل عمل نہیں ہوتی، جیسے ابوداؤد شریف کی حضرت عائشہ سے مروی حدیث "المستحاضۃ تغتسل لکل صلاۃ"، اسی طرح تلقی کے بنا پر جمہور علماء بعض اوقات کم قوی روایت کو زیادہ قوی روایت پر ترجیح دیتے ہیں، مثلاً تیمم میں ہاتھوں کا مسح کہ کہاں تک ہو، اس سلسلہ میں تین روایتیں ملتی ہیں، ایک یہ کہ گٹوں تک مسح کیا جائے، دوسری یہ کہ کہنیوں تک، تیسری یہ کہ بغل تک، دوسری روایت اگرچہ پہلی اور تیسری کے مقابلہ میں سنداً کمزور ہے مگر ائمہ نے تلقی بالقبول کی وجہ سے حسن قرار دے کر اسے ترجیح دی ہے (شرح النووی مع مسلم، ۱/ ۱۶۰)۔

ج۔ تلقی کی دونوں صورتوں (روایت اور عمل) کے درمیان فرق کیا جائے گا یا دونوں کا حکم یکساں ہے؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات کے آراء دو طرح کی ہیں:

۱۔ دونوں کا حکم یکساں ہے۔

۲۔ دونوں کے درمیان فرق کیا جائے گا۔

پہلی رائے کے قائلین مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا ابوالحسن علی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خالد صدیقی اور مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوالحسن علی اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ محدثین آپس میں اسی روایت کو نقل کرتے ہیں جس کو تلقی بالقبول حاصل ہو اور ایسی حدیث کے قبول کے لیے یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ اہل علم اس پر عمل کرتے ہوں۔ لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

مولانا خالد صدیقی کے بقول فقہاء احناف اور شاہ صاحب بھی اسی کے قائل نظر آتے ہیں (حجۃ اللہ البالغۃ نقلاً عن قواعد فی علوم الفقہ، ۲/۲۱)۔

دوسری رائے کے قائلین کے نام یہ ہیں:

مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا عبدالواحد قاسمی، مولانا اسعد فلاحی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا شیر علی۔ ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی حدیث کی بابت صرف عمل کی حد تک علماء کا اتفاق ہو تو اسے خبر واحد کے درجہ میں رکھا جائے گا اور اگر اس پر عمل بھی ہو اور اس کے مطابق فتویٰ بھی دیا جاتا ہو تو پھر قطعیت کے ساتھ اس کے ثبوت کا حکم بھی دیا جائے گا (احکام القرآن، ۱/۳۸۶، فتح القدیر ۳/۴۹۳، مقالہ مولانا مصطفیٰ قاسمی)۔

مولانا اسعد فلاحی اور مولانا شیر علی کے نزدیک حکم کے اعتبار سے تلقی بالعمل کو تلقی بالروایہ پر ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ حدیث ضعیف مؤید بقرائن

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے مراد بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک اسی ضعیف حدیث ہے جس کے ضعف کی تلافی تعدد طرق یا کسی متابع، یا کسی شاہد کے ذریعہ ہو جائے، مقالہ نگار حضرات کے مطابق ایسی حدیثیں حسن لغیرہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور اصلاً مقبول ہوتی ہیں اور جمہور علماء نے بھی اسے قابل احتجاج اور معتبر مانا ہے (فتح المغیث/۶۵، ظفر الامانی/۴۱۰، حاشیہ قواعد فی علوم الحدیث/۱۰۱، قواعد الفقہ/۴۰۳، انہاء السکن ۱۹۔۲۰)۔

مقالے: مولانا حبیب اللہ قاسی، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا عبدالواحد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا شیر علی، مولانا اسعد مفتاحی، مولانا خالد صدیقی۔

مولانا محمد امین صاحب کے بقول اس سلسلہ میں دو آراء ہیں، بعض علماء اسے قبول کرتے ہیں، اور بعض اسے قبول نہیں کرتے۔

ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، مولانا مصطفیٰ قاسمی اور مولانا مبارک حسین ندوی کے بقول امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقات ایسی احادیث ذکر کی ہیں (فتح المغیث/۶۵، النکت/۳۴۰)، (مقالہ مولانا مبارک حسین ندوی)۔

مولانا مصطفیٰ اور ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی کے بقول امام ترمذی نے امام بخاری کے تعلیقات کو کتاب العلل میں ذکر کیا ہے۔ امام سخاوی نے اربعین حدیث کو کثرت طرق کی وجہ سے قابل عمل قرار دیا ہے۔

تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر احادیث ضعیفہ کا ضعف سوء حفظ، یا ارسال، یا تدلیس یا جہالت یا دوسرے ایسے امور کی وجہ سے ہے جن کا تعلق ضبط راوی سے ہے اور تعدد طرق سے یہ ضعف زائل ہو جاتا ہے تو ایسی احادیث مقبول ہوں گی اور اگر ان کا ضعف راوی کے فسق یا کذب یا ایسے دیگر اسباب کی بنا پر ہے جن کا تعلق راوی کی عدالت سے ہے تو تعدد طرق سے ایسی احادیث کا ضعف ختم نہیں ہوگا اور نہ وہ مقبول ہوں گی (مقدمہ ابن صلاح/۱۴، تقریب النووی/۵۸، مقالہ مولانا انیس احمد مدنی، اصول الفقہ/۲۷۲ للشیخ محمد خضری، مقالہ جناب شمس پیرزادہ الاجوبۃ الفاضلۃ/۲۲۹، قواعد فی علوم الحدیث مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۲۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات کے مطابق ایسی احادیث سے فضائل کے باب میں تو مطلقاً استدلال کیا جا سکتا ہے، البتہ احکام اور مسائل میں استدلال کے لیے شرط یہ ہے کہ یا تو تعدد طرق ہو، یا صحیح شاہد موجود ہو، یا ظاہر قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہو، یا ائمہ وتابعین کا اس پر عمل رہا ہو (قواعد التحدیث/۱۰۹، اعلاء السنن، ۱/۶۷، انہاء السکن/۲۲، فتح الملہم ۱/۵۸، میزان الحدیث/۶۴)، مقالہ مولانا انیس احمد مدنی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا اسعد فلاحی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا خالد صدیقی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا حبیب اللہ قاسمی وغیرہ)۔ جناب شمس پیرزادہ نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے:

ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ کی روایت ہے: "فإن رسول الله ﷺ كان يأمرنا ان نخرج الصدقة من الذى نعد للبيع" اس حدیث کے ایک راوی جعفر بن سعد اور دوسرے خبیب بن سلمان ہیں، جو ضعیف ہیں، لیکن یہ حدیث (ان کے خیال کے مطابق) آیت: "انفقوا من طيبات ماكسبتم" (سورہ بقرہ/۲۶۷) سے بالکل مطابقت رکھتی ہے، اور اس کا اقتضاء ہے کہ اموال تجارت پر زکاۃ ہو، جبکہ مولانا عبدالواحد قاسمی کی مطابق راجح مذہب یہ ہے کہ ایسی احادیث پر صرف فضائل میں اعتماد کیا جاسکتا ہے، احکام اور مسائل میں نہیں۔

۳۔ حدیث ضعیف کے ضعف کی تلافی کے ذرائع

تقریباً تمام ہی مقالہ نگار حضرات کے نزدیک ضعیف احادیث کے ضعف کے تلافی کے مندرجہ ذیل ذرائع ہیں:

۱۔ تعدد طرق۔ ۲۔ تلقی بالقول۔ ۳۔ تلقی بالعمل۔ ۴۔ متابع یا شاہد کا پایا جانا۔

۵۔ کسی دلیل شرعی سے موافقت۔ ۶۔ ظاہر قرآن سے مطابقت۔ ۷۔ صحابی رسول کا فتویٰ (ظفر الامانی/ ۲۱۲، میزان الحدیث/ ۶۴، الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۲۳۱، تدریب الراوی، ۱/ ۶۸، قواعد فی علوم الحدیث/ ۲۴، فتح المغیث/ ۶۸، فتح القدیر/ ۳۸۹، شرح نخبۃ الفکر)۔

(مقالہ مولانا ارشاد احمد قاسمی، مولانا عبدالرشید احمد قاسمی، مولانا اسعد فلاحی، مولانا محبوب علی، مولانا ابوسفیان مفتاحی وغیرہ)۔

مولانا خالد صدیقی نے صحابی رسول کے فتویٰ پر عمل سے ضعف حدیث کی تقویت کی دلیل یہ دی ہے کہ بسااوقات صحابہ اپنی رائے یا فتویٰ کی شکل میں بھی احادیث رسول بیان کرتے تھے (ازالۃ الخفاء نقلاً عن قواعد فی علوم الفقہ، ۲/ ۲)۔

مولانا خالد صدیقی کے بقول کسی امام، فقیہ یا مجتہد کا استدلال بھی حدیث کے ضعف کی تلافی کرسکتا ہے۔ (قواعد فی علوم الفقہ، ۲/ ۲۰)۔

ان کے نزدیک عرف سے بھی حدیث کے ضعف کے تلافی ہوسکتی ہے، جیسے حضرت جابر سے مروی روایت: "الدينار اربعة وعشرون قيراطا" (تدریب، ۱/ ۶۷)۔

مولانا انیس احمد مدنی کے مطابق اگر راوی صدوق مگر سئی الحفظ ہو تو ظاہر یہ کہ علاوہ تمام فقہاء نزدیک یہ ضعف تعدد طرق سے دور ہوجائے گا اور یہ حدیث حسن لغیرہ کا درجہ حاصل کر کے قابل استناد ہوجائے گا۔

مولانا محمد امین کے نزدیک حدیث کے ضعف کی تلافی ان امور سے ہوتی ہے:

۱۔ اتصال سند۔ ۲۔ عدالت۔ ۳۔ تام الضبط۔ ۴۔ صدق الحدیث۔

مولانا انیس احمد مدنی، مولانا خالد صدیقی نے تعدد طرق سے ضعف کی تلافی کی دلیل میں یہ روایت پیش کی ہے:

"ان امرأة من فزارة تزوجت على نعلين، فقال رسول الله ﷺ ارضيت من نفسك ومالك نعلين، قالت: نعم، فاجاز" (ابن ماجۃ کتاب النکاح، ۱/ ۶۰۸، ترمذی ۳/ باب مہور النساء)۔

اس روایت کے ایک راوی عاصم سئی الحفظ تھے مگر اس کے معنی کی تائید دوسرے بند سے ہوتی ہے، اس لیے امام ترمذی نے اسے حسن لغیرہ قرار دیا اور امام شافعی اور احمد نے مہر کی کم سے کم مقدار کی عدم تعیین کی صورت میں اسے اپنا مستند بنایا ہے (سبل السلام، ۳/ ۳۱۹، المہذب ۲/ ۵۵، المغنی ۶/ ۶۸۰)۔

مولانا عبدالرحیم قاسمی اور مولانا انیس احمد مدنی کے بقول حدیث ضعیف کے انجبار اور عدم انجبار کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر اس کے قبول ورد دونوں کا احتمال ہو تو اسی صورت میں احتمال سے ضعف دور ہوگا اور اگر رد کا پہلو غالب ہو تو ضعف دور نہیں ہوگا (حاشیہ قواعد علوم الحدیث/ ۷۹، النکت لابن حجر، ۱/ ۲۰۶)۔

مولانا خالد صدیقی کے بقول فقہاء احناف نے متفقہ طور پر تعدد طرق کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔

۴۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک تعدد طرق کی صورت میں دوسری سندوں کا پہلی سند سے اعلیٰ یا کم از کم مساوی ہونا ضروری ہے، اگر دوسری سندیں پہلی کمزور سندوں سے زیادہ کمزور ہوگی تو اس تعدد سے پہلی سند کے ضعف کی تلافی نہیں ہوگی۔

مولانا خالد صدیقی کے نزدیک اور مولانا ابوالحسن علی کے بقول حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے نزدیک متابعت کی صورت میں وحدت

صحابی کی شرط ہے (شرح نخبۃ الفکر/ ۱۱۰، اعلاء السنن، ۱/ ۳۱)۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک متعدد اسناد والی روایتوں میں نہ صحابہ کا ایک ہونا ضروری ہے نہ روایت کا متعدد صحابہ سے مروی ہونا ضروری ہے اور نہ لفظی موافقت ضروری ہے، بلکہ مضمون اور معنی کی موافقت کافی ہے۔

مقالہ نگار حضرات کے بقول یہی جمہور کی رائے ہے (شرح نخبۃ الفکر/ ۱۹۴، تدریب الراوی، ۱/ ۲۴۲، عمدۃ القاری، ۱/ ۸، النکت، ۲/ ۶۸، ظفر الامانی/ ۲۳۳، قواعد فی العلوم الحدیث/ ۲۴، فتح المغیث/ ۷۱، الفیۃ السیوطی مع شرح محمد شاکر/ ۱۶)، (مقالہ مولانا اسعد فلاحی، مولانا خالد صدیقی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا مصطفیٰ قاسمی، مولانا شیر علی وغیرہ)۔

مولانا ابوالحسن علی کے بقول بعض نے متابعت کو لفظی موافقت اور شاہد کو معنوی موافقت کے ساتھ مشروط کر دیا ہے، چاہے دونوں کی روایت ایک ہی صحابی سے ہو یا متعدد صحابہ سے (نزہۃ النظر/ ۴۲، ۴۳)۔

۴۔ اس کی وضاحت شق (۱) میں گذر چکی ہے، البتہ اس ضمن میں مولانا انیس احمد مدنی، مولانا عبدالکریم قاسمی اور مولانا عبدالرشید قاسمی نے نصب الرایہ ۱/ ۳۶۰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کبھی کبھی تعدد طرق سے حدیث ضعیف، ضعیف تر ہو جاتی ہے، مثلاً حدیث "طیر"، حدیث "حاجم ومحجوم" اور حدیث "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" (آثار الحدیث، ۱/ ۱۴۷)، لہٰذا محض تعدد طرق ضعف کے ازالہ کے لیے کافی نہیں۔

۵۔ احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

۱۔ اس سلسلہ کی بعض تفصیلات سوال نمبر (۱) کی شق (۲) میں گذر چکی ہیں، اس سلسلہ میں ائمہ فقہ وحدیث کے حوالہ سے بیشتر مقالہ نگار حضرات نے اجمالی طور پر رائے ظاہر کی ہے کہ ایسی احادیث کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا، مولانا حبیب اللہ قاسمی نے لکھا ہے کہ علامہ ابن القیم کے مطابق مذاہب اربعہ میں سے ہر ایک میں احادیث ضعیفہ سے استدلال کیا گیا ہے (اعلام الموقعین، ۱/ ۳۔ ۳۲)۔

اس کی مثال میں بیشتر مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ ذیل روایات پیش کی ہیں:

۱۔ وضوء بالقہقہۃ فی الصلاۃ کی روایت۔

۲۔ وضوء بنبیذ التمر کی روایت۔

۳۔ أکثر الحیض عشرۃ ایام۔

۴۔ لا مہر اقل من عشرۃ دراہم۔

۵۔ حدیث ترسل فی الاذان۔

۶۔ حدیث کراہیۃ استعمال الماء المشمس۔

اور مسلک شافعیہ کے مطابق حدیث "من قاء او رعف فلیتوضا ولیس غلی صلاتہ ما لم یتکلم"۔

مسلک مالکیہ وشافعیہ کے مطابق حدیث "ان النبی ﷺ مسح علی اعلی الخف واسفلہ" (ترمذی، ۱/ ۹۸)۔

اور حنابلہ اور شوافع کے مطابق حدیث: "لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئا من القرآن"

(تحفۃ الاحوذی، ۱/ ۱۲۴، اعلام الموقعین، ۱/ ۷۷، مناقب الامام ابی حنیفۃ للذہبی/ ۲۱، الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ/ ۱۲۶۔ ۱۳۰، قواعد فی علوم الحدیث/ ۵۸)، (مقالہ مولانا خالد صدیقی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ارشاد احمد اعظمی وغیرہ)۔

مولانا شیر علی کے بقول امام احمد کی رائے یہ ہے کہ ایسی حدیث کو مورد نص میں منحصر رکھ کر عمل کیا جائے، مولانا محمد امین صاحب کے بقول اصولیین کے نزدیک ایسی حدیث کا اعتبار نہیں، البتہ مجتہدین کے نزدیک "الضرورات تبیح المحظورات" کی صورت میں ایسی احادیث کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

جناب شمس پیرزادہ کے بقول حدیث کے معاملہ میں روایت کے ساتھ درایت بھی ملحوظ رکھی جائے گی، لہٰذا اگر کوئی حدیث سنداً صحیح ہو اور قرآن و

سنت کی معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا، ان کا کہنا ہے کہ ایک طرف احناف یہ احتیاط کرتے ہیں کہ اس خبر واحد کو قبول نہیں کرتے جس کی اسناد صحیح ہو مگر اس کا تعلق عموم بلویٰ سے ہو اور دوسری طرف ان میں ضعیف حدیثوں کے قبول کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے (اصول الفقہ/ ۲۹۲)۔

۲۔ بعض ائمہ مثلاً امام ابوحنیفہ اور امام احمد سے جو ضعیف احادیث پر عمل کی گنجائش نقل کی جاتی ہے، اس سے مراد ان کے نزدیک حدیث حسن لغیرہ ہے۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے، مقالہ نگار حضرات کا خیال ہے کہ علامہ ابن تیمیہ، ابن العربی اور ابن القیم نے بھی یہی توجیہ نقل کی ہے (منہاج السنہ ۲/ ۱۹۱، فتاویٰ شیخ اسلام ۱/ ۲۵۱، اعلام الموقعین ۱/ ۶۱، مقالہ مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا عبدالواحد قاسمی اور جناب شمس پیرزادہ وغیرہ)۔

مقالہ نگار حضرات کا خیال ہے کہ متقدمین کے نزدیک حدیث کی صرف دو ہی قسمیں تھیں:

۱۔ صحیح، ۲۔ ضعیف۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے مطابق متقدمین جن کو ضعیف کہتے تھے متاخرین اسی کو حسن کہتے ہیں۔

مولانا ارشاد احمد اعظمی اور مولانا عبدالرشید قاسمی کے بقول حسن کی اصطلاح امام ترمذی کے عہد سے شروع ہوئی ہے۔

لیکن مولانا ابوالحسن علی کے بقول علامہ کشمیری نے اور مولانا خورشید احمد اعظمی کے بقول شیخ عوامہ نے ان کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ متقدمین کے درمیان بھی حسن کی اصطلاح پائی جاتی تھی، جیسے امام مالک، ابوالولید الطیالسی، ابوالحسن العجلی، امام بخاری اور علی بن المدینی کے نزدیک۔

مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا ابوالحسن علی اور مولانا خورشید اعظمی کے بقول بعض نے ائمہ سے احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش سے اصطلاحی ضعیف حدیث ہی مراد لی ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا ابوالحسن علی کے بقول شیخ عوامہ کے نزدیک اس سے مراد ضعیف متوسط اور قریب الحسن روایت ہے۔ ان دونوں حضرات نے شیخ عوامہ کے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے (اعلاء السنن ۱/ ۵۹، قواعد فی علوم الحدیث/ ۶۶)۔

مولانا شیر علی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا مصطفیٰ قاسمی اور مولانا اسعد فلاحی نے اس کی وضاحت کی ہے کہ امام احمد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر تفصیل کے حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم کرنے کے قائل ہیں، یا زیادہ سے زیادہ ضعف شدید یا تعارض سے خالی ہونے کی شرط لگاتے ہیں اور احناف مزید کچھ اس طرح کی قیود لگاتے ہیں جن کے بعد حدیث محض ضعیف نہ رہ جاتی ہے بلکہ حسن لغیرہ کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

کتب فقہ میں ضعیف احادیث سے استدلال کرنے کی توجیہ کرتے ہوئے مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا ابوالحسن علی اور مولانا انیس احمد مدنی لکھتے ہیں کہ جرح وتعدیل کے اسباب کے اختلاف کی وجہ سے بعض ائمہ کے نزدیک بعض رواۃ ثقات ہوتے ہیں اور وہی روات دوسرے ائمہ کے نزدیک ضعیف ہوتے ہیں، اس لیے ایک ہی حدیث ایک جماعت کے نزدیک قابل استدلال اور صحیح ہوتی ہے اور دوسری جماعت کے نزدیک ضعیف اور ناقابل استدلال ہوتی ہے۔

مولانا انیس احمد مدنی مزید لکھتے ہیں کہ بعض احادیث ائمہ مجتہدین تک صحیح سندوں سے پہنچیں، لیکن بعد میں اسی سلسلہ میں کوئی ضعیف راوی آ گیا جس کی وجہ سے وہ حدیث جو عہد ائمہ میں صحیح تھی، عہد تدوین میں ضعیف ہو گئی، اس طرح بعض ائمہ نے حدیث کو صحیح نہ مان کر اپنے قیاس اور اجتہاد سے فتویٰ دیا اتفاقاً وہ حدیث ضعیف کے مطابق ہو گیا اور متاخرین نے فریق مخالف کو خاموش کرنے کے لیے اس ضعیف حدیث کا ذکر کیا۔

۳۔ اس قسم کی ضعیف احادیث کے احکام میں اعتبار اور شرائط کی تفصیل سوال نمبر (۱) کی شق (۳) میں گزر چکی ہے، اور اس کی مثالیں اسی سوال کی شق (۱) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

۶۔ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف سے استدلال واعتبار

۱۔ تقریباً تمام ہی مقالہ نگار حضرات نے فضائل کے باب میں ضعیف احادیث پر اعتماد کے سلسلہ میں تین قسم کی آراء ذکر کی ہیں:

۱۔ مطلقاً ضعیف احادیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ ترغیب وترہیب اور فضائل کے باب میں مطلقاً ضعیف سے استدلال درست ہے۔

۳۔ فضائل اعمال کے باب میں چند شرائط کے ساتھ ضعیف احادیث سے استدلال درست ہے (شرائط کی تفصیل گذر چکی ہے)۔ پہلی رائے یحیی بن معین، امام مسلم، امام بخاری، ابوبکر ابن العربی، ابوشامہ المقدسی، ابن حزم الظاہری، الشہاب الخفاجی، جلال الدین الدوانی اور امام شوکانی کی ہے (لمحات فی اصول الحدیث/۱۹۶۔۱۹۷، الفصل فی الملل والاہواء والنحل ۲/ ۸۳، مقالات الکوثری/ ۴۵، (مقالہ مولانا انیس احمد مدنی، مولانا ابوالحسن علی وغیرہ)۔

دوسری رائے امام احمد کی طرف منسوب ہے اور امام ابوداؤد کا بھی مسلک ہے (القول البدیع/ ۱۹۵)، (مقالہ مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا انیس احمد مدنی وغیرہ)

عام طور پر مقالہ نگار حضرات نے تیسری رائے کو اختیار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ چند شرائط کے ساتھ ضعیف حدیث پر فضائل کے باب میں عمل دراصل ایک طرح کی فضیلت کا حصول ہے، لہٰذا اگر وہ حدیث فی نفسہ صحیح ہے تو اس پر عمل ہو گیا اور اگر وہ ضعیف ہے تو اس پر کسی شرعی حکم کی بنیاد نہیں رکھی گئی ہے لہٰذا ممانعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے (مقالہ مولانا ابوالحسن علی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔

لیکن مولانا انیس احمد مدنی، مولانا ارشاد احمد اعظمی، مولانا خالد صدیقی، جناب شمس پیرزادہ اور مولانا محمد امین صاحب نے پہلی رائے کو اختیار کیا ہے، ان حضرات کی ایک مشترک دلیل یہ ہے کہ احادیث صحیحہ احکام اور فضائل دونوں کے تعلق سے ہمارے پاس اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کی موجودگی میں ہمیں ضعاف کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

مولانا انیس احمد مدنی اور مولانا ارشاد احمد اعظمی کے نزدیک فضائل اور ترغیب وترہیب کا تعلق احکام شرعیہ سے ہے، لہٰذا اس باب میں معتبر احادیث ہی سے استدلال درست ہوگا، ان حضرات کے بقول خود حافظ ابن حجر نے بھی اس فرق کو تسلیم نہیں کیا ہے (نخبۃ الفکر/ ۴۳)۔

مولانا انیس احمد مدنی اور جناب شمس پیرزادہ کی ایک دلیل یہ ہے کہ حدیث ضعیف کی نسبت آپ ﷺ کی طرف چونکہ مشکوک ہے، اس لیے ایسی حدیث پر عمل کرنے اور اس کو بیان کرنے کی صورت میں آدمی اس وعید کا نشانہ بن سکتا ہے جو حدیث "من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار" (صحیح مسلم، ۱/ ۶۷) میں مذکور ہوئی ہے، حدیث ضعیف کے اس شعبہ کی وجہ سے اسے ضعیف کہا جاتا ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا اور اسے بیان کرنا کیسے درست ہوگا جبکہ دینی امور میں یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا محمد ارشاد احمد اعظمی اور مولانا انیس احمد مدنی کا خیال ہے کہ اگر فضائل کے باب میں ضعیف احادیث پر عمل جائز ہو تو جرح وتعدیل کے قوانین بے معنی ہیں۔

مولانا محمد امین صاحب اور مولانا رئیس احمد مدنی کے بقول امت میں فتنے اور گمراہ کن عقائد کا ظہور ضعیف احادیث کو رواج دینے ہی سے ہوا ہے، مولانا ارشاد احمد اعظمی اور مولانا انیس احمد مدنی کے بقول ضعیف احادیث پر عمل اور اسے بیان کرنے کی گنجائش نکالنے ہی کی وجہ سے لوگوں نے یہ موقف بھی اپنایا کہ اگر موضوع حدیث بھی شریعت کے کسی اصل عام کے تحت آتی ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

مولانا ارشاد احمد اعظمی کہتے ہیں کہ کم از کم سد ذریعہ کے طور پر ہی سہی ایسی روایات کے ذکر اور اس پر عمل سے احتراز کیا جانا چاہئے۔ مولانا محمد امین صاحب کے بقول ضعیف احادیث کو صوفیاء نے باقاعدہ رواج دیا ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام انہوں نے تقی الدین سبکی شافعی کا لیا ہے، عبداللہ بن سبا نے موضوع احادیث کو رواج دینا شروع کیا، ان کے بقول چوتھی صدی تک یہی حالت رہی پھر اس کے بعد ابوسفیان توحیدی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا، مولانا موصوف نے ضعیف اور موضع احادیث کے رواج پانے اور اس کے عام ہونے کی پوری تاریخ پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ اس کی تفصیلات گذر چکی ہیں، دیکھئے: سوال (۱) کی شق (۲)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

سوال نمبر ایک کا عرض مسئلہ

مولانا انیس احمد مدنی[1]

حدیث ضعیف کی تعریف:

حدیث ضعیف کی متداولو معروف تعریفوں کے استقصائی مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس کی جملہ تعریفوں کو درج ذیل دو تعریفوں میں سمویا جاسکتا ہے۔

۱۔ "الضعیف ما لم یوجد فیه شروط الصحة ولا شروط الحسن"

(حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں صحیح اور حسن کی شرطیں نہ پائی جائیں)۔

اس تعریف کو درج ذیل مقالہ نگاروں نے اپنے مقالوں میں درج کیا ہے۔

مولانا عبدالرشید صاحب قاسمی، مولانا محمد بن مولوی عبدالرزاق پالنپوری صاحب، مولانا شمس پیرزادہ صاحب، مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب، مولانا شیر علی صاحب، مولانا محمد خالد صدیقی صاحب، مفتی محبوب علی وجیہی صاحب، مولانا محمد ابوالحسن علی صاحب، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی صاحب، مولانا محمد ارشاد القاسمی صاحب، مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب۔

اس قسم کی تعریفوں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس میں "شروط الصحة" کے الفاظ زائد ہیں، کیونکہ جس حدیث میں حدیث حسن ہی کی شرطیں نہ پائی جاتی ہوں، اس میں صحت کی شرطیں کیوں کر پائی جاسکتی ہیں اور تعریف کی صحت کے لیے یہ بنیادی شرط ہے وہ کہ وہ حشو وزائد سے خالی ہو۔

۲۔ حدیث ضعیف ہر وہ حدیث ہے جس میں حدیث حسن کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جاتی ہو۔

اس قسم کی تعریفوں میں عبارتوں کا جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کا سبب یا تو ایجاز واختصار کا اسلوب اختیار کرنا ہے یا تفصیل وتوضیح کا۔

اس تعریف کو درج ذیل مقالہ نگاروں نے اپنے مقالہ میں درج کیا ہے:

مولانا مبارک حسین ندوی صاحب، مولانا خورشد اعظمی صاحب، مولانا عبدالواحد قاسمی صاحب، مولانا عبدالرحیم قاسمی صاحب، راقم الحروف (انیس احمد مدنی)۔

حدیث ضعیف کا اجمالی حکم:

اجمالاً پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف احادیث سے احکام ومسائل میں استدلال درست نہیں ہے، اور نہ ہی ان سے عقائد کا اثبات جائز ہے۔ فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب کے باب میں اس سے استدلال مختلف فیہ ہے۔

ضعیف احادیث کے اسباب:

تمام مقالہ نگار حضرات کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ضعف حدیث کے بنیادی اسباب مجملاً صرف دو ہیں:

۱۔ سند سے ایک یا ایک سے زائد راویوں کا سقوط۔ ۲۔ راوی میں باعث جرح امر کی موجودگی۔

---

[1] جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ یوپی۔

راوی کی عدالت پر کلام کیا گیا ہو تو اس کی عدالت ختم ہو جاتی ہے اور یہ کلام راوی کے حفظ واتقان کے پہلو سے ہوتا ہے یا دیانت وامانت کے پہلو سے۔

حفظ واتقان کے اعتبار سے درج ذیل چیزیں اسباب جرح میں داخل ہیں، کھلی ہوئی غلطی، سوء حفظ، کثرت غفلت، کثرا وہام، معتبر راویوں کی مخالفت اور دیانت وامانت کے پہلو سے جھوٹ، تہمت، کذب، فسق، جہالت اور بدعت، اسباب جرح ہیں۔

مذکورہ بالا تمام ہی امور محدثین اور فقہا کے نزدیک بالاتفاق ضعف کا باعث ہیں، سوائے مستور الحال کے کہ اس کی روایت فقہاء احناف کے یہاں مقبول ہوتی ہے۔

ضعف حدیث کا دوسرا سبب سند سے کسی راوی کا سقوط ہے خواہ یہ سقوط جلی ہو یا خفی ہو ہر صورت میں وہ ضعف حدیث کا سبب بنے گا، کیونکہ محذوف راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ دونوں ہونے کا احتمال ہے۔ ظاہر ہے اس احتمال کے ساتھ حدیث مقبول کیوں کر ہو سکتی ہے۔

یہ دوسرا سبب محدثین وفقہاء کے نزدیک مختلف فیہ ہے، محدثین کے نزدیک تو سقط کی تمام ہی صورتوں میں حدیث غیر مقبول ہوگی، سوائے مراسیل صحابہ کے، جبکہ فقہاء کے نزدیک مرسل حدیث حجت ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا اسباب طعن کے علاوہ اگر حدیث خبر واحد ہو تو بعض اصولیین وفقہاء اس کے معتبر ہونے کے لیے حدیث کی قبولیت کی چھ شرطوں کے علاوہ مزید ان شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں:

۱۔ خبر واحد کا تعلق اگر ان مسائل سے ہو جو عموم بلوی سے تعلق رکھتے ہیں تو غیر مقبول ہوگی، جیسے مس ذکر کے ناقض وضو ہونے کے سلسلہ میں وارد خبر ابن مسعود، نیند سے بیدار ہونے کے وقت دونوں ہاتھوں کے دھونے کا حکم، یہ رائے امام کرخی اور بعض حنفیہ کی ہے۔

۲۔ راوی حدیث کا عمل اگر حدیث کے مخالف ہو تو وہ حدیث غیر مقبول ہوگی، یہ رائے بھی بعض احناف کی ہے۔

۳۔ عمل اہل مدینہ، امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل کو اخبار آحاد پر ترجیح دیتے ہیں۔

۴۔ اخبار آحاد سے حدود کا اثبات نہیں ہو سکتا ہے، یہ رائے امام کرخی اور ابو عبداللہ بصری کی ہے۔

۵۔ خبر واحد اگر قیاس کے خلاف ہو تو عیسیٰ بن ابان کے نزدیک وہ غیر مقبول ہوگی، بشرطیکہ راوی غیر ضابط، روایت کے مضامین سے بے خبر اور متساہل ہو اور اگر راوی ضابط، عالم ہو اور متاہل ہو نہ تو ایسی صورت میں قیاس وخبر کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے میں اجتہاد سے کام لیا جائے۔

۶۔ امام جبائی سے حدیث کے مقبول ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہوں۔ یہی رائے امام حاکم ابو عبداللہ کی بھی ہے۔

واضح رہے کہ فقہاء ومحدثین کے درمیان مختلف فیہ مذکورہ بالا امور کی جانب صرف درج ذیل مقالہ نگاروں نے توجہ دلائی ہے:

۱۔ مولانا محمد خالد صدیقی صاحب ۲۔ جناب خورشید احمد اعظمی

۳۔ مولانا ابو الحسن علی صاحب ۴۔ مولانا محمد اسعد بن عبد الرزاق صاحب

۵۔ مولانا شیر علی صاحب ۶۔ انیس احمد مدنی۔

ایک امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اکثر مقالہ نگاروں نے مذکورہ بالا اختلافی نکات میں سے صرف بعض کی جانب اشارہ کیا ہے۔

عرض مسئلہ:

حدیث "موضوع"

مولانا محمد ابوالحسن علی غفرلہ[1]

سوالنامہ بابت احادیث ضعیفہ سے متعلق سوال (۲) میں تین سوالات کئے گئے ہیں اول حدیث موضوع کی تعریف، دوم حدیث موضوع کا حکم اور سوم یہ کہ کیا کسی حدیث کی سند میں واقع حدیث کی شمولیت سے اس پر موضوع ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں ۱۹ حضرات علماء کرام کے مقالات موصول ہوئے ہیں، ہم اس وقت موصول ہونے والے مقالات کا خلاصہ پیش کررہے ہیں:

سوال (۱) موضوع حدیث کی تعریف

لغوی تعریف: گھڑا ہوا ہونا۔"وضع" ضاد کے فتح کے ساتھ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کی قدر یا وقار میں کمی کیا۔

"قال ابن العراف الموضوع لغة اسم مفعول من وضع الشيء يضعه بالفتح وضعا حطه واسقطه" (الوضع والوضاعون/۹)۔

اصطلاحی تعریف: "الحديث المختلق المصنوع والمنسوب افتراء إلى رسول الله ﷺ" (ظفر الامانی/ ۴۱۲،۲ ابن الصلاح/ ۳۸)۔

موضوع حدیث کی اصطلاحی تعریف یہ بھی ہے:

"هو المختلق المصنوع شر الضعيف۔ ونقل السيوطي عن ابن الجوزي قال اذا رايت الحديث يباين المعقول او يخالف المنقول او يناقض الاصول فاعلم انه موضوع" (تدریب/۲۷۷)۔

تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے اصطلاحی تعریف یکساں نقل کیا ہے قدرے الفاظ کا البتہ فرق ہے، البتہ مولانا عبدالرحیم قاسمی صاحب نے علامہ ابوالفرج کی اصطلاح میں موضوع کی تعریف کا فرق بیان کیا ہے، علامہ ابوالفرج کے اصطلاح میں موضوع وہ حدیث ہے جس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہو اگرچہ محدث نے عمداً جھوٹ نہ بولا ہو بلکہ اس میں غلطی کیا ہو، اسی لیے کتاب الموضوعات میں انہوں نے بہت سی ایسی احادیث کو بھی موضوع کہا ہے جن سے دیگر علماء کرام کا اختلاف ہے۔

۲۔ حدیث موضوع کا حکم

علماء کا اتفاق ہے کہ حدیث موضوع کو وضع کا ذکر کیے بغیر نقل کرنا جائز نہیں ہے اور اس سے احکام وقصص نیز ترغیب وترہیب میں عمل کرنا حرام ہے، نیز کسی حال میں بھی موضوع حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

بعض صوفیاء کرام اور فرقہ کرامیہ کی طرف سے ترہیب کے حق میں وضع حدیث کا جواز نقل کیا گیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ بعض روایات

---

[1] خادم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا عیدگاہ روڈ شہر بھروچ گجرات۔

میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت اس مضمون کے حق میں ہے جو مخالفت اور نقصان پر مبنی ہو، اور موافقت و مصلحت پر مبنی کے حق میں وضع کی ممانعت نہیں ہے، مگر جمہور علماء کرام ومحدثین عظام اس کے مخالف ہیں۔

اکثر مقالہ نگار حضرات نے اسی کو ترجیح دیا ہے کہ حدیث موضوع کو احکام وقصص اور ترغیب وترہیب وغیرہ امور میں نقل کرنا اور اس پر عمل کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے اور ذکر وضع کے ساتھ بیان کرنا بھی اہل علم کے لیے ہے نہ کہ عوام کے لیے، عوام کو اس کے نقل کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔

البتہ مقالہ نگار حضرات میں سے حضرت مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں کہ موضوع روایات میں جب تک اس کے تمام راوی قاطبۃً اور بالاتفاق موضوع نہ کہہ دیں اس پر موضوع کا حکم لگانا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ ان راویوں میں اگر ایک راوی بھی کوئی ایسی روایت نقل کردیں جس سے اس راوی کی روایت میں احتمال ناشی عن الدلیل کسی بھی درجے میں حدیث ہونے کا ہو جائے تو اس کو غیر حدیث کہنا جائز نہ ہوگا۔

مولانا قدرت اللہ باقوی صاحب موضوع کو مردود اور غیر قابل عمل قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ فضائل اور ترغیب وترہیب کے باب میں اگر ضعف شدید نہ ہو اور شرعی قاعدہ کے تحت آجائے اور پورے وثوق کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منسوب ہو تو اس پر عمل کی اجازت ہے۔

مولانا عبدالرشید قاسمی صاحب نے کرامیہ کے استدلال کا اس طرح جواب دیا ہے کہ مسند بزار اور سنن دارمی میں "من كذب علي متعمدًا ليضل به الناس" سے ترغیب وترہیب کے لیے کذب بیانی کو جائز قرار دینا غلط ہے، کیونکہ لیضل بہ الناس باطل ہے اور کسی صحیح روایت میں یہ زیادتی نہیں ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اگر یہ زیادتی صحیح مان لی جائے تو وہ بطور تاکید ہے جیسا کہ اللہ کے قول "فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا ليضل به الناس بغير علم" میں موجود ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں: "ليضل به الناس" میں لام تعلیلیہ نہیں ہے بلکہ یہ لام عاقبت ہے یعنی کذب بیانی جس کا انجام گمراہی ہے۔

۳- واضع حدیث اور کذب فی الحدیث راوی کا کسی سند میں شامل ہونا کیا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی ہے؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات کے آراء مختلف ہیں، کچھ حضرات مطلقاً کسی سند میں راوی کذاب کا آجانا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی قرار دیتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی شرط نہیں لگاتے ہیں جیسے مولانا مصطفیٰ صاحب۔

مولانا اسعد پالنپوری صاحب فرماتے ہیں کہ مستند احادیث کا ذخیرہ ہوتے ہوئے اس میں تساہل برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اکثر حضرات نے تفصیل اور شرائط کے ساتھ ہی وضع کا حکم لگایا ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اگر اس میں کوئی راوی مجہول واضع بھی ہو لیکن اس کا اندمال دوسری محفوظ ومستند روایت سے ہو جاتا ہو تو اس کو قبول کرلیں گے، لیکن اعتقادیات میں شدید احتیاط برتیں گے، اور دیگر جزئیات فقہیہ فرعیہ میں تساہل برتیں گے۔ باقی ہر حال میں پوری احتیاط وتفتیش سے کام لیں گے اور جب تک تمام راویوں کو خوب جانچ پرکھ نہ لیں اس کو دلیل بنانے میں احتیاط کریں گے۔

مولانا انیس مدنی صاحب فرماتے ہیں کہ مطلقاً موضوع نہیں قرار دی جائے گی بلکہ اس کے تمام طرق کا تتبع واستقصاء کرنا ضروری ہوگا جیسا کہ ضعیف حدیث کا حکم ہے الا یہ کہ اس کا متن ہی محسوسات ومعقولات یا صریح قرآن کے خلاف ہو، کیونکہ راوی کبھی محض طلب شہرت کے لیے مختلف صحیح متون میں دوسرے سلسلہ سند کو ملا دیتا ہے اور اس میں اس امر کا احتمال ہوتا ہے کہ کوئی حدیث متعدد طرق سے مروی ہو جس کے اکثر سلسلہ اسناد تو درست ہوں لیکن کسی ایک میں کوئی کذاب راوی آگیا ہو۔

مولانا ارشاد صاحب مدنی فرماتے ہیں اگر کوئی بہتر سند ہو تو کسی سند میں ان کی موجودگی حدیث کو موضوع بنا دے گی۔

مولانا امین رضوی صاحب کا ارشاد ہے کہ کسی سند میں کذاب راوی کی شمولیت وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ کسی دوسرے معتبر سند میں یہ روایت موجود نہ ہو۔

مولانا قدرت اللہ باقوی فرماتے ہیں کسی ایک کذاب راوی کی وجہ سے پوری حدیث کو مشتبہ قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اگر روایت عقل سلیم کے منافی نہ ہو اور اہل عرب کے ادبیات کی روشنی میں ٹیک ہو تو اس پر بدظنی کرنا شدت متصور ہوگا۔

مولانا مبارک ندوی صاحب فرماتے ہیں قرائن سے وضع کا حکم لگے گا۔

مولانا ارشاد القاسمی صاحب فرماتے ہیں: راوی کذاب کے سند میں آنے سے روایت کے موضوع ہونے کی چند شرطیں ہیں: اول اس حدیث کو اس راوی کے علاوہ کسی نے روایت نہ کیا ہو، دوم اس کا نہ کوئی متابع ہو نہ شاید "لا يعرف الخبر إلا من جهته ولا يتابعه عليه احد وليس له شاهد" (قواعد علوم الحدیث/ ۴۳)۔

مولانا عبدالرشید صاحب قاسمی فرماتے ہیں کہ واضع حدیث کا کسی بھی سند میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کی ہر روایت ان ائمہ کے نزدیک مردود ہے، امام ابومحمد جوینی، علامہ ابن صلاح، امام احمد بن حنبل، عبداللہ ابن مبارک، امام حمیدی، ابوبکر صیرفی، امام ذھبی، علامہ عینی، ان ائمہ کرام نے ظاہرا کچھ قیود لگائے ہیں مگر سب کا حاصل ایک ہے مثلاً امام ابومحمد جوینی کے نزدیک قبل التوبہ وبعد التوبہ کسی بھی صورت میں کذاب فی الحدیث کی روایت قبول نہیں ہوگی۔ ابن صلاح کے نزدیک عمد کی قید ہے لہٰذا خطاء وسہو کی صورت میں روایت قبول ہوگی، امام احمد کے نزدک توبہ ایک امر پوشیدہ ہے، لہٰذا ایک مرتبہ بھی کذب بیانی کرنے سے روایت قبول نہ ہوگی، حضرت امام ابوحنیفہ اور امام شافعی روایت حدیث کو شہادت کے اقسام میں سے مانتے ہیں۔

امام نووی ان تمام آراء کو کمزور مانتے ہیں اور قواعد شرعیہ کے خلاف بھی تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ مختار قول یہ ہے کہ کذاب فی الحدیث اگر توبہ کرنے کے وقت توبہ کے شرائط ثلاثہ کی رعایت کرلیں تو پھر اس کا توبہ قبول ہونا چاہئے، اس لیے کہ "التائب من الذنب كمن لا ذنب له" حدیث میں وارد ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب کہتے ہیں کہ اس تفصیل کے ساتھ وضع کا حکم لگایا جائے گا (۱) موضوع ہونا واضع کے اقرار سے ثابت ہو (۲) کسی قرینہ سے معلوم ہو جو راوی کے حال سے اخذ کیا جائے جیسے راوی کا جھوٹ میں بعض روساے ہواء نفس کی اتباع (۳) کسی کذاب راوی کا درمیان سند میں آجانا اور ایسا کذاب کہ یہ حدیث صرف اسی سے معروف ہو اسی کا نہ کوئی موافق ہو نہ شاہد (۴) راوی کی روایت مرویہ سے موضوع ہونا اخذ کیا جائے، جیسے اس کی حدیث کے الفاظ یا معانی کا رکیک ہونا (۵) اس حدیث کا قرآن کریم یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا صریح عقل کے خلاف ہونا، کوئی حدیث ضعیف الاسناد ہو اور واضع نے اس کے لیے کوئی صحیح سند جوڑ دیا ہو تا کہ اس کو رواج دے (۹) نئی چیز لانے کے لیے وضع کیا ہو (۱۰) واضع نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے وضع کیا ہو (۱۱) احتساب کے لیے وضع کیا ہو (۱۲) محض تعصب میں وضع کیا ہو (۱۳) بعض امراء کے خواہش نفس کی اتباع کے لیے وضع کیا ہو۔ (۱۴) وضع کرنا وہم یا غلطی سے ہو، (انہاء السکن، ص ۱۵/ ۹۔)

مولانا شیر علی صاحب فرماتے ہیں: راوی کا واضع ہونا وضع کے حکم کے لیے کافی ہے، جس کا کذاب ہونا اس کے اقرار یا علماء کی جستجو سے ثابت ہو وہ موضوع ہے، البتہ مابقی روایتوں سے جن میں کذب ثابت ہوا ہو وہ ظن غالب کے بناء پر موضوع کہلائیں گی قطعی طور پر نہیں (بحوالہ النکت/ ۱۱۸)۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب فرماتے ہیں: احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو موضوع قرار دیا جائے، لیکن وضع کا حکم لگانا ظن غالب کے اعتبار سے ہوگا قطعی ویقینی نہیں (بحوالہ میزان الحدیث ۷۵)۔

عارض کی رائے

۱۔ حدیث موضوع کی لغوی واصطلاحی تعریف میں تمام مقالہ نگار حضرات کے ساتھ بندہ کا مکمل اتفاق ہے اور یہی احقر کے مقالہ میں تحریر ہے۔

۲۔ جس حدیث کے وضع کا علم ہو اس کو وضع کی تصریح کے بغیر روایت کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ ایسے کسی مضمون کا نقل کرنا بھی بلا تصریح وبیان جائز نہیں ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مسئلہ سے ہو۔

کرامیہ اور بعض صوفیاء جو ترغیب وترہیب کے مضامین کا وضع کرنا جائز قرار دیتے ہیں وہ غلط ہے، یہ حضرات جس روایت سے استدلال کرتے ہیں وہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، نیز وہ نص قرآنیہ وسنت متواترہ کے خلاف ہے، لہٰذا اس سے استدلال مردود ہے، مندرجہ ذیل کتابوں میں اس کی تصریح دیکھی جاسکتی ہے۔ (مقدمہ مشکوۃ شریف ۵، ظفر الامانی ۴۳۴، لمعات فی اصول الحدیث ۳۱۶، تدریب الراوی، ۱/ ۲۸۳۔)

۳۔ کسی حدیث کے سند میں واضع یا کذاب فی الحدیث کے شمولیت سے اس حدیث کو موضوع قرار دینے کے بعد مقالہ نگار حضرات نے جن تفصیل وشرائط کا اعتبار کیا ہے حدیث کو موضوع قرار دینے کے لیے بندہ بھی ان شرائط کے اعتبار کو ضرور خیال کرتا ہے، مطلقاً کسی کذاب راوی کے سند میں آجانے کی وجہ سے حدیث کو موضوع شمار نہیں کیا جائے گا، نیز وضع کا حکم بھی ظن غالب کے اعتبار سے لگایا جائے گا قطعی ویقینی حکم نہیں لگایا جائے گا الا یہ کہ تمام قرائن وشواہد اس کے موضوع ہونے پر دلالت کریں تو پھر اس کو قطعی طور پر موضوع کہہ سکتے ہیں، اس میں کسی طرح کا تساہل اور نرمی برتنا جائز نہیں ہوگا۔

''ھذا ما عندی والعلم عند اللہ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔''

موضوع احادیث پر لکھنے والے مقالہ نگار کے اسماء گرامی

جناب مفتی نظام الدین، جناب مولانا ابوسفیان صاحب، جناب مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب، جناب محمد ابوالحسن صاحب، جناب مولانا خورشید اعظمی صاحب، جناب شمس پیرزادہ صاحب، جناب مولانا انیس احمد مدنی صاحب، جناب مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی صاحب، جناب مولانا ارشاد احمد اعظمی صاحب، جناب مولانا مبارک حسین ندوی، جناب مولانا ارشاد القاسمی صاحب، جناب مولانا عبدالرشید قاسمی، جناب مولانا خالد صدیقی صاحب، جناب مولانا عبدالواحد قاسمی، جناب مولانا امین رضوی صاحب، جناب مولانا عبدالرحیم قاسمی صاحب، جناب ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، جناب مولانا شیر علی صاحب، جناب مولانا محمد اسعد ابن مولوی عبدالرزاق صاحب۔

☆☆☆

عـرض مسئلہ:

عرض بابت محور سوم محور چہارم

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی[1]

حدیث ضعیف سے متعلق سوالنامہ کے محور سوم اور محور چہارم کی بابت عرض احقر کے سپرد کیا گیا ہے محور سوم کا حاصل یہ ہے کہ جو حدیث بظاہر ضعیف ہے اور لائق احتجاج نہیں ہے، لیکن تلقی بالقبول۔ یعنی علماء امت کی روایت وعمل کی رو سے اس کو مقبولیت حاصل ہو تو کیا اس کی وجہ سے اس کے مرتبہ وحکم میں کوئی فرق آتا ہے؟

اور محور چہارم کا حاصل یہ ہے کہ جو حدیث بظاہر ضعیف ہے اور لائق احتجاج نہیں ہے تو کیا کچھ امور ایسے ہو سکتے ہیں کہ جب وہ ایسی حدیث کے ساتھ پائے جائیں تو اس کے مرتبہ وحکم میں فرق ہو جائے اور اس پر عمل واعتماد کرنا درست ہو۔

دونوں محوروں کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف کا احکام میں حجت نہ ہونا معروف ہے۔ لیکن کیا کچھ ایسی صورتیں وقرائن بھی ہیں کہ جن کے پیش نظر اسی حدیث کی حیثیت بدل جاتی ہے اور اس کا ضعف قوت سے بدل جاتا ہے اور وہ عدم احتجاج کے مرحلہ سے حجیت اور سند کے مرتبے میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس بابت جہاں تک مقالہ نگار حضرات کی آراء کا معاملہ ہے تو احقر کے سامنے ۲۱ اہل علم حضرات کے مقالے ہیں، ان میں سے دو حضرات نے خصوصیت سے تلقی اور علماء کی طرف سے مقبولیت والی صورت سے اختلاف کیا ہے، ایک مولانا امین صاحب (بنگلہ دیش) اور دوسرے مولانا شمس پیرزادہ صاحب (بمبئی)، شمس صاحب نے اپنے موقف کی کچھ زیادہ وضاحت کی ہے۔

ان کا موقف یہ ہے کہ جب حدیث اصلاً اپنی سند اور راویوں کے حالات کی بنیاد پر ضعیف قرار دی جا چکی تو اب کوئی چیز اس کے ضعف کو قوت سے نہیں بدل سکتی، شمس صاحب فرماتے ہیں: تلقی بالقبول متاخرین کی اصطلاح ہے اور یہ اصول حدیث میں اضافہ ہے نیز یہ کہ ایسی حدیث پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے، حالانکہ وہ حدیث آپ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ شمس صاحب نے اپنے موقف کی اہمیت اور صحت کے تذکرہ کے ساتھ مرسل کے ضعف کی بابت امام مسلم کی صراحت کا تذکرہ کیا ہے اور اسی کو بنیاد بنایا ہے۔

بقیہ حضرات نے ایسی حدیث کی قوت واعتماد کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے اکثر ملک کے ممتاز تعلیمی اداروں میں فن حدیث کی تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مثلاً مفتی محبوب علی وجیہی (رامپوری)، مولانا شیر علی (ترکیسر)، مفتی عبدالرحیم (بھوپال)، مفتی ارشاد احمد بھاگلپوری (گرینی جونپور)، مفتی حبیب اللہ قاسمی (مہذب پور اعظم گڈھ)، مولانا ابوالحسن علی (دار العلوم ماٹلی والا)، ابوسفیان مفتاحی (مفتاح العلوم مئو)۔

ان حضرات نے اپنے استدلال میں فن کی اہم کتابوں اور اہم شخصیات کی صراحتیں نقل کی ہیں جن میں متقدمین ومتاخرین سب شامل ہیں، ان صراحتوں اور دیگر مراجع کو دیکھنے کے بعد شمس صاحب کی یہ بات کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتی کہ یہ متاخرین کی اصطلاح اور ان کا اضافہ ہے۔

جن ائمہ فن کی تصریحات نقل کی گئی ہیں ان میں امام مالک، امام شافعی، عبد اللہ بن مبارک، امام ترمذی، ابوبکر جصاص رازی، ابوالحسن الحصار، بیہقی، ابواسحاق اسفرائینی، ابن عبدالبر، ابن الجوزی، ابن تیمیہ، ابن القیم، ابن ہمام اور حافظ ابن حجر وسخاوی علیہم الرحمہ ہیں اور یہ سارے حضرات پہلے ہزارے کے ہیں اور ابتدائی چند حضرات متقدمین ہی میں سے نہیں بلکہ ممتاز ائمہ فقہ وحدیث کے سرخیل بھی ہیں۔

---

[1] جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ۔

بہتر ہوگا کہ چند حضرات کے ارشادات وعبارات کو اسی موقع پر پیش کر دیا جائے:

امام مالک فرماتے ہیں: "شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده" (سنن الدارقطنی، ۲/۴۴۱)

امام شافعی فرماتے ہیں: (حدیث: "لا وصية لوارث" کی بابت)

"لا يثبته اهل العلم بالحديث ولكن العامة تلقته بالقبول وعملوابه حتى جعلوه ناسخا" (النكت على ابن الصلاح/۴۹۴، ۴۹۵)۔

امام ترمذی کا معاملہ تو اس بابت بہت معروف ہے، نہ جانے کتنے ابواب میں وہ حدیث کے ضعف وسقم کو بیان کرنے وثابت کرنے کے بعد بھی فرماتے ہیں: "وعليه العمل عند اهل العلم" مثلاً دیکھئے: "باب ماجاء فی الصلوة على الدابة فی الطين والمطر"۔ "وباب ماجاء فی من استقاء عمداً، وباب ماجاء فی الرجل يقتل ابنه"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بار بار اپنے فتاویٰ میں اس کو ذکر کیا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"الخبر اذا تلقته الامة بالقبول تصديقا له وعملا بموجبه افاد العلم عند جماهير العلماء من السلف والخلف وهو الذى ذكره جمهور المصنفين فى اصول الفقه" (النکت ص ۳۷۴)۔

ان کے مایہ ناز شاگرد علامہ ابن القیم فرماتے ہیں: (اجتہاد سے متعلق حضرت معاذ کی مشہور حدیث کی بابت)۔

"وان كانت هذه الاحاديث لم تثبت من جهة الاسناد ... لكن لما نقلها الكافة عن الكافة غنوا بصحتها عندهم عن طلب الاسناد لها" (اعلام الموقعين،۱/ ۲۰۲)۔

اور اس سلسلہ کو فخر المحدثین اور خاتم المحققین حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کی عبارت پر ختم کرتا ہوں۔

"ومن جملة صفات القبول ... أن يتفق العلماء على العمل بمدلول الحديث فإنه يقبل حتى يجب العمل به وقد صرح بذلك ائمة الاصول" (النکت/۳۷۴)۔

بہرحال حدیث ضعیف کی اس مقبولیت کی بڑی اہمیت ہے، اور ظاہر ہے کہ علماء کی طرف سے تلقی وقبول کی قید لگی ہے اور مراد صاحب نظر علماء ہیں، انہیں کے درمیان حدیث کی روایت وقبولیت معیار ہے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے صراحت کی ہے (النکت/ ۳۷۴) اور دوسرے حضرات کے اقوال سے اس کی تائید ہوتی ہے، ایک صورت حدیث کی نقل اور ذکر وروایت کا بغیر نکیر عام ہونا ہے، اور دوسری صورت حدیث کے موافق عمل اور فتویٰ کا پایا جانا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا اقوال سے بھی ظاہر ہے۔ اور حافظ ابن حجر وغیرہ کی نقل وصراحت کے مطابق دونوں صورتوں کے حکم میں یہ فرق ہے کہ پہلی صورت میں صرف ظن غالب کے درجہ میں اس کے ثبوت کو اور اس پر عمل کے وجوب کو مانا جائے گا جب کہ دوسری صورت میں قطعیت ولزوم مانا گیا ہے۔ (النکت/ ۲۷۲)۔

اگرچہ عمل کا حکم دونوں صورتوں میں ہے اور ایسی حدیث کبھی صحیح وحسن اخبار آحاد کے درجہ میں ہوتی ہے اور کبھی تلقی وقبولیت کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے تواتر کے درجہ ومرتبہ کو پہنچ کر دوسری متواتر وقطعی دلیل کے لیے ناسخ بھی قرار دی جاتی ہے، علامہ سخاوی فرماتے ہیں:

"اذا تلقت الامة الضعيف بالقبول يعمل به على الصحيح، حتى انه ينزل منزلة المتواتر فى انه ينسخ المقطوع به، ولهذا قال الامام الشافعى فى حديث "لا وصية لوارث" انه لا يثبته اهل الحديث ولكن العامة تلقته بالقبول وعملوا به حتى جعلوه ناسخا لآية الوصية" (فتح المغيث/ ۲۸۵)۔

حدیث ضعیف کے ساتھ تلقی وقبولیت کے علاوہ دوسرے بعض قرائن کے پائے جانے کی صورت میں بھی حضرات فی الجملہ اس پر متفق ہیں کہ حدیث کو قوت اور عمل کی قبولیت حاصل ہو جاتی ہے، اور یہ حکم ان کے نزدیک انہیں تفصیلات کے ساتھ ہے جن کو ائمہ فن نے ذکر کیا ہے جن کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ:

۱- علم مصطلح الحدیث کے ماہرین کی صراحت کے مطابق ضعیف کا مفہوم بڑا وسیع ہے، جو بقول حافظ ابن حجر مقبول کا بالمقابل ہے، (ملاحظہ ہو: نخبۃ

ونزھہ) اس لیے اصولی طور پر اس کے تحت حدیث صحیح ۔لعینہ ہو یا لغیرہ ان کو اور حدیث حسن لذاتہ کو چھوڑ کر جملہ تمام اقسام آجاتی ہیں، خواہ ان کے رد اور عدم ثبوت کا فیصلہ ہو چکا ہو یا توقف کیا گیا ہو، یا کچھ گنجائش ذکر کی گئی ہو اور خواہ ضعف کا سبب سند میں کوئی خلل ہو یا متن میں، یا راوی کی عدالت وضبط میں کوئی کمی ہو۔

۲۔ اسی لیے دیگر امور وقرائن کی وجہ سے قوت واعتماد کا حکم ایسی تمام احادیث کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس میں سے کچھ متعین محدود انواع وصورتوں کے لیے ہے، جن کا حاصل یہ ہے کہ ضعف بہت شدید نہ ہو بالخصوص یہ کہ ضعف کا باعث حفظ وضبط اور سند میں کمی وخلل ہو۔

۳۔ ایسے امور جن سے تقویت ہوتی ہے وہ بھی محدود ومتعین ہیں، علماء کی طرف سے تلقی وقبولیت بھی ایک قرینہ ہے، جس کا تذکرہ گذر چکا ہے اور اس کی خصوصیت نوعیت وحیثیت کی وجہ سے اس کو عموماً علیحدہ وممتاز کر کے ذکر کیا جاتا ہے۔

۴۔ دیگر قرائن میں کسی آیت کی موافقت، قواعد شریعت کی موافقت اور صحابہ کے فتاویٰ کی تائید وغیرہ کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ امام شافعی (الرسالۃ/ ۴۶۲۔ ۴۶۴)، ابوالحسن بن الحصار (التدریب، ۱/ ۶۸) اور ابن القطان مغربی (فتح المغیث / ۶۸۔ ۶۹) وغیرہ سے منقول ہے اور حافظ ابن حجر کے الفاظ بھی بتاتے ہیں:" وان قامت قرينة ترجح جانب قبول ما يتوقف فيه فهو الحسن ايضا لكن لا لذاته" (نزھۃ النظر/ ۲۹)۔

۵۔ اور ان قرائن میں سب سے اہم اور معروف قرینہ تعدد طرق ہے، یعنی روات کا صرف ایک طریق وسند سے مروی ومنقول نہ ہونا۔ بلکہ مزید طرق اور سند وروات کا پایا جانا۔ اس میں سیوطی وغیرہ کی صراحت کے مطابق (التدریب، ۱/ ۱۶۰) مزید ایک طریق کا پایا جانا کافی ہے، ضروری نہیں کہ تین وچار طرق ہوں، چنانچہ شوافع کے یہاں مرسل سے مرسل کی تائید کا قول معروف ہے اور اس میں صحابی کے مختلف ہونے کی (البعث الاسلامی عدد ۸ جلد ۳۹) اور لفظی موافقت کی بھی شرط نہیں ہے (منہج النقد/ ۲۶۹) البتہ اگر تائید میں مزید صرف ایک طریق ہو تو ضروری ہے کہ وہ مرتبہ بھی پہلے سے کمتر وکمزور نہ ہو بلکہ اس سے فائق یا اس کے مساوی ہو۔ اور اگر تائید میں کئی طرق ملتے ہوں تو ان کا کمتر وکمزور ہونا بھی کفایت کرے گا (فتح المغیث ۶۴ /۷ / وقواعد فی علوم الحدیث/ ۲۴۔ ۲۵)۔

۶۔ جن احادیث کے حق میں ان امور کی افادیت کو قبول کیا گیا ہے وہ ضعف سے حسن لغیرہ کے درجہ میں پہنچ جاتی ہیں، اور یہ مسئلہ تقریباً اتفاقی ہے کہ احکام میں جیسے صحیح کے ساتھ حسن سے استدلال کیا جاتا ہے اسی طرح حسن لذاتہ کے ساتھ حسن لغیرہ سے بھی حجت پکڑی جاتی ہے، اسی لیے حافظ ابن حجر وغیرہ نے حدیث مقبول کی چار اقسام ذکر کی ہیں، احقر اپنے عرض کو بعض ائمہ ومحققین کی ان تصریحات پر ختم کرتا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث سے احتجاج واستدلال میں سند پر نظر کے ساتھ اور اس کی اہمیت کے باوجود بعض دوسرے امور کو بھی اہمیت ونافعیت ہی نہیں بلکہ فیصلہ کی صلاحیت حاصل ہے:

ابن ہمام: "ان ضعف الاسناد غير قاطع ببطلان المتن بل هو ظاهر فيه. فاذا تايد بما يدل على صحته من القرائن كان صحيحا" (فتح القدیر/ ۸۷)۔

ابن حجر: لايلزم من كون رجال الاسناد من رجال الصحيح ان يكون الحديث الوارد به صحيحا لاحتمال ان يكون فيه شذوذ او علة" (النکت/ ۲۷۴)۔

الجزائری: إن في كثير من الأحاديث الضعيفة ما هو صحيح المعنى فصيح المبنى" (توجیہ النظر/ ۴۵)۔

ابن تیمیہ: "الأصل في النقل ان يرجع فيه إلى ائمة النقل وعلمائه. وان يستدل على الصحة والضعف بدليل منفصل عن الرواية فلابد من هذا وهذا. والا فبمجرد قول القائل "رواه فلان" لا يحتج به. لا اهل السنة ولا الشيعة وليس في المسلمين من يحتج بكل حديث رواه كل مصنف. فكل حديث نطالبه في اول مقام بصحته" (منہاج السنۃ، ۴/ ۱۲)۔

الامام الدہلوی: لا ينبغي لمحدث ان يتعمق بالقواعد التي احكمها اصحابه وليست مما نص عليه الشارع فيرد به حديثا او قياسا صحيحا كرد مافيه ادنى شائبة الارسال والانقطاع" (حجۃ اللہ البالغۃ، ۱/ ۱۵۶)۔

عرض مسئلہ:

احکام وفضائل میں احادیث ضعیفہ کا اعتبار اور اس کی شرطیں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی[1]

ضعیف احادیث سے متعلق سوال نمبر ۵ اور سوال نمبر ۶ بنیادی اہمیت کے سوال ہیں، گویا اس سوالنامہ کا حاصل اور موضوع سے متعلق تمام مباحث کا خلاصہ ہیں؛ کیونکہ اصل مقصود یہی جاننا ہے کہ ضعیف احادیث فی الجملہ معتبر ہیں یا نہیں؟ اور معتبر ہیں تو کن ابواب میں، اعتقادات میں، احکام میں یا فضائل میں یا بالکل ہی نا قابل اعتبار ہیں؟ اس سوالنامہ کا جواب کل انیس علماء وارباب افتاء نے دیا ہے، ان میں بعض حضرات کے جوابات محض اصولی اشارات ہیں اور بعض حضرات نے دونوں نقاط نظر کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کسی رائے کو ترجیح نہیں دی ہے لیکن اکثر حضرات نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ اگر حدیث کا ضعف شدید نہ ہو، کسی اصل شرعی کے موافق ہو، وجوب کا حکم نہ ہو، بلکہ استحباب وکراہت کا ہو اور صفات باری سے بھی متعلق نہ ہو، تو ایسے مواقع پر احادیث ضعیفہ معتبر ہیں۔ اس رائے کے قائل ہیں: مولانا ابوالحسن صاحب، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شیر علی صاحب، مولانا محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان صاحب، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا عبدالرشید صاحب، مولانا محمد امین (بنگلہ دیشی) اور مولانا محمد خالد صدیقی (نیپالی)، مولانا امین صاحب نے لکھا ہے کہ ایسی احادیث اصولیین کے نزدیک معتبر نہیں ہیں، لیکن محدثین کے نزدیک "الضرورات تبیح المحظورات" کی حالت میں جائز ہیں، مولانا حبیب اللہ صاحب کی رائے ہے کہ تمام احادیث ضعیفہ احکام میں معتبر نہیں، لیکن موصوف نے کوئی ضابطہ بندی نہیں کی ہے، کس طرح کا ضعف قابل تحمل ہے اور کس درجہ کا ضعف قابل تحمل نہیں؟ افسوس کہ مقالہ نگاروں میں سے اکثر حضرات نے ان شرطوں کی وضاحت کی طرف توجہ نہیں کی ہے کہ جن کی موجودگی میں احادیث ضعیفہ پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احکام میں حدیث ضعیف مطلقاً غیر معتبر ہیں۔ جناب شمس پیرزادہ، مولانا انیس احمد مدنی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا محمد مبارک حسین ندوی، مولانا محمد مصطفیٰ اور مولانا عبدالواحد قاسمی اس نقطۂ نظر کے حاملین ہیں۔ مولانا انیس احمد مدنی نے اس نقطۂ نظر پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ محدثین کے یہاں یہ ایک متفق علیہ قاعدہ کے طور پر مشہور ہے: "ان الاحکام لاتثبت الا من طریق صحیح" (الاعتصام للشاطبی: ۲۴)، اسی طرح حضرات ائمہ سے یہ مقولہ منقول ہے کہ اگر کوئی حدیث بہ طریق صحیح ثابت ہو، تو وہی میرا مذہب ہے، "لو صح الحدیث فھو مذھبی"۔ اگر غیر مدخول بہا کے شوہر کا انتقال ہوجائے تو اسے کیا مہر ملے گا؟ اس سلسلہ میں حضرت معقل بن سنان اشجعی سے بروع بنت واشق کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے پورے مہر کا فیصلہ فرمایا، امام شافعیؒ نے اس روایت کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اگر یہ حدیث ثابت ہوتی تو میں اسی کا قائل ہوتا، "لو ثبت حدیث بروع لقلت بہ" (سبل السلام ۳/۳۱۷)، مولانا انیس احمد صاحب کا خیال ہے کہ حضرات ائمہ کی طرف ضعیف روایتوں کے معتبر ہونے کا جو قول منسوب ہے، اگر ان کے راویوں کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ائمہ کی طرف اس قول کی نسبت کسی مستند ذریعہ سے ثابت نہیں، دوسرے سلف کے جن اقوال سے حدیث ضعیف کا معتبر ہونا ثابت کیا جاتا ہے، وہ مبہم ومجمل ہے اور ان کا مقصد محض یہ ہے کہ فضائل میں کم درجہ صحت کی حامل روایت بھی معتبر ہے، نہ یہ کہ ضعیف روایتیں معتبر ہیں۔ مولانا محمد ارشاد صاحب نے اس سلسلہ میں مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی عبارت نقل کی ہے کہ احکام خمسہ میں سے کسی میں بھی حدیث ضعیف معتبر نہیں، "الحدیث الضعیف لایثبت بہ شئی من الاحکام الخمسۃ" (ظفر الامانی/ ۲۳۳)، مولانا مبارک حسین ندوی

---

[1] جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

نے بھی یہی بات (منہاج السنہ ۲/ ۱۹۱) کے حوالہ سے لکھی ہے، جناب شمس پیرزادہ صاحب نے علامہ شوکانی کی عبارت نقل کی ہے:

"الضعیف الذی یبلغ ضعفه الی حد لا یحصل معه الظن، لایثبت به الحکم ولا یجوز الاحتجاج به فی اثبات شرع عام" (ارشاد الفحول:۴۳)

پیرزادہ صاحب کا خیال ہے کہ جب حنفیہ ایسے مسائل میں جن میں عموم بلویٰ پایا جاتا ہو خبر واحد کا بھی اعتبار نہیں کرتے، تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ ضعیف احادیث کو بھی قبول کرلیں۔

جو حضرات فی الجملہ احکام میں بھی احادیث ضعیفہ کے معتبر ہونے کے قائل ہیں، انہوں نے بھی عام طور پر سلف صالحین کے اقوال نقل کیے ہیں، مولانا ابوالحسن علی صاحب، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا عبدالرشید قاسمی نے نسبتاً زیادہ وضاحت سے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر علامہ ابن حزم، حافظ ابن قیم، علامہ سیوطی، امام نووی اور محقق ابن ہمام کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اور امام ترمذی کے نقطۂ نظر سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

فضائل میں احادیث ضعیفہ کے معتبر ہونے اور نہ ہونے کے سلسلہ میں بھی مقالہ نگاروں کی دو رائیں سامنے آئی ہیں: جناب شمس پیرزادہ صاحب اور مولانا انیس احمد مدنی کے نزدیک فضائل میں بھی ضعیف حدیثیں معتبر نہیں۔ جناب پیرزادہ صاحب کا خیال ہے کہ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ان روایات کی نسبت مشکوک ہے، اس لیے اس کو آپ ﷺ کا قول یا عمل سمجھ کر کیسے عمل کیا جاسکتا ہے؟ آپ نے ابن تیمیہ کے حوالہ سے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ سے جو فضائل میں ضعیف روایتوں کے معتبر ہونے کی بات منقول ہے، اس سے مراد حدیث "حسن" یعنی صحیح سے کمتر درجہ کی روایات مراد ہیں مولانا انیس احمد مدنی کا استدلال ہے کہ احکام ہوں یا فضائل، تمام ہی شرعی احکام قدر و منزلت میں برابر ہیں اور ترغیب وترہیب بھی من جملہ احکام شرعیہ کے ہے، جیسا کہ ابن حجر لکھتے ہیں: "ان الترغیب والترهیب من جملة الاحکام الشرعیة" (نخبۃ الفکر ۴۳)، دوسرے: "من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار" کی روایت ہر طرح کی روایت کو شامل ہے، تیسرے: جرح وتعدیل کا مقصد احادیث نبویہ کی تحقیق وتمیز ہی ہے، اگر ضعیف حدیثوں کا کسی بھی درجہ میں اعتبار ہو تو جرح وتعدیل ایک بے معنی بات ہوگی۔

اکثر مقالہ نگاروں کے نزدیک فضائل میں احادیث ضعیفہ بھی معتبر ہیں، مولانا ابوالحسن صاحب، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابوسفیان، مولانا شیر علی، مولانا محبوب علی وجیہی، مولانا ارشاد قاسمی، مفتی عبدالرحیم اور مولانا عبدالواحد قاسمی نے فضائل میں ضعیف روایات کو معتبر مانا ہے، باقی مقالہ نگاروں کی رائے واضح نہیں، بلکہ دونوں طرح کی رائے کے نقل کرنا پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ان حضرات نے عام طور پر علامہ عراقیؒ کی "التقیید" امام نوویؒ کی "الاذکار" علامہ سیوطی کی "تدریب الراوی" علامہ سخاوی کی "القول البدیع" مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کی "الاجوبۃ الفاضلۃ" اور "ظفر الامانی" شیخ جمال الدین قاسمیؒ کی "قواعد التحدیث" اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی "قواعد فی علوم الحدیث" کے حوالہ سے اپنا مدعیٰ نقل کیا ہے۔

جن حضرات نے احکام میں بھی حدیث ضعیف کا اعتبار کیا ہے انہوں نے اس کے لیے کچھ شرطیں بھی بیان کی ہیں، مولانا ابوالحسن، مولانا ارشاد، مولانا امین اور مولانا مبارک صاحبان کے نزدیک حدیث ضعیف اس وقت احکام میں معتبر ہے جب کہ وہ متعدد طرق سے منقول ہو، لیکن یہ بات غالباً سوال کے دائرہ سے باہر ہے، اس لیے کہ تعدد طرق کے بعد تو روایت "حسن لغیرہ" ہوجائے گی اور اس کے معتبر ہونے میں کلام نہیں، بعض مقالہ نگاروں نے "تلقی بالقبول" اور دوسرے قرائن سے مؤید ہونے کی شرط لگائی ہے، تلقی بالقبول اور مؤید بالقرائن احادیث کے سلسلہ میں بحث آپ کے سامنے آچکی، ان سوالات میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے، مولانا ابوالحسن، مولانا خورشید، مولانا محمد اسعد، مولانا مبارک، مولانا حبیب اللہ اور مولانا ابوسفیان وغیرہ کے نزدیک ضروری ہے کہ حدیث میں ضعف شدید نہ پایا جائے، مولانا ارشاد اور مولانا خورشید نے یہ شرط لگائی ہے کہ راوی کے فسق یا کذب کی وجہ سے ضعف نہ ہو، گویا یہ دوسرے لفظوں میں ضعف شدید نہ پائے جانے ہی کی دوسری تعبیر ہے، مولانا خورشید اور مولانا محمد اسعد نے یہ بھی شرط لگائی ہے کہ وہ روایت کسی اور حدیث کے اور مولانا حبیب اللہ صاحب کے خیال میں وہ ادلہ صحیحہ کے معارض نہ ہو، مولانا خورشید کا خیال ہے کہ اس پر عمل بہ تقاضائے احتیاط ہو، اور مولانا حبیب اللہ کی رائے ہے کہ وہ شرعی قاعدہ کے تحت آتی ہو، مولانا ابوسفیان نے یہ شرطیں بھی ذکر کی ہیں کہ

اس کے کسی راوی کے متروک ہونے پر اجماع نہ ہو، باب میں اس سے اقویٰ کوئی روایت نہ ہو، اس کے خلاف اجماع نہ ہو اور کسی صحابی کا قول اس کے خلاف نہ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ وغیرہ سے جو یہ بات منقول ہے کہ احادیث ضعیفہ بھی قیاس سے مقدم ہے، ان میں احادیث ضعیفہ سے حسن لغیرہ مراد ہے یا متاخرین کی اصطلاح کے مطابق ضعیف روایتیں؟ اس سلسلہ میں مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا حبیب اللہ قاسمی کی رائے ہے کہ اس سے حدیث ضعیف ہی مراد ہے، مولانا خورشید صاحب نے اس سلسلہ میں شیخ عوامہ کی اس تحقیق کا حوالہ دیا ہے جسے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے "القواعد فی علوم الحدیث" میں نقل کیا ہے، اکثر مقالہ نگار مولانا ارشاد قاسمی، مولانا ابوسفیان اعظمی، مولانا محبوب علی وجیہی، مولانا مبارک حسین، مفتی محمد عبدالرحیم، مولانا انیس احمد مدنی، مولانا مصطفیٰ، جناب شمس پیرزادہ، مولانا محمد امین اور مولانا عبدالواحد کا خیال ہے کہ اس سے حسن لغیرہ مراد ہے، عام طور پر ان حضرات نے "اعلام الموقعین" علامہ ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ اور بعد کے ناقلین یعنی مولانا عبدالحی صاحب کی "الاجوبۃ الفاضلۃ" اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی قواعد فی علوم الحدیث نے حوالہ سے یہ بات کہی ہے، مولانا شیر علی صاحب کا خیال ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے متن لغیرہ مراد ہے اور امام احمد کے نزدیک ضعیف بشرطیکہ ضعف شدید نہ ہو، باقی مقالہ نگاروں نے یا تو صرف دونوں نقاط نظر کے نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے اور کسی رائے کو ترجیح نہیں دی ہے، یا اس مسئلہ پر روشنی ہی نہیں ڈالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ضعیف کو فضائل میں قبل کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ جن اعمال کی فضیلت صحیح حدیثوں سے ثابت ہو، ان کے بارے میں ضعیف حدیث کو ترغیب وترہیب کے طور پر قبول کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ ضعیف حدیث سے کسی عمل کے مستحب یا احتیاط کے موقع پر مکروہ ہونے کو ثابت کیا جائے، چوں کہ مستحب اور مکروہ ہونا بھی احکام تکلیفیہ میں داخل ہے، اس لیے فضائل میں حدیث ضعیف کو قبول کرنے کی یہ صورت احکام میں حدیث ضعیف کے معتبر ہونے سے متعلق ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ترغیب وترہیب کے باب میں جمہور محدثین کے نزدیک حدیث ضعیف بعض شرطوں کے ساتھ مقبول ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی فن میں اس فن کے ماہرین اور مدونین کی رائے ہی اصل ہے؛ اس لیے ہم اس سلسلہ میں پہلے محدثین کے اقوال نقل کریں گے۔ محدثین کے اقوال کا تتبع کیا جائے، تو متقدمین کے یہاں کلام میں اجمال ہے اور متاخرین کا بیان اس سلسلہ میں واضح اور بے غبار ہے۔ متقدمین میں امام ابوزکریا عنبری سے منقول ہے:

"الخبر اذا ورد لم یحرم حلالا، ولم یحل حراما، ولم یوجب حکما، وکان فی ترغیب او ترهیب اغمض عنه وتسهل فی روایته" (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۲)۔

بیہقی نے مہدی کے جو الفاظ نقل کیے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

"اذا روینا عن النبی صلی الله علیه وسلم فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فی الأسانید وتسامحنا فی الرجال" (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۲)۔

میمونیؒ نے امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے:

"الاحادیث الرقائق یحتمل ان یتساهل فیها حتی یجیئ شئی فیه حکم" (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۲)۔

عباس دوریؒ کی روایت امام احمد سے اس مسئلہ میں زیادہ واضح ہے کہ:

"ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها، واذا جاء الحلال والحرام أردنا قوما هکذا. وقبض اصابع یدیه الاربع" (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۲)۔

ترغیب وترہیب کی روایت میں اغماض وتساہل اور راویوں کے بارے میں تسامح سے کام لینے کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات ضعیف

حدیث کو بھی فضائل کے باب میں قبول کیا کرتے تھے، ورنہ ضعیف سے اونچی سطح کی حدیث تو معتبر ہے ہی، اس میں تساہل اور تسامح کا کیا معنی؟ محمد ابن اسحاق کے بارے میں جو امام احمدؒ نے فرمایا کہ محمد بن اسحاق کی روایت مغازی میں قبول کی جائے، وہ تو اس بارے میں قریب قریب واضح ہے، کیونکہ خود امام احمدؒ کا قول محمد بن اسحاقؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ حجت نہیں ہیں، ابن اسحاق لیس بحجة (دیکھئے: تہذیب التھذیب ۷ / ۳۹، المغنی فی الضعفاء للذھبی ۲ / ۲۶۲)، اس کے باوجود مغازی میں ابن اسحاق کی روایت کو قبول کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ امام احمدؒ ان ابواب میں ضعیف روایات کو بھی قابل قبول تصور کرتے تھے؛ اسی لیے متاخرین نے یہ وضاحت وصراحت ضعیف روایتوں کے قبول کرنے کا ذکر کیا ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے علامہ علی الحلبیؒ، محمد بن سید الناس، ملاعلی قاریؒ اور علامہ سیوطیؒ وغیرہ کے اقوال نقل کیے ہیں (الاجوبة الفاضلة ۳۹ / ۳۶)، علامہ عراقی نے شرح الفیة الحدیث میں لکھا ہے:

''اما غیر الموضوع فجوزوا التساهل فی اسناده وروایته من غیر بیان ضعفه اذا کان فی غیر الاحکام والعقائد، بل فی الترغیب والترهیب من المواعظ والقصص وفضائل الاعمال ونحوها'' (الکامل فی ضعفاء الرجال / ۱۲)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ویجوز عند اهل الحدیث وغیرهم التساهل فی الاسانید وروایة ماسوی الموضوع من الضعیف والعمل به من غیر بیان ضعفه فی غیر صفات الله تعالی والاحکام کالحلال والحرام ومما لا تعلق بالعقائد والاحکام'' (تدریب الراوی، ۱/ ۲۵۲)۔

یہاں تک کہ امام نوویؒ اور حافظ ابن حجر مکیؒ سے منقول ہے کہ فضائل اعمال میں حدیث پر عمل کرنے کی بابت علماء کا اتفاق ہے:

''قد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال'' (الاجوبة الفاضلة:۴۱ بحواله الاربعین للنووی وشرحه الفتح المبین لابن حجر المکی)۔

اس لیے کہ حدیث ضعیف کے معتبر ہونے کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں: ایک قول مطلقاً معتبر ہونے کا دوسرا قول جمہور کا، جس میں فضائل اور احکام کے باب میں فرق کیا گیا ہے، گویا یہ دونوں اقوال فضائل میں احادیث ضعیفہ کے معتبر ہونے پر متفق ہیں، تیسرا قول حدیث ضعیف کے مطلقاً غیر معتبر ہونے کا ہے، سیوطیؒ وغیرہ نے اس کا قائل قاضی ابوبکر ابن عربی کو نقل کیا ہے اور ابن سید الناس نے یحییٰ بن معین کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے (قواعد التحدیث: ۱۱۶ / للشیخ جمال الدین قاسمی)، علامہ ابن حزمؒ سے بھی یہی نقطۂ نظر نقل کیا گیا ہے۔ گویا دو تین اہل علم کو چھوڑ کر باقی محدثین کے نزدیک فضائل یعنی ترغیب وترہیب میں بھی ضعیف روایتیں معتبر ہیں۔

جن حضرات کے نزدیک ترغیب وترہیب میں بھی ضعیف روایتیں معتبر نہیں، ان کی اصل دلیل یہی ہے کہ چاہے احکام سے متعلق احادیث ہوں یا ترغیب وترہیب سے متعلق، ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جاتی ہے، اس حیثیت سے بھی حدیثیں مساوی ہیں اور ان کی تحقیق واعتبار کا یکساں معیار ہونا چاہئے۔ گو بادی النظر میں یہ بات بہت قوی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ کوئی قوی دلیل نہیں، اس لیے کہ خود قرآن وحدیث میں کسی واقعہ پر مرتب ہونے والے حکم اور اثر کے اعتبار سے تحقیق وتثبت کے طریقہ میں تفاوت روا رکھا گیا ہے، مثلاً جرم خواہ زنا کا ہو یا دوسری حدود ہوں، یا دیگر مالی یا غیر مالی معاملات، ہر ایک کا انحصار خبر کے درست اور خبر دہندہ کے صادق القول ہونے پر ہے، لیکن زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے، دوسری حدود کے لیے دو مرد کی گواہی ضروری ہے اور مالی معاملات میں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی بھی کافی ہے، پس اسی طرح حدیث میں بھی اصل مقصد تو یہ ہے کہ نقل روایت کی صحت اور راوی کی صداقت کو پرکھا جائے، لیکن اس حدیث پر جو حکم مرتب ہوگا اس کی نسبت سے بعض ابواب میں احتیاط وتشدد اور بعض میں نسبتاً تساہل کو روا رکھنا درست ہوگا۔

حدیث ضعیف کے قبول کرنے کے لیے کیا شرطیں ہیں؟ علامہ سخاویؒ نے اس سلسلہ میں حافظ ابن حجرؒ سے تین شرطیں نقل کی ہیں، جن میں سے پہلی شرط متفق علیہ ہے اور دوسری اور تیسری شرطیں شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام اور ابن دقیق العید سے منقول ہیں اور وہ اس طرح ہیں:

''الاول متفق علیه أن یکون الضعف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتهمین بالکذب ومن

فحش غلطه، الثاني ان يكون مندرجا تحت اصل عام فيخرج ما يخترع بحيث لا يكون له اصل اصلا، الثالث ان لا يعتقد عند العمل به ثبوته، لئلا ينسب الى النبي صلى الله عليه وسلم ما لم يقله" (القول البديع: ۲۵۵)۔

یہ شرط کہ اس حدیث کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے، سے یہ مسئلہ بھی متعلق ہے کہ حدیث ضعیف کو نقل کرتے ہوئے اس کے ضعف کا اظہار بھی ضروری ہے یا نہیں؟ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ ضعف کا اظہار ضروری نہیں، چنانچہ علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

يجوز عند اهل الحديث وغيرهم التساهل في الاسانيد ورواية ماسوى الموضوع من انواع الاحاديث الضعيفة من غير اهتمام بيان ضعفها فيما سوى صفات الله تعالى وذلك كالمواعظ والقصص وفضائل الاعمال سائر فنون الترغيب والترهيب وسائر مالا تعلق له بالاحكام والعقائد (مقدمه ابن صلاح/۴۰)۔

اسی طرح علامہ عراقی فرماتے ہیں: "وسهلوا في غير موضوع رووا من غير تبيين لضعف ورأوا بيانه في الحكم والعقائد عن ابن مهدي وغيرواحد" (فتح المغيث، ۱/ ۳۳۰)۔

امام نوویؒ اور علامہ سخاویؒ وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (دیکھئے: تدریب الراوی: ۱/ ۲۵۲، فتح المغیث، ۱/ ۲۳۲)، لیکن اگر روایت کے ضعیف ہونے کا ذکر نہ کیا جائے تو لوگوں کو اس کے ثبوت کے عقیدہ سے بچانا شاید ممکن نہ ہو۔ غالباً یہ بات اہل علم نے اپنے زمانہ کے علمی معیار اور فن حدیث سے اہل علم کے اشتغال کو دیکھتے ہوئے فرمائی ہے کہ ضعیف حدیث کو بیان کرنے کی حاجت نہیں، کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر حدیثیں سند کے ساتھ ذکر کی جاتی تھیں اور رجال کے بارے میں محدثین کا کلام معروف ومتعارف تھا، اسی لیے محدثین نے لکھا ہے کہ اگر کوئی حدیث بغیر سند کے روایت کی جائے، تو جزم کے صیغہ کے ساتھ "قال رسول اللہ" نہ کہا جائے بلکہ صیغہ تضعیف کے ساتھ حدیث نقل کی جائے، کہا جائے روی کذا، بلغنا کذا؛ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"واذا اردت رواية الضعيف بغير اسناد، فلا تقل قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا وما اشبه من صيغ الجزم، بل قل روى كذا او بلغنا كذا او ورد أوجاء او نقل وما اشبهه، وكذا ما تشك في صحته" (تدريب الراوي، ۱/ ۲۵۱)۔

موجودہ کم علمی اور حدیث سے قلت اشتغال کے عہد میں ضعیف روایات کی بابت ثابت ہونے کے یقین وجزم سے روکنے اور باز رکھنے کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس کے ضعیف اور غیر مستند ہونے کا اظہار کردیا جائے۔

جہاں تک احکام میں ضعیف احادیث کے معتبر ونامعتبر ہونے کی بات ہے، تو احکام سے متعلق ضعیف روایتوں کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ ایسی ضعیف حدیثیں جو قوی تر قرائن سے مؤید ہوں، جیسے قرآن یا حدیث مشہور اپنے عموم یا خصوص کے اعتبار سے مضمون حدیث کی تائید کرتی ہو، یا اس حدیث کے مضمون پر عہد صحابہ میں یا بعد کے ادوار میں اجماع واتفاق ہوگیا ہو، یا اس حدیث کو اہل علم کے نزدیک تلقی بالقبول حاصل ہوگئی ہو، تو ایسی احادیث کے مقبول ہونے پر قریب قریب اہل علم متفق ہیں اور اس سلسلہ میں عرض مسئلہ ابھی آپ کے سامنے آچکا ہے۔

۲۔ ایسی ضعیف حدیثیں جو نصوص صحیحہ ثابتہ سے متعارض ہوں، ظاہر ہے وہ معتبر نہیں ہیں اور اس پر بھی اہل علم کا اتفاق ہے، جیسا کہ اصولیین نے اسباب ترجیح کے ذیل میں لکھا ہے۔

۳۔ جن حدیثوں میں ضعف، راوی کے متہم بالکذب ہونے یا فاسق ہونے کی وجہ سے ہو تو ایسی ضعیف روایتیں بالاتفاق غیر معتبر ہیں۔ (مقدمہ ابن صلاح/ ۱۴)۔

حافظ ابن حجر وغیرہ نے فضائل کے باب میں حدیث کے معتبر ہونے کے لیے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ:

"ان يكون الضعف غير شديد، فيخرج من انفرد من الكذابين والمتهمين بالكذب ومن فحش غلطه" (تدريب الراوي، ۱/ ۲۵۲)۔

۴۔ ایسی ضعیف حدیثیں جو کسی حدیث صحیح سے متعارض نہ ہوں اور اس کا ضعف شدید نہ ہو تو بعض مقالہ نگاروں کے نزدیک مواقع احتیاط میں ان کا اعتبار ہے۔ سلف صالحین میں بھی یہ بہت سے اہل علم کی رائے رہی ہے علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

''ویعمل بالضعیف ایضا فی الاحکام اذا کان فیه احتیاط'' (حوالہ سابق ۱/ ۲۵۳)۔

موقعہ احتیاط سے مراد یہ ہے کہ حدیث کسی بات کو مستحب قرار دیتی ہو تو احتیاط اس پر عمل کر لینے میں ہے، یا کسی بات سے منع کرتی ہو تو احتیاط اس سے بچنے میں ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''الا ان یکون فی احتیاط فی شئی من ذلک کما اذا ورد حدیث ضعیف بکراهة بعض البیوع والانکحة فان المستحب ان یتنزه عنه ولکن لا یجب'' (کتاب الاذکار: ۲۷)۔

اسی طرح کی بات علامہ سخاویؒ نے بھی لکھی ہے (فتح المغیث، ۱/ ۳۳)، علامہ ابن ہمام نے بھی صراحت کی ہے کہ استحباب "ضعیف غیر موضوع" سے ثابت ہو سکتا ہے، "الاستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع" (فتح القدیر، ۱/ ۴۶۷، کتاب الجنائز)، فقہاء حنفیہ میں علامہ حصکفیؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں: "فیعمل به فی فضائل الاعمال" (درمختار: ۱/ ۸۷) اور یہی رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔ ابن حجر مکی نے الفتح المبین شرح الاربعین میں اس پر دو باتوں سے استدلال کیا ہے، ایک معقولی دلیل اور ایک منقول۔ معقولی دلیل یہ ہے کہ یہ ضعیف حدیث نفس الامر میں یا تو صحیح ہوگی یا نہیں ہوگی، اگر صحیح ہو تو اس پر عمل کرنا اس کو اس کا مستحق مقام دینا ہے اور اگر صحیح نہیں ہے تو اس پر عمل کرنا کسی مفسدہ کا باعث نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ تو کوئی تحریم ہے اور نہ دوسرے کے حق کا ضیاع، اور دلیل منقول یہ ہے: ایک حدیث ضعیف میں ہے:

''من بلغه من ثواب عمل فعمله حصل له اجره وان لم اکن قلته'' (قواعد فی علوم الحدیث/ ۹۳)۔

اس روایت کو الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ حافظ سیوطیؒ نے معجم اوسط للطبرانی کے حوالہ سے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے، لیکن یہ حدیث حد درجہ ضعیف ہے، یہاں تک کہ بعض راویوں پر کذب کی تہمت ہے (دیکھئے فیض القدیر، ۶/ ۹۵)۔

اگر اس روایت کے راویوں کا حال ظاہر نہیں ہوتا تب بھی اس کے متن اور مضمون ہی سے اس کا ضعیف اور بے اصل ہونا ظاہر ہے، لیکن ابن حجر کی پہلی بات معقول بھی ہے اور قوی بھی اور محدثین بالخصوص امام ترمذیؒ کے عمل سے بھی اس طرز عمل کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمری روایت کے بارے میں فرمایا ہے کہ: "حدیث ابن عمر اسناده لیس بذلک القوی" (ترمذی: باب ما جاء فی کراهیة ما یصلی الیه وفیه)،

لیکن قریب قریب تمام ہی فقہاء کے نزدیک اس حدیث پر عمل ہے، اسی طرح نماز مغرب کے بعد صلوٰۃ الاوابین سے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اور ترمذی نے امام بخاریؒ سے اس کے ایک راوی ابن عبداللہ ابن خثعم کا ضعف نقل کیا ہے، لیکن یہ روایت بھی عام طور پر فقہاء کے یہاں قبول کی گئی ہے، ایسا لگتا ہے کہ امام بخاریؒ بھی بعض مسائل میں ضعیف احادیث پر عمل کے قائل ہیں۔ اہل علم کے لیے یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ بخاری اپنے بعض تراجم کے تحت حدیث نقل نہیں کرتے، لیکن اس سے بعض ضعیف احادیث کے مضمون کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں مثلاً تسمیہ قبل الوضوء کا مسئلہ ہے، تسمیہ قبل الوضوء کے سلسلہ میں جو روایت ہے وہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، امام بخاری نے اس کو تسمیہ عند الوقاع والی روایت سے ثابت کیا ہے کہ وقاع موقع تخجیس ہے اور وضوء موقع تطہیر، تو جب موقعہ تخجیس سے پہلے تسمیہ مستحب ہے تو موقعہ تطہیر سے پہلے بدرجہ اولیٰ مستحب ہوگا۔ امام بخاری نے اس مسئلہ پر باب التسمیة عند الوقاع وغیرہ کا عنوان قائم کر کے تسمیہ والی حدیث پر استدلال کیا ہے۔ دیگر فقہاء کا طرز عمل بھی یہی ہے۔

امام ترمذیؒ اذان کے بارے میں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ اذان ٹھہر ٹھہر کر دو اور اقامت میں حدر سے کام لو، "اذا اذنت فترسل فی اذانك واذا قمت فاحدر الی آخره"۔ امام ترمذی نے اس حدیث پر کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اسناد مجہول ہے، "هو اسناد مجهول" (سنن ترمذی)

لیکن اس حدیث میں جتنی باتیں کہی گئیں ہیں۔یعنی اذان میں ترسل، اقامت میں حدر اور اذان واقامت کے درمیان کسی قدر فاصلہ، ان تمام ہی باتوں کے مستحب ہونے پر قریب قریب تمام ہی فقہاء متفق ہیں، اسی طرح مسح رقبہ کا مسئلہ ہے کہ اس کی سند میں طلحہ بن مصرف ہیں، جو محدثین کے یہاں ضعیف سمجھے گئے ہیں، لیکن اکثر حنفیہ نے اس حدیث کو قبول کیا ہے اور مسح رقبہ کو مستحب قرار دیا ہے، اسی طرح ماءِ مشمس کے استعمال کی کراہت کا مسئلہ ہے کہ اس حدیث کا ضعف کہا جاسکتا ہے کہ متفق علیہ ہے (دیکھئے نصب الرایہ، ۱/ ۱۰۲/ ۱۰۳)، لیکن حنفیہ اور شوافع اس حدیث کی بنا پر ایسے پانی کے استعمال کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔پس قول صحیح یہی ہے کہ حدیث ضعیف سے کراہت اور استحباب ثابت ہوسکتا ہے۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا مسئلہ جو گو کراہت اور مستحب سے اونچے درجے کا ہو، لیکن اس روایت میں ضعف شدید نہ پایا جاتا ہو، یا صحابہ کے فتاویٰ سے اس کی تائید ہوتی ہے، ایسی ضعیف احادیث کے بارے میں ہمارے مقالہ نگاروں نے عام طور پر گفتگو نہیں کی ہے۔اہل علم کے لیے یہ بات محتاجِ اظہار نہیں کہ بعض ائمہ سے منقول ہے کہ جن مسائل میں کوئی حدیث صحیح موجود نہیں ان میں بجائے قیاس کے حدیث ضعیف پر عمل کرنا بہتر ہے، حنفیہ کے بارے میں ابن حزمؒ جیسے ناقد نے نقل کیا ہے کہ حدیث ضعیف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک رائے اور قیاس سے اولیٰ ہے۔

" ان جميع الحنفية مجمعون على ان مذهب أبي حنيفة ان ضعيف الحديث اولى عنده من الرای والقياس " (القول البدیع: ۲۵۵)۔

نیز ابن قیم کا بیان ہے:

اصحاب ابي حنيفة مجمعون على ان مذهب ابي حنيفة ان ضعيف الحديث عنده اولى من القياس والرای (اعلام الموقعين، ۱/ ۷۷)۔

یہی حال امام مالکؒ کا ہے۔امام مالکؒ نے موطا میں جو طریقہ استدلال اختیار کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ منقطع الاسناد روایات اور بلاغات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔امام احمدؒ سے بہ صراحت ووضاحت منقول ہے کہ:

"ضعيف الحديث احب الينا من رأى الرجال" دیکھئے التعلقات الحافلة على الاجوبة الفاضلة: ۴۹/ ۴۸)۔

اسی طرح ابن مندہ نے امام ابوداؤدؒ کے بارے میں نقل کیا ہے:

انه يخرج الاسناد الضعيف اذا لم يجد في الباب غيره وانه اقوى عنده من راى الرجال (حواله سابق/ ۲۵۶)۔

امام ترمذیؒ کے طریقۂ استدلال سے بھی یہی بات نمایاں ہے، مثلاً حضرت عامر بن ربیعہ کی روایت، ہم لوگ سفر میں تھے رات تاریک تھی، اس کی وجہ سے قبلہ مشتبہ ہوگیا اور ہم لوگوں نے تحری کر کے نماز ادا کی، کے بارے میں ترمذیؒ فرماتے ہیں: "هذا حديث ليس اسناده بذلك"، لیکن پھر فرماتے ہیں: "وقد ذهب اكثر اهل العلم إلى هذا" (باب ماجاء في الرجل يصلي لغير القبلة في الغيم)، اسی طرح نوم کے ناقض وضوء ہونے سے متعلق احادیث کا معاملہ ہے کہ اکثر محدثین نے اسے یزید بن عبدالرحمٰن دالانی کی سند سے نقل کیا ہے اور محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے۔اس مضمون کی روایت جن دوسری اسناد سے منقول ہے وہ بھی ضعف سے خالی نہیں (دیکھئے: نصب الرایہ، ۱/ ۴۴۔۴۵)، لیکن فی الجملہ ائمہ اربعہ نیند کے ناقض ہونے پر متفق ہیں، گو بعض تفصیلات میں اختلاف رائے ہے۔

حنفیہ کے یہاں تو اس کی نظیریں کثرت سے مل جائیں گی جیسے نماز میں قہقہہ کا ناقض وضو ہونا۔نبیذ تمر سے وضوء، اکثر مدت حیض، کم سے کم مقدار مہر وغیرہ مسائل میں حدیث ضعیف کو اسی لیے قبول کیا گیا ہے کہ اس باب میں دوسری معارض روایت موجود نہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ ائمہ اربعہ میں امام شافعیؒ کے یہاں سند پر توجہ زیادہ ہے، لیکن فقہ شافعی میں بھی ایسی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں کہ جن میں حدیث ضعیف پر عمل کی بنیاد رکھی گئی ہے، چنانچہ مقام وج کے شکار کی حرمت، ممنوعہ اوقات میں مکہ میں نماز کی اجازت اور ایک قول کے مطابق قئی اور نکسیر کی صورت میں بناء صلاۃ کی اجازت،

یہ وہ احکام ہیں جن کی بنیاد احادیث ضعیفہ پر ہے، لیکن امام شافعیؒ نے ان کو قبول کیا ہے (دیکھئے التعلیقات الحافلۃ علی الاجوبۃ الفاضلۃ، ۴۹، ۴۸)۔

ترمذی میں امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: "لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئا من القرآن" پھر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن آگے لکھا ہے: "هو قول اكثر اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعين ومن بعدهم مثل سفيان الثوری وابن المبارك والشافعی، واحمد، واسحاق (ترمذی، باب ماجاء فی الجنب والحائض الهما لا يقرءان القرآن)۔" اسے ہی امام ترمذیؒ ہی نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت نقل کی ہے: "ان النبی ﷺ مسح اعلی الخف واسفله" اور آگے لکھتے ہیں: "وبه يقول مالك والشافعی واسحاق" پھر کہتے ہیں: هذا حديث معلول اور بخاریؒ اور ابوزرعہ سے بھی اس حدیث کا ضعیف ہونا نقل کرتے ہیں (ترمذی باب المسح علی الخفين اعلاه واسفله)، اسی طرح امام شافعیؒ کے یہاں احادیث مرسلہ ضعیف ہیں، لیکن بعض مسائل میں احادیث مرسلہ کو قبول بھی کرتے ہیں؛ چنانچہ علامہ سبکیؒ فرماتے ہیں:

"الشافعی رضی الله عنه صدر القائلين برد المراسيل الا انه نقل عنه انه قبل بعضها فی اماكن" (الابہاج، ۲/ ۳۳۹)۔

علامہ ماوردیؒ کے بیان کے مطابق قولِ جدید میں حدیث مرسل سے بھی امام شافعیؒ استدلال کرتے ہیں، بشرطیکہ اس کے سوا کوئی دلیل نہ پائی جائے: "انه فی الجديد يحتج بالمرسل اذا لم يوجد دليل سواه" (فتح المغیث، ۱/ ۱۷۴)

اسی طرح علامہ تاج الدین سبکیؒ سے منقول ہے کہ اگر حدیث مرسل کسی بات کی ممانعت کو بتاتی ہو تو احتیاطاً اس سے بچنا واجب ہوگا۔

"اذا دل علی محظور ولم يوجد سواه فالاظهر وجوب الانكفاف يعنی احتياطًا" (حوالہ سابق)۔

اس لیے یہ بات ہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی حدیث ضعیف جو کسی نص قوی سے متعارض نہ ہو اور اس کا راوی متہم بالکذب یا فاسق نہ ہو تو اس روایت پر عمل کیا جائے گا؛ کیونکہ حضرت معاذؓ کی روایت کے مطابق قیاس واجتہاد کی گنجائش وہاں ہے جہاں کوئی حدیث موجود نہ ہو اور جب کسی مسئلہ میں ایسی روایت موجود ہے جس کے حدیث ہونے کا گمان کیا جاسکتا ہے تو حدیث مقدم ہے اور ایسی احادیث ضعیفہ اسی قبیل سے ہیں، کیونکہ سیئ الحفظ راوی کی روایت کا غلط ہونا یقینی نہیں، بلکہ دوسری ادلہ شرعیہ سے متعارض نہ ہونے کی وجہ سے غلبۂ ظن یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوگی، لہٰذا ایسی احادیث کو ترک کرنا مناسب نظر نہیں آتا۔

رہ گئی یہ بات کہ ائمہ نے کہا ہے: "اذا ثبت الحديث فهو مذهبی"۔

لہٰذا حدیث ضعیف ائمہ کے اس قول کی روشنی میں معتبر نہیں، تو یہ کچھ زیادہ قوی استدلال نہیں، کیونکہ جب ائمہ سے حدیث صحیح کی عدم موجودگی میں احادیث ضعیفہ پر بناء استدلال رکھنا ثابت ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے مسائل میں یہ حدیثیں ان کے نزدیک احادیث ثابتہ ہی کے درجے میں ہیں، کیونکہ کسی خبر کا استناد ایک امر اضافی ہے اور ممکن ہے کہ ایک ہی خبر بعض مواقع پر کر مستند سمجھی جائے اور بعض مسائل میں مستند نہ سمجھی جائے۔

علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن قیمؒ نے جو یہ بات لکھی ہے کہ امام احمدؒ کے کلام میں حدیث ضعیف سے حدیث حسن ہی کی ایک قسم مراد ہے اور صاحب درمختار کا حنفیہ کی طرف سے حدیث ضعیف کے مقبول ہونے کی بابت اقوال کا یہی محمل قرار دینا، تو یہ درست نظر نہیں آتا۔ شیخ عوامہ نے صحیح فرمایا ہے کہ اگر امام احمدؒ کی یہ رائے ہوتی کہ حدیث حسن رائے پر مقدم ہے تو یہ کون سی اہم اور قابل ذکر بات تھی! یہ تو ایک متفق علیہ اصول ہے۔ پھر خود امام احمدؒ کے بعض کلام سے اس کی تردید ہوتی ہے؛ کیونکہ عبداللہ بن احمدؒ نے جب اپنے والد حضرت الامام سے دریافت کیا کہ کوئی شخص ایسے شہر میں ہو جس میں کوئی صاحب حدیث ہو، لیکن وہ صحیح وضعیف روایات میں امتیاز کی صلاحیت سے محروم ہو اور دوسری طرف اصحاب الرای ہوں تو اسے مسائل میں کس سے رجوع کرنا چاہئے؟ امام احمدؒ نے فرمایا:

"يسئل صاحب الحديث ولا يسئل صاحب الرأی، ضعيف الحديث أقوى من الرأی" (المحلی، ۱/ ۶۷)

اس سے ظاہر ہے کہ امام احمدؒ کے یہاں وہی حدیث ضعیف مراد ہے متاخرین حدیث ضعیف قرار دیتے ہیں، اسی طرح قاضی ابویعلی حنبلیؒ نے مھنا نقل کیا ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا:

''الناس کلھم اکفاء الا الحائك والحجام والکساح''

ان سے کہا گیا کہ آپ یہ حدیث ''کل الناس اکفاء الا حائکا او حجاما'' کی بناء پر کہہ رہے ہیں، حالانکہ آپ اس روایت کو ضعیف قرار دے رہے ہیں۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ ہاں! ہم اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیتے ہیں لیکن عمل اسی پر ہے۔ ''انما نضعف اسنادہ لکن العمل علیہ'' (العدہ، ۳/۹۳۸)، اسی طرح حکیم بن جبیرؒ کی روایت ہے کہ جس کے پاس پچاس درہم ہو اس کے لیے صدقہ حلال نہیں، امام احمدؒ اسی کے قائل ہیں۔ جب امام صاحبؒ سے اس مسئلہ کی دلیل دریافت کی گئی تو حکیم بن جبیر کی حدیث کا حوالہ دیا۔ استفسار کیا گیا کہ حکیم بن جبیر آپ کے نزدیک معتبر ہیں؟ امام احمدؒ نے اس کا جواب نفی میں دیا ''لیس ھو عندی ثبتًا فی الحدیث'' (حوالہ سابق ۳/۹۳۹)۔

حضرت غیلان ثقفیؒ کی روایت ہے کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں، یہ سب مسلمان ہوگئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے چار کا انتخاب کرلیں۔ امام احمدؒ سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: ''لیس بصحیح والعمل علیہ'' (العدۃ: ۳/۹۴۰)۔

اس لیے صحیح یہی ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ کے نزدیک حدیث ضعیف سے ضعیف روایت ہی مراد ہے، نہ کہ حسن اور جن مسائل میں کوئی قوی اور صحیح روایت موجود نہیں ہوتی، ان میں ایسی ضعیف روایتوں پر بھی عمل کیا جاتا ہے جن کا ضعف بہت شدید نہ ہو۔

۶۔ اخیر میں اس اصطلاح کی طرف بھی اشارہ کردینا مناسب ہوگا جو متاخرین نے ضعیف اور مضعف کے نام سے ذکر کی ہے، کہ جس حدیث کے ضعف پر اتفاق ہو وہ حدیث ضعیف ہے اور جس حدیث کے ضعف پر اتفاق نہ ہو بلکہ محدثین کی رائیں اس کے بارے میں مختلف ہوں وہ مضعف ہے۔

علامہ قسطلانیؒ ''ارشاد الساری'' میں رقمطراز ہیں:

''والمضعف ما لم یجمع علی ضعفہ بل فی متنہ او سندہ تضعیف لبعضھم وتقویۃ للبعض الآخر وھو اعلی من الضعیف'' (قواعد فی علوم الحدیث: ۱۰۸)۔

غالبًا اسی بناء پر امام نسائیؒ کا یہ قول ہے کہ:

''لا یترك الرجل عندی حتی یجتمع الجمیع علی ترکہ'' (زھر الربی علی المجتبی للسیوطی ۱/۳)۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی رائے ہے کہ ایسی مختلف فیہ حدیثیں حسن کے درجہ میں ہیں، ''ان المختلف فیہ حسن'' (قواعد فی علوم الحدیث: ۱۰۹)، اور علامہ ھیثمیؒ نے ''مجمع الزوائد'' میں حدیث کی تحسین کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اکثر جگہ جہاں مختلف فیہ راوی آئے ہیں، ھیثمیؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ حدیث ضعیف کے سلسلہ میں یہ بھی ایک اہم اصول ہے، کیونکہ حدیث کو قوی یا ضعیف قرار دینا ایک اجتہادی عمل ہے اور جب کسی امر میں اصحاب نظر کا اجتہاد مختلف ہوجائے تو اس کے بارے میں احکام میں نرمی پیدا ہوجاتی ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب: تفصیلی مقالات

احکام میں احادیث ضعیفہ کی حیثیت

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

الف۔سوال۔وباللہ التوفیق: حدیث ضعیف وہ ہے جس میں حدیث صحیح کے بارے میں جو معتبر شرائط ہیں وہ یا تو کل نہ ہوں یا بعض نہ ہوں۔

مقدمہ مشکوۃ میں ہے:

"وما فقد فيه الشرائط المعتبرة في الصحيح كلا او بعضا فهو الضعيف. والضعيف ان تعدد طرقه وانجبر ضعفه يسمى لغيره"۔

سوال نمبر۔۲۔وباللہ التوفیق: کسی حدیث کے ضعیف و ناقابل عمل ہونے میں اہم اور بنیادی دو سبب ہیں:

۱۔ سقوط یعنی اسناد سے کسی راوی کے چھوٹ جانے کو کہتے ہیں، سقط کی دو قسمیں ہیں: واضح اور خفی، پھر سقط واضح حدیث مردود وضعیف اور غیر مقبول کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ معلق وہ حدیث ہے جس کی سند کا ابتدائی حصہ حذف کردیا گیا ہو یعنی کسی مصنف نے بالقصد ابتدائے سند سے ایک یا چند راویوں کو حذف کردیا ہو، چاہے تمام سند حذف کردی ہو اور قال رسول اللہ ﷺ کہہ کر حدیث بیان کی ہو، یا صحابی کے علاوہ باقی تمام سند حذف کردی ہو، یا صحابی یا تابعی کے علاوہ باقی سند حذف کی ہو یا مصنف نے اپنی جانب سے ابتدائے سند سے صرف ایک یا چند راویوں کو حذف کیا ہو، سب کو معلق کہا جاتا ہے۔

۲۔ مرسل وہ حدیث ہے جس کی سند کا آخری حصہ نہ بیان کیا گیا ہو، تابعی قال رسول اللہ ﷺ کہہ کر حدیث بیان کرتا ہو چاہے تابعی بڑے مرتبہ کا ہو یا معمولی درجہ کا ہو۔

۳۔ معضل وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے دو یا زیادہ راوی مسلسل حذف کئے گئے ہوں۔

۴۔ منقطع وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے صرف ایک راوی حذف ہوا ہو یا چند راوی حذف ہوئے ہوں مگر مسلسل نہ ہوئے ہوں بلکہ الگ الگ جگہوں سے حذف ہوئے ہوں۔

سقط واضح: وہ ہے جو آسانی سے معلوم ہوجائے مثلاً پتہ چل جائے کہ راوی کی مروی عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی ہے اور روایت بطور اجازت یا وجادت بھی نہ رہے۔

دوسری سقط خفی: وہ ہے جو واضح نہ ہو یعنی ہر شخص اس کو نہ سمجھ سکتا ہو صرف ماہرین فن ہی اس کو پاسکتے ہوں، دوسرا سبب ردطعن یعنی راوی میں کوئی عیب وخرابی ہو۔

اسباب طعن:

[1] جامعہ مفتاح العلوم، شاہی کٹرا، مئو۔

اسباب طعن دس چیزیں ہیں جن میں پانچ اسباب متعلق بضبط ہیں:

۱۔ فحش غلط یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جس کی غلط بیانی صحت بیانی سے زیادہ ہو۔

۲۔ کثرت غفلت یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جو حدیث کو خوب اچھی طرح محفوظ کرنے سے اکثر غفلت برتتا ہو۔

۳۔ وہم: بھول کر غلطی سے ایک حدیث کے ٹکڑے کو دوسری حدیث میں داخل کر دینا یا حدیث میں کمی وبیشی کر دینا، یا ضعیف راوی کی جگہ ثقہ راوی کا نام لینا۔

۴۔ مخالفت ثقات: یعنی ثقہ راوی کی روایت کے خلاف روایت کرنا۔

۵۔ سوء حفظ یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جس کی غلط بیانی حافظہ کی خرابی کی وجہ سے صحت بیانی سے زیادہ ہو یا برابر ہو۔

اور پانچ اسباب متعلق بعدالت ہیں:

۱۔ کذب فی الحدیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بالقصد کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا۔

۲۔ تہمت کذب اس طعن کا مطلب یہ ہے کہ راوی کے متعلق یہ بات تو ثابت نہیں ہوئی کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قصداً کوئی جھوٹ بات منسوب کی، مگر کچھ قرائن ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن سے کذب فی حدیث الرسول کی بدگمانی ہوتی ہے۔

۳۔ فسق: یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جو کسی قولی یا فعلی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے، مثلاً زنا و چوری وغیرہ کرتا ہے، یا موہوم کفریہ کلمات بکتا ہے، یا نہایت گندی گالی گلوچ کرتا ہے، یا وہ کسی گناہ صغیرہ کا عادی ہے۔

۴۔ جہالت: یعنی راوی کا حال معلوم نہ ہونا کہ وہ ثقہ ہے یا غیر ثقہ۔

۵۔ بدعت یعنی دین میں کوئی ایسی جدت کرنا جس کی اصلیت قرآن وحدیث میں یا قرون مشہود لھا بالخیر میں نہ پائی جاتی ہو، ضعف احادیث کے اہم وبنیادی اسباب ہیں۔

احادیث کی تصحیح وتضعیف کے اصول وقواعد

پہلا قاعدہ:

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث صحیحہ صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں منحصر ہیں، نیز بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو حدیث صحیحین میں نہ ہو وہ لازماً ضعیف ہوگی اور وہ کسی حال میں بھی صحیحین کی حدیث کا معارضہ نہیں کرسکتی، حالانکہ بالکل غلط ہے کیونکہ کسی حدیث کی صحت کا اعتبار اس کے بخاری ومسلم میں ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی سند پر ہے، خود امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں احادیث صحیحہ کا ستیعاب نہیں کیا ہے، لہٰذا عین ممکن ہے کوئی حدیث صحیحین مین نہ ہو اور اس کے باوجود اس کا رتبہ سند کے اعتبار سے صحیحین کی بعض احادیث سے بھی بلند ہو۔

دوسرا قاعدہ:

احادیث کی تصحیح وتضعیف انتہائی نازک کام ہے جس کے لیے انتہائی وسیع اور عمیق علم کی ضرورت ہے، لہٰذا اس کے اہل وہی لوگ ہیں جو اس علم میں اجتہاد کے درجہ پر فائز ہیں، اور محقق بات یہ ہے کہ تصحیح وتضعیف کا کام کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ علم وفہم کی مطلوبہ شرائط جس کسی میں پائی جائیں وہ تصحیح وتضعیف کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

تیسرا قاعدہ:

بعض اوقات ایک ہی راوی کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات اس کی تضعیف کرتے ہیں اور بعض توثیق، ایسے موقع پر

کس کے قول کو اختیار کرنا چاہئے تو مولانا عبدالحئی رحمہ اللہ نے ان اقوال میں ترجیح کے تین طریقے بیان کئے ہیں:

پہلا طریقہ: یہ ہے کہ اگر دو علماء میں سے کوئی ایک تصحیح کے معاملہ میں متساہل ہو اور دوسرا محتاط ہو تو دوسرے کے قول پر عمل کیا جائے گا، مثلاً تصحیح حاکم اور تضعیف ذہبی رحمہما اللہ ہیں تو حافظ ذہبیؒ کے قول کا اعتبار ہوگا۔

دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ اگر دو محدثین میں سے کوئی ایک متشدد ہو اور دوسرا معتدل تو دوسرے کے قول کا اعتبار ہوگا مثلاً ابن الجوزی بہت متشدد ہیں، اور حافظ ابن حجر یا حافظ ذہبی معتدل ہیں، لہٰذا ابن الجوزی کے مقابلہ میں ان دو حضرات کا قول معتبر ہوگا۔

مولانا لکھنوی رحمہ اللہ نے حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل میں زمانہ کے اعتبار سے چار طبقات ہیں، انہیں طبقات میں ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بتلایا ہے کہ ان میں متشدد کون ہے اور کون معتدل؟

(۱) پہلا طبقہ شعبہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کا ہے ان دونوں میں شعبہ رحمہ اللہ اشد ہیں

(۲) دوسرا طبقہ یحییٰ بن سعید قطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی کا ہے ان دونوں میں یحییٰ اشد ہیں

(۳) تیسرا طبقہ یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی کا ہے ان دونوں میں یحییٰ بن معین اشد ہیں

(۴) چوتھا طبقہ ابن ابی حاتم اور امام بخاریؒ کا ہے ان دونوں میں ابن ابی حاتم اشد ہیں، لہٰذا جہاں ان حضرات میں باہم اختلاف ہو وہاں اشد کے قول کو چھوڑ کر متوسط کے قول کو اختیار کیا جائے گا، مولانا لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان حضرات کے بعد علماء میں علامہ ابن الجوزی، عمر بن بدر موصلی، علامہ جوزقانی، حافظ صنعانی اور صاحب سفر السعادۃ اور ابوالفتح نووی اور علامہ ابن تیمیہ بھی متشددین میں سے ہیں لہٰذا حافظ ابن حجر، حافظ ذہبی، حافظ عراقی اور حافظ زیلعی وغیرہ رحمہم اللہ جیسے معتدل علماء کے مقابلہ میں ان حضرات کے اقوال کو چھوڑ دیا جائے گا۔

تیسرا طریقہ: یہ ہے کہ فریقین کے دلائل پر غور کیا جائے اور جس کے دلائل قوی معلوم ہوں اس کے قول کا اعتبار کیا جائے گا، لیکن یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کے علم حدیث کے متعلقات پر مکمل عبور حاصل ہو، معتدل علماء کے مابین اختلاف کی صورت میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا یعنی اگر کسی شخص میں دونوں فریق کے دلائل کا موازنہ کرنے کی صلاحیت ہو تو وہ موازنہ کرکے کسی قول کو ترجیح دے سکتا ہے ورنہ جس قول پر زیادہ اعتماد ہو اسے اختیار کیا جائے گا۔

چوتھا قاعدہ:

احادیث کی تصحیح وتضعیف ایک اجتہادی معاملہ ہے جیسا کہ محقق ابن ہمام رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے جس میں مجتہدین کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں اور ایسی صورت میں کسی بھی مجتہد پر کوئی ملامت نہیں، نیز کسی مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث اس کے نزدیک قابل استدلال ہے، لہٰذا اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے مجتہد کا یہ قول پیش کرنا درست نہیں ہے کہ وہ حدیث نا قابل استدلال ہے کیونکہ ایک مجتہد کا قول دوسرے مجتہد کے خلاف صحیح نہیں ہوتا۔

پانچواں قاعدہ:

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقدم مثلاً امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو ایک حدیث بالکل صحیح سند سے پہنچی لیکن ان کے بعد اس حدیث کی سند میں کوئی ضعیف راوی آگیا چنانچہ بعد کے لوگ اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ بعد کے لوگوں کی یہ تضعیف امام ابوحنیفہؒ پر حجت نہیں ہوسکتی، حنفیہ کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس قاعدہ کی تصریح کی ہے اسی وجہ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث امام بخاریؒ کے زمانہ میں ضعیف قرار دی گئی پہلے زمانہ میں بھی ضعیف رہی ہو۔

چھٹا قاعدہ:

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جب ہم کسی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ وہ نفس الامر

میں بھی یقیناً صحیح ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں صحیح کی وہ خفی شرائط موجود ہیں جو محدثین نے صحیح کے لیے مقرر کی ہیں، لہٰذا ظن غالب یہ ہوتا ہے کہ وہ نفس الامر میں بھی صحیح ہوگی، اس لیے کہ نفس الامر کی صحت کا یقین تواتر کے بغیر نہیں ہوتا، لہٰذا صحیح میں بھی یہ احتمال موجود ہے کہ نفس الامر کے طور پر کوئی غلطی رہ گئی ہو کیونکہ خطاء ونسیان ثقہ سے بھی ممکن ہے اور اس کا امکان ہے کہ کسی راوی سے کوئی وہم ہوا ہو، البتہ اس احتمال پر عمل اس وقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے دلائل قویہ اس کو ثابت نہ کریں۔ اب بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی مجتہد کے پاس ایسے دلائل قویہ موجود ہوتے ہیں جن کی بناء پر وہ اس ضعیف احتمال کو راجح قرار دے کر کسی حدیث صحیح کو ترک کر دیتا ہے یا حدیث ضعیف کو اختیار کرتا ہے، تو اس صورت میں اس کو حدیث صحیح کا تارک یا حدیث ضعیف پر عامل نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب العلل میں لکھا ہے کہ میری کتاب میں دو حدیثیں ایسی ہیں کہ جن پر کسی فقیہ کا عمل نہیں ہے،

ایک ابن عباسؓ کی روایت:

''قال جمع رسول اللہ ﷺ بین الظھر والعصر وبین المغرب والعشاء بالمدینۃ من غیر خوف ولاسفر ولا مطر''

حالانکہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث قابل استدلال ہے۔

دوسری حدیث حضرت امیر معاویہؓ کی ہے:

''قال قال رسول اللہ ﷺ من شرب الخمر فاجلدوہ فان عاد فی الرابعۃ فاقتلوہ''

حالانکہ یہ حدیث بھی قابل استدلال ہے، ان دونوں حدیثوں کے ظاہر کو باجماع امت ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ دوسرے دلائل ان کے خلاف موجود تھے، لیکن ان حدیثوں کے ترک کرنے کی وجہ سے کسی کو بھی تارک سنت نہیں کہا گیا اس کے برعکس حدیث ضعیف پر بعض اوقات دوسرے دلائل کی وجہ سے عمل کر لیا جاتا ہے؛ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب النکاح میں عمرو بن شعیب رحمہ اللہ کی روایت نقل کی ہے:

"عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ ﷺ رد ابنتہ زینب علی ابن العاص ابن الربیع بمھر جدید ونکاح جدید" اس حدیث کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "ھذا حدیث فی اسنادہ مقال والعمل علی ھذا الحدیث عند اھل العلم الخ ثم قال وھو قول مالک بن انس والاوزاعی والشافعی واحمد واسحاق"

کیا ان تمام ائمہ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ عامل بالحدیث الضعیف ہیں، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے حدیث کو اس لیے اعتبار کیا کہ دوسرے دلائل سے اس کی تائید ہو رہی ہے، لہٰذا اگر امام ابوحنیفہؒ کسی مقام پر حدیث ضعیف کو دوسرے دلائل کی وجہ سے اختیار کریں تو تنہا نشانہ ملامت کیسے ہو سکتے ہیں۔

ساتواں قاعدہ:

اگر کوئی حدیث ضعیف مؤید بالتعامل ہوں یعنی صحابہ وتابعین کا عمل اس کے مطابق ثابت ہو تو وہ اپنے ضعف کے باوجود قابل استدلال ہوگئی ہے چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ اس کے تحت لکھتے ہیں:

''حدیث عائشۃ حدیث غیر لا نعرفہ مرفوعًا الا من حدیث مظاھر من اسلم ومظاھر لا یعرف فی العلم غیر ھذا الحدیث والعمل علی ھذا اھل العلم من اصحاب النبی ﷺ وغیرھم''

اسی طرح حدیث: "لاوصیۃ لوارث" اور "القاتل لا یرث" کی اسانید بھی ضعیف ہیں، لیکن تلقی بالقبول کی وجہ سے انہیں قابل استدلال سمجھا گیا، اسی اصول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ اور دیگر احناف بعض مرتبہ ایسی ضعیف حدیث کو اختیار کر لیتے ہیں جو مؤید بالتعامل ہو، ضعیف حدیث اگر متعدد طرق سے مروی ہو اس صورت میں اسے حسن لغیرہ کہہ کر قابل استدلال سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ ضعف احادیث کے بنیادی واہم اسباب مندرجہ ذیل امور ہیں:

۱۔ اسناد حدیث سے ایک یا دو راویوں کا ساقط ہو جانا۔

۲۔ طعن یعنی اسناد میں کوئی راوی غفلت یا فحش غلط یا جہالت یا سوء حفظ یا وہم وغیرہ اوصاف میں سے کسی وصف کے ساتھ متصف ہو۔

۳۔ یہ اجتہادی معاملہ ہے، لہٰذا کسی مجتہد نے اپنے اجتہاد سے کسی حدیث یا کسی راوی کو صحیح جانا تو دوسرے کو اس کی ملامت کرنا جائز نہیں ہے۔

۴۔ جس حدیث میں حدیث صحیح کی خفی شرائط موجود نہ ہوں۔

محدثین وفقہاء مجتہدین کے درمیان اختلاف اتنا ہے کہ صرف راوی کے احوال کو دیکھ کر صحت وضعف کا فیصلہ کر دیتا ہے اور اس سے نفس کو سکون مل جاتا ہے، اور مجتہد راوی کے اندر شرائط وعدم شرط کے اعتبار کے ساتھ راوی کی مروی خبر وحدیث کو بھی دیکھتا ہے تو مجتہد کے نزدیک صحت وضعف کا مرجع اس کی رائے ہے؛ کیونکہ نفس الامری صحیح اسناد کو قرینہ سے جو ضعیف ہونے پر دلالت کرے ضعیف کہا جا سکتا ہے، اور محدث کا کسی حدیث کو روایت کرنا اس کی تصحیح نہیں ہے لیکن مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال کرنا حدیث کو صحیح کرتا ہے؛ کیونکہ اس تک جو سند پہنچی ہے اس میں سب راوی ثقہ تھے تو بعد میں ضعیف راوی کے داخل ہو جانے سے وہ حدیث مجتہد کے اعتبار سے ضعیف نہ ہوگی، ہاں اس وقت کے محدثین کو ضعیف کہنا جائز ہے، لہٰذا بعد کے ضعیف راویوں کی وجہ سے مجتہد کو ملامت کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم (تفصیل کے لیے دیکھئے: انہاء السکن، ۱/ ۱۲)۔

اگر حدیث ضعیف دو یا دو سے زائد سندوں سے مروی ہو تو کبھی حدیث صحیح اور کبھی حدیث حسن کے ساتھ ملحق ہو جاتی ہے۔ درمختار میں ہے بنا بریں فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا، علامہ شامی رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی صرف اعمال پر مرتب فضیلت حاصل کرنے کے لیے عمل جائز ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح الاربعین میں کہا ہے کیونکہ اگر وہ نفس الامر میں صحیح ہوگی تو عامل نے عمل کر کے اس کا حق ادا کر دیا اور اگر ایسا نہ ہو تو اس پر عمل کرنے سے تحلیل وتحریم کا فساد مرتب نہ ہوگا اور نہ کسی دوسرے کے حق کا ضیاع ہوگا، امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضعیف حدیث پر احکام میں عمل کیا جا سکتا ہے جبکہ عمل میں احتیاط ملحوظ ہو۔

درمختار میں ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی تین شرطیں ہیں:

۱۔ شدید ضعیف نہ ہونا۔

۲۔ کسی اصل کے تحت داخل ہونا۔

۳۔ اس حدیث سے ثابت مسئلہ کے سنت کا عقیدہ نہ ہو۔

امام ابن حزمؒ نے کہا ہے: تمام حنفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف ان کے نزدیک رائے سے اولیٰ ہوتی ہے، پس احادیث کے اس اہتمام پر غور کرو کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب قوی یہ ہے کہ حدیث ضعیف کو محض قیاس پر مقدم رکھا جائے، نیز امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ ہر اس راوی کی حدیث روایت کی جائے جس کے متروک ہونے پر اجماع نہ ہو، اسی طرح امام ابوداؤد رحمہ اللہ کا مذہب بھی ہے کہ جب وہ کسی باب میں حدیث ضعیف کے علاوہ کوئی صحیح حدیث نہیں پاتے تو حدیث ضعیف کی روایت کرتے ہیں، کیونکہ حدیث ضعیف ان کے نزدیک لوگوں کی رائے سے اقوی ہے، نیز امام احمد بن حنبلؒ کی بھی رائے یہی ہے، کیونکہ انہوں نے فرمایا ہے کہ حدیث ضعیف میرے نزدیک لوگوں کی رائے سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ نص کے نہ ہونے کی صورت میں قیاس کی جانب عدول ہوتا ہے اور حدیث ضعیف نص ہے گو ضعیف سہی پھر بھی وہ قیاس سے افضل ہے، علامہ ظفر عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضعیف سے مراد شدید الضعف حدیث نہیں، کیونکہ شدید الضعف حدیث پر عمل بالکل جائز نہیں ہے اور ایسی شدید الضعف حدیث سے کچھ بھی ثابت نہ ہوگا بلکہ حدیث ضعیف سے مراد وہ ہے جس کو علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کے اصول وفتاویٰ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ چوتھی اصل حدیث ضعیف کو اختیار کرنا ہے جبکہ باب میں کچھ اس کے مانع نہ ہو اور یہی ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے قیاس پر راجح کیا ہے، اور ان کے نزدیک ضعیف سے مراد باطل ومنکر نہیں ہے اور نہ وہ حدیث مراد ہے جس میں کوئی متہم بالکذب راوی ہو کہ

اس کی طرف جانا بھی جائز نہیں ہے اور نہ اس پر عمل کرنا، بلکہ حدیث ضعیف ان کے نزدیک حدیث صحیح کی قسم ہے اور حسن کی ایک قسم ہے اور وہ حدیث کی تقسیم صحیح وحسن اور ضعیف نہیں کرتے بلکہ صحیح اور ضعیف تقسیم میں کہتے ہیں، اور ان کے نزدیک حدیث ضعیف کی چند مراتب ہیں، جب باب میں اس کے خلاف کوئی اثر نہ پایا جائے اور نہ کسی صحابی کا قول اور نہ اجماع اس کے خلاف ہو تو ان کے نزدیک حدیث ضعیف پر قیاس کے مقابل میں عمل کرنا اولیٰ ہے، اور تمام ائمہ رحمہم اللہ ان کے اس اصل میں موافق ہیں، کوئی مخالف نہیں ہے، کیونکہ سبھوں نے حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم رکھا ہے، اور نیز فرمایا ہے کہ حنفیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس اور رائے سے اولیٰ ہے اور اسی پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اور دس درہم سے کم کی چوری میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، حالانکہ حدیث اس سلسلہ میں ضعیف ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس ورائے پر مقدم رکھنا امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے اور امام احمدؒ کا قول کہ سلف کی اصطلاح میں حدیث ضعیف سے مراد وہ ضعیف نہیں ہے جو متاخرین کی اصطلاح میں ضعیف مراد لی جائے گی؛ بلکہ جس حدیث کو متاخرین حسن کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو متقدمین اس کو ضعیف کا نام دیتے ہیں، علامہ ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ احادیث میں حسن ہونا صرف امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ہے اور ان کے سواء محدثین کے نزدیک حدیث کی دو قسم ہے صحیح وضعیف اور ان کے نزدیک ضعیف وہ ہے جو صحیح کے درجہ سے کم تر ہو اور ضعیف پر عمل کرنا قیاس سے اولیٰ ہے، علامہ ظفر عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے کلام میں ضعیف سے مراد کہ حدیث ضعیف قیاس پر مقدم ہے، وہی ہے جسے متاخرین فی ذاتہ نام دیتے ہیں وہ جب مؤید بالشواہد ہو جائے تو حسن لغیرہ ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم (انہاء السکن، ۲۱۔ ۲۳)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ضعیف سے فضائل اعمال میں باجماع محدثین رضی اللہ عنہم عمل کرنا جائز ہے تین شرطوں کے ساتھ (۱) شدید ضعیف نہ ہو (۲) کسی اصل عام کے تحت داخل ہو (۳) اس پر عمل کی سنت کا عقیدہ نہ رکھا جائے اور احکام پر عمل جائز ہے جبکہ اس میں احتیاط ہو۔ واللہ اعلم

ب۔ موضوع

سوال نمبر ۱۔ وباللہ التوفیق:

حدیث موضوع وہ ہے کہ جو کسی مطعون بالکذب راوی سے مروی ہو کہ جس میں رسول اللہ ﷺ پر عمداً یا خطاءً جھوٹی نسبت کی گئی ہو۔

فی مقدمة فتح الملہم: الموضوع ہو الحدیث المکذوب علی رسول اللہ ﷺ سواء کان عمدًا او خطًا (۱۴۷)۔

سوال نمبر ۲۔ وباللہ التوفیق: علماء کا اتفاق ہے کہ حدیث موضوع کا تذکرہ بغیر اس کی وضاحت کے جائز نہیں ہے اور اس سے احکام وقصص اور ترغیب و ترہیب میں عمل کرنا حرام ہے، نیز کسی حال میں بھی موضوع حدیث پر عمل جائز نہیں ہے اور نہ اس کی روایت کرنا جائز ہے

"فلا یجوز العمل بہ بحال ولا روایة الا اذا قرن ببیانه"۔

کسی حدیث میں واضع حدیث اور کذاب فی الحدیث راوی کے سند میں شامل ہو جانے سے وضع کا حکم لگانے میں درج ذیل تفصیل ہے:

۱۔ موضوع ہونا واضع کے اقرار سے ہو۔

۲۔ کسی قرینہ سے معلوم ہو جو راوی کے حال سے اخذ کیا جائے جیسے راوی کا جھوٹ میں بعض رؤساء کے ہوائے نفس کی اتباع۔

۳۔ کسی کذاب راوی کا درمیان سند میں آ جانا اور وہ ایسا کذاب ہے کہ یہ حدیث صرف اسی سے معروف ومشہور ہو اور کوئی اس راوی کا نہ موافق ہو اور نہ اس کا کوئی شاہد ہو۔

۴۔ راوی کی روایت مرویہ سے موضوع ہونا اخذ کیا جائے، جیسے اس کی حدیث کے الفاظ یا معانی کا رکیک ہونا۔

۵۔ اس حدیث کا بعض قرآن کریم یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا صریح عقل کے مخالف ہونا۔

۶۔ واضع حدیث نے اس کو گڑھ لیا ہو۔

۷۔ دوسرے کے کلام سے لے کر حدیث کہہ دیا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہو۔

۸۔ کوئی حدیث ضعیف الاسناد ہوتو واضع نے اس کے لیے اسناد صحیح جوڑ دیا ہوتا کہ اس کو رواج دے۔

۹۔ واضع نے گمراہ کرنے کے لیے وضع کیا ہو۔

۱۰۔ احتساب کے لیے وضع کیا ہو۔

۱۱۔ محض تعصب میں وضع کیا ہو۔

۱۲۔ نئی چیز لانے کے لیے وضع کیا ہو۔

۱۳۔ بعض رؤساء کے خواہش نفس کی اتباع کے لیے وضع کیا ہو۔

۱۴۔ وضع کرنا وہم وغلط ہو۔ واللہ اعلم (انہاء السکن، مقدمہ اعلاء السنن، ۹۔۱۰)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

سوال نمبر۔۱: وباللہ التوفیق:

حدیث کے متلقی بالقبول سے مراد یہ ہے کہ علماء مجتہدین نے اس حدیث کو عمل کے لیے قبول کیا ہے، اگر چہ اس کی اسناد صحیح نہیں ہے محدثین کے نزدیک، اور تلقی بالقبول کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی اس پر عمل کے ذریعہ سے ہوتا ہے، صرف علماء مجتہدینؒ کے قبول کرنے پر تلقی کا اطلاق ہوگا۔ واللہ اعلم

سوال نمبر۔۲: وباللہ التوفیق:

ایسی ضعیف حدیث پر صحیح حدیث کا حکم لگایا جاتا ہے اگر چہ اسناد صحیح نہ ہوتی، چنانچہ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے الاستذکار میں کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ سے منقول ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث: "البحر هو الطهور ماؤه" کو صحیح کہا ہے حالانکہ محدثین اس طرح کی اسناد کو صحیح نہیں کہتے، لیکن یہ حدیث میرے نزدیک صحیح ہے کیونکہ علماء کی اس کے ساتھ تلقی بالقبول ہے، اور قبول کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی اس پر عمل کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اسی لیے علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ علماء کے نزدیک اس پر عمل ہے، اس کی اصل کی قوت کو چاہتا ہے اگر چہ خصوصی طور پر یہ سند ضعیف ہے، اسی طرح امام سیوطی رحمہ اللہ نے تعقبات میں کہا ہے کہ حدیث ابن عباس: "من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد اتى بابا من الكبائر" کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے اور فرمایا ہے کہ ایک راوی حسین کی امام احمدؒ وغیرہ نے تضعیف کی ہے لیکن اس پر اہل علم کے نزدیک عمل ہے، تو اس سے اشارہ فرمایا کہ حدیث اہل علم کے قول سے قوی ہوگئی ہے، اور بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ حدیث کی صحت کی دلیل اہل علم کا اس کا قائل ہونا ہے، اگر چہ اس کی اسناد ایسی نہیں ہے کہ اس جیسی سند پر اعتماد کیا جائے، نیز اسی کتاب میں ہے کہ صلاۃ التسبیح کو جائز کہا ہے اور اس میں فضل وثواب کا ذکر فرمایا ہے، اور امام بیہقیؒ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کہا کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ یہ نماز پڑھتے تھے اور صلحاء نے اس نماز کو ایک دوسرے سے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، بناء بریں اس پر عمل کرنے میں حدیث مرفوع کو تقویت دینا ہے۔ واللہ اعلم

سوال نمبر۔۳:...... تلقی کی ایک صورت یہ ہے کہ علماء اس کو آپس میں روایت کرتے ہوں اور ایک یہ کہ اس کے موافق عمل ہوتا ہو۔ تو حکم کے اعتبار سے یہ دونوں صورتیں یکساں ہیں کیونکہ تلقی کبھی روایت سے ہوتی ہے اور کبھی اس پر عمل کے ذریعہ سے ہوتی ہے (انہاء السکن ۲۱۔۲۳)۔

حدیث ضعیف مؤید بقرائن

سوال نمبر۔۱: حدیث ضعیف منجبر سے مراد کثرت اسناد کی وجہ سے اس کا ضعف دور ہوجاتا ہے اور قوت آجاتی ہے، بنا بریں ایسی حدیثیں محدثینؒ کے نزدیک مقبول ہوتی ہیں (انہاء السکن، ۱۹۔۲۰)۔

سوال نمبر۔۲: فضائل کے علاوہ احکام ومسائل میں بھی ضعیف حدیثوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے جبکہ اس میں احتیاط ہو۔

فی انهاء السکن: قال السیوطی ویعمل به ایضا فی الاحکام: اذا کان فیه احتیاط وفی الاذکار: وأما الأحکام فلا یعمل فیها الا بالحدیث الصحیح او الحسن الا ان یکون فی احتیاط فی شئی من ذلک'' (انهاء السکن، ۱۵۔ ۲۱)۔

سوال نمبر۔ ۳: وہ امور جو حدیث کے ضعف کی تلافی کا ذریعہ بنتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سندوں کی کثرت۔

۲۔ ایک دوسری سند۔

۳۔ دو سندوں کا ہونا: کیونکہ دونوں تنہا ہوں تو حجت نہیں جیسے حدیث مرسل حجت ہے جبکہ دوسری سند سے وارد ہو جانے سے اس کا ضعف زائل ہو جائے گا اور حدیث حسن لذاتہ سے کم یعنی حسن لغیرہ ہو جائے گی۔

۴۔ سئ الحفظ راوی کی متابعت ہو جائے، کسی ایک ایسے معتبر راوی سے جو سئ الحفظ راوی سے بڑھ کر ہو اس کے مثل ہو اس سے کمتر نہ ہو، اسی طرح مختلط راوی اور مستور راوی اور اسناد مرسل اور مدلس راوی کی حدیث حسن ہو جاتی ہے لیکن لذاتہ نہیں بلکہ وہ متابع اور متابع کے مجموعہ کے اعتبار سے حسن لغیرہ ہوتی ہے کیونکہ دونوں راویوں میں احتمال صواب وغیر صواب برابر ہے (انہاء السکن، ۱۹۔ ۲۰)۔

سوال نمبر۔ ۴: تعدد طرق کے سلسلہ میں کثرت اسانید کا محض اعتبار ہے، اس سلسلہ میں کوئی متعین حد نہیں ہے ضعیف حدیث کے لیے محض ایک سے زائد سند سے مروی ہونا کافی ہے اگر چہ وہ دوسری سند ضعیف ہو اور اسی صحابی سے مروی ہو جس سے اصلی حدیث روایت کی جارہی ہے، یا کسی دوسرے صحابی سے مروی ہو اصل حدیث کا راوی ہونا ہی شرط نہیں ہے اور اس میں لفظ کی موافقت شرط نہیں ہے، ہاں مضمون ومعنی کی موافقت شرط ہے (حوالہ سابق)۔

سوال نمبر۔ ۵: تعدد طرق وغیرہ سے ہر قسم کی ضعیف حدیث کو فائدہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس میں تفصی اور اس بابت ضابطہ اور معیار ہے جس کو بیان کیا جارہا ہے: علامہ ظفر عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حدیث ضعیف اور مضعف کے مابین فرق ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف سے صرف فضائل میں استدلال کیا جاتا ہے اور تعدد طرق اسی ضعیف حدیث ہی کے لیے مفید ہوتا ہے اور حدیث مضعف سے احکام وفضائل دونوں میں استدلال کیا جاتا ہے تعدد طرق یہاں کچھ مفید نہیں ہوتا؛ کیونکہ یہ تو بغیر تعدد طرق کے بھی استدلال کے لیے کافی ہوتی ہے، چنانچہ علامہ قسطلانی رحمہ اللہ ارشاد الساری میں لکھتے ہیں کہ حدیث مضعف وہ ہے کہ جس کی تضعیف پر اجماع نہ ہو بلکہ مضعف حدیث کے متن یا سند میں بعض کی تضعیف ہوتی ہے اور بعض دوسرے کی تقویت ہوتی ہے یعنی بعض اسے ضعیف کہتے ہیں اور دوسرے بعض اسے قوی قرار دیتے ہیں، اور یہ ضعیف حدیث اعلیٰ ہوتی ہے اور صحیح بخاری میں بھی بعض حدیث مضعف ہیں لیکن ضعیف ایک بھی نہیں ہے، اور تدریب الراوی میں ہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے حدیث صحیح کی دس قسمیں بیان کی ہیں، پانچ کا صحیح ہونا متفق علیہ ہے اور پانچ کے بارے میں اختلاف ہے وہ پانچ مختلف فیہا یہ ہیں: (۱) حدیث مرسل (۲) احادیث مدلسین جبکہ سماع کا ذکر نہ کیا جائے (۳) حدیث کو ایک ثقہ راوی نے مسند بیان کیا ہے اور دوسرے ثقہ راویوں نے مرسل کیا ہے، (۴) غیر حافظ ثقہ راویوں کی مرویات (۵) سمجھدار بدعتیوں کی روایات، اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں اور اول یہ کہ صحیحین میں بھی بعض احادیث کے باب میں اختلاف ہے دوم یہ کہ مرسل اور مدلس کی روایت بغیر ذکر سماع کے اور مجہول العدالۃ راوی کی روایات ان کی صحت میں اختلاف ہے بعض نے صحیح کہا ہے اور بعض نے ضعیف کہا ہے تو یہ مضعف میں ہے نہ کہ ضعیف میں۔ (انہاء السکن، ۲۴)۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

سوال نمبر۔ ۱: ایسی ضعیف احادیث جن کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں کہ جن سے ضعف منجبر ہو جاتا ہے تو اس صورت میں احکام ومسائل کے علاوہ صرف فضائل میں ان کا اعتبار ہے، لیکن امام سیوطیؒ نے کہا ہے کہ ضعیف حدیث پر احکام میں بھی عمل کرنا جائز ہے جبکہ اس میں احتیاط ہو۔ یہ محدثین اصولیین کے نظریات ہیں اور ائمہ مجتہدینؒ کے نظریات یہ ہیں کہ مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال کرنا اس حدیث کو صحیح قرار دینا ہے،

اور ابوالحسن ابن الحصار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقیہ حدیث کو صحیح جانتا ہے اور وہ کتاب اللہ کی کسی آیت کے موافق ہو یا شریعت کے بعض اصول کے موافق ہو جبکہ اس کی سند میں کوئی کذاب راوی نہ ہو تو یہ فقیہ کو اس کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے پر ابھارتا ہے، بنابریں اس سے حدیث لغیرہ ہو جاتی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص میں کہا ہے: ایسے حدیث کے بارے میں امام بیہقی رحمہ اللہ نے کلام کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث سے امام احمدؒ اور ابن منذرؒ نے استدلال کیا ہے اور ان دونوں کا اس پر یقین کرنا اس کی دلیل ہے یہ حدیث ان دونوں کے نزدیک صحیح ہے، علامہ ظفر عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس طرح ہر مجتہد کا کسی حدیث پر یقین کرلینا دلیل ہے، حدیث اس کے نزدیک صحیح ہے، علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب محدث کوئی حدیث روایت کرے اور کوئی حافظ استدلال کرے تو دلوں میں یہ بات آئے گی کہ وہ صحیح ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس کی روایت کی ہے، علامہ ظفر عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ بنابریں ہر وہ حدیث جس کو امام محمد رحمہ اللہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ ذکر کریں اس سے استدلال کرتے ہوئے تو اس ضابطہ پر وہ حدیث صحیح ہے؛ کیونکہ یہ دونوں حضرات محدثین مجتہدین میں ہیں۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیث ضعیف جب مؤید بالقرینہ ہو تو صحیح ہو جاتی ہے۔(انہاء السکن/ص ۵)۔

سوال۔۲: امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ سے جو احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش منقول ہے تو ان حضرات کے کلام میں ضعیف کا مصداق وہ ضعیف لذاتہ ہے جس کو متاخرین اپنی اصطلاح میں حسن لغیرہ کہتے ہیں جبکہ وہ شواہد وغیرہ سے مؤید ہو جائے، جیسا کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ واللہ اعلم (انہاء السکن/ ۲۳)۔

سوال نمبر۔۳: احکام میں بھی ایسی ضعیف احادیث کا اعتبار ہے بشرطیکہ: (۱) اس کے کسی راوی کے متروک ہونے پر اجماع نہ ہو (۲) باب میں اس سے اقویٰ کوئی روایت نہ (۳) شدید ضعیف نہ ہو (۴) باب میں اس کے خلاف کوئی حدیث نہ ہو (۵) کسی صحابی کا قول اس کے خلاف نہ ہو (۶) اس کے خلاف اجماع نہ ہو۔ تو ایسی ضعیف حدیث پر عمل کرنا قیاس سے اولیٰ ہوگا اور اسی پر تمام رحمہم اللہ کی موافقت ہے کیونکہ تمام ائمہ رحمہم اللہ نے حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم رکھا ہے؛ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ حدیث قہقہہ پر نقض وضوء کے باب میں عمل کیا ہے باوجودیکہ وہ ضعیف ہے اور قیاس ورائے پر عمل کرنا اس کے مقابل میں چھوڑ دیا ہے اور مسافر کے لیے سفر میں پانی پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں نبیذ تمر کی حدیث پر عمل کیا ہے باوجودیکہ وہ ضعیف ہے اور اس کے مقابل میں قیاس ورائے کو چھوڑ دیا ہے، اور دس درہم سے کم کی چوری کرنے میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے روک دیا ہے ایک حدیث کی وجہ سے حالانکہ وہ حدیث ضعیف ہے، بلکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس پر مقدم رکھا جائے اور اسی طرح اکثر مدت حیض کی حدیث ہے باوجودیکہ وہ ضعیف ہے، لیکن اسی کو مقدم رکھا ہے، اور حدیث "لامهر اقل من عشرة دراهم" کو باوجود ضعیف ہونے کے قیاس پر مقدم رکھا ہے اور حدیث "جواز الصلوة بمكة فى وقت النهى" کو باوجود ضعیف ہونے کے قیاس پر مقدم رکھا ہے، اور امام مالکؒ نے حدیث مرسل ومنقطع اور بلاغات اور قول صحابی کو قیاس پر مقدم رکھا ہے اور امام احمدؒ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم (اعلام الموقعین)۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف سے استدلال واعتبار

سوال نمبر۔۱: فضائل کے باب میں ضعیف احادیث پر اعتماد درست ہے اس بابت حضرات محدثین اور اصولیین کے نظریات ملاحظہ ہوں، علامہ خفاجی اور ابن تیمیہ وغیرہ ضعیف حدیث کے اعتبار کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ عمل کا ثبوت تو احادیث صحیحہ سے ہوگا اور خاص اس فضیلت کا ثبوت احادیث ضعیفہ کے ذریعہ ہو تو ان احادیث ضعیفہ کا اس مسئلہ میں اعتبار نہیں ہے وہ اعمال وفضائل اعمال میں فرق کرتے ہیں جس کا حاصل "استحباب العمل يثبت بالحديث الصحيح والرجاء بخصوص ذالك الثواب يثبت بالحديث الضعيف" ابن تیمیہ نے امام احمدؒ کے قول "تساهلنا فى الأسانيد" کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: "ليس معناه اثبات الاستحباب بالحديث الذى لا يحتج به فان الاستحباب حكم شرعى فلا يثبت الا بدليل شرعى" پھر آگے چل کر فرمایا: "انما مراد هم بذلك ان

یکون العمل قد ثبت انه مما یحبه الله او مما یکره الله بنص او اجماع کتلاوة القرآن والتسبیح والدعاء والصدقة والعتق والاحسان الی الناس ونحو ذلك فاذا روی حدیث فی فضل الاعمال المستحبة وثوابها وکراهة بعض الاعمال وعقابها فمقادیر الثواب والعقاب وانواعه اذا روی فیها حدیث لا نعلم انه موضوع جازت روایته والعمل به، بمعنی ان النفس ترجو ذالك الثواب او تخاف ذلك العقاب" پھر کہتے ہیں: "فإذا تضمنت احادیث الفضائل الضعیفة تقدیرًا وتحدیدًا مثل صلوة فی وقت معین لقراءته معینة او علی صفة معینه لم یجز ذلك، لان استحباب هذا الوصف المعین لم یثبت بدلیل شرعی فاما تقدیر الثواب المروی فیه فلا یضر ثبوته ولا عدم ثبوته" (فتاویٰ ابن تیمیہ، ۱۸/ ۶۷)۔

لیکن ان حضرات کی اس بات کو علماء تسلیم نہیں کرتے ہیں ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: "الاستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع۔" امام نوویؒ فرماتے ہیں: "قال العلماء من المحدثین والفقهاء وغیرهم: یجوز ویستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترهیب بالحدیث الضعیف مالم یکن موضوعًا" نیز جیسے علامہ خفاجیؒ وابن تیمیہؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نفس عمل کا ثبوت حدیث صحیح سے ہو اور فضیلت کا ثبوت حدیث ضعیف سے ہو اگر یہ تسلیم کرلیں تو حافظ ابن حجرؒ نے جو شرط لگائی ہے کہ وہ حدیث کسی اصل کے تحت میں داخل ہو، یہ قید لگانا لغو اور بے فائدہ ہوگا، بلکہ جمہور علماء کا مذہب یہی ہے کہ کسی مخصوص شئی کا جواز یا استحباب اگرچہ کسی حدیث صحیح سے نہ ثابت ہو مگر اس سلسلہ میں کوئی ایسی ضعیف جس کا ضعف شدید نہ ہو اور کسی اصل شرعی کے تحت داخل ہو، دیگر اصول شرعیہ کے مناقض ومعارض نہ ہو تو ایسی حدیث ضعیف سے اس کا استحباب ثابت ہوگا، کسی چیز کا مستحب ہونا اور جائز اور مباح ہونا بھی تو حکم شرعی ہے تو جب حدیث ضعیف کا احکام میں اعتبار نہیں ہے تو استحباب وجواز میں کس طرح اعتبار کرلیا گیا، اس کا جواب علامہ دوانی نے دیا ہے کہ ایسا عمل جس میں کراہت وحرمت کا احتمال نہیں ہے تو وہ عمل فی نفسہ قواعد شرعیہ کی بناء پر جائز ہے اور وہ جائز عمل مستحب بھی ہوسکتا ہے اور غیر مستحب بھی، اس حدیث ضعیف کی وجہ سے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس پر عمل کرلیا جائے، ممکن ہے کہ وہ ثواب مذکورہ مل جائے۔ اگر وہ عمل ایسا ہے جس میں حرمت واستحباب دونوں کا احتمال ہے تو حدیث ضعیف کی بناء پر اس عمل کو مستحب نہیں کہا جاسکتا اور اسی طرح اس حدیث ضعیف سے اس کی حرمت کی نفی پر استدلال کیا جائے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے انتفاء حرمت جس سے اس کی اباحت لازم آئے گی یہ بھی ایک حکم شرعی ہے اور حدیث ضعیف سے کوئی حکم ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر وہ عمل کراہت واستحباب کے درمیان دائر ہے تو غور کرنا ہوگا کہ کون سا پہلو راجح ہے، اگر کراہت شدیدہ اور استحباب ضعیف ہے تو جانب ترک راجح ہوگی اور اگر استحباب قوی اور کراہت ضعیف ہے تو جانب استحباب راجح ہوگی اور اگر کراہت واستحباب دونوں برابر ہیں تو اس کو مستحب ہونا چاہئے، اس لیے کہ مباح بھی نیت سے عبادت بن جاتا ہے، تو جس میں استحباب کا شبہ ہو بدرجہ اولیٰ عبادت بن جائے گا، بہرحال حدیث ضعیف پر عمل اور اس کا استحباب مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، امام نوویؒ نے حدیث ضعیف سے جواز کی بات جو فرمائی ہے اس کا مقصد حدیث ضعیف سے اباحت کی تمہید کے طور پر ہے، اس تحقیق کی بناء پر دونوں قول کی عبارتیں الگ الگ ہیں مگر مفہوم ان کا ایک ہی ہوگا، تیسرا قول جو امام احمدؒ کی ایک روایت اور بقول ابن قیمؒ تمام فقہاء وائمہ کا قول ہے کہ ضعیف حدیث کا ہر اصناف حدیث میں حتیٰ کی احکامات میں بھی اعتبار ہے، نیز حافظ ابن حجرؒ نے اجماع نقل کیا ہے کہ جس حدیث ضعیف کا راوی کاذب یا متہم بالکذب یا جس کے اغلاط کی اکثریت ہو تو اس حدیث ضعیف کا اعتبار نہیں ہے (نعمت المنعم، ۱۱۲۔ ۱۱۴)۔

سوال نمبر۔۳: اس اعتماد واعتبار کے لیے شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ضعف شدید نہ ہو (۲) کسی اصل صحیح کے تحت داخل ہو (۳) اس سے عمل کی سنت کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ اعمال پر مرتب فضیلت وثواب حاصل کرنے کے لیے واللہ اعلم (انہاء السکن/ ۲۲)۔



احادیث ضعیفہ سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا ابوالحسن علی غفرلہ [۱]

احادیث ضعیفہ سے متعلق مباحث واحکام

الف۔(ا) حدیث ضعیف: وہ حدیث جس میں حدیث حسن کے شرائط نہ پائے جائیں۔

علامہ شہزوری اپنی کتاب مقدمہ ابن الصلاح میں لکھتے ہیں: "معرفة الضعيف من الحديث كل حديث لم يجتمع فيه صفات الحديث الصحيح ولا صفات الحديث الحسن المذكورات فيما تقدم فهو حديث ضعيف" (مقدمہ ابن الصلاح/ ۱۷)۔

حافظ جلال الدین سیوطی تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی میں امام نووی کی تعریف "ما لم يجتمع فيه صفة الصحيح او الحسن" پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام نووی نے ابن الصلاح کی تبعیت میں حسن وصحیح کو جمع فرمایا ہے، حالانکہ اگر وہ صرف حسن پر اکتفاء کرتے تو بہتر ہوتا، کیونکہ جس میں حسن کے صفات جمع نہ ہوں اس میں صحیح کے صفات بدرجہ اولی نہیں ہوں گے (تدریب الراوی/ص ا، ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی/ ۲۵۶، الخلاصہ للطیبی/ ۴۸، الموقظہ للذہبی/ ۳۳)۔

۲۔ضعف احادیث کے بنیادی اسباب

احادیث صحیح اور حسن کی طرح ضعیف کے بھی قوت وضعف کے اعتبار سے بہت سے مراتب ہیں، اصول حدیث میں ضعف اسباب کی قوت وضعف کے اعتبار سے بہت سی قسمیں مذکور ہیں، حافظ عراقی نے ۴۲ اقسام بیان کئے ہیں ان کے علاوہ دوسروں نے ۳۶ بھی ذکر کئے ہیں، قاضی شرف الدین مناوی نے ۲۹ اقسام ذکر کئے ہیں۔

حافظ سیوطی اس کی تفصیل ذکر کرنا چاہتے تھے لیکن ابن حجر کے اس قول کے بعد ارادہ ترک کردیا۔ "قال ان ذلك تعب ليس وراءه ارب" (تدریب، ا/ ۱۸۰)، مولانا عبدالحی لکھنوی نے ظفر الامانی میں اور ابن الصلاح نے مقدمہ میں ان اقسام کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے (ظفر الامانی/ ۲۵۸، مقدمہ ابن الصلاح مع التقیید/ ۶۳)، علماء اصولیین نے ان سب اقسام کا حاصل اصولی طور پر دو چیزوں کو ذکر کیا ہے اگرچہ ان کی عناوین واحکام کے اعتبار سے مختلف قسمیں بیان کی ہیں:

(ا) حدیث کی سند سے رواۃ کا ذکر ساقط ہو جانا، (۲) راوی پر دیانت وضبط کے لحاظ سے طعن کو ہونا، اول سقوط سند کے اعتبار سے مختلف قسمیں نکلتی ہیں، حافظ ابن حجر نے یہ ذکر کئے ہیں اس کے ضمن میں دوسری بھی قسمیں ذکر کئے ہیں ان سب کو ہم چھ ۶ شمار کر سکتے ہیں، پہلا معلق، دوسرا مرسل، تیسرا معضل، چوتھا منقطع، پانچواں مرسل خفی اور چھٹا مدلس (مدلس شیوخ، اسناد تسویہ، متعلقات مدلس (معنعن، مؤنن) (نزہۃ النظر/ ۴۸۔ ۵۴، تدریب، ا/ ۱۱۸، اعلاء مقدمہ، ا/ ۱۵۵، خلاصہ/ ۵۱)۔

ا۔معلق: "ما حذف من مبدأ اسناده واحد او اكثر" (ظفر الامانی/ ۲۴۱)۔

معلق کا حکم

اتصال سند نہ پائی جانے کی وجہ سے حدیث معلق مردود قرار پاتی ہے، کیونکہ راوی غیر مذکور کے احوال کا علم نہیں ہوتا، اگر راوی غیر مذکورہ کے حال کا کسی طرح

[۱] دار العلوم ماٹلی والا شہر بھروچ، گجرات، الہند۔

علم ہوجائے تو حدیث معلق بھی مقبول قرار دی جاتی ہے (لمحات فی اصول الحدیث/ ۲۸۲)۔

۲۔مرسل: "علی ما سقط ذکر الصحابي من اسناده فيقول التابعي قال رسول الله ﷺ" (الموقظہ/ ۳۸)۔

مرسل کا حکم

اصل یہ ہے کہ وہ ضعیف ومردود ہے، اتصال سند اور غیر مذکور راوی (جو ہوسکتا ہے کہ وہ غیر صحابی ہو) کے حال سے ناواقفیت کے سبب، لیکن اس پر عمل کے سلسلہ میں اختلاف ہے، وجہ یہ ہے کہ مرسل میں اکثر صحابی غیر مذکور ہوتے ہیں اور وہ سب عادل ہیں۔

جمہور محدثین واکثر اصولیین نے مذکورہ سبب سے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، البتہ ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور مشہور قول میں امام احمد اس کو قابل احتجاج مانتے ہیں، بشرطیکہ مرسل ثقہ ہو اور کسی معتمد ہی سے ارسال کرتا ہو خاص کر تابعی ثقہ ہو، اسی وجہ سے تابعین مراسیل پر نکیر نہیں کرتے ہیں۔

امام شافعی کے نزدیک چند شرطوں کے ساتھ مرسل مقبول ہے: (۱) مرسل اکابر تابعی سے ہو۔ (۲) اور جب غیر مذکور کا نام لیا جائے تو ثقہ ہی کا نام لیا جائے۔ (۳) معتمد حفاظ حدیث کے درمیان اس کی روایت کرنے میں مخالفت نہ پائی جاتی ہو۔ (۴) کسی دوسرے طریق وسند سے متصلاً مروی ہو یا مرسلاً مروی ہو، مگر مرسل اور اس کے اساتذہ ورواۃ سند پہلی مرسل کے رواۃ سے الگ ہوں۔ (۵) کسی صحابی کے قول کے موافق ہو یا اکثر اہل علم اس کے مضمون کے مطابق فتویٰ دیتے ہوں، اگر یہ شرطیں پائی گئیں تو پھر حدیث مرسل اور اس کی مؤید حدیث دونوں صحیح قرار دی جائے گی اور اگر ایک طریق وسند سے مروی صحیح روایت اس کے مخالف ہو اور ان تینوں رواتوں کے درمیان جمع کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو مرسل دو سندوں سے مروی ہونے کی وجہ سے راجح قرار دی جائے گی۔ (تدریب،۱/ ۱۹۵۔۱۹۹، نزہۃ/ ۵۰، الرسالہ/ ۴۶۱)۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ عندالاحناف مرسل کی روایت اگر کسی تابعی یا تبع تابعی کی ہو تو مطلقاً قبول ہے اور اگر تبع تابعین کے بعد کے لوگوں کی ہو تو ثقہ راوی کی مطلقاً اور دوسروں کی تحقیق واعتماد کے بعد ہی قابل قبول ہے (اعلاء السنن،۱/ ۸۵، فواتح الرحموت،۲/ ۱۷۴،۱۷۴، شامی/ ۶۶)۔

معضل

"هو ما سقط من اسناده اثنان فصاعدا" (ظفر الامانی/ ۳۵۵، اعلاء،۱/ ۲۸، خلاصہ/ ۶۸)، یہ حدیث ضعیف شمار ہوتی ہے اور بالاتفاق مرسل و منقطع سے زیادہ بدتر سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس میں غیر مذکور راوی زیادہ ہوتے ہیں (ظفر الامانی/ ۳۵۶)۔

منقطع

"ما حذف من وسط اسناده واحد" (اعلاء السنن،۱/ ۲۷، ظفر الامانی/ ۳۵۴، الموقظہ/ ۴۰، خلاصہ/ ۶۶)۔

منقطع روایت راوی غیر مذکور کا حال معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بالاتفاق ضعیف قرار پاتی ہے۔

مدلس

"ما كان وجود السقط في اسناده خفيا" (اعلاء السنن،۱/ ۲۸)، "وفي الموقظة: ما رواه الرجل عن آخر ولم يسمعه منه او لم يدركه" (ص ۴۷، خلاصہ ص ۷۱)۔

مدلس کے دو اقسام ہیں (۱) مدلس الاسناد (۲) مدلس الشیوخ اور پھر مدلس الاسناد کی پانچ صورتیں ہیں، سب سے اہم مدلس التسویہ ہے، یہ احادیث ضعیفہ کی اہم اقسام میں سے ہے، محدثین نے اس کو نہایت درجہ کا مکروہ قرار دیا ہے (اعلاء،۱/ ۲۸، ظفر الامانی/ ۳۷۷، تدریب،۱/ ۳۹۰)۔ مدلس الشیوخ اس کی کراہت پہلی قسم سے کم ہے، کیونکہ اس میں کسی راوی کا سقط نہیں ہوتا ہے، راوی کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے سننے والے کو دشواری ہوتی ہے، اور ایسا کرنے والے لوگوں کے اغراض مختلف ہونے کی وجہ سے اس کی کراہت بھی مختلف ہوتی ہے (ظفر الامانی/ ۳۹۱، الموقظہ/ ۴۵)۔

حدیث مدلس کا حکم

مدلس کو قبول کرنے کے سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے، صحیح قول یہ ہے کہ اگر سماع کی صراحت کردی جائے تو حدیث مقبول ہوگی اور اگر سماع کی تصریح نہ

کرے اور محتمل الفاظ ذکر کرے تو وہ مقبول نہیں ہوگی۔

کچھ حضرات نے کہا ہے کہ ثقات سے تدلیس کرنے والے معتمد رواۃ کی روایت مقبول ہوگی اور غیر ثقات سے تدلیس کرنے والا جب تک براہ راست سننے کی تصریح نہ کرے اس کی حدیث مقبول نہیں ہوگی۔ (اعلاء السنن، ۱/ ۶۸ ظفر الامانی/ ۳۸۹)۔

مرسل خفی

"ما یرویه معاصر لم یلق من حدث عنه" (اعلاء السنن، ۱/ ۲۹)، یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں انقطاع ہوتا ہے۔

معنعن

هو ما یقال فی سنده فلان عن فلان، والصحیح انه متصل اذا امکن اللقاء مع البرائة عن التدلیس وقد اودع فی الصحیحین" (اعلاء، ۱/ ۲۷، ظفر الامانی/ ۲۲۵، خلاصه/ ۵۰، الموقظه/ ۴۴)۔

اس حدیث کو متصل یا منقطع شمار کرنے کے سلسلہ میں دو قول منقول ہیں:

۱۔ صحیح معمول بہ قول جمہور فقہاء ومحدثین کا یہ ہے کہ چند شرائط کے ساتھ اس کو متصل شمار کیا جائے گا بشرطیکہ "عن" کے ذریعہ روایت کرنے والا مدلس نہ ہو، جن دو راویوں کے درمیان لفظ "عن" آرہا ہو ان کے درمیان ملاقات کا امکان زماناً پایا جاتا ہو، کما قال الامام مسلم (فتح الباری مقدمہ، ۱/ ۸، اعلاء/ ۷/ ۲، ظفر الامانی/ ۲۳۶)۔

مؤنن

"الذی یقال فی اسناده حدثنا فلان ان فلانا قال کذا" (لمحات فی اصول الحدیث/ ۲۸۵)، اس حدیث کے سلسلہ میں امام احمد اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جب تک اتصال ثابت نہ ہو اس کو منقطع قرار دیں گے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ "أن" "عن" کے مانند ہے، ایسی حدیث کو سماع پر محمول کیا جائے گا، جبکہ معنعن کے لیے ذکر کردہ شرائط پائے جائیں۔ (تدریب، ۱/ ۷/ ۲۱، لمحات فی اصول الحدیث/ ۲۸۶)۔

۲۔ راوی میں طعن کے اعتبار سے ضعف حدیث کے اقسام

طعن کے اسباب مجموعی لحاظ سے دس ۱۰ ہیں: (۱) کذب۔ (۲) تہمت کذب۔ (۳) فسق۔ (۴) بدعت۔ (۵) جہالت ان پانچوں چیزوں کا تعلق راوی کی عدالت سے ہے اور اسی طرح راوی کے ضبط کے متعلقات بھی پانچ ہیں (۱) زبانی اغلاط (۲) سوء حفظ (۳) غفلت (۴) کثرت وہم (۵) مخالفت ثقات۔

عدالت کے اعتبار سے پانچوں چیزوں کو بالترتیب ان پانچ عنوانوں سے تعبیر کیا جاتا ہے: (۱) کذب کو موضوع (۲) تہمت کذب کو متروک (۳) فسق کو منکر (۴) بدعت کو مردود (۵) جہالت کو مجہول (اگرچہ محدثین کے اصطلاح میں فسق وبدعت پر مشتمل حدیث کو بھی مردود کہتے ہیں)۔

۱۔ موضوع: طعن راوی میں کذب پر مشتمل روایت کو موضوع کہا جاتا ہے، اس کی تفصیل گذر چکی۔

۲۔ منکر: طعن راوی کے اسباب میں سے کثرت اغلاط، شدت غفلت اور فسق میں سے کسی ایک پر وہ روایت مبنی ہو۔

مخالفت ثقات کے اعتبار سے بھی منکر کی تعریف کی گئی ہے، ان شاء اللہ وہاں اس کا حکم بیان کیا جائے گا۔

۳۔ معلل: راوی پر وہم کے سبب سے لگنے والے طعن والی حدیث کو معلل کہتے ہیں، حدیث معلل میں جن عیوب کا اعتبار کرکے اس کو عیب والا قرار دیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ غموض وخفاء ہو۔ (۲) صحت حدیث پر اثر انداز ہو، یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں (ظفر الامانی/ ۳۶۳)۔

راوی پر طعن کا ایک سبب مخالفت ثقات ہے، اس مخالفت کی مختلف صورتیں ہیں، محدثین نے اس کے تحت سات اقسام ذکر کئے ہیں:

۱۔ مدرج، ۲۔ مقلوب، ۳۔ المزید فی الاسناد، ۴۔ مضطرب، ۵۔ مصحف ومحرف، ۶۔ شاذ، ۷۔ منکر۔

۲۔مقلوب:...... "هو ما رواه الشيخ يا سناده لم يكن كذلك فينقلب عليه وينط من اسناد حديث الى متن آخر بعده او ينقلب عليه اسم راو" (الموقظ/۶۰،خلاصہ/ ۷۳،التقیید/۱۳۱)۔

قلب کا حکم:......قلب کا حکم اس کے اسباب پر موقوف ہے، اگر قلب اغراب یعنی اپنا علمی تفوق ظاہر کرنے کی غرض سے ہے تو اس کے عدم جواز میں کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ قصداً یہ عمل تقدیم وتاخیر وضاعین کیا کرتے ہیں اور ایسی احادیث احادیث موضوعہ شمار ہوتی ہیں۔

اگر قلب خطاء ونسیان کی وجہ سے ہو تو وہ معذور ہوگا، البتہ کثرت سے ایسا کرنے والا اضبط میں مجروح ہوگا اور وہ روایت ضعیف قرار دی جائے گی (تدریب/۲۹۱۔۲۹۴)۔

المزید فی متصل الاسانید:......یہ حدیث وہم کی بنیاد پر مردود ہے بشرطیکہ زیادتی نہ کرنے والے سے اتقان وپختگی میں فائق ہو، یا زیادتی کی جگہ دوسرے طریق میں راوی نے سماع کی تصریح کردیا ہو، اگر یہ دونوں یا کوئی ایک بھی نہ پائی جائے تو زیادتی راجح ومقبول قرار پاتی ہے (التقیید/۲۸۰)۔

مضطرب:......اضطراب راوی کے ضبط کی کمزوری یا عدم ضبط پر دال ہے، اسی وجہ سے مضطرب روایت ضعیف ومردود شمار ہوتی ہے اور حدیث مضطرب کی بھی مختلف قسمیں ہیں (التقیید/ ۱۲۲، الموقظۃ/۵۱،خلاصہ/ ۷۳)۔

شاذ ومنکر:......شاذ ومنکر مردود ہیں، کچھ محدثین نے اس کی اقسام وشرائط بھی ذکر کئے ہیں۔ (ظفر الامانی/ ۳۵۹)۔

ثقات کی زیادتی:......۱۔متن کی زیادتی اگر وہ دوسرے ثقات یا اوثق کی روایت کے منافی ومعارض ہو تو مردود ہے، ۲۔اور اگر منافی ومعارض نہیں ہے، تو یہ زیادتی ثقہ کی مستقل روایت کے درجہ میں مقبول ہے۔ ۳۔اگر وہ زیادتی بعض وجوہ سے منافی ہو تو اس زیادتی کے ذریعہ کبھی عام کی تخصیص اور کبھی مطلق کی تقیید ہوتی ہے، امام مالک وامام شافعی کے نزدیک یہ زیادتی بھی مقبول ہے اور احناف کے نزدیک بھی کچھ تفصیل کے ساتھ مقبول ہے (تدریب الراوی، ۱/ ۲۴۵۔ ۲۴۷،فواتح الرحموت، ۲/ ۱۷۲،نزھۃ/۳۹)۔

سند میں زیادتی کے سلسلہ میں چار اقوال ہیں (۱) اکثر رواۃ کا اعتبار ہوگا۔ (۲) احفظ رواۃ کا اعتبار ہوگا۔ (۳) اکثر محدثین کا مذہب یہ ہے کہ زیادتی قبول نہ ہوگی۔ (۴) جمہور فقہاء واصولیین کے نزدیک زیادتی مقبول ہے (الکفایہ/ ۴۰۹،النکت علی مقدمہ ابن الصلاح، ۲/ ۶۹۰)۔

جہالت:......جہالت کی طعن والی حدیث کو مجہول کہتے ہیں۔

مجہول العین ومستور کی روایت جمہور کے نزدیک مردود ہے، حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک مجہول العین کی روایت اس صورت میں غیر مقبول ہوگی جبکہ سلف نے اس کو مردود قرار دیا ہو۔

بدعت:......بدعت مکفرہ رواہت کے رد کا باعث ہوتی ہے، اور بدعت مفسقہ کے ساتھ متصف راوی کی روایت دو شرطوں کے ساتھ مقبول ہوتی ہے، اول یہ کہ وہ بدعت کا داعی نہ ہو، دوم یہ کہ وہ اپنی بدعت کی مؤید کسی چیز کی روایت نہ کرے (اعلاء السنن/ ۱۳۸۔۱۴۱)۔

سوء حفظ:......یہ راوی پر طعن کا سبب ہے، اگر سوء حفظ راوی کی زندگی کے آغاز ہی سے لاحق ہو تو وہ مردود ہے، اور اگر آغاز زندگی سے نہ ہو بلکہ بعد میں لاحق ہوا ہو تو اس کیفیت کے پیش آنے سے پہلے کی تمام روایات مقبول ہوں گی اور بعد کی مردود، اور جن روایات کے متعلق یہ معلوم نہ ہوسکے کہ وہ سوء حفظ سے پہلے کی ہے یا بعد کی تو ان میں توقف کیا جائے گا (تدریب الراوی، ۲/ ۲۷۳،نزھۃ/۵۶)۔

۳۔حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم

اگر ضعیف حدیث موضوع نہ ہو تو ضعف کے بیان کئے بغیر اس کی روایت اور اس کی اسانید کے حق میں تساہل دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

(۱) عقائد مثلاً صفات باری سے اس کا تعلق نہ ہو۔

(۲) حلال وحرام سے متعلق نہ ہو، اگر موضوع ہو تو وضع کی تصریح کے بغیر اس کی روایت جائز نہیں ہے (مختصر الجرجانی مع ظفر الامانی/ ۲۰۹، ۲۲۲)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مزید شرطوں کا اضافہ کیا ہے، جس کا ذکر فضائل کے باب میں گفتگو کرتے وقت کیا جائے گا۔

ب۔ موضوع: راوی پر طعن کا بڑا اسبب کذب بیانی ہے اس پر مشتمل روایت کو موضوع کہتے ہیں (ظفر الامانی/ ۱۲۴، التقیید/ ۱۲۸، الموقظہ/ ۳۶، خلاصہ/ ۴۸، ۳۰۵، ابن الصلاح/ ۳۸)۔

حدیث موضوع کا حکم: علماء کا اتفاق ہے کہ جس حدیث کی وضع کا علم ہو اس کو وضع کی تصریح کئے بغیر روایت کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ ایسا کسی بھی مضمون کا نقل کرنا بھی بغیر تصریح کے جائز نہیں ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مسئلہ سے ہو، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی بات کی میری طرف نسبت کو جھوٹ جانتے ہوئے نقل کرے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے، بعض صوفیہ ترغیب کو اور فرقہ کرامیہ اس کے ساتھ ترہیب کے جواز کے قائل ہوئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ کے الفاظ بعض روایات میں ایسے ہیں جن سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ممانعت اس مضمون کے حق میں ہے جو مخالفت ونقصان پر مبنی ہو، اور جو موافقت ومصلحت پر مبنی ہو اس کے حق میں ممانعت نہیں ہے، لیکن یہ قول جمہور علماء ومحدثین کے خلاف ہے، بلکہ امام الحرمین علامہ جوینی تو واضع حدیث کو کافر قرار دیتے ہیں، یہ جرم اتنا قبیح ہے کہ ایک مرتبہ بھی کسی کے بارے میں اس کا علم ہو جائے تو اس کی پوری زندگی کی کوئی روایت مقبول نہ ہوگی، حتی کہ اگر وہ توبہ بھی کرلے تو بھی اس کی روایت مقبول نہ ہوگی (مقدمہ مشکوۃ شریف/ ۵، ظفر الامانی/ ۴۴۳، لمحات فی اصول الحدیث/ ۳۱۶، تدریب الراوی، ۱/ ۲۸۳، التقیید/ ۱۲۹)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

علامہ سیوطیؒ حدیث مقبول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو علمائے کرام نے قبول کرلیا ہو خواہ اس کی سند صحیح نہ ہو، اس کو حدیث ضعیف متلقی بالقبول کہتے ہیں جیسے "الدینار اربعة وعشرون قیراطا"۔

۲۔ یا جو حدیث ائمہ کرام کے یہاں مشہور ہوگئی ہو اور اس پر ان کی طرف سے نکیر نہیں کی گئی ہو، جیسے حدیث "لا وصیة لوارث" (التعلیقات الحافلہ مع الاجوبہ/ ۲۳۱)۔

۳۔ یا وہ حدیث جو کتاب اللہ کی کسی آیت یا بعض اصول شرعیہ کے موافق ہو اور اس کی سند میں کوئی کذاب نہ ہو (التعقبات علی الموضوعات/ ۱۲، بحوالہ الاجوبۃ الفاضلہ/ ۲۲۹، اعلاء السنن، ۱/ ۴۰)۔

اور تدریب ص ۲۴ پر ہے کہ جس حدیث کو تلقی بالقبول ہو جائے اس پر صحت کا حکم لگا دیا جائے گا، چاہے اس کی سند صحیح نہ ہو، اعلاء السنن، ۱/ ۴۰ میں بھی ایسا ہی کہا گیا ہے، علامہ ابن عبدالبر نے امام ترمذی کا قول نقل کیا ہے کہ "ھو الطھور ماؤہ" کو امام بخاری نے صحیح قرار دیا ہے؛ کیونکہ علماء نے اس کو قبول کیا ہے (الاجوبۃ الفاضلہ/ ۲۲۹، اعلاء، ۱/ ۴۰)۔

امام مالک فرماتے ہیں: "شھرۃ الحدیث بالمدینة تغنی عن صحة سندہ"۔

حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ ضعیف روایت کو جب تلقی بالقبول حاصل ہو جائے تو اس پر عمل کیا جائے گا، بلکہ وہ متواتر کے درجہ میں شمار ہوگی کہ اس سے مقطوع کا نسخ ہوگا، چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث "لا وصیة لوارث" کو اہل حدیث ثابت نہیں مانتے ہیں، لیکن علماء نے تلقی بالقبول کرتے ہوئے اس پر عمل کیا ہے حتی کہ اس کو آیت وصیت کے لیے ناسخ بھی مانا ہے (التعلیقات مع الاجوبہ/ ۲۳۲، الاجوبہ/ ۵۲)۔

محدثین نے اس سلسلہ میں بہت سی روایات کو تلقی بالقبول کے مثال میں پیش کئے ہیں۔

علامہ کشمیری ابن قطان کی بحث (کہ حدیث ضعیف پر جب اجماع منعقد ہو جائے تو کیا وہ صحیح ہوگی یا نہیں) پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض محدثین اس کے قائل ہیں کہ اگر حدیث کی تائید عمل کے ذریعہ ہو جائے تو وہ اس کو ضعف کے درجہ سے نکال کر مرتبہ قبولیت پر پہنچا دیتا ہے، "وھو الأوجه عندی" مولانا بدر عالم میرٹھی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کوئی اس سے یہ نہ سمجھے کہ امام العصر کے نزدیک اسناد کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، "کیف ولولاہ لقال من شاء ماشاء" بلکہ آپ کے فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ جب حدیث قرائن سے صحت کو پہنچ جائے اور اس پر عمل بھی ہونے لگے تو ایسی روایت کو محض راوی کے ضعف کی بنیاد پر رد کرنا پسندیدہ نہیں ہے، جبکہ عمل کا تسلسل محدثین کے نزدیک اس کے ثبوت کے لیے قوی شاہد ہے۔

۲۔ تلقی بالقبول والی روایت کا حکم اور اس پر عمل کی گنجائش

محدثین وفقہاء کرام نے تلقی بالقبول کی شرائط پائی جانے والی روایت کو احکام شرعیہ کے لیے بھی قابل حجت مانا ہے، ماقبل میں امام ترمذی کا "طلاق

الامة ثنتان وعدتها حيضتان "والی روایت کوضعیف قرار دینے کے باوجود کہ حدیث غریب ہے، اہل علم اور صحابہ کرام کا اس پر عمل کرنے کا ذکر آچکا ہے، اور دارقطنی میں حضرت قاسم وسالم سے مروی ہے کہ اس پر مسلمانوں کا عمل ہے" شیخ ابراہیم المالکی شرح اربعین للنووی میں فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف کو احکام کے باب میں اس وقت تک معتبر نہیں مانا جائے گا جب تک اس کو تلقی بالقبول حاصل نہ ہو، اگر اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو جائے تو احکام وغیرہ میں اس کو قابل صحت قرار دیا جائے گا (التعلیقات الحافلۃ مع الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۲۳۳)۔

مولانا عبدالحیؒ اس کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حدیث "لا وصية لوارث "مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے، امام ترمذی اور امام حافظ ابن حجر نے اس کے سند پر کلام کیا ہے، لیکن مجموعہ کے اعتبار سے حدیث کی اصلیت کو ثابت کیا ہے، ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام شافعی اس کے متن کو متواتر مانتے ہیں۔

۳۔ علماء کی آپسی روایت اور اس پر عمل، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے؛ کیونکہ محدثین واصولیین کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپس میں اس روایت کو نقل کرتے ہیں جس کو تلقی بالقبول حاصل ہو، اور محدثین کے نزدیک قبول کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اہل علم اس پر عمل کرتے ہوں، تو دونوں میں فرق نہیں ہے، ماقبل میں اعلاء کے حوالہ سے تلقی بالقبول کی دوقسمیں قول وعمل کا ذکر (ابن ہمام کی عبارت) میں آچکا ہے۔

ا۔حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

حدیث ضعیف منجبر: حدیث ضعیف منجبر کی کوئی تعیین اور ضابطہ مقرر نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ یہ جائز ہے یا نہیں، حافظ ابن حجر اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ قبول ورد دونوں طرف کے احتمال کو دیکھا جائے، اگر مساوی ہو تو انجبار کی صلاحیت ہوگی اور اگر رد کا جانب قوی ہے تو وہ جابر نہیں ہوگی (النکت علی ابن الصلاح، ۱/ ۴۰۹)۔

ابن الصلاح نے ضعف کی دوقسمیں بیان کی ہیں: (۱) اس کا ضعف زائل ہو جاتا ہو جبکہ اس کے لیے کوئی متابع یا شاہد جابر ہو (۲) اس کا ضعف زائل نہ ہوتا ہو، شدت ضعف اور روایت کے عدم جابر ہونے کی وجہ سے (ابن الصلاح مع التقیید/ ۵۲)۔

علامہ جرجانی فرماتے ہیں: "واما الضعيف فلكذب راويه وفسقه لا ينجبر لتعدد طرقه" مولانا عبدالحیؒ لکھنوی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ علامہ جرجانی حدیث حسن وضعیف منجبر اور حدیث غیر منجبر کے درمیان فرق بیان کرتے ہیں کہ راوی کے فسق وکذب کی وجہ سے انجبار نہیں ہوگا، مولانا لکھنوی نے احناف وعلمائے حدیث کی یہ عبارت "ضعیف کا انجبار متعدد طرق سے ہوجاتا ہے" کو نقل کرنے کے بعد اس پر جو اعتراضات ہوئے ہیں اس کا جواب دیا ہے۔

۲۔فضائل کے علاوہ مسائل میں اعتماد

ضعیف منجبر میں ضعف کی کمی ہوتی ہے، لہٰذا مسائل واحکام میں بھی اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، درمختار میں حدیث ضعیف پر عمل کی شرطوں میں لکھا ہے کہ (۱) اس کا ضعف شدید نہ ہو (۲) اصل عام کے ماتحت ہو (۳) اس کی سنت کا اعتقاد نہ کیا جائے۔

علامہ شامی شدید الضعف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے طرق میں سے کوئی بھی طریق کذاب یا متہم بالکذب سے خالی نہ ہو۔ (اعلاء السنن، ۱/ ۸۵)۔

احناف وحنابلہ کی طرف سے جس ضعیف حدیث کا اعتبار کیا گیا ہے، اس سے مراد ایسی حدیث ہے جو شدید الضعف نہ ہو، کیونکہ شدید الضعف کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے کسی حکم کا ثبوت ہوگا۔

علامہ ابن تیمیہؒ کا کلام نقل کرتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ علماء احناف کے کلام میں بھی ضعیف سے مراد وہی ضعیف ہے جس کو متاخرین نے ضعیف فی ذاتی حسن لغیرہ (شواہد) کہا ہے، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں احناف کی ضعیف روایات سے ثابت شدہ بہت سے احکام شرعیہ والی روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ تمام روایات وہ ہیں جن کو سلف ضعیف اور متاخرین حسن سے تعبیر کرتے ہیں:

"وليس المراد بالحديث الضعيف فى اصطلاح السلف هو الضعيف فى اصطلاح المتأخرين بل ما يسميه المتاخرون حسنا قد يسميه المتقدمون ضعيفا"

مولانا ظفر احمد فرماتے ہیں کہ وہ تمام روایات جن کو علامہ ابن قیم نے (الوضوء بنبیذ التمر. ومنع قطع ید السارق یسرقه اقل من عشرة دراهم) ضعف کی مثال میں پیش کیا ہے اور جس کو امام ابوحنیفہ نے قیاس پر مقدم کیا ہے، اگر آپ اس پر غور کریں گے تو ان سب کو حسن پائیں گے، یا تو حسن لذاتہ یا حسن لغیرہ اس کی مزید تفصیل وتحقیق اعلاء السنن میں موجود ہے۔ (اعلاء السنن، ۱/۶۷)۔

۳۔ ضعف کے تلافی کے ذرائع

ماقبل میں ضعیف کی تعریف، اقسام واحکام کے ضمن میں یہ تفصیلات گذر چکی ہے کہ کب ان کا اعتبار ہوسکتا ہے اور بعض قرائن کا ذکر بھی آچکا ہے جن کی بناء پر احادیث ضعیفہ بھی احادیث مقبولہ کے قریب ہوجاتی ہیں، حدیث ضعیف پر عمل کی شرطیں بھی اس سلسلہ میں رہنمائی کرتی ہیں، اسی طرح تلقی بالقبول کی شرائط بھی ضعف کی تلافی کردیتی ہے، اسی طرح تعدد طرق سے بھی حدیث ضعیف کو تقویت پہنچتی ہے اور حدیث ضعیف کو حسن لغیرہ بنادیتی ہے، البتہ یہ حکم ہر حدیث ضعیف کے بارے میں نہیں ہے۔

اسی طرح مجہول العین کی روایت جب متعدد طرق سے مروی ہوتو وہ مردود کے مرتبہ سے ترقی کرکے ان احادیث ضعیفہ کے مرحلہ میں پہنچ جاتی ہے جن پر فضائل اعمال کے حق میں عمل کرنا جائز ہے۔

فاسق یا جھوٹے کی متابعت اگر اسی جیسے لوگوں سے تعدد طرق کی وجہ سے ہوتو مجموعہ منکر اور بے اصل ہونے کی حد سے نکل کر مستور یعنی مجہول الحال اور سئی الحفظ کی روایت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے (تدریب، ۱/۱۷۶)۔

۴۔ تعدد طرق کا اعتبار

ماقبل میں جرجانی کی عبارت "واما الضعف فلکذب راویه او فسقه لا ینجبر بتعدد طرقه" کی تشریح اور احناف ومحدثین پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے تعدد طرق کی مختلف اقسام بیان کی جاچکی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مطلق تعدد طرق قابل اعتبار نہیں ہے، بلکہ راوی کے اعتبار سے معتبر ہے (اعلاء، ۱/۴۹)۔

تدریب میں ہے کہ راوی کے فسق وکذب کی وجہ سے آنے والا ضعف دوسرے اسی قسم کے راوی کی موافقت سے زائل نہیں ہوگا، کیونکہ ضعف قوی ہے اور یہ جابر نہیں ہوسکتا ہے، البتہ مجموعی طرق سے وہ روایت منکر اور بے اصل ہونے سے ترقی کرجائے گی، بلکہ بسا اوقات کثرت طرق کی وجہ سے وہ مستور اور سئی الحفظ کی روایت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے اور جب اس کے دوسرے طرق پائے جائیں، جو ضعف میں اسی کے قریب ہوں، تو ان کا مجموعہ درجہ حسن تک ترقی کرجاتا ہے۔

حافظ ابن کثیر ابن الصلاح کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ حدیث کا متعدد طرق سے وارد ہونا اس کے حسن ہونے کو مستلزم نہیں ہے، کیونکہ مختلف درجات ہیں، ان میں سے کچھ وہ ہیں جو متابعات سے بھی زائل نہیں ہوتے ہیں، اور بعض ایسے ضعف ہیں جو متابعت سے زائل ہوجاتے ہیں۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

حدیث ضعیف پر عمل کے متعلق اختلاف ہے، عام محدثین فضائل اعمال اور مواقع احتیاط میں یعنی مستحبات ومکروہات کے سلسلہ میں ضعیف پر عمل کے قائل ہیں، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو، یعنی کوئی راوی کسی طرق میں بھی کذب یا متہم بالکذب نہ ہو، (۲) حدیث کسی اصل شرعی کے موافق ہو، (۳) عمل وجوب اور حدیث کے قطعی ثبوت کی بنیاد پر نہ ہو۔

اسی طرح محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث اگر موضوع نہیں ہے تو صفت کو بیان کئے بغیر اس کی روایت اور اسانید میں تساہل دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے، اول عقائد مثلاً صفات باری سے اس کا تعلق نہ ہو، دوم حلال وحرام سے متعلق نہ ہو، یعنی مواعظ، ترغیب وترہیب اور قصص سے اس کا تعلق ہو۔ (ظفر الامانی/ ۲۲۳، تدریب الراوی، ۱/ ۲۹۸)۔

۲۔ احکام کے باب میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ سے ضعیف کا جو اعتبار منقول ہے، علامہ ابن تیمیہ وابن حزم وغیرہ نے امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح حاصل ہوگی، امام احمد بغیر تفصیل کے اس کے قائل ہیں یا زیادہ سے زیادہ شدید ضعف اور تعارض سے خالی ہونے کی شرط لگاتے

ہیں، احناف مزید اور شرطیں بھی لگاتے ہیں، جن کا ذکر علامہ ابن ہمام اور علامہ شامی نیز مولانا ظفر احمد و علامہ عبدالفتاح ابوغدہ کے حوالہ سے آچکا ہے، علامہ ابن تیمیہ، ابن قیم نے امام ابوحنیفہؒ کے حدیث ضعیف کے مصداق کو بھی واضح کیا ہے اور اس کا ذکر ماقبل میں اعلام الموقعین کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔

احکام اور غیر احکام دونوں میں سند کی ضرورت ہے، البتہ احکام کے سلسلہ میں شدت برتی جاتی ہے اور غیر احکام میں ضعف سند والی روایت بھی ان کے شرطوں کے ساتھ قبول کرلی جاتی ہے، چنانچہ امام احمد کا قول ہے کہ جب ہم حلال وحرام کے بارے میں روایت کو ذکر کریں گے تو شدت اختیار کریں گے، اور فضائل اعمال کے باب میں تساہل اختیار کریں گے۔ (الاجوبۃ الفاضلۃ/۳۶)۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ہمارا قول "الحديث الضعيف خير من الرأى" سے مراد حدیث ضعیف متروک نہیں ہے بلکہ اس سے حسن مراد ہے، امام ترمذی سے پہلے اصطلاح میں حدیث کے صرف دو ہی اقسام تھے (۱) صحیح (۲) ضعیف، اور ضعیف کی دو قسمیں تھیں (۱) ضعیف متروک (۲) ضعیف غیر متروک، اور ائمہ حدیث نے اسی اصطلاح سے کام لیا ہے اور بعد کے وہ لوگ جو صرف امام ترمذی کے اصطلاح ہی سے واقف تھے جب انہوں نے یہ مقولہ سنا، یعنی "الحديث الضعيف احب الى من القياس" تو وہ یہ سمجھے کہ اس سے مراد وہ ضعیف ہے جس کو امام ترمذی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اگرچہ علامہ کشمیری نے ابن تیمیہ کے اس دعوی کو غیر صحیح قرار دیا ہے اور امام بخاری اور علی ابن المدینی کے بارے میں بھی یہ تقسیم کرنا منسوب کیا ہے (اعلاء، ۱/ ۶۵ حاشیہ علامہ عبدالفتاح ابوغدہ) اور علامہ ابن علان فرماتے ہیں کہ امام احمد کی جانب یہ منسوب ہے کہ مطلقاً حدیث ضعیف پر عمل ہوگا، یعنی جہاں اس کے علاوہ اور کوئی روایت نہ ہو، اور اس حدیث ضعیف پر عمل کرنا رائے پر عمل سے بہتر ہوگا، تو اس سے مراد صحیح کے مقابلہ کی ضعیف روایت مراد ہے اور متقدمین کے عرف میں بھی یہی مراد ہے۔

علامہ ابن قیم نے بھی روایت احناف کو ذکر کر کے اس کو حسن میں شامل کیا ہے، جس کا ذکر ماقبل میں آچکا ہے، علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی عبارت پر خاص کر کے امام ترمذی کے طرف حسن کی اصطلاح منسوب کرنا جو اقعتہً غلط ہے، نیز امام احمد کے بارے میں یہ دعوی کرنا کہ ترمذی نے جن کو حسن یا صحیح کہا ہے وہی امام احمد کے نزدیک ضعیف ہے، "هذا قول يصعب اتباعه فلا تغتر بتحسين الترمذى" (التعلیقات الحافلہ/۴۸)۔

۳۔ حدیث ضعیف کو احکام میں احتیاط کے موقعہ پر استحباب کے طور پر معتبر مانا گیا ہے۔

علامہ ابن ہمام کتاب الجنائز میں فرماتے ہیں: "الاستحباب يثبت بالضعيف غير الموضوع" مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جب کسی صحیح حدیث سے صراحۃً کسی چیز کا ندب وجواز معلوم نہ ہو اور اس سلسلہ میں ضعیف حدیث جو شدید الضعیف نہ ہو، اس سے استحباب وجواز ثابت ہوگا بشرطیکہ اصول شرع کے ماتحت ہو اور اصول شرعیہ وادلہ صحیحہ کے مناقض نہ ہو، کیونکہ وہ نفع کی امید والی ہوگی اور چونکہ اباحت اور استحباب کے درمیان دائر ہے، لہٰذا احتیاطاً ثواب کی امید کے ساتھ اس پر عمل جائز ہے، اور اگر استحباب وحرمت کے درمیان دائر ہو تو غور وفکر کا دائرہ وسیع ہے، کیونکہ عمل کی شکل میں کراہت میں مبتلا ہونے کا دغدغہ ہے۔ اور ترک میں ترک مستحب کا مظنہ ہے اور اگر کراہت کا خطرہ اشد ہے کہ کراہت شدید امر کو محتمل ہے اور استحباب ضعیف کو محتمل ہے تو اس وقت ترک عمل کو ترجیح ہوگی اور اس کے برعکس کی صورت میں حکم بھی برعکس ہوگا۔

حدیث ضعیف سے استحباب کے ثبوت کے سلسلہ میں محدثین واصولیین کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ اصول حدیث میں حدیث ضعیف سے احکام شرعیہ کے ثابت نہ ہونے پر اتفاق ہے، اور استحباب بھی ایک حکم ہے تو پھر اس کا ثبوت بھی نہ ہونا چاہئے، امام نووی نے الاذکار میں استحباب کے ثبوت کو حدیث ضعیف سے معتبر مانا ہے، حضرت مولانا عبدالحئی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے اس تناقض کو دور کردیا ہے، مولانا لکھنوی نے دوانی کی انموذج العلوم کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ جب حرمت کا احتمال نہ ہو تو عمل کا جواز حدیث ضعیف سے نہ ہوگا، کیونکہ حدیث کے نہ ہونے کی شکل میں بھی عمل جائز تھا، حرمت کا انتفاء اباحت کے ثبوت کو مستلزم ہے، اور اباحت حکم شرعی ہے جو حدیث ضعیف سے ثابت نہیں ہے، حاصل یہ ہے کہ جواز خارج سے معلوم ہوتا ہے اور استحباب قواعد شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے، لہٰذا حدیث ضعیف سے کچھ بھی ثابت نہ ہوا بلکہ حدیث نے استحباب کا شبہ پیدا کردیا، تو احتیاط یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اور یہ بات قواعد شرعیہ سے ہی معلوم ہوئی، لیکن اس پر علامہ خفاجی نے سخت اعتراضات کئے ہیں اور مولانا عبدالحئی نے اس کا بہت تفصیلی جواب دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ محدثین ومجتہدین نے حدیث ضعیف سے استدلال کو ثابت کیا ہے، البتہ یہ استحباب حدیث حسن وصحیح سے ثابت شدہ استحباب سے کم درجہ کا ہوگا، اس سے یہ بھی اعتراض دور ہوگیا کہ فقہاء بھی حدیث ضعیف سے استحباب ثابت کرتے ہیں اور بھی

انکار کرتے ہیں، اس کے شدت ضعف کا علم نہیں ہوتا ہے تو اس سے استحباب ثابت کردیتے ہیں، یا اس کو اصول شرعیہ کے موافق سمجھ لیتے ہیں اور کبھی شدت ضعف وغیرہ کا علم ہوجاتا ہے تو روایت کو ساقط کردیتے ہیں (ظفر الامانی / ۲۱۴۔ ۲۲۳، الاجوبۃ الفاضلۃ مع التعلیقات / ۴۸)۔

علامہ ظفر احمد تھانوی علامہ سیوطی کے حوالہ سے بھی یہی فرماتے ہیں:

''إنه يعمل بالضعيف فی الاحکام ایضا اذا کان فیه احتیاط'' (اعلاء/۶۸)۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب کا ثبوت ہوجاتا ہے (لمحات / ۲۰۴)

ماحصل یہی ہے کہ حدیث ضعیف سے احکام شرعیہ یعنی حلال وحرام کا ثبوت نہیں ہوگا اور اس پر جمہور محدثین ومجتہدین کا اتفاق ہے، البتہ احتیاط کے طور پر یا خارجی دلائل کی بنیاد پر صرف تقویت کے طور پر اس سے استحباب کا ثبوت ہوگا۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ ضعف ایک امر اضافی واجتہادی چیز ہے، ایک روایت کسی کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے، اور دوسرے کے نزدیک وہ حسن کے قریب ہوتی ہے، شرائط کے اختلاف وفرق کی وجہ سے بھی اختلاف ہوتا ہے کبھی قرائن تلقی بالقبول اور تعدد طرق کی وجہ سے بھی اس کا اعتبار کرلیا جاتا ہے، جیسے ما قبل میں امام شافعی سے ''لا وصية لوارث'' والی حدیث کا تلقی بالقبول کی وجہ سے متواتر کا درجہ حاصل کرلینا منقول ہوچکا ہے (ظفر الامانی / ۲۲۳)۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کا استدلال واعتبار

ماقبل میں احکام کے سلسلہ میں فضائل کا اجمالا ذکر آچکا ہے کہ فضائل کے لیے بھی ضعیف روایت سے استدلال مطلقاً صحیح نہیں ہے، بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ معتبر ہے۔

۱۔ جن محدثین نے فضائل میں انکار کیا ہے، خواہ ترغیب وترہیب یا احتیاط ہی سے متعلق ہو ان میں یحییٰ بن معین وغیرہ ہیں، بظاہر امام بخاری علیہ الرحمہ کا بھی یہی مسلک معلوم ہوتا ہے، اسی طرح امام مسلم نے بھی اپنے مقدمہ میں احادیث ضعیفہ ومنکرہ کے رواۃ کی تشنیع کی ہے اور ان کی صحیح احادیث کو بھی چھوڑ دیا ہے، تو ان کا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اسی طرح ابوبکر بن العربی، ابن حزم اور شوکانی کا بھی یہی مسلک ہے (لمحات بحوالہ مقالات کوثری/ ۱۹۷)۔

۲۔ حدیث ضعیف فضائل میں مقبول ہیں بشرطیکہ صحیح حدیث اس باب میں نہ ہو یہ امام احمد بن حنبل، امام ابوداود وغیرہ کی طرف منسوب ہے، اگرچہ امام احمد کی ضیف سے کیا مراد ہے، اس کی تفصیل شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کے حوالہ سے گذر چکی ہے۔

۳۔ حدیث ضعیف پر فضائل کے باب میں عمل کیا جائے، اسی طرح مواعظ وقصص، ترغیب وترہیب وغیرہ میں اسناد کے تساہل کے ساتھ عمل کیا جائے، البتہ عقائد اور احکام میں بالکل روایت نہ کی جائے اور نہ اسناد وروایت میں تساہل اختیار کیا جائے، چنانچہ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے:

''واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرای''۔

اسی طرح امام احمد، حاکم نیساپوری، یوسف ابن عبدالبر، امام نووی، ابن ہمام وغیرہ سے منقول ہے، امام نووی نے الاذکار اور التقریب میں اس کو ذکر کیا ہے، اور اس کا ذکر آچکا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے حدیث ضعیف پر فضائل میں عمل کی تین شرطیں ذکر کی ہیں:

(۱) ضعف شدید نہ ہو، یعنی کوئی راوی کسی طریق میں بھی کذب کا متہم بالکذب نہ ہو (۲) وہ حدیث شریعت کے کسی اصل کے موافق ہو، مخالف نہ ہو (۳) عمل کے وقت اس کے ثبوت کا اعتبار نہ ہو بلکہ احتیاط کا اعتقاد ہو، تا کہ آپ ﷺ کی طرف وہ بات منسوب نہ ہو جو آپ نے نہ فرمایا ہو، یہ آخری دو شرطیں ابن دقیق العید عز بن عبدالسلام سے بھی منقول ہے (التدریب ۱/ ۱۹۶، الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۴۳، ۴۴، لمحات فی اصول الحدیث/ ۲۰۲، اعلاء ۱/ ۴۶)۔

اسی طرح محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث اگر موضوع نہ ہو تو ضعف کو بیان کئے بغیر اس کی روایت اور اسانید میں تساہل، دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔

(۱) عقائد یعنی صفات باری سے اس کا تعلق نہ ہو (۲) وہ حلال وحرام سے متعلق نہ ہو، یعنی مواعظ وقصص وغیرہ سے اس کا تعلق ہو (ظفر الامانی / ۲۲۳، تدریب ۱/ ۲۹۸)۔

....

احادیث ضعیفہ اور ثبوت احکام

مولانا خورشید احمد اعظمی [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال وافعال، سیرت وکردار، حرکات وسکنات اور صفات کو محدثین کی اصطلاح میں حدیث، خبر اور اثر کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مگر چونکہ یہ ساری چیزیں ہم تک رجال کے واسطوں اور سند کے ذریعہ پہنچ رہی ہیں، اس لیے ان وسائط کے اعتبار سے حدیث وخبر کی اساسی طور پر دو قسمیں ہوجاتی ہیں:

مقبول اور غیر مقبول

وہ احادیث جس کے نقل کرنے والوں میں صفات قبولیت یعنی ضبط وعدالت اور اتصال سند وغیرہ موجود ہوتی ہیں ان کو مقبول کہا جاتا ہے، اس میں صحیح اور حسن دونوں شامل ہیں۔

اور وہ احادیث جس کے نقل کرنے والوں میں صفات قبولیت نہ پائی جائیں وہ غیر مقبول کہلاتی ہیں، اس میں حدیث ضعیف اور اس کی تمام اقسام شامل ہیں۔

کتب علوم حدیث میں حدیث ضعیف کی تعریف کی گئی ہے اس میں چونکہ صحیح اور حسن کا ذکر بھی آتا ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حدیث صحیح اور حسن کی تعریف کردی جائے۔

حدیث صحیح

وہ حدیث ہے جس کی سند ابتداء سے انتہاء تک تام الضبط کامل الحفظ، فسق وفجور سے بری، اخلاق کریمہ سے متصب راویوں کے ذریعہ متصل ہو، اور اس میں کوئی ایسا مخفی سبب بھی نہ پایا جائے جو صحت حدیث میں قادح ہو۔

حدیث حسن

حدیث صحیح کی تعریف میں مذکور قیود کے ساتھ صرف راوی کے حفظ وضبط میں کمی ہو۔ (بشرطیکہ قلت ضبط فحش اور کثیر نہ ہو) تو وہ حدیث حسن کہلاتی ہے۔

الف۔ ضعیف

۱۔ اور اگر حدیث حسن کے مرتبہ تک بھی نہ پہنچ سکے تو ضعیف کہلاتی ہے، یعنی سند اور راویوں سے متعلق جو صفات اور شرائط قبولیت ہیں ان میں سے کوئی صفت یا شرط مفقود ہو تو وہ سند اور اس کے ذریعہ مروی حدیث ضعیف اور غیر مقبول کہلاتی ہے۔

شرائط قبولیت پانچ ہیں: ۱۔ اتصال سند۔ ۲۔ عدالت راوی۔ ۳۔ ضبط راوی۔ ۴۔ نفی الشذوذ۔ ۵۔ نفی العلۃ القادحۃ۔

اور فتح المغیث میں ایک مزید شرط کا ذکر ہے، ۶۔ ضرورت کے وقت کسی مؤید کا نہ ہونا۔

لہٰذا ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو حدیث ضعیف ہوجائے گی، اور انہیں مذکورہ شرائط کے فقدان کے اعتبار سے حدیث ضعیف کی متعدد قسمیں

---

[1] المکتب العلمی، رگوناتھ پورہ مئوناتھ بھنجن۔

بنتی ہیں اوران کے مراتب میں فرق پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ضعیف احادیث کے اہم اور بنیادی اسباب

مذکورہ بالا شرائط قبولیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضعف احادیث کے بنیادی اسباب دو ہیں:

۱۔ یا تو وہ سند جس کے ذریعہ حدیث ہم تک پہنچ رہی ہے اس میں کہیں سے انقطاع ہو جائے۔

۲۔ یا اس سند کے رجال میں سے کسی کے اندر وہ صفات نہ پائی جائیں جن کی وجہ سے حدیث مقبول ہوتی ہے (مقدمہ فتح الملہم/ ۵۶)۔

انقطاع سند کے سبب حدیث ضعیف کی جو اقسام بنتی ہیں، ان میں سے ایک قسم کا نام مرسل ہے، مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعی کے درمیان کا واسطہ مذکور نہ ہو، یعنی تابعی کہے: "قال رسول الله ﷺ كذا"۔

یہ حدیث محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف قرار پاتی ہے، لیکن فقہاء کے نزدیک اس حدیث کا اعتبار ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ نیز امام شافعیؒ بھی بعض شرائط کے ساتھ اسے قابل حجت واستدلال مانتے ہیں، امام سیوطی رحمہ اللہ نے قبول مراسیل کے سلسلہ میں نو اقوال نقل کئے ہیں (دیکھئے: نزہۃ النظر/ ۸۰)۔

۳۔ اصولاً اور اجمالاً حدیث ضعیف نا قابل استدلال اور مردود ہے، اس لیے کہ اس کے رواۃ ورجال میں صفات قبولیت نہیں پائی گئی، تو وہ غیر مقبول ہو جائے گی (نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر/ ۲۸)۔

ب۔موضوع

اوپر ذکر ہوا کہ حدیث ضعیف کی کئی قسمیں ہیں اور ان سب کے مختلف مراتب ہیں، ان میں سب سے گھٹیا اور مردود قسم حدیث موضوع ہے، کیونکہ سند میں خامی کے ساتھ ساتھ اس کا متن بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط طور پر منسوب ہوتا ہے، چنانچہ حدیث موضوع کی تعریف یہ کی گئی ہے:

ا۔تعریف:

والكذب المختلق المصنوع علی النبي فذالك الموضوع

(اور ایسا جھوٹ جو بنایا گیا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر گھڑا گیا ہو وہ موضوع ہے)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غیر کے قول وفعل کو منسوب کرنا، یا کسی ایسے امر کو آپ کی طرف منسوب کرنا جو آپ سے صادر نہ ہو موضوع کہلاتا ہے۔

موضوع کو حدیث مجازاً کہا جاتا ہے، کیونکہ بظاہر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوتا ہے ورنہ حقیقۃً وہ حدیث نہیں ہے۔

۲۔حکم

موضوع کے ذریعہ استدلال تو کیا؟ بغیر اس کے موضوع ہونے کی صراحت کئے اس کا روایت کرنا بھی حرام ہے، حدیث ضعیف کی یہ سب سے ناقص اور مردود قسم ہے۔

تدریب الراوی میں ہے: کسی حدیث کے وضع کو جانتے ہوئے بلا صراحت وضع اس کی روایت کرنا بھی حرام ہے، خواہ وہ احکام سے متعلق ہو یا فضائل وترغیب سے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، جو کوئی میری طرف ایسی بات منسوب کرے جس کو وہ جانتا ہے کہ جھوٹ ہے تو وہ خود جھوٹ بولنے والوں میں سے ایک ہے (تدریب الراوی، ۱/ ۲۷۴، نزہہ/ ۹۴)۔

کسی حدیث کی سند میں محض ضعیف، کذاب یا واضع حدیث راوی کی شمولیت اس حدیث کے متن پر ضعف کا حکم لگانے کے لیے کافی نہیں ہے، ہاں کسی ایسے راوی کی شمولیت کے سبب اس متن سے استدلال میں توقف کیا جائے گا، اگر اس متن کی تائید کسی دوسری حدیث صحیح سے ہو جاتی ہے تو پھر وہ متن بھی صحیح کہلائے گا (تدریب الراوی، ۱/ ۲۹۶)۔

حدیث ضعیف ملتقی بالقبول

۱۔ کچھ ایسی احادیث بھی ہیں جو سند کے اعتبار سے گرچہ ضعیف ہوتی ہیں، لیکن علماء کے مابین روایۃ یا عملاً مقبول ومشہور ہوتی ہیں، ایسی احادیث کو متلقی بالقبول سے تعبیر کرتے ہیں، "والقبول یکون تارۃ بالقول وتارۃ بالعمل علیہ" (قواعد فی علوم الحدیث، ص ۴۰)۔

اور اس سلسلہ میں علماء وفقہاء، ائمہ حدیث اور اجماع امت کا اعتبار کیا جائے گا (تدریب الراوی/ ۲۷)۔

حکم

۲۔ احادیث ضعیفہ متلقی بالقبول کا شمار احادیث مقبولہ قابلۃ للعمل والحجۃ میں ہوتا ہے، اور احکام میں بھی ان کا اعتبار ہوتا ہے۔

علامہ سیوطی نے تدریب میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے:

"یحکم للحدیث بالصحۃ اذا تلقاہ الناس بالقبول وان لم یکن لہ اسناد صحیح"

خلاصہ کلام یہ کہ تلقی بالقبول کی وجہ سے حدیث ضعیف مقبول ہوتی ہے اور اس پر صحت کا حکم لگتا ہے، یہی رائے حافظ ابن عبدالبر، ابواسحاق الاسفرائینی، ابن الحصار، کشمیری، علامہ ظفر احمد، شبیر احمد عثمانی، علامہ سیوطی ودیگر محققین علماء کی ہے (تقریب النواوی مع تدریب الراوی، ۱/ ۲۹۸)۔

۳۔ احادیث ضعیفہ کی روایت کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث کے ضعف کی صراحت کیے بغیر اس کی روایت کا جواز ہے، اور اگر حدیث صفات باری تعالیٰ، احکام ومسائل اور احلال وحرام سے متعلق ہو تو ضعف حدیث کی صراحت کے بغیر اس کی روایت کرنا جائز نہیں ہے۔

اس لیے اگر کسی حدیث کی روایت علماء کے مابین بلانکیر وبغیر صراحت ضعف عام ہو تو اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو عمل کا ہوتا ہے اور اس پر تلقی بالقبول کا اطلاق ہوگا۔

حدیث ضعیف مؤید بقرائن

۱۔ وہ حدیث جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہو مگر مضمون حدیث کی تقویت دوسرے قرائن سے ہورہی ہو، تو ان قرائن کے سبب اس حدیث کے ضعف میں تخفیف ہوجاتی ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی کذاب اور فاسق راوی نہ ہو۔

حدیث ضعیف جس کے ضعف کی تلافی قرائن کے ذریعہ ہوجاتی ہے وہ فی الجملہ اصلاً مقبول ہوتی ہے، علامہ سیوطی نے الاجوبۃ الفاضلۃ میں اس کی تصریح کی ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قواعد فی علوم الحدیث میں علامہ ابن الہمام کا قول نقل کیا ہے:

"وقال المحقق فی الفتح: اذا تاید الضعیف بما یدل علی صحتہ من القرائن کان صحیحا" (قواعد فی علوم الحدیث/ ۳۹)

علامہ کشمیریؒ کی رائے اوپر مذکور ہوچکی ہے کہ جب کسی حدیث ضعیف کی تائید عمل کے ذریعہ ہوتی ہو تو وہ ضعف سے نکل کر مقبول کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہے۔

نیز تعدد طرق سے بھی حدیث کا ضعف زائل ہوجاتا ہے اور وہ حسن کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہے جس کی مزید وضاحت عنقریب سیوطی کے کلام سے ہوجائے گی۔

۲۔ لہٰذا جب تائید بالقرائن کے سبب حدیث کا ضعف زائل ہوجاتا ہے اور وہ مقبول اور صحیح کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے ذریعہ استدلال واعتبار درست ہوگا اور صرف فضائل میں ہی نہیں بلکہ احکام ومسائل میں بھی انکا اعتبار کیا جائے گا۔

۳۔ حدیث ضعیف کے ضعف کی تلافی اور اس کے مضمون کی تائید مختلف قرائن کے ذریعہ ہوتی ہے کبھی تو تعدد طرق کے ذریعہ جبکہ حدیث میں ضعف

راوی کے کذب وفسق کے سبب نہ ہو اور کبھی کبھی مجتہد، فقیہ اور امام کا اس حدیث سے استدلال کرنا بھی قرینہ بنتا ہے کہ حدیث اس کے نزدیک مقبول کے دائرہ میں ہے۔

نیز ائمہ حدیث کے مابین کسی حدیث کا بلانکیر مشہور ہونا، یا حدیث کا آیت قرآنی یا کسی حدیث صحیح کے موافق ہونا بھی قرینہ بنتا ہے اثر ... ضعف کی تلافی کا۔

۴۔ کسی ضعیف کا محض تعدد طرق سے مروی ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اولین شرط یہ ہے کہ اس حدیث ضعیف کا ضعف کسی راوی کے کذب وفسق کے سبب نہ ہو، بلکہ راوی کے قلت ضبط اور حفظ کے خفیف ہونے کے سبب پیدا ہوا ہو اگر وہ ضعف کسی راوی کے متہم بالکذب یا فسق کی وجہ سے ہوگا تو پھر تعدد طرق کے سبب اسے تقویت نہیں حاصل ہوگی، مولانا فرنگی محلی نے اس کی صراحت کی ہے (ظفر الامانی/ ۲۱۲)۔

نیز یہ شرط بھی ملحوظ رہے کہ اس کے دوسرے طرق میں بھی کوئی ایسا راوی نہ ہو جس پر فسق وکذب کی تہمت ہو۔

۵۔ حدیث میں ضعف کا سبب یا تو سند میں انقطاع ہوتا ہے یا راویوں میں صفات قبولیت کا فقدان، اور صفات قبولیت کا فقدان یا تو عدالت میں خامی کے سبب ہوتا ہے یا ضبط میں نقص کے سبب، عدالت راوی پر حرف اس کے فسق وفجور اور کذب واختراع کے سبب آتا ہے ... روایات جو راوی کے کذب وفسق کے سبب ضعیف ہوں، ان کو تعدد طرق سے تقویت حاصل نہیں ہوتی۔

تعدد طرق سے صرف انہیں احادیث ضعیفہ کو تقویت ملتی ہے، جن کا ضعف راوی کے سوء حفظ یا قلت ضبط کے سبب واقع ہوا ہو، یا حدیث مرسل ہو اور دوسری سند سے محذوف راوی کی وضاحت ہو رہی ہو یا حدیث مدلس ہو اور دوسری سند سے زوال تدلیس ہو جائے (تدریب الراوی ۱/ ۱۷۱)۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

۱۔ وہ احادیث ضعیفہ جن کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں اصولی طور پر تو ان کا اعتبار مسائل واحکام میں نہیں ہونا چاہئے، لیکن بتقاضائے احتیاط ان کے اعتبار کی صراحت امام سیوطیؒ سے ملتی ہے، فرماتے ہیں:

"ویعمل بالضعیف ایضا فی الاحکام اذا کان فی احتیاط" (تدریب الراوی ۱/ ۲۹۹)۔

نیز فقہ کے اصول اربعہ میں سے ایک اصل قیاس ہے جس کی حجیت پر جمہور فقہاء واصولیین اور بقول ابن قیم الجوزیہ فی الجملہ تمام ہی ائمہ ... کے نزدیک حدیث ضعیف قیاس پر مقدم ہے، اس لیے کسی مسئلہ میں حدیث ضعیف کے علاوہ کوئی دوسری حدیث صحیح نہ ہو تو اس مسئلہ میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا بہ نسبت قیاس افضل وراجح ہوگا۔

"قال ابن حزم: جمیع الحنفیة مجمعون علی ان ضعیف الحدیث عنده اولی من الرأی" (قواعد فی علوم الحدیث/ ۵۸)۔

۲۔ مسائل واحکام کے باب میں بھی احادیث ضعیفہ کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، انہوں نے ان احادیث ضعیفہ ... متاخرین؟ اس سلسلہ میں ابن القیمؒ نے صراحت کی ہے کہ حسن کی اصطلاح متاخرین کی ہے۔

"ولیس المراد بالحدیث الضعیف فی اصطلاح السلف هو الضعیف فی اصطلاح المتاخرین بل ما یسمیه المتاخرون حسنا قد یسمیه المتقدمون ضعیفًا" (قواعد فی علوم الحدیث/ ۶۱)۔

مگر ابن قیم وابن تیمیہ رحمہما اللہ کی اس تحقیق پر کہ حسن کی اصطلاح متاخرین کی ہے، شیخ عوامہ کا ایک لمبا حاشیہ ہے جسے شیخ عبد الفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ نے تحسین کے ساتھ درج کیا ہے، شیخ نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ حسن کی اصطلاح کا ذکر متقدمین میں بھی ملتا ہے مثلاً امام مالک، ابوالولید الطیالسی، ابوالحسن الکلبی، محمد بن عبد اللہ بن نمیر، یعقوب بن شیبہ السدوسی اور امام بخاری وغیرہ رحمہم اللہ۔

شیخ عوامہ نے اپنے مفصل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ ائمہ کے نزدیک جو احادیث ضعیفہ کا اعتبار کیا گیا ہے اس سے مراد وہی ضعیف ہے جس کا مرتبہ حسن سے بھی کم ہو اور جسے متاخرین ضعیف کہتے ہیں (قواعد فی علوم الحدیث/٦٦ حاشیہ)۔

اگرچہ مذکورہ باب میں ضعیف سے حسن مراد ہونے کی صراحت بہت سے لوگوں سے مروی ہے، چنانچہ ظفر الامانی میں زرکشی کا قول نقل کیا ہے۔

... قول احمد بن حنبل: العمل بالحديث الضعيف اولى من القياس يريد به الحسن انتهى كلام الزركشي (ظفر الاماني/١٨٦)۔

لیکن شیخ عوامہ کی تحقیق وقیع اور راجح معلوم ہوتی ہے، اور اس کا اعتبار چند شرائط کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ مثلاً وہ حدیث موضوع، منکر نہ ہو، اور نہ اس کی سند میں کوئی متہم بالکذب یا فاسق راوی ہو، وہ حدیث شدید الضعف نہ ہو۔ اس باب میں کوئی حدیث اس کے معارض ومنافی نہ ہو۔ اس پر عمل بتقاضاء احتیاط ہو۔

تقاضاء احتیاط کی تشریح یہ ہے کہ مثلاً کوئی حدیث ضعیف نکاح وبیع کے معاملات میں سے کسی کے کراہت پر دلالت کر رہی ہو تو احتیاط یہ ہے کہ اس کا ارتکاب نہ کیا جائے اگرچہ اس سے بچنا واجب نہ ہو، جیسا کہ الاجوبۃ الفاضلہ ص ۵٦ میں نووی کی کتاب الاذکار سے نقل کیا ہے۔

قیاس کے مقابلہ میں حدیث ضعیف پر اعتبار کی مثالیں متعدد ہیں۔ مثلاً نبیذ تمر سے وضوء کرنا، قہقہہ فی الصلاۃ کا ناقض وضو ہونا، اقل مہر کا دس درہم متعین کر دینا وغیرہ۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال واعتبار

گزشتہ بحثوں میں اس طرف اشارہ گذر چکا ہے کہ احادیث ضعیفہ کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، بلکہ قرائن، وموئیدات اور خارجی امور کے ہوتے ہوئے بلکہ کبھی ان کے بغیر بھی احادیث ضعیفہ کا اعتبار احکام میں کیا گیا ہے، لیکن فضائل کے باب میں علماء کے مابین تساہل اور ترقی بھی پائی جاتی ہے۔ (فتح الملہم / ۲۸۴)۔

"وقد قال الامام احمد وغيره من الأئمة: اذا روينا فى الحلال والحرام شددنا واذا روينا فى الفضائل ونحو تساهلنا" (الاجوبة الفاضلة/٣٦)۔

چنانچہ عقائد واحکام اور حلال وحرام کے باب میں یہ تشدد اور فضائل کے باب میں تساہل ونرمی کبار ائمہ عبدالرحمن بن مہدی، یحیٰ بن معین، احمد بن حنبل، عبداللہ بن المبارک، سفایان ثوری اور سفیان بن عیینہ سے بھی منقول ہے، اور یہی جمہور ائمہ حدیث وفقہاء کا قول ہے (فتح المغیث/ ۲۸۵)۔

مذکورہ قول کے علاوہ اس باب میں دوسرے بھی اقوال منقول ہیں، چنانچہ علامہ فرنگی محلیؒ اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

فمنهم من منع العمل بالضعيف مطلقًا وهو مذهب ضعيف، ومنهم من جوزه مطلقًا وهو توسع سخيف، ومنهم من فصل وقيد وهو المسلك المسدد (الاجوبة الفاضلة /٥٣)۔

یعنی ایک قول تو یہ ہے کہ عمل بالضعیف مطلقاً ممنوع ہے، اس قول کی نسبت ابن العربی کی طرف کی گئی ہے، "ومنع ابن العربي المالكي العمل بالضعيف مطلقًا" (فتح القدیر/ ۲۸۵)۔

اور بعض لوگوں نے اس کی نسبت امام بخاری کی طرف بھی کر دی ہے، لیکن شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے ظفر الامانی کے حاشیہ میں اس کی تردید کرتے ہوئے غیر مسلم اور منقوض قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"وعلى ما ذهب اليه الامام احمد وغيره من ائمة ذلك العصر الذين قالوا اذا روينا فى الحلال والحرام شددنا واذا روينا فى الفضائل ونحوها تساهلنا، جرى الامام البخاري رحمه الله فى كتابه الادب المفرد فاورد فيه جملة كبيرة من

الاحادیث والآثار الضعیفة مستار لابها فی الباب وقد یکون الباب قاصرا علیها وفی رواتها الضعیف والمجهول ومنکر الحدیث والمتروك واشباه ذلك" (ظفر الامانی تحقیق الشیخ عبدالفتاح ابی غدہ/۱۸۳)۔

بہر کیف علامہ فرنگی محلیؒ نے اسے قول ضعیف قرار دیا ہے۔

اور بعض لوگوں نے ضعیف احادیث پر عمل کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے، جسے علامہ نے غیر دانشمندانہ قرار دیا ہے۔

اور تیسرا قول تفصیل اور قیود وشرائط کا ہے جسے معتدل اور صحیح مسلک قرار دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف اگر احکام وعقائد اور حلال وحرام کے باب میں ہوگی تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، رواۃ پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔ اور اگر فضائل اور ثواب کے باب میں ہوگی تو تساہل برتا جائے گا اور حدیث ضعیف کا اعتبار کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ حدیث اگر واقع کے اعتبار سے صحیح ہوئی تو اس کا حق دے دیا گیا اور اگر ضعیف ہی رہی تو حلال وحرام کے باب میں کوئی مفسدہ اور خرابی نہیں آئے گی۔ (ظفر الامانی/ ۲۲۵)۔

اور قیود وشرائط یہ ہیں:

۱۔ وہ حدیث ضعیف شدید الضعف نہ ہو۔

۲۔ مضمون حدیث کسی اصل معمول بہ کے تحت ہو، شریعت کے عام قواعد کے خلاف ومعارض نہ ہو۔

۳۔ اس پر عمل کرتے وقت اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونے کا عقیدہ نہ ہو۔ (فتح المغیث، ۱/ ۲۸۶)۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ فضائل کے باب میں بھی احادیث ضعیفہ پر عمل کے لیے مذکورہ بالا شرائط کا لحاظ ضروری ہے، مطلقاً حدیث ضعیف پر عمل کرنا فضائل کے باب میں بھی درست نہیں ہے۔

☆☆☆

احادیث ضعیفہ اور اس سے متعلق تفصیلات

مولانا شمس پیرزادہ[1]

۱۔ حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس کی سند یا متن میں ضعف ہو، وہ نہ صحیح درجہ کی ہوتی ہے اور نہ حسن درجہ کی۔

اصول حدیث کی مشہور کتاب مقدمۃ ابن الصلاح میں ہے:

"کل حدیث لم یجتمع فیہ صفات الحدیث الصحیح ولا صفات الحدیث الحسن المذکورات فیما تقدم فھو حدیث ضعیف" (مقدمۃ ابن الصلاح/۲۰)۔

(ہر وہ حدیث جس میں صحیح اور حسن حدیث کی صفات جو اس سے پہلے بیان کی گئیں جمع نہ ہوں وہ ضعیف ہے)۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

"وقد اطلق جماعۃ من المصنفین فی علوم الحدیث ان الراوی ان کان تام الضبط مع بقیۃ الشروط المعتبرۃ فحدیثہ من قسم الصحیح، وان خف ضبطہ فحدیثہ من قسم الحسن، وان کثر غلطہ فحدیثہ من قسم الضعیف" (ارشاد الفحول/۴۸)۔

(علوم حدیث کے مصنفین کے ایک گروہ نے مطلقاً یہ بات کہی ہے کہ اگر راوی میں ضبط (حفظ) کا وصف پوری طرح پایا جاتا ہو دیگر معتبر شروط کے ساتھ، تو اس کی حدیث صحیح درجہ کی ہوگی، اور اگر ضبط میں کمی ہو تو اس کی حدیث حسن درجہ کی ہوگی، لیکن اگر وہ کثرت سے غلطیاں کرتا ہو تو اس کی حدیث ضعیف درجہ کی ہوگی) (ارشاد الفحول/۴۸)۔

اسناد ہی کا نہیں متن کا ضعف بھی حدیث کو ضعیف بنا دیتا ہے، چنانچہ مضطرب اور منکر حدیثوں کا شمار ضعیف حدیثوں ہی میں ہوتا ہے۔

۲۔ ضعیف احادیث کے بنیادی اسباب میں ضبط (حفظ) کی کمی، نسیان کا واقع ہو جانا، بڑھاپے میں اختلاط، راوی کی کتابت شدہ احادیث کا ضائع ہو جانا اور پھر یادداشت سے حدیثیں بیان کرنا، ثقاہت کی کمی، حدیث کو بالمعنی بیان کرنے میں بے احتیاطی، عنعنہ کے طریقہ پر روایتوں کو قبول کرنے میں بے احتیاطی وغیرہ۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اصولی حکم یہ ہے کہ وہ حجت نہیں ہے۔

امام مسلم صحیح مسلم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

"ثقہ راویوں سے صحیح حدیث اس کثرت سے مروی ہیں کہ غیر ثقہ راویوں کی روایتیں نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو لوگ ان ضعیف اور مجہول الاسناد حدیثوں پر اعتماد کرتے ہیں، وہ عوام پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے بکثرت حدیثوں کو جمع کیا ہے، تو جس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہو اس کا علم میں کوئی حصہ نہیں اور اس کو اہل علم کے بجائے جاہل کہنا زیادہ مناسب ہے"۔ (مقدمہ صحیح مسلم/۲۸)۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"ولا یجوز ان یعتمد فی الشریعۃ علی الاحادیث الضعیفہ التی لیست صحیحۃ ولا حسنۃ" (مجموعہ فتاوی ابن

---

[1] ادارہ دعوۃ القرآن ممبئی۔

تیمیہ، ۲۵/۱)۔

(شریعت میں احادیث ضعیفہ پر اعتماد کرنا جو نہ صحیح ہوں اور نہ حسن جائز نہیں ہے)۔

ب۔ موضوع

۱۔ موضوع حدیث وہ ہے جو گھڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردی گئی ہو۔

مقدمۃ ابن الصلاح میں موضوع حدیث کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

هو المختلق المصنوع (ص۴۷)

(وہ گھڑی ہوئی اور بناوٹی حدیث ہے)۔

۲۔ حدیث موضوع کا حکم یہ ہے کہ اسے رد کردیا جائے گا۔

حافظ ابن حجر نخبۃ الفکر میں فرماتے ہیں:

"واتفقوا على تحريم رواية الموضوع الا مقرونا ببيانه. لقوله ﷺ: من حدث عني بحديث يرى انه كذب فهو احد الكاذبين" (مسلم، شرح الفكر/۱۲۹، ۱۳۰)۔

(اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ موضوع حدیث کو روایت کرنا حرام ہے، الا یہ کہ اس کا موضوع ہونا بیان کردیا جائے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس نے میری طرف منسوب کر کے کوئی ایسی حدیث بیان کی جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں میں ایک ہے) مسلم نے روایت کیا ہے۔

موضوع حدیث درحقیقت اللہ پر افتراء ہے، کیونکہ یہ دین میں اپنی طرف سے ایسی بات شامل کرنا ہے جو ثابت نہیں، اور اللہ پر افتراء کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے۔

فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا ليضل الناس بغير علم (الانعام: ۱۴۴)۔

(اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی طرف جھوٹ بات منسوب کرے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کو گمراہ کرے)۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من كذب علي متعمدًا فليتبوأ مقعده من النار" (بخاری)

(جس نے میری طرف جان بوجھ کر جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے)۔

۳۔ کسی واضع حدیث اور کذاب فی الحدیث راوی کا سند میں شامل ہونا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی ہے، کیونکہ جب یہ ثابت ہوا کہ سلسلہ اسناد میں کوئی راوی واضع حدیث ہے تو اس کی روایت کا کیا اعتبار؟ اس نے ثقہ راویوں کی طرف جھوٹ کیوں نہ منسوب کردیا ہوگا، اس میں کچھ تفصیل مرتب کر کے ایسی حدیثوں کو قبول کرنے کی صورتیں نکالنے کا مطلب موضوع احادیث کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا اور سہل نگاری سے کام لینا ہے، جب کہ احتیاط اس بات میں ہونی چاہئے کہ کوئی غلط بات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔ تلقی بالقبول متاخرین کی اصطلاح ہے، اور یہ اصول حدیث میں اضافہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کسی حدیث کی سند صحیح نہ ہو لیکن علماء نے اسے قبول کرلیا ہو تو وہ قابل عمل اور قابل احتجاج (حجت) ہوگی، نیز یہ کہ جب علماء کسی حدیث کو قبول کرنے پر متفق ہوجائیں تو پھر سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سوال یہ ہے کہ اگر قبول حدیث کا یہی معیار ہے تو امام بخاری اور امام مسلم نے ہر حدیث کی اسناد پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ کیا اس زمانہ کے علماء کے قبولِ حدیث کو وہ معیار بنا کر سند سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے؟

۲۔ ضعیف حدیث خواہ وہ متلقی بالقبول کی حیثیت کیوں نہ رکھتی ہو ہرگز حجت نہیں ہے، اور جب حجت نہیں ہے تو اس پر عمل بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسی حدیث پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے، حالانکہ وہ حدیث آپ سے ثابت ہی نہیں۔

امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں مرسل حدیث کے بارے میں جو ضعیف حدیث کی ادنیٰ قسم ہے لکھا ہے، وہ حجت نہیں ہے:

”والمرسل من الروايات في اصل قولنا وقول اهل العلم بالاخبار ليس بحجة“ (ص ۲۰)

(مرسل روایت اصلاً ہمارے نزدیک اور حدیث کا علم رکھنے والوں کے نزدیک حجت نہیں ہے)۔

اور جب مرسل حدیث حجت نہیں ہے تو دوسری ضعیف حدیثیں جن کا ضعف مرسل سے زیادہ ہی ہوتا ہے کیونکر حجت ہو سکتی ہیں؟

۳۔ اس کا جواب اوپر گزر چکا۔

حدیث ضعیف مؤید بقرائن

ضعیف حدیث کے بارے میں امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

”دین کے معاملہ میں حدیثیں تحلیل وتحریم، امر ونہی یا ترہیب سے متعلق ہوتی ہیں، تو جب راوی سچا اور امانت دار نہ ہو اور اس سے ایسا شخص روایت کرے جو اس کو جانتا ہو اور اس کا حال ان لوگوں کو بیان نہ کردے جو اس کو جانتے نہ ہوں تو وہ اپنے اس فعل پر گنہگار ہوگا اور عامۃ المسلمین کو دھوکہ دینے والا ہوگا، کیونکہ سننے والا ان پر یا ان میں سے بعض حدیثوں پر عمل کر سکتا ہے، جبکہ ممکن ہے وہ سب یا اکثر حدیثیں جھوٹ ہوں، جن کی کوئی اصل نہ ہو، حالانکہ ثقہ سے روایت کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

جو لوگ ان ضعیف اور مجہول الاسناد حدیثوں پر اعتماد کرتے ہیں وہ عوام پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے بہ کثرت حدیثوں کو جمع کیا ہے، تو جس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہو اس کا علم میں کوئی حصہ نہیں اور اس کا اہل علم کے بجائے جاہل کہنا زیادہ مناسب ہے“ (مقدمہ صحیح مسلم/ ۲۸)۔

رہا تعدد طرق تو شیخ محمد خضری ”اصول الفقہ“ میں لکھتے ہیں:

جب حدیث کا ضعف راوی کے غیر ضابطہ ہونے کی بناء پر ثابت ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس سے استدلال کیا جائے گا، البتہ اگر روایات کے طریقے متعدد ہوں تو قبول کی جائے گی، کیونکہ ان کو ترک اس کے غلط ہونے کے اندیشہ سے کیا جارہا تھا، لیکن اس کا متعدد طریقوں سے مروی ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ راوی نے درست کہا ہے۔ لیکن اگر ضعیف فسق کی وجہ سے ہو تو متعدد طریقوں سے مروی ہونے کے باوجود وہ استدلال کے قابل نہیں ہوتی، کیونکہ راوی کے عادل نہ ہونے کی وجہ سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے وہ اس جیسے دوسرے راویوں کے مل جانے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتا۔ (اصول الفقہ/ ۲۷۲)۔

ضعیف حدیث کے قابل قبول ہونے کی اگر کوئی مناسب صورت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ حدیث کے راوی ثقہ ہوں لیکن ضبط میں کمی پائی جاتی ہو، وہ قرآن اور احادیث صحیحہ کی معارض نہ ہو اور حکم ایسے مسئلہ کا بیان کیا گیا ہو جو مقتضائے شریعت ہو، مثلاً مال تجارت پر زکوۃ کے بارے میں ابوداؤد کی یہ حدیث کہ:

”فان رسول الله ﷺ كان يأمرنا ان نخرج الصدقة من الذي نعد للبيع“ (ابوداؤد کتاب الزکوۃ)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ جو مال ہم فروخت کے لیے تیار رکھتے تھے اس میں سے زکوۃ ادا کریں)۔

اس حدیث کے ایک راوی جعفر بن سعد اور دوسرے خبیب بن سلیمان ہیں جو ضعیف ہیں، لیکن یہ حدیث آیت: ”انفقوا من طيبات ما

کسبتم" سے بالکل مطابقت رکھتی ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اموال تجارت پر زکوۃ عائد ہو۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

ویرد هذا الجواب بان الضعیف الذی یبلغ ضعفه الی حد لا یحصل معه الظن. لا یثبت به الحکم. ولا یجوز الاحتجاج به فی اثبات شرع عام، وانما یثبت الحکم بالصحیح. والحسن لذاته او لغیره لحصول الظن بصدق ذلك وثبوته عن الشارع" (ارشاد الفحول،ص۴۳)۔

(اس جواب کی تردید اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ضعیف حدیث جس کا ضعف اس حد تک ہو کہ اس سے ظن حاصل نہ ہوتا ہو اس سے حکم ثابت نہیں ہوتا اور نہ اس سے عام شرعی احکام میں استدلال کرنا صحیح ہے، حکم صرف ایسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے جو صحیح ہو یا حسن لذاتہ یا حسن لغیرہ ہو، کیونکہ اس صورت میں اس کے سچے ہونے اور شارع سے ثابت ہونے کا ظن حاصل ہوتا ہے)۔

حدیث کے معاملہ میں روایت ہی کی نہیں درایت کی بھی اہمیت ہے، اگر چہ حدیث قرآن وسنت کی معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ اسناد کے لحاظ سے صحیح ہی کیوں نہ ہو، لہٰذا جو ضعیف روایتیں بالبداہت غلط اور ناقابل تسلیم ہوں ان کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جہاں تک احناف کا تعلق ہے وہ تو ایسی خبر واحد کو بھی قبول نہیں کرتے جس کی اسناد صحیح ہو، لیکن اس کا تعلق عموم بلوئی سے ہو، چنانچہ شیخ خضری لکھتے ہیں:

واستدل الحنفیة علی عدم الایجاب بخبر الواحد فیما یعم به البلوی (اصول الفقه/۲۹۲)۔

(احناف نے اس خبر واحد کے واجب نہ ہونے پر استدلال کیا ہے جس میں عموم بلوئی کی صورت پائی جاتی ہو)۔

گویا احناف کے نزدیک روایت ہی کی نہیں درایت کی بھی اہمیت ہے، لیکن پھر علماء درایت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور اسناد کو کافی خیال کرنے لگتے ہیں، کہاں تو خبر واحد کے بارے میں یہ احتیاط اور کہاں ضعیف حدیثوں کو قبول کرنے کا رجحان، حقیقت یہ ہے کہ ہر مسلک کے اصول حدیث الگ الگ ہیں، پھر جو لوگ کسی مسلک سے وابستہ نہیں ہیں اور تحقیق پر انحصار کرتے ہیں وہ ان اصولوں کے کیوں پابند ہو کر رہ جائیں؟

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال واعتبار

فضائل کے باب میں ضعیف حدیثوں پر اعتماد درست نہیں، کیونکہ اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مشکوک ہے اور جب ایسے حدیث کے لیے ظن غالب حاصل نہیں تو اس کو آپ کا قول یا عمل سمجھ کر کیونکر عمل کیا جاسکتا ہے؟

فضائل میں ضعیف اور موضوع روایتوں کی کثرت ہوگئی ہے جس نے دین کا چہرہ مسخ کر دیا ہے، لہٰذا اس میں سہل انگاری برتنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، امام احمد بن حنبل کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے:

"جب ہم حلال وحرام کے بارے میں کوئی حدیث روایت کریں گے، تو اس میں تشدد سے کام لیں گے اور جب فضائل اعمال میں کوئی حدیث روایت کریں گے تو اس میں سہل انگاری برتیں گے) (الکفایہ/۱۷۸)

تو ان کے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم فضائل اعمال میں ضعیف حدیث سے استدلال کریں گے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ صحیح سے کچھ کم درجہ کی حدیث کو قبول کریں گے، مراد ایسی حدیث ہے جو قریب قریب حدیث حسن کے درجہ کی ہو۔

ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"ولا یجوز ان یعتمد فی الشریعة علی الاحادیث الضعیفة التی لیست صحیحة ولا حسنة. لکن احمد بن حنبل وغیره من العلماء جوزوا ان یروی فی فضائل الاعمال ما لم یعلم انه ثابت اذا لم یعلم انه کذب۔"

(شریعت میں احادیث ضعیفہ پر جو نہ صحیح ہوں اور نہ حسن ہوں اعتماد کرنا جائز نہیں، لیکن احمد بن حنبل اور دیگر علماء فضائل اعمال میں ایسی حدیثوں کو بیان کرنا جائز قرار دیتے ہیں، جن کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ ثابت ہیں جب کہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ جھوٹ ہیں)۔

مزید فرماتے ہیں:

"اور جس نے امام احمد سے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ حدیث ضعیف سے جو نہ صحیح ہوتی تھی اور نہ حسن استدلال کیا کرتے تھے، اس نے ان کی طرف غلط بات منسوب کردی، صحیح بات یہ ہے کہ احمد بن حنبل اور ان سے قبل کے علماء کے عرف میں حدیث کی دو قسمیں تھیں، صحیح اور ضعیف، ضعیف کی ان کے نزدیک دو قسمیں تھیں، ضعیف اور متروک جس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا اور دوسری ضعیف حسن (مجموع فتاوی ابن تیمیہ، ۱/ ۲۵۰-۲۵۱)۔

ڈاکٹر صبحی صالح نے اس مسئلہ پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں:

"دین اسلام میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ضعیف حدیث کسی حکم شرعی یا فضائل اعمال کے لیے مصدر و ماخذ قرار نہیں دی جاسکتی۔ (اس لیے کہ حدیث ضعیف کی اساس ظن پر رکھی گئی ہے اور ظن کسی صورت میں بھی حق کی جگہ نہیں لے سکتا) پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فضائل شرعی احکام کی طرح دین کے بنیادی ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ کسی طرح جائز نہیں کہ دین کے بنیادی ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ کسی طرح جائز نہیں کہ دین کی اساس و بنیاد ایسے ستونوں پر رکھی گئی ہو جو بالکل کمزور اور قوت و استحکام سے یکسر عاری ہو۔

خلاصہ یہ کہ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیثوں کو معمول بہ بنا سکتے ہیں، اگر چہ وہ شرائط ان میں موجود بھی ہوں جن کو آسانی سے ڈھونڈنے والوں نے اس ضمن میں ضروری ٹھہرایا ہے، ان کے خیال کے مطابق یہ شرائط تین ہیں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ روایت بہت زیادہ ضعیف نہ ہو۔

۲۔ وہ ان اصول وکلیات سے ہم آہنگ ہو جو کتاب اور سنتِ صحیحہ سے ثابت ہیں۔

۳۔ اس سے قوی تر دلیل اس کی معارض نہ ہو۔

ان شروط کے باوصف ہم ضعیف حدیث کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اس لیے کہ ہم اس پر عمل کرنے سے بے نیاز ہیں، ہمارے پاس احادیث حسن وصحیح کی احکام شرعیہ اور فضائل میں اس قدر کثرت ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے حدیث ضعیف کو تسلیم کرنے کی کچھ حاجت نہیں۔ عدم تسلیم کی وجہ یہ بھی ہے کہ حدیث ضعیف کا ثبوت ہمارے قلب میں ہمیشہ کھٹکتا رہے گا، اور ہمیں کبھی اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکے گا، اور اسی شک وشبہ کی وجہ سے ہم اس کو ضعیف کہتے ہیں، حالانکہ دینی امور میں یقین واذعان کی ضرورت ہوتی ہے۔ (علوم الحدیث/ ۲۷۵)۔

☆☆☆

ضعیف حدیث کی تعریف اور حکم

مولانا انیس احمد مدنی[1]

حدیث ضعیف کی تعریف

لفظ ضعیف صفت کا صیغہ ہے جو قوی کی ضد ہے (المصباح المنیر/ ۷/ ۱۳)۔

ضعف دو طرح کا ہوتا ہے: حسی اور معنوی، یہاں ضعف سے ضعف معنوی مراد ہے۔

اصطلاحی تعریف: "وكل ما عن رتبة الحسن قصر۔ فهو الضعيف وهو اقسام كثر" (تیسیر مصطلح الحدیث/ ۶۳)۔

جو رتبہ حسن کو نہ پہنچے ضعیف ہے۔ اس کی بہت سی قسم اے میرے حبیب ہے۔

حدیث ضعیف کا حکم:...... اجمالاً پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف احادیث سے احکام و مسائل میں استدلال درست نہیں ہے اور نہ ہی ان سے عقائد کا اثبات جائز ہے، فضائل اور ترغیب و ترہیب کے باب میں اس سے استدلال مختلف فیہ ہے، جس کی تفصیلات مقالہ کے آخر میں ہدیہ قارئین کی گئی ہیں۔

ضعف حدیث کے بنیادی اسباب

ضعف حدیث کے بنیادی اسباب صرف دو ہیں:

(۱) سند سے ایک یا ایک سے زائد راوی کا سقوط (۲) راوی میں باعث جرح امر کی موجودگی (توجیہ النظر/ ۲۴۲)۔

راوی کی عدالت پر کلام کیا گیا ہو تو اس کی عدالت ختم ہو جاتی ہے، اور یہ کلام راوی کے حفظ و اتقان کے پہلو سے ہوتا ہے یا دیانت و امانت کے پہلو سے، حفظ و اتقان کے اعتبار سے درج ذیل چیزیں اسباب جرح ہیں:

کھلی ہوئی غلطی، سوء حفظ، کثرت غفلت، کثرت اوہام، معتبر راویوں کی مخالفت، اور دیانت کے پہلو سے جھوٹ، تہمت کذب، فسق، جہالت اور بدعت اسباب جرح ہیں، چنانچہ اگر راوی کاذب ہو تو اس کی حدیث کو موضوع، اور متہم بالکذب ہو تو متروک، اور اگر طعن کا سبب کھلی ہوئی غلطی یا کثرت غفلت یا فسق ہو تو منکر اور وہم ہو تو "معلل" اور اگر ثقہ راویوں کی مخالفت ہو تو اسے مدرج، مقلوب، مزید فی متصل الاسانید، مضطرب اور مصحف کہتے ہیں۔

اگر یہ مخالفت سند کے سیاق کی تبدیلی یا موقوف کو مرفوع میں داخل کرنے سے ہوئی ہو تو اسے مدرج اور اگر تقدیم و تاخیر کے ذریعہ ہوئی ہو تو "مقلوب" اور اگر کسی راوی کی زیادتی کے ذریعہ ہوئی ہو تو اسے "مزید فی متصل الاسانید" اور راوی کو دوسرے راوی سے بدل دینے یا متن میں اضطراب ہونے کی وجہ سے ہوئی ہو تو اسے "مضطرب" اور اگر سیاق کو باقی رکھتے ہوئے صرف لفظ کی تبدیلی میں مخالفت ہوئی ہو تو اسے مصحف کہتے ہیں (النخبہ/ ۴۸، ۴۹)۔

اور اگر راوی مجہول العین یا مجہول الحال یا مبہم ہو تو اس کی مرویات غیر مقبول ہوتی ہیں، اسی طرح بدعتی کی روایات اگر اس کی بدعت موجب کفر ہو تو مطلقاً غیر مقبول اور اگر موجب فسق ہو اور وہ اس کی اشاعت و ترویج میں کوشاں ہو تو غیر مقبول ہوتی ہیں، آخر سبب سوء حفظ ہے، اگر راوی اوائل عمر

---

[1] جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

سے ہی اس کا شکار ہو تو اس کی روایت مطلقاً غیر مقبول ہوتی ہے، اور اگر کبر سنی یا بصارت کے زائل ہونے یا کتابوں کے جل جانے کی وجہ سے وہ اس مرض کا شکار ہو تو اسے "مختلط" کہتے ہیں، اور اختلاط سے پہلے کی روایات مقبول اور بعد کی غیر مقبول ہوتی ہیں۔

مستور الحال کے دیانت وامانت کو متاثر کرنے والے مذکورہ بالا تمام ہی اسباب محدثین اور اصولیین کے نزدیک بالاتفاق ضعف حدیث کا سبب بنتے ہیں، مستور الحال کی روایات احناف کے یہاں مقبول ہوتی ہے۔ (روضۃ الناظر، ۱/ ۶۸۶)

ضعف حدیث کا دوسرا سبب

ضعف حدیث کا دوسرا سبب سند سے کسی راوی کا سقوط ہے، اور یہ سقوط تو جلی ہوگا یا خفی، اور اگر سقط ظاہر ہو تو یا تو سند کے آغاز سے ایک یا ایک سے زائد راوی محذوف ہوں گے جسے معلق کہتے ہیں، یا سند کے آخر سے تابعی کے بعد کے راوی محذوف ہوں گے جسے مرسل کہتے ہیں، یا سند سے پیہم دو راوی یا دو سے زائد محذوف ہوں گے جسے معضل کہتے ہیں، یا سند میں کسی جگہ انقطاع پایا جا رہا ہو تو اس صورت میں اسے منقطع کہتے ہیں (نخبہ/ ۸۰)۔

اور اگر سقوط مخفی ہو تو اس کے تحت حدیث ضعیف کی دو قسمیں آتی ہیں مدلس اور مرسل خفی، اگر راوی اپنے استاذ سے نہ سنی ہوئی روایت بیان کرے تو اسے (مدلس) اور اگر اپنے ہم عصر سے جس سے اس نے کوئی حدیث نہ سنی ہو روایت کرے تو اسے مرسل خفی کہتے ہیں۔

دوسرا سبب محدثین واصولیین کے نزدیک مختلف فیہ ہے، محدثین کے نزدیک تو مذکورہ بالا تمام صورتوں کے نزدیک مرسل حدیث حجت ہوتی ہے، یہی رائے امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان الثوری، اور زیدیہ کی ہے (فتح المغیث، ۱/ ۱۶۴)، امام شافعیؒ بھی کبار تابعین کی مراسیل کو حجت مانتے ہیں بشرطیکہ یہ "مرسل" صرف ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہو اور ثقات کی کبھی مخالفت نہ کی ہو، نیز اس مرسل کی تائید کسی صحابی کے قول یا اہل علم کے فتوی، یا کسی دوسرے سلسلہ سند سے بھی مروی ہونے کی وجہ سے ہو رہی ہو (الرسالہ/ ۴۶۱)۔

جمہور محدثین مرسل کو حجت نہیں مانتے ہیں، کیونکہ تابعی نے اگر براہ راست کوئی روایت کی تو اس کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان محذوف راوی یا تو صحابی ہوں گے یا تابعی اور صحابی، اگر صحابی ہوں تو کوئی حرج نہیں، لیکن تابعی ہونے کی صورت میں یا تو ثقہ ہوں گے یا غیر ثقہ، ظاہر ہے اس احتمال کے ساتھ مرسل حدیث کیسے قابل اعتبار ہوسکتی ہے؟ (الکفایہ/ ۳۹۱)۔

واضح رہے کہ مرسل کی تعریف میں محدثین اور اصولیین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، محدثین صرف تابعین کی ارسال کردہ روایات کو مرسل کہتے ہیں، جبکہ فقہاء سند میں واقع ہر قسم کے اسقاط کو ارسال سے تعبیر کرتے ہیں (تیسیر مصطلح الحدیث/ ۷۲)۔

مراسیل کی حجیت کی بحث عہد تدوین تک رائج تھی، لیکن اب تو یہ نزاع تقریباً ختم ہو چکا ہے کیونکہ کوئی بھی محدث یا فقیہ مرسل ومنقطع حدیث کو اپنا مستدل نہیں بناتا ہے، ابن عبدالبر لکھتے ہیں: مرسل سے استدلال اگرچہ مالکیہ واحناف کا مسلمہ مسلک ہے، لیکن جب میں نے فقہاء کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا تو کسی کو بھی اپنے فریق سے مرسل سے استدلال کی صورت میں مطمئن نہ پایا اور کوئی بھی اپنے فریق سے حدیث متصل سے کمتر حدیث سے استدلال پر راضی نہیں ہوتا ہے، اور ہر ایک مناظرہ کے وقت اپنے فریق سے احادیث وآثار کے متصل ومرفوع ہونے کا مطالبہ کرتا ہے (التمہید، ۱/ ۷)۔

مذکورہ بالا اسباب طعن کے علاوہ اخبار وآحاد کی حجیت کے لیے بعض اصولیین کے نزدیک درج ذیل شرطوں کا پایا جانا بھی ضروری ہے:

۱۔ خبر واحد کا تعلق اگر ان مسائل سے ہو جو عموم بلویٰ سے تعلق رکھتے ہیں تو غیر مقبول ہوگی، جیسے مس ذکر کے ناقض وضو ہونے کے سلسلے میں وارد خبر، نیند سے بیدار ہونے کے وقت ہاتھوں کے دھونے کا حکم (جس کے راوی صحابہ میں صرف حضرت ابوہریرہؓ ہیں)، رکوع میں جانے کے وقت رفع یدین کی حدیث، یہ رائے امام کرخی اور بعض احناف کی ہے (الاحکام للآمدی، ۱/ ۳۳۹)۔

۲۔ راوی حدیث کا عمل اگر حدیث کے خلاف ہو تو وہ حدیث بھی غیر مقبول ہوگی، یہ رائے بعض احناف کی ہے (حوالہ بالا)۔

۳۔ امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل کو بعض اخبار آحاد پر ترجیح دیتے ہیں (المدرک/ ۴۱)۔

۴۔ اخبار آحاد سے حدود کا اثبات نہیں ہوسکتا، یہ رائے امام کرخی اور ابوعبداللہ بصری کی ہے(روضۃ الناظر، ۱/ ۳۲۸)۔

۵۔ خبر واحد اگر قیاس کے خلاف ہو تو عیسیٰ بن ابان کے نزدیک وہ غیر مقبول ہوگی بشرطیکہ راوی غیر ضابط، روایت کے مضمون سے بے خبر اور متساہل ہو اور اگر راوی ضابط عالم اور متساہل نہ ہو تو ایسی صورت میں قیاس وخبر میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں اجتہاد سے کام لیا جائے گا (الاحکام، ۱/ ۳۴۹)

۶۔ امام جبائی نے حدیث کے مقبول ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرنے والے ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہوں، یہی رائے امام حاکم ابوعبداللہ کی بھی ہے(نزہۃ النظر/ ۱۱)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

تعریف: اس سے مراد وہ ضعیف حدیث ہے جو سنداً اگرچہ ضعیف ہو، لیکن تمام فقہاء اور علماء نے اسے اپنا مستدل بنایا ہو اور فقہی وعملی مسائل واحکام کی اس پر بنیاد رکھی ہو۔

تلقی کا یہ اطلاق صرف فقہاء ومجتہدین کے قبول کرن پر ہوگا، عہد تدوین سے پہلے مجتہدین وفقہاء کا کسی ضعیف حدیث کے قبول کرنے پر اتفاق اہل حدیث کے نزدیک یک گونہ صحیح ہونے اور اس میں صدق کے احتمال کے غالب ہونے کی تائید ہے، بلکہ یہ تائید حدیث کی صحت کے بارے میں حصول علم کے اعتبار سے متواتر سے کمتر درجہ کی متعدد طرق سے منقول روایات کی صحت کے احتمال سے زیادہ قوی ہے۔(یہ الگ بات ہے کہ اتفاق سے ہم تک وہ روایت صحیح وسالم طریقہ سے نہ پہنچ سکی)، ارشاد رسول ﷺ ہے:

"لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" (سنن ابن ماجہ: کتاب الفتن) میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی ہے۔

احادیث موضوعہ

حدیث موضوع کی روایت بیان کرنا حرام ہے اس پر تمام امت کا اجماع ہے، ابن حجر لکھتے ہیں:

"واتفقوا علی تحریم روایۃ الموضوع الا مقرونا ببیانہ"۔

موضوع احادیث کی روایت کے حرام ہونے پر علماء کا اتفاق ہے، البتہ اس کے موضوع ہونے کی تصریح کے ساتھ اس کی روایت کی اجازت ہے، نبی اکرم ﷺ کے اس قول کی بناء پر کہ: جو شخص میری جانب نسبت کرکے کوئی ایسی حدیث بیان کرے گا جس کا جھوٹ ہونا معلوم ہو تو اس کا شمار بھی کذابوں میں ہوگا۔

ابن صلاح لکھتے ہیں:

موضوع ہونے کی تصریح کے بغیر کسی کے لیے کسی موضوع حدیث کی روایت کسی بھی حال میں درست نہیں ہے(معرفۃ علوم الحدیث/ ۱۳۱)۔

موضوع روایات کے سلسلہ میں علماء امت کی ان صاف وصریح تصریحات کے باوجود بھی بعض علماء نے موضوع روایت پر عمل کرنے کو اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ وہ شریعت کے کسی عام اصول سے متصادم نہ ہو، بلکہ اس سے اس کی مطابقت اتنی کھلی ہوئی ہو کہ وہ اسی کی ذیلی شق معلوم ہو (قواعد فی علوم الحدیث/ ۱۵)، لیکن یہ رائے کمزور ہے، کیونکہ موضوع حدیث کو ضعیف کی قسم ماننا بھی محل نظر ہے، اس لیے کہ حدیث موضوع کے کذب میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ حدیث ضعیف کے فی نفسہ صحیح ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے، کیونکہ حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حدیث صحیح یا حسن کی کوئی شرط نہ پائی جائے۔

۳۔ کسی بھی حدیث کی سند میں اگر کوئی واضع حدیث اور کذاب فی الحدیث موجود ہو تو اس کی سند موضوع تصور کی جائے گی، اور متن پر حکم لگانے سے پہلے اس کے تمام طرق کا تتبع واستقصاء کرنا ضروری ہوگا، جس طرح ضعیف راوی کی بناء پر کسی حدیث پر مطلقاً ضعیف ہونے کا حکم

نہیں لگایا جاتا، جب تک اس کے تمام طرق واسانید کا تتبع نہ کرلیا جائے، اسی طرح موضوع روایت میں بھی استقصاء ضروری ہوگا، الا آنکہ اس کا متن ہی محسوسات ومعقولات یا صریح قرآن کے خلاف ہو، کیونکہ کبھی کبھی راوی شہرت کی طلب میں بھی مختلف صحیح احادیث کے متون میں دوسرے سلسلہ سند کوملا دیتا ہے، تاکہ لوگ استغراب واستعجاب کی نگاہ سے ان روایات کو دیکھیں اور سماج ومعاشرہ میں اس کا ذب کا خوب چرچا ہو کہ فلاں شخص کے پاس تو یہ متون ایسے اسانید سے موجود ہیں جو عام محدثین کے یہاں نہیں پائے جاتے، شہرت کی غرض سے احادیث کی سندوں میں ہیرا پھیری کرنے والوں میں ابن ابی دحیہ اور حماد النصیبی زیادہ مشہور ہیں (تدریب الراوی، ا/۲۸۶)، نیز اس امر کا بھی احتمال ہے کہ کوئی حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کے اکثر سلسلہ اسانید تو درست ہوں اور کسی ایک میں کوئی کذاب راوی آگیا ہو۔

مذکورہ بالا امر کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے علامہ ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات میں متعدد حسن احادیث بھی آگئی ہیں (فتح المغیث، ا/۲۹۷)۔

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن سے مراد وہ ضعیف حدیث ہے جس کا ضعف معمولی درجہ کا ہو اور کئی سندوں سے مروی ہونے کی بناء پر اس کا ضعف دور ہو گیا ہو۔

اس طرح کی احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا حکم مطلقاً لگانا درست نہیں ہے، وہ احادیث ضعیفہ جن کے ضعف کا سبب سوء حفظ یا ارسال یا تدلیس یا جہالت ہو تو دوسرے طرق سے مروی ہونے کی بناء پر ان کا ضعف دور ہو جاتا ہے، اور اگر حدیث کے ضعف کا سبب راوی کا فسق ہو تو ایسی صورت میں متعدد طرق واسانید سے مروی ہونے کی وجہ سے حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث کلیۃً بے بنیاد نہیں ہے (مقدمہ ابن صلاح/۱۴)۔

جو امور حدیث کے ضعف کے تدارک کا ذریعہ بنتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر حدیث مرسل ہو تو اس کے کسی دوسرے متصل سلسلہ سند سے مروی ہونے سے وہ ضعف دور ہو جاتا ہے۔

۲۔ اگر حدیث کے ضعف کا سبب سوء حفظ ہو تو دوسرے طرق سے مروی ہونے سے اس کا ضعف بڑی حد تک دور ہو جاتا ہے، بشرطیکہ یہ جابر اصل سے فروتر نہ ہو، کیونکہ کسی حدیث کے متعدد سندوں سے منقول ہونے سے عدم ضبط کا اندیشہ بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔

۳۔ ضعف کا سبب جہالت ہو اور دوسرے طرق میں اس مجہول راوی کی تعیین موجود ہو تو یہ ضعف ختم ہو جاتا ہے اور حدیث قابل استناد ہو جاتی ہے۔

۴۔ تدلیس سے روایت میں جو ضعف آتا ہے وہ بھی دوسرے سلسلہ سند میں سماع کی تصریح سے زائل ہو جاتا ہے (تدریب الراوی، ا/۱۷۶)۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مرسل کے موصولا بیان ہونے یا مدلس کے سماع کی تصریح کرنے، نیز مجہول راوی کی دوسری سلسلہ سند میں تعیین سے تو ضعف کے دور ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ راوی اگر "صدوق" ہو اور سوء حفظ کا شکار ہو تو ظاہریہ کے علاوہ تمام ہی علماء اور فقہاء کے نزدیک یہ ضعف متعدد طرق واسانید سے مروی ہونے کی بناء پر دور ہو جاتا ہے اور وہ حدیث حسن لغیرہ کے مقام پر پہنچ جاتی ہے، اس لیے اس سے استدلال درست ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر یہ حدیث:

"ان امرأة من بنی فزارة تزوجت علی نعلین، فقال رسول اللہ ﷺ: ارضیت من نفسك ومالك بنعلین قالت: نعم فاجاز" (ابن ماجہ، ا/۶۰۸) اصلاً ضعیف ہے، کیونکہ اس کے راوی عاصم سوء حفظ کے شکار تھے، لیکن اس حدیث کے مضمون ومعنی کی دوسرے سلسلہ سند سے تائید ہوتی ہے، اس لیے امام ترمذی نے اسے حسن لغیرہ قرار دیا ہے (سبیل السلام، ۳/۳۱۹)

اور امام شافعیؒ واحمدؒ نے مہر کی کم سے کم مقدار کے متعین نہ ہونے پر اسے اپنا مستدل بنایا ہے (المہذب، ۲/۵۵)۔

• حدیث ضعیف کے ضعف دور ہونے یا نہ ہونے کا ضابطہ یہ ہے کہ حدیث کے مقبول یا مردود ہونے پر غور کیا جائے، اگر اس کے مقبول اور مردود ہونے کا دونوں احتمال برابر ہو تو ایسے احتمال سے ضعف دور ہو جائے گا، اور اگر حدیث کے مردود ہونے کا احتمال قوی ہو تو وہ ضعف دور

نہیں ہوگا (النکت، ا/۲۰۶)۔

تعدد طرق سے ہر قسم کی ضعیف حدیث کو فائدہ پہنچتا ہے، البتہ اگر ضعف کا سبب حفظ واتقان میں کمی ہو تو متعدد سندوں سے منقول ہونے سے اس کا ضعف بڑی حد تک دور ہوجاتا ہے اور وہ حدیث حسن لغیرہ کے مقام تک پہنچ جاتی ہے، البتہ اس سے استدلال واحتجاج کے تعلق سے یہ تفصیل مستحسن ہے کہ فضائل اعمال کے باب میں تو اس سے مطلقاً استدلال کیا جائے، البتہ احکام ومسائل میں اسی وقت استدلال درست ہوگا جب وہ متعدد طرق سے مروی ہو، یا اس کا کوئی صحیح شاہد موجود ہو یا ظاہر قرآن سے اس کی تائید ہورہی ہو، یا ائمہ وتابعین کا اس پر عمل ہورہا ہو، حافظ ابن حجرؒ اور ابن القطان نے اسی تفصیل کو پسند کیا ہے (توجیہ النظر/۲۱۸)

اور اگر ضعف کا سبب فسق ہو تو ایسی صورت میں کثرت طرق سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے کہ اسے منکر یا بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا، ہاں اسے مستدل بنانا جائز نہیں ہے اور کبھی کبھی تو کثرت طرق سے حدیث کے ضعف میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے، (جبکہ دوسرا طبقہ پہلے سے بھی بدتر ہو)

امام زیلعیؒ لکھتے ہیں:

"واحادیث الجهر بالبسملة وان كثرت رواتها لكنها كلها ضعيفة، وكم من حديث كثرت رواته و تعددت طرقه وهو حديث ضعيف كحديث الطير بل قد لا يزيد الحديث كثرة الطرق الا ضعفا" (نصب الرایہ احادیث الجہر بالبسملہ)۔

ضعیف احادیث سے استدلال

تمام ہی فقہاء ومجتہدین کا اتفاق ہے کہ شرعی احکام کا ثبوت صرف صحیح احادیث ہی سے معتبر مانا جائے گا، مشہور مقولہ ہے:

"ان الاحكام لا تثبت الا من طريق صحيح" (الاعتصام للشاطبی/ ۲۳)

لیکن اس اجماع واتفاق کے باوجود کتب فقہ میں ضعیف احادیث سے استدلال کی بعض مثالیں ملتی ہیں، اور ضعیف احادیث سے استدلال کی نسبت بھی ائمہ مجتہدین کی جانب مذکور ہے، چنانچہ فقہ حنفی میں ضعیف حدیث کی بناء پر نماز میں قہقہہ کو ناقض وضو مانا گیا ہے، اور نبیذ تمر سے وضو کی اجازت دی گئی، اور فقہ حنبلی میں قصاص میں آلہ قتل میں مساوات کا لحاظ نہ کرکے تلوار کے ذریعہ قاتل سے قصاص لیے جانے کا اس ضعیف حدیث کی بنا پر فتویٰ دیا گیا (سبل السلام، ۳/ ۴۸۴) "لا قود الا بالسيف" (سبل السلام، ۳/ ۴۸۴) اور فقہ حنفی اور فقہ شافعی میں اس ضعیف ومضطرب حدیث کی بناء پر بیٹے کے قاتل (اگر وہ اس کا باپ ہو) سے قصاص نہ لیے جانے کا فتویٰ دیا گیا۔

ان تمام مثالوں میں عملاً ضعیف احادیث سے استدلال کیا گیا ہے، درانحالیکہ تمام ہی ائمہ مجتہدین کا ضعیف احادیث سے استدلال نہ کرنے پر اجماع ہے، چنانچہ ائمہ کا یہ مقولہ ہے: "ولو صح الحديث فهو مذهبی" ایسے ہی بعض مسائل میں مجتہدین نے حدیث کے ضعیف ہونے کی بناء پر اس سے استدلال نہ کرکے قیاس سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا: "لو صح الحديث لعملت به"۔

مثال کے طور پر امام شافعیؒ نے حدیث بروع کے بارے میں فرمایا: "لا احفظه من وجه يثبت مثله. وقال لو ثبت حديث بروع لقلت به" (سبل السلام، ۳/ ۲۱۷) میری دانست میں یہ حدیث کسی بھی ایسے سلسلہ سند سے ثابت نہیں ہے جو قوی وثابت ہو اور آپ نے فرمایا کہ اگر بروع کی حدیث ثابت ہوتی تو میں اسی کے مفہوم کو لیتا۔

رہا فقہ کی کتابوں میں ضعیف احادیث سے استدلال تو اس کی توجیہ درج ذیل طریقوں سے کی جاسکتی ہے:

۱۔ جرح وتعدیل کے اسباب میں اختلاف کی بناء پر بعض رواۃ کسی کے نزدیک ضعیف قرار پائے تو دوسرے لوگوں کے نزدیک ثقہ، اور اس طرح اس راوی کو ثقہ سمجھتے ہوئے کسی امام نے اس سے مروی حدیث سے استدلال کیا جبکہ دیگر لوگوں نے اسے ضعیف قرار دیا۔

۲۔ بعض احادیث ائمہ مجتہدین تک صحیح سندوں سے پہنچی، لیکن بعد میں اس سلسلہ سند میں کوئی ضعیف راوی درآیا، اس طرح عہد ائمہ میں صحیح حدیث

عہد تدوین میں پہنچ کر ضعیف ہوگئی۔

۳۔ بعض ائمہ نے حدیث کو صحیح نہ پا کر قیاس واجتہاد سے کام لیتے ہوئے فتویٰ دیا، جو اتفاق سے اس ضعیف حدیث کے موافق نکل آیا، اور متاخرین نے فریق مخالف کو خاموش کرنے کے لیے اس ضعیف حدیث کو ذکر کر دیا۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر ہمیں کتب فقہ میں ضعیف احادیث سے استدلال واستنباط نظر آیا ہے، ورنہ حقیقۃً کسی بھی مجتہد یا امام کے مسلک میں متروک وضعیف غیر منجبر حدیث سے استدلال روا نہیں رہا ہے، ہاں حسن لغیرہ سے وہ استدلال کرتے رہے ہیں جس کو امام ترمذی سے پہلے ضعیف ہی کہا جاتا تھا۔

ضعیف احادیث سے استدلال کی بابت منقول ائمہ کے اقوال کی توجیہ

بعض سلف سے احکام ومسائل اور فضائل اعمال کے باب میں ضعیف احادیث سے استدلال کا درست ہونا منقول ہے، جن میں امام احمد بن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ، عبد الرحمن بن مہدی، سفیان بن عیینہؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ابوذکریا العنبری قابل ذکر ہیں (الکفایہ/ ۱۳۴)۔

اس سلسلہ میں دو طرح سے گفتگو کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے:

۱۔ ان اقوال کی نسبت کی تحقیق

۲۔ ان اقوال کے مفہوم ومدعا کی تعیین

ابوسفیان الثوری کے قول کے تخریج رامہرمزی اور خطیب البغدادی نے ان الفاظ میں کی ہے:

”لا تأخذوا هذا العلم فى الحلال والحرام الا من الرؤساء المشهورين بالعلم الذين يعرفون الزيادة والنقصان فلا باس بما سوى ذلك من المشائخ“ (الکفایہ/۱۳۴)۔

حلال وحرام کے اس علم کو صرف انہیں راویوں سے حاصل کرو جو علم روایت سے واقف ہوں اور جو احادیث کی سندوں اور متنوں میں کمی وبیشی سے واقف ہوں، حلال وحرام کے علاوہ دیگر اشیاء کا علم ان سے کمتر درجہ کے مشائخ سے حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عبد الرحمن بن مہدی سے منقول رائے یوں ہے: جب ہم حلال وحرام اور احکام کے باب میں روایت کرتے ہیں تو سندوں اور راویوں کی تحقیق میں پوری احتیاط وشدت برتتے ہیں اور فضائل اعمال کے باب میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے آپ کی جانب منسوب قول کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: امام احمد سے ضعیف احادیث سے استدلال کی جو رائے منقول ہے، اس سے مراد حدیث حسن لغیرہ ہے، کیونکہ آپ کے عہد میں حدیث کی صرف دو ہی قسمیں تھیں:

۱۔ صحیح، ۲۔ ضعیف۔ اور پھر ضعیف کی دو قسمیں کی جاتی تھیں، ضعیف متروک، ۲۔ ضعیف حسن، حدیث کی سہ طرفی موجودہ تقسیم تو امام ترمذیؒ نے کی ہے اور آپ سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے حدیث کی تین قسمیں کیں اور اپنی ”سنن“ میں حسن کا خوب استعمال کیا، اور حدیث حسن امام ترمذیؒ کے نزدیک وہ حدیث ہے جو متعدد طرق سے ثابت ہو اور اس کے راویوں میں متہم بالکذب راوی نہ ہو، اور نہ ہی وہ روایت شاذ ہو، تو اس قبیل کی احادیث کو امام احمد ضعیف کہتے ہیں، اور ان سے استدلال کے قائل ہیں، اسی لیے ضعیف کے مثال میں امام احمد نے ان حدیثوں کو پیش کیا ہے جو حسن لغیرہ ہیں، جیسے عمرو بن شعیب (جمہور کے نزدیک یہ ثقہ ہیں، تہذیب التہذیب، ۱/ ۱۶۵) اور ابراہیم الہجری سے مروی احادیث (بعض علماء کے نزدیک آپ ثقہ اور جمہور کے نزدیک ضعیف ہیں)۔

امام ابوحنیفہؒ کی جانب ضعیف احادیث سے استدلال کی بات بلا سند منسوب ہے، امام سخاوی نے فتح المغیث میں اسے صیغۂ تمریض وتشکیک سے

نقل کیا ہے لکھتے ہیں:

"یقال عن ابی حنیفة ذلك" (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۳)۔

سند سے منقول نہ ہونا خود اس بات کے بے اصل ہونے کی دلیل ہے، اور اس چیز کو مزید تقویت اس امر سے بھی پہنچتی ہے کہ آپ احادیث کے تثبت میں شدت احتیاط کے قائل تھے، حتیٰ کہ اسی کی بنا پر لوگوں نے آپ کی جانب اخبار آحاد کی مقبولیت کے لیے چند شرطوں کے لگانے کی بات منسوب کردی، ایک جانب تو یہ احتیاط کہ راوی کا فقیہ ہونا اور روایت کے موافق اس کا عمل ہونا بھی مقبولیت کے لیے ضروری ہو اور دوسری جانب یہ بے احتیاطی کہ ضعیف روایت سے بھی استدلال درست ہونا قابل فہم ہے، رہا ابن القیم کا یہ کہنا کہ آپ نماز میں قہقہہ کو مفسد وضو ونماز اور نبیذ تمر سے وضو کی حلت کے قائل ضعیف حدیث کی بناء پر ہی تھے (اعلام الموقعین، ۱/ ۷۷) محل نظر ہے، ہوسکتا ہے آپ کے عہد میں یہ حدیثیں آپ تک ثقہ راویوں کے ذریعہ پہنچی ہوں اور عہد تدوین آتے آتے ان کی سندوں میں کوئی ضعیف راوی آ گیا ہو۔ واللہ اعلم

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف سے استدلال

اس مسئلے میں علماء کے تین نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں:

۱۔ ضعیف ومتروک احادیث پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے، یہ رائے یحییٰ بن معین، امام مسلم، امام بخاری، ابوبکر بن العربی، ابوشامہ المقدسی، ابن حزم الظاہری، الشہاب الخفاجی، جلال الدوانی، اور امام شوکانی کی ہے (لمحات فی اصول الحدیث/ ۱۹۶، ۱۹۷، مقالات الکوثری/ ۴۵)۔

۲۔ ترغیب وترہیب اور فضائل اعمال کے باب میں ضعیف احادیث سے استدلال مطلقاً درست ہے، یہ رائے امام احمد کی جانب منسوب ہے اور امام ابوداؤد کا بھی یہی مسلک تھا (القول البدیع/ ۱۹۵)۔

۳۔ فضائل اعمال کے باب میں ضعیف احادیث سے استدلال واعتبار درج ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہے:

۱۔ حدیث کا ضعف خفیف ہو، گویا وہ روایات جو جھوٹے یا متہم بالکذب راویوں کے ذریعہ آئی ہوں یا ایسے رواۃ کے ذریعہ جن کی غلطیاں واضح ہوں اور وہ روایت میں منفرد ہوں تو ان سے استدلال درست نہیں ہے۔

۲۔ وہ حدیث شریعت کے کسی عام اصول کے تحت مندرج ہو، اس طرح وہ روایات جن کی کوئی اساس وبنیاد نہ ہو وہ بھی عمل کے دائرہ سے خارج ہوں گی۔

۳۔ عمل کے وقت ان کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھا جائے، تاکہ کسی غلط بات کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی جانب نہ ہوسکے۔

پہلی شرط محققین کے نزدیک متفق علیہ اور آخری دونوں شرطیں عز بن عبد السلام اور ابن دقیق العید نے بیان کی ہیں۔

یہ رائے ابن صلاح (معرفة علوم الحدیث: ۱۳۵)، امام نووی (الاذکار امام نووی: ۵)، امام سخاوی (فتح المغیث، ۱/ ۳۳۲) حافظ ابن حجر، ابن عبد البر (التمہید ۶/ ۳۹)، عز بن عبد السلام، ابن دقیق العید، امام سیوطی اور جمہور محققین کی ہے (منہج العقد فی علوم الحدیث: ۲۹۲)، یہاں تک کہ امام نووی نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کر دیا ہے جو محل نظر ہے (المنہل اللطیف فی احکام الحدیث الضعیف، السیوطی علوی المالکی: ۱۳)۔

☆☆☆

احادیث ضعیفہ اور اس پر عمل

مولانا عبدالرشید قاسمی [1]

محور اول

ا۔الف۔حدیث ضعیف کی تعریف

لغوی۔ضعیف بمعنی کمزور۔کمزوری اور ضعف حسی بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی، مراد یہاں معنوی ہے:"الضعف والضعف خلاف القوة وقيل: الضعف بالضم في الجسد والضعف بالفتح في الرأي والعقل وقيل هما جائزان في كل وجه"(لسان العرب،۹/ ۲۰۳)۔

(جب ضمہ سے پڑھیں تو مراد جسمانی کمزوری ہوگی اور جب فتح سے پڑھیں تو مراد رائے اور عقل کی کمزوری ہوگی)۔

اصطلاحی تعریف: جس میں صحیح اور حسن کی شرطیں نہ پائی جائیں (قواعد الحدیث/۱۰۸)۔

۲۔اسباب ضعف

شیخ الاسلام علامہ ابن حجر العسقلانی نے یہ اسباب بیان کیا ہے:

"اما ان يكون لكذب الراوى او تهمة بذلك او فحش غلطه او غفلته او فسقه او وهمه او مخالفته او جهالته او بدعته او سوء حفظه"۔

راوی میں اگر عدالت اور ضبط نیز قلت عدالت سے جو نقص لاحق ہوتا ہے ان سے پاک ہو تو یہ روایت صحیح لذاتہ کہلائے گی، اور اگر راوی ساقط العدالت ہو تو اس سے پانچ بنیادی کمزوریاں لاحق ہوتی ہیں کذب، تہمت کذب، فسق، جہالت، بدعت، تو ایسے راوی کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں، اسی طرح اگر راوی ضابط نہ ہو تو اس میں بھی پانچ کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جو روایت کو بے اعتبار بنا دیتی ہیں، فرط غفلت، کثرت غفلت، مخالفت ثقات، وہم، سوء حفظ، اسباب ضعف میں سے پانچ کا تعلق راوی کی عدالت سے ہے، لہٰذا جن احادیث میں ان اسباب میں سے کوئی بھی سبب پایا جائے تو وہ حدیث ضعیف کہلائے گی، اور حدیث ضعیف بمعنی حسن لغیرہ ہوگی اس سے استدلال صحیح ہوگا۔(نزھۃ النظر/ ۵۵)

محدثین وفقہاء کے مابین اتفاقی واختلافی نکات

امام ابوحنیفہؒ کے نظریہ حدیث کی ترجمانی حافظ شمس الدین الذہبی یوں کرتے ہیں:

"آخذ بكتاب الله فما لم اجد فبسنة رسول الله ﷺ والآثار الصحاح عنه التى فشت فى ايدى الثقات عن الثقات فإن لم اجد فبقول اصحابه آخذ بقول من شئت، واما اذا انتهى الامر ابراهيم والشعبى والحسن وعطاء فأجتهد كما اجتهدوا" (مناقب ابی حنیفہ/۲۰)۔

محقق ابن الہمام (۸۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ جب کوئی صحابی اپنی روایت کردہ حدیث پر عمل نہ کرے یا اس کے خلاف فتوی دے تو وہ روایت امام صاحب کے نزدیک خود حجت نہ ہوگی، کیونکہ اس کے ساتھ تواتر عمل ثابت نہیں ہوسکا، حضرت امام کا یہ نظریہ انتہائی سخت ہے کہ روایت کے ساتھ راوی کا عمل ساتھ ساتھ چلے، ایسے راوی تو صحیح بخاری ومسلم میں بھی کم ملیں گے، حضرت امام تو اتر عمل کے اس حد تک قائل تھے کہ وہ اس کی تائید میں ان روایات

---

[1] گورینی بازار جونپور۔

وآثار سے مدد لیتے تھے جو اپنی جگہ مرسل ہوں مگر عملاً اتصال رکھتے ہوں۔

امام صاحب کے اس نظریہ کی بنیاد یہ شرط تھی، امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

"حدثنا سليمان ابن شعيب. حدثنا ابن عن ابی يوسف قال قال ابوحنيفة: لا ينبغی للرجل ان يحدث عن الحديث الا بما حفظه من يوم سمع الى يوم يحدث" (الجواهر المضيئه)۔

المبسوط میں ہے کہ امام صاحب حدیث صحیح کے مقابل میں کسی بھی رائے کا اعتبار نہیں کرتے تھے، بلکہ علامہ ابن حزم نے فقہاء عراق کا اجماع نقل کیا ہے کہ وہ حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔

ایسے ہی حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں: "ان ضعيف الحديث عنده ای ابی حنيفة اولى من القياس"، اور اس کی بکثرت مثالیں مذہب حنفی میں موجود ہیں، حديث وضو بالقهقهه فی الصلوة، حديث وضوء بنبيذ التمر وغیرہ کو باوجود ضعیف ہونے کے امام صاحب نے قیاس پر مقدم کیا ہے اس کی تفصیل کرتے ہوئے حافظ بن قیم فرماتے ہیں:

"فتقديم الحديث الضعيف وآثار الصحابة على القياس والرأى قوله ای قول الامام ابی حنيفة واحمد" (السنة و مكانتها/٤٧٠)۔

امام شافعی علیہ الرحمہ ابتداء میں تحقیق اسناد پر توجہ زیادہ فرماتے تھے، آپ کے یہاں حدیث کی قبولیت کا معیار اس کی صحت سند تھا، استفاضۂ عمل کو کچھ نہ سمجھتے تھے، لیکن آخری دور میں آپ بھی سیدنا امام ابوحنیفہ کے نظریۂ حدیث کے پیروکار ہوئے، اب آپ فرماتے کہ تواتر عمل کے ہوتے ہوئے اسناد کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، بیس رکعت تراویح کے ثبوت میں آپ کے پاس کوئی صحیح حدیث نہ تھی، آپ نے اہل مکہ کے عملی استفاضہ سے استدلال کیا، چنانچہ امام ترمذی لکھتے ہیں:

"وقال الشافعی وهكذا ادركت ببلدنا بمكة يصلون عشرين ركعة" (ترمذی،١/ ١٣٩)۔

اسی فکری تبدیلی کے باعث اکثر مسائل میں آپ کے دو قول ملتے ہیں، جنہیں قول جدید اور قول قدیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کا نظریہ یہ تھا کہ آثار صحابہ حجت اور سند ہے، آپ کا عقیدہ تھا کہ صحابہ آسمانی ہدایت کے روشن ستارے ہیں، امت پر ان سے رہنمائی حاصل کرنا لازم ہے، صحابی کی بات کو حجت تسلیم کرتے ہوئے، آپ امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہیں (جامع بیان العلم، ٢/ ١٣٥)۔

امام احمد بن حنبل کا موقف بھی یہی ہے کہ حدیث ضعیف کو اپنے قیاس اور اجتہاد پر مقدم کرنا چاہئے، ضعیف حدیث کو کلیتاً ترک کرنا صحیح نہیں، جب کسی موضوع پر صحیح حدیث نہ ملے تو وہاں ضعیف حدیث کو ہی لے لینا چاہئے، امام اعظم اور امام احمد کا مسلک اس باب میں ایک ہے، حافظ ابن قیم (٧٥١ھ) لکھتے ہیں:

"فتقديم الحديث الضعيف وآثار الصحابة على القياس والرأى قوله وقول احمد" (اعلام الموقعين)۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم

بہت سی حدیثیں سنداً ضعیف ہوتی ہیں لیکن دوسرے قرائن سے ان کا مضمون ثابت ہوتا ہے اور وہ قرائن اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ ان کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

"واذا قيل هذا حديث غير صحيح، فمعناه لم يصح اسناده على الشرط المذكور لا انه كذلك فی نفس الأمر" (تدريب الراوی،١/ ٧٦)۔

عموماً محدثین اس پر متفق نظر آتے ہیں کہ ضعیف روایتیں احکام واعتقادات میں قابل عمل نہیں ہیں۔ البتہ ترغیب وترہیب اور فضائل کے باب میں ضعیف روایتوں کو قابل عمل سمجھا گیا ہے، اگرچہ اس میں تفصیل ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن حجر نے کچھ یوں تفصیل فرمائی ہے:

۱۔ صرف فضائل اعمال میں حدیث ضعیف کو قابل عمل سمجھا جائے۔

۲۔ اگر ضعف شدت کا ہو اور اس میں کوئی راوی کذاب و متہم بالکذب ہو اور وہ راوی بھی منفرد ہو تو وہ حدیث ضعیف قابل عمل نہ ہوگی۔

۳۔ وہ روایت کسی معمول بہ اصول سے متعارض نہ ہو (قواعد التحدیث/۱۱۶)۔

اس سلسلے میں حافظ عراقی نے شرح الفیہ اور علامہ جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی میں اور امام نووی نے تقریب میں مفصلاً کلام فرمایا ہے۔

دوسری قابل توجہ بات حدیث ضعیف کے سلسلے میں یہ ہے کہ کسی حدیث ضعیف میں اس کی سند صحیح نہ ہو تو "قال رسول اللہ ﷺ" نہ کہنا چاہئے، محدثین اس میں احتیاط کرتے ہیں اور ایسے مواقع پر چند احتیاطی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جیسے:

"روی عنه کذا، بلغنا عنه کذا، جاء عنه کذا، نقل عنه کذا وغیر ذلک" (قواعد التحدیث ۱۳۱)۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر حدیث ضعیف میں اشکالات وارد ہوں تو انہیں تاویلات سے رفع کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ کوئی جواب دینے کی ضرورت ہے، بلکہ اشکالات کے رفع کے لیے اتنا واضح کر دینا کافی ہے کہ یہ روایتیں ضعیف ہیں، کیونکہ تاویل اور حل اور روایتوں میں تطبیق تو دراصل صحیح روایتوں میں کی جاتی ہے نہ کہ ضعیف روایتوں میں، حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں اسی احتیاطی پہلو کو اختیار فرمایا ہے۔ (فتح الملہم ۱/۵۸)۔

محور دوم

ب۔ موضوع

ا۔ حدیث موضوع کی تعریف

لغوی:...... موضوع، بمعنی وضع کردہ، گڑھا ہوا ہونا، "وضعه یضعه" دونوں ضاد کے فتح کے ساتھ معنی یہ ہے کہ اس نے اس کی قدر یا وقار میں کمی کی یا حیثیت کو کم کیا، وضع وضعًا رکھنا ڈالنا گڑھ لینا۔

اصطلاحی تعریف:...... محدثین کے نزدیک ایسے مضمون کو حدیث موضوع کہتے ہیں جس کی جھوٹی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف عمداً کی جائے، جس کو نبی کریم ﷺ نے نہ لفظاً فرمایا ہو نہ معناً (ایضاً ص ۱۰)۔

لغوی و اصطلاحی تعریف میں مناسبت

جب موضوع بمعنی وضع کردہ اور گڑھا ہوا ہونا ہے، اور محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم ﷺ کی طرف جھوٹے مضمون کی نسبت حدیث موضوع کہلاتا ہے، تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ دونوں تعریفوں میں نسبت تامہ ہے، لہٰذا تعریف سے بھی حدیث موضوع کی قباحت واضح ہوگئی (حوالہ بالا)۔

۲۔ حدیث موضوع کا حکم

علماء اس امر پر متفق ہیں کہ جس حدیث موضوع کا علم ہو تو بلا تصریح وضع اس کی روایت جائز نہیں، بلکہ اس طرح کے کسی بھی مضمون کا بلا صراحت نقل کرنا جائز نہیں خواہ اس کا تعلق کسی بھی مسئلہ مضمون سے ہو، حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی بناء پر۔

"عن سمرة بن جندب قال قال رسول اللہ ﷺ: من حدثه عنی بحدیث یری انه کذب فهو احد الکذابین" ورواه الامام احمد وابن ماجة الکذابین علی صیغة التثنیة والکاذبین بالجمع (قواعد التحدیث/۱۵۰)

بعض صوفیہ اور کرامیہ ترغیب اور ترہیب کے حق میں جواز کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے الفاظ بعض روایات میں ایسے ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ ممانعت اس مضمون کے حق میں ہے جو مخالفت اور نقصان پر مبنی ہو، اور جو موافقت و مصلحت اور نفع پر مبنی ہو اس کے حق میں ممانعت نہیں ہے، جمہور اس رائے کے خلاف ہیں (نزہۃ النظر/۵۸)۔

واضع حدیث کا کسی سند میں شامل ہونا

امام ابو محمد الجوینی واضع حدیث کو کافر کہتے ہیں (نزہۃ النظر/ ۵۹)۔

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حدیث رسول ﷺ کے سلسلہ میں عمداً جھوٹ بولنے کے بعد کذب فی الحدیث کی توبہ اور روایت کبھی بھی قبول نہ ہوگی (الوضع والوضاعون/ ۳۰۱)۔

کسی واضع حدیث کا کسی بھی سند میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کی ہر روایت مندرجہ ذیل ائمہ کے نزدیک مردود ہے:

امام ابو محمد الجوینی، علامہ ابن صلاح، احمد بن حنبل، عبداللہ مبارک، امام حمیدی، ابوبکر صیرفی امام ذہبی اور امام عینی رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

ان ائمہ نے ظاہراً کچھ قیود لگائے ہیں مگر سب کا حاصل ایک ہے، مثلاً ابو محمد کے نزدیک قبل التوبہ وبعد التوبہ کسی بھی صورت میں کذاب فی الحدیث کی روایت قبول نہیں ہوگی، علامہ ابن صلاح کے نزدیک عمد کی شرط ہے، لہٰذا خطاء اور سہو کی صورت میں روایت قبول ہوگی، امام احمد بن حنبل نے کہا کہ توبہ ایک پوشیدہ امر ہے، لہٰذا ایک مرتبہ بھی کذب بیانی کرنے سے روایت قبول نہ ہوگی، عبداللہ بن المبارک کے نزدیک کذاب فی الحدیث کی حدیث موضوع کے علاوہ حدیث صحیح بھی قبول نہ ہوگی، امام حمیدی نے ابدی طور پر عدم قبولیت کو فرمایا ہے، امام ذہبی نے کہا ہے کہ جب کذب بیانی سے لوگوں سے گفتگو کرنے میں کام لیتا ہے تو صدق میں بھی احتمال ہوگیا، امام عینی کے نزدیک جب کذاب ایک مرتبہ بھی جھوٹی شہادت میں گرفتار ہوگیا تو اب توبہ کرے یا نہ کرے اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی روایت حدیث کو شہادت کے اقسام میں سے مانتے ہیں، امام نووی ان تمام ائمہ کی آراء کو کمزور مانتے ہیں اور قواعد شرعیہ کے خلاف بھی تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ قول مختار یہ ہے کہ اگر کذاب فی الحدیث توبہ کرنے کے وقت تین شرطوں کی رعایت کرے تو توبہ کے بعد روایت قبول کی جائے گی ورنہ نہیں، ۱۔ گناہ سے کنارہ کشی کرلے ۲۔ گناہ پر ندامت ہو۔ ۳۔ مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم ہو، دلیل یہ ہے کہ کفر سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے، اسلام لے آنے کے بعد روایتیں قبول ہوتی ہیں، اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس صفت سے متصف تھے، نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ" (حوالہ بالا)، اور چونکہ کذب بیانی اسباب فسق میں سے ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: "التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ"۔

محور سوم

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔ تلقی بالقبول کی کیفیت وہ ہے: ایک آنحضرت ﷺ کے ظاہری اقوال اور دوسری صورت دلالت نص واجتہاد سے استدلال کرنا۔

ظاہری اقوال سے اخذ کے لیے آیات سے منقول ہونا ضروری ہے، خواہ تواتر ظاہری ہو یا معنوی اور تواتر ظاہری الفاظ قرآن یا احادیث نبوی سے ماخوذ ہے، اور تواتر معنوی جیسے احکام طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، بیع وشراء، غزوات وغیرہ ہیں، ان احکام کے بارے میں فرق اسلامیہ میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے اور تواتر معنوی کی قسموں میں سے اعلیٰ قسم مستفیض ہے۔

۱۔ یہ ایسی روایت ہے جن کے راوی تین یا تین سے زائد صحابہ ہوں اور پانچویں طبقہ تک برابر ان میں اضافہ ہوتا رہے، اور یہ قسم کثیر تعداد میں پائی جاتی ہے اور اسی پر فقہ کی بنیاد ہے۔

۲۔ اس کے بعد وہ احادیث ہیں جن کا حفاظ حدیث نے فیصلہ کیا ہو۔

۳۔ اس کے بعد ان اخبار واحادیث کا مقام ہے جن کی قبولیت میں اختلاف ہو، لیکن استحکام شواہد اور عقل سلیم سے ان کی تائید ہوتی ہو تو اس کی پیروی لازم ہے۔

دوسرا طریقہ:...... اخذ شریعت کا کتاب اللہ اور سنت رسول کی دلالت ہے، مثلاً صحابہ نے کوئی ارشاد نبوی سنا یا کوئی عمل نبی دیکھا اور اس سے ایک حکم مستنبط کرکے لوگوں کو بتلایا کہ یہ واجب ہے، نیز تابعین، تبع تابعین وغیرہ نے اپنے فتاوی کو مدون کیا، اس طریقے پر شریعت کو حاصل کرنے

والے صحابہ چار ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ۔ لیکن حضرت عمرؓ صحابہ کی ایک فقہی کونسل قائم کئے ہوئے تھے جس کے وقتاً فوقتاً اجلاس ہوتے تھے، اہم اور جدید مسائل پر بحث ہونے کے بعد پیش آمدہ مسائل حل ہوتے، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر جس راستہ پر چلتے ہم اس کو سہل پاتے، حضرت عمرؓ کے فیصلے یا یوں کہئے کہ فقہی کونسل کی تجاویز کی اطراف واکناف میں پیروی کی گئی اور آج تک اقتداء ہورہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی، باقی صحابہ کی مقامی یا علاقئی طور پر اقتداء ہوئی، سیدنا علیؓ وابن مسعودؓ کے فیصلے عموماً حدود کوفہ سے متجاوز نہ ہوسکے اور حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ کے حدود مکہ کی سرحد تھی۔

اکابر تابعین میں فقہاء سبعہ تھے جن کے فیصلے اور فتاویٰ ان کے علاقوں میں سکۂ رائج الوقت تھے، مثلاً مدینہ طیبہ میں کوئی فتویٰ قابل قبول نہ ہوتا، جب تک حضرت سعید بن المسیب دستخط نہ کردیں، مکہ مکرمہ میں عطاء بن ابی رواح کے فتاوے نقود کی حیثیت حاصل کرچکے تھے، کوفی حضرات ابراہیم نخعی کے فتاویٰ کے مقلد تھے، اور حضرت شریح اور شعبی کے بھی فتاویٰ رائج تھے، بصرہ کا دارالافتاء حضرت حسن بصری کا مرہون منت تھا۔

تلقی بالقبول کا تیسرا طریقہ:...... صحابہ اور تابعین نے کتاب وسنت سے جو استنباط اور قیاس کیا اسے دین کا جزء قرار دیا گیا، البتہ اجتہاد کی ہر صورت کا صحیح ہونا ضروری نہیں، مثلاً ابن مسعود اور حضرت عمرؓ عنہم نے جنابت کے موقع پر تیمم کی بابت اجتہاد کیا لیکن تمام صحابہ نے ابن مسعود کے اجتہاد پر اتفاق کیا اور اللہ رب العزت نے بھی تائید فرمادی۔

۲۔ تلقی بالقبول کی تفسیر کے بعد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ احادیث ضعیفہ ان احادیث سے علیحدہ حکم رکھتی ہیں جن پر تلقی بالقبول نہ پائی جاتی ہو، لہٰذا اس حدیث ضعیف کا حکم یہ ہے کہ قابل استدلال ہے اور اس پر عمل کی گنجائش ہے، چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا مستحب ہے واجب نہیں۔

اور ابن العربی مالکی ایسی حدیث ضعیف پر عمل کرنے سے منع فرماتے ہیں۔

"ومنع ابن العربي المالكي العمل بالضعيف مطلقًا" (فتح الملهم ۱/۵۸)

۳۔ محدثین اور فقہاء کے نزدیک تلقی بالقبول سے عموماً درایتاً مراد ہے، یعنی حدیث ضعیف کے موافق عمل کرنا اس کا حکم عرض ہوچکا، اب رہا مسئلہ کہ تلقی کی ایک صورت روایت کی ہے کہ علماء اس کو آپس میں روایت کرتے ہوں تو ایسی صورت کا حکم یہ ہے کہ حدیث ضعیف کی تلقی بالقبول کی روایت کے لیے بھی وہی شرائط ہیں، فرق یہ ہے کہ اگر حدیث ضعیف حلال وحرام سے یا صفات باری تعالیٰ سے متعلق ہو تو اسانید بیان کرنے میں تساہل نہیں ہونا چاہئے اور درایت کی صورت میں اگر کچھ کی اسانید میں کمزوری ہے تو امت کا قبول کرنا اور عمل کرلینا یہ اس کی کمزوری کو دور کردینے کے مرادف ہے، لہٰذا دونوں صورتوں کا حکم الگ الگ ہے (الکفایہ/ ۱۳۳، ۱۳۴، علوم الحدیث/ ۹۳)۔

محور چہارم

۱۔ حدیث ضعیف مؤید بقرائن

حدیث ضعیف منجبر یعنی ایسی سنداً کمزور حدیث جس کی کمزوری کو دوسرے امور نے دور کردیا ہو۔

اسباب طعن میں سے پانچ کا تعلق راوی کے ضبط سے ہے، مثلاً فحش غلط، کثرت غفلت، وہم، مخالفت ثقات، سوء حفظ، اگر کسی راوی کی روایت میں ان اسباب خمسہ میں سے کوئی ایک سبب پایا جائے اور اسی کے ساتھ کوئی اور دوسری سند جو اس کے ہم مثل یا اعلیٰ ہو تو اس راوی کی روایت کا ضعف دور ہوجائے گا، اور اگر کسی راوی میں یہ اسباب پائے جاتے ہیں مثلاً کذب، تہمت کذب، فسق، جہالت اور بدعت تو اس کی یہ حدیث دوسرے قرائن سے مؤید نہیں ہوسکتی اور اصلاً یہ حدیث قابل قبول بھی نہ ہوگی۔

۲۔ اگر سوء حفظ وغیرہ جیسی علت ہو تو یہ دوسرے امور سے دور ہوسکتے ہیں اور جب یہ ضعف ختم ہوگیا تو فضائل کے علاوہ واحکام میں بھی ایسی حدیث پر اعتماد کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

۴۔تعدد طرق

حدیث ضعیف کی دوقسم ہیں: ایک حدیث ضعیف مؤید بطرق اور دوسری قسم حدیث ضعیف متروک، حدیث ضعیف مؤید بطرق یہی حسن لغیرہ ہے، اور یہی قسم زیر بحث ہے، رہا حدیث ضعیف متروک بمعنی موضوع تو یہ زیر بحث مسئلہ سے خارج ہے، لہٰذا اگر ضعف راوی کے کذب یا فسق کی بناء پر ہے تو یہ ضعف اس کے ہم مثل سے ختم نہیں ہوگا، بلکہ یہ تمام طرق منکر کے درجہ پر پہنچ جائیں گے اور اگر سیٔ الحفظ یا مستور الحال راوی کوئی روایت کرے تو یہ حدیث حدیث ضعیف ہوگی مگر اس کے ہم مثل سے مل کر یہ ضعف دور ہوجائے گا، یہی رائے امام بخاری، امام نووی اور امام بیہقی کی ہے اور ان محدثین نے یہ بھی فرمایا کہ حدیث ضعیف قابل استدلال ہوگی بشرطیکہ کوئی راوی کذب یا متہم بالکذب سے مشہور نہ ہو، اور جب اسانید ہم مثل ہوں گی تو الفاظ میں بھی موافقت ہوجائے گی (قواعد التحدیث/۱۰۹)۔

حدیث ضعیف مؤید بطرق احکام میں بھی مستدل بن سکتی ہے چار شرطوں کے ساتھ:

۱۔ اذا کثرت طرقه، ۲۔ او عضده اتصال عمل، ۳۔ او موافقه شاهد صحیح، ۴۔ او ظاهر القرائن (حوالہ بالا)۔

عون الباری میں امام نووی سے نقل کیا گیا ہے کہ حدیث ضعیف ایک سے زائد سندوں سے مؤید ہونے کی بناء پر حسن لغیرہ کے درجہ تک پہنچ جائے گی اور یہ مقبول اور معمول بہ بھی ہوگی (ایضاً)۔

لیکن علامہ ابن حزم ظاہری جمہور محدثین سے ایک الگ ہی رائے رکھتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ کسی حدیث کو اہل مشرق اور مغرب یا ایک بڑی جماعت دوسری بڑی جماعت سے یا ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی سے نقل کریں، یہاں تک کہ اس حدیث کی سند آنحضرت ﷺ تک پہنچ جائے مگر اس سند میں کوئی ایسا شخص ہو جو مجروح بالکذب یا غفلت سے متصف یا مجہول الحال ہو تو ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ اس حدیث کو بیان کریں، یا اس کی تصدیق کریں، یا اس سے استدلال کریں۔ (ایضاً)

حدیث ضعیف مؤید بطرق کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

امام ترمذی حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے حالت حیض میں یا اس کے پچھلے مقام میں صحبت کرے، یا کسی کاہن کے پاس جائے تو وہ محمد ﷺ پر نازل کردہ کتاب وشریعت کا منکر ہے، امام ترمذی کا بیان ہے کہ ہم تک یہ حدیث حکیم بن اثرم کے واسطے سے پہنچی ہے اور امام بخاری نے اسناداً اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (ترمذی مع تحفہ، ۱/۴۱۹)

سنداً یہ حدیث ضعیف (حسن لغیرہ) ہے مگر ان کے مضامین کتاب اللہ کے ظاہر آیت کے موافق ہیں، ارشاد باری ہے:

"یسئلونك عن المحیض قل هو اذی فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوهن حتی یطهرن."

پچھلے مقام میں صحبت کرنے کے سلسلہ میں حدیث میں شدید وعید آئی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، "من اتی امرأته فی دبرها لم ینظر الله الیه یوم القیامة"

اور مفسر قرطبی نے صراحت کی ہے کہ ایک نہیں بارہ صحابیوں سے مختلف عبارتوں کے ساتھ احادیث صحیح ومسند میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے اور تفسیر ابن کثیر میں بھی شرح وسط کے ساتھ حدیثوں کے حوالہ سے اس پر کلام کیا گیا ہے (تفسیر ماجدی، ۱/۴۲۱)۔

محور پنجم

۱۔احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

ایسی احادیث ضعیفہ جو متلقی بالقبول یا مؤید بقرائن یا مؤید بطرق نہ ہوں، تو ان سے بھی احکام ومسائل کے باب میں استدلال کی گنجائش ہے، اور یہ وہ احادیث ضعیفہ ہیں جن سے ائمہ مجتہدین علیحدہ علیحدہ اجتہاد کرتے ہیں، یعنی ہر امام کا ایک جداگانہ اجتہاد ہوتا ہے، لہٰذا ان احادیث ضعیفہ سے احکام ومسائل کے باب میں اعتبار کی گنجائش ہے، ترمذی میں حضرت مغیرہ ابن شعبہ کی روایت ہے: "ان النبی ﷺ مسح اعلی الخف واسفله"۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث معلول ہے، لیکن معلول حدیث ہونے کے باوجود امام ترمذی فرماتے ہیں کہ بہت سے صحابہ وتابعین کا یہی مذہب ہے، اور ائمہ اربعہ میں سے امام مالک اور امام شافعی نیز امام اسحاق اسی کے قائل ہیں (۱/ ۹۸)۔

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئا من القرآن" امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اور اسی ضعیف حدیث پر اکثر صحابہ وتابعین کا عمل ہے، اور اسی مذہب کے قائل سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق ہیں (تحفۃ الاحوذی، ۱/ ۱۲۴)۔

محور ششم

۱- باب فضائل میں احادیث ضعیفہ کا استدلال واعتبار

فضائل کے باب میں احادیث ضعیفہ پر اعتماد درست ہے یا نہیں؟ اس بابت حضرات محدثین اور اصولیین کے تین نظریات ہیں:

نظریہ اول:

احادیث ضعیفہ پر مطلقاً عمل کرنا جائز نہیں نہ احکام میں نہ فضائل میں، علامہ ابن سید الناس نے عیون الاثر میں اسی کو یحییٰ بن معین سے بیان کیا ہے، اور فتح المغیث میں اس نظریہ کی نسبت ابوبکر ابن العربی کی طرف ہے، اور امام بخاری اور امام مسلم کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے، علامہ ابن حزم کا بھی یہی مذہب ہے، اپنی کتاب الملل والنحل میں فرماتے ہیں کہ وہ حدیث جس کو تمام اہل مشرق ومغرب نقل کریں، یا ایک بڑی جماعت دوسری جماعت سے ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی سے نقل کرے یہاں تک کہ اس حدیث کی سند نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے، مگر سند میں کوئی شخص مجروح بکذب یا غفلت ہو یا مجہول الحال ہو، تو ہمارے نزدیک اس حدیث کی روایت کرنا یا اس کی تائید کرنا یا اس کے کسی جزء سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔

نظریہ ثانی:

حدیث ضعیف پر مطلقاً عمل کیا جائے گا، امام سیوطی فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد، امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مذہب یہی ہے، اور ائمہ حدیث ضعیف کو قیاس سے زیادہ قوی مانتے ہیں۔

نظریہ ثالث:

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر چند شرطوں کے ساتھ عمل کیا جائے گا، اور یہی قول محدثین کے نزدیک معتمد ہے۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ فضائل کی احادیث میں اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے طرق سے بحث کی جائے، امام حاکم کہتے ہیں کہ میں نے ابوذکریا عنبری کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حدیث جب ایسے مسئلہ میں وارد ہو جس میں نہ کوئی حرام حلال ہو رہا ہو اور نہ کوئی حلال حرام کیا جائے اور نہ کسی حکم کا وجود ہو، البتہ وہ حدیث ترغیب اور ترہیب کے سلسلہ میں آئی ہو تو اس میں چشم پوشی کرتا ہوں اور اس کے رواۃ میں تساہل برتتا ہوں۔

اور ابن مہدی کے الفاظ جنکی تخریج امام بیہقی نے المدخل میں کی ہے کہ جب ہم نبی ﷺ سے حرام حلال اور احکامات کی بابت روایت کرتے ہیں تو ہم سندوں میں سختی برتتے ہیں اور راویوں پر نقد کرتے ہیں اور جب فضائل اور ثواب اور سزاؤں کی بابت روایت کرتے ہیں تو سندوں میں تساہل برتتے ہیں اور راویوں سے تسامح کرتے ہیں، امام احمد سے میمونی کی روایت ہے کہ احادیث فضائل تساہل کا احتمال رکھتی ہیں، یہاں تک کہ اس میں کچھ حکم آجائے، اور عباس الدوری کی روایت میں امام احمد نے فرمایا کہ ابن اسحاق ایک ایسے شخص ہیں جن سے سیر ومغازی کی حدیثیں لکھی جاتی ہیں، لیکن جب حلال وحرام کی بات آتی ہے تو ہم بھی انہیں ائمہ کی طرح ارادہ کرتے ہیں اور اپنی انگلیوں کو بند کر لیتے ہیں (قواعد التحدیث/ ۱۱۳)۔

احادیث ضعیفہ کا مسئلہ

مولانا محمد ارشاد القاسمی [1]

حدیث ضعیف اور اس کی تعریف

ارباب اصول حدیث نے اپنی ذوق اور تحقیق کے مطابق اس کی مختلف تعریف کی ہے، جس کا مآل ایک ہے۔

محدث ابن صلاح کی مقدمہ میں یہ تعریف ہے:

"کل حدیث لم یجتمع فیه صفات الحدیث الصحیح ولا صفات الحدیث الحسن المذکورات فیما تقدم فهو حدیث ضعیف" (مقدمه ابن صلاح مع الایضاح/۶۲)۔

ضعیف حدیث کے اہم اور بنیادی اسباب

ضعف کے بنیادی اسباب صحیح اور حسن کی شرطوں کا مفقود ہونا اور نہ پایا جانا ہے، جیسا کہ خود اس کی تعریف سے واضح ہے، چنانچہ زین الدین العراقی اس کے بنیادی اسباب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ما عدم فیه جمیع الصفات ای صفات ما یحتج به وهو الصحیح والحسن، وهی ستة: اتصال السند او جبر المسند بما یؤکده، وعدالة الرجل، والسلامة من کثرة الخطاء والغفلة، ومجیئی الحدیث من وجه آخر" (ص ۶۲)۔

حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم

اس کے حکم کو تین قسموں پر تقسیم کرتے ہیں: اولاً: من حیث الروایہ۔ ثانیاً: من حیث القبول، ثالثاً: من حیث العمل۔

۱۔ من حیث الروایة: اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی اسناد میں تساہل اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اسے ضعیف الاسناد یعنی سنداً ضعیف کہا جاتا ہے متناً ضعیف نہیں کہا جائے گا۔

۳۔ بغیر سند کی روایت درست ہوگی۔

۴۔ حدیث ضعیف میں صیغہ جزم کے ساتھ رسول پاک ﷺ کی طرف نسبت نہ کی جائے گی، بلکہ صیغہ مجہول یا اسی کے مشابہ لفظ اختیار کیا جائے گا۔

مثلاً روی عنه یا بلغنا عنه، یا ورد عنه، یا جاء عنه۔

۵۔ بغیر ضعف کے ذکر کئے اس کی روایت درست ہوگی (دلائل النبوۃ ۱/ ۴۳، مقدمہ ابن صلاح/ ۱۳۲)۔

اور من حیث القبول یہ ہیں:

۱۔ شدت ضعف نہ ہو: یعنی راوی کاذب متہم بالکذب نہ ہو۔

۲۔ اصل عام کے تحت داخل ہو۔

۳۔ عمل کی صورت میں سنیت کا اعتقاد نہ ہو۔

---

[1] استاذ حدیث مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور۔

''كما في قواعد علوم الحديث: عدم شدة ضعفه، وأن يدخل تحت اصل عام، وان لا يعتقد سنية ذلك الحديث'' (قواعد علوم/۹۴)۔

۴۔ اس سے اقوی صحیح یا حسن اس کے معارض نہ ہو (ظفر الامانی/۲۳۸)۔

اور من حیث العمل یہ احکامات ہیں:

۱۔ فضائل ترہیب وترغیب، وعظ وقصص میں اعتبار ہوگا: (کمافی ظفر الامانی ص ۲۲۴)۔

۲۔ استحباب کا ثبوت ہو جائے گا (ظفر الامانی/ ۲۷۳)۔

۳۔ احکام شرعیہ میں اعتبار کیا جائے گا، کمافی قواعد ص ۱۱۱۔

۴۔ ضعیف کے ذریعہ تقویت پہنچ جائے گی، "الضعيف يصلح للتقوية" (القواعد/۱۱۱)۔

۵۔ حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا۔ (القواعد/۹۶)۔

موضوع کی تعریف

علامہ عبدالحئی فرنگی محلی اس کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''الكذب المختلق على النبي ﷺ اوعلى غيره من الصحابة و غيرهم'' (ظفر الامانی/۴۵۳)۔

موضوع کی یہ تعریف حدیث کے علاوہ آثار موضوعہ کو بھی شامل ہو جائیں گی، جیسا کہ "على غيرهم" کے عموم سے مستفاد ہوتا ہے۔

ابن الصلاح کی مقدمہ علوم الحدیث میں یہ تعریف ان الفاظ سے ہے: "وهو المختلق المصنوع"۔

گو لفظ سے عموم ثابت ہو رہا ہے، مگر مؤلف کے سیاق وسباق سے معلوم ہو رہا ہے کہ صرف حدیث موضوع کی تعریف مقصد ہے۔

حدیث موضوع اور اس کا حکم

الف۔ موضوع حدیث کے متعلق ارباب اصول نے متعدد احکامات ذکر کیے ہیں، جن میں اولین اور اساسی ومعیاری حکم یہ ہے کہ اس کی روایت کسی صورت میں جائز نہیں، مگر یہ کہ اس کا موضوع ہونا بیان کر دیا جائے۔

چنانچہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

''اعلم ان الحديث الموضوع شر الاحاديث الضعيفة ولا تحل روايته لاحد علم حاله في اى معنى الا مقرونا ببيان وضعه بخلاف غيره من الاحاديث الضعيفة'' (مقدمہ ابن صلاح/۱۲۸)۔

مولانا عبدالحئی فرنگی لکھتے ہیں:

جن کو گمان غالب ہو یا یقین ہو کہ یہ گھڑی ہوئی روایت ہے، اس کے لیے کسی بھی طریقہ سے اس کی روایت جائز نہیں ہے، خواہ ترغیب وترہیب کے لیے ہو، اسی طرح وعظ ومجلس وغیرہ میں بھی اس کا بیان کرنا درست نہ ہوگا تاوقتیکہ اس کا موضوع ہونا ظاہر نہ کر دے۔

ب۔ اگر کسی سند میں راوی کذاب ہو تو اس کی وجہ سے اس حدیث کا موضوع ہونا ضروری نہیں "اذا الكاذب قد يصدق"۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث کی اور دوسری سند ہو جس میں راوی کذاب نہ آ رہا ہو۔

اس کا کوئی متابع اور شاہد ہو ایسی صورت میں محض کذب راوی سے علی الاطلاق حدیث کو موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ ایسی حدیثوں کو محدثین نے متروک، منکر، ضعیف شدید قرار دیا ہے۔

کسی سند میں راوی کے کذب سے حدیث موضوع کی فہرست میں اس وقت تک نہ شامل ہوگی جب تک کہ یہ شرطیں نہ پائی جائیں۔

ا۔اس حدیث کو اس راوی کے علاوہ کسی نے روایت نہ کی ہو۔

۲۔نہ اس کا کوئی متابع ہو نہ کوئی شاہد ہو۔

کذب راوی سے حدیث کا موضوع ہونا ضروری نہیں جیسے دارقطنی میں مشہور بین الاحناف حدیث: "لا مهر اقل من عشرة دراهم" اس میں ایک راوی مبشر بن عبید ہے اور یہ کذاب ہے، اسے ضعیف تو کہا گیا مگر موضوع نہیں کیا گیا (ظفر الامانی مطبوعہ بیروت/ ۲۱۲)۔

احادیث ضعیفہ کے متلقی بالقبول ہونے کی تشریح

جب کسی حدیث کو امت کے ارباب تحقیق مجتہدین نے قبول کیا اس پر عمل کیا، اس سے مسائل واحکام کا استنباط کیا تو ایسی صورت میں خبر واحد ہو یا حدیث ضعیف ہو (بشرطیکہ ان میں شرط اخذ پائی جاتی ہو) حکم میں صحیح اور حسن کے ہو جاتی ہے۔

اور تلقی سے مراد ائمہ محدثین، مجتہدین، ائمہ مشہورین کی تلقی ہے عامۃ الناس کی تلقی ہرگز مراد نہیں، چنانچہ احکام القرآن جصاص رازی لکھتے ہیں: "بل الحديث اذا تلقته الامة بالقبول فهو عندنا في معنى المتواتر" (قواعد/ ۶۲)۔

اسی طرح ابن عبد البر کے الاستذکار کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

لما حكى عن الترمذى ان البخارى صحح حديث البحر هو الطهور مائه واهل الحديث لا يصححون مثل اسناده، لكن الحديث عندى صحيح، لأن العلماء تلقوه بالقبول" اسی پر علامہ عثمانی لکھتے ہیں:

"والقبول يكون تارة بالقول وتارة بالعمل عليه ولذا قال المحقق فى الفتح وقول الترمذى العمل عليه عند اهل العلم يقتضى قوة اصله وان ضعف خصوص هذا الطريق۔

اسی طرح سیوطی "التعقبات" میں ذکر کرتے ہیں: "الحديث اخرجه الترمذى وقال ضعفه احمد وغيره والعمل عليه عند اهل العلم فاشار بذلك ان الحديث اعتضد بقول اهل العلم وقد صرح غير واحد بان من دليل صحة الحديث قول اهل العلم به وان لم تكن له اسناد يعتمد على مثله" (التعقبات/ ۶۲)۔

معلوم ہوا حدیث باوجود ضعیف اور سنداً کمزور ہونے کے ارباب حدیث وفقہ جو اجتہاد یا جلالت شان کے مالک ہیں، ان کا عمل اور ان سے تعامل ثابت ہو جائے تو وہ حدیث دائرہ ضعف سے خارج ہو کر تلقی کی وجہ سے قابل استناد ہو جاتی ہے، چنانچہ صلوۃ التسبیح والی حدیث ضعیف ہے، مگر امیر المومنین فی الحدیث عبد اللہ بن مبارک اور دیگر اہل فضل وعلم کے عمل کی وجہ سے اس میں تقویت پہنچ گئی۔

حدیث ضعیف سے کسی مجتہد کا استدلال اس کی تصحیح ہے جیسا کہ ابن ہمام کو التحریر میں ہے:

"المجتهد اذا استدل بحديث كان تصحيحا له" (قواعد/۵۲)۔

راوی ضعیف ہو مگر کذاب یا متہم بالکذب نہ ہو تو بھی تلقی سے وہ حکماً صحیح ہو جائے گا۔

"قد يحكم الحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح" (قواعد/ ۶۰)۔

روایت کی کثرت ترجیح کا سبب ہے یا نہیں، یعنی جس طرح ائمہ مجتہدین ومحدثین کرام فقہاء عظام سے اگر تلقی بالعمل ہو تو وہ قابل استدلال اور قابل اخذ ہو جاتا ہے، کیا اسی طرح ضعیف کثرت روایت سے متصف ہو تو وہ قابل استدلال وترجیح ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں ائمہ محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔

بیشتر احناف اور بعض شوافع کے نزدیک اس کے ذریعہ ضعف کی تلافی نہیں ہوتی اور نہ حدیث قابل ترجیح ہوتی ہے، چنانچہ علامہ عبد الحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں:

"اما كثرة طرق الحديث فاختلفوا فيها على قولين: الاول: انها ليست من امارات الترجيح واليه ذهب عامة الحنفية وبعض اصحاب الشافعى۔"

اور علامہ عبدالعزیز بخاری صاحب کشف الاسرار کا قول نقل کرتے ہیں:

۱۔ "ووجهه بان كثرة العدد لا تكون دليل القوة مالم يخرج عن خبر الآحاد إلى خبر التواتر او الشهرة"
جس طرح کثرت شہادت باعث ترجیح نہیں ہے اسی طرح یہ۔

۲۔ "واوضحه بانه لا يترجح فى الشهادة احدى الشهادتين بكثرة العدد" (الاجوبة الفاضله/۲۰۷)۔

علامہ عبدالحئی فرنگی محلی اپنی مایہ ناز کتاب الاجوبۃ میں قول محقق یہ لکھتے ہیں کہ محض کثرت ضعیف کا منجبر نہیں ہوسکتا یہی مسلک وتحقیق زیلعی نے نصب الرایہ میں عینی نے بنایہ میں ذکر کیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اسباب ترجیح میں سے ہے۔

اسی ثانی قول کی تائید علامہ شعرانی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

"وقال العلامة المحدث العارف الشعرانى تليذ الحافظ السيوطى فى الميزان وقد احتج جمهور المحدثين بالحديث الضعيف اذا كثرت طرقه، والحقوه بالصحيح تارة والحسن اخرى"

چنانچہ سنن کبریٰ میں اکثر ایسی حدیثیں ہیں جو کثرت طرق اور متابعات کی وجہ سے علماء کے نزدیک قابل احتجاج بن گئی ہیں۔

علامہ عثانی لکھتے ہیں: "والقبول يكون تارة بالقول وتارة بالعمل" (القواعد/۶۱)۔

خلاصہ یہ کہ بیشتر احناف کا قول ہے کہ کثرت روایت باعث ترجیح نہیں ہے، ہاں مگر یہ کہ شہرت یا حد تواتر کو پہنچ جائے اور اکثر علماء اعتبار کرتے ہیں، اور کثرت طرق کو باعث ترجیح مانتے ہیں۔

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے مراد

حدیث ضعیف منجبر سے مراد وہ حدیث ہے جس کی کوئی متابع یا شاہد کے ذریعہ سے تائید یا اس کے ضعف کی تلافی ہوتی ہو (قواعد/۱۰۱)۔

اسی طرح وہ حدیث جو متعدد طرق سے مروی ہو وہ بھی حدیث منجبر ہے۔

"ان الضعيف ينجبر بتعدد طرقه جيحتج به" (ظفر الامانی/۲۱۲)۔

اور حدیث منجبر سے فضائل اور استحباب میں استدلال درست ہے۔

حدیث ضعیف مؤید بقرائن

وہ امور جو حدیث ضعیف کے تلافی کا ذریعہ اور باعث ہیں۔

تلافی ضعف کے متعدد ذرائع ہیں جن میں تعدد طرق اور متابع اور شواہد کو اکثر وبیشتر علماء نے بیان کیا ہے، اسی طرح ائمہ مجتہدین کا عمل اور تلقی بالقبول بھی اسی متلافی میں داخل ہے۔

قواعد فی علوم الحدیث میں ہے: "والحديث الضعيف اذا تعددت طرقه ولو طريقًا واحدا اخرى ارتقى بمجموع ذلك الى درجة الحسن وكان محتجا به"۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف تعدد طرق کی وجہ سے منجبر ہو کر قابل استدلال ہوجاتی ہے اور تعدد طرق یا کثرت طرق خواہ اسی جیسے ضعف کے ساتھ ہو یعنی دوسری سند بھی ضعیف ہو تب بھی فی الجملہ قوت پیدا ہوجاتا ہے۔

چنانچہ علامہ عثانی لکھتے ہیں: البتہ عدد طرق سے ہر ضعیف کو فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے کچھ ضابطے اور شرطیں ہیں:

۱۔ راوی متہم بالکذب نہ ہو۔ ۲۔ فسق راوی کی وجہ سے حدیث ضعیف نہ ہو۔ ۳۔ حدیث شاذ نہ ہو۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

۱۔ جن احادیث ضعیفہ کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں گے، ان کا احکام وباب مسائل میں اعتبار نہیں ہے، اس سے احکام فقہیہ ثابت نہیں کئے جاسکتے جس کی بحث حدیث ضعیف متلقی بالقبول کے جواب نمبر ۲ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

۲۔ ضعیف کا مصداق

ائمہ مجتہدین نے عملی کی گنجائش میں جس ضعیف کا اعتبار کیا ہے وہ ہر ضعیف نہیں بلکہ اس کا مصداق حسن لغیرہ ہے، متاخرین کی اصطلاح والی ضعیف نہیں (قواعد علوم الحدیث/۱۰۰)۔

۳۔ احکام میں ضعیف احادیث معتبر ہیں اور اس کی مختلف شرطیں ہیں:

۱۔ اس کی تلافی کسی طرح سے ہو رہی ہو: مثلاً تعدد طرق کے ذریعہ سے۔

۲۔ اس ضعیف ارباب فن فقہاء اور ائمہ نے اس پر عمل کیا ہو یا اسے تلقی بالقبول حاصل ہو۔

۳۔ ضعف فسق یا کذب کی وجہ سے ہو، کذا فی التدریب اما الضعیف لفسق الراوی او کذبه فلا یؤثر فیه موافقة غیره له اذا کان الآخر مثله" (قواعد علم الحدیث/۸۱)۔

فضائل کے باب میں احادیث ضعیفہ کا اعتبار اور اس پر اعتماد

جمہور علماء فضائل اور ترغیب کے باب میں احادیث ضعیفہ کا اعتبار کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں، البتہ بعض علماء اس کے خلاف ہیں۔

فضائل وترغیب وترہیب کے باب میں احادیث ضعیفہ پر اعتماد ائمہ محدثین اور محققین علماء سے ثابت ہے۔ امام بیہقی اپنی مشہور کتاب دلائل النبوہ میں ذکر کرتے ہیں:

"اذا روینا فی الثواب والعقاب وفضائل الاعمال تساهلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال واذا روینا فی الحلال والحرام والاحکام تشددنا فی الاسانید وانتقدنا الرجال" (دلائل النبوہ/۳۴)۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے درج ذیل شرطیں ہیں:

صاحب الدر المختار لکھتے ہیں: "شرط العمل بالحدیث الضعیف عدم شدة ضعفه، وان یدخل تحت اصل عام وان لا یعتقد سنیة ذلك الحدیث" (شامی مصری، ۱/ ۱۲۸)۔

یعنی شدت ضعف نہ ہو، کسی اصل عام کے تحت داخل ہو، سنیت کا اعتقاد نہ ہو۔

علامہ فرنگی محلی نے دیگر علماء کے خلاف ۳/ کے بجائے ۴/ شرطوں کو بیان کیا ہے جو قبولیت کے لیے ضروری اور اساسی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

کوئی حدیث صحیح یا حسن جو کہ اس سے اقوی ہو اس کے معارض نہ ہو، کہ اقوی کو چھوڑ کر اضعف یا ضعیف پر کیسے عمل ہو سکتا ہے؟

دوسری شرط کا خلاصہ یہ ہے شدید ضعف نہ ہو؛ اور شدت ضعف کا مفہوم اور اس کے پائے جانے کی صورت یہ ہے کہ یا تو اس کی روایت میں تفرد ہو، راوی کذاب یا فاحش الغلط اور مغفل نہ ہو کہ ایسی صورت میں موضوع یا مخترع کے قریب ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ اس پر عمل کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

تیسری شرط کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کے اصول کلیہ میں سے کسی اصل کے تحت یہ حدیث داخل ہو، اس کے خلاف نہ ہو تا کہ اصول شرعیہ کی مخالفت لازم نہ آئے، جب کسی اصل شرع کے تحت داخل رہے گا تو اسی سے جواز ثابت ہو جائے گا اور حدیث پاک سے اس کی تاکید یا جواز سے بڑھ استحباب ثابت ہو جائے گا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے والا اس کے ثبوت یا سنیت کا اعتقاد نہ رکھے۔

احکام میں احادیث ضعیفہ کے مراتب

مولانا محمد خالد صدیقی[1]

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی النبی الامین۔

۱۔حدیث ضعیف کی تعریف

علامہ ابن صلاح نے حدیث ضعیف کی یہ تعریف کی ہے:

"کل حدیث لم یجتمع فیه صفات الحدیث الصحیح ولا-صفات الحسن فهو حدیث ضعیف" (مقدمہ ابن الصلاح/۴۸، دار الحدیث بیروت)۔

(ہر وہ حدیث جس میں صحیح حدیث کی صفات مجتمع نہ ہوں اور نہ ہی حسن حدیث کی صفات مجتمع ہوں، تو وہ حدیث ضعیف ہے)۔

مولانا عبدالرحمن مبارک پوری نے یہ تعریف نقل کی ہے:

"واما الحدیث الضعیف فهو ما لم یجتمع فیه صفة الحسن" (مقدمہ تحفة الحوذی،۱/ ۲۰۴ دار الفکر)

(حدیث ضعیف وہ ہے جس میں حسن کی صفات جمع نہ ہو)۔

ظاہر ہے کہ جس میں حسن کی صفت نہیں ہوگی اس میں صحیح کی صفت بدرجہ اولیٰ نہیں ہوگی، اس لیے یہاں صحیح کے ذکر کو نظر انداز کردیا گیا۔

علامہ ظفر احمد عثمانی علیہ الرحمہ نے علامہ سیوطیؒ کے حوالہ سے ضعیف کی تعریف کے ساتھ مراتب ضعف کی جانب بھی اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:

اور ضعیف یہ ہے کہ اس میں حسن کی صفت جمع نہ ہو اور اس کے ضعف میں کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے "صحیح" کی صحت کی طرح چنانچہ ضعیف سے انتہائی ضعیف ہوتا ہے جیسا کہ صحیح سے اصح (قواعد فی علوم الحدیث/ ۳۶۔۳۷م ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)۔

۲۔ضعف احادیث کے اسباب

۱۔ ضعف احادیث کا سب سے اہم اور بنیادی سبب راوی کا جھوٹا ثابت ہونا ہے، اگر کسی روایت میں کسی ایک بھی راوی کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ وہ جھوٹا تھا تو اس کی روایت ضعیف کہلائے گی، فنی نقطہ نظر سے ہر چند کہ اس سبب کو ضعف حدیث کے بجائے، وضع حدیث کا باعث قرار دیا جاتا ہے، لیکن چونکہ "وضع" بھی ضعف کی ہی ایک قسم ہے، اس لیے اسے یہاں ذکر کردیا گیا ہے: "ان شر اقسام الضعیف الموضوع لانه کذب" (المصباح علی مقدمۃ الشیخ ابن الصلاح للصباح/ ۴۹)۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی متہم بالکذب راوی سے نقل کی جائے (تدریب الراوی،۱/ ۲۱۵)۔

۳۔ راوی فاسق ہو (علم رجال الحدیث/ ۱۸۱)۔

۴۔ بدعتی ہو (ایضاً/ ۱۷۹)۔

۵۔ مجہول ہو (ایضاً)۔

---

[1] صدر سماج کلیان سمیتی نیپال۔

۶۔ راوی کا حافظہ کمزور ہو اور ضبط و اتقان میں کمی پائی جاتی ہو۔

۷۔ راوی روایت کے سننے/سنانے کے وقت تساہل برتتا ہو یا غفلت سے کام لیتا ہو (الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ/ ۸۵)۔

۸۔ سند میں انقطاع ہو، اور اس کی کئی قسمیں ہیں:

الف۔ ابتدائے سند سے ہی ایک یا ایک سے زائد راوی ساقط ہو اصطلاحاً ایسی روایت معلق کہلاتی ہے: "ماحذف من مبداء اسناده واحد فاكثر" (قواعد فی علوم الحدیث، ۱۹/ ۳۹)۔

ب۔ درمیان سنت سے ایک راوی ساقط ہو، یہ روایت منقطع کہلاتی ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی نے یہ تعریف کی ہے:

"ما حذف من وسط اسناده واحد" (ایضاً)

البتہ دیگر اصولیین کی تشریح کے مطابق منقطع کے مصداق میں اثناء سند سے راوی کا سقوط شامل نہیں ہے بلکہ ان کے مطابق خواہ جس طرح بھی روایت میں انقطاع ہو اور سند متصل نہ ہو وہ روایت منقطع کہلائے گی، تاہم اکثر و بیشتر اس کا اطلاق اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ صحابی اور تابعی کے بیچ سے راوی ساقط ہو، جیسے کہ: مالک عن ابن عمر اس میں راوی نافع کا ذکر نہیں ہے: "الصحيح الذى ذهب إليه الفقهاء والخطيب وابن عبدالبر وغيرهم من المحدثين ان المنقطع مالم يتصل اسناده على اى وجه كان انقطاعه واكثرما يستعمل فى رواية من دون التابعى عن الصحابى كمالك عن ابن عمر..." (تدریب الراوی، ۱/ ۸۔ ۲۰۴)۔

ج۔ ضعف حدیث کا یہ سبب بھی ہے کہ مسلسل دو راوی یا دو سے زائد سند سے ساقط ہوں جس روایت میں اس قسم کا ضعف پایا جاتا ہو، اصطلاحاً اسے معضل کہتے ہیں (اعلاء السنن، ۱۹/ ۴۱)۔

۹۔ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔

۱۰۔ راوی نے روایت میں تدلیس کی ہو، خواہ تدلیس کی جو بھی شکل ہو، یعنی وہ اپنے ایسے معاصر راوی سے روایت کرے جس سے کہ اس کا سماع ثابت نہ ہو، یا اپنے شیخ کا ان اوصاف کے ساتھ ذکر کرے جو ان میں موجود نہ ہوں یا یہ کہ سند میں اپنے شیخ کے علاوہ کسی اور راوی کو ضعیف ہونے کی وجہ سے ساقط کردے (حوالہ مذکور)۔

علماء محدثین کے نزدیک تقریباً ان اسباب پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ جب یہ اسباب پائے جائیں گے تو حدیث ضعیف متصور کی جائے گی، تاہم فقہاء کے درمیان ان اسباب کو ضعف حدیث کا سبب ماننے کے باوجود ان کے ہاں مزید کچھ حالات و اسباب ایسے ہیں جن کی بناء پر روایت ضعیف قرار دیدی جاتی ہے، اور وہ اسے قابل استدلال نہیں سمجھتے مختصراً ان چند اسباب کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

فقہاء کے نزدیک ضعف حدیث کے کچھ اسباب

۱۔ بعض فقہاء کے نزدیک اگر روایت کسی غیر فقیہ راوی سے مروی ہے خواہ وہ غیر فقیہ راوی صحابی رسول ہی کیوں نہ ہو، جیسے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ، تو اس کی تین شکلیں ہیں، ایک یہ کہ روایت قیاس کے مطابق ہو، دوسری یہ کہ ایک قسم کے قیاس کے مطابق اور دوسری قسم کے قیاس کے خلاف ہو، تیسری یہ کہ بالکلیہ قیاس کے خلاف ہو، اول الذکر دونوں صورتوں میں روایت مقبول ہوگی، اور موخر الذکر صورت میں روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ (توضیح تلویح، ۱/ ۴۳۱ کراچی)۔

لیکن بعض فقہی کتابوں میں سنت کے باب میں اس اصول کے ذکر کرنے کے باوجود جمہور فقہاء احناف اس اصول کو نہیں مانتے، بعض متاخرین فقہاء احناف نے خواہ مخواہ اس اصول کی نسبت احناف کی جانب کردی، چنانچہ صاحب کشف نے کہا ہے کہ قبول روایت کے لیے اس طرح کا فرق کرنا ایک نئی چیز ہے جس کی کوئی اصل نہیں، اور خبر واحد ہر حال میں قیاس پر مقدم ہے:

"ان هذا الفرق مستحدث وان خبر الواحد تقدم على القياس من غير تفصيل" (ایضاً)۔

۲۔ فقہاء نے انقطاع حدیث کی دو صورتیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو مذکور ہوئی یعنی کہ سند میں انقطاع ہو، فقہاء کرام اسے انقطاع ظاہر کا نام دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ باطن میں انقطاع ہو اس کی بھی کئی شکلیں ہیں:

الف: روایت کتاب اللہ کے ظاہر، شریعت کے عمومی ضابطہ اور مسلمات کے خلاف ہو جیسے کہ فقہاء احناف کے بقول ایک گواہ اور قسم کی وجہ سے قاضی کے فیصلہ والی روایت، کہ یہ قرآن کی آیت استشہاد "واستشهدوا شهيدين من رجالكم" کے خلاف ہے، نیز مشہور حدیث "البينة على المدعي واليمين على من انكر" کے بھی خلاف ہے جو کہ باب شہادت اور قضاء میں شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ب: صحت کے باوجود حدیث سے صحابہ نے اعراض کیا ہو، صحابہ کا اعراض اس حدیث کے ضعف کا باعث سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ کسی بھی حال میں قرین قیاس نہیں کہ صحابہ کرام حدیث رسول کو چھوڑ دیں ہاں! یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کسی وجہ یعنی عدم ثبوت، نسخ وغیرہ کی بناء پر نا قابل استدلال ہے، مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت: "طلاق العبد اثنتان" (دارقطنی، نقلا عن الفقہ الاسلامی وادلتہ الدکتور وہبہ زحیلی، ۷/ ۳۸۷) کو فقہاء احناف نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ صحابہ کرام نے اس سے اعراض کیا تھا، جیسا کہ صاحب توضیح فرماتے ہیں: "واما يا عراض الصحابة عنه نحو الطلاق بالرجال والعدة بالنساء فانهم اختلفوا ولم يرجعوا اليه" (التوضیح مع التلویح، ۱/ ۴۳)۔

لیکن خود احناف متفقہ طور پر مذکورہ مثالوں سے متفق نہیں ہیں، چنانچہ توضیح کے حاشیہ تلویح میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ مثال میں دی گئی روایت سے صحابہ کا اعراض ثابت نہیں ہے اور یہ کہ طلاق کے باب میں عورت کا اعتبار ہوگا اس حنفی نقطۂ نظر کے برعکس بہت سے صحابہ مثلاً حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عائشہ وغیرہم کا مسلک یہ ہے کہ طلاق میں اعتبار مرد کا ہوگا، جو کہ شوافع کا مسلک ہے، البتہ احناف کا اس حدیث سے استدلال نہ کرنے کا سبب اعراض صحابہ نہیں بلکہ ایک دوسری روایت: "طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان" ہے (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

۳۔ راوی خود روایت کرنے کے بعد روایت کے خلاف عمل کرے، یا ائمہ صحابہ اور ائمہ حدیث اس حدیث کے خلاف عمل کریں تو اس حدیث پر سے عمل ساقط ہو جائے گا جبکہ حدیث ظاہر ہو، اس میں کسی طرح کا خفا نہ ہو (حسامی مع النامی، ۱/ ۱۵۲، ہم مختار اینڈ کمپنی دیوبند)۔

۴۔ عموم بلوی سے متعلق مسائل میں اگر مروی روایت کا درجہ صرف "خبر واحد" کا ہو تو وہ مقبول نہیں ہوگی، جیسا کہ نماز میں جہراً بسم اللہ پڑھنے والی روایت ہے، کیونکہ اس طرح کے مسائل میں روایت کا علی سبیل التواتر یا کم از کم علی سبیل الشہور نقل نہ کیا جانا عقلاً محال ہے: "إما بكونه شاذا في البلوى العام كحديث الجهر بالتسمية فإنه لو كان فخفاءه في مثل هذه الحادثة مما يحيله العقل" (التوضیح، ۱/ ۴۳۲)۔

لیکن محققین علماء نے اس اصول کو بھی بہت زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم

حدیث ضعیف کا اجمالی حکم بیان کرتے ہوئے یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ یہ حکم ہر مذہب ومکتبہ فکر کے ضعیف حدیث کے لیے وضع کردہ ضابطہ واصول کو دیکھتے ہوئے منطبق ہوگا، بالفاظ دیگر کچھ مخصوص حالات میں ایک حدیث ایک مذہب میں صحیح اور قابل صحت قرار پاتی ہے تو دوسرے مسلک میں ضعیف اور نا قابل استدلال متصور کی جاتی ہے، مثال کے طور پر مرسل روایت ائمہ شوافع کے یہاں ضعیف اور نا قابل استدلال ہے جبکہ مرسل روایت ہی ائمہ احناف کے نزدیک بلا تامل حجت اور قابل استشہاد ٹھہرتی ہے، مدلس کی روایت اکثر کے مطابق ضعیف ہے لیکن بعض ائمہ ثقہ کی تدلیس کو قابل گوارا سمجھتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ ذیل میں بیان کئے جانے والے حکم کا اطلاق بغیر کسی قید کے حدیث ضعیف پر ہوگا، یہاں حدیث ضعیف کے محل ومصداق سے اور اس کی اقسام سے بحث نہیں۔

علامہ سیوطی حدیث ضعیف کے احکام کو یوں بیان کرتے ہیں:

"ويجوز عند اهل الحديث وغيرهم التساهل في الاسانيد الضعيفة ورواية ماسوى الموضوع من الضعيف والعمل به من غير بيان ضعفه في غير صفات الله تعالى ... والاحكام كالحلال والحرام وغيرها، ذالك كالقصص وفضائل الاعمال والمواعظ وغيرها مما لا تعلق به له بالعقائد والاحكام" (تدریب الراوی، ۱/ ۲۹۸)۔

(علماء حدیث وغیرہ کے نزدیک اسانید ضعیفہ میں تساہل برتنا اور ضعیف کی (موضوع کے علاوہ) روایت کرنا، اور بغیر اس کے ضعف کے بیان

کے اس پر عمل کرنا جائز ہے، تاہم یہ جواز اللہ تعالیٰ کی صفات اور احکام جیسے کہ حرام وحلال وغیرہ کے علاوہ میں ہے، جیسے کہ قصص، فضائل اعمال، نصائح وغیرہ جن کا عقائد واحکام سے کوئی تعلق نہیں)۔

علامہ سیوطی نے اس رائے کی نسبت امام احمد بن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک کی جانب کی ہے اور انہیں ائمہ فن کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

"اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل تساهلنا"

(جب ہم حرام وحلال کے باب میں روایت کریں گے تو شدت برتیں گے اور اگر فضائل کے باب میں روایت کریں گے تو تساہل برتیں گے)۔

تاہم احکام میں بھی بعض صورتوں میں احتیاطاً حدیث ضعیف پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے، مثلاً کوئی ضعیف حدیث خرید وفروخت کی بعض اقسام سے روکتی ہو یا کہ نکاح کی بعض صورتوں کو نادرست کہتی ہو وغیرہ تو ان میں احتیاط کا تقاضہ ہے کہ اس ضعیف حدیث پر عمل کرلیا جائے، نواب صدیق حسن خان علیہ الرحمۃ مسئلہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"الا ان یکون فی احتیاط فی شئی من ذلك، کما اذا ورد حدیث ضعیف بکراهة بعض البیوع او الانکحة فإن المستحب ان ینزه عن ذلك ولکن لا یجب" (الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ/۱۲۵)۔

(مگر اس طرح کی چیز میں احتیاط ظاہر ہو (تو جائز ہے) جیسا کہ بعض بیوع یا نکاح کی کراہت کے بارے میں کوئی ضعیف حدیث وارد ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس سے بچا جائے لیکن بچنا واجب نہیں ہے)۔

بعض علماء سے حدیث ضعیف کے سلسلہ میں مطلقاً یہ رائے منقول ہے کہ کسی بھی حال میں حدیث ضعیف پر عمل نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ ابن عربی مالکی کا موقف ہے: "وخالف ابن العربی المالکی فی ذلك قال: ان الحدیث الضعیف لا یعمل به مطلقا" (ایضاً)۔

ب۔ موضوع

ا۔ موضوع کی تعریف: موضوع بنائے ہوئے اور گھڑے ہوئے کو کہتے ہیں: "وهو المختلق المصنوع" (التقیید والایضاح شرح مقدمہ ابن الصلاح/۱۰۹)۔

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ضعیف کی تعریف اور اس کی انواع بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ آنحضرت ﷺ پر جان بوجھ کر لگایا ہوا جھوٹ ہے، یہ ضعیف حدیث کی سب سے کم تر اور قبیح قسم ہے، ایسی ضعیف حدیث کی معرفت خواہ واضع کے اقرار سے ہوئی ہو، یا ایسے کسی قرینہ سے ہوئی ہو جو راوی کے حال سے حاصل ہو مثلاً یہ کہ بعض روساء کی خواہش پر جھوٹ میں ان کی پیروی کرے، یا یہ کہ اس کی سند کے بیچ میں وہ بحیثیت راوی واقع ہو، اور وہ جھوٹا ہو، نیز وہ سند خبر صرف اسی طریقہ (سند) سے معروف ہو، اور اس کی کسی نے بھی متابعت نہ کی ہو نہ اس کا شاہد ہو یا موضوع حدیث کی معرفت اس کے الفاظ اور معانی کی رکاکت سے ہوئی ہو، یا قرآن، سنت متواترہ، اجماع قطعی، یا عقل صریح کی مخالفت سے، خواہ اس نے اپنی وضع کردہ روایت کو گھڑلیا ہو، یا کسی دوسرے کے کلام سے اخذ کیا ہو، یا یہ کہ حدیث ضعیف الاسناد تھی لیکن اس نے اس کو رواج دینے کے لیے صحیح سند بنائی اور خواہ وضع حدیث لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے یا کار ثواب سمجھ کر یا تعجب میں ڈالنے کے لیے یہ بعض روساء کی خواہش کی پیروی کے لیے ہو، یا یہ کہ وضع کا صدور وہم میں ہوا ہو غلطی سے ہوا ہو، (ہر حال میں حدیث موضوع کہلائے گی)" (قواعد فی علوم الحدیث/ ۴۳)۔

۲۔ حدیث موضوع کا حکم

حدیث موضوع کا حکم آنحضور ﷺ کے اس ارشاد سے ہی معلوم ہوجاتا ہے جو کہ خبر مشہور کے درجہ میں:

"من کذب علی متعمدًا فلیتبوا مقعده من النار"

(جس نے میرے اوپر جان بوجھ کر جھوٹ گھڑا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے)۔

موضوع حدیث کا حکم بیان کرتے ہوئے حافظ ابن صلاح تحریر فرماتے ہیں:

"تمام قابل قدر علماء کا ان کی حرمت پر اجماع ہے، البتہ بعض نام نہاد صوفیاء اور کرامیہ فرقہ سے ترغیب وترہیب کے باب میں اباحت منقول ہے،

یہ اس کے کرنے والے کی کھلی ہوئی جہالت اور نادانی ہے کیونکہ ترغیب وترہیب بھی احکام شرعیہ میں سے ہے، نیز امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑنا گناہ کبیرہ میں سے ہے، اس معاملہ میں ابومحمد الجوینی نے اور بھی مبالغہ کیا ہے، چنانچہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑنے والے کی تکفیر کی ہے" (مقدمہ ابن الصلاح/۱۵۷۔۱۵۸)۔

اور علماء امت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ موضوع روایت بیان کرنا حرام ہے۔ الا یہ کہ ساتھ ساتھ وضاحت کردی جائے کہ وہ روایت موضوع ہے؛ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس نے مجھ سے روایت بیان کی اور وہ جان رہا ہے کہ جھوٹ ہے تو بیان کرنے والا بھی جھوٹا ہے۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ موضوع کو اس کے موضوع ہونے کے علم باوجود بیان کرنا حرام ہے، موضوع روایت میں ضعیف کی طرح اس کی بھی قطعاً گنجائش نہیں کہ فضائل، قصص، مواعظ، یا ترغیب وترہیب میں بھی اسے بیان کیا جائے (تدریب الراوی/ ۲۷۴)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔ مسائل کے اخذ واستنباط کا ایک اہم مصدر حدیث رسول ہے، بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں دو روایتیں ہیں، ایک سند کے لحاظ سے مثلاً صحیح ہے تو دوسری حسن یا ایک حسن دوسری ضعیف، اگر مخالفت میں حدیث حسن ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ بھی صحیح کی ہی ایک قسم ہے اس لیے پلہ مساوی ہوگیا لیکن اگر ضعیف ہو یا یہ کہ اس خاص مسئلہ میں صرف ضعیف حدیث ہی وارد ہوئی ہو اور اسے متدل بنایا جارہا ہو اور اس کی بنیاد یہ ہو کہ "اہل علم" نے عملی طور پر اسے قبول کرلیا ہو اور امت میں اسے قبولیت کا درجہ حاصل ہے تو اس کی اصطلاح میں تلقی سے تعبیر کریں گے۔

رہی یہ بات کہ کن لوگوں کے قبول کرنے پر تلقی کا اطلاق ہوگا اس باب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اہل مدینہ میں اگر کسی روایت کو قبول عام حاصل ہو تو یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ حدیث سنداً صحیح ہے یا ضعیف؟

"قال مالك شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده" (فتح القدیر لابن الہمام، ۳۴۹/۳)۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ جس پر علماء عمل کرلیں وہ صحیح قرار پائے گی، محدث علامہ خلیل احمد نقل فرماتے ہیں:

"ومما يصحح الحديث ايضا عمل العلماء على وفقه" (بذل المجہود شرح ابی داؤد، ۴/ ۶۴، مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ "تلقی" کے ثابت ہونے کے لیے کسی ایک امام/مجتہد کا محض کسی روایت کا رد وقبول کافی نہیں، مثلاً یہ کہ اگر کسی روایت سے صرف ایک امام یا ان کی تقلید میں ان کے مکتبہ فکر کے دیگر علماء اخذ واستنباط کرتے ہوں تو اس پر "تلقی" کا اطلاق نہیں ہوگا؛ کیونکہ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ کسی ضعیف حدیث کو اخذ واستنباط کی بنیاد بنایا گیا لیکن بعد میں صحیح حدیث پہنچنے کے بعد رجوع کرلیا گیا، اس لیے حزم واحتیاط ہی نہیں بلکہ تحقیق کا تقاضہ ہے کہ روایت اسی وقت متلقی بالقبول ہوگی جبکہ ائمہ ومجتہدین کی اتنی تعداد نے اسے قبول کیا ہو جس پر طبقہ جمہور کا اطلاق ہوسکے ورنہ بہت سی اختلافی روایات تلقی کے زمرے میں شامل ہوجائیں گی، کیونکہ اسے کسی نہ کسی امام مجتہد کے قبول کرنے کا ثبوت مل سکتا ہے۔

۲۔ ایسی احادیث جنہیں تلقی حاصل ہے اگر وہ صحیح/حسن ہیں تو تلقی کے بعد اپنے سے زیادہ مضبوط سند والی روایت کے مقابلہ میں راجح قرار پائیں گی اور اگر ضعیف ہیں تب بھی انہیں متدل بنانا ہوگا، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی صحیح روایت کو تلقی حاصل نہیں ہے، تو فقہاء کرام اسے قبول نہیں کرتے، مثلاً یہ روایت کہ: مستحاضہ ہر نماز کے لیے غسل کرے گی" (ابوداؤد عن عائشہ باب ماروی ان المستحاضہ تغتسل لکل صلاۃ) سنداً اس روایت کے صحیح ہونے کے باوجود فقہاء کے یہاں اس پر عمل نہیں ہے، اس کی بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ "تلقی" کی وجہ سے جمہور علماء نے کم قوی روایت کو زیادہ قوی روایت کے مقابلہ میں ترجیح دیا ہے، مثلاً یہ مسئلہ ہے کہ تیمم میں ہاتھوں کا مسح کہاں تک ہو اس باب میں تین روایتیں ملتی ہیں، ایک یہ کہ گٹوں تک مسح کیا جائے، دوسری یہ کہ کہنیوں تک مسح کیا جائے، تیسری یہ کہ بغل تک، موخر الذکر روایت کو علماء نے صحیح کہا ہے، پہلی روایت سب سے قوی ہے، تیسری روایت کو بھی علماء نے صحیح کہا ہے، جبکہ دوسری روایت (کہنیوں تک والی) سنداً دونوں روایتوں سے کمزور ہے اور اسے صرف "حسن" کا درجہ حاصل ہے، اس کے باوجود اکثر فقہاء نے اسی حسن روایت پر عمل کیا ہے، علامہ نووی نقل کرتے ہیں:

"ہمارا اور اکثر کا مذہب یہ ہے کہ دو بار زمین پر مارنا ضروری ہے ایک چہرہ کے لیے دوسرے کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کے لیے، علماء میں سے حضرت علی

بن ابی طالب، حضرت ابن عمر، حسن بصری، شعبی، سالم، سفیان ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ، اصحاب رائے اور دیگر حضرات اسی کے قائل ہیں" (شرح النووی مع صحیح المسلم، ۱/۱۶۰، سعید کمپنی کراچی)۔

یہی نہیں بلکہ (جیسا کہ گذر چکا ہے) ضعیف روایت بھی تلقی بالقبول کے بعد قابل استدلال بن جاتی ہے، طلاق کے باب میں ایک روایت ہے: "طلاق الامة تطليقتان وعدتها حيضتان "اسے امام ترمذی نے نقل فرمایا ہے (ترمذی عن عائشہ باب ماجاء ان طلاق الامۃ تطلیقتان) ساتھ ہی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، پھر بھی امت کا عمل اسی روایت پر ہے، کیونکہ اس روایت کو تلقی بالقبول حاصل ہے۔

یہ نقطہ نظر صرف فقہاء احناف کا ہی نہیں بلکہ دوسرے فقہاء بھی اسی کے قائل ہیں، علامہ سیوطی نے اس مسئلہ میں یہ تفصیل بیان کی ہے:

"ایسے ہی وہ حدیث (صحیح ہوگی) جو کہ علماء کے ذریعہ قبولیت حاصل کرلے، بعض علماء کا کہنا ہے کہ جب لوگوں نے اسے قبول کرلیا ہو تو ایسی حدیث پر صحت کا حکم لگایا جائے گا جیسے امام بخاری نے حدیث: "البحر هو الطهور ماءه" کو صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ علماء حدیث اس طرح کی اسناد کو درست نہیں کہتے ہیں (اس پر امام ترمذی نے فرمایا کہ) لیکن میرے نزدیک حدیث صحیح ہے، کیونکہ علماء نے اسے قبول کیا ہے، اور تمہید میں ہے کہ حضرت جابر نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ دینار چوبیس ۲۴ قیراط کا ہوگا، اس روایت کے بارے میں فرمایا کہ علماء کی ایک جماعت اور لوگوں کے اس کے معنی پر اجماع کی وجہ سے اس میں اسناد (کی صحت) کی ضرورت نہیں" (تدریب الراوی، ۱/۶۷)۔

استاذ ابواسحق اسفرائنی فرماتے ہیں کہ جب حدیث ائمہ حدیث کے نزدیک بغیر ان کی نکیر کے مشہور ہوجائے تو اس حدیث کی صحت کا علم ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ تلقی بالقبول سے حدیث راجح ہوجاتی ہے، اگر اس کے مقابل کوئی قوی تر روایت ہو اور حدیث کم از کم حسن کا درجہ حاصل کر کے قابل استدلال بن جاتی ہے جبکہ فی نفسہ اس روایت میں ضعف ہو، پس ایسی ضعیف روایت جسے تلقی حاصل ہے، اسے قابل استدلال سمجھا جائے گا، اور فنی لحاظ سے ایسی روایت کو کم از کم حسن کا درجہ دیا جائے گا۔

گزشتہ سطور سے واضح ہوگیا ہوگا کہ ایسی روایت پر عمل کی گنجائش بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن ایسی روایات کے قابل استدلال بن جانے کے بعد علماء فقہاء کے سامنے اسی سے جڑا ہوا ایک اور اہم سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ کیا مسائل کے اخذ واستنباط یا تخریج وتفریع میں جس طرح دیگر صحیح روایتوں میں تحقیق اور بحث ونظر کے بعد علت تلاش کی جاتی ہے اور اس کی تعیین کی جاتی ہے، پھر اس علت کو بنیاد اور مدار بنا کر دوسرے مسائل مستنبط کئے جاتے ہیں، اور ہزاروں مسائل کا حل معلوم کیا جاتا ہے اسی طرح حدیث ضعیف متلقی بالقبول میں بھی کسی ایک مسئلہ میں متدل بنانے کے بعد علت قدر مشترک معلوم کیا جائے، پھر اس پر دوسرے احکام ومسائل کی بنیاد رکھی جائے۔

فقہ حنفی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء احناف حدیث ضعیف متلقی بالقبول میں بھی صرف منصوص مسئلہ پر اکتفاء نہیں کرتے، بلکہ اس پر دوسرے مسائل بھی متفرع کرتے ہیں، مثلاً "طلاق الامة تطليقتان... الخ" میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ باندی کو دو طلاقیں دی جاسکتی ہیں، احناف نے اس روایت سے دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا کہ طلاق میں اعتبار عورتوں کا ہوگا مردوں کا نہیں، چنانچہ اگر عورت باندی ہو اور شوہر آزاد ہو تو شوہر دو ہی طلاق دے سکتا ہے اور اگر عورت آزاد اور شوہر غلام ہو تو غلام شوہر آزاد بیوی کو تین طلاقیں دے سکتا ہے۔

یہ ایسی بحث ہے جس پر درحقیقت علماء کی نظر توجہ کی ضرورت ہے۔

۳۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تلقی کی دو صورتیں بیان فرمائیں ہیں وہ لکھتے ہیں:

"معلوم ہونا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کا شریعت کا حصول دو قسموں پر ہے، ایک ظاہر، اس کے لیے ضروری ہے کہ متواتر نقل کے ذریعہ ہو، یا غیر متواتر نقل کے ذریعہ، دوسری قسم یہ ہے کہ حصول دلالۃ ہو یعنی صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ فرماتے ہوئے یا کرتے ہوئے دیکھیں اور اس سے وجوب یا غیر وجوب کا حکم مستنبط کرلیں اور اس حکم کے بارے میں بتلائیں اور خبر دیں کہ فلاں شئے واجب ہے اور وہ دوسری شئے جائز" (حجۃ اللہ البالغہ نقلا عن قواعد فی علوم الفقہ، ۲/۲۱)۔

شاہ صاحب کی اس عبارت سے تلقی کے باب میں دو قسم ظاہر اور دلالت کا پتہ چلتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی نظروں میں دونوں قسموں

کا اعتبار ہے اور دونوں کا ہی حکم یکساں ہے، دیگر علماء سے بھی صراحۃً اس طرح کے اقوال منقول ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو شاید اس میں سب سے آگے ہوں کہ وہ تعامل اہل مدینہ یا یوں کہہ لیجئے کہ اہل مدینہ کی تلقی دلالت کو صحیح مرفوع روایت پر ترجیح دیتے ہیں، فقہاء احناف بھی دونوں قسموں کے قائل نظر آتے ہیں۔

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

قرینہ اور احادیث ایسی شئی ہے کہ شریعت میں عام حالات میں اس کا اعتبار کیا گیا ہے، قرائن و امارات کی وجہ سے بظاہر مضبوط ترین شواہد و دلائل ترک کر دیئے جاتے ہیں، خصوصاً قضا کے باب میں کہ فقہاء نے اس سے خوب خوب اعتنا برتا ہے۔

(ملاحظہ فرمائیں: الطرق الحکمیۃ، السیاسۃ الشرعیۃ لابن القیم الجوزیہ ۳ وامابعد بامر دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قرائن کا درجہ بہر حال نص شرعی سے کم ہے اور کبھی بھی قرائن کو نص شرعی کے برابر کھڑا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

لیکن درایت احادیث کے باب میں اس کی صحت/ضعف کی جانکاری کے لیے یا اس کے قابل استدلال ہونے یا نہ ہونے کے سلسلہ میں قرائن سے مدد لی جاسکتی ہے بشرطیکہ حدیث ضعیف ہو، کیونکہ صحیح حدیث کے لیے کسی قرینہ کی ضرورت نہیں۔

۱، ۲۔ جب کسی ضعف حدیث کو قرائن سے تائید مل جائے یا کوئی ایسا خارجی عامل سامنے آجائے جس سے کہ حدیث کے مضمون سند کو تقویت ملتی ہو تو اس وقت حدیث ضعیف کا ضعف جاتا رہتا ہے۔

چنانچہ حدیث ضعیف کے لیے جب واضح اور مضبوط قرائن سامنے آجائیں تو بلاشبہ ان پر نہ صرف فضائل میں بلکہ مسائل واحکام میں بھی عمل کیا جائے گا، اس لیے کہ مختلف دبستانِ فقہ میں بہت سی مثالیں ملیں گی کہ فقہاء نے قرائن کی بنیاد پر اور ضعف کے جائز اسباب کے پائے جانے کی وجہ سے بہت سی ضعیف احادیث کو قبول کیا ہے، قول اسباب و عوامل کو قبول کرنا اور قرائن و امارات کو محتاط انداز میں نقد و جرح کے لیے اور تعدیل کے لیے بنیاد بنانا اسلامی اصول اور فنی مطالبہ کی خلاف ورزی نہیں۔

۳۔ رہی یہ بات کہ وہ کون سے عوامل اور امور ہیں جو کہ ضعف حدیث کی تلافی کا ذریعہ بنتے ہیں، ائمہ فن نے مختلف جگہوں پر اس کے بارے میں وضاحت کے ساتھ یا اشاروں میں کافی کچھ لکھا ہے، یہاں اختصار کے ساتھ ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

☆ کوئی امام/مجتہد کسی حدیث سے استدلال کرے، تو یہ استدلال حدیث کی تصحیح کے مترادف ہے، بقول ابن عابدین:

''المجتھد اذا استدل بحدیث کان تصحیحا له'' (رد المحتار، ۴/۴۷)۔

مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ بظاہر کسی ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں یا ان کا بیان کردہ کوئی مسئلہ حدیث ضعیف کے ہی مطابق ہے تو یہ ایک مضبوط قرینہ ہے کہ حدیث صحیح ہوگی، جبھی امام ابوحنیفہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے، کیونکہ اجالہ صحابہ کی طرح امام ابوحنیفہ نے بھی اپنے پاس حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہونے کے باوجود بھی روایت حدیث سے احتراز کیا اور احادیث کو مسئلہ کی شکل میں بیان کیا جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

پس یہ مسائل درحقیقت آنحضور ﷺ کی احادیث ہیں جنہیں امام صاحب نے بطریق افتاء نقل کیا ہے، بطریق تحدیث نہیں اس لیے کہ روایت حدیث کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ کہ وہ آدمی (راوی) راویوں کا اپنے اور آنحضور ﷺ کے درمیان نام لے کر سند بیان کرے اور اسے آنحضور ﷺ تک مرفوعا یا مرسلا پہنچائے اور کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کہا یا کیا اور اپنے شیخ سے سنے ہوئے کو انہیں کے الفاظ میں یا ان کے قریبی الفاظ میں نقل کرے)۔

دوسری قسم یہ کہ اس سے کوئی حکم مستنبط کرے اور اس کے بارے میں خبر دے (قواعد فی علوم الفقہ، ۲ / ۲۰)۔

گویا ایک موقف یہ ہوا کہ امام کا حدیث ضعیف سے استدلال اس کے ضعف کی تلافی کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ حدیث اس امام تک کسی صحیح سند سے ہی پہنچی ہوگی، تبھی اس نے قابل اعتناء سمجھا ہوگا، ایسا کسی امام مجتہد سے مستبعد ہے کہ وہ صحیح روایت کے رہتے ہوئے خواہ مخواہ ضعیف روایت پر عمل کرے۔

اسی طرح اگر کسی صحابی رسول کا فتویٰ پر عمل حدیث ضعیف کے مطابق ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کی کوئی نہ کوئی صحیح اصل ضرور موجود ہے؛ کیونکہ بہت سے صحابہ خصوصاً حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو بطور احادیث بیان کرنے کے بجائے اپنے فتوی اور اپنی رائے کی شکل میں بیان کرتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ عاجز اس سلسلہ میں ایک بحث رکھتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، اور ابن مسعود کی حدیث میں، بہت ایسا پائیں گے کہ ظاہراً موقوف ہوگی اور حقیقۃً مرفوع" (ازالۃ الخفاء نقلاً عن قواعد فی علوم الفقہ، ۲/ ۲۱)۔

☆ حدیث ضعیف عرف وعادت کے مطابق ہو، اس وقت بھی اس کی تقویت کا سبب بنے گا، کیونکہ عرف وعادت کو چند قیود وشرائط کے ساتھ شریعت نے ایک دلیل کا درجہ دیا ہے، فقہ اسلامی میں مسائل کے استنباط واستخراج کا ایک اہم مدار ومحور عرف وعادت ہے، فقہاء اسے ایک متفقہ اور غیر نزاعی اصول مانتے ہیں۔

تدریب الراوی (۱/ ٦۷) کے حوالہ سے یہ بحث گذر چکی ہے کہ حضرت جابرؓ کی ایک روایت جو کہ دینار کو ۲۴/ قیراط بتلاتی ہے اگر چہ سنداً کمزور ہے لیکن عرف وعادت میں دینار کی جو تشریح وتفصیل ہے، اس سے حدیث کی سند کی جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی، البتہ حدیث ضعیف کو عرف وعادت، یا مصالح سے مربوط کر کے ایک نتیجہ نکالنا انتہائی مشکل اور پیچیدہ کام ہے جس کے لیے عمیق نگاہ، عبقری صلاحیت، اصول واصول فقہ سے واقفیت کے ساتھ ساتھ انتہائی درجہ حزم واحتیاط ضروری ہے۔

حدیث ضعیف شریعت کے عام مسلمہ اور متفقہ اصول سے ہم آہنگ ہو، یعنی اس سے شریعت کے عمومی نظریہ واصول کی تائید ہوتی ہو، اس وقت بھی اس کو تقویت ملے گی۔

☆ حدیث اگر اس بناء پر ضعیف قرار دی گئی ہے کہ اس کے راوی کو مثلاً "منکر الحدیث تفرد عن فلان بحدیث، هو ضعیف لیس بالقوی" جیسی جرحوں کا سامنا ہے تو دیکھا جائے گا کہ ثقہ راویوں نے اس راوی کی متابعت کی ہے یا نہیں اگر متابعت کی ہوگی تو اس سے حدیث کا ضعف جاتا رہے گا۔

یا راوی کو اہل فن نے مجہول کہا ہو لیکن یہ ثابت ہو جاتا ہو کہ اس راوی سے ایک سے زائد ثقہ محدثین نے حدیث نقل کی ہے تو اس سے اس کی جہالت مرتفع ہو جائے گی، مثلاً ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں حضرت علیؓ سے ابوداؤد نے جو روایت موقوفاً نقل کی ہے اس کی سند یہ ہے:

"حدثنا محمد بن محبوب، ثنا حفص بن غیاث عن عبدالرحمن بن اسحق عن زیاد بن زید عن ابی جحفة ان علیا قال من السنة..." (ابوداؤد باب وضع الیمن علی الیسری فی الصلوٰۃ)۔

اس میں علماء نے زیاد بن زید کو مجہول کہا ہے جس کی بناء پر یہ روایت ضعیف ہو جاتی ہے، اور دیگر روایتوں کے مقابلہ میں ساقط الاعتبار۔ علامہ خلیل احمد سہارنپوری اس پر تحریر فرماتے ہیں:

اس روایت کو دار قطنی وغیرہ نے تین سندوں سے بیان کیا ہے، دو سندیں یوں ہیں، عبدالرحمن بن اسحٰق عن زیاد بن زید عن ابی جحفہ عن علی...... اور تیسری سند: عبدالرحمن بن اسحٰق عن النعمان بن سعد عن علی کے واسطے سے بیان کی گئی ہے لہٰذا زیاد بن زید کا مجہول ہونا کچھ نقصان دہ نہیں ہوگا" (بذل المجہود، ۲/ ۲۳، مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

۴۔ مذکورہ تشریح سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ روایت کی تصحیح میں یا ضعیف روایت کے ضعف کا جابر بننے کے لیے تعدد طرق ایک موثر اور مضبوط ذریعہ ہے، اصحاب فن علماء ومحدثین نے اس اصول کو چند باہمی جزوی اختلاف کے ساتھ قبول کیا ہے کہ اگر روایت ضعیفہ ایک سند کے بجائے متعدد اسناد سے منقول ہوں، تو ان کے مجموعہ سے کچھ شرائط کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حدیث اصلاً درست ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی نقل کرتے ہیں:

"والحدیث الضعیف اذا تعددت طرقه ولو طریقا واحدا اخری ارتقی بمجموع ذلك الی درجة الحسن وكان محتجا به" (قواعد فی علوم الحدیث/ ۷۸)۔

(حدیث ضعیف جب متعدد طرق سے مروی ہو، خواہ ایک ہی طریق (سند) سے ہو تو اس کے مجموعہ سے حسن کا درجہ حاصل کر لے گی، اور وہ قابل استدلال ہوگی)۔

محدثین کے نزدیک یہ ایک مسلمہ شئے ہے کہ تعدد طرق سے احادیث کو تقویت پہنچتی ہے، البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جب تمام سندیں ضعیف ہوں تب بھی یہی حکم ہے؟ علماء احناف و دیگر محققین کی رائے ہے کہ اگر ضعف فسق کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہے جیسے کہ حفظ واتقان کی کمی، روایت کا مرسل ہونا (شوافع و کچھ دیگر علماء کے مطابق) راوی کا مدلس ہونا، مجہول ہونا وغیرہ کی وجہ سے ہو تو ہر حال میں تعدد طرق حدیث ضعیف کے ضعف کو دور کرنے والا (جابر) ثابت ہوگا، سیوطی نقل کرتے ہیں:

جب حدیث ضعیف سندوں سے مروی ہو تو ضروری نہیں کہ ان کے مجموعہ سے یہ حاصل ہو جائے کہ وہ قوی ہے، بلکہ جس کا ضعف صدوق امین راوی کے ضعف حفظ کی بناء پر ہو تو وہ ضعف دوسرے طرق کی وجہ سے زائل ہو جائے گا اور وہ حسن ہو جائے گا، ایسے ہی جب اس کا ضعف ارسال کی وجہ سے ہو تو دوسرے طریقہ (سند) سے مروی ہونے سے زائل ہو جائے گا (تدریب الراوی، ۲/۷۷-۱۷۶)۔

بعض علماء نے مزید صراحت کے ساتھ اس کا بیان کیا ہے، حافظ العراقی کے حوالہ سے ظفر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''وهذه الاسانيد وان كانت ضعيفة لكن اذا ضم بعضها الى بعض احدثت قوة...'' (قواعد فی علوم الحدیث/۸۱)۔

(یہ سندیں ہر چند کہ ضعیف ہیں لیکن ان میں سے بعض کو بعض سے جب ملایا جاتا ہے تو ایک قوت حاصل ہو جاتی ہے)۔

البتہ بعض علماء کے مطابق یہ ضروری ہے کہ دوسری سندیں پہلی کمزور سند سے اعلیٰ ہوں یا کم از کم مساوی ہوں، اگر دوسری مؤید سندیں پہلی کمزور سند سے بھی زیادہ کمزور ہوں گی تو پھر یہ تعدد حدیث ضعیف کے ضعف کی تلافی کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکے گا۔

حافظ ابن حجر متابعت کے باب میں بیان کرتے ہیں:

''ومتى توبع سئى الحفظ بمعتبر كان يكون فوقه او مثله لادونه...'' (شرح نخبة الفكر/۱۹۳)۔

(اور جب سئی الحفظ راوی کی متابعت کسی معتبر راوی کے ذریعہ ہو، مثلاً یہ کہ قوت میں اس سے بڑھ کر ہو یا اس کے برابر ہو یا اس سے کم نہ ہو (تو روایت قابل اعتبار ہوگی))۔

لیکن تعدد طرق کی ایک نوع متابعت میں ایک شرط ہے اور وہ یہ کے متابع اور متابع کی روایت ایک ہی صحابی سے مروی ہونی چاہئے: ''لکهنما مختصة بکونها من رواية ذالك الصحابي'' (شرح نخبة الفکر/۱۱۰)۔

حاصل یہ کہ اس ضمن میں علماء کی آراء اور مختلف مکاتب فکر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد طرق ضعف کی تلافی کا ایک موثر ذریعہ ہے، خصوصاً فقہاء احناف متفقہ طور پر اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں (دیکھیں: رد المحتار، ۱/۱۲۷)۔

ائمہ محدثین کے یہاں بھی کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ وہ تعدد طرق کو تسلیم کرتے ہیں (دیکھیں: رد المحتار)۔

امام ترمذی نے یہ حدیث:

''ان امراة من بنى فزارة تزوجت على نعلين فقال رسول الله ﷺ: ارضيت من نفسك ومالك بنعلين؟ قالت نعم فاجاز'' (ترمذی ۲/باب مهور النساء)۔

اس سند سے نقل کیا ہے: ''شعبة عن عاصم بن عبيد الله عن عبد الله بن عامر بن ربيعه عن أبيه...''

گرچہ امام ترمذی نے راویوں پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، لیکن اس کے ایک راوی حد درجہ کے ضعیف ہیں، اور وہ عاصم بن عبید اللہ ہیں، ابن معین کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، یہی رائے امام احمد کی ہے، ابن سعد کہتے ہیں: ''لا يحتج به'' یعقوب بن شیبہ کی رائے ہے: ''له احاديث مناكير''، ابو حاتم کی جرح ہے کہ وہ

منکر الحدیث، مضطرب الحدیث ہے، اس کی کسی حدیث پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے یہی رائے امام نسائی کی ہے، ابن خزیمہ کہتے ہیں "لست اختج به لسوء حفظه"۔ ابوداؤد فرماتے ہیں: "لا یکتب حدیثه"، ابن حبان یوں جرح کرتے ہیں: "کان سئی الحفظ کثیر الوهم فاحش الخطاء فترك من اجل کثرۃ خطائه" (تہذیب التہذیب ۵/ ۴۷۔۴۸م داراحیاء التراث العربی)۔

اتنی زبردست جرحوں کے باوجود امام ترمذی اس ضعیف راوی عاصم کی روایت کو "حسن صحیح" قرار دیتے ہیں، استاذ احمد بن محمد شاکر بھی امام ترمذی کے حسن صحیح کہنے پر خاموش ہیں تو اس کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ روایت چونکہ متعدد طرق سے مروی ہے اس لیے اس نے حسن کا درجہ اختیار کرلیا ہے، اور وہ بعض فقہاء کے نزدیک قابل استدلال بن چکی ہے، حاصل یہ کہ تعدد طرق کی بناء پر ضعیف روایتوں سے استدلال کرنا یہ صرف احناف کا موقف نہیں بلکہ جمہور کا موقف ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بغیر تحقیق کے احناف کی جانب صرف احادیث ضعیفہ سے استدلال کرنے کی نسبت کی جاتی ہے، یہ جانے بغیر کہ انہوں نے جن احادیث ضعیفہ کو متدل بنایا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

۵۔ گذشتہ تشریح سے قطعاً یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حدیث ضعیف خواہ کیسی بھی ہو اور اس کے راوی جس درجہ کے ضعیف ہوں ہر حال میں تعدد طرق سے ضعف دور ہوجائے گا، بلکہ علماء کے نزدیک اس سلسلہ میں یہ ضابطہ ہے کہ ضعف میں شدت نہ ہو اگر ضعف میں شدت ہوئی تو پھر حدیث ضعیف مختلف اسناد سے مروی ہونے کے باوجود مقبول نہیں ہوگی، جیسا کہ ابن عابدین کی اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے:

"مقتضی عملهم بهذا الحدیث انه لیس شدید الضعیف فطرقه یرقیه الی الحسن" (ردالمحتار ۱/ ۱۲۸)۔

علامہ سیوطی نے اس باب میں یہ ضابطہ بیان کیا ہے:

اگر حدیث راوی کے فسق یا اس کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ضعیف ہو تو اس میں راوی کے علاوہ دوسرے کی موافقت موثر نہیں ہوگی جب کہ دوسرا بھی اسی جیسا (ضعیف) ہو، ایسا ضعف کی شدت اور اس پر جابر کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہے، ہاں ان کے مجموعہ سے یہ ضرور ہوگا کہ حدیث منکر اور بے اصل نہیں رہے گی (تدریب الراوی، ۱/ ۱۷۷)۔

احکام میں احادیث ضعیفہ کی استدلالی حیثیت

۱، ۳۔ ایسی احادیث ضعیفہ جن کے ساتھ کچھ دوسری موثر اور موئید دلیلیں نہ ہوں، مثلاً قرائن سے اسے تقویت نہ ملتی ہو نہ ہی اس میں تعدد طرق پایا جاتا ہو، نہ وہ متلقی بالقبول ہوں تو ان کے بارے میں اجمالی اور اصولی حکم یہی ہے کہ بہر حال حدیث ضعیف انسانی رائے پر فوقیت رکھتی ہے۔

علامہ ابن حزم فقہاء احناف کی رائے نقل کرتے ہیں:

"جمیع الحنفیة مجموعون علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عنده اولی من الرأی"۔ (نقلا عن قواعد فی علوم الحدیث/ ۹۵۔۹۶)۔

(تمام احناف کا اتفاق ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف ان کے نزدیک قیاس پر فائق ہے)۔

ابن مندہ امام ابوداؤد کے بارے میں فرماتے ہیں:

اور جب وہ باب میں حدیث ضعیف کے علاوہ کوئی دوسری حدیث نہیں پاتے تو اسے ہی بیان کرتے، اس لیے کہ ان کے نزدیک اس کی حیثیت انسانی آراء سے برتر ہے (التقیید والایضاح شرح مقدمہ ابن الصلاح/ ۴۰)۔

یہی رائے امام احمد اور دیگر محدثین وائمہ کی ہے، اگر امام ابوحنیفہ نے قہقہہ والی روایت کو قیاس پر ترجیح دیا ہے باوجود یہ کہ علماء حدیث کا اس کے ضعف پر اتفاق ہے، ایسے ہی نبیذ تمر سے وضو والی روایت کو قیاس پر مقدم رکھا جبکہ اکثر اہل فن اس کو ضعیف کہتے ہیں، حیض کی مدت دس دن ہے اس روایت کو قیاس پر ترجیح دیا گیا حالانکہ روایت ضعیف ہے "دس درہم سے کم پر مہر نہیں ہے" اس روایت کو بھی قیاس پر فائق سمجھا گیا یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ روایت ضعیف ہے، تو دوسری طرف امام شافعی کے نزدیک بھی اس رجحان کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ انہوں نے ممنوع اوقات میں مکہ میں نماز کے جواز سے متعلق روایت کو اس کے ضعف کے باوجود قبول کرلیا جبکہ قیاس صراحتاً اس کی نفی کررہا تھا، انہیں کے ایک قول کے مطابق حدیث: "من قاء او رعف

فلیتوضأ ولیس علی صلاته مالم یتکلم " کو فقہ شافعی میں جگہ ملی، حالانکہ روایت ضعیف ہے اور مرسل بھی ہے، جس کو شوافع ضعیف کے ہی زمرے میں شامل کرتے ہیں، امام مالک بھی حدیث مرسل اور منقطع اور قول صحابی کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں، امام احمد کا موقف بھی یہی ہے کہ قیاس کی جانب اسی وقت رجوع کیا جائے گا جبکہ متعلقہ باب میں کوئی ضعیف روایت بھی نہ ہو (نواب صدیق حسن خان مرحوم: الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ/ ۷ ۱۲ ـ ۱۲۹)۔

۲۔ اب سوال متاخرین اور متقدمین علماء کے درمیان اصطلاحوں کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے کہ ضعیف کا مصداق کیا ہے؟ مطلق ضعیف یا وہ حدیث جو "حسن لغیرہ" کہلاتی ہے؟ علماء احناف کے دعویٰ کے مطابق الحدیث الضعیف مقدم علی القیاس کا مصداق وہ روایتیں ہیں جو علماء متاخرین کے نزدیک فی نفسہ ضعیف تو ہیں، لیکن قرائن اور شواہد کی بناء پر ضعیف سے ترقی کر کے "حسن لغیرہ" کا مرتبہ اختیار کرگئی ہیں، ان کے دعویٰ کے مطابق فقہاء احناف نے جن ضعیف احادیث سے استدلال کیا ہے اگر ان کی اسناد اور ان روایتوں کے طرق و دیگر مؤید کو دیکھا جائے، تو پتہ چلے گا کہ تمام روایتیں حسن لغیرہ ہیں (قواعد فی علوم الحدیث/ ۱۰۸)۔

فقہاء کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ضعیف حدیث کا اصل مصداق کیا ہے؟ علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں:

"شرط العمل بالحدیث الضعیف عدم شدة ضعفه وان یدخل تحت اصل عام" (درمختار، ۱/ ۱۲۷)۔

(ضعیف حدیث پر عمل کی شرط یہ ہے کہ اس کے ضعف میں شدت نہ ہو اور یہ کہ وہ عام اصل کے تحت داخل ہو)۔

حافظ ابن قیمؒ نے اس باب میں بڑی اچھی بحث کی ہے انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف اعلام الموقعین میں تحریر فرمایا ہے:

"چوتھی اصل مرسل اور حدیث ضعیف سے استدلال ہے، جبکہ اس باب میں کوئی ایسی شئی نہ ہو جو اس کو دفع کر سکے اس کو علماء نے قیاس پر ترجیح دیا ہے، ان کے نزدیک ضعیف سے مراد باطل اور منکر نہیں اور نہ وہ جس میں کوئی تہمت لگایا ہوا ہو اس طور پر کہ اس کی جانب رجوع کرنا اور عمل کرنا بھی بلکہ ان کے نزدیک حدیث ضعیف صحیح کی ایک قسم ہے اور ایک حسن کی (پہلے) حدیث صحیح، حسن، ضعیف، وغیرہ انواع پر تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔

بلکہ صرف صحیح اور ضعیف پر منقسم ہوتی تھی ضعیف کے بھی ان کے یہاں کئی مراتب ہیں، پس جب باب میں نہ کوئی اثر ہو، اور نہ کسی امام کا قول جو اسے دفع کر سکے، نہ ہی کوئی اجماع اس کے خلاف ہو تو اس پر عمل کرنا ان کے نزدیک قیاس پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔

ائمہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو مجموعی طور پر اس اصل کا موافق نہ ہو، اس لیے ہر ایک امام نے حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم رکھا ہے (اعلام الموقعین، ۱/ ۳۱)۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے شیخ محمد عوامہ کے حوالہ سے ضعیف حدیث کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ ایسی ضعیف حدیث جس کے لیے متابعت، شاہد وغیرہ کی صورت میں جابر موجود ہو اور اس کے کسی راوی کے بارے میں اس قسم کی جرح کی گئی ہو: لین الحدیث: فیہ لین ایسی حدیث من وجہ حسن سے مشابہ ہوتی ہے اور من وجہ ضعیف سے لیکن یہ حسن سے اقرب ہوتی ہے۔

۲۔ ایسی ضعیف حدیث جس میں متوسط قسم کا ضعف ہو، یہ ایسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ اس کے راوی کے بارے میں کہا جائے: ھو ضعیف الحدیث، مردود الحدیث، منکر الحدیث۔

۳۔ چوتھی یہ کہ روایت موضوع ہو۔

چاروں قسمیں بیان کرنے کے بعد شیخ محمد عوامہ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم، امام احمد کے اس موقف (ضعیف حدیث لوگوں کی رائے سے بہتر ہے) کا مصداق پہلی قسم کو ہی ٹھہراتے ہیں، بقیہ تینوں قسموں کو وہ ساقط الاعتبار قرار دیتے ہیں (عبدالفتاح ابوغدہ، تعلیق علی قواعد فی علوم الحدیث/ ۱۰۰ـ۱۰۱)۔

اس باب میں حنفی نقطہ نظر کے بیان اور اس کی تشریح و توضیح میں بالعموم ناقلین نے غلطی ہے اور انہوں نے حدیث ضعیف سے مطلق ضعیف سمجھا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ حنفی کی مستدل ضعیف روایتوں کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ حدیثیں بالکل ہی ضعیف ہیں جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، مثلاً حدیثِ قہقہہ ہے کہ اس کے بارے میں بغیر تحقیق کے رائے زنی کردی جاتی ہے، حالانکہ علماء احناف کے مطابق وہ روایت

متعدد طرق سے مقبول ہے علامہ ظفر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"مذکورہ تفصیل سے واضح ہو چکا ہے کہ قہقہہ سے نقض وضو کا مسئلہ متعدد احادیث سے ثابت ہے بعض مرسل ہے تو بعض مرفوع حسن ہے، اس کے علاوہ ہم نے بہت سی احادیث کو چھوڑ دیا ہے جو کہ اس باب میں وارد ہوئی ہیں وہ گو کہ ضعیف ہیں لیکن بعض کو بعض سے تقویت ملتی ہے، پھر امام ابوحنیفہ پر لعن طعن کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے" (اعلاء السنن، ۱/ ۱۷۱)۔

۲۔ یہ واضح ہو چکا ہوگا کہ ائمہ کے کلام میں ضعیف احادیث سے استدلال کی صحیح تشریح اور صحیح مصداق کیا ہے؟

البتہ یہ مسئلہ اب بھی باقی رہ جاتا ہے کہ پھر ان احادیث ضعیفہ کا کیا ہوگا، جو صرف ایک ہی سند سے مروی ہوں ان میں قرائن، تلقی اور دیگر موئیدات نہ پائے جاتے ہوں، کیا احکام ومسائل میں ان احادیث سے اخذ واستنباط کی گنجائش ہے؟

ابوبکر ابن عربی کی رائے ہے کہ احکام ومسائل میں مطلقاً قبول نہیں کی جائیں گی، زرکشی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترغیب وترہیب کے علاوہ میں مردود ہے، جمہور کی رائے ہے کہ اس پر عمل کی گنجائش موجود ہے، البتہ اس کے لیے کچھ شرطیں ہیں جن کو تقریباً اصحاب فن نے نقل کیا ہے، میں یہاں اختصار کے ساتھ ان کو ذکر کرتا ہوں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ضعف میں شدت نہ ہو، ضعف میں شدت سے مراد یہ ہے کہ راوی متہم بالکذب نہ ہو، یا کاذب نہ ہو، فحش غلطیاں نہ کرتا ہو، اس شرط پر حافظ ابن حجر اور علائی نے اتفاق نقل کیا ہے۔

۲۔ اگر ضعف میں شدت نہیں ہے پھر دیکھا جائے گا کہ وہ حدیث ضعیف دین کے کسی عمومی اصل اور ضابطہ کے تحت آتی ہے یا نہیں؟ اور وہ دین کے عام مذاق کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر وہ عمومی ضابطے کے مطابق اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہوگی تو وہ مقبول ہوگی۔

۳۔ پھر یہ کہ اس سے احکام میں حرام وحلال کا ثبوت نہیں ہوسکتا، وجوب کے لیے استدلال نہیں کیا جاسکتا، فقط ان پر احتیاطاً عمل کیا جاسکتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔

۴۔ نیز یہ کہ اس پر "سنیت" کا اعتقاد نہ کیا جائے (ملاحظہ فرمائیں: تدریب الراوی، ۱/ ۲۹۸-۲۹۹، الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ/ ۱۲۶، درمختار مع رد المحتار، ۱/ ۸۷، قواعد فی علوم الحدیث/ ۹۴)۔

فضائل میں حدیث ضعیف سے استدلال

۲،۱۔ گرچہ بعض حضرات نے یہ رائے دی ہے کہ ضعیف روایتیں فضائل کے باب میں مقبول نہیں ہیں، تاہم جمہور محدثین فقہاء کی رائے یہ ہے کہ فضائل کے باب میں ان کا اعتبار کیا جائے گا، نواب صدیق حسن خان علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

"وان كان من جهة اتهام الكذب او الشذوذ او فحش الخطاء لا يجبر بتعدد الطرق" حسن خان ایسے ہی علامہ نوویؒ نے الاذکار میں نقل کیا ہے کہ جب تک حدیث پر "وضع" کا حکم نہ لگایا جائے، اس وقت تک ترغیب وترہیب اور فضائل میں ان پر عمل کرنا مستحب ہوگا۔

اس رائے پر بعض علماء نے یہ کہہ کر اعتراض کیا کہ ضعیف احادیث فضائل اعمال میں کیوں کر مقبول ہوں گی جبکہ اس پر عمل کرنے اور اس کے مستحب قرار دیئے جانے کے بعد وہ بھی احکام شرعیہ کے ضمن میں آجاتے ہیں، اس طرح اسے مقبول بنا کر احادیث ضعیفہ سے احکام میں استدلال کے جواز کا موقع فراہم کیا جارہا ہے اس کا جواب یوں دیا گیا:

"جب کوئی حدیث کسی عمل کی فضیلت کے بارے میں جس میں حرمت اور کراہت کا احتمال نہ ہو، اس پر ثواب کی نیت کرتے ہوئے عمل کرنا جائز ہے، اگر معاملہ حرمت اور ثواب کے مابین معلق ہو تو اس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہے، اس لیے کہ مباح شئے بھی نیت سے مستحب ہوجاتی ہے، پس یہاں عمل کا جواز حدیث کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ "اباحت" بھی احکام خمسہ میں سے ہے......" (الحطۃ/ ۱۲۸)۔

احادیث ضعیفہ کی استدلالی حیثیت

مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی [1]

حدیث ضعیف کی تعریف

ضعیف وحدیث ہے جس میں حسن کے شرائط مفقود ہوں، سند میں تسلسل نہ ہو یا راوی میں موجب طعن موجود ہو:

"الضعیف ما لم یجمع صفة الحسن" (قواعد فی علوم الحدیث/۳۶)۔

تعریف مذکور کے مطابق حدیث ضعیف دو نوعوں میں تقسیم ہوگی، پہلی نوع وہ حدیث ضعیف جس میں سند میں سے کسی راوی کا ساقط ہونا موجب رد ہو، تو اس کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ معلق ۲۔ مرسل ۳۔ معضل ۴۔ منقطع

دوسری نوع وہ حدیث ضعیف جس کے راویوں میں سے کسی راوی میں موجب طعن ہو اس کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ جس کے راوی میں موجب رد کذب ہو تو وہ روایت موضوع ہے۔
۲۔ راوی کا کذب سے متہم ہونا موجب طعن ہو تو وہ حدیث متروک ہے۔
۳۔ اگر فحش غلطی یا زیادتی غفلت یا ظہور فسق موجب رد ہو تو وہ حدیث منکر ہے۔
۴۔ راوی کا وہم کرنا موجب رد ہو تو اس حدیث کا نام معلل ہے۔
۵۔ ثقہ راویوں کی مخالفت موجب رد ہو تو ادراج کے ذریعہ مخالفت کے وقت حدیث مدرج ہے۔
۶۔ الفاظ کو مقدم ومؤخر کرنے کی صورت میں حدیث مقلوب ہے۔
۷۔ تدافع کے باوجود بدلنا پایا جائے اور مرجح نہ ہو تو مضطرب ہے۔
۸۔ رسم الخط باقی رکھنے کے ساتھ صرف لفظوں کو تبدیل کیا ہو تو اس کا نام مصحف ہے۔
۹۔ الفاظ کی شکل وصورت بدل دی جائے تو اس کو محرف کہتے ہیں (خلاصہ مقدمہ فتح الملہم/ ۵۶)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں دیانت وصداقت کے باوجود بعض راویوں کے حافظہ کی خرابی سے جب ضعف پیدا ہوا اور یہی حدیث دوسری سند سے بھی مروی ہو تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ راوی نے اس حدیث کو ٹھیک طور پر یاد رکھا ہے اور اس کے محفوظ رکھنے میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا، لہٰذا ضعیف سے حسن تک وہ حدیث ترقی کر جائے گا۔

اسی طرح جس کا ضعف ارسال کی وجہ سے پیدا ہو، مثلاً وہ مرسل جس کو امام حافظ نے ارسال کیا ہو تو اسی حدیث کے دوسری سند سے مروی ہونے سے اس کا ضعف زائل ہو جائے گا اور ضعیف سے حسن کے درجہ کی طرف وہ حدیث ترقی کر جائے گی۔

اور ارسال کی طرح تدلیس یا بعض راویوں کی جہالت کے سبب پیدا ہونے والا ضعف بھی تعدد طرق سے ختم ہو جائے گا اور یہ حدیث ضعیف

---

[1] ناظم جامعہ خیر العلوم بھوپال۔

حسن کے درجہ تک پہنچ جائے گی۔

اور ارسال کی طرح تدلیس یا بعض راویوں کی جہالت کے سبب پیدا ہونے والا ضعف بھی تعدد طرق سے ختم ہوجائے گا اور یہ حدیث ضعیف حسن کے درجہ تک پہنچ جائے گی۔

اگر اس کا ضعف زائل کرنا ممکن نہیں ہو، جیسے راوی پر جھوٹ کی تہمت سے پیدا ہونے والا ضعف، یا حدیث کے شاذ ہونے کی وجہ سے آنے والا ضعف تو دوسری سندوں سے بھی یہ ضعف دور نہیں ہوں گے، لہٰذا ضعیف سے حسن تک اس کی ترقی نہیں ہوگی، مثلاً یہ حدیث کہ جو شخص میری امت کو چالیس حدیثیں محفوظ کر کے پہنچائے گا اللہ قیامت کے روز اس کو فقہاء کے زمرہ میں شامل کر کے اٹھائے گا، کثرت طرق کے باوجود اس کے ضعیف ہونے پر سب کو اتفاق ہے (مقدمہ فتح الملہم ص ۲۸)۔

ضعیف حدیث کا حکم

علامہ شبیر احمد عثمانی نے تحریر فرمایا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ موضوع حدیث کو اس کے وضع کی وضاحت کیے بغیر بیان کرنا جائز نہیں، خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو بہرحال غیر موضوع ضعیف کے بارے میں اختلاف ہے، اس کے ضعف کی وضاحت کے بغیر اس سے استدلال کرنے اور اس کی سندوں اور روایت میں نرمی برتنے کے جواز کی طرف ایک جماعت گئی ہے، جبکہ وہ حدیثیں احکام وعقائد کے علاوہ دیگر امور مثلاً فضائل اعمال اور قصص کے بیان میں ہوں، علامہ سخاوی نے فرمایا لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سے استدلال کیا ہے جبکہ باب میں اس کے علاوہ نہ ہو، امام ابوداؤد نے بھی اس کا اتباع کیا ہے اور قیاس پر حدیث ضعیف کو مقدم کیا ہے، امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے، امام شافعی دیگر روایات نہ ہونے کی صورت میں مرسل سے استدلال کرتے ہیں۔

اسی طرح جب امت نے ضعیف حدیث کو قبول کرلیا ہو تو صحیح قول کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کو متواتر کے درجہ میں اتار کر قطعی کو اس سے منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے امام شافعی نے "لا وصیة لوارث" کے متعلق کہا ہے کہ محدثین اس کو ثابت نہیں کرتے، لیکن عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہے اور اس کے مطابق عمل کیا ہے اور آیت وصیت کے لیے اس کو ناسخ مانا ہے۔

یا حدیث ضعیف احتیاط کے موقع پر ہو، جیسے بعض بیوع اور نکاحوں کی کراہت کے متعلق حدیث ضعیف وارد ہوئی ہے تو نووی نے کہا کہ ان سے بچنا مستحب ہے لیکن واجب نہیں اور ابن عربی مالکی نے ضعیف پر عمل کو مطلقاً منع کیا ہے لیکن نووی نے اپنی متعدد تصانیف میں فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کے بارے میں علماء حدیث کا وغیرہ اجماع نقل کیا ہے (مقدمہ فتح الملہم /۵۸)۔

علامہ محدث شعرانی نے فرمایا: "قد احتج جمهور المحدثين بالحديث الضعيف اذا كثرت طرقه والحقوه بالصحيح تارة والحسن اخرى" (قواعد علوم الحدیث/ ۸۲)۔

(ضعیف حدیث کے طرق زیادہ ہوتے کے وقت یقیناً جمہور محدثین نے اس سے استدلال کیا ہے اور اس کو کبھی صحیح سے کبھی حسن سے ملا دیا ہے)۔

حافظ ابن رجب حنبلی نے فرمایا: حقیقتاً محدثین اور فقہاء کے کلام میں اس بارے میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ حفاظ معین حدیث مرسل ہونے کے وقت صرف اس کی صحت کو چاہتے ہیں حالانکہ وہ منقطع ہونے اور حضرت نبی کریم ﷺ تک اس کی سند متصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اصطلاح کے مطابق صحیح نہیں، اور فقہاء کی مراد اس معنی کا صحیح ہونا ہے جس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے، لہٰذا جب قرائن سے اس مرسل کی تائید ہوجائے جو اس کے لیے اصل ہونے پر دلالت کرتے ہوں تو اس کے مدلول کے صحیح ہونے کا ظن قوی ہوجائے گا۔ (ہامش قواعد علوم الحدیث/ ۴۳)۔

موضوع حدیث

موضوع وہ من گھڑت مصنوعی حدیث ہے جس میں جھوٹی بات گھڑ کر حضور ﷺ کی طرف غلط نسبت کی گئی ہو۔

"الموضوع وهو المختلق المصنوع المكذوب على رسول الله ﷺ" (المقدمہ الاباطیل والمناکیر/۱۱)۔

حکم موضوع

موضوع ہونے کا علم ہونے کے باوجود اس کو روایت کرنا حرام ہے، "محرم روایته مع العلم بوضعه الا مبینا بوضعه" مگر اس کے موضوع ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے (مقدمہ الاباطیل المناکیر/۱۷)۔

موضوع کی تعریف میں اختلاف

ابوالفرج کی اصطلاح میں موضوع وہ حدیث ہے جس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہو، اگرچہ محدث نے عمداً جھوٹ نہ بولا ہو، بلکہ اس میں غلطی کی ہو، اسی لیے انہوں نے اپنی کتاب الموضوعات میں اس قسم کی بہت سی احادیث روایت کی ہیں حالانکہ ان کی ذکر کی ہوئی بہت روایتوں کے بارے میں علماء کی ایک جماعت نے ان سے اختلاف کیا ہے اور کہا کہ یہ ان میں سے نہیں جن کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہوگئی ہے، بلکہ ان حدیثوں کے ثبوت انہوں نے بیان کیے ہیں۔

"واما الحافظ ابو العلاء او مثاله فانما یریدون بالموضوع المختلق المصنوع الذی تعمد صاحبه الکذب، والکذب کان قلیلا فی السلف" (مقدمه الاباطیل والمناکیر ص۸۶)۔

(حافظ ابوالعلاء اور ان کے مثل علماء موضوع سے صرف من گھڑت مصنوعی روایت جن کے بنانے والے نے عمداً جھوٹ بولا ہو مراد لیتے ہیں، اور سلف میں جھوٹ کم تھا)۔

احادیث موضوعہ کی چند علامتیں

احادث موضوعہ کو پہچاننے کے لیے ملا علی قاری نے جو علامتیں تحریر فرمائیں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ قرآن پاک کی واضح آیات کے خلاف ہونا (الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ/ ۳۲۴)۔

۲۔ حدیث کا واضح سنت کے کھلم کھلا مخالف اور متضاد ہونا، لہٰذا ہر حدیث جو فساد یا ظلم یا عبث یا باطل کی تعریف، حق کی مذمت یا اس کے مثل پر مشتمل ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بری ہیں۔

۳۔ الفاظ کا پھسپھسا اور قبیح ہونا کہ کان اس کے سننے سے بیزار اور طبیعت اس سے متنفر ہو اور اس کو دفع کرتی ہو (الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ، ص ۳۳۱)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

ابن عبدالبر نے استذکار میں کہا ترمذی نے نقل کیا ہے کہ بخاری نے حدیث "ھو الطھور ماءہ" کی تصحیح کی ہے، حالانکہ اہل حدیث اس جیسی اسناد کو صحیح نہیں کہتے، لیکن حدیث میرے نزدیک صحیح ہے کیونکہ علماء نے اس کو قبول کیا ہے (قواعد فی علوم الحدیث/ ۶۰۔۶۱)۔

علامہ ظفر احمد عثمانی نے فرمایا:

"قد یحکم للحدیث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم یکن له اسناد صحیح" (قواعد فی علوم الحدیث/۶۰)۔

قبول کبھی قول سے ہوتا ہے، اور کبھی عمل سے ہوتا ہے، اسی بنا پر ابن الہمام نے کہا ہے کہ امام ترمذی کا قول کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے اس کی اصل کے قوی ہونے کا تقاضہ کرتا ہے، اگرچہ خاص اس طریق کی تضعیف کی ہے:

"قال الترمذی قد رای ابن المبارک وغیره صلاة التسبیح وذکروا الفضل فیه، وقال البیهقی: کان عبدالله بن مبارک یصلیها وتداوله الصالحون بعضهم عن بعض وفی ذلك تقویة للحدیث المرفوع۔" (قواعد فی علوم الحدیث/ ۶۲)۔

(امام ترمذی نے کہا کہ ابن مبارک وغیرہ کی رائے میں صلوٰۃ التسبیح کی اہمیت ہے اور اس کی فضیلت کو انہوں نے ذکر کیا ہے، بیہقی نے کہا کہ ابن

مبارک صلاۃ التسبیح پڑھتے تھے اور بعض صالحین نے بعض سے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے)۔

جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا ہے: یقیناً امت نے ان دونوں حدیثوں کو استعمال کیا ہے (جن میں باندی کے لیے دو طلاق اور اس کی عدت دو حیض مذکور ہیں)، اگر چہ آحاد کے طور پر مروی ہیں لیکن وہ تواتر کے دائرہ میں آ گیا، کیونکہ اخبار آحاد میں سے جن کو لوگ قبولیت کے ساتھ حاصل کریں وہ ہمارے نزدیک تواتر کے ہم معنی ہے (قواعد فی علوم الحدیث/ ۶۲)۔

مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ عمومی مقبولیت ظاہر کرنے کے لیے اگر چہ تلقی امت کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں مستند و معتمد صالحین اور اہل علم کے نزدیک قبولیت حاصل کر لینا ہی مقبولیت عامہ ہے اور قول و عمل دونوں میں مقبولیت کا حکم یکساں ہے۔

تلقی بالقبول حدیث متواتر کے درجہ میں ہے، اس کے ذریعہ نص قطعی کی تنسیخ بھی ہو سکتی ہے۔

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

محقق ابن ہمام نے کہا: ضعیف حدیث کی صحت پر دلالت کرنے والے قرائن اس کی تائید کریں تو وہ حدیث صحیح ہو جائے گی۔

"قال المحقق في الفتح: اذا تأيد الضعيف بما يدل على صحته من القرائن كان صحيحا" (قواعد علوم الحدیث/۵۹)

کلام مذکور کی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے حضرت ابو ہریرہؓ کا مذہب ہے کہ کتے کے منھ ڈالے ہوئے برتن کو پاک کرنے کے لیے تین بار غسل کافی ہے، ان کا یہ فتویٰ قرینہ ہے کہ ان سے روایت کی ہوئی حدیث مرفوع صحیح ہے۔ (جس میں تین بار دھونے سے پاک ہونے کا ذکر ہے) اور راوی مصنف نے اس حدیث کو اچھی طرح یاد رکھا ہے۔

حافظ ابن رجب حنبلی نے کہا ہے: ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، مالک اور ان کے اصحاب، اسی طرح شافعی، احمد اور ان دونوں کے اصحاب نے مرسل سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ جبکہ دوسری سند سے اس کی تائید ہو جائے۔ ۲۔ یا اس کے ہم معنی دوسرے مرسل دوسری سند سے آئے جو تعدد مخرج پر دلالت کرے۔ ۳۔ یا بعض صحابہ کا قول اس کے موافق ہو یا اکثر اہل علم کا قول اس کے مطابق ہو، ان چاروں میں سے کوئی ایک قرینہ پایا جائے تو وہ مرسل کے صحیح ہونے کی حجت پر دلالت کرے گا۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

علامہ ابن قیم نے فرمایا: امام احمد بن حنبل کے نزدیک ضعیف سے باطل و منکر مراد نہیں اور جس کے راویوں میں متہم بالکذب ہو وہ بھی مراد نہیں، اس کی طرف جانے کی گنجائش نہیں تو عمل کیونکر ہوگا، بلکہ ان کے نزدیک حدیث ضعیف صحیح کی قسم ہے اور حسن کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، پہلے حدیث کو صحیح، حسن، ضعیف کے درمیان تقسیم نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ صرف صحیح اور ضعیف کی طرف ہی تقسیم کیا جاتا تھا، اور ضعیف کے ان کے نزدیک کئی مراتب ہیں (اعلام الموقعین بحوالہ قواعد فی علوم الحدیث/۹۹)۔

علامہ ابن قیم نے تحریر فرمایا کہ اصحاب ابی حنیفہ اس پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے پر مقدم ہے، اسی پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے جیسے کی حدیث قہقہہ کو ضعیف ہونے کے باوجود قیاس پر مقدم کیا ہے، اور سفر میں نبیذ تمر سے وضو کی حدیث کو ضعیف ہونے کے باوجود قیاس پر مقدم کیا ہے، اور دس درہم سے کم کی چوری میں چور کے ہاتھ کاٹنے کو منع کیا ہے، حالانکہ اس مسئلہ میں بھی حدیث ضعیف ہے، الی قولہ ضعیف حدیث اور آثار صحابہ کو قیاس پر مقدم کرنا امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا قول ہے اور سلف کی اصطلاح میں ضعیف سے وہ مراد نہیں جو متاخرین کی اصطلاح ہے، بلکہ متاخرین جس کا نام حسن رکھتے ہیں متقدمین کبھی اس کا نام ضعیف رکھ دیتے ہیں (اعلام الموقعین بحوالہ قواعد فی علوم الحدیث/ ۱۰۰)۔

فضائل میں ضعیف حدیث کا اعتبار

علماء کے نزدیک مواعظ، قصص اور فضائل اعمال میں ضعف کو بغیر بیان کئے ضعیف کی سندوں میں نرمی برتنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات اور حلال وحرام کے احکام میں اس کی اجازت نہیں (قواعد فی علوم الحدیث/ ۴۷)۔

علامہ ظفر احمد عثمانی نے فرمایا ضعیف اور مضعف میں فرق ہے، اول سے فضائل کے علاوہ احکام میں استدلال نہیں کیا جاتا اور دوسرے سے احکام میں بھی استدلال کیا جاسکتا ہے: "فرق بین الحدیث الضعیف والمضعف. فالاول لایحتج به فی الاحکام غیر الفضائل. والثانی یحتج به" (قواعد فی علوم الحدیث ص ۱۰۸)۔

قسطلانی نے ارشاد الساری میں کہا: مضعف وہ ہے جس کے ضعف پر اتفاق نہ ہو بلکہ اس کے متن یا سند میں بعض کی طرف سے تضعیف ہو، اور بعض کی طرف سے تقویت ہو یہ ضعیف سے اعلیٰ ہے (قواعد علوم الحدیث/ ۱۰۹)۔

محقق کمال نے فتح القدیر میں فرمایا: موضوع کے علاوہ ضعیف پر فضائل اعمال میں عمل کیا جاسکتا ہے:

"والضعیف غیر الموضوع یعمل به فی فضائل الاعمال" (قواعد فی علوم الحدیث/۱۱۰)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرمایا: نووی نے متعدد تصانیف میں فضائل وغیرہ میں حدیث ضعیف کے مطابق عمل کرنے پر اہل حدیث وغیرہ کا اجماع نقل کیا ہے (مقدمہ فتح الملہم / ۸۵)۔

فضائل میں حدیث ضعیف پر عمل کے شرائط حسب ذیل تحریر فرمائے ہیں:

۱۔ ضعف شدید نہ ہو۔

۲۔ وہ اصل عام کے تحت داخل ہو جس سے منع کرنے پر ایسی دلیل قائم نہ ہو جو عام کو خاص کردے۔

۳۔ اس پر عمل کے وقت اس کے ثابت ہونے کا عقیدہ نہ رکھیں۔ (تدریب الراوی/ ۱۹۶، بحوالہ فتاویٰ مجموعیہ، ۱/ ۷۳۔ ۷۴)۔

☆☆☆

احادیث ضعیفہ اور ثبوت احکام

مولانا محمد اسعد پالن پوری فلاحی [1]

ا۔حدیث ضعیف کی تعریف

حدیث ضعیف ہر اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حدیث صحیح وحسن کی شرائط نہ پائی جائیں۔

(الدرایة فی اصول الحدیث/۵۵، نیز دیکھئے: علوم الحدیث لابن الصلاح/۳۷، قواعد التحدیث/۱۰۸)۔

۲۔احادیث ضعیفہ کے بنیادی اسباب اور فقہاء ومحدثین کے نکات

کوئی بھی حدیث فی نفسہٖ ضعیف نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ جن واسطوں سے ہم تک پہنچی ہے اس میں کمی زیادتی کی وجہ سے قوت وضعف کے مراتب پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ حدیث کی صحت کا سب سے اعلیٰ درجہ حدیث صحیح لذاتہ کا ہے اور صحت کا آخری درجہ حسن لغیرہ کا ہے، اب جو بھی حدیث درجہ حسن لغیرہ سے نیچے اتر جائے گا اس میں کچھ نہ کچھ ضعف ضرور آجائے گا، ائمہ حدیث نے اس ضعف کے بنیادی دو اسباب بتلائے ہیں:

(۱) طعن برراوی (۲) سقوط از سند۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو چند قسموں پر منقسم کیا ہے، چنانچہ طعن برراوی کے دس اسباب ذکر کئے ہیں:

ا۔راوی کا کذاب ہونا۔ ۲۔متہم بالکذب ہونا۔ ۳۔فاحش الغلط ہونا۔ ۴۔فاسق ہونا۔ ۵۔مکثر غلط ہونا۔ ۶۔ واہم ہونا۔

۷۔مخالف ثقات ہونا۔ ۸۔جاہل ہونا۔ ۹۔بدعتی ہونا۔ ۱۰۔سئ الحفظ ہونا۔

پہلا سبب:......راوی کا کذاب ہونا، ایسے راوی کی حدیث کو حدیث موضوع کہتے ہیں۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ ایسی حدیث پر ظنی طور پر تو وضع کا حکم لگایا جاسکتا ہے قطعی طور پر نہیں (قواعد التحدیث/۱۵۱)۔

جبکہ امام احمد بن حنبلؒ، ابوبکر الحمیدیؒ (شیخ بخاری)، امام شافعیؒ، ابوبکر الصیرفی، ابوبکر، المظفر المعانی المروزیؒ وغیرہم حضرات کا کہنا ہے کہ اس کی روایت قطعی طور پر وضع کا حکم لگا کر مردود قرار دی جائے گی۔ (مقدمہ لابن الصلاح/۵۵)۔

دوسرا سبب:......راوی کا متہم بالکذب ہونا ایسے راوی کی روایت کو متروک کہا جاتا ہے، (الباعث الحثیث فی اختصار علوم الحدیث للحافظ ابن کثیر ص ۵۴)، یہ روایت قبول نہیں کی جائے گی الا یہ کہ راوی اپنی اس حرکت سے توبہ کرلے۔

تیسرا سبب:......راوی کا فاحش الغلط ہونا۔ ایسے راوی کی حدیث کو حدیث منکر کہا جاتا ہے۔

چوتھا اور پانچواں سبب:......راوی کا اپنے قول وفعل میں فاسق اور غافل عن الاتقان ہونا، ایسے راوی کی حدیث کو حدیث منکر کہا جاتا ہے۔ (الباعث الحثیث/۵۴)۔

چھٹا سبب:......راوی کا واہم ہونا۔ ایسے راوی کی حدیث کو حدیثِ معلل کہا جاتا ہے، اگر تحقیق سے راوی کی اس غلطی کا غالب گمان حاصل ہوجائے تو حدیث کی عدم صحت کا فیصلہ کیا جائے گا اور اگر ایسا گمان نہ ہو بلکہ تردد ہو تو توقف کیا جائے گا۔ (علوم الحدیث لمحمد عبید اللہ الاسعدی ص ۱۶۹ / ۱۷۰)

لیکن اس علت کا پالینا اور ایک ایسی حدیث کو (کہ بظاہر اس کے سلسلہ میں سند کے راوی ثقہ وضابطہ وحافظ ہیں اور صحیح کی دیگر تمام شرائط بھی اس

---

[1] دار العلوم فلاح دارین ترکیشور، سورت، گجرات۔

میں پائی جاتی ہیں) نا قابل قبول و نا قابل حجت قرار دینا ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لیے حدیث کے متعلق دیگر تمام علوم پر حاوی ہونا، احادیث کا حافظہ میں محفوظ ہونا، اخبار سلف پر عبور ہوتے ہوئے فہم ثاقب کا مالک ہونا بہت ضروری ہے۔ امام بخاریؒ کے شیخ علی بن مدینی تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ جب تک کسی حدیث کی وہ تمام اسناد جمع نہ کر لی جائیں جن کے ذریعے حدیث منقول ہو کر آئی ہے اس وقت تک کسی حدیث میں کسی علت کا نکالنا بہت دشوار ہے بلکہ ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اکثر یہ علت حدیث کی سند ہی میں پائی جاتی ہے اور کبھی متن میں بھی ہوا کرتی ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ فن نہایت عظیم الشان اور دقیق ہے کہ اس کے جزئیات کی واقفیت بڑی گہری وتحقیق کی طالب ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد ان اسباب وعلل پر ہے جو ظاہر و واضح ہونے کے بجائے نہایت مخفی اور پوشیدہ ہوتے ہیں جن کو علم حدیث کے اعلیٰ درجہ کے باکمال ومحققین فن ہی سمجھ پاتے ہیں اور انہیں کو فن پر عبور ہوتا ہے جو قوی یادداشت کے مالک اور اس میدان کے چپے چپے سے واقف ہوں، یہی وجہ ہے کہ ائمہ فن میں بھی محض چند حضرات نے ہی اس موضوع پر کام کیا ہے، جیسے علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، ابوحاتم، دارقطنی وغیرہ (علوم الحدیث/ ۱۷۰)۔

ساتواں باب:......راوی کا مخالف ثقات ہونا، ایسے راویوں کی احادیث کو مدرج، مقلوب، مزید فی متصل الاسانید، مضطرب اور مصحف کہا جاتا ہے۔

مبحث مدرج: تمام محدثین وفقہاء کا اتفاق ہے کہ صحابہ کے بعد کسی کے لیے ادراج جائز نہیں ہے، البتہ کسی نامانوس لفظ کی شرح کے طور پر ہو تو جائز ہے اسی لیے محتاط و محقق علماء فن سے اس طرح کا ادراج منقول ہے مثلاً امام زہری وغیرہ (تیسیر مصطلح الحدیث/ ۱۰۶)

مبحث قلب:......قلب کے حکم کے باب میں ائمہ جرح وتعدیل کا کہنا ہے کہ قلب کا حکم اسباب قلب پر مبنی ہے:

الف: اگر قلب اغراب کی غرض سے ہو تو اس کے عدم جواز میں کوئی شک نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں قصداً بغیر کسی معقول شرعی ضرورت واجازت کے حدیث کو بدل دیا جاتا ہے اور یہ حرکت وضاعین کیا کرتے ہیں، ایسی حدیث احادیث موضوعہ کے قبیل سے ہوگی۔

ب: اگر امتحان کی غرض سے ہو تو اجازت ہے بشرطیکہ اختتام مجلس سے پہلے اصل صورت کو بیان کر دیا جائے ورنہ سننے والے غلط صورت میں روایت کریں گے سہواً ایسا کرنے والا معذور ہے، البتہ اگر بکثرت کسی سے ایسا ہو تو اس کا ضبط مجروح ہوگا اور روایت بھی ضعیف ومردود ہوگی (علوم الحدیث/ ۱۷۹)

مبحث مزید فی متصل الاسانید:......مزید فی متصل الاسانید کے باب میں لکھا ہے کہ وہم کی بنا پر اس کی حدیث مردود ہوتی ہے بشرطیکہ زیادتی نہ کرنے والا زیادتی کرنے والوں سے اتقان میں فائق ہو، زیادتی کی جگہ دوسرے طریق میں راوی نے سماع کی تصریح کی ہو، اگر دونوں یا کوئی ایک نہ پائی جائے تو زیادتی راجح ومقبول قرار پائے گی (حوالہ بالا/ ۱۸۱)۔

مبحث مضطرب:......اس کا حکم یہ ہے کہ اضطراب راوی کے ضبط کی کمزوری یا عدم ضبط پر دلالت کرتا ہے، اس لیے مضطرب روایت ضعیف ومردود شمار ہوگی (حوالہ بالا/ ۱۸۴)۔

مبحث مصحف:......اس کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی راوی سے اتفاقاً یہ عمل سرزد ہو جائے تو اس کی وجہ سے اس کا ضبط متاثر نہیں ہوتا، اس لیے کہ تھوڑی بہت غلطی سے تو شاذ و نادر کوئی بچتا ہے اور اگر بکثرت ایسا کرتا ہو تو یہ عیب شمار ہوگا جس سے راوی کا ضبط بھی مجروح ہوگا اور فنی مرتبہ وحیثیت بھی کمزور ہوگی (حوالہ بالا/ ۱۸۸)۔

آٹھواں سبب: جہالتِ راوی یعنی راوی کی ذات یا صفات کا غیر معروف ہونا۔ ایسے راوی کی حدیث کو حدیثِ مجہول کہا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مجہول کے احکام کے باب میں تفصیل یہ ہے:

الف: **مجہول العین:** اس کی روایت اس صورت میں غیر مقبول ہوگی جبکہ سلف نے اس کو غیر مقبول اور مردود قرار دیا ہو یا یہ کہ اس کا ظہور عہد تبع تابعین کے بعد ہو البتہ اگر اس سے پہلے ہو تو خواہ سلف نے اس کی تقویت کی ہو یا بعض نے موافقت کی ہو یا یہ کہ سب نے سکوت اختیار کیا ہو، اس پر عمل درست ہے۔

ب: **مجہول الحال:**......راوی مقبول ہے خواہ عدل الظاہر، خفی الباطن ہو یا دونوں کی رو سے مجہول ہو۔

ج: مجہول الاسم:...... یہ بھی مقبول ہے بشرطیکہ قرونِ ثلاثہ سے اس کا تعلق ہو۔ اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی مجہول مطلقاً مقبول نہیں، کم از کم قرونِ ثلاثہ سے تعلق کی قید ضرور ملحوظ ہے (امعان النظر ص ۱۷۶/۱۷۷)۔

نواں سبب:...... راوی کا بدعتی ہونا۔ ایسے راوی کی حدیث کا محدثین نے کوئی خاص نام نہیں رکھا ہے، اس کی حدیث کے باب میں حکم یہ ہے کہ جس شخص کی بدعات کفر کی حد تک پہنچی ہوئی ہوں اس کی روایت کے قبول کرنے میں علما و محدثین کا اختلاف ہے، بعض محدثین نے ایسے بدعتی کی روایت کو مطلقاً مردود قرار دیا ہے اس لیے کہ وہ اپنی بدعت کی وجہ سے فاسق کا درجہ پا چکا ہے، اور ان کے نزدیک فسق تاویلی وغیرہ تاویلی دونوں یکساں ہیں، جس کا کفر تاویلا ہو یا بغیر تاویل ہو، روایت کے مردود ہونے میں یکساں درجہ رکھتا ہے اور بعض محدثین نے اس شرط کے ساتھ کہ یہ بدعتی اپنے مذہب یا اہل مذہب کی نصرت یا اشاعت کے لیے کذب کو حلال نہ سمجھتا ہو خواہ اپنی بدعت کی طرف دعوت دیتا ہو یا نہ دیتا ہو، اس کی روایت قبول کی ہے، بعض علماء نے اس مسلک کو امام شافعیؒ کی طرف منسوب کیا ہے، اس لیے کہ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ میں اہل ہویٰ کی شہادت سوائے فرقہ خطابیہ، شیعیہ کے قبول کرلوں گا، خطابیہ کی اس لیے قبول نہ کروں گا کہ وہ اپنے مذہب کے حق میں جھوٹی شہادت کو بھی حلال سمجھتے ہیں، بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر یہ بدعتی اپنے مذہب کی دعوت دیتا ہو تب تو اس کی روایت مقبول نہ ہوگی اور اگر داعی نہیں تو اس کی روایت مقبول ہوگی، اکثر علماء کا مذہب یہی ہے۔ (الدرایۃ فی اصول الحدیث/۱۰۸)۔

علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ بعض علماء نے اصحاب امام شافعیؒ کے درمیان اختلاف نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو شخص اپنی بدعت کا داعی نہ ہو، اس کی روایت قبول کرنے میں اختلاف ہے، لیکن جو شخص اپنی بدعت کا داعی ہو تو اصحاب امام شافعی کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کی روایت مقبول نہ ہوگی (تدریب الراوی ۱۱۹، فتح المغیث ۲/۲۶)

ابوحاتم بن حبان بستی کا قول ہے کہ جو شخص بدعت کا داعی ہو اس کے متعلق ہمارے تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، وہ فرماتے ہیں کہ میرے علم کی حد تک ایسے بدعتی کی روایت کے رد کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں، یہ تیسرا مذہب دیگر مذاہب کے مقابلہ میں بہتر اور مقتضائے عمل ہے اور اول مذہب یعنی مطلقاً قبول نہ کرنا ائمہ حدیث کے مشہور مسلک سے بہت ہی بعید ہے، کیوں کہ ایسے اہل بدعت جو کہ اپنے مذہب کے حق میں دعوت دینے والے نہ تھے، ان کی روایات سے کتب حدیث بھری پڑی ہیں اور شواہد و اصول میں صحیحین کے اندر بھی ایسے لوگوں سے بکثرت منقول ہیں (تدریب الراوی/۱۱۹، فتح المغیث ۲/۲۶)۔

صاحب تعلیقات نفیسہ نے فتح المغیث کے حاشیہ پر حافظ ابن حجر کے قول کو قول فیصل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن حجر فرماتے ہیں: تحقیق یہ ہے کہ جن فرقوں پر ان کی بدعت کی وجہ سے کفر کا حکم لگایا گیا ہے ان میں سے ہر فرقے کی روایت کو ساقط نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ہر فرقہ اپنے مقابل فرقے کو بدعتی کہتا ہے اور اپنے مخالف کی تکفیر میں مبالغہ سے کام کرتا ہے، چنانچہ اگر مطلقاً اس تکفیر کا اعتبار کرلیا جائے تو تمام فرقوں کی تکفیر لازم آئے گی، اس بنا پر معتمد مذہب یہ ہے کہ جو فرقہ ضروریات دین کا منکر ہو اس کی روایت رد کردی جائے گی، اس لیے کہ مسلم کو گالی دینا فاسق بنا دیتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ کو یا ان کے بعد دیگر صالحین کو برا کہنا بطریقۂ اولیٰ فسق کا سبب ہوگا، علامہ ذہبی نے میزان میں اس کی تصریح فرمائی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بدعتِ صغریٰ، جیسے شیعیت بغیر غلو کے اختیار کرنا مثلاً ان حضرات کو برا کہنا جنہوں نے حضرت علی سے جنگ کی، تابعین میں اس قسم کے بہت سے حضرات تھے، حالانکہ دینداری اور تقویٰ وسچائی میں مکمل تھے۔

۲۔ بدعتِ کبریٰ: مثلاً شیعیت میں غلو اختیار کرنا اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کو گالیاں دینا دین کا رکن سمجھا جائے، چنانچہ اس قسم کے لوگوں کی روایات قابل حجت نہ ہوں گی، نیز عصر حاضر میں اس قسم کے ایسے تمام اصحاب جن میں صدق وامانت نہ پایا جاتا ہو اور تقیہ ان کے مذہب کا ایک جزء ہو، ان کی روایات قابل حجت نہ ہوں گی (تعلیقات نفیسہ بر حاشیہ فتح المغیث/۲۷، ۲۸)۔

ضعفِ حدیث کا دسواں اور آخری سبب:...... راوی کا سیٔ الحفظ ہونا، اس کیفیت کے پیش آنے سے پہلے کی روایات جو ممتاز ہوں یعنی ان کے متعلق معلوم ہو کہ پہلے کی ہیں تو مقبول ہیں اور بعد کی ہوں تو مردود ہوں گی اور جن روایات کے متعلق معلوم نہ ہو کہ پہلے کی ہیں یا بعد کی تو ان کے متعلق

توقف کیا جائے گا (علوم الحدیث ۲۰۲)۔

ضعیفِ حدیث کے کل بنیادی دو اسباب ذکر کئے گئے تھے، طعن برراوی اور سقوط از سند۔ طعن برراوی کی مکمل تفصیل گذر چکی، سقوط از سند کی بنیادی دو قسمیں ہیں: (ا) سقوط ظاہری (۲) سقوط خفی۔

۱۔ سقوط ظاہری کا مطلب یہ ہے کہ سلسلہ سند سے کسی راوی کا رہ جانا اور اس کا ذکر نہ کرنا واضح ہو اور اس کو جاننے کے لیے بہت زیادہ تحقیق وجستجو کی ضرورت نہ ہو، علماء نے سقوط ظاہری کو چار عناوین سے معنون کیا ہے (الف) معلق (ب) مرسل (ج) معضل (د) منقطع۔

۲۔ سقوط خفی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی راوی کا عدم ذکر اس انداز پر ہو کہ بآسانی اسے نہ سمجھا جاسکے، چنانچہ سقوط خفی پر مشتمل حدیث کے دو عناوین تجویز کئے ہیں: (الف) مدلس (ب) مرسل خفی۔ (علوم الحدیث ص ۱۳۹ / ۱۴۰)۔

مبحث معلق: ... اس وصف اور عمل کو تعلیق کہتے ہیں، ایسی احادیث قبولیت حدیث کی شرطوں میں سے ایک شرط یعنی اتصال سند کے نہ پائے جانے کی وجہ سے معلق ومردود قرار پاتی ہیں، اس لیے کہ راوی غیر مذکور کے حال کا علم نہیں ہوتا، اگر غیر مذکور راوی کے حال کا اندازہ ہو خواہ تحقیق کی بناء پر تو حدیث معلق بھی مقبول قرار پاتی ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ کسی ایسی کتاب میں ایسی حدیث مذکور ہو جس میں صحت کا یعنی احادیثِ صحیحہ کے جمع وذکر کا التزام واہتمام کیا گیا ہو، جیسے امام بخاریؒ ومسلمؒ۔ (علوم الحدیث / ۱۴۲)۔

مبحث مرسل: ... مرسل وہ حدیث ہے جس میں کوئی بڑے درجہ کا تابعی صحابی کو چھوڑ کر یہ کہہ دے:

''قال رسول اللہ ﷺ کذا او فعل رسول اللہ ﷺ کذا''

لیکن اگر کوئی چھوٹے درجہ کا تابعی مذکورہ طریقہ پر روایت کرے، مثلاً زہری یہ کہہ دیں۔

''قال رسول اللہ ﷺ کذا یا فعل رسول اللہ ﷺ کذا''

اس میں محدثین کا اختلاف ہے ایک جماعت اس کو مرسل اور دوسری جماعت اس کو منقطع کہتی ہے۔

چونکہ مرسل ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ہے اس لیے جمہور محدثین کے نزدیک قابل حجت نہ ہوگی، خصوصاً امام شافعیؒ کے نزدیک، جیسا کہ امام نوویؒ نے شرح مسلم کی ابتداء میں کہا ہے اور ابن عبدالبرؒ نے تمہید اور حاکم نے حضرت ابن مسیب اور امام مالکؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے اور امام محمدؒ کے مشہور قول اور ابن قیم اور ابن کثیر کے نزدیک مرسل قابل حجت ہے، امام نووی نے شرح مہذب میں یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ فقہاء کی اکثریت یا جمہور فقہاء اس کے حجت ہونے کے ہی قائل ہیں اور کہا ہے کہ امام غزالی نے بھی اس کے حجت ہونے کو جمہور کا مذہب بیان کیا ہے۔ تدریب الراوی میں ابن جریر سے نقل کیا گیا ہے کہ مرسل کے حجت ہونے پر تمام تابعین اور ۲۰۰ھ سے قبل تمام ائمہ کا اتفاق تھا، ان حضرات میں سے کسی سے بھی اس کے حجت ہونے کا انکار ثابت نہیں، ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ ابن جریر کے اس قول کا یہ معنی نکلتا ہے کہ مرسل کے حجت ہونے سے انکار کی ابتداء امام شافعیؒ سے ہوئی ہے، علامہ سخاویؒ نے فتح المغیث میں لکھا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ احادیث مرسلہ کو گذشتہ دور کے تمام ائمہ حجت تسلیم کیا کرتے تھے، جیسے سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ حتی کہ امام شافعیؒ تشریف لے آئے اور انہوں نے مرسل کے حجت ہونے اور نہ ہونے کی بحث کی ابتداء کی، امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں فرمایا ہے کہ امام شافعیؒ نے جو یہ مشہور ہو چکا ہے کہ وہ مرسل حدیث کو قبول نہیں فرمایا کرتے البتہ سعید بن مسیب کی مرسل کو قابل حجت تصور فرماتے ہیں۔ درحقیقت امام شافعیؒ کا مسلک یہ نہیں کہ مرسل حدیث مطلقاً نہ قبول کی جائے یا یہ کہ مطلقاً قبول کی جائے بلکہ انہوں نے مرسل کے قبول کرنے اور حجت ہونے کی چند شروط مقرر کی ہیں، جن مراسیل میں یہ شروط موجود ہوں گی وہ ان کے نزدیک قابل حجت ہوں گی اور جن میں یہ شروط نہ پائی جائیں قابل حجت نہ ہوں گی، مذکورہ بیان سے یہ ثابت ہوا کہ امام شافعیؒ مطلقاً مرسل کے حجت نہ ہونے کے قائل نہیں بلکہ اپنے مقرر کردہ شرائط کے ساتھ وہ مرسل کو قبول فرماتے ہیں (الدرایہ فی اصول الحدیث / ۷۸۔۷۹)۔

علامہ سیوطیؒ نے مرسل کے باب میں دس اقوال ذکر کیے ہیں جن میں سے تین اقوال اہم ہیں:

الف: جمہور محدثین اور اکثر اصولیین وفقہاء کے نزدیک حدیث مرسل ضعیف ومردود ہے اس لیے کہ راوی غیر مذکور کا حال معلوم نہیں، بہت ممکن ہے کہ

وہ غیر صحابی ہو۔

ب: ائمہ ثلاثہ (ابوحنیفہ، مالک، احمد) اور ایک جماعت علماء کے نزدیک مقبول اور لائق احتجاج ہے، بشرطیکہ ارسال کرنے والا ثقہ ہو اور کسی معتمد سے ہی ارسال کرے کہ اسی کا نام چھوڑے، اس لیے کہ ثقہ تابعی جب تک کسی ثقہ سے بات نہ سنے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کرتا تھا، اسی وجہ سے حضرات تابعین سے منقول ہے کہ وہ مرسل پر نکیر نہیں کیا کرتے تھے۔

ج: امام شافعیؒ اور بعض علماء کے نزدیک حدیث مرسل چند شرائط کے ساتھ مقبول ہے:

۱۔ ارسال کرنے والا کبار تابعین میں سے ہو۔

۲۔ جب راوی غیر مذکور کا نام لیا جائے اور تعیین کی جائے تو ثقہ ہی کا نام لیا جائے۔

۳۔ معتمد حفاظ حدیث اگر اس حدیث کو روایت کریں تو مخالفت نہ پائی جائے۔

۴۔ اور ذیل میں سے کسی ایک کی موافقت پائی جائے:

الف: کسی دوسرے طریق وسند سے متصلاً مروی ہو۔

ب: یا مرسلاً مروی ہو مگر ارسال کرنے والا اور اس کے اساتذہ وروات سند پہلی مرسل کے روات سے الگ ہوں۔

ج: کسی صحابی کے قول کے موافق ہو۔

د: اکثر اہل علم اس کے مضمون کے مطابق فیصلہ دیتے ہوں (قواعد فی علوم الحدیث/ ۸۵)۔

اگر یہ شرطیں پائی جائیں تو اصل حدیث مرسل اور اس کی مؤید حدیث دونوں صحیح قرار پائے گی اور اگر ایک طریق وسند سے مروی کوئی صحیح روایت ان کے مخالف ہو اور ان تینوں کے درمیان جمع کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو مرسل حدیث دو سندوں سے مروی ہونے کی بناء پر راجح قرار پائے گی (تدریب الراوی، ۱/ ۱۹۵-۱۹۹)۔

مرسل صحابی: صحابی کی مرسل جمہور کے نزدیک قابل احتجاج ہے، اس لیے کہ یہ احتمال کہ شاید صحابی نے کسی تابعی سے سنا ہو شاذ و نادر کے درجہ کا ہوتا ہے جس کا عام حالات میں اعتبار نہیں اور صحابی ایسے مواقع پر ضرور تشریح فرما دیا کرتے ہیں، اگر وہ یہ تشریح نہ کریں اور براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرتے ہوئے بیان کریں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انہوں نے خود کسی صحابی سے سنا ہے اور صحابی کا عدم ذکر مؤثر نہیں ہوتا۔

مرسل نزد احناف: مرسل روایت اگر کسی تابعی یا تبع تابعی کی ہو تو مطلقاً قبول کرتے ہیں اور اگر تبع تابعین کے بعد کے لوگوں کی ہو تو ثقہ راوی کی مطلقاً اور دوسروں کی تحقیق اور اعتماد کے بعد ہی قبول کرتے ہیں۔ (علوم الحدیث، ص ۱۳۷)۔

مبحث معضل: یہ وہ ضعیف حدیث ہے کہ جس کی سند سے دو یا اس سے زیادہ راوی متواتر ساقط ہوں، اگر یہ سقوط سند کے متفرق مقامات سے ہے تو یہ حدیث منقطع ہوگی معضل نہیں کہلائے گی۔ فقہاء کے نزدیک حدیث معضل پر مرسل یا منقطع کا بھی اطلاق ہوتا ہے، لیکن محدثین کے نزدیک معضل کا اطلاق صرف اسی حدیث پر ہوگا جس کی تعریف ابھی ذکر کی گئی۔

جب ثقہ روات کا کسی حدیث میں اس طرح اختلاف واقع ہو جائے کہ بعض اس کو متصلاً اور بعض مرسلاً روایت کرتے ہوں، تو ایسی حدیث میں محدثین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں اتصال کو ترجیح ہوگی یا ارسال کو یا اکثریت واحفظ کے لحاظ سے حکم لگایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں محدثین کے چار اقوال ہیں:

۱۔ ان حضرات کا اعتبار ہوگا جنہوں نے اس کو موصولاً روایت کیا ہے، یہ قول اظہر ہے۔

۲۔ ان روات کے لحاظ سے حدیث پر حکم لگایا جائے گا جنہوں نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔

۳۔ اکثریت کے اعتبار سے حکم لگایا جائے گا، اگر اکثریت متصل روایت کرنے والوں کی ہے تو حدیث متصل ہوگی اور اگر اکثریت مرسل روایت

کرنے والوں کی ہے تو حدیث مرسل ہوگی۔

۴۔ رواۃ کی زیادتی حفظ کا اعتبار ہوگا، جس طریقہ کے راوی احفظ ہوں گے وہی طریقہ راجح ہوگا۔

اگر کسی حدیث کے رفع و وقف میں اختلاف ہوجائے کہ بعض حضرات اس کو مرفوع کی صورت میں روایت کریں اور بعض موقوف کی صورت میں، تو یہاں صحیح مذہب یہی ہے کہ حدیث کو مرفوع تصور کیا جائے گا اور اگر ایسا واقعہ ایک راوی سے پیش آئے کہ وہی اس کو کبھی مرفوعاً اور کبھی موقوفاً روایت کرے تو بھی وصل و رفع کو ارسال پر ترجیح ہوگی، لیکن اصول فقہ کے علماء اکثریت رواۃ کا لحاظ کرکے وصل یا وقف کا حکم لگاتے ہیں (الدرایۃ فی اصول الحدیث/ ۸۳-۸۴)۔

مبحث منقطع: ...... اس کے متعلق اکثر محدثین کا قول یہ ہے کہ جب راوی کو بالکل ذکر ہی نہ کیا جائے تب حدیث کو منقطع کہا جائے گا، اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ ایک یا دو راویوں سے زیادہ یا متواتر کئی راوی ساقط نہ ہوئے ہوں۔ یہ حدیث بھی راوی غیر مذکور کا حال معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بالاتفاق ضعیف ہے۔

مبحث مدلس: ...... اس کی بنیادی دو قسمیں ہیں: ۱۔ مدلس الاسناد، ۲۔ مدلس الشیوخ۔

مدلس الاسناد: ...... یعنی وہ حدیث جسے راوی اپنے استاذ سے سنے بغیر اس کی طرف نسبت کرکے ایسے الفاظ سے نقل کرے کہ براہ راست سننے کا گمان ہو، اس کے حکم کے باب میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ عمل نہایت مکروہ ہے اور مذمت کا سبب ہے، علامہ عراقی کا قول ہے کہ جو شخص قصداً ایسا کرتا ہے وہ اپنے آپ کو مجروح کردیتا ہے، اس لیے کہ اس عمل میں بڑا دھوکہ ہے، عام آدمی ظاہر حال کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ معتمد رواۃ کی روایت ہے اور اسی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ بھی کرتا ہے، حالانکہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔

مسئلہ مدلس الشیوخ: ...... یعنی وہ حدیث جسے راوی اپنے استاذ سے نقل کرتے ہوئے اس کے لیے کوئی غیر معروف نام، لقب یا کنیت ونسب ذکر کرے تاکہ اس سے پہچانا نہ جاسکے، یہ کراہت کے اعتبار سے پہلے قسم سے کمتر ہے، اس لیے کہ اس میں کسی راوی کا سقوط نہیں ہوتا بلکہ راوی کا غیر معروف نام ذکر کرنے سے سننے والے الجھن ودشواری میں پڑ جاتے ہیں اور راوی کی حیثیت عرفی میں متاخر ہوجاتی ہے، البتہ اس کی اغراض مختلف ہوتی ہیں اس لیے ان اغراض کے پیش نظر کراہت کے درجات بھی مختلف ہوں گے (تدریب الراوی ۱/ ۲۲۸، علوم الحدیث/ ۱۴۵)۔

ایسی مدلس احادیث کی قبولیت کے باب میں علماء کا اختلاف ہے، صحیح ومعتمد اقوال یہ ہیں کہ اگر سماع کی تصریح کردی جائے تو حدیث مقبول ہوگی یعنی راوی صاف صاف اپنے سننے یا شیخ کے اس سے بیان کرنے کو ذکر کردے۔ ۲۔ اگر سننے کی تصریح نہ کرے بلکہ محض محتمل الفاظ ذکر کرے تو قبول نہیں کی جائے گی۔ ۳۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ معتمد رواۃ جو ثقات سے تدلیس کیا کرتے ہیں ان کی روایت مقبول ہوگی اور جو غیر ثقات سے تدلیس کرتے ہیں وہ جب تک براہ راست سننے کی تصریح نہ کردیں ان کی حدیث مقبول نہ ہوگی (تدریب الراوی ۱/ ۲۲۹-۲۳۰)۔

مبحث مرسل خفی: ...... وہ حدیث ہے، جسے راوی کسی ایسے شخص سے نقل کرے جس سے اس کی معاصرت کے باوجود ملاقات یا سماع ثابت نہ ہو، یہ بھی انقطاع کی وجہ سے ضعیف قرار پائے گی (علوم الحدیث/ ۱۴۹)۔

۳۔ حدیث ضعیف کا حکم

ضعیف حدیث اگر موضوع نہ ہو تو ضعف کو بیان کیے بغیر اس کی روایت اور اس کی اسانید کے حق میں تساہل دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

۱۔ عقائد سے اس کا تعلق نہ ہو۔ ۲۔ حلال وحرام سے بھی متعلق نہ ہو۔ (تیسیر مصطلح الحدیث/ ۶۵)۔

حدیث موضوع

حدیث موضوع کی تعریف

اس کے لغوی معنی ہیں وضع کردہ یا گھڑا ہوا، اور اصطلاحی معنی وہ مضمون جس کی بصورت حدیث حضور اکرم ﷺ کی طرف جھوٹی نسبت کی

جائے: "الذی ینسب الی رسول اللہ ﷺ کذبا ولیس صلة حقیقة بالنبی ﷺ ولیس ھو حدیث" (منہج النقد فی علوم الحدیث /۳۰۱)۔

۲۔حدیث موضوع کا حکم

محققین علماء کا اتفاق ہے کہ جس حدیث کے وضع کا علم ہو، وضع کی تصریح کیے بغیر اس کی روایت جائز نہیں، بلکہ ایسے کسی بھی مضمون کا نقل کرنا بغیر تصریح روا نہیں خواہ کسی بھی مضمون اور مسئلہ سے اس کا تعلق ہو نبی اکرم ﷺ کے اس مشہور ارشاد کی بنا پر:

"من حدث عنی بحدیث یری أنه کذب فھو احد الکاذبین" (رواہ مسلم)۔

بعض صوفیاء لوگوں کے لیے ترغیب کے حق میں اور فرقہ کرامیہ (گمراہ اسلامی فرقہ ہے) لوگوں کے لیے ترہیب کے حق میں وضع حدیث کے جواز کا قائل ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے الفاظ بعض روایات میں ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت اس مضمون کے حق میں ہے جو مخالفت اور نقصان پر مبنی ہو اور جو موافقت اور مصلحت پر مبنی ہو اس کے حق میں ممانعت نہیں، مگر جمہور علماء اس کے مخالف ہیں، بلکہ امام الحرمین واضع حدیث کو کافر قرار دیتے ہیں کہ یہ جرم اتنا قبیح ہے کہ ایک مرتبہ بھی اگر کسی کی بابت اس کا ثبوت ہو جائے تو پوری زندگی اس کی روایت مقبول نہ ہوگی حتیٰ کہ اگر توبہ کر لے تب بھی یہی حکم رہے گا (علوم الحدیث/۱۵۶)۔

۳۔کذاب اور واضع حدیث کی روایت کا حکم

شیخ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ جو شخص انسانی گفتگو میں کذب یا دیگر اسباب فسق سے توبہ کر لے تو اس کی باتیں توبہ کے بعد مقبول ہوں گی، لیکن جس نے رسول اکرم ﷺ کی احادیث میں کذب کا ارتکاب کیا ہو تو توبہ کر لینے کے بعد بھی کسی وقت اس کی کوئی حدیث قابل قبول نہ ہوگی، اکثر اہل علم کا یہی مذہب ہے جن میں امام احمد بن حنبلؒ، ابو بکر الحمیدیؒ (شیخ امام البخاریؒ) شامل ہیں اور ابو بکر الصیرفی الشافعیؒ نے تو رسالہ شافعی کی تشریح میں یہاں تک لکھا ہے کہ اہل روایت میں سے جن لوگوں کی روایات ہم نے کذب کی بنا پر ترک کردی ہیں، توبہ کر لینے کے بعد بھی ہم قبول نہیں کریں گے، اسی طرح جس کی روایت کو ہم ضعیف قرار دے چکے ہیں توبہ کے بعد اس کو بھی قوی متصور نہ کریں گے، پھر آگے وہ فرماتے ہیں کہ یہی وہ مقام ہے جہاں روایت وشہادت کے مابین فرق ہو جاتا ہے، یعنی فسق سے توبہ کر لینے کے بعد شہادت تو مقبول ہوگی لیکن روایت حدیث مقبول نہ ہوگی، امام ابو المظفر السمعانی المروزیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی ایک حدیث میں کسی راوی کا کذب ظاہر ہو جائے تو اس کی سابقہ روایت کردہ تمام احادیث مردود قرار دی جائیں گی (مقدمہ ابن الصلاح/۵۰، الدرایۃ فی اصول الحدیث/۱۱۲)۔

صاحب قواعد التحدیث محمد جمال الدین القاسمی نے شرح نخبہ کے حوالہ سے حافظ ابن حجرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ایسی ہر حدیث پر کہ جس میں کذاب راوی آ گیا ہو ظنی طور پر وضع کا حکم لگایا جا سکتا ہے قطعی طور پر نہیں، کیوں کہ کذاب راوی بھی کبھی کبھی سچ بول دیتا ہے (شرح نخبہ/۱۹ بحوالہ قواعد التحدیث/۱۵۱)۔

علامہ سیوطیؒ نے اس مقام پر مزید فرمایا ہے کہ علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ابن صلاح کا مذکورہ بیان ہمارے اور غیر دونوں کے مذہب کے خلاف ہے، روایت وشہادت میں کوئی قوی فرق نہیں، چنانچہ مسلم کی شرح میں موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ پسندیدہ مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ قطعاً صحیح ہوگی اور اس بنا پر روایت مقبول ہوگی، بالکل اسی طرح جس طرح اس کی شہادت ہوتی ہے، چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے امام نووی سے اختلاف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ اگر ان کا مقصد امام احمد وصیرفی وسمعانی کے قول کو مخالف مذہب قرار دینا ہے تو میرے خیال میں ان حضرات کا قول کسی طرح نہ تو خلاف مذہب ہے اور نہ بعید ہے، بلکہ زجر وتوبیخ کے لیے وہی صحیح ہے جس کو امام احمدؒ نے فرمایا ہے، لیکن اگر صیرفی کے اس کلام کو کہ ہر کلام میں انہوں نے کذب کو عدم قبول توبہ کا سبب قرار دیا ہے مخالف مذہب کہاں ہے؟ علامہ عراقی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ صیرفی کا مقصد وہی ہے جو کہ امام احمدؒ کا ہے، اگرچہ صیرفی کی عبارت عام معلوم ہوتی ہے اور مجھے فقہ میں بھی دو مسئلے ایسے ملے ہیں کہ جن سے صیرفی وسمعانی کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ باب اللعان میں فقہاء نے فرمایا ہے کہ زانی جب زنا سے توبہ کر لے اور توبہ پر خلوص ہو، تو بھی وہ اس توبہ کے بعد محصن نہ سمجھا جائے گا اور اس

کے بعد اگر کوئی اس پر زنا کی تہمت لگائے تو تہمت لگانے والے پر حد قذف جاری نہ ہوگی، چونکہ ایک مرتبہ اس کا دامن داغدار ہو چکا ہے، اسی طرح آپ کاذب فی الحدیث کو بھی تصور کر لیجئے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے دوسرے پر زنا کا الزام لگایا پھر اس کو ثابت نہ کر سکا تو ملزم پر حد قذف جاری کردی جائے گی، لیکن ابھی حد جاری نہ کی گئی تھی کہ یہ شخص جس پر زنا کا الزام لگایا گیا تھا زنا کا مرتکب ہو گیا تو اب ملزم سے حد قذف ساقط ہو جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاریہ ہے کہ پہلی مرتبہ جرم پر کسی کو رسوا نہیں فرماتے، جب تک کہ وہ شخص اس گناہ کو بار بار نہ کرتے تو اس نے اس گناہ کا ثابت ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے قبل بھی اس نے یہ عمل کیا ہوگا، اس وجہ سے قاذف سے حد ساقط ہو جائے گی، لہذا آپ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ لوگوں پر راوی کے کذب کا ظاہر ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث میں پہلے بھی بار بار کذب اختیار کرتا ہوگا جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے کذب کو لوگوں پر ظاہر کر کے اس کو رسوا کیا، اب ہم اس کی کس کس روایت میں اس کو صادق تصور کریں؟ مجبوراً تمام روایتوں کو ساقط الاعتبار کرنا پڑے گا (الدرایہ فی اصول الحدیث/ ۱۱۳) لیکن صاحب فتح المغیث علامہ عراقی نے اسی مقام پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ جب کسی راوی کے بارے میں فلان کذاب یا یضع الحدیث، وضاع، وضع حدیثا، متروک الحدیث، ذاہب الحدیث وغیرہ الفاظ استعمال کئے جائیں تو ایسے راوی کی نہ تو حدیث لی جائے گی اور نہ ہی اس کو تحریر میں لایا جائے گا (فتح المغیث ۲/ ۴۱)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔تعریف

بعض مرتبہ حدیث محدثین کے مقرر کردہ اصول وشرائط پر پوری نہیں اترتی مگر وہ علماء کے مابین اتنی مشہور و متداول ہو جاتی ہے کہ اس سے شریعت کا ایک قانون بنالیا جاتا ہے اور وہ متواتر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، بعض مرتبہ اس سے قطعیات کا بھی نسخ درست ہوتا ہے، ایسی حدیث کو حدیث متلقی بالقبول اور اس فعل کو تلقی بالقبول کہا جاتا ہے، نیز یہ تلقی عام علماء کرام کی قبول نہ ہوگی بلکہ ان علماء کی جن کو احادیث کی چھان پھٹک اور استنباط فقہ ومسائل میں ید طولیٰ حاصل ہو قبول ہوتی ہے، مثلاً فقہاء کرام، ائمہ جرح وتعدیل وغیرہ (علوم الحدیث/ ۱۲۷)۔

۲۔حدیث مذکور کا حکم

ایسی ضعیف متلقی بالقبول احادیث پر عمل کرنا واجب ہے اور بعض مرتبہ اس سے قطعیات کا بھی نسخ ہوتا ہے، چنانچہ امام شافعی سے منقول ہے کہ حدیث: "لا وصیة لوارث" کا ثبوت اگرچہ محققین علماء حدیث کے نزدیک محل کلام ہے مگر عام طور سے علماء ومجتہدین نے اس پر اس حد تک اعتماد کیا ہے کہ سورۃ بقرہ کی آیت: "کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ... الخ" کے لیے اس کو ناسخ قرار دیا ہے۔ (امعان النظر/ ۱۸۶)۔

بہر حال مختصر کلام یہ کہ جب حدیث سند کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن علماء وفقہاء کے مابین تلقی کی وجہ سے مشہور ومعروف ہو جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

۳۔تلقی بالروایہ اور تلقی بالعمل میں فرق

تلقی بالروایہ اور تلقی بالعمل حکم کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں، بلکہ دونوں کے مابین فرق کیا جائے گا، تلقی بالعمل کو تلقی بالروایہ پر حکم کے اعتبار سے ترجیح ہوگی۔

۱۔حدیث ضعیف منجبر کی تعریف اور اس کا حکم

حدیث جس سند سے ہم تک پہنچی ہے وہ سند بسا اوقات بعض وجوہ کی بنا پر ضعیف ہوتی ہے جس کی وجہ سے حدیث کے اوپر ضعف کا حکم لگا دیا جاتا ہے، لیکن یہی حدیث بعض دیگر طرق سے بھی مروی ہوتی ہے جن کی وجہ سے اس حدیث کے ضعف کا انجبار (تلافی) ہو جاتا ہے، ایسی حدیث کو حدیث ضعیف منجبر کہا جاتا ہے نیز ایسی احادیث مذکورہ شرط کے ساتھ مقبول ہوگی۔

۴۔ فضائل کے علاوہ مسائل میں ان پر اعتبار

فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، لیکن احکام کے باب میں توقف کیا جائے گا، ہاں جب کثرت طرق یا اتصال عمل یا شاہد صحیح یا ظاہر قرائن کی موافقت سے اس کے ضعف کا انجبار ہوجائے تو پھر احکام میں بھی اس کا اعتبار کیا جائے گا (قواعد التحدیث/۱۰۹)۔

۵۔ تعدد طرق سے انجبار ضعف کے متعلق ضابطہ اور معیار

ایسی احادیث کی قبولیت کے باب میں صاحب نزہۃ النظر ایک اصول ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ تعدد طرق سے حدیث کو تقویت پہنچتی ہے، چنانچہ حدیث حسن لذاتہ تعدد طرق سے صحیح لغیرہ قرار پاتی ہے اور حدیث ضعیف کو حسن لغیرہ قرار دیا جاتا ہے، مگر یہ حکم ہر حدیث ضعیف کے لیے نہیں ہے، بلکہ جس کا سبب ضعف راوی کا سوء حفظ یا جہالت یا انقطاع ہو تو یہ حکم ہے، چنانچہ سیئ الحفظ یا مجہول الحال کی متابعت میں، اسی طرح حدیث مرسل یا مدلس کی متابعت میں اگر کوئی ایسی حدیث مروی ہو جس کا راوی ان کے رواۃ سے فائق ہو یا یہ کہ ان کے درجہ کا ہو تو حدیث درجہ ضعف سے ترقی کرکے حسن لغیرہ کے مرحلہ میں پہنچ جاتی ہے (نزہۃ النظر)۔

اسی طرح صاحب اعمان النظر فرماتے ہیں کہ مجہول العین کی روایت جب متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ مردود کے مرتبہ سے ترقی کرکے ان احادیث ضعیفہ کے مرحلے میں پہنچ جاتی ہے جن پر فضائل کے حق میں عمل کرنا جائز ہے (اعمان النظر/۱۹۱)۔

فاسق یا جھوٹے کی متابعت اسی جیسے دوسرے لوگوں سے تعدد طرق کے ذریعہ ہو تو مجموعہ منکر اور بے اصل ہونے کی حد سے نکل کر مستور اور سیئ الحفظ رواۃ کی روایت کے درجہ میں ہوجاتا ہے کہ اگر مزید اس کی تائید میں کوئی دوسری ایسی ضعیف حدیث مل جائے کہ جس کے ضعف کو گوارا کیا جاتا ہو یا کیا جاسکتا ہو تو پورے مجموعہ کو دیکھتے ہوئے اسے حسن لغیرہ کی حیثیت حاصل ہوجائے گی اور اس کے لیے حسن لغیرہ کے احکام جاری ہوں گے (تدریب الراوی، ۱/۱۷۶)

اسی تفصیل سے ان رواۃ کی روایات کو سمجھا جاسکتا ہے جو شدت، غفلت اور کثرت اغلاط سے متصف ہوں، کہ متابعت اور تعدد طرق کی وجہ سے ان کی روایت بھی منکر کی حیثیت میں نہیں رہ جائے گی۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک احکام میں بھی حدیث ضعیف کا اعتبار منقول ہے حتیٰ کہ احناف کی نسبت ان کی کتابوں میں اور دیگر محققین علماء کی کتابوں میں یہ منقول ہے کہ ضعیف حدیث قیاس ورائے پر بہر صورت مقدم ہے (علوم الحدیث/۱۲۷)۔

البتہ امام احمدؒ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر تفصیل کے اس کے قائل ہیں یا زیادہ سے زیادہ ضعف شدید یا تعارض سے خالی ہونے کی شرط لگاتے ہیں، جبکہ احناف مزید کچھ اس انداز کی قیودات لگاتے ہیں کہ جن کے بعد حدیث محض ضعیف نہ رہ جائے، بلکہ حسن لغیرہ کے درجہ میں شامل ہوجائے۔

۳۔ احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال کے شرائط

امام ابوحنیفہؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام احمدؒ سے منقول ہے کہ احکام میں بھی احادیث ضعیفہ کا اعتبار کیا جاتا ہے، جبکہ تین شرائط پائی جائیں:

۱۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری حدیث نہ ہو۔

۲۔ ضعف شدید سے خالی ہو۔

۳۔ تعارض سے خالی ہو (منہج النقد/۲۹۱)۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال کا اعتبار

صاحب تدریب الراوی علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ قصص، فضائل اعمال اور مواعظ کے سلسلہ میں موضوع حدیث کو چھوڑ کر ضعیف حدیث سے

روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ صفات باری، عقائد واحکام اور حلال وحرام وغیرہ میں ضعیف حدیث سے استدلال درست نہیں، امام احمد بن حنبلؒ، ابن مہدی اور عبداللہ بن مبارک سے مروی ہے کہ جب ہم حلال وحرام کے سلسلہ میں کچھ روایت کرتے ہیں تو بہت سختی کرتے ہیں، لیکن جب فضائل کے متعلق روایت کرتے ہیں تو اس میں تساہل سے کام لیا کرتے ہیں۔

۲۔ شرائط عمل بر حدیث ضعیف

شیخ الاسلام وغیرہ نے فضاء کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے سلسلہ میں تین شرائط ذکر کی ہیں:

۱۔ انتہائی ضعیف نہ ہو یعنی ایسے روات سے مروی نہ ہو جن کا کاذب یا متہم بالکذب یا فاحش الغلط کہا گیا ہو اس پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔

۲۔ اصول حدیث کے تحت آتی ہو۔

۳۔ اس پر عمل کے وقت سنت سے ثبوت کا عقیدہ نہ ہو، بلکہ احتیاط کے پیش نظر عمل کرنے کا تصور ہو (قواعد التحدیث/ ۱۱۳)۔

بہرحال حدیث ضعیف پر عمل کے سلسلہ میں محدثین کا اختلاف ہے ابوبکر بن العربی مطلقاً عدم جواز کے قائل ہیں۔

امام ابوداؤد اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے جائز قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ دوسرے لوگوں کی رائے پر عمل کرنے سے حدیث ضعیف پر عمل کرنا اولیٰ ہے (قواعد التحدیث/ ۱۱۲، ۱۱۳)۔

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ ضعیف حدیث اگر ترغیب وترہیب کا پہلو لیے ہوئے یا متعدد سندوں سے مروی ہو تو عمل درست ہے ورنہ نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ دوسری سند بھی اس سند سے کمزور نہ ہو۔ (قواعد التحدیث/ ۱۱۶)۔

ماخذ مقالہ

الموقظة فی علوم الحدیث	خیر الاصول	الدرایة فی اصول الحدیث
الاجوبة الفاضلة	قواعد التحدیث	مقدمه لابن الصلاح
علوم الحدیث لمحمد عبید الله الاسعدی	نظم الدرر	علوم الحدیث لابن الصلاح
تحفة الدرر	الخلاصه فی اصول الحدیث	نخبة الفکر
من اطیب المنح فی علوم المصطلح	نزهة النظر	منحة المغیث
امعان النظر	تیسیر مصطلح الحدیث	تدریب الراوی
الباعث الحثیث	منهج النقد	فتح المغیث
میزان الاعتدال	رسالتان فی مصطلح الحدیث	

☆☆☆

تیسرا باب: مختصر تحریریں

احادیث ضعیفہ سے احکام کا استنباط

مفتی نظام الدین صاحب [1]

حدیث پاک میں ہے: "من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعده من النار" (او کما قال علیہ السلام)۔

حدیث صحیح متواتر باللفظ والمعنی ہے اور اس کا مفہوم ایک امر ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو چیز نہ تو قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور نہ تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح منقول ہو اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دینا یا حدیث کہہ دینا نہایت خطرناک اور سخت ترین گناہ ہے اور ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ حکم شرعاً اصل کلی ہے، اور اسی اصل کلی سے یہ حکم بھی نکل آیا کہ جس کلام میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل یا تقریر ہونے کا احتمال ناشی عن الدلیل مل جائے اس سے انکار کرنا بھی ہرگز جائز نہ ہوگا، بلکہ اسی عذاب ونکال کا مستحق ہوگا جو حدیث بالا میں مذکور ہے، اور یہ حکم ایک اصل شرعی یعنی "قولاً بمساوقة النتيجة بين المقدمتين وقولاً لمعرفة المجهول بمعرفة المعلوم" سے حاصل ہوتا ہے، اور اس حکم کی تائید اس تسلیم شدہ اصل شرعی سے ملتی ہے جو بایں الفاظ ہے: "كذا الاصل عند علمائنا انه متى علمت التساوى فى الاصل ابتداء بين شيئين ثم ورد البيان فى احدهما كان ذالك البيان فى الاخر قولا بمساوقة النتيجة بين المقدمتين وقولا لمعرفة المجهول بمعرفة المعلوم" (قواعد الفقہ/ ۴۷)۔

یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جس حدیث کو علماء نے موضوع کہا ہے اس کو جب تک اس کے سارے موضوع کہنے والوں نے موضوع کہہ کر رد نہ کر دیا ہو اس کو متروک العمل قرار دینا واجب نہ رہے گا، اس لیے کہ موضوع کہنے والے راوی میں سے ایک راوی نے بھی ایک ایسی روایت نقل کر دی جس سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل یا تقریر کا یا اس کے معنی کے صحیح ہونے کا احتمال ناشی عن الدلیل نظر آ جائے تو اس کا حدیث ہونے سے انکار کرنا ہرگز جائز نہ رہے گا، بلکہ سخت ترین عذاب ونکال کا محل ہو جائے گا، اس کی مکمل ومدلل گفتگو اس مکالمہ میں تسلیم ہو چکی ہے جو حضرت امام مالکؒ اور خلیفہ وقت منصور کے درمیان ہوئی ہے، پھر منصور خلیفہ کے لڑکے ہارون رشید کے درمیان ہو کر امت کے نزدیک معتبر وتسلیم ہو چکی ہے، خلیفہ منصور نے حضرت امام مالک سے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں موطا کو سارے قلمرو میں قانون اور لازم بنا دینا چاہتا ہوں تاکہ سب لوگ اس پر عمل کریں تو حضرت امام مالک نے منع فرما دیا اور فرمایا کہ:

"بے شمار صحابہ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہوں نے جو حدیث یا اس کا مفہوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور اس کے حدیث ہونے کا احتمال ہو گیا ہے اس کو غیر حدیث کہنا کسی طرح جائز اور درست نہ رہے گا؟

یہ سن کر خلیفہ نے اس کا ارادہ ترک کر دیا، پھر یہی خواہش اور ارادہ منصور کے لڑکے ہارون رشید نے ظاہر کیا تو ہارون رشید چونکہ حضرت امام مالک کا شاگرد بھی تھا اس سے بہت سختی سے اور غصہ سے منع فرما دیا اور وجہ وہی بیان فرمائی کہ جس قول وفعل یا تقریر میں حدیث ہونے کا احتمال ہوا اس کو ترک کرنا کسی طرح جائز نہ ہوگا، لہٰذا یہ معاملہ بند ہو گیا، اس حکم کی مزید تاکید وتوثیق حضرت صدیقؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے، اس لیے اگرچہ حضرت موصوف سے بظاہر صرف دو سو یا ڈھائی سو روایات منقول ملتی ہیں مگر زمانہ ارتداد میں بہت سے ایسے اقوال واعمال منقول ہیں جو بلاشبہ رسول یا فعل رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا تقریر رسول علیہ السلام کی ترجمانی کرتے ہیں، پھر اسی طرح خلفاء راشدین کے بہت سے اقوال واعمال ایسے ملتے ہیں جو بلاشبہ قول رسول، یا عمل رسول، یا تقریر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ترجمان ہوتے تھے، اس سے روایت بالمعنی کے جواز کے حق ہونے پر بھی کافی ثبوت اور روشنی پڑتی ہے، پس محدثین میں روایت بالمعنی کے صحیح ہونے یا نہ ہونے میں جو اختلاف

[1] سابق مفتی دار العلوم دیوبند۔

مذکور ہے اس میں راجح اور صحیح قول روایت بالمعنی کے حق ہونے کا ہی نکلتا ہے۔

احادیث موضوعہ کے احکام

موضوع روایات میں جب تک اس کے سب راوی قاطبہ اور بالاتفاق موضوع نہ کہہ دیں اس پر موضوع کا حکم لگا دینا ضروری نہیں دینا، اس لیے کہ ان راویوں میں سے اگر ایک راوی بھی کوئی ایسی روایت نقل کر دے جس سے اس راوی کی روایت میں احتمال ناشئ عن الدلیل کسی درجہ میں بھی حدیث ہونے کا ہو جائے تو اس کو غیر حدیث کہنا اوپر کی تقریر اور گفتگو کی رو سے جائز نہ رہے گا۔

احادیث ضعیفہ کے احکام

حدیث ضعیف کے مقبول اور غیر مقبول ہونے میں معیار یہ ہے کہ اس کے سب راویوں کو دیکھا جائے پھر کسی نص شرعی سے تصادم محسوس نہ ہو تو اس کو قبول کر لیں گے، ورنہ رد کر دیں گے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر اس میں کوئی راوی مجہول واضع حدیث بھی ہو لیکن اس کا اندمال دوسری محفوظ السند روایت سے ہو جاتا ہے تو اس کو قبول کر لیں گے، لیکن اعتقادیات میں احتیاط شدید برتیں گے، دیگر جزئیات فقہیہ فرعیہ میں تسہیل برتیں گے، باقی ہر حال میں پوری احتیاط اور تفتیش سے کام لیں گے۔

اور جب تک تمام راویوں کی خوب جانچ پرکھ نہ کر لیں اس کو دلیل بنانے میں احتیاط کریں گے۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

اس عنوان کے نمبر ۲ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی ہے، اور ان کی ولادت سے ساڑھے چوراسی سال بعد ۱۶۴ھ میں حضرت امام احمد بن حنبل کی ولادت ہوئی ہے۔

یہ فاصلہ تقریباً ایک قرن کے قریب کا ہو جاتا ہے، اس فاصلہ میں عموماً انقلاب کلی ہو جاتا ہے اور اس مدت میں اسماء رجال کے اصول وضوابط بھی قریب قریب مکمل ہو چکے تھے۔

حضرت امام احمد بن حنبل کے دور میں اسماء رجال کی بحث مکمل ہو چکی تھی، اس لیے امام احمد بن حنبل کی روایات میں اسماء رجال کے اصول وغیرہ سے گفتگو ہو سکتی ہے، برخلاف امام ابوحنیفہ کی روایات کے، کیونکہ ان کی ولادت ساڑھے چوراسی سال پہلے کی ہے، جب صرف عنعنہ معتبر تسلیم تھا یعنی "عن فلان عن فلان" کی روایت معتبر ہو جاتی تھی اور راویوں پر کلام کے بغیر معتبر سمجھی جاتی تھی، نیز امام ابوحنیفہؒ کی روایت صرف ایک یا دو واسطوں سے دربار رسالت تک پہنچ جاتی ہیں۔ دیگر یہ کہ امام کے زمانہ تک راویوں کے اصول وقواعد کی داغ بیل بھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اس لیے بھی امام ابوحنیفہ کو امام احمد بن حنبل کے صف میں لا کر رکھ دینا کب جائز ودرست ہو سکتا ہے، بلکہ یہ حرکت بظاہر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے کسی مخالف کا مغالطہ دینا معلوم ہوتا ہے، اس مغالطہ کو تسلیم کرنے کے بجائے اس پر سخت رد ونکیر ہونا لازم ہے۔

نیز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حیثیت اپنے ہم عصروں میں نمایاں اور متمیز ہے اور امام ابوحنیفہ جیسی جامعیت ومانعیت حضرت امام ابوحنیفہ کے علاوہ کسی اور میں نظر نہیں آتی جس کو احقر نے اپنے رسالہ "امام ابوحنیفہؒ کی خصوصیات" میں مکمل ومدلل طور پر بیان کر دیا ہے اور یہ خصوصیات احقر کی علمی بے بضاعتی کے باوجود گیارہ تک ثابت ہو گئی ہیں۔

....

احادیث ضعیفہ محدثین کی نظر میں

مفتی محبوب علی وجیہی[1]

حدیث ضعیف کی تعریف

حافظ ابن صلاح نے ضعیف کی تعریف میں لکھا ہے: "كل حديث لم تجتمع فيه صفات الحديث الصحيح ولا صفات الحديث الحسن المذكورات في ما تقدم" اور حافظ ابن حجر نے اس کو مختصر کر کے یوں کہا ہے کہ "كل حديث لم تجتمع فيه صفات القبول" یعنی جس حدیث میں وہ صفات جو صحیح وحسن کی تعریف میں معتبر ہیں کسی حدیث میں نہ پائے جائیں تو وہ ضعیف ہے۔

۲۔ ابن صلاح نے ابوحاتم بن حبان البستی کے حوالہ سے انچاس اقسام کا ذکر کیا ہے، اس کے بنیادی اسباب میں اتہام کذب، سوءحفظ، شاذ، منکر، منقطع، معضل، مدلس، متروک وغیرہ ہیں۔ محدثین کے نزدیک جو راوی اعلیٰ درجہ کا ضبط اور عدالت رکھتا ہے اس کی روایات قابل اعتبار ہوگی چاہے وہ فقیہ ہو یا نہ ہو، لیکن فقہاء کے نزدیک جو راوی فقیہ ہے اس کی حدیث کو ترجیح دی جائے گی اس راوی پر جو فقیہ نہیں ہے، صحابہ کرام میں خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر وغیرہ حضرات فقیہ ہیں۔

۳۔ اگر کوئی واضع حدیث کسی سند میں آجائے یا کذاب فی الحدیث آجائے تو اس حدیث پر وضع کا حکم لگایا جائے گا، اگر کسی سے ایک مقام پر بھی وضع حدیث کا علم ہو جائے تو اس کی تمام روایت کردہ حدیثیں قابل تسلیم نہ ہوں گی، ضعیف حدیث پر عمل کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، امام احمد وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ ضعیف حدیث میں صحیح ہونے کا بھی احتمال ہے، اس لیے اگر اس کے مخالف کوئی حدیث نہ ہو تو وہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں، لیکن عام مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف سے نہ صفاتِ الٰہی ثابت ہو سکتے ہیں، نہ اور بنیادی مسائل، نہ حلال وحرام کے مسائل، البتہ جس حدیث میں بہت زیادہ ضعف نہ ہو اس سے اعمال کی فضیلت ثابت کی جاسکتی ہے، کمافی فتح الملہم وفی کتب اخری، اور اگر کسی ضعیف حدیث کی روایت مختلف طرق سے ہو تو اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور فی الجملہ اس کمزوری کا تدارک ہو جاتا ہے، اس کو حسن لغیرہ کہتے ہیں اور اکثر فقہاء کے یہاں یہ قابل حجت ہے جن میں حنفیہ بھی شامل ہیں۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

ا۔ ایسی احادیث جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، لیکن علماء امت نے ان کو عمل کرنے کے لیے قبول کر لیا ہے، اور اپنی ماہرانہ چشم بصیرت سے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے ان کو درست مان لیا ہے اس کو تلقی بالقبول کہتے ہیں، اور حدیث ضعیف کے متلقی بالقبول ہونے کا یہ مطلب ہے کہ امت اس پر عمل کرتی چلی آرہی ہے یا علماء صالحین اسے نقل کرتے چلے آرہے ہیں تو اس کا ضعف مٹ جاتا ہے اور اس میں ماہرین فن اور ائمہ کا بھی قبول کرنا قابل اعتبار ہوگا، اور تلقی کی ایک قسم تلقی بالعمل بھی ہے، حنفیہ کے نزدیک ایسی خبر جس میں عموم بلوی ہو یعنی اس چیز کے سب محتاج ہوں اور بار بار اس کی حاجت پڑتی ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس کے قبول کرنے کی اور اس پر عمل کے واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں، ایک اس کا مشہور ہونا اور دوسرے امت کا تلقی بالقبول ہونا، جیسے بسری کی حدیث مس ذکر کے بارے میں یہ نہ حد شہرت کو پہنچی نہ تلقی امت بالقبول

---

[1] دار العلوم فرقانیہ، نزد انگوری باغ، رام پور۔

ہوئی، حالانکہ مس ذکر کا مسئلہ عام ہے ہر ایک اس کا محتاج ہے، لیکن اکثر محدثین واصولیین کہتے ہیں کہ جب اس کی سند صحیح ہے تو اس کے قبول کرنے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے اور تلقی بالعمل اگر سلفا الی خلف مسلسل چلی آرہی ہے تو اس سے علم طمانینت پیدا ہوتا ہے جو متواتر کے افادۂ علم میں قریب قریب ہے، اور وہ خبر واحد جس کو علماء آپس میں روایت کرتے ہیں اور تسلیم وقبول کرتے ہیں اور اس میں ان کو کوئی خلاف نہیں تو اس سے بھی علم طمانینت حاصل ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور اگر اس کے قبول کرنے میں اختلاف ہے تو اس کا درجہ گر جائے گا اور علم طمانینت پیدا نہیں ہوگا، نہ اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

۲۔ اس کا جواب نمبر ۱ میں آگیا ہے۔

۳۔ اس کا جواب نمبر ۱ میں آگیا ہے۔

۲۔ ایسی حدیث جس کو امت نے تلقی بالقبول کا درجہ عطا کیا ہے اور امت سے مراد ائمہ کرام ہیں تو اس سے نص بھی منسوخ ہوسکتی ہے اور وہ متواتر کا بھی مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حدیث "لا وصیۃ لوارث" محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے، لیکن اسے قبولیت عامۂ حاصل ہوئی اور اس پر باتفاق ائمہ عمل کیا گیا اور آیتِ وصیت اس سے منسوخ قرار دی گئی۔

۳۔ تلقی کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ علماء کو آپس میں روایت کریں، دوسرے یہ کہ اس پر عمل ہوتا چلا آیا ہو اور اس میں کسی زمانہ میں اختلاف ظاہر نہ ہوا ہو جیسے پانچ نمازیں اور تلقی بالقبول ماہرین کی قرنا بعد قرن تواتر کا فائدہ دے گی، ابن تیمیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

حدیث ضعیف مؤید بقرائن

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے مراد وہ حدیثیں ہیں کہ دوسری احادیث ضعیفہ سے ان کا ضعف ختم ہو گیا ہو اور وہ حسن لغیرہ میں داخل ہو گئی ہوں، یا وہ کسی اصل عام کے تحت داخل ہوتی ہیں اور یا اس ماحول کے قرائن سے ان کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے تو ان کو احادیث ضعیفہ منجبرہ کہا جائے گا، کیونکہ قرینہ نے یا دوسری حدیث نے ان کی کمزوری کو دور کر دیا ہے۔

۲۔ جمہور علماء کے نزدیک احادیث ضعیفہ جن میں شدید ضعف نہ ہو اس میں ائمہ کے دو قول ہیں: ایک جمہور کا اور دوسرے امام احمد وغیرہ کا، یہ لوگ کہتے ہیں، اگر حدیث صحیح نہ ملے تو قیاس کے مقابلہ میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا جبکہ وہ حدیث کسی اصل عام کے خلاف نہ ہو اور ضعیف متروک نہ ہو۔

۳۔ حدیثِ ضعیف کی تائید میں دوسری حدیثیں ہوں، یا اس کو تلقی امت کا درجہ حاصل ہو گیا ہو، یا ائمہ نے اس کو سلفا عن خلف روایت کیا ہو اور اسے تسلیم بھی کیا ہو۔

۴۔ کسی حدیث ضعیف کی تائید میں دوسری حدیث ضعیف ہو اور ضعف ایسا نہ ہو جس کی وجہ سے حدیث کو متروک کر دیا گیا ہو تو ایک ہی سند سے روایت تائید کے لیے کافی ہے، لیکن جتنی زیادہ حدیثیں اس کی تائید میں ہوں گی اتنا ہی ضعف کم ہو جائے گا، اگر تائید کرنے والی حدیث یا حدیثیں دو یا اس سے زیادہ صحابہ سے مروی ہوں تو ضعف بہت کم ہو جاتا ہے۔

۵۔ حدیث ضعیف کی دو قسمیں ہیں، ضعیف السند اور ضعیف المتن، جو ضعیف السند ہے اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں اور ضعیف المتن کو آپ مطلق ضعیف بھی کہہ سکتے ہیں جب تک کہ ثابت نہ ہو کہ اس کی مؤید کوئی حدیث صحیح ہے، تعدد طرق سے حدیث موضوع کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ایسے ہی جو حد درجہ کمزور ہوں جیسے ان کے راوی متہم ہوں یا وہ شاذ ہوں۔

احکام میں ضعیف حدیثوں سے استدلال

۱۔ حدیث ضعیف کے احکام ومسائل کے باب میں اعتبار ہے یا نہیں اس میں محدثین اور علماء کے مختلف اقوال ہیں، امام احمد اور امام ابوداؤد

دونوں کا یہ کہنا ہے کہ حدیث ضعیف ہر مسئلہ میں قابل قبول ہے بشرطیکہ اس کے سواء کوئی اور حدیث صحیح موجود نہ ہو۔"قال ابن منارہ وکذلك ابوداود السجستانی یاخذ ماخذہ ویخرج الاسانید اذا لم یجد فی الباب غیرہ، لانه اقوی من رای الرجال"۔

امام احمد فرماتے ہیں:"ان ضعیف الحدیث احب الی من رای الرجال" لیکن جمہور علماء کے نزدیک احکام میں ضعیف حدیث کا اعتبار نہیں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا البتہ فضائل اعمال میں اس پر عمل کرنا جائز ہے، امام نووی نے اس پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے، البتہ حافظ ابن حجر نے ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے لیے تین شرطیں بیان کی ہیں، ضعف شدید نہ ہو، کسی اصل عام کے تحت داخل ہو، اس پر عمل کرنے کی صورت میں اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد نہ ہو، امام نووی کا قول ہے:"قال العلماء من المحدثین والفقهاء وغیرهم یجوز ویستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترهیب بالحدیث الضعیف مالم یکن موضوعًا. واما الاحکام کالحلال والحرام والبیع والنکاح والطلاق وغیر ذلك فلا یعمل فیها الا بالحدیث الصحیح والحسن۔"

۲۔ امام احمد یا امام اعظم سے احادیث ضعیفہ پر عمل کرنے کی بابت جو منقول ہے۔ حسن لغیرہ یا ایسی حدیث ضعیف جو کسی صحیح حدیث کے خلاف نہ ہو، کسی اصل عام کے تحت داخل ہو اور کسی متفق علیہ مسئلہ کی نفی اس سے نہ ہوتی ہو۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال واعتبار

۱۔ فضائل اعمال میں ایسی احادیث ضعیفہ کا اعتبار کیا گیا ہے جو مردود نہ ہوں اور شدید ضعیف نہ ہوں، شریعت کے اصول تسلیم شدہ اور کسی عام قاعدہ کے خلاف نہ ہوں۔

بعض علماء نے حدیث ضعیف پر عمل کو مطلقاً جائز نہیں مانا ہے، چاہے اس کا تعلق حلال وحرام سے ہو یا فضائل اعمال سے، قاضی ابوبکر ابن العربی اور جلال الدین دوانی کی طرف یہ قول منسوب ہے، مگر جمہور کا مسلک پہلے بیان کردیا گیا۔



احادیث ضعیفہ کا احکام میں اعتبار

مفتی حبیب اللہ قاسمی [1]

الف۔ضعیف احادیث

۱۔ حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں وہ شرائط کلیۃً یا جزئیۃً نہ پائے جائیں جو حدیث صحیح وحسن کے لیے ضروری ہیں (مقدمہ شیخ عبدالحق ص ۵۴)۔

۲۔ حدیث میں ضعف عموماً یا تو سند کی ابتداء یا انتہاء سے ایک یا دو یا اس سے زائد راویوں کے ساقط ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، خواہ یہ حذف واسقاط ایک ہی جگہ سے لگاتار ہو یا متعدد جگہوں سے ہو، یا ائمہ جرح وتعدیل کا کسی راوی حدیث کے متعلق طعن وجرح کرنا، خواہ یہ طعن و جرح راوی کی عدالت ودیانت سے متعلق ہو، یا اس کے حافظہ وضبط حدیث سے متعلق ہو، اس اعتبار سے اسباب جرح وضعف کے بہت سے اقسام ہوجائیں گے، مثلاً راوی کے متہم بالکذب ہونے کا طعن یا فحش غلط یا فاسق ہونا وغیرہ۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی، واصولی حکم یہ ہے کہ فی الجملہ اس کی روایت کی بھی اجازت ہے اور اس پر عمل کی بھی گنجائش ہے، ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: ”اعلم ان الحدیث الموضوع شر الاحادیث الضعیفة ولا تحل روایته لاحد علم حاله. بخلاف غیره من الاحادیث الضعیفة التی یحتمل صدقها فی الباطن“ (مقدمہ ابن الصلاح/۴۷)۔

البتہ حدیث ضعیف کی روایت اور عمل کے لیے کچھ شرائط ہیں:

پہلی شرط: یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو مثلاً موضوع نہ ہو، اسی طرح اور بھی بعض صورتیں اس کے تحت آتی ہیں یعنی راوی متہم بالکذب نہ ہو۔

دوسری شرط: حدیث ضعیف کا مضمون شریعت کے کسی اصل کلی یا قاعدہ کے تحت آتا ہو۔

تیسری شرط: حدیث ضعیف پر عمل حدیث کے ثبوت کے یقین واعتقاد کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ احتیاطاً عمل کیا جائے (القول البدیع/ ۲۱۵، تدریب الراوی، ۱/ ۲۹۹)۔

ب۔موضوع

۱۔ موضوع وہ گڑھت بات ہے جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جائے۔

”ھو الکذب المختلق المصنوع المنسوب الی رسول اللہ ﷺ“ (تیسیر مصطلح الحدیث/۸۸)۔

۲۔ حدیث موضوع کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا ناجائز اور اس کی روایت بھی ناجائز ہے، البتہ لوگوں کو موضوع ہونے کی اطلاع دینے کے لیے نقل کرنا درست ہے۔

”واتفقوا علی تحریم روایة الموضوع الا مقرونا ببیانه (شرح النخبة للعسقلانی/۵۹)۔

۳۔ جس حدیث کے راویوں میں سے کوئی بھی راوی واضع حدیث یا کذب فی الحدیث ہو وہ حدیث موضوع سمجھی جائے گی اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو موضوع قرار دیا جائے، لیکن وضع کا حکم لگانا ظن غالب کے اعتبار سے ہوگا قطعی ویقینی نہیں (کمافی رسالۃ میزان الحدیث ص ۷۵)۔

---

[1] مہتمم جامعہ اسلامیہ مہذب پور، سنجرپور، اعظم گڑھ۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔ علامہ سیوطیؒ نے شرح نظم التقریب میں ضعیف متلقی بالقبول کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے: "ما تلقاه العلماء بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح او اشتهر عند ائمة الحديث بغير نكير منهم" (الاجوبة الفاضلة/ ۲۲)۔

یعنی ضعیف متلقی بالقبول وہ حدیث ہے جس کو علماء نے عمل واحتجاج کے سلسلہ میں قبول کیا ہو، اگر چہ اس کی کوئی صحیح سند موجود نہ ہو، یا اس حدیث کی روایت محدثین کے مابین مشہور ہو اور محدثین کی طرف سے اس حدیث کی روایت میں کوئی ممانعت ونکیر نہ پائی جاتی ہو، انہی علماء دین کے تلقی بالقبول سے تلقی کا اطلاق ہوگا، جن کو دینیات وشرعیات میں نظر عمیق اور مہارت تامہ حاصل ہو، عام آدمیوں کے قبول وعدم قبول کا کوئی اعتبار نہیں۔

۲۔ جب کسی ضعیف حدیث کو علماء احتجاج یا روایت کے لیے قبول کریں تو پھر وہ حدیث صحیح قرار دی جائے گی، اگر چہ اس کی کوئی سند صحیح موجود نہ ہو۔

"يحكم على الحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح" (تدريب الراوی، اص ۶۷)

جب علماء نے ضعیف متلقی بالقبول کو صحیح قرار دیا ہے تو اب مذکورہ حدیث پر عمل کرنا اور روایت کرنا درست ہوگا۔

۳۔ کسی حدیث کو علماء کے درمیان صرف قولاً یا صرف عملاً قبول عام حاصل ہو۔

ان دونوں کا حکم یکساں ہے کہ ایسی احادیث کی سند سے زیادہ بحث نہیں کی جائے گی اور ان کو صحیح و واجب العمل قرار دیا جائے گا، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے: "الخبر اذا تلقته الامة بالقبول تصديقا له وعملا بموجبه افاد العلم عند جماهير العلماء من السلف والخلف وهو الذى ذكره جمهور المصنفين فى اصول الفقه" (النکت/ ۷ ۳۴)۔

نیز حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: "شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده" (تدریب الراوی، ۱/ ۶۷)

حدیث ضعیف موید بالقرائن

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے مراد وہ احادیث ہیں جو اصلاً ضعیف ہوں، لیکن دوسرے امور قرائن سے اس کی تائید وتقویب حاصل ہوتی ہو، جس سے اس کے ضعف کی تلافی ہو جائے اور وہ حدیث ضعیف کے مرتبہ سے نکل کر حسن لغیرہ کے درجہ میں داخل ہو جائے۔

جمہور علماء کے نزدیک ایسی حدیثیں اصلاً مقبول ومعتبر اور حجت ہیں۔

چنانچہ علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: "الحسن لغيره اصله ضعيف وانما طرأ عليه الحسن بالعاضد الذى عضده" (فتح المغیث/ ۶۵)۔

۲۔ ایسی ضعیف احادیث جن کی تائید وتقویت خارجی امور وقرائن سے حاصل ہو ان سے بالاتفاق فضائل، مسائل اور احکام میں احتجاج واستدلال درست ہے (رسالة میزان الحدیث/ ۶۴)۔

۳۔ حدیث ضعیف کے ضعف کو ختم کرنے والے اور اس کو تقویت پہنچانے والے بہت سے امور وقرائن ہیں جن میں سے کچھ کو ہم ذکر کرتے ہیں۔

الف: تعدد طرق یعنی وہ حدیث ایک سے زائد سند وطرق سے مروی ہو۔

جب کوئی حدیث ایک سے زائد دو یا تین یا اس سے زیادہ طرق واسناد سے مروی ہوگی، تو یہ دلیل ہے کہ مذکورہ حدیث واقع اور نفس الامر میں ضرور ثابت وموجود ہے (رسالة میزان الحدیث/ ۶۴)۔

ب: ضعیف حدیث کا مضمون قرآن کی کسی آیت کے مطابق ہو۔

ج: ضعیف حدیث کا مضمون کسی قول صحابی کے مطابق ہو۔

د: ضعیف حدیث کسی شرعی ضابطہ وقاعدہ سے مطابقت رکھتی ہو۔

چنانچہ علامہ سیوطیؒ وغیرہ نے ابوالحسن حضار مالکیؒ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"قد یعلم الفقیه صحة الحدیث ان لم یکن فی سنده کذاب بموافقة آیة من کتاب الله وبعض اصول الشریعة فیعمله ویدل علی قبوله والعمل به" (تدریب الراوی، والاجوبة الفاضله / ۲۳۱)۔

۴۔ تعدد طرق یعنی ایک سے زائد سندوں سے مروی ہونا اس سلسلہ میں مفید ومعتبر ہے، اگر کوئی ضعیف حدیث ہے اور دوسری سند کے ساتھ وہی حدیث مروی ہے اور دوسری سند بھی ضعیف ہے، یا اسی صحابی سے مروی ہو جس صحابی سے پہلی سند مروی ہے، تب بھی پہلی سند سے مروی ضعیف حدیث کو تائید وتقویت حاصل ہوجائے گی، نیز یہ ضروری نہیں کہ دوسندوں سے مروی ایک حدیث کے الفاظ متحد ہوں، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ اصل ضعیف جس کی تقویت مطلوب ہے اس کا متابع اس سے فائق ہو یا برابر ہو، یعنی اس سے کم نہ ہو ورنہ تقویت حاصل نہیں ہوگی (فتح المغیث/ ۶۳، قواعد فی علوم الحدیث/ ۲۴)۔

۵۔ تعدد طرق وغیرہ سے ہر قسم کی ضعیف احادیث کو تقویت حاصل نہیں ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ اگر کوئی ضعیف حدیث محض کسی راوی کے سوء حفظ یا اختلاط یا تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے، حالانکہ راوی سب ثقہ ہیں تو تعدد طرق اس ضعف کو دور کردے گا اور سوء حفظ وغیرہ کی کمی پورا کردے گا۔

اور اگر کوئی حدیث راوی کے متہم بالکذب یا فحش غلطی یا فسق راوی یا شذوذ کی وجہ سے ضعیف ہے تو تعدد طرق اس ضعیف کو قوی نہیں بنا سکتا۔ (رسالۃ میزان الحدیث/ ۶۴)۔

اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ اس ضعیف حدیث کا ضعف شدید نہ ہو کیونکہ اگر ضعف شدید ہو تو تعدد طرق سے اس کا ضعف ختم نہیں ہوگا، اسی طرح وہ ضعیف حدیث ادلہ شرعیہ اور نصوص شرعیہ کے معارض ومخالف نہ ہو اور اس کی تائید وتقویت دوسری سند وطرق سے ہو تب تعدد طرق مفید ہوگا ورنہ نہیں، "لیس کل ضعیف یصلح لذلك"، (قواعد فی علوم الحدیث/ ۲۵)، بہرحال بعض احادیث ضعیفہ کو قرائن ملنے سے تقویت ملتی ہے اور بعض احادیث ضعیفہ کو نہیں ملتی، جن احادیث ضعیفہ کو تقویت ملتی ہے وہ یہ ہیں: مرسل، معلق، مختلط، سیء الحفظ کی روایت، مدلس کی روایت (نزہۃ النظر/ ۵۱)، باقی متہم بالکذب، فحش غلط، فسق راوی ان وجوہات سے پیدا شدہ ضعف کا انجبار تعدد طرق وقرائن سے نہیں ہوگا۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

اس مسئلہ میں مجتہدین واصولیین کی معروف ومشہور رائے یہی ہے کہ احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال واحتجاج درست نہیں باقی فضائل میں چند شرائط کے ساتھ درست ہے، اور جن حضرات سے احادیث ضعیفہ سے استدلال کی گنجائش ملتی ہے ان کے یہاں اس سے مراد حسن لغیرہ ہے، ضعیف محض مراد ہیں؛ کیونکہ ابتداء عہد میں حسن لغیرہ کو بھی ضعیف ہی کی ایک قسم شمار کیا جاتا تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن العربی، ابن قیم رحمہم اللہ نے یہی توجیہ فرمائی ہے (منہاج السنۃ النبویہ ۲/ ۱۹۱، فتاوی شیخ الاسلام، ۱/ ۲۵۱، قواعد فی علوم الحدیث، ۶۱ و ۶۲)۔

لیکن ایک دوسری رائے یہ بھی معروف ہے جس کو ابن حزم وابن القیم علیہما الرحمہ نے خصوصیت کے ساتھ امام احمد اور امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کیا ہے کہ ان حضرات کے یہاں حدیث ضعیف رائے وقیاس پر مقدم ہے (اعلام الموقعین، ۱/ ۷۷، مناقب الامام ابی حنیفۃ للذھبی ۲۱)۔

بلکہ ابن قیمؒ نے تو یہاں تک ذکر کیا ہے کہ چاروں ہی مذاہب کے بعض مسائل میں احادیث ضعیفہ سے استدلال کیا گیا ہے (اعلام الموقعین ۱/ ۳۱، ۳۲)۔

جیسا کہ ابھی یہ بات گذری ہے کہ ابن قیم اور ابن تیمیہ وغیرہمؒ کی رائے یہ ہے کہ ضعیف اصطلاحی مراد نہیں بلکہ حسن لغیرہ پر عمل کی گنجائش فقہاء ومجتہدین سے ملتی ہے، لیکن عصر حاضر کے بہت سے محققین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ فقہاء سے جو گنجائش کی بات ملتی ہے اس سے ضعیف اصطلاحی مراد ہے، حضرت امام احمدؒ سے منقول ہے، "ضعیف الحدیث اقوی من الرای" (المحلی، ۱/ ۶۸)

اسی طرح امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ اگر کسی مسئلہ کے اندر صرف مرسل روایت ہی ملتی ہو اور کوئی حدیث اس کی مؤید نہ ہو تب بھی رائے وقیاس کو چھوڑ کر اسی مرسل پر عمل کریں گے (تدریب الراوی، ۱/ ۲۰۲/ ۲۰۹)۔

۲۔ ماضی قریب کے بہت سے محققین علماء کی رائے کے مطابق حضرات امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ سے جو احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش منقول ہے، ان حضرات کے کلام میں ضعیف کا مصداق اصطلاحی ہی ہے، حسن لغیرہ نہیں۔

۳۔ احکام میں بھی جن احادیث ضعیفہ سے استدلال درست ہے، ان کے لیے چند شرائط ہیں:

۱۔ضعیف حدیث کا ضعف شدید نہ ہو۔

۲۔ضعیف حدیث کا مضمون نصوص شرعیہ اور ادلۂ صحیحہ کے معارض نہ ہو۔

۳۔وہ ضعیف حدیث کسی شرعی قاعدہ وضابطہ کے تحت آتی ہو۔

مثلاً دھوپ سے گرم شدہ پانی کے استعمال کی کراہت کا مسئلہ۔

یہ مسئلہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، البتہ ضعیف متوسط الضعف سے اس کا ثبوت ہے۔

فضائل کے باب میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

۱۔ علامہ سخاویؒ وغیرہ نے اس بارے میں متعدد مذاہب تحریر فرمائے ہیں: لیکن خود انہوں نے جمہور علماء کا جو مذہب ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر مکی اور ملا علی قاری وغیرہ نے جسے اتفاقی ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل جائز ہے (الاجوبۃ الفاضلۃ، ۵/ ۳۵)۔

ائمہ حدیث میں عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام احمدؒ وغیرہم سے یہی منقول ہے (الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۴۰)۔

۲۔ فضائل میں احادیث ضعیفہ سے استدلال کرنا جمہور علماء کا مسلک ہے، اس کے لیے تین شرطیں مشہور ہیں: ضعیف حدیث کا ضعف شدید نہ ہو۔ کسی شرعی قاعدہ کلیہ وضابطہ اصلیہ کے تحت آتی ہو، اس حدیث پر عمل اس کو سنت اعتقاد کر کے نہ کرے بلکہ احتیاطاً عمل کرے، جیسے گردن کے مسح والی حدیث، اذان میں ترسیل، اقامت میں تحدید والی حدیث، یہ دونوں حدیثیں سنداً ضعیف ہیں، علامہ سیوطیؒ نے "شرح تقریب النووی" میں ان شرائط ثلاثہ کو ذکر فرمایا ہے، (کذا فی رسالۃ میزان الحدیث/ ۶۵) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔



احادیث ضعیفہ کے اصول وضوابط

محمد امین رضوی[1]

الف۔ ضعیف

۱۔ خبر آحاد میں جس حدیث کا جانب صدق راجح نہ ہو، یعنی حدیث صحیح میں جو شرائط معتبرہ ہیں وہ جس حدیث میں کلا یا بعضاً مفقود ہو، وہ حدیث ضعیف ہے۔

۲۔ ضعف احادیث کے اہم اور بنیادی اسباب یہ ہیں، سند کا متصل نہ ہونا، راوی عادل کا نہ ہونا، راوی کثرت غفلت کا شکار ہو، راوی کا متہم بالکذب ہونا، روایت کا شاذ ہونا، راوی کے اندر علت قادحہ کا پایا جانا۔

محدثین کے نزدیک ضعف حدیث جس میں صرف قلت الضبط ہو اور باقی صفاتِ صحیحہ موجود ہوں تو ایسی حدیث احکام میں قابل قبول ہے ورنہ نہیں، فقہاء کے نزدیک ضعیف کا ضعف تعدد طرق سے جب منجبر ہو تو احکام میں مقبول ہے، میزان الاخبار کے مصنف کہتے ہیں کہ ضعیف حدیث اگر موضوع نہ ہو اگرچہ ایک ہی سند سے مروی ہے تو فضائل اعمال میں اس پر عمل کرنا مستحب ہے، البتہ احکام میں بحیثیت حجت مقبول نہیں، مگر احتیاط کے موقع پر مدعیٰ کو قوی بنانے کے لیے بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہے، بہر حال فقہاء تعدد طرق کو قبولیت کے لیے حد جواز مانتے ہیں، محدثین کا کہنا ہے کہ تعدد طرق کے باوجود ضعیف حدیث ضعف ہی رہتی ہے، اس لیے کہ ضعیف کے ساتھ ضعیف کے ملنے سے صحیح نہیں بنتی، کیونکہ چند زیرو (نقطہ) کا مجموعہ بھی زیرو ہے عدد نہیں بنتی، فقہاء تعدد طرق کو مفید للقوۃ کہتے ہیں، لہٰذا احکام میں قابل قبول مانتے ہیں۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی اور اصولی حکم مقبول نہ ہونا ہے۔

ب: جو حدیث مطعون بالکذب ہو وہ حدیث موضوع ہے، اگرچہ راوی کی زندگی میں ایک مرتبہ ہی کذب صادر ہو، پھر اگر توبہ کرلیا تو بھی معتبر نہ ہوگا۔

یہ روایت حدیث کے بارے میں ہے، البتہ معاملات میں جھوٹ بول کر توبہ کرلیا تو اس کی شہادت مقبول ہے، لیکن حدیث میں مقبول نہیں۔

۲۔ موضوع حدیث ہرگز قابل قبول نہیں، وہ لاشئ محض ہے۔

۳۔ کسی واضع حدیث اور کذاب فی الحدیث راوی کا نام کسی سند میں شامل ہونا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی نہیں، جب کہ دوسری معتبر سند سے یہ حدیث مروی ہو، اگر کسی دوسری معتبر سند میں یہ روایت موجود نہ ہوں تو ایسی حدیث موضوع قرار دی جائیں گی۔

حدیث ضعیف کا متلقی بالقبول ہونا

احادیث ضعیفہ متلقی بالقبول محققین کے نزدیک متروک ہے، اس پر عمل واعتماد کی گنجائش نہیں ہے۔

تلقی کی ایک صورت روایت کی ہے یعنی علماء اس کو آپس میں روایت کرتے ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے موافق عمل کرتے ہیں، حکم کے اعتبار سے محققین کے نزدیک دونوں صورتوں بنظر تحقیق لایعتبر شئ ہیں۔

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے مراد یہ ہے کہ راوی کے نقص کو تعدد روایت کے ذریعہ دور کرنا، اس حدیث کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف

[1] بنگلہ دیش۔

ہے، ایک گروہ قبول کرتے ہیں دوسرے گروہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

۲۔ قبول کرنے والے گروہ فضائل کے علاوہ احکام میں بھی اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

۳۔ جو چیز حدیث کے ضعف کی تلافی کا ذریعہ بنتے ہیں، وہ یہ ہیں: اتصال سند، عدالت، تام الضبط، صدق الحدیث۔

۴۔ فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک اگر ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا، ان کے نزدیک ایک سے زائد سند کے ذریعہ مروی ہونا کافی ہے، اگر چہ دوسری ضعیف ہو، البتہ لفظ اور مضمون کی موافقت شرط ہے، دوسری جماعت کے نزدیک ضعیف روایت کا اعتبار نہیں۔

احکام میں ضعیف احادیث سے استدلال

۱۔ ایسی ضعیف احادیث جن کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں احکام و مسائل کے باب میں اصولیین کے نزدیک ان کا اعتبار ہی نہیں، مجتہدین کے نزدیک "الضرورات تبیح المحظورات" کی حالت پیش آنے کی صورت میں اعتبار ہے۔

۲۔ امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ کے نزدیک احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش جو نقل کی جاتی ہے (بنسبت رائے کے) تو ان کے کلام میں ضعیف کا مصداق حسن لغیرہ ہے نہ کہ متاخرین کے نزدیک ضعیف کا جو مصداق ہے۔

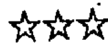
۳۔ جن حضرات نے احادیث ضعیفہ کا احکام میں اعتبار کیا ہے وہ تعدد روایت کو شرط قرار دیتے ہیں۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال واعتبار

۱۔ فضائل کے باب میں ضعیف احادیث پر اعتماد کرنا صوفی محدثین کے نزدیک درست ہے محققین محدثین کے نزدیک درست نہیں، امام بخاری و مسلم نے فضائل میں بھی حدیث روایت کی ہے مگر ہرگز ضعیف حدیث پیش نہیں کی، جو لوگ ضعیف احادیث پر اعتماد کرتے ہیں اس سے مراد مفردات ہیں نہ کہ مجموعہ۔

۲۔ فضائل کے باب میں ضعیف احادیث پر اعتماد واعتبار کرنے کے لیے یہ حضرات یہ شرط لگاتے ہیں کہ روایت صفات باری، احکام اور عقائد سے متعلق نہ ہو، ایسی ضعیف حدیث جو ترغیب، ترہیب، سیر و مغازی اور فضائل میں سے ہو تو اس کی روایت جائز ہے۔

ائمہ حدیث نے جس حدیث کے اندر شرائط صحت وشرائط حسن اکٹھا نہ ہو اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔



احادیث ضعیفہ اور فقہی احکام

مولانا مصطفیٰ قاسمی[1]

الف۔ حدیث ضعیف

حدیث کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں سے سب سے اعلیٰ صحیح، اس کے بعد حسن پھر ضعیف ہے۔ اگر حدیث میں حدیث حسن کی شرائط بھی نہیں پائی جائیں، تو انہیں حدیث ضعیف کہا جائے گا۔

''وما فقد فيه الشرائط المعتبرة فى الصحيح كلا او بعضا فهو الضعيف''

(مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی/۶۱۔۸۱، تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمہ ابن الصلاح، ۱/۱۷۔۱۸، دارالعلوم دیوبند)۔

ضعیف کے لیے دوسری تعبیر مردود کی استعمال ہوتی ہے۔ محققین محدثین کسی حدیث کو مردود کہہ کر ہر جگہ یہ مراد نہیں لیتے ہیں کہ اس کے متعلق عدم عمل یا بطلان وعدم اعتبار کا فیصلہ ہو چکا ہے، بلکہ اس حدیث کو بھی مردود کہہ دیا کرتے ہیں جس کے راویوں میں صدق اور قبول کی صفات کا ثبوت نہ ہو اور اس کے لیے مزید تحقیق اور غور وفکر کی ضرورت ہو، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ضعیف ومردود حدیث کی اقسام بیان کرتے ہوئے علماء ایک ہی انداز کی بحث وتفصیل کرتے ہیں (تیسیر مصطلح الحدیث/۶۱ دار التعلیم بیروت لبنان)۔

ابن حجر فرماتے ہیں: ''واذا توقف عن العمل به صار كالمردود، لا لثبوت صفة الرد بل لكونه لم يوجد فيه صفة توجب القبول'' (نزهة النظر/۲۶)۔

(جن حدیث پر عمل میں توقف کیا جائے وہ مردود کی طرح ہو جاتی ہے، اور ایسا اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کے راوی کے حق میں حدیث کو رد کردینے کی صفت ثابت ہوگئی، بلکہ اس وجہ سے کہ قبول کی صفت کی تحقیق نہیں ہوسکی ہے)۔

صحیح وحسن کی طرح، رواۃ کے اندر پائے جانے والے ضعف کی قوت وشدت کے اعتبار سے ضعیف کے بھی متعدد مراتب ہیں، جن کی بنا پر ضعیف کا نام بھی بدل جاتا ہے اور حکم بھی، سب سے بدتر قسم "موضوع" ہے۔

۳۔ اقسام:...... اسباب ضعف اور ان کی قوت وضعف کے اعتبار سے بقول عراقی ابن صلاح نے ۴۲، اور ابن حبان نے ۴۹، بعض نے ۶۳، اور مناوی نے عقلاً ۱۲۹ اقسام ذکر کی ہیں، جن میں سے بہت سی اقسام کے مستقل عناوین ہیں اور بہت سی دوسری اقسام یا ضعیف کے عنوان کے تحت داخل ہیں۔

حکم روایت:...... ضعیف حدیث اگر موضوع نہ ہو تو ضعف کو بیان کئے بغیر اس کی روایت اور اس کی اسانید کے حق میں تساہل دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

الف: عقائد مثلاً صفات باری تعالیٰ سے اس کا تعلق نہ ہو۔

ب: حلال وحرام سے متعلق نہ ہو۔ یعنی مواعظ، ترغیب وترہیب اور قصص وغیرہ سے اس کا تعلق ہو۔

اور اگر موضوع ہو تو وضع کی تصریح کے بغیر اس کی روایت جائز نہیں ہے۔

حدیث ضعیف کے قبول کرنے کی چند ضروری شرطیں

علامہ جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی شرح تقریب النواوی میں اور علامہ سخاوی نے القول البديع فى الصلوٰة على الحبيب الشفيع

[1] مدرسہ اسلامیہ شکرپور، بھرواره، دربھنگہ۔

میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ:

۱۔ اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ قوی کوئی دلیل موجود نہ ہو، کیونکہ اگر کسی حدیث صحیح یا حدیث حسن سے ایک عمل کی کراہت ثابت ہو رہی ہو اور حدیث ضعیف اسے مستحب قرار دے، تو ایسی صورت میں عمل قوی دلیل پر ہی کیا جائے گا اور اسی کے مقتضیٰ کو مقدم رکھا جائے گا۔

۲۔ اس حدیث کا ضعف زیادہ شدید نہ ہو، مثال کے طور پر کوئی حدیث ایک ہی سند سے منقول ہے اور اس میں کوئی راوی ایسا ہے جو بہت ضعیف ہے، جیسے کذاب ہونا یا فاحش الغلط ہونا یا مغفل ہونا وغیرہ۔

۳۔ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی تیسری شرط یہ ہے کہ جو مضمون اس سے ثابت ہوتا ہو وہ شریعت کے عام قواعد کلیہ کے مخالف نہ ہو، بلکہ ان کے تحت آتا ہو، تاکہ جو چیز شرعاً غیر ثابت ہے اس کا اثبات لازم نہ آئے۔

۴۔ اور چوتھی شرط یہ ہے کہ عمل کرنے والا اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا عقیدہ نہ رکھے، بلکہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر ایک یقینی کیفیت پر پہنچنے کی نیت ہو، یعنی یہ کہ اگر حقیقت میں اس حدیث کا مضمون صحیح ہو تو عمل کر لیا گیا ہے اور اگر صحیح نہیں ہے تو کوئی شرعی برائی پیش نہیں آئی۔

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کا حکم

حدیث ضعیف پر عمل کے متعلق اختلاف ہے، عام طور سے علماء اس کے قائل ہیں کہ فضائل اعمال میں، مستحبات و مکروہات میں ایسے ہی مواقع احتیاط میں ضعیف پر عمل کرنا مستحب ہے بشرطیکہ تین باتیں پائی جائیں:

الف: ضعف شدید نہ ہو یعنی کسی طریق میں کوئی راوی کذاب یا متہم بالکذب نہ ہو (قواعد فی علوم الحدیث/ ۵۸۔ ادارۃ القرآن کراچی)۔

ب: حدیث کسی اصل کے تحت آتی ہو، یعنی کسی شرعی کلیہ یا قاعدہ کے تحت۔

ج: عمل وجوب وقطعیت اور حدیث کے قطعی ثبوت کی بنیاد پر نہ ہو (تدریب الراوی ۱/ ۲۹۸، قواعد فی علوم الحدیث/ ۵۸)

بعض مرتبہ قرائن کی وجہ سے ضعیف حدیث پر عمل واجب بھی قرار پاتا ہے، بلکہ اس سے قطعیات کا نسخ بھی ہوتا ہے، جیسے کوئی حدیث ثبوت کے اعتبار سے ضعیف ہو مگر علماء امت کے درمیان اس کی نقل معروف ومتداول ہو تو اس کی وجہ سے وہ متواتر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اس سے قطعیات کا نسخ درست قرار پاتا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ حدیث "لا وصیۃ لوارث" (ترمذی ۲/ ۳۲، نسائی ۲/ ۱۳۱، ابوداؤد ۲/ ۳۹۶، مختار اینڈ کمپنی دیوبند، ابن ماجہ ۲/ ۱۹۵ اشرفی بکڈپو دیوبند) کا ثبوت اگرچہ اہل تحقیق علماء اہل حدیث کے نزدیک محل کلام ہے مگر عام طور سے علماء ومجتہدین نے اس پر اس حد تک اعتماد کیا ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت: "کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت" (بقرہ: ۱۸۰) کے لیے اس کو ناسخ قرار دیا ہے، اسی طرح حدیث "طلاق الامۃ تطلیقتان وعدتھا حیضتان" (ترمذی ۱/ ۲۲۴، ابوداؤد ۱/ ۲۹۸، ابن ماجہ ۱/ ۱۵۰۔ ۱۵۱، مستدرک حاکم ۱/ ۲۰۵، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن) کو بھی اسی فہرست میں شمار کیا گیا ہے اس کی تفصیل معانی النظر اور قواعد فی علوم الحدیث اور ترمذی جلد اول وتدریب الراوی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ب۔ حدیث موضوع

اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ موضوع وہ من گھڑت بات ہے جس کی نسبت رسول اکرم ﷺ کی طرف کی جائے:

"وھو الکذب المختلق المصنوع المنسوب الی رسول اللہ ﷺ" (تیسیر مصطلح الحدیث ص ۸۸ محمود الطحان، دار التعلیم بیروت لبنان، مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۸ تا ۳۹ دار العلوم دیوبند ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء)۔

اور یوں بھی تعریف ہوسکتی ہے کہ حدیث موضوع وہ کلام ہے جس کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف صحیح نہ ہو۔ اس لیے کہ موضوع کا خالص جھوٹ اور من گھڑت ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات ایک چیز صحیح وثابت ہوتی ہے لیکن اس کی نسبت حضور ﷺ کی طرف صحیح نہیں ہوتی (مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۹۔ تدریب الراوی، ج ۱ ص ۲۸۷، نزھۃ النظر ص ۴۵، لمحات من تاریخ السنۃ ص ۴۲، علوم الحدیث ص ۱۵۵)۔

۳۔ موضوع روایت کی شناخت

موضوع روایت کی شناخت کے سلسلہ میں محدثین نے جو تفصیلات دی ہیں انہیں کو مختصر طور پر میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ پہلی علامت خود گھڑنے والے کا اعتراف ہے، واضع حدیث خو اقرار کرے کہ میں نے یہ روایت وضع کی ہے، اگر اس نے ایک بھی روایت کے وضع کرنے کا اعتراف واقرار کرلیا تو اب وہ جو بھی روایت بیان کرے گا وہ نا قابل اعتبار ہوگی اور اس کی تمام روایتیں رد کردی جائیں گی، میسرہ ابن عبدربہ نے فضائل قرآن کے سلسلہ میں بعض روایتوں کے وضع کرنے کا اقرار کیا تھا۔

۲۔ راوی کی تاریخ پیدائش معلوم ہے اور وہ شیخ سے روایت سننے کا زمانہ وہ بتاتا ہے جب کہ شیخ کا انتقال ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے راوی کی شیخ سے ملاقات ممکن ہی نہیں، پھر اس نے ان سے روایت کیسے سنی؟

۳۔ تیسری علامت یہ ہے کہ وہ جھوٹا مشہور ہو۔

۴۔ روایت میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ عقل، حواس اور مشاہدہ کے صریح خلاف ہو اور اس میں کسی تاویل اور توجیہ کی بھی گنجائش نہ ہو۔

۵۔ راوی جو روایت بیان کر رہا ہے وہ کسی آیت محکمہ، سنت متواترہ، یا اجماع قطعی کے خلاف ہو۔

۶۔ روایت کا تعلق کسی ایسے اہم مسئلہ سے ہو جس کا علم تمام مکلفین کے لیے لازم ہو لیکن وہ روایت کسی فرد واحد سے مروی ہو۔

۷۔ کسی معمولی کوتاہی پر شدید ترین وعید کا ذکر ہو یا کسی معمولی عمل پر بہت ہی عظیم اجر کا وعدہ ہو۔

۸۔ ایک علامت امام فخر الدین رازیؒ نے یہ ذکر کی ہے کہ جس زمانے میں احادیث کی تدوین وترتیب ہو چکی اس دور میں کوئی ایسی روایت کی جائے جس کا سراغ نہ کسی کتاب میں ملے نہ کسی امام حدیث کو اس کی خبر ہو۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

۱۔ ایسی ضعیف احادیث جن کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں کیا کسی صورت میں احکام ومسائل کے باب میں ان کا اعتبار ہے، اس بابت ائمہ مجتہدین واصولیین کے نظریات کیا ہیں؟

۱۔ ایسی ضعیف جس کے تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں ان پر مسائل کے باب میں اعتبار وعمل کی گنجائش نہیں ہے، ابن العربی، ابن القیم اور ابن تیمیہ نے صراحت کی ہے کہ اس پر احکام یعنی حلال وحرام اور جائز وناجائز کے باب میں بالکل ہی عمل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد سے احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش نقل کی گئی ہے تو ان کے کلام میں ضعیف کا مصداق حسن لغیرہ ہے۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف کے استدلال واعتبار

۱۔ جمہور محدثین کے نزدیک فضائل کے باب میں ضعیف احادیث پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، حافظ ابن حجر اور ملا علی قاری وغیرہ سے بھی یہی منقول ہے (الاجوبۃ الفاضلۃ/ ۳۷۔۳۸)۔



حدیث ضعیف و موضوع سے متعلق احکام

مولانا عبد الواحد قاسمی [1]

تعریف حدیث ضعیف

جمہور محدثین نے احادیث کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے، مقرر کردہ تمام خاص شرائط جس میں پائے جائیں وہ سب سے اعلیٰ ہے اس کو صحیح کہتے ہیں، اس سے کمتر درجہ حسن کا ہے اور جن احادیث میں حدیث حسن کے شرائط بھی نہ پائی جائیں انھیں حدیث ضعیف کہا جائے گا۔

ضعف احادیث کے دیگر بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ سلسلہ سند میں ایک یا چند راوی ایسا آگیا ہو جو معیار رواۃ پر پورے اترتے ہوں اور صدق وقبول کے صفات اس میں نہ پائے جاتے ہوں، تو یہ بھی اسباب ضعف میں محسوب ہوگا۔

حدیث ضعیف کا اصولی حکم

حدیث موضوع کے علاوہ عام احادیث ضعیفہ کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ فی الجملہ ان کی روایت کی بھی اجازت ہے اور ان پر عمل کی بھی گنجائش ہے، چنانچہ ابن الصلاح اپنے مقدمہ میں ضعیف کی روایت کا جواز بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اعلم ان الحديث الموضوع شر الاحاديث الضعيفة: ولا تحل روايته لاحد علم حاله بخلاف غيره من الاحاديث الضعيفة التي يحتمل صدقها في الباطن" (مقدمه/۴۷)۔

یعنی حدیث موضوع احادیث ضعیفہ کی بدترین قسم ہے اور ضعف کا علم ہوتے ہوئے اس کی روایت کرنا کسی کے لیے جائز نہیں، ہاں! سوائے ان احادیث ضعیفہ کے کہ جن کا صدق محتمل ہو۔ ان کی روایت جائز ہے۔

حدیث موضوع کی تعریف

حدیث موضوع وہ بات ہے جس کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف صحیح نہ ہو۔

صاحب تیسیر مصطلح الحدیث موضوع کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هو الكذب المختلق المصنوع المنسوب الى رسول الله صلى الله عليه وسلم" (تیسیر/۸۸)۔

یعنی وہ جھوٹی اور خود ساختہ بات جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے۔

ان دونوں تعریف میں اول الذکر تعریف بہتر اور انسب معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دوسری تعریف میں "جھوٹی بات" کا قید ہے، جب کہ بسا اوقات ایک بات صحیح ہوتی ہے لیکن ان کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

حدیث موضوع کا حکم

علماء حدیث وفقہاء کرام نے موضوع کے متعلق اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس پر عمل کرنا کسی حال میں جائز نہیں، یہاں تک کہ بلا موضوع ہونے کی صراحت کے اس کی روایت کرنا بھی جائز نہیں اور موضوع ہونے کی وضاحت کے بغیر اس کی نقل و روایت کرنا نہ صرف یہ کہ حرام ہے بلکہ...

---

[1] دار العلوم محمدیہ بنگلور، کرناٹک۔

نے کفر تک کہا ہے۔(ردالمحتار،۱/ ۸۷)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

ائمہ فن نے حدیث ضعیف کی ایک قسم کو متلقی بالقبول کے نام سے موسوم کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ضعیف متلقی بالقبول وہ حدیث ہے جس کو علماء نے عمل واحتجاج کے حق میں قبول کیا ہے اگرچہ اس کی کوئی صحیح ومعتبر سند نہ پائی جاتی ہو، الا یہ کہ اس میں ضعف شدید نہ ہو، صاحب جلالین علامہ سیوطیؒ ضعیف متلقی بالقبول کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ما تلقاه العلماء بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح او اشتهر عند ائمة الحديث بغير نكير منهم" (الاجوبة الفاضلہ/۲۲)۔

یعنی ضعیف متلقی بالقبول وہ حدیث ہے جس کو علماء نے عمل واحتجاج میں قبول کیا ہو، اگرچہ اس کی کوئی صحیح ومعتبر سند نہ پائی جاتی ہو، یا ائمہ حدیث کے یہاں یہ مشہور ہو اور اس پر کسی طرح کا انکار بھی نہ پایا جاتا ہو۔ جن احادیث ضعیفہ کے متعلق بالاتفاق علماء کا یہ طریقہ ہو کہ اس کو عمل واحتجاج کے حق میں قبول کرتے ہوں اور امت اس کو بلا کسی نکیر کے تسلیم کرتی ہو اور اس کے مداول ومعنی پر عمل کرتی ہو، نیز شہرت وعموم کے نقل وروایت کے ساتھ ساتھ حدیث کے مطابق عام عمل وفتویٰ بھی جاری ہو تو ایسی روایات کو متلقی بالقبول کہیں گے اور ان پر تلقی کا اطلاق ہوگا۔

گزشتہ سطور میں علامہ سیوطیؒ نے اسی کی تصریح کی ہے، حافظ ابن حجر ایک جگہ فرماتے ہیں:

"من جملة صفات القبول ان يتفق العلماء على العمل بمدلول حديث فانه يقبل حتى يجب العمل به" (النکت/۴۹۴)۔

یعنی منجملہ حدیث کے مقبول ہونے کی صفات میں یہ ہے کہ علماء کسی حدیث کے مدلول پر عمل کے لیے متفق ہو جائیں تو ایسی حدیث مقبول قرار پاتی ہے یہاں تک کہ اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے۔

حکم

حدیث ضعیف متلقی بالقبول کا حکم یہ ہے کہ وہ صحیح اور واجب العمل ہے جیسا کہ ائمہ حدیث کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ اور سخاویؒ کی وضاحت کے مطابق یہ متواتر کی قوت وحیثیت اختیار کر کے قطعی اور آیات احکام کے لیے ناسخ قرار پاتی ہے۔

البتہ اگر علماء نے ایسی احادیث کے متعلق صرف عمل کی حد تک اتفاق کیا ہے تو اس کو متواتر اور قطعیت کا درجہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ خبر واحد کے درجہ میں رکھا جائے گا اور اگر علماء میں قابل عمل ہو یعنی عمل بھی ہوتا ہو اور اس کے مطابق فتویٰ بھی دیا جاتا ہو تو پھر قطعیت کے ساتھ اس کے ثبوت کا حکم بھی دیا جائے گا (احکام القرآن،۱/ ۳۸۶)۔

خلاصہ یہ کہ تلقی کی دونوں صورتوں میں فرق کیا جائے گا اور دونوں کے حکم الگ الگ ہوں گے۔

حدیث ضعیف مؤید بقرائن

احادیث ضعیفہ کے باب میں کچھ احادیث ایسی آتی ہیں جن میں تلقی کی صفت نہیں پائی جاتی، البتہ اس میں کچھ ایسے قرائن پائے جاتے ہیں جن سے حدیث کے مضمون کو تقویت ملتی ہے اور اس سے ضعف کی تلافی ہو جاتی ہے، اور اس طرح یہ حدیث ضعیف کے درجہ سے نکل کر قوی کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے، ایسی احادیث اصلاً مقبول کے اقسام میں شمار ہوتی ہیں، محدثین نے اس قسم کی احادیث کے لیے حسن لغیرہ کی اصطلاح متعین کیا ہے، علامہ سخاوی فرماتے ہیں:

"الحسن لغيره اصله ضعيف وانما طرا عليه الحسن بالعاضد الذى عضده" (فتح المغیث/۶۵)۔

یعنی حسن لغیرہ اصلاً ضعیف ہوتی ہے مگر کسی وقت پہچانے والے امر کی وجہ سے اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

حکم

جمہور علماء احادیث کے دیگر اقسام کی طرح ضعیف مؤید بقرائن کو قابل حجت مانتے ہیں، اور راجح مذہب کے مطابق اس قسم کے احادیث پر فضائل ہی کے باب میں اعتماد کیا جا سکتا ہے، مسائل واحکام یعنی حلت وحرمت، جائز وناجائز کے لیے اس پر عمل نہیں کر سکتے۔

تقویت پہنچانے والے امور

حدیث ضعیف کو دور کرنے اور قوت کا فائدہ پہنچانے والے متعدد امور وقرائن ہیں:

سب سے مشہور قرینہ یہ ہے کہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہو، دوسرا قرینہ یہ ہے کہ کسی اصل شرعی کے موافق ہو، چونکہ حدیث ضعیف کے مختلف اقسام ہیں اور اس میں مراتب کے اعتبار سے فرق بھی ہے یہاں تک کہ ضعیف کا اطلاق موضوع حدیث پر بھی ہو جاتا ہے، اس لیے ضعف کو دور کرنے والے قرائن کے ذریعہ ضعیف حدیث کو جو فائدہ ہوگا اور اس کے مدلول کو جو تقویت پہنچے گی اس سے تمام ضعیف مراد نہیں بلکہ اس میں یہ شرط ضروری ہے کہ وہ ایسی حدیث ہو جس میں ضعف شدید نہ ہو، کیوں کہ موضوع حدیث کو جو ضعیف ہی کی قسم ہے ان قرائن سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا...... گویا مراد ضعیف سے یہاں خاص ضعیف ہے۔

ضعف کو ختم کرنے والے امور میں جو تعدد طرق کا اعتبار کیا گیا ہے، اس میں نہ تو یہ ضروری ہے کہ وہ دوسرا طریق جس نے قوت حاصل ہو رہی ہے راوی صحابی دوسرا ہو اور نہ یہ کہ دونوں کا لفظ ایک ہو، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ مرتبہ میں یہ طریق اصل ضعیف حدیث سے کمتر نہ ہو یا فائق ہو یا ہم مرتبہ ہو (قواعد فی علوم الحدیث/ ۴۳)۔

احکام میں احادث ضعیفہ کا اعتبار

حدیث ضعیف کی جو دو صورتیں تلقی بالقبول، مؤید بقرائن او پر ذکر کی گئیں ہیں، ان صورتوں میں حدیث ضعیف، ضعیف باقی نہیں رہتی بلکہ وہ قبول وصحت اور حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے، لہٰذا ان کے متعلق کوئی بات نہیں، ایسی احادیث ضعیفہ جن کے ساتھ مذکورہ دونوں صفت نہ پائی جائے ان کے متعلق معروف یہی ہے کہ ان پر احکام ومسائل کے باب میں عمل نہیں کیا جا سکتا، مجتہدین اور اصولیین نے اسی نظریات کو اپنایا ہے، رہی بات امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ سے احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش کا قول تھا تو انھوں نے بھی ضعیف سے ضعیف اصطلاحی مراد نہیں لیا ہے، بلکہ وہ ضعیف جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے جیسا کہ ابن تیمیہ وغیرہ کی رائے ہے (منہاج السنۃ ۲/ ۱۹۱)۔

فضائل میں ضعیف کا استدلال واعتبار

فضائل کے باب میں احادیث ضعیفہ پر عمل واعتبار کے بارے میں جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ فضائل میں حدیث ضعیف پر عمل جائز ہے، البتہ محققین نے اس جواز کو کچھ شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے، علامہ سخاویؒ اور حافظ ابن حجر نے اس سلسلے میں تین شرط ذکر کی ہیں:

پہلی شرط یہ کہ ضعف شدید نہ ہو (یعنی موضوع نہ ہو)۔

دوسری شرط یہ کہ حدیث اپنے مضمون کے اعتبار سے کسی اصل کلی کے تحت آتی ہو۔

تیسری شرط یہ کہ حدیث پر عمل کے ثبوت ویقین کے ساتھ نہ ہوتا کہ پورے وثوق کے ساتھ ایسی بات کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا ہے۔

☆☆☆

احادیث ضعیفہ کی معنویت

ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی[1]

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حدیث صحیح اور حسن کی کوئی شرط نہ ہو اور اس میں ضبط وعدالت بھی نہ رہے اور اس کے اسناد منقطع رہیں خواہ وہ شاذ رہے یا معلل یا منکر سے موسوم رہے (تیسیر القاری)۔

محدثین کا فیصلہ ہے کہ حدیث ضعیف کی شناخت مندرجہ ذیل اصول سے ہوتی ہے:

۱۔ وہ حدیث جو عقل کے مخالف ہو اور اصول کی مخالف ہو۔

۲۔ مشاہدات، قرآن اور حدیث متواتر کی بھی مخالف ہو۔

۳۔ اجماع قطعی کے خلاف ہو اور قابل تاویل بھی نہ ہو۔

۴۔ جس میں معمولی سی بات پر دھمکی ہو۔

۵۔ اور مختصر سے کام پر بڑے بڑے انعامات کا وعدہ ہو۔

۶۔ اور اس کا سلسلہ روایت یا مضمون قابل اعتراض ہو۔

حدیث ضعیف کی دوسری تعبیر مردود بھی ہے اور علمائے محدثین نے خبر مردود کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں اور ان کے لیے مختلف نام بھی تجویز کئے ہیں، ظاہر ہے کہ مردود کا ظاہر مفہوم حدیث کو غیر معتبر بنا دیتا ہے، اس لیے اس حدیث کی روایت میں مقبولیت کی صفت محقق نہیں ہے (نخبۃ الفکر)

کتب احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ضعیف احادیث کی روایت کی بھی اجازت ہے اور ان پر عمل کی گنجائش ہے، امام نوویؒ بھی ضعیف حدیث کی روایت اور ان پر عمل کے حق میں نرم رویہ کو جائز قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر مکی اور ملا علی قاری نے بھی فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل جائز قرار دیا ہے۔ (التقریب علی التدریب)۔

ضعیف احادیث جب تعدد طرق سے مرتبۂ حسن کو پہنچے تو وہ بھی صحیح ہیں، اور فضائل اعمال میں صرف مفردات میں ان کا اعتبار ہے، مجموع میں نہیں۔ (تیسیر القاری)۔

موضوع

"هو الكذب المختلق المصنوع المنسوب الى رسول الله صلى الله عليه وسلم"

یعنی موضوع وہ من گھڑت بات ہے جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہو اور یہ انتساب صحیح نہ ہو، اس لیے یہ عام علماء کے پاس متروک ہے لیکن موضوع کا خالص جھوٹ اور من گھڑت ہونا ضروری نہیں ہے، بسا اوقات ایک چیز صحیح و ثابت ہوتی ہے مگر اس کی نسبت سرور کائنات ﷺ کی طرف صحیح نہیں ہوتی، البتہ اس کی سند میں تصرف کر کے اس کو صحیح بنا کر پیش کرتے ہیں (نزہۃ النظر)۔

حدیث موضوع پر عمل کسی طرح اور کسی محل میں جائز نہیں اور اس کی صراحت کے بغیر روایت بھی جائز بھی نہیں ہے۔

---

[1] دار قدرت، میسور، کرناٹک۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

ضعیف متلقی بالقبول وہ حدیث ہے جس کو علماء نے عمل واحتجاج کے حق میں قبول کرلیا ہے اگرچہ اس کی کوئی صحیح ومعتبر سند نہ پائی جاتی ہو۔

احکام میں احادیث ضعیفہ سے استدلال

قوی اور قرائن والی ضعیف حدیث ضعیف نہیں رہ جاتی بلکہ حدود ضعف سے نکل کر وہ قبول اور حسن وصحت بلکہ قطعیت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، مگر احکام میں اعتبار وعمل کی گنجائش نہیں ہے بلکہ صرف فضائل میں، البتہ جن مذاہب اور اقوال میں احکام کی گنجائش ملتی ہے، مثلاً ابن العربی، ابن تیمیہ اور ابن القیم ان کی تفصیل وتوجیہ میں ضعیف نہیں بلکہ حسن لغیرہ ہے۔

ابن حزم اور ابن القیم نے کہا ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے یہاں حدیث ضعیف رائے اور قیاس پر مقدم ہے (اعلام الموقعین/ ۷۷)، بلکہ ابن القیم نے ذکر کیا ہے کہ چاروں مذاہب کے بعض مسائل میں احادیث ضعیفہ سے استدلال کیا گیا ہے۔



حدیث ضعیف پر عمل کی تفصیل اور گنجائش کا مسئلہ

مفتی شیر علی گجراتی[1]

ا۔حدیث ضعیف کی تعریف کیا ہے؟

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں صحیح اور حسن کی شرطیں نہ پائی جاتی ہوں۔

''الضعيف لغة من الضعف ضد القوة، واصطلاحا هو الحديث الذى لم تجتمع فيه صفات الصحيح ولا صفات الحسن ويقال له المردود'' (القواعد الاساسيه/۲۷)۔

۲۔ضعیف احادیث کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟

محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث کے بنیادی اسباب یہ ہیں:

ا۔راوی کا کاذب ہونا۔

۲۔متہم بالکذب ہونا۔

۳۔فحش غلطی کرنا۔

۴۔غیر عادل وغیر متقن وغیر ضابط ہونا۔

۵۔وہمی ہونا (روایت جب بیان کرتا ہے تو وہم کے طور پر بیان کرتا ہے یقین کے ساتھ نہیں)۔

۶۔ثقہ راویوں کی مخالفت کرنا۔

۷۔بدعتی ہونا (سنن معروفہ کے خلاف عقیدہ رکھنا)۔

۸۔سند میں کسی راوی کا مجہول الحال ہونا۔

۹۔حدیث کا شاذ ہونا (غیر ثقہ راوی کا ثقہ راوی سے مخالفت کرنا)۔

۱۰۔منکر ہونا (اضعف راوی کا مخالفت کرنا ضعیف راوی سے)۔

۱۱۔مدلس ہونا (جس میں تدلیس کی گئی ہو)۔ ۱۲۔منقطع ہونا

یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جن کے پائے جانے پر حدیث ضعیف ہوجاتی ہے۔

فقہاء ومحدثین کے درمیان اتفاقی واختلافی نکات

فقہاء کے نزدیک ضعیف حدیث کے بنیادی اصول یہ ہیں:

ا۔عقل کا ناقص ہونا مثلاً نابالغ ہونا۔

---

[1] دار العلوم فلاح دارین ترکیسر گجرات۔

۲۔ معتوہ ہونا۔

۳۔ کماحقہ سماع کے وقت نہ سننا۔

۴۔ سننے سے ادا تک کسی بھی وقت نسیان کا طاری ہوجانا۔

۵۔ معنی کا نہ سمجھنا۔

۶۔ غیر مسلم ہونا (اصول فقہ میں مذکور ہے)۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور اس زمانہ کے فقہاء کرام کے نزدیک روایت کا متصل ہونا صحت حدیث کے لیے شرط نہیں تھا، لہٰذا ان کے نزدیک مرسل روایت ضعیف نہیں ہے، اور امام شافعیؒ اور محدثین کے نزدیک مرسل روایت ضعیف ہے۔

خلاصہ یہ کہ محدثین کے نزدیک راوی کا ضبط و اتقان، کماحقہ حدیث کے الفاظ کو یاد کرنے اور حدیث کا متصل ہونا شرط ہے، نیز محدثین کے نزدیک علو سند بھی سبب ترجیح ہے۔

اور فقہاء کے نزدیک تفقہ راوی وجہ ترجیح ہے اور متصل ہونا اور حدیث کے الفاظ ضبط کرنا امر اہم نہیں ہے، اس لیے فقہاء کرام کے نزدیک ثقہ اور فقیہ راوی کی حدیث مرسل حجت ہے۔

۳۔ حدیث ضعیف کا اجمالی واصولی حکم کیا ہے؟

حدیث ضعیف مردود ہے، اور عقائد واحکام میں حجت نہیں ہے، البتہ فضائل اور ترغیب وترہیب میں اس پر عمل کرنا جائز ہے مع الشروط

"الحديث الضعيف لا يعمل فى العقائد والاحكام ويجوز العمل به فى الفضائل والترغيب والترهيب وذكر المناقب بشروط" (القواعد الاساسيه ۲۸)۔

ب۔ موضوع

۱۔ موضوع کی تعریف کیا ہے؟

کذاب اور متہم بالکذب راوی (جس کا کذب حدیث رسول ﷺ میں ثابت ہوچکا ہو) کی من گھڑت و بناوٹی حدیث جو احکام شرعیہ اور کتب منقولہ فی الاسلام کے خلاف ہو، اس کو موضوع کہتے ہیں۔

"الموضوع: هو المختلق المصنوع هو شر الضعيف" (التقريب للنووى)

۲۔ حدیث موضوع کا کیا حکم ہے؟

حدیث موضوع مردود وباطل ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لیے کہ یہ کذب و بہتان ہے حضور ﷺ پر اور موضوع روایت نقل کرنا حرام ہے، لقوله عليه السلام: "من كذب على متعمداً فليتبوا مقعده من النار"

البتہ لوگوں کو موضوع حدیث نقل کرنے سے اور اس پر عمل کرنے سے روکنے کے لیے اور ان لوگوں پر حدیث کے موضوع ہونے کو واضح کرنے کے لیے روایت کا بیان کرنا جائز ہے۔

۳۔ کیا کسی واضع حدیث اور کذاب فی الحدیث راوی کا کسی سند میں شامل ہونا وضع کا حکم لگانے کے لیے کافی ہے اور ایسی ہر حدیث موضوع تصور کی جائیگی جس میں ایسا راوی آگیا ہو یا اس میں کچھ تفصیل ہے۔

کذاب راوی جس کا کذب اس کے اقرار، علماء کی جستجو وتحقیق سے ثابت ہو چکا ہوایسا راوی اگر حدیث میں آجائے تو حدیث موضوع ہے جیسا کہ اوپر تدریب الراوی کی عبارت سے معلوم ہوا، البتہ علماء فرماتے ہیں کہ مابقیہ رواتیوں میں جس میں کذب ثابت ہوا ہے وہ ظن غالب کی بنا پر موضوع کہلائیں گی قطعی طور پر نہیں (النکت علی نزہۃ النظر/ ۱۱۸)۔

البتہ امام نوویؒ اپنی تقریب میں فرماتے ہیں کہ علماء کرام کی اس رائے سے مجھے اختلاف ہے، بلکہ شریعت نے توبہ کرنے کے بعد اس کے فسق کو معاف کردیا ہے اور اس کو مؤمن متقی شمار کیا ہے، لہٰذا توبہ کرنے کے بعد اس کی تمام روایات اصول کے مطابق مقبول ہوں گی اور اس کو عادل شمار کیا جائے گا، جیسے کہ شہادت کے باب میں: "قال الامام النووی فی التقریب: ''قلت هذا كله مخالف لقاعدة مذهبنا مذهب غيرنا ولا نقول الفرق بينه وبين الشهادة" (تدریب الراوی، ۱/ ۳۳۲)۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

۱۔ بہت سی ضعیف احادیث ایسی ہیں جن کے لیے ہم کو تلقی بالقبول کی تعبیر ملتی ہے، تو حدیث ضعیف کے متلقی بالقبول ہونے سے کیا مراد ہے؟

متلقی بالقبول وہ روایت ہے جس پر علماء مجتہدین نے ضعیف ہونے کے باوجود عمل کیا ہو، فقہاء و مجتہدین کے عمل اور اصحاب جرح وتعدیل من المحدثین حضرات کا ضعیف حدیث پر عمل کرنا معتبر ہے، اور ایسی حدیث کو حدیث متلقی بالقبول کہا جاتا ہے۔

کن لوگوں کے قبول کرنے پر تلقی کا اطلاق ہوگا؟

فقہاء و مجتہدین وائمہ جرح وتعدیل کے قبول کرنے پر تلقی کا اطلاق ہوگا۔

۲۔ ایسی ضعیف حدیث کا کیا حکم ہے؟

جن ائمہ نے اس روایت کو قبول کیا اور اس پر عمل کیا ان کے متبعین کے لیے اس پر عمل کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ روایت نصوص قطعیہ، احادیث صحیحہ اور اصول شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ تلقی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ علماء آپس میں روایت کرتے ہوں اور دوسری یہ کہ اس کے موافق عمل کرتے ہوں دونوں کا حکم یکساں ہے؟

دونوں کو تلقی بالقبول سمجھا جائے گا اور تلقی بالعمل اقوی ہے، علامہ بنوریؒ فرماتے ہیں:

''التواتر العملی اقوی من التواتر الاسنادی''

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

۱۔ حدیث ضعیف منجبر سے کیا مراد ہے؟ وہ حدیث جو مؤید بقرائن ہو جیسے متابع موجود ہو یا شاہد ہو یا اس پر تعامل امت ہو یا عمومات کے ماتحت آتی ہو ایسی حدیث کو منجبر کہتے ہیں اور وہ مقبول ہوتی ہے۔

۲۔ کیا فضائل کے علاوہ مسائل میں بھی ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ ہاں، احکام میں بھی قابل عمل رہے گا بشروط مذکورہ بالا (یہ بندے کی رائے ہے)

۳۔ وہ کیا امور ہیں جو حدیث کے ضعف کی تلافی کا ذریعہ بنتے ہیں؟

۴۔ تعدد طرق یعنی حدیث کا ایک سے زائد سندوں سے مروی ہونے کا اس سلسلہ میں کس حد تک اعتبار ہے؟ کیا کسی ضعیف حدیث کے لیے محض ایک سے زیادہ سند سے مروی ہونا بھی کافی ہے جبکہ وہ دوسری سند بھی ضعیف ہو اور اس صحابہ کے واسطے سے مروی ہو جس سے اصل حدیث روایت کی جارہی ہو اور اس میں مضمون ولفظ کی موافقت کی شرط ہوگی یا نہیں۔

ایسی روایت جس میں ضعیف کی موافقت میں ایک طریقہ اور ہو تو یہ طریقہ شاہد اور متابع کے درجے میں ہوگا اور اس کو تعدد طرق میں شامل کریں

گے اور یہ حدیث بھی منجبر کہلائے گی بشرطیکہ ضعف فسق کی وجہ سے نہ ہو اور اصول شرعیہ کے خلاف بھی نہ ہو، البتہ مضمون کی موافقت بالاتفاق شرط ہے اور الفاظ کی موافقت عندالاکثر ضروری نہیں ہے۔

۵۔ تعدد طرق وغیرہ سے ضعیف حدیث کو فائدہ ہوتا ہے یا اس میں کوئی تخصیص وتفصیل ہے اس بابت ضابطہ اور معیار کیا ہے؟

اس بارے میں ضابطہ ومعیار یہ ہے کہ تعدد طرق وغیرہ سے فائدہ اسی وقت ہوگا جبکہ سبب ضعف ضعف حافظہ اور نسیان فسق نہ ہو اور صحیح روایتوں اور اصول شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔

احادیث ضعیفہ سے استدلال

۱۔ ایسی ضعیف احادیث جن کے ساتھ تلقی یا قرائن نہ پائے جائیں، کیا کسی صورت میں احکام ومسائل کے باب میں ان کا اعتبار ہے......الخ؟

ایسی حدیث ضعیف کا پایا جانا کہ جس پر تلقی بالعمل پایا گیا ہو مشکل ہے، امام ترمذیؒ کا مقولہ اس پر دال ہے، اور عندالاحناف اگر ایسی روایت جو متلقی بالقبول نہ ہو جس پر فرق حقہ میں سے کسی نے عمل کیا ہو اور وہ روایت اصول شرعیہ کے خلاف نہ ہو تو وہ حدیث قابل عمل ہوگی اور اگر اصول شرعیہ کے خلاف ہو تو قابل عمل نہ ہوگی، امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسی روایت کو مورد نص میں منحصر رکھ کر عمل کیا جائے گا۔

۲۔ بعض ائمہ جیسے امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ سے جو احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش نقل کی جاتی ہے تو ان کے کلام میں ضعیف کا مصداق کیا ہے حسن لغیرہ یا وہ حدیث جو متاخرین کے نزدیک ضعیف کا مصداق ہے؟

امام احمدؒ کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر تفصیل کے ضعیف روایت پر عمل کے قائل ہیں یا زیادہ سے زیادہ شدید ضعف اور تعارض سے خالی ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔

اور احناف کچھ اس طرح کی قیودات لگاتے ہیں کہ جن کے بعد حدیث ضعیف محض ضعیف نہ رہ جائے بلکہ وہ حسن لغیرہ کی حد میں داخل ہو جائے۔

۳۔ احکام میں بھی ایسی ضعیف روایت کا اعتبار ہے بشروط مذکورہ بالا (۱) اور (۲) عندالاحناف حدیث قہقہہ، اور احناف مال، حرفت اور نسب میں کفو کا اعتبار کرتے ہیں اور مانتے ہیں۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف سے استدلال واعتبار

۱، ۲۔ ہاں درست ہے، حضرات محدثین واصولیین کے نزدیک فضائل کے باب میں تین شرطیں ہیں:

۱۔ انتہائی ضعیف نہ ہو یعنی ایسے رواۃ سے مروی نہ ہو جن کو کاذب یا متہم بالکذب یا فاحش الغلط کہا گیا ہو۔

۲۔ اصول حدیث کے تحت آتی ہو (۳) اس پر عمل کے سلسلہ میں سنت سے ثبوت کا عقیدہ نہ ہو بلکہ احتیاط کے پیش نظر عمل کرنے کا تصور ہو (قواعد التحدیث/۱۱۶)۔

مناقشہ

احادیث ضعیفہ

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلاشبہ اکیڈمی کی جانب سے جو موضوعات یا عنوانات بحث وتمحیص کے لیے دیئے جاتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اس کے پیچھے کچھ تقاضے اور کچھ مطالبات ہوتے ہیں اور اس سے پہلے بھی جو موضوعات اکیڈمی کی جانب سے دیئے گئے تھے، اس کے بھی کچھ مطالبات رہے ہیں مثلاً مسئلہ ولایت یا کفاءت کا موضوع جس پر اس سے پہلے بحث ہوئی ہے وہ بھی ایک سماجی مسئلہ تھا اور اس طرح کے موضوعات متعین کرنے کے بہر حال کچھ اسباب سمجھ میں آتے ہیں اور اس میں قدماء کی کچھ رائیں بھی تھیں جو دور حاضر کی مشکلات پیدا کر رہی تھیں، لیکن یہ ضعیف احادیث یا احادیث ضعیفہ جو موضوع بحث وتمحیص کے لیے رکھا گیا ہے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی یا اس کا سبب کیا ہے؟ اگر اس کی وضاحت ہو جاتی تو شاید کوئی رائے متعین کرنے میں یا کسی نتیجہ تک پہنچنے میں مجھ جیسے طالب علم کو کم از کم کچھ سہولت ہوتی، تو میرا خیال ہے کہ اگر اس کی وضاحت کر دی جائے تو مناسب ہوگا، حضرت مولانا بدر الحسن صاحب نے اس کی وضاحت کچھ کی ہے لیکن بہر حال بھرپور وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔

مولانا عتیق احمد صاحب

ڈاکٹر صاحب نے جو نکتہ اٹھایا ہے وہ بہت ہی بعد میں اٹھایا ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ اس موضوع کو اٹھایا کیوں گیا، حدیث ضعیف کے احکام اور اس سے متعلق بحثیں اس کی کیا ضرورت تھی؟ محرک کیا تھی؟ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سی گفتگوؤں میں یہ بات آچکی ہے کہ حدیث ضعیف کے تعلق سے جو افراط وتفریط ہے، اور جو رویئے پائے جاتے ہیں، اس افراط وتفریط میں اعتدال پیدا کرنا اور ایک درمیانی راستہ امت کو دینا یہ بھی ایک اہم ذمہ داری ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بھائی یہ حدیث ضعیف تو حدیث کا موضوع ہے، فقہ اکیڈمی تو فقہی مسائل پر غور کرنے کے لیے قائم ہوئی ہے تو مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ بھائی ہم اس تقسیم کے قائل نہیں ہیں، ہم تو حدیث وفقہ کا جو ربط چلا آرہا ہے اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، اس کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں، فقہ کے اہم موضوعات میں سے یہ موضوع بھی ہے کہ کن احادیث سے ہم احکام میں استدلال کر سکتے ہیں اور کن سے استدلال نہیں کر سکتے، آپ نے بحثیں پڑھی ہوں گی، عرض کہ اس کے اندر کتنے نقطہ نظر سامنے آئیں مسئلہ کے تعلق سے، جب بھی ہم احکام پر بحث کریں گے تو احکام میں احادیث ضعیفہ حجت ہے کہ نہیں، اگر حجت ہیں تو کن شرطوں کے ساتھ ہیں، کن قیدوں کے ساتھ ہیں یہ سب باتیں تو آئیں گی ہی اور ہماری اکیڈمی نے شروع سے ایک معمول رکھا ہے کہ مسائل فقہیہ کے ساتھ کوئی اصولی موضوع بھی رکھا جائے، چنانچہ اس سے پہلے عرف وعادت اور کہیں ضرورت وحاجت، اس طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ہے، یہ بھی ایک اصولی موضوع ہے جس کا بہت گہرا تعلق احکام شرعیہ سے ہے، اس کو اس سیمینار میں رکھا گیا، اب اس کے بعد دوسرا نام ہے مفتی نسیم احمد قاسمی کا جو امارت شرعیہ کے نائب ناظم ہیں، ان سے درخواست ہے کہ اپنی گفتگو کو ملخص اور مختصر پیش کریں۔

مفتی نسیم احمد قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حدیث ضعیف پر عمل کے سلسلہ میں شرکاء کے جو مقالات تھے، مقالات پر مشتمل عرض مختلف حضرات کی طرف سے پیش کئے گئے، صحیح یہ ہے کہ اس موضوع کے انتخاب میں اکیڈمی نے بہت صحیح قدم اٹھایا ہے اور بلاشبہ وقت کی ایک ضرورت تھی کہ حدیث ضعیف پر عمل کو اس سیمینار کا موضوع قرار دیا جائے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حدیث ضعیف کا مطلب ہے حدیث موضوع، یعنی کچھ حضرات ایسے ہیں کہ جب ان کے سامنے یہ تذکرہ کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ضعیف کا لفظ سنتے ہی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور ان کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس

پر عمل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان شاء اللہ اکیڈمی کے فیصلے کے ذریعہ اس سلسلہ میں صحیح نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے آسکے گا۔

اس سلسلہ میں محدثین نے اور ائمہ جرح وتعدیل نے جو بحثیں کی ہیں ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کے سلسلہ میں علماء امت اور مشائخ حدیث کے تین اقوال ہیں:

سب سے پہلا قول یہ ہے کہ "الاحتجاج بالحدیث مطلقاً ای فی الاحکام وغیرھا، یعنی علی الاطلاق"، یہ حضرات حدیث ضعیف سے احتجاج کے قائل ہیں، چاہے حدیث ضعیف احکام سے متعلق ہوں یا مواعظ سے اور دوسرے موضوعات سے متعلق ہوں، امام سخاوی نقل کرتے ہیں: "احتج احمد رحمه الله بالضعیف حیث لم یکن فی الباب غیره واتبعه ابوداود وقدماه/ وقدمه علی الرای والقیاس ویقال عن ابی حنیفة ایضا ذلك، وان الشافعی یحتج بالمرسل اذا لم یجد غیره. وکذا اذا تلقت الامة الضعیف بالقبول یعمل به علی الصحیح، حتی انه ینزل منزلة المتواتر فی انه ینسخ المقطوع به"۔

اور دوسرا جو محدثین کا قول ہے کہ حدیث ضعیف پر مطلقاً عمل جائز نہیں، نہ مواعظ کے سلسلہ میں اور نہ احکام کے سلسلہ میں، لیکن یہ صرف ابن عربی کی رائے ہے، سخاوی کہتے ہیں کہ ابن عربی کا یہ کلام اس حدیث پر محمول کیا جائے گا جو اپنے سند کے اعتبار سے نہایت ہی ضعیف ہو اور علماء کا اتفاق ہو کہ اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

اور تیسرا مذہب محدثین کا اس سلسلہ میں یہ ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا، لیکن اس کے لیے تین شرطیں ہیں: پہلی شرط متفق علیہ ہے اور دوسری اور تیسری شرط پر اتفاق نہیں ہے۔

پہلی شرط جن پر اتفاق ہے وہ یہ ہے: "ان یکون الضعف غیر شدید" کہ ضعف حدیث کا شدید نہ ہو، اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث کسی عام اصل کے تحت شامل ہو، مندرج ہو، اور تیسری شرط یہ ہے کہ اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ کیا جائے، یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ حدیث ثابت ہے، بلکہ صرف یہ تصور اور خیال ہو کہ ہم احتیاطاً ایسا کہہ رہے ہیں کہ حدیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے احتیاط واجتناب ضروری ہے اور محدثین نے اور ائمہ جرح وتعدیل نے جن تفصیلات اور جن شرائط وضوابط کے ساتھ حدیث ضعیف پر عمل کی اجازت دی ہے، ان شرائط کی رعایت کرتے ہوئے حدیث ضعیف پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم

میرے سامنے کوئی سوال نہیں ہے، بلکہ مختصر دو ملاحظات ہیں، پہلی چیز تو یہ کہ عرض مسئلہ سے میں نے جہاں تک سمجھا ہے زیادہ تر مقالہ نگاروں نے ضعیف حدیثوں کے قبول وعدم قبول کے سلسلہ میں طرق روایت پر زور دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ سلسلہ روایات کے علاوہ درایت کو بھی ہمیں اپنے سامنے رکھنا چاہئے جو ایک دوسرے طریقہ سے ضعیف احادیث کو جانچنے کا، اس کو قبول یا عدم قبول کے سلسلہ میں فیصلہ کرنے کا۔

دوسری چیز میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فضائل کے سلسلہ میں عام طور سے یہ رائے ہے کہ اس سلسلہ میں ضعیف احادیث کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن میں ایک وارننگ یا تحذیر آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کے فضائل پر عمل کرنے سے قوی احادیث جو فضائل کے سلسلہ میں آئی ہیں چھوٹ جاتی ہیں، اس کی مثال میں اپنے مضمون معاشیات سے دیتا ہوں، معاشیات میں ایک اصول ہے کہ برا سکہ اچھے سکے کو ختم کردیتا ہے، اگر کسی وقت میں ایک ساتھ دو سکے چل رہے ہوں ایک کی دھات اچھی ہو دوسرے کی خراب، لیکن ان کی ظاہری ویلیو ایک ہی ہو تو دھیرے دھیرے جو اچھا سکہ ہوتا ہے وہ ختم ہوجاتا ہے، سونا تو دبالیں گے چاندی سرکولیشن میں رہ جائے گا، یہی حال احادیث کا بھی ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تسبیحات پڑھ لینے سے کچھ وظائف کرلینے کا حج وعمرہ کا ثواب ہے، یا جہاد کا ثواب ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو جو مشقت وتکالیف کے ساتھ جن ثواب کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی چاہئے ان سے نظر ہٹ جاتی ہے، یہ پہلو ہمارے سامنے رہنا چاہئے۔

نام معلوم نہیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرا بہت ہی مختصر سا سوال ہے کہ ضعیف حدیث اگر متعدد طرق سے منجبر ہو تو وہ حسن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، یہ چیز تو تقریباً مسلم ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی خاص مسئلہ میں حدیث صحیح یا حدیث حسن موجود ہو اور ٹھیک اس کے متوازی حدیث ضعیف منجبر بتعدد الطرق بھی موجود ہو تو کس کو ترجیح حاصل ہوگی؟ حدیث صحیح یا حدیث حسن کو؟ جو خارجی واضافی تائید کے بغیر مستدل بننے کے لائق ہے یا پھر حدیث ضعیف کو جو تعدد طرق کے بعد لائق اعتناء بنی ہے، میرا بس یہی سوال ہے۔

ایک آواز

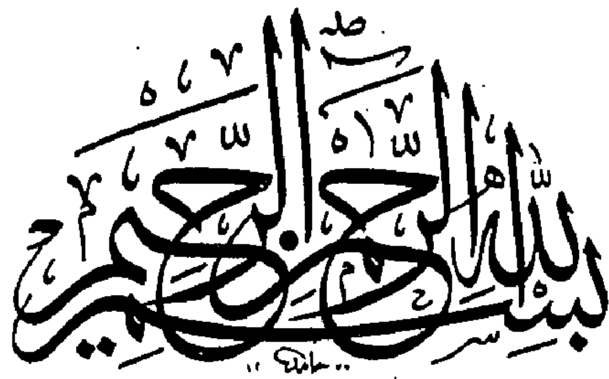
صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ اور یہ چاروں قسمیں باہم مراتب رکھتی ہیں جس ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے وہی ترتیب ان کی ہے اور تعارض کے متعلق یہ ضابطہ معروف ہے یہ کوئی استفسار کی چیز بھی نہیں تھی کہ جب دو دلیلیں جن میں فرق مراتب ہوگا کسی مسئلہ میں متعارض ہوں گی تو جو دلیل قوی ہوگی وہ لائق احتجاج وراجح ہوگی، حسن لذاتہ کو حسن لغیرہ پر ترجیح ہوگی، لیکن ایک بات یہ ذہن میں رکھی چاہئے کہ خود حافظ ابن حجر وغیرہ نے بھی وضاحت کی ہے کہ بسا اوقات سند کی جو اصل حیثیت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے حدیث پر جو حکم لگتا ہے اس کے ساتھ دوسرے قرائن جب جمع ہو جاتے ہیں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ سند کی بنیاد پر قوت رکھنے والی حدیث کے مقابلے میں کمتر حدیث کو ترجیح دیدی جائے، "نزہۃ الخواطر" وغیرہ میں اس کی وضاحت موجود ہے، اس لیے کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حسن لغیرہ کو ایک ایسی حدیث پر جو تنہا حسن لذاتہ ہے ترجیح دے دی جائے اگر کوئی اور قرینہ پایا جائے۔

مفتی عزیز الرحمٰن چمپارنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابھی ڈاکٹر عبدالعظیم صاحب نے جو سوال اٹھایا تھا کہ جو دوسرے موضوع تھے وہ سماجی ضرورتوں کے تحت ضروری معلوم ہوتے ہیں کہ اس پر تحقیق کی جائے، لیکن حدیث کی ضعف کا جو موضوع مقرر ہوا ہے اس کی کیا ضرورت تھی؟ اصل میں جس طرح ایک دور میں یہ فتنہ تھا کہ وضاعین حدیث اپنے عقائد باطلہ اور آراء فاسدہ کی تائید کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے اور اس کو اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے تھے، میرا جہاں تک خیال ہے کہ یہ دور بھی کچھ اس طرح کا فتنہ لے کر آیا ہے، اباحیت پسندی کا، یا اپنے موقف کی تائید میں بغیر سوچے احادیث سے استدلال اور جو اصحاب جرح وتعدیل کی آراء ہیں ان پر نظر کیے بغیر، محدثین نے جو اصول مقرر کئے ہیں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے، صرف یہ کہ ہمارے موقف یا ہماری رائے کے خلاف یہ روایت ہے، اس لیے اس کو کم سے کم موضوع قرار دے دیا جائے، اس طرح کا رجحان بھی ہمارے یہاں بڑی تیزی سے پنپ رہا ہے، اس لیے اس طرح کے موضوع مقرر کرنے کی وجہ بھی ہے، اور ضرورت بھی، دوسرا سوال طالب علمانہ استفسار کے طور پر ہے وہ یہ ہے کہ احادیث کے سلسلہ میں ہم ضعف کا یا قوت کا صحت کا یا وضع کا جو حکم لگاتے ہیں اس میں بڑی پیچیدگی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب اصحاب جرح وتعدیل کی آراء کا ہم تتبع کرتے ہیں تو بسا اوقات کسی ایک ہی راوی کے سلسلہ میں کسی کا قول کچھ ہے، کسی کا قول کچھ ہے، مثال کے طور پر یہ روایت جو "ایما امرأۃ نکحت نفسھا بغیر اذن ولیھا" ہے یا "لا نکاح الا بولی" یا "لا تزوج المرأۃ المرأۃ"، وغیرہ، ان ہی روایتوں کو آپ دیکھ لیں کہ اس میں اصحاب جرح وتعدیل کی آراء میں کتنا تعارض معلوم ہوتا ہے تو کیسے ہم فیصلہ کریں اور کس کی رائے پر ہم اعتماد کریں یہ ایک قابل غور چیز ہمارے سامنے آرہی ہے۔

....



عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

حدیث ضعیف
اصول و احکام

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ٥ ایم اے جناح روڈ ٥ کراچی پاکستان

پیش لفظ

احکام شریعت کا سب سے بڑا ماخذ حدیث نبوی ہے، حدیث سے مراد وہ تمام باتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں، جو باتیں آپ ﷺ سے منقول ہیں اپنے ثبوت واستیناد کے اعتبار سے ایک درجہ کی نہیں ہیں، کیونکہ بعض بد دین لوگوں نے اسلام کی شناخت کو نقصان پہنچانے کی نیت سے یا کسی اور مقصد کے تحت حدیث کے صاف وشفاف مواد میں اپنی من گھڑت باتیں بھی شامل کر دی ہیں، اس لئے محدثین کو ایک مستقل فن اسماء الرجال وجود میں لانا پڑا جن میں راویوں کے احوال سے بحث کی جاتی ہے کہ وہ اپنی دین داری اور قوت حفظ کے اعتبار سے کس حد تک قابل اعتبار ہیں اور کہاں تک ان کی بات کا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک اہل علم کے ایک طبقہ نے سند حدیث کو پرکھنے کی کوشش کی اور رواۃ کے مقبول اور نامقبول ہونے کے سلسلے میں اصول وقواعد مقرر کئے، وہیں کچھ اہل علم نے از روئے درایت حدیث کے متون کا جائزہ لیا اور قرآن مجید، آثار صحابہ، دین کے مسلمہ اصول وقواعد اور شریعت کے بنیادی مقاصد، نیز دوسرے قرائن کی روشنی میں اس بات کو طے کیا کہ کون سی حدیثیں مقبول ہیں اور کون سی نامقبول؟ کیونکہ نہ صحت سند صحت حدیث کو مستلزم ہے اور نہ ضعف سند حدیث کے نامقبول ہونے کو، پہلی خدمت زیادہ تر علماء حجاز نے کی اور دوسرے پہلو پر زیادہ توجہ علماء عراق نے کی۔

عصر حاضر میں حدیثوں کے مقبول اور نامقبول ہونے کے سلسلے میں افراط وتفریط کی کیفیت ہے، ایک طرف وہ واعظین علماء ومشائخ ہیں جو بے تکلف انتہائی ضعیف نامقبول اور موضوع روایتیں بھی نقل کرتے جاتے ہیں، انہوں نے فضائل وآداب میں ضعیف روایت کے معتبر ہونے کا مطلب یہ سمجھا کہ ہر طرح کی بے سروپا روایتیں نقل کی جائیں، دوسری طرف کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے ضعیف کو موضوع کا مترادف سمجھ لیا اور یہ خیال کرنے لگے کہ گویا ضعیف روایتیں دریابرد کردیئے جانے کے لائق ہیں، حالانکہ ضعیف بمعنی غیر معتبر ہونے کے نہیں ہیں، یہ ایک اصطلاح ہے، خود ضعیف حدیث میں بھی مقبول اور نامقبول ہونے کے اعتبار سے مختلف درجات ہیں، بعض حدیثیں اصطلاحی اعتبار سے ضعیف ہوتی ہیں لیکن دوسرے قرائن سے درجہ اعتبار حاصل کر لیتی ہیں، تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں، ہم لوگ جن روایات وواقعات کو بلا چوں چرا مان لیتے ہیں ان سے کہیں بڑھ کر ان ضعیف احادیث کا درجہ ہوتا ہے، اس لئے صرف اس وجہ سے کسی حدیث کو نامعتبر سمجھ لینا کہ کسی محدث نے اس کو ضعیف کہا ہے، حد یہ ہے کہ ایک بڑے ذخیرہ سے اپنے آپ کو محروم کر لینے کے مترادف ہے۔

جیسے وضع حدیث ایک فتنہ ہے، اسی طرح ان احادیث کا انکار جن کو سلف صالحین قبول کرتے آئے ہیں، بھی ایک فتنہ ہے، اسی پس منظر میں فاضل گرامی محبی فی اللہ حضرت مولانا مفتی محمد عبید اللہ اسعدی زید مجدہم نے حدیث ضعیف کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور اس سلسلے میں اصولی گفتگو کرتے ہوئے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو نہ صرف طلبہ بلکہ اکثر اوقات اساتذہ کی نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں، اس سے پہلے بھی ......التحفة المرضية، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے "الرفع والتكميل، الأجوبة الفاضلة" میں اس پر چشم کشا بحث کی ہے، پھر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن کے مقدمہ میں اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم کے مقدمہ میں اس موضوع کو آگے بڑھایا ہے اور ماضی قریب کے عظیم محدث وفقیہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اپنی تعلیقات کے ذریعہ اس عنوان کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے، مولانا اسعدی صاحب نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ان تمام مباحث کا عطر کشید کر کے تسہیل وتیسیر کے ساتھ اس موضوع کو پیش کیا ہے، جو ہر صاحب علم کے پڑھنے کے لائق ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس اہم موضوع پر یہ اہم تالیف اکیڈمی کے تعاون سے منظر عام پر آرہی ہے، مولانا محمد عبید اللہ اسعدی صاحب زید مجدہم حدیث وفقہ دونوں موضوع سے گہری مناسبت رکھتے ہیں، اردو عربی میں ان کی کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں اور ان تحریروں نے اہل علم کے درمیان پذیرائی حاصل کی ہے، وہ جہاں اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے سکریٹری برائے سمینار ہیں تو وہیں جامعہ عربیہ باندہ کے شیخ الحدیث بھی ہیں اور طویل عرصہ سے علوم اسلامی کی اہل کتابوں کا درس دے رہے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے، نیز غلط فہمیوں کو دور کرنے اور شکوک وشبہات کے کانٹوں کو نکالنے کا ذریعہ بنائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی / (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی)

۸ رمحرم الحرام ۱۴۳۵ھ / ۱۳ رنومبر ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مؤلف

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

أما بعد!

آج کل کے بے اعتدالی کے شکار ذہن ومزاج نے عوامی چیزوں کو خواص میں پہنچا دیا ہے اور علمی چیزیں جو خواص کے دائرہ کی ہیں ان کو عمومی بنا کر ایک بڑے فساد کا دروازہ کھول دیا ہے۔

ایک حلقہ اس کثرت سے احادیث کی نسبت سے صحیح وضعیف کی بات کرتا ہے اور صرف ان دو کی، اور ایک پر عمل، دوسری کا رد کہ ایک عامی آدمی یوں کہتا نظر آتا ہے:

''ہندوستان، پاکستان وبنگلہ دیش کی سب حدیثیں ضعیف ہیں''۔

آدمی ''حدیث'' کی اصطلاحی تعریف نہیں جانتا اور صحیح وضعیف کی بات کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ یہ فنی امور واصطلاحات ہیں۔

بہر حال اس ذہن نے یہ تصور عام کر دیا ہے کہ حدیث ضعیف اور موضوع ایک ہی ہیں کوئی فرق نہیں حالانکہ جیسے صحیح وضعیف میں ہمیشہ فرق کیا گیا۔ ضعیف وموضوع میں بھی فرق کیا گیا، اصول حدیث کی کوئی کتاب اٹھایئے یا جہاں بھی یہ فنی بحث ہو دیکھئے آپ کو فرق ملے گا۔

اور بات اہم ہو جاتی ہے جب اہل علم کے حلقہ وزمرہ میں شمار ہونے والے لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔

اسی کے پیش نظر ضرورت کا احساس کر کے یہ تحریر تیار کی گئی جو اصلاً عربی میں ہے جس کی جلد ہی تیسری اشاعت، انشاء اللہ نئی ترتیب واضافہ کے ساتھ سامنے آنے والی ہے۔

یہ تحریر اس عربی تحریر کا اردو خاکہ ہے کچھ ردو بدل اور حذف واضافہ کے ساتھ۔ حق تعالی سے دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کو اپنے طالبین حق بندوں کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے اور احقر نیز اس کے بزرگوں کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔

احقر ''ایفا پبلی کیشنز'' کا مشکور ہے کہ اس نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی ہے۔

محمد عبید اللہ الاسعدی / ہتورا باندہ

۲۸ / جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ / ۲۱ / اپریل ۲۰۱۲ء

باب اول

(الف)

حدیث ضعیف

۱-تعریف:

حدیث ضعیف وہ حدیث کہلاتی ہے جس کے اندر حدیث حسن کی صفت بھی نہ پائی جائے اس وجہ سے کہ اس میں حسن کے لئے مطلوب شرائط میں سے کوئی مفقود ہو۔ (تیسیر مصطلح الحدیث ص ۶۳)

عراقی کا قول ہے: ضعیف وہ حدیث ہے جو مرتبہ حسن کی نہ ہو (فتح المغیث ص: ۱۴)۔

۲-ضعیف ومردود:

''نخبۃ الفکر ونزہۃ النظر'' میں مردود کی تعریف یوں کی گئی ہے: مردود وہ حدیث ہے جس کے مخبر کا صدق راجح نہ ہو اس بنا پر کہ اس کے اندر قبول کے لئے مطلوب شرائط میں سے ایک یا چند یا اکثر موجود نہ ہوں۔ (نزہۃ مع النخبۃ ص: ۲۶)

اسی وجہ سے ڈاکٹر محمود طحان نے ضعیف کی توضیح وتشریح مردود سے کی ہے (تیسیر مصطلح الحدیث ص: ۶۱)۔

اوپر ذکر کردہ ضعیف ومردود دونوں کی تعریفات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ضعیف ومردود باہم متحد ومترادف ہیں کیونکہ اہل فن جب کسی حدیث کو مردود کہتے ہیں تو اس کے اصل اور اوّلی اطلاق میں ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کو انہوں نے سرے سے رد کر دیا ہے اور چھوڑ دیا ہے بلکہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''یہ ایسی حدیث ہے جو صحیح وحسن کی طرح قبولیت ومقبولیت نہیں رکھتی۔ اور بسا اوقات یہ مراد ہوتا ہے کہ اہل فن کو اس میں توقف ہے، اور غور وفکر کے بعد وہ اس کی بابت کوئی رائے قائم کرتے ہیں، خواہ یہ رائے اس کو سرے سے چھوڑ دینے کی اور اعراض کی ہو یا قبول واعتبار کی''۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''نخبہ'' میں اخبار آحاد سے متعلق یہ فرمایا ہے: اخبار آحاد مقبول بھی ہیں اور مردود بھی، بعد میں اس کی شرح وتوضیح کرتے ہوئے اخیر میں فرمایا ہے:

''جب کسی حدیث پر عمل کے حق میں توقف کیا جائے تو وہ مردود کی طرح ہوتی ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اس کے اندر رد کی صفت پائی جارہی ہے بلکہ اس وجہ سے اس کے اندر قبول کی موجب صفت موجود نہیں ہے'' (نزہۃ مع النخبہ ص: ۲۶)۔

اسی لئے ڈاکٹر محمود صاحب ''ضعیف'' کی بابت فرماتے ہیں:

''ضعیف مردود کا عام نام ہے'' (تیسیر مصطلح الحدیث ص: ۶۱)۔

اور انہوں نے مردود کی اقسام کے متعلق اسی انداز کا کلام کیا ہے، جیسا کہ اہل فن ضعیف کی انواع سے متعلق کیا کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''علماء نے خبر مردود کی بہت سی اقسام کی ہیں اور ان میں سے بہت سی اقسام کے لئے خاص نام ذکر کئے ہیں، اور بعض کے لئے کوئی خاص نام اختیار نہیں کیا ہے بلکہ عام نام ذکر کیا ہے اور وہ ''ضعیف'' ہے (ایضاً)۔

۳- حدیث ضعیف کی انواع:

پیچھے یہ بات گذر چکی ہے کہ مردود کی انواع ہی ضعیف کی انواع ہیں، اس لئے کہ دونوں مترادف ہیں اس لئے کہ ضعف ورد کے لئے دو میں سے ایک سبب کا بنیادی طور پر اعتبار کیا جاتا ہے یا سند سے سقوط (کسی ایک) یا چند یا کل روایت کرنے والوں کا یا راوی کے اندر کوئی عیب جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ (نزہۃ النظر ص: ۳۹-۴۰)۔

یہی دو بنیادی سبب ہیں جن کی طرف فی الجملہ سارے اسباب ضعف ورد راجع ومتعلق ہوتے ہیں۔

حافظ ابن صلاح نے ضعیف کی ۴۲ اقسام بتائی ہیں اور مناوی کا کہنا ہے کہ وہ عقلاً ۱۲۹ ہیں (تدریب الراوی ۱/۱۷۹)۔

اور بعض نے کافی توسع کرتے ہوئے سینکڑوں اقسام ذکر کی ہیں (منہج النقد عند المحدثین ص: ۲۸۷)۔

۴- حکم:

حدیث ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے کے حق میں توقف کیا جائے اور غور کیا جائے کہ کیا کوئی جہت وصفت ایسی ہے کہ جو اس کو قابل قبول قرار دیتی ہے اور اس کا تقاضا کرتی ہے اور اس پر عمل کا یا ایسا نہیں ہے؟

کیونکہ اس کی ساری انواع ضعف میں ایک مرتبہ کی نہیں بلکہ ان میں رواۃ کے اندر پائے جانے والے ضعف کی شدت وخفت کے اعتبار سے، نیز بعض دوسری وجوہ سے فرق مراتب پایا جاتا ہے، چنانچہ بعض کو ضعیف، بعض کو شدید الضعف، بعض کو واہی یا منکر وغیرہ کہتے ہیں اور اس کی بدترین قسم موضوع ہے۔ (تدریب الراوی ۱/۹۸)۔

اسی وجہ سے اس قبیل کی بعض احادیث مقبول قرار پاتی ہیں اور اس درجہ کو بھی پہنچ جاتی ہیں کہ اہل فن اس کو حسن کی دوسری قسم قرار دیتے ہیں اور اسی طرح بعض رد کردی جاتی ہیں اور اس طور پر کہ عام حالات میں اور بغیر کسی تفصیل کے اس کی روایت جائز نہیں ہوتی جیسے موضوع۔

اور یہ سب ائمہ فن کی تصریحات اور محققین کی توضیحات سے ظاہر ہے مثلاً حافظ ابن القیم علیہ الرحمہ نے ضعیف کی اس قسم کو بیان کرتے ہوئے جس کو امام احمد علیہ الرحمہ قیاس پر مقدم رکھتے ہیں، فرمایا ہے:

امام احمد نے اس موقع وسباق میں ضعیف سے اس حدیث کو مراد نہیں لیا ہے جو باطل ہو یا منکر ہو یا اس کے رواۃ میں کوئی ایسا متہم راوی ہو کہ جس کی روایت کو قبول کرنا جائز نہ ہو بلکہ ان کے نزدیک یہ ضعیف صحیح کی قسیم (یعنی بالمقابل ایک قسم) ہے جو کہ حسن کی ایک قسم ہے، اور پہلے یہ حدیث کی (تین اقسام) صحیح، حسن، ضعیف کی تقسیم کے ساتھ نہیں کی جاتی تھیں بلکہ صرف (دو قسمیں) صحیح وضعیف، اور ضعیف ان کے نزدیک مختلف مراتب کی تھی'' (اعلام الموقعین ۱/۲۱)

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: ''حسن کا آخری مرتبہ، ضعیف کا اولین مرتبہ ہے'' (الموقظہ ص: ۲۳)۔

اور شیخ محسن یمانی اپنے رسالہ ''التحفۃ المرضیۃ'' میں فرماتے ہیں:

''حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جو مقبول کی کسی شرط سے خالی ہو اور مقبول صحیح وحسن سے عام ہے اور اس کے عام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مفہوم میں بہت سے افراد کی شرکت درست ہے، کیونکہ قبول صحیح وحسن پر بھی صادق آتا ہے اور ان دونوں کے علاوہ پر بھی'' (الاجوبۃ الفاضلۃ، التعلیقات ص: ۲۶۸)۔

۵- حدیث ضعیف کی روایت اور اس پر عمل کا حکم:

حدیث ضعیف کی روایت کا کیا حکم ہے؟ اس کی تفصیل موضوع کی روایت کے حکم کے ساتھ آ رہی ہے۔

اور جہاں تک سوال ہے اس پر عمل کا، تو آئندہ چار ابواب کا تعلق اسی امر سے ہے۔

(ب)

موضوع

۱- تعریف:

حدیث موضوع: ایسا مضمون ہے جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خلاف واقع وجھوٹ کی جائے (تیسیر مصطلح الحدیث ص:۸۸)۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''حدیث موضوع محدثین کی اصطلاح میں ایسی حدیث ہے جس کا صدور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہ ہوا ہو، نہ قولاً، نہ فعلاً، اور نہ تقریراً، اور اس کی نسبت آپ کی طرف کی جائے، خواہ خطأً یا عمداً ہو یا جہالت یا عناد کی بنیاد پر'' (لمحات من تاریخ السنہ وعلوم الحدیث ص:۴۱)۔

اور احقر یہ سمجھتا ہے کہ موضوع کی تعریف یوں کی جانی چاہئے:

''حدیث موضوع ایسا کلام ہے جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خلاف واقع وحقیقت ہو یا ایسا کلام کہ جس کی نسبت آپ کی طرف قطعی طور پر یا کسی طور سے جائز نہ ہو''۔

یہ بات اس لئے کہی جارہی ہے کہ حدیث موضوع کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کا مضمون محض من گڑھت اور خالص جھوٹ ہو بلکہ اس کا مضمون کبھی ثابت بلکہ صحیح بھی ہوتا ہے لیکن یہ ثبوت وصحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ کسی دوسرے سے متعلق ہوتا ہے، بلکہ کبھی آپ کی طرف نسبت ضعف کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کو قوت کی شکل دیدی جاتی ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

۲- موضوع حدیث کو حدیث کہنا:

جس حدیث کے موضوع ہونے کا علم ہو اس کے لئے ''حدیث'' کے لفظ کا استعمال کیا حیثیت رکھتا ہے؟

اس بابت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں:

''موضوع کو حدیث سے موسوم کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے— کہ یہ درست ہے— کیونکہ لغوی معنی کی رو سے وہ بھی حدیث ہے (اس لئے کہ حدیث کے لغوی معنی بات وگفتگو کے ہیں)، پھر جس نے اس کو وضع کیا ہے اس کے خیال وعمل کے مطابق وہ اصطلاحی طور پر حدیث ہے، اسی طرح جب تک بحث وجستجو سے اس کی حقیقت واضح نہ ہو وہ حدیث ہی ہے اور حدیث کہلائے گی اگرچہ وہ اصطلاح کی رو سے حقیقت میں حدیث نہیں ہے'' (لمحات من تاریخ السنہ ص:۴۱)۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب امر کے لئے حدیث کا لفظ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث میں آیا ہے حتی کہ مسلم کی ایک روایت میں موضوع امر کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے جبکہ اس کی نسبت آپ کی طرف جائے (روایات کے لئے ملاحظہ ہو درس ترمذی ۱/۲۰)۔

مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں:

''من حدث عني بحديث يرى أنه كذب فهو أحد الكاذبين''۔ (مسلم مقدمہ باب وجوب الرواية من الثقات)۔

(جو آدمی مجھ سے کوئی ایسی بات نقل کرے جس کو وہ جھوٹ سمجھتا ہے تو وہ بھی ایک جھوٹا ہے)۔

۳-وضع کی صورتیں وشکلیں:

حدیث موضوع کا مضمون کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیان کرنے والے کا گڑھا ہوا اور ایجاد کیا ہوا ہوتا ہے اور ایسا کرنے والا اس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کردیتا ہے۔ احادیث موضوعہ کا اکثر حصہ اسی قسم کا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسی حرکت کرنے والا دوسرے کے کلام کو لے کر نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کردیتا ہے، غیر کوئی بھی ہوسکتا ہے، صحابی، یا تابعی، یا کوئی دوسرا، حکماء وغیرہ میں سے یا وہ مضمون اسرائیلیات وغیرہ کے قبیل کا ہوتا ہے اور آدمی اس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتا ہے۔

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والا کسی ضعیف السند حدیث کو لے کر کسی اچھی سند کے ساتھ اس کو بیان کرتا ہے تاکہ اس کو رواج وقبولیت کے مرحلہ میں لایا جاسکے جیسا کہ آدمی سے کبھی خطأً وغلطی کی بنیاد پر بھی ایسا ہوجاتا ہے کہ وہ نسبت کر بیٹھتا ہے جبکہ ایسا ہوتا نہیں ہے، اس کو بھی حدیث موضوع کہہ دیا کرتے ہیں

(نزھۃ النظر ص: ۴۵ ولمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث ص: ۴۲)۔

۴-حدیث موضوع کی حیثیت ومقام:

حدیث موضوع، احادیث ضعیفہ ومردود کی ایک قسم ہے جیسا کہ عام طور سے محدثین اور علماء اصول حدیث نے ذکر کیا ہے اور احادیث ضعیفہ کی بدترین اور سب سے خراب قسم ہے۔

بعض حضرات کی رائے تو یہ ہے کہ یہ ایک مستقل قسم ہے ضعیف اور اس کی انواع سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(تدریب الراوی ۱/ ۹۸ وتوجیہ النظر ص: ۲۵۷)۔

۵-عام ضعیف احادیث کی روایت کا نیز موضوع کی روایت کا حکم:

علامہ ابن صلاح علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''جان لو کہ حدیث موضوع احادیث ضعیفہ میں سب سے بدتر ہے، اور جو شخص اس کے حال سے واقف ہو اس کے لئے اس کا روایت کرنا جائز نہیں خواہ کسی بھی مضمون سے اس کا تعلق ہو البتہ اگر وہ اس کی حالت وحیثیت کا بھی ساتھ میں تذکرہ کرے تو اس کو روایت کیا جاسکتا ہے۔

جبکہ دوسری احادیث ضعیفہ جو اپنے اندر کچھ وقوع وسچائی کا امکان واحتمال رکھتی ہیں ان کا حکم مختلف ہے کہ ان کو ان کی حیثیت کی وضاحت کے بغیر بھی روایت کیا جاسکتا ہے'' (مقدمہ ابن صلاح ص: ۴۷)۔

اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ''التقریب'' میں فرماتے ہیں:

''محدثین کے نزدیک ضعیف اسانید واحادیث کے حق میں تساہل کی گنجائش واجازت ہے، اور موضوع کے ماسوا کسی بھی ضعیف کو روایت کیا جاسکتا ہے، اور اس پر عمل کی بھی گنجائش ہے اگرچہ اس کے ضعف کو ذکر نہ کیا جائے'' (التقریب مع التدریب ۱/ ۲۹۸)۔

عراقی نے ''الفیۃ الحدیث'' کی شرح میں فرمایا ہے:

''محدثین کے نزدیک ضعیف اسانید واحادیث کے حق میں تساہل کی گنجائش واجازت ہے اور موضوع کے ماسوا کسی بھی ضعیف کو روایت کیا جاسکتا ہے، اور اس پر عمل کی بھی گنجائش ہے اگرچہ اس کے ضعف کو ذکر نہ کیا جائے'' (التقریب مع التدریب ۱/ ۲۹۸)۔

عراقی نے ''الفیۃ الحدیث'' کی شرح میں فرمایا ہے:

''محدثین نے غیر موضوع کی سند وروایت میں تساہل وتوسع کی اجازت دی ہے اگرچہ وضاحت نہ کی جائے''

(الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۳۹، شرح الالفیۃ ۲/ ۲۹۱)۔

علامہ شامی نے ''ردالمحتار'' میں علامہ طحطاوی سے اس بابت جو کچھ نقل کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

''موضوع حدیث کو اس کا حال وحیثیت ذکر کئے بغیر بیان کرنا حرام یا کفر ہے، کیونکہ اس بابت وعید مشہور ہے'' (ردالمحتار ۱ر ۲۵۲)۔

۶-حدیث ضعیف کی روایت کے الفاظ:

علماء نے صراحت کی ہے:

''اگر کوئی آدمی کسی ضعیف حدیث کو سند کے بغیر روایت کرنا چاہے یا جس حدیث کی صحت وضعف میں شبہ ہو اس کو روایت کرنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ وہ جزم (پختگی کے الفاظ اور معروف) کا صیغہ استعمال نہ کرے، بلکہ ضعف کی طرف اشارہ کرنے والے الفاظ، یعنی مجہول کا لفظ وصیغہ استعمال کرے—مثلاً: ''روایت کیا جاتا ہے'' اور ''روایات میں آیا ہے''، یا ''وارد ہوا ہے''—وغیرہ (تیسیر مصطلح الحدیث ص: ۶۵) (یعنی یوں نہ کہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے)۔

۷-موضوع پر عمل کا حکم:

گذشتہ تفصیلات سے یہ واضح ہے کہ حدیث موضوع پر عمل کا کیا حکم ہے؟ جب اہل فن نے اس کی اجازت نہیں دی کہ بغیر ضرورت اور بغیر وضاحت حدیث موضوع کی روایت کی جائے تو اس پر عمل کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے، چنانچہ علماء نے اس کی صراحت بھی کی ہے کہ موضوع پر عمل جائز نہیں ہے۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ حصکفی نے ''درمختار'' کے اندر حدیث ضعیف پر عمل کے جواز اور اس کے شرائط کے تذکرہ کے ساتھ فرمایا ہے:

''موضوع پر عمل کسی حال میں جائز نہیں ہے اور نہ اس کی روایت بغیر بیان ووضاحت کے جائز ہے'' (درمختار ۱ر ۲۵۲)۔

علامہ شامی نے اس پر وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''فضائل اعمال میں بھی اس کی اجازت نہیں ہے'' (ردالمحتار ۱ر ۲۵۲)۔

اور اسی کے ساتھ علامہ طحطاوی نے جو موضوع پر عمل کی بات ذکر کی ہے کہ جب کہ موضوع کسی اصل سے متعلق ہو جیسا کہ ضعیف کا حکم ہے (الطحطاوی علی الدر)، تو علامہ شامی نے اس کی تردید کی ہے (ردالمحتار ۱ر ۲۵۲)۔

اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں:

''موضوع کو کسی اصل خاص یا عام کے تحت داخل کرنا جائز نہیں ہے اور علامہ طحطاوی کا مذکورہ قول بالکل قابل التفات نہیں ہے''

(التعلیقات علی قواعد فی علوم الحدیث ص: ۵۸)۔

۸-انتہائی قابل لحاظ امر:

موضوع وضعیف کے درمیان فرق

گذشتہ مختصر تفصیل—ضعیف وموضوع کی تعریف اور روایت وعمل کے حکم—سے یہ واضح ہے کہ اگرچہ موضوع کو ضعیف کی ایک قسم قرار دیا جاتا ہے، لیکن دونوں ہم معنی وہم مفہوم نہیں کہ کسی حدیث کو ضعیف کہنے کا مطلب یہ ہو کہ یہ موضوع اور بالکل قابل ترک ہے۔

ضعیف کے مفہوم میں عموم ہے، اور اس کی بہت سی اقسام ہیں لہذا کسی حدیث کو جب ضعیف کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل سوچ سمجھ کر اور غور وفکر کے بعد ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ بس اب اس سے بالکل آنکھیں بند کرلو۔

البتہ جب کسی حدیث کے حق میں موضوع ہونا طے وراجح ہو تو اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ بس اب اس سے دور رہو، روایت بھی نہ کرو، اور عمل کی تو اجازت ہی نہیں ہے۔

۹- متہم بالوضع راوی کی روایت اوراس کا حکم:

رواۃ حدیث کی ایک تعداد ہے جن کے حق میں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ وضع الحدیث (گڑھنے) کے ساتھ متہم ہیں۔ اور متہم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مذکورہ حدیث جس کی سند میں ایسا راوی ہے وہ موضوع ہے اور اس کے حق میں گڑھا ہوا ہونا ثابت ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راوی یہ حرکت کرنے والا ہے اور اس کی روایت کے حق میں اس کا احتمال رہتا ہے۔

ایسی صورت میں کیا روایت کو موضوع قرار دیا جائے؟ تو بعض حضرات کا نقطۂ نظر تو یہی ہے کہ وہ اس بنیاد پر روایت کو موضوع اور قابل ترک وصرف نظر قرار دیتے ہیں۔

لیکن محققین کے نزدیک جیسے حدیث ضعیف کا حکم مطلق اعراض کا نہیں بلکہ تحقیق ونظر ہے، پھر کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جس حدیث کی سند میں کوئی متہم بالوضع راوی ہو اس کا حکم بھی یہی ہے کہ غور وفکر کے بعد فیصلہ کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں محققین فن کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ ایسی احادیث پر بھی — حسب موقع — اعتماد کرتے ہیں جن کی سندوں میں ایسے راوی پائے جاتے ہیں جن کے حق میں اتہام وضع کا عیب ذکر کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اہل فن جنہوں نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ اپنے علم کی حد تک اپنی کتابوں میں موضوع احادیث یعنی وہ احادیث ذکر نہ کریں جن کے حق میں وضع کا حکم وفیصلہ ثابت ہے اور ان اہل فن کی عظمت ومحنت کی بنا پر اہل نظر اپنی نظر کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ان کتابوں میں کوئی موضوع حدیث نہیں ہے اور ان مصنفین نے ایسی روایات کو عمل کی غرض سے ذکر کیا ہے، البتہ استقلالی حیثیت میں نہیں بلکہ — تائید واستشہاد — یعنی تقویت کی جہت سے۔

۱۰- ایسی روایات ذکر کرنے والے بعض ائمہ فن:

ایسے حضرات میں امام عبدالرزاق صنعانی ہیں، ان کی معروف کتاب ''مصنف'' میں اس قسم کی روایات بہت آتی ہیں۔

اسی طرح امام ترمذی کی ''سنن وجامع'' کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے رواۃ آئے ہیں۔

(ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں: ''میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ امام ترمذی نے کسی ایسے راوی کی حدیث تنہا اسی سے اور اسی کی سند سے لی ہو جو متہم بالوضع ہو اور اس کے حق میں اس عیب پر اتفاق ہو، البتہ وہ ایسی احادیث ضرور ذکر کرتے ہیں جس کے متعدد طرق ہوں اور کسی طریق میں ایسا راوی موجود ہو۔ (التعلیقات الفاضلہ ص: ۹۷)۔

بعد کے حضرات جنہوں نے تحقیق ونظر کے بعد انتخابی مجموعے تیار کئے ہیں یا احادیث کو اپنی شروح وکتب کے اندر ذکر کیا ہے ایسے حضرات میں منذری، نووی، ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ ہیں۔

(اس قسم کی کتابوں اور ایسے حضرات سے متعلق ملاحظہ ہو: ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' سوال دوم مع جواب اور کتاب پر شیخ عبد الفتاح ابوغدہ کی تعلیقات ص: ۱۱۷-۱۳۲)۔

۱۱- وضع کا حکم چند امور کا محتاج ہے:

اہل فن واہل تحقیق حدیث موضوع کے بیان میں صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ موضوع کی تعریف وصورت سے بیان کے ساتھ مزید کسی تفصیل کے بغیر احادیث موضوعہ کا تذکرہ کریں۔

بلکہ اس کے ساتھ انہوں نے اہتمام کے ساتھ کچھ قرائن کا بھی تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ کسی حدیث کو موضوع قرار دینے کے لئے ان قرائن کا پایا جانا اور ان کا دیکھا جانا ضروری ہے، اس کے بعد ہی کسی حدیث پر وضع کا حکم لگ سکتا ہے اور انہوں نے اپنی کتابوں وفیصلوں میں اس بات کو سامنے بھی رکھا ہے۔

اور کسی حدیث میں غور وفکر کے بعد اگر اس قسم کے قرائن ان کو نہیں ملتے تو وہ حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے اس کے لئے ضعیف کا حکم ومعاملہ

اختیار کرتے ہیں اس کو موضوع نہیں کہتے۔

چنانچہ ائمہ فن نے ہر زمانے میں اس کی صراحت کی ہے کہ کسی حدیث سے متعلق وضع کا حکم راوی کے متہم بالوضع ہونے کے ساتھ بعض دوسرے امور وقرائن کے ساتھ بھی مقید ہے اور کسی حدیث کو محض راوی کے متہم بالوضع ہونے کی بنا پر اگر کسی نے موضوع کیا ہے تو انہوں نے اس کی تردید کی ہے۔ (تعلیقات ظفر الامانی للشیخ عبد الفتاح ص: ۷۱، ۴۷۴، ۴۸۳)۔

آگے محدث اعظمی حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے حوالہ سے یہ بات بوضاحت آرہی ہے۔

۱۲- محدث اعظمی کا محققانہ کلام:

کتب حدیث سے متعلق تحقیقی کام کرنے والے مشہور عالم اور معروف محدث مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی علیہ الرحمہ نے بطور فتوی ایک تفصیلی تحریر سپرد قلم کی تھی جو بعض رسائل میں شائع بھی ہوئی تھی (یہ فتوی مجلہ ''مآثر'' میں شائع ہوا ہے جو مولانا اعظمی علیہ الرحمہ کے ادارے مرقاۃ العلوم مئو سے شائع ہوتا ہے)۔ اور جس کا پس منظر نصف شعبان کی فضیلت سے متعلق معروف حدیث کی بابت سوال اور اس کے بارے میں بعض حضرات کی طرف سے وضع کا حکم لگانا تھا، مولانا نے اپنی تحریر وفتوی میں اس قول کا اور اس بات کا محققانہ رد فرمایا کہ سند میں متہم بالوضع راوی کا آجانا حدیث کو موضوع قرار دیتا ہے۔ اس موقع سے اس کے بعض حصوں کا نقل کرنا مفید معلوم ہوتا ہے۔

مولانا اصولی وبنیادی طور پر فرماتے ہیں:

''کسی حدیث پر وضع کا حکم لگانا محض اس وجہ سے جائز نہیں کہ اس کا کوئی راوی احادیث کی وضع کرنے والوں میں سے ہے، اس کی وجہ سے تو صرف سند کی رو سے حدیث کا ضعف لازم آتا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ابن ماجہ کی موضوع احادیث سے متعلق لکھا ہے انہوں نے ابن ماجہ کی اس حدیث کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

اور علوم الحدیث کی کتابوں میں نیز دیگر کتابوں میں بھی مختلف مواقع ومباحث میں یہ تصریح موجود ہے کہ کسی حدیث کی سند میں کسی وضاع یا کذاب کے پائے جانے کی وجہ سے اس کو موضوع نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس وضع پر کوئی دوسری دلیل موجود نہ ہو''۔

اور یہ بھی فرمایا ہے:

''اسی طرح اس وقت بھی کسی حدیث کو موضوع قرار دینا درست نہیں جبکہ اس کے کسی راوی کے حق میں یہ کہا جائے کہ وہ منکر الحدیث ہے یا خود کسی حدیث کے بارے میں کہا جائے کہ یہ حدیث منکر ہے''۔

ایک مثال:

مولانا نے اصل حدیث سے متعلق تفصیلی گفتگو کرنے کے علاوہ بعض دوسری احادیث کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، مثلاً حدیث ''لا تقولوا سورة البقرہ'' امام احمد علیہ الرحمہ نے اس کو منکر کہا ہے اور اس کے ایک راوی عبیس بن میمون عطار کے متعلق فرمایا ہے کہ منکر الحدیث ہے، اسی وجہ سے اس حدیث کو ابن الجوزی نے اپنی ''موضوعات'' میں ذکر کیا ہے، مگر حافظ ابن حجر نے اس پر سخت اعتراض کیا ہے اور فرمایا ہے:

''ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع میں ذکر کر کے زیادتی کی ہے، جبکہ بطور دلیل کوئی بات ذکر نہیں کی ہے، صرف امام احمد کا قول اور عبیس کی تضعیف کا ذکر کیا ہے، مگر اتنی بات وضع کا تقاضا نہیں کرتی'' (اللآلی المصنوعہ ۱/۲۳۹)۔

۱۳- شعبان کے روزہ کی فضیلت سے متعلق حدیث موضوع نہیں ہے:

نصف شعبان کے روزہ کی فضیلت سے متعلق حدیث ابن ماجہ میں آئی ہے، اسی کی بابت سوال پر مولانا اعظمی کی تحریر ہے، مولانا اپنی تمہید وتفصیل کے بعد فرماتے ہیں:

''ہم نے جو کچھ ذکر کیا اس سے واضح ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شعبان کے روزہ کی فضیلت سے متعلق حدیث کو ابوبکر بن عبد اللہ نے روایت

کیا ہے اور وہ واضح حدیث تھا لہذا یہ حدیث موضوع ہے، ان کا یہ قول بالکل غلط ہے، اس قسم کی جہالت کی بات کوئی عالم نہیں کرسکتا''۔

۱۴- حدیث موضوع - غیر کے ساتھ مل کر بھی حجت اور قابل قبول نہیں ہوتی:

مولانا نے محدث مبارکپوری مولانا عبدالرحمن صاحب تحفۃ الاحوذیؒ کا کلام اس حدیث سے متعلق نقل کیا ہے اور کچھ اور بات بھی۔

(ملاحظہ ہو: تحفۃ الاحوذی ۳؍۴۴۲)۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''دیکھئے کہ مولانا مبارکپوری نے ابن ماجہ کی حدیث نقل کی ہے اور اس کی بابت جرح بھی نقل کی ہے مگر اس کے باوجود اس کے راوی کو دوسری احادیث کے ساتھ ضم وانضمام کی صورت میں حجت قرار دیا ہے تو کیا موضوع بھی دوسری احادیث کے ساتھ مل کر حجت ہوتی یا ہوسکتی ہے، کوئی بھی عالم اس کا قائل نہیں ہے''۔

۱۵- ابن جوزی کے توسع پر نقد وتبصرہ:

علامہ ابن جوزی کے متعلق معروف ہے کہ وہ حدیث کو موضوع قرار دینے میں متوسع ہیں اور جلدی حکم لگا دیتے ہیں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''سیف احمد بن ابی المجد کی تحریر میں میں نے یہ پڑھا ہے کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الموضوعات کی تصنیف کی اور اچھا کام کیا کہ اس کتاب میں انہوں نے بہت سی ایسی احادیث نقل کی ہیں جو نہایت خراب ہیں اور عقل ونقل کے خلاف ہیں۔

لیکن یہ کام اچھا نہیں کیا کہ بہت سی احادیث کو اس وجہ سے موضوع کہہ دیا کہ اس کے بعض راویوں کے حق میں کچھ لوگوں کا کلام ہے مثلاً اس قسم کا، فلاں ضعیف ہے یا فلاں قوی نہیں ہے یا بہت کمزور ہے، جبکہ وہ حدیث ایسی نہ ہو کہ دل اس کے بطلان کی شہادت دے اور نہ ہی اس میں کتاب وسنت واجماع کی مخالفت ومعارضہ ہے، اور اس کے موضوع ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے بجز اس کے کہ کسی راوی کے بارے میں بعض لوگوں کا کلام پایا جاتا ہے۔

ابن جوزی کا یہ کام زیادتی اور حد سے تجاوز کا ہے'' (تدریب الراوی ۱؍۲۶۷، اللآلی مصنوعہ کتاب المبتدا)۔

امام ذہبی یہ بھی فرماتے ہیں:

''ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ موضوعات میں ایسی احادیث کو بھی لے آئے ہیں جو حسن وصحیح ہیں حتی کہ بعض صحیحین میں سے کسی ایک میں بھی ہیں، دوسری کتابیں تو الگ رہیں، یہ قابل نکیر توسع ہے جو بڑے ضرر ونقصان کا باعث ہے کہ اس کی وجہ سے غیر موضوع کو موضوع سمجھا جائے گا، اور ان سے حسن ظن رکھنے والا صاحب علم ان پر اعتماد کرتے ہوئے اسی پر اکتفا کرلے گا اور خود بحث وتحقیق نہیں کرے گا، دوسرے آدمی کی کیا بات کی جائے اسی لئے علماء نے ان کے اس عمل پر نکیر ونقد کیا ہے۔

اور ان سے ایسا اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے اکثر روایت کے کسی راوی کے ضعف کو دیکھا ہے اس وجہ سے اس پر وضع کا الزام ہے یا کسی دوسری وجہ سے اور اس کا لحاظ نہیں کیا کہ حدیث کا دوسرا طریق وسند بھی ہے، اور بسا اوقات انہوں نے بعض حضرات کی طرف سے تفرد کے قول پر اعتماد کرلیا ہے جبکہ کہنے والے کا مقصد تفرد نسبی ہے (نہ کہ تفرد مطلق جو عیب ہے جبکہ تفرد نسبی کی یہ حیثیت نہیں ہے)'' (فتح المغیث ۱؍۲۵۱)۔

۱۶- کذاب ووضاع کا تفرد وضع کو مستلزم نہیں ہے:

علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ ''فتح المغیث'' میں فرماتے ہیں:

''کسی کذاب بلکہ وضاع کا تفرد یعنی تنہا کسی حدیث کو روایت کرنا، اس کو مستلزم نہیں کہ حدیث موضوع ہو اور موضوع قرار دی جائے، اگرچہ تفرد کی بابت تحقیق میں خوب استقصاء کرلیا گیا ہو اور کسی حافظ حدیث نے کیا ہو جو فن میں تبحر اور احاطہ رکھنے والا ہو اسی لئے کسی حدیث کی بابت متاخرین

کی طرف سے حکم لگانا، بہت دشوار ہے۔

ائمہ متقدمین کا معاملہ مختلف تھا کہ حق تعالیٰ نے ان کو علم حدیث میں تبحر عطا فرمانے کے ساتھ حفظ و یادداشت میں بڑے توسع سے نوازا تھا''۔

(فتح المغیث ص: ۲۵۱ وظفر الامانی مع التعلیقات عبد الفتاح ص: ۴۸۳)۔

۱۷- کتاب ''ترغیب و ترہیب'' میں منذری کا ضابطہ:

حافظ منذری کا منتخب مجموعہ جو ''الترغیب والترہیب'' کے نام سے معروف ہے، منذری نے خود اپنی اس کتاب کے قواعد کو بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے:

''میرا طریقہ یہ ہے کہ جب حدیث کی سند میں کوئی ایسا راوی ہوتا ہے جس کے حق میں کذاب یا وضاع کہا گیا ہو یا متہم بتایا گیا ہو یا یہ کہ اس کے ضعف یا ترک پر اتفاق ہے، یا ذاہب الحدیث، ہالک، ساقط، لیس بشیٔ، ضعیف جدا، یا ضعیف (صرف) کہا گیا ہو یا مجھ کو اس کے بارے میں کوئی توثیق نہ ملی ہو اور نوعیت ایسی ہو کہ اس حدیث کی تحسین کا احتمال و گنجائش ہو تو میں ایسی حدیث کو لفظ ''روی'' (مجہول کے صیغہ) سے ذکر کرتا ہوں اور راوی کا نام نہیں ذکر کرتا اور نہ ہی اس بات کو کہ اس کے حق میں کیا کہا گیا ہے۔

اس طرح میری اس کتاب میں سند ضعیف کی دو علامتیں ہیں ایک تو لفظ روی سے اس کو نقل کرنا اور دوسرے اس کے اخیر میں کلام نہ کرنا''

(الترغیب والترہیب ۱/۳۷)۔

حاصل یہ کہ منذری اس کو اس بنیاد پر اور اس حیثیت سے نقل کرتے ہیں کہ موضوع نہیں ہے البتہ ضعیف ہے۔

۱۸- منذری نے ترغیب میں موضوع کا تذکرہ نہیں کیا ہے:

امام منذری نے یہ بھی فرمایا ہے:

''میں نے اپنی اس کتاب میں ان احادیث کے ذکر سے اعراض کیا ہے جن کو قطعی طور پر موضوع کہا گیا ہے'' (ایضا)۔

۱۹- بعض رواۃ جن پر وضع کا الزام واتہام ہے:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زیادتی توضیح کی غرض سے ایسے بعض رواۃ کا تذکرہ کیا جائے جن کے حق میں اس الزام وعیب کی بات آئی ہے، اور اس کے ساتھ ان کی بعض روایات کا بھی ذکر کیا جائے جن کے بارے میں رواۃ کے اس عیب کے ذکر کے باوجود محض ضعف کو اختیار کیا گیا ہے، وضع کا حکم نہیں لگایا گیا ہے۔

الف- ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سبرہ:

اس قبیل سے ایک راوی ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن ابی سبرہ قرشی وعامری مدنی ہیں، ابن ماجہ میں شعبان کے روزہ کی فضیلت والی روایت کے ایک راوی یہی ہیں، ''تحفۃ الاحوذی'' میں مذکور ہے:

''اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن ابی سبرہ قرشی عامری مدنی ہیں، نام میں اختلاف ہے عبداللہ یا محمد، ان کی نسبت ان کے دادا کی طرف کرتے ہوئے ان کو ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سبرہ کہہ دیا جاتا ہے، محدثین نے ان پر وضع کا الزام لگایا ہے، جیسا کہ تقریب میں ہے'' (التقریب ۲/۳۹۷)۔

اور ذہبی نے ''میزان'' (میزان الاعتدال ۶/۱۷۷، ۱۷۸) میں فرمایا ہے:

''بخاری وغیرہ نے ان کی تضعیف کی ہے، اور امام احمد کے دونوں بیٹوں، احمد وصالح نے اپنے والد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ شخص حدیث وضع کیا کرتا تھا، نسائی نے ان کو متروک کہا ہے'' (تحفۃ الاحوذی ۳/۴۴۲)۔

ب-یحییٰ بن العلاء بجلی:

ایسے ایک راوی یحییٰ بن علاء ہیں جو امام عبدالرزاق صنعانی کے شیوخ میں سے ہیں "تقریب" میں ان کی بابت مذکور ہے:

"یحییٰ بن العلاء البجلی ابو عمر او ابو سلمہ الرازی ان پر وضع کا الزام ہے اور یہ آٹھویں طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابوداود وابن ماجہ نے ان سے روایت لی ہے (التقریب ۲/۳۵۵)۔

امام ذہبی نے "میزان الاعتدال" کے اندر ان کے ترجمہ میں کہا ہے:

"امام احمد کا قول ہے کہ یہ شخص کذاب ہے اور حدیثیں گڑھا کرتا ہے"۔

نیز "میزان" میں یہ بھی مذکور ہے:

"عبدالرزاق سے منقول ہے کہ میں نے وکیع سے یحییٰ بن علاء کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: تم ان کی فصاحت زبان سے واقف نہیں ہو؟ میں نے کہا: اس کے ساتھ آپ لوگوں کو ان پر انکار کیوں ہے؟ فرمایا: ان پر (عیب اور وضع کے عیب کے حق میں) یہ کافی ہے کہ انہوں نے کھانا کھاتے وقت جوتے وغیرہ اتار دینے سے متعلق بیس احادیث روایت کی ہیں (اور وہ سب غلط ہیں)" (میزان الاعتدال ۶/۷)۔

ابن حبان کا قول ہے: "ان سے احتجاج درست نہیں ہے"۔ اور ابن عدی نے کہا ہے: "ان کی سب روایات غیر محفوظ ہیں" (تہذیب الکمال ص: ۱۵۱۴)۔

۲۰-مذکورہ رواۃ کی بعض روایات جن کو موضوع نہیں کہا گیا:

ان دونوں اور اس قسم کے رواۃ سے مروی احادیث کی ایک تعداد ایسی ہے کہ جس پر محققین اور افراط وتفریط سے ہٹ کر کام کرنے والے اہل اعتدال محدثین نے وضع کا حکم نہیں لگایا ہے بلکہ بس ان کو ضعیف کہا ہے اور اس بنیاد پر گنجائش اختیار کی ہے اور رکھی ہے۔

الف-نصف شعبان کی رات وروزے کی فضیلت سے متعلق حدیث:

اس سلسلہ کی ایک حدیث ابن ماجہ کی ہے جس کا ذکر پیچھے بار بار آیا ہے جس کو ابن ماجہ نے "ابواب اقامۃ الصلاۃ باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان" میں بواسطہ ابوبکر بن ابی سبرہ جن کا ذکر گذرا یوں روایت کیا ہے:

"حدثنا الحسن بن علی الخلال قال: حدثنا عبد الرزاق قال: أنبأنا ابن ابي سبره وهو ابوبكر بن ابي سبرة عن إبراهيم بن محمد عن معاوية بن عبد الله بن جعفر عن ابيه عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ:

"إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا يومها فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا فيقول: ألا مسترزق فأرزقه. ألا مبتلى فأعافيه. ألا كذا ألا كذا حتى يطلع الفجر"۔

(سنن ابن ماجہ، ابواب اقامۃ الصلاۃ باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان ۱/۲۳۵ رقم: ۱۳۸۴)۔

پیچھے مولانا حبیب الرحمن اعظمی علیہ الرحمہ کی جس تحریر کا تذکرہ آیا ہے وہ اسی حدیث کی تحقیق سے متعلق ہے، مولانا نے خود اس حدیث کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس میں یہ بھی ہے:

"کسی نے اس کو ابن ماجہ کی موضوع احادیث میں اور ان کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے"۔

محدث مبارکپوری مولانا عبدالرحمن صاحب کا رجحان بھی یہی ہے کہ اس مضمون کی روایات موضوع نہیں ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"یہ احادیث مجموعی طور سے ان لوگوں پر حجت ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نصف شعبان کی روایت کی فضیلت میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے"

(تحفۃ الاحوذی ۳/۴۴۱ و ۴۴۲)۔

منذری نے اس کو اپنی "ترغیب" (الترغیب والترہیب ۲/۱۲۰ و ۱۲۱) میں ذکر کیا ہے اور اس کتاب کا ضابطہ خود ان سے نقل کیا جاچکا ہے۔

علامہ سیوطی منذری کی بابت لکھتے ہیں:

''اگر کسی حدیث کے متعلق تم کو علم ہو کہ وہ صاحب ترغیب وترہیب — یعنی منذری — کی تصانیف میں ہے تو تم اس کو اطمینان سے روایت کرو''
(الرحمۃ المرسلۃ لمحسن الیمانی ص:۱۵)۔

بوصیری نے ''زوائد ابن ماجہ'' میں حدیث مذکور سے متعلق کہا ہے:

''اس کی سند ضعیف ہے کہ اس میں ابن ابی سبرہ ہے جس کے بارے میں امام احمد وابن معین نے کہا ہے کہ وہ حدیث وضع کرتا تھا''
(زوائد ابن ماجہ ۱/۲۴۷ حدیث ۴۹۲)۔

وضع کے عیب والزام کے ذکر کے باوجود بوصیری نے حدیث کو صرف ضعیف کہا ہے موضوع نہیں کہا ہے۔

ب-نومولود کے کانوں میں اذان واقامت کی حدیث:

اس سلسلہ کی ایک حدیث جو کافی معروف ہے اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے [کہ] وہ نومولود کے کانوں میں اذان واقامت کہے جانے کی حدیث ہے کہ وہ ارشاد نبوی نقل فرماتے ہیں:

''من ولد له مولود فأذن في أذنه اليمنى وأقام في أذنه اليسرى لم يضره أم الصبيان''۔

(عمل اليوم والليلة ص: ۵۷۸ ومجمع الزوائد ۴/۶۲ وتحفة المودود ص: ۲۵ ورواه البيهقي في شعب الايمان ۱۱/۱۰۶)۔

(جس کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا اور وہ اس کے داہنے کان میں اذان کہے اور بائیں کان میں اقامت کہے تو اس بچہ کو ام الصبیان (کمیڑہ) کی بیماری نقصان نہیں پہنچائے گی)۔

اس کو ابن السنی، ابو یعلی اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور سب نے یحییٰ بن علاء بجلی رازی کے واسطہ سے لیا ہے جن کا ذکر گذر چکا ہے، اس کے باوجود اس حدیث کو ائمہ امت نے قبول کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے حق میں صرف ضعف کا ذکر کیا ہے وضع کا حکم نہیں لگایا ہے بلکہ ترمذی وغیرہ کی ایک روایت جو اسی مضمون سے تعلق رکھتی ہے اس کے بعض رواۃ کے حق میں کلام کے ساتھ صاحب تحفۃ الاحوذی فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح ہے کہ حدیث ضعیف ہے لیکن اس کو تائید وتقویت حاصل ہے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے جس کو ابو یعلی موصلی اور ابن السنی نے روایت کیا ہے'' (تحفۃ الاحوذی ۵/۱۰۸)۔

امام نووی نے اس کا تذکرہ اپنی ''الاذکار'' (الاذکار للنووی ص: ۲۴۴) میں اور ابن القیم نے ''تحفة المودود فی احکام المولود'' (تحفۃ المودود ص: ۲۵) میں کیا ہے اور شیخ ناصر الدین البانی نے ''سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ رقم الحدیث: ۳۲۱)۔

حافظ ابن حجر نے ''تلخیص الحبیر'' میں سکوت کے ساتھ ذکر کیا ہے (تلخیص الحبیر ۴/۱۴۹)۔ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' میں ذکر کیا ہے اور یہ صراحت کی ہے:

''اس میں مروان بن سالم غفاری ہیں جو متروک ہیں'' (مجمع الزوائد ۴/۶۲)۔

اور ہیثمی نے یحییٰ بن علاء کا تذکرہ نہیں کیا ہے، جبکہ احقر یہ محسوس کرتا ہے کہ یحییٰ ان سے بدتر حال رکھتے ہیں کہ ان کے حق میں بڑے سخت الفاظ منقول ہیں۔ (التقریب ۴/۳۵۵، ومیزان الاعتدال ۶/۱۷، تہذیب الکمال ص: ۱۵۱۴)۔

بیہقی نے اپنی شعب الایمان (شعب الایمان ۱۱/۱۰۶، ۶/۳۹۰) میں اور مناوی نے ''تیسیر شرح جامع صغیر'' (التیسیر شرح الجامع الصغیر ۲/۴۴۷) میں اور عبد القادر الارناؤوط نے نووی کی اذکار کی تحقیق میں اس کے ضعف کی صراحت کی ہے (الاذکار رالتعلیقات ۱/۳۳۰)۔

خلاصہ یہ کہ اس حدیث کو موضوع کے بجائے ضعیف قرار دینے والوں اور اس کو عمل واستحباب کی نسبت وجہت سے ذکر کرنے والوں میں ائمہ فن

ونقادفن ہیں ۔نووی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ہیثمی، حافظ ابن حجر وغیرہ (البانی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے)۔

البتہ خود شیخ البانی کا رجحان ضعف کے بجائے وضع کا ہے جس کو انہوں نے ثابت کرنے کی سعی کی ہے (ملاحظہ ہو ضعیف الجامع الصغیر)۔

۲۱- وضع کے قرائن:

پیچھے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ کسی حدیث پر وضع کا حکم لگانے کے لئے صرف اتنا کافی نہیں ہوتا کہ اس کی سند میں کوئی راوی وضاع وکذاب ہے یا اس کے ساتھ متہم ہے بلکہ اس کے لئے مزید کچھ چیزیں بھی دیکھی جاتی ہیں انہیں کو وضع کے قرائن کہا جاتا ہے۔

اور اس تفصیل سے واضح ہے کہ ایک طالب حدیث اور حدیث کی حیثیت کی تحقیق وتوضیح کرنے والے کے لئے کس حد تک یہ ضروری ہے کہ وہ ان امور، قرائن وعلامات اور ضوابط وقواعد سے واقف ہو جن سے وضع کی معرفت اور وضع کا حکم لگانے میں مدد لی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء حدیث – حدیث کے اصول وضوابط کو بیان کرتے ہوئے علم مصطلح الحدیث کے تحت حدیث موضوع پر گفتگو میں ان امور وقرائن کو بھی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

احقر کی نظر سے اس بابت جو تحریریں اور تحقیقات گذری ہیں بظاہر سب سے اچھی تفصیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ نے کی ہے جو ان کی کتاب "لمحات من تاریخ السنة وعلوم الحدیث" میں مذکور ومسطور ہے، انہوں نے اپنی اس تحریر میں بحث ومضمون کا بڑا اچھا احاطہ کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث ص: ۱۰۴ تا ۱۰۷ و ۱۱۷ تا ۱۲۸)۔

ویسے تو اصول حدیث ومصطلح الحدیث کی ہر کتاب میں اس کا تذکرہ ہے، کتاب کی نوعیت، اور مصنف کے مزاج ومقصد کے اعتبار سے، حافظ ابن القیم نے اپنی کتاب "المنار المنیف فی الصحیح والضعیف" میں ۲۵ رامور کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۲- بعض اہم امور وقرائن کا تذکرہ:

اس موقع سے حافظ ابن العراق کنانی کی کتاب "تنزیه الشریعة المرفوعه عن الأخبار الشنیعة الموضوعة" میں مذکور تفصیل کا حاصل پیش کیا جارہا ہے جس کو شیخ عبدالفتاح نے اپنی تحریر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

الف- بیان کرنے والے کا خود اقرار کہ اس نے وضع کیا ہے۔

ب- قرینہ بدرجۂ اقرار – اور وہ یہ کہ مضمون کی تاریخ سے تردید وتکذیب ثابت ہوتی ہو۔

ج- ایک جم غفیر راوی کی تکذیب کرے، ایسا مجمع کہ جس کا جھوٹ پر متفق ہونا اور ایک دوسرے سے سن کر ونقل کر کے بیان کرنا عادۃً ناممکن سمجھ میں آتا ہو۔

د- راوی کے اندر پایا جانے والا قرینہ جیسے راوی کا کسی خاص فکر وعقیدہ سے تعلق اور روایت اسی مضمون کی ہو۔

ہ- خود روایت ومضمون کے اندر پایا جانے والا قرینہ، اور وہ یوں کہ عقل صراحۃً اس کی تردید کرے اور اس میں کسی توجیہ کی کوئی گنجائش نہ ہو، اسی طرح حس ومشاہدہ وعرف کی مخالفت کا حال ہے نیز اس کا بھی کہ روایت کا مضمون قرآن کے قطعی مضمون کے خلاف ہو یا سنت متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو۔

و- حدیث کا مضمون کسی اہم وعام معاملہ سے متعلق ہو جس سے واقفیت اور نقل ایک مجمع وجماعت کا تقاضا کرتی ہو جب کہ بیان کرنے والا تن تنہا ہو۔

ز- مضمون ایسا ہو کہ تمام مکلفین کو اس سے واقف ہونا چاہئے، پھر بھی راوی بس ایک آدمی ہو۔

ح- لفظ ومعنی کی رکاکت وسطحیت۔

ط- معمولی سے کام پر سخت ترین وعید یا بہت بڑا اجر وثواب۔

ی- تدوین کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد بھی روایت سینہ بسینہ کی جارہی ہو اور متون حدیث کی کتابوں میں کہیں اس کا تذکرہ نہ ہو۔

(لمحات من تاریخ السنہ ۱۲۱ – ۱۱۷ وتنزیہ الشریعہ ۱/۸–۵)۔

۲۳- کسی حدیث پر وضع کا حکم قطعیت نہیں رکھتا:

کسی حدیث کی بابت جو حکم اہل فن لگاتے ہیں وہ ان کی تحقیقات ومعلومات پر مبنی ہوتا ہے اور ان کے غور وفکر یا یوں کہئے کہ اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ ظن غالب کے درجہ کا ہوتا ہے، اپنے اندر قطعیت نہیں رکھتا، البتہ اس کے ساتھ پائے جانے والے قرائن فیصلے کو قوت وطاقت بخشتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کسی حدیث کے بارے میں وضع کا حکم ظن غالب کی بنیاد پر ہوتا ہے قطعیت کی بنیاد پر نہیں (کہ یہ سمجھا جائے یہ سرے سے بے اصل ہے، بلکہ کچھ احتمال رکھتا ہے اس لئے کہ ظن غالب کا مرحلہ گنجائش کا مرحلہ رکھتا ہے)۔

یہ فیصلہ قطعی اس لئے نہیں ہوتا کہ جھوٹ بولنے والا (جس کی عادت ومشغلہ ہی جھوٹ کا ہو وہ) بھی کبھی سچ بولتا ہے (تو حدیث کی وضع کا مجرم ضروری نہیں کہ وہ وضع کی بنیاد پر بات کہہ رہا ہو بلکہ دوسروں سے سن کر اعتماد کی بنیاد پر نقل کرنے والا بھی ہو سکتا ہے)۔

تاہم جو محدثین قطعیت کے مرحلے تک پہنچتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو فن کی بابت ایک قوی ملکہ (خاص اعلی صلاحیت) حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ حق وناحق کا اور ثابت وبے اصل وباطل میں فرق وامتیاز کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ کام محدثین میں ایسے حضرات کرتے ہیں جن کی فنی واقفیت انتہائی کامل ومکمل ہوتی ہے، ذہن انتہائی تیز ورسا اور فہم نہایت قوی، اور وضع کو بتانے والے قرائن سے واقفیت بھرپور ہوتی ہے'' (نزہۃ النظر ص: ۴۴)۔

۲۴- مذکورہ ضوابط سے متعلق شیخ عبد الفتاح کا قول:

شیخ عبد الفتاح نے ''لمحات من تاریخ السنہ'' میں وضع کے قرائن وضوابط پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد اخیر میں فرمایا ہے جو خود ایک بڑا اور اہم ضابطہ ہے:

''یہ جو ضوابط بیان کئے گئے ہیں جو جامع ونافع دونوں ہیں، نیز علامات جو ذکر کی گئی ہیں، جو حق ومضبوط ہیں، یہ ان اہم ترین چیزوں میں ہیں جن سے ایک مسلمان اور طالب حدیث وعلم کو حدیث موضوع سے واقفیت حاصل کرنے میں خاص بصیرت حاصل ہوتی ہے، اور ان سے ان کے اندر اس کی بابت ایک خاص بیداری اور حس پیدا ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ (ایک صحیح ومحتاط فیصلہ) کسی حدیث کو رد کرنے (موضوع قرار دینے) یا کم از کم اس کے حق میں توقف کا اختیار کرتا ہے، اور ایسا ان احادیث میں ہوتا ہے جن کو ایسے لوگوں نے ایک طرف کر دیا ہے اور ٹھکانے لگا دیا ہے جو فنی بنیاد پر اور احتیاط کی بنیاد پر بات نہیں کرتے بلکہ ظن وتخمین کی بنیاد پر لوگوں کو اپنے فیصلے سناتے ہیں۔

ان علامات وضوابط سے واقفیت اور ان پر عمل کا کم از کم یہ فائدہ ہے کہ یہ ایک عالم وطالب علم کے ذہن کو حدیث صحیح اور حدیث باطل وموضوع کا ایک صحیح ومعتبر معیار عطا کرتے ہیں اور جس کو اپنے علم ومعلومات میں اس قسم کی چیز حاصل ہو جائے تو اس کو علم عظیم اور بڑی دولت مل گئی''

(لمحات من تاریخ السنہ ص: ۱۲۷)۔

۲۵- حدیث موضوع اور حکم وضع سے متعلق واقفیت کا معتبر ذریعہ وافراد:

اس موقع سے ایک بات کا ذکر مناسب ہے اور اس سے واقفیت اور اس کی رعایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ کوئی بھی علم وفن ہو اس کے اہل سب یکساں نہیں ہوتے، ہر سلسلہ میں بعض لوگ تشدد پسند اور بعض تساہل برتنے والے ہوتے ہیں جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں اور ضرور ہوتے ہیں جو درمیانی راہ ومزاج نیز اعتدال کے حامل ہوتے ہیں۔

حضرات محدثین اور ان کے نقاد کا بھی یہی حال ہے، اس کی وجہ سے روایات ورواۃ سے متعلق فیصلوں میں اختلاف وتعارض سامنے آتا ہے اور عام طالب علم مشکل میں پڑتا ہے۔

تو احادیث کی صحت وضعف اور رد وضع کے باب میں ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے، کیا ہر قول کے ماخذ و دلائل کو دیکھ کر پرکھ کر ترجیح کی راہ اپنائی جائے؟ یا یہ دیکھا جائے کہ کون زمانہ وطبقہ میں سابق ومتقدم ہے؟ یا تعداد کی کثرت دیکھی جائے، یا ہر چیز سے صرف نظر ایک رائے کو دوسری پر مقدم رکھیں، یہ ایک اہم مرحلہ ہے جس سے ایک طالب حدیث کو گذرنا پڑتا ہے۔

۲۶-اقوال متعارضہ سے نکلنے کا حل:

مولانا عبدالحیؒ صاحب لکھنوی علیہ الرحمہ کی وقیع کتاب ''الاجوبۃ الفاضلۃ للأسئلۃ العشرۃ الکاملۃ'' میں درج یہ چوتھا سوال ہے (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۱۶۰) جس کا مولانا نے تحقیقی وتفصیلی جواب دیا ہے، اور جواب کا حاصل یہ ہے:

''زمانہ کا تقدم، عدد کی کثرت مرتبہ کا تفوق، یہ سب مرجحات میں سے نہیں ہے، بلکہ وجوہ ترجیح دوسرے ہیں، یہ امور صحیح رائے تک پہنچنے میں وجوہ ترجیح کی تائید وتقویت کرتے ہیں'' (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۱۸۰ و ۱۸۱)۔

الف-اعتدال پسند محدثین کی رائے کو ترجیح:

بنیادی شکلیں تعارض کو حل کرنے کی دو ہیں:

پہلی یہ کہ جو طبقہ میانہ روی واعتدال کے ساتھ متصف ومعروف ہے، اس کے قول کو ترجیح دی جائے، کیونکہ بہت سے حضرات جیسا کہ گذرا یا تشدد کی راہ پر ہیں یا تساہل کی، یعنی افراط وتفریط کا شکار، ہم کو ایسی صورت میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ضعف وموضوع کا حکم کس طبقہ کی طرف سے ہے، اگر تشدد پسند طبقہ کی طرف سے ہے اور اعتدال پسند طبقہ حدیث کے ثبوت صحت یا حسن کا قائل ہے تو اعتدال پسند طبقہ کی رائے کو اختیار وترجیح ہوگی۔

ایسے میں اگر تساہل پسند طبقہ کی طرف سے صحت وحسن کی بات ہے جبکہ اعتدال پسند طبقہ دوسری رائے رکھتا ہے تو بھی اعتدال پسند طبقہ کی رائے راجح ہوگی۔ (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۱۶۱، ۱۷۹)۔

ب-دلائل وماخذ میں نظر:

دوسری شکل اس مشکل کے حل کی یہ ہے دونوں قسم کے اقوال کے دلائل وماخذ کو دیکھا جائے اور غور وفکر، دقت نظر سے کام لیتے ہوئے جو رائے مضبوط وقوی ہو اس کو اختیار کی جائے (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۱۸۰)۔

۲۷-متشدد اور متساہل ہر دو طبقہ کے بعض افراد:

جرح وطعن نیز وضع وضعف کا حکم لگانے میں تشدد پر عامل طبقہ میں مذکورہ ذیل حضرات کا شمار ہے ابن الجوزی، عمر بن بدر موصلی، رضی الدین ہندی صاغانی صاحب مشارق الانوار)، ابوعبداللہ جوزقانی، مجد الدین فیروز آبادی، (صاحب سفر السعادۃ) محمد بن حسین ازدی، ابن حبان۔ (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۱۶۳ تا ۱۷۹) وغیرہ۔

آج کل بھی ایک جماعت اسی طبقہ کی راہ پر گامزن ہے اور ان کی رائے کو پسند کرتی ہے۔ اس جماعت کے پیش نظر ان حضرات کی جلالت قدر ہے اگرچہ بسا اوقات یہ حضرات حدیث کے رد وضع کا فیصلہ محض ضعف یا عام جرح کی بنیاد پر کیا کرتے ہیں بالخصوص آج کا یہ ذہن کہ ضعیف وموضوع ایک ہی ہے اس نے وضع کے حکم میں بڑا توسع اختیار کرلیا ہے۔

اس کے بالمقابل تساہل پسند طبقہ ہے، جو بڑی آسانی سے حدیث کو ثابت مان لیتا ہے بلکہ صحیح بھی کہتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی، علامہ طاہر بن احمد الجزائری وغیرہ نے ایسے دو طبقہ کا تذکرہ بڑی وضاحت واہمیت کے ساتھ کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو فتاوی شیخ الاسلام ۱۳ / ۵۳ و حجۃ اللہ البالغہ ۱ / ۱۵۶، وتوجیہ النظر ص: ۴۷، ۷۵ و ۸۲)۔

۲۸-ایک ضروری امر فنی اصطلاحات سے واقفیت:

اس بابت ایک ضروری قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ہر فن کی اصطلاحات ہوتی ہیں اور بعض مرتبہ خواص اہل فن اپنی کچھ مخصوص اصطلاحات بنا لیتے

ہیں اور ان کو استعمال کرتے ہیں۔

محدثین کے یہاں بھی عمومی وخصوصی اصطلاحات ہیں جن سے وہ کام لیتے ہیں تو طالب تحقیق کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان اصطلاحات سے واقف ہو جس کو اہل فن حدیث کا حکم بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو حدیث کی صحت وضعف کے بیان کے لئے بھی ہوتا ہے اور وضع وغیرہ کے بیان کے لئے۔

بعض مرتبہ ایک لفظ وتعبیر ایک صاحب فن کے نزدیک جرح وتضعیف کی اور بطلان کے بیان کی ہوتی ہے جبکہ دوسرے کے نزدیک وہی لفظ وتعبیر تعدیل وتوثیق یا اعتماد کے لئے استعمال ہوتی ہے (راجع مقدمہ کتاب المصنوع اور موضوعات صغری علی قاری از شیخ عبدالفتاح)۔

حتی کہ لفظ کذاب ضروری نہیں کہ کذب کے معروف مفہوم یعنی وضع کے لئے استعمال ہو بعض مرتبہ یہ لفظ خطأ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (قواعد فی علوم الحدیث مع تعلیقات ص: ۱۰۵، ۱۰۶)۔

۲۹- احادیث موضوعہ سے کیسے بچا جائے:

صورت حال یہ ہے کہ احادیث موضوع کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جو امت کے درمیان اور امت کے مختلف طبقات کے درمیان پھیلا ہوا ہے اور اس طرح کہ بہت سے لوگ ان کو ثابت ومعتبر اور صحیح مانتے ہیں آخر ان احادیث سے کیسے احتراز و بچاؤ ہو جبکہ علماء محققین کا فیصلہ ان کی بابت وضع کا اور اس کی وجہ سے احتراز وصرف نظر کا ہے تو اس کی دو شکلیں ذکر کی جاتی ہیں:

اول: ان کتابوں کی اشاعت اور تشہیر جن کا مقصد ہی اس قسم کی احادیث کو جمع کرکے نمایاں کرنا ہے، اس سے عوام کے اندر اس بابت بصیرت وواقفیت پیدا کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

دوم: موضوع احادیث سے متعلق کتب کا کثرت سے مطالعہ، ان سے مراجعت اور اچھی واقفیت، کہ اس کی وجہ سے طالب تحقیق کے اندر اس بابت بصیرت پیدا ہوگی اور دوسروں کو دور رکھے گا، بلکہ اس کی وجہ سے اس کے اندر ایک خاص داعیہ وملکہ اس بات کا پیدا ہوگا کہ احادیث نبویہ کو بیان کرنے ونقل کرنے میں خوب اطمینان حاصل کرے۔ حتی کہ بصارت وبصیرت کا یہ صحیح ومفید استعمال طالب کے اندر خود یہ ملکہ پیدا کرے گا کہ وہ بذات خود باطل وصحیح، اور قوی وضعیف احادیث کے درمیان فرق کرسکے۔

۳۰- موضوع احادیث سے متعلق اہم کتب:

۱- تذکرۃ الموضوعات مولفہ حافظ محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ۔

۲- الموضوعات من الاحادیث المرفوعات جس کو کتاب الاباطیل کے نام سے بھی ذکر کرتے ہیں، مؤلف ابو عبد اللہ حسین بن ابراہیم جوزقانی م ۵۴۳ھ۔

۳- الموضوعات مولفہ ابو الفرج عبد الرحمن بن جوزی ۵۹۷ھ۔

۴- المغنی عن الحفظ والکتاب بقولہم لم یصح شیئ فی ہذا الباب مولفہ حافظ ضیاء الدین ابو حفص عمر بن بدر موصلی م ۶۲۲ھ۔

۵- المنار المنیف فی الصحیح والضعیف، ابن قیم جوزی م ۷۵۱ھ۔ اس کتاب میں مؤلف نے ابن جوزی کی ''الموضوعات'' کی تلخیص کی ہے اور اس بابت قواعد وضوابط کے وضع اور ضبط ذکر کا اہتمام کیا ہے اس کی وجہ سے کتاب بڑی جامع ومفید ہے۔

۶- المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنہ حافظ شمس الدین سخاوی م۔ یہ کتاب موضوعات کے ساتھ خاص نہیں لیکن اس میں موضوعات کا کافی حصہ آیا ہے۔

۷- اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ۔

۸- ذیل الموضوعات، یہ دونوں کتابیں علامہ سیوطی م ۹۱۱ھ۔

۹- تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الأخبار الشنیعۃ الموضوعۃ۔ حافظ ابوالحسن علی بن محمد بن عراق کنانی م ۹۶۳ھ اس کتاب کی ترتیب وتنظیم بہت اچھی ہے، ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں وضاعین کے نام کی ایک مرتب فہرست بھی ہے اور مبسوط مقدمہ بھی بڑا ہی جامع ومفید ہے۔

۱۰- تمییز المرفوع عن الموضوع جس کو ''موضوعات کبری'' بھی کہتے ہیں۔

۱۱- المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع جس کو ''موضوعات صغری'' بھی کہتے ہیں، یہ دونوں کتابیں ملاعلی قاری ہروی مکی م ۱۰۱۴ھ کی ہیں۔

۱۲- کشف الخفاء ومزیل الالباس عما اشتہر من الأحادیث علی ألسنۃ الناس، علامہ اسماعیل عجلونی م ۱۱۶۲ھ یہ مقاصد حسنہ کے انداز کی کتاب ہے۔

۱۳- الفوائد المجموعۃ فی الأحادیث المرفوعۃ علامہ شوکانی ابوعبداللہ محمد بن علی یمانی م ۱۲۵۵ھ۔

۱۴- الاحادیث المرفوعۃ فی الأخبار الموضوعۃ، علامہ عبدالحی لکھنوی م ۱۳۰۴ھ (لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث ص ۱۱۳ و ۱۱۴ وعلم اسماء الرجال ص ۲۰۵)۔

۳۱- اس باب میں عقل حاکم صرف عقل سلیم اور مسلم ہے:

وضع کے باب میں جو ایک قرینہ عقل کی مخالفت کا ہے، کہ جو حدیث صریح عقل کے خلاف ہو اور کسی توجیہ کی اس میں گنجائش نہ ہو سکے تو یہ بھی وضع کی ایک علامت ہے۔

تو یہ جاننا چاہئے کہ اس موقع سے مطلق عقل اور عام عقل مراد نہیں ہے بلکہ وہ عقل جو سلیم ہو اور مسلم ہو۔

عقل سلیم سے مراد ہے ایسی عقل جو ادھر ادھر کے تاثرات سے خالی ہو جیسے آج کل ہر آدمی اپنے ماحول وحالات سے متاثر ہوتا ہے اس کا ذہن ودماغ وعقل سب سوچ ورائے کا ایک خاص نہج رکھتے ہیں، یہ نہ ہو بلکہ فطرت والی عقل ہو (کہا جا سکتا ہے کہ وہ عقل وفطرت جس کا تذکرہ معروف حدیث: ''کل مولود یولد علی الفطرۃ'' (بخاری، الجنائز) میں کیا گیا ہے)۔

اور عقل کا سلامت کے ساتھ مسلم ہونا بھی ضروری ہے کہ اللہ کی ذات، اس کی صفات پر نیز اس کی کتاب ورسول وغیرہ ایمانیات پر کتاب وسنت اور اہل حق واہل سنت کے عقیدہ کے مطابق ایمان ویقین ہو، اس لئے کہ بہت سی باتوں کو اس کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا لہذا غیر مومن عقل کا فیصلہ معتبر نہ ہوگا۔

اسی طرح مشاہدہ وعادت کی مخالفت سے ان چیزوں کا استثناء ہے جن کا ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یا آپ کے صحابہ کے لئے صحت واعتبار کے ساتھ ہے اور اس طور پر کہ وہ خرق عادت وخلاف عادت ہیں۔

یہ تفصیل وقیود اس لئے ہیں کہ اہل حق واہل سنت کے بہت سے معتقدات اور احادیث صحیحہ سے ثابت بہت سے امور ایسے ہیں کہ ان کو وہ عام وعادی عقل انسانی قبول نہیں کرتی جو اللہ تعالی اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان نہیں رکھتی کیونکہ وہ مادیات سے متلوث ہوتی ہے اور شیطانی تصرفات ونفسانی خیالات واحساسات کی گندگی کے زیر اثر ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ کسی چیز کے بارے میں ایسے فیصلہ پر قادر نہیں ہوتی جو اس کے اندر پائے جانے والے مادی رذائل اور مہلک خصائل کے اثر سے خالی ہو۔

ڈاکٹر مصطفی اعظمی تحریر فرماتے ہیں: ''کسی بھی نص (حدیث) کے نقد میں عقل کا استعمال ضرور ہوتا ہے اور ہوا ہے، لیکن حدیث کے قبول ورد میں محدثین عموماً محض عقل پر اعتماد نہیں کرتے، شاذ ونادر کہیں ایسا ہوتا ہے، اور احادیث کے نقد کا عملی طریقہ بھی اسی کو چاہتا ہے کیونکہ حدیث کی جانچ وپرکھ کے معاملات میں عقل کا محض اس کی ذاتی حیثیت سے استعمال محال ہے''۔

اپنے اس قول پر انہوں نے امام شافعی علیہ الرحمہ کے قول سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے:

''امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

''حدیث کی صداقت وثبوت اور کذب وعدم ثبوت پر استدلال مخبر۔ بیان کرنے والے۔ کی صداقت وکذب بیانی سے ہی ہوتا ہے۔ بہت کم احادیث ہیں جن میں اس کے بغیر فیصلہ لیا جاتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ثبوت وعدم ثبوت پر اس سے استدلال کیا جائے کہ کسی حدیث بیان کرنے والے نے ایسی بات سنائی کہ جس کا ہونا ناممکن ہے یا جوان باتوں وچیزوں کے خلاف ہے، جو ثبوت وقوت اور دلائل میں اس بیان کردہ سے کہیں فائق ہیں''۔

(منہج النقد عند المحدثین ص: ۸۱، والرسالہ ص: ۲۶۵، و ۲۶۶ نیز ملاحظہ ہو: ظفر الامانی مع تعلیقات الشیخ عبد الفتاح ص: ۲۸۰)۔

۳۲-وضع کے حکم کے لئے کبھی سند کو ہی دیکھا جاتا ہے:

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وضع کی تحقیق وثبوت کا کام صرف اس طرح ہوسکتا ہے کہ حدیث کی سند کو دیکھا جائے اور اس میں غور کیا جائے۔

ابن القیم علیہ الرحمہ نے ایک موقع سے فرمایا ہے:

''حدیث موضوع کی معرفت سند میں نظر وغور کے بغیر بھی بعض ضوابط کی بنیاد پر ممکن ہے'' (المنار المنیف ص: ۴۳ و مابعد)۔

بیروتی نے تعقب کرتے ہوئے کہا ہے: ''جو حدیث موضوع شریعت مطہرہ کے خلاف ہو اس کے حق میں تو یہ بات صحیح ہے، لیکن نفس حدیث موضوع کی نسبت سے اور مطلقاً یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حدیث موضوع مختلف قسم کی ہوتی ہے، بعض خلاف شریعت ہوتی ہے، لیکن بعض کا مضمون ومعنی صحیح ہوتا ہے، ایسی حدیث کی وضع کا علم سند ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اس لئے کہ اس بابت نقل کا علم وسہارا ضروری ہے'' (اسنی المطالب ص: ۱۷۲، لمحات من تاریخ السنہ ص: ۱۲۲)۔

شیخ عبد الفتاح فرماتے ہیں:

''بعض موضوع احادیث کی وضع کا علم صرف سند اور راوی سے واقفیت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے'' (التعلیقات علی لمحات من تاریخ السنہ ص: ۱۲۳)۔

''حدیث موضوع سے متعلق اس لمبی گفتگو کو احقر شیخ الاسلام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کے ایک ارشاد پر ختم کرتا ہے وہ اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں:

''جیسے کچھ دلائل کے ذریعہ کسی حدیث کے صدق کو جانا جاتا ہے اور کبھی قطعیت کے ساتھ، اسی طرح کچھ دلائل ہیں جن کے واسطہ سے حدیث کے کذب کو جانا جاتا ہے اور اس بابت قطعیت کی رائے اختیار کی جاتی ہے، مثلاً ان احادیث کا قطعی طور پر موضوع وباطل ہونا جن کو اہل بدعت واہل غلو واضعین نے فضائل کے باب میں روایت کیا ہے'' (فتاوی شیخ الاسلام ۱۳؍۳۵۴)۔

باب دوم

فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل

۱- فضائل اعمال کے حق میں اعتبار ضعیف کے مذاہب

امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''القول البدیع'' میں فرماتے ہیں:

''حدیث ضعیف پر عمل کی بابت تین مذاہب ہیں عمل مطلقاً منع ہے، عمل مطلقاً جائز ہے، فضائل کے باب میں کچھ شرائط کے ساتھ عمل جائز ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے'' (القول البدیع ص: ۱۹۵، الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۰)۔

سخاوی کی صراحت کے مطابق جمہور، اور ابن حجر مکی کی صراحت (الفتح المبین ص: ۳۲ والفتاوی الحدیثیۃ ص: ۱۳۳) میں اور ملا علی قاری کی صراحت (الموضوعات الکبری ص: ۷۳ والحظ الاوفر ص: ۲۹) کے مطابق علماء امت متفق ہیں کہ فضائل اعمال کے حق میں حدیث ضعیف پر عمل جائز ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''علماء حدیث کے نزدیک اسانید ضعیفہ کے حق میں تساہل، نرم روی، جائز ہے اور موضوع کو چھوڑ کر بقیہ ضعیف روایات کا روایت کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی درست ہے اگرچہ ضعف کو بیان نہ کیا جائے بشرطیکہ حدیث کا تعلق حق تعالی کی صفات اور احکام سے نہ ہو'' (التقریب مع التدریب ۱/۲۹۸)۔

اس جواز کی وجہ یہ ہے کہ اگر حدیث ضعیف نفس الامر میں ثابت ہے تو عمل سے اس کا حق ادا ہو جائے گا اور اگر ثابت نہ ہوئی تو فضائل کے باب میں اس پر عمل کرنے کی وجہ سے کوئی مفسدہ نہیں لازم آئے گا، نہ تحریم وتحلیل کا اور نہ کسی کے حق کے ضیاع کا (الفتح المبین ص: ۳، الاجوبۃ الفاضلۃ: ۳۸)۔

امام لکھنوی مولانا عبدالحئی فرماتے ہیں:

''بعض حضرات نے ضعیف پر عمل کو- مطلقاً- منع کیا ہے، لیکن یہ مذہب ضعیف ہے، اور بعض نے مطلقاً- بغیر کسی قید- اس کی اجازت دیدی ہے یہ رائے توسع بیجا ہے، اور بعض حضرات تفصیل کرتے ہیں اور قید کے ساتھ اجازت دیتے ہیں یہی رائے ومشرب پختہ وصائب ہے'' (الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۳، مولانا نے اس موقع سے اس موضوع سے متعلق اقوال کا احاطہ کیا ہے)۔

بظاہر امام بخاری علیہ الرحمہ کا بھی یہی مذہب ہے اس لئے کہ اپنی کتاب ''الادب المفرد'' میں امام بخاری نے بعض ضعیف احادیث (الادب المفرد ملاحظہ ہو: حدیث ۱۲۸، ۴۰ وغیرہ نیز ملاحظہ ہوں: محقق شیخ ومزید تعلیقات الشیخ عبدالفتاح علی ظفر الامانی ص: ۱۸۲ تا ۱۸۴) کا بھی بغرض عمل تذکرہ کیا ہے۔

سعودیہ کی لجنۃ دائمۃ للبحوث العلمیہ کے فتاوی میں آیا ہے:

''فضائل اعمال کے حق میں، حدیث ضعیف پر عمل کیا جاسکتا ہے، جبکہ ضعف شدید نہ ہو اور یہ ثابت ہو کہ بات فی الجملہ فضائل کی ہے اور فضائل کی حد تک ہے اور حدیث ضعیف میں اسی فضیلت کا ذکر ہے'' (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۴/۹۲، اس فتوی پر شیخ ابن باز وغیرہ کے دستخط ہیں)۔

۲- مذہب جمہور کی بنیاد وسند:

جمہور کے مذہب کی اساس متقدمین ائمہ محدثین کی صراحتیں ہیں جیسے عبدالرحمن بن مہدی، احمد بن حنبل، عبداللہ بن المبارک، وغیرہ عراقی نے اس امر کی صراحت کرنے والوں میں ان تینوں حضرات کا تذکرہ کیا ہے، اور الفاظ یہ ہیں: جیسا کہ حلبی نے ''انسان العیون'' (انسان العیون ۱/...) میں اور خطیب بغدادی نے ''الکفایۃ'' (الکفایۃ ص: ۱۳۴، الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۳۶ شرح الفیۃ الحدیث للعراقی ۲/۲۹۱، الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۴۰) میں ذکر کیا ہے۔

''جب ہم حلال وحرام کی بابت روایت کرتے ہیں تو شدت برتتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایات میں توسع اختیار کرتے ہیں''

(شرح الفیۃ الحدیث للعراقی ۲۹۱/۲، الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۴۰)۔

عبدالرحمن بن مہدی سے جو الفاظ منقول ہیں وہ تشدد وتوسع کی وضاحت کرتے ہیں:

''جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال وحرام اور احکام کی بابت روایت نقل کرتے ہیں تو سندوں میں شدت برتتے ہیں اور رواۃ ورجال کے حق میں نقد کرتے ہیں اور جب فضائل اور ثواب وعقاب کی روایت نقل کرتے ہیں تو سندوں میں نرمی برتتے ہیں اور رواۃ کے حق میں تسامح وتوسع سے کام لیتے ہیں''

(فتاویٰ شیخ الاسلام ۶۵/۱۸)۔

۳- اسانید میں تساہل وتوسع سے کیا مراد ہے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ نے اس بابت گفتگو کی ہے کہ

ترغیب وترہیب کے باب میں مذکور تساہل ونرم روی سے کیا مراد ہے جیسا کہ بعض دوسرے حضرات نے بھی وضاحت کی ہے، چنانچہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں: ''امام احمد نے یہ فرمایا ہے کہ ترغیب وترہیب کا معاملہ ہو تو ہم اسانید میں تساہل کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان اسانید سے اور ان اسانید کو نقل کرتے ہیں اگرچہ اس کے رواۃ ورجال ان ثقات میں سے نہ ہوں جو حجت مانے جاتے ہیں'' (فتاویٰ شیخ الاسلام ۶۶/۱۸)۔

۴- اس مذہب کی مصلحت وحکمت:

فضائل اعمال میں ضعیف پر عمل کی حجت ووجہ یہ ہے- جیسا کہ گذر چکا- کہ ایک حدیث جو بظاہر ضعیف ہے اور جس پر ہم عمل کرتے ہیں اگر وہ نفس الامر وواقع میں ثابت ہو تو اس کا حق ادا ہو جاتا ہے اور اگر وہ واقع میں ثابت نہ ہو تو اس پر کسی قسم کا دینی یا دنیوی مفسدہ نہیں مرتب ہوتا اس وجہ سے کہ اس پر عمل محض فضل وفضیلت کی جہت سے ہوتا ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ اس سے اصل عمل کا ثبوت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں اسی کو واضح کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

''فضائل اعمال کے حق میں حدیث ضعیف پر عمل کا جو جواز ومذہب (عام) علماء کا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حدیث ضعیف غیر حجت سے کسی عمل کا استحباب ثابت کیا جا رہا ہے جو دلیل شرعی کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔

اور جو آدمی بغیر کسی دلیل شرعی کے کسی عمل کی بابت کہتا ہے کہ فلاں عمل کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں تو اللہ کی شریعت میں ایسی چیز کی ایجاد کرتا ہے جو شریعت سے باہر ہے اور جس کی حق تعالیٰ نے اجازت نہیں دی ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اپنی طرف سے یا ایسی حدیث کی بنیاد پر حرمت ووجوب کو ثابت کرے۔ استحباب بھی (وجوب وحرمت کی طرح) ایک حکم ہے اس لئے علماء استحباب کے بارے میں بھی دوسرے امور کی طرح اختلاف کرتے ہیں بلکہ استحباب دین وشرع کی ایک اصل واساس ہے (کہ بہت سی چیزیں صرف اسی درجہ ومرتبہ میں رکھی گئی ہیں)۔

علماء کی اس اجازت ورائے کا مطلب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ایسے عمل سے متعلق ہو جس کا ثبوت کہ دوسرے دلائل سے موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں اور یہ ثبوت کسی نص (قرآنی یا حدیثی) سے ہو یا اجماع سے، جیسے قرآن کریم کی تلاوت، تسبیح، دعاء وصدقہ، غلام کی آزادی اور دیگر حسن سلوک وغیرہ۔

تو جن اعمال کا استحباب یا کراہت ثابت ہو ان سے متعلق اگر کوئی حدیث فضیلت کے بیان میں یا ثواب کے بیان میں آئے، اسی طرح ناپسندیدگی وسزا کے بیان میں آئے اور اس میں ثواب یا سزا کی شکل یا مقدار کا بیان ہو اور ہم کو اس حدیث کے موضوع ہونے کا علم نہ ہو تو ایسی حدیث ضعیف کی روایت درست ہے اور اس پر عمل بھی جائز ہے، اس حیثیت ونسبت سے کہ آدمی اس عمل کی بنا پر اس حدیث میں مذکور ثواب کی امید کرے یا سزا کا خوف کرے''

(فتاویٰ شیخ الاسلام ۶۵/۱۸، ۶۶)۔

نیز شیخ الاسلام یہ بھی فرماتے ہیں:

''جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ احادیث ضعیفہ پر فضائل اعمال میں عمل کیا جائے گا تو مطلب یہ ہے کہ ان امور پر عمل جن کا تذکرہ ایسی احادیث میں ہوتا ہے مثلاً تلاوت، ذکر، اوران برے امور واعمال سے اجتناب واحتراز جن کا ذکر ان احادیث میں ہوتا ہے۔ خلاصہ وحاصل یہ کہ حدیث کی روایت استحباب (وکراہت) کے اثبات کے لئے نہیں بلکہ ترغیب وترہیب کے لئے ہو، اورعمل بھی اسی جہت سے ہو'' (فتاوی شیخ الاسلام ۱۸ / ۶۶)۔

کچھ لوگ اس مضمون کی ایک روایت کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جس کی نسبت شیخ الاسلام نے سنن ترمذی کی طرف کی ہے لیکن وہ اس میں نہیں ہے، اس حدیث پر البانی اور عجلونی نے تفصیل سے کلام کیا ہے (ملاحظہ ہو: سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ رقم: ۴۵۱، ۵۲۴ و کشف الخفاء ۲ / ۲۴۶ و ۲۷۳)۔

۵- حدیث ضعیف پر عمل کا جواز صرف فضائل کی حد تک ہے:

حدیث ضعیف پر عمل کا جواز جس کا تذکرہ پیچھے تفصیل سے آیا اور جس پر علماء کا اتفاق ہے یا جو جمہور کا مذہب ہے یہ عمل فضائل اعمال اور اس قبیل کی چیزوں کے ساتھ خاص ومختص ہے، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ''اذکار'' میں فرماتے ہیں:

''حدیث ضعیف اگر موضوع نہ ہو تو اس پر فضائل، اور ترغیب وترہیب کے باب میں عمل کیا جاسکتا ہے'' (الاذکار ص: ۷)۔

یعنی جیسا کہ پیچھے شیخ الاسلام وغیرہ کی تحریر میں آیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے استقلالاً کوئی حکم جائز یا ناجائز ثابت کیا جائے بلکہ دوسرے دلائل سے ثابت جائز عمل سے متعلق فضیلت اور اجر وثواب کے بیان میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

اسی طرح جس چیز کا عدم جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہے اس سے متعلق وعید اور سزا وعقاب کے بیان ولحاظ میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

۶- فضائل میں حدیث ضعیف پر عمل کے شرائط کا بیان:

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل کا جواز جس کا تذکرہ کیا گیا، جمہور کے نزدیک یہ مطلق نہیں بلکہ مقید ہے اور اس کے کچھ شرائط ہیں اور مشہور ہے کہ یہ شرطیں تین ہیں جن کو یکجائی طور پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی مرتبہ اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، بعد کے حضرات نے ان کے بیان میں انہیں کی اتباع وتقلید کی ہے جیسا کہ سیوطی نے ''تدریب الراوی'' میں صراحت کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''ابن الصلاح ونووی نے اس بابت صرف ایک شرط- جو بنیادی ہے- ذکر کی ہے وہ ہے حدیث کا فضائل سے متعلق ہونا'' (تدریب الراوی ۱ / ۲۹۸)۔

حافظ ابن حجر کی ذکر کردہ تینوں شرطوں کو ان کے ممتاز شاگرد علامہ سخاوی نے اپنی کتاب ''القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع'' میں نقل کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے شیخ ابن حجر کو بار بار یہ کہتے سنا:

''ضعیف پر عمل کی تین شرطیں ہیں:

اول: ضعف شدید نہ ہو لہذا وہ احادیث اس سے باہر ہیں جن کو تنہا کوئی ایسا راوی نقل کرے جو کذابین ومتہمین میں سے ہو یا جو کثرت سے غلطی کرتا ہو۔

دوم: حدیث اپنے مضمون میں کسی اصل عام کے تحت داخل ہو لہذا وہ حدیث اس سے خارج ہے جس کا تعلق ایسے امور سے ہو جو ایجادی واختراعی ہوں اور ان کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو۔

سوم: عمل اس حیثیت سے نہ ہو کہ اس کے ثبوت وصحت کا عقیدہ رکھا جائے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی چیز کی نسبت نہ ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی'' (القول البدیع ص: ۱۹۵، تدریب الراوی ۱ / ۲۹۸ و ۲۹۹، والاجوبۃ الفاضلہ ص: ۴۱)۔

ان تین شرطوں میں سے پہلی تو متفق علیہ ہے جیسا کہ علائی نے ذکر کیا ہے، اور سخاوی نے بھی اتفاق نقل کیا ہے اس شرط کو ابن صلاح ونووی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور دوم وسوم کو عز الدین بن عبد السلام اور ابن دقیق نے ذکر کیا ہے (یہ تفصیل حافظ ابن حجر نے بھی کی ہے (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۴۱-۴۴) نیز ملاحظہ ہو: القول البدیع ص: ۱۹۵، التدریب ۱ / ۱۹۶)۔

۷-شروط مذکورہ کی وضاحت:

مذکورہ شروط کی ایک درجہ وضاحت گذشتہ تفصیلات وتصریحات میں آگئی ہے اور یہ شروط متاخرین کے درمیان معروف بھی ہیں لیکن بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مستقلاً اس بابت عرض وذکر کردیا جائے۔

شرط اول: پہلی شرط ہے شدت ضعف سے خالی ہونا اور ''شدید الضعف'' وہ حدیث کہلاتی ہے جس کا ضعف ایسا ہوتا ہے کہ تعدد طرق وغیرہ سے اس کی تقویت نہیں ہوتی اور اس کی وجہ سے وہ قبولیت کے آخری درجہ ''حسن لغیرہ'' تک نہیں پہنچ سکتی اس کے رواۃ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو وضع وکذب کے ساتھ متہم وموصوف ہوتے ہیں اسی طرح وہ غلطی کی کثرت نیز اختلاط، سوء حافظہ کے شکار ومتصف ہوتے ہیں۔

تیسری شرط: تیسری شرط یہ ہے کہ ایسی حدیث ضعیف پر عمل احتیاط کی بنیاد پر ہو، اعتقاد کی بنیاد پر نہیں یعنی پیش نظر یہ بات ہو کہ حدیث رسول ﷺ ہے اگر چہ ضعیف ہے مگر موضوع نہیں ہے، لہذا احتیاط اس میں ہے کہ اس کو ترک نہ کیا جائے، یہ بات نہ ہو کہ اس کو ثابت ہی مانا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ آدمی اگر اس پر عمل نہیں کرے گا تو ملامت یا سزا کا مستحق ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''اس قسم کی حدیث کو روایت کیا جائے اور ترغیب وترہیب میں اس پر عمل کیا جائے، اس سے استحباب کو ثابت نہ کیا جائے، اور نہ اس کے موجب ومضمون کا اعتقاد ویقین کیا جائے یعنی اس حدیث میں جو ثواب کی نوعیت ومقدار بیان کی گئی ہے اس کا یقین نہ کیا جائے، کیونکہ اعتقاد ویقین دلیل شرعی کی بنیاد ہوتا ہے (اور حدیث ضعیف کی یہ حیثیت نہیں ہے)'' (فتاوی شیخ الاسلام ۱۸/۶۸)۔

دوسری شرط: دوسری اور نہایت اہم شرط یہ ہے کہ حدیث کا مضمون کسی اصل کلی سے تعلق رکھتا ہو یعنی اس کا موضوع ایسا ہو جو کہ بنیادی طور پر شریعت سے کتاب وسنت سے ثابت ہو، خواہ کرنے کی حیثیت سے کہ اس کو اپنانے کا حکم ہو یا نہ کرنے کی نسبت سے کہ اس سے بچنے و دور رہنے کا حکم ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''علماء نے جو حدیث ضعیف پر عمل کی جو اجازت دی ہے، تو ان کا مطلب یہ ہے کہ اصل عمل (جس کا ایسی حدیث میں تذکرہ ہے) اس کے متعلق دوسرے دلائل سے یہ ثبوت ہو کہ حق تعالی اس کو پسند کرتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں خواہ یہ ثبوت نص کتاب وسنت سے ہو یا اجماع سے ہو جیسے قرآن کریم کی تلاوت، ذکر وتسبیح، دعاء وصدقہ، غلاموں کی آزادی اور عام حسن سلوک وغیرہ اسی طرح جھوٹ وخیانت وغیرہ کی ناپسندیدگی۔

لہذا جب کوئی حدیث کسی مستحب عمل کی فضیلت وثواب کے بیان میں وارد ہو یا بعض برے اعمال کی ناپسندیدگی وسزا کے ذکر میں وارد ہو اور ہم یہ جانتے ہوں کہ موضوع نہیں ہے تو اس کی روایت اور اس پر عمل جائز ہے۔

اور اگر فضائل سے متعلق ضعیف حدیث میں کسی چیز کا شکل ومقدار میں تحدید وتعیین کے ساتھ تذکرہ ہو (اسی طرح اس کا برعکس) مثلاً کسی خاص وقت میں مخصوص قراءت یا خاص کیفیت کے ساتھ نماز تو اس حدیث پر عمل جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اس خصوصی کیفیت ووقت کا استحباب کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے''۔

(فتاوی شیخ الاسلام ۱۸/۶۵)۔

مثلاً اشراق وچاشت کی نماز کہ نفس نماز کا بنیادی طور پر احادیث صحیحہ ومعتبرہ سے ثبوت ہے، تو اس کی فضیلت میں ضعیف روایت قابل لحاظ وقابل عمل ہے لیکن کسی روایت ضعیفہ میں اگر اس کے متعلق کیفیت وقراءت کا خصوصی تذکرہ ہو تو وہ اس تفصیل سے الگ ہوگی۔

شیخ نور الدین عتر اس شرط کی وضاحت اور اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ حدیث ضعیف پر فضائل اعمال کے باب میں بھی عمل ایک عبادت کی ایجاد واختراع اور دین میں تشریع واحداث یعنی بدعت ہے، فرماتے ہیں:

"یہ استحباب (جس کا لحاظ حدیث ضعیف پر عمل میں پیش نظر ہوتا ہے۔نفس استحباب) شریعت کے دوسرے قواعد سے معلوم وثابت ہے اور وہ ہے دین میں احتیاط کا استحباب ولحاظ (کہ کہیں کوئی کوتاہی وخلاف ورزی نہ ہونے پائے) اور حدیث ضعیف پر اس حال میں عمل اسی قبیل کی چیز ہے اس لئے ایسی صورت میں حدیث ضعیف کی بنیاد پر کسی شرعی چیز کے ثابت کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا۔

اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ حدیث ضعیف پر عمل کے جو شرائط ہیں ان کو اچھی طرح دیکھنے وجاننے والا واضح طور پر وہ بات سمجھتا ومحسوس کرتا ہے جو اس خیال کی تردید کرتی ہے کہ یہاں اور ایسی صورت میں شریعت میں کسی نئی چیز کو ثابت کرنا مقصود ہے۔

کیونکہ ان حضرات محدثین نے شرط یہ لگائی ہے کہ حدیث کا مضمون ایسا ہو جو شریعت سے ثابت عمومی واصولی چیزوں میں سے کسی اصل سے متعلق ہو۔تو ایسی صورت میں اصل مشروعیت تو عام اصل شرعی سے ثابت ہوتی ہے اور پیش نظر حدیث ضعیف (صرف) اس کی مؤید ہوتی ہے"

(منہج النقد عند المحدثین ص:۲۹۴)۔

۸-فضائل اعمال سے کیا مراد ہے؟

فضائل اعمال جن کے حق میں حدیث ضعیف پر عمل کی اجازت وجواز کا تذکرہ چل رہا ہے، بظاہر اور عموماً یہ سمجھا جاتا ہے اور سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے مراد اوامر وامتثال کا باب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں پر ہم سے عمل مطلوب ہے اور ہم کو حکم ہے ان کی فضیلت وترغیب میں حدیث ضعیف پائی جائے تو اس پر عمل کیا جائے گا اور نواہی وممنوعات سے اس کا تعلق نہیں کہ جن چیزوں کی ممانعت اور ان سے دور رہنے کا حکم ہے، ان سے متعلق یہ بات نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ نہیں کہ بلکہ یہاں مراد عام ہے اوامر ونواہی کرنے ونہ کرنے دونوں قسم کے اعمال سے اس حکم کا تعلق ہے کیونکہ لفظ فضائل جو فضیلۃ کی جمع ہے یہاں معروف مفہوم میں نہیں جس کا ماخذ لفظ فضُل (ضاد کے پیش کے ساتھ) ہے بلکہ یہ فضَل (ضاد کے زبر کے ساتھ) ہے جس کے معنی زائد ہونے کے ہیں، فضُل کا مصدر فضولا اور فضَل کا فضلا ہے (المعجم الوسیط)

،اور یہ زائد وزوائد کے مفہوم میں ہے یعنی فرائض وغیرہ سے جو امور زائد ومزید ہیں خواہ کرنے کے ہوں یا نہ کرنے کے۔

اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ معروف مفہوم میں اور فضل (ضاد کے زبر) سے ہے لیکن تغلیباً اس کا تعلق دونوں قسم کے امور سے ہے، البتہ چونکہ زیادہ تر اس قسم کی احادیث کا تعلق کرنے کے امور اور مستحب، وپسندیدہ اعمال سے ہے اور دوسری قسم کے یعنی ممنوع ونا پسندیدہ اعمال سے کم ہے، تو جو زیادہ ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے یہ تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

اور چونکہ مراد عموم ہے، اسی لئے یوں کہا کرتے ہیں کہ:

"فضائل اعمال خواہ مستحبات میں سے ہوں یا مکروہات میں سے، دونوں کے حق میں حدیث ضعیف پر عمل پسندیدہ ہے"، جیسا کہ گذشتہ سطور میں آچکا ہے۔

اسی نسبت سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے الفاظ آئے ہیں: جب بعض مستحب اعمال کی فضیلت وثبوت میں یا بعض اعمال کی کراہت وسزا میں کوئی حدیث ضعیف وارد ہو......الخ" (فتاوی شیخ الاسلام ۱۸/ ۶۵، ۶۶)۔

اور مراد کے عموم کی وجہ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لفظ "ترغیب وترہیب" کو محدثین نے ذکر کیا ہے، کبھی لفظ فضائل کے ساتھ اور کبھی اس کے بغیر بھی (ملاحظہ ہوں گذشتہ حوالہ جات)۔

نیز مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے اپنی کتاب "ظفر الامانی بشرح مختصر الجرجانی" کے اندر فضائل اعمال میں حدیث ضعیف کو قبول کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس بابت علماء کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے دو قول ذکر کئے ہیں ایک تو یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب نفس استحباب کا اثبات ہے، اور دوسرا قول جو ذکر کیا ہے جو اکثر کا ہے وہ یہ ہے:

''اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اعمال جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں ان کے حق مین حدیث ضعیف کو اس اعتبار سے قبول کرنا کہ جب کوئی حدیث ضعیف ایسی پائی جائے جو کسی مخصوص ثواب یا مخصوص عقاب وسزا کو بتاتی ہو اور ایسے کسی عمل کے بارے میں ہو جو دوسرے دلائل سے ثابت ہو تو ایسی حدیث کو قبول کیا جائے گا، اس لئے کہ اس صورت میں اصل عمل اور اس کا استحباب تو دوسرے دلائل سے ثابت ہے (حدیث ضعیف سے نفس عمل واستحباب کا ثبوت نہیں بلکہ صرف اس کی خاص فضیلت کا)'' (ظفر الامانی ص:۱۹۰)۔

۹-مثالیں:

جن حضرات نے اس موضوع پر تفصیل سے کلام کیا ہے انہوں نے مثالوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، چنانچہ مولانا عبدالحئی صاحب نے ایسی حدیث ضعیف کی چند مثالیں ذکر کی ہیں جن پر مذکورہ تینوں شرطیں منطبق ہیں اور اس کی وجہ سے باب فضائل میں ان پر عمل جائز سمجھا گیا ان احادیث میں ایک اذان میں ترسل (ٹھہراؤ اختیار کرنے) کی حدیث ہے اور ایک وضو میں گردن پر مسح کی (الاجوبۃ الفاضلہ ص:۴۴-۴۶)۔

لیکن احقر کو ان مذکورہ مثالوں میں تامل ہے، وجہ یہ ہے کہ مذکورہ دونوں امور ترسل اور گردن کا مسح یہ دونوں از قبیل احکام ہیں اور ہمارا نیز مولانا کا موضوع فضائل سے متعلق حدیث ضعیف اور اس پر عمل کی مثال ہے تو مثالیں بھی فضائل کو بتانے والی مطلوب ہیں نہ کہ احکام کی، اور مذکورہ دونوں امور نیز ان جیسے دیگر امور کو فقہاء نے مستحبات میں (یعنی مستقل حکم کی حیثیت سے نہ کہ فضل وفضیلت کی نسبت سے) ذکر کیا ہے اور مستحب جیسا کہ معلوم ہے احکام کی معروف پانچ اقسام میں سے ہے (الموجز فی اصول الفقہ ص:۴۸)۔

چنانچہ مولانا عبدالحئی صاحب نے بھی ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' میں اس موضوع پر گفتگو کے ضمن میں اعتراض کا ذکر کیا ہے (الاجوبۃ الفاضلہ ص:۵۳)۔

پھر جبکہ مثال میں ذکر کردہ دونوں حدیثیں ترسل ومسح کی ان کے اندر کسی فضل وفضیلت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ترسل کی حدیث میں حضرت بلال کے لئے اس کا حکم مذکور ہے (جامع الاصول ۵/۲۹۲، رواہ الترمذی فی ابواب الأذان)۔

اور مسح کی حدیث جو مسند احمد وغیرہ کی ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مذکور ہے (مسند احمد ۳/۴۸۱ وراجع نیل الاوطار ۱/۲۱۹، ۲۲۰)۔

اس لئے مثال میں تو ایسی حدیث مطلوب ہے جس میں دوسرے دلائل سے ثابت کسی عمل کے لئے فضیلت اور خصوصی ثواب کا تذکرہ ہو جیسے قرآن کریم کی سور وآیات کی فضیلت اور اجر وثواب کی احادیث۔

لہذا مسح رقبہ کی حدیث اگر ذکر ہی کرنی ہے تو وہ حدیث موقع کے مناسب ہے جس کو مولانا لکھنوی نے خود بھی اخیر مین ذکر فرمایا ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے اور جس کو دیلمی نے روایت کیا ہے۔

''مسح الرقبة أمان من الغل يوم القيامة'' (رواه الديلمي في الفردوس كما ذكر في تخريج الاحياء وكشف الخفاء)

(گردن کا مسح، قیامت کے دن گردن کے طوق سے امان کا ذریعہ ہوگا)

یہ حدیث بیان فضیلت پر مشتمل ہے، اصل حکم پر نہیں، اور ضعیف ہے، جیسا کہ عراقی نے ''تخریج احیاء'' (تخریج احادیث الاحیاء ۲/۴۶، الاجوبۃ الفاضلہ تعلیقات ص:۴۶) میں اور زبیدی نے ''اتحاف السادۃ المتقین'' میں کہا ہے (اتحاف السادۃ المتقین ۲/۳۲۵)۔

البتہ اس بابت ایک مرسل روایت بھی ہے جو صحیح ہے جیسا کہ مولانا ظفر احمد تھانوی علیہ الرحمہ نے ذکر کیا ہے (اعلاء السنن ۱/۶۷ تا ۶۹)۔

مرسل حدیث کو حافظ ابن حجر نے ''تلخیص الحبیر'' میں نقل کیا ہے اور فرمایا ہے:

''اس حدیث میں گنجائش ہے یہ کہنے کی کہ یہ اگرچہ سنداً موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے اس لئے کہ اس قسم کی بات عقل واجتہاد کی بنیاد پر نہیں کہی جاسکتی اور موقوف ہونے کے ساتھ یہ مرسل بھی ہے'' (تلخیص الحبیر ۱/۹۲)۔

اس حدیث کی بابت ایک جماعت کا موقف وضع کا بھی ہے، امام نووی وغیرہ سے ایسا ہی منقول ہے لیکن کچھ حضرات ضعف کے ساتھ ثبوت کے قائل ہیں۔ (کشف الخفاء ۲/۲۰۸، اس کی تفصیلی تخریج کے لئے ملاحظہ ہو: حاشیہ الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۴۵، و ۴۶)۔

۱۰- ایک مثال شروط کی تطبیق کے ساتھ:

شیخ نورالدین عتر نے اس کی مثال میں ابن ماجہ کی حدیث ذکر کی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے:

''من قام ليلتي العيدين يحتسب الله لم يمت قلبه يوم تموت القلوب''

(ابن ماجه كتاب الصيام باب فيمن قام ليلتي العيدين)۔

(جس آدمی نے عیدین کی رات کو محض اللہ کی رضا کے لئے زندہ کیا کہ راتوں کو نمازیں پڑھیں اس کا دل اس دن مردہ نہیں ہوگا جس دن سارے دل مردہ ہوجائیں گے)۔

یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ بوصیری وغیرہ نے کہا ہے (حاشیہ ابن ماجہ نسخہ مصطفی اعظمی)۔

شیخ نورالدین فرماتے ہیں: ''علماء کہتے ہیں کہ عیدین کی راتوں کا احیاء، ذکر وغیرہ طاعات وعبادات کے ذریعہ مستحب ہے، اور دلیل یہ حدیث ضعیف ہے، کیونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جاتا ہے جیسا کہ امام نووی نے ذکر کیا ہے''۔

آگے شیخ فرماتے ہیں:

''ہم کو معلوم ہے کہ شب بیداری اور راتوں میں عبادت کی تحریض وترغیب قرآن کریم اور سنت متواترہ میں ہے اور حق تعالی سے قرب حاصل کرنے کی سعی ذکر ودعا وغیرہ کے ذریعہ ہر وقت وہر حال میں اس کی رغبت دلائی گئی ہے تو یہ دونوں امور اپنے عموم کے تحت عیدین کی راتوں اور ان میں اہتمام طاعت وعبادت کو شامل ہیں جس کی فضیلت (مذکورہ حدیث ضعیف میں) ذکر کی گئی ہے''۔ (منہج النقد فی علوم الحدیث ص: ۲۹۵)۔

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق نصف شعبان کی رات کی نماز وعبادت کی روایات بھی اسی قبیل کی ہیں، شب بیداری کی عمومی فضیلت وحکم معلوم ومعروف ہے، نصف شعبان کی روایات اسی عموم کے تحت آتی ہیں جبکہ نصف شعبان کی روایات کافی تعداد میں ہیں''۔ (روایات کے لئے ملاحظہ ہو: تحفۃ الاحوذی ۳/۴۴۱، ۴۴۲)۔

ایسے ہی بعد مغرب دو سنت مؤکدہ کے علاوہ مزید نماز ورکعات سے متعلق روایات بھی مذکورہ عموم کے تحت داخل ہوکر بدرجہ فضل وفضیلت اعتبار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (روایات ترمذی وغیرہ میں آئی ہیں ملاحظہ ہو: جامع الاصول ۹/۴۰۳)۔

باب سوم

حدیث ضعیف مُتَلَقّٰی بالقبول
یعنی وہ حدیث ضعیف جس کو فی الجملہ مقبولیت حاصل ہو

فن کا یہ مسئلہ اتفاقی اور اختلاف سے خالی ہے کہ حدیث ضعیف کی نوعیت جب ایسی ہو کہ علماء امت اور مجتہدین کے یہاں وہ مقبول ومعروف ہو تو وہ ضعیف مطلق اور ضعیف محض کے حکم سے نکل جاتی ہے اور وہ اعتبار واعتماد کی ایک خاص نوعیت وحیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

۱-ضعیف متلقی بالقبول کی تعریف:

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ "نظم الدرر" کی شرح میں ایسی حدیث ضعیف جس کو تلقی بالقبول حاصل ہو اس کی تعریف وتوضیح میں فرماتے ہیں:

"حدیث ضعیف متلقی بالقبول وہ حدیث ہے جس کو علماء نے قبول کے ساتھ لیا ہو اگر چہ اس کی کوئی سند صحیح نہ ہو یا ائمہ حدیث کے نزدیک ودرمیان وہ معروف ومشہور ہو اور اس پر ان کے درمیان اور ان کی طرف سے کوئی نکیر نہ ہو" (الرحمۃ المرسلہ للیمانی، الاجوبۃ الفاضلۃ، التعلیقات ص:۲۲۹)۔

اور سیوطی سے یوں بھی منقول ہے:

"کسی حدیث کو جب لوگ-علماء-قبولیت کے ساتھ لیں تو اس کو صحیح قرار دیا جاتا ہے، اگر چہ اس کی کوئی اسناد صحیح نہ پائی جاتی ہو" (تدریب الراوی ۲/ ۶۷)۔

۲-اس بابت ائمہ فن کی تصریحات:

الف-اسفرائینی وابن فورک کا قول:

شیخ محسن یمانی نے اپنے رسالہ التحفۃ المرضیۃ میں اسفرائینی وابن فورک کا قول نقل کیا ہے:

"جب کوئی حدیث ائمہ حدیث کی طرف سے کسی نکیر کے بغیر ان کے درمیان مشہور ہو تو اس سے حدیث کی صحت کا علم ہوتا ہے" (التحفۃ المرضیۃ، الاجوبۃ الفاضلۃ، التعلیقات ص: ۲۲۱، نیز ملاحظہ ہو: النکت علی ابن الصلاح ص: ۳۷۳، توضیح الافکار ۱/ ۱۲۵)۔

ب-حافظ ابن حجر:

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ "النکت علی ابن الصلاح" میں فرماتے ہیں:

"حدیث کے قبول کی صفات واحوال میں سے یہ بھی ہے کہ علماء کسی حدیث کے مدلول کے مطابق عمل پر متفق ہوں، ایسی حدیث مقبول قرار پاتی ہے، ائمہ اصول کی ایک جماعت نے اس کی صراحت کی ہے" (النکت علی ابن الصلاح ص: ۴۹۴)۔

ج-علامہ باقلانی:

علامہ باقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"امت-یعنی علماء امت-یا بہت سے لوگ کہ جن کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو اور اس کا کوئی ثبوت بھی نہ ہو اس پر متفق ہوں کہ فلاں حدیث ثابت ہے تو یہ اس کے ثبوت واعتبار کی دلیل ہے" (النکت علی ابن الصلاح ص: ۳۷۳)۔

د-شیخ الاسلام ابن تیمیہ:

علامہ بلقینی نے اپنی کتاب ''محاسن الاصطلاح'' میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کا قول یوں نقل کیا ہے:

''بعض متاخرین حفاظ نے شافعیہ، حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے یہ لوگ اس حدیث کی صحت وثبوت کو قطعی مانتے ہیں جس کو امت کی طرف سے قبول حاصل ہو'' (النکت علی ابن الصلاح ص: ۳۷۴)۔

حافظ ابن حجر نے ''النکت'' میں شیخ الاسلام کے قول کا حاصل ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

''کسی حدیث کو امت جب قبول کے ساتھ لے خواہ یوں کہ اس کی تصدیق کرے اور اس کو ثابت مانے یا اس طرح کہ اس کے مضمون پر عمل کرے تو جمہور علماء سلف وخلف کے نزدیک یہ چیز یقین کا فائدہ دیتی ہے، (یعنی اس حدیث کی صحت وثبوت کی نسبت سے) اس کو اصول فقہ کے تمام مصنفین نے ذکر کیا ہے''

(النکت ص: ۳۷۴)۔

شیخ الاسلام نے مذاہب اربعہ کے نیز دیگر ان ممتاز علماء کا نام بھی ذکر کیا ہے جو اس کے قائل ہیں اور جنہوں نے اس کی صراحت کی ہے اور اسی ضمن میں ان کا یہ ارشاد آیا ہے:

''متاخرین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو اس مسئلہ میں اہل کلام کی متبع ہے کہ وہ اس کے منکر ہیں (اور اس طرح کے ثبوت وصحت کو نہیں مانتے) لیکن بہت سے اہل کلام بھی بلکہ اکثر اس مسئلہ میں فقہاء ومحدثین اور سلف کی موافقت کرتے ہیں'' (النکت ص: ۳۷۴)۔

اور اس سلسلہ میں ان کا خاتمہ کلام یہ ہے:

''اگر کسی خبر وحدیث کے ثبوت وصحت پر اجماع اس کی قطعیت اور اس کے یقینی ہونے کو واجب ولازم کرتا ہے تو اس میں علماء حدیث کے اجماع واتفاق کا اعتبار بدرجۂ اولی ہوگا جیسے کہ احکام شرعیہ وفقہیہ، کی بابت اجماع میں امر ونہی واباحت سے واقفیت رکھنے والے علماء کے اجماع کا اعتبار ہوتا ہے''

(النکت ص: ۳۷۴-۳۷۶)۔

اور اس سے بھی زیادہ واضح لفظوں میں شیخ کا قول ان کے فتاوی میں متعدد مواقع میں آیا ہے:

''وہ حدیث بھی صحیح کے قبیل کی ہے جس کو علماء حدیث کی طرف سے قبولیت حاصل ہو، جیسے بخاری ومسلم کی تمام احادیث ہیں کہ سارے محدثین ان دونوں کتابوں کی تمام احادیث کو قطعی طور پر صحیح مانتے ہیں اور حدیث سے واقفیت میں سارے لوگ ان علماء کے تابع ومتبع ہیں۔

علماء حدیث کا کسی حدیث کے صدق وثبوت پر اجماع ایسا ہی ہے جیسے فقہاء کا اس بات پر اجماع کہ فلاں فعل حلال یا حرام یا واجب ہے، اور جب اہل علم کسی چیز پر متفق ہوں تو اس میں ساری امت ان کے تابع ہوتی ہے کیونکہ علماء کا اجماع معصوم۔محفوظ عن الخطا۔ ہے، علماء امت کسی غلط وخطأ پر متفق نہیں ہوسکتے''

(فتاوی شیخ الاسلام ۱۸/ ۴۸)۔

ہ-ابن القیم:

ابن القیم علیہ الرحمۃ نے اجتہاد سے متعلق حضرت معاذ کی مشہور حدیث کی صحت وثبوت کی بابت گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''اگر چہ یہ احادیث اسناد کی رو سے ثابت نہیں ہیں لیکن چونکہ ایک بڑی جماعت نے بڑی جماعت سے ان کو نقل کیا ہے، تو یہ ان کے نزدیک صحیح وثابت ہیں اور اس کی وجہ سے وہ (ان روایات کے حق میں) اسناد کی طلب وصحت سے مستغنی رہے'' (اعلام الموقعین ۱/ ۲۰۲)۔

اسی طرح ابن القیم نے تلقین میت (اس حدیث کو حضرت ابوامامہ کے واسطہ سے طبرانی نے روایت کیا ہے جیسا کہ ابن القیم نے الروح ص ۲۱۳ میں ذکر کیا ہے نیز ابن صلاح نے اپنے فتاوی میں ذکر کیا ہے جیسا کہ نووی کی الاذکار (ص: ۱۳۸) میں ہے) کی حدیث کے متعلق فرمایا ہے:

''یہ حدیث - اگر چہ - (سنداً) ثابت نہیں ہے لیکن تمام شہروں وملکوں میں بغیر نکیر وانکار اس پر عمل کا ثبوت وتسلسل اس حدیث پر عمل کے جواز کے لئے کافی ہے'' (الروح ص: ۱۴)۔

و- ابن حزم:

ابن حزم علیہ الرحمۃ اس موضوع سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کبھی ایک حدیث مرسل ہونے کے حال میں وارد ہوتی ہے (اور اس وجہ سے وہ ضعیف ہوتی ہے)، لیکن اس کا مضمون ایسا ہوتا ہے کہ جو طبقہ در طبقہ یقینی طور پر منقول چلا آتا ہے اس کی وجہ سے اس پر اجماع کا ثبوت ہوتا ہے، ایسی صورت حال میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نقل عمومی ہے، قرآن مجید کی نقل وروایت کی طرح لہذا اس کو سند کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ صورت حال سند سے مستغنی ہوتی ہے اور اس صورت میں اس مضمون کی حدیث مرسل کا ورود وعدم ورود برابر ہوتا ہے (یعنی مضمون کا جب اجماع وتواتر کے ساتھ ثبوت ہوتا ہے تو پھر روایت کی ضرورت نہیں رہ جاتی) جیسے حدیث ''لا وصیۃ لوارث'' (کہ اس کا یہی حال ہے)''

(الاحکام لابن حزم ۲/ ۲۰۰)۔

ز- ابن عبد البر:

مشہور مالکی محقق، فقیہ ومحدث ابن عبد البر علیہ الرحمہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت پر اپنی کتاب ''التمہید'' میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس حدیث کے معنی پر لوگوں کے اجماع اور اس کے موافق علماء کے قول کے بعد اس کو سند کی ضرورت نہیں ہے یہ اس سے بے نیاز ہے''

(فتح المالک بترتیب التمہید ۵/ ۱۲ وتدریب الراوی ۱/ ۶۷)۔

اسی طرح ایک معروف حدیث ''ترکت فیکم أمرین'' (موطا مالک، کتاب الجامع، ورواہ الحاکم فی المستدرک ۹۳/۱) پر ''تجرید التمہید'' میں گفتگو کے درمیان فرماتے ہیں:

''یہ حدیث اہل علم کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محفوظ ومشہور ہے اور اس کی ایسی شہرت ہے کہ جس کی وجہ سے اس کو اسناد سے ایک قسم کا استغناء ہے'' (تجرید التمہید ص: ۲۵۱)۔

۳- بعض ائمہ مجتہدین کے اقوال:

امت کے معروف ومتبوع ائمہ مجتہدین سے بھی یہ بات منقول ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور بطور ایک قاعدہ وکلیہ:

''کسی حدیث کا مدینہ میں مشہور ہونا اس کو صحت سند سے مستغنی کر دیتا ہے'' (سند الدارقطنی ۲/ ۴۴۱)۔

امام موصوف کا یہ ارشاد حاصل ومراد ہے ابن حزم کی اس تفصیلی عبارت کا جس کا ذکر پیچھے گذرا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الام'' میں پانی کی پاکی وناپاکی سے متعلق ایک روایت کہ ''نجاست جب پانی کے مزہ، بو اور رنگ کو بدل دے تو پانی ناپاک قرار پائے گا'' (رواہ الطحاوی والدارقطنی والطبرانی وابن ماجہ، اور ملاحظہ ہو: ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب الحیاض وشرح معانی الآثار، ابواب الطہارۃ باب الماء یقع فیہ النجاسۃ - ابوحاتم نے اس کو مرسلاً صحیح قرار دیا ہے، لہذا مرفوع موصول ضعیف اگر اس کو ضعیف مانیں تو مرسل صحیح سے تائید وتقویت کی بنیاد پر مقبول ہے (ملاحظہ ہو: اعلاء السنن ۱/ ۱۷۹، وامانی الاخبار شرح معانی الآثار ۱/ ۴۶، وتحب الافکار وتلخیص الحبیر ۱/ ۴) کے ذکر میں فرماتے ہیں:

''میں نے جو یہ ذکر کیا کہ پانی کا مزہ، اور رنگ وبو بدل جائے تو پانی ناپاک ہو جائے گا یہ مضمون نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، مگر اس طرح کہ محدثین اس کو ثابت نہیں مانتے (کیونکہ اس کی سند کمزور ہے)، لیکن سب کا قول یہی ہے اور اس بابت علماء کا کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں ہے''

(کتاب الام ۱/ ۳ واختلاف الحدیث ص: ۱۰۸)۔

اور ایک معروف حدیث ''لا وصیۃ لوارث'' (اس حدیث کو ترمذی ونسائی وابوداؤد نے روایت کیا ہے، ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے اور جامع الاصول کے محقق نے ترمذی ونسائی کی روایت کو حسن اور ابوداؤد کی روایت کو صحیح کہا ہے۔ ملاحظہ ہو: جامع الاصول ۱/ ۲، ۳۳۲، ۳۳۳)۔ جس کا ذکر ابن حزم کے کلام

میں آیا ہے اس حدیث کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں:

''علماء حدیث اس کو ثابت نہیں مانتے لیکن سب نے اس کو قبول کے ساتھ لیا ہے اور اس پر عمل کیا ہے حتی کہ اس کو ورثہ کے حق میں وصیت کی آیت کے لئے ناسخ قرار دیا ہے'' (النکت مع التعلیقات ص: ۴۹۴ و ۴۹۵)۔

امام شافعی وابن حزم وغیرہ کی رائے میں اس حدیث کا از روئے سند ثبوت محل نظر ہے، اس لئے ان حضرات نے یہ بات فرمائی ہے ورنہ ائمہ محدثین کی ایک جماعت اس کو صحیح وثابت مانتی ہے جیسے امام ترمذی وغیرہ۔

شیخ عبد الفتاح کے استاذ خاص علامہ زاہد الکوثری جو وقت کے ممتاز فقہاء احناف اور محققین ومحدثین میں سے تھے انہوں نے ایک مستقل مضمون لکھا جس میں حدیث کے ثبوت نیز اس پر عمل کی نسبت سے علماء کے اجماع کا تذکرہ کیا ہے، یہ مقالہ ان کے مجموعہ مقالات میں شامل ہے (ملاحظہ ہو مقالات الکوثری شیخ عبد الفتاح نے الاجوبۃ الفاضلۃ کی تعلیقات میں اس کا تذکرہ کیا ہے (ص: ۵۲)۔

۴- تلقی بالقبول کی صورتیں وشکلیں:

علماء امت کی طرف سے کسی حدیث کو قبولیت - جس کو تلقی بالقبول کہتے ہیں یہ قبولیت - کبھی نقل وروایت کے واسطے سے اور کبھی عمل وافتاء کی رو سے ہوتی ہے یعنی اس کی دو صورتیں ہیں:

اول: امت اور علماء امت کے درمیان تلقی کی صورت یہ ہو کہ اس کی نقل وروایت ان کے درمیان بغیر نکیر کے معروف ومشہور ہو، اسفرائینی کا جو قول شروع میں گذرا ہے:

''ائمہ حدیث کے نزدیک کسی حدیث کی شہرت جب بغیر انکار ونکیر ہو تو اس سے حدیث کی صحت کا علم ہوتا ہے'' (الاجوبۃ الفاضلۃ، التعلیقات ص: ۲۳۱)۔

اس کا یہی مطلب ومصداق ہے، اور اسی کو امام مالک علیہ الرحمہ نے اپنے قول میں مراد لیا ہے:

''مدینہ میں کسی حدیث کی شہرت سند سے مستغنی کرتی ہے'' (سنن الدارقطنی ۲/۲۴۱)۔

دوم: تلقی کی دوسری صورت یہ ہے کہ علماء امت کا عمل اور فتوی اس کے موافق ہو یعنی علماء امت کے درمیان اس کا قبول قول وعمل، نقل وفعل دونوں کی رو سے ہو، امام ترمذی علیہ الرحمہ اپنی جامع میں بہت سی احادیث سے متعلق جو یہ ذکر کیا کرتے ہیں "والعمل علیہ عند أهل العلم" یا اس قسم کے دوسرے الفاظ تو اس سے ان کے نزدیک تلقی کی یہی صورت مراد ہوتی ہے۔

اور یہ بات وہ جیسے ان احادیث کے حق میں ذکر کرتے ہیں جن کی صحت کی وہ صراحت کرتے ہیں مثلاً باب کراهة الاستنجاء باليمين اور باب الاستنجاء بالماء میں □ اسی طرح ان احادیث کے حق میں بھی ذکر کیا کرتے ہیں جن کے حق میں ضعف وغرابت کا وہ ذکر کرتے ہیں مثلاً:

باب ما جاء في من استقاء عمدًا، باب ما جاء في الصلاة على الدابة في الطين والمطر. باب ما جاء في الرجل يقتل ابنه

امام ترمذی کی جامع کی جہاں یہ خصوصیت ہے کہ وہ حدیث کی حیثیت وحکم کا عموماً تذکرہ کرتے ہیں وہیں مذاہب کا بھی ذکر کرتے ہیں اور بکثرت ایسا ہے کہ حدیث یا بعض رواۃ کے ضعف کا تذکرہ کرنے کے ساتھ بھی وہ حدیث کے موافق عمل کی بات ذکر کرتے ہیں جس سے ان کی مراد عمل وفتوی کی رو سے تلقی وقبول سے ہوتی ہے۔

سیوطی امام ترمذی کے اس قسم کے لفظ کی شرح میں فرماتے ہیں:

''اشارہ ہے کہ یہ حدیث (ضعیف ہے مگر) اہل علم کے قول سے مؤید وقوی ہے'' (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۴۰)۔

مولانا ظفر احمد تھانوی نے ''اعلاء السنن'' میں تلقی کی تفصیل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''تلقی کبھی قول سے ہوتی ہے اور کبھی فعل وعمل سے'' (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۴۰)۔

اس سے بظاہر یہی مذکورہ دونوں صورتیں مراد ہیں جن کا تفصیل سے ذکر کیا گیا کیونکہ قول کے ذریعہ قبول نقل وروایت اور عمل کے ذریعہ قبول حدیث

کے موافق فتوی وعمل ہے۔

اور یہی بات شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی سابق ایک عبارت وصراحت سے سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے: جس حدیث کو امت نے تلقی کے ساتھ لیا ہو یوں کہ اس کی تصدیق کی ہو یا اس کے مدلول پر عمل کیا ہو تو ایسی حدیث جمہور اہل علم کے نزدیک یقین کا فائدہ دیتی ہے" (فتاوی شیخ الاسلام ۱۸/ ۴۰۸)۔

ان کی اس عبارت میں تلقی کی دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں ایک تصدیق کے واسطہ سے تلقی، دوسری حدیث کے مفہوم ومدلول پر عمل سے تلقی۔

۵- تلقی بالقبول کا حکم یا حدیث متلقی بالقبول کی حیثیت ومرتبہ:

حدیث ضعیف کی قبول کے ساتھ تلقی اسناد اور صحت سند میں نظر سے کہیں اہم وبڑھ کر ہے۔ اس تلقی کا معاملہ یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف کو صحیح اخبار احاد کے درجہ میں پہنچا دیتی ہے اور ایسی حدیث کے ساتھ صحیح اخبار احاد کا معاملہ کیا جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات تلقی حدیث کو ایسی بلندی وتفوق عطا کرتی ہے کہ اس کی وجہ سے حدیث ضعیف قطعیت وقوت کے اس درجہ کو پالیتی ہے جو خبر متواتر کا ہے حتی کہ اس کی وجہ سے اس کے مخالف ومعارض کو منسوخ مانا جاتا ہے اگر چہ معارض قطعیات میں سے ہو جیسے کہ حدیث متواتر قطعی امر کو (معارضہ کی صورت میں) منسوخ کر دیتی ہے۔

لیکن یہ موقوف ہے تلقی کی نوعیت وکیفیت اور قوت پر اس لئے کہ تلقی ایک ہی انداز کی اور ایک ہی انداز پر نہیں ہوتی، اس لئے قبول کے ساتھ تلقی حاصل کرنے والی حدیث ضعیف ایک ہی حال ومرتبہ کی نہیں ہوتی بلکہ اس میں فرق مراتب پایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک حدیث ضعیف وہ ہے جس پر تمام فقہاء ومجتہدین کا عمل ہے اور سب کے نزدیک اس کا اعتبار ہے اور ایک وہ ہے جو بعض کے نزدیک معتبر ومعمول بہ ہے دونوں کے درمیان فرق کیا جائے گا امام ترمذی کبھی تمام اہل علم کا عمل ذکر کرتے ہیں اور کبھی بعض کا۔

الف- ابن فورک کا قول:

حافظ ابن حجر نے ابن فورک سے اس بابت تفصیل یوں نقل کی ہے:

"اگر کسی حدیث ضعیف پر صرف عمل کی حد تک لوگ متفق ہوں تو اس کو قطعی طور پر ثابت نہیں مانا جائے گا، اور اس کو اس پر محمول کریں گے جیسے کہ خبر واحد صحیح پر عمل واجب ہوتا ہے، لیکن اگر قبول کے ساتھ تلقی قول وفعل- روایت اور عمل وفتوی دونوں کی رو سے ہو تو قطعی طور پر اس کے صدق وثبوت کا حکم لگایا جائے گا"

(النکت علی ابن الصلاح ص: ۳۷۴)۔

ب- ابوبکر جصاص رازی کا قول:

ابوبکر جصاص رازی "احکام القرآن" میں بعض ایسی احادیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"امت نے ان دونوں احادیث کو عمل میں اختیار کیا ہے اگر چہ ان کی روایت احادی طور پر ہے، لیکن امت کے اس پر عمل کی وجہ سے یہ تواتر کے درجہ میں ہو گئی ہے، کیونکہ جس خبر واحد کو علماء قبول کے ساتھ لیتے ہیں وہ ہمارے نزدیک متواتر کے مفہوم ودرجہ میں ہوتی ہے وجہ ہم نے متعدد مواقع میں بیان کی ہے"

(احکام القرآن للجصاص ۱/ ۳۲۲)۔

جصاص کے قول میں مذکور دونوں احادیث سے حضرت عائشہ وحضرت ابن عمرؓ کی روایات ذیل مراد ہیں:

"طلاق الأمة تطليقتان وقرؤها حيضتان" اور "تطليق الأمة تطليقتان وعدتها حيضتان"۔

(حضرت عائشہ کی روایت ترمذی (الطلاق باب ماجاء أن طلاق الأمة تطليقتان) میں آئی ہے اور ابن عمرؓ کی ابن ماجہ وبیہقی نے مرفوعا اور امام مالک وامام شافعی نے موقوفا روایت کیا ہے، حضرت عائشہ کی حدیث ابوداؤد میں بھی ہے ملاحظہ ہو: جامع الاصول ۷/ ۶۱۲ کا حاشیہ)۔

ج-ابن حجر کا قول:

حافظ ابن حجر نے ''النکت'' میں اس بابت گفتگو کرتے ہوئے اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:

''کسی خبر کی صحت پر امت کا اتفاق واجماع بلاشبہ اس خبر سے زیادہ یقین کا فائدہ دیتا ہے جو قرائن کے ساتھ ہوتی ہے یا متعدد طرق سے مروی ہوتی ہے''

(النکت ص: ۳۷۸)۔

۶-تلقی بالقبول سے حدیث صحیح کو بھی نفع ہوتا ہے:

حافظ ابن صلاح نے اپنی ''شرح صحیح بخاری'' کے اندر شیخین کی ذکر کردہ روایات کی حیثیت وحکم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''جس حدیث پر یہ دونوں حضرات متفق ہیں (کہ دونوں نے اس کو روایت کیا ہے) وہ قطعی طور پر ثابت ہے اس لئے کہ امت نے ان دونوں کتابوں اور ایسی احادیث کو قبول کے ساتھ لیا ہے۔

اور ایسی احادیث سے علم نظری کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اس سے متواتر کی طرح یقین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ متواتر سے علم ضروری بدیہی کا حصول ہوتا ہے اور تلقی والی حدیث سے علم نظری کا'' (مقدمہ ابن صلاح ص: ۲۴ و ۲۵ و النکت ص: ۳۷۲)۔

حافظ ابن حجر نے ''نخبۃ ونزہۃ'' میں یہ گفتگو کرتے ہوئے کہ خبر واحد صحیح ذاتی طور پر ظن غالب کا فائدہ دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ جب مخصوص قرائن پائے جائیں تو وہ متواتر کی طرح یقین کا فائدہ دیتی ہے لیکن یقین نظری کا اور قرائن میں اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ کوئی حدیث صحیحین میں مذکور ہو یعنی دونوں میں پھر اس کے دلائل ووجوہ ذکر فرماتے ہیں (نخبہ ونزہۃ ص: ۲۶ و ۲۷)۔

اور حافظ ابن حجر ''النکت'' میں فرماتے ہیں:

''ابونصر عبدالوہاب مالکی نے اس حدیث کو جزماً وقطعاً صحیح قرار دیا ہے جس کو تلقی بالقبول حاصل ہو (یعنی روایۃ) البتہ اگر کسی حدیث پر عمل کے حق میں امت متفق ہو تو کیا یہ چیز صحت کی دلیل ہوگی؟ اس میں اختلاف ذکر کیا ہے'' (النکت ص: ۳۷۳)۔

گذشتہ صفحات میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے اقوال میں یہ بات آئی ہے کہ مذاہب اربعہ کی ایک جماعت وائمہ اس حدیث کو قطعی طور پر صحیح مانتے ہیں جس کو امت کی طرف سے تلقی بالقبول حاصل ہو (النکت ص: ۳۷۴)۔

اسی طرح یہ قول بھی کہ جس حدیث کو تلقی بالقبول حاصل ہو وہ جمہور علماء سلف وخلف کے نزدیک یقین کا فائدہ دیتی ہے (النکت ص: ۳۷۴)۔

۷-حدیث ضعیف کو تلقی سے قبول واعتبار نیز صحت کا فائدہ ہوتا ہے:

کسی حدیث ضعیف کو جب امت کے مجتہدین ومحدثین کی طرف سے تلقی بالقبول کا حصول ہوتا ہے تو وہ نکارت وضعف کی حد سے نکل کر قبول واعتبار بلکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اور وہ حدیث مقبول کی ایک قسم قرار پاتی ہے۔

حافظ ابن حجر نے ''النکت'' میں اس کی صراحت کی ہے (النکت ص: ۳۷۴)۔

۸-حدیث ضعیف تلقی سے کبھی تواتر کی قوت حاصل کرتی ہے:

حافظ سخاوی ''فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث'' میں فرماتے ہیں:

''امت جب کسی حدیث ضعیف کو قبولیت کے ساتھ لے تو قول صحیح کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا، یعنی وجوبا جیسا کہ حافظ ابن حجر نے صراحت کی ہے اور خود سخاوی نے بھی بعد میں ذکر کیا ہے۔

''ایسی حدیث متواتر کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ قطعی دلیل کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے اسی وجہ سے امام شافعی علیہ الرحمۃ نے حدیث

"لا وصیۃ لوارث" کے حق میں فرمایا ہے کہ علماء حدیث تو اس کو ثابت نہیں مانتے لیکن سب ہی علماء نے اس کو قبولیت کے ساتھ لیا ہے اور اس پر عمل کیا ہے حتی کہ اس حدیث کو آیت وصیت کے لئے ناسخ قرار دیا ہے" (فتح المغیث ص: ۲۸۵، النکت ص: ۴۹۵، الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۱، ۵۲)۔

۹- سابقہ اقوال ونقول کا خلاصہ:

گذشتہ سطور میں جن تصریحات، اقوال ونقول کا ذکر آیا ہے ان کا حاصل یہ ہے کہ

حدیث ضعیف کو تلقی بالقبول کی وجہ سے ایک خاص حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور ایسی کہ وہ صحیح وحسن خبر واحد کے درجہ میں مقبول قرار پاتی ہے یہی نہیں بلکہ اخبار احاد کی تمام اقسام سے اعلی وارفع قرار پاتی ہے حتی کہ تلقی اس کو کبھی اس حیثیت میں بھی کر دیتی ہے کہ وہ متواتر کے مساوی ومتوازی بن جاتی ہے جو خبر کی سب سے اعلی واقوی قسم ہے اور ثبوت نیز صحت وقوت میں تمام دلائل شرعیہ میں فائق ہے۔

اسی وجہ سے ایسی صورت میں حدیث ضعیف قطعیت میں اور علم ویقین کا فائدہ دینے میں متواتر کا حکم رکھتی ہے، اور اسی طرح مخالف ومعارض قطعی خبر ودلیل کے لئے نسخ کا فائدہ بھی دیتی ہے جبکہ نسخ کے قرائن وشرائط پورے ہو رہے ہوں۔

۱۰- تلقی بالقبول حاصل کرنے والی حدیث سے علم ویقین نظری کا حصول ہوتا ہے:

البتہ متواتر اور حدیث متلقی بالقبول بدرجۂ متواتر کے درمیان فرق یہ ہے کہ متواتر اصطلاحی سے تو علم ضروری وبدیہی حاصل ہوتا ہے، اور ایسی حدیث سے علم نظری حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ ابن صلاح نے ذکر کیا ہے (مقدمہ مع النکت ص: ۳۷۲)،

اور جیسا کہ حافظ ابن حجر نے صحیح اخبار احاد کے لیتے ذکر کیا ہے جبکہ اس کے ساتھ کچھ خاص قرائن پائے جائیں (نزہۃ النظر ص: ۲۶)۔

واضح ہو کہ نظری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں غور وفکر، دقت نظر، اصول وضوابط وغیرہ کی تحقیق وتفتیش اور تطبیق کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ ضروری وبدیہی کا مطلب ہوتا ہے سہولت سے اور برجستہ حاصل ہونے والا یہی وجہ ہے کہ بدیہی کا حصول خواص اہل علم کے ساتھ مختص نہیں ہوتا اور نظری اہل نظر وخواص اہل علم کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

۱۱- تلقی کی دونوں صورتوں کے درمیان حکم کا فرق:

اس موقع سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ تلقی کی دو بنیادی شکلیں جو ذکر کی گئی ہیں جن کی وضاحت تفصیل سے آچکی ہے کیا حکم اور فائدہ وافادہ میں دونوں کے درمیان کوئی فرق ہے؟

تو عام طور سے جو بات کہی گئی ہے اس سے تو بظاہر اطلاق سمجھ میں آتا ہے اور یہ کہ دونوں میں فرق وتفصیل نہیں ہے لیکن ابن فورک وابونصر مالکی کے کلام سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ فرق وتفصیل ہے، حافظ ابن حجر کا میلان بھی یہی سمجھ میں آتا ہے اس لئے کہ انہوں نے دونوں کا کلام کسی نقد ورد کے بغیر نقل کیا ہے۔

ابن فورک کا قول ہے:

"تلقی اگر قولاً وفعلاً (دونوں) ہو تو قطعی صدق وثبوت کا حکم لگایا جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو حکم خبر واحد پر وجوب عمل کے درجہ میں رکھا جاتا ہے اور قطعی ثبوت کا اعتبار نہیں ہوتا" (النکت ص: ۳۷۳)۔

فقہاء حنفیہ نے اجماع کی اقسام واحکام میں جو تفصیل ذکر کی ہے اس سے بھی اس کی ایک درجہ تائید ہوتی ہے اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک اجماع متواتر واجماع مشہور کے درمیان حکماً فرق ہے (الموجز ص: ۲۰۲، ۲۱۹، ۲۲۴، فواتح الرحموت ۲ / ۲۴۲، ۲۴۳)۔

لہذا ابن فورک وغیرہ کی تفصیل ورائے کے مطابق ہم کہتے ہیں:

۱- ضعیف کی قبول کے ساتھ تلقی اگر صرف عمل سے ہو تو اس کی وجہ سے ضعیف اخبار صحیح احادیث کے مرتبہ میں ہوگی جو صرف وجوب عمل کا فائدہ دیتی ہیں۔

۲- اور اگر تلقی عمل کے ساتھ قول، نقل وروایت اور فتوی سب کے ساتھ ہو تو حدیث ضعیف خبر متواتر کے درجہ میں ہوتی ہے اور علم نظری کا فائدہ دیتی ہے، جیسا کہ ابن صلاح نے ذکر کیا ہے (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۲۴، ۲۵، النکت ص: ۳۷۲)

اور قطعی کے حق میں بھی نسخ کا کام کرتی ہے جیسا کہ سخاوی نے ذکر کیا ہے (فتح المغیث ص: ۲۸۵)۔

۱۲- مثالیں:

ایسی احادیث ضعیفہ جن کو پیچھے ذکر کردہ تفصیل کے مطابق تلقی وقبول حاصل ہو ان کا بڑا ماخذ وذخیرہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی "جامع" ہے، کہ ان کی اس کتاب میں حسن احادیث کا بہت بڑا حصہ ہے جو مختلف قسم کی ہیں جن میں یہ شکل بھی فی الجملہ داخل ہے۔

امام ترمذی اپنی اس کتاب میں کثرت سے حدیث کے ضعف وغرابت کا تذکرہ کرنے کے ساتھ فرماتے ہیں:

"وعليه العمل عند أهل العلم" یا "والعمل عليه عند أكثر أهل العلم"

یعنی سارے اہل علم یا اکثر اہل علم کے نزدیک عمل اسی حدیث پر اور اس کے موافق ہے۔

۱۳- مثال مع توضیح وتطبیق:

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے "الاجوبۃ الفاضلۃ" کی تعلیقات کے اواخر میں بطور مثال ذکر فرمایا ہے (الاجوبۃ الفاضلۃ التعلیقات ص: ۲۲۴):

"اس کی ایک مثال حدیث من ذرعه القيئ... الخ ہے کہ جس کو روزے کے حال میں قے آئے تو اس پر قضا نہیں ہے اور اگر آدمی (قصداً) قے کرے تو قضا کرے (الترمذی مع التحفۃ ۳/۴۰۹-۴۱۱ باب من ذرعہ القئ من ابواب القیامۃ)۔

حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" کتاب الصیام باب الحجامۃ والقئ للصائم میں ذکر کیا ہے:

"امام بخاری نے "تاریخ کبیر" میں ذکر کیا ہے:

"قال مسدد عن عيسى بن يونس حدثنا هشام بن حسان عن محمد بن سيرين عن أبي هريرة رضي الله عنه: من ذرعه القئ الحديث"۔

امام بخاری کا کہنا ہے: یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

اس حدیث کو اصحاب سنن اربعہ نے نیز حاکم نے عیسی بن یونس کے طریق سے روایت کیا ہے۔

امام ترمذی نے فرمایا ہے:

"یہ حدیث غریب ہے، ہم اس کو صرف عیسی بن یونس کی روایت سے جانتے ہیں انہوں نے اس کو ہشام سے نقل کیا ہے اور میں نے امام بخاری سے اس کے متعلق معلوم کیا تو انہوں نے فرمایا: "میں اس حدیث کو محفوظ-ثابت-نہیں سمجھتا"۔

اس حدیث کو ابن ماجہ اور حاکم نے حفص بن غیاث کے طریق سے ہشام سے نقل کیا ہے۔

امام ترمذی نے اس کو روایت کرنے کے بعد اس کے حق میں کلام کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے:

"یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مختلف طرق سے مروی ہے اور اس کی سند صحیح نہیں ہے، البتہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے" (فتح الباری ۴/۱۵۲)۔

باب چہارم

حدیث ضعیف منجبر یعنی حدیث حسن لغیرہ

(یعنی وہ حدیث ضعیف جو قرائن سے قوت پا جاتی ہے اور ضعف کی تلافی ودوری ہو جاتی ہے)

۱- حدیث حسن لغیرہ کی تعریف:

یہ مسئلہ بھی ایسا ہے کہ جس کی بابت ہم کو اجماع اور عدم اختلاف کا دعوی کرنا ممکن ہے اور یہ مسئلہ ہے حدیث ضعیف کے ضعف کے انجبار یعنی قرائن سے تائید وتاکد کا جبکہ اس کے لئے کوئی ایسا امر وقرینہ مل جائے جس کا ائمہ حدیث کے نزدیک اعتبار ہے، اس لئے کہ بالخصوص متاخرین محدثین اور علماء محققین کے نزدیک یہ معروف ہے کہ حدیث مقبول کی دو قسمیں ہیں صحیح اور حسن۔

پھر حسن کی دو قسمیں ہیں جیسے صحیح کی دو قسمیں ہیں۔

حسن کی دو اقسام ہیں حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ۔

اور جس حدیث کو حسن لغیرہ کہتے ہیں وہ ایسی ہی حدیث ہوتی ہے جو اپنی اصل میں ضعیف ہوتی ہے اور اس کا ضعف ان چیزوں میں سے کسی کے ساتھ میں پائے جانے کی وجہ سے دور ہو جاتا ہے جن کا حدیث ضعیف کے ضعف کا ازالہ اور اس کی تقویت کے لئے اعتبار کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمود طحان نے حسن لغیرہ کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

"هو الضعيف إذا تعددت طرقه" (تیسیر مصطلح الحدیث ص:۵۱)۔

(حسن لغیرہ حدیث ضعیف ہوتی ہے جس کے طرق کئی ہوں)۔

ڈاکٹر نور الدین عتر نے "منهج النقد في علوم الحديث" میں تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جو (کسی چیز سے) تقویت پانے کی وجہ سے حسن کے درجہ ومرتبہ تک پہنچ جائے" (منهج النقد في علوم الحديث ص:۲۶۸)۔

علامہ سخاوی نے "فتح المغيث" میں فرمایا ہے:

"حسن لغیرہ اصلاً ضعیف ہوتی ہے لیکن کسی مؤید کی وجہ سے تقویت پا کر وہ حسن بن جاتی ہے" (فتح المغيث ص:۲۵)۔

حافظ ابن حجر خبر واحد کی صحیح وحسن اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جس حدیث میں توقف کیا جائے جب کوئی قرینہ مل جائے جو اس کی قبولیت کے پہلو کو راجح قرار دے تو ایسی حدیث بھی حسن کہلاتی ہے لیکن اس کو حسن لغیرہ کہتے ہیں" (نخبہ ونزہہ ص:۲۹)۔

اور حافظ ابن حجر نے جو توقف کی بات ذکر کی ہے تو انہوں نے ضعیف مطلق ومردود مطلق- یا یوں کہئے کہ ضعیف کا عمومی وعام حکم یہ ذکر کیا ہے کہ اس کے بارے میں توقف وتفتیش سے کام لیا جائے گا کیونکہ انہوں نے فرمایا ہے:

"اخبار آحاد مقبول بھی ہوتی ہیں اور مردود بھی اور مردود وہ حدیث کہلاتی ہے جس کے مخبر کا صدق راجح نہ ہو"۔

اور آخری بات انہوں نے یہ فرمائی ہے قبولیت ورد اور صدق وکذب کے ثبوت کے اعتبار سے تین پہلو ذکر کرتے ہوئے:

''تیسری شق یہ ہے کہ اگر کوئی قرینہ مل جائے جو حدیث (ضعیف) کو دونوں قسموں (ثابت وغیر ثابت) میں سے کسی ایک سے ملحق کردے تو وہ اس کے ساتھ ملحق ہوجائے گی (ثابت یا غیر ثابت مانی جائے گی) ورنہ اس کے بارے میں توقف کیا جائے گا'' (نزہۃ النظر ص: ۲۶)۔

سعودیہ کی لجنۃ دائمۃ للافتاء کے مجموعہ فتاوی میں ہے:

''احکام کے اثبات کے لئے حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا جبکہ اس حدیث ضعیف کو کسی دوسری حدیث سے تقویت حاصل ہوجو اس کی ہم معنی وہم مضمون ہو یا یہ کہ خود وہ کئی طرق سے مروی ہونے کی بنا پر معروف ہو کہ اس صورت میں وہ حسن لغیرہ کے قبیل سے ہوگی جو حدیث کی قابل احتجاج اقسام میں سے چوتھی قسم ہے'' (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۹۶/۴)۔

۲- حدیث حسن لغیرہ کا حکم ومرتبہ:

حدیث حسن لغیرہ کا حکم یہ ہے کہ وہ حجت وقابل عمل ہے، جمہور علماء مجتہدین واصولیین وغیرہ کا یہی مذہب ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی صحیح میں ایسی احادیث کا تذکرہ کیا ہے اگر چہ وہ معلقات میں سے ہیں'' (النکت علی ابن الصلاح ص: ۳۴۰ تا ۳۴۲)۔

اور چونکہ ''حدیث ضعیف منجبر'' جس پر گفتگو چل رہی ہے وہ حدیث حسن لغیرہ ہی ہے جو معروف ہے اور جو بالاتفاق مقبول ہے تو اس کی بابت کسی تفصیل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے لیکن مناسب ومفید معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع سے اس موضوع سے متعلق کچھ مفید باتیں یہاں ذکر کردی جائیں۔

۳- ضعیف اور ضعیف منجبر:

ا- حدیث ضعیف کی تعریف گذر چکی ہے، باب اول ملاحظہ کیا جائے، حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے:

''حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس کے مخبر وراوی کا صدق راجح وثابت نہ ہو'' (نزہۃ النظر ص: ۲۶)۔

اس کے بعد انہوں نے تفصیل کرتے ہوئے ذکر فرمایا ہے کہ اخبار آحاد تین احتمالات رکھتی ہیں، جس میں تیسرا یہ ہے کہ نہ تو صفت قبول اس میں پائی جائے اور نہ صفت رد، اس کے بعد اس کا حکم ان لفظوں میں ذکر فرمایا ہے۔

''اگر کوئی قرینہ مل جائے تو اس قسم کی حدیث کو پہلی دونوں قسموں - ایک صدق کے رجحان والی، دوسری کذب کے رجحان والی، میں سے کسی ایک سے اس کو ملحق کردے تو اسی قسم کا حکم اس کا بھی ہوگا ورنہ اس کے بارے میں توقف کیا جائے گا اور عمل میں توقف کی وجہ سے اس کی حیثیت وحکم مردود کے جیسا ہوگا (کہ مردود پر عمل نہیں ہے تو اس پر بھی نہ ہوگا) یہ حکم اس وجہ سے نہیں کہ اس کے حق میں رد کی صفت کا ثبوت ہوگیا بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں قبول کی موجب کوئی صفت موجود نہیں ہے'' (نزہۃ النظر ص: ۲۶)۔

ب- ضعیف منجبر وہ حدیث ہے جو اپنی اصل میں اس طرح مروی ہوتی ہے کہ اس کے اندر قبول کی کوئی صفت موجود نہیں ہوتی جو کم از کم حدیث حسن میں مطلوب ہوتی ہے لیکن تحقیق سے اس کے لئے کوئی ایسا قرینہ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ خالص ضعف کے مرحلہ سے نکل کر احتجاج وقبول کے مرحلہ میں پہنچ جاتی ہے اور ضعیف کی اصل حقیقت وتعریف یہ ہے کہ حدیث کے قبول کے لئے جو شرطیں ذکر کی جاتی ہیں جب وہ سب یا چند یا ایک نہ پائی جائے تو حدیث کو ضعیف کہتے ہیں جیسا کہ متعدد اہل فن واہل نظر نے وضاحت کی ہے (منہج النقد فی علوم الحدیث ص: ۲۸۶، والنکت علی ابن الصلاح ص: ۲ و ۴)۔

۴- انجبار (تلافی ضعف) واعتماد کے حصول کے ذرائع:

حدیث ضعیف کو انجبار اور تلافی ضعف کی بنا پر قوت واعتماد اور قبول واحتجاج کئی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے کہ ایسے امور وقرائن متعدد ہیں۔

۵-معروف ترین ذریعہ ووسیلہ:

ضعیف کے انجبار اور تلافی ضعف کا سب سے معروف واہم ذریعہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف ایک سے زیادہ طریق وسند سے مروی ہو۔ اس بابت زیادہ تر اسی امر کا تذکرہ کتابوں میں ہے اور یہی سب سے مشہور ہے اور اس کا اعتبار معروف ہے، اس کو کبھی تو کثرت طرق سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی ''تعدد طرق'' کے لفظ سے، ڈاکٹر محمود طحان نے حسن لغیرہ کی تعریف میں یہی لفظ ذکر کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''ہو الضعیف إذا تعددت طرقہ'' (تیسیر مصطلح الحدیث ص:۵۱)۔

حسن لغیرہ وہ حدیث ضعیف ہے جس کے طرق متعدد ہوں۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی فرماتے ہیں:

''حدیث ضعیف کے جب متعدد طرق ہوں-اگرچہ مزید ایک ہی طریق ہو-تو حدیث مجموعی طور پر درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہے'' (قواعد فی علوم الحدیث ص:۴۵)۔

ابن ہمام کے کلام میں فی الجملہ دونوں لفظ آئے ہیں وہ فرماتے ہیں:

''حدیث حسن کثرت طرق کی وجہ سے صحت کو پہنچ جاتی ہے اور حدیث ضعیف اس کی وجہ سے حجت ہوتی ہے کیونکہ تعدد طرق نفس الامر میں اس کے ثبوت کا قرینہ ہے'' (فتح القدیر ۱/۳۸۹)۔

حیض کی اکثر واقل مدت سے متعلق روایات کے ذکر اور ان پر کلام کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی متعدد احادیث ہیں جن کے طرق متعدد ہیں اور یہ چیز حدیث ضعیف کو حسن کے درجہ تک پہنچاتی ہے، بلکہ اس بابت صحابہ وتابعین سے جو کثرت سے روایات ہیں ان کی بنا پر دل اس پر مطمئن ہوتا ہے کہ مضمون کی حدیث مرفوع میں ضعیف راوی نے اچھا ہی کام کیا ہے اور اچھائی کا ثبوت دیا ہے'' (فتح القدیر ۱/۱۴۳)۔

۶-تعدد طرق وکثرت طرق سے کیا مراد ہے؟

ضعیف کے انجبار کے لئے کثرت طرق وتعدد طرق، سے کیا مراد ہے اور اس کا کیا مطلب ہے؟ چونکہ عموماً جمع کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے تو کیا کم از کم تین طرق وتین سندیں مطلوب ہوتی ہیں؟

محققین کی صراحت کی روشنی میں جواب یہ ہے کہ انجبار تلافی ضعف، اور حصول اعتماد کے لئے مزید صرف ایک طریق وسند کافی ہے، امام سیوطی ''تدریب الراوی'' میں فرماتے ہیں:

اور اس میں کوئی ندرت وانکار نہیں ہے کہ ایسی حدیث کو حجت بنایا جائے جس کے دو طرق ہوں اور ایسے کہ ان میں سے ہر ایک الگ وتنہا ہونے کی شکل میں حجت نہ ہو۔

جیسے مرسل کا معاملہ ہے کہ اگر اس کی (مضمون میں) روایت کسی دوسرے طریق سے موصولاً ومسنداً ہو یا کوئی دوسری مرسل روایت وطریق اس کا مؤید موجود ہو تو مرسل حجت ہوتی ہے (اسی طرح ضعیف کا حکم ہے جبکہ دوسرا طریق پایا جائے)'' (تدریب الراوی ۱/۱۶۰)۔

اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی فرماتے ہیں جیسا کہ پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے کہ حدیث ضعیف کے طرق میں جب تعدد ہو خواہ مزید ایک ہی طریق پایا جائے تو مجموعی طور پر حدیث وروایت کو حسن مانا جاتا ہے اور وہ حجت ہوتی ہے (قواعد فی علوم الحدیث ص:۴۹)۔

علامہ سخاوی کے کلام سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اگرچہ انہوں نے بعض حضرات سے یہ نقل کیا ہے اور ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ مزید صرف ایک طریق فضائل وغیرہ میں کافی ہے لیکن احکام کے باب میں استدلال واحتجاج کے لئے مزید ایک سے زائد طرق یا دوسرے قرائن مطلوب ہوتے ہیں (فتح المغیث ص:۶۸) تفصیل آگے آرہی ہے۔

۷- تعدد طرق سے حاصل ہونے والی قوت وحیثیت:

تعدد طرق سے حدیث ضعیف کو انجبار واعتماد حاصل ہوتا ہے یہ کس درجہ کا ہوتا ہے؟ علماء امت نے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ حدیث مرسل سے احتجاج واستدلال کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تعدد سے کس قسم کے ثبوت وقوت کا حصول ہوتا ہے اس کی بابت فرماتے ہیں:

''حدیث مرسل جب متعدد طرق سے مروی ہو اور اس بات سے خالی ہو کہ اس کے حق میں قصداً یا بغیر قصد کسی غیر ثابت چیز کے بیان پر اتفاق ہو سکے اور سمجھا جائے تو ایسی حدیث مرسل قطعی صحیح ہوتی ہے۔

اس لئے کہ نقل یا تو صحیح، واقع کے مطابق ہوگی، یا جھوٹ ہوگی کہ بیان کرنے والے نے قصداً یا خطاً جھوٹ وخلاف واقع کہا ہوگا لہذا جب کوئی خبر قصد وبغیر قصد ہر قسم کے جھوٹ سے خالی ہو تو بغیر کسی شک وشبہ کے وہ ثابت وسچی ہوگی۔

لہذا اگر کوئی حدیث دو یا تین جہت، طریق وسند سے مروی ہو اور یہ سمجھا جائے کہ بیان کرنے والوں نے اس کے گڑھنے وبنانے پر اتفاق نہیں کیا ہے اور یہ بھی سمجھا جائے کہ اس جیسی چیز میں بغیر قصد بھی اس قسم کا اتفاق نہیں ہوسکتا تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ خبر وحدیث صحیح ہے۔

اس تفصیل کی بنیاد پر جو بھی روایت ذاتی حیثیت میں اور تنہا ایسی ہو کہ وہ اعتماد واعتبار کے لئے کافی نہ ہو اس وجہ سے کہ اس میں ارسال ہے یا رواۃ میں ضعف ہے لیکن ایسی خبر کو تعدد طرق واسانید حاصل ہو جائے تو اس کی صحت وثبوت کو مانا جائے گا۔

یہ اصل وقاعدہ ایسا ہے کہ جس کو خوب جاننا اور معروف کرنا چاہئے کہ یہ چیز بہت سی منقولات ومرویات کے قطعی ومضبوط ثبوت کے جاننے میں نافع ومفید ہے عام ہے کہ مضمون حدیث وتفسیر ومغازی کا ہو یا عام لوگوں کے اقوال وافعال وغیرہ سے تعلق رکھتا ہو'' (فتاوی شیخ الاسلام ۱۳/ ۳۴۷ تا ۳۴۹)۔

۸- دوسرے مؤید طریق کے لئے مطلوب امور:

حدیث ضعیف کو دوسرا طریق ملنے پر جو اعتبار واعتماد حاصل ہوتا ہے تو اس دوسرے طریق کے لئے کیا قیود ہیں؟ ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔

الف- ضروری نہیں کہ دونوں طرق کا راوی صحابی الگ الگ ہو:

دوسرے طریق کے مفید ہونے کے لئے یہ قید نہیں ہے کہ صحابی مختلف ہو بلکہ سند کا کچھ مختلف ہونا کافی ہے اگر چہ دونوں کا صحابی ایک ہو۔

امام ترمذی نے جن احادیث کو حسن کہا ہے، جبکہ ان کا کہنا ہے کہ ضعف کے ساتھ تعدد طرق کی صورت میں ہی میں حدیث کو حسن کہتا ہوں، ان احادیث سے یہ ظاہر وواضح ہوتا ہے۔

مثلاً امام ترمذی نے اپنی جامع کے ''باب ماجاء فی التطوع فی السفر'' میں ایک حدیث روایت کی ہے:

''حدثنا علی بن حجر أخبرنا حفص بن غیاث عن حجاج عن عطیة عن ابن عمر رضی اللہ عنہ:

صلیت مع النبی ﷺ الظهر فی السفر رکعتین وبعدہا رکعتین'' (ترمذی ابواب السفر باب ما جاء فی التطوع فی السفر)۔

اس کے بعد امام ترمذی نے فرمایا ہے:

''یہ حدیث حسن ہے کہ اس کو ابن ابی لیلی نے بھی بواسطہ عطیہ عن نافع عن ابن عمر روایت کیا ہے''۔

اس کے بعد امام ترمذی نے اس طریق کی پوری سند کے ساتھ حدیث کو نقل کیا ہے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی فرماتے ہیں:

''امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے حالانکہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ اور عطیہ ہیں اور دونوں ہی مدلس ہیں اور دونوں کی روایت عن

کے ساتھ ہے، لیکن ابن ابی لیلی نے حجاج کی متابعت و موافقت کی ہے، جیسا کہ دوسری سند میں ہے اور عطیہ کی نافع نے متابعت کی ہے، (اس لئے امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے) (الترمذی وشرحہ تحفۃ الاحوذی ۳/۱۱۹، ۱۲۰)۔

شیخ نور الدین عتر نے امام ترمذی کی اصطلاح حسن اور اس کی شرط کو مدنظر رکھتے ہوئے حدیث مذکور کے متعلق فرمایا ہے:

''اس حدیث کی پہلی سند میں حجاج ہیں جو صدوق، کثیر الخطأ اور مدلس ہیں، نیز اس میں عطیہ ہیں ان کا بھی حال حجاج جیسا ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی متہم بالکذب نہیں ہے، اور نہ اعتبار سے گیا گذرا ہے، امام ترمذی نے ان دونوں کی حدیث کی تحسین کی ہے اس لئے کہ اس کو دوسرے طرق سے تقویت حاصل ہے اور وہ ابن ابی لیلی کا طریق ہے، ابن ابی لیلی کے حق میں حافظہ کی رو سے کلام ہے لیکن اس طریق نے اصل حدیث کو قوت پہنچادی تو امام ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا'' (منہج النقد فی علوم الحدیث ص: ۲۷۰، ۲۷۱)۔

یہ تو عام محدثین کی بات ہے کہ ایک صحابی سے ہی اگر دوسرا طریق مل جائے تو تقویت - انجبار و اعتماد کے لئے کافی سمجھ لیا گیا۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ تو آگے بڑھ کر یہ بات کہتے ہیں کہ ایک روایت ایک ہی صحابی سے جب کافی سندوں سے مروی ہو تو وہ بھی متواتر قرار پاتی ہے۔

مثلاً ''باب الرجل یوجه بالهدی إلی مکة ویقیم فی أهله هل یتجرد إذا قلد الهدی''

(شرح معانی الآثار. نیز ''باب اللباس والطب متی یحلان للمحرم''

(دونوں) میں حضرت عائشہ کی روایت کو متواتر قرار دیا ہے، اس لئے کہ پہلے باب میں ان کی حدیث کو کئی طرق سے اور دوسرے میں آٹھ طرق سے روایت کیا ہے۔

ایسے ہی ''باب وقت رمی جمرة العقبة للضعفاء الذین یرخص لهم فی ترك الوقوف بمزدلفة'' میں حضرت ابن عباس کی روایت کو انہوں نے چھ طرق سے نقل کر کے متواتر قرار دیا ہے۔

یہ تینوں احادیث جن کو امام طحاوی نے متواتر کہا ہے، ایک ہی صحابی سے چار سے زائد طرق سے مروی ہیں (شرح معانی الآثار ابواب مذکورہ جلد اول کتاب الحج)۔

حافظ سخاوی نے حدیث منجبر حسن لغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''متابع کی کثرت سے ثبوت کا ظن قوی ہوتا ہے جیسے کہ متواتر کا معاملہ ہے کہ وہ بھی اصلاً فرد و مفرد ہوتی ہے (مگر کثرت طرق اس کو متواتر بناتا ہے)''

(ملاحظہ ہو: فتح المغیث ص: ۶۳)۔

ب- دوسرے طریق کا پہلے کے ہم پلہ و مساوی ہونا:

۱- دوسرا طریق جو معاون، اور انجبار کا باعث اور اعتماد و اعتبار فراہم کرنے والا ہوتا ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے طریق، اور اصل حدیث ضعیف سے از روئے سند و رواۃ کمتر و کمزور نہ ہو، بلکہ اس سے کچھ فائق ہو یا کم از کم برابر و ہم پلہ ہو۔

امام سخاوی (فتح المغیث ص: ۶۳ تا ۷۰، منہج النقد ص: ۲۶۹ و تیسیر مصطلح الحدیث ص: ۵۱) اور مولانا ظفر احمد تھانوی (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۲۵) دونوں نے اس کی صراحت کی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرسل کے اعتبار کے قرائن میں ایک یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا مرسل طریق مل جائے جیسا کہ عام طور سے ذکر کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو: نزہۃ النظر و تیسیر مصطلح الحدیث و تدریب الراوی وغیرہ نیز الرسالہ)۔ اس سے بھی یہ واضح ہے کہ ہم پلہ ہونا کافی ہو جائے گا۔

۲- اور دوسرے طریق کا پہلے و اصل طریق کے مساوی ہونا بظاہر اس صورت میں ہے جبکہ مزید و مؤید صرف ایک طریق ہو، لیکن اگر بعض و مزید

طرق اس سے زیادہ ہوں کہ مجموعی طرق تین یا زائد ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں، مساوات ضروری نہیں بلکہ اصل حدیث ضعیف سے کمزور کی موافقت وتائید بھی کام کرے گی۔

مولانا ظفر احمد تھانوی نے ''حدیث صحیح لغیرہ'' کے بیان میں ذکر کیا ہے:

''حدیث حسن لذاتہ کے اگر مزید طرق ہوں:

۱- ایک ہو جو اصل حدیث حسن لذاتہ سے زیادہ قوی یا اس کے مساوی ہو۔

۲- یا ایک سے زائد ہوں تو خواہ منقطع کیوں نہ ہوں، تو حدیث حسن لذاتہ صحیح لغیرہ قرار پائے گی'' (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۳۴)۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حسن لغیرہ کے لئے مطلوب دوسرے طریق کی مساوات اسی صورت میں ہے جبکہ مزید ایک ہی طریق ہو، اور زیادہ طرق ہوں تو اصل سے کمزور سے بھی حسن لغیرہ کا ایسے ہی تحقق ہوگا جیسے حسن لذاتہ میں کئی کمزور طرق کا مجموعہ بھی حدیث کو صحیح لغیرہ بنا دیتا ہے۔

اور اس بات کی صراحت علامہ سخاوی نے بھی کی ہے (فتح المغیث ص: ۶۷ شرح النزہۃ لعلی القاری ص: ۷۲)۔

ج- معنی ومضمون کی موافقت:

انجبار واعتماد میں یہ مطلوب نہیں کہ دوسرا طریق پہلے کے ہی لفظ میں ہو، بلکہ صرف معنی ومضمون کی موافقت بھی کافی ہو جائے گی (منہج النقد ص: ۶۹)

اور عام طور سے ایسا ہی ہے۔

مثلاً بچے کے کان میں اذان واقامت کہنے کی روایت، جس کا ذکر باب اول کے تحت حدیث موضوع کے بیان میں آچکا ہے۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت ابن السنی وغیرہ کی ہے۔

''من ولد له مولود فأذن في أذنه اليمنى وأقام في أذنه اليسرى لم يضره أم الصبيان'' (عمل اليوم والليلة لابن السنی ص: ۵۷۸، والأذكار للنووي ص: ۳۴۴)۔

اس مضمون کی حدیث ترمذی وابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابورافع سے نقل کی ہے:

''رأيت رسول الله ﷺ أذن في أذن الحسين بن علي حين ولدته فاطمة بالصلوة. رضي الله عنهم أجمعين''۔

(الترمذي، الاضاحي باب الاذان في أذن المولود ابوداؤد الادب باب في الصبي يولد فيؤذن في أذنه. ورواه أحمد والحاكم والبيهقي كما في ارواء الغليل ۴/ ۴۰۰، ۴۰۱)۔

بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے:

''أذن في أذن الحسن بن علي يوم ولد وأقام في أذنه اليسرى'' ۔(تحفة المودود ص: ۲۵ شعب الايمان ۱۱/ ۱۰۶)۔

پہلی حدیث میں ارشاد نبوی اور دوسری وتیسری میں نبی اکرم ﷺ کا فعل ہے، اور تیسری میں مضمون پہلی کے پورے طور پر موافق ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلی میں قول اور تیسری میں فعل ہے، اور دوسری وتیسری دونوں کی موافقت یہاں معنی ومضمون کی ہے لفظ کی نہیں، اور اس کو کافی سمجھا گیا ہے، چنانچہ مولانا مبارکپوری فرماتے ہیں:

''(ترمذی کی) یہ حدیث ضعیف ہے (اس لئے کہ اس میں عاصم بن عبید اللہ ہیں) لیکن یہ مؤید ہے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے جس کو ابویعلی موصلی وابن السنی نے روایت کیا ہے'' (تحفۃ الاحوذی ۵/ ۱۰۸)۔

جبکہ اس کے مجروح راوی ''عاصم بن عبید اللہ'' ابن السنی کے مجروح راوی یحیی بن العلاء سے اچھے ہیں (ملاحظہ ہو: التقریب ص: ۲۶۷، ۶۶۴)۔

اور مزید یہ کہ امام ترمذی نے اپنی روایت کو صحیح قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو: ترمذی، الاضاحی)۔

عبدالقادر ارناؤوط ''جامع الاصول'' کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''ترمذی کی حدیث (کے ضعف کے باوجود اس) کے لئے حضرت ابن عباس کی روایت - جس کو بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں روایت کیا ہے - شاہد ہے، اس کی وجہ سے یہ حدیث قوی ہے اس لئے امام ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے'' (جامع الاصول مع الہامش ۱؍۳۸۴)۔

شیخ البانی نے بھی ابن عباس کی حدیث کی وجہ سے حدیث ابی رافع کی قوت کو مانا ہے، لیکن حضرت حسین کی حدیث کو وہ موضوع قرار دیتے ہیں (ملاحظہ ہو: سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ۱؍۳۲۰، ۳۲۱)۔

جبکہ ابن عباس کی حدیث بھی ضعیف ہے، جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے (تحفۃ المودود ص: ۲۵، وشعب البیہقی ۱۱؍۱۰۶)۔

۹- بعض دوسرے امور وقرائن بھی اعتماد وانجبار کا فائدہ دیتے ہیں:

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے تعدد طرق وکثرت طرق ضعیف کے انجبار واعتماد کے لئے اہم ومعروف نیز سب سے زیادہ مستعمل ومعمول قرینہ، اور طریقہ وذریعہ ہے لیکن یہ تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ دوسرے امور وقرائن بھی اس سلسلہ میں کام آتے ہیں جن سے ضعیف کو اعتماد کی حیثیت وقوت حاصل ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجر نے خبر واحد مقبول کی چوتھی قسم ''حسن لغیرہ'' کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تعریف یوں کی ہے:

''اور اگر توقف والی حدیث کے حق میں قبول کو ترجیح دینے والا کوئی قرینہ مل جائے تو ایسی حدیث - جو اصل میں ضعیف ہوتی ہے، اسی لئے اس میں توقف کیا جاتا ہے - بھی حسن قرار پاتی ہے لیکن یہ حسن لغیرہ ہوتی ہے حسن لذاتہ نہیں'' (نزہۃ النظر ص: ۲۹، فتح المغیث ص: ۲۳)۔

ابن ہمام فرماتے ہیں:

''سند کے ضعف کا مطلب متن کا قطعی باطل ہونا نہیں ہے بلکہ یہ اس کا ظاہر ہوتا ہے، لہذا ایسی حدیث کو جب صحت وثبوت پر دلالت کرنے والے کسی قرینہ سے تائید حاصل ہو تو وہ صحیح وثابت قرار پاتی ہے'' (فتح القدیر ۲؍۸۷)۔

مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں:

''حدیث ضعیف کے جب کئی طرق ہوں یا اس کو کسی ایسی چیز سے تائید حاصل ہو جو اس کے قبول کو ترجیح دے تو وہ حسن لغیرہ ہوتی ہے'' (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۲۵)۔

اہل فن کے یہ سارے اقوال جو بات کہی گئی اس کی تائید کرتے ہیں کہ تعدد طرق کے علاوہ بعض دوسرے امور بھی ضعیف کو انجبار واعتماد کا فائدہ پہنچاتے ہیں۔

مثلاً کسی صحابی کا قول وفتوی جس کا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مرسل کے مؤید امور میں ذکر واعتبار کیا ہے (الرسالہ ص: ۴۶۲-۴۶۴)۔

ابوالحسن بن الحضار مالکی کہتے ہیں:

''جب کوئی حدیث - ضعیف - کی سند کذاب سے خالی ہو تو فقیہ اس کی صحت کو اس طرح بھی جانتا ہے کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت یا شریعت کے اصول اس کے مؤید ہوتے ہیں تو وہ اس کو قبول کر کے اس پر عمل کرتا ہے'' (تدریب الراوی ۱؍۲۸، الاجوبۃ الفاضلۃ تعلیقات ص: ۲۳۱)۔

حافظ ابن حجر نے حسن لغیرہ اور اس کے حکم کی بابت ابن القطان مغربی کا قول نقل کیا ہے۔

''یہ قسم ایسی ہے کہ یہ مطلقاً حجت نہیں ہے (کہ ہر باب میں اس کا اعتبار ہو فضائل واحکام سب میں) بلکہ فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جاتا ہے اور احکام کے بارے میں اس پر عمل کے حق میں توقف کیا جاتا ہے البتہ اگر اس کے طرق زیادہ ہوں (یعنی دو سے زیادہ) یا اس کو امت کے عمل کی تائید یا

کسی ثابت حدیث یا ظاہر قرآن کی موافقت حاصل ہو تو احکام کے باب میں بھی اس پر عمل کیا جائے گا'' (النکت ص: ۲۲، وفتح المغیث ص: ۶۸، ۶۹)۔

اور سعودیہ کی لجنۃ دائمۃ للافتاء کے فتاوی میں حدیث ضعیف پر عمل کی بابت آیا ہے:

''ضعیف پر عمل جائز ہے بشرطیکہ شدید الضعف نہ ہو اور اس کے لئے ضعف کا ازالہ کرنے والے شواہد موجود ہوں یا شریعت کے معتبر قواعد سے اس کو تائید حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ وہ کسی حدیث صحیح کے خلاف نہ ہو، ایسی صورت میں حدیث ضعیف حسن لغیرہ ہو جاتی ہے جو اہل علم کے نزدیک حجت ہے''

(فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۴/ ۲۹۱، ۲۹۲)۔

۱۰- دیگر امور کیا ہیں؟

گذشتہ دفعہ ۹ میں مذکور اقوال وتصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تعدد طرق کے علاوہ مزید امور کیا ہیں اور وہ ہیں:

۱- قرآن کریم کی کسی آیت وصراحت کی تائید۔

۲- احادیث معتبرہ کی تائید۔

۳- شریعت کے مسلمہ امور وضوابط قواعد کی تائید۔

۴- کسی صحابی کے قول وفتوی وعمل کی تائید۔

کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعی نے مرسل کی تقویت کے لئے جن امور کا اعتبار کیا ہے وہ یہاں بھی مفید ہوں گے۔

۱۱- انجبار ہر ضعیف کے لئے نہیں ہے:

ضعیف کے ضعف کا انجبار اور اس کی تلافی مذکورہ امور وقرائن کے ذریعہ ہر قسم کی ضعیف کے لئے نہیں ہے کیونکہ ضعیف کی بہت سی اقسام ہیں جیسا کہ گذر چکا ہے، یہ اقسام ضعف کی شدت وخفت کے اعتبار سے بھی ہیں اور پھر ضعف کی شدت وخفت کے بھی مراتب ہیں۔

معلوم ومعروف ہے کہ موضوع بھی ضعیف کی ایک قسم ہے لیکن اس کو اس قسم کے امور سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ثبوت وضع کے بعد سو طرق بھی کسی کام کے نہیں ہیں۔

ابن الصلاح نے اس نسبت سے حدیث ضعیف کی دو اقسام ذکر کی ہیں:

''ایک قسم وہ کہ جس کے ضعف کا ازالہ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے جبکہ اس کو کوئی مناسب تلافی کرنے والا امر مل جائے موافق روایات کی رو سے۔

اور ضعف کی ایک قسم وہ ہے کہ دوسرا طریق اس کو کوئی نفع نہیں پہنچاتا اس لئے کہ اس کا ضعف قوی ہوتا ہے اور تلافی کرنے والے امر میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ اس کے ضعف کا ازالہ کر سکے اور مقابلہ کر سکے'' (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷، والنکت مع التعلیق ص: ۴۰۸)۔

مزید فرماتے ہیں: ''ہم کو بہت سی احادیث ایسی بھی ملتی ہیں کہ ان کے بہت سے طرق واسانید ہیں پھر بھی ان کو ضعیف کہا گیا ہے''

(مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷، والنکت ص: ۴۰۹)۔

اور اصولی طور پر یوں فرمایا:

''ہر حدیث ضعیف متابعت واستشہاد کی صلاحیت واہلیت نہیں رکھتی'' (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۳۹)۔

۱۲- فائدہ نہ اٹھانے والی بعض انواع:

امام سیوطی نے ''تدریب الراوی'' میں ذکر کیا ہے:

''جو حدیث راوی کے فسق یا کذب کی وجہ سے ضعیف ہو اس میں دوسرے طریق کی موافقت کوئی اثر نہیں کرتی (یعنی نفع نہیں پہنچاتی) جبکہ

دوسرا طریق اسی جیسا ہو، کیونکہ اس صورت میں ضعف قوی ہوتا ہے اور جابر- تلافی والی روایت- کمزور ہوتی ہے'' (تدریب الراوی ۱؍۱۷۷)۔

اور ابن الصلاح نے کہا ہے کہ ایسی احادیث میں وہ حدیث ضعیف ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو اسی طرح انہوں نے اس ضمن میں شاذ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷)۔

بہرحال بنیادی طور پر شدید الضعف روایت کو فائدہ نہیں ہوتا۔

۱۳- فائدہ اٹھانے والی بعض انواع:

وہ ضعیف احادیث جن کو انجبار واعتماد کا فائدہ جابر اور قوت پہنچانے والے امور سے ہوتا ہے وہ ایسی احادیث ہیں جن کا ضعف شدید نہ ہو۔

ایسی احادیث میں معلق، مرسل، مدلس، اور مستور ومجہول نیز سیئ الحفظ اور مختلط کی احادیث وغیرہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

معلق، وہ حدیث جس کی سند کا کل یا بعض حصہ شروع سے مذکور نہ ہو۔

مرسل (جس کی سند اخیر سے محذوف ہو)۔

مدلس (جس کا راوی تدلیس کا مریض ہو)۔

مستور (وہ راوی جس کی عدالت یا جرح کچھ معلوم نہ ہو)۔

مجہول (وہ راوی جس کی ذات، شخصیت یا صفت معلوم نہ ہو)۔

مختلط (وہ راوی جو سوء حفظ کا شکار ہو)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

''جو راوی سوء حفظ کا شکار ہو اور اس کو معتبر موافق روایت مل جائے، اسی طرح جس مختلط کا حال واضح نہ ہو (کہ کب سے اس کا یہ حال ہے اور کون سی روایت اس کے کس حال کی ہے) اس کو نیز مستور کو معتبر موافق مل جائے؟ نیز مرسل ومدلس وغیرہ بھی اگر موافق کو پالیں تو ایسی احادیث حسن قرار پاتی ہیں لیکن حسن لذاتہ نہیں بلکہ لغیرہ مجموعی طور پر دونوں مل کر اصل اور اس کے موافق حسن لغیرہ قرار دی جاتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ رواۃ میں سے ہر ایک کی روایت الگ الگ اور اکیلی درست ونادرست، ثبوت وعدم ثبوت کا یکساں احتمال رکھتی ہے، اگر ان میں سے کسی کو موافق روایت مل جاتی ہے تو دونوں احتمالات میں سے ایک یعنی ثبوت واعتبار کے پہلو کو ترجیح حاصل ہوجاتی ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ حدیث محفوظ ہے۔ اور اس طرح ایسی کمزور روایت توقف کے درجہ ومرحلہ سے نکل کر قبول ومقبول کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے'' (نزہۃ النظر ص: ۵۱، ۵۲)۔

ابن الصلاح تعدد وغیرہ کے ذریعہ ضعف کے زوال پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک ضعف وہ ہے جو تعدد وغیرہ سے زائل ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ضعف ایسا ہوتا ہے کہ اس کا راوی اپنی جگہ معتبر ہوتا ہے، سچائی ودیانت والا ہوتا ہے مگر اس کا حافظہ کمزوری کا شکار ہوتا ہے، تو ایسے راوی کی حدیث جب دوسرے طریق وسند سے مروی ہوتی ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس روایت کو اس نے محفوظ اور صحیح طور پر یاد رکھا ہے اور اس کے حق میں اس کے ضبط ویادداشت نے کمی نہیں کی ہے اسی طرح جب ضعف ارسال کی وجہ سے ہوتو وہ بھی اس صورت سے ختم ہوجاتا ہے'' (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷)۔

اور جیسے حدیث مرسل وحدیث معلق کو تعدد وغیرہ سے نفع ہوتا ہے اسی طرح حدیث شاذ کا بھی حکم ہے اگرچہ ابن الصلاح نے اس سے انکار کیا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷)۔

لیکن دوسرے حضرات نے ان کی تائید نہیں کی ہے۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی فرماتے ہیں:

''حدیث شاذ کو جب موافق روایت متابع یا مشاہد مل جائے تو اس کا شذوذ دور ہو جاتا ہے، اور وہ قابل احتجاج ہو جاتی ہے''

(قواعد فی علوم الحدیث ص:۷۶)

جبکہ ائمہ فن کو اس میں گفتگو ہے کہ آیا شذوذ مطلق عیب ہے اور صحت کے لئے اس سے خالی ہونے کی شرط ہے یا اس میں تفصیل ہے علامہ ذہبی نے صحیح کی تعریف میں شذوذ کی قید نہیں لگائی ہے (ملاحظہ ہو: الموقظہ مع تعلیقات الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ ص، نیز فتح الملہم ۱/۱۳۶)۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثانی نے ''فتح الملہم شرح مسلم'' کے مقدمہ میں ''شاذ و شذوذ'' سے متعلق لمبی گفتگو کرتے ہوئے آخری بات یوں ذکر فرمائی ہے:

''شاذ اگر مردود بھی ہو اس وجہ سے کہ وہ محدثین کے نزدیک ایک خاص جہت و پہلو سے مرجوح ہوتی ہے، اس کے باوجود احتمال رکھتی ہے کہ باعتبار متن وہ دوسرے اہل فن کے نزدیک (دوسری وجوہ کی بنیاد پر) راجح ہو، اس لئے محدثین اگر کسی حدیث پر شذوذ کا حکم لگاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اہل فن (یعنی فقہاء واصولیین) کے نزدیک معتبر مرجحات سے کام نہ لیا جائے۔ جبکہ اس میں کوئی منافات نہیں کہ ایک چیز ایک جہت و پہلو سے مردود ہو اور دوسری طرف وہ دو جہتوں سے مقبول ہو'' (فتح الملہم ۱/۱۴۰)۔

۱۴- کیا شدید الضعف احادیث بھی کچھ فائدہ حاصل کرتی ہیں؟

یہ بات بار بار آرہی ہے کہ ضعیف احادیث کا وہ حصہ جس کو شدید الضعف قرار دیا گیا ہے وہ عمل و اعتبار میں صرف نظر کا مستحق قرار دیا گیا ہے اور ایسی احادیث کو مفید تقویت قرائن سے بھی انجبار و قوت کا نفع نہیں ہوتا اور یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ کس قسم کی احادیث اس کے تحت آتی ہیں۔

تاہم یہ ایک سوال ہے کہ انجبار و اعتبار کا فائدہ پہنچانے والے امور و قرائن سے کیا شدید الضعف احادیث کسی طرح کا فائدہ حاصل نہیں کرتیں؟ تو علماء نے اس بابت کچھ تفصیل کی ہے یا یوں کہئے کہ ان کے حق میں تقسیم کی ہے۔

ایک حصہ تو وہ ہے جن کے حق میں کسی قسم کے نفع و قوت کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بلکہ ان کے حق میں مفید جبر و قوت امور عدم کے درجے میں مانے جاتے ہیں خواہ تعدد طرق و کثرت اسانید ہو یا کچھ اور۔ اس نسبت سے آچکا ہے کہ احادیث موضوعہ کو کسی طرح کا نفع نہیں ہوتا۔

اور ایک حصہ وہ ہے جس کو یہ نفع تو نہیں ہوتا کہ ضعف ختم ہو جائے اور قوت و قبول کا مرتبہ حاصل ہو جائے، لیکن یہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر قرائن صحیح وقوی ہوں تو وہ شدید الضعف حدیث کو ان احادیث کے مرتبہ تک پہنچاتے ہیں جن کے حق میں یہ قرائن مفید قوت اور انجبار و اعتبار کے لئے نافع ہوتے ہیں۔

۱۵- بعض شدید الضعف حدیث قرائن مفیدہ کی وجہ سے شدت ضعف سے نکل جاتی ہے:

اس کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ قرائن صحیحہ و مفیدہ کی وجہ سے شدید الضعف حدیث مستور و سیئ حفظ کی روایت کے درجہ میں ہو جاتی ہے اور اب اس کے حق میں یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ یہ منکر و بے اصل ہے، اور یہ بھی ہوتا ہے کہ فضائل کے باب میں اعتبار کیا جائے، بلکہ یہ کہ اب اگر مزید مفید و معتبر قرائن، طریق و سند مل جائے تو اس کو یہ نفع بھی حاصل ہو سکتا ہے اس کو حسن لغیرہ کے درجہ میں مان کر احکام کے حق میں اس پر عمل کیا جائے۔

یعنی ایسی حدیث – جابر و مفید قوت امر سے دو مرحلہ میں درجہ بدرجہ فائدہ حاصل کرتی ہے پہلے مرحلہ میں شدت ضعف سے نکلنے کا اور دوسرے مرحلہ میں قوت و اعتبار کے حاصل کرنے کا۔

سیوطی نے ''تدریب الراوی'' میں ایسی احادیث اور ان کے احوال و احکام پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''ایسی شدید الضعف حدیث اپنے طرق کے مجموعہ سے ترقی کر کے اس سے نکل جاتی ہے کہ اس کو منکر کہا جائے یا بے اصل کہا جائے، شیخ الاسلام (حافظ ابن حجر) نے اس کی صراحت کی ہے، بلکہ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض مرتبہ کثرت طرق ایسی حدیث کو مستور و سیئ الحفظ کے درجہ میں پہنچا دیتی ہے اور اس حال کو کہ اگر مزید کوئی طریق ضعیف مل جائے جو قابل گوارا و قبول ہو تو اس مزید و نئے طریق کی وجہ سے پورا مجموعہ حسن

(لغیرہ) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے''۔ (تدریب الراوی ۱/۱۷۷)۔

حافظ ابن حجر ''النکت'' میں حسن لغیرہ وصحیح لغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ کوئی حدیث ضعیف ہو اور بہت سی سندوں وطرق سے مروی ہو اور سب کے سب (اس درجہ کمزور ہوں کہ) اعتبار سے ساقط وقاصر ہوں اور ایک دوسرے کی تائید نہ کر سکتے ہوں، لیکن ایسی حدیث ضعیف اس ضعیف سے (بہر حال) بہتر ہے جو محض ایک بہت کمزور سند سے مروی ہو اور اس کا نفع اس بارے میں سامنے آئے گا کہ آیا اس پر عمل جائز ہے یا مطلقاً و بالکل منع ہے'' (النکت ص: ۴۲۰)۔

اور علامہ جزائری اس بابت فرماتے ہیں:

''بعض حفاظ کا کہنا ہے کہ اس قسم کی حدیث کے کبھی طرق بہت ہوتے ہیں اور وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہوتے ہیں لیکن وہ اس کثرت کی وجہ سے اس منکر کے رتبہ سے نکل جاتی ہے جس پر کسی حال میں عمل جائز نہیں اور اس ضعیف کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے جس پر فضائل کے باب میں عمل جائز ہے اور کبھی کبھی یہ کمزور طرق ان طرق کے مرحلہ کو پا لیتے ہیں جن میں معمولی سا ضعف ہوتا ہے اور یہ حال ہوتا ہے کہ اگر یہ حدیث (مزید) معمولی ضعف والی سندوں کے ساتھ مروی ہو تو ضعیف سے ترقی کر کے حسن لغیرہ کے رتبہ کو پہنچ جائے گی'' (فتح الملہم ۱/۷۶)۔

۱۶- مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق شدید الضعف کی مثال:

اہل تحقیق نے ایسی احادیث مثال میں ذکر کی ہیں جو شدید الضعف ہیں اور کثرت طرق کی وجہ سے ان کو حسن لغیرہ کی قوت وحیثیت نہیں حاصل ہوتی، البتہ منکر و بے اصل ہونے کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

علامہ سخاوی نے اس نسبت سے ایک معروف حدیث کا تذکرہ کیا ہے:

''من حفظ على أمتي أربعين حديثًا بعث يوم القيامة فقيهًا''

(روایت کی تخریج وتحقیق کے لئے ملاحظہ ہو: کشف الخفاء ۲/۲۴۶، اس میں ممتاز علماء کے اقوال نقل کئے گئے ہیں امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کے طرق بہت ہیں مگر حفاظ اس کے ضعف پر متفق ہیں اور حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ کوئی طریق علت قادحہ سے خالی نہیں ہے)۔

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ امام نووی نے ذکر کیا ہے کہ حفاظ اس پر متفق ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے حالانکہ اس کے بہت سے طرق ہیں لیکن وہ مجموعی طور پر ایک دوسرے کی تقویت کے لائق نہیں ہیں اس لئے یہ حدیث کثرت طرق کے باوجود قوی اور حسن لغیرہ نہیں، البتہ یہ مجموعی طور پر ایسی ہے کہ اس مردود و منکر کے حال سے نکل گئی جس پر عمل کی کوئی گنجائش نہیں اور اس ضعیف کی حیثیت میں آ گئی جس کو فضائل اعمال میں قبول کر لیتے ہیں (فتح المغیث ص: ۷۰)۔

۱۷- جابر (تقویت پہنچانے والے امر وحدیث) کے لئے ضابطہ:

حافظ ابن حجر نے موضوع سے متعلق ابن الصلاح کے کلام پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''ابن الصلاح نے جابر کے لئے کوئی ضابطہ ذکر نہیں کیا جس سے یہ سمجھا جائے کہ کونسی حدیث جابر بننے کے لائق ہے اور کونسی نہیں ہے۔

اس میں تحقیقی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یوں کہا جائے کہ قبول ورد دونوں کے احتمال کو دیکھا جائے، جس حدیث میں دونوں احتمال برابر درجہ کے ہوں وہ جابر بننے کی صلاحیت رکھے گی اور جس میں رد کا پہلو راجح وقوی ہو گا وہ اس کی اہلیت وصلاحیت نہیں رکھے گی'' (النکت ص: ۴۰۹)۔

حافظ ابن حجر نے نخبہ ونزہۃ میں جو کچھ فرمایا ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اخبار آحاد میں سے صرف مقبول پر عمل واجب (وجائز) ہے اس لئے کہ اخبار آحاد میں تین احتمالات ہوتے ہیں:

۱- ان میں صفت قبول بنیادی طور پر پائی جائے اور وہ ہے ناقل کے صدق کا ثبوت۔

۲- ان میں رد کی صفت بنیادی طور پر پائی جائے وہ ہے ناقل کے کذب کا ثبوت۔

۳- یا دونوں میں سے کوئی بات نہ مانی جائے۔"

اس کے بعد تیسرے احتمال وشق کی بابت فرمایا ہے:

"تیسری صورت میں اگر کوئی قرینہ مل جائے تو پہلی دو میں سے کسی ایک سے حدیث کو ملحق کرے تو الحاق ہوگا ورنہ توقف کیا جائے گا"۔

(نخبہ ونزہۃ ص:۲۶)۔

حاصل یہ کہ جابر-تقویت پہنچانے والا امر وقرینہ- اس ضعیف کو نفع پہنچاتا ہے جس میں توقف کیا گیا ہو اس وجہ سے اس کے مخبر کا نہ تو صدق ثابت ہے اور نہ کذب۔

۱۸-ضعیف منجبر کو جابر سے کس قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے:

حدیث ضعیف جو انجبار وتقویت کو قبول کرتی ہے وہ تقویت پہنچانے والے امر سے کیا فائدہ اٹھاتی ہے اور اس سے اس کو کس درجہ کی قوت حاصل ہوتی ہے؟

گذشتہ تفصیل میں بار بار اور وضاحت سے یہ بات آئی ہے کہ ایسی حدیث ضعیف سے نکل کر قبول کے مرحلہ کو پہنچتی ہے، اور قبول ومقبول کے آخری مرتبہ "حسن لغیرہ" میں مانی جاتی ہے۔ حتی کہ بعض حضرات نے حسن لغیرہ کی تعریف میں ہی جابر کے قبیل کی چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔

اور حسن لغیرہ جمہور محدثین کے نزدیک حسن لذاتہ کی طرح حجت ہے، اگرچہ مرتبہ میں فرق ہے، جبکہ کسی مسئلہ میں اس سے فائق حدیث موجود ہو اس سے معارضہ ہو تو فائق کو ترجیح ہوگی اور اس سے فائق نہ ملے تو اس کو حجت بنائیں گے اور بناتے ہیں۔

یہ تو اس کا اصل اور عام حکم ہوا لیکن ائمہ فن کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حدیث کی حیثیت وقوت اس مرتبہ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے اور بسا اوقات مانی جاتی ہے، معاملہ اس پر موقوف ہوتا ہے کہ تقویت پہنچانے والے امور وقرائن کیسے ہیں اور کتنے ہیں؟ ان کو دیکھتے ہوئے بسا اوقات اس قسم کی حدیث حسن کے اعلی مرتبہ اور صحت کے ادنی درجہ کو بھی پا لیتی ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے علامہ شعرانی کی "المیزان" سے نقل کیا ہے:

"جمہور محدثین حدیث ضعیف کو حجت بناتے ہیں جب کہ اس کے متعدد طرق ہوں، پھر کبھی اس کو صحیح کے ساتھ اور کبھی حسن کے ساتھ ملحق کرتے ہیں"

(قواعد فی علوم الحدیث ص:۵۱، المیزان ۱/۶۸)۔

امام تقی الدین سبکی نے "شفاء السقام" میں ذکر فرمایا ہے، اور ابن صلاح کے قول کا تعقب کیا ہے جو گذر چکا ہے۔

"ایسی حدیث ضعیف جس کے ضعف کا سبب حافظہ کا ضعف ہو، جبکہ راوی اپنی ذات میں سچا، معتبر، دیندار ودیانت دار ہو تو اس قسم کی احادیث کا مجموعہ قوت کو بڑھا دیتا ہے اور ایسی حدیث اس کی وجہ سے ترقی کر کے حسن یا صحیح کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے" (شفاء السقام ص:۱۱، تعلیقات قواعد فی علوم الحدیث ص:۵۱)۔

ابن کثیر نے اپنی کتاب "اختصار علوم الحدیث" کے اندر "حسن" سے متعلق اور ابن صلاح کے قول کی بابت گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"تعدد طرق حدیث (ضعیف) کو ضعف کے مرحلہ سے اٹھا کر حسن یا صحت کی بلندی تک پہنچا دیتا ہے" (اختصار علوم الحدیث ص:۴۳)۔

امام سخاوی نے فرمایا ہے جیسا کہ گذر چکا ہے:

''متابع ومؤید روایت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی ثبوت وصدق کا ظن قوی ہوگا جیسا کہ متواتر میں ہوتا ہے کہ اس کی اصل واول افراد ہی کی روایت ہوتی ہے''۔ (فتح المغیث ص: ۲۳)۔

۱۹- کیا قرائن کے فرق کی وجہ سے قوت وحکم کا فرق ہوگا؟

علماء کے درمیان کسی حدیث کی تلقی بالقبول یعنی مقبولیت کے بارے میں محققین نے نوعیت کی فرق کی بنا پر مرتبہ کا فرق ذکر کیا ہے جیسا کہ آچکا ہے۔ (ملاحظہ ہو: دفعہ ۱۰ باب سوم)۔

اسی طرح تعدد طرق کی صورت میں بھی فرق کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہ مزید ایک طریق ہے یا ایک سے زیادہ اور ان طرق کی نوعیت کیا ہے؟ یہ بھی تفصیل گذر چکی ہے (ملاحظہ ہو: دفعہ ۶ باب چہارم)۔

اس کے پیش نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تعدد طرق کے علاوہ جن قرائن کا اعتبار کیا گیا ہے، ان کے مدنظر حدیث کے مرتبہ وحیثیت میں فرق کیا جائے گا، یہ بات احقر کو صراحۃً نہیں مل سکی، لیکن پیچھے ذکر کردہ باتوں کا تقاضا ہے اور کچھ صراحتوں کا بین السطور یہی ہے۔

اس باب کی دفعہ ۱۰ کے تحت دیگر قرائن کا ذکر کیا گیا ہے ان قرائن کی نوعیت کا مقتضی بھی یہی ہے، ظاہر ہے کہ قرآن کریم یا احادیث مشہورہ اور امور مسلمہ کا مرتبہ کسی صحابی کے قول وفتوی سے مختلف وفائق مانا جائے گا۔

۲۰- ایسی احادیث کے مواقع وکتابیں:

اس قسم کی احادیث کا بڑا ذخیرہ امام ترمذی کی ''جامع'' اور سنن ابی داؤد نیز بیہقی کی ''سنن کبری'' وغیرہ میں ہے، امام ترمذی جن احادیث کے حق میں ''حسن'' ہونے کی صراحت کرتے ہیں وہ اسی قبیل کی ہیں، کیونکہ امام ترمذی نے اپنی ''علل صغیر'' میں خود اپنی کتاب کی حسن کی تعریف وتعارف میں ذکر کیا ہے۔

''ہم اپنی اس کتاب میں جس حدیث کو حسن کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک اس کی اسناد حسن ہے، ہر حدیث جو اس طور پر مروی ہو کہ اس کی اسناد میں متہم بالکذب راوی نہ ہو، اور نہ ہی حدیث شاذ ہو اور وہ اسی طرح کی کئی سندوں وطرق سے مروی ہو تو وہ ہمارے نزدیک حدیث حسن ہوتی ہے'' (جامع ترمذی، کتاب العلل اواخر الجامع)۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں جو معلقات ذکر کی ہیں ان میں سے بعض اسی قسم کی ہیں، حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی معلق روایات کی بابت گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان مثالوں سے ظاہر وواضح ہے کہ جن احادیث کو امام بخاری نے تعلیقاً- جزم- یعنی معروف کے لفظ وصیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے ان میں بہت سی امام بخاری کی شرط سے خالی ہیں۔

اور جن معلق روایات کو انہوں نے مجہول کے لفظ وصیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے ان کو اگر احتجاج یا استشہاد کے طور پر ذکر کیا ہے تو وہ یا تو صحیح ہیں یا حسن یا ضعیف ہیں تو منجبر ہیں البتہ اگر رد کے سیاق میں لائے ہیں تو وہ ان کے نزدیک ضعیف ہے اور ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ اس صورت میں وہ اس کے ضعف کو بیان کرنا چاہتے ہیں'' (النکت ص: ۳۴۲)۔

۲۱- امثلہ:

دو مثالیں ذکر کی جارہی ہیں ایک صحیح بخاری کی معلقات سے اور ایک امام ترمذی کی جامع سے۔

ابن صلاح وحافظ ابن حجر وغیرہ نے معلقات بخاری پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی حیثیت کی وضاحت کی ہے۔

الف- حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

امام بخاری نے کتاب الزکاۃ میں ایک روایت نقل کی ہے:

''یذکر عن سالم عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ: ''لایفرق بین مجتمع ولا یجمع بین مفرق''

(بخاری. کتاب الزکاۃ باب لایجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع)۔

اس حدیث کو سفیان بن حسین نے بواسطہ زہری موصولاً نقل کیا ہے (رواہ ابوداؤد والترمذی وغیرہ، جامع الاصول ۴/۵۷۶، ۵۹۲)۔

یہ بخاری کی شرط کی نسبت سے ضعیف ہے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت (مسند احمد ۱/ ۱۲) اس کے لئے شاہد ہے، اس لئے یہ حدیث حسن ہے

(النکت ص: ۳۳۷، ۳۳۸)۔

اسی طرح ابن لہیعہ کی ایک روایت کی بابت متابعت کی وجہ سے حدیث کے حسن ہونے کی بات ذکر کی ہے (النکت ص: ۳۳۸، ۳۳۹)۔

ب- امام ترمذی نے اپنی سنن کے اندر کتاب الصلاۃ میں حضرت ابوسعید خدری سے ایک روایت نقل کی ہے:

''إذا صلی أحدکم فلم یدر کیف صلی فلیسجد سجدتین وہو جالس''۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اس لئے کہ حضرت ابوسعید سے یہ کئی سندوں سے مروی ہے۔

(الترمذی، ابواب الصلاۃ باب فیمن شک فی الزیادۃ والنقصان)۔

یعنی اصلاً ضعیف ہے اس لئے کہ اس میں ایک راوی عیاض بن ہلال ہیں جو مجروح و مجہول راوی ہیں (التقریب ص: ۴۶۱)

اس لئے روایت ضعیف ہے۔

لیکن تعدد طرق کی وجہ سے اس کو حسن قرار دیا گیا ہے۔

باب پنجم: احکام کے باب میں

حدیث ضعیف پر عمل

اس باب کا مقصد اس امر کی وضاحت ہے کہ مطلق حدیث ضعیف یا عام جو شدید الضعف نہ ہو اور جس کو علماء امت کی طرف سے قبول کا حصول نہ ہو اور نہ ہی اس کے لئے ضعف کے جبر و تلافی کا کوئی قرینہ فراہم ہو تو کیا نفس احکام کے اثبات کے لئے اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے، فضائل کی بابت نہیں وہ بحث تو گذر چکی، اب مقصود حدیث ضعیف سے مسائل و احکام کے ثابت ہونے و کرنے کی بابت گفتگو ہے

(اس موضوع پر مولانا عبدالحئی لکھنوی نے "ظفر الامانی" میں استقلالاً گفتگو کی ہے، اور بہت اچھی و تحقیقی اور اس بابت علامہ کوثری کا بھی ایک مقالہ ہے، ایسے ہی مولانا ظفر احمد تھانوی نے "قواعد فی علوم الحدیث" میں اس سے متعلق ایک مستقل ایک فصل رکھی ہے)۔

۱- اس بابت علماء امت و ائمہ فن کے مذاہب و اقوال:

باب دوم میں خصوصیت سے اور اس سے پہلے بھی یہ بات بار بار آئی ہے کہ جمہور فضائل کے باب میں تو حدیث ضعیف پر عمل کی اجازت دیتے ہیں لیکن احکام میں انہوں نے اس سے انکار کیا ہے یعنی حدیث ضعیف سے استحباب و کراہت وغیرہ جیسے احکام بھی ثابت نہیں کئے جا سکتے۔

جن لوگوں نے اس کی صراحت کی ہے ان میں حافظ عراقی کا بھی نام ہے، مولانا عبدالحئی لکھنوی نے ذکر کیا ہے کہ عراقی نے "الفیۃ الحدیث" کی شرح میں کہا ہے: "اگر حدیث ضعیف کا تعلق احکام شرعیہ حلال و حرام وغیرہ کے بیان سے ہو یا عقائد سے ہو حق تعالیٰ کی صفات وغیرہ کے بارے میں تو علماء نے اس کے حق میں تساہل کو گوارا نہیں کیا ہے، ائمہ میں سے جن حضرات نے اس کی صراحت کی ہے ان میں عبدالرحمن بن مہدی، احمد بن حنبل، عبداللہ بن مبارک وغیرہ ہیں"۔ (شرح الالفیہ للعراقی ۲/ ۵۹، الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۳۹، ۴۰)۔

امام نووی نے "الاذکار" میں فرمایا ہے:

"احکام جیسے حلال و حرام، بیع اور نکاح و طلاق وغیرہ تو ان کے حق میں تو صرف حدیث صحیح یا حسن پر عمل کیا جائے گا" (الاذکار للنووی ص: ۵)۔

علامہ دوانی نے "نموذج العلوم" میں فرمایا ہے جیسا کہ مولانا عبدالحئی صاحب نے نقل کیا ہے:

"علماء اس پر متفق ہیں کہ حدیث ضعیف سے احکام شرعیہ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا" (الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۵۵، ۵۶)۔

باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام ابوحنیفہ و امام احمد علیہما الرحمہ ان دونوں کا مذہب یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں اگر حدیث ضعیف موجود ہو تو اس کو حکم کے باب میں قیاس و "رائے" بلکہ موقوف پر تقدم حاصل ہوگا، اس بابت ابن حزم کی نقل اور ابن القیم کا قول معروف ہے۔

اور جیسا کہ ابن القیم نے ذکر کیا ہے مذاہب اربعہ میں سے ہر ایک میں بعض مسائل کی سند ضعیف احادیث کے علاوہ نہیں ہے ابن القیم نے "اعلام الموقعین" میں اس کا ذکر کرنے کے ساتھ مثالیں بھی ذکر کی ہیں (اعلام الموقعین ۱/ ۳۲)۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے بھی "الاجوبۃ الفاضلۃ" کے حواشی میں، اس امر کا اور مثالوں کا تذکرہ کیا ہے (الاجوبۃ الفاضلۃ تعلیقات ص: ۴۸، ۴۹)۔

ابن القیم نے امام احمد کے مذہب کے اصول کو بیان کرتے ہوئے امام احمد کا قول عمل بالضعیف کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی: "ان کی اس اصل پر ہر امام فی الجملہ ان کا موافق ہے اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک نے (بعض مسائل میں) حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم کیا ہے"۔ (اعلام الموقعین ۱/ ۳۱)۔

۲-ائمہ وعلماء مذاہب کی تصریحات:

الف-حنفیہ:

جیسا کہ گذر چکا ابن حزم اور ابن القیم دونوں نے ذکر کیا ہے: ''علماء اس پر متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ حدیث ضعیف ان کے نزدیک رائے وقیاس سے اولی ہے''۔ (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۵۸، ۵۹، اعلام الموقعین ص: ۶۷)۔

(ابن حزم کا قول ان کی کتاب ملخص ابطال القیاس ص: ۶۸، والاحکام فی اُصول الاحکام ۷ / ۵۴ میں ہے جیسا کہ شیخ عبد الفتاح نے قواعد فی علوم الحدیث ص: ۵۹ کے حواشی میں ذکر کیا ہے، اور ابن حزم کے اس قول کو ان سے ذہبی، سخاوی، ابن حجر مکی نے نقل کیا ہے)۔

ابن الہمام نے ''فتح القدیر شرح ہدایہ'' میں ذکر کیا ہے: ''حدیث ضعیف غیر موضوع سے استحباب کا ثبوت ہوتا ہے'' (فتح القدیر ۲ / ۹۵)۔

اور ملا علی قاری نے ''شرح مشکاۃ-مرقاۃ المفاتیح'' میں ذکر کیا ہے:

''حنفیہ کا مذہب قوی یہ ہے کہ حدیث ضعیف کو اس قیاس مجرد سے مقدم کیا جائے جورد وتضعیف کا احتمال رکھتا ہو'' (مرقاۃ المفاتیح ۱ / ۳)۔

مولانا ظفر احمد تھانوی نے ''قواعد فی علوم الحدیث'' میں مستقل ایک فصل میں اس بابت اقوال کو جمع وذکر کیا ہے (قواعد فی علوم الحدیث)۔

نیز ''اعلاء السنن'' ''کتاب البیوع میں ایک موقع پر ذکر کیا ہے: ''منقطع اگر متصل سے معارض نہ ہو تو حجت ہے'' (اعلاء السنن ۱۴ / ۵۰)۔

اور اپنے اس قول کی تائید میں امام طحاوی کا یہ قول نقل کیا ہے جو ''خیار الرؤیۃ'' سے متعلق انہوں نے ذکر کیا ہے:

''اس بابت آثار تواتر کے ساتھ وارد ہیں، اور اگر چہ ان میں سے اکثر منقطع ہیں لیکن یہ انقطاع ایسا ہے کہ اس کا کسی متصل سے تعارض نہیں ہے''

(شرح معانی الآ ثار کتاب البیوع باب خیار الرؤیۃ)۔

ب-حنابلہ:

شیخ محمد ابوزہرہ نے ''تاریخ المذاہب الاسلامیۃ'' میں امام احمد کے مذہب کے اصول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اصل رابع-حدیث مرسل پر عمل جس میں راوی صحابی کا تذکرہ نہیں ہوتا، اسی طرح اس حدیث ضعیف پر عمل جس کی وضع کا ثبوت نہ ہو جبکہ اس مضمون کی کوئی معارض قوی روایت موجود نہ ہو اور وہ ایسی حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم کرتے ہیں'' (تاریخ المذاہب الاسلامیۃ ۲ / ۳۲۹، ۳۳۰)۔

ابن القیم ''اعلام الموقعین'' میں امام احمد کے اصول فقہ بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں:

''امام احمد کے فتاوی کی اصولی بنیادوں میں چوتھی اصل مرسل اور حدیث ضعیف پر عمل واعتبار ہے بشرطیکہ مسئلہ موضوع سے متعلق قوی چیز موجود نہ ہو جو مرسل وضعیف کو دفع کرے، اس کو وہ قیاس پر ترجیح دیتے ہیں'' (اعلام الموقعین ۱ / ۳۱)۔

مولانا عبد الحی لکھنوی اور علامہ سخاوی نے بھی امام احمد کا مذہب وقول یہی ذکر کیا ہے بشرطیکہ دوسری نص موجود نہ ہو اور ضعیف کا کوئی معارض بھی نہ ہو''

(الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۴۶، ۴۷، القول البدیع ص: ۱۹۵، فتح المغیث ص: ۲۰)۔

امام احمد سے ان کا قول یوں بھی مروی ہے: ''ہمارے نزدیک حدیث ضعیف لوگوں کی رائے سے زیادہ پسند ہے''۔

اسی طرح انہوں نے فرمایا: ''صاحب رائے کے بجائے مسئلہ اس سے پوچھو جس کو حدیث کا علم ہو خواہ وہ صحیح وضعف کو نہ جانتا ہو''۔

ایک موقع پر انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا: بیٹے تم حدیث کی بابت میرا طریقہ جانتے ہو کہ: اگر کوئی حدیث ضعیف ہو اور اس کے خلاف کوئی مضبوط چیز موجود نہ ہو تو میں حدیث ضعیف کی مخالفت نہیں کرتا'' (فتح الملہم ۱ / ۷۷، الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۴۶، ۴۷)۔

ج-شافعیہ:

امام نووی کا قول پیچھے آچکا ہے، انہوں نے فضائل کے باب میں ضعیف کے اعتبار وعمل کی بات نیز احکام میں نفی کی بات کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے:

"اگر کوئی احتیاطی موقع وبات ہوتو احکام میں اعتبار کیا جائے گا" (الاذ کار ص: ۵)۔

ان کے اس قول کی وضاحت دوسرے قول سے ہوتی ہے:

"اگر کسی حدیث ضعیف میں بیع کی کسی شکل یا نکاح کی کسی صورت کی کراہت کا تذکرہ ہوتو مستحب یہ ہے کہ اس سے بچا جائے" (الاذ کار ص: ۵، ۶، فتح المغیث ص: ۲۸۵)۔

سیوطی نے "تدریب الراوی" میں ذکر کیا ہے: "حدیث ضعیف پر احکام میں بھی عمل کیا جاتا ہے جبکہ اس میں احتیاط ہو" (تدریب الراوی ار ۲۹۹)۔

بلکہ امام شافعی جن کی رائے مرسل وغیرہ کے حق میں سب سے سخت ہے خود ان سے سیوطی نے نقل کیا ہے:

"اگر کسی مسئلہ میں بطور دلیل صرف حدیث مرسل موجود ہوتو امام شافعی کے تین اقوال ہیں: تیسرا قول ہے جو اظہر ہے کہ اس کی وجہ سے اس کام سے بچنا اور رکنا ضروری ہے" (تدریب الراوی ار ۲۰۲)۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے "مقدمہ فتح الملہم" میں ماوردی سے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے جس کو ان کا قول جدید بتایا ہے:

"جب مرسل کے علاوہ کوئی دلیل نہ ہو حدیث مرسل سے احتجاج کیا جائے گا" (فتح الملہم ار ۲۹)۔

سخاوی نے بھی "فتح المغیث" میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے (فتح المغیث ص: ۸۰، ۲۸۵)۔

حدیث ضعیف پر احکام کی بنا کی مثالوں میں ابن قیم نے وادی وج کے شکار کا مسئلہ نیز ممنوع اوقات میں مکہ مکرمہ میں نماز کے جواز کا مسئلہ، فقہ شافعی کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ ان مسائل کی مستدل احادیث ضعیف ہیں (اعلام الموقعین ار ۳۲)۔

اسی طرح دفن کے بعد تلقین کا مسئلہ شوافع کی ایک جماعت کے نزدیک مختار ہے جس میں رافعی، ابن صلاح، نووی وغیرہ ہیں جبکہ مستدل حدیث ضعیف ہے۔ (الاذ کار ص: ۳۸، مسئلہ تلقین کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اعلاء السنن ۹ / ۱۷۳، والروح لابن القیم ص: ۱۳، ۱۴، اور حدیث کے لئے الاذ کار کا حاشیہ ص: ۱۳۸، والاجوبۃ الفاضلہ ص: ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۸)۔

د- مالکیہ:

علامہ ابن القیم نے "اعلام الموقعین" میں ائمہ کے اصول پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالک کے متعلق تحریر فرمایا ہے:

"امام مالک حدیث مرسل اور منقطع وبلاغات کو نیز قول صحابی کو بھی قیاس پر مقدم کرتے ہیں" (اعلام الموقعین ار ۳۲)۔

"بلاغات" سے مراد وہ روایات ہیں جن کو انہوں نے "موطا" میں "بلغنا" کے لفظ سے ذکر کیا ہے، اور ان کا یہ قول گذر چکا ہے کہ "مدینہ میں کسی حدیث کی شہرت سند سے مستغنی کر دیتی ہے" (سنن الدارقطنی ۲ / ۴۴۱)۔

امام ابوداؤد اپنے خط (بنام اہل مکہ) میں تحریر فرماتے ہیں:

"مرسل روایات کو گذشتہ علماء حجت بنایا کرتے تھے جیسے سفیان ثوری، مالک، اوزاعی حتی کہ امام شافعی نے اس بابت کچھ گفتگو کی ہے جس میں امام احمد وغیرہ نے بھی ان کی موافقت کی، یہ امام احمد کی ایک روایت ہے، لیکن کسی مسئلہ میں جب مرسل ہی روایت ہوتو وہ حجت ہوگی اگرچہ وہ قوت میں متصل کی مانند نہیں ہوگی" (فتح الملہم ار ۹۰)۔

ابن عبدالبر نے قید لگائی ہے کہ مرسل مالکیہ کے یہاں مقبول ہے بشرطیکہ ارسال کرنے والا ثقہ سے ہی ارسال کرے (فتح الملہم ار ۹۰)۔

ابوالولید باجی مالکی فرماتے ہیں کہ اگر ارسال کرنے والا صرف ثقہ سے ارسال کرتا ہوتو جمہور فقہاء اس پر عمل کے حق میں متفق ہیں۔ (احکام الفصول فی احکام الاصول ص: ۳۴۹، ۳۶۰)۔

۳- ایک اعتراض اور جواب:

احکام میں حدیث ضعیف کے اعتبار کی نسبت سے مولانا عبدالحئی لکھنوی نے ایک اعتراض ذکر کیا ہے اور اس کو دوانی سے بھی نقل کیا ہے اور ان کا جواب بھی ذکر کیا ہے، اور خود بھی جواب دیا ہے۔

اعتراض یہ ہے کہ معروف ہے، اور بار بار بوضاحت یہ کہا گیا، جیسا کہ گذر چکا ہے کہ حدیث ضعیف کا اعتبار صرف فضائل کے باب میں ہے، احکام ومسائل میں نہیں ہے، پھر اس اعتبار کے کیا معنی جس کا ذکر پیچھے کیا گیا۔

کہ ضعیف سے مسائل کو بھی ثابت کیا گیا، کراہت واستحباب وغیرہ، اور کراہت واستحباب وغیرہ بھی احکام کے قبیل سے ہیں۔

مولانا لکھنوی فرماتے ہیں: ''علماء نے صراحت کی ہے کہ حدیث ضعیف سے احکام شرعیہ ثابت نہیں ہوتے اور اس کی بنیاد پر جواز واستحباب کا ثبوت احکام سے ہی تعلق رکھتا ہے، لہذا جب کسی حدیث ضعیف کے تقاضے سے کسی عمل کو مستحب قرار دیا گیا تو یہ ضعیف سے استحباب کا اور حکم کا ثبوت ہوا تو یہ تو ان حضرات کے کلام میں تناقض وتعارض ہوا؟ (الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۳)۔

دوانی نے اس کا تفصیل سے جواب دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی صورت میں اصل جواز واستحباب حدیث ضعیف سے ثابت نہیں جیسا کہ علماء کی صراحت کا حاصل وظاہر بھی ہے، بلکہ ایسے مواقع میں اصلاً احتیاط کو اختیار کیا گیا ہے کہ ایک عمل جب اباحت واستحباب دونوں کے درمیان دائر ہوتا ہے تو احتیاط اعتبار میں سمجھی گئی (الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۷، مزید ملاحظہ ہو: ص: ۵۶ تا ۵۹)۔

خود مولانا عبدالحئی صاحب کا جواب ہے، اور احقر کے نزدیک وہ زیادہ بہتر ہے کہ

''حق اس مقام میں یہ ہے کہ جب خصوصیت سے کسی چیز کا استحباب یا جواز کسی حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس کا تذکرہ کسی ایسی حدیث ضعیف میں ہو جو شدید الضعف نہ ہو تو اس حدیث کی وجہ سے اس کا استحباب وجواز ثابت ہوگا اس شرط پر کہ وہ امر کسی اصل شرعی کے تحت داخل ہو اور شریعت کے اصول نیز دلائل صحیحہ سے معارض نہ ہو'' (الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۷، نیز ۵۶ تا ۵۹)۔

۴- احکام میں معتبر ضعیف سے کیا مراد ہے؟

امام ابوحنیفہ وامام احمد کے متعلق خصوصیت سے جو احکام میں ضعیف کا اعتبار معروف ہے تو ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ اس ضعیف سے کیا مراد ہے؟ ضعیف محض ومعروف یا ضعیف منجبر وغیرہ۔

اس بابت شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید ابن القیم نے جو تفصیل وتحقیق اختیار کی ہے اور جس کو بعد میں عموماً پسند کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی مراد آج کی معروف اصطلاح میں ضعیف نہیں بلکہ حسن مطلق یا کم از کم حسن لغیرہ یعنی ضعیف منجبر وغیرہ ہے۔

شیخ الاسلام ''منہاج السنۃ'' میں فرماتے ہیں:

''ہم جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث ضعیف رائے سے بہتر ہے تو اس سے وہ ضعیف مراد نہیں جو متروک ہے (اس لئے کہ وہ اصطلاحی ضعیف ہے)، بلکہ اس سے مراد حدیث حسن ہے جیسے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند اور ابراہیم ہجری کی حدیث، اور ان جیسی احادیث جن کی امام ترمذی تحسین کرتے ہیں اور کبھی تصحیح بھی۔

امام ترمذی سے پہلے اصطلاحی طور پر حدیث کی دو ہی اقسام تھیں صحیح وضعیف اور ضعیف کی دو اقسام تھیں ضعیف متروک (غیر مقبول وغیر قابل عمل) ضعیف (مقبول وقابل عمل) ائمہ حدیث نے (عموماً) اسی اصطلاح کے مطابق گفتگو کی ہے۔ اب جن لوگوں کو امام ترمذی کی اصطلاح کے علاوہ (اصل اصطلاح) کا علم نہیں رہا تو انہوں نے بعض ائمہ کا یہ قول سنا: ''حدیث ضعیف ہم کو قیاس سے زیادہ پسند ہے''۔

تو وہ یہ سمجھے کہ وہ لوگ اس ضعیف سے حجت پکڑتے ہیں جس کو امام ترمذی جیسے حضرات نے ضعیف کہا ہے اور انہوں نے ان لوگوں کا طریقہ اختیار کیا جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حدیث صحیح کی زیادہ اتباع کرتے ہیں جبکہ ایسے لوگ تناقض کا شکار اور ان لوگوں میں ہیں جو غیر اولی کو اولی پر ترجیح دیتے ہیں جو کم از کم

اس سے کمتر نہیں ہوتی'' (منہاج السنۃ النبویۃ ۳؍۱۹۱، تعلیقات الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۴۷)۔

اس سے بھی زیادہ واضح ان کا یہ قول ہے: ''امام احمد اور ان سے قبل کے علماء کا عرف یہ تھا کہ حدیث کی دو انواع مانی جاتی تھیں صحیح وضعیف اور ضعیف کی ان کے نزدیک دو اقسام تھیں، ضعیف متروک (غیر مقبول) اس کو حجت نہیں بنایا جاتا تھا اور ضعیف حسن (مقبول وحجت)۔

حدیث کی تین اقسام قرار دینے والے اولین صاحب فن جو معروف ہیں وہ امام ترمذی ہیں کہ انہوں نے تین اقسام صحیح، حسن، ضعیف قرار دیں۔

امام ترمذی کے نزدیک حسن وہ حدیث ہے جس کے طرق متعدد ہوں اور اس کے رواۃ میں کوئی متہم بالکذب نہ ہو اور حدیث شاذ نہ ہو۔

اس قسم کی حدیث کو امام احمد ضعیف اور قابل احتجاج کہتے ہیں اسی لئے امام احمد نے ضعیف قابل احتجاج کی مثال میں عمرو بن شعیب اور ابراہیم ہجری وغیرہ کی حدیث کا تذکرہ کیا ہے۔

اور جو لوگ امام احمد کا قول یہ بتاتے ہیں کہ وہ اس حدیث ضعیف کو حجت بناتے ہیں جو نہ صحیح ہو اور نہ حسن، تو ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔

(فتاوی شیخ الاسلام ۱؍۲۵۱، ۲۵۲، وقاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ ص: ۸۲، ۸۳، تعلیقات قواعد فی علوم الحدیث ص: ۶۱، ۶۲)۔

اسی انداز کی بات ابن القیم نے بھی امام احمد وامام ابوحنیفہ کے مذہب کی بابت ذکر کی ہے (اعلام الموقعین ۱؍۳۲، ۷۷)۔

امام نووی کی ''الاذکار'' کے شارح ابن علان نے بھی ان دونوں حضرات کی موافقت کی ہے اور ذکر کیا ہے:

''مشہور اصطلاح کے مطابق ضعیف جس کا مطلب ہے ایسی حدیث جس کے اندر مقبول کی شروط نہ پائی جائیں مراد نہیں ہے، جیسا کہ ابن العربی نے اپنے شیخ سے نقل کیا ہے اور یہ بات صحیح ہے اس سے امام احمد کے حق میں وارد ہونے والا اعتراض دفع ہو جاتا ہے''۔

(شرح ابن علان ص: ۸۳، وتعلیقات الاجوبۃ ص: ۴۷)۔

ابن حزم نے امام ابوحنیفہ کے قول کا ذکر کیا ہے تو اس کی بابت زرکشی نے یہی وضاحت کی ہے (الاجوبۃ الفاضلۃ، تعلیقات ص: ۴۷)۔

اور یہی بات مولانا ظفر احمد تھانوی نے اختیار کی ہے اور اس کو بار بار ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: قواعد فی علوم الحدیث ص: ۶۷)۔

ایک موقع پر مولانا فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ ہمارے اصحاب کے کلام میں جو یہ آیا ہے کہ حدیث ضعیف قیاس پر مقدم ہے تو ضعیف سے مراد وہ قسم ہے جس کو متاخرین ذاتی طور پر ضعیف اور شواہد وغیرہ کی بنا پر حسن مانتے ہیں۔

اگر تم ان احادیث کو دیکھو اور جانچو جن کو ابن قیم نے ایسی حدیث ضعیف کی مثال میں ذکر کیا ہے جس کو امام ابوحنیفہ نے قیاس پر مقدم کیا ہے تو ان سب کو تم حسن پاؤ گے خواہ حسن لذاتہ یا حسن لغیرہ'' (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۶۷ ومابعد)۔

۵- کیا ثلاثی تقسیم امام ترمذی کی ایجاد ہے اور حسن کی اصطلاح؟

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید ابن القیم نے یہ بات پرزور طور پر کہی ہے اور بعد کے بہت سے حضرات نے موافقت کی ہے کہ حدیث میں اصل تقسیم صحیح وضعیف کی ہے پھر ہر ایک کے مراتب وانواع ہیں حسن جہاں صحیح کی انواع واقسام میں ہے ویسے ہی ضعیف کی اقسام میں بھی اس کو ذکر کیا جاتا ہے، اس لئے امام احمد وغیرہ ضعیف سے حسن ہی مراد لیتے ہیں یعنی حسن لغیرہ جو اصلاً ضعیف ہوتی ہے، خالص ضعیف نہیں۔

ائمہ حدیث میں امام ترمذی اولین شخص ہیں جنہوں نے صحیح وضعیف کے ساتھ حسن کو استقلالاً ذکر واختیار کیا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ رجحان درست نہیں ہے، شیخ محمد عوامہ اور شیخ عبد الفتاح ان دونوں حضرات نے بڑی وضاحت سے اور پورے استقراء وتتبع کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے کہ حسن کی اصطلاح کا استعمال امام ترمذی کے ماقبل حضرات، ان کے اساتذہ ومشائخ بلکہ امام مالک وامام شافعی وغیرہ سے بھی ثابت ہے، حتی کہ امام احمد سے بھی ثابت ہے، اور ابو حاتم وغیرہ سے بھی۔

ان حضرات کے استعمال میں حسن کا لفظ، حدیث کی نسبت سے بھی آیا ہے اور اسناد کی نسبت سے اور راوی کے لئے بھی آیا ہے۔

یعنی اہل فن وائمہ فن، فن کی تنقیح وتحقیق کے آغاز سے ہیں، لفظ حسن کو بطور اصطلاح استعمال کرتے رہے ہیں اور اس ضمن میں کبھی حدیث کو حسن کہتے ہیں کبھی راوی کو "حسن الحدیث" کہتے ہیں اور کبھی سند کو حسن کو اور راوی کو "حسن الاسناد" کہتے ہیں:

تفصیل کے لئے "قواعد فی علوم الحدیث" (مقدمہ اول برائے اعلاء السنن) ملاحظہ ہو جو شیخ عبد الفتاح ابوغدہ کی تعلیقات وحواشی کے ساتھ مزین ہے۔

اگرچہ "قواعد فی علوم الحدیث" کے مصنف مولانا ظفر احمد صاحب ابن تیمیہ وابن قیم کے نظریہ کی مؤید ہیں لیکن علامہ انور شاہ کشمیری وعلامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ نے اس کو رد کیا ہے اور حق شیخ عبد الفتاح وشیخ محمد عوامہ استاذ وشاگرد نے ادا کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: قواعد فی علوم الحدیث ص: ۶۲ تا ۶۴، نیز فتح الملہم، مقدمہ فیض الباری)۔

۶- حقیقت کیا ہے؟

امام ابوحنیفہ وامام احمد نے احکام میں ضعیف کا جو اعتبار کیا ہے تو فن کے عمومی احکام وضوابط نیز خود حدیث ضعیف سے متعلق تفصیلات کی بنا پر عام رجحان تو کچھ اسی قسم کا ہے جو ابن تیمیہ وغیرہ سے منقول ہے کہ یہ حضرات ضعیف محض کو حجت نہیں بناتے بلکہ اس ضعیف کو جو ضعف کی حد سے نکل جائے، لیکن غور کرنے پر حقیقت کچھ اور سمجھ میں آتی ہے جیسا کہ بعض محققین عصر نے وضاحت کی ہے اور اس کو ثابت بھی کیا ہے۔

معاملہ یہ ہے کہ اگر بات یہی ہو جو یہ حضرات کہتے ہیں تو ان حضرات کے اختلاف اور اس کو اہتمام سے ذکر کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کیونکہ ضعیف منجبر اور حسن لغیرہ پر اعتماد واعتبار تو جمہور کا مذہب ہے اور امام احمد کا جملہ ہے: "حدیث ضعیف رائے وقیاس سے مجھ کو زیادہ پسند ہے"۔

پھر یہ بھی درست نہیں کہ ثلاثی تقسیم امام احمد وغیرہ کے بعد کے عہد کی ہے بلکہ صحیح 'حسن' ضعیف کا ذکر، تعریف وتعارف کا سلسلہ پہلے سے آرہا ہے جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا۔

اس لئے صحیح وراجح یہی ہے کہ ضعیف سے مراد وہ ضعیف ہے جس کا اعتبار فضائل کے باب میں متفق علیہ ہے، مولانا عبد الحی لکھنوی شیخ عبد الفتاح، شیخ محمد عوامہ وغیرہ کا رجحان یہی ہے۔

مولانا عبد الحیٔ صاحب نے "الاجوبۃ الفاضلۃ" اور "ظفر الامانی" دونوں میں اس کا بوضاحت تذکرہ کیا ہے۔

"ظفر الامانی" میں ایک موقع پر فضائل کے باب میں اعتبار کی بابت گفتگو کرتے ہوئے دو مذہب ذکر کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ذکر کیا ہے کہ

"حدیث ضعیف سے استحباب کا ثبوت ہوتا ہے"

اور اس کی نسبت ابن الہمام ونووی وغیرہ کی طرف کی ہے (ظفر الامانی ص: ۱۹۰، فتح القدیر ۲/ ۹۵)۔

اور "الاجوبۃ الفاضلۃ" میں فرماتے ہیں:

"جب کسی چیز کا جواز یا استحباب خصوصیت سے کسی حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس کی بابت کوئی حدیث ضعیف پائی جائے جو شدید الضعف نہ ہو تو اس سے اس امر کا جواز واستحباب ثابت ہوگا" (الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۵)۔

نیز "ظفر الامانی" میں موضوع پر گفتگو وتفصیل کے بعد فرماتے ہیں:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس سے تمام اوہام کا دفعیہ ہو جاتا ہے، کہ استحباب یا کراہت جو استحباب کے درجہ میں ہوتی ہے، (یعنی کراہت تنزیہیہ) یا جواز حدیث ضعیف سے ثابت ہوتا ہے جبکہ وہ شرطیں پائی جائیں جو فضائل میں اعتبار کی بابت گذری ہیں اور یہ چیز علماء (فن) کے اس قول کے منافی ومعارض نہیں کہ حدیث ضعیف احکام شرعیہ کو ثابت نہیں کرتی" (ظفر الامانی ص: ۳۹)۔

"الاذکار" میں امام نووی کی عبارت بھی یہی بتاتی ہے جو نقل کی جا چکی ہے کہ وہ نفی کے قول کو ذکر کرنے کے ساتھ فرماتے ہیں:

"الا یہ کہ احتیاط کے موقع پر مثلاً کسی حدیث ضعیف میں بیع کی کسی قسم یا نکاح کی کسی صورت کی کراہت کا تذکرہ ہو" (الاذکار ص: ۵،۶)۔

یعنی نفی کا مطلب ہے کہ کوئی حدیث ضعیف اپنی ذات میں یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ اس سے کسی باب میں فائدہ اٹھایا جائے لیکن جب اس کے ساتھ

وہ قرائن نہ ہوں جن سے اس کو تقویت ہوتی ہے اور جن کی بنا پر وہ حسن لغیرہ قرار پاتی ہے، البتہ وہ شرائط وامور موجود ہوں جن کا تذکرہ فضائل کے باب میں اعتبار کے لئے معروف ہے تو جمہور کے نزدیک جہاں فضائل میں اس کا اعتبار ہے وہیں علماء وائمہ کی ایک جماعت-جس میں امام ابوحنیفہ وامام احمد کا نام معروف ہے-اس کی قائل ہے کہ احکام میں بھی بوقت ضرورت اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ضرورت کا مطلب ہے اس سے قوی وفائق کا موجود نہ ہونا، بلکہ صورت حال یہ ہو کہ ایک طرف قیاس ہو جس کا مقتضی کچھ ہو اور دوسری طرف حدیث ضعیف ہو جس کا تقاضا دوسرا ہو تو حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا جیسا کہ امام احمد کے قول میں بار بار آیا ہے (اعلام الموقعین ۱/۲۷، الاجوبۃ الفاضلہ ص: ۴۶، ۴۷)۔

اسی پر اعتراض وارد ہوتا ہے جس کو مولانا عبدالحئی صاحب وغیرہ نے ذکر کیا ہے ورنہ حسن لغیرہ میں کیا اشکال اور حسن لذاتہ پر تو بدرجہ اولی اشکال واعتراض نہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی "مقدمہ فتح الملہم" میں فرماتے ہیں: "امام احمد کے کلام میں ضعیف کو حسن پر محمول کرنا بعید ہے جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے "منہاج السنہ" میں ذکر کیا ہے، اس لئے کہ امام احمد کے کلام کا سیاق ہماری نقل کے مطابق اس سے مناسبت نہیں رکھتا" (فتح الملہم ۱/۷۷)۔

اور مولانا نے اس سے قبل امام احمد کے مذکور قول اور اس کی بابت کچھ تفصیل کو بھی ذکر کیا ہے (فتح الملہم ۱/۷۷)۔

بلکہ علامہ سخاوی نے بھی "فتح المغیث" میں کچھ اس قسم کی بات فرمائی ہے اور ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ:

ابوداؤد اپنی سنن میں سند ضعیف-حدیث ضعیف-کا بھی تذکرہ کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک حدیث ضعیف رائے سے قوی ہے اور ابوداؤد اپنے اس معمول میں اپنے شیخ امام احمد رحمہ اللہ کے متبع ہیں کہ ان کا معمول یہی تھا جیسا کہ امام احمد کے بیٹے "عبداللہ" نے امام صاحب سے بار بار نقل کیا ہے جس میں یہ جملہ بھی آیا ہے: "بیٹے تم میرا طریقہ جانتے ہو کہ میں ضعیف کی اسی وقت مخالفت کرتا ہوں جب کوئی حدیث اس کے بالمقابل موجود ہو ورنہ میں اس کی مخالفت نہیں کرتا"۔ (فتح الملہم ۱/۷۷)۔

۷- شیخ عبدالفتاح وشیخ محمد عوامہ کی ناقدانہ ومحققانہ بحث:

جیسا کہ ذکر کیا گیا ابن تیمیہ وغیرہ کے نقطہ نظر کے خلاف کئی حضرات نے صراحت کی ہے اور یہی امام ابوحنیفہ اور بالخصوص امام احمد کے کلام کا ظاہر ومتبادر ہے۔

شیخ محمد عوامہ نے ابتداءً تو اس دعوی پر ردونقد کیا ہے کہ تقسیم ثلاثی ترمذی وغیرہ کی اور بعد کی ہے، جیسا کہ نقل کیا جاچکا ہے اور اس کے بعد اس امر پر گفتگو کی ہے کہ ضعیف سے ضعیف اصطلاحی کو ہی مراد لیا گیا ہے۔

شیخ محمد عوامہ کی بحث کا حاصل خود ان کے دو اقتباسات کے واسطے سے پیش خدمت ہے، ایک بحث کا آغاز ہے اور ایک اختتام ہے۔ فرماتے ہیں:

"حدیث ضعیف کی چار اقسام کی جانی چاہئیں:

۱- ضعیف منجبر، وہ ضعیف جس کے ضعف کی تلافی وتدارک متابعت وشواہد کی بنا پر ہو۔

۲- ضعیف متوسط الضعف۔ ۳- ضعیف شدید الضعف۔ ۴- موضوع۔

(موضوع تو موضوع بحث سے باہر ہے، اسی طرح شدید الضعف بھی، دو قسمیں بچیں پہلی اور دوسری)۔

امام مالک وامام شافعی صرف پہلی کو لیتے ہیں جبکہ امام احمد وامام ابوحنیفہ اس موقع ومناسبت میں ضعیف سے دوسری قسم کو بھی مراد لیتے ہیں اور اس کو داخل حکم وبحث کرتے ہیں" (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۶۲)۔

اور شیخ محمد عوامہ کے کلام کا آخری حصہ ہے:

"امام احمد کے کلام کا ظاہر اس امر کی طرف مشیر ہے کہ ان کی مراد ضعیف سے وہ ضعیف ہے جس میں قبول کی شرطیں نہ پائی جائیں اس لئے کہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک کسی مسئلہ میں نص ملتی ہو اور موجود ہو رائے وقیاس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، خواہ نص ضعیف کیوں نہ ہو کہ حدیث ضعیف رائے سے

(بہرحال) بہتر ہے'' (قواعد فی علوم الحدیث، تعلیقات ص:۶۶)۔

اور اپنی رائے کی تائید میں ابن حزم کی نقل کردہ روایت ذکر کی ہے:

''عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ ایک آدمی ایک ایسے علاقہ میں ہے جہاں ایک حدیث کا عالم ہے لیکن حدیث میں صحیح وضعیف سے واقف نہیں ہے اور اس علاقہ میں کچھ اصحاب رائے ہیں، اب اس آدمی کو کوئی حالت پیش آتی ہے جس میں شرعی حکم کی ضرورت ہے تو کس سے پوچھے؟ میرے والد نے فرمایا: حدیث کے عالم سے مسئلہ وحکم شرعی دریافت کرے اور صاحب رائے سے مسئلہ معلوم نہ کرے، کیونکہ ضعیف حدیث بھی رائے سے کہیں قوی ہے'' (المحلی ۱/۲۷، وفتح المغیث ص:۸۰، تعلیقات قواعد فی علوم الحدیث ص:۶۶)۔

شیخ محمد عوامہ کا جو نقطہ نظر ہے وہی شیخ نورالدین عتر کا بھی ہے، وہ اپنی کتاب ''منہج النقد فی علوم الحدیث'' میں ذکر کرتے ہیں:

''علماء کی ایک جماعت نے امام احمد وغیرہ کے ان اقوال کی یہ تاویل وتوجیہ کی ہے کہ ضعیف سے متعارف معنی ومفہوم مراد نہیں بلکہ دوسرا مفہوم مراد ہے اور وہ حسن ہے ضعیف سے اس کو مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ حسن میں صحیح کی نسبت ومقابلہ میں ضعف ہوتا ہے'' (منہج النقد ص:۲۹۲)۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''لیکن ہمارے نزدیک یہ توجیہ وتاویل ابوداؤد کے قول کی روشنی میں مشکل ہے، کیونکہ ابوداؤد نے حدیث صحیح نہ ملنے کی صورت میں غیر متصل (منقطع) کو قابل عمل قرار دیا ہے، اور معلوم ہے کہ حدیث منقطع حدیث ضعیف کی اقسام میں سے ہے، حسن کی قسم نہیں ہے''

اور مزید فرماتے ہیں:

''ان حضرات کے قول میں ضعیف کا مطلب اگر حسن لے لیں تو ان حضرات کی تخصیص اور ان کے خصوصی قول کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے کہ ضعیف کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا، کیونکہ حسن پر عمل (اور اس کا قیاس پر مقدم کرنا) جمہور علماء کا مذہب ہے''۔

(منہج النقد فی علوم الحدیث ص:۲۹۲، واضح رہے کہ ضعیف کی حسن سے توجیہ کرنے والوں کے خلاف گفتگو میں، شیخ عبدالفتاح شیخ عتر و شیخ محمد عوامہ کی گفتگو کا حاصل ایک ہے جو ذکر کیا گیا ہے)۔

بہرحال ان حضرات محققین کی تنقیح وتفصیل کے مطابق احکام میں احتجاج کے باب میں ضعیف سے مروج اصطلاح کے مطابق ضعیف مراد ہے، البتہ کچھ قیود وتفصیل کے ساتھ جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۸- کس قسم کی ضعیف احکام میں حجت ہے؟

گذشتہ سطور میں یہ بات واضح ہوگئی کہ امام ابوحنیفہ وامام احمد نے احکام میں احتجاج کے لئے ضعیف سے ضعیف ہی کو مراد لیا ہے، متاخرین کی اصطلاح کے مطابق جو حدیث کی تین اقسام قرار دیتے ہیں یا دو تو یوں ایک مقبول جو حسن لغیرہ کو بھی شامل ہے اور دوسری ضعیف۔

اور یہ طے ہے کہ موضوع - ضعیف کی ایک قسم ہونے کی حیثیت سے مراد نہیں اور نہ ہی شدید الضعف مراد ہے۔

بلکہ وہ ضعیف مراد ہے جس کا اعتبار فضائل کے حق میں ہے اور اسی تفصیل وشرائط کے مطابق جو وہاں معتبر ہیں۔ مولانا عبدالحئی صاحب کا قول گذر چکا ہے۔

''جب کسی چیز کا جواز یا استحباب خصوصیت سے کسی حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس کی بابت کوئی حدیث ضعیف موجود ہو جو شدید الضعف نہ ہو تو اس حدیث ضعیف سے اس امر کا استحباب وجواز ثابت ہوگا، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ امر کسی اصل شرعی کے تحت داخل ہو اور شریعت کے اصول اور ادلہ صحیحہ کے منافی ومعارض نہ ہو'' (الاجوبۃ الفاضلۃ ص:۵۵)۔

فضائل کے باب میں حدیث ضعیف سے استدلال اور اس کے شرائط کی تفصیل گذر چکی ہے۔ مولانا کی اس عبارت سے بھی فی الجملہ اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ جس میں اہم بات یہ ہے کہ حدیث شدید الضعف نہ ہو اور اصول شریعت سے مناسبت رکھتی ہو۔

اور شدید الضعف نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی ہو کہ مناسب ومفید قرائن مل جائیں تو اس کے ضعف کو تقویت ہو اور وہ حسن لغیرہ کے درجہ کو

پہنچ جائے۔

تو اس قسم کی حدیث ضعیف اگر صرف ایک طریق سے مروی ہو، نہ تعدد طرق ہو اور نہ تلقی بالقبول وغیرہ، اور مسئلہ زیر بحث میں ہم کو اس سے قوی واچھی کوئی دلیل شرعی ونقلی نہ ملے۔ ہاں قیاس ضرور ہو، تو ایسی صورت میں اس قسم کی ضعیف حدیث کو ہم رائے وقیاس پر مقدم کریں گا جیسا کہ امام احمد نے بار بار اور بوضاحت فرمایا ہے۔

سیوطی نے تعدد طرق کی نسبت سے کہا ہے:

''ایسی حدیث سے استدلال ناجائز نہیں ہے جس کے دو طریق ہوں اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ حجت نہ ہو'' (تدریب الراوی ۱/۱۶۰)۔

یہاں مراد اسی قسم کی حدیث ضعیف ہے کہ دوسری اپنی جیسی ضعیف سے مل جائے تو خود قوت حاصل کرے اور قوت پہنچائے، اور جب تک تنہا واکیلی ہو تو یہ حیثیت رکھے کہ اس میں کسی قسم کی قوت نہ ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی نہ ہو کہ اس کو مردود وغیر قابل احتجاج قرار دیا گیا ہو۔

شیخ محمد عوامہ کی تفصیل وتحقیق سامنے رکھی جائے:

۱- موضوع کسی کام کی نہیں۔

۲- شدید الضعف بھی کسی کام کی نہیں البتہ تعدد طرق کی وجہ سے کبھی یہ حیثیت حاصل کر لیتی ہے کہ بے اصل ومنکر نہیں کہی جاتی جیسا کہ گذر چکا ہے۔

۳- ضعیف منجبر بالاتفاق حجت ہے جس کو حسن لغیرہ کہتے ہیں۔

۴- متوسط الضعف فضائل کے باب میں جمہور کے نزدیک اور احکام کے باب میں بالخصوص امام ابوحنیفہ وامام احمد کے نزدیک حجت ہے۔

اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں ضعیف کی دو اقسام ہیں، شدید الضعف اور خفیف الضعف، شدید الضعف موضوع کی طرح قابل احتجاج نہیں الا یہ کہ طرق وقرائن کی وجہ سے نکارت سے نکل جائے۔

اور خفیف الضعف کے دو حصے ہیں ایک جس کو کسی طرح قوت وانجبار واعتبار حاصل ہو، دوسرا وہ جو اس سے خالی ہو اول بالاتفاق حجت ہے، دوم میں اختلاف ہے اور وہی اس بحث وباب کا موضوع ہے، جب کسی مسئلہ میں اس قسم کی حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہ ملے تو شرعی طور پر جیسے فضائل میں یہ حجت ہے احکام میں بھی حجت ہے۔

۹-۱ مثلہ (جو عمومی ذکر کی گئی ہیں):

احقر کا رجحان بھی وہی ہے جو شیخ محمد عوامہ، شیخ نور الدین عتر اور ان سے قبل کے بہت سے بزرگوں کا ہے، عام رجحان کے خلاف۔

لیکن جہاں تک مثال کا سوال ہے تو عموماً جن احادیث کا تذکرہ مثالوں میں کیا گیا ہے ان کی نوعیت یہ نہیں کہ وہ محض ضعیف ہیں حتی کہ جن کو انتہائی ضعیف اور وضع کی حد تک پہنچا ہوا بتایا گیا ہے بلکہ وہ اس موقف کی ہیں جو ابن تیمیہ وابن القیم وغیرہ کا مختار ہے، چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی فرماتے ہیں (اور ان کا موقف بھی انہیں حضرات کا ہے):

''جس ضعیف کو امام ابوحنیفہ نے قیاس پر مقدم کیا ہے، اس کی مثال میں ابن قیم نے جن احادیث کا تذکرہ کیا ہے اگر تم ان کا جائزہ لو گے تو ان سب کو حسن پاؤ گے خواہ حسن لذاتہ خواہ حسن لغیرہ'' (قواعد فی علوم الحدیث ص: ۶۷)۔

ابن القیم نے فرمایا ہے: ''امام ابوحنیفہ نے نماز میں قہقہہ کی حدیث کو خالص قیاس پر مقدم کیا ہے، جبکہ علماء حدیث اس کے ضعف پر متفق ہیں''۔

(روایات کے لئے ملاحظہ ہو: نصب الرایہ ۱/۹۵ تا ۱۰۳)۔

ایسے ہی نبیذ تمر سے وضو کی حدیث کو قیاس پر مقدم کیا ہے اور اکثر علماء حدیث اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں'' (اعلام الموقعین ۱/۳۱، ۳۲)۔

حیض کی اکثر مدت دس دن کو بتانے والی حدیث کو امام ابوحنیفہ نے خالص قیاس پر مقدم کیا ہے حالانکہ حدیث ضعیف ہے۔ قیاس کی بات یہ کہ دم -دسویں دن کا یا- بعد کا دونوں اپنی حقیقت وصفت میں متحد و یکساں ہیں۔

نیز دس درہم سے کم مہر کی نفی والی حدیث کو قیاس پر مقدم کیا ہے جبکہ علماء اس کے ضعف بلکہ بطلان پر متفق ہیں۔

ان احادیث کی نسبت سے احقر نے حسن ہونے کی بابت کہی ہے اور جس کا دعوی واثبات مولانا ظفر احمد صاحب نے کیا ہے اس کے لئے ان احادیث ومسائل سے متعلق تفصیل کو کتب ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ابن ہمام کی ''فتح القدیر'' اور علامہ عینی کی ''البنایہ'' اور یہ دونوں فقہ حنفی کی معروف ومعتبر کتاب ہدایہ کی شروح ہیں، اسی طرح ''السعایہ شرح شرح الوقایہ'' مولانا عبدالحئی لکھنوی کی نیز ''اعلاء السنن'' مولانا ظفر احمد صاحب کی اور ''معارف السنن'' مولانا یوسف صاحب بنوری کی جو علامہ انور شاہ کشمیری کے امالی وافادات پر مشتمل ہے) یہ سب کتب فقہ حنفی کے مسائل اور ان کے حدیثی ماخذ کی تحقیق کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔

اسی طرح ان مسائل واحادیث کا معاملہ ہے جن کا ذکر مولانا عبدالحئی صاحب اور شیخ عبدالفتاح کی تحریروں میں آیا ہے جیسا کہ گذر چکا ہے (ملاحظہ ہو: الاجوبۃ الفاضلۃ مع التعلیقات ص: ۴۴ تا ۴۶)۔

احقر نے اپنی اہلیت ولیاقت کے مطابق ان احادیث سے متعلق تفصیلات دیکھی ہیں تو صورت حال یہی ہے جو ذکر کی گئی ہے اس موقع سے ایک حدیث سے متعلق علامہ انور شاہ کشمیری کے قول کو ذکر کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جواز ان میں توسل کی حدیث سے متعلق ہے، جس کا ذکر آچکا ہے اور جس کو مولانا عبدالحئی صاحب نے بطور مثال ذکر کیا ہے:

''اس ساری بحث وتفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ حدیث مرفوعاً حضرت جابر سے متعدد طرق سے مروی ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ سے بیہقی میں، حضرت علی سے طبرانی ودارقطنی میں، اور دارقطنی میں حضرت عمر سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ لہذا تعدد طرق اور تعدد مخارج وروایات کی بنا پر اس کے ضعف کی تلافی وازالہ ہوگیا۔

اور اسانید کے ضعف وکمزوری کو ہی مانا جائے تو بھی اس کے مطابق عمل وتوارث خود ایک حجت ہے جس کی بنیاد پر ان احادیث کو صحیح قرار دیا جائے گا لہذا اسناد اگر مجہول ہو تو اس پر عمل وتعامل معلوم ہے جو دلیل بننے کے لئے کافی ہے'' (معارف السنن ۲ر ۱۹۷)۔

تاہم یہ احادیث مذکورہ تفصیل کے تحت فی الجملہ مثال میں ذکر کی جاسکتی ہیں کہ اپنی جن تفاصیل کی بنا پر ان کو حسن قرار دیا گیا ہے وہ ساری تفصیل سب کے سامنے نہیں رہی ہیں بلکہ اصلاً وابتداءً وہی حیثیت رہی ہے جو ضعف کی اور بدرجۂ مجبوری اعتبار کی ہے۔

ابن القیم علیہ الرحمہ نے جن احادیث کا تذکرہ کیا ہے ان کو خالص ضعیف ہی سمجھ کر ذکر کیا ہے جیسا کہ انہوں نے صراحت کی ہے جبکہ خود ان کا موقف اپنے شیخ کی طرح یوں ہے کہ امام ابوحنیفہ وامام احمد اس ضعیف کو حجت مانتے وبناتے ہیں جو فی الجملہ حسن مانی جاتی ہے۔

۱۰- حکم مذکور کی تفصیل پر منطبق ایک مثال وحدیث:

احقر کے نزدیک مثال میں حضرت عائشہ وحضرت ابن عباس وحضرت انس کی ایک حدیث ذکر کی جاسکتی ہے جس کا تعلق ''ماء مشمس'' سے ہے، ''ماء مشمس'' دھوپ میں گرم کیا ہوا پانی ایسے پانی کا استعمال حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک مکروہ ہے (ردالمحتار ۱ر ۸۵، ۱۶۱، اعلاء السنن ۱ر ۱۸۳، ۱۹۴، نہایۃ المحتاج ۱ر ۵۹)۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے طباً کراہت کو اختیار کیا ہے (اعلاء السنن ۱ر ۱۹۳، ۱۹۴)۔ اور یہی بات امام شافعی نے ''الام'' میں ذکر فرمائی ہے (الام ۱ر ۳)۔

حضرت عائشہ وغیرہ سے مرفوعاً اس کی کراہت مروی ہے لیکن یہ روایت کئی حضرات سے مروی ہونے اور متعدد طرق کے باوجود مرفوعاً شدید الضعف ہے۔

حضرت عائشہ کی روایت کے کئی طرق ہیں لیکن کوئی طریق متروک یا متہم بالکذب یا ان جیسے راویوں سے خالی نہیں ہے اور سب طرق بواسطہ ہشام عن ابیہ عن عائشہ ہیں۔

حضرت انس کے طریق میں سوادہ ہیں جن کی نسبت سے عقیلی نے کہا ہے، سوادہ عن انس مجہول حدیثہ غیر محفوظ۔

اور حضرت ابن عباس کی روایت میں انقطاع ہے نیز سند میں عمیر بن صبح ہے جس کو کذاب کہا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تین صحابہ سے مروی ہے، اور حضرت عائشہ سے متعدد طرق ہیں پھر بھی سند وروات کی حیثیت یہ ہے کہ شدید الضعف ہے، ایک دوسرے

سے تقویت وانجبار کا فائدہ نہیں مانا گیا ہے (روایت کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نصب الرایہ ار ۱۰۱، ۱۰۲ و تلخیص الحبیر ار ۳۲، ۳۳، اعلاء السنن ار ۱۹۳، ۱۹۴)۔

البتہ حضرت عمرؓ سے موقوفاً اس کی روایت معتبر ہے جس کو دار قطنی (سنن دار قطنی ار ۳۹ الطہارۃ باب الماء المسخن) اور ابن حبان (الاحسان) نے روایت کیا ہے، منذری نے اس کو حسن (الترغیب والترہیب) اور حافظ ابن حجر نے قوی کہا ہے (تلخیص الحبیر ار ۱۴۸ باب الماء الطاہر)۔

تو حضرت عمر کی موقوف - قوی ومعتبر روایت کی وجہ سے مضمون کی مرفوع روایت کو یہ نفع ہوا کہ وہ شدۃ ضعف سے اور نکارت و بے اصل ہونے کے مرحلہ سے نکل گئی اور اس ضعیف کے مرحلہ مین آگئی جو جابر کو قبول کر سکتی ہے، اور فضائل میں بھی معتبر ہے فی الجملہ لہذا احکام میں بھی قبول کی جائے گی۔

یعنی مرفوع تو ذاتی طور پر شدید الضعف ہے نہ فضائل کے لائق اور نہ جابر کو قبول کرنے کی اہل، لیکن حضرت عمر کی موقوف کی وجہ سے یہ حدیث مرفوع بالکل بے اصل نہ رہ گئی بلکہ کچھ کام کی ہوگئی، اور اس طرح اس کو "ماء مشمس" کے استعمال کی کراہت کے لئے دلیل بنایا جاسکتا ہے اگر چہ یہ کراہت شرعی نہ مانی جائے بلکہ طبی اور ارشادی،

والله تعالى أعلم وعلمه أتم وأحكم۔

الحمد لله الذى بنعمته تتم الصالحات بدايته فى بلد النبى ﷺ ومسجده ونهايته فى بلد الله الحرام ومسجده۔

۲/ذو الحجه الحرام ۱۴۳۲ھ على حساب مكة المكرمه

و ۱/ذو الحجه على حساب الهند يوم السبت قبل الظهر

وذلك فى سفر الحج ۱۴۳۲ھ

الاسعدى

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی اشاعت

اور بریل کوڈ

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے 24ویں فقہی سمینار مورخہ 1 تا 3/مارچ 2015ء منعقدہ دار العلوم اسلامیہ اوچیرا (کیرالا) میں پیش کئے جانے والے علمی وتحقیقی مقالات اور مباحثات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُ الاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پہلا باب: تمہیدی امور

دوسرا باب: تعارف موضوع - بریل کوڈ وغیرہ

تیسرا باب: تفصیلی مقالات

چوتھا باب: مختصر تحریر

پیش لفظ

قرآن مجید اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہے اور اب اسی کتاب سے قیامت تک انسانیت کی فلاح ونجات متعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ تمام ہوگیا، آپ کے بعد نہ کسی نبی کی آمد ہوسکتی ہے اور نہ کسی آسمانی کتاب کا نزول، اس لئے منجانب اللہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے: "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر:۹)، اللہ تعالی نے حفاظت کے اس نظام کو اپنے منتخب بندوں کے ذریعہ پورا فرمایا، حافظوں نے اس کے الفاظ کی حفاظت، قاریوں نے اسلوب ادائیگی اور قراءت کو محفوظ کیا، محدثین نے احادیث کی جمع وتدوین کا فریضہ انجام دے کر قرآن کی صحیح تشریح وتوضیح امت کے سامنے رکھ دی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل ہی قرآن مجید کا اصل بیان ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہی یہی ہے:

"وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم" (سورۂ نحل:۴۴)

اور فقہاء نے اجتہاد واستنباط کے اصول وقواعد مقرر کئے اور قرآن مجید کے اشارات اور دلالت سے ثابت ہونے والے احکام کو اس طرح مرتب کردیا کہ قرآن مجید میں معنوی تحریف کے لئے کوئی موقع باقی نہ رہے۔

قرآن کے الفاظ، معانی اور لب ولہجہ کی طرح اس کے خط کو بھی محفوظ کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے زمانہ میں لغت قریش کے مطابق قرآن کی کتابت کرائی جس کو رسم عثمانی کہا جاتا ہے اور اسی خط میں آج تک قرآن مجید کی کتابت ہوتی آئی ہے، اسی طرح جب قرآن مجید کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہونے لگا تو اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا کہ ترجمے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا متن بھی لکھا جائے، تاکہ متن قرآن سے امت کا رشتہ کمزور نہ ہو اور جیسے گذشتہ قوموں نے اصل کتاب کو کھودیا اور ترجمہ ہی کو انہوں نے اپنا اصل سرمایہ بنالیا، خدانخواستہ قرآن مجید کے ساتھ ایسا ہی معاملہ نہ ہو۔

موجودہ دور میں قرآن مجید کی کتابت وطباعت کے سلسلہ میں بعض ایسے مسائل پیدا ہوئے ہیں جن سے گذشتہ زمانے میں لوگ دوچار نہیں تھے، ان میں ایک نابینا حضرات کے لئے بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت ہے، یہ ایک اشاراتی زبان ہے جس کے ذریعہ دنیا بھر میں ہزاروں نابینا لوگوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک اور مسئلہ متن کے بغیر ترجمہ قرآن مجید کی طباعت کا ہے، چونکہ وسائل ابلاغ کی ایجاد کی وجہ سے یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ مسلمان بہت سے ان غیر مسلموں تک بھی اللہ کا دین پہنچائیں جو عربی زبان سے نابلد ہیں، ایسے غیر مسلم یا ان قوموں میں سے اسلام قبول کرنے والے نومسلم عربی متن کو نہیں پڑھ سکتے اور ایک اندیشہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر عربی متن ان کے ہاتھ میں جائے تو کہیں اس سے قرآن مجید کی بے ادبی نہ ہو، اسی طرح نوجوانوں کی نئی نسل اردو پڑھنے یا عربی خط میں قرآن کو پڑھنے سے قاصر ہے، ظاہر ہے کہ اس میں سرپرستوں کی کوتاہی ہی ہے، لیکن عملی صورت

حال یہی ہے، اس لئے بعض طباعتی ادارے متن کے بغیر صرف قرآن کا ترجمہ شائع کررہے ہیں یا قرآن مجید کو رومن خط میں طبع کرارہے ہیں۔

موبائل اس عہد کی ایک اہم ایجاد ہے اور بہت سی دوسری ایجادات کی طرح اس میں بھی نفع ونقصان کا دونوں پہلو موجود ہے، اس کے مفید استعمال کی ایک صورت یہ ہے کہ اس طرح لوگوں کے لئے سفر میں یا چلتے پھرتے تھوڑا بہت وقت مل جانے پر قرآن مجید کی تلاوت آسان ہوجاتی ہے۔

یہ مسائل یا تو نئے ہیں یا موجودہ حالات میں ان کی وضاحت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، اس لئے اکیڈمی کے چوبیسویں سمینار منعقدہ دار العلوم اسلامیہ اوچرا (کیرالہ) مورخہ ۱-۳ر مارچ ۲۰۱۵ء مطابق ۹-۱۱ر جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ میں ان موضوعات کو بھی شامل رکھا گیا، بحمد اللہ ایک سو کے قریب مختصر اور تفصیلی مقالات آئے، بریل کوڈ کے ماہرین شریک ہوئے اور موضوع سے متعلق مناقشات بھی ہوئے۔ چنانچہ پچھلے سمیناروں کے مجلات کی طرح یہ مجلہ بھی قارئین کے سامنے ہے جو سمینار کے مقالات، مقالات کی تلخیص، سمینار میں پیش کئے جانے والے عرض مسئلہ، ماہرین کی تحریروں، مشارکین کے مناقشات اور پھر سمینار میں طے پانے والی تجاویز پر مشتمل ہے، غالباً اردو زبان میں اس موضوع پر اتنی تفصیل کے ساتھ کوئی کتاب سامنے نہیں آئی، اس کی ترتیب کی ذمہ داری شعبہ علمی کے رفیق مفتی احمد نادر القاسمی نے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دی ہے، اللہ تعالی ان کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور گذشتہ مجلات کی طرح یہ نئی کاوش بھی قبول کی جائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

تاریخ: 13/ دسمبر 2015، مطابق یکم ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

پہلا باب: تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ

قرآن کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت

۱- قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب ہدایت ہے، جو قیامت تک انس وجن کی رہنمائی کرتی رہے گی، دنیا میں چونکہ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، لہٰذا قرآنی تعلیمات کو عام انسانوں تک پہونچانے کے لئے مختلف زبانوں میں معتبر تراجم کو فروغ دیا جائے۔

۲- متن قرآن کے بغیر کسی بھی زبان میں تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز ہے، لہٰذا اسے خریدنا، تقسیم کرنا، ہدیہ کرنا درست نہیں ہے۔

۳- عثمانی رسم الخط کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت ناجائز ہے۔

۴- قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنا اور اپنے اندر ناظرہ قرآن پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہر مسلمان مرد وعورت کا شرعی فریضہ ہے، اس لیے ہر شخص کو خود بھی یہ صلاحیت حاصل کرنی چاہئے اور اپنے بچوں اور زیر تربیت افراد کو اس کی تعلیم دلانے کا اہتمام کرنا چاہئے ورنہ وہ عند اللہ جواب دہ ہوں گے۔

۵- اصل تو یہ ہے کہ صرف عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت کی جائے، لیکن ضرورتاً عربی متن کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں درج ذیل شرائط کے ساتھ اشاعت کی گنجائش ہے:

الف: قرآن کریم کی ترتیب نہ بدلے۔ ب: مخارج کا حتی الامکان لحاظ کیا جائے۔

ج: عثمانی وعربی رسم الخط کی تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کے رسم الخط کو مکمل کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

۶- نابینا اور معذور افراد سماج کی خصوصی توجہ اور ہمدردی کے مستحق ہیں، ان کی تعلیم کے لئے بریل کوڈ کی ایجاد نہایت اہم پیش رفت ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس رمزی زبان کے ذریعہ نابینا حضرات کو زیادہ سے زیادہ علوم اسلامیہ سے استفادہ کی سہولت فراہم کی جائے۔

۷- بریل کوڈ کے مسلمان ماہرین سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس کوڈ کو زیادہ سے زیادہ عربی خط اور رسم عثمانی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں؛ تاکہ یہ رموز قرآن مجید کے اصل رسم سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہوجائے۔

۸- چونکہ بریل کوڈ علامتی زبان ہے، رسم الخط نہیں، اس لئے نابینا افراد کی حاجت وسہولت کے پیش نظر بریل کوڈ میں قرآن حکیم کی کتابت واشاعت جائز ہے، اور چونکہ یہ قرآن کریم کا رمز ہے اس لئے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ نابینا حضرات قرآن مجید کے صحیح تلفظ سے واقف شخص کی مدد سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کریں۔

۸- موبائل کی اسکرین پر نظر آنے والی آیات کو بے وضو نہ چھوا جائے۔

۹- موبائل اور اس قسم کے دیگر آلات کا ڈھانچہ اسکرین سے علیحدہ ہے، لہٰذا جب اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل یا دیگر آلہ کو ہاتھ میں لینے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں۔

نوٹ:......شرکاء سمینار میں سے مفتی جنید بن محمد پالن پوری (ممبئی)، مفتی محمد شاہد قاسمی (بھروچ) کی رائے میں قرآن مجید کے اصل متن کے ساتھ بھی غیر عربی رسم الخط میں اس کی کتابت جائز نہیں، نیز مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی (بہار) کی رائے میں یہ صورت بھی جائز نہیں ہے اور قرآن مجید کو بریل کوڈ میں منتقل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

برصغیر میں مطبوعہ قرآن مجید کے نسخے

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہے اور قیامت تک انسانیت کی ہدایت اسی کتاب سے متعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور نہ صرف قراء وحفاظ کے ذریعہ اس کی حفاظت فرمائی گئی ہے، بلکہ متن قرآن کو جس طرح آپ نے املاء کرایا اور لکھوایا وہ طریقہ کتابت بھی رسم عثمانی کی صورت میں محفوظ ہے، عربی اور عجمی نیز مشرقی اور مغربی ممالک میں اسی طرح قرآن مجید کی کتابت ہوتی آئی ہے، البتہ اصل الفاظ سے ہٹ کر تسہیل تلاوت کے لئے جو رموز وعلامات اعراب استعمال کئے گئے ہیں ان میں کسی قدر فرق پایا جاتا ہے جس کا قرآن مجید کے الفاظ اور نفس متن کی کتابت سے تعلق نہیں، ہند وپاک میں قرآن مجید کی جس انداز پر کتابت ہوتی ہے وہ اس فن کی مرکزی شخصیت شیخ ابوعمرو الدانی (متوفی ۴۴۴ھ) کی تصریحات کے مطابق ہے، اور ہندوستان کے نہایت معتبر علماء، ارباب افتاء اور ماہرین فن کی توثیق کے ساتھ اس کی نشر وطباعت ہوتی آئی ہے، اس لئے اس میں تبدیلی اور بلاد عرب میں مروجہ رموز وعلامات کے مطابق اس کی کتابت نہ صرف غیر ضروری عمل ہے بلکہ یہ امت میں افتراق وانتشار کا سبب بن سکتا ہے، اس لئے امت میں جو طریقہ مروج رہا ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ اپنی سہولت کے اعتبار سے اس علاقہ میں مروج رموز کے مطابق قرآن مجید کی نشر واشاعت کی خدمت انجام دیا کرتے ہیں، اس کو اسی طرح باقی رکھا جائے اور کسی بھی ایسے عمل سے بچا جائے جو فتنہ وانتشار کا سبب بن سکتا ہو۔

☆☆☆

سوالنامہ:

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت سے متعلق بعض مسائل

قرآن کریم اللہ تعالی کی نازل کردہ آخری کتاب ہدایت ہے، قرآن کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب نازل ہونے والی نہیں، قیامت تک انس وجن کی رہنمائی اسی کتاب (قرآن) کے ذریعہ ہوگی، اللہ تعالی نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا: "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورہ حجر:۹)۔

یہ اللہ جل شانہ کی حفاظت ہی ہے کہ قرآن کریم چودہ صدیاں گذرنے کے باوجود اسی طرح محفوظ اور موجود ہے جس طرح نازل ہوا تھا۔ دشمنان اسلام کی تمام تر سازشوں اور کوششوں کے باوجود نہ اس کے الفاظ میں تحریف ہوسکی اور نہ اس کے معانی میں تحریف کی ناپاک کوششیں کامیاب ہوسکیں۔

سابقہ آسمانی کتابوں کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ ان کا اصل آسمانی متن محفوظ نہیں رہ سکا، ان کتابوں کو ماننے والی قوموں نے ان کتابوں کے ترجموں پر اکتفا کرلیا اور رفتہ رفتہ ان کتابوں کا اصل متن دنیا سے ناپید ہوگیا، اور ترجموں میں بھی ان اقوام کے احبار ورہبان اور ربی حذف واضافہ، ترمیم وتبدیل کرتے رہے، سابقہ آسمانی کتابوں کے اصل متن کو زبانی یاد کرنے کا رواج ان قوموں میں نہیں رہا، اس طرح ان آسمانی کتابوں کا ربانی متن دنیا سے غائب ہوگیا، نہ وہ کتابوں میں محفوظ رہا نہ انسانی دماغوں میں۔

اللہ تعالی نے قرآن کریم کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، اس کی عملی صورت یہ ہوئی کہ امت مسلمہ میں قرآن کریم کو یاد کرنے کا غیر معمولی جذبہ وشوق پیدا فرمایا، اور اس امت کے لئے قرآن کریم یاد کرنا آسان بنادیا کہ نوعمر بچے اور بچیاں مختصر مدت میں پورا قرآن حفظ کرلیتے ہیں، ہر ملک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں حفاظ قرآن موجود ہیں اور حفاظ قرآن کی تعداد میں دن بہ دن غیر معمولی اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

غیر عربی میں قرآن کریم کے ترجمہ کا مسئلہ علماء امت میں اختلافی رہا ہے، انیسویں صدی کے اخیر تک علماء کی ایک بڑی تعداد کسی اور زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کرنے اور اسے چھاپنے کو ممنوع قرار دیتی رہی، ان کے اس نقطۂ نظر کی ایک بنیاد تو یہ تھی کہ قرآن کریم کے الفاظ وآیات میں جو اعجاز، ایجاز اور جامعیت ہے اس کی ادائیگی کسی اور زبان میں ہو ہی نہیں سکتی اور دوسری بنیاد تھی کہ ترجمہ قرآن کا رواج پڑنے سے کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ اصل متن قرآن سے امت کی توجہ ہٹ جائے اور لوگ تراجم کی طرف متوجہ ہوکر اصل قرآن کی برکتوں اور رحمتوں سے محروم ہوجائیں اور مستقبل بعید میں الفاظ قرآنی کی حفاظت کا مسئلہ خطرے میں پڑجائے۔

ترجمۂ قرآن کی اجازت دینے والے علماء کا نقطۂ نظر یہ رہا کہ ہم بھی اس سے متفق ہیں کہ قرآن کا کسی اور زبان میں ایسا ترجمہ کہ آیات قرآن کے تمام معانی اور اشارات اس میں منتقل ہوجائیں، ممکن نہیں ہے؛ بلکہ کسی اور زبان میں قرآن کے ترجمہ کا مقصد آیات کے ظاہر اور متبادر معنی ومفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے؛ تاکہ جو لوگ عربی زبان کو سمجھنے پر قادر نہیں ہیں، وہ ممکن حد تک اپنی زبان میں قرآن کے معنی ومفہوم اور پیغام کو سمجھ سکیں اور قرآن کی ہدایت رسانی کا دائرہ زیادہ وسیع ہوسکے، ترجمۂ قرآن کو ہرگز اصل متن قرآن کی حیثیت حاصل نہیں، نہ اسے پڑھنے کو تلاوت قرآن قرار دیا جائے گا، نہ ہی نماز میں قرآن کی جگہ اسے پڑھا جائے گا وغیرہ۔

علماء ہند کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے فارسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کر کے اور ان کے گرامی قدر صاحبزادگان حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبانؒ نے اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کر کے برصغیر کے علمی حلقوں کو ترجمہ قرآن کے جواز و عدم جواز کی بحث سے بہت پہلے فارغ کر دیا تھا، لیکن برصغیر ہند و پاک میں ماضی قریب تک یہ التزام رہا کہ ترجمہ قرآن کو متن قرآن کے بغیر تنہا شائع نہ کیا جائے، اور اصحاب افتاء تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتے رہے۔

لیکن ادھر ماضی قریب سے بعض افراد یا ادارے تنہا ترجمہ قرآن (متن قرآن کے بغیر) شائع کرنے لگے اور یہ رجحان رفتہ رفتہ بڑھنے لگا ہے، اس کی تائید میں دو باتیں کہی جاتی ہیں:

۱- اس میں مصارف کم آتے ہیں۔

۲- جو لوگ متن قرآن کو نہیں پڑھ سکتے، انہیں متن والا ترجمہ قرآن دینے سے کیا فائدہ؟ ترجمہ قرآن بہت سے غیر مسلموں کو بھی دیا جاتا ہے، انہیں متن پر مشتمل ترجمہ قرآن دینے میں قرآن کی بے حرمتی کا بھی اندیشہ ہے، اس سے بچنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ انہیں متن کے بغیر صرف ترجمہ قرآن دیا جائے؛ تاکہ ان تک قرآن کا پیغام پہنچ بھی جائے اور قرآن کی بے حرمتی کا اندیشہ بھی نہ ہو۔

بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت:

اس پس منظر میں علماء اور اصحاب افتاء کو یہ طے کرنا ہے کہ کیا کسی زبان میں (متن قرآن کے بغیر) تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست ہے؟ اگر یہ اشاعت ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے کا کیا حکم ہے، اور اگر یہ اشاعت درست ہے تو بے وضو اسے چھونے کا کیا حکم ہے؟

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

دور حاضر میں قرآن کے حوالے سے ایک بات یہ بھی شروع ہوگئی ہے کہ جو لوگ قرآن پاک کی عبارت کو عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے یا اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کے لئے متن قرآن کو ان کی زبان (ہندی، انگریزی وغیرہ) اور ان کے رسم الخط میں لکھ دیا جاتا ہے، یعنی عبارت قرآن کی ہوتی ہے اور رسم الخط غیر عربی ہوتا ہے؛ تاکہ غیر عربی داں حضرات کو تلاوت قرآن میں سہولت ہو، شرعاً ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے اور غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا کیا حکم ہے؟

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

دور قدیم میں نابینا افراد کی تعلیم کا طریقہ صرف زبانی تلقین کا تھا، بصارت سے محرومی کی بنا پر ان کے لئے یہ بات متصور نہیں تھی کہ وہ لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھیں، لیکن قریبی ایک دو صدی میں اس کے لئے مخلصانہ کوششیں ہوئیں کہ بینائی سے محروم یا انتہائی کمزور بینائی والے افراد کی تعلیم کے لئے پیش رفت کی جائے، چنانچہ بریل کوڈ ایجاد کیا گیا، جو نسبۃً موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نابینا افراد عموماً انگلیوں کے پوروں کے لمس سے اسے پڑھتے ہیں، یعنی جو کام بینا افراد اپنی نگاہوں سے لیتے ہیں، وہ کام بینائی سے محروم افراد انگلیوں کے پوروں کے لمس سے لیتے ہیں، رفتہ رفتہ بریل کوڈ میں کتابیں تیار ہوگئیں، رسالے نکلنے لگے اور نابینا افراد کے لئے پڑھنے لکھنے کی ایک وسیع دنیا کھل گئی۔

نابینا افراد کے لئے اس پیش رفت کو اسلام نہ صرف پسند کرتا ہے؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی بھی کرتا ہے۔ اس لئے اب بریل کوڈ کی مدد سے نابینا افراد کی تعلیم کے بڑے بڑے دینی تعلیمی ادارے بھی کھل گئے ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے لٹریچر بھی تیار کیا جا رہا ہے۔

اس پس منظر میں ایک اہم سوال یہ ابھرا ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی، جس میں قرآن کو لکھنا لازم قرار دیا گیا ہے، لیکن بریل کوڈ میں قرآن کی اشاعت سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ہر قدم

بینا افراد کے محتاج نہیں رہ جاتے، حفظ کرنے والے نابینا افراد اس کی مدد سے قرآن یاد کرسکتے ہیں، بھولنے کی صورت میں اس کی طرف مراجعت کرسکتے ہیں، براہ راست قرآن کا مطالعہ کرسکتے ہیں، سوال یہ ہے کہ بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کے باوجود کیا نابیناؤں کی مجبوری کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے؟

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم کیا اصل قرآن کی طرح ہے کہ اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے یا وضو کے بغیر بھی اسے چھوا جاسکتا ہے؟ اگر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے تو کیا اس کے کچھ مخصوص آداب واحکام ہیں؟

موبائل پر قرآن مجید:

آج کل موبائل میں بھی قرآن مجید کے متن اور اس کی تلاوت کو محفوظ کرنے کی آسانی پیدا ہوگئی ہے، اس طرح سفر وحضر میں کہیں بھی قرآن کی تلاوت کی جاسکتی ہے، تو اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو کیا موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا، یا موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے؟

☆☆☆

تلخیص مقالات

قرآن مجید کے بلا متن ترجمہ کی اشاعت اور بریل کوڈ

قرآن خالق کائنات اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب اور سلسلہ وحی آسمانی کی اختتامی کڑی ہے، اس کے بعد قیامت تک نہ تو کوئی رسول آنے والا ہے، اور نہ ہی کوئی کتاب ہدایت ہی آنے والی ہے، بنی نوع انسان کی ہدایت اور روئے زمین پر عدل وانصاف کی بالادستی، حق و ناحق کی شناخت، ظلم وانصاف کے درمیان تمیز، خیر وشر سے آگاہی اور بھلائی و برائی کے درمیان فرق کرنے والی، انسانی اخلاقیات کا حقیقی سرچشمہ اور خالق و مخلوق کے رشتہ کی استواری اور انسان کے لئے خالق کائنات کی معرفت کا ذریعہ و وسیلہ صرف اور صرف یہی آخری کتاب، یعنی قرآن کریم ہے، چونکہ یہ آخری پیغام ربانی ہے اس لحاظ سے بالعموم پوری انسانیت کی اور بالخصوص امت مسلمہ کے وجود کی اولین ذمہ داری ہے اور قیامت تک رہے گی کہ وہ اس کے تحفظ وصیانت کا فریضہ انجام دے، قرآن کریم کی شکل میں موجود اللہ کا یہ آخری پیغام روئے زمین پر جب تک باقی ہے امت مسلمہ کا وجود بھی باقی ہے، اگر اس سرمایہ ربانی پر کسی بھی طرح معنوی یا لفظی اعتبار سے حرف آجاتا ہے (اللہ نہ کرے قیامت تک کبھی ایسا ہو) تو اس امت کا وجود بھی کائنات ہست وبود سے ختم ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے یقیناً اس قانونی واخلاقی مجموعہ اور سرمایہ ہدایت کی قیامت تک حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

"إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" (سورہ حجر: ۹)۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے تحفظ کا ذریعہ بھی خالق کائنات اور مالک کل نے انسان اور خاص طور پر انسانوں کے اس طبقہ کو بنایا ہے جس نے الٰہ وحدہٗ لاشریک کی معرفت حاصل کی اور ایک ہونے کی گواہی دی ہے، اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان اور وفاداری کا معاملہ کیا ہے، جس کا آخری گروہ امت محمد یہ ہے، جو اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان اور آپ کے خاتم النبیین ہونے کا عقیدہ رکھتی اور امانت ربانی کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے

(اللهم أنصرنا وثبت أقدامنا عليه إلى يوم القيامة)۔

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ دنیا کی وہ قومیں جنہوں نے پیغامات ربانی کے تحفظ کی ذمہ داری پوری دیانت داری کے ساتھ ادا نہیں کی اور اپنے رسولوں کی دی ہوئی سوغات کو ضائع کردیا، اللہ نے انہیں دنیا میں بھی ہمیشہ کے لئے آنے والی انسانی نسلوں کے لئے نشان عبرت بنادیا اور آخرت میں بھی رسوائی اور ناکامی ان کے مقدر کردی۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں حضرت آدم سے لیکر خاتم النبیین والمرسلین نبینا ورسولنا محمد علیہ الف الف تحیہ وتسلیم تک جتنے بھی انبیاء آئے اور جن کو اللہ نے کتاب اور شریعت دی، جن میں سے بعض کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور بعض کا نہیں ہے سب نے ہدایات ربانی میں خرد برد کر کے اپنی منشا کے مطابق اصول زندگی وضع کر لئے، حاملین توریت وانجیل اور زبور کو بطور خاص اس بارے میں مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کے علاوہ جتنے بھی مذاہب کے لوگ ہیں اور جو جو کتاب بھی اپنی اپنی مذہبی کتاب کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، ان میں سے کسی بھی کتاب کے بارے میں تاریخی اور دینی بنیاد پر یقینی شواہد موجود نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان کتابوں کو حقیقی معنی میں مذہبی کتاب کہا جائے۔ سوائے قرآن کریم کے، قرآن کریم کو ہر لحاظ سے دنیا نے جانچ پرکھ اور چھان پھٹک کر دیکھنے کے بعد اس کی قائل ہوئی کہ یہ واقعی اللہ ہی کا کلام ہے، کسی انسان اور بشر کا کلام نہیں ہے۔ پوری انسانیت نے اسے تسلیم کرلیا۔ اب ظاہر ہے یہ کتاب الٰہی اور ہدایت ربانی ہے تو اسے دنیا کے ہر انسان تک پہونچنا اور پہونچانا ان لوگوں کی دینی اور ایمانی ذمہ داری ہے جنہوں نے اس کی حقانیت دل سے تسلیم کیا اور عقیدت ومحبت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم:

اس ضرورت کا احساس ہر دور میں اہل علم نے کیا کہ دنیا میں بہت سی قومیں آباد ہیں اور سب الگ الگ زبانیں بولتی اور سمجھتی ہیں، ظاہر بات ہے کلام الٰہی عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اسلام اور قرآن دنیا کے تمام انسانوں کے لئے آیا ہے، اللہ کا کیا پیغام ہے، اللہ اپنے بندوں سے کیا چاہتا ہے، اس کی دنیا اور آخرت کی بھلائی کن چیزوں میں مضمر ہے، انسانی اخلاقیات کے موازین ومعیارات کیا ہوں گے؟ یہ سب کلام الٰہی میں ہی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ دنیا کی تمام اقوام تک قرآن کا پیغام پہونچے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں موجود مذہبی کتابوں میں صرف قرآن ہی ایسی کتاب ہے جس کے وکی پیڈیا کی رپورٹ کے مطابق چھ سو سے زائد بولی جانے والی زبانوں میں سے اب تک دنیا کی ایک سو چودہ زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور الحمد للہ ہوتے ہی جا رہے ہیں۔

انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے سہل پسند واقع ہوا ہے وہ سوچتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی چیز جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے آسانی سے اسے دستیاب ہو جائے، آج کی انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے جہاں انسانوں کے پاس دوسری چیزیں تیزی سے پہونچی ہیں وہیں اس کے توسط سے اسلام اور قرآن کا پیغام بھی پہونچا ہے، جس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں میں اپنی زبانوں میں قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا شوق تو پیدا ہوا ہی، خود قرآن کے الفاظ کو بھی عربی سے ناواقف لوگوں میں پڑھنے کا رجحان پیدا ہوا ہے، اور اس سے متعلق بہت سے نئے مسائل بھی سامنے آئے ہیں، جن کا حل پیش کیا جانا علما اور ماہرین شریعت کی طرف سے وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جہاں ایک طرف قرآن کی حفاظت اور اسے ہر طرح کی تحریف سے پاک رکھنا یہ امت مسلمہ کا بنیادی مسئلہ ہے۔ وہیں دوسری طرف حق کے متلاشی لوگوں کی دینی ضرورت کا احساس بھی امت کے لئے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے، ان دونوں صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اپنے ۲۴/ویں انٹرنیشنل فقہی سمینار کے لئے ایک موضوع "قرآن مجید کے ترجمہ ومتن کی اشاعت" سے متعلق بھی رکھا ہے، اور بنیادی طور پر بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت، غیر عربی رسم الخط میں ایک ساتھ یا علاحدہ قرآن کریم کی کتابت، نابینا حضرات کے لئے بریل کوڈ کی تیاری کی شرعی حیثیت، موبائل اسکرین پر قرآن کریم کو چھونا، موبائل کو ہاتھ لگانے کے لئے طہارت، اسی طرح قرآن کریم کے تراجم کو مس کرنے کے لئے وضو وطہارت سے متعلق مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔

اس اہم موضوع پر جو سوالنامہ اکیڈمی کی طرف سے حضرات علماء، مفتیان اور اسلامی شریعت کے ماہرین کی خدمت میں بھیجا گیا تھا آپ کے ہاتھ میں موجود مقالات کی تلخیص کرتے وقت تک جو ۸۱ رعلماء کے جوابات مقالات کی شکل میں اکیڈمی کو موصول ہوئے تھے ان کی تلخیص حضرات اہل علم کی مؤقر آراء اور دلائل کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

جن حضرات علماء ومفتیان اور اہل علم وبصیرت کی تحریریں اس موضوع پر اکیڈمی کو موصول ہوئیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

مفتی علام اللہ کاوی والا، مولانا محمد صادق مبارک پوری، مفتی ڈاکٹر شاہجہان ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد عبید اللہ ندوی، مفتی محمد ارشاد پالن پوری، مفتی حنیف (ویراول) مفتی جمیل احمد نذیری، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا محمد موسیٰ قاسمی، مفتی عبد اللہ کاوی والا، مفتی جنید بن محمد، مولانا سلمان کھلی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا محمد یوسف علی (آسام)، مولانا مقیم احمد ندوی، مولانا عبد الباسط پالن پوری، مولانا اویس بن صالح بنگ، مولانا مشبر مصطفی حسن پوری، مولانا عبد الحکیم پانی پوری، مفتی لطیف الرحمن (ممبئی) مفتی شبیر یعقوب دیولوی، مولانا روح الامین، مفتی ریاست علی قاسمی (امروہہ)، مولانا عبید اللہ ابوبکر ندوی، مفتی حذیفہ داحودی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا ندیم احمد انصاری، مفتی محمد اخلاق حسینی قاسمی، مولانا عبد الرب سعادتی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا قمر الدین حمود بڑودوی، مفتی صادق پٹیل، ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام خان، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبد العظیم ندوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا احسن عبد الحق ندوی، مولانا اسرار احمد آبادی، مفتی عبد الرحیم حسنی کشمیری، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مفتی ذکاء اللہ شبلی مفتاحی، مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری، مولانا عبد الباسط قاسمی (اجراڑہ) مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محمد منصف بدایونی، مفتی اقبال احمد قاسمی کانپور، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا فضل الدبی القاسمی الندوی، مولانا عبد العظیم قاسمی (کوپا گنج)، مفتی عبد المنان (آسام)، مولانا طاہر حسین قاسمی، مفتی نذیر احمد کشمیری، مفتی محمد شاہد قاسمی (مدھوبنی)، مفتی اسماعیل لاجپوری، مولانا عبد الرشید نعمانی (ممبئی)، قاضی مزمل الدین ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی (شکر پور بھروارا)، مولانا وحید الدین (ترکیسر)، مولانا محمد اعظم

ندوی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مفتی محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا حسین احمد قاسمی، مولانا عمر یوسف کوکنی، مولانا مصطفی عبدالقدوس، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مفتی سعید الرحمن فاروقی ممبئی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، پٹنہ اور مفتی عبدالباسط قاسمی (تھانے، ممبئی)۔

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

مذکورہ بالا تمہیدی گفتگو کے بعد اصل سوال کا رخ کرتے ہیں۔

جیسا کہ سوال میں مذکور ہے کہ ماضی قریب تک یہ التزام رہا ہے کہ ترجمہ قرآن کو متن قرآن کے بغیر تنہا شائع نہ کیا جائے، اور اصحاب افتاء تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتے رہے ہیں، لیکن ادھر ماضی قریب سے بعض افراد یا ادارے متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن شائع کرنے لگے اور یہ رجحان رفتہ رفتہ بڑھنے لگا، اور اس کے جواز کے لئے دو باتیں خاص طور سے کہی جاتی ہیں:

۱- صرف ترجمہ شائع کرنے میں مصارف کم آتے ہیں۔

۲- جو لوگ متن قرآن کو نہیں پڑھ سکتے انہیں متن والا ترجمہ دینے سے کیا فائدہ؟ جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ:

سوال: "کیا کسی بھی زبان میں متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست ہے؟ اگر یہ اشاعت ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر درست ہے تو بے وضو اسے چھونے کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کی دو طرح کی آراء سامنے آئی ہیں، جواز اور عدم جواز۔

عدم جواز:

اس سوال کے جواب میں ۸۱ مقالہ نگار جن کے مقالے تلخیص میں شامل ہیں، ان میں سے ۲۷ حضرات کی رائے یہ ہے کہ ترجمہ قرآن خواہ کسی بھی زبان میں ہو بغیر متن قرآن کے تنہا شائع کرنا ناجائز، ممنوع، حرام اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ اور جب اس کی اشاعت جائز نہیں ہے تو اسے خریدنا، تقسیم اور ہدیہ کرنا بھی ممنوع ہے، اور جو مصلحت جواز کے لئے پیش کی جارہی ہے، وہ تحریف قرآنی کے اندیشے اور عظیم مفسدہ کے پیش نظر نا قابل التفات ہے، چونکہ اکثریت کی یہی رائے ہے، اس لئے ان کے اسمائے گرامی کی طویل فہرست کو طوالت کی وجہ سے چھوڑا جاتا ہے، البتہ تمام دلائل و وجوہ جو عدم جواز کے قائلین نے اپنے موقف کی تائید میں پیش کئے ہیں، انہیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

دلائل:

- "وقال الرسول یارب إن قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورا" (سورہ الفرقان: ۳۰)۔
- "من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ" (سورۃ النساء: ۴۶)۔
- "یحرفون الکلم من بعد مواضعہ" (سورہ مائدہ: ۴۱)۔
- "إنا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون" (سورہ الزخرف: ۳)۔
- "ولو جعلناہ قرآنا أعجمیا لقالوا لولا فصلت أیاتہ أأعجمی وعربی" (سورہ فصلت: ۴۴)۔
- "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ علیکم" (آل عمران: ۱۰۳)۔
- "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" (سورہ القمر: ۱۷،۲۲،۳۲)۔
- "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ المائدۃ: ۲)۔
- "ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا" (سورہ النساء: ۸۵)۔
- "نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کأنھم لا یعلمون" (سورہ بقرۃ: ۱۰۱)۔
- "وما اختلف فیہ إلا الذین أوتوہ من بعد ما جائتھم البینات بغیًا بینھم" (سورہ بقرۃ: ۲۱۳)۔ (دیکھئے مقالہ مفتی جمیل احمد نذیری)

-"یأیها الذین آمنوا أدخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطان" (سورۃ البقرۃ: ۲۰۸)۔

-"ولا تتبعوا أهواء قوم قد ضلوا من قبل وأضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل" (سورہ مائدہ: ۰۰)۔

-"ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار" (سورہ ھود: ۱۱۳)۔

-"اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله" (سورہ توبہ: ۳۱)۔

-"لا یکلف الله نفسا إلا وسعها" (سورہ آل عمران: ۲۸۶)۔

-"یتلوا علیهم آیاته ویعلمهم الکتاب والحکمة" (سورہ جمعہ: ۲)۔

-"لا تحرك به لسانك لتعجل به إن علینا جمعه وقرآنه. فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم إن علینا بیانه" (سورۃ قیامۃ: ۱۹-۱۶)۔

-"من قرأ حرفا من کتاب الله فله حسنة، والحسنة بعشر أمثالها لا أقول الم حرف، ولکن الف حرف، ولام حرف ومیم حرف" (ترمذی حدیث نمبر ۲۹۱۰، حدیث کی سند صحیح ہے)، (مذکورہ دلائل ماخوذ از مقالہ مفتی ڈاکٹر شاہجہان ندوی)۔

-"من تشبه بقوم فهو منهم" (ابوداؤد ۲/ ۵۵۹، کتاب اللباس)۔

-"إن الله لا یجتمع أمتي علی الضلالة، وید الله علی الجماعة، ومن شذ شذ فی النار، واتبعوا سواد الأعظم" (مشکوۃ باب الاعتصام/ ۳۰)۔ (محمد ریاض ارمان)۔

والذی نفسی بیده لترکبن سنة من کان قبلکم" (ترمذی ۲/ ۴۱، ابواب الفتن)۔

-"أمتهوکون أنتم کما تهوکت الیهود والنصاری فقد جئتکم بها بیضاء نقیة ولو کان موسی حي ما وسعه إلا اتباعی" (رواہ البیهقی فی شعب الإیمان مشکوۃ المصابیح ۱/ ۳۰)۔ (ماخوذ از مفتی محمد صادق، ڈاکٹر ظفر الاسلام)۔

-"إذا أمرتکم بشئ فأتوا منه ما استطعتم وإذا نهیتکم عن شئ فاجتنبوه" (بخاری ۱۳/ ۲۸۸)۔

-"لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر وذراعا بذراع حتی لو سلکوا جحر ضب لسلکتموه، قالوا یا رسول الله! الیهود والنصاری قال: فمن" (بخاری حدیث نمبر: ۳۴۵۶، مسلم حدیث نمبر ۲۶۶۹)۔ (روح الامین)۔

-"عن عبدالله بن عمر عن رسول الله صلی الله علیه وسلم أنه کان ینهی أن یسافر بالقرآن إلی أرض العدو مخافة أن یناله العدو" (مسلم الإمارۃ باب النهی أن یسافر بالمصحف)۔

-(مقوقس شاہ مصر اور ہرقل شاہ روم کے نام عربی زبان میں آپ کا خط):

"بسم الله الرحمن الرحیم من محمد بن عبدالله ورسوله إلی برقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الهدی، أما بعد: فانی أدعوك بدعایة الاسلام اسلم، تسلم، یوتك الله أجرك مرتین، فإن تولیت، فعلیك إثم الأریسین" ویأهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شیئا، ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله، فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون"، (سورہ آل عمران: ۶۴)، (صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۵۵۳، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۷۷۳)۔ (ماخوذ از مقالہ: مولانا ندیم احمد انصاری، ڈاکٹر مفتی شاہ جہان ندوی)۔

-شاہ حبشہ نجاشی کے نام خط میں آپ کا درج ذیل آیات درج فرمانا، جبکہ ان کی زبان بھی غیر عربی تھی۔

"هو الذی لا إله إلا هو الملك القدوس السلام المؤمن المهیمن العزیز الجبار المتکبر، سبحان الله عما یشرکون" (سورۃ الحشر: ۲۳)

"یأیها الکتاب لا تغلوا فی دینکم، ولا تقولوا علی الله إلا الحق، إنما المسیح عیسی بن مریم رسول الله وکلمته ألقاها إلی مریم" (سورۃ النساء: ۱۷۱)۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور کے زمانے میں ان بادشاہوں کی زبان بولنے والے افراد موجود تھے اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان ہی میں آیات لکھوانے کا اہتمام فرمایا۔

''أصبح كل رجل منهم يتكلم بلسان القوم الذين بعثه إليهم'' (الطبقات الكبرى لابن سعد ۱/ ۱۹۸، ۲۰۲، طبع بيروت العلمية: ۱۹۹۵)۔ (دیکھئے مقالہ ڈاکٹر مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

''لاتشددوا على أنفسكم'' (مشكوة كتاب النكاح وكتاب الاعتصام ۱/ ۳۱)۔ (دیکھئے مقالہ: مفتی سعید الرحمن فاروقی وغیرہ)۔

''لايمكن ترجمة القرآن ترجمة تماثلة فى دقة تعبيره وعلو أسلوبه، وجمال سبكه وإحكام نظمه وتقوم مقامه فى اعجازه وتحقيق جميع مقاصده من إفادة الأحكام والآداب والإبانة عن العبر والمعانى الأصلية والثانوية، ونحو ذلك معا هو من خواصه ومزاياه المستمدة من كمال بلاغته وفصاحته ومن حاول ذلك ممثله كمثل من يحاول أن يصعد إلى السماء بلا أجهزة ولاسلم، أو يحاول أن يطير فى الجو بلا أجنحة ولا آلاته، ويمكن أن يعبر العالم عما فهمه من معانى القرآن حسب وسعة وطاقة بلغة أخرى ليبين لأهلها ما أدركه، فكره من هداية القرآن وما استنبطه من أحكامه أو وقف عليه من عبره ومواعظه، لكن لايعتبر شرحه لتلك بغير اللغة العربية قرآنا ولاينزل منزلة من جميع النواحى، بل هو نظير تفسير القرآن باللغة العربية فى تقريب المعانى والمساعدة على الاعتبار واستنباط الأحكام. ولايسمى ذلك التفسير قرآنا، وعلى هذا يجوز للجنب والكفار مس ترجمة معانى القرآن بغير اللغة العربية كما يجوز مسهم تفسيره باللغة العربية'' (فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء، فتوى نمبر ۲۲۳، سوال ۱۹۹۷، ۴/ ۱ی ۳۳)۔

-أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته (ثم قال) قال العلامه ابن عاشر: و وجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثنى عشر الفا. والإجماع حجة حسبما تقرر فى أصول الفقه (۳۱ رساله خلاصة النصوص الجليله/ ۲۵، لشيخ القراء شيخ محمد بن على حداد) (مولانا عبدالباسط پالن پوری)۔

''وأصل هذه المسأله إذا قرأ فى صلاته بالفارسية جاز عند أبي حنيفة رحمه الله ويكره، وعندهما لايجوز إذا كان يحسن العربية، وإذا كان لايحسنها يجوز، وعند الشافعى رحمه الله لاتجوز القرأة بالفارسية بحال. ولكنه إن كان لايحسن العربية، وهو أمي يصلى بغير قرأة، فالشافعى رحمه الله يقول: إن الفارسية غير القرآن، قال الله تعالى: ''إنا جعلناه قرآنا عربيا'' (سوره الزخرف:۳)۔ ''وقال الله تعالى: ولو جعلنا قرآنا أعجميا لقالوا لو لا فصلت آياته أأعجمى وعربي (سوره فصلت: ۹۹)۔ فالواجب قرأة القرآن. فلا يتأدى بغيره بالفارسية والفارسية من كلام الناس، فتفسد الصلاة، وأبويوسف ومحمد رحمهما الله قالا: القرآن معجز. والإعجاز فى النظم المعنى. فإذا قدر عليهما، فلا يتأدى الواجب إلا بهما، وإذا عجز عن النظم أتى بما قدر عليه كمن عجز عن الركوع والسجود يصلى بالإيماء۔ وأبوحنيفة رحمه الله استدل بما روى أن الفرس كتبوا إلى سلمان رضى الله عنه أن يكتب لهم الفاتحة بالفارسية، فكانوا يقرأون ذلك فى الصلاة، حتى لانت ألسنتهم للعربية. ثم الواجب عليه قرأة المعجز. والإعجاز فى المعنى، فإن القرآن حجة على الناس كافة، وعجز الفرس عن الإتيان بمثله إنما يظهر بلسانهم. والقرآن كلام الله تعال غير مخلوق ولا محدث، واللغات كلها محدثة، فعرفنا أنه لايجوز أن يقال: إنه قرآن بلسان مخصوص، كيف؟ وقد قال الله تعالى: ''و إنه لفى زبر الأولين'' (سوره الشعراء: ۱۹۶)۔ وقد كان بلسانهم'' (المبسوط للسرخسى، كتاب الصلاة باب افتتاح الصلاة ۱/ ۳۷)۔

-''وقال البيهقى فى شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغى أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير بما كتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة منا، فلاينبغى أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم'' (الاتقان ۲/ ۲۰۳، مطبع فيصل ديوبند)۔

-''ما كان سببا لمحظور فهو محظور'' (شامی ۵/ ۲۲۳)۔

-''كل ما أدى إلى الحرام حرام'' (درمختار مع شامی ۹/ ۳۲۲، بدائع الصنائع ۲/ ۲۸۸)۔

-''ما حرم أخذه حرم أعطاؤه'' (الاشباه والنظائر مع الحموی)۔

-''إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما'' (المقاصد الشريعة للخادمی/ ۳۶)۔

-''وأما لو اعتاد قرأة القرآن أو كتابة المصحف بالفارسية يمنع أشد المنع حتى إن أحدا من أهل الأهواء فى زمان الشيخ الإمام الجليل أبي بكر محمد بن الفضل رحمة الله كتب فتوى وبعثها إليه إن الصبيان فى زماننا يشق عليهم التعليم باللغة العربية هل يجوز لنا نعلم بالفارسية؟ فقال للمستفتي: إرجع حتى تتأمل، ثم استخبر من حاله، فإذا هو كان معروفا بفساد مذهبه فأعطى لواحد من خدامه سكينا. فقال: اقتله بهذا ومن أخذك به فقل: إن فلانا أمرني به ففعل فجاء الشرطي إليه وقال: إن الأمير يدعوك، فذهب الشيخ إليه فقص القصة وقال: إن هذا كان يريد أن يبطل كتاب الله فخلع له الأمير وجازاه بالخير'' (فتح القدير مع الكفاية ونهاية على هامش الفتح ۱/ ۳۹۲۸)۔

(دیکھئے مقالات: مفتی غلام اللہ کاوی والا، مولانا عبید اللہ ندوی، عبد الرب عبد الوہاب خان)۔

-ماذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبًا، لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتناء بالمامورات'' (الأشباه والنظائر ۱/ ۳۲۲)۔

-''أن القرآن جميعه كلام الله حروفه، ومعانيه، ليس شي ذلك كلا ما لغيره، ولكن انزله على رسوله، وليس القرآن اسما لمجرد المعنى ولمجرد الحرف، بل مجموعهما'' (فتاوی ابن عثیمه ۱۲/ ۲۲، ۲۴۳)۔

-''إذا أراد أن يكتب مصحفا بها أى بالفارسية يمنع، وإن فعل فى آية أو آيتين لا. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (فتح القدير كتاب الصلاة: ۱/ ۲۸۶)۔

-''عن النبي صلى الله عليه وسلم:'' أنا تارك فيكم ثقلين: أولهما كتاب الله. فيه الهدى والنور. فخذوا بكتاب الله واستمسكوا به'' (مسلم حدیث نمبر: ۲۹۰۸)۔

-''والقرآن معجز، والإعجاز من اللفظ يزول بزوال النظم العربي، فلا يكون الفارسى قرآنا لإنعدام الإعجاز، ولهذا لم تحرم قرأته على الجنب والحائض'' (بدائع الصنائع كتاب الصلاة ۱/ ۱۱۲)۔

-''قدمنا حكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسية، وإنه إنما نص على الفارسية لإفادة المنع بغير بالطريق الأولى، لأن غيرها ليس مثلها فى الفصاحة، ولذا كانت فى الجنة مما يتكلم به كالعربية كما تقدم'' (النفحة القدسية / ۳۲)۔

-''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، و لأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمر القرآن'' (جواہر الفقه ۱/ ۹۸، كتاب التجنيس ۱/ ۲۷۷)، (دیکھئے مقالہ: محمد شکیل اسلام پوری وغیرہ)۔

-''لأن الترجمة ليست قرآنا، والقرآن هو أساس الاسلام وكل مسلم يحس فى نفسه الحاجة الماسة لتعلم العربية حتى يأخذ الاسلام من مصادره الأصلية والموثرة، وفى ذلك فليتنافس المتنافسون'' (ترجمة القرآن الكريم ۱/ ۹۵)۔

-''وفى حاشية المغنى: ما نصه استمر الإجماع على قرأة جميع المسلمين القرآن فى الصلاة وغيرها بالعربية كأذكارها وسائر الأذكار والأدعية الماثورة، على كثرة الأعاجم حتى قام بعض المرتدين من أعاجم هذا العصر

يدعون إلى ترجمة القرآن وغيره من الأذكار وبطريق التعبد. وإنما مرادهم التوسل بذلك إلى الردة على قومهم. ونبذ القرآن المنزل من عند الله وراء ظهورهم. وهو إنما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة، وإنما كان تبليغه والدعوة إلى الإسلام به وإنذار، كما أنزل الله تعالى لم يترجم النبي صلى الله عليه وسلم ولا أذن بترجمته ولم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي صلى الله عليه وسلم كتبه إلى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح تعليل الذى علله به الشافعي في رسالته الشهيرة في الأصول إن الله تعالى فرض على جميع الأمم تعلم اللسان العربي بالطبع لمخاطبتهم بالقرآن والتعبد به ولم ينكر ذلك عليه أحد من علماء الإسلام، لأنه أمر مجمع عليه، وإن أهمله الأعاجم بعد ضعف الدين والعلم (مغنی مع شرح الکبیر ۱/۲۵۰)۔

-''أما كتابة الصحف بالفارسية عند فقهاء مذهب الإمام على ما نقل عنهم فهي ممنوعة بالإجماع أشد المنع إن كان مستقلا مجردا عن النص العربي''۔

-''وصاحب الكافي أجازها بشرط أن يكتب القرآن ويكتب تحته تفسير كل حرف'' (شیخ الاسلام مصطفی صبری اور فتح القدیر کے حوالہ (۱/۳۶)۔(دیکھئے مقالہ مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

متن کے بغیر تنہا تراجم شائع نہ کرنے کے مصالح:

مقالہ نگار حضرات نے تنہا ترجمہ شائع نہ کرنے کی بابت بہت سی مصلحتیں بھی تحریر کی ہیں مثلاً:

- متن قرآن کے تحفظ کے پیش نظر۔
- معانی میں شیطانی ذہن رکھنے والوں کی طرف سے خلط ملط اور التباس پیدا کرنے کا اندیشہ۔
- اسلام کی ڈگر سے ہٹنا زیغ وضلال اور انحراف کو دعوت دینا ہے۔
- یہ قرآن کی حفاظت کا معاملہ ہے، مصارف کی کمی کا بہانا قطعی لائق التفات نہیں۔
- ترجمہ عام طور سے مترجم کی فہم وفراست کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، جو دین میں نزاع کا ذریعہ بنے گا۔
- صرف ترجمہ پڑھنے سے لوگوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ٹوٹے گا اور وہ رحمت سے محروم ہوں گے۔
- ترجمہ میں فساد عقیدے میں فساد کا موجب ہوگا۔
- مترجم تحریف معنوی کے لئے آزاد ہوجائے گا۔
- اس کی اجازت اجماع اور اسلاف کی خلاف ورزی ہوگی۔
- انسان کی طبیعت میں سہل پسندی ہے، اصل کو چھوڑ کر فرع ہی کو اختیار کرلیں گے اور مرور زمانہ کے بعد لوگوں کی عادت بن جائے گی، اور یہ دین وایمان کے لئے بڑا خسارہ ہوگا۔
- یہ امت کے مروجہ طریقہ کے خلاف ایک بدعت ہے۔
- شائع شدہ ترجمہ پرانا ہونے کی صورت میں بے حرمتی کے نذر ہوگا۔
- عربی زبان میں نازل شدہ قرآن نور ہدایت سے لبریز ہے، صرف ترجمہ اس نعمت سے خالی ہوگا۔
- لوگوں کا تعلق رفتہ رفتہ قرآن سے ختم ہوجائے گا۔
- لوگ بجائے اصل قرآن کے اسی کو قرآن سمجھنے لگیں گے۔

- قرآن مجید کے اصل الفاظ توقیفی ہیں، اس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔
- توریت وانجیل جیسے سلوک کا خطرہ اور اندیشہ ہے، اور دشمن اسی تاک میں ہے، اس لئے اس محض چند لوگوں کے فائدے کے لئے کم خرچ اور ناخواندہ لوگوں کا عذر تلاش نہ کیا جائے۔

مفتی عبدالرحیم حسنی کشمیری نے تو تنہا ترجمہ شائع کرنے والے افراد کے خلاف قانونی کاروائی تک کئے جانے کی رائے دی ہے۔

جو ترجمہ بغیر متن کے شائع ہو چکے ہیں اسے خرید وفروخت کرنا اور ہدیہ دینا ولینا بالکل بند کردیا جائے، اس سے اس کی اشاعت اپنے آپ بند ہوجائے گی۔

تائید میں اکابر کے فتاوی:

متن کے بغیر ترجمہ شائع کرنے کی ممانعت کی تائید میں مقالہ نگاران نے مندرجہ ذیل کتب فتاوی سے اکابر کے فتاوی کو بھی پیش کیا ہے:

- کتاب الفتاوی (مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ار ۴۷۳)۔
- امداد الفتاوی (حضرت مولانا اشرف علی تھانوی)
- خیر الفتاوی (ار ۲۱۵)۔
- فتاوی حقانیہ (۲ر ۱۳۸)۔
- کفایۃ المفتی (مفتی کفایۃ اللہ مراد آبادی ثم دہلوی: ار ۱۲۰)۔
- فتاوی محمودیہ (مفتی محمود حسن دیوبند: ۳ر ۵۱۰)۔
- امداد الاحکام (حضرت تھانوی: ار ۲۳۲)۔

جواز:

چونکہ اکثر جملہ حضرات مقالہ نگاران کی رائے بغیر متن کے ترجمہ کی اشاعت کے عدم جواز کی ہے، اس لئے ان کے اسمائے گرامی کو حذف کرتے ہوئے صرف ان حضرات کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے جو اس کے جواز کے قائل ہیں، بنیادی طور پر مجوزین حضرات کا خیال یہ ہے کہ جب دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کی اجازت بھی ہے اور دعوت دین اور دنیا تک قرآن کریم کے پیغام کو پہنچانا یہ ضرورت بھی ہے، پھر صرف ترجمہ شائع کرنا کیوں کر جائز نہ ہوگا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی شافعی، مولانا محمد اعظم ندوی، مولانا نعیم احمد ندوی (کیرالا)، مولانا حسین احمد قاسمی (امارت شرعیہ پٹنہ)۔

دلائل:

ان تینوں حضرات نے بنیادی طور پر قرآن کریم کو پوری انسانیت کے لئے ہدایت کا انمول تحفہ اور آفاقی وعمومی کتاب ہونے کی وجہ سے اس کے دعوتی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور غیر عربی داں حضرات جو اس پر احکام اسلام کی تعلیم کے محتاج ہیں ان کی ضرورت کو بنیاد بنا کر جائز، بلکہ اس عمل کو مستحسن قرار دیا ہے اور اس پر مندرجہ ذیل نصوص پیش کئے ہیں:

"یجوز ترجمة معانی النصوص القرآنیة إلی اللغات الاجنبیة لحاجة الناس إلی معرفة أحکام الإسلام ورسالته العامة للبشریة، إذا أنه یتعذر علی کل فرد غیر عربی تعلم اللغة العربیة لما فی ذلك من حرج وعسر" (موسوعة الفقه الاسلامی وادلته للزحیلی: ۱۰/ ۵۹۳)۔

"یجوز إعطاء ترجمة معانی القرآن الکریم لغیر المسلمین من أجل البلاغ و دعوة إلی الإسلام وتغلیب

الجانب الترجمة'' (فتاوی اللجنة: ۴/۴۲)۔

''ولا یسمی ذلك التفسیر قرآن وعلی هذا یجوز للجنب والکفار مس ترجمة معانی القرآن بغیر اللغة العربیة، کما یجوز مسهم تفسیره باللغة العربیة'' (فتاوی اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء: ۴/۱۶۴)۔

(دیکھئے مقالہ: مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی)۔

- ''صرف ترجمہ کی اشاعت کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں ہے''۔

- جب حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورہ الحجر: ۹) کے ذریعہ لے لیا ہے تو پھر اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ بعید از قیاس ہے۔

- اس کا جواز دعوتی نقطہ نظر ہے، یہ بڑا مقصد ہے، اور غیر مسلموں کے ہاتھوں میں بے حرمتی کی بات جہاں تک ہے تو بے حرمتی سے بچانا اور ان کو قرآن کی دعوت دینا دونوں حفاظت ہی کے قبیل سے ہے۔

- حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جمع قرآن کا اہتمام الفاظ قرآنی کے ضائع ہونے کے اندیشے سے ہوا ہے، معانی کے اختلاف کی بنا پر نہیں ہوا ہے جس کا اندیشہ محسوس کیا جارہا ہے۔

- ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے پیش نظر دعوت ایک ضرورت ہی نہیں، بلکہ فریضہ ہے۔ (دیکھئے مقالہ مولانا محمد نثار عالم ندوی، کیرالا)۔

جبکہ مولانا نعیم احمد ندوی کیرالا نے افادۃ اور استفادے کو سامنے رکھتے ہوئے خالص ترجمہ کو کسی اور نام سے شائع کرنے کا عندیہ دیا ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ) اور مولانا اعظم ندوی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے تو خالص بغیر متن کے ترجمہ پڑھنا جائز نہیں ہے، البتہ غیر مسلموں کے لئے تنہا چھاپنا، تقسیم کرنا سب درست ہے، چونکہ مقصد دعوت ہے اور اسے بجائے ایک ساتھ ۳۰/پارے چھاپنے کے اجزاء میں تقسیم کرکے چھاپا جائے۔

۲- بغیر متن والا ترجمہ قرآن خریدنا اور ہدیہ کرنا:

بیشتر مقالہ نگاران حضرات کی رائے یہ ہے کہ جب ترجمہ قرآن کو بغیر متن کے شائع کرنا جائز نہیں ہے تو پھر اسے خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے، بلکہ کوئی شخص اگر ایسا کرتا ہے تو تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔ اس موقف کو ۶۸ حضرات نے اختیار کیا ہے، چونکہ اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے، اور تقریباً اتفاقی ہے، اس لئے ان کے اسمائے گرامی کی فہرست کو چھوڑا جاتا ہے۔

دلائل:

مذکورہ حضرات نے عدم جواز کے لئے مندرجہ ذیل دلائل دیئے ہیں:

- "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۃ المائدۃ: ۲)۔

- "ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها" (سورۃ النساء: ۸۵)۔

''الدال علی الخیر کفاعله''۔ (حدیث)

''ومن عمل عملا صالحا فله أجرها وأجر من عمل بها. ومن عمل عملاً سیئًا فله وزرها و وزر من عمل بها'' (حدیث)

''دفع المفاسد أولی من جلب المنافع''۔ (الاشباہ والنظائر)

- اجماع امت کی خلاف ورزی۔

مجوزین کے اسمائے گرامی سوال نمبر ا کے ضمن میں آچکے ہیں اور ان کے دلائل بھی مذکور ہیں، حسب خواہش ملاحظہ کرلیا جائے۔

۳- بغیر متن والے ترجمہ قرآن کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو کی شرط:

بغیر متن کے ترجمہ سے متعلق تفصیلات اوپر مذکور ہوچکی ہیں کہ اس کی اشاعت ناجائز ہے۔ اگر بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کوئی کر ہی دیتا ہے تو

استفادہ کرتے وقت اس ترجمہ کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو ضروری ہوگا یا نہیں، اس بارے میں مقالہ نگاران کے تین طرح کے رجحانات سامنے آئے ہیں:

پہلا رجحان:

پہلا رجحان یہ ہے کہ اگرچہ تنہا متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت ممنوع ہے، تاہم اگر شائع کر ہی دیا گیا تو اس کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو ضروری ہوگا اور بغیر وضو وطہارت اسے چھونا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ وہ بھی قرآن ہی کے حکم میں ہے، اور اس کو نسبت بھی قرآن ہی کی حاصل ہے، یہ رجحان مندرجہ ذیل حضرات کا ہے:

مفتی محمد جہانگیر حیدر، مولانا محمد فاروق ور بھنگوی، مولانا عبدالرشید نعمانی، مولانا اسماعیل لاجپوری، مفتی اقبال احمد کانپوری، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محمد اسرار احمد آبادی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی صادق محمد پٹیل، مفتی اخلاق حسین قاسمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی شبیر یعقوب دیولوی، ڈاکٹر مفتی شاہ جہان ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مولانا عبدالباسط پالن پوری، مولانا یوسف علی آسام، مولانا جنید بن محمد پالنپوری، مولانا محمد موسیٰ القاسمی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد حنیف، مفتی محمد ارشاد پالن پوری، اور مفتی غلام اللہ کاوی والا، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مفتی سعید الرحمن فاروقی، ممبئی، مفتی عبدالباسط قاسمی (تھانے ممبئی)۔

دلائل:

دلائل میں عام طور سے مندرجہ ذیل نصوص پیش کئے ہیں:

-"إنه لقرآن كريم. في كتاب مكنون، لا يمسه إلا المطهرون" (سورہ واقعہ: ۷۹-۷۷)۔

-"لا يمس القرآن إلا طاهر"۔ (الاتقان في علوم القرآن: ۹/ ۱۹۵، سنن دارمي حديث: ۲۲۱۴، دار قطني حديث: ۱۹۳۷)۔

-اور فقہاء کی عبارتیں، مثلاً:

"ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح" (فتاوى هندية ۱/ ۲۰)، (دیکھئے: مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی وغیرہ)۔

دوسرا رجحان:

دوسرا رجحان یہ ہے کہ بغیر متن قرآن والے ترجمہ کو بغیر وضو کے ہاتھ لگانا، مکروہ، اور بے ادبی ہے، اس لئے احتیاط کا تقاضا اور بہتر یہ ہے کہ وضو کر لیا جائے، گویا جواز کے باوجود احتیاط وضو میں ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اپنایا ہے:

مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محمد اعظم ندوی، مولانا وحید الدین ترکیسر، مولانا محمد اقبال شکر پور، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبدالعظیم ندوی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی محمد حذیفہ داحودی، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا عبید اللہ ندوی، اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا حسین احمد قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی۔

دلائل ان حضرات کے بھی تقریباً وہی ہیں جو پہلے رجحان کے حاملین نے پیش کئے ہیں۔

تیسرا رجحان:

تیسرا رجحان یہ ہے کہ جب اس کی اشاعت ممنوع ہے، اس کے باوجود کسی نے چھاپ دیا ہے تو اس کی حیثیت عام کتاب کی سی ہوگی اور اس پر قرآن کے احکام جاری نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس کے چھونے کے لئے وضو ضروری ہے۔ بغیر وضو کے اسے ہاتھ لگانا جائز ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات تحریر کیا ہے:

مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا ندیم احمد انصاری، مفتی محمد اشرف قاسمی۔

البتہ-پچیس مقالہ نگار حضرات نے بغیر متن کے ترجمہ قرآنی کی اشاعت کے عدم جواز کی رائے رکھنے کے باوجود انھوں نے اس پر کوئی رائے نہیں دی ہے کہ خالص ترجمہ قرآنی کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو ضروری ہے یا نہیں ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مفتی عبداللہ کوہی والا، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا محمد نعیم احمد ندوی، کیرالا، مولانا اویس بن صالح

بنگ، مولانا مشبر مصطفی، مولانا عبدالحکیم پالنپوری، مولانا روح الامین، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی عبدالرحیم حسنی کشمیری، مولانا مصطفی قاسمی آواپوری، مولانا عبدالباسط قاسمی اجراڑہ، میرٹھ)، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا افضل الدلی قاسمی ندوی، محمد شفیق الکوثری قاسمی، مولانا عبدالعظیم ندوی، مفتی عبدالمنان (آسام)، مولانا طاہر حسین قاسمی، مفتی نذیر احمد کشمیری، اور مفتی شاہد قاسمی (مدھوبنی)۔

البتہ ڈاکٹر شاہ جہان ندوی صاحب نے اپنی تحریر میں اس تعلق سے اس اندیشہ کا اظہار ضرور کیا ہے کہ اگر لوگوں میں بے وضو ترجمہ پڑھنے کی عادت پڑ جائے گی تو اصل قرآن کی عظمت بھی دل سے آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گی، اور ترجمہ کو بے وضو پڑھنا اصل کو بے وضو پڑھنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

۴۔ بغیر متن کے ترجمہ کی خرید وفروخت اور ہدیہ:

اس کے جواب میں بھی بنیادی طور پر دو موقف ہیں۔

پہلا موقف:

چونکہ تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز اور ممنوع ہے، بلکہ قرآن کے خلاف بہت سے فتنوں یہاں تک تحریف کے دروازے تک کے کھلنے کا اندیشہ ہے، اس لئے شریعت کا قاعدہ ہے کہ "إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه" لہٰذا اس کا خریدنا، ہدیہ اور تقسیم کرنا ناجائز اور تعاون علی الاثم ہے، اس رائے کو ۲۹ حضرات نے اختیار کیا ہے جو تقریباً اتفاقی رائے ہے۔

دلائل:

"تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورۂ المائدہ: ۲)۔

-"ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورہ نساء: ۸۵ صيانة القرآن عن تغير الرسم واللسان: ۱/ ۹۶)۔

-"ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم" (سورۂ انعام: ۱۰۸)۔

-"ولا يضربن بأرجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن" (سورۂ النور: ۳۱)۔

-"يايها الذين آمنوا لا تقولوا راعنا، وقولوا انظرنا" (سورۂ بقرہ: ۱۵۴)۔

-"إذا أمرتكم بشئ فأتوا منه ما استطعتم وإذا نهيتكم عن شئ فاجتنبوه" (بخاری: ۱۳/ ۲۸۸)۔

-"عن ابن عمر رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان ينهى أن يسافر بالقرآن إلى أرض العدو مخافة أن يناله العدو" (مسلم: ۲/ ۱۳۱)، (ماخوذ از مقالہ: محمد اقبال قاسمی بھروارا)۔

-"من عمل عملا صالحا له أجرها و أجر من عمل بها، ومن عمل عملا سيئا فله وزرها و وزر من عمل بها" (حدیث) (مفتی عبداللہ کاوی والا)۔

"من الكبائر شتم الرجل والدين، قالوا يا رسول الله! هل يشتم الرجل والدين، قال نعم، يسب أبا الرجل فيسب أباه ويسب أمه فيسب أمه" (متفق عليه)۔

(یہ سارے امور سد الذریعہ کے قبیل کے ہیں)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا روح الامین)۔

"إذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه، يثبت التبع بثبوت الأصل" (قواعد الفقہ: ۱۳۹)۔

"النهى إذا كان لسد الذريعة أبيح للمصلحة الراجحة" (القواعد الفقهية وتطبيقاتها فى المذاهب الأربعة للدكتور محمد مصطفى الزحيلى: ۲/ ۷۸۳)۔

"إذا اجتمع مفسدتان يدفع أعظمها" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم)۔

"فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبا، لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتناء

بالمأمورات'' (الاشباہ: ۱/ ۳۲۲)۔

''ما كان سببا لمحظور فهو محظور'' (شامی: ۵/ ۲۲۳)۔

''وكل ما أدى إلى ما لايجوز لايجوز'' (در مختار: ۸/ ۳۳۲)۔

''وكل ما أدى إلى الحرام حرام'' (بدائع: ۷/ ۳۸۸)۔

''الإعانة على المحظور محظور'' (جمهرة القواعد الفقهية: ۲/ ۶۴۴)۔

''إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما'' (المقاصد الشرعية للخادمی/ ۴۶)۔

(دیکھئے مقالہ: مفتی جعفر ملی رحمانی)۔

''درأ المفاسد أولى من جلب المنافع''۔

''وتجوز كتابة آية أو آيتين الفارسية لا أكثر'' (در مختار: ۱/ ۴۸۶)۔

-چونکہ ترجمہ کے ساتھ والے قرآن کریم کو غیر مسلم حضرات کو دینے اور احکام کا مکلف نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے بلا وضو چھونے کی فقہاء نے اجازت دی ہے اس لئے بلا شبہ محض ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا موقف:

مندرجہ ذیل حضرات قرآن کریم کو دنیا تک پہونچانے، اور دعوتی نقطہ نظر سے جائز اور مستحسن قرار دیتے ہیں، ان میں بعض جزوی طور پر اور بعض کلی طور پر۔

کلی طور پر:

کلی طور پر محض ترجمہ کی اشاعت اور ہدیہ وتقسیم کو جائز، بلکہ مستحسن قرار دینے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، جناب مولانا عبید اللہ ابوبکر ندوی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا نعیم احمد ندوی، کیرالا، مولانا حسین احمد قاسمی۔

جزوی طور پر اشاعت کی اجازت:

جناب مفتی اشرف قاسمی، جناب سید باقر ارشد قاسمی کی رائے یہ ہے کہ جزوی طور پر اگر چند آیات، یا بعض سورت کا محض ترجمہ شائع کیا جاتا ہے، تو اس کی اجازت ہے، جبکہ مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی کہتے ہیں کہ ''ضرورت کے بقدر اسے خریدنے اور تقسیم کرنے کی اجازت ہے۔

-مولانا نعیم احمد ندوی کیرالا کا خیال ہے کہ محض ترجمہ شائع کرنے کے جواز کے باوجود اسے قرآن کے بجائے دوسرے کسی نام سے شائع کیا جائے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

دلائل:

جواز کا موقف اختیار کرنے والے حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل ووجوہ کا سہارا لیا ہے:

-''فاقرؤا ما تيسر من القرآن'' (سورہ مزمل: ۲۰)۔

-''وإنه لفي زبر الأولين'' (سورۃ الشعراء: ۱۹۶)۔

-رکوع اور سجدہ پر قادر نہ ہونے والے شخص کے لئے ایماء (اشارہ) سے نماز کی اجازت پر قیاس۔

-امام ابوحنیفہ کے نزدیک فارسی ترجمہ کا نماز میں تلاوت کے قائم مقام ہونا۔

''إذا أفتتح الصلاة بالفارسية أو قرأ فيها بالفارسية أو ذبح وسمى بالفارسية وهو يحسن العربية أجزأه عند أبي حنيفة، وقالا: لايجزيه إلا في الذبيحة، وإن لم يحسن العربية أجزأه'' (فتح القدير: ۱/ ۲۹۰)۔

-اہل عجم کے لئے قرآن میں نقط اور اعراب کی اجازت ''ويكره التعشير والنقط في المصحف لقول ابن مسعود جردوا

القرآن ویروی جردوا المصحف، وفی التعشیر والنقط ترك التجرید، لأن التعشیر یخل بحفظ الآی والنقط بحفظ الإعراب اتکالا علیه، فیکره، قالوا فی زماننا لابد للعجم من دلالة، فترك ذلك إخلال بالحفظ و هجران القرآن فیکون حسنا (ہدایہ کتاب الکراہیۃ: ۴۵۸/۵)۔

-ابتداء میں کسی بھی زبان میں علماء ترجمہ کے عدم جواز کے قائل تھے، بعد میں اجازت دی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے خود ترجمہ کر کے جواز کا فتوی دیا۔

-جب آیت قرآنی "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورہ الحجر:۹) میں حفاظت کا وعدہ ہے تو ضیاع کا اندیشہ بے بنیاد ہے۔

-قرآن کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے غیر کو نہ دینا اور دعوتی نقطۂ نظر دینا دونوں ہی حفاظت کے قبیل کی چیز ہے۔

-حضرات شیخین کے زمانے میں اختلاف قرأت کی وجہ سے ضیاع کا اندیشہ تھا، اختلاف معانی کی وجہ سے نہیں، اس لئے یہ اندیشہ بھی بعید معلوم ہوتا ہے

-الضرورات تبیح المحظورات" (دلائل کے لئے دیکھئے مقالہ: مولانا محمد نثار عالم ندوی)۔

۵-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت:

سوال: دور حاضر میں قرآن کے حوالے سے ایک بات یہ بھی شروع ہوگئی ہے کہ جو لوگ قرآن پاک کی عبارت کو عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے یا اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کے لئے متن قرآن کو ان کی زبان (ہندی، انگریزی وغیرہ) اور ان کے رسم الخط میں لکھ دیا جاتا ہے، یعنی عبارت قرآن کی ہوتی ہے اور رسم الخط غیر عربی ہوتا ہے؛ تاکہ غیر عربی داں حضرات کو تلاوت قرآن میں سہولت ہو، شرعاً ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے اور غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا کیا حکم ہے؟

پہلا رجحان:

۸۱ رمقالہ نگاران میں سے ۷۰ رمقالہ نگاران حضرات علما و مفتیان کرام کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم کی عربی اور عثمانی رسم الخط کے علاوہ دنیا کی کسی بھی زبان کے رسم الخط میں کتابت نہ کلی نہ جزوی، اور نہ ہی دونوں کو ایک ساتھ اور نہ ہی علاحدہ، کوئی بھی صورت ناجائز، حرام اور اجماع امت کے خلاف ہے، چونکہ اکثر حضرات کی رائے ہے، اس لئے ان کے اسمائے گرامی بخوف طوالت حذف کئے جاتے ہیں۔

دلائل و وجوہ:

عدم جواز کے لئے مقالہ نگاران نے بہت سے دلائل دیئے ہیں:

-"إن کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم" (آل عمران: ۳۱)۔

-"ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین توله ما تولی ونصله جهنم" (سورہ نساء: ۱۱۵)۔

-"کذلك أوحینا إلیك قرآنا عربیا" (سورہ شوری: ۷)۔

-"ولو جعلناه قرآنا أعجمیا لقالوا لولا فصلت آیاته أأعجمی وعربی" (سورہ فصلت: ۵۶)۔

-"فإنه من یعش منکم فسیری اختلافا کثیرا، فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین من بعدی عضوا علیها بالنواجذ" (ابن ماجہ حدیث: ۴۲، ۴۳) (دیکھئے مقالہ مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

-"قال جماعة من الأئمة إن الواجب علی القراء والعلماء وأهل الکتابة أن یتبعوا هذا الرسم فی خط المصحف، فإنه رسم زید بن ثابت رضی الله عنه وکان أمین رسول الله وکاتب وحیه" (تفسیر نیشاپوری: ۳۳/۱)

"من یکتب مصحفا، فینبغی أن یحافظ علی هجاء الذی کتبوا به تلك المصاحف، ولا یخالفهم فیه، ولا یغیر مما کتبوه شیئا، فإنهم کانوا أکثر علما وأصدق قلبا و لسانا وأعظم أمانة. فلا ینبغی أن نظن بأنفسنا إستدراکا

علیہم'' (مناهل القرآن: ۱/ ۳۸۰)۔ (دیکھئے مقالات: مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب، محمد شکیل اسلام پوری، ڈاکٹر مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب إتباع رسم عثمان رضى الله عنه ومنع مخالفته... قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه، وهم زهاء إثنى عشر الفا. والإجماع حجة حسبما تقرر في أصول الفقه'' (نصوص جلد/ ۲۵۱، جواہر الفقہ: ۲/ ۸۷)۔

''ففى كتابته بالعجمى تصرف فى اللفظ المعجز الذى حصل التحدى به بما لم يرد. بل مما يوهم عدم الاعجاز بل الركاكة، لأن الألفاظ العجمية فيها تقديم المضاف إليه على المضاف، ونحو ذلك مما يخل بالنظم ويشوش الفهم'' (الفتاوى الكبير: ۱/ ۳۸)۔ (ماخوذ از مقالہ: مولانا روح الامین)۔

''أراد أن يكتب المصحف بالفارسية منع أشد المنع'' (المحيط البرهاني: ۱/ ۲۰۸)۔

''رسم القرآن سر من اسرار المشاهدة وكمال الرفعة وهو صادر من النبى صلى الله عليه وسلم وليس للصحابة ولا لغيرهم فى رسم القرآنى شعرة واحدة، و إنما هو توقيف من النبى صلى الله عليه وسلم وهو الذى أمرهم أن يكتبوه على الهيئة المعروفة بزيادة الألف ونقصانها و نحو ذلك للأسرار لاتهتدى إليها العقول إلا بالفتح الربانى وهو سر من الأسرار. خص الله به كتابه العزيز دون سائر الكتب السماوية. فكما أن نظم القرآن معجز. فرسمه معجز أيضًا'' (ابواسحاق ابراهيم تونسى مالكى. دليل الحيران على مورد الظمآن/ ۶۹)۔ (ماخوذ از مقالہ ڈاکٹر مفتی شاہجہان ندوی، مفتی جعفر ملی رحمانی، عبدالرب عبدالوہاب سعادتی)۔

دوسرا رجحان: غیر عربی رسم الخط میں کتابت جائز ہے:

غیر عربی رسم الخط قرآن کی کتابت کو تعلیمی، دعوتی اور تبلیغی ضرورت کے پیش نظر اس شرط کے ساتھ کہ غیر عربی رسم الخط کے ساتھ عربی والا مصحف عثمانی بھی ساتھ میں طبع ہو، جائز ہے۔

اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد موسیٰ القاسمی، مفتی عبداللہ کادی والا، قاضی محمد حسن ندوی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی جہانگیر حیدر قاسمی، مفتی عثمان بستوی گورینی، مولانا حسین احمد قاسمی، مولانا آزاد بیگ قاسمی اور مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی، یہ حضرات مطلق جواز کے قائل ہیں اور مفتی اشرف قاسمی گونڈوی جزوی طور پر اس کی اجازت دیتے ہیں۔ جبکہ مفتی اقبال احمد کانپوری نے اپنا ناجائز والا موقف تحریر کرنے کے بعد اس عنوان: ''رسم عثمانی کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کے خط میں متن قرآن شائع کرنا'' کے تحت حضرت مفتی سید نظام الدین صاحب کا پوری احتیاطی تدابیر کے ساتھ جواز کے رجحان والا فتویٰ نقل کیا ہے، البتہ اس پر کوئی رائے نہیں دی ہے۔

دلائل:

ان حضرات مجوزین نے بنیادی طور پر تعلیمی ضرورت کو پیش نظر رکھا ہے۔

-نیز متن قرآن کے ساتھ ترجمہ کے جواز پر قیاس کیا ہے (دیکھئے مقالہ: محمد حسن ندوی، مولانا محمد موسیٰ القاسمی)۔

-بعد میں قرآن کریم میں نقطے اور اعراب عجمیوں کی سہولت کے لئے لائے جانے پر قیاس۔

''ثم انتهى الأمر فى ذلك إلى الإباحة والاستحباب، أخرج ابن داؤد عن الحسن وابن سيرين أنهما قالا: لا بأس بنقط المصاحف، وأخرج عن ربيعة بن أبى عبدالرحمان أنه قال: لا بأس بشكله. وقال النووى: نقط المصحف وشكله مستحب، لأنه صيانة له من اللحن والتحريف'' (الاتقان فى علوم القرآن للسيوطى: ۲/ ۱۷۱)، (مولانا مفتی جہانگیر حیدر قاسمی)۔

مولانا مفتی محمد عثمان گورینی نے گنجائش کے ساتھ ساتھ اس کی وضاحت بھی کی ہے کہ اسے قرآن کا نام نہ دیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے: ''ہندی رسم الخط یا

انگریزی رسم الخط یا بنگلہ رسم الخط میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ، یا مثلاً ہندی رسم الخط یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف، تاکہ قرآن کریم کے ساتھ خلط ملط اور التباس نہ ہو، اور اس پر مفتی نظام الدین کے فتوی کا حوالہ دیا ہے (دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۴۲۸، مقالہ مفتی عثمان البستوی گورینی)۔

-''وسئل الإمام الشهاب الرملي هل تحرم كتابة القرآن العزيز بالقلم الهندي أو غيره فأجاب بأنه لا يحرم، لأنها دلالة على لفظه العزيز وليس فيها تغيير له... وعبارة الاتقان للسيوطي: هل يحرم كتابته بقلم غير العربي، قال الزركشي لم أرى فيه كلاما لأحد من العلماء ويحتمل الجواز: لأنه قد يحسنه من يقرأه. والأقرب المنع والمعتمد الأول'' (حاشية الجمل على شرح المنهج للجمل: ۱/ ۱۲۲)۔

-''وأفتى شيخنا (الرملي) بجواز كتابة القرآن بالقلم الهندي وقياسه جوازه بنحو التركي ايضًا'' (حاشية البجيرمي: ۱/ ۳۷۴)، (مولانا عبید اللہ ابوبکر ندوی)۔

بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت:

سوال: بریل کوڈ جو نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی، جس میں قرآن کو لکھنا لازم قرار دیا گیا ہے، لیکن بریل کوڈ میں قرآن کی اشاعت سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہوجاتی ہے، وہ ہر قدم پر بینا افراد کے محتاج نہیں رہ جاتے، حفظ کرنے والے نابینا افراد اس کی مدد سے قرآن یاد کرسکتے ہیں، بھولنے کی صورت میں اس کی طرف مراجعت کرسکتے ہیں، براہ راست قرآن کا مطالعہ کرسکتے ہیں، سوال یہ ہے کہ بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کے باوجود کیا نابیناؤں کی مجبوری کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے؟

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم کیا اصل قرآن کی طرح ہے کہ اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے یا وضو کے بغیر بھی اسے چھوا جاسکتا ہے؟

اگر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے تو کیا اس کے کچھ مخصوص آداب واحکام ہیں؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگاران حضرات میں دو طرح کے رجحانات اور آراء پائے جاتے ہیں:

پہلا رجحان:

ان حضرات کے لئے بریل کوڈ جو پڑھنے میں بالکل قرآن ہی طرح ہوتا ہے اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ بریل کوڈ پر پڑھنے والے نابینا حضرات اسی طرح مجود اور ترتیل سے قرآن پڑھتے ہیں جس طرح بینا حضرات پڑھتے ہیں۔ اور قرآن جس طرح بینا حضرات کی بنیادی دینی ضرورت ہے اسی طرح نابینا حضرات کی بھی ہے، اور یہ ان حضرات کے لئے ایک اچھی اور مستحسن ایجاد ہے، اس لئے بریل کوڈ تیار کرنے کی گنجائش بھی ہے، جائز بھی ہے، بلکہ امر مستحسن ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بریل کوڈ کی تیاری میں رسم عثمانی کے اصول وضوابط اور رموز کا خیال رکھا گیا ہو، ورنہ نسخہ کا اختلاف بڑے اختلاف کا سبب بن سکتا ہے۔

یہ رائے مندرجہ ذیل ۴۸ حضرات علماء ومفتیان اور اہل علم کی ہے۔

ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، قاضی مزمل الدین ندوی، مولانا عبدالباسط فیاض قاسمی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا محمد شار عالم ندوی، مولانا عبید اللہ ابوبکر ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی شبیر یعقوب دیولوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی، مفتی صادق محمد پٹیل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی گورینی، مفتی اقبال احمد کانپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا مصطفی قاسمی آداپوری، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا حیدر علی قاسمی، محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی ڈاکٹر شاہ جہان ندوی، مولانا روح الامین، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، محمد اقبال قاسمی (شکر پور)، مولانا وحید الدین، مولانا محمد اعظم ندوی، مولانا محمد جہانگیر حیدر قاسمی، مولانا محمد موسی القاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا نعیم احمد ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا عبدالحکیم پالن پوری، مولانا مشبر مصطفی، مولانا طاہر حسین قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبدالعظیم ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی، مولانا عبدالعظیم ندوی، مولانا فضل الدلی کوثری، مولانا محمد شفیق قاسمی، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا محمد موسی القاسمی، مولانا عمر بن یوسف کونی، مولانا حسین احمد قاسمی، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی سعید الرحمن فاروقی۔

دلائل:

ان حضرات نے اس کے جواز کے لئے عام طور پر ضرورت کو بنیاد بنایا ہے، اور جس طرح ضرورت کے پیش نظر علماء نے ترجمہ قرآن کی اجازت دی ہے، اسی طرح اس کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔ یہ بات اکثر مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں تحریر کی ہے، اس لئے انسانوں کے ایک طبقہ کی ضرورت اور دین وقرآن سیکھنے کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس کی گنجائش ہو۔ اور اس کے لئے احادیث اور ان قواعد وعبارات کا سہارا لیا ہے:

"وما جعل عليكم في الدين من حرج"۔ (سورہ حج: ۷۸)۔

"يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)۔

"طلب العلم فريضة على كل مسلم" (متفق علیہ)۔

"الدين يسر" (بخاری ۱/۱۰۔ سنن نسائی، حدیث: ۵۰۳۴)۔

"من سن سنة حسنة له أجرها وأجر من عمل بها" (حدیث)۔

"ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن" (حدیث) (مفتی اقبال احمد کانپور)۔

"الضرورات تبيح المحظورات" (الاشباہ والنظائر)۔

"المشقة تجلب التيسير" (الاشباہ والنظائر)۔

"وأما النقط فيجوز، لأنه ليس له صورة، فيتوهم لأجلها ما ليس بقرآن قرآنا. وإنما هي دلالات على هيئة المقروء، فلا يضر إثباتها لمن يحتاج إليها" (الاتقان ۱/ ۳۷۷)، (ماخوذ از مقالہ مفتی شاہد قاسمی)۔

۱۰الحرج مدفوع" (الاشباہ)۔

۱۱"الحاجة تنزل منزلة الضرورة" (الاشباہ)۔

"ولأن النقطة ليست بمقروء، فيتوهم لأجلها ما ليس بقرآن قرآنا. وإنما هي دلالات على هيئة القرآن، فلا يضر إثباتها لمن يحتاج إليها. والله اعلم" (شعب الایمان دار الکتب العلمیۃ ۲/ ۵۴۸، حدیث: ۲۶۷۷)۔ (مقالہ مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

دوسرا رجحان بریل کوڈ کے عدم جواز کا:

بریل کوڈ کے سلسلہ میں دوسرا رجحان عدم جواز کا ہے عدم جواز کا رجحان رکھنے والے حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ رسم عثمانی کے خلاف قرآن مجید کی کتابت کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جانا اجماع امت اور امت کے موروثی طریقے کے خلاف ہے، اور اس میں رسم عثمانی کے جملہ قرآنی رموز واوقاف اور قرأت سبعہ کی رعایت بھی ممکن نہیں ہے، جو بجائے خود ایک تحریف کی شکل ہے، اس لئے بریل کوڈ ناجائز ہے، اور نابینا حضرات کو اسی طرح اساتذہ کی مدد سے قرآن پڑھنا اور سیکھنا چاہئے جس طرح اب تک ہوتا چلا آ رہا ہے، یہ رجحان مندرجہ ذیل حضرات کا ہے:

مفتی اخلاق حسین قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ندیم احمد انصاری، مولانا اسرار احمد آبادی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا اسماعیل لاجپوری، مولانا محمد فاروق اعظم، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا یوسف علی آسام، مفتی محمد سلمان پالنپوری، مولانا عبدالباسط پالن پوری، مفتی جنید بن محمد فلاحی، مفتی محمد ارشاد پالن پوری، مفتی حنیف صاحب، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا عبیداللہ ندوی، مولانا اویس بن صالح بنگ، مفتی عبدالمنان (آسام)، مفتی عبدالرحیم حسنی کشمیری، مولانا سعید احمد ندوی، اور مولانا عبدالشکور قاسمی۔

دلائل:

"قل فيهما إثم كبير ومنافع للناس إثمهما أكبر من نفعهما" (سورہ بقرہ: ۲۱۹)۔

"عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين من بعدي عضوا عليها بالنواجذ" (ابن ماجہ حدیث: ۴۲، ۴۳)۔

"يقول الإمام العالم المصري الشيخ محمد بن علي الحداد في رسالته "خلاصة النصوص الجلية": أجمع

المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمانی ومنع مخالفته، ثم قال: قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عامة وهو زهاء اثنی عشر ألفًا والإجماع حجة حسبما تقرر فی أصول الفقه (النصوص الجلیة/۲۵)۔

''وقال البیهقی فی شعب الایمان: من یکتب مصحفا، فینبغی أن یحافظ علی الهجاء الذی کتبوا به تلك المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئًا، فإنهم کانوا أکثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة. فلاینبغی أن نظن بأنفسنا إستدراکا علیهم'' (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۲/۱۶۷)۔

''ثم قال العلامة الحداد: ثبت بما ذکر من النقول الصحیحة والنصوص الصریحة أنه انعقد إجماع سائر الأمة من الصحابة وغیرهم علی تلك الرسوم وأنه لایجوز بحال من الأحوال العدول عن کتابة القرآن الکریم ولانسرع بصورة تخالف رسوم المصاحف العثمانیة'' (رسالہ النصوص الجلیلة: ۲۵)۔

''وفی هٰذا ما فیه من الخطر، درأ المفاسد أولی من جلب المصالح. وبناء علی هذه الأسباب اتخذ المجلس القرار التالی: یری هیئة کبار العلماء: أن یبقی رسم المصحف علی ما کان بالرسم العثمانی. ولا ینبغی تغییره لیوافق قواعد الإملا الحدیثة محافظة عن کتاب الله من التحریف واتباعا لما کان علیه الصحابة وأئمة المسلمین''۔

''أن کتابة القرآن العظیم بالأحرف اللاتینیة أمر خطیر بالغ الخطورة وهو غیر جائز. لأن الأحرف العربیة لایوجد کثیر منها باللاتینیة وهو تحریف للقرآن وتغییر له عن العربیة المنزل بها'' (مجلس الاقراء کا فیصلہ)۔

''ولایجوز کتابة القرآن الکریم (المصحف) بغیر اللغة العربیة وبغیر الرسم العثمانی حتی ولو کان بقصد تیسیر قرأة القرآن الکریم لغیر العرب أو للمسلمین الجدد لما یترتب علی ذلك من تحریف للقرآن الکریم وتبدیل بعض الحروف، لأنه کتب بالرسم العثمانی الذی یستوعب القرأت السبع کلها سدا للذرائع وصیانة للقرآن الکریم من محاولات التغییر والتبدیل التی یحرص علیها أعداء الإسلام'' (ہیئۃ عامہ کا فیصلہ)۔

''أن علماء السلف الصالح لایجیزون کتابة نص القرآن الکریم بغیر العربیة: وهٰذا هو مسلك الأمة کما هو معلوم أن الأمة الإسلامیة تتعرض لفتن ومخاطر کثیرة فی هٰذا العصر علی أید الإعداء'' (جمعیۃ علما ہند کا فیصلہ)۔

''وبذلك أجمع علماء الإسلام سلفا وخلفا علی أن کل تصرف فی القرآن الکریم یؤدی إلی تحریف لفظه أو تغییر فی معناه ممنوع منعا باتا ومحرم تحریما قاطعًا''(دارالإفتاء عمان کا فیصلہ)۔

''أن فکرة کتابة القرآن الکریم بالأحرف اللاتینیة فکرة هدامة یجب محاربتها بکل الوسائل علی علماء الأمة الإسلامیة وعلماء القرارات لم یجیزوا کتابته إلا بالرسم به فی زمن الخلیفة الثالث سیدنا عثمان رضی الله عنه وحافظوا علی هٰذا الرسم حتی وصلت بطریق التواتر والآیات القرآنیة مشابدة علی ذلك'' (وزار أوقاف إداره جامع بنی أمیة شام)۔

-اس کے علاوہ علماء ہند واکابر کے فتاوی، مثلاً مفتی محمود صاحب وغیرہ کے فتاوی بھی پیش کئے گئے ہیں۔

متفرق خیالات:

مولانا عبیداللہ ندوی صاحب کی رائے یہ ہے کہ اس سلسلہ میں فیصلے کے لئے کافی غور وخوض کرلیا جائے۔

مزید وہ لکھتے ہیں:

۱- امت نے کتابت قرآن کے لئے رسم عثمانی کی شکل میں جو معیار متعین کیا ہے اس کے خلاف ہے۔

۲- دیگر امور میں یہ پیش رفت یقیناً قابل قدر ہے مگر قرآن شریف میں مناسب معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ نابینوں کا یہ مسئلہ نیا نہیں بلکہ پرانا ہے، اور صدر اول سے لے کر آج تک لاکھوں نابینا حفاظ ہوئے ہیں جبکہ بریل کا وجود بھی نہیں ہوا تھا، میرے خیال میں اس پہلے طریقۂ حفظ کا نہ کوئی بدل ہے اور نہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش ہے۔

۳- بریل کوڈ کا معاملہ بڑا نازک اور سنگین ہے، ذرا سی چوک سے کچھ کا کچھ ہوسکتا ہے، ایک واحد زائد نقطہ یا کسی نقطہ کی کمی لفظ کے معنی ومفہوم تبدیل کردیتی ہے۔

۴- مختلف بریل میں پاروں کی تقسیم میں اختلاف ہے، مثلاً عرب بریل قرآن میں ساتواں پارہ "اذا سمعوا" کے بجائے "لتجدن أشد الناس" (سورۂ مائدہ: ۸۲) سے شروع ہوتا ہے جو صحیح نہیں۔ اور مصحف عثمانی کے خلاف ہے۔

۵- بریل کوڈ میں مکتوب قرآن نقطوں پر مبنی ہے حالانکہ قرآن کریم کے الفاظ معجزہ ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو تحدی کی تھی، نیز بریل قرآن کو قرآن کہنا بھی درست ہے یا نہیں؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔

۶- بریل علامت تلفظ کی نمائندگی کرتی ہے نہ کہ رسم الخط کی، اور بریل میں حروف کے تلفظ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، حروف کے رسم الخط کو نہیں، جبکہ قرآن کے لئے تلفظ اور رسم الخط دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔

۷- بریل کے سلسلہ میں ابھی تک کوئی متفقہ رائے نہیں پائی جاتی ہے مختلف ممالک کے مختلف انداز ہیں۔

۸- عربی دائیں طرف سے لکھی اور پڑھی جاتی ہے جبکہ بریل قرآن میں دونوں کام الٹی سمت سے ہوتے ہیں جو خلاف حدیث "إن اللہ یحب التیامن فی کل شئی حتی التنعل والترجل" (نصب الرایۃ ۱/ ۳۴، بخاری کتاب الصلاۃ، باب التیمن فی دخول المسجد وغیرہ رقم: ۴۲۶) کے خلاف ہے۔

۹- عربی بریل کے طرز تحریر میں باہم کافی فرق پایا جاتا ہے حتی کہ قرآن میں لفظ "اللہ" لکھنے میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔

۱۰- بریل میں اگر ہم الف کی آواز کے بدلے میں عثمانی رسم الخط کے ضابطہ کے مطابق واو لکھیں تو یہ الفاظ نابینا قاری کے ذریعہ غلط تلفظ کے ساتھ ادا ہوں گے، اس سے بچنے کے لئے "الصلوۃ"، "الزکوۃ" وغیرہ الفاظ الف کے ساتھ "الصلاۃ"، "الزکاۃ" لکھے جاتے ہیں، جو رسم عثمانی کے خلاف ہیں۔

۱۱- اور آخری بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے سے کوئی نعمت سلب کرتے ہیں تو اس کا بدل ضرور عطا فرماتے ہیں، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ نابینا افراد کا حافظہ عموماً تیز ہوتا ہے، جو چیز ایک بار یاد کرلی وہ محفوظ ہوجاتی ہے، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ وہی پرانا طریقہ ہی ان کے حفظ کے لئے باقی رکھا جائے تاکہ قرآن محفوظ رہے، اور تحریف کا دروازہ نہ کھلے۔

نیز جن افراد یا اداروں نے اس کے جواز کا فتوی دیا ہے ان کی تحریریں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات بھی اس معاملہ میں ابھی مکمل بصیرت حاصل نہیں کرسکے ہیں، ایسے میں کوئی فیصلہ لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔ (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

جبکہ مولانا ندیم احمد انصاری فرماتے ہیں کہ بریل کوڈ کی بجائے رسم عثمانی کو ہی بڑے حروف میں لکھا جائے اور نابینا حضرات جس طرح کاغذ کے نوٹوں کو چھو کر اندازہ لگالیتے ہیں، اسی طرح ان کے لئے بڑے حروف کا پڑھنا آسان ہوگا۔ مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محمد موسیٰ قاسمی اور مفتی روح اللہ صاحب کہتے ہیں کہ بریل کوڈ کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ دونوں ایک ساتھ طبع کیا جائے، احتیاط اسی میں ہے، مفتی عبدالباسط قاسمی (تھانے ممبئی) کہتے ہیں کہ یہ اسی صورت میں درست ہے جب کوئی استاذ نابینا حضرات کو پہلے مجود پڑھانے کا اہتمام کرے۔

۷- بریل کوڈ کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو:

اس سوال کے جواب میں بھی وضو کے وجوب اور عدم وجوب کی بابت دونوں طرح کی رائے مقالہ نگاران میں پائی جاتی ہے۔

وجوب:

بریل کوڈ ہاتھ لگانے کے لئے ۳۶ رحضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ بریل کوڈ بھی نابینا حضرات کے لئے قرآن ہی کے حکم میں ہے، اس لئے وضو

ضروری ہے، انہیں میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ وضو ضروری تو نہیں ہے، تاہم قرآن یا قرآن کی نسبت کا تقاضا ہے کہ احتراماً وضو کرلیا جائے اور قرآنی آداب ہی ملحوظ رکھے جائیں۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا عبدالباسط فیاض قاسمی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مفتی لطیف الرحمن، مفتی شبیر یعقوب دیولوی، مولانا نثار عالم ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبدالرب عبدالوہاب، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا سعید قمرالدین محمود بڑودوی، مفتی صادق محمد پٹیل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی محمد حذیفہ داحودی، مفتی اخلاق حسین قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا اسماعیل لاجپوری، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا یوسف علی آسام، مفتی سلمان پالن پوری، مفتی حنیف، قاضی محمد ریاض ارمان، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عبدالرحیم حسنی کشمیری، محمد اقبال قاسمی (شکرپور) مولانا وحید الدین، مولانا محمد اعظم ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا عبدالحکیم پالن پوری، شبیر مصطفی، مولانا طاہر حسین، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبدالعظیم ندوی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا منصف بدایونی، مولانا مصطفی قاسمی آواپوری، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم حسنی کشمیری، مولانا روح الامین، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی عبدالباسط قاسمی (تھانے، ممبئی)، مفتی سعید الرحمن فاروقی۔

دلائل:

اس میں دلائل وہی ذکر کئے گئے ہیں جو ماقبل میں بلا متن ترجمہ کی اشاعت والے سوال کے جواب میں محض ترجمہ قرآن کو ہاتھ لگانے کے ضمن میں آچکے ہیں، اس لئے تکرار سے بچتے ہوئے یہاں ان کو حذف کیا جاتا ہے۔

عدم وجوب:

اس سلسلہ میں وہ حضرات علماء جو بریل کوڈ کو پڑھنے اور ہاتھ لگانے کے لئے وضو کو لازم قرار نہیں دیتے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مولانا عبداللہ ابوبکر ندوی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا حسین احمد قاسمی، مولانا محمد صادق مبارک پوری، مولانا حیدر علی قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا نعیم احمد ندوی، مولانا محمد موسی قاسمی، مولنا عبدالعظیم ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا فضل الدین مولانا محمد شفیق قاسمی۔

اور مولانا مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالباسط پالن پوری، مفتی جنید بن محمد پالن پوری، مفتی ارشاد پالن پوری، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا جہانگیر حیدر قاسمی، مولانا اویس بن صالح، مولانا اسرار احمد آبادی وغیرہم نے بریل کوڈ کو چھونے اور پڑھنے کے معاملہ میں وضو کے مسئلہ سے تعرض نہیں کیا ہے۔

جبکہ ڈاکٹر مفتی شاہ جہان ندوی نے بریل کوڈ تیار کرنے والے کو باوضو اور مسلمان ہونا واجب قرار دیا ہے، اور مولانا ندیم احمد انصاری بریل کوڈ کو ہاتھ لگانے سے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب بریل کوڈ تیار کرنا ہی درست نہیں تو پھر وضو کا سوال ہی لاحاصل ہے (دیکھئے موصوف کا تفصیلی مقالہ)۔

تاہم یہ واضح رہے کہ وضو کے وجوب اور عدم وجوب کی یہ بحث نابینا حضرات کے لئے نہیں ہے، نابینا حضرات کے حق میں چونکہ بریل کوڈ کی حیثیت قرآن ہی کی ہے، اس لئے ان کو بریل کوڈ پر ہاتھ لگانے کے لئے وضو ضروری ہوگا۔

مفتی سعید الرحمن فاروقی کہتے ہیں کہ بریل کوڈ کوئی مستقل رسم الخط نہیں ہے، بلکہ مستقل تک پہونچنے کا ذریعہ و وسیلہ ہے اور مجازاً اس پر رسم الخط کا اطلاق ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

دلائل:

عدم وجوب کے قائلین چونکہ بریل کوڈ کو مصحف کے قائم مقام تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اس کو محض رموز اور نقطہ کی حیثیت مانتے ہیں، اس لئے وضو کو ضروری قرار نہیں دیتے۔

موبائل اسکرین پر قرآن مجید:

سوال: موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہوتو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، کیا موبائل کو غلاف تصور کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران میں دو طرح کی رائے پائی جاتی ہے۔

پہلی رائے:

اگر موبائل کے اندر قرآن کریم میموری یا سم میں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شکل تہہ در تہہ کی ہے، اس لئے موبائل کے اندر ہوتے ہوئے موبائل کو چھونا اور ہر جگہ لے جانا جائز ہے، اس کے لئے طہارت اور وضو ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ میموری اور سم کے اندر جب کوئی چیز ہوتی ہے تو خود میموزی کا کور ایک غلاف ہوتا ہے، اس کے بعد موبائل کے اندر جس ہارڈویئر میں چپس لگایا جاتا ہے، وہ دوسرا غلاف ہوتا ہے، اور اس کے اوپر موبائل کی باڈی جو پلاسٹک کی ہوتی ہے وہ الگ تیسرا غلاف اور اب تو اس کے اوپر بھی کور آتا ہے یہ چوتھا غلاف۔ اور میموری اور سم وہ چیز ہے جسے جب چاہا جائے موبائل سے نکالا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ خود میموری جس میں قرآن کو ڈاؤن لوڈ کیا گیا ہے موبائل سے نکال کر اگر ہاتھ میں لیا جائے تو اس کے لئے بھی وضو اور طہارت کی ضرورت نہیں ہے، چہ جائیکہ موبائل کو ہاتھ میں لینے کے لئے۔ اور اگر موبائل کو آن کیا جائے اور اسکرین پر قرآنی آیات موجود ہوں تو اس کو چھونے کے لئے وضو اور طہارت ضروری ہے۔ اس رائے کو مندرجہ ذیل زیادہ تر حضرات علماء نے اختیار کیا ہے:

مفتی جعفر ملی رحمانی، عبید اللہ ندوی، مفتی حنیف، مفتی جمیل احمد نذیری، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی عبد اللہ کاوی والا، مفتی جنید بن محمد، مفتی محمد سلمان پالن پوری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا یوسف علی آسام، مولانا عبد الباسط پالن پوری، مولانا اویس بن صالح بنگ، مولانا مشبر مصطفی، عبد الحکیم پالن پوری، مفتی لطیف الرحمن، مفتی شبیر یعقوب دیولوی، مولانا روح الامین، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبد اللہ ابوبکر ندوی، مفتی حذیفہ داحودی، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا ندیم احمد انصاری، مولانا عبد الرب عبد الوہاب، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی، مفتی صادق محمد پٹیل، ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبد العظیم ندوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مولانا اسرار احمد آبادی، مفتی عبد الرحیم حسنی کشمیری، مفتی جہان گیر حیدر قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی آواپوری، مفتی محمد عثمان گورینی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ڈاکٹر شاہ جہان ندوی، مفتی شاہد قاسمی مدھوبنی، مولانا اسماعیل لاجپوری، مولانا عبد الرشید نعمانی، مولانا محمد اقبال قاسمی (شکر پور) مولانا محمد اعظم ندوی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا حسین احمد قاسمی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا محمد مصطفی عبد القدوس ندوی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی عبد اللہ کاوی والا، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی عبد الباسط قاسمی (تھانے، ممبئی)۔

دلائل:

ان حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں وہی دلائل پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر قرآن کریم کو بغیر طہارت اور حالت حدث میں بے بغیر وضو چھونے کو فقہاء نے منع کیا ہے، ان تمام دلائل اور فقہی عبارتوں کا نقل کرنا یہاں تحصیل حاصل ہے، اس سے پہلے سوال نمبر ۱ کے ضمن میں سب نقل کئے جاچکے ہیں، حسب ضرورت وہاں دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً:

-"إنه لقرآن كريم، في كتاب مكنون لا يمسه إلا المطهرون" (سورہ واقعہ: ۷۷، ۷۸، ۷۹)۔

"لا يمسه إلا الطاهر" (حدیث)۔ وغیرہ

-اور فقہاء کی عبارتیں:

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ موبائل کی باڈی تو غلاف متجاف کے حکم میں ہے ہی اسکرین خود غلاف کے حکم میں ہے، اس لئے اگر اسکرین پر بھی

قرآنی آیات نمایاں ہوں تو اس موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین کو ہاتھ لگانے اور ورق پلٹنے کے لئے وضو اور طہارت ضروری نہیں ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا فضل الدین، مولانا شفیق قاسمی، مولانا نعیم احمد ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مولانا ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا عبدالباسط فیاض قاسمی، مولانا مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالعظیم ندوی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا طاہر حسین قاسمی، مولانا وحیدالدین، مفتی سعیدالرحمن فاروقی۔

وضو کو لازم قرار نہ دینے والوں میں مفتی اقبال احمد قاسمی، عبدالباسط فیاض قاسمی ڈاکٹر مبین سلیم، اور عبدالعظیم ندوی کی رائے یہ ہے کہ صرف ادب کا تقاضا ہے کہ اسکرین کو چھونے کے لئے وضو کر لے۔ جبکہ مفتی نذیر احمد کشمیری اور قاضی ذکاء اللہ شبلی نے اس بارے میں کوئی رائے نہیں دی ہے اور اس سوال کے جواب سے خاموشی اختیار کی ہے۔

دلائل:

ان حضرات نے موبائل اور اس کے اسکرین کو ایسا غلاف تصور کیا ہے جس کی وجہ سے اسکرین پر ہاتھ لگانے سے الفاظ قرآنی یا آیات پر انگلی مس نہیں ہوتی ہے، اس لئے وضو اور طہارت کی ضرورت نہیں، نیز یہ کہ وضو کی قید لگانے میں حرج ہے اور قاعدہ ہے: الحرج مدفوع (مولانا نعیم احمد ندوی، کیرالا)۔

متفرق مشورے:

-مولانا جنید بن محمد کہتے ہیں کہ موبائل کے اوپر اگر کور ہے جو موبائل کی حفاظت کے لئے لگایا جاتا ہے تو اس کو ہاتھ میں لینے کے لئے وضو ضروری نہیں ہے، کیونکہ وہ جزء دان کی طرح ہے، جب چاہیں اسے جدا کر سکتے ہیں (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

-مولانا عبدالعظیم قاسمی (مئو) کہتے ہیں کہ وہ موبائل میں لگی ہوئی چپس جس میں قرآن اور حدیث وغیرہ محفوظ ہوں، آن کرنے کے بعد قرآن وحدیث کے حروف نظر آتے ہیں موبائل کو ہاتھ میں لیکر بغیر وضو تلاوت کرنا درست اور صحیح ہے، چپس کے اندر ابھرنے والے حروف اور نقوش انتہائی اندرونی خانہ میں ہوتے ہیں، لہٰذا اوپر کا حصہ غلاف کے مانند ہوگا، نیز اس سے اور بھی مسائل تخریج کئے جا سکتے ہیں" (موصوف کا مقالہ)۔

-موبائل ایک مشنری شی ہے جس میں آواز، حروف اور رسم الخط وغیرہ محفوظ کر سکتے ہیں، یہ بعینہ قرآن نہیں ہے اور نہ ہی قرآن کے حکم میں ہے، لہٰذا اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے وضو ضروری نہیں، بلکہ موبائل کے ڈھانچے کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بغیر وضو چھونے کی گنجائش ہے، جیسا کہ شرح وقایہ میں ہے:

ولا یمس ہولاء أی الحائض والجنب والنفساء والمحدث مصحفا إلا بغلاف متجاف عنہ" (شرح وقایہ ۱/۱۱۲)۔

"لایمنع إلا مس المکتوب" (البحر الرائق: ۱/ ۲۰۱)۔ (دیکھئے مقالہ موصوف)۔

-مولانا احسن عبدالحق ندوی اپنے مقالہ میں موبائل کے تعلق سے نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موبائل فون صرف بات کرنے کا ایک آلہ نہیں، بلکہ بیک وقت فون بھی ہے، کیمرہ، ریڈیو، ایف ایم، انٹرنٹ سسٹم، ٹی وی، ڈائری، گھڑی، آلارم، ریمائنڈر، کیلکولیٹر، ٹیپ ریکارڈر، گیم، مراسلت، نیز انسانی طبائع کو جس چیز سے دلچسپی ہو اس کا سامان ایک چھوٹے سے موبائل میں فراہم ہے، زنا، شراب، نغمہ ورقص، عیش ونشاط، ٹیلی وژن ڈش انٹینا، ٹی وی، وی سی آر، آڈیو کمپیوٹر اور انٹرنٹ کے شانہ بشانہ موبائل کی ہولناکیاں اور ہلاکت آفرینیاں اپنی منزل کو تجاوز کر چکی ہیں، اس لئے سنجیدہ فکر رکھنے والوں کو موبائل کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں کا سد باب کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ عوام اس کی برائیوں اور بیماریوں سے اپنی حفاظت کر سکیں"۔ (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

مولانا عبدالباسط فیاض قاسمی کہتے ہیں کہ موبائل کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں:

الف: ایک یہ کہ جس اسکرین کو ہم چھوتے ہیں قرآن دراصل اس پر نہیں لکھا ہوتا ہے، بلکہ اس کے نیچے شیشے کی ایک دوسری پلیٹ ہوتی ہے جو میموری سے

اخذ کر کے قرآن کا صرف عکس دکھاتا ہے اس پر نہ تو حروف منقش ہوتے ہیں اور نہ الفاظ۔

ب: موبائل کی ظاہری اسکرین اور نیچے کی وہ پلیٹ جس پر قرآن کا عکس نظر آتا ہے یہ دو علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں اور ساتھ ہی ان میں حقیقی اتحاد اور اتصال بھی نہیں ہے۔اس صورت میں نہ قرآن کی عبارت کو چھونا لازم آئے گا اور نہ ہی بالذات اس شیشے کو اسکرین کے حائل ہونے کی وجہ سے۔

دلائل:

موبائل اسکرین کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو ضروری نہیں ہے اس کے مختلف دلائل ووجوہ بیان کئے ہیں:

-موبائل کا ڈھانچہ خود غلاف ہے، خواہ اسکرین کھلا ہوا ہو یا بند ہو (مفتی عبدالسنان آسام)۔

-اسکرین پر جو حروف ابھرتے ہیں، وہ اسکرین کے اوپر نہیں، بلکہ اسکرین کے نیچے ہوتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسکرین پر ہے (مفتی اقبال احمد قاسمی کانپور)۔

-موبائل میں جو صفحہ کھلتا ہے وہ اس تختی کے مانند ہے جس پر قرآن کی چند آیتیں لکھ دی گئی ہوں، لہٰذا اوپر والی اسکرین کا اگرچہ غیر منفصل طریقہ پر اتصال ہے، لیکن چونکہ وہ غیر مکتوب حصہ ہے، اس لئے اسے چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔احتیاط اور افضلیت الگ چیز ہے (عبدالباسط فیاض قاسمی)۔

-موبائل کا ڈھانچہ، موبائل میں جڑا ہونے کے باوجود غلاف منفصل کے حکم میں ہی ہوگا (محمد اشرف قاسمی گونڈوی)۔

-الکٹرونک مصحف مکمل طور پر ہر اعتبار سے اصل مصحف کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے آلہ اور مشین کو خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو (موبائل، کمپیوٹر، ہارڈ ویئر وغیرہ) اس میں اصل مصحف کی طرح اس میں مکتوب الفاظ، حروف اور رسوم کو بغیر کسی حائل کے ڈائریکٹ چھونا ممکن نہیں، چونکہ اسکرین پر جو قرآنی کلمات وحروف نظر آتے ہیں وہ تو صرف الکٹرونک وائبریشن اور حرکات ہوتے ہیں...... اس لئے شیشہ یا کسی اور دھات سے تیار اسکرین کو چھونا مصحف کے چھونے کے حکم میں نہیں۔(باوضو رہیں تو افضل ہے) (ڈاکٹر مبین سلیم ازہری ندوی)۔

-اسکرین خود مانند غلاف ہے (مولانا نعیم احمد ندوی)۔

-موبائل ایک بند غلاف ہے، ابھرے ہوئے نقوش مستقل صنعت کا نتیجہ ہے وہ مصحف اور قرآن کریم کی طرح مستقل نہیں ہے، بلکہ تابع اور بسا اوقات تابع در تابع ہیں، لہٰذا اس کے لئے طہارت کی شرط نہیں ہے (مفتی سعید الرحمن فاروقی ممبئی)۔



عرض مسئلہ:

قرآن مجید کے متن و ترجمہ کی کتابت و اشاعت سے متعلق بعض مسائل

ڈاکٹر و مفتی محمد شاد جہاں ندوی

اسلامک فقہ اکیڈمی کے چوبیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع: ”قرآن مجید کے متن و ترجمہ کی کتابت و اشاعت سے متعلق بعض مسائل“ ہے۔ اکیڈمی نے اس موضوع پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری راقم پر ڈالی ہے۔ چنانچہ اکیڈمی کے توسط سے اس موضوع پر احقر کو کل ۷۷ مقالات دستیاب ہوئے۔ مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی طوالت کی وجہ سے ترک کر رہا ہوں۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ ہے کہ ”کیا کسی زبان میں متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست ہے“؟ اگر یہ ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر یہ اشاعت درست ہے۔ تو بے وضو اسے چھونے کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کی تین شقیں ہیں۔

شق نمبر (۱):

یہ ہے کہ ”کیا کسی زبان میں متن قران کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست ہے“؟

اس شق کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز اور حرام ہے۔ اس رائے کے دلائل درج ذیل ہیں۔

۱) اللہ تعالے کا ارشاد ہے: "بلسان عربی مبین" [۲۶/الشعراء:۱۹۵] یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ قرآن وہی ہے جو عربی الفاظ کے ساتھ ہو۔ (مقالہ: مولانا ندیم احمد انصاری)۔

۲) اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے کیوں کہ بغیر متن کے محض ترجمہ شائع کرنا ان ہی کا وطیرہ ہے۔ اور خاص طور سے امر دینی میں ان کے ساتھ تشبہ شنیع اور مذموم ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" [سورۃ ھود: ۱۱۳] اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”من تشبه بقوم فهو منهم“ [سنن أبي داؤد حديث نمبر: ۴۰۳۱]

۳) توارث امت کی مخالفت ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم عجمی ممالک میں چودہ سو سال پہلے پہنچا۔ اور تاریخ میں یہ کہیں ثابت نہیں کہ صحابہؓ اور تابعینؒ نے نو مسلموں کی مشکلات کی وجہ سے محض ترجمہ شائع کیا ہو۔ (مقالہ: مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد شکیل اسلام پوری)

۴) اس طرح کا ترجمہ ہی عربی نہ جاننے والوں کیلئے اصل قرآن کا درجہ حاصل کر لیگا۔ اور وہ اصل قرآن سے بے تعلق ہو جائیں گے۔ اور اصل قرآن سے دور ہونا سنگین نتائج کا حامل ہے۔ اور خدشہ ہے کہ اس طرح کا قرآن شائع کرنے والے وعید الہی کے حقدار بن جائیں۔ جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

"وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" [سورۃ الفرقان:۳۰] (مقالہ: راقم الحروف و محبوب فروغ احمد قاسمی)

۵) ہر مترجم اپنے لحاظ سے ترجمہ کریگا جسکا نتیجہ ہوگا کہ اختلاف پایا جائیگا۔ اور متن سامنے نہیں ہوگا تو ترجمہ کی تصحیح نہیں ہو پائیگی۔ (مقالہ: محبوب فروغ احمد قاسمی)

۶) اہل کتاب بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط میں آپ ﷺ نے قرآنی آیات تحریر کرائے۔ (دیکھئے: صحیح البخاری حدیث نمبر۔ ۲۹۴۱)

اگر تنہا ترجمہ درست ہوتا تو نبی ﷺ ترجمہ لکھوا دیتے۔ اس لئے کہ ترجمہ کے ماہرین آپ ﷺ کے پاس موجود تھے۔ چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

''وأصبح كل رجل منهم يتكلم بلسان القوم الذين بعثه اليهم'' (ابن سعد، الطبقات الكبرى ۱/ ۱۹۸)۔

۷) اگر متن قرآن کے بغیر ترجمہ قرآن کی اشاعت کی گئی تو انگریزی قرآن، اردو قرآن، اور مختلف زبانوں کے قرآن کے وجود میں آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہوجائے گی۔

۸) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من قرأ حرفا من كتاب الله فله حسنة، و الحسنة بعشر أمثالها. لا أقول الم حرف، ولكن الف حرف، ولام حرف، وميم حرف'' (سنن الترمذی: حدیث نمبر ۲۹۱۰، اور اسکی سند صحیح ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ اصل قرآن کے پڑھنے میں بڑا ثواب ہے، چنانچہ اگر متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کی جائے تو اصل قرآن کو پڑھ کر ثواب حاصل کرنے کی کوشش ہی ناپید ہوجائے گی۔ اور اسطرح اصل قرآن سے توجہ ہی ہٹ جائے گی (مقالہ: راقم الحروف)۔

۹) قدیم ومعاصر فقہاء کے اقوال سے استئناس!

قدیم ومعاصر فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست نہیں ہے چنانچہ 'الکافی' کے حوالے سے ابن الہمام لکھتے ہیں: ''أراد أن يكتب مصحفا بها أي بالفارسية، يمنع، وان فعل في آية أو آيتين لا فان كتب القرآن و تفسير كل حرف و ترجمته جاز (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۱/ ۲۸۶) (مقالہ: محبوب فروغ احمد قاسمی، وراقم الحروف)

اور علامہ حسن شرنبلالیؒ نے ''النفحة القدسية في احكام قراءة القرآن و كتابته بالفارسية'' نامی رسالہ میں اسطرح کے ترجمے کی ممانعت پر مذاہب اربعہ کی تصریحات نقل کی ہیں (مقالہ: محمد حذیفہ داحودی)، اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے دس وجوہ سے اس طرح کے ترجمہ کو ممنوع قرار دیا ہے (مقالہ: محبوب فروغ احمد قاسمی)، اور حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے اس طرح کے ترجمے کی ممانعت پر 'جواهر الفقه' میں مستقل مقالہ لکھا ہے۔

دوسری رائے:

دوسری رائے مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی شافعی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، ڈاکٹر مبین سلیم ازہری ندوی، اور مولانا اعظم ندوی کی ہے۔ کہ بغیر متن قرآن کے تنہا ترجمہ دعوتی نقطۂ نظر اور قرآن کی حرمت کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے شائع کرنا جائز ہے۔ ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱) اس میں مصارف کم آتے ہیں۔

۲) غیر مسلموں میں دعوت اور قرآن کے پیغام کو عام کرنے کیلئے یہ ایک موثر ذریعہ ہے۔

۳) نفس ترجمہ کی اشاعت کی صورت میں اس کی حیثیت قرآن کی نہیں رہتی۔ لھذا کافر کے ہاتھ اسکی خرید وفروخت اور ھبہ کرنے میں کوئی شرعی ممانعت باقی نہیں رہے گی۔

۴) متن قرآن کے بغیر نفس ترجمہ کی اشاعت کی صورت میں اسکی بے حرمتی کے مسئلے میں اتنی شدت باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کہ اسکی حیثیت ایک دینی کتاب کی باقی رہ جائے گی (مقالہ: مولانا عبیداللہ شافعی)۔

ترجیح:

جمہور علمائے امت کا مسلک راجح ہے اسلئے کہ کفار فرعی احکام کے مخاطب نہیں ہیں۔ جیسا کہ علامہ ''کاسانی'' رقمطراز ہیں:

''الكفار غير مخاطبين بشرائع هي عبادات عندنا'' (بدائع الصنائع ۱/ ۳۴۶)، لہٰذا ان کے بے وضو قرآن کے چھونے میں بے حرمتی نہیں ہے۔ نیز غیر مسلم حضرات بھی مذہبی کتابوں کا احترام کرتے ہیں۔ اس لئے بے حرمتی کا اندیشہ بے بنیاد ہے۔

اور جہاں تک تنہا ترجمہ چھاپنے کی تائید میں مصارف کم آنے کی بات کا تعلق ہے تو مفتی جمیل احمد نذیری صاحب نے اسکا بہتر جواب دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: یہ حفاظت قرآنی کا معاملہ ہے اسمیں مصارف کے کم آنے یا زیادہ آنے کا کوئی اعتبار نہیں، سارے مسلمان اصل عربی قرآن کو شوق سے لیتے ہیں، انہیں

اسکا کوئی شکوہ نہیں ہوتا کہ اسکا ہدیہ کم ہے یا زیادہ؟ وہ صرف اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ کونسی جلد، سائز، کاغذ، اور چھپائی والے قرآن ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق ہیں۔ اور جہاں تک متن قرآن نہ پڑھ سکنے کی بات ہے۔ تو یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ کہ ایک مسلمان دنیوی فوائد کیلئے مختلف زبانیں مختصری مدت میں سیکھ لے اور اسلام کی رسمی اور سرکاری زبان عربی کو سیکھنے کی کوشش نہ کرے۔ اور رہا یہ امر کہ غیر مسلموں کیلئے تنہا ترجمہ کافی ہے۔ تو یہ نہایت کمزور بات ہے۔ اسلئے کہ اسلام کی اشاعت صحیح طریقے سے ہونی چاہیے خواہ اس پر مصارف زیادہ ہی کیوں نہ آتے ہوں۔

شق (۲):

اگر یہ اشاعت ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے، اور ہدیہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

اس شق کے جواب میں بھی زیادہ تر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز ہے اور اسے خریدنا، تقسیم کرنا، اور ہدیہ کرنا سب ناجائز اور حرام ہے۔ ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں۔

۱) اس میں اعانت علی المعصیت ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" سورۃ المائدۃ: ۲ (مقالہ: مولانا محمد شکیل اساپوری)۔

۲) علامہ شامی لکھتے ہیں: "ما کان سببا لمحظور فهو محظور" (رد المحتار ۵/ ۲۲۳، نعمانیہ)۔

۳) علامہ کاسانی لکھتے ہیں: "کل ما أدى إلى الحرام حرام" (بدائع الصنائع ۶/ ۴۸۸)۔

۴) قاعدہ فقہیہ ہے: "الإعانة على المحظور محظور" (جمهرة القواعد الفقهية ۲/ ۶۴۴)۔

۵) "إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما" (خادمی. المقاصد الشرعية ص/ ۴۶)
(مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

دوسری رائے:

دوسری رائے ان ہی حضرات کی ہے جو دعوتی نقطہ نظر سے تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز قرار دیتے ہیں، اور جب اشاعت جائز ہے تو اسے خریدنا، تقسیم کرنا، اور ہدیہ کرنا سب جائز ہے۔

شق (۳):

تیسری شق یہ ہے کہ بے متن والے ترجمہ کو بے وضو چھونے کا کیا حکم ہے؟

اس شق کے جواب میں اکثر مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ بے متن والے ترجمہ کو بلا وضو چھونا اور اٹھانا ناجائز اور مکروہ ہے، ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ عالمگیری میں ہے: "ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة. وكذا عندهما على الصحيح" (ہندیہ ۱/ ۳۹)۔

۲۔ علامہ نسفیؒ لکھتے ہیں: "القرآن قرآن إذا ترجم بغير العربية" (مدارك التنزيل ۲/ ۵۸۲)۔

۳۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ترجمہ کا چھونا بھی حسب تصریح فقہاء جائز نہیں ہے، لیکن عوام الناس اس کا لحاظ نہیں رکھ پائیں گے۔

دوسری رائے:

ترجمہ قرآن قرآن نہیں ہے، لہذا اس کے چھونے کے لئے وضو لازم نہیں ہے لیکن افضل ہے کہ وضو کرلے کہ وہ معانی قرآن کا ترجمہ ہے، یہ رائے مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا وحید الدین، مولانا اعظم ندوی، مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی، مفتی حبیب اللہ قاسمی مولانا عبدالعظیم قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، اور راقم الحروف کی ہے۔ ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- قرآن نظم و معنی دونوں کا نام ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''وهو إسم للمنزل باللفظ العربي...والاعجمی انما یسمی قرآنا مجازا)) وکذایصح نفی إسم القرآن عنه'' (رد المحتار، ۲/ ۱۸۳)۔

اور بزدوی لکھتے ہیں: ''وهو النظم والمعنى جميعا فى قول عامة العلماء وهو الصحيح من قول أبي حنيفة عندنا'' (کشف الاسرار ۱/ ۶۷)۔

۲- علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''والقرآن معجز. والإعجاز من حيث اللفظ يزول بزوال النظم العربي. فلا يكون الفارسي قرآنا لإنعدام الإعجاز. ولهذا لم تحرم قراءته على الجنب والحائض'' (بدائع الصنائع ۱/ ۱۱۲)۔

۳- وضو کو لازم قرار دینے والے حضرات نے جن فقہی جزئیات سے استدلال کیا ہے، ان کا تعلق ترجمہ قرآن سے نہیں بلکہ ان کا تعلق غیر عربی رسم الخط میں قرآن کے لکھے جانے سے ہے، جیسا کہ ''موسوعہ فقہیہ کویتیہ'' میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ غیر عربی داں کی سہولت کی خاطر عبارت قرآن کو غیر عربی رسم الخط میں لکھنا شرعا درست ہے یا نہیں؟ نیز عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو شائع کرنا کیسا ہے؟

اس سوال کی بھی دو شقیں ہیں: پہلی شق یہ ہے کہ غیر عثمانی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا کیا حکم ہے؟

اس شق کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنا ناجائز ہے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- رسم عثمانی کے اتباع کے واجب ہونے پر صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے۔

۲- رسم عثمانی توقیفی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ حج میں "سعوا" (سورہ حج: ۵۱) الف کے ساتھ لکھا گیا ہے اور سبا میں ''سعو'' بغیر الف کے لکھا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسم قرآن میں کوئی راز مضمر ہے۔

۳- رسم قرآنی خلفاء راشدین کا اختیار کردہ ہے، اور ان کے طریقہ پر چلنا واجب ہے، جیسا کہ عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فانه من يعيش منكم فسيرى اختلافا كثيرا. فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين من بعدي. عضوا عليها بالنواجذ'' (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۲، ۴۳، اور اس کی سند صحیح ہے)۔

۴- رسم قرآنی کے تلفظ میں آخری درجہ کی لطافت ہے جس میں معمولی سی تبدیلی معنی مقصود کو بدل کر رکھ دیتی ہے، لہذا غیر عربی و عثمانی رسم الخط میں قرآن لکھنا درست نہیں ہے (بیشتر مقالہ نگار)۔

۵- یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ ایک آدمی دنیا کی زبان کو مادی فوائد کے لئے چند مہینوں میں سیکھ لے، لیکن اللہ تعالی کی آخری کتاب کے رسم الخط کو سیکھنے کا اہتمام نہ کرے اور مختلف بہانوں سے اسے ہندی اور انگریزی رسم الخط میں پڑھنے کی کوشش کرے (مقالہ راقم الحروف)۔

۶- ائمہ فقہ کے اقوال سے استئناس:

زرکشی (ت: ۷۹۴ھ) لکھتے ہیں:

''قال أشهب: سئل مالك رحمه الله: هل تكتب المصحف على ما احدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا. إلا على الكتبة الأولى. رواه أبو عمرو والداني في المقنع. ثم قال: ''ولا مخالف له من علماء الأمة''. و قال الإمام أحمد رحمه الله تحرم مخالفة خط مصحف عثمان في ياء أو واو أو ألف. أو غير ذلك''. (البرهان في علوم القرآن ۱/ ۳۷۹)۔

اور امام بیہقی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: ''من كتب مصحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء التي كتبوا بها تلك المصاحف. ولا يخالفهم فيها، ولا يغير مما كتبوه شيئا. فإنهم كانوا أكثر علما. و أصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة منا. فلا ينبغي لنا

أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم ولا تسقطا عليهم" (شعب الایمان ۴/ ۲۱۹)۔

اور ابن مازہ بخاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أراد أن يكتب المصحف بالفارسية منع من ذلك أشد المنع" (المحیط البرہانی ۱/ ۳۰۸)۔

دوسری رائے:

ایک مقالہ نگار مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی شافعی کی رائے ہے کہ غیر عربی میں کتابت قرآن جائز ہے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ شوافع کے معتمد قول کے مطابق غیر عربی میں کتابت قرآن جائز ہے، چنانچہ شیخ سلیمان جمل رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"سئل الإمام الشهاب الرملي: هل تحرم كتابة القرآن العزيز بالقلم الهندي أو غيره؟ فأجاب بأنه لا يحرم، لأنه دالة على لفظه العزيز، وليس فيها تغييره"۔

(حاشیۃ الجمل ۱/ ۱۳۲) اور بجیرمی تحریر فرماتے ہیں: "وافتى شيخنا اى الرملي بجواز كتابة القرآن بالقلم الهندي وقياسه جوازه بنحو التركي أيضا" (حاشیۃ البجیرمی ۱/ ۳۴۳)۔

البتہ شوافع کے یہاں غیر عربی زبان میں لکھے ہوئے قرآن کی تلاوت اسی شخص کے حق میں جائز ہے جو غیر عربی قرآن کو صحیح طریقہ سے پڑھ سکے، چنانچہ علامہ بجیرمی تحریر فرماتے ہیں:

"فائدة كتابته بغير العربية مع حرمة القراءة بها أنه قد يحسنها من يقراه بالعربية" (حاشیۃ البجیرمی ۱/ ۳۴۳)۔

ترجیح:

اگر چہ رسم عثمانی کے توقیفی ہونے پر کتاب وسنت کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے، باقلانی وغیرہ اسے توقیفی نہیں بلکہ اصطلاحی مانتے ہیں اور عز بن عبدالسلام وغیرہ عام لوگوں کی سہولت کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن جمہور علماء امت کا مسلک راجح ہے کہ رسم عثمانی کا اتباع واجب ہے، اس لئے کہ عثمانی رسم الخط کے التزام سے ہر قاری کو احساس ہوتا ہے کہ وہ قرآن اسی طرح پڑھ رہا ہے، جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پڑھ کر سنایا، چنانچہ رسم عثمانی کو بدلنے سے کتاب الٰہی کی حفاظت کا یہ اعلیٰ درجہ کا تصور پیدا نہیں ہوسکتا ہے، نیز یہ حفاظت قرآن میں خلل ڈالنے کا ذریعہ ہوگا، خواہ الفاظ کے بدلنے سے معنی نہ بدلیں لیکن قرآن مجید کی حفاظت میں سستی کی طرف مشیر ہے۔

دوسری شق ہے کہ رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس شق کے جواب میں بھی اکثر مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ ایسا کرنا ناجائز ہے، اور انکی دلیل درج ذیل ہے:

۱۔ قرآن کا رسم الخط اعجازی ہے اس میں قراءت سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، نیز رسم عثمانی کی جو خوبیاں ہیں وہ دوسری زبان کے رسم الخط میں ادا نہیں ہوسکتی ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ دیگر رسم الخط میں بہت سے قرآنی حروف کا صحیح تلفظ مشکل ہے، نیز اس میں قرآن کو تابع بنانا لازم آئے گا جو خلاف ادب ہے کیونکہ اس صورت میں لوگ قرآن کریم سے نگاہیں پھیر لیں گے اور اپنی زبان کے رسم الخط میں ہی تلاوت کریں گے (بیشتر مقالہ نگار حضرات)۔

دوسری رائے:

بعض مقالہ نویسوں کی رائے ہے کہ عربی رسم الخط کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کو شائع کرنا درست ہے انکے اسماء گرامی ہیں (مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی شیر یعقوب، مولانا محمد یوسف علی، مولانا محمد موسیٰ قاسمی، مفتی حنیف، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ازہری ندوی، مولانا ابوبکر ندوی، مولانا ندیم احمد انصاری، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی باقر ارشد قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری) ان حضرات کے یہاں یہ اجازت درج ذیل شرطوں کے ساتھ ہے۔

۱۔ قرآن کی ترتیب نہ بدلے۔ ۲۔ مخارج کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے۔

۳۔ عثمانی اور عربی رسم الخط کی تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے۔

چنانچہ ان شرطوں کے ساتھ حضرت مولانا مفتی نظام الدین نے بھی اجازت دی ہے (دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی ۳/۴۲۸)۔

بریل کوڈ کی تعریف:

بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کئے جانے کے حکم کے سلسلہ میں مقالہ نویسوں کی آراء جاننے سے پہلے مناسب ہے کہ بریل کوڈ کی مراد واضح کردی جائے۔

"بریل کوڈ" (Brail Code) کا بانی فرانسیسی عالم لوئیس برایل (Louis Braille) (پ:۱۸۰۹ء-و:۱۸۵۲ء) ہے، اور اس نظام کا ظہور ۱۸۲۹ء میں ہوا یہ چھ نقطوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک خلیہ (Cell) کے اندر نقطوں کی جگہ کی تبدیلی سے مختلف رموز تیار ہوتے ہیں، جن کی تعداد ۶۳ تک پہنچتی ہے۔ اور ان رموز کو نسبتاً موٹے کاغذ پر نقطے کی شکل میں ابھارا جاتا ہے جنہیں نابینا افراد اپنی انگلیوں کی پوروں کے لمس سے پڑھتے ہیں۔

یہاں پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ بریل نظام رسم یا شکل کے لحاظ سے عثمانی اور املائی رسم کے موافق نہیں، البتہ مضمون کے اعتبار سے زیادہ تر خط عثمانی کو بریل طریقہ سے لکھ سکتے ہیں، مثال کے طور پر کلمہ (غیابت) رسم عثمانی کے مطابق تاء مستطیلہ کے رمز سے لکھا جاسکتا ہے، البتہ بعض حروف رسم عثمانی کے مطابق نہیں لکھے جاسکتے ہیں جیسے (ننجی) (۲۱/الانبیاء:۸۸) کا چھوٹا نون اور (متاب) (۲۱/الرعد:۲۹) کا ہمزۂ واسعہ۔

بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے کے سلسلہ میں مقالہ نویس حضرات کی آراء:

تیسرا سوال یہ ہے کہ:

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے یا نہیں اور بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم کیا اصل قرآن کی طرح ہے، اور اگر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے تو کیا اس کے کچھ مخصوص آداب واحکام ہیں؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ بریل کوڈ میں نابینا افراد کی حاجت اور سہولت کے پیش نظر قرآن تیار کرنا جائز و مستحسن اقدام ہے، اور ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (سورۂ حج:۷۸)۔

۲۔ فرمان باری تعالی ہے: "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (سورۂ بقرہ:۱۸۵) (مقالہ: مولانا محمد اقبال قاسمی)۔

۳۔ فقہی قاعدہ ہے: "الحرج مدفوع" (بزدوی، کشف الاسرار ۴/ ۲۸۷، اور المشقۃ تجلب التیسیر، زرقا، شرح القواعد الفقہیۃ/ ص ۱۵۷) (مولانا حیدر علی قاسمی)۔

نیز "الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ کانت أو خاصۃ" (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر ص:۷۸) (مقالہ: راقم الحروف)۔

بیشتر مقالہ نگاروں کے نزدیک بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن کی طرح ہے کیونکہ وہ نابینا افراد کے ساتھ خاص حروف میں لکھے گئے ہیں، اور ایک نابینا یہی سمجھتا ہے کہ وہ مصحف لئے ہوئے ہے اور مصحف میں پڑھ رہا ہے، نیز اسے بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن ہی سمجھا جاتا ہے، لہذا اسے چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے۔

اور بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے کے مخصوص احکام وآداب وہی ہیں جو اصل قرآن لکھنے کے ہیں، مثلاً تیار کرنے والا مسلم اور باوضو ہو۔

جبکہ مولانا محمد اعظم ندوی، مولانا عبدالعظیم قاسمی، مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی مفتاحی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا مقیم احمد ندوی، اور قاضی محمد حسن ندوی کے نزدیک اسے چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں۔

دوسری رائے:

دوسری رائے یہ ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنا ناجائز ہے، اور اس میں تیار کردہ مصحف کے احکام قرآن کی طرح نہیں ہیں، یہ رائے مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی، مولانا محمد فاروق، مولانا عبدالرشید نعمانی، مولانا اسماعیل اچھوری، (البتہ ان کے نزدیک اگر ایسا مصحف تیار ہوجائے تو چھونے کے لئے وضو

لازم ہے) مفتی حبیب اللہ قاسمی (ان کے نزدیک بھی چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے) مفتی عبدالمنان، اسرار احمد آبادی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا سعید احمد ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی صادق محمد پٹیل، مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی (ان کے نزدیک بھی چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے) مولانا حفیظ الرحمن مدنی قاسمی ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، اویس بن صالح، مفتی عبدالباسط پالنپوری، مفتی جنید بن محمد، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی (البتہ ان کے نزدیک اگر کوئی چھاپ ہی دے تو وہ بریل کوڈ والا قرآن حکماً قرآن ہوگا) مفتی حنیف، مفتی محمد ارشاد، مولانا عبیداللہ ندوی محمد صادق مبارکپوری، مولانا ندیم احمد انصاری اور مولانا عبدالرحیم حسنی کی ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اس میں رسم عثمانی کی مخالفت ہے، اور قرآن نظم اور معنی دونوں کا نام ہے، اور ظاہر ہے کہ بریل کوڈ نظم نہیں ہے۔

ترجیح:...... بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے کا جواز ہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بریل کوڈ میں رسم عثمانی کا التزام بڑی حد تک ہوسکتا ہے، البتہ چند کلمات جو بریل کوڈ میں رسم عثمانی کے مطابق نہیں لکھے جاسکتے ہیں وہ قابل عفو ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بقدر استطاعت ہی مکلف بناتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" (سورۂ بقرہ ۲۸۶)

اور بریل کوڈ چونکہ رمز ہے لہذا وہ رسم کے مخالف بھی نہیں ہے۔

چوتھا سوال:

آج کل موبائل میں بھی قرآن مجید کے متن اور اس کی تلاوت کو محفوظ کرنے کی آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ اس طرح سفر و حضر میں کہیں بھی قرآن کی تلاوت کی جاسکتی ہے، تو اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو کیا موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا، یا موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ موبائل کا ڈھانچہ اسکرین سے علیحدہ شے ہے لہذا جب اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں۔

البتہ جب قرآن مجید کے الفاظ اسکرین پر موجود ہوں تو اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، اور اس کی نظیر فقہاء کی یہ صراحت ہے:

"ولا یجوز مس شی مکتوب فیہ شی من القرآن، فی لوح أو دراھم أو غیر ذلك. اذا کان آیۃ تامۃ" (ہندیہ ۳۸/۱)۔

دوسری رائے:

دوسری رائے یہ ہے کہ موبائل کی اسکرین پر نظر آنے والی آیات نقوش ہیں جنہیں چھوا ہی نہیں جاسکتا، کیونکہ یہ نقوش موبائل کے شیشے پر نہیں بنتے ہیں، بلکہ "ریم" (RAM) پر بنتے ہیں، اور شیشے کے اس پار سے نظر آتے ہیں، لہذا موبائل کا ڈھانچہ علیحدہ غلاف کے حکم میں ہے، چنانچہ اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں، البتہ بطور ادب وضو کرلے تو بہتر ہے، اس رائے کے قائل ہیں مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی، مولانا محمد اعظم ندوی، مفتی عبدالمنان، مولانا عبدالعظیم قاسمی، مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا اسرار احمد آبادی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا عبدالعظیم ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا محمد یوسف علی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا عبدالحکیم قاسمی، مولانا ندیم احمد انصاری، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی ظفر عالم ندوی اور مولانا مقیم احمد ندوی۔

تیسری رائے:

تیسری رائے یہ ہے کہ جب قرآن اسکرین پر ہو تو نہ بے وضو اسکرین کو چھونا درست ہے اور نہ ہی موبائل کو، البتہ بے وضو موبائل کو اس وقت چھو سکتے ہیں جبکہ کوئی ایسا غلاف ہو جو موبائل کے ساتھ سلے یا چپکے ہونے کی وجہ سے تابع نہ ہو، جیسے موبائل پر لگا ہوا زائد کور جو اس کی حفاظت کے لئے لگایا جاتا ہے۔

اس رائے کے قائل ہیں مولانا محمد فاروق، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مفتی صادق محمد پٹیل اور مفتی عبدالباسط۔

☆☆☆

باب دوم تعارف موضوع

قرآنی بریل کوڈ

(قرآنی بریل کوڈ کے موضوع پر ترکی میں منعقدہ ایک کانفرنس میں پیش کردہ ایک تحریر جس میں قرآن کے طرز تحریر پر غور کیا گیا)

اس مباحثہ کے دوران بحیثیت انسان اپنی کم علمی اور خطا شعاری کا احساس ہمیں دامنگیر رہنا چاہئے، قرآن پاک کے متعلق رائے زنی کرنے یا کوئی بات کہنے کو بڑی جرأت اور بے باکی کا سنگین عمل سمجھنا چاہئے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری کوتاہی یا جلد بازی (جو ہم سے سرزد ہو) کو معاف فرمائے (آمین)۔

ہم اپنی رپورٹ کی ابتداء اس اعتراض سے کرتے ہیں جو ہمیں علماء اور اسلامی اسکالروں کی جانب سے موصول ہوا ہے۔ ان اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پاک کو بریل میں منتقل کرنا حرام ہے۔ اور اس کو بریل میں منتقل کرنا اس معیار کے خلاف ہے جو قرآن پاک کی تحریر کے لئے طے کیا گیا ہے کیونکہ قرآن کی تحریر کے لئے جو معیار طے کیا گیا ہے، وہ عثمانی رسم الخط ہے، یعنی وہ رسم الخط جو تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے ذریعہ قرآن پاک کی تحریر کے لئے رائج کیا گیا، قرآن پاک کی تحریر کے لئے کسی بھی رسم الخط کو اسی معیار کے مطابق اور اس کے ضوابط و تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔

ہم (مدرسہ النور فاردی بلائنڈ) نے مذکورہ اعتراض کے تمام نکات کا جواب دیا اور اس کے تمام پہلوؤں پر مباحثہ کیا، ہم (مدرسہ النور برائے نابینا اشخاص) آپ کے سامنے قرآن کریم کو بریل میں منتقل کرنے کی الجھنوں کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر واضح کرنا چاہتے ہیں۔

آیئے ہم قرآن پاک کی ماضی سے اب تک کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالتے چلیں۔

قرآن کریم کی مختصر تاریخ:

قرآن کریم میں خود قادر مطلق اللہ تعالی کے الفاظ ہیں، جو ہمارے محبوب پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر ۲۳ سال کے عرصہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے اتارے گئے۔

قرآن کریم کی حفاظت زبانی یادداشت کے ذریعہ:

قرآن شریف حضور ﷺ پر حرف بہ حرف نازل کیا گیا، جب حضور ﷺ پر وحی اتاری جاتی تو فوراً آپ ﷺ ان نازل کی گئی آیات کو حفظ کر لیتے، پھر آپ ﷺ وہ آیات صحابہ کرامؓ کو سناتے، پھر وہ بھی ان آیات قرآنی کو یاد کر لیتے، حضور ﷺ کے زمانہ میں یادداشت کے ذریعہ چیزوں کو محفوظ کرنے کی عادت عربوں میں عام تھی، حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو قرآن کے الفاظ و آیات لکھنے کی تاکید فرمائی تھی، سب سے مشہور کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ تھے، کاتبین وحی نے قرآن کی ان آیات کو جانور کی کھالوں، لکڑی کے تختوں، سوکھی ہڈیوں، پتھر کی سلوں اور درختوں کے تنوں پر لکھا۔

آیات قرآنی کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کی تاکید:

حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں کاتبین وحی کو قرآن کریم ایک مخصوص الہامی تحریری شکل میں لکھنے کا حکم دیا تھا، حضور ﷺ کے عہد میں قرآن کی تحریر یا رسم بہت ابتدائی شکل میں تھی، نہ ان پر حرکات وسکنات تھے، نہ نقطے۔

قرآن کریم کی تدوین:

حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں ستر سے زیادہ صحابہ جو مکمل حافظ قرآن تھے، جنگ یمامہ (۱۱ھ) میں شہید

ہو گئے، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور قرآن کریم کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کرنے کی فوری ضرورت پر زور دیا، اس وقت قرآن کریم مختلف تختیوں پر لکھا ہوا مختلف صحابہ کے پاس موجود تھا، ان حفاظ کرام کی شہادت کے بعد ایک خطرہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ قرآن کریم کے الفاظ کی حفاظت کے لئے اگر صرف حفظ یا زبانی یاد کرنے پر انحصار کیا گیا تو کہیں قرآن کے الفاظ ضائع نہ ہو جائیں، اس لئے تحریری شکل میں قرآن کریم کی تدوین لازمی ہے۔

قرآن پاک کی تدوین کے عظیم عمل کو انجام دینے کی ذمہ داری صحابہ میں سے قرآن کے ماہرین نے اٹھائی اور اپنے مشن میں وہ کامیاب ہوئے۔

رسم قرآن کو معیار کے موافق بنانے کی کوشش:

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اسلامی اقتدار کافی وسیع ہو گیا، اور غیر عرب اقوام دائرۂ اسلام میں کثرت سے داخل ہوئیں، تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ قرآن پاک کے طرز تحریر اور رسم الخط کو معیار کے موافق بنایا جائے، تاکہ قرآن کریم کی تلاوت اور قرآن کریم کے لکھنے میں غلطیوں سے بچا جاسکے۔

حضرت عثمانؓ کی تاکید:

حضرت عثمانؓ نے خود یہ فرمان جاری کیا کہ قرآن پاک کا ایک معیاری نسخہ مدون کیا جائے جس میں وہی رسم الخط اختیار کیا گیا ہو جو حضور ﷺ پر قرآن کی شکل میں نازل کیا گیا تھا، لہذا عہد عثمانی میں تقریباً پانچ نسخے تیار کئے گئے اور وہ اسلامی ریاست کے اہم شہروں کی طرف بھیجے گئے جیسے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، دمشق، بصرہ اور کوفہ۔

قرآن کریم کے رسم الخط کی حفاظت:

چند رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ خلیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس خود ایک ذاتی نسخہ تھا یہ نسخہ عالمی سطح پر "المصحف الامام" کے نام سے جانا جاتا ہے، قرآن پاک کے اس نسخہ کی اصل کاپی "توپ کاپی" استنبول کے ایک میوزیم میں رکھی ہے۔

عثمانی رسم الخط ہر اس شخص کے لئے ایک روایتی معیار ہے جو قرآن کریم کو لکھنا چاہتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ اس کی اقتداء کرے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ رسم خط الہامی ہے اور قرآن کریم کے الفاظ اور رسم خط دونوں منزل من اللہ ہیں، وحی کے ذریعہ اتارے گئے ہیں اور اللہ رب العزت کی جانب سے محفوظ بھی کئے گئے ہیں۔

تجوید کا ارتقاء:

علم تجوید اور علم رسوم کو ماہر قراء اور اہل علم حضرات کی سرپرستی میں مسلسل ترقی دی جاتی رہی، جن میں امام شمس الدین بن محمد الجزری، امام ابوعمرو الدانی، ابوداؤد سلیمان بن نجاح الاندلسی، ابوولید الباجیؒ وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن کے اعراب:

قرآن مجید پر اعراب لگانے کی پیش رفت ابوالاسود الدولی یا نصر بن عاصم لیثی یا یحیی بن یعمرؒ نے کی، اس کا مقصد غیر عرب لوگوں کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنا اور ان کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ قرآن کریم کی اسی انداز سے تلاوت کرسکیں جس طرح وہ نازل ہوا، قرآن کا اعراب وحی کا حصہ نہیں ہے، یہاں ہمیں یہ نکتہ ذہن نشین کرنا چاہئے کہ اعراب کو وحی کا حصہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

قرآن کریم کی طباعت مشین کے ذریعہ:

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے طباعت کی ابتداء تک قرآن مجید کاتبین کے ذریعہ ہاتھوں سے لکھا جاتا رہا۔

پہلی مرتبہ قرآن کریم کی طباعت ۱۶۹۴ء میں ہمبرگ جرمنی میں ہوئی اور یہ کوشش غیر مسلموں نے انجام دی، مسلمانوں کے ذریعہ قرآن مجید کی طباعت کی پہلی مثال ملا عثمان کا ایڈیشن ہے جو ۱۷۸۷ء میں پیٹرزبرگ میں طبع کرایا گیا، اس کے بعد دوسری طباعتیں بھی عمل میں آئیں جیسے قازان (۱۸۲۸ء)، ایران (۱۸۳۳ء) اور استنبول (۱۸۷۷ء)۔

المصحف المدینۃ المنورۃ:

ماضی قریب میں شاہ مصر فؤاد رحمہ اللہ نے ۱۹۲۵ء میں قرآن پاک کی طباعت کا فرمان جاری کیا، اس طبع شدہ قرآن کو المصحف الامیر المصری کہتے ہیں، یہ مصحف آج مصحف المدینۃ المنورہ کے نام سے مشہور ہے، موجودہ تمام مصاحف میں اس کا رسم خط سب سے زیادہ صحیح ہے۔

بریل قرآن کا آغاز:

بریل میں قرآن کریم کی طباعت کی ابتداء سب سے پہلے مصر اور فلسطین میں کی گئی، سب سے پہلے عربی بریل علامات کو ۱۹۵۱ء میں مصر کے شہر زیتون میں ''عربیین بلائنڈ کمیٹی'' نے اختیار کیا، سب سے پہلے متفقہ انگریزی بریل علامات ۱۹۳۲ء میں اختیار کی گئی تھی۔

بریل کا آغاز تاریخ میں کافی نیا ہے اور قرآن پاک کو عربی بریل میں منتقل کرنے کا تصور اس سے بھی زیادہ نیا ہے۔

زبانی تلاوت:

جب سے قرآن کریم نازل ہوا لاکھوں کروڑوں لوگ اس کی زبانی تلاوت کرتے رہے ہیں، اور اسی طرح بہت سے نابینا لوگ قرآن پاک کی زبانی تلاوت بڑی روانی اور صحیح تلفظ کے ساتھ کرتے ہیں اور وہ تجوید وقرأت کے میدان میں ماہر ہو گئے ہیں، مثال کے طور پر مشہور نابینا امام شاطبیؒ۔

یہ مہارت زبانی تلاوت کے ذریعہ حاصل ہوئی جہاں طالب علم نے استاذ کو قرآن پڑھتے سنا، پھر جیسے سنا تھا اس کو ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کی۔

جب نابینا شخص کے قرآن کریم سیکھنے کے لئے کوئی رسم الخط یا بریل علامتیں نہیں تھی، یہ قرآن کو سیکھنے کا بنیادی طریقہ تھا اور آج تک قابل عمل ہے، نہ اس کا کوئی بدل ہے نہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قرآن کی تلاوت کرو اس طریقہ پر جیسے تم کو سکھائی گئی''۔

قرآن کی تلاوت میں نابینا شخص کو خود کفیل بنانا:

بریل کے بے شمار فائدوں میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ نابینا شخص کو خود کفیل بناتا ہے، وہ جہاں چاہے اور جو چاہے خود سے پڑھ سکتا ہے، اسے کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ وہ آئے اور اس کو پڑھ کر سنائے، اس کے پاس کی ہر وقت پڑھنے اور جانچنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

بریل کا تعارف - بریل کیا ہے؟

بریل ایک قسم کا ذریعہ ابلاغ ہے جو کاغذ پر ابھارے گئے نقطوں پر مبنی ہے جن کے ذریعہ ایک نابینا آدمی اپنی قوت لمس (انگلیوں کے پوروں کے ذریعہ) کا استعمال کرتے ہوئے پڑھنے کے قابل بن سکتا ہے، بریل کوڈ چھ نقطوں پر مبنی ہوتا ہے:

[illegible]	مُؤْمِنُوْنَ	مُؤْمِنُوْنَ	[illegible]
[illegible]	مُؤْمِنِيْنَ	مُؤْمِنِيْنَ	[illegible]
[illegible]	قَالَ	قَالَ	[illegible]

Pakistan	اللّٰه	[illegible]
Malaysia	الله	[illegible]
Egypt	الله	[illegible]
Jordan	الله	[illegible]
South Africa	الله	[illegible]

یہ ان کے لئے تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، ان چھ نقطوں کے مختلف نمونے نشانات اور شکلوں کی تبدیلی سے بنتے ہیں اور وہ مختلف حروف، الفاظ، حروف علت حرکات اور علامتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، ان چھ نقطوں سے ۶۳ مختلف شکلیں بنائی جاسکتی ہیں۔ بریل اپنے بانی لوئس بریل کے نام سے موسوم ہے جو ۱۸۴۲ء میں متعارف ہوا۔

بریل علامات کا استعمال:

بریل علامات زبان وادب کے اظہار کے موقع پر حروف کے لئے استعمال ہوتی ہیں، اور حساب کرتے ہوئے یہی علامتیں نمبرات کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، نیز

کمپیوٹرو سائنس کے مطالعہ کے دوران یہ علامتوں اور اکائیوں وغیرہ کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔

العمیدی کا حصہ:

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک نابینا عرب مسلم جن کا نام علی ابن یوسف ابن خضر العمیدیؒ (وفات ۱۳۱۴) ہے، نابینا لوگوں کے لئے چھوکر پڑھنے کے سب سے پہلے نظام کے موجد و بانی ہیں، اور یہ لوئس بریل کے ذریعہ بریل کے طریقہ کے ایجاد ہونے کے چھ سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔

چونکہ بریل ایک قسم کے کوڈ پر مبنی ہے، کسی بھی زبان کے حروف کو بریل میں منتقل کرنا ممکن ہے، بنیادی کوڈ کو "گریڈ ون" بریل کہا جاتا ہے، مذکورہ بریل حروف عام حروف ہجاء کا بدل ہیں، عملی طور پر زیادہ تر بریل استعمال کرنے والے "گریڈ ٹو" استعمال کرتے ہیں، یہ شارٹ ہینڈ یا مخففات کی ایک شکل ہے جو نسبتا تیز لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، گریڈ ٹو بریل میں کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور وہ نسبتا کم ضخیم ہوتی ہیں۔

عربی بریل حروف ہجاء:

عربی حروف تہجی ۲۸ حروف پر مشتمل ہیں، عربی بریل میں مزید آٹھ حروف زائد ہیں، جس سے یہ تعداد ۳۶ تک پہنچ جاتی ہے۔

تحریر کے دو طریقے:

ہمارے پاس بریل قرآن کے چند نسخے ہیں جو مصر، تیونس، اردن اور ملیشیا وغیرہ سے طبع ہوئے ہیں، دیگر ممالک جیسے ساؤتھ افریقہ، انڈونیشیا، فلسطین، پاکستان، بحرین، ایران، کویت، ترکی، یمن وغیرہ بھی عربی بریل میں قرآن مقدس کو طبع کراتے ہیں، یہ سب قرآن مخفف عربی بریل میں تحریر شدہ ہیں۔

قرآن پاک کے ان تمام نسخوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے مشاہدہ کیا ہے، بریل میں رسم قرآن کے دو طریقے پائے جاتے ہیں، پہلا وہ جو عرب قراء کے لئے تیار کیا گیا ہے، اور دوسرا جس میں غیر عرب قاریوں کے لئے خصوصی علامات بھی متعارف کرائی گئی ہیں۔

دونوں طریقہ تحریر درست ہیں:

حسب طبقہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عربی اور عجمی دونوں طریقہ تحریر درست ہیں، ہر قاری کو دونوں میں سے کسی بھی طرز تحریر کو اپنی ترجیح کے مطابق منتخب کرنے کا اختیار ہے۔

اس تعلق سے آپ کو یہ بھی دیکھنے کو ملے گا کہ سعودی عرب نے دونوں طرز تحریر کو اختیار کر کے قرآن پاک کی طباعت کی، ان کے ذریعہ شائع شدہ عربی قرآن کا کور سبز رنگ اور غیر عرب لوگوں کے لئے شائع ہونے والے قرآن کا کور نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔

قرأت اور روایت:

زیادہ تر عربی بریل قرآن امام حفص ابن سلیمان ابن مغیرہ الاسدی الکوفیؒ اور امام عاصم ابن ابی النجود الکوفیؒ کی روایت پر لکھا جاتا ہے، تیونس میں ایک بریل قرآن امام قالونؒ کی روایت کے مطابق برالقاسہ میں ۱۹۷۶ء میں چھاپا گیا۔

عربی بریل کوڈ:

اس وقت اہل الجیریا بالکل مختلف عربی بریل کوڈ اختیار کرتے ہیں، حالانکہ عرب ممالک کی اکثریت مشہور عربی بریل کوڈ کی علامتوں کو اختیار کرتے ہیں، جو بحرین سے وابستہ ہے، اور سب سے تازہ ترین کوڈ ریاض میں ۲۰۰۲ء میں اختیار کیا گیا، نیز اس وقت دنیا بھر کے مختلف اداروں کے درمیان جو قرآن پاک کو طبع کرواتے ہیں قرآن کریم کے لئے متفقہ عربی بریل کے سلسلے میں کوئی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہاں استنبول میں ہماری میٹنگ متفقہ عربی بریل علامات Unifide Arabic Braille Code پر کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے میں کامیاب ہوگی۔

بریل قرآن - سعودی عربیہ:

بریل قرآن کریم ریاض، سعودی عربیہ کے پریس میں طبع کیا جاتا ہے، یہ بریل قران پانچ پانچ پاروں کی چھ جلدوں پر مشتمل ہوتا ہے، جس کا وزن تقریبا دس کلو ہوتا ہے، ایک مکمل کمپیوٹرائزڈ پریس کے ذریعہ قرآن کریم کو بریل میں ڈیجیٹل ماسٹر کے ذریعہ چھاپا جاتا ہے، البتہ جیسا کہ اس سے پہلے وضاحت کی گئی کہ غیر عرب لوگ بریل کے اس طرز تحریر کو پڑھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

بریل قرآن - پاکستان:

نیشنل فیڈریشن فاردی ویلفیئر آف دی بلائنڈ جو کراچی پاکستان میں واقع ہے، ۱۹۵۰ سے قرآن پاک کو عربی بریل میں طبع کراتا رہا ہے، اس کے پاس بریل کی اشاعت کے لئے مینول پلیٹ سسٹم (Manual Plate System) ہے، ہر پلیٹ کو ہاتھ سے براہ راست ٹائپ کیا جاتا ہے اور پھر اس کو پلیٹن پریس کے ذریعہ ابھارا جاتا ہے، البتہ غیر عرب لوگ اس قرآن کے طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ یہ طریقہ ان کے لئے زیادہ آسان ہے۔

بریل کیسے لکھی جاتی ہے؟

بریل کی تحریر کے لئے سب سے سادہ اور سب سے سستا طریقہ بریل پلیٹ اور اسٹائلس کے ذریعہ لکھنا ہے، چھ بٹن کے ٹائپ رائٹر کو پرکنس بریلر Perkins Brailler کہا جاتا ہے، یہ زیادہ رفتار کے ساتھ بریل تحریر کرسکتا ہے۔

کمپیوٹرائزڈ بریل انپٹ:

آج کل بریل کی صنعتی طباعت کمپیوٹر کے ذریعہ ہوتی ہے، ایک ٹائپسٹ عام عبارت ٹائپ کرتا ہے، اور ایک ٹرانسلیشن پروگرام Translation Programe اس عبارت کو بریل میں منتقل کرتا ہے، دوسرا طریقہ ایک بریلسٹ (بریل علامات کا ماہر) براہ راست بریل ہی کو کمپیوٹر پر ٹائپ کرتا ہے۔

سافٹ کاپی، ہارڈ کاپی اور پروف ریڈنگ:

یہ دونوں طریقے بریل کی سافٹ کاپی تیار کرتے ہیں، اس کے بعد کاغذ پر بریل پرنٹ ہوتی ہے، یہ ابھرے ہوئے نقطوں والا صفحہ ہارڈ کاپی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، پھر اس صفحہ کی پروف ریڈنگ ہوتی ہے، یہ جانچنے کے لئے کہ سافٹ کاپی اور ہارڈ کاپی یکساں ہے، عام طور پر ایک صفحہ کی پروف ریڈنگ بینا اور نابینا لوگوں کو ایک جماعت کئی بار کرتی ہے، تب جا کر اس کو امبوسنگ پروسیس Embossing Process کے لئے تیار سمجھا جاتا ہے۔

ٹریکٹر فیڈ اور کنوینشینل امبوسنگ:

امبوسنگ مشین مسلسل ٹریکٹر فیڈ پیپر استعمال کرتا ہے، اور ہر صفحہ کو اصلی دستاویز کی شکل دیتا ہے، اس نظام میں سب سے بڑی دشواری نقاط ابھارنے میں مکمل استحکام برقرار رکھنا ہے، ہارڈ کاپی اور سافٹ کاپی میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں کمزوری یا کوئی جزوی غفلت وکوتاہی کے نتیجہ میں امبوسنگ کی غلطیاں پیدا ہوجاتی ہیں، زنگ پلیٹ کا استعمال کرتے ہوئے روایتی کاغذ پر امبوسنگ سسٹم ضخیم جلدوں والی کتاب جیسے قرآن وغیرہ چھاپنے کے لئے زیادہ محفوظ تصور کیا جاتا ہے، براہ راست پرنٹنگ کے مقابلے میں اس میں غلطیوں کا کم اندیشہ ہوتا ہے۔

سخت محنت:

بریل کی چھپائی مشکل بھی ہے اور مہنگی بھی، کاغذ کا وزن/ ۱۳۵ گرام یا اس سے زیادہ ہوتا ہے، چھپائی میں نقطوں پر توجہ دینی ہوتی ہے، پروف ریڈنگ کے دوران بڑی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، ایک واحد زائد نقطہ یا کسی نقطہ کی کمی پورے لفظ کے معنی تبدیل کردیتی ہے۔

ہماری صورتحال:

۱۹۸۶ء میں مدرسہ النور فاردی بلائنڈ کی بنیاد رکھنے کے بعد سے بریل قرآن پاکستان، سعودی عربیہ اور اردن سے برآمد کرتے رہے ہیں، بریل قرآن کی ضرورت اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ وہ دنیا بھر کے پریسوں میں چھپتا ہے۔ فی الحال مدرسہ النور فاردی بلائنڈ نے خود اپنا بریل قرآن طبع کرانے کی ابتداء

مقامی طور پر ساؤتھ افریقہ میں اور ہندوستان میں کردی ہے۔

ہماری ترجیح:

عرب قرآن اور غیر عرب قرآن کا جائزہ لینے کے بعد غیر عربوں کے لئے طبع شدہ بریل قرآن کو مذکورہ ذیل اسباب کی بنیاد پر ترجیح دی۔ یہ بریل قرآن کا نسخہ عکسی قرآن کے عین مطابق ہے، جو برصغیر ہند میں عام طور پر پایا جاتا ہے، ملیشیاء، افریقہ اور ترکی میں بھی یہی عجمی طرز تحریر ملا علی قاری رسم الخط کے نام سے جانی جاتی ہے۔

مانوس طرز:

اس قرآن میں پاروں کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے ہم مانوس ہیں، مثال کے طور پر پہلا پارہ (الم)، اکیسواں پارہ (اتل ما اوحی)، تیسواں پارہ (عم) وغیرہ۔ عرب قرآن میں پاروں کی تقسیم دوسرے طرز پر کی گئی ہے۔ مثلاً ساتواں پارہ (لتجدن) سے شروع ہوتا ہے، (اذا سمعوا) سے نہیں، اس طرح عرب قرآن میں رکوع کی تقسیم نہیں پائی جاتی۔

آسان تعریب:

اسی طرح یہ غیر عرب قرآن میں اعراب کی علامات بہت زیادہ آسان اور قریب الفہم ہیں، مثال کے طور پر غیر عرب قرآن میں کچھ خاص علامات بھی ہیں، الضمة المقدرہ (و)، الفتحة المقدرہ (الف)، الکسرة المقدرہ (ی) وغیرہ ان علامتوں سے قرآن کریم کی تلاوت میں سہولت ہوتی ہے۔

ماوبرک بریل کوڈ:

قرآن کریم کی تحریر کا کام ایک انتہائی نازک اور دلچسپ سعی ہے، کوئی بھی خود ساختہ من گھڑت علامت جو قرآن اور بریل کے ماہرین کی مسلمہ علامات سے ٹکراتی ہو اس کا اختیار کرنا بڑا خطرناک ہے، ایسی غیر معروف علامات کا گھڑنا، وضع کرنا، غلط فہمی، کشمکش اور اختلاف کا سبب ہوسکتا ہے، اور بالواسطہ طور پر گناہ بھی ہے۔

کیا بریل رسم الخط ہے یا کوڈ ہے؟

قرآن کریم کو معیار عثمانی کے مطابق بریل میں منتقل کرنے کا پورا معاملہ تقاضا کرتا ہے کہ اسے پوری طرح سمجھا جائے، اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ عثمانی رسم الخط وہ رسم الخط ہے جسے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے مطلوبہ معیار کے مطابق بنایا، اور یہ ہر شخص کے لئے روایتی طرز تحریر ہے جسے قرآن پاک کے لکھنے میں مسلمہ معیار کے طور پر تسلیم کرنا چاہئے۔

دکھائی دینے والا رسم الخط:

رسم الخط مرئی، یعنی قابل مشاہدہ ہوتا ہے، اور یہ بینا لوگوں کے لئے ہوتا ہے، اور اسے دیکھا جاسکتا ہے، اس کے برخلاف بریل نقطوں کا ایک کوڈ ہے، جسے نابینا لوگوں کے لئے تشکیل دیا گیا ہے، ان لوگوں کے لئے جو پڑھنے کے لئے قوت لمس کا سہارا لیتے ہیں، بریل دیکھ کر پڑھنے کے لئے نہیں مرتب کی گئی ہے، بلکہ یہ چھو کر پڑھنے کے لئے ترتیب دی گئی ہے، ایک نابینا شخص کے لئے ابھرے ہوئے نقطہ کو پہچاننا اور محسوس کرنا آسان ہے، ایک نابینا شخص پرنٹ شدہ نقطہ کو محسوس نہیں کرسکتا، بینا شخص کے لئے نظروں سے پڑھے جانے والے رسم الخط کو اندھیرے میں پڑھنا ممکن نہیں ہے، البتہ ایک نابینا شخص بریل اندھیرے میں بھی پڑھ سکتا ہے۔

رسم الخط کے متعلق غور وفکر:

علماء اسلام کا عثمانی معیار کے مطابق رسم قرآن کے ضوابط سے متعلق مباحثہ نظر آنے والے رسم الخط پر مبنی ہے، ان کا مباحثہ علامات رسم الخط یا ابھرے ہوئے نقاط کے کوڈ پر جو چھو کر پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، مبنی نہیں۔

بریل ایک رسم الخط نہیں ہے، کسی رسم الخط کی طرح اس میں شوشے یا گھ. و بھراؤ نہیں ہوتے ہیں، بریل کو دیکھنے سے نقطے نظر آئیں گے، بریل ابتداء میں

جنگ کے دوران میدان جنگ میں ذریعہ ابلاغ کے طور پر ترتیب دیا گیا تھا۔

بریل نقاط لکھے ہوئے نقاط نہیں ہوتے، بلکہ وہ کاغذ پر ابھارے ہوئے ہوتے ہیں، اور بنیادی طور پر اس طرح ترتیب دیئے جاتے ہیں کہ وہ محسوس کئے جائیں اور نابینالوگوں کے ذریعہ چھوکر پڑھے جائیں اپنی ترتیب اور مقصد میں بینالوگوں کے لئے ناقابل فہم ہوتے ہیں۔

موضوع:

عثمانی رسم الخط کا موضوع کیا ہے؟ اس کا موضوع قرآن کریم کے حروف ہیں۔

حروف القرآن:

لہذا یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بریل کو جو نقطوں کی زبان ہے قرآن کے حروف تصور کیا جائے؟ بینا افراد کی حیثیت سے ہم ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر دنیا بھر کے مختلف رسوم خط کی تحریروں کے فرق کو جان سکتے ہیں، ہم یقینی طور سے پہچان سکتے ہیں کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی ہے، اور یہ قرآن مقدس عربی زبان میں ہے اور وہ ناقابل فہم غیر ملکی زبان کے رسم الخط میں ہے۔

تمام بریل ایک جیسی نظر آتی ہے:

جہاں تک نابینالوگوں کی بات ہے جب ایک نابینا شخص اس کوڈ کو اچھی طرح جانچتا ہے، جس کو وہ پڑھ رہا ہے، تب وہ بریل کی اس کتاب کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے ورنہ بریل یا نقاط بے معنی ہوتے ہیں، مثال کے طور پر انگریزی ادب کی بریل کی کتاب، حساب کی بریل کی کتاب، چائنیز بریل کا ایک جرنل اور قرآن کے عربی بریل کا ایک نسخہ ایک میز پر رکھا جائے تو ان ساری کتابوں میں بریل ایک جیسی ہوگی۔ اس کے برخلاف طبع شدہ کتابوں کا ایک یکساں انتخاب اگر ایک میز پر رکھا جائے تو مختلف زبانوں کے اشاروں اور رسوم خط کو آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے اور ان کو الگ الگ بھی کیا جاسکتا ہے۔

کوڈ-ترجمہ نگاری:

چونکہ بریل ایک کوڈ ہے، اور یہ کوڈ علامتیں ہر زبان کے حروف تہجی کی نمائندگی کرتی ہیں، اس لئے کسی زبان کے ٹرانسلٹر یشن (نقل الفاظ) کی ضرورت نہیں۔ یکساں تلفظی بنیادی جب ہم ادبی تخلیق کے لئے بریل کا استعمال کرتے ہیں تو ایک حقیقت یہ پائی جاتی ہے کہ کسی بھی زبان کے الفاظ جن کا تلفظ یکساں ہے وہ یکساں بریل علامتوں سے جانے جاتے ہیں، مثال کے طور پر عربی میں لفظ "ل" کی علامت انگریزی لفظ "L" کی بریل علامت اور گجراتی کے لفظ --- بریل کی علامت یکساں ہے، مطلب نقطہ نمبر ۱، ۲، ۳ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی بنیاد یکساں تلفظ پر ہے۔

تلفظ کے اعتبار سے ترتیب شدہ:

مذکورہ بالا بحث سے یہ نکتہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ادب کی تخلیق میں بریل کا استعمال تلفظ پر مبنی ہوتا ہے اور منطقی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بنیادی طور پر بریل علامت تلفظ کی نمائندگی کرتی ہے، نہ کہ رسم الخط کے الفاظ کی، اور بریل میں حروف کے تلفظ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، حروف کے رسم الخط کو نہیں۔

ہمارا موقف:

تصحیح واصلاح:

ایک ادارہ کی حیثیت سے اپنے ابتدائی سالوں میں ہم نے صرف تعلیم مہیا کرنے پر توجہ کی، ہمارے پاس اپنی ذاتی عمارت بریل قرآن طبع کرنے کے لئے نہیں تھی، لہذا مدرسہ النور فاردی بلائنڈ نے فیصلہ کیا کہ غیر عرب قرآن جو پاکستان سے طبع شدہ تھا اس کی تصحیح واصلاح کا کام کرے، چنانچہ کئی سالوں تک ہم غلطیاں ڈھونڈتے اور ان کی فہرست تیار کرتے رہے، بعد میں ہم نے طبع کرنے والوں کو بھی مطلع کیا، ان میں کچھ بڑی غلطیاں بھی تھیں جن میں الفاظ غلط طریقہ سے لکھے گئے تھے، ۱۹۹۶ء میں ہم نے کراچی کا سفر کیا، اور اصلی ہارڈ کاپی پلیٹ پر غلطیوں کی تصحیح کی، ہم نے بینا اور نابینا پروف ریڈرس کی ایک ٹیم تشکیل دی، تاکہ وہ تصحیح واصلاح کا کام کریں، اور تصحیح کا کام اب بھی جاری ہے۔

سافٹ کاپی:

کمپیوٹرائزڈ سافٹ کاپی کی اصلاح ہارڈ کاپی کے مقابلے میں زیادہ آسانی اور تیزی سے کی جاسکتی ہے، یہ ضرورت ہمیں سافٹ کاپی تیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے، تاکہ ہم آزادی کے ساتھ ایڈیٹنگ کرسکیں۔

دوراستے:

ہمارے پاس عربی بریل قرآن پرنٹ کرنے کے دوراستے ہیں:

۱- مکمل بریل قران ازسرنو ڈکزبری ٹرانسلیشن سافٹ ویئر (Duxbusry Translation Software) یا ASC II کے ذریعہ ایک ایک حرف پھر سے ٹائپ کرکے لکھا جائے۔

۲- فی الحال جو غیر عرب قرآن موجود ہے اس کو کاپی کرلیا جائے۔

ہم نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے، قران پاک کو آپٹکل بریل رکگنیشن سافٹ ویئر (Optical Braille Recognition Software) کے ذریعہ ڈیجیٹل اسکین کیا، اس طرح کئی سال تک ہم قرآن پاک کے اس نسخے کی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ کرتے رہے، تاکہ غلطیوں سے پاک ایک ماسٹر کاپی تیار ہوجائے، اور ایک بار جب وہ ماسٹر کاپی تیار ہوگئی تو پھر بریل میں قرآن کریم کی طباعت آسان ہوجائے گی، انشاء اللہ پھر کوئی بھی شخص قرآن حکیم کو مقامی طور پر طبع کراسکے گا، اور اس طرح بریل قرآن کی نشرواشاعت کو کافی بڑھاوا ملے گا۔

احتیاط:

چونکہ یہ قرآن پاک کا معاملہ ہے، اس لئے کافی احتیاط کی ضرورت ہے، ہمیں بریل کی کوئی نئی علامت یا کوڈ ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

عربی رسم الخط کی سمت:

عربی ایک سامی زبان ہے اور اس کے ہر لفظ کا ایک مخصوص تلفظ ہے، اگر دوسری زبانوں کے رسوم خط سے موازنہ کریں تو اس کا رسم خط بھی نرالا اور منفرد ہے، فن کی دنیا عربی خطاطی کو خود اپنے ایک شاہکار کی حیثیت سے جانتی ہے، عربی ہمیشہ دائیں سے بائیں طرف لکھی اور پڑھی جاتی ہے، اس کے برخلاف عربی بریل بائیں سے دائیں جانب پڑھی جاتی ہے، اور یہ سمت مکمل طور سے عثمانی معیار کے مخالف ہے۔

حروف کی بناوٹ:

عربی کی طباعت میں حروف ہجاء کا طرز تحریر معیاری نہیں ہے، عربی کے حروف اپنی جگہ کی تبدیلی پر سے اپنی شکلیں تبدیل کرتے ہیں، زیادہ تر الفاظ کی تین شکلیں ہوتی ہیں ابتدائی، درمیانی اور اختتامی۔

عثمانی رسم الخط کا معیار اس ضرورت کا تقاضہ کرتا ہے۔ حروف کی شکلیں درمیانی مقام پر اس کی اختتامی مقام کی شکل سے مختلف ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر:

البتہ عربی بریل میں حروف مختلف شکلوں میں نہیں پائے جاتے اور نہ اس کی ضرورت ہے، عربی بریل میں کوئی بھی حرف ابتدائی، درمیانی اور اختتامی ہر مقام پر ایک ہی شکل میں ہوتا ہے، اور وہ اس کی ابتدائی شکل ہے، خلاصہ کلام یہ کہ عربی بریل کے حروف مکمل طور پر عثمانی رسم الخط کے معیار کے موافق نہیں ہیں۔

بریل پڑھنے کی مہارت:

نابینا شخص بریل پڑھنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بریل کتاب کے صفحہ پر رکھتا ہے، وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس جگہ کو ٹٹولنے کے لئے استعمال کرتا ہے جہاں سے اس کو پڑھنا شروع کرنا ہے اور پھر وہ اپنی شہادت کی انگلی دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ملادیتا ہے جس مقام پر وہ ہے، دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں کو ملانے کا مقصد صفحہ پر سطروں کے فاصلہ کو سمجھنا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ نشانی بھول جائے اور ادھر ادھر سے پڑھنے لگے، نابینا

آدمی اب اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو پڑھنے کے لئے بائیں سے دائیں کی طرف حرکت دیتا ہے اور مسلسل پڑھتے ہوئے سطر کے آخری سرے تک پہنچتا ہے، پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر بائیں ہاتھ کی انگلی سے دوبارہ ملا دیتا ہے جو مسلسل سطر کے فاصلہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے نیچے کی سطر تک پہنچ جاتی ہے اس طرح پڑھنے والا اگلی سطر تک پہنچ جاتا ہے یہ جگہ کا خیال رکھنا سطروں پر دھیان دینا اور جانچنے ٹٹولنے کی مہارت یعنی حروف کو اپنی انگلی کے پورے سمجھنے کی صلاحیت بریل کی تعلیم کے لئے از حد ضروری ہے۔

سست رفتاری:

اپنی شہادت کی انگلی سے وہ ایک وقت میں ایک ہی بریل سیل محسوس کرسکتا ہے، وہ ہر نقطہ اور حرف کو انفرادی طور پر محسوس کرتا ہے، اس کی شہادت کی انگلی کا درمیانی نرم حصہ اس کے جسم کا واحد ایسا عضو ہے جو چھونے کے ذریعہ معلومات کی جانچ کرتا ہے۔

ایک سطح اور مختلف سطحیں:

مزید برآں ایک نابینا شخص ہر حرف کو یا سیل کو اسی سطح پر یا منزل پر دیکھتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس حروف کے ساتھ جس کو وہ پڑھ رہا ہے ایک حرف پہلے اور ایک حرف بعد میں بھی محسوس کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

یہ ساری معلومات اسے قوت لمس سے ہی حاصل ہوتی ہے، چھونے کی حس دماغ کو اشارہ دیتی ہے۔ دماغ اس کی وضاحت کرتا ہے جس کو وہ سمجھ رہا ہے وہ ان علامتوں کو جو اس کو ملی ہیں لیتا ہے پھر حروف کو ملاتا ہے، پھر ان سے ایک لفظ کو تشکیل دیتا ہے یہ کافی وقت طلب اور سست رفتار عمل ہے، دماغ رموزی تحریر پڑھ کر احساس کو تشکیل دیتا ہے اور اس سے لفظ اور جملے بناتا ہے۔

ایک بینا شخص رسم الخط کو کیسے پڑھتا ہے:

اس کے برخلاف جب ایک بینا آدمی اپنی آنکھوں کا استعمال کر کے پڑھتا ہے، تو اس کی توجہ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، ایک حرف کو ایک پورے لفظ کو، جملہ کو یا ایک پورے پیراگراف کو ایک ہی وقت میں دیکھ سکتا ہے، مثال کے طور پر ایک لفظ 'اللہ' پڑھتے ہوئے آپ کی آنکھیں صرف اس کے پہلے حرف 'الف' تک ہی محدود نہیں رہتی، بلکہ آپ کی آنکھیں اس کے آگے بھی چند حروف کو دیکھتی ہیں، الف سے پہلے کے الفاظ اور بعد کے الفاظ دونوں نظر میں ہوتے ہیں۔

جانچنے اور توجہ مرکوز کرنے کا بین الاقوامی طریقہ:

یقیناً دونوں آنکھوں کا مشاہدہ کچھ لفظوں پر، سامنے کی سطروں پر پیچھے اور لفظ کے اوپر اور نیچے مرکوز ہوتا ہے، لفظ اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے تم ایک ایسے لفظ کی طرف دیکھ رہے ہو جس کی تین منزلیں ہیں، پہلی منزل پر حروف ہیں، دوسری منزل پر تشدید ہے اور تیسری منزل پر کھڑا زبر (فتحہ مقدرہ) ہے۔

ایک بینا شخص کی حیثیت سے تم ایک ایسے لفظ کی ساخت کو دیکھ سکتے ہو جو ایک ساتھ تین منزلوں پر مشتمل ہے، اس موقع پر آپ کو اپنی نظر گھمانے کی ضرورت نہیں ہے، نہ اس تین منزلہ تحریر کو جو لفظ اللہ تشکیل دیتا ہے بار بار جانچنے کی اور سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک بینا فرد کی حیثیت سے آپ ایک نابینا کے مقابلہ میں جب وہ پڑھنے کی شروعات کرتا ہے آپ بہت ممتاز ہو، نابینا شخص ہر حرف اور لفظ کی ایک ہی منزل پڑھتا ہے جس کے لئے اس کو بہت زیادہ وقت اور کوشش صرف کرنی پڑتی ہے۔

یہ تو ایسی مثال ہے گویا کہ ایک کوئلہ کی آگ سے چلنے والی گاڑی کا مقابلہ کسی اسپورٹ سے رکھ دیا جائے۔

آسان طرز تحریر:

اس سوال کے جواب میں کہ قرآن کریم کے چند الفاظ کو بریل میں غیر روایتی طور پر کیوں کر لکھا جائے؟ ہم نے جواب دیا کہ قرآن کریم کو بریل میں منتقل کرنے کے لئے بہترین طرز تحریر وہ ہے جو آسان ہو۔ "عن انس رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "يسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا" (صحیح بخاری) (حضور ﷺ نے فرمایا: آسانی پیدا کرو، مشکل پیدا مت کرو، خوشخبری سناؤ اور نفرت پیدا مت کرو)۔

تعریب کا مالہ وما علیہ:

چنانچہ بریل میں وہ طرز تحریر جو آسان ہو مشکل تحریر کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور ممتاز سمجھی جاتی ہے، اعراب کی زیادتی پڑھنے کے عمل کو ناسازگار اور سست بناتی ہے اور اعراب کی کمی پڑھنے کو زیادہ آسان اور تیز کر دیتی ہے۔

لہذا اس طریقہ کے بالمقابل جو بینا لوگوں کے پڑھنے کے لئے پایا جاتا ہے جس میں زیادہ اعراب مطبوعہ عبارت کو زیادہ سادہ سمجھنے میں آسان اور پڑھنے کے لئے تیز تر بنا دیتے ہیں، البتہ نابینا لوگ اس طریقہ کو زیادہ آسان اور پڑھنے میں تیز بہتر سمجھتے ہیں جس میں کم اعراب ہوتے ہیں۔

بریل حرف کے اوپر علامات:

کچھ بریل قرآنوں میں مختلف قسم کا اعراب پایا جاتا ہے، جس میں اعراب بریل سیل کے اوپر لگا یا جاتا ہے، جو نابینا لوگوں کے لئے کافی دشواری کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ کچھ نابینا لوگ ایک سیل سے زیادہ نقطے جانچنے میں بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔

غربت:

ایک انتہائی قابل غور بات یہ ہے کہ بہت سارے نابینا لوگ آج دنیا میں غربت کی مزید ایک الگ سے مصیبت سے دوچار ہیں، اکثر اوقات وہ ہاتھ سے استعمال ہونے والا استاذ ذریعہ استعمال کرتے ہیں، جیسے سلیٹ اور اسٹائلس یا بعض اوقات بریل لکھنے کے لئے ٹائپ رائٹر کا استعمال کرتے ہیں، یہ ہاتھ سے استعمال ہونے والے ذرائع ساتویں اور آٹھویں نقطہ کو لکھ سکنے کے لائق نہیں ہوتے، یہ مسئلہ بھی ہمارے بہت سارے قاریوں کے لئے مشکل کا سبب ہے۔

نابینا آدمی بریل کیسے پڑھتا ہے:

ایک ایسا شخص جو تبادلہ خیال کے لئے بریل کا استعمال کرتا ہے، اس کے ساتھ سابقہ پڑے تو ایک اہم نفسیاتی پس منظر ذہن میں ضرور رہنا چاہئے جس کو نظر انداز کرنے سے نابینا کی تدریس کا منفی نتیجہ نکلتا ہے، ایک بینا شخص جس رفتار سے پرنٹ شدہ مواد پڑھ سکتا ہے نابینا اس کے مقابلہ میں بریل بہت سست رفتاری سے پڑھتا ہے، نابینا آدمی کو پڑھ سکنے کے لئے آنکھوں میں وہ روشنی نہیں ہوتی ہے، وہ اپنی قوت لمس کا سہارا لے کر پڑھنے کے لئے اپنے ہاتھ کی انگلیاں استعمال کرتا ہے، عام طور پر آدمی کی ساری انگلیوں میں شہادت کی انگلی سب سے زیادہ حساس ہوتی ہے، ہاتھ کی دوسری انگلیوں کے مقابلہ اس میں ادراک کی حس زیادہ ہوتی ہے۔

اسم الجلالہ بریل میں:

جیسا کہ پہلے بھی اس کی وضاحت کی گئی کہ عربی بریل کے طرز تحریر میں باہم کافی فرق پایا جاتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ خود ہمارے درمیان خیالات کا فرق ہے، حتی کہ قرآن کریم میں اللہ کا نام لکھنے میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے، یہاں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن کے ذریعہ ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ ممالک جو بریل قران کی طباعت کا فریضہ انجام دیتے ہیں وہ عربی رسم الخط اور بریل میں لفظ اللہ کو کس طرح تحریر کرتے ہیں:

یہاں ہم آپ کی توجہ چند پیچیدہ مسائل کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں:

مسائل ہمزہ:

غیر عربی قرآن کریم کی طباعت میں ہمزہ قطعی اور ہمزہ وصلی کے قاعدوں پر خاص توجہ دی گئی ہے، عربوں کے لئے ان دونوں قسم کے ہمزہ میں فرق کرنا آسان ہے، کیونکہ وہ ان کی مادری زبان ہے۔

وہ مختلف ہمزہ کی اچھی طرح اور واضح تلفظ کی ادائیگی کی اہلیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر مذکورہ آیت (ادع إلى سبيل ربك) (سورہ نحل: ۱۲۵) ادع میں ہمزہ وصلی اور "إلى" میں ہمزہ قطعی ہے، اس لئے غیر عرب قرآن میں دونوں ہمزہ اعراب کے ساتھ لکھے ہوتے ہیں۔

ہم اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ عربی رسم الخط کی تحریر کے ضابطوں کے مطابق غیر عرب نسخہ جس میں ان دونوں ہمزوں پر حرکت ظاہر کی گئی ہے یہ بات عربی کے نقطہ نظر سے غلط ہے، چونکہ ہمزہ کے قواعد پیچیدہ ہیں، اور غیر عرب لوگوں کے لئے ان دونوں ہمزوں کے فرق کو سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس لئے ہم اس

نتیجہ پر پہنچے کہ جس طرح غیر عرب لوگوں کے لئے مطبوعہ قرآن میں دونوں ہمزوں کے اوپر خاص نشانات واضح طور پر لگائے گئے ہیں، تاکہ قرآن پاک کو صحیح طریقہ پر پڑھا جاسکے۔

اقلاب حروف:

اسی طرح کی ایک مثال ''و'' کی بھی ہے جو الصلوۃ اور الزکوۃ میں پایا جاتا ہے، عثمانی رسم الخط کے ضابطہ کے مطابق یہ واو لکھا تو جاتا ہے، لیکن تلفظ میں اس کے بدلہ میں الف ادا کیا جاتا ہے، ایک مسئلہ ہمارے سامنے کھڑا ہوتا ہے کہ بریل میں ہم الف کی آواز کے بدلے میں عثمانی رسم الخط کے ضابطہ کے مطابق واو لکھیں تو یہ الفاظ نابینا قاری کے ذریعہ غلط تلفظ کے ساتھ ادا ہوں گے، چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم الصلاۃ میں لام الف اور الزکوۃ میں الف استعمال کرتے ہیں تو حروف کے اقلاب کی یہ مثالیں ہیں:

دونوں علامتوں کی صحت:

حسب مذکور فتحہ مقدرہ (نقطہ نمبر ۴) اور الف (نقطہ نمبر ۱) دونوں علامتوں کا تلفظ ایک جیسا ہوتا ہے، لہذا ان دونوں میں سے کسی ایک کے لئے یکساں بریل علامت کا استعمال درست ہے، جیسے مالک، ملک۔

مسائل مد:

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم میں مد کا تلفظ مد کے قاعدے یاد کرنے اور ان کی مشق کرنے سے آسانی سے ادا کئے جاسکتے ہیں، ہم انڈونیشیا اور ملیشیا کے دوستوں کے تجربات سے یہ سیکھ سکتے ہیں، کہ وہ بریل میں مد کی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔

رموز واوقاف:

ہم نے جائزہ لیا کہ تمام مطبوعہ اور بریل قرآنوں کا جو فی الحال ساری دنیا میں موجود ہے، عاصمؒ سے بروایت امام حفصؒ کے مطابق وقف، معانقہ اور سکتہ کی علامتیں ہیں، ہم نے دوسری علامات کا بھی مطالعہ کیا جو سجدہ، عجز، رکوع، اور آیت کے اختتام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

ان علامات کا موازنہ کرنے پر جو عرب اور غیر عرب قاریوں کے لئے مرتب کی گئی ہیں، ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس عمومی مقصد میں جس کے لئے یہ علامات مرتب کی گئی ہیں کوئی تضاد نہیں ہے، لیکن غیر عرب قاریوں کے لئے یہ علامات بہت زیادہ اور غیر ضروری ہیں، اور بعض اوقات وہ اشتباہ اور ابہام بھی پیدا کرتی ہیں، البتہ عرب قاریوں کے لئے علامات بہت بہتر ہے کہ وہ کم ہیں، ٹھیک اور سمجھنے کے لئے آسان ہیں۔

بائیں جانب سے پڑھنا:

ایک عام سا اعتراض یہ اٹھایا گیا ہے کہ نابینا قرآن کریم کو بائیں جانب سے کیوں پڑھتا ہے، اور حسب ضابطہ دائیں طرف سے کیوں نہیں پڑھتا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا مطبوعہ نسخہ ہمیشہ دائیں جانب سے پڑھا جاتا ہے، البتہ بریل میں بائیں طرف سے پڑھنے والی بات غیر محبوب اور ناپسندیدہ ہے، اسلام اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ تمام اچھے کام دائیں جانب سے شروع کئے جائیں اور سیدھے ہاتھ سے انجام دیئے جائیں۔

اس معاملہ میں حقیقت امر یہ ہے کہ نابینا لوگوں کی اکثریت جو قرآن کریم پڑھتے ہیں وہ دائیں ہاتھ کو اور خاص طور پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو استعمال کرتے ہیں، اور بائیں ہاتھ کو سطر سمجھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اگر بریل کو دائیں سے بائیں طرف پڑھا جائے تو نابینا کو بڑی دشواری ہوگی، اس کو اپنا ہاتھ لگا کر اس کو کرنا پڑے گا یا اس کو اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی پڑھنے میں استعمال کرنی ہوگی اور دائیں ہاتھ سے سطریں تلاش کرنی ہوں گی، اور اس طرح پڑھنے والے کا ہاتھ بھونڈے اور بے ہنگم طریقہ پر ہوگا اور پڑھنے کا تجربہ بھی تکلیف دہ ہوگا۔

فائق اور مقدم طریقہ:

قادر مطلق اللہ نے نابینا آدمی کے لئے اسے آسان بنایا ہے، اور دین اسلام میں اس کو فوقیت عطا فرمائی ہے، مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ کے طواف کی سمت گھڑی کے گھومنے کے متضاد ہے، یا یہ کہ وہ بائیں جانب سے طواف شروع کرتا ہے، ایک شخص طواف بیت اللہ بائیں طرف سے شروع کرتا ہے ہمارے علماء نے اس کے سبب کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ اللہ نے ہم کو اپنے دل کے ساتھ بنایا ہے، جو ہمارے جسم کے بائیں جانب ہے، بائیں جانب سے ہمارے طواف کی وجہ سے ہمارا دل دوران طواف اللہ کے گھر اور اللہ کی رحمت سے قریب تر ہوتا ہے۔

نابینا افراد کی حیثیت سے ہمیں خود کو خطا کار سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس حقیقت کو محسوس کرنا چاہئے کہ باوجود یہ کہ ہم قرآن پاک بائیں جانب سے پڑھ رہے ہیں، ہمارے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اللہ کی رحمت اور اس کی مہربانی کو محسوس کرتی ہے۔

محدودیت:

ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بریل علامات اپنی طبعی ساخت میں قرآن پاک کے مطلوبہ رسم الخط جس کا عثمانی معیار تقاضہ کرتا ہے نہ اس کے تمام ضابطوں کو سمیٹ سکتا اور نہ ہی ان تمام کو بروئے کار لانا ممکن ہے۔

ترتیب اور استعداد:

یہ توقع غیر امکانی ہے کہ ایک Analog system ہندی نظام (Digital System) کا بوجھ اٹھا سکے، اس طرح ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ کار جو سڑک پر چلنے کے لئے بنائی گئی ہے، وہ پانی پر کشتی کی طرح نہیں چل سکتی ہے، نقل وحمل کے دونوں ذرائع مختلف ہیں، ایک خچر ایک ہاتھی کا وزن لے کر نہیں چل سکتا۔

قابل طباعت حروف ہجاء کا استعمال بریل حروف سے، بہت مختلف ہوتا ہے، طبع شدہ حروف کی بنیاد رسم الخط پر ہوتی ہے اور بریل حروف ہجاء کی بنیاد تلفظ اور آواز پر ہوتی ہے، یہ اپنے طریقہ استعمال کے ساتھ دو مختلف نظام ہیں:

متبادل:

بریل نظام پر اس ساری بحث وتکرار کے بعد یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ فی الحال موجودہ بریل نظام کے علاوہ ہمارے پاس کوئی متبادل موجود نہیں ہے، جس کے ذریعہ نابینا شخص قرآن پاک کو لکھ اور پڑھ سکے۔

اصل اور متبادل:

وضو کے لئے پانی کا استعمال طہارت کے حصول کے لئے اساسی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جب پانی نہ ملے تو ہم طہارت حاصل کرنے کے لئے مٹی کا استعمال کر کے تیمم کا سہارا لیتے ہیں، تیمم وضو کا متبادل ہے۔

بالکل اسی طرح عثمانی رسم الخط قرآن کریم کو تحریر کرنے کے لئے اصلی معیار رسم ہے، لیکن جب ہم نابینا لوگوں کے لئے اس رسم الخط کو استعمال نہیں کر پاتے تو قرآنی عربی بریل علامات اس کے متبادل کا کردار ادا کرتی ہے، اور یہ نابینا شخص کے لئے متبادل بن جاتی ہے۔

رموز القرآن:

چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ "کیا ہم بریل، یعنی نقطوں کی زبان کو قرآن کے حروف تصور کر سکتے ہیں؟" ہاں ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ بریل حروف/ رموز القرآن یا قرآنی علامات کے طور پر حروف القرآن کے مساوی ہیں نشان یا کوڈ کو عربی میں الرمز الاشارہ یا العلامۃ کہتے ہیں، بریل بطور نشان یا علامت کے یقینا مذکورہ بالا اصطلاحات پر صادق آتی ہے۔

ذریعہ ابلاغ کی ایک گاڑی کی حیثیت سے بریل میں حتمی طور پر اہلیت ہے کہ وہ اپنے کوڈ علامات کی گاڑی کے ذریعہ تمام ضروری تلفظات اور زبان و آواز کی نمائندگیوں کو جو قرآن پاک کی حفاظت کے لئے مطلوب ہیں بہ حسن وخوبی مل سکتی ہے باذن اللہ۔

روح برقرار رکھی جاتی ہے:

حروف القرآن گویا کہ ایک گاڑی ہے جو قرآن پاک کے رسم الخط کو طباعت تک منتقل کرتی ہیں۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ رموز القرآن ایک گاڑی ہے جو قرآن مقدس کی آواز کو بریل میں منتقل کرتی ہے۔

چنانچہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہم توجہ مرکوز رکھتے ہیں کہ عثمانی رسم الخط کی روح ہر وقت زندہ رکھی جائے اور اس وقت بھی جب ہم بریل کو ایک تلفظی کوڈ یا علامت جو رموز القرآن ہے، استعمال کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر سورہ تحریم آیت نمبر ۱۰ را یک مونث لفظ 'امرآۃ ت' و 'امرأت' لمبی تاء کے ذریعہ لکھا جائے۔ حالانکہ یہ دونوں تاء ایک جیسی آواز پیدا کرتے ہیں اس کے باوجود ہمارے لئے جائز نہیں ہوگا کہ ہم بریل علامت (نقطہ نمبر ۱، ۶) جو گول تاد کی نمائندگی کرتی ہے اس کو استعمال کریں بلکہ ہمارے لئے لازمی ہے کہ ہم وہاں لمبی تاء (نقطہ ۲، ۳، ۴، ۵) استعمال کریں، جیسا کہ عثمانی معیار تقاضہ کرتا ہے۔

علامات کے ذریعہ قرآن کا تحفظ:

بریل کی ایجاد اور نابینا لوگوں کے ذریعہ اس کا استعمال بہت نیا ہے اور عربی بریل میں قرآن پاک کا آغاز وارتقاء ایک صدی سے زیادہ نہیں ہے، لہذا بریل کے مسائل، اس کے حدود اور ضابطوں کے تحفظ اور اعادہ کی یقینی طور پر ضرورت ہے، ان مسائل پر ترقی اور تحقیق کے لئے خصوصی کمیٹیاں بنانے کی ضرورت ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ تحقیقی کام کو آگے بڑھائیں جہاں ہم بنیاد رکھ سکیں یا خصوصی بریل کوڈ یا علامات تشکیل دے سکیں، جو مطلوبہ تلفظات کی نمائندگی کرتے ہوں۔

ثواب:

قرآن پاک کا بریل میں منتقل کرنا حرام نہیں ہے، بلکہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کو بریل میں نقل کرنا اور اس میں اس کا تحفظ کرنا جائز اور درست ہے، بلکہ یہ ثواب اور اللہ رب العزت کی جانب سے اجر کا ذریعہ ہے۔

ہمارا مقصود قرآن کریم کو درست وصحیح طریقہ پر بریل میں منتقل کرنا ہے (باذن اللہ) اور یہ فرض منصبی کسی بھی قیمت پر ادا کرنا ہے۔

قادر مطلق اللہ سبحانہ وتعالی اپنے کلام قرآن مقدس کی حفاظت کرے گا ان راستوں سے بھی جن کو ہم نہیں جانتے، جیسے کہ اس نے حفاظت کی الفاظ کے ذریعہ، یادداشت کے ذریعہ، رسم الخط کے ذریعہ اور کوڈ اور علامات کے ذریعہ۔

نتیجہ:

ہمیں یقین ہے کہ عربی قرآنی بریل کوڈ رموز القرآن ہیں، اور یقینی طور پر لفظ ''الذکر'' کے ذیل میں آتا ہے۔ جیسے کہ عثمانی نظام اور حروف القرآن الہامی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ بریل کوڈ موز القرآن کی حیثیت سے قبول کرے اور قرآن کو منتقل کرنے کا عمل اس کے دربار میں اجر کا استحقاق حاصل کرلے، اللہ تعالی نے قرآن میں وعدہ کیا ہے:

قال تعالی: ''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ'' (سورۂ قمر: ۱۷)

(اور یقینا ہم نے قرآن کو سمجھنے اور یاد کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، تو ہے کوئی جو اس کو یاد کرے یا اس سے نصیحت حاصل کرے)۔

''إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون'' (سورۂ حجر: ۹)

(بیشک ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

اللہ قادر مطلق یقینا اپنے کلام کو نابینا لوگوں کے لئے محفوظ کرے گا)۔

☆☆☆

نابیناؤں کے لئے قرآن کی کتابت، طباعت وتعلیم

مولانا محمد ارشاد قاسمی[1]

اللہ تبارک وتعالیٰ کا بہت ہی بڑا احسان ہے کہ ''فقہ اکیڈمی، انڈیا'' نے ایک بہت ہی اہم موضوع ''بریل میں قرآن کریم'' پر سیمینار کا پروگرام بنایا ہے۔ جو کہ نابینا اور بریل اساتذہ لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے نیز جو بینائی سے محروم ہیں اور بالمشافہ، براہِ راست قرآن پاک پڑھنے کی حسرت اپنے دل میں رکھتے ہیں ان کے لئے امید کی کرن ہے۔ فالحمدللہ

اللہ تعالیٰ جملہ علماء وماہرین قرآن وسنت کو اجر عظیم عطا فرمائے، نیز ان معذورین کے حالات ومسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی رعایت میں قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح ومعتدل فیصلہ کی جانب رہنمائی فرمائے۔

بندہ بھی الحمدللہ ادارۂ دینیات میں ''عربی بریل'' کے ذریعے نابینا حضرات کے دینی تعلیم اور ان کے لئے بریل میں کتابیں تیار کرنے کی خدمت پر مامور ہے۔ ''عربی بریل'' میں رسم عثمانی سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل تھے جو کہ انفرادی طور پر مفتی حضرات نیز بریل کے ماہر حضرات سے استفسار پر یا تو ''جواز وعدمِ جواز'' کے درمیان معاملہ رہا یا بریل ماہرین کی جانب سے ''بریل قرآن'' میں رسم املائی کی گنجائش کا فرمان رہا۔ بہرحال کوئی حتمی بات کھل کر نہ آسکی، لہٰذا یہ موقع بہت ہی غنیمت ہے کہ فقہی سمینار میں علماء کا اس ''نازک مسئلہ'' پر قیمتی اجتماع ہو رہا ہے ان شاء اللہ ضرور اس مبارک اجلاس کی برکت سے اس نازک مسئلہ کا حل نکل سکے گا۔

بندہ کی ناچیز معروضات پیش خدمت ہے۔

☆ بریل میں قرآن کریم کے منتقل کرنے کے جواز کے تعلق سے عرب علماء کی تحریرات وآراء سے بندہ کی ناقص رائے کے مطابق کسی حد تک اطمینان ہوتا ہے، لیکن ''بریل قرآن'' میں کچھ مقامات پر ''رسم عثمانی'' کی ترتیب کے متعذر ہونے پر ''رسمِ املائی'' کے لئے جو ''وجہِ رخصت'' پیش کی گئی ہے بچند وجوہ زیر غور ہے:

سب سے پہلے ان حضرات کے ''اقوال'' کو ذکر کیا جائے گا بعدہ اُس پر باعتبار ''بریل'' تجزیہ کیا جائے گا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ''فیصلہ'' حضرات مفتیانِ کرام کا ہوگا۔

☆ رائج ومتداول ''بریل قرآن کریم'' کی ضخامت کو کم کرنے اور نابینا لوگوں کے لئے تلاوت کو آسان بنانے کے پیشِ نظر کئی طریقے اپنائے جاتے ہیں تو کیا ان تمام صورتوں میں مندرجہ ذیل تبدیلیوں کی گنجائش ہوگی؟ مثلاً:

مسئلہ (۱): ابدالِ اعراب بالحروف:

''بریل قرآن'' میں مٰلِكِ کو مَالِكِ (باثبات الالف) لکھا جاتا ہے، جبکہ ''بریل'' میں (مٰلِكِ m`leke) کھڑا زبر کے ساتھ لکھنے کی گنجائش ہے؟

وجہ: کھڑا زبر'' تلفظ میں الف کے مساوی ہے۔ لہٰذا تلفظ اور شناخت میں آسانی کے لحاظ سے اس کو الف سے بدلا جائیگا۔

تجزیہ: (۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ''بریل نظام'' میں وسعت ہے کیوں کہ اس میں ہر ایک چیز کا نمبر متعین ہے، نیز بریل میں ''کھڑا زبر

[1] ادارۂ دینیات ''شعبہ بریل کتب'' فائن ٹچ بمبئی سینٹرل ۸۔

''ہونے کی شکل میں طلباء کو کوئی دقت بھی پیش نہیں آتی ہے جو کہ مختلف مقامات پر کثیر الاستعمال بھی ہے۔ اور اگر یہ آسانی پیش نظر ہے تو کھڑا زبر والے جتنے بھی کلمات ہیں سب کو ''الف'' سے بدل دینا چاہئے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، لہٰذا یہ تکلف غیر معقول ہے۔

مسئلہ (۲): حذف الحروف:

زوائد حروف والے قرآنی کلمات میں سے ''غیر متلو'' حرف کو حذف کر کے تلاوت کے مطابق کر دیا جاتا ہے مثلاً:

مَلَإِيْهِمْ کو مَلَيْهِمْ، لِشَايْءٍ کو لِشَيْءٍ وغیرہ۔

وجہ:.....طلباء کو اشتباہ سے بچانے کے لئے کہ وہ زوائد حروف کو بھی نہ پڑھ لیں، کیوں کہ بزعم خویش ''بریل کے اعتبار سے جو لکھنے میں آئیگا وہ پڑھنے میں آئے گا''۔

مسئلہ (۳): ابدال الحروف بالحروف:

نابینا حضرات کو تلاوت میں مغالطے اور اشتباہ سے بچانے کے لئے ''ابدال'' (ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل دینا) کی شکل اپنائی جاتی ہے مثلاً: الصلوٰة کو الصلاة (باثبات الالف)، الزکوٰة کو الزکاة (باثبات الالف) کر دیا جاتا ہے۔

تجزیہ:..... یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے کیونکہ جب انہیں ہدایت کر دی جائے گی تو مغالطہ کا امکان نہیں رہے گا۔ نیز اسی ضابطہ اور اصول کو مان بھی لیا جائے (جبکہ بریل کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں ہے) تو اس طرح کے دیگر زوائد حروف والے کلمات میں اس انداز کو کیوں نہیں اپنایا جاتا ہے، جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مثلاً: مِائَة (باثبات الالف الزائد) لٰكِنَّا (باثبات الالف الزائد) وَجَائَ (باثبات الالف الزائد) علی حالہ مذکور ہیں۔

مسئلہ (۴):..... حروف مدہ والے کلمات سے ان کے وہ اعراب جو مد اور غیر مد میں وجہ شناخت ہیں ان کو ختم کر کے صرف حروف مدہ (خالی عن الاعراب) ہی رکھے جاتے ہیں گویا کہ حروف مدہ ''خالی عن الاعراب'' ایک کوڈ بن گیا، قرآن میں حروف مدہ والے کلمات با اعراب ہی کھینچنے اور نہ کھینچنے کی شناخت ہیں مثلاً:

☆ الف مدہ والے کلمات میں الف: ماقبل کی حرکت سے خالی ہے۔ جیسے: ''قالَ''۔

☆ واو مدہ والے کلمات میں واو: جزم اور ماقبل پیش کی حرکت سے خالی ہے۔ جیسے: ''قالوا''۔

☆ یاء مدہ والے کلمات میں یاء: جزم اور ماقبل زیر کی حرکت سے خالی ہے۔ جیسے: ''فی''۔

وجہ:..... ''اعراب'' اصل نہیں ہیں لہٰذا مخصوص مقامات سے انہیں ختم کر کے بریل میں سیل کی زیادتی سے اجتناب کیا جا سکے تا کہ نابینا کو کم از کم انگلی گھمانا پڑے جو کہ بریل کا ضابطہ ''اختصار'' ہے۔ نیز قرآن کا مقصود تلاوت، تلفظ ہے نہ کہ اس کے الفاظ۔

تجزیہ:..... اس تبدیلئ اعراب کی وجہ سے عربیت سے ناواقف ابتدائی طلباء کو کھینچنے اور نہ کھینچنے کی شناخت میں اشتباہ ہوتا ہے طالب علم تردد کا شکار ہو جاتا ہے کہ آیا اس کو کھینچوں یا نہیں مثلاً: ''فی انفسکم فی الأرض قالوا ابلی قالوا الئن'' مزید ان کلمات کو مابعد سے ملانے کی شکل میں مد کی حیثیت کو پہچاننا مشکل ترین امر ہے نیز یہ ذوق تو عربی زبان سے واقفیت پر مبنی ہے۔

مسئلہ (۵): اختصار [contraction]:..... بریل میں دو حرفوں [cell] کے قائم مقام ایک ایسا نمبر متعین کیا جاتا ہے جو ان دو حرفوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً: ''لا'': دو حرفوں سے مرکب ہے۔ لام، الف۔ بریل میں لام کا نمبر (۱، ۲، ۱۳)، الف کا نمبر (۱ a ہے۔ بریل میں ایک ایسا نمبر متعین کر دیا گیا ہے جو ان دونوں کے مجموعے کی جانب مشیر ہو جیسے: ۱، ۲، ۳، ۶ ۷ لا: (مرکب) متعین کر دیا گیا ہے۔

وجہ:......اختصار کے پیش نظر ایسا کیا جاتا ہے۔تاکہ کتاب کی ضخامت کو کم کیا جاسکے، نیز چوں کہ نابینا طلبا ''بریل'' کے ایک لفظ کو پہچاننے کے لئے اس لفظ کے تمام حروف پر یکے بعد دیگرے انگلی سے ٹٹولنے کے بعد ہی اس لفظ کی شکل اس کے ذہن نشین ہوتی ہے اختصار کی بنیاد پر نابینا کو ٹٹولنے کی زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑتی ہے۔

مسئلہ(۶):...... بسم اللہ الرحمن الرحیم کو سورۂ فاتحہ کا جز قرار دے کر آیت نمبر ایک دیں گے یا نہیں، انعمت علیہم پر علی اختلاف الاقوال آیت نمبر کو حذف کریں گے یا نہیں۔

نوٹ:......مذکورہ تمام باتوں میں ہم اپنے سامنے پرنٹ شدہ سعودی مصحف اور غیر سعودی مصحف کو سامنے رکھیں گے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

بندہ کا موقف یہ ہے کہ:

☆ نابینا حضرات کی باعتبار دینی تعلیم اضطراری ضرورت کی بنیاد پر بریل قرآنِ کریم بترتیب عثمانی گنجائش ہونی چاہئے کیوں کہ یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔چونکہ حصولِ علم کیلئے براہِ راست استفادہ کرنے کے لئے اس نظام کے متبادل کوئی دوسرا نظام نہیں ہے۔

☆ جب بینا حضرات کے لئے پوری دنیا میں قرآنِ کریم ''براویت حفصؒ'' رسم عثمانی کی ترتیب پر دو طرح سے طبع ہوتے ہیں ''عربی قرآن'' (جس میں اہلِ عرب کے ذوقِ عربیت کا لحاظ کیا گیا ہے باعتبار ''اعراب ورموز'')، ''غیر عربی قرآن'' (جس میں اہل عجم کے ذوق کا لحاظ کیا گیا ہے باعتبار ''اعراب ورموز'') بعینہ اسی طرح بریل قرآن بھی ہونا چاہئے۔نیز رسم عثمانی کی ترتیب کی مکمل رعایت کی جائے۔

☆☆☆

بریل رسم الخط میں قرآن کریم کو منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

قاضی معز الدین ندوی ؎

۲۴واں سیمینار ایک ایسے موضوع پر بھی مشتمل ہے جو ہمارے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ ہمارے لئے اور ان تمام لوگوں کے لئے جو بینائی سے محروم ہیں اور قرآن پڑھنے کی حسرت اپنے دل میں رکھتے ہیں ایک امید کی کرن ہے۔ بریل رسم الخط میں قرآن کریم کو منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو عرصہ سے الجھن کا سبب بنا ہوا ہے۔

ہمارے ملک میں ۱۵ ملین یعنی ڈیڑھ کروڑ نابینا رہتے ہیں۔ مسلم نابینا لوگوں کی تعداد کا کوئی سروے موجود نہیں ہے۔ لیکن آبادی کے اوسط کے مطابق ہندستان میں ۳۰ لاکھ سے زیادہ مسلم نابینا آباد ہیں۔ نابینا لوگوں کے لئے ہر سطح پر تقریباً ہر ضلع میں عصری تعلیم کا نظم موجود ہے۔ لیکن یہ ایک افسوسناک صورتحال ہے کہ پورے ملک میں ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں ہے جو بریل کے ذریعہ قرآنی تعلیم کا انتظام کرتا ہو۔ چند مدارس میں نابینا بچے داخلہ لیتے ہیں، لیکن ان کے لئے صرف حفظ کی تعلیم کی سہولت ہوتی ہے۔ بہت سے نابینا بچوں کو مختلف وجوہات بتا کر ان کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کے باوجود واپس کر دیا جاتا ہے۔ مزید قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ عام طور پر عصری تعلیم گاہیں یا تو عیسائی مشنریاں چلاتی ہیں یا متعصب ہندو تنظیمیں، مسلم بچے بھی انھیں اداروں میں مجبوراً پڑھتے ہیں اور ان کے لئے آسان ہدف ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس غفلت پر ہمیں معاف فرمائے۔

گذشتہ پانچ سال قبل کچھ ابتدائی کوششیں ہوئیں اور الحمدللہ ملک بھر میں اس وقت ۱۷، ۱۸ مقامات پر مکاتب کی سطح کی تعلیم جاری ہے۔ مولانا حسن عبدالقادر مربی صاحب (جو ساؤتھ افریقہ میں رہتے ہیں اور مدرسۃ النور للمکفوفین کے مہتمم ہیں) نے درس نظامی کی بیشتر کتابوں کو بریل میں منتقل کرلیا ہے۔ ان کے مدرسہ میں نابینا طلبہ کے لئے بخاری شریف (دورہ) تک کی تعلیم کا نظم موجود ہے۔ اور یہ نابینا لوگوں کی دینی تعلیم کے نظم کی مثالی کوشش کی ہے۔ ہندوستان میں نابینا لوگوں کی دینی تعلیم، اور بریل میں قرآن کی طباعت کے لئے بھی وہ برسوں سے کوشاں ہیں۔ ممبئی کے ادارۂ دینیات فائن ٹچ نے ان کی رہنمائی میں اس پروجکٹ کو عملی جامہ پہنانے کا عزم ۲۰۰۹ء میں کیا۔ اور مکاتب کے ایک سلسلہ کی شروعات ہوئی۔ عاجز نے بھی بریل سیکھی اور ادارۂ دینیات کے تعاون سے ۱۴ صوبوں کے ۱۷ افراد کو بریل کی تعلیم اور نابینا لوگوں کی تربیت کے لئے تیار کیا۔ ادارہ دینیات ممبئی ان مکاتب کی نگرانی کرتا ہے اور نور القرآن، پارۂ عم اور دینیات کی پہلی کتاب بریل رسم الخط میں NAB Press Mumbai سے طبع کرا کر حسب ضرورت نابینا لوگوں کو مہیا کرواتا ہے۔ ہندوستان میں قرآن پاک کی بریل میں طباعت نہیں ہوتی ہے۔ ہندوستانی نابینا لوگوں کو قرآن پاک بڑی مشکل سے مل پاتا ہے۔ دنیا میں چند ممالک سعودی عرب، مصر، یمن، اردن، فلسطین، ایران، ترکی، ملیشیاء، انڈونیشیا، ساؤتھ افریقہ، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ بریل قرآن طبع کرواتے ہیں۔ ان ممالک سے قرآن پاک حاصل کرنا کافی دشوار ہے۔ درخواستیں بمشکل منظور ہوتی ہیں۔ پھر ٹرانسپورٹیشن بڑی مصیبت ہے۔ بریل قرآن کافی ضخیم ہوتا ہے اور نازک بھی، اگر مناسب احتیاط نہ برتی گئی تو ابھرے نقطے دب جاتے ہیں۔

ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں اتنی بڑی تعداد میں نابینا لوگ رہتے ہیں بریل قرآن کی طباعت نہ ہونا اور مسلمانوں کا کوئی بریل

؎ لیکچرار، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اقراء ایچ جے تھیم کالج، مہرون، جلگاؤں۔

پریس نہ ہونا افسوسناک اور قابل توجہ امر ہے۔

علماء کرام کے ایک طبقہ کا موقف یہ ہے کہ قرآن حکیم کی بریل میں طباعت جائز نہیں۔ کیونکہ بریل میں قرآن کی کتابت میں عثمانی رسم الخط کی اتباع ممکن نہیں ہے۔ اس لئے قرآن کے متن کو عربی رسم الخط کے علاوہ دوسرے رسم میں منتقل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

لیکن یہاں چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

☆ یہ بات محل نظر ہے کہ کیا بریل ایک رسم خط ہے۔ جسے دیکھ کر نہیں، بلکہ چھو کر پڑھا جاتا ہے یا رسم خط کی بجائے محض علامات (Codes) ہیں جو آوازوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

☆ بریل کے cells حروف کی بجائے آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کیونکہ انگریزی، مراٹھی، گجراتی یا کسی بھی زبان کے یکساں آواز رکھنے والے حروف کے لئے ایک ہی علامت استعمال ہوتی ہے۔

☆ بریل، تحریر کا ایک علامتی طریقہ ہے۔ اس میں تحریر شدہ آیات کو حروف القرآن کے بجائے رموز القرآن تصور کیا جائے تو زیادہ قرین قیاس ہے۔

☆ بریل میں ان ساری چیزوں کی علامات موجود ہیں جو ضبط تحریر میں آتی ہیں۔ اور ان علامات کے ذریعہ رسم عثمانی کی مکمل اقتداء کی جاسکتی ہے۔

☆ بریل قرآن پڑھنے والا نابینا شخص اس علامتی تحریر کی روشنی میں تجوید و ترتیل کے ان تمام قواعد کی رعایت اسی طرح کرسکتا ہے جیسے بینا شخص دیکھ کر پڑھے جانے والے قرآن میں کرسکتا ہے۔

☆ بریل وہ واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعہ نابینا شخص کو پڑھنے لکھنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اور ان کے لئے روایتی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اگر اسے اختیار نہ کیا جائے تو ان کی تعلیم کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ نہ قرآن کریم سیکھ سکتے ہیں نہ دیگر دینی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے بریل کو اختیار کرنا ان کی اضطراری ضرورت ہے۔

☆ بریل طرز تحریر کے ذریعہ قرآن کریم کی طباعت کرنے والوں میں زوائد کے حذف اور مخففات کے اختیار کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ضخامت کو کم کرنا اور نابینا لوگوں کے لئے تلاوت کو آسان بنانا ہے۔ جیسے الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ کو الصلاۃ اور الزکاۃ لکھا جائے۔ ایک بینا شخص جب لفظ الصلوٰۃ کو دیکھتا ہے تو اس کے چھ حروف اور ان کی حرکات کو ایک ہی نگاہ میں دیکھ لیتا ہے البتہ نابینا شخص اپنے سیدھے ہاتھ کی پور سے پہلے الف پھر اس کی حرکت، پھر لام اور اس کی حرکت، پھر صاد اور اس کی حرکت، پھر لام اور اس کی حرکت، پھر واو اور اس کی حرکت پھر گول تاء اور اس کی حرکت کو ٹٹو لنے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض بینا جس چیز کو ایک نگاہ میں دیکھ لیتا ہے نابینا اسی کو آٹھ مرتبہ ٹٹول کر سمجھ پاتا ہے۔ نابینا لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنا اہم ترین ترجیحات میں شامل ہے۔ ہمارا موقف رسم عثمانی کی حتی المقدور رعایت کرتے ہوئے حسب ضرورت املائی رسم اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

☆ بریل قرآن کے لئے ایک عالمی تنظیم کام کرتی ہے۔ انٹرنیشنل یونین فار بریل قرآن سرویز (IBQS) جس سے تقریباً سبھی بریل قرآن طبع کرنے والے ادارے جڑے ہوئے ہیں۔ گذشتہ دو سالوں سے ان کی کوشش کا محور متحدہ بریل قرآن کوڈ (Unifide Braille Quran Code) ترتیب دینا ہے۔ مصری اور یمنی بریل آٹھ نقاط پر مبنی ہوتی ہے۔ (وہ لوگ اعراب حروف کے اوپر لکھتے ہیں) جب کہ دوسرے لوگوں کے نزدیک عربی بریل عام بریل کی طرح صرف چھ نقطوں پر مبنی ہوتی ہے (وہ لوگ اعراب حروف کے بعد لکھتے ہیں)۔ وہ مطابع جو عرب ممالک میں ہیں جیسے سعودی عرب، اردن، یمن، مصر اور فلسطین وغیرہ اور وہ جو غیر عرب ممالک میں ہیں جیسے ساؤتھ افریقہ، ملیشیاء،

انڈونیشیا، ترکی، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ ان دونوں کا موقف اعراب لگانے کے معاملہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بعض جگہ جہاں ہمارے یہاں اعراب ضروری سمجھا جاتا ہے اسکے بغیر بھی لوگ صحت کے ساتھ تلاوت نہیں کر سکتے ہیں۔عرب حضرات کا اصرار ہے کہ وہاں اعراب لگانا اصولی طور پر غلط ہے۔ بہرحال بڑا علمی اور تحقیقی کام ہے۔ بے شار مسائل قابل غور ہیں۔ مولانا حسن عبدالقادر مرچی صاحب نے دنیا بھر میں پرنٹ ہونے والے تمام بریل قرآن جمع کئے، ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور ان کے طرز تحریر (spelling style) میں موجود فروق کی فہرست تیار کی۔ علم الرسم اور علم تجوید کی روشنی میں مسائل اخذ کئے۔ اور اس کو سوالنامہ (Quetionair) کی شکل دی پھر IBQS کے تمام اراکین کی آراء منگوا کر ایک تجزیاتی رپورٹ تیار کی ہے۔ یہ متحدہ بریل کوڈ کی ترتیب کی جانب پیش رفت ہے۔ متحدہ بریل کوڈ کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں رہنے والا نابینا شخص جہاں بریل قرآن طبع نہیں ہوتا ہے اگر مطبع خادم الحرمین سعودی عرب سے بریل قرآن حاصل کر سکا تو وہ اس قابل ہو کہ وہ اس میں تلاوت کر سکے۔ اور اسی شہر میں دوسرے نابینا شخص کے لئے بریل قرآن کا حصول ملیشیا سے ممکن ہو سکا تو دونوں کا تفاوت کسی کنفیوژن کا سبب نہ بنے۔

الحمدللہ فقہ اکیڈمی نے بنیادی اور اصولی مسئلہ پر اہل علم و فتوی کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ اس بات کی درخواست ہے کہ فروعی مسائل بھی اہل نظر علماء کے سامنے رکھے جائیں اور ان پر بحث و تحقیق کی سبیل نکالی جائے۔

بہت معذرت اور ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علوم قرآن وحدیث سے وابستہ اصحاب اہل علم و نظر ضروری امور سے بے نیازی اور لا پرواہی برتتے ہیں تو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ خالص فنی مسائل پر علماء کرام کی جانب سے رہنمائی نہیں ملتی تو یونیورسٹیوں کے اسکالرس طبع آزمائی کرنے لگتے ہیں اور ان کے ناقص شعور کی وجہ سے بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے جس کو سنوارنا مشکل ہوتا ہے۔ بریل قرآن کے مسائل بھی کچھ ایسی ہی دشواری کا شکار ہیں۔

نابینا طبقہ ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے۔ عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی جانب نبی پاک ﷺ نے ایک دعوتی مصلحت کے تحت التفات نہیں فرمایا تو اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو تنبیہ فرمائی۔ آج صورتحال یہ ہے کہ عیسائی تنظیمیں سنہری موقع سمجھ کر نابینا لوگوں کے لئے کام کرتی ہیں، ان کے لئے اسپیشل اسکولیں کھولی جاتی ہیں، ہاسٹل بنا کر ہر عمر کے لوگوں کے لئے رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے، ان کے لئے تمام بنیادی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں، تاکہ متاثر ہو کر ان کا مذہب قبول کر لیں۔ اور ہم اقدامی عمل کیا اختیار کرتے دفاعی پوزیشن لینے کو بھی تیار نہیں ہے، بڑے افسوس کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اہل علم طبقہ کے پاس بریل قرآن کی طباعت اور نابینا لوگوں کی قرآنی تعلیم کا کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے، ان شاء اللہ فقہ اکیڈمی کا یہ اجلاس سنگ میل ثابت ہوگا

(لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا)۔



باب سوم- تفصیلی مقالات

نظم قرآنی کے بغیر محض ترجمہ شائع کرنا

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی [1]

۱- قرآن مجید کا محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی درست نہیں، دلائل درج ذیل ہیں:

علی بن ابی بکر اپنی کتاب "التجنیس والمزید" میں لکھتے ہیں:

"ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن"۔

"ومنها ما فى معراج الدراية: أنه يمنع من كتاب المصحف بالفارسية أشد المنع"

"ومنها ماقال فى شرح الهداية فتح القدير:" وفى الكافى: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، فإن فعل آية او آيتين لا" (جواہر الفقہ ۱/ ۹۹،۹۸)

بقول ابن الہمام ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس ممانعت میں شامل نہیں ہے، بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے۔

جواہر الفقہ (۱/ ۱۱۲ تا ۱۱۵) میں ترجمہ قرآن غیر حامل المتن کے تعلق سے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کا فتوی بھی منقول ہے جس میں دس دلائل سے اس کی حرمت مذکور ہے، ان میں سے بعض نقل کئے جارہے ہیں:

۱- "خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے، اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام...... پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے۔ اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا جیسا حدیث میں ہے:

"أمتهوكون أنتم كما تهوكت اليهود والنصارى" (مشکوۃ ۱/ ۳۰) جس طرح یہود و نصاری گڑھے میں گر گئے تم بھی اسی طرح جا گروگے۔

۲- مثلا دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے تو اس سے بھی ایک محذور لازم آئیگا۔

۳- اور اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسی بہانے سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر تو قرآن سے بالکل ہی بے تعلق اور اجنبی ہوجائیں گے...... ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہوجائے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ ہردوئی کی تصویب کے ساتھ "اشرف المدارس" سے ایک فتوی پیش ہے فتوی نمبر ۳۲۲۰ "جو قرآن پاک کہ صرف اس کا ترجمہ ہو، خواہ وہ اردو میں ہو یا ہندی یا انگلش میں اس کو شائع کرنا جائز نہیں الخ۔

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی تحریر فرماتے ہیں کہ "ترجمہ قرآن سے استغنا کا سبب بن جائے گا اور کچھ زمانہ گذرنے کے بعد ترجمہ کا نام ختم ہوکر قرآن کا نام پڑ جائے گا اور لوگ کہنے لگیں گے:" هذا قرآن بالانجليزية، وذاك قرآن بالفرنسية"، اس کے بعد کہتے ہیں:

[1] شیخ الحدیث و پرنسپل جامعہ دار العلوم مئو، مئو۔

''ولا ريب أن كل مايعرض الدين للتغير والتبديل، وكل مايعرض القرآن للإهمال والضياع حرام بإجماع المسلمين'' (مناهل العرفان ۲/ ۱۶۱، دار الکتب العلمیہ بیروت)

(بلاشبہ ہر وہ چیز جو دین کی تغیر وتبدیل اور قرآن کے اہمال اور ضیاع کا باعث ہوگی وہ باجماع امت حرام ہوگی)۔

شیخ زرقانی نے مجوزین ترجمہ کے دلائل اور ان کا رد بعدہ ان کے چھ شبہات اور ان کے جوابات پر چودہ صفحات پر محیط تفصیلی بحث کی ہے، مجوزین کے شبہات میں سے ایک شبہ اور اس کا جواب نقل کیا جارہا ہے:

''يقولون إن تبليغ هداية القرآن إلى الأمم الأجنبية واجب لما هو معروف من أن الدعوة إلى الإسلام عامة لاتختص بجيل ولا بقبيل وهذا التبليغ الواجب يتوقف على ترجمة القرآن لغير العرب بلغاتهم، لأنهم لايحذقون لغة العرب بينما القرآن عربي ومالايتم الواجب إلا به فهو واجب'' (مناہل العرفان ۲/ ۱۶۵ دار الکتب العلمیہ بیروت)

(امم اجنبیہ کو قرآن کا پیغام پہنچانا واجب ہے، کیونکہ دعوت اسلامی عام ہے جو کسی قبیلہ وقوم کے ساتھ مخصوص نہیں اور یہ پیغام موقوف ہے عربی زبان کے علاوہ میں (یعنی خود ان کی زبان میں) کیونکہ وہ قوم عربی زبان کے ساتھ ساتھ قرآن سے بھی ناآشنا ہے اور واجب کی تکمیل جس سے ہو وہ بھی واجب ہے، لہذا تبلیغ ان کی خود کی زبان میں واجب ہے)۔

''ونجيب على هذه الشبهة أولا بأن هذا تبليغ لايتوقف على ترجمة القرآن نعم تلك الترجمة العرفية الممنوعة، بل يمكن أن يحصل بترجمته على المعنى اللغوى السالف وهو تفسيره بغير لغته على ماشرحناه آنفا الخ'' (مناہل العرفان ۲/ ۱۶۵،۱۶۶)

اس شبہ کا جواب ہم اولاً یوں دیں گے کہ اس تبلیغ کا مدار اس ترجمۃ القرآن پر نہیں جو عرفیہ ممنوعہ ہے، بلکہ اس کا تعلق اس ترجمہ سے ہے جسے تفسیر کہتے ہیں اور یہاں ترجمہ بھی تفسیر ہوگا اور وہ غیر عربی میں ہو سکتی ہے۔

صرف ترجمہ قرآن کے حکم میں نہیں، دلائل درج ذیل ہیں:

''كتابة القرآن بلغة أخرى لايسمى قرآنا؛ لأن الترجمة نقل الكلام كما هو إلى لغة أخرى وهذا بالنسبة للقرآن مستحيل؛ لأنه معجز لذلك نقول هى تفسير. وإن كانت فى العرف ترجمة وتسميتها بذلك خطأ أو تسامح... تفسير القرآن بغير اللغة العربية لايأخذ حكم القرآن اذلايسمى قرآنا فيجوز مسه وحمله لغير الطاهر'' (رأی الدکتور نور الدین ماخوذ از محاضرات الدورة التاہلیة الثانیة للائمة والخطباء/ ص ۳۱۳)۔

اسی محاضرہ کے (/ص ۳۱۶) پر ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی رائے یوں ہے:

''قال فى كتابه اصول الفقه الاسلامى مانصه''...وترجمة القرآن لايعد قرآنا مهماكانت الترجمة فلا تصح الاعتماد عليها فى استنباط الأحكام الشرعية...ولا تصح الصلوة بالترجمة ولا يتعبد بتلاوتها''

(ترجمہ قرآن قرآن نہیں نہ تو احکام شرعیہ میں اس پر اعتماد درست ہے نہ ہی ترجمہ سے نماز درست ہے اور نہ اس کی تلاوت عبادت کا درجہ رکھتی ہے)۔

نیز اسی کے (/ص ۳۱۷ تا ۳۲۱) پر یہی رائے شیخ محمد رمضان بوطی کی بھی ہے، شیخ زرقانی لکھتے ہیں:

''ويجرى هذا المجرى مقصد القرآن الثالث وهو كونه متعبدا بتلاوته. فإنه لايمكن أن يتحقق فى الترجمة؛ لأن ترجمة القرآن غير القرآن قطعا الخ'' (مناہل العرفان ۲/ ۱۵۵ دار الکتب العلمیہ بیروت)، ''ولأن ترجمة القرآن من قبيل التفسير وليست قرآنا؛ لأن القرآن هو اللفظ العربي المنزل على سيدنا محمد ﷺ فلاتكون الترجمة قرآنا لانعدام الاعجاز، ولذالم تحرم قراءة الترجمة على الجنب والحائض ولا يحنث بهامن حلف لايقرء القرآن''

(ترجمہ قرآن تفسیر کے قبیل سے ہے قرآن نہیں ہے، اعجاز وغیرہ نہ پائے جانے کے سبب اسی لئے جنبی وحائض ترجمہ قرآن چھوسکتی ہے اور قرآن نہ پڑھنے کی قسم کھانے والا اگر ترجمہ پڑھ لے تو وہ حانث فی الیمین نہ ہوگا)۔

فتاوی ابن باز ۲۴/۳۴۰ کی تحریر بھی پیش ہے:

"ترجمة معاني القرآن فلاحرج في أن يمسه الكافر...أي أن الترجمة تفسير لمعاني القرآن، فإذا مسه الكافر ومن ليس على طهارة فلا حرج؛ لأنه ليس له حكم القرآن"۔

(قرآن کا ترجمہ اگر کوئی کافر چھوئے تو کوئی حرج نہیں..... یعنی ترجمہ قرآن تو تفسیر ہے معانی قرآن کی، اس لئے کافر یا محدث کے چھونے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ قرآن کے حکم میں نہیں)، مفتی عبدالستار نائب مفتی خیر المدارس ملتان خیر الفتاوی (۱/۲۱۶ تا ۲۱۸) پر ترجمہ کے غیر قرآن ہونے وعدم اجازت پر مفصلاً گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طبائع میں خودرائی وخودنمائی کا غلبہ ہے، جس نے بھی الٹے سیدھے چار حروف پڑھ لئے ہیں وہی اجتہاد اور محقق بن رہا ہے، اجازت کی صورت میں نہ معلوم کن کن لوگوں کے تراجم شائع ہوں گے اور ان میں بھی وہ کیا کیا گل کھلائیں گے اور افہام وتفہیم مستبعد اور احقاق حق قریب قریب محال ہوجائے گا تو اس طرح تحریف مراد خداوندی کا ایک ایسا دروازہ کھل جائے گا جس کا بند کرنا بس سے باہر ہوگا، بہت سے لوگ اسے بلا وضو چھوئیں گے، حالانکہ احتراماً اس کا بلا وضو چھونا درست نہیں، ایسے تراجم پرانے ہونے کی صورت میں ردی میں اس طرح سے فروخت ہوں گے جیسا کہ عام اردو کی کتابیں"۔

یہی بات جواہر الفقہ (۱/۱۱۳) پر بحوالہ عالمگیری موجود ہے، گو کہ اس کے خلاف بھی ماقبل میں تحریر کیا جاچکا ہے، مولانا کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: "خالص ترجمہ کی اشاعت میں تغیر وتبدل کے امکانات زیادہ ہیں، اس لئے اس پر اقدام کرنا مسلمانوں کے لئے قرین صواب نہیں" (کفایت المفتی ۱/۱۶۹)۔

جہاں تک غیر مسلمین کے دینے میں بے حرمتی کا اندیشہ ہے تو اس کے متعلق مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی رائے ہے کہ اگر اطمینان ہو کہ وہ بے حرمتی نہیں کرے گا تو اس تاکید کے ساتھ دیا جاسکتا ہے کہ غسل کر کے ہی چھوئے اور پڑھے (دیکھئے آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱/۶۳) لیکن راجح یہ ہے کہ چاہے غسل کرے یا نہ کرے، بہر دو صورت کافر کو چھونے اور پکڑنے سے منع کیا جائے گا، یہی شیخین کا مسلک ہے، حضرت امام محمدؒ کے نزدیک غسل کرلے تو اجازت ہوگی:

"ويمنع النصراني من مسه (المصحف) وجوزه محمد إذا اغتسل" (درمختار ۱/۳۲۲ زکریا) (قوله جوزه محمد) "جزم به في الخانية بلاحكاية خلاف ما قال في البحر، وعندهما يمنع مطلقا" (ردالمحتار على الدر ۱/۳۲۱ زکریا) الظاهر اعتماد الأول لانفراد محمد بهذا (طحطاوي على الدر ۱/۱۰۰ المكتبة العربية كانسي روڈ کوئٹہ پاکستان)

پہلا قول (یعنی شیخین کی رائے) حضرت امام محمدؒ کے منفرد ہونے کے سبب قابل اعتماد ہے۔

۲- رسم الخط عثمانی توقیفی ہے جس کی رعایت واجب ہے اس کے خلاف لکھنا موجب گناہ ہے۔

"وقال ابن الفارس الذي نقوله إن الخط توقيفي لقوله تعالى: "علم بالقلم علم الإنسان ما لم يعلم" الخ" (اتقان ۲/۱۶۶ مطبعة الازهريه مصر) "قال مولانا الشيخ المقرى عبدالرحمن المحدث الفاني فتي في رسالته المسماة بتحفة النذريه: واعلم أن رعاية رسم الخط العثماني واجب والكتابة بخلافه إثم. وبهذا واجب على كتاب المصاحف أن يتعلموا رسم الخط العثماني، وإلا إن غلطوا وخالفوه فيستحقون العذاب. وقال: واعلم أن رسول الله ﷺ لما نزلت عليه آية أوسورة دعا الكاتب وأمر لكتابته وأمر أن يكتب هذا الحرف كذا وهذا الحرف كذا بتعليم جبرئيل عليه السلام، وفي زمان حياته ﷺ بعض الصحابة خفظوه على ظهر قلب من أوله إلى آخره" (منه افضل الدرر قلمی/ص ۴)۔

المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے (ص ۱۷۶ تا ۱۷۸) میں بھی رسم الخط عثمانی ہی کو اختیار کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے "عثمانی رسم الخط کو چھوڑ کر موجودہ املائی رسم الخط کو پڑھنے کی آسانی کی غرض سے اختیار کرنا دراصل پھر دوسری تبدیلی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ یہ املائی رسم الخط ایک نوع اصطلاح ہے جو آئندہ کسی دوسری اصطلاح میں بدل سکتی ہے اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں قرآن کے بعض حروف میں کمی اور زیادتی اور تبدیلی کی صورت میں قرآن کے اندر تحریف کا خدشہ

بن جائے گی اور گذرتے ایام کے ساتھ قرآن کے مختلف نسخوں میں فرق واقع ہوجائے گا..... قرآن کی کتابت میں اگر عثمانی رسم الخط کی پابندی نہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کررہ جائے گی کہ جب جب کسی انسان کو کوئی نیا خیال سمجھ میں آئے گا تو اسے بروئے کار لے آئے گا کوئی اسے لاطینی زبان میں اور کوئی اور زبان میں تحریر کرنے کی تجویز پیش کرے گا جو ایک خطرناک عمل ہے اور مفاسد کا ازالہ مصالح کے حصول سے زیادہ اہم ہے..... جہاں تک بچوں کے لئے قرآن کریم کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کا سوال ہے، جو موجودہ املائی رسم الخط کے عادی ہوتے ہیں تو اس ضرورت کی تکمیل اساتذہ کی تلقین سے ہوجاتی ہے الخ۔

فضیلۃ الشیخ المقری اظہار احمد تھانویؒ بہت ساری روایات پیش کرنے کے بعد اس شعر: واعرف لمقطوع وموصول وتا-فی مصحف الامام فیما قد أتی. . . کے تحت لکھتے ہیں:

ان روایات سے اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہوجاتا ہے کہ قرآن کریم کے رسم کا توقیفی وسمائی ہونا بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، یعنی قرآن کریم کی تمام کتابت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ اور تعلیم سے مکمل ہوچکی تھی..... لہٰذا مابعد کے ہر دور میں یہی رسم قرآنی مقرر ہوگیا حتی کہ زمانہ ابوبکر صدیقؓ پھر زمانہ حضرت عثمان غنیؓ میں بھی اسی رسم کی اتباع برابر جاری رہی (الجواہر النقیہ فی شرح المقدمۃ الجزریہ، ص ۲۱۷ تا ۲۱۹ مطبع قرأت اکیڈمی فلاح دارین ترکیسر گجرات)۔

مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں: کہیں انگریزی رسم الخط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے تو کہیں ہندی و گجرات میں جو باجماع امت ناجائز ہے، خصوصا ہندی وانگریزی رسم الخط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہوگی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمت اسلام سمجھ کر کیا جارہا ہے اور اس کے لئے بہت سی مصالح دینیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع ہے نہ ضرورت، کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں..... ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماع امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی..... الخ (جواہر الفقہ ۱/ ۱۱۰)۔

الجواہر النقیہ کے (ص ۲۱۹) پر مولانا تھانوی تحریر فرماتے ہیں: تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن اجمالی تصور یہ رکھئے کہ قرآن مجید میں بہت سے کلمات کا رسم عام قواعد رسم کے خلاف ہے، مگر باجماع امت اسی رسم میں قرآن لکھنا فرض وضروری قرار دیا گیا ہے" ایک تحریر پیش کی جارہی ہے، جو جامع ازہر کے علماء کے فتاویٰ سے ماخوذ ہے:

"وهذا واضح فى توقيفة الخط القرآنى من جهة، وفى انعقاد إجماع الأصحاب رضوان الله عليهم على وجوب اتباع المرسوم العثمانى، وحرمة مخالفته من أخرى" (كف اللسان عن مخالفة رسم خط القرآن: ۱۲۷ اعجاز مشن پریس حیدرآباد)

خط قرآنی کا توقیفی ہونا نیز صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا رسم عثمانی کے اتباع پر اجماع واضح طور پر اس کے خلاف کی حرمت پر دلالت کرتا ہے۔

"وقال السخاوى فى جمال القراء: المراد أنهما يشهد ان على ان ذلك المكتوب كتب بين يدى رسول الله ﷺ أو المراد أنهما يشهد ان على أن ذلك من الوجوه نزل بها القرآن. قال أبوشامه: وكان غرضهم أن لايكتب إلا من عين ما كتب بين يدى النبى ﷺ" (اتقان ۱/ ۵۸ نیز دیکھئے: اتقان ۲/ ۷۶ المطبعة الازهريه مصر)

علامہ سیوطی نے اس کے قبل ابن ابی داؤد کی تخریج کردہ ایک روایت بطریق ہشام بن عروہ پیش فرمائی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ جو کوئی کتاب اللہ کی کوئی سورہ یا آیت پر دو گواہ پیش کرے اسے لکھ لو، علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس شہادت کا تعلق اس بات سے ہے کہ اس کا رسم وہی ہو، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا یا اسی طرح ہے جس طرح نازل کیا گیا محدث ابوشامہ فرماتے ہیں کہ اس شہادت کی غرض یہ تھی کہ قرآن کا رسم وہی ہونا چاہئے جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا۔

"وأن نقتدى فى كتبنا القرآن بكتبه لجعله المصحف إما ما متبعًا لكل من يكتب القرآن. فلا يجوز لمن أراد أن يكتب مصحفا أن يكتبه على خلاف الرسم العثمانى" (الكوكب الدريه/ ص ۲۴. الشيخ محمد الشهيد بالجواد بن على بن خلف الحسينى المالكى الازهرى)

جو کوئی قرآن لکھے تو اسے مصحف امام کا اتباع کرنا چاہئے، رسم عثمانی کے خلاف لکھنا بالکل جائز نہیں، اس کی تائید الوسیلہ فی کشف العقیلہ للسخاوی، کتاب

المقنع لابی عمرو الدانی (ص ۱۰-۱۱) سے بھی ہوتی ہے۔

شیخ زرقانی نے علماء کرام کے تین نقاط نظر:

''الرأی الأول أنه توقیفی الخ والرأی الثانی أن رسم المصاحف اصطلاحی لاتوقیفی الخ والرأی الثالث یمیل صاحب التبیان ومن قبله صاحب البرهان إلی ما یفهم من کلام العز بن عبدالسلام من أنه یجوز هل تجب کتابته المصحف الآن لعامة الناس علی الاصطلاحات المعروفة الشائعة عندهم الخ''۔

اوران کے دلائل پیش فرمانے کے بعد رسم عثمانی کے مخالفین شیخ ابوبکر باقلانی وابن خلدون وغیرہ کے دلائل پر تفصیلاً نقد فرمایا ہے، یہ بحث مناہل العرفان (۱/ ۳۷۷ سے ۱/۳۸۶ صفحات) پر محیط ہے، بعدہ (۱/۳۸۶) سے (۱/۳۹۸) تک رسم عثمانی پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات دے کر رسم عثمانی کے فوائد کا احصار فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''ولقد مرت علی الأمة اجیال وقرون وماشعرت بغضاضته فی التزامها الرسم العثمانی علی أن المعول علیه أولًا وقبل کل شئ هو التلقی من صدور الرجال وبالتلقی یذهب الغموض من الرسم کائنا ما کان ولیس بعد العیان بیان''

(تفصیلات کے لئے مناہل العرفان فی علوم القرآن دار الکتب العلمیہ بیروت کا مطالعہ فرمائیں)۔

(صدیاں بیت گئیں مگر رسم عثمانی کے التزام میں کوئی بھی نقص اور کمی واقع نہیں ہوئی اسی پر اعتماد کیا گیا اور اس کی تلقی پر امت کا اجماع ہے اور تلقی ہر طرح کے ابہام کو دور کردیتی ہے، عیاں راچہ بیان)۔

شیخ محمد متولی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں: ''وأجمع أهل الأداء وأئمة القراء علی لزوم تعلم مرسوم المصاحف ... وقد اجتمع علی کتابة المصحف حین کتبوه اثنا عشر الفا من الصحابة رضی الله عنهم ونحن ماجورون علی اتباعهم وما ثومون علی مخالفتهم، فیجب علی کل مسلم أن یقتدی بهم وبفحلهم'' (نهایة القول المفید/۳۲۸-۳۴۷)

(ائمہ قراء و اہل ادا کا اسی عثمانی رسم پر اجماع ہے...... بارہ ہزار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مصاحف کو اسی رسم کے ساتھ لکھنے پر اتفاق ہے، ہمیں ان کے اتباع پر اجر ملے گا مخالفت میں گنہگار ہوں گے، لہٰذا ہر مسلمان پر انہیں کا اقتدا واجب ہے)۔

شیخ جزری تحریر فرماتے ہیں: ''وهو خط المصاحف العثمانیة التی أجمع علیها الصحابة ولا یتعداها إلی سواها منها ما عرفنا سببه ومنها ماغاب عنها'' (النشر فی القراءات العشر ۲/۴۵۷ قراءت اکیڈمی ترکیسر گجرات)۔

مصاحف عثمانیہ پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے، خواہ اس رسم کے اسباب معلوم ہوں یا نہ ہوں بہر دو نوع اس سے تجاوز درست نہیں،

موصوف ہی ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''کل قراءة وافقت العربیة ولو بوجه ووافقت إحدی المصاحف العثمانیة ولو احتمالا وصح سندها فهی القراءة الصحیحة التی لایجوز ردها ولا یحل إنکارها'' (النشر فی القراءات العشر ۱/۱۵)

ہر وہ قراءت جس میں عربیت کی من وجہ اور مصاحف عثمانیہ کی موافقت (احتمال ہی کے درجہ میں سہی) پائی جائے اور اس کی سند صحیح ہو تو وہ قراءت صحیح ہوگی جس کا رد کرنا درست نہیں اور اس کا انکار حلال نہیں، محقق الفن علامہ جزری کی ایک تحریر جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ اگر رسم عثمانی کی موافقت ہے تو وہ قراءت متواتر ہوگی، ورنہ مجمع علیہ رسم کی مخالفت کے باعث وہ قراءت شاذ ہوگی

''فوردت القراءة عن أئمة تلك الأمصار علی موافقة مصحفهم فلولم یکن ذلك کذلك فی شئ من المصاحف العثمانیة لکانت القراءة بذلك شاذة لمخالفتها الرسم المجمع علیه'' (النشر فی القراءت العشر ۱/۶ قراءت اکیڈمی ترکیسر گجرات)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''فلايجوز قطعا كتابته برسم مايغاير بذ الرسم العثمانى، بل يخشى به تسلل المحرفين والمغيرين وانفتاح ابواب التحريف تدريجا الخ'' (نوازل فقهيه معاصره ۲/ ۵۲۸ مؤسسة ايفا للطبع والنشر الهند)۔

محدث ابوشامہ تحریر فرماتے ہیں: ''يعنى خط المصحف على ما وضعته عليه الصحابة رضى الله عنهم لما كتبوا المصاحف فى زمن عثمان وانفذ با إلى الأمصار فقيها مواضع وجدت الكتابة فيها على خلاف ما الناس عليه اليوم فى الكتابة، وقد صنف فى ضبط ذلك تصانيف ولابي عمرو الدانى فى ذالك كتاب المقنع وقد نظمه الشيخ الشاطبى القيافى قصيدته الرائية'' (ابراز المعانى للامام الكبير عبدالرحمن بن اسماعيل الدمشقى الشافعى المعروف بابي شامه/ ۱۹۷) وبهامشه ''خط المصاحف العثمانية التى أجمع عليها الصحابة رضى الله عنهم أجمعين'' (ارشاد المريد الى مقصود القصيد للشيخ على بن محمد الشهير بالضباع/ ص ۱۹۷ مصطفى البابي الحلبي واولاده بمصر)۔

محدث ابوشامہ کی تحریر و ابوعمرو الدانی کی تصنیع وعلامہ شاطبی کی رائیہ وارشاد المرید کی عبارتوں سے بھی ماقبل کی تائید ہورہی ہے، اہل فن کے یہاں ایک مقولہ بھی زبان زد ہے: ''خطان لا يقاسان خط القوافى وخط القرآن'' وہ بھی مؤید ہے، اسی کی تائید سراج القاری ابی القاسم علی بن عثمان بن محمد ابن القاصح العذری: ص ۷ ۱۲ مصطفی البابی الحلبی بمصر ودقائق الحکمۃ: ص ۷ لشیخ الاسلام زکریا الانصاری دار الکتب الاشرفیہ دہلی، فتاوی عثمانی ۱/ ۲۴۶-۲۴۷ مکتبہ نعیمیہ، المنح الفکریہ ملا علی قاری: ص ۸۵، کفایۃ المفتی ۱/ ۷۱ از کریا دیوبند سے بھی ہورہی ہے، طوالت سے بچتے ہوئے صرف حوالہ جات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

شیخ ابن ضیاء محب الدین احمدؒ دیوبند ودیگر علاقوں سے آئے ہوئے چند سوالات جس میں رسم الخط کے متعلق بھی ایک سوال ہے اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''یہ امر مسلم ہے کہ قرآن پاک کا رسم الخط توقیفی اور سماعی ہے اجماع وتواتر سے ثابت اور واجب الاتباع ہے اس کے خلاف کتابت قرآن جائز نہیں۔

حضرت نے ۲۰ دلائل اپنے رسالہ ضیاء البرہان فی الجواب علی خط القرآن: ص ۲۳ تا ص ۲۶ قلمی رقم فرمائے ہیں اور وہ نثر المرجان، نہایۃ القول المفید، العقیلہ، رسالہ قراءۃ قران علی تحفۃ الندریہ مقنع للدانی نظم القرآن وغیرہ سے ماخوذ ہیں، جن کی عظمت واستنادی حیثیت ائمہ فن پر مخفی نہیں، حضرت نے بھی رسم عثمانی کی مصالح اور اسرار الہیہ ذکر فرمایا ہے ''ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ ہر شخص اسی غیر قیاسی رسم الخط کے بدولت کلام اللہ صحیح پڑھتے ہیں، استاذ کا محتاج ہے، اسی احتیاج شیوخ کی بدولت تلفظ کلام اللہ کا تحفظ ہے ورنہ خدا جانے پڑھنے والے کن کن غلطیوں کے مرتکب ہوجاتے الخ۔

دوسری مصلحت یہ ہے کہ رسم خط موجودہ دیگر قراءت کے لئے معین ہے، مثلاً ارجہ اس لفظ کا یہ رسم چھ قراءتوں کو مشتمل ومحتمل ہے یہ بھی رسم خط قرآن کا عجیب وغریب اعجاز ہے کہ اسی ایک رسم خط سے کتنی قراءتیں نکلتی ہیں۔

تیسری مصلحت یہ ہے کہ اسی غیر قیاسی رسم الخط کی بدولت کلمہ قرآن وکلمہ غیر قرآن میں امتیاز ہوجاتا ہے، جیسے شیخ العلماء اور من عبادہ العلموا اسی لئے کہا گیا ہے رسم خط غیر قیاسی آیات متشابہات وحروف مقطعات کے مثل ہے "لا يعلم تأويله إلا الله" (سورۂ آل عمران: ۷)، رسم خط غیر قیاسی کی یہ خصوصیت کسی اور کتاب اللہ میں نہیں پائی جاتی، جیسا کہ صاحب ''نہایۃ القول المفید'' فرماتے ہیں:

''لايوجد من هٰذا الرسم لا فى التوراة ولا فى الإنجيل ولا فى الزبور ولا فى غيرها من الكتب السماوية. فكما أن نظم القرآن معجز فرسمه معجز أيضا... الخ''

بعض لوگ رسم خط قرآن پر تو اعتراض کرتے ہیں لیکن دوسری زبانوں کے رسم الخط میں رسم غیر قیاسی مثل خوشی، خود خواب، خواہش بالکل، خورد (نالج) knowledge, know, listen, walk, talk پر نظر نہیں کرتے اور نہ اس کی جرأت کرتے ہیں کہ رسم تلفظ کے مطابق ہوا ایسے لوگوں کو چاہئے کہ ان کلمات کو تلفظ کے مطابق لکھیں الخ۔

واضح ہو کہ انگریزی کے یہ پانچ کلمات اس کتاب کے حاشیہ پر درج ہیں جو حضرت صبغت اللہ صاحب صدیقی مہتمم تجوید القرآن کے اضافہ شدہ ہیں۔

احقر رسم خط عثمانی کی شمولیت قرأت کی مثال عنایات رحمانی (۱/ ۲۸-۲۹) از حضرت فتح محمد پانی پتیؒ ۱۴۰۷ھ سے پیش کر رہا ہے: ''صراط اور المصیطرون'' دونوں اصل لغت میں سین کے ساتھ ہیں، لیکن اس پر بھی ان دونوں کو اصل کے خلاف صاد سے لکھا گیا جو سین سے بدلا ہوا ہے، تاکہ صاد والی قراءت تو اسم صریح سے نکل آئے اور سین والی من وجہ رسم کے خلاف ہونے کے باوجود اصل سے سمجھ لی جائے اور دونوں قراءتیں اس بات میں معتدل اور برابر

ہوجائیں کہ صاد تو رسم کے موافق اور اصل کے خلاف ہے اور سین اصل کے موافق اور رسم کے کسی قدر خلاف ہے اور اشمام والی قراءت کو رسم احتمالا اور تقدیرا شامل ہوجائے اور اگر ان دونوں کلمات کو اصل کے موافق سین سے لکھتے تو نہ تو اعتدال ہی باقی رہتا اور نہ رسم اشمام والی قراءت کو احتمالا شامل ہوسکتی، بلکہ اس صورت میں خالص صاد والی اور اشمام والی دونوں قراءتیں رسم واصل دونوں ہی کے خلاف ہوجاتیں اور یہ خلاف قابل تحمل نہ رہتا اور یہی وجہ ہے کہ مشہور قراءت کی بنیاد پر "فی الخلق بصطة" (اعراف:۹) میں تو خلاف ہے کہ بعض اس کو صاد سے اور بعض سین سے پڑھتے ہیں، لیکن "بسطة فی العلم" (بقرہ:۳۲) میں خلاف نہیں، بلکہ یہ مشہور قراءتوں میں سین ہی کے ساتھ ہے اور یہ فرق اس لئے ہے کہ بصطة اعراف میں تو صاد سے لکھا ہوا ہے اور اس میں سین کی طرف اشارہ موجود ہے، لیکن بقرہ میں سین سے لکھا ہوا ہے جس سے صاد کی طرف اشارہ نہیں نکلتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ "بسطة" بقرہ میں صاد کی قراءت رسم کے خلاف ہے، الخ۔

مقری اظہار احمد تھانوی تحریر فرماتے ہیں: جس طرح تمام قرآن منجانب اللہ ہے، روٴس الآیات تمام آیات کی ترتیب اور تمام سورتوں کی ترتیب بھی باجماع توقیفی ہے، جمہور محققین فرماتے ہیں کہ کلمات قرآن کی رسمی اوضاع بھی توقیفی ہیں مصاحف عثمانیہ بعینہ اسی رسم پر لکھے گئے جس رسم پر صحف ابوبکر صدیق تھے اور صحف صدیقی بعینہ اسی رسم پر مرسوم ہوئے جس رسم پر آنحضورﷺ کے حضور میں کاتبین وحی نے قرآن مجید کو لکھا اور وہ بعینہ وہ رسم تھا جو لوح محفوظ میں ہے، لہٰذا موجودہ اوضاع رسمی لوح محفوظ کے مطابق ہیں اور توقیفی ہیں تو

"کل ما فیہ مشهور بسنته ولم یصب من أضاف الوهم والغیّرا"۔

(قرآن مجید میں جس قدر بھی اوضاع ہیں وہ سب حضورﷺ کے حکم وسنت سے شہرت یافتہ ہیں اس شخص نے درست بات نہیں کہی جس نے اس رسم کو وہم وتغیر کی طرف منسوب کیا) (ایضاح المقاصد شرح عقیلہ اتراب القصائد: ص ۱۰)۔

"وقد ورد التسهیل کالرسم فأحذ فابفم کمستهزون مالون مسجلا" کی شرح کرتے ہوئے شیخ محمد بن احمد الشهیر بالمتولی اتحاف الانام واسعاف الافهام: ص ۳۰ پر رقم فرماتے ہیں: "یعنی انه ورد عن حمزه اتباع رسم المصاحف العثمانیة الصحیحة فی الوقف علی الهمز حیث، وافق العربیة وهٰذا معنی قول الشاطبی وقد رووأنه بالخط کان مسهلا"

(حضرت حمزہ کوفی سے ہمزہ پر وقف کے سلسلہ میں مصاحف عثمانی ہی کے رسم کا اتباع کیا گیا ہے)۔

قاری فتح محمد ابن اسماعیل پانی پتی نے رائیہ کی شرح "اسہل الموارد" کے (ص ۱۷۷ تا ۱۸۰) رسم کے توقیفی ہونے پر علمائے مصر کے فتاوی سنت رسول اللہ، اجماع وغیرہ سے استدلال فرمایا ہے۔

ایک رسالہ "تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط من مصحف الامام" جو جواہر الفقہ (۱/ ۳۰۷ تا ص ۱۱۷) سوالات وجوابات کی صورت میں موجود ہے اس میں بھی اور الجواهر الضیائیه (ص ۲۹۵-۲۹۶) از قاری محمد سلیمان دیوبندی، نیز شیخ المشائخ امام القراء محی الاسلام پانی پتی کی شرح سبعۃ قراءات (۱/ ۳۱۱)، ضیاء البرهان قلمی (ص ۵۳ تا ص ۵۵) پر منجد المقوئین مطبوعہ مصر ۲۱-۲۲ کے حوالہ سے ایک طویل اقتباس حضرت شیخ ابن ضیاء محب الدین علیہ الرحمہ نے پیش فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانیہ کی کتابت اور رسم خط میں تین امور ملحوظ رکھے گئے ہیں، لغت قریش، عرضہ اخیرہ کی موافقت اور جو حضرت رسول اللہﷺ سے صحت کے ساتھ مستفاد ومسموع ہوا۔

علامہ نظام الدین حسن بن محمد حسین القمی النیساپوری کی عبارت بھی درج ذیل ہے:

"وقال جماعة من الأئمة أن الواجب علی القراء والعلماء وأهل الکتاب أن یتبعوا هٰذا الرسم فی خط المصحف، فإنه رسم زید بن ثابت وکان أمین رسول اللہ ﷺ وکاتب وحیه" (مقدمہ غرائب القرآن ورغائب الفرقان ۱/ ۴۳ دار الکتب العلمیہ بیروت) اسی مفہوم کی ترجمانی اتقان فی علوم القرآن (۲/ ۱۶۷ المطبعة الازهریه مصر) سے بھی ہورہی ہے:

"من کتب مصحفا فینبغی أن یحافظ علی الهجاء الذی کتبوا به تلک المصاحف ولا یخالفهم ولا یغیر مما کتبوه شیئا، فانهم کانوا أکثر علماء وأصدق قلبا ولسانا واعظم أمانة منا. فلا ینبغی أن نظن بأنفسنا استدرا کا علیهم"

(جو کوئی مصحف لکھے تو اس پر اس ہجاء کی محافظت ضروری ہے جس پر مصاحف باجماع صحابہ لکھے گئے اس رسم کی مخالفت اور تغیر وتبدل بالکل نہ کرے، کیونکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ علم والے ان کے قلوب وزبان صداقت کا اعلیٰ نمونہ تھی کذب وخداع ومکر وزر سے دور امانت علم وعمل میں کامل تھے

مناسب نہیں کہ ہم ان پر کسی طرح کا ظن کریں۔

مذکورہ تحریروں کی روشنی میں کیا رسم الخط عثمانی کی تبدیلی کا قول درست ہوگا؟

۳- بریل کوڈ کا حکم:

ترکی میں منعقدہ کانفرنس میں بریل کوڈ کے تعلق سے ایک تحریر جسے مدرسہ النور فاردی بلائنڈ نے پیش کیا تھا اس کے چند اقتباسات پیش ہیں: ''بنیادی طور پر بریل علامت تلفظ کی نمائندگی کرتی ہے نہ کہ رسم الخط کے الفاظ کی اور بریل میں حروف کے تلفظ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے حروف کے رسم الخط کو نہیں''۔ ''بریل میں الف کی آواز کے بدلے میں عثمانی ذریعہ غلط تلفظ کے ساتھ ادا ہوں گے، چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم الصلوۃ میں لام الف اور الزکوۃ میں الف استعمال کرتے ہیں، تو حروف کے اقلاب کی یہ مثالیں ہیں''۔ ''ہمیں یقین ہے کہ عربی قرآن بریل کوڈ رموز القران ہیں اور یقینی طور پر لفظ ''الذکر'' کے ذیل میں آتا ہے، جیسے کے عثمانی نظام اور حروف القرآن الہامی ہیں..... اللہ تعالی نے قرآن میں وعدہ کیا ہے "قال تعالیٰ: ولقد یسرنا القران للذکر فھل من مدکر (سورۂ قمر: ۳۲)، انانحن نزلنا الذکر وانالہ لحافظون.." (سورۂ حجر: ۹) اللہ قادر مطلق یقیناً اپنے کلام کو نابینا لوگوں کے لئے محفوظ کرے گا)۔

اب احقر ''الذکر'' کے تعلق سے مفسرین کے اقوال پیش کر رہا ہے:

(وانالہ لحافظون-سورۃ الحجر: ۹) ''من أن یزاد فیہ او ینقص منہ'' (تفسیر قرطبی ۱۰/ ۵ مکتبہ عباس احمد الباز مکۃ المکرمہ) (وانالہ لحافظون) ''وانا للقرآن لحافظون من أن یزاد فیہ باطل ما لیس منہ أو ینقص منہ ما ھو من أحکامہ وحدودہ و فرائضہ'' (جامع البیان لمحمد بن جریر الطبری المجلد السابع الجزء الرابع عشر / ص ٦ دار المعرفۃ بیروت لبنان)۔

"انانحن نزلنا الذکر وانالہ لحافظون" (سورۂ حجر: ۹)

ہر زمانہ میں ایک جم غفیر علماء کا جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ایسا رہا کہ جس نے قرآن کے علوم ومطالب اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی، کاتبوں نے رسم الخط کی قاریوں نے طرز ادا کی حافظوں نے اس کے الفاظ وعبارت کی (تفسیر مع ترجمہ شیخ الھند: ص ۳۴۸)۔

"ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" (سورہ قمر: ۱۷) ''وقیل: للذکر للحفظ أی سھلناہ للحفظ لما اشتمل علیہ من حسن النظم وسلامۃ اللفظ وعروہ عن الحشر وشرف المعانی وصحتھا فلہ تعلق بالقلوب'' (التفسیر الکبیر المسمی البحر المحیط ۸/ ۱۷۸ دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان)

بغوی میں ہے: ''وقال سعید بن جبیر یسرناہ للحفظ والقراءۃ'' (معالم التنزیل ۴/ ۲٦۱ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

ڈکتور عبدالعزیز عبدالرحیم استاذ جامعۃ الملک فہد دہران سعودی عرب لکھتے ہیں:

آسانی کے اس پہلو کا تعلق سمجھنے اور نصیحت حاصل کرنے سے ہے (قرآن مجید اور عصر حاضر/ ص ۹۴۳)

''ولقد یسرنا القرآن أی سھلناہ للحفظ وأعنا علیہ من أراد حفظہ فھل من طالب لحفظہ فیعان علیہ'' (تفسیر قرطبی ۱۷/ ۸۷ مکتبہ عباس احمد الباز مکۃ المکرمہ) ولقد یسرنا القرآن الخ ھونا قراءتہ (بخاری ۲/ ۷۲۲)۔

مدرسہ النور کے دیئے گئے اقتباسات سے معلوم ہوا کہ بریل میں رسم عثمانی کی موافقت بالکل نہیں (جس کا انہیں خود بھی اعتراف ہے) دوسرے کوئی ٹھوس بنیادی دلیل نہیں جس سے بریل کے رموز القرآن ہونے کا حکم لگایا جاسکے، نیز اس کے ''الذکر'' کے تحت داخل ہونے کا علم مفسرین کے اقوال سے قطعاً نہیں ہو رہا ہے۔

ماضی میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ نابینا حضرات بدون کسی سہولت کے حدیث وتفسیر، فقہ وادب وشعر وشاعری، انساب وفرائض ونحو میں ایسا نمایاں مقام حاصل کیا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، آیئے چند نام پیش کئے دیتے ہیں:

حضرت قتادہ جلیل القدر تابعی اور بڑے پایہ کے مفسر تھے تفسیر کے علاوہ حدیث علم انساب، تاریخ عرب اور علم ادب ولغت میں ان کی جلالت مسلم تھی۔ امام شاطبی قراءت کے علاوہ تفسیر وحدیث کے زبردست عالم تھے فن نحو ولغت میں بے نظیر تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''ان کی ذات نے ایک عالم کو فیض پہنچایا'' حافظ علامہ ابوعمر جو امام ابوداؤد ومحدث ابوزرعہ کے شیخ ہیں، ابوالعباس رازی حافظ حدیث، مشہور شاعر بشار بن ہود جو اسلام کے بعد پیدا ہونے والے شعراء

میں اول درجہ رکھتے ہیں، ابن جنی کے شاگرد ابوالقاسم عمر کوی۔ محب الدین حنبلی جو فرائض، نحو وحساب میں کامل تھے، ابن الدہان نحوی وابوالعلامعری وغیرہ۔

بہر کیف اس فقہی ضابطہ کالحاظ تو کرنا ہی چاہئے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے۔

بریل میں لکھا ہوا قرآن مصحف کا حکم نہیں رکھتا۔

''المصحف کتاب جمع بین دفتیه کلام الله المکتوب وهذه الثقوب التی فی المصحف لاتتحدی الدلالة علی کلام الله، و خاصة إذا اعتبرنا أن رسم القرآن حکمه توقیفی وهذه الثقوب اجتهادیة قابلة للتغیر ولذلك أری والله أعلم أنه لایأخذ حکم المصحف'' (رأی الاخ مرحف)

کلام اللہ معجز بھی ہے اور توقیفی بھی، اور بریل ان دونوں صفتوں سے خالی ہے وہ غیر معجز بھی ہے اور اجتہادی بھی جو قابل تغیر ہے۔

موصوف ہی کی تائید اس تحریر سے بھی ہو رہی ہے، ''وانا من وجهة نظری القاصره أری ما یراه الاخ الکریم مرهف واقیسه علی الشریط والقرص المدمج (الاستاذ خالد شبل)''

میری ناقص رائے بھی وہی ہے جو آخ مرہف کی ہے اور اس جیسے قرآن کو ریل اور کیسٹ پر قیاس کرتا ہوں۔

شیخ محمد بن ابراہیم اپنے فتاوی (۲/۷۷) پر رقم طراز ہیں:

''إن مصحف المکفوفین لاتثبت له أحکام المصحف، وکذا ترجمة معانی القرآن''۔

شیخ عبدالعزیز بن باز ''معہد النور للمکفوفین'' ادارہ میں دوران تقریر اس بابت سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''لیس بقرآن هذا، هذا شبه ترجمة فلا ینطبق علیه أحکام المصحف یجوز لمسه للمحدث والجنب ولا بأس أن یقرأ المحدث والجنب''۔

۴- موبائل اسکرین پر قرآن:

موبائل کی وہ قسم جس کا ہر کام انگلیوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کو اسکرین ٹچ کہا جاتا ہے، یعنی اگر قرآن کھولنا ہو یا بدلنا یا اسی طریقہ سے صفحہ کو بڑا کر کے دیکھنا ہو تو لامحالہ یہ عمل انگلیوں کے ذریعہ ہی وجود پذیر ہوگا۔ موبائل میں ایک تو ڈسپلے ہوتا ہے اور دوسرا ٹچ ڈسپلے خود ایک الگ شیشہ پر مشتمل ہوتا ہے اور ٹچ دوسرے شیشہ پر۔

وہ موبائل جو keypad والے ہوں اس میں تو قرآن کے مس کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اس کا ہر کام بٹن پر مشتمل ہوتا ہے جسے کسی چیز کو بڑا کر کے دیکھنا ہو یا کسی اور فنکشن میں جانا ہو تو بٹن کے ذریعہ ہی جایا جا سکتا ہے اس میں بھی دو شیشے الگ الگ ہیں، اب غلاف کے تعلق سے دو تحریریں نقل کی جا رہی ہیں:

''والغلاف الجلد الذی علیه المتصل عند بعض المشائخ، وفی الکافی: هو الأصح وعند بعضهم المنفصل کالخریطة ونحوها... وفی الینابیع: وإن لم یکن الجلد مشرز یحل له أخذه'' (فتاوی تاتارخانیه ۱/ ۲۷۰ زکریا)۔

''إنما دفت القرآن هی ما التصقت بالقرآن فی التجلید ولا یمکن انفصها لها إلا بقطع الخیط فهی فی حکم المصحف ولا یمسها إلا المطهرون عند الجمهور خلافا لابن حزم، وأما إذا کان انفصالها سهلا میسورا کما هو یستعمل فی عصرنا کأنه جیب مستقل یوضع فیه القرآن الکریم، فیکون فی حکم الغلاف، ویجوز مسه بغیر وضوء کالخریطة والجلد غیر المشرز'' (نوازل فقهیه محاضره ۱/ ۴۷ از مولانا خالد سیف الله رحمانی)۔

ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوا کہ غلاف کی دو قسمیں ہیں ایک متصل جسے بدون وضو چھونے کی اجازت نہیں دوسرے منفصل جسے بدون وضو چھونے کی اجازت ہے بالفاظ دیگر ایک مشرز (جس کے کنارے ملے ہوئے اور بندھے ہوئے ہوں) دوسرے غیر مشرز)۔

احقر کے خیال میں ٹچ کا حکم وہی ہونا چاہئے جو کہ غلاف مشرز کا ہے، اس لئے اسے بغیر وضو نہیں چھونا چاہئے ہاں بعض کور غیر مشرز ہوتے ہیں ان کو کھولے بغیر بھی انگلیوں کے لمس سے استعمال کیا جاتا ہے، اس میں چین بھی ہوتی ہے جسے کھولکر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، اگر ایسے کور والے موبائل کو کھولے بغیر استعمال کیا جائے تو اسے غلاف قرار دیا جا سکتا ہے اور اسے بلا وضو چھونے کی اجازت ہونی چاہئے۔ ☆☆☆

قرآن مجید کے متن وترجمہ سے متعلق بعض قابل غور مسائل

مفتی جمیل احمد نذیری [1]

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

متن قرآن کے بغیر کسی بھی زبان میں تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز نہیں، یہ مجتہدین مذاہب اربعہ اور جملہ فقہاء وعلماء امت کا اجماعی فتوی ہے، جس سے انحراف سراسر گمراہی اور زیغ وضلال ہے۔

تنہا ترجمہ چھاپنے کی تائید میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ نہایت کمزور اور ناقابل التفات ہیں، یہ حفاظت قرآنی کا معاملہ ہے، اس میں مصارف کم آنے، زیادہ آنے کا کوئی اعتبار نہیں، سارے مسلمان، اصل عربی قرآن کو شوق سے لیتے ہیں، انہیں اس کا کوئی شکوہ نہیں ہوتا کہ اس کا ہدیہ کم ہے یا زیادہ؟ وہ صرف اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ کونسی جلد، سائز، کاغذ، چھپائی والے قرآن، ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق ہیں۔

لہذا صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت میں مصارف کم آنے والی بات تاجران کتب کے مفاد والی بات ہوئی، عام مسلمانوں کے مفاد کی بات نہ ہوئی۔

دوسرا عذر بھی ناقابل قبول اور غیر مسموع ہے، کیونکہ متن قرآن نہ پڑھ سکنے والے افراد، اگر مسلمانوں میں سے ہیں تو ان کے حق میں، صرف ترجمہ قرآن درج ذیل مفاسد کا ذریعہ ہے۔

۱- ان پر متن قرآن عربی زبان میں پڑھنا اور سیکھنا فرض عین ہے، انہیں اس پر آمادہ کیا جائے اور شوق دلایا جائے، نہ یہ کہ ان کی زبان میں محض ترجمہ دے کر، انہیں مزید کاہل، سست، پست ہمت اور ترجمہ پر قناعت پسند بنادیا جائے۔

اگر وہ ترجمہ پڑھ سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ اپنی زبان تو سیکھ لیں، لکھ پڑھ سکتے ہوں، مگر قرآن ہی نہ پڑھیں قرآن ہی نہ سیکھیں، جبکہ اس کا پڑھنا اور سیکھنا ان پر فرض ہے وہ قرآن نہ پڑھنے اور نہ سیکھنے کی وجہ سے گنہگار ہو رہے ہیں، ہمیں انہیں گناہ سے بچانے کی کوشش کرنی چاہئے، نہ کہ گناہ میں مبتلا رکھنے کی۔

اگر وہ ترجمہ نہیں جان سکیں گے تو کوئی گناہ نہیں ہوگا، لیکن اگر قرآن نہ پڑھ سکیں گے تو گناہ ہوگا، کیونکہ فرض عین کے تارک ہیں۔

۲- اگر متن قرآن کے ساتھ ترجمہ رہے گا تو قرآن سے تعلق باقی رہے گا، ترجمہ بھی پڑھیں گے تو بھی قرآن سامنے رہے گا، ترجمہ ملانے کے بہانے ہی قرآن پڑھ لیں گے، اور اگر صرف ترجمہ رہا تو قرآن سے بالکل ہی بے تعلق ہو جائیں گے، اور یہ آیت صادق آجائے گی۔

"نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظهورهم کأنهم لایعلمون" (بقرہ:۱۰۱)

(اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا ہے جیسے ان کو گویا اصلا علم ہی نہیں)۔

۳- مترجمین کے ترجموں میں اختلاف ہوتا ہے، ترجمہ پڑھنے والا اختلاف کو دیکھتا ہے، مگر وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اصل متن قرآنی، ہر ترجمہ میں ایک ہی ہے، کیونکہ ترجمہ کے ساتھ متن قرآن بھی سامنے ہوتا ہے، لہذا ترجمہ کا اختلاف اسے اصل قرآن کے بارے میں کسی بدگمانی میں مبتلا نہیں کرتا، لیکن جب صرف ترجمہ ہی سامنے رہے گا، اصل سامنے نہ ہوگا تو ترجموں کا اختلاف، اصل کے مختلف ہونے کا گمان پیدا کرنے لگے گا، اور یہ اختلاف، کلام اللہ کی طرف منسوب ہونے کا اندیشہ پیدا ہونے لگے گا، رفتہ رفتہ یہ سوء ظنی ہونے لگے گی کہ اصل قرآن ہی مختلف ہے۔

۴- صرف ترجمہ قرآن کا یہ مفسدہ، اعتقاد پر اثر انداز ہوا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ صرف ترجموں کو لے کر آپس میں لڑیں گے اور اصل کی جانب

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ، مبارکپور، اعظم گڑھ۔

مراجعت کی توفیق نہ ہوگی جس سے اختلاف کا فیصلہ ہو سکے، اور یہ آیت صادق آجائے گی:

''وما اختلف فيه إلا الذين أوتوه من بعد ماجاء تهم البيانات بغيا بينهم'' (سورۂ بقرہ: ۲۱۳)
(یہ اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو اولا وہ کتاب ملی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح پہنچ چکے تھے باہم ضد اضدی کی وجہ سے)۔

۵- ابھی تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے، قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے، یا غلط سمجھتے ہیں، یا فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو اپنی فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں، اور مترجم کو دین کا مالک و ذمہ دار نہیں سمجھتے، نیز کسی مترجم کو بھی تحریف معنوی کی ہمت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اصل سامنے ہوتا ہے، ہر اہل علم، اس پر گرفت کر سکتا ہے، اور بغیر متن کا صرف ترجمہ ہی ترجمہ رہا تو اسی کو مستقل کتاب سمجھیں گے، کسی کا تابع نہ سمجھیں گے ترجمہ کی غلطی کو نہ مترجم کا قصور سمجھیں گے، نہ اپنی فہم کا، مترجم کو ہی دین کا اصل مالک سمجھ لیں گے، مترجم تحریف معنوی کے لئے بھی آزاد ہو جائے گا، کیونکہ اصل سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی گرفت بہ آسانی نہ ہو سکے گی، اور اصحاب زیغ وضلال کو غلط ترجمہ و تفسیر کرنے اور مسلمانوں میں پھیلانے کا خوب خوب موقع مل جائے گا کیونکہ مترجمین ہی متبوع مستقل بن جائیں گے، ہر ترجمہ پڑھنے والا حافظ نہیں ہوتا کہ اصل سے ملا سکے، اور اصل کی طرف مراجعت ہر وقت آسان بھی نہیں ہوتی۔

۶- اگر یہ طریقہ مروج ہو گیا تو توریت وانجیل کی طرح اصل قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو جائے گا، اور ترجمہ کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جائے گا، جس طرح اصل توریت وانجیل ناپید ہیں، ان کا ترجمہ مروج ہے، اور یہود و نصاری اسی ترجمہ کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اصل توریت وانجیل سے نابلد نہیں محروم ہیں۔

۷- اسی طرح یہود و نصاری سے مشابہت پیدا ہو جائے گی، وہ بھی تورات وانجیل کے ترجمہ پر ہی اکتفا کئے ہوئے ہیں، جبکہ کفار و مشرکین و اہل کتاب کی مشابہت حرام ہے اور دینی معاملے میں ان کی مشابہت ہو تو اور زیادہ شنیع ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''من تشبه بقوم فهو منهم'' (ابوداؤد ۲/ ۵۵۹ کتاب اللباس) (جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے)۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''الذی نفسی بیده لترکبن سنة من کان قبلکم'' (ترمذی ۲/ ۴۱ ابواب الفتن)
(اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم لوگ ضرور بالضرور ہی طریقہ اختیار کرو گے جو تم سے پہلے لوگوں کا تھا)۔

''أمتهوكون انتم كما تهوكت اليهود والنصارى'' (رواه البيهقي في شعب الايمان المشكوة المصابيح ۱/ ۳۰)
(کیا تم دین کے معاملے میں اس طرح متحیر ہو جانا چاہتے ہو، جیسے یہود و نصاری متحیر ہوئے)۔

۸- متن سے خالی ہونے کی وجہ سے اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے، اور ناقابل انتفاع ہو جانے کے وقت، دوسری معمولی کتابوں سے اوراق کی طرح، اس کے اوراق بھی استعمال کریں گے، مثلاً ردی بنا دینا، کسی جلد پر چسپاں کر دینا، لگا دینا وغیرہ وغیرہ۔

۹- متن سے خالی ہونے کی وجہ سے اسے صرف ایک کتاب کا درجہ دیں گے، اس کے چھونے کے لئے وضو کا اہتمام نہ کریں گے، جبکہ اس ترجمہ کو بھی بلا وضو چھونا جائز نہ ہوگا۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: ''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وكذ اعندهما على الصحيح. هكذا في الخلاصة'' (۱/ ۳۹) (اگر قرآن فارسی میں لکھا ہو تو اس کا چھونا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے، اور صحیح قول کے مطابق صاحبینؒ کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے)۔

''إذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا أخبر السامع أنه قرأ آية السجدة'' (۱/ ۱۳۳) (جب فارسی میں آیت سجدہ پڑھے تو اس پر اور سننے والے پر سجدہ واجب ہو گیا، خواہ سننے والا سمجھے یا نہ سمجھے، جب اسے یہ بتا دیا گیا ہو کہ آیت سجدہ ہے)۔

ان دونوں جزئیوں سے معلوم ہوا کہ ترجمہ قرآن بھی حکماً قرآن ہوتا ہے، لہٰذا ترجمہ کو بھی بلاوضو مس کرنا جائز نہیں، جیسے حقیقی قرآن کو بلاوضو مس کرنا جائز نہیں۔

بہرحال بغیر متن کے، ترجمہ قرآن کی اشاعت میں بہت مفاسد ہیں، جن میں سے چند کا یہاں تذکرہ کردیا گیا (مستفاد از امداد الفتاوی ۴/ ۳۹تا ۴۲)۔

یہ مفاسد وہ تھے جو ایک مسلمان کے اعتبار سے تھے، جن میں سے بعض میں قرآن کی بے حرمتی بھی ظاہر تھی۔

جہاں تک ایسا ترجمہ غیر مسلموں کو دینے کی بات ہے تو مفسدہ ۳، ۵، ۶ ان کے حق میں بھی متحقق ہے۔

غیر مسلموں کو قرآن دیتے وقت قرآن کے آداب بھی بتادیئے جائیں، جو ان پر عمل کا وعدہ کریں، یا جن سے ان پر عمل کی امید ہو، انہیں ہی قرآن دیا جائے، جن سے امید نہ ہو، انہیں ہرگز نہ دیا جائے (مستفاد از فتاوی قاضی خاں ۴/ ۹۴، فتاوی محمودیہ ۵/ ۲۴۱)۔

اگر وہ قرآن مجید کسی کتب فروش سے لے رہا ہو تو کتب فروش بھی مذکورہ باتوں کا لحاظ رکھے، ورنہ قرآن کی بے حرمتی کے گناہ میں غیر مسلم کو قرآن دینے والے اور فروخت کرنے والے دونوں شامل ہوجائیں گے، بغیر متن قرآن کے صرف ترجمے سے قرآن کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اصل الفاظ قرآن کے بغیر صرف ترجمے کا کیا اثر؟

اشاعت کرنے، خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے والوں کا حکم:

جب یہ ثابت ہوگیا کہ متن قرآن کے بغیر، تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز نہیں ہے، تو اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اس طرح کی اشاعت کرنے والے، اسے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے والے، سبھی گناہ میں شامل ہیں، یہ تعاون علی الاثم ہے جو کہ جائز نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲)

(نیکی اور تقوی کے کام میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، گناہ اور سرکشی کے کام میں ایک دوسرے کا تعاون مت کرو)۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں: اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بہ قیمت لے، اور نہ بلا قیمت تو پھر ایسے ترجمہ کا سلسلہ بند ہوجائے، اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (امداد الفتاوی ۴/ ۴۲)۔

اس طرح کے ترجمے کی اشاعت تو درست نہیں، لیکن اگر کہیں اشاعت ہوگئی ہو تو اسے بے وضو چھونا جائز نہ ہوگا، اس کام کے مفاسد کے بیان میں ۹ کے تحت کتب فتاوی کے حوالے آگئے ہیں۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

غیر عربی رسم الخط میں پورا قرآن لکھنا جائز نہیں ہے (ایک دو آیتوں کی گنجائش ہے، جیسا کہ آئندہ کسی موقع پر آجائے گا)، اسی طرح عربی رسم الخط کو باقی رکھتے ہوئے غیر عربی رسم الخط کے ساتھ بھی لکھنا اور اشاعت کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس موضوع پر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے "جواہر الفقہ" جلد اول ص ۷۳ تا ۱۱۱ پر "تحذیر الانام عن تغیر رسم الخط من مصحف الامام اور صیانۃ القرآن عن تغیر الرسم واللسان" کے ناموں سے دو تفصیلی رسالے لکھے ہیں اور موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔

یہاں انہی دونوں سے جستہ جستہ عبارتیں نقل کی جارہی ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں:

"پہلے ایک بات بطور مقدمہ سمجھ لی جاوے پھر اس سے سب سوالات کا جواب آسان ہوگا وہ یہ ہے کہ باجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین وتابعین رحمہم اللہ اور باتفاق ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت "مصحف عثمانی" جس کو اصطلاح میں "امام" کہا جاتا ہے، اس کی پیروی اور اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا "تحریف قرآن" اور زندقہ کے حکم میں ہے، اور خصوصاً کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے، جس کو کوئی "ملحد" بھی صراحۃً تجویز نہیں کرسکتا، اس اجماع کا ثبوت اور شواہد آخر میں ذکر کئے جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین میں جب اسلام مشرق ومغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے ساتھ پھیلا، اس وقت قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے والے گنے چنے حضرات تھے، عراق وخراسان اور ہندوستان وترکستان وغیرہ کے رہنے والے نومسلم نہ عربی رسم خط پڑھ

سکتے تھے نہ ان کے ممالک میں ابتداءً کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر ان کی ملکی زبان میں اس کی ترجمانی با آسانی کر سکے اور قرآن ان کو پڑھا سکے، ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہوگی، کہ ہر ملک کے رسم خط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجا جائے، تا کہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں، لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ بھی اس کا قرون مشہود لھا بالخیر میں ثابت نہیں، کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم خط میں قرآن کریم لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو" (جواہر الفقہ ۱/ ۷۴، ۷۵)۔

مصحف عثمانی میں قرآن مجید کی کتابت کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں بلکہ تقریبا تیرہ سو برس پہلے پہنچا ہوا ہے، اور عجمیوں کو عربی رسم خط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات بھی آج پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اسی وقت سے ہے اور اگر غور کیا جائے تو اس وقت یہ مشکلات بہت زیادہ ہونی چاہئے، کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی پھر ان میں لکھے پڑھے کم تھے، خصوصا قرآن پڑھانے والا تو کوئی عرب ہی ہو سکتا تھا جس کا ہر شہر ہر بستی ہر قصبہ میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا، لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود صحابہ وتابعین ؒ نے کہیں یہ تجویز نہ کیا کہ قرآن کو ملکی رسم خط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جائے، بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم خط کو بھی مصحف عثمانی کے موافق حفاظت کرنا ضروری سمجھا اور ان مشکلات کو حفاظت مذکورہ کے مقابلے میں ناقابل التفات قرار دیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ میں دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات محض خیالی تھیں، خداوند سبحانہ وتعالی نے قرأت قرآن کے آسان کر دینے کا کھلے لفظوں میں خود اعلان فرمایا ہے: "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" (سورۂ قمر: ۱۷)، اس کا مشاہدہ سب کی آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ ہر ملک اور ہر زبان والے قرآن کو ایسا پڑھنے لگے کہ اپنی اپنی مادری زبان کی کتابوں کو بھی ایسا نہیں پڑھ سکتے اور انہیں اہل عجم میں سیکڑوں ایسے حضرات ہوئے کہ جو تجوید قرآن اور دیگر علوم قرآنیہ کے امام مانے گئے، الغرض اول تو یہ مشکلات محض خیالی ہیں ان کو مشکل تسلیم کرنا ہی غلطی ہے اور بالفرض تسلیم بھی کیا جاوے تو ہر مشکل کا ازالہ ضروری نہیں، یوں تو نماز وروزہ وغیرہ ارکان اسلام سب ہی کچھ نہ کچھ مشکل اپنے اندر رکھتے ہیں (کتاب مذکور/ص ۷۶، ۷۷)۔

پھر شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے فتاوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الغرض صحابہ کرام وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے واضح ہو گیا کہ جس طرح قرآن کریم میں زبان عربی کی حفاظت ضروری اور لازم ہے، کسی عجمی زبان میں بدون قرآنی عبارت کے قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم خط کی حفاظت بھی ضروری ہے، کسی دوسرے رسم خط میں ان کا لکھنا جائز نہیں، کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے، جو باجماع امت حرام ہے۔

خصوصا ایسے رسم خط جن میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا پڑے، جیسے انگریزی رسم خط ہے کہ اس میں حرکات (زبر، زیر، پیش) کو بھی بشکل حروف لکھا جاتا ہے، ایسا لکھنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعا تحریف قرآن ہے" (کتاب مذکور: ص ۷۷)۔

اتقان للسیوطی کا حوالہ دینے کے بعد پھر لکھتے ہیں:

الغرض عربی رسم خط میں حرکات اور نقطوں کا کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہونا ثابت ہونے کے باوجود سلف صالحین کو ان کی کتابت فی المصاحف میں اختلاف پیش آیا تو جس رسم خط (مثلا انگریزی) میں یہ حرکات خود کلمات کے درمیان بشکل حروف لکھی جاتی ہوں اس کی اجازت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔ ٹامل زبان کا حال معلوم نہیں کہ اس بارہ میں بھی انگریزی کی طرح ہے یا کیا صورت ہے؟

علاوہ ازیں عربی زبان میں چند حروف ایسے ہیں کہ ہر حرف سے لفظ کے معنی بالکل جدا ہو جاتے ہیں، لیکن بہت سی عجمی زبانوں میں ان حروف میں کوئی فرق نہیں سب کو ایک ہی آواز سے پڑھا جاتا ہے ایک ہی شکل سے لکھا جاتا ہے، مثلا (س، ث، ص) اور (ذ، ز، ظ) وغیرہ تو جب قرآن کو اس رسم خط میں لکھا جائے گا تو ان حروف کا کوئی امتیاز نہ رہیگا جو سخت ترین تحریف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگر چہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں مثلا اوائل سورت میں "بسم اللہ" کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے اور "اقرأ باسم ربك" میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگر چہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں مگر باجماع امت اسی کی نقل واتباع کرنا ضروری ہے اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے (کتاب مذکور: ص ۷۸)۔

چند صفحات کے بعد پھر لکھتے ہیں:

غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے، اور اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے، اس کے چند جملے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں:

''وأما كتابة القرآن بالفارسية فقد نص عليها في غير ما كتاب من كتب ائمتنا الحنفية المعتمدة منها ما قاله مؤلف الهداية الإمام الأجل شيخ مشائخ الاسلام حجة الله تعالى على الأنام برهان الدين أبو الحسن على بن أبي بكر المرغيناني الكبير رحمه الله تعالى في كتابه التجنيس والمزيد ما نص ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة؛ ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن انتهى''۔

(لیکن قرآن مجید کی فارسی زبان میں سو کسی ایک کتاب میں نہیں (بلکہ بہت سی کتب میں جو ہمارے ائمہ حنفیہ کے نزدیک مستند ہیں اس کی تصریح موجود ہے منجملہ ان کے وہ ہے جو صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب تجنیس اور مزید میں فرمایا ہے جس کی عبارت یہ ہے: اور فارسی میں کتابِ قرآن سے باجماع منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ حفاظت قرآن میں خلل ڈالنے کا ذریعہ ہے کیونکہ ہم قرآن مجید کے الفاظ اور معنی دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں کیونکہ الفاظ بھی ثبوت نبوت کی دلیل ہیں، اور الفاظ کے بدلنے سے (اگرچہ معنی نہ بدلیں) قرآن مجید کی حفاظت میں سستی پیدا ہوتی ہے)۔

''وزعم أن كتابته بالعجمية فيها سهولة للتعليم كذب مخالف للواقع والمشاهدة فلايلتفت لذلك على أنه لو سلم صدقه لم يكن مبيحا لإخراج ألفاظ القرآن عما كتب عليه، وأجمع عليه السلف والخلف''

(اور یہ گمان کرنا کہ عجمی (زبان یا رسم الخط) میں تعلیم کی سہولت ہے تو یہ غلط اور مخالف واقع ہے اور خلاف مشاہدہ ہے، اس کی طرف التفاف نہ کیا جاوے، علاوہ ازیں اگر اس کا سچ ہونا بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی قرآن کے الفاظ کا ان کی اجماعی صورت اور قدیم طرز کتابت سے نکالنا اس مصلحت کی وجہ سے جائز نہیں ہوسکتا)۔

علامہ ابن حجرؒ کی اس تقریر میں ان تمام شبہات کا بھی پورا جواب ہے جو رسم خط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں کہ اس میں عجمیوں کے لئے قرآن پڑھنے میں سہولت ہے، حافظ نے واضح کردیا کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے اور اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سہولت کی خاطر قرآن کی تبدیل وتغیر جائز نہیں ہوسکتی۔

اور حنابلہ کے مشہور فقیہ ابن قدامہ کی کتاب المغنی کے حواشی میں اس کو اور بھی واضح کردیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں آیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک واقعہ بھی اس کا مذکور نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کرکے بھیجا ہو یا عجمی رسم الخط میں لکھوایا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب جو ملوک عجم کسری وقیصر ومقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے جن میں سے بعض کے فوٹو بھی چھپ گئے ہیں اور آج تک محفوظ ہیں ان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ ان میں عجمی زبان اختیار کی گئی ہے نہ عجمی رسم خط اختیار کیا گیا ہے، حواشی مذکورہ کے چند جملے یہ ہیں:

''وهو إنما نزل باللسان العربي كماهو مصرح في الآيات المتعددة. وإنما كان تبليغه والدعوة إلى الإسلام والإنذار به كما أنزل الله تعالى لم يترجم النبي ﷺ ولا أذن بترجمته ولم يفعل ذلك الصحابة ولا الخلفاء المسلمين وملوكهم۔ ولو كتب النبي ﷺ كتبه إلى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذى علل به'' (مغني مع الشرح الكبير: ۱/ ۸۳۰)۔

(اور قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا، جیسا کہ متعدد آیات قرآن میں صراحت ہے اور اسی عربی زبان میں قرآن کی تبلیغ اور دعوت وانذار عمل میں آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس کا ترجمہ کرکے نہیں پہنچایا، اور نہ ترجمہ کرکے پہنچانے کی اجازت دی اور نہ حضرات صحابہ نے ایسا کیا اور نہ خلفائے اسلام اور سلاطین اسلام نے ایسا کیا، اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطوط قیصر وکسری اور مقوقس وغیرہ کو ان ہی کی زبانوں میں لکھواتے تو یہ دلیل صحیح مانی جاسکتی تھی کہ عجم کو عجمی زبان میں پہنچانا زیادہ مفید ہے) (کتاب مذکور، ص ۸۱ تا ۸۴)۔

مفتی صاحبؒ نے اپنے دوسرے رسالہ ''صیانۃ القرآن عن تغیر الرسم واللسان'' میں مسئلہ کے مالہ وماعلیہ کی وضاحت کے بعد تنبیہات بھی رقم

فرمائی ہیں، جو کہ یہ ہیں:

''تنبیہ:...... رسالہ نصوص جلیہ اور فضائل القرآن ابن کثیر اور امام زرکشی سے جو عبارات ونصوص نقل کی گئی ہیں ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت ومخالفت بھی ثابت ہوگئی کہ زبان تو عربی ہی رہے، لیکن رسم خط انگریزی یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی، ناگری وغیرہ کردیا جائے، جیسا کہ اس فتنہ زا زمانہ میں اس کا بھی شیوع ہے، کہیں انگریزی رسم خط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے، کہیں ہندی اور گجراتی میں، جو باجماع امت ناجائز ہے، خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم خط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہوگی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمت اسلام سمجھ کر کیا جارہا ہے، اور اس کے لیے بہت سی مصالح دینیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے، نہ ضرورت، کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اسی طرح حاصل ہوتی آئی ہیں کہ ہر ملک وقوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انہوں نے بدون رسم خط تبدیل کرنے کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں، اور ایسا پڑھا کہ انہیں اہل عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کی قرأت وتجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے، اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کیے جائیں تو ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماع امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا، اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمان اور دوسرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنھم) نے ان مصالح کی طرف نظر نہیں فرمائی، حالانکہ یہ مصالح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں، کیونکہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا، اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا ہے مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے، اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن نہ تھا، کیونکہ خود کاتب قرآن زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) مختلف زبانیں جانتے تھے، مگر اس کے باوجود کتابت قرآن میں خاص خاص ملکی مصالح کو نظر انداز کرکے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں بھیجے۔

'' والی اللہ المشتکی مما عمت فیہ البلویٰ من أیدی أصحاب الھویٰ و ایاہ نسئل الھدیٰ والتقیٰ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم''۔

تنبیہ دوم:...... یہ سوال کوئی آج پیدا نہیں ہوا، ہندوستان میں مدت سے یہ رسم بد چل گئی ہے، ۱۳۳۲ھ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سامنے ایک ایسے ہی اردو ترجمہ بلا عربی عبارت کی اشاعت کے متعلق لکھا گیا، تو حضرتؒ نے اس کی ممانعت وحرمت پر ایک نہایت مفصل ومدلل فتوی تحریر فرمایا تھا، جو ''حوادث الفتاوی حصہ دوم: ص ۱۵۶'' پر شائع ہوچکا ہے (جواہر الفقہ ۱/۱۱۱)۔

اسی قسم کے سوالات کے جوابات کے تحت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں: 'عبارات منقولہ بالا سے معلوم ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگرچہ وہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علمائے امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا، پھر غیر عربی بنگلہ وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، اس میں جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، لہذا صورت مسئولہ بالا جماع ناجائز ہے، بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے طاء، حاء، ض، ظ، ذ، ز وغیرہ یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے، ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے، نہ شکل وصورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے، جو کہ بنگلہ میں مستعمل ہیں اور یہ عمداً تحریف وتغییر ہے جو کہ حرام ہے، البتہ اگر متن قرآن کریم تو عربی اصل رسم خط میں ہو اور اس کا ترجمہ وتفسیر بنگلہ زبان میں ہو تو شرعاً مضائقہ نہیں (فتاوی محمودیہ ۱/ ۴۶)۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: الفاظ قرآن کو عربی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے، ہندی یا کسی اور رسم الخط میں لکھنے کی اجازت نہیں، اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے، ہندی رسم الخط میں عبارت مسخ ہوجائے گی، ''ح، ذ، ز، ض، ظ'' میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہوگی، اصل مخارج وصفات سے ادا نہ کیا جائے گا، استعلاء، اطباق، استطالت، سب کچھ ضائع کردیں گے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم (فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۵۱)۔

حضرت مفتی نظام الدین اعظمی صفتی دار العلوم دیوبند سے سوال کیا گیا:

''کسی شخص نے قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں اس طرح لکھا ہے کہ لکھنے اور پڑھنے میں عربی الفاظ وکلمات مسخ ہوجاتے ہیں، مثلاً قرآن عربی میں 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' ہے، اس آیت کو ہندی رسم الخط میں یوں لکھا گیا ہے کہ اگر ہندی تحریر کو عربی میں لکھیں تو یوں آیت ہوگی 'بسم ل للہ ہ ر حمان ر ر حیماہ' جو تحریراً بھی غلط اور قراءۃً بھی غلط ہے، اور عربی بسم اللہ میں لفظ ''اللہ'' کا ''الف'' اور ''الرحمن'' کا ''ال'' اور ''الرحیم'' کا ''ال'' کم ہے، اس طرح ہندی میں

"بسم اللہ" کے پانچ حروف کم کئے گئے ہیں، اور "الرحمن" کی (ر) اور "الرحیم" کی (ر) ڈبل لکھی گئی ہیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ دو (ر) کی زیادتی اور اضافہ کیا گیا ہے، گویا ایک آیت مذکورہ میں سات غلطیاں ہیں، پورے قران مجید میں تو ہزاروں حروف کی کمی اور اضافہ ہے، اس طرح پورے قرآن مجید عربی میں ترمیم و تنسیخ کر کے قران کو مسخ کیا گیا ہے، اور اس کو "ہندی قرآن" نام دیا گیا ہے، کیا ایسی صورت میں اس ہندی قرآن کا لکھنا اور پڑھنا جائز ہے، یا کہ ناجائز؟ اور لکھنے والا ناسخ قرآن ہے کہ نہیں؟ اور یہ حرکت تمسخر قرآن میں داخل ہے کہ نہیں، اور لکھنے والے کو اور پڑھنے والے کو اور پڑھانے والے کو مومن اور مسلمان کہا جاسکتا ہے یا کہ نہیں، (نوٹ) اس کی تحسین و تعریف کرنے والے کو شرعا کیا کہا جائے گا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کا جواب یوں لکھا:

قرآن کریم نام یعنی علم خاص اس کلام الٰہی کا جو عربی زبان میں بذریعہ جبرئیل علیہ السلام جناب رسول اللہ ﷺ پر منجانب خدا نازل کیا گیا ہے، اور تلاوت کیا گیا ہے، اور اس کے تمام کلمات و حروف زیر زبر، مد ولین، جزم و تشدید وغیرہ سب ہی چیزیں متعین و معلوم ہیں، اس کا رسم الخط بھی علاحدہ و متعین ہے، ایک خاص انداز سے مکتوب ہے، اس کا نطق و تکلم بھی نرالی شان رکھتا ہے، ان تمام کیفیات و خصوصیات کے ساتھ لوح محفوظ میں موجود محفوظ ہے، اور اس کے تمام احکام الگ و ممتاز ہیں، اس کو کسی شخص کا بغیر طہارت چھونا بھی جائز نہیں، چنانچہ ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"الٓمٓر تلك آيات الكتاب المبين. إنا أنزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون" (سورۂ یوسف: ۲)۔

اور ایک مقام پر اس طرح مذکور ہے:

"إنه لقرآن كريم فى كتاب مكنون. لا يمسه إلا المطهرون. تنزيل من رب العالمين" (سورۂ واقعہ: ۸۰،۷۷)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: "بل هو قرآن مجيد فى لوح محفوظ" (سورۂ بروج)۔

اور تفسیر روح المعانی (۱/ ۱۰) میں قرآن کریم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"والقرآن كلام الله المنزل بهذه المعنى. فهو كلمات غيبية مجردة عن المراد مترتبة فى علم الله ازلا غير متعاقبة تحقيقا، بل تقديرا عند تلاوة على الألسنة من غير كونية الزمانية (الى قوله) ومن هنا قال الشمعون القرآن كلام الله غير مخلوق مكتوب فى المصاحف، محفوظ فى الصدور. مقروء بالألسنة مسموع بالأذن. غير حال فى شرمنها وهو فى جميع هذه المراتب قرآن حقيقة شرعية. معلوم من الدين بالضرورة. وهكذا فى غاية تفسير المحققين"۔

ان آیات کریمہ و عبارات سے نیز دوسرے محققین کے کلام و روایات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں (قرآن پاک کے کلمات و حروف زیر و زبر وغیرہ) امور توقیفی ہیں، ان میں ایک زبر و زیر، بلکہ ایک نقطہ کی بھی کمی و بیشی جائز نہیں۔ اور ان قرآتوں کے علاوہ جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں کسی نوع کا تغیر و تبدل جائز نہیں ہے، اگرچہ عربی زبان اور عربی عبارت باقی کیوں نہ رہے، پھر ایسی تبدیلی و تغیر جس میں عربی زبان یا عربی رسم الخط وغیرہ تک متغیر و متبدل ہو جائے، کب اور کیوں کر درست و مباح ہو سکتا ہے۔

"ففى الإتقان للسيوطى لم يجوز احد من الأئمة الأربعة كتابة القرآن بغير العربية"

پس سوال میں جو خرابیاں لکھی ہوئی ہیں ان کے ساتھ تو لکھنا یا پڑھنا اس کو قرآن کریم کہنا کسی طرح درست نہیں ہے سخت گناہ اور قطعی حرام ہے اور بڑی خطرناک قسم کی جرأت ہے، اگر دیدہ دانستہ کوئی شخص اس طرح لکھے یا پڑھے تو اس کے محرف قرآن و ناسخ قرآن کریم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اسی طرح اس کو جائز سمجھنا یا اس کی رعایت کرنا بھی شدید جرم اور حرام ہے، مذکورہ طریقہ پر ہندی یا انگریزی، بنگلہ، برمی یا چینی رسم الخط غرض کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن شریف کو لکھنا، جس میں قرآنی رسم الخط و تلفظ و ادا کی خصوصیات محفوظ نہ رہیں، اور پھر اس کو اس زبان کی طرف منسوب کر کے ہندی قرآن یا انگریزی قرآن یا بنگلہ یا برمی یا چینی قرآن کہنا قرآن کریم و کلام الٰہی کی توہین و تحقیر ہے، اور تحریف کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی خرابیوں کی روک تھام کریں اور اس کی اصلاح کرنے کی ہر مناسب تدبیر اختیار کریں اور پوری کوشش کریں۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں، ان کی تعلیم و تلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سر حوض و سر صفحہ نمایاں کر کے اس طرح لکھا جائے

کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی عظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً: س، ث، اور ز، ذ، ظ، ض اور ہمزہ، ع وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً: حروف زوائد (الف لام) اور مدوجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کر کے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے، پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی اور ان باتوں کے بعد جو ایک بات اور پھر بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے، بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا اور کہا جائے کہ مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا انگیزی میں بنگلہ وغیرہ میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ یا مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف، صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے، اگر ذرا بھی کسی عمل میں یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی، ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہوجائے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کریم کے ساتھ تابع بن کر لکھ دی جاتی ہیں اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف ترجمہ قرآن یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں'' (منتخبات نظام الفتاوی ۱/ ۴۱۴)۔

لیکن احقر کے علم میں نہیں کہ کسی زبان میں ایسی جامع ومانع اصطلاحات وضع کرلی گئی ہیں یا وضع کرنا ممکن ہے جن میں عربی الفاظ وحروف، صفات اور مصحف عثمانی کے مطابق رسم الخط کو لکھا اور ادا کیا جاسکے، اگر حضرت مفتی صاحب کی ذکر کردہ قیود وشرائط جن کی دار العلوم دیوبند کے دو دیگر مفتیان کرام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اور حضرت مولانا مفتی سید احمد علی سعید صاحبؒ نے بھی تائید وتوثیق کی ہے، کی پوری پوری رعایت ہوجائے تو غیر عربی رسم الخط میں قرآن لکھنے کی کسی درجے میں گنجائش نکل سکتی ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

نابینا افراد کی ضرورت کے لئے بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنے کی گنجائش ہے، لیکن اسے مستحسن کہنے میں احقر کو تامل ہے، چونکہ اس میں رسم خط عثمانی کی رعایت نہیں، اس لئے فی نفسہ تو یہ حرام وناجائز ہے، لیکن نابینا افراد کی ضرورت وحاجت کی بنا پر ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے قبیل سے اس کی گنجائش ہے۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، بغیر وضو نہیں چھوا جاسکتا، جیسے تنہا ترجمہ قرآن کو بغیر وضو نہیں چھوا جاسکتا، بریل کوڈ والے قرآن کے آداب وہی ہیں جو اصل قرآن کے ہیں۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر اسکرین پر قرآن مجید موجود ہے، یعنی نظر آرہا ہے تو اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، موبائل کے ڈھانچے کو غلاف کے بجائے جلد اور دفتی مانا جائے گا جس کو قرآن سے الگ نہیں کیا جاسکتا، جیسے دفتی اور جلد الگ نہیں کی جاسکتی، جبکہ غلاف بالکل الگ چیز ہوتا ہے، جب پڑھتے ہیں تو بھی الگ کردیتے ہیں، جبکہ موبائل کا ڈھانچہ الگ نہیں کیا جاتا، اسی کے ساتھ مستقل لگا رہتا ہے، جیسے دفتی اور جلد لگی رہتی ہے۔

''لا یجوز لهما وللجنب والحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه کالخریطة والجلد الغیر المشرز لا بما هو متصل به'' (عالمگیری ۱/ ۳۸)۔

البتہ اگر اسکرین پر قرآن، موجود نہ ہو تو اسے بلا وضو چھوا جاسکتا ہے، حضرت تھانویؒ فونوگرام کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان نقوش میں جب تک پڑھے جانے کی صلاحیت ثابت نہ ہو ''حروف مکتوبہ کے حکم'' میں نہیں، اس لئے ان کا مس کرنا محدث وجنب کو جائز ہے، جیسے دماغ میں ارتسام الفاظ قرآنیہ کا ہوتا ہے اور اس دماغ کا مس کرنا جائز ہے، البتہ اگر وہ پڑھے جانے لگیں تو اس وقت دلالت وضعیہ غیر لفظیہ کی وجہ سے ان کو حکم حروف مکتوبہ کا دیا جائے گا'' (امداد الفتاوی ۴/ ۲۴۵)۔

☆☆☆

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت اور بریل کوڈ

ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی [1]

تمہید: قرآن مجید اللہ تعالی کی آخری کتاب ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی، یہ تمام انسانیت کے لئے ہدایت ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"شهر رمضان الذی أنزل فيه القرآن هدی للناس" (بقرہ/۱۸۵)

(رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کو تمام لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اتارا گیا)۔

اور رسول اللہ ﷺ جن پر قرآن اترا، وہ پوری انسانیت کے نبی ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

"وما أرسلناك إلا كافة للناس بشيرا ونذيرا، ولكن أكثر الناس لايعلمون" (سبا: ۲۸)

(اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس خوشخبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں)

، خود نبی کریم ﷺ نے اپنی نبوت ورسالت کے اس امتیازی پہلو کو واضح فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''كان النبي يبعث إلى قومه خاصة، وبعثت إلى الناس كافة'' (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۴۳۸، صحیح مسلم حدیث نمبر ۵۲۱)

(ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے اور مجھے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے)۔

اور جب قرآن ساری انسانیت کے لئے ہدایت ہے، تو اس کی تعلیمات کو تمام انسانی گروہوں تک پہنچانے کی ایک ہی راہ ہے، اور وہ ہے ترجمہ، کیونکہ مختلف انسانی جماعتوں کی زبانیں الگ الگ ہیں، اگر چہ یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید کی تعبیرات اور اس کے عربی الفاظ میں جو لطافت اور خوبیاں ہیں، وہ دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوسکتی ہیں، لیکن قرآن مجید کے ترجمہ کا مقصد قرآنی تعلیمات کو پہنچانا ہے، نہ کہ اس کی معجزانہ شان اور اس کی فصاحت وبلاغت کو نمایاں کرنا اس لئے کہ معجزہ ہونا اصل قرآن مجید کی شان ہے، لہذا ترجمہ میں اگر وہ معجزاتی کیفیت پیدا نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس مختصر کی تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ہیں:

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- اس طرح کا ترجمہ ہی عربی نہ جاننے والوں کے لئے اصل قرآن کا درجہ حاصل کر لے گا، اور وہ اصل قرآن سے بے تعلق ہو جائیں گے، اور اصل قرآن سے دور ہونا سنگین نتائج کا حامل ہوگا، اور خدشہ ہے کہ اس طرح کا قرآن شائع کرنے والے وعید الہی کے حقدار بن جائیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

"وقال الرسول يارب إن قومي اتخذوا هذا القرآن مهجورا" (فرقان: ۳۰)

(اور رسول کہیں گے کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنایا)

لہذا محض قرآنی تعلیمات پہنچانے کے لئے قرآن کی یہ ناقدری درست نہیں کہ لوگوں کو اصل قرآن سے دور کر دیا جائے، چنانچہ "بیضاوی" اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

[1] عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، کیرالا۔

''وقال الرسول محمد يومئذ أوفي الدنيا بثا إلى الله تعالى: يا رب إن قومي قريشا اتخذوا هذا القرآن مهجورا، بأن تركوه وصدوا عنه'' (أنوار التنزيل وأسرار التاويل ۳/ ۱۲۳)

(اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت یعنی قیامت کے دن کہیں گے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں اللہ تعالی سے شکوہ سنج ہو کر کہا کہ اے میرے پروردگار، میری قوم قریش نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنالیا، اس طرح کہ اسے چھوڑ دیا اور اس سے اعراض کیا)۔

اور ابن کثیر لکھتے ہیں: ''وترک عمله وحفظه أيضا من هجرانه'' (تفسیر ابن کثیر ۶/ ۱۰۸، تحقیق: سلام طبع دوم دار طیبة ۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء) (اور اس کے علم اور حفظ کو ترک کرنا بھی اسے پس انداز کردہ چیز بنانے میں داخل ہے)، میری رائے میں صرف ترجمہ پر اکتفا کرنا بھی قرآن سے بے تعلق ہونے کے مترادف ہے۔

۲- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے شہنشاہ ہرقل کے نام جو خط لکھا تھا، اس میں قرآن کریم کی آیت:

"يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا، ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله، فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون" (آل عمران: ۶۴)

(اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے، اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں، تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں) تحریر فرمائی تھے (دیکھئے: صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۹۴۱، ۴۵۵۳، ۷۵۵۱، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۷۷۳)۔

اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو جو خط لکھا تھا، اس میں درج ذیل آیات تھیں (دیکھئے: محمد حمید اللہ، مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافة الراشدة، ص ۷۴-۷۷، بیروت، دار الارشاد ۱۹۷۹ء)۔

"هو الله الذي لا إله إلا هو الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر، سبحان الله عما يشركون" (حشر: ۲۳)

(وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سلامتی، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحب کبریاء، اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں)۔

"يأهل الكتاب لا تغلوا في دينكم، ولا تقولوا على الله إلا الحق، إنما المسيح عيسى بن مريم رسول الله وكلمته ألقاها إلى مريم" (نساء: ۱۷۱) (اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو، مسیح عیسی بن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں، جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا)۔

اور بادشاہ مصر مقوقس کو جو خط لکھا تھا، اس میں یہ آیت درج کی تھی:

"قل يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله، ولا نشرك به شيئا، ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله، فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون" (آل عمران: ۶۴)

(اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے، اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں، تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں)۔

جبکہ ان آیات کی بے حرمتی کا اندیشہ تھا، اور اگر اس اندیشہ کی کوئی اہمیت ہوتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ترجمہ لکھوا دیتے، اس لئے کہ ترجمہ کے ماہرین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

''وأصبح كل رجل منهم يتكلم بلسان القوم الذين بعثه إليهم'' (ابن سعد الطبقات الکبری ۱/ ۲۰۲، ۱۹۸ طبع اول، بیروت العلمیہ ۱۴۱۰ھ، ۱۹۹۰) (اور ان سفراء میں سے ہر سفیر شخص اس قوم کی زبان بولنے لگا تھا، جس کی طرف اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا)۔

اس سے پتہ چلا کہ متن کے بغیر محض ترجمہ شائع کرنا درست نہیں ہے۔

۳- متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنے سے تحریف کا دروازہ کھل سکتا ہے، جس میں عام طور سے گذشتہ قومیں مبتلا ہوئیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"من الذين هادوا يحرفون الكلم عن مواضعه" (نساء:۴۶) (یہود میں سے ایک گروہ الفاظ کو ان کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے)

اور ایک جگہ ارشاد ہے: "يحرفون الكلم من بعد مواضعه" (مائدہ:۴۱) (وہ کلام کو اس کا موقع و محل معین ہونے کے باوجود اس کے محل سے ہٹا دیتے ہیں)، اور یہ بات مخفی نہیں کہ عام طور سے اہل کتاب تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے، چنانچہ بیضاوی لکھتے ہیں:

''أي يميلونه عن مواضعه التي وضعه الله فيها بإزالته عنها وإثبات غيره فيها. أو يؤولونه على ما يشتهون فيميلونه عما أنزل الله فيه'' (تفسیر البیضاوی ۲/ ۷۷)

(یعنی وہ کلام کو اس کے محل سے ہٹا کر دوسرا کلام اس کی جگہ رکھ دیتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ مفہوم سے ہٹا کر اپنی خواہش کے مطابق تاویل کرتے ہیں)

سو اگر متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنے کی اجازت دے دی جائے، تو ترجمانی کے نام پر اصل متن کی عدم موجودگی میں تحریف کے دروازے کھل جائیں گے۔

۴- متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنے سے اصل قرآن کا احترام دلوں سے رخصت ہو جائے گا، کیونکہ یہ ترجمہ اصل قرآن کے حکم میں نہیں ہے، چنانچہ اس ترجمہ کی تلاوت نہیں کی جاسکتی ہے، نہ اس کو قرآن کہا جاسکتا ہے، نہ محض ترجمہ کی عبارت سے احکام شرعیہ مستنبط کئے جاسکتے ہیں، نہ نماز میں اس کی قراءت جائز ہے، اور اس ترجمہ کو بغیر وجو کے چھونا بھی جائز ہے، چنانچہ سرخسی رقم طراز ہیں:

''وأصل هذه المسألة إذا قرأفي صلاته بالفارسية جاز عند أبي حنيفة رحمه الله ويكره، وعندهما لاتجوز. إذا كان يحسن العربية، وإذا كان لايحسنها يجوز. وعند الشافعي لاتجوز القراءة بالفارسية بحال. ولكنه إن كان لايحسن العربية، وهو أمي يصلي بغير قرائة... فالشافعي يقول: إن الفارسية غير القرآن. قال الله تعالى:'' إنا جعلناه قرآنا عربيا'' (زخرف:۳) ''وقال الله تعالى: ولوجعلناه قرآنا أعجميا لقالوا: لولا فصلت آياته أعجمي وعربي'' (فصلت:۴۴) ''فالواجب قراءة القرآن. فلا يتأدى بغيره بالفارسية. والفارسية من كلام الناس. فتفسد الصلاة. وأبويوسف ومحمدرحمهما الله قالا: القرآن معجز. والإعجاز في النظم والمعنى. فإذا قدر عليهما. فلايتأدى الواجب إلا بهما. وإذا عجز عن النظم أتى بما قدر عليه. كمن عجز عن الركوع والسجود يصلي بالإيماء. وأبوحنيفة استدل بما روي أن الفرس كتبوا إلى سلمان، أن يكتب لهم الفاتحة بالفارسية. فكانوا يقرءون ذلك في الصلاة، حتى لانت ألسنتهم للعربية. ثم الواجب عليه قراءة المعجز. والإعجاز في المعنى. فإن القرآن حجة على الناس كافة، وعجز الفرس عن الاتيان بمثله إنما يظهر بلسانهم. والقرآن كلام الله تعالى غير مخلوق ولا محدث. واللغات كلها محدثة. فعرفنا أنه لايجوز أن يقال: إنه قرآن بلسان مخصوص. كيف؟ وقد قال الله تعالى: ''وإنه لفي زبر الأولين'' (شعراء:۱۹۶) ''وقد كان بلسانهم'' (المبسوط، كتاب الصلاة، باب افتتاح الصلاة ۱/ ۳۷)۔

(اور اس مسئلہ کی اصل یہ ہے کہ اگر نماز میں فارسی زبان میں قراءت کرے، تو یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور مکروہ ہے، اور صاحبین کے نزدیک جائز نہیں اگر عربی زبان کو اچھی طرح ادا کرسکتا ہو، اور اگر عربی زبان پر قدرت نہ ہو، تو جائز ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک کسی حال میں فارسی زبان میں قراءت جائز نہیں، لیکن اگر عربی زبان پر قدرت نہ ہو، اور وہ ناخواندہ ہو تو بغیر قراءت کے نماز پڑھ لے، چنانچہ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ فارسی ترجمہ قرآن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے)، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے، تو یہ لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی، کلام عجمی اور مخاطب عربی)، لہذا فرض قرآن کا پڑھنا ہے، سو قرآن کے بغیر فارسی ترجمہ سے فرض ادا نہ ہوگا، اور فارسی لوگوں کے کلام سے ہے، لہذا نماز فاسد ہو جائے گی، اور ابو یوسف اور محمدؒ کہتے ہیں کہ قرآن معجزانہ شان رکھتا ہے اور معجزانہ شان لفظ اور معنی دونوں کے اندر ہے، سو جب دونوں پر قادر ہو، تو فرض دونوں کے بغیر ادا نہ ہوگا، اور اگر لفظ پر قادر نہ ہو تو اس معنی ہی کو ادا کرلے جس پر قادر ہو، جیسے وہ شخص جو رکوع اور سجدہ پر قادر نہ ہو وہ اشارہ سے ہی نماز پڑھ لے، اور امام ابوحنیفہؒ نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کو لکھا کہ وہ ان کے لئے سورہ فاتحہ فارسی زبان میں لکھ دیں، چنانچہ وہ لوگ نماز میں اس ترجمہ کو پڑھتے تھے، یہاں تک کہ ان کی زبان عربی زبان کے لئے نرم پڑ گئی، پھر اس کے ذمہ عاجز کر دینے

والے قرآن کا پڑھنا واجب ہے، اور معجزانہ شان کا تعلق معنی سے ہے، کیونکہ قرآن تمام لوگوں پر حجت ہے، اور قرآن کے مثل لانے سے ایرانیوں کی بے بسی ان کی زبان میں ظاہر ہوگی، اور قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مخلوق اور نو ایجاد نہیں، اور ساری زبانیں مخلوق ہیں، لہٰذا ہم نے جانا کہ جائز نہیں کہ کہا جائے کہ کلام الٰہی مخصوص زبان میں قرآن ہے، اور ایسا کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (اور وہ اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے)، اور ان صحیفوں میں قرآن ان کی زبان میں تھا)۔

اور علامہ مرغینانیؒ کی تحقیق کے مطابق امام صاحب نے صاحبین کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''ویروی رجوعه في أصل المسألة إلی قولهما، وعلیه الاعتماد'' (الهدایه مع العنایه ا/ ۲۸۵)

(اور اصل مسئلہ میں امام صاحب کا صاحبین کے قول کی طرف رجوع مروی ہے، اور اسی پر اعتماد ہے)۔

اور علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: ''والقرآن معجز، والإعجاز من حیث اللفظ یزول بزوال النظم العربي، فلا یکون الفارسي قرآنا لانعدام الإعجاز، ولهذا لم تحرم قراءته علی الجنب والحائض'' (بدائع الصنائع، کتاب الصلاة ا/ ۱۱۲)

(اور قرآن معجزانہ شان کا حامل ہے، اور لفظ کے اعتبار سے معجزانہ پہلو عربی نظم کے زائل ہونے سے زائل ہو جائے گا، لہٰذا اعجاز کے معدوم ہونے کی وجہ سے فارسی ترجمہ قرآن نہیں ہوگا، اور اسی وجہ سے جنبی اور حیض والی عورت پر اس کا پڑھنا حرام نہیں ہے)۔

لیکن مرجوح قول کی بنیاد پر امام نسفیؒ نے قرآن کے معانی کے اگلوں کے صحیفوں میں ہونے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ''القرآن قرآن إذا ترجم بغیر العربیة، فیکون دلیلا علی جواز قراءة القرآن بالفارسیة في الصلاة'' (مدارک التنزیل ۲/ ۵۸۲ طبع اول، بیروت، دار الکلم الطیب ۱۴۱۹ھ، ۱۹۹۸ء) (قرآن اگر غیر عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے، تو وہ قرآن باقی رہے گا، تو یہ امر اس بات کی دلیل ہوگی کہ نماز کے اندر فارسی زبان میں قرآن کی قراءت جائز ہے)۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ آیت سے استدلال ناقص ہے، اس لئے کہ اگلوں کے صحیفے میں اس کا تذکرہ موجود ہے، نہ کہ بعینہ قرآن موجود ہے، خلاصہ یہ کہ امام شافعی اور دیگر علماء کے نزدیک ترجمہ قرآن نہیں، اور مجبوری کی صورت میں تہلیل (لا الہ إلا اللہ) اور تسبیح (سبحان اللہ) سے کام چلائے گا، چنانچہ اس بات کی تصریح خود فقہاء شوافع نے بھی کی ہے، جیسا کہ امام نووی شافعیؒ رقم طراز ہیں:

''مذهبنا أنه لا یجوز قراءة القرآن بغیر لسان العرب، سواء أمکنه العربیة أو عجز عنها، وسواء کان في الصلاة أو في غیرها، فإن أتی بترجمته في صلاة بدلا عن القراءة لم تصح صلاته، سواء أحسن القراءة أم لا. هذا مذهبنا، وبه قال جماهیر العلماء، منهم مالك وأحمد وداؤد'' (المجموع ۳/ ۳۷۹)

(ہمارا مذہب یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں قرآن کی قراءت جائز نہیں، خواہ اس کے لئے عربی زبان ممکن ہو، یا وہ اس پر قادر نہ ہو، اور خواہ نماز میں ہو یا نماز کے علاوہ میں ہو، سو اگر نماز کے اندر قراءت کی جگہ قرآن کا ترجمہ پڑھے، تو اس کی نماز صحیح نہیں خواہ قراءت پر قدرت ہو یا نہ ہو، یہ ہمارا مذہب ہے اور یہی جمہور اہل علم کا قول ہے، جن میں امام مالک، احمد اور داؤد شامل ہیں)۔

اور یہ واضح ہے کہ جب بے وضو ترجمہ پڑھنے کی عادت پڑ جائے گی، تو اصل قرآن کی عظمت بھی دل سے آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی، اور ترجمہ کو بے وضو پڑھنا اصل کو بے وضو پڑھنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

۵- تاج الشریعہؒ نے لکھا ہے کہ ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے فارسی زبان میں سورہ فاتحہ تحریر کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے ان کے لئے لکھا ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' بنام یزدان بخشاونده... (النهایه ا/ ۱۸۶) اس سے بھی پتا چلا کہ متن کے ساتھ ترجمہ ہونا چاہئے۔

۶- متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنے سے اصل اور ترجمہ کا فرق ذہنوں سے کافور ہو جائے گا، اور ترجمہ قرآن اصل قرآن کا درجہ حاصل کر لے گا، اور گذشتہ قوموں کی طرح مسلمانوں کی بھی اصل قرآن سے توجہ ہٹ جائیگی۔

۷- اگر متن قرآن کے بغیر ترجمہ قرآن کی اشاعت کی گئی، تو انگریزی قرآن، اردو قرآن اور مختلف زبانوں کے قرآن کے وجود میں آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو جائیگی، اور نتیجتاً ان کی ہوا اکھڑ جائے گی، جبکہ قرآن کریم وہ آخری مرجع اور پناہ گاہ ہے، جس کی پناہ لی جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی

ہے: "واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا" (آل عمران: ۱۰۳) (اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو)۔

اور حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أنا تارك فيكم ثقلين: أولهما كتاب الله، فيه الهدى والنور، فخذوا بكتاب الله و استمسكوا به" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۴۰۸) (میں تمہارے اندر دو بھاری بھر کم چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں، پہلی چیز قرآن پاک ہے جس میں ہدایت اور نور ہے، سو کتاب اللہ پر عمل کرو اور اسے مضبوطی سے تھام لو)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ قرآن کریم وہ آخری میزان ہے جس پر ہر چیز پرکھی جائے گی، اور یہ متن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کی صورت میں ممکن نہیں ہے، کیونکہ اصل قرآن کی طرف رجوع کا حکم ہے نہ کہ ترجمہ قرآن کی طرف۔

۸- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من قرأحرفا من كتاب الله، فله حسنة، والحسنة بعشر أمثالها، لا أقول ألم حرف، ولكن ألف حرف، ولام حرف و ميم حرف" (سنن ترمذی، حدیث نمبر ۲۹۱۰، اور اس کی سند صحیح ہے) (جو کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھے گا تو اسے اس کے بدلہ ایک نیکی ملے گی، اور ہر نیکی دس گنی لکھی جائے گی، میں نہیں کہتا کہ الم حرف ہے، لیکن الف حرف ہے، لام حرف ہے اور میم حرف ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ اصل قرآن کے پڑھنے میں بڑا ثواب ہے، چنانچہ اگر متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کی جائے، تو اصل قرآن کو پڑھ کر ثواب حاصل کرنے کی کوشش ہی ناپید ہو جائے گی، اور اس طرح اصل قرآن سے توجہ ہٹ جائے گی، اور ترجمہ ہی اصل قرآن کا درجہ لے لے گا، جبکہ مؤمن کی اصل ذمہ داری اصل قرآن کو پڑھنا، حفظ کرنا، سمجھنا اور اس کے اندر تدبر کرنا ہے۔

۹- فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست نہیں ہے، چنانچہ (الکافی) کے حوالہ سے ابن الہمام لکھتے ہیں:

"أراد أن يكتب مصحفا بهاأي بالفارسية تمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز" (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۱/ ۲۸۶، نیز دیکھئے: رد المحتار ۱/ ۴۸۶)

(فارسی رسم الخط میں قرآن لکھنا چاہے، تو اس سے منع کیا جائے گا، اور اگر ایک دو آیت کے اندر ایسا کرے تو ممانعت نہیں، پھر اگر متن قرآن لکھے اور ہر جملہ کی تفسیر اور ترجمہ فارسی میں لکھے تو جائز ہے)۔

۱۰- عام طور سے غیر مسلم حضرات بھی مذہبی کتابوں کا احترام کرتے ہیں، اس لئے بے حرمتی کا اندیشہ بے بنیاد ہے، اصل ضرورت نفرت کی فضا کو ختم کرنے کی ہے، چنانچہ اگر غیر مسلم حضرات "ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم وعلى أبصارهم غشاوة" (بقرہ: ۷) (اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے) کے قبیل سے نہ ہوں، اور اپنی فطری صلاحیتوں کو ضائع نہ کیا ہو، تو ان حضرات کی طرف سے بے حرمتی کا اندیشہ موہوم ہے۔

اور چونکہ کفار فرعی احکام کے مخاطب نہیں ہیں، جیسا کہ کاسانی لکھتے ہیں: "الكفار غير مخاطبين بشرائع هي عبادات عندنا" (بدائع الصنائع ۱/ ۲۴۶) (کفار عبادت کے قسم کے شرعی احکام کے ہم احناف کے نزدیک مخاطب نہیں ہیں)۔

لہٰذا ان کے بے وضو قرآن کو چھونے میں بے حرمتی نہیں ہے، اس لئے کہ مشرک کے اندر اعتقادی نجاست ہے نہ کہ حسی وظاہری، اسی بنا پر ان کے مسجد میں آنے کو فقہاء حنفیہ بے حرمتی سے تعبیر نہیں کرتے ہیں، جیسا کہ عینی لکھتے ہیں کہ "الكفار غير مخاطبين بفروع الشريعة: فلا بأس بدخولها" (البنایہ ۹/ ۲۰) (کفار شریعت کے فرعی احکام کے مخاطب نہیں، لہٰذا مسجد کے اندر غیر مسلم حیض والی خاتون کے آنے میں کوئی حرج نہیں)، اور جب غیر مسلم حائضہ خاتون کے مسجد میں داخل ہونے میں کوئی بے حرمتی نہیں ہے، تو بے وضو قرآن چھونے میں بھی بے حرمتی نہیں ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے مسلک کے مطابق جو کفار کو فروعی احکام کا مخاطب قرار دیتے ہیں (رد المحتار ۶/ ۳۹۱)۔

چونکہ وہ ادائیگی کے مکلف نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بے وضو چھونے میں بے حرمتی نہیں ہے، اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ فاطمہ بنت الخطاب نے

حضرت عمرؓ سے کہا:

''إنك نجس على شركك، وإنه لايمسه إلا الطاهر، فقام عمر فاغتسل، ثم أعطته الصحيفة، وفيها طه، فقرأها'' (احمد بن حنبل، فضائل الصحابة ۱/ ۲۷۹، طبع اول، بیروت، الرسالہ ۱۴۰۳ھ)

(اپنے شرک کی بنا پر آپ نجس ہیں، اور اس صحیفہ کو پاک شخص ہی چھو سکتا ہے، چنانچہ حضرت عمر نے اٹھ کر غسل فرمایا حضرت فاطمہ نے ان کو صحیفہ دیا، جس میں سورہ طہ مرقوم تھی اور انہوں نے اسے پڑھا)۔

تو یہ یا تو ان کا اپنا فہم ہے کہ کافر حسی اعتبار سے بھی نجس ہوتے ہیں، یا جنابہ فاطمہ نے حضرت عمر سے غسل کے لئے اس لئے کہا تاکہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے، اور وہ صحیفہ کی بے حرمتی نہ کریں، اگرچہ حضرت عمر نے ان سے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ صحیفہ کی بے حرمتی نہیں کریں گے، لیکن شدت غضب کو دیکھتے ہوئے حضرت فاطمہ نے مکمل اطمینان کر لینا چاہا ہو۔

۱۱- فریب دینا اسلام میں درست نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من غشنا فليس منا'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۱۰۲) (جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں)، سو غیر مسلموں کو محض ترجمہ دے کر یہ کہنا کہ یہ قرآن ہے، ایک طرح سے دھوکہ ہے، اس لئے کہ ترجمہ قرآن نہیں، بلکہ اس کے معانی کی ترجمانی ہے۔

۱۲- مسلمانوں کا حال عجیب وغریب ہے، وہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات پر لاکھوں روپے صرف کر دیتے ہیں، لیکن اسلام کی دعوت اور تبلیغ کے نام پر خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں، اور مختصر راہ کی تلاش میں رہتے ہیں، جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ويسألونك ماذا ينفقون. قل العفو'' (بقرہ: ۲۱۹) (اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے)، لہذا ان کو چاہئے کہ اسلام کی اشاعت صحیح طریقہ سے کریں، خواہ اس پر مصارف زیادہ آتے ہوں، کیونکہ اصل مقصد اللہ تعالی کی رضا کے لئے کام کرنا ہے، نہ کہ اپنی مرضی کے مطابق۔

۱۳- دنیاوی فوائد کے لئے لوگ مختلف زبانیں مختصر سی مدت میں سیکھ لیتے ہیں، تو ایک مسلم کو یہ کیسے زیب دیتا ہے کہ وہ اسلام کی رسمی اور سرکاری زبان عربی کو نہ سیکھے، تاکہ متن قرآن کو پڑھ سکے۔

ان دلائل کے پیش نظر بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز ہے، اور اسے خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا سب ناجائز وحرام ہے۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

جس طرح قرآن کریم کے الفاظ ومعانی معجزانہ شان کے حامل ہیں، اسی طرح اس کا رسم الخط بھی معجزانہ شان کا حامل ہے، چنانچہ عثمانی رسم الخط جس میں قرآن کریم لکھا جاتا ہے، یہ وہ رسم الخط ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن مجید لکھا ہے، اور اسی رسم الخط کی پیروی حضرت ابوبکر اور حضرت عثمانؓ نے کی، اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر اتفاق کیا، اور اسی رسم الخط پر عہد تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں امت کا اتفاق رہا، چنانچہ عثمانی رسم الخط توقیفی، یعنی اللہ تعالی کی طرف سے بتایا ہوا رسم ہے، لہذا دوسرے رسم الخط میں قرآن کریم لکھنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے اس کا اعجاز متاثر ہوگا، اور تحریف وتغییر کا دروازہ کھلے گا، اس لئے نہ یہ کہ عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآنی کو باقی رکھتے ہوئے، کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھا جائے، اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے، اور نہ یہ جائز ہے کہ غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کی جائے، چنانچہ ابن الہمام (الکافی) کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''أراد أن يكتب مصحفا بهاأي بالفارسية يمنع'' (فتح القدیر ۱/ ۲۸۶) (فارسی رسم الخط میں مصحف لکھنا چاہے تو اس سے منع کیا جائے گا)۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی تعبیرات اور اس کے عربی الفاظ میں جس طرح لطافت اور خوبیاں ہیں، اسی طرح ان کے تلفظ میں بھی آخری درجہ کی لطافت ہے، جس میں ہلکی سی تبدیلی معنی ومفہوم کو بدل کر رکھ دیتی ہے، چنانچہ ابن مازہ بخاری حنفی لکھتے ہیں:

''أراد أن يكتب المصحف بالفارسية منع من ذلك أشد المنع'' (المحيط البرهانی ۱/ ۳۰۸)

(فارسی رسم الخط میں مصحف لکھنا چاہے تو اس سے سختی سے منع کیا جائے گا)۔

اور زرکشی (م: ۷۹۴ھ) لکھتے ہیں: ''قال أشهب سئل مالك: هل تكتب المصحف على من أحدثه الناس من الهجاء؟

فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى. رواه أبوعمرو والداني في(المقنع)ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة...وقال الإمام احمد: تحرم مخالفة خط مصحف عثمان في ياء أو واو أو الف. و غير ذلك'' (البرهان في علوم القرآن ١/ ٣٧٩ طبع اول البابي، ١٣٧٦ھ،١٩٥٧ء)

(اشہب کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ آپ اس طرز پر مصحف لکھیں گے جو لوگوں نے ایجاد کیا ہے، تو انہوں نے جواب دیا نہیں، مگر پہلے طرز پر، (مقنع) نامی کتاب میں ابوعمرو دانی نے اسے نقل کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ علماء امت میں سے کوئی امام مالک کے مخالف نہیں، اور امام احمد کا قول ہے کہ (یاء) یا (واو) یا (الف) یا اس کے علاوہ دیگر حرف کی لکھائی کے سلسلہ میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت حرام ہے)۔

اور عارف باللہ عبدالعزیز دباغ کا قول ہے:

''رسم القرآن سر من أسرار المشاهدة، وكمال الرفعة، وهو صادر من النبيﷺ وليس للصحابة ولا لغيرهم في رسم القرآن شعرة واحدة، وإنما هو توقيف من النبي ﷺ وهو الذي أمرهم أن يكتبوه على الهيئة المعروفة بزيادة الألف ونقصانها، ونحو ذلك، لأسرار لاتهتدي إليها العقول إلا بالفتح الرباني. وهو سر من الأسرار خص الله به كتابه العزيز دون سائر الكتب السماوية، فكما أن نظم القرآن معجز فرسمه معجز أيضا'' (ابواسحاق ابراہیم تونسی مالکی(م:١٣٤٩ھ)، دليل الحيران على مورد الظمآن: ص٦٣، قاہرہ، دار الحديث)

(قرآن کریم کا رسم الخط مشاہدہ اور کمال رفعت کے رازوں میں سے ایک راز ہے، اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صادر ہوا ہے، اور صحابہ اور دیگر افراد کا قرآنی رسم الخط کے سلسلہ میں بال برابر بھی دخل نہیں ہے، وہ تو بس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے واقف کرایا ہوا ہے، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الف کے اضافہ یا کمی وغیرہ کے ساتھ مشہور طرز پر لکھنے کا صحابہ کو حکم دیا، ایسے راز کی بنا پر جس تک فضل ربانی کے بغیر عقلوں کی رسائی نہیں ہوسکتی ہے، اور وہ ایسا راز ہے جس کے ساتھ اللہ تعالی نے دیگر آسمانی کتابوں کے درمیان اپنی کتاب عزیز کو خاص کیا ہے، تو جس طرح قرآن کا لفظ معجزانہ شان کا حامل ہے، سو اسی طرح اس کا رسم الخط بھی معجزانہ شان کا حامل ہے)۔

اور امام بیہقیؒ رقم طراز ہیں: ''من كتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء التي كتبوا بها تلك المصاحف، ولايخالفهم فيها، ولا يغير مما كتبوا شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما، وأصدق قلبا ولسانا، وأعظم أمانة منا، فلا ينبغي لنا أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم، ولا تسقطا عليهم'' (شعب الإيمان ٣/ ٢١٩ طبع اول رياض، مكتبه الرشد ١٤٢٣ھ)

(جو مصحف لکھے تو اسے چاہئے کہ اس طرز کی پابندی کرے، جس پر صحابہ نے مصاحف کو لکھا، اور اس سلسلہ میں ان کی مخالفت نہ کرے، اور ان کے لکھے ہوئے میں کچھ تبدیلی نہ کرے، کیونکہ ان کا علم زیادہ تھا، اور دل وزبان کے اعتبار سے زیادہ سچے تھے اور ہم سے زیادہ امانتدار تھے، تو ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم اپنے بارے میں ان کی غلطی کو درست کرنے اور ان کی لغزش ڈھونڈنے کا گمان کریں)۔

چنانچہ ہمارے اسلاف نے غیر عربی رسم الخط اور غیر رسم عثمانی میں متن قرآن لکھنے کی جو ممانعت کی ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- قرآن کریم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے سامنے لکھا گیا، اور جس طرز پر لکھا گیا، اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا، اب یہ ممکن نہیں کہ صحابہ کرامؓ اس طرز کتابت کی مخالفت کریں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ''الرحمن'' کے الف کو ثابت رکھا، تو یہ محال ہے کہ صحابہ اس الف کو ساقط کردیں، اس لئے کہ اس سے قرآن کے اندر صحابہ کا خود سے کمی کرنا لازم آئے گا، اور ایسا ماننا باطل ہے۔

۲- قرآن کریم کے رسم الخط کا دستور اور ضابطہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا ہے، چنانچہ کاتبین وحی میں سے ایک حضرت معاویہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ألق الدواة، وحرف القلم، وانصب الباء، وفرق السين، ولا تعور الميم، وحسن الله، ومد الرحمن، وجرد الرحيم'' (زرقاني، مناهل العرفان في علوم القرآن ١/ ٣٣٥. طبع اول بيروت، دار المعرفة ١٤٢٠ھ)

(دوات جھکاؤ، قلم کو ٹیڑھا کرو، اور باء کو عمدہ انداز میں لکھو، سین کو ممتاز کرکے لکھو، میم کو مٹے ہوئے انداز میں نہ لکھو، اللہ کو عمدہ انداز میں لکھو، الرحمن کو پھیلا کر لکھو اور الرحیم کو صاف انداز میں لکھو)۔

۳- رسم عثمانی امت کے اندر تواتر کے ساتھ منقول ہوتا آرہا ہے، تو جس طرح الفاظ قرآن میں کسی طرح کا تصرف حرام ہے، اسی طرح رسم قرآن میں بھی تصرف ناجائز ہے۔

۴- جس رسم قرآنی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا، اس کی پیروی واجب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم" (آل عمران: ۳۱)

(کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا، اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا)۔

۵- رسم قرآنی خلفاء راشدین کا اختیار کردہ ہے، اور ان کے طریقہ پر چلنا واجب ہے، جیسا کہ عرباض بن ساریہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فإنه من يعش منكم فسيرى اختلافا كثيرا، فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين من بعدي، عضوا عليها بالنواجذ'' (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۲، ۴۳، اور اس کی سند صحیح ہے) (تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلاف دیکھے گا، سو تم میری اور میرے بعد ہونے والے خلفاء راشدین کی سنت کو اختیار کرو اور اسے مضبوطی سے تھام لو)۔

۶- بارہ ہزار سے زیادہ صحابہ کرام مدینہ منورہ میں موجود تھے، اور انہوں نے رسم عثمانی پر اتفاق کیا، اور جس طریقہ پر صحابہ کا اتفاق ہو، اس کی مخالفت جائز نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وساءت مصيرا" (نساء: ۱۱۵) (اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا، اور مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈال دیں گے جس پر وہ پڑا، اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے)۔

۷- اگر رسم عثمانی توقیفی نہیں ہوتا، تو کیا وجہ ہے کہ سورہ حج میں "سعوا" (الحج: ۵۱) الف کے ساتھ لکھوا گیا ہے، اور سورہ سبا میں (سعو) بغیر الف کے لکھا گیا؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسم قرآن میں کوئی راز مضمر ہے۔

۸- رسم قرآن کے تلفظ میں آخری درجہ کی لطافت ہے جس میں معمولی سی تبدیلی معنی ومقصود کو بدل کر رکھ دیتی ہے، لہذا غیر عربی رسم الخط میں قرآن لکھنا درست نہیں ہے۔

۹- یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ ایک آدمی دنیا کی کسی زبان کو مادی فوائد کے لئے چند مہینوں میں سیکھ لے، لیکن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کی زبان سیکھنے کا اہتمام نہ کرے، اور مختلف بہانوں سے اسے ہندی اور انگریزی رسم الخط میں پڑھنے کی کوشش کرے۔

۱۰- عثمانی رسم الخط میں لکھنے سے ہر قاری کو احساس ہوتا ہے کہ وہ قرآن اسی طرح پڑھ رہا ہے، جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پڑھ کر سنایا، چنانچہ رسم عثمانی کو بدلنے سے کتاب الٰہی کی حفاظت کا یہ اعلیٰ درجہ کا تصور پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

قرآن کریم کا سیکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر نماز صحیح ہوتی ہے، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تعلیمات کا علم ہوسکتا ہے، اگرچہ نابینا افراد بینا اشخاص کے ذریعہ قرآن سیکھ سکتے ہیں، حفظ کرسکتے ہیں اور بھولنے کی صورت میں ان کی طرف مراجعت کرسکتے ہیں، لیکن اس عمل میں نابینا افراد کے لئے مشقت ہے، لہذا ان کی حاجت کے پیش نظر بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کے باوجود بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے، فقہی ضابطہ ہے:

''الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة'' (ابن نجيم، الأشباه والنظائر: ص۷۸، سيوطي الأشباه: ص۸۸)

(حاجت ضرورت کا درجہ لے لیتی ہے خواہ عام ہو یا خاص)۔

اور اس قاعدہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ

''رخص النبي ﷺ الزبير وعبد الرحمن في لبس الحرير لحكة بهما'' (صحيح البخاری حديث نمبر ۵۸۳۹، ۲۹۲۲، ۲۹۲۱)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبد الرحمن بن عوف کو خارش کی وجہ سے ریشم پہننے کی اجازت دی)۔

اور بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن کی طرح ہے، کیونکہ وہ نابینا افراد کے ساتھ خاص حروف میں لکھے گئے ہیں، اور ایک نابینا یہی سمجھتا ہے کہ وہ مصحف لئے ہوئے ہے، اور مصحف میں پڑھ رہا ہے، نیز اسے بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن ہی سمجھا جاتا ہے، لہذا اس کو چھونے کے لئے باوجو ہونا ضروری ہے، چنانچہ علامہ سمرقندی لکھتے ہیں:

''ولا يباح له أي المحدث مس المصحف إلا بغلافه'' (تحفة الفقهاء ۱/۳۱)

(بے وضو کے لئے بغیر غلاف کے مصحف چھونا مباح نہیں ہے)۔

اور ابن مازہ حنفی لکھتے ہیں: ''المحدث لايمس المصحف ولا الدرهم الذي كتب عليه القرآن'' (المحيط البرهاني ۱/۷۷)

(بے وضو شخص مصحف اور اس درہم کو نہ چھوئے جس پر قرآن لکھا گیا ہو)

اور سیوطی شافعیؒ رقم طراز ہیں: ''مذهبنا ومذهب جمهور العلماء: تحريم مس المصحف للمحدث، سواء كان أصغر أم أكبر، لقوله تعالى: ''لا يمسه إلا المطهرون'' (واقعه: ۷۹) وحديث الترمذى وغيره: لايمس القرآن إلا طاهر'' (الاتقان في علوم القرآن ۴/ ۱۹۰، الهيئة المصرية العامة للكتاب ۱۳۹۴ھ، اور حدیث کے لئے دیکھئے: سنن الدارمی حدیث نمبر ۲۳۱۲، سنن الدار قطنی حدیث نمبر ۴۳۷، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے)

(ہمارا اور جمہور اہل علم کا مسلک یہ ہے کہ بے وضو کا مصحف چھونا حرام ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اس کو صرف پاکیزہ ہی ہاتھ لگاتے ہیں، اور ترمذی وغیرہ کی حدیث ہے کہ قرآن کو باوضو شخص ہی چھوئے)۔

۱- بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے والا مسلم ہو، اس لئے کہ وہ اللہ کی کتاب تیار کر رہا ہے، اور اللہ کی کتاب کی تعظیم حقیقتاً ایک مسلمان ہی کر سکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ومن يعظم شعائر الله، فإنها من تقوى القلوب" (حج: ۳۲) (اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقوی سے تعلق رکھنے والی ہے)۔

۲- بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے والا باوضو ہو، اس لئے کہ مصحف کے احترام کا تقاضا ہے کہ تیار کرنے والا طہارت پر ہو، امام نووی لکھتے ہیں:

''أجمع المسلمون على وجوب صيانة المصحف واحترامه'' (التبيان فى آداب حملة القرآن/ ص ۱۹۰، طبع سوم، بيروت، دار ابن حزم ۱۴۱۴ھ) (مصحف کی حفاظت اور احترام کے وجوب پر مسلمانوں کا اتفاق ہے)۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید اس طرح تیار کیا جائے کہ نابینا افراد کو دشوار نہ ہو، قرطبی لکھتے ہیں:

''روي عن عمر بن الخطاب أنه رأى مصحفا صغيرا في يد رجل، فقال: من كتبه؟ قال: أنا فضربه بالدرة، وقال: عظموا القرآن'' (الجامع الأحكام القرآن ۱/ ۲۹)

(حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں چھوٹا سا مصحف دیکھا، تو پوچھا اسے کس نے لکھا ہے؟ تو اس شخص نے جواب دیا میں نے، اس پر آپ نے اسے کوڑے لگایا، اور فرمایا کہ قرآن کی تعظیم کرو)۔

۴- بریل کوڈ میں قرآن پاک اس طرح تیار کیا جائے کہ اس میں تفسیر یا شرح نہ لکھی جائے، تاکہ مصحف کا دوسری چیز سے خلط ملط نہ ہو، قرطبی لکھتے ہیں:

''ومن حرمته ألا يخلط فيه ما ليس منه'' (تفسیر القرطبی ۱/ ۳۰) (اور اس کی حرمت کا تقاضا ہے کہ اس میں کسی دوسری چیز کو خلط ملط نہ کیا جائے)۔

۵- بریل کوڈ میں قرآن شریف اس طرح تیار کیا جائے کہ اس میں کسی طرح کی تحریف وتغییر کی گنجائش نہ رہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

''أجمع المسلمون على وجوب تعظيم القرآن العزيز على الإطلاق وتنزيهه وصيانته'' (التبيان/ ص ۱۶۴)

(مطلقاً قرآن مجید کی تعظیم اور دوسری چیز سے دور رکھنے اور اس کے تحفظ کے وجوب پر مسلمانوں کا اتفاق ہے)۔

موبائل پر قرآن مجید:

جس موبائل میں قرآن مجید کے متن اور اس کی تلاوت محفوظ کردہ ہو، وہ مصحف کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے اندر قرآن مجید کوڈ بل نظام کے

مطابق محفوظ کیا گیا ہے، جو ہر حرف کو متعین رمز دیتا ہے، اور رمز ۸ / خانوں والا ہوتا ہے، جیسا کہ ماہرین کہتے ہیں۔

اور اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو، تو بھی موبائل کو ہاتھ میں لینے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ موبائل کا ڈھانچہ غلاف کے درجہ میں ہے، علامہ زیلعیؒ لکھتے ہیں: ''وغلافه ما يكون منفصلا عنه، دون ما يكون متصلا به في الصحيح، وقيل: لا يكره مس الجلد المتصل به'' (تبیین الحقائق ۱/ ۵۷) (اور اس کا غلاف وہ ہے جو اس سے علاحدہ ہو، اور صحیح قول کے مطابق اس چیز کا غلاف میں شمار نہیں جو مصحف سے متصل ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مصحف سے متصل جلد کا چھونا مکروہ نہیں ہے)۔

اور موبائل کا ڈھانچہ اسکرین سے علاحدہ شئی ہے، اور ہندیہ میں ہے:

''حرمة مس المصحف، لا يجوز لهما، وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز، لا بما هو متصل به، هو الصحيح: هكذا في الهداية، وعليه الفتوى كذا في الجوهرة'' (عالمگیری ۱/ ۳۸۹)

(اور ان احکام میں سے مصحف کے چھونے کی حرمت ہے، (چنانچہ) حیض ونفاس والی عورت اور جنبی اور بے وضو کے لئے مصحف کا چھونا جائز نہیں ہے، مگر اس سے الگ غلاف کے ذریعہ، جیسے مصحف چمڑے وغیرہ کے تھیلے میں ہو، اور جیسے وہ چمڑا جو سلا ہوا نہ ہو، اور اس چیز کے ذریعہ چھونا درست نہیں جو مصحف سے متصل ہو، یہی صحیح ہے، ایسا ہی ''ہدایہ'' میں ہے، اور اسی پر فتوی ہے، ایسا ہی ''الجوہرۃ النیرۃ'' نامی کتاب میں ہے)۔

البتہ جب قرآن مجید کے الفاظ وکلمات اسکرین پر موجود ہوں، تو اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''ولا مس الدراهم التي عليها القرآن؛ لأن حرمة المصحف كحرمة ما كتب منه. فيستوي فيه الكتابة في المصحف، وعلى الدراهم، ولا مس كتاب التفسير؛ لأنه يصير بمسه ماسا للقرآن'' (البدائع ۱/ ۳۳)

(جائز نہیں ان درہموں کو چھونا جن پر قرآن لکھا ہو، اس لئے کہ مصحف کی حرمت مصحف سے لکھی ہوئی آیت کی حرمت کی طرح ہے، تو اس حکم کے سلسلہ میں مصحف اور درہموں پر لکھی ہوئی آیت برابر ہے، اور تفسیر کی کتاب کا چھونا بھی درست نہیں، اس لئے کہ اس کو چھونے کی بنا پر قرآن کو چھونے والا ہو جائے گا)۔

اور زیلعیؒ لکھتے ہیں: ''ويكره مس الدرهم واللوح إذا كان فيهما كتابة شئ من القرآن'' (تبیین الحقائق ۱/ ۵۷)

(اور درہم اور تختی کو چھونا مکروہ ہے، اگر ان کے اندر قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا ہو)۔

اور عالمگیری میں ہے: ''ولا يجوز مس شي مكتوب فيه شي من القرآن، في لوح أو دراهم أو غيره ذلك، إذا كان آية تامة... ويكره لهم مس كتب التفسير'' (ہندیہ ۱/ ۳۸)

(جس چیز میں قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہو جیسے تختی یا درہم وغیرہ پر قرآن کا کچھ حصہ لکھا ہو، اس کا چھونا جائز نہیں، جبکہ مکمل ایک آیت ہو...... اور بے وضو وغیرہ کے لئے تفسیر کی کتابوں کا چھونا بھی مکروہ ہے)۔

اسی طرح اس حالت میں یعنی جبکہ قرآن کے الفاظ اسکرین پر ہوں، بیت الخلاء اور غسل خانہ وغیرہ میں جانا ناجائز ہوگا، اس لئے کہ اس میں ایک طرح کی بے حرمتی ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں: ''أجمع المسلمون على وجوب صيانة المصحف واحترامه'' (التبیان/ ص ۱۹۰) (مصحف کی حفاظت اور احترام پر مسلمانوں کا اتفاق ہے)۔

یہ اگرچہ مصحف نہیں ہے کہ موبائل کے اندر قرآن کے حروف نہیں ہیں، بلکہ قرآن کو دوہرے نظام کے مطابق محفوظ کیا گیا ہے، لیکن اسکرین پر کلمات کے ظاہر ہونے کی حالت میں وہ مشابہ مصحف ہے، لہذا اس کا احترام بھی لازم ہے۔

☆☆☆

عربی متن کے بغیر ترجمہ قرآن کی اشاعت

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی[1]

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

(الف): کسی زبان میں متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے (۱)، عامة الناس خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لیے وضو کا اہتمام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا، اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے، اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابلِ انتفاع ہوجانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے، تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آوے گا، اور محذور کا سبب لامحالہ محذور و محظور ہے (۲)۔

(ب): جب اشاعت ناجائز ہے تو اس کی خرید و فروخت، تقسیم اور ہدیہ وغیرہ سب بوجہ اعانت علی المعصیت ناجائز ہوگا (۳)۔

(ج): اشاعت تو درست نہیں، البتہ کسی نے شائع کر دیا تو اس ترجمہ قرآن کو بلا وضو چھونا خلاف ادب و احترام مصحف ہوگا (۴)۔

مذکورہ موقف مدلل انداز کے دیکھنے کے لئے مندرجہ فقہی تصریحات اور فتاوی ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ما في "المحيط البرهاني": ولو كتب القرآن وكتب تفسير كل حرف وترجمته تحته؛ روي عن الفقيه أبي حفص رحمه الله: لا بأس بهذا في ديارنا. لأن معاني القرآن وفوائدها لايضبطها العوام إلا بهذا. وإنما يكره هذا في ديارهم، لأن القرآن نزل بلغتنا (۱/۲۵۱، كتاب الصلاة. الفصل الرابع في كيفيتها. دار احياء التراث العربي بيروت)۔

ما في "جواہر الفقه": "قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے" (۱/۹۷، صیانۃ القرآن عن تغییر الرسم واللسان)۔

ما في "جواہر الفقه": "خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات و انجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے، اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے، محققان دین و مبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں، پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے۔" (۱/۱۱۳، نقل فتویٰ حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہ وقدس سرہ)

ما في "فتاوی محمودیہ": "بغیر عربی کے محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف کو لکھنا چھاپنا منع ہے، اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل ہے۔"

(فتاوی محمودیہ: ۳/۵۱۰، باب ما یتعلق بالقرآن، ترجمہ قرآن بغیر عربی عبارت کے، کراچی، امداد الفتاویٰ: ۴/۳۹ تا ۴۲، عدم جواز کتابت و اشاعت ترجمہ قرآن مجید مجرد از قرآن، امداد الاحکام: ۱/۲۳۲ تا ۲۳۹، قرآن مجید کی کتابت میں خط عثمانی کا واجب ہونا اور ترجمہ قرآن کو علیحدہ چھاپنے کا حکم، امداد الفتاویٰ: ۴/۴۲، ۴۳، مشورہ در ترجمہ قرآن مجید بزبان ہندی، کفایت المفتی: ۱/۱۲۶، ۱۲۸، کتاب العقائد، خیر الفتاویٰ: ۱/۲۱۷، محض اردو ترجمہ چھاپنا جائز

[1] دار الافتاء جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندربار، مہاراشٹر۔

نہیں)

ما في '' فتح القدير لإبن الهمام '': وفي الكافي: إن اعتاد القرآن بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع. فإن فعل آية أو آيتين لا. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز. ... الخ۔ (۱/۲۸۶، باب صفة الصلاة. مصطفى البابي الحلبي مصر. رد المحتار: ۱/۴۸۶، مطلب في بيان المتواتر والشاذ. مكتبة سعيد كراچی. مناهل العرفان: ۲/۳۸، دار احياء التراث العربي بيروت)

ما في ''فتاوى محموديہ'': ''محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں، اصل عربی کے ساتھ ترجمہ بھی ہو تو درست ہے''(۳/۵۰۹، اردو میں قرآن پاک لکھنا)۔

(۲) ما في '' القرآن الكريم '': ولا تعاونوا على الإثم والعدوان۔ (سورة المائدة: ۲)

ما في '' الشامية '': بقاعد فقهية سدًا للذرائع: '' ما كان سببًا لمحظور فهو محظور ''۔ (۵/۲۲۳، نعمانيه)

ما في '' الدر المختار مع الشامية '': '' وكل ما أدى إلى ما لايجوز لايجوز ''۔ (۹/۴۳۲)

ما في '' بدائع الصنائع '': ''كل ما أدى إلى الحرام حرام ''۔ (۶/۴۸۸)

ما في '' جمهرة القواعد الفقهية '': بقاعد فقهية: '' الإعانة على المحظور محظور ''۔ (۲/۶۴۳)

ما في ''المقاصد الشرعية للخادمي '':إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرمًا (ص/۴۶)

(۳) ما في ''جواہر الفقہ '': ''اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید و فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لیے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا، اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہگار ہوں گے وہ اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔

لقوله تعالى: وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا '' (۱/۹۷، صيانة القرآن عن تغيير الرسم واللسان)

ما في ''فتاوى محموديہ'': ''محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں۔'' (فتاوی محمودیہ: ۳/۵۰۹، اردو میں قرآن پاک پڑھنا، کراچی، خیر الفتاویٰ: ۱/۲۱۸، جزئیہ نمبر ۶،۵)۔

(۴) ما في ''جواہر الفقہ '': ''حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا۔کما في العالمگيرية: ولو كان القرآن مكتوبًا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح. هٰكذا في الخلاصة۔ (۱/۳۹) وفيه أيضًا: إذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا أخبر السامع أنه قرأ آية السجدة۔ (۱/۸۵) وهٰذه الجزئية الثانية تؤيد الأولى حيث.وجب سجدة التلاوة بقراءة القرآن بالفارسية. فعلم منه أن الترجمة بالفارسية لاتخرج القرآن عن كونه قرآنا حكما. فلا يجوز مسه للمحدث.

اور یہ یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہر گز اس کے مس کے لیے وضو کا انتظام نہ کریں گے''(۱/ ۱۱۳، ۱۱۴)۔

'' ارشادات گنگوہی'': ''قرآن شریف مترجم کو بے وضو ہاتھ لگانا منع ہے۔'' (ص/ ۲۰۲، بحوالہ ماہنامہ راہِ عافیت: ص/ ۴۰، محرم الحرام ۱۴۳۶ھ، شمارہ نمبر: ۹، جلد نمبر: ۹)، نیز دیکھئے: (خیر الفتاویٰ: ۱/ ۲۱۸، محض اردو ترجمہ چھاپنا الخ)۔

''کتاب الفتاویٰ'' (مولانا خالد سیف اللہ رحمانی) (۱/ ۷۸ ۴، ترجمۂ قرآن پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے؟ نیز دیکھیے: جواب نمبر: ۴ کا حاشیہ نمبر: ۱)۔

۲-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

(الف) قرآن کریم کو رسمِ عثمانی اجماعی توقیفی کے علاوہ کسی اور عجمی رسم الخط میں لکھنا بالاجماع ناجائز ہے، غیر عربی داں حضرات کو تلاوتِ قرآن

میں سہولت کی خاطر انہیں عربی رسم الخط سکھایا جائے، محض غیر عربی داں حضرات کی سہولت کے خاطر اجماعِ امت کا فیصلہ نہیں بدلا جا سکتا، نیز حفاظتِ قرآن کی مصلحت پر کسی اور مصلحت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی (۱)، اور قرآن کریم چونکہ اُن مقدس الفاظ کا نام ہے جو کلامِ الٰہی کی حیثیت سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔ گویا قرآن کریم حقیقت میں وہ خاص عربی الفاظ ہیں جن کو قرآن کہا جاتا ہے (۲)۔

(ب): عربی رسم الخط اور رسمِ عثمانی میں متنِ قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھنے کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے سے عبارت مصحف مسخ ہو جائے گی، مثلاً – ح، ذ، ز، ض، ظ – میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہوگی، اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلاء، اطباق، استطالت سب کچھ ضائع کر دیں گے (۳)۔

(ج): غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت درست نہیں ہے (۴)۔

مذکورہ موقف کی تائید مندرجہ ذیل فقہی عبارات سے ہوتی ہے:

(۱) ما في " فقه النوازل ": الخلاصة: "لا يجوز استعمال الرسم التعليمي إلا إذا كان لبعض الآيات ضمن كتب تعليمية " (۲/۱۸، وثيقة رقم: ۱، الموضوع ؛ حكم كتابة القرآن الكريم بالرسم التعليمي، المصدر؛ مجمع البحوث الإسلامية بالقاهرة، التاريخ؛ شعبان ۱۳۸۸ھ)

وفيه أيضًا: الخلاصة: " يبقى رسم المصحف على الرسم العثماني ولا ينبغي تغييره ليوافق قواعد الإملاء الحديثة. وذلك محافظة على كتاب الله من التحريف واتباعًا لما كان عليه أئمة السلف" (۲/۱۹، وثيقة رقم: ۲، الموضوع؛ حكم كتابة القرآن الكريم بطريقة الإملاء العادية، المصدر؛ هيئة كبار العلماء بالسعودية. التاريخ ؛ شوال ۱۳۹۹ھ، دار ابن الجوزي، الدمام، السعودية)

ما في " الإتقان في علوم القرآن للسيوطي ": وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء ؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى۔ رواه الداني في المقنع۔ ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة. وقال في موضع آخر: سئل مالك عن الحروف في القرآن مثل الواو والألف: أترى أن يغير من المصحف إذ وجد فيه كذلك ؟ قال: لا. قال أبوعمرو: يعني الواو والألف المزيدتين في الرسم المعدومتين في اللفظ نحو: (أولوا)۔ وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك۔ وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفًا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف. ولا يخالفهم فيه، ولا يغير مما كتبوه شيئًا فإنهم كانوا أكثر علمًا، وأصدق قلبًا ولسانًا، وأعظم أمانةً، فلا ينبغي أن نظنّ بأنفسنا استدراكًا عليهم "۔

(۲/۲۲۹، النوع السادس والسبعون في مرسوم الخط وآداب كتابته، فصل، قديمى كتب خانه كراچي، كذا في مناهل العرفان: ۱/۳۷۹، أقوال العلماء في التزام الرسم العثماني، مطبعة دار احياء الكتب العربية قابرة مصر، المقدمات الأساسية في علوم القرآن: ص/۱۵۲، ۱۵۳، المبحث الثالث: حكم المحافظة عينه في خطوط المصاحف، ط: مؤسسة الريان بيروت، عبدالله يوسف الجديع)(مزید تفصیل اور عربی عبارتوں کے لئے دیکھئے: ص۲۵، جواهر الفقه: ۱/۱۰۶، الفرائد الحسان في بيان رسم القرآن: ص۵۸، مناهل العرفان للزرقاني: ص۳۷۰، دليل الحيران: ص/۴۰، المقنع في معرفة مرسوم مصاحف الأمصار للداني: ص۲۳، نثر المرجان في رسم نظم القرآن: ۱/۳۶۹، لطائف البيان في رسم القرآن: ۲/۲۷، الجامع لما يحتاج إليه من رسم المصحف: ص/۵۲، بحواله فتاوىٰ عثماني: ۱/۲۸۱، ۲۱۹، كتاب التفسير وما يتعلق بالقرآن، بعنوان: قرآن کریم کو رسم عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنا)

" الموسوعة الفقهية الكويتية " (۳۸/۱۲، ۱۳، المقنع في معرفة مرسوم مصاحف أهل الأمصار للداني: ص/۹، ۱۰، البرهان في علوم القرآن للزركشي: ۱/۳۷۹، ط: دار المعرفة بيروت، الإتقان في علوم القرآن للسيوطي: ۲/۴۳۰، ۴۳۱، ط: دار الحديث، النوع السادس والسبعون في مرسوم الخط وآداب كتابته، شرح منتهى الإرادات: ۱/۷۴، ط: دار الفكر)

'' فتح الباري لابن حجر '' (۹/۳۰، باب أنزل القرآن على سبعة أحرف، ط: دار المعرفة بيروت) (مقدمة شرح الدرة ص/۱۱۶، بحواله فضائل حفاظ القرآن: ص/۱۲۱۰، حصہ دوم، اُبوعبدالقادر محمد طاہر رحیمی مدنی، ط: ادارۂ اسلامیات کراچی لاہور، پاکستان، قرآنی املا، اور رسم الخط: ص/۱۴، ۱۵، مکتبہ صوت القرآن دیوبند، مؤلفہ المقری ابوالحسن أعظمی ، امداد الاحکام: ۱/۲۲۰،۲۲۱، خط ناگری میں قرآن مجید لکھنے کا حکم)۔

(وكذا في البحوث العلمية: ۷/۳۸۸، كتابة المصحف حسب قواعد الإملاء، هيئة كبار العلماء بالمملكة السعودية، الناشر: رئاسة إدارة البحوث العلمية والإفتاء، مجلة البحوث الإسلامية: ۶/۲۱، القاعدة السادسة من قواعد رسم المصحف الخ، المؤلف: الرئاسة العامة لإدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، أبحاث هيئة كبار العلماء: ۷/۲۹۳، ثانيا نقول عن العلماء الخ، المؤلف: هيئة كبار العلماء بالمملكة العربية السعودية، فتاوى الأزهر: ۷/۴۷۶، رسم المصحف، إعداد: موقع وزارة الأوقاف المصرية، فتاوى دار الإفتاء المصرية: ۷/۴۷۶، رسم المصحف، المؤلف: دار الإفتاء المصرية، أرشيف المجلس العلمي من موقع الألوكة: حكم كتابة القرآن الكريم بغير العربية۔ www.majles.alukah.net، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير: ۱/۴۲۲، فصل في نواقض الوضوء، الفتاوى الكبرى الفقهية: ۱/۳۸، باب النجاسة، المكتبة الإسلامية تركي، آكام النفائس: ص/۵۳، في ضمن رسائل اللكنوي: ۴/۳۸۵، إدارة القرآن كراچي، '' مناهل العرفان في علوم القرآن '' ۱/۳۶۹، رسم المصحف، '' المحيط البرهاني '' ۱/۳۵۱، كتاب الصلوة، الفصل الرابع في كيفيتها، ط: احياء التراث العربي بيروت، '' تاريخ القرآن الكريم '' ۱/۱۱۹، المكتبة الشاملة، الشيخ محمد طاهر الكردي، '' التفسير الحديث '' ۱/۱۲۰، رسم المصحف العثماني، دار احياء الكتب العربية القاهرة، دار الغرب الإسلامي دمشق)

'' جواهر الفقه '': ''رسالہ نصوص جلیہ اور فضائل القرآن ابن کثیر اور امام زرکشی سے جو عبارات ونصوص نقل کی گئی ہیں ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت ومخالفت بھی ثابت ہوگئی کہ زبان تو عربی ہی رہے، لیکن رسم خط انگریزی یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی، ناگری وغیرہ کردیا جائے، جیسا کہ اس فتنہ زاز زمانہ میں اس کا بھی شیوع ہے، کہیں انگریزی رسم خط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے، کہیں ہندی اور گجراتی میں، جو باجماع امت ناجائز ہے، خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم خط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہوگی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمتِ اسلام سمجھ کر کیا جارہا ہے، اور اس کے لیے بہت سی مصالحِ دینیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے، نہ ضرورت، کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اسی طرح حاصل ہوتی آئی ہیں کہ ہر ملک وقوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انہوں نے بدون رسم خط تبدیل کرنے کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں، اور ایسا پڑھا کہ انہیں اہلِ عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کی قرأت وتجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے، اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کیے جائیں تو ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماعِ امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا، اور حفاظتِ قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمان اور دوسرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنھم) نے ان مصالح کی طرف نظر نہیں فرمائی، حالانکہ یہ مصالح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں، کیونکہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا، اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے، اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن نہ تھا، کیونکہ خود کاتب قرآن زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) مختلف زبانیں جانتے تھے، مگر اس کے باوجود کتابت قرآن میں خاص خاص ملکی مصالح کو نظر انداز کرکے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں بھیجے۔''

والى الله المشتكى مما عمت فيه البلوىٰ من أيدى أصحاب الهوىٰ و اياه نسئل الهدىٰ والتقىٰ والله سبحانه وتعالىٰ اعلم۔

(۱/ ۱۱۰، ۱۱۱، تنبیہ، فتاویٰ محمودیہ: ۳/ ۵۰۸، ۵۰۹، کراچی، و ۳/ ۵۱۲، اڑیہ زبان میں قرآن وحدیث لکھنا، کفایت المفتی: ۱/ ۱۲۸، کتاب العقائد، فتاویٰ مولانا عبدالحی ابوالحسنات اردو: ص ۱۱۵، ۱۱۶، قرآن کا رسم الخط اور علم نحو، مکتبہ تھانوی دیوبند، فتاویٰ محمودیہ: ۳/ ۵۰۷، ۵۰۸، غیر عربی میں قرآن لکھنا، مکتبہ فاروقیہ کراچی، و ۳/ ۵۰۹، اردو میں قرآن پاک پڑھنا، کفایت المفتی: ۱/ ۱۲۸، امداد الاحکام: ۱/ ۲۴۳، امداد الفتاویٰ: ۴/ ۴۴، حکم نوشتن قرآن درخط ناگری، خیر

الفتاوی: ۱/ ۲۲۵، قرآن کے رسم الخط میں مصاحفِ عثمانیہ کا اتباع واجب ہے، فتاوی رحیمیہ: ۱۶/۳، ۱۷، گجراتی میں قرآن شریف لکھنا)

(۲) ما فی ''کشف الأسرار لفخر الإسلام البزدوی'': ''أما الكتاب فالقرآن المنزل على الرسول المكتوب في المصاحف، المنقول عن النبي ﷺ نقلًا متواترًا بلا شبهة وهو النظم والمعنى جميعًا في قول عامة العلماء، وهو الصحيح من قول أبي حنيفة عندنا'' (۱/۶۷، و۱/۱۹، دار الکتاب الإسلامي بیروت. نور الأنوار: ص/۷۹، طبع مکتبه حقانیه پشاور، پاکستان، الموسوعة الفقهية: ۲۳/۲۰، قرآن)

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

(الف): بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسمِ عثمانی نہ ہونے کے باوجود نابیناؤں کی مجبوری وسہولت کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن مجید میں تیار کرنا درست اور مستحسن ہے۔ (۱)

(ب): بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن پر اصل قرآن کی طرح احکام جاری نہیں ہوں گے (۲)، البتہ بحیثیت وجوبِ تعظیم وآداب وحرمتِ امتہان واستخفاف بریل کوڈ قرآن کا حکم بھی اصل قرآن کی طرح ہوگا (۳)، لہٰذا اسے بلا وضو چھونا اور پڑھنا اور لکھنا خلافِ ادب ضرور ہوگا۔ (۴)

(ج): ☆ ایسی خود ساختہ من گھڑت علامت جو قرآن اور بریل کے ماہرین کی مسلمہ علامات سے ٹکراتی ہو انہیں اختیار نہ کیا جائے، کہ غیر معروف علامات باعث تشویش، غلط فہمی اور سببِ اختلاف وگناہ ہے۔

☆ بریل نسخے کی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ اطمینان بخش، یقینی اور اغلاط سے پاک ہو۔

☆ مسلمہ عربی بریل کے علاوہ کوئی نامانوس بریل طباعت میں طباعت میں اختیار نہ کی جائے۔

☆ عربی بریل کے حروف چونکہ مکمل طور پر رسمِ عثمانی کے معیار کے موافق نہیں ہیں، لہٰذا ان کی پہچان اور صحت وتجوید پر مکمل توجہ دی جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ موقف کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ما في ''القرآن الكريم'': عبس وتولى ان جاءه الاعمى ،وما يدريك لعله يزكى ۔ (سورۃ عبس: ۱، ۲)

ما في ''الدر المنثور في التفسير المأثور'': ''وأخرج ابن جرير وابن مردويه عن ابن عباس قال: بينا رسول الله ﷺ يناجي عتبة بن ربيعة والعباس بن عبدالمطلب وأباجهل بن هشام، وكان يتصدى لهم كثيرا، ويحرص أن يؤمنوا فأقبل إليه رجل أعمى يقال له: عبدالله بن أم مكتوم يمشي وهو يناجيهم، فجعل عبدالله يستقرئ النبي ﷺ آية من القرآن، قال: يا رسول الله ! علّمني مما علّمك الله، فأعرض عنه رسول الله ﷺ وعبس في وجهه وتولى وكره كلامه، وأقبل على الآخرين، فلما قضى رسول الله ﷺ نجواه، وأخذ ينقلب إلى أهله أمسك الله ببعض بصره ثم خفق برأسه ثم أنزل الله {عبس وتولّى أن جاء ه الأعمى} فلما نزل فيه ما نزل أكرمه نبي الله وكلمه يقول له: ما حاجتك ؟ هل تريد من شيء ؟'' (۶/۵۱۸، سورة عبس، دار الكتب العلمية بيروت، معالم التنزيل المعروف بتفسير البغوي: ۸/۳۳۲، دار طيبة للنشر والتوزيع، روح المعاني: ۱۵/۲۴۱، دار الكتب العلمية بيروت)

وما في ''القرآن الكريم'': ولقد يسّرنا القرآن للذّكر فهل من مدّكر}۔ (سورۃ القمر: ۱۷)۔

ما في ''تفسير القرآن العظيم'': قوله تعالى: {ولقد يسّرنا القرآن للذّكر} ؛ أي سهلناه للحفظ والقراءة والكتابة... {فهل من مدكر} ؛ أي فهل ذاكرٌ يذكره، وقارئٌ يقرأه، ومعناه: الحثّ على قراءة القرآن ودرسه وتعلّمه، ولو لا تسهيل الله علينا ذلك لم يستطع أحد أن يلفِظَ به۔ (الباب: ۱۷، أبوالقاسم سليمان بن احمد بن أيوب بن مطير اللخمي والشامي الطبراني، الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: ۱۷/۱۳۴، سورة القمر، دار عالم الكتب، الرياض، التحرير

والتنوير المعروف بتفسير ابن عاشور:۱۶/۸۹، سورة مريم، الآية/۹۶، محمد الطاهر بن محمد بن محمد الطاهر ابن عاشور التونسي، مؤسسة التاريخ العربي بيروت)

ما في '' الأصول والقواعد للفقه الإسلامي '': "مَا رَآهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللهِ حَسَنٌ". ''جس چیز کو مسلمان اچھا خیال کریں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہے۔'' (ص/۲۶۳، قاعدہ: ۳۱۲، شرح السير الكبير:۱۳۹/۲، باب ما يكره في دار الحرب وما لايكره، قواعد الفقه:ص/۱۱۵، القاعدة:۲۹۴، جمهرة القواعد، المادة:۱۱۷۱)

ما في '' موقع الإسلام سؤال وجواب '': وقال الشيخ صلاح الصاوي حفظه الله: '' أما إن كان سؤالك حول جواز هذا العمل في ذاته أي: المصحف المترجم بطريقة برايل، فلا شك في مشروعيته، وأنه يمثل إنجازا حضاريا كبيرا، ونعمة من أجل نعم الله على المكفوفين۔ والله تعالى أعلى وأعلم۔ انتهى ''۔ (أحكام المصاحف '' القرآن وعلومه '' www.islamQA.com (كتابة القرآن الكريم بنظام برايل للمكفوفين، د۔ عبدالله الخميس، المسلم نت almoslim.net، نیز اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے ارسال کردہ، مدرسۃ النور فاردی بلائنڈ ترکی کانفرنس کا مقالہ)

(۲) (ما هو حكم ترجمة معاني القرآن إلى طريقة برايل للمكفوفين ؟وهل تأخذ حكم المصحف؟ موقع الإسلام سؤال وجواب www.islamQA.com ، وكذا: اللجنة الدائمة للإفتاء في السعودية. المجموعة الثانية: ۳/۴۱)

(۳) (المصحف المطبوع بطريقة برايل للمكفوفين هل له حكم المصحف المعروف ؟، الدكتور حسام الدين عفانه/ جامعة القدس فلسطين، المصدر: جمعية أصدقاء الكفيف فلسطين) .

(۴) (جواب نمبر:۴/ کا حاشیہ نمبر:۱)۔

۴-موبائل پر قرآن مجید:

(الف): اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو، یعنی قرآن کریم کے حروف اسکرین (Screen) پر لکھے ہوئے آرہے ہوں، تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہوگا۔ (۱)

(ب): موبائل کے ڈھانچے کو غلافِ منفصل تصور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ غلافِ متصل ہے، اور غلافِ متصل مفتیٰ بہ قول کے مطابق جزوِ مصحف میں داخل ہے، جسے بلاوضو چھونا درست ہوگا۔ (۲)

دلائل ومؤیدات کے لئے دیکھئے:

(۱) ما في '' القرآن الكريم '': {لا يمسه إلا المطهرون}۔ (سورة الواقعة: ۷۹)

ما في '' أحكام القرآن شفيعي '': ''وجه الاستدلال بالآية أن المراد بالمطهرين هم المطهرون من الأحداث، ويؤيد هذا أن الكلام مسوق لتعظيم القرآن...... وهذا شرط لمس نقوشه وأوراقه '' (۵/۱۰)

ما في '' أحكام القرآن لظفر أحمد التهانوی '': ''إن المراد به المطهرون من الأحداث، وهم المكلفون من الآدميين لما روى أنس بن مالك فى حديث إسلام عمر قال لأخته: أعطونى الكتاب الذى كنتم تقرؤن، فقالت: إنك رجس إنه لايمسه إلا المطهرون، فقم واغتسل أو توضأ...... ولذا ذهب الجمهور إلى أنه لايجوز للمحدث مس المصحف إلا بواسطة شيء منفصل عنه '' (۵/۱۰)

ما فی '' جامع الترمذي '': عن علي قال: '' كان رسول الله ﷺ يقرئنا القرآن على كل حال ما لم يكن جنبًا ''۔ قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح۔ (۱/۳۸، أبواب الطهارة)

ما فی '' الفتاوى الهندية '': ل''ا يجوز مسّ شيء مكتوب فيه شيء من القرآن من لوح أو دراهم أو غير ذلك إذا

کان آیة تامة۔ هکذا فی الجوهرة النیرة۔ والصحیح منع مس حواشی المصحف والبیاض الذی لا کتابة علیه۔ هکذا فی التبیین " (۳۹/۱، بدائع الصنائع: ۱۴۱/۱، کتاب الطهارة، مطلب فی مس القرآن، مراقی الفلاح مع حاشیة الطحطاوي: ص/۲۴، کتاب الطهارة، الدر المختار مع الشامیة : ۲۸۲/۱، کتاب الطهارة)

(۲) ما في " الدر المختار مع الشامیة ": وقراءة قرآن بقصده ومسّه ولو مکتوبًا بالفارسیة في الأصح إلا بغلافه المنفصل... قوله: إلا بغلافه المنفصل أي کالجراب والخریطة دون المتصل کالجلد المشرز هو الصحیح وعلیه الفتوی؛ لأن الجلد تبع له۔ (۳۲۳/۱، کتاب الطهارة، باب الحیض، مطلب لو أفتی مفت بشيء من هذه الأقوال... الخ، الفتاوی الهندیة: ۳۸/۱، ۳۹، الفصل الرابع في أحکام الحیض والنفاس والاستحاضة)

ما في " الفقه الإسلامي وأدلته ": " ویجوز للمحدث أن یمس غلاف المصحف إذا کان متجافیًا عنه بأن یکون شيء ثالث بین الماس والممسوس کمندیل ونحوه... وأما مس الغلاف المتصل بالمصحف غیر المتجافي عنه فلا یحل شيء؛ لأنه تبع للمصحف " (۹۸/۱)

(امداد الاحکام: ۱/ ۲۵۰، دستانے پہن کر بلا وضو قرآن پاک چھونا، مکتبہ دار العلوم کراچی، المسائل المهمة فیما ابتلت به العامة: ۲/ ۲۵۲، ۲۵۳، مسائل متفرقہ، و۳/ ۵۴، ۵۵، مسئلہ: ۲۱، ۲۲، کتاب الطهارة، و۷/ ۲۲۵، درسی وتعلیمی اہم مسائل کا انسائیکلو پیڈیا: ص/ ۶۶، مسئلہ: ۷۴، ۷۵، ۷۶، پاکی وناپاکی کا بیان)



قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت کے شرعی احکام

مولانا محمد ظفر عالم ندوی[1]

قرآن مجید اللہ تعالی کی آخری آسمانی کتاب ہے جس کے تمام حروف والفاظ اور معانی توقیفی ہیں، اس میں کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم واضافہ کی کسی درجہ میں گنجائش نہیں یہ ہر طرح کی تبدیلی سے پاک ہے اور دنیا میں مصحف عثمانی کی صورت میں موجود اور محفوظ ہے، اللہ تعالی نے خود اس کی جمع و ترتیب اور حفاظت اپنے ذمہ لیا ہے اور فرمایا ہے: "إن علینا جمعه وقرآنه. فإذا قرأناه فاتبع قرآنه" (سورۂ قیامہ: ۱۷، ۱۸)، "وقال: إنا نحن نزلنا الذکر وإناله لحافظون" (سورۂ حجر: ۹) (جو صحیفہ ہر طرح کی تبدیلی سے پاک ہو جس کی حفاظت خود خالق کائنات کے ذمہ ہو اس کی کتابت اور ترجمہ کے سلسلہ میں کسی طرح کا کلام کرنے سے قبل جمہور امت کی رائے سامنے رکھنا از حد ضروری ہے، اس لئے ناچیز سوالنامہ کے جواب سے قبل اس موضوع پر امت کے مستند علماء کی تحریر پہلے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

مستند علماء میں حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نام انتہائی نمایاں ہے، شاہ صاحب نے ''ازالۃ الخفاء'' میں ایک اہم مقدمہ اس موضوع پر تحریر فرمایا ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ حق تعالی نے وعدہ فرمایا تھا کہ قرآن کی جمع وترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔

"إن علینا جمعه وقرآنه. فإذا قرأناه فاتبع قرآنه" (سورۂ قیامہ: ۱۷، ۱۸)، "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹)

لیکن اس وعدہ الہی کے ظہور اور حفاظت الہی کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا، جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے اور نہ اس طرح کے قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہو جاتا جو مٹانے سے نہ مٹ سکے، بلکہ مشاہدہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع وتدوین کی خدمات انجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہ قرآنی پر مجتمع ہو جائیں اور ہمیشہ جماعات عظیمہ اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہیں، تاکہ سلسلہ تواتر نہ ٹوٹ جاوے اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی میں مشورہ واجماع صحابہؓ تمام مصاحف، ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا جس میں قرأت شاذہ نہیں لی گئیں، بلکہ قرآت متواترہ لی گئیں اور قبائل عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل ہوا تھا ایک لغت قریش لی گئی اور باقی لغات کے مصاحف متروک کردیئے گئے، جن کا بعد میں کہیں نام ونشان نہیں رہا۔

اس واقعہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو گیا کہ قرآن جس کی حفاظت کا حق تعالی نے وعدہ فرمایا تھا وہ یہی مصحف عثمانی ہے اور یہی قرآن محفوظ من اللہ ہے، ورنہ اگر حفاظت خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی تو دوسری لغات کے مصاحف کا تلف کردینا کسی مخلوق کی قدرت میں نہ ہوتا، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن محفوظ صرف وہی ہے جو مصحف امام اور مصحف عثمانی کہلاتا ہے، جو چیز اس میں نہیں وہ قرآن نہیں اور جو چیز اس مین ہے وہ نہ مٹائی جاسکتی ہے اور نہ اس میں کوئی ادنی تغیر کرنا جائز ہوسکتا ہے، یہی راز ہے اس اجماع کا جو اوپر نقل کیا گیا کہ مصحف عثمانی کی رسم خط کی بھی حفاظت واجب ہے شاہ صاحب کی گفتگو سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتابت قرآن کا موضوع کس قدر اہم ہے (ازالۃ الخفاء ۱/ ۲۵)۔

علوم القرآن کے موضوع پر جو کتابیں ہیں ان میں علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' علماء کے درمیان نہایت ہی معتبر اور مستند ہے، اس میں رسم عثمانی اور کتابت قرآنی کے آداب، بہت ہی تفصیلی گفتگو موجود ہے، علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''وقال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلا على الكتبة الأولى، رواه الداني في المقنع، ثم قال ولا مخالف له من علماء الأمة'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۳۲۹، ۳۲۸)

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کی اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کئے ہیں، فرمایا نہیں بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا ضروری ہے، اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالکؒ کا اس بارے میں مخالف نہیں ہے)۔

آگے لکھتے ہیں:

''وقال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واؤ وياء أو الف أو غير ذلك'' (الاتقان ۲/۲۲۹)

(امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے، واؤ یا الف زائدہ میں جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے میں آتے ہیں)۔

علامہ سیوطی آگے امام بیہقیؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، ينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوابه تلك المصاحف ولايخالفهم منه ولا يغير ماكتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة، فلاينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم'' (الاتقان في علوم القرآن ۲/۲۲۹)

(امام بیہقیؒ شعب الایمان میں فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو اسے چاہئے کہ اسی طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہؓ نے مصاحف لکھے ہیں اور ان کی مخالفت نہ کرے اور جو..... اس میں تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے، دل وزبان میں سب سے زیادہ سچے اور سب سے زیادہ امانت دار تھے، لہذا ہمارے لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں)۔

علامہ موصوف علامہ زرکشی کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہل تجوز كتابته بقلم غيرالعربي قال الزركشي لم أرفيه كلما مالأحد من العلماء قال: ويحتمل الجواز؛ لأنه قد يحسنه من يقرابالعربية والأقرب المنع، كما تحرم قراته بغير لسان العرب ولقولهم القلم أحد اللسانين والعرب لاتعرف قلما غيرالعربي، وقال تعالى: بالسان عربي مبين'' (شعراء:۱۹۵)

(کیا عربی رسم الخط میں قرآن لکھنا جائز ہے؟ علامہ زرکشیؒ نے اس بارے میں فرمایا کہ میں نے اس مسئلہ میں کسی عالم کی تصریح نہیں دیکھی اور احتمال جواز کا ہے، کیونکہ بعض اوقات غیر عربی رسم الخط کو وہ عجمی لوگ اچھی طرح ادا کر لیتے ہیں حالانکہ یہ عربی پڑھ تو لیتے ہیں، لیکن لکھنے کی قدرت نہیں رکھتے لیکن اقرب یہ ہے کہ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے کو منع کیا جائے، جبکہ غیر عربی میں قرآت کو منع کیا جاتا ہے مشہور ہے کہ رسم الخط بھی زبان کی ایک قسم ہے اور عرب عربی رسم الخط کے علاوہ کوئی اور خط نہیں جانتے اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "بلسان عربي مبين")۔

علامہ حسن شرنبلالیؒ کا اس موضوع پر مستقل ایک رسالہ ہے "النفحة القدسية في أحكام قرأة القرآن وكتابته بالفارسية" کے عنوان سے جس میں انہوں نے ائمہ اربعہ کی مستند کتب فقہ سے اس پر اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم الخط کا اتباع واجب اور لازم ہے، غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے، اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو "جواہر الفقہ جلد دوم" میں موجود ہے، انہوں نے مستند علماء کی تحریریں بھی جمع کی ہیں، اور علماء سلف کی تحقیقات کی روشنی میں بہت ہی ٹھوس رائے قائم کی ہے۔

اس موضوع پر حافظ ابن حجر عسقلانی کا کلام، حافظ ابن کثیر کی فضائل القرآن پر تقریر اور امام ابن تیمیہؒ کی تحقیقات بہت ہی معرکۃ الآراء ہیں، امام ابن تیمیہ نے قرآ کے موضوع پر اپنے فتاوی میں بہت ہی محققانہ اور فاضلانہ گفتگو کی ہے، جمہور علماء سلف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن نہ صرف حروف کا نام ہے اور نہ صرف معانی کا، بلکہ دونوں کے مجموعہ کا نام قرآن ہے:

''والصواب الذى عليه سلف الأئمة كإمام احمد والبخارى صاحب الصحيح في كتاب خلق أفعال العباد'' وغيره وسائر الأئمة قبلهم وبعدهم اتباع النصوص الثابتة وإجماع سلف الأمة، وهو أن القرآن جميعه كلام الله حروفه ومعانية ليس شئ ذلك كلاما لغيره، ولكن أنزله على رسوله وليس القرآن إسما لمجرد المعنى ولمجرد الحرف بل لمجموعهما'' (مجموع فتاوى ابن تيميه ۱۲/ ۲۴۲، ۲۴۳)۔

امام موصوفؒ نے جمہور امت کے نقطۂ نظر کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کو کسی غیر زبان یا رسم میں لکھنا یا ترجمہ کرنا قرآن نہیں کہلائے گا، بلکہ قرآن مخصوص الفاظ وحروف اور مخصوص معانی کا نام ہے جو خالص اللہ رب العزت کی طرف سے ہے اور امت کو محفوظ طریقہ سے حاصل ہے اور قیامت تک یہ محفوظ رہے گا۔

غرض کہ تمام تحقیقات اور تصریحات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط حفاظت اور اتباع لازم ہے، اس سے کسی مصلحت یا ضرورت کے پیش نظر ہٹنا بڑے فتنہ کو دعوت دینا اور تحریف کا دروازہ کھولنا ہے۔

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

اس سوال کا جواب تمہید میں ذکر کردہ اصولی گفتگو سے واضح ہوجاتا ہے کہ بغیر متن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز نہیں ہے، بلکہ کسی بھی درجہ میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، کیونکہ قرآن مجید کے اصل الفاظ توفیقی ہیں اور یہ بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں ان کی حفاظت انتہائی ضروری ہے، صرف ترجمہ کی اشاعت میں تغیر وتبدل کے امکانات زیادہ ہیں اس سے تحریف کے دروازے کھل سکتے ہیں، اس لئے قطعاً اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

جس طرح صرف ترجمہ بلا متن کی اشاعت جائز نہیں ہوگی اسی طرح اس کی خرید وفروخت، تقسیم اور ہدیہ کرنا بھی جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ بھی تعاون علی الاثم میں داخل ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

''إن اعتاد القرأة بالفارسية أو اراد أن يكتب مصحفا بها يمنع'' (ردالمحتار۱/ ۳۵۲)۔

علامہ سیوطیؒ نے بھی اس موضوع پر قدر تفصیل سے گفتگو کی ہیں اور محققین کی آراء نقل کی ہیں جن کی عبارتیں میں نے ابتداء میں درج کردی ہیں، اس موضوع پر علامہ حسن شرنبلالیؒ صاحب نورالانوار نے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو ''النفحة القدسية فی احكام قراءة القرآن و كتابته بالفارسية'' کے نام سے معروف ہے، انہوں نے مستند علماء کے حوالے سے بڑی تحقیقی گفتگو کی ہے، موصوف فرماتے ہیں:

''أما كتابة القرآن بالفارسية فقد نص عليها فی غير ما كتاب من كتب ائمتنا الحنفية المعتمدة''

(رہی بات قرآن مجید کو فارسی میں لکھنے کی تو ہمارے حنفی اماموں کی بہت سی معتبر کتابوں میں اس کی تصریح ہے)۔

ان تصریحات میں صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی کی کتاب ''التجنیس والمزید'' میں یہ صراحت ہے:

۱- ''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى فانه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يودى إلى التهاون بأمر القرآن'' (هدايه بجواهر الفقه)۔

۲- ''معراج الدرایہ'' میں تصریح ہے:

''إنه يمنع من كتابه المصحف بالفارسية أشد المنع وإنه يكون زنديقا''۔

۳- الکافی میں ہے: ''لو أراد أن يكتب مصحفا بالفاريسة يمنع'' (فتح القدير صفة الصلاة۱/ ۲۴۸)۔

۴- فتح القدیر میں الکافی کے حوالہ سے ہے:

''إن اعتاد القرأة بالفارسية أو اراد أن يكتب مصحفا بها يمنع'' (فتح القدير۱/ ۲۶۶)

یہ ممانعت صرف فارسی زبان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ عربی کے علاوہ جو بھی زبان ہو کسی میں بھی قرآن لکھنا منع ہے۔

علامہ شرنبلالیؒ اس کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''قدمنا حكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسية لإفادة المنع بغيرها بالطريق الاولى. لأن غيرها ليس مثلها فی الفصاحة، ولذا كانت فی الجنة مما بتكلم به كالعربية كما تقدم'' (النفحة القدسية/ ص۲۲)۔

علامہ حصکفیؒ نے الدر المختار میں صراحت کی ہے: ''وتجوز کتابة آية أو آيتين لا أكثر''

اس پر علامہ شامیؒ کا حاشیہ ہے: ''الفارسية غير قيد'' (الدر المختار مع رد المحتار ۱/ ۴۵۳)۔

کفایہ شرح ہدایہ میں اس پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے یہ صراحت کی ہے:

''وكان الشيخ ابوبكر محمد بن الفضل يقول: إما من تعمد ذلك يكون زنديقا أو مجنونا فالمجنون يداوى والزنديق يقتل'' (الکفایہ علی ہامش فتح القدیر ۱/ ۲۴۹)۔

وزارت اوقاف کویت سے شائع شدہ موسوعہ فقہیہ میں عدم جواز کا قول نقل کرنے کے بعد یہ توجیہ کی گئی ہے کہ ترجمہ قرآن کی حیثیت قرآن کی نہیں اور ترجمہ سے قرآن کا اعجازی پہلو ختم ہوجاتا ہے، موسوعہ کی عبارت اس طرح ہے:

''ولأن ترجمة القرآن ليست قرآنا، لأن القرآن هو هذا النظم المعجز وبالترجمة يزول الإعجاز فلم تجز'' (موسوعہ فقہیہ ۲۳/ ۱۲)۔

موسوعہ فقہیہ میں غیر عربی زبان میں نماز میں قرأت کے مسئلہ پر فقہاء حنفیہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں، پھر حنفیہ کا مفتی بہ قول نقل کیا گیا ہے، جس میں یہ صراحت ہے کہ اگر نماز میں قرآن کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں پڑھا گیا تو اس سے قرأت کی ادائیگی نہیں ہوگی اور نماز درست نہیں ہوگی، کیونکہ قرآن خاص عربی منظوم کا نام ہے جس کے بغیر قرآن کا تصور نہیں۔

''وذهب ابويوسف ومحمد بن الحسن الشيباني إلى أنه لاتجوز القراة بغير العربية إذا كان يحسن العربية؛ لأن القرآن إسم لمنظوم عربي لقول لله تعالى إنا جعلناه قرآنا عربيا'' (الزخرف: ۲)،

''وقال تعالى: إنا أنزلناه قرآنا عربيا'' (سورۂ یوسف: ۲)۔

آگے مزید صراحت ہے: ''والفتوى عند الحنفية على قول الصاحبين ويروى جروع إبي حنيفة إلى قولهما'' (الموسوعة الفقهية ۳۳/ ۵۵) شیخ وہبہ زحیلی کا بھی یہی نقطہ نظر ہے، موصوف لکھتے ہیں: ''لأن القرآن بجرة بلفظه ومعناه فإذا غير خرج من نظمه فلم يكن قرآنا ولا مثله'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/ ۸۴۰)۔

امام ابن تیمیہ نے قرآن کے موضوع پر بہت ہی محققانہ گفتگو فرمائی ہے، اور یہ وضاحت کی ہے کہ صرف معنی قرآن نہیں کہلائے گا بلکہ معانی اور حروف دونوں ہی قرآن ہیں اور اس پر امت کا اجماع بتایا ہے:

''وهو أن القرآن جميعه كلام الله حروفه ومعانيه، ليس شئ ذلك كاملا لغيره ولكن أنزله على رسوله وليس القرآن إسماء لمجرد المعنى ولمجرد الحرف بل لمجموعهما'' (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۱۲/ ۲۴۴، ۲۴۳)۔

علماء عرب کے علاوہ برصغیر ہندو پاک کے علماء نے اس اہم موضوع پر اپنی اپنی رائیں دی ہیں، مولانا اشرف علی تھانویؒ سے عربی عبارت کے بغیر صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کے بارے میں استفتاء کیا گیا تو آپ نے اس کا تفصیلی جواب تحریر فرمایا اور اس کام کو اہل کتاب کے ساتھ تشبہ قرار دیا، آپ فرماتے ہیں:

''یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً وعادتاً ان کے خصائص میں سے ہے، سواول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے، پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے'' (حوادث الفتاوی)۔

مولانا تھانویؒ نے آگے دلائل دینے کے بعد فرمایا ہے:

''خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام''۔

آگے مزید تاکید فرماتے ہوئے اس سلسلہ کے شبہ کا رد فرمایا ہے: اور یہ شبہ نہ کیا وے کہ یہ احتمال بعید ہے، محققان دین وبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں حضرات شیخینؓ نے بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع

قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا، پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا، جیسا کہ حدیث میں ہے:

''أمتهوكون انتم كما تهوكت اليهود والنصارى'' (مشکوۃ: ص۳۰)۔

آگے مولانا تھانویؒ مزید دلائل کے ساتھ مسئلہ کی اہمیت ثابت فرماتے ہیں اور اخیر میں یہ بھی فرمایا: اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) اور فقہاء اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے۔ اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جائے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (حوادث الفتاوی ۲/۱۵۶)۔

اس اہم مسئلہ کے سلسلہ میں جناب مفتی شفیع صاحبؒ سے بھی سوال کیا گیا تو انہوں نے ایک تحقیقی جواب مرتب فرمایا جو رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، اور ''جواہر الفقہ'' میں یہ رسالہ موجود ہے، موصوف نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز اور حرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید و فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید و فروخت کی وجہ سے گنہگار رہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔

لقوله تعالى: "من يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورۂ نساء: ۸۵ جواهر الفقه ۲/ ۹۷)۔

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

قرآن مجید کی اصل نظم عربی اور اس کی خصوصیات کے لئے ضروری ہے کہ اس کی عبارت ترجمہ کے ساتھ ضرور رہے، خالص ترجمہ کی اشاعت میں تغیر وتبدل کے امکانات زیادہ رہتے ہیں، اس لئے اس پر اقدام کرنا مسلمانوں کے لئے قریب صواب نہیں (کفایت المفتی: ۱/ ۱۲۹)۔

مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: بغیر عربی کے محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف چھاپنا منع ہے، اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا گیا ہے، ''في الفتح عن الكافي إن اعتاد القرأة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع'' (شامی: ۱/ ۳۲۶) اس سے خریدنے اور بیچنے کی بھی ممانعت معلوم ہوگئی (فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۱۵)۔

متقدمین اور متاخرین، نیز عصر حاضر کے مستند علماء کی تحریریں دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ کی اشاعت جائز نہیں ہے، اس کی خرید و فروخت اور ہدیہ لینا و دینا بھی جائز نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

''پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کتاب کے متن کو نظر انداز کر دیا اور اس کے ترجمہ وتشریح کو مرکز توجہ بنایا، اسی لئے فقہاء نے متن قرآن کے بغیر ترجمہ لکھنے کو منع کیا ہے، قرآن مجید کی آیات لکھتے ہوئے ان کے ساتھ ترجمہ لکھنا چاہئے، یہ حکم اردو ترجمہ کے لئے بھی ہے اور انگریزی ترجمہ کے لئے بھی اور دوسری زبان کے تراجم کے لئے بھی، بغیر متن کے صرف ترجمہ لکھنا درست نہیں (کتاب الفتاوی/ ۴۷۳)۔

اب رہی یہ بات کہ اگر کوئی ترجمہ ہو تو اس کے چھونے کا کیا حکم ہے؟ تو اس بارے میں فقہاء کی عبارتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ترجمہ کو قرآن نہیں کہا جائے گا، لیکن چونکہ یہ قرآن کے معانی اور مفاہیم کا مجموعہ ہوتا ہے اس لئے اس کو بلا وضو چھونا چاہئے ورنہ کراہت ہوگی، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح هكذا الخلاصة'' (الفتاوى الهنديه ۱/ ۳۹)۔

مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ سے ترجمہ قرآن بلاوضو چھونے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا:

"ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے، لہذا بلاوضو نہ چھوئے" (فتاوی رحیمیہ: ۱۹/۳)۔

مذکورہ تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ترجمہ کو اگرچہ قرآن نہیں کہا جائے گا، لیکن مسلمانوں کے حق میں وہ قرآن کا حکم رکھے گا اس لئے اسے بلاوضو نہ چھوئے ورنہ کراہت ہوگی۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

اس سوال کا جواب بھی وہی ہے کہ یہ بھی قطعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ اس پر جمیع صحابہ کرامؓ تابعی ائمہ مجتہدین اور پوری امت کا اجماع ہے کہ قرآن مجید کی کتابت مصحف عثمانی ہی میں ضروری اور لازم ہے اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے۔

عہد صحابہ سے اب تک کسی نے بھی اس کے خلاف کوئی عمل نہیں کیا ہے، عہد عثمانی ہی سے قرآن کو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلایا گیا، صدیوں سے لوگ اسے پڑھتے آرہے ہیں، صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی یہ تجویز پیش نہیں کی کہ قرآن کو ملکی رسم الخط میں لکھوا کر لوگوں کو دیا جائے، بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم الخط کو بھی مصحف عثمانی کے موافق کرنا ضروری سمجھا، اور غیر عربی زبان والوں کے لئے جو مشکلات تھیں ان کو نا قابل التفات قرار دیا، تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں ہر ملک کے مسلمانوں اور صاحب ایمان نے اسے عربی ہی میں پڑھنا اور تلاوت کرنا سیکھا۔

آج جو یہ خیالات پیش کئے جاتے ہیں کہ غیر عربی داں کے لئے غیر عربی رسم الخط میں سہولت ہوگی اور قرآن کا پیغام عام ہوگا، یہ خیالات محض خیالی ہیں، تاریخ سے کھلے طور پر اسکی تردید ثابت ہے اور عربی میں پڑھنے میں مشکلات تصور کرنا کوتاہی اور بے توفیقی ہے، اسی لئے صاحب فکر و تحقیق علماء نے اس موضوع پر توجہ بھی دی ہے اور مستقل تحریریں تیار کی ہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ دانیؒ، علامہ سیوطیؒ اور علامہ زرکشیؒ اور ان کے علاوہ بے شمار اہل علم تحقیق نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، تمام ہی حضرات نے یہی رائے ظاہر فرمائی ہے کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت ضروری اور لازم ہے، کسی عجمی زبان میں بغیر قرآنی عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں اسی طرح عربی رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری اور لازم ہے کسی دوسرے رسم الخط میں اس کو لکھنا رسم خط عثمانی کی مخالفت کرنا اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے، جو باجماع امت حرام ہے۔

خصوصاً ایسے رسم الخط جن میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا پڑے، جیسے انگریزی رسم الخط کی اس میں حرکات (زیر، زبر، پیش) کو بھی بشکل حروف لکھا جاتا ہے، ایسا لکھنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعی طور پر تحریف قرآن، یہی حال گجراتی، تامل، بنگالی، ہندی وغیرہ زبان کا ہے۔ کسی بھی رسم الخط میں سوائے خط عثمانی کے ہرگز جائز نہیں ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں رسم خط قرآنی اور کتابت قرآنی کے آداب پر مستقل عنوان کے تحت ایک فصل تحریر فرمائی ہے، انہوں نے امام مالکؒ کا قول بڑی اہمیت کے ساتھ نقل کیا ہے:

"سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلا على الكتبة الأولى"

آگے لکھا ہے: "ولا مخالف له من علماء الأمة" (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۳۲۹/۲)۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے:

"وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك" (الاتقان ۳۲۹/۲)۔

علامہ ابن حجر عسقلانی سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے اپنے فتوی میں غیر عربی رسم الخط میں قرآن لکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔

"وقد أفاد شيخ الإسلام العلامة ابن حجر العسقلاني الشافعي في فتاواه تحريم الكتابة. وقد سئل هل تحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية كقراءة. فأجاب بقوله قضية ما في المجموع الإجماع على التحريم"

دوسری جگہ انہوں نے یہ بھی صراحت کی: ''ویحرم أیضا کتابته بقلم غیر العربي''

آگے حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی صراحت کی: ''وفی کتابة القرآن العظیم بالعجمی تصرف فی اللفظ المعجز الذی حصل التحدی به بما لم یرو'' (النفحة القدسیة/ ص۳۵)۔

جولوگ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے کی وجہ سے غیر عربی داں کے لئے سہولت خیال کرتے ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ خیال غلط اور جھوٹ ہے اور مشاہدہ کے خلاف ہے، اس لئے اس طرف توجہ دینا چنداں ضروری نہیں اور اگر اس ضرورت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی اس کی وجہ سے قرآن میں تغییر وتبدل کی اجازت نہیں دی جاسکتی، موصوف فرماتے ہیں:

''وزعم أن کتابته بالعجمیة فیها سهوله للتعلیم کذب مخالف الواقع والمشاهدة فلا یلتفت لذلك علی أنه لو سلم صدقة لم یکن مبیحا لإخراج ألفاظ القرآن عما کتب علیه، وأجمع علیه السلف والخلف'' (النفحة القدسیة: ص۳۵)

علامہ ابن قدامہ کی کتاب المغنی کے حواشی میں اس نقطہ نظر پر بڑی صراحت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں آیا اور رسول کریم ﷺ نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک بھی واقعہ نہیں ملتا کہ آپ ﷺ نے عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کر کے بھیجا گیا ہو یا عجمی رسم الخط میں لکھوایا پھر حضور ﷺ نے قیصر وکسری کو جو خطوط لکھے ہیں اگر گنجائش ہوتی تو ان کی زبان میں قرآن کی آیات بغرض دعوت لکھ دیتے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر عربی رسم الخط میں قرآن لکھنا مصلحت کے بالکل خلاف ہے، ''الشرح الکبیر'' کی عبارت اس طرح ہے:

''وهوإنما نزل بلسان العربي کما هو مصرح فی الآیات المتعددة، وإنما کان تبلیغه والدعوة إلی الإسلام والانذار به کما أنزل الله تعالی لم یترجم النبی ﷺ ولا أذن بترجمته ولم یفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء المسلمین وملوکهم لو کتب النبی ﷺ کتبه إلی قیصر و کسری ومقوس بلغاتهم لصح التعلیل الذی علل به'' (المغنی مع الشرح الکبیر ۱/ ۸۳۰)۔

اس موضوع پر ایک اہم رسالہ مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد کا ہے جو خلاصة الدحوص الجلیلة سے معروف ہے اس میں انہوں نے مصحف عثمانی کے رسم الخط کی اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت کیا ہے اور یہ تحریر فرمائی ہے:

''أجمع المسلمون قاطبة علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمانی ومنع مخالفته''

آگے لکھا ہے: ''قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ماتقدم من إجماع الصحابة علیه، وهم زهاء اثنی عشر ألفا والإجماع حجة حسبما تقرر فی أصول الفقه'' (النصوص الجلیلة/ ص۲۵)۔

علماء سلف کی آراء اور متاخرین کی تحقیقات وتصریحات نقل کرنے کے بعد میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں برصغیر ہندو پاک کی آراء بھی درج کردی جائیں۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے ہندی رسم الخط میں قرآن لکھنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا:

الفاظ قرآن کو عربی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے، ہندی یا کسی اور رسم الخط میں لکھنے کی اجازت نہیں ہے، ''اتقان'' میں اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا گیا ہے، ہندی رسم الخط میں لکھنے سے عبارت مسخ ہوجائے گی، ح، ذ، ز، ض، ظ میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہوگی، اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلاء اطباق، استطالت سب کچھ ضائع کردیں گے (فتاوی محمودیہ: ۷/ ۲۲۳)۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

عربی کو ختم کر کے محض آیت کسی بھی زبان میں لکھنا اور چھاپنا جائز نہیں، اسی طرح عربی الفاظ کو کسی اور رسم الخط ہندی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ میں چھاپنا بھی جائز نہیں، اس پر اتفاق واجماع ہے جیسا کہ الاتقان میں مذکور ہے (فتاوی محمودیہ: ۷/ ۲۲۱)۔

حضرت مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ سے گجراتی رسم الخط میں قرآن لکھنے کے بارے میں استفتاء کیا گیا تو انہوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بہت ہی

تفصیلی جواب تحریر فرمایا جس کا بنیادی حصہ یہ ہے:

قرآن شریف گجراتی حروف میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریفِ رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے۔ مثلاً "بسم اللہ" کو گجراتی حروف میں لکھا جائے تو لفظ اللہ اور لفظ "رحمٰن" اور لفظ "رحیم" کی ابتداء کے دو حروف (الف لام) تحریر میں نہیں آئیں گے "بسم للہ رحمٰن رحیم" لکھا جائیگا اس طرح لکھنے میں صرف "بسم اللہ" شریف میں چھ حروف کی کمی آجاتی ہے۔

تو غور فرمایئے! پورا قرآن شریف گجراتی میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہو جائیں گے، حالانکہ معانی کی طرح حروف بھی قرآن ہونے میں شامل ہیں۔ دوسری جانب صورت یہ ہے کہ بعض آیتوں میں حروف زائد ہو جائیں گے مثلاً "الٓمٓ" میں قرآنی رسم الخط کے بموجب صرف تین حروف ہیں لیکن گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہو جائیں گے، اب حساب لگایئے پورے قرآن شریف میں کتنی کمی پیشی ہو جائے گی (فتاوی رحیمیہ ۱۲/۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اس موضوع پر اپنی رائے آسان تفسیر کے مقدمہ میں ان الفاظ میں فرمائی ہے:

قرآن مجید کو مصحف عثمانی کے مطابق ہی لکھنا واجب ہے، رسم عثمانی سے ہٹ کر لکھنا جائز نہیں ہے (مقدمہ آسان تفسیر، ص ۰۷)۔

علماء سلف وخلف کی آراء اور تصریحات درج کرنے کے بعد اب ہم اخیر میں رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت قائم اسلامک فقہ اکیڈمی مکۃ المکرمۃ کا اس موضوع سے متعلق فیصلہ پیش کرنا بہتر سمجھتے ہیں جو عالم اسلام کے ممتاز اہل علم وفکر اور معروف شخصیات کے سامنے کیا گیا ہے، اور یہ فیصلہ دراصل ھیئۃ کبار العلماء السعودیۃ کی قرارداد سامنے آنے کے بعد کیا گیا۔ اس اہم فیصلہ اور قرارداد کا ترجمہ بھی ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

اکیڈمی کے اجلاس میں جدہ کے شیخ ہاشم وہبہ عبدالعال کا وہ خطبہ پیش ہوا جس میں انہوں نے "مصحف عثمانی" کے رسم الخط کی املائی رسم الخط میں تبدیلی کے موضوع کا ذکر کیا ہے، نیز اس سلسلہ میں "ھیئۃ کبار العلماء، ریاض" کی قرارداد نمبر (۷۱) مورخہ ۲۱/۱۰/۱۳۹۹ھ کو بھی پیش نظر رکھا جس میں عثمانی رسم الخط ہی میں قرآن شریف کو باقی رکھنے کے درج ذیل اسباب ذکر کیے گئے ہیں:

۱- یہ ثابت ہے کہ عثمانی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت حضرت عثمانؓ کے عہد میں انجام پائی، انہوں نے کاتبین کو حکم دیا کہ قرآن کریم کی کتابت ایک مقررہ رسم الخط میں کریں، صحابہ کرام نے ان سے اتفاق کیا اور تابعین بھی اسی راہ پر گامزن رہے اور آج تک ہر دور کے لوگوں نے اس کی پابندی کی، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے، لہذا حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور تمام صحابہ کرامؓ کی پیروی اور ان کے اجماع پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں تحریر کرنا متعین ہو جاتا ہے۔

۲- عثمانی رسم الخط کو چھوڑ کر موجودہ رائج املائی رسم الخط کو پڑھنے کی آسانی کی غرض سے اختیار کرنا دراصل پھر دوسری تبدیلی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ یہ املائی رسم الخط ایک نوع کی اصطلاح ہے جو آئندہ کسی دوسری اصطلاح میں بدل سکتی ہے اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں قرآن کے بعد حروف میں کمی وزیادتی اور تبدیلی کی صورت میں قرآن کے اندر تحریف کا باعث بن جائے گی اور گذرتے ایام کے ساتھ قرآن کے مختلف نسخوں میں فرق واقع ہو جائے گا اور اسلام دشمنوں کو قرآن کریم پر انگشت نمائی کا موقع مل جائے گا۔

۳- قرآن کریم کی کتابت میں عثمانی رسم الخط کی پابندی نہ کی جائے تو اللہ کی کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کے رہ جائے گی کہ جب جب کسی انسان کو کوئی نیا خیال سمجھ میں آئے گا تو اسے بروئے کار لے آئے گا، کوئی اسے لاطینی زبان میں اور کوئی کسی اور زبان میں تحریر کرنے کی تجویز پیش کرے گا جو ایک خطرناک عمل ہے اور مفاسد کا ازالہ مصالح کے حصول سے زیادہ اہم ہے۔

فیصلہ:

اجلاس میں اس موضوع پر غور وخوض کے بعد بالاتفاق فیصلہ کیا گیا کہ ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب کی اس قرارداد کی تائید کی جائے کہ قرآن کے عثمانی رسم الخط میں تبدیلی جائز نہیں ہے اور موجودہ رسم الخط ہی میں اسے باقی رکھنا واجب ہے تا کہ ایک دائمی دلیل وحجت اس بات کی ہو کہ قرآن کے متن میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس کی پابندی ہی میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ سلف کی پیروی واتباع بھی ہے۔

جہاں تک بچوں کے لئے قرآن کریم کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کا سوال ہے جو موجودہ املائی رسم الخط کے عادی ہوتے ہیں تو اس ضرورت کی تکمیل

اساتذہ کی تلقین سے ہوجاتی ہے، کیونکہ قرآن کریم کی تعلیم کے لئے اساتذہ کی ضرورت سے کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہوا جاسکتا ہے، وہ یہ طریقہ اپنا سکتے ہیں کہ بچوں کو تعلیم دیتے وقت عثمانی رسم الخط میں تحریر آیات کو املائی رسم الخط میں لکھ کر تعلیم دیں، بالخصوص جبکہ یہ ملاحظہ کیا گیا کہ ایسے حروف کی تعداد بہت کم ہے، لیکن وہ قرآن کریم میں بار بار بکثرت آتے ہیں جیسے لفظ صلاۃ (نماز)، سموات (آسمانوں) وغیرہ، جب بچے ایسے بار بار آنیوالے الفاظ کو عثمانی رسم الخط میں سیکھ لیں گے تو پڑھنا آسان ہوجائے گا، جیسا کہ موجودہ رسم الخط کے قواعد میں ھٰذا اور ذٰلک کے رسم الخط میں ہوتا ہے۔

مذکورہ قرارداد کی نقل کے بعد ناچیز سمجھتا ہے کہ قرآن مجید کا کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اسی فیصلہ کو تمام علمی تحقیقات کی روشنی میں دین اسلام کے مفاد میں حتمی اور آخری تصور کیا جائے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت:

پچھلی بحثوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ رسم عثمانی قرآن کا رکن ہے، یہ قیاسی نہیں، بلکہ سماعی اور توقیفی ہے اور لوح محفوظ میں تحریر شدہ ہے، اس کے حروف اور معانی منزل من اللہ ہیں اور تواتر واجماع سے ثابت شدہ ہیں، اس لئے اس کی اتباع لازم ہے اس میں کسی طرح کی تبدیلی، ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں ہے، کسی دوسرے رسم الخط میں اس کی کتابت تحریف کے درجہ میں ہے جو حرام ہے۔

اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے کہ اگر بریل کوڈ کی حیثیت ایک قسم کے رسم الخط کی ہے تو اس صورت میں قرآن مجید کو بریل کوڈ میں لکھنا یا اشاعت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، اس کی اجازت دینے میں کوئی ساری قباحتیں پیش آئیں گی، جن کے پیش نظر دوسرے رسم الخط میں اس کی کتابت واشاعت جائز نہیں، اس لئے اس سے بچنا اور قرآن کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اس کی حفاظت انسانی طبقہ کی کسی جماعت کے لئے آسانی فراہم کرنے سے زیادہ اہم ہے اور مصلحت حفاظت میں ہے۔

لیکن اگر بریل کوڈ کی حیثیت مصحف عثمانی پڑھنے اور تلاوت کرنے کا ذریعہ وآلہ ہو جیسے کمزور بینائی والوں کے لئے عینک یا وہ الیکٹرانک مشین جس کے ذریعہ اسکرین پر بڑے حروف اور عبارتیں ظاہر ہوں تو اس صورت میں یقینا مصحف عثمانی ہی کی کتابت وقراءت ہوگی اور اس کی حیثیت نابیناؤں کے لئے محض مددگار ومعاون کی ہوگی، اس میں رسم قرآنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور یہ صورت جائز ہوگی۔

ناچیز کی بعض ایسے علماء سے گفتگو ہوئی جنہوں نے اپنی نگاہ سے نابینا کو بریل کوڈ کے ذریعہ تلاوت کرتے ہوئے دیکھا تو اس تلاوت میں بعینہ عثمانی رسم الخط کے مطابق پایا حروف یا حرکات وسکنات وغیرہ میں کوئی فرق نہیں پایا، انہوں نے بطور امتحان مصحف عثمانی سے کئی مقامات پر متعین کر کے پڑھنے کو کہا تو نابینا نے بریل کوڈ کی مدد سے اسی طرح پڑھا جو رسم قرآنی میں موجود ہے، اس قسم کے مشاہدہ سے ناچیز یہ رائے قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ بریل کوڈ کی حیثیت محض ایک آلہ کی ہے، رسم الخط کی نہیں، اس لئے اس کی مدد سے مصحف عثمانی کی تلاوت کی جاسکتی ہے، لیکن یہ اجازت صرف نابینا تک محدود ہوگی، بینا حضرات کے لئے اس کی اجازت نہیں ہوگی، بلکہ ان کے لئے براہ راست مصحف عثمانی سے تلاوت کرنا لازم ہوگا، تاکہ امت کسی ضرورت کے درجہ کی چیز کو اختیار کر کے اصل مقصود چیز یعنی عثمانی رسم الخط کو ترک نہ کردے، اس لئے بنیا کے لئے رسم عثمانی کی اتباع لازم ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اس مسئلہ میں ظاہر ہے کہ موبائل کا ڈھانچہ خلاف کے درجہ میں ہے، اور فقہاء اس کی صراحت کی ہے کہ خلاف کے ساتھ قرآن مجید چھونے کے لئے وضو ضروری نہیں ہے، بلکہ بلا وضو چھونے کی اجازت ہوگی، تاہم جب موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کی آیات لانے کا ارادہ ہو تو اسکرین پر ہاتھ رکھنے کے لئے وضو کر لینا بہتر ہے اور آداب میں داخل ہے، علامہ سیوطیؒ اور صاحب مناہل نے اس قسم کے آداب تحریر فرمائے ہیں اور اس کتاب عظیم اور وحی الٰہی کی تلاوت کے لئے باوضو تو ہونا ہی چاہئے۔



بغیر عربی متن کے ترجمہ کی قباحتیں

مفتی اقبال احمد قاسمی[1]

بلا عربی عبارت کے محض ترجمہ قرآن کا سوال جب بھی اٹھایا گیا تو ہر دور کے اہل علم نے اس کی پرزور مخالفت کی چنانچہ ماضی قریب میں ۱۳۳۲ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دور میں جب یہ مسئلہ سامنے آیا تو حضرت تھانویؒ نے صرف ترجمہ شائع کرنے کی دس خرابیاں بیان کرتے ہوئے محض ترجمہ قرآن کے چھاپنے کو حرام قرار دیا مفصل فتوی میں مذکور ممانعت کی دس وجوہ "جواہر الفقہ" کے حوالہ سے بالاجمال ذکر کر دینا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔
وھو ھذا:

(۱) کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً وعادتاً ان کے خصائل میں سے ہے سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے، پھر خصوص جب تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے "تشبه في الأمر الديني أشد ہے۔ الخ

(۲) خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے محققان دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے پھر خواہ بعید ہو یا قریب، ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے۔

(۳) حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا (کمافی عالمگیری ص ۴۴ ج ۱) جبکہ یہ یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کیلئے وضو کا انتظام نہ کریں گے تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے۔

(۴) (ترجمہ خالی از قرآن کا) احترام بھی لوگ زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہو جانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے تو اس سے یہ بھی ایک محظور لازم آوے گا اور محذور کا سبب لامحالہ محذور ومحظور (ممنوع) ہے۔

(۵) آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا اور جو کسی نے ایسا کیا تو اس پر انکار کیا گیا اس وقت بھی ایسے ترجمہ غیر حامل متن پر علماء کو انکار ہے چنانچہ اس جواب لکھنے کے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی، بلکہ سب نے شدید انکار کیا۔

(۶) باوجودیکہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی جس حاجت کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے (یعنی ترجمہ محض) تو باوجود داعی کے تمام علماء امت کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی اس امر کے مذموم ومنکر ہونے پر۔ کما قال رسول اللہ ﷺ اتبعوا السواد الأعظم (مشکوۃ)۔

(۷) ترجمہ مع متن کی صورت میں تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ وتعلق بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر تو قرآن سے بالکل بے تعلق اور اجنبی ہو جائیں گے۔

(۸) متن کے ساتھ شائع ترجموں میں اگر کہیں کچھ اختلاف ہو تو اصل (متن) سامنے ہے جو سب نسخوں میں متحد ہے تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہونچتا - اور جب ترجمے ہی رہ جائیں گے اور اصل نظروں سے غائب تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا۔ بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ

[1] صدر مدرس ومفتی مدرسہ مظہر العلوم (مسجد نکھٹو شاہ)، ۱۳۶/ ۹۸، بیکن گنج، کانپور۔ یوپی۔

اصل حکم ہی مختلف ہے یہ تو اعتقاد پر اسکا اثر ہوگا اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لےلیکر آپس میں لڑیں گے اور مراجعت فی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں جو مدار ہوسکتا ہے فیصلہ کا مدار ہوسکتا ہے۔

(۹) ترجمہ مع متن میں ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے قرآن کا تابع سمجھتے ہیں اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے۔ یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں اور مترجم کو دین کا مالک (ٹھیکیدار) نہیں جانتے۔

(۱۰) نیز متن کے ساتھ ترجمہ میں کسی مترجم کو تحریف معنوی کی ہمت بھی نہیں ہوسکتی کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس کی گرفت کر سکے گا (جیسا کہ غلط ترجموں پر گرفت آسانی سے ہوجاتی ہے۔

اور اگر ایسا ترجمہ (متن) شائع ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے کسی کا تابع نہ سمجھیں گے اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی خصوص مترجمین ہی کا متبوع مستقل ہوجانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے غلط ترجمہ اور تفسیر کا موقع ملے گا، کیونکہ ہر دیکھنے والے حافظ نہیں ہوتے اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی" کما قال: اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله" (سورۃ التوبہ:۳۱) اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ قبول کرنا ناجائز ہے اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ از ص ۱۱۵/تا ص ۱۲۲ ج ۱/ بحوالہ بحوادث الفتاویٰ ص ۱۵۶/ج ۲)۔

تنہا ترجمہ کی اشاعت اور اس کی خرید وفروخت یا اعانت حرام ہے:

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ "صیانۃ القرآن" میں بالتفصیل ثابت کیا ہے کہ "قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز وحرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جبکہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہ گار ہونگے وہ ان کے نامہ اعمال میں لکھا جاوے گا۔

"لقوله تعالى: من يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورۂ نساء ۲/۸۵)۔

علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور حنفی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر جس کا نام "النفحة القدسيه فى أحكام قرأة القرآن و كتابته بالفارسية" ہے، اس میں مذاہب اربعہ سے اسکی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی کے لکھا جاوے جس کی عبارت یہ ہے (بحوالہ جواہر الفقہ ص ۹۸ ج ۱)۔

"وأما كتابة القرآن بالفارسية فقد نص عليها فى غير ما كتاب من كتب ائمتنا الحنفية المعتمدة منها ما قاله مؤلف الهدايه الإمام الأجل شيخ مشائخ الإسلام حجة الله تعالى على الأنام برهان الدين أبوالحسن على بن أبي بكر المرغيناني الكبير رحمه الله تعالى فى كتابه التجنيس المزيد ما نصه: ويمنع من كتابة القران بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوت، ولأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمر القرآن۔ انتهى۔

ومنها ما فى معراج الدراية:

أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع، وأنه يكون معتمده زنديقا وستذكره تمامه۔

ومنها ما فى الكافى: أنه لوأراد أن يكتب مصحفا بالفارسية يمنع، ومنها ما قال فى شرح الهداية فتح القدير للمحقق الكمال ابن همام رحمه الله وفى الكافى: إن اعتاد القرأة بالفارسية أوأراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، فان فعل آية اوآيتين لا، فان كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز۔ اه"

(ترجمہ) اور رہا قرآن شریف کو فارسی میں لکھنا ہمارے حنفی اماموں کی بہت سی معتبر کتابوں میں اس کے متعلق تصریح ہے۔

(۱) ہدایہ کے مصنف امام اجل اسلام کے شیخ المشائخ حجۃ اللہ علی الخلق برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی کبیرؒ اپنی کتاب "التجنیس والمزید" میں یہ الفاظ

لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ یہ قرآن مجید شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے۔ دوسرے یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے۔

(۲) معراج الدرایہ میں ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنا سخت ترین ممنوع ہے اور قصداً ایسا کرنے والا زندیق ہے اور باقی مضمون ہم آگے لکھیں گے۔

(۳) کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا۔

(۴) ہدایہ کی شرح کمال بن ہمام کی تصنیف فتح القدیر اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے۔ لیکن اگر الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ و تفسیر لکھے نا جائز ہے۔

علامہ محقق ابن ہمام کی عبارت سے اس تفصیل کی بھی تصریح ہوگئی کہ فارسی (یا کسی اور عجمی) زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو بھی ممنوع نہیں۔

پھر عبارات مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا جس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کہ کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو اس لئے علامہ شرنبلالی نے روایات مذکورہ بالا نقل کرنے کے بعد فرمایا:

''قد مناحكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسية وأنه إنما نص على الفارسية لإفادة المنع بغيرها بالطريق الاولى؛ لأن غيرها ليس مثلها في الفصاحة، و لذا كانت في الجنة مما يتكلم به كالعربية كما تقدم (النفحة القدسية)''

اور درمختار میں ہے:

''وتجوز كتابة آية او آيتين بالفارسية لا أكثر (قال الشامي) والظاهر أن الفارسية غير قيد'' (شامی ص ۴۵۳ ج ۱)

یہاں تک یہ سب روایات ائمہ حنفیہ اور معتبر کتب حنفیہ کی تھیں اس کے بعد امام شافعی، مالک، احمد بن حنبلؒ کے مذاہب کی روایات حسب ذیل ہیں۔

''أما عند الأئمة الشافعية فقد قدمنا عن الإمام الزركشي رحمه الله احتمال الجواز وأن الأقرب المنع من كتابة القرآن بالفارسية كما تحرم قراءته بغير لسان العرب اه

''وقد افاد شيخ الاسلام العلامة ابن حجر العسقلاني الشافعي في فتاواه تحريم الكتابة ... وأجمع عليه السلف والخلف

وأما عند الأئمة المالكية كلما نقل العلامة ابن حجر في فتاواه أن الامام مالك سئل هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا. إلا على الكتبة الأولى أي كتب الإمام وهو المصحف العثماني قال بعض أئمة القراءة ونسبته إلى الإمام مالك لأنه المسئول عن المسئلة، وإلا فهو مذهب الأئمة الأربعة وبمثله قال أبو عمرو۔

وأما عند الأئمة الحنابلة فقد قدمنا عن الدراية ما نصه و عند الشافعي تفسد الصلوة بالقراءة بالفارسية وبه قال مالك وأحمد عند العجز وعدمه انتهى (النفحة القدسية ص ۳۵)۔

وفي حاشية المغني لابن قدامة الحنبلي ما نصه؛ استمر الإجماع على قرائة جميع المسلمين القرآن في الصلوة وغيرها بالعربية كأذكارها وسائر الأذكار والأدعية الماثورة على كثرة الأعاجم حتى قام بعض المرتدين من اعاجم هذا العصر يدعون الى ترجمة القرآن وغيره من الاذكار و بطريق التعبد وانما مرادهم التوسل بذالك إلى تسهيل الردة على قومهم'' (مغني مع الشرح الكبير ص ۵۳۰ ج ۱)۔

(ترجمہ) اور ائمہ شافعیہ کے نزدیک کیا حکم ہے تو ہم نے پہلے امام زرکشی سے جواز کا احتمال اور یہ نقل کر ہی دیا ہے کہ حق کے قریب یہی ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنے کی ایسی ممانعت ہے جیسے کہ غیر عربی زبان میں تلاوت حرام ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی شافعیؒ نے اپنے فتویٰ میں ایسے لکھنے کے حرام ہونے کو بیان فرمایا ہے۔ اور اس پر اسلاف واخلاف کا اجماع بتلانے کو

جائز نہیں کر سکتے۔

اور ائمہ مالکیہ کے نزدیک اس لئے کہ علامہ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے امام مالک سے سوال کیا گیا کہ لوگوں نے جو یہ نیا طریقہ نکالا ہے الگ الگ حروف کر کے لکھنے کا کیا اس طرح لکھا جا سکتا ہے فرمایا نہیں سوائے اس پہلے طریقہ یعنی طریقہ امام کے جو مصحف عثمانی کا ہے اور کوئی طرز جائز نہیں قرائت کے بعض ائمہ نے بیان کیا ہے کہ اس مسئلہ کی نسبت امام مالک کی طرف اس بناء پر ہے کہ ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تھا ورنہ یہ تو ائمہ اربعہ کا مذہب ہے اور ایسا ہی ابوعمرؒو نے بھی فرمایا ہے۔

اور ائمہ حنابلہ کے نزدیک تو ہم پہلے درایہ سے نقل کر چکے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک فارسی میں قراءۃ کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور یہی امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے عجز و عدم عجز کے وقت کیلئے فرمایا۔

ابن قدامہ حنبلی کی کتاب مغنی کے حاشیہ میں ہے کہ اس پر اجماع قرار پایا ہے کہ تمام مسلمان نماز میں بھی اور نماز کے علاوہ بھی قرآن شریف کی تلاوت عربی ہی میں کریں جیسے نماز کی اور دعائیں اور ذکر اور سب ادعیہ ماثورہ بھی عربی میں پڑھی جاتی ہیں اور یہ اجماع عجمیوں کی کثرت کے باوجود ہے، لیکن اس زمانہ کے عجمیوں میں سے بعض مرتد لوگ اُٹھے ہیں اور لوگوں کو ترجمہ قرآن اور ترجمہ اذکار کی اور تراجم کو بطور عبادت تلاوت کرنے کی دعوت دینے لگے ہیں اور اس سے ان لوگوں کی غرض اپنی قوم پر مرتد ہونے کو سہل کر دینا ہے۔

مذکورہ بالا عبارات سے جس طرح آئمہ اربعہ کی تصریحات سے یہ بات صاف ہوگئی کہ فارسی اردو یا کسی بھی عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا منع و حرام ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک دو آیت کا ترجمہ محض لکھنا اس ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا معتدبہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے۔ نیز یہ کہ محض ترجمہ کو قرآن کہنا بھی جائز نہیں، کیونکہ قرآن عربی زبان کے ساتھ مختص ہے اگرچہ ترجمہ کو ادباً باوضو چھونا ضروری ہے باقی ایسے تراجم کو احترام کے ساتھ اس طرح دفن کر دینا چاہئے جس طرح ناقابل قرأت بوسیدہ قرآن مجید واحادیث وغیرہ کتب کو دفن کیا جاتا ہے۔

مع متن ترجمہ کی بھی ایک ضروری شرط:

مذکورہ بالا عبارات سے عربی قرآن کے متن کے ساتھ ترجمہ کا جواز بھی معلوم ہوا لیکن فقہاء نے اسکی بھی صراحت کی ہے کہ ترجمہ قرآن اس طرح پر لکھنا جائز نہیں کہ وہ قرآن سے منفصل وعلیحدہ ہو سکے مثلاً ایک صفحہ یا ورق میں عربی ہی عربی دوسرے ورق یا صفحہ میں محض ترجمہ ہی ترجمہ یہ شکل جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں ترجمہ کا انفصال قرآن سے ممکن ہے۔ ترجمہ کو متن قرآن کے ساتھ ایسا ملحق ہونا چاہئے کہ اس سے جدا نہ ہو سکے، تا کہ اصل عربی سے بے توجہی یا کم توجہ کا سبب نہ بنے البتہ یہ صورت بالکل درست ہوگی کہ آیت کا نمبر ڈال کر ترجمہ کو آیت کے نمبر کے مطابق لکھا جائے۔ اس صورت میں ترجمہ و متن قرآن سے مربوط رہے گا مستقل اس کی حیثیت نہ ہوگی (امداد الاحکام للتھانوی ص ۲۳۹ ج ۱)۔

فقہاء کی تصریحات:

بلا متن عربی خالص ترجمہ کی اشاعت کی ممانعت کے ذکر میں جو عبارات و نصوص گذری ہیں ان سے جس طرح عربی کے سواء کسی اور زبان میں قرآن کریم کی اشاعت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا اسی طرح اسکی حرمت و مخالفت بھی ثابت ہوگی کہ عربی زبان کو انگریزی یا ہندی یا گجراتی یا بنگلہ وغیرہ رسم الخط میں کر دیا جائے یہ بھی باجماع امت ناجائز ہی خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم الخط میں عربی لکھنا تو تحریف کو بھی مستلزم ہے، کیونکہ اس میں حرکات زیر زبر پیش کو بشکل حرف لکھا جاتا ہے، لہٰذا اس کا حرام ہونا اظہر من الشمس ہے۔ فقہاء نے تو عربی رسم الخط میں قرآن لکھنے کے سلسلہ میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کی رعایت و متابعت کو لازم قرار دیا ہے اور مصحف عثمانی کے رسم خط کے خلاف لکھنا اگرچہ وہ عربی ہی خط کیوں نہ ہو اس کو ناجائز و حرام کہا ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق اور علماء امت کا اجماع نقل کیا ہے تو پھر عربی چھوڑ کر غیر عربی بنگلہ وغیرہ رسم خط میں قرآن لکھنے کا جواز کیسے نکل سکتا ہے اسمیں تو جواز کا احتمال ہی نہیں۔ فقہاء کی چند دیگر تصریحات ملاحظہ ہوں:

"أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: و وجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثنى عشر ألفًا و الإجماع حجة حسبما تقرر في أصول الفقه (جواہر الفقہ ص۱۰۶)، وقال البيهقي: من كتب صحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك

المصاحف ولايخالفهم فيه ولايغير ما كتبوه شيئا. فإنهم كانوا(اى الصحابة) أكثر علمًا وأصدق قلبًا ولسانًا وأعظم أمانةً. فلاينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم. كما في الاتقان لشيخ مشا نختنا الجلال السيو طي. ثم قال العلامة الحداد: فثبت بما ذكر من النقول الصحيحة والنصوص الصريحة أنه قد انعقد إجماع سا ئر الأمة من الصحابة وغيرهم على تلك الرسوم. وأنه لايجوز بحال من الأحوال العدول عن كتا بة القرآن الكريم ولا نشرة بصورة تخالف رسم المصاحف العثما نية. والله الموفق والمعين انتهى''۔

(ترجمہ) امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ جوشخص قرآن شریف کی کتابت کرنا چاہے تو اس کیلئے مناسب یہی ہے کہ حرفوں کے اس جوڑ توڑ کی حفاظت کرے جس پر وہ مصاحف لکھے گئے ہیں اور ان کے خلاف نہ کرے اور جیسے جیسے انہوں نے لکھا ہے سر مونہ بدلے کیونکہ حضرات صحابہؓ علم میں سب سے زیادہ کامل، صدق قلبی ولسانی میں سب سے بڑھے ہوئے اور تدین وامانت میں سب سے اعلیٰ تھے۔ ہم کو روا نہیں ہے کہ اپنے دلوں میں ان کی طرف سے کوئی شبہ قائم کریں یہ اتقان میں ہے جو ہمارے شیخ المشائخ جلال السیوطیؒ کی ہے پھر علامہ حداد نے لکھا ہے کہ جو جو نقول صحیحہ اور نصوص صریحہ ذکر کی گئی ہیں ان سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس رسم خط کے وجوب پر اور اس پر کہ قرآن شریف کی کتابت میں کسی حال میں بھی اس رسم الخط سے عدول جائز نہیں اور نہ کسی ایسی صورت سے جو مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کے خلاف ہو قرآن شریف کا شائع کرنا جائز ہے، صحابہؓ وغیر صحابہؓ ساری امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ واللہ الموفق والمعین (رسالہ النصوص الجلیلۃ ص ۲۵/ جواہر الفقہ ص ۱۰۸)۔

رسم عثمانی کے ساتھ دوسری زبان کے خط میں متن قرآن کو شائع کرنا:

جہاں تک رسم عثمانی میں کوئی تصرف کئے بغیر کسی اور زبان میں متن کو ساتھ ساتھ لکھنے کا مسئلہ ہے تو فقہاء عصر نے اس مسئلہ میں چند شرطوں کے ساتھ گنجائش ذکر کی ہے مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی دارالعلوم دیو بند لکھتے ہیں۔

''ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں'' ان کی تعلیم و تلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتاب شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سرحوض وسر صفحہ نمایاں کر کے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی متبوعات وعظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً: س۔ ث۔ اور۔ ز۔ ذ۔ ظ۔ ض اور ہمزہ۔ ع۔ وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً حروف زوائد (الف لام) اور مدوجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کیلئے جامع مانع اصطلاحات وضع کر کے اس زبان کو مکمل کر لیا جائے، پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی۔

اور ان باتوں کے باوجود ایک بات اور پھر بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے۔

بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا جائے، مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ رسم الخط میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ، یا مثلاً ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف۔

صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے۔ اگر ذرا بھی کسی عمل میں یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہو جائے گی جو قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کریم کے ساتھ تابع بن کر لکھ دی جاتی ہیں، اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف ترجمہ قرآن کریم یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

''ھذا ما عندی'' فقط واللہ اعلم بالصواب (منتخبات نظام الفتاویٰ ص ۲۲۸ ج ۳)۔

بریل کوڈ کا شرعی حکم:

نابیناؤں کے لئے ایجاد کردہ قرآنی بریل کوڈ کا شرعی حکم طے کرنے کیلئے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ بریل کوڈ، یعنی نقطوں والی ابھری ہوئی نقوش کی مدد سے جو کلام تیار ہوتا ہے اس کا درجہ کیا ہے آیا وہ تحریر اور رسم الخط ہے یا وہ نقطے خطوط اشارات کی حد تک محدود ہیں؟ جن علماء نے بریل کو تحریر و کتابت مانا ہے انہوں نے قرآن پاک کو بریل میں منتقل کرنا حرام قرار دیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی تحریر کیلئے جو معیار عہد صحابہ سے بالاجماع طے ہے وہ عربی عثمانی رسم الخط ہے، قرآن پاک کی تحریر کیلئے کسی بھی رسم الخط و تحریر کو اسی معیار کے مطابق اور اس کے ضوابط پر پورا اترنا ضروری ہے۔

اور چونکہ بریل کا رسم الخط قرآنی عربی رسم الخط اور عثمانی طرز کتابت سے بالکل جداگانہ چیز ہے، اس لئے قرآن کو بریل میں لکھنے اور منتقل کرنے کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن دوسری طرف ایک جماعت فقہاء کا خیال یہ ہے کہ بریل کو رسم الخط اور عربی تحریر و کتابت سے تعبیر کرنا صحیح نہیں یہ محض تحریر کا بدل ہیں خود تحریر نہیں، لہٰذا اس کو رسم عثمانی کے معیار پر پرکھنا ہی غلط ہے چونکہ یہ تحریر نہیں تحریر کا بدل اور کتابت کا کوڈ ہے، اس لئے اس کا حکم بھی علیحدہ ہوگا اور معذوروں کیلئے اس کی گنجائش رہے گی۔

بریل کوڈ اور رسم الخط (کتابت) میں بنیادی فرق:

اب یہ بحث کہ بریل کو تحریر و کتابت مانا جائے یا اسکا بدل و قائم مقام یہ غور طلب مسئلہ ہے؟

تحقیق اور غور و فکر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بریل کو رسم الخط یا تحریر کہنا مشکل ہے بریل کو نابیناؤں کی تحریر تو کہا جا سکتا ہے مطلق تحریر کہنا صحیح نہیں۔ بریل میں اور عام تحریر و کتابت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً:

(۱) عربی زبان کے رسم الخط میں جو شوشے اور گھماؤ دیکھنے میں آتے ہیں بریل میں یہ بات نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو نقطے ہی نقطے ہوتے ہیں ان ہی کے کم و بیش سے حروف کا بدل بنتا ہے۔

(۲) بریل جو نقطوں سے ترتیب دیا جاتا ہے وہ لکھے ہوئے نقطے نہیں ہوتے، بلکہ وہ کاغذ پر ابھارے ہوئے ہوتے ہیں جو لمس کی مدد سے محسوس کئے جاتے ہیں اور نابینا لوگ چھو کر اس کو پڑھ سکتے ہیں، جبکہ بینا لوگوں کیلئے وہ عموماً ناقابل فہم ہوتے ہیں۔

(۳) رسم الخط حروف قرآن پر دال ہوتے ہیں اسی لئے عثمانی رسم الخط کا موضوع قرآن کریم کے حروف کہلاتے ہیں جبکہ بریل نقطوں کی زبان ہے اور وہ حروف کا بدل ہیں خود حروف نہیں۔

(۴) بریل یا نقطے تلفظ کی علامت ہوتے ہیں اور زبان کے بدلنے کے باوجود جن الفاظ کا تلفظ یکساں ہوتا ہے ان کی شکل نہیں بدلتی مثلاً (ل) کی علامت کے طور جو بریل وضع کیا گیا ہے وہ انگریزی عربی گجراتی میں یکساں ہے اسی لئے مختلف زبان کے رسم الخط سے ایک نظر میں زبان کا فرق جانا جا سکتا ہے کہ یہ انگریزی کی تحریر ہے یہ عربی کی کتاب ہے اور یہ کسی اور زبان میں لکھی ہوئی ہے، جبکہ بریل میں لکھی ہوئی مختلف زبانوں کی کتابوں کا فرق جاننا تعلیم یافتہ نابینا کیلئے بھی مشکل ہوجاتا ہے اور بینا و دانا اس سے اپنے کو عاجز ہی پاتا ہے، کیونکہ تمام بریل ایک جیسی نظر آتی ہے یہ بھی ایک واضح فرق ہے بریل اور رسم الخط کے درمیان۔

(۵) رسم الخط مشاہدہ کی چیز ہوتی ہے جس سے نابینا عاجز ہے، جبکہ بریل دیکھ کر نہیں چھو کر جاننے والی چیز ہے، کیونکہ وہ ایک کوڈ ہوتا ہے جو صرف نابینا لوگوں کیلئے قوت لمس کے سہارے سے پڑھنے کیلئے وضع کیا جاتا ہے گویا بریل دیکھ کر نہیں چھو کر پڑھنے کیلئے ترتیب دیا جاتا ہے۔ ایک نابینا شخص کیلئے ابھرے ہوئے نقطوں کو پہچاننا آسان ہوتا ہے جبکہ وہ پرنٹ شدہ نقطہ کو نہیں پہچان سکتا۔ اسی سے یہ فرق بھی نکل آیا کہ نابینا شخص کیلئے بریل کا پڑھنا روشنی اور اندھیرے میں برابر ہے جب کہ بینا شخص کیلئے مطبوع رسم الخط کو اندھیرے میں پڑھنا ممکن نہیں۔

بریل کوڈ میں قرآن کے جواز کو ترجیح:

خلاصہ یہ کہ بریل رموز القرآن کی زبان ہے جو حروف القرآن کے رسم الخط کے مساوی ہے اصلاً یہ رسم الخط کے حکم میں نہیں۔ لہٰذا اس پر قرآنی رسم الخط کی مخالفت کا حکم نہیں لگے گا بلکہ نابیناؤں کی سہولت کیلئے یہ اقدام "من سن سنة حسنة... الخ" (حدیث) کے تحت داخل اور "ماراٰه المسلمون حسنا فهو

عند اللہ حسن" (حدیث) کا مصداق ہوگا۔ اسی لئے یہ بریل کوڈ قرآنی تمام ممالک میں قبول عام حاصل کررہا ہے خود مرکز اسلام حرمین شریفین میں بریل کوڈ والے قرآن رکھے گئے ہیں۔ اسلئے اس کے جواز کو ہی ترجیح ہونی چاہئے۔

موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کیلئے وضو کا حکم:

دور حاضر میں قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کیلئے موبائل اسی طرح لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ کا استعمال عام ہے اور اللہ کے نیک بندے ہی ان چیزوں کا نیک اور جائز کام میں استعمال کرتے ہیں۔

موبائل کے سیٹ میں قرآن مجید فیڈ ہو یا اسکی میموری (چپ) میں جب تک اسکرین پر نہیں ہے اس کو بلا وضو ہاتھ لگانا بلکہ حالت جنابت وغیرہ میں اس کو ہاتھ میں لینا، نیز اس کو جیب وغیرہ میں رکھ کر بیت الخلاء وغیرہ جانا بالاتفاق جائز ہے، کیونکہ یہ اس تعویذ کی مانند ہے جس کو موم جامہ کرکے تعویذ کے خول میں محفوظ کر دیا گیا ہو یا یوں کہا جائے کہ جس طرح حفاظ کے سینوں میں کلام پاک ہے موبائل کے سینہ میں بھی کلام پاک اسی کے حکم میں ہے۔ شرح ہدایہ فتح القدیر میں ہے

"ولو كانت رقية في غلاف متجاف عنه لم يكره دخول الخلاء به والاحتراز عن مثله أفضل" (ص۱۵۰ج۱ کوئٹہ)۔

(ترجمہ) اگر کوئی رقیہ (قرآنی تعویذ) کسی علیحدہ کپڑے میں کر دیا گیا ہو تو اس کو بیت الخلاء میں لیجانا مکروہ نہیں البتہ اس سے بچنا افضل ہے۔

البتہ جب وہی کلام پاک اسکرین پر کھلا ہوا ہو تو اس کو چھونے اور اسکرین پر رونما قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کیلئے اس پر انگلیوں کو مس کرنے کیلئے شرعاً وضو کی حاجت ہوگی یا بلا وضو بھی اس کو ہاتھ لگانا درست رہے گا؟۔

اس سلسلہ میں وضو کی شرط کی بات عصر حاضر کے بعض مفتیان نے ذکر کی ہے اور لوح و درھم پر لکھے ہوئے قرآن کیلئے وضو کی شرط والے جزئیہ سے استدلال کیا ہے، مثلاً مفتی سلمان منصور پوری لکھتے ہیں۔

"اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن یا احادیث شریفہ کے حروف دکھائی دے رہے ہوں تو ان حروف پر بلا وضو ہاتھ رکھنا درست نہیں، لیکن اگر یہ پروگرام بند ہو تو ایسے موبائل کو بلا وضو چھونا منع نہیں"۔

"ويمنع دخول مسجد (إلى قوله) ومسه أي القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط" (شامی زکریا ص۲۸۸ج۱)۔

لیکن یہ استدلال محل تامل ہے، کیونکہ لوح و درھم پر لکھی ہوئی آیت کے لئے تو وضو اس لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ انسان کا ہاتھ بلا حائل براہ راست اس کو چھوتا و پکڑتا ہے۔ اس طرح آیت کا بلا حجاب چھونا لازم آتا ہے جو کہ "لایمسه الا المطهرون" (سورۂ واقعہ:۷۹)، تحت ناجائز ہے، لیکن موبائل سیٹ وغیرہ کی اسکرین کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ اسکرین جو شیشہ یا پلاسٹک کی ہوتی ہے اس کے نیچے ہی وہ قرآنی آیات ابھرتی ہیں جو اسکرین کے اوپر نظر آتی ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ لائبریری اور بڑے کتب خانوں میں یادگار قرآنی مخطوطات یا نادر نسخوں وغیرہ کو شیشہ پر ہاتھ لگا کر ایسی قرآنی کتب و آیات کا نظارہ کرتے ہیں۔ اور شیشہ پر ہاتھ لگانے کیلئے وضو کی شرط نہیں ہوتی اسی طرح موبائل کی اسکرین پر قرآن کھلا ہو تو اسکرین (شیشہ یا کور) کو بلا وضو بھی ہاتھ لگانا درست ہونا چاہئے اگرچہ ادب واحتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ بلا وضو قرآن کی اسکرین پر ہاتھ نہ پڑے۔

اسکرین کا حصہ جہاں قرآن رونما نظر آرہا ہے اس کو چھوڑ کر باقی موبائل کے حصہ کو پکڑنا چھونا بلا اختلاف جائز ہے جیسا کہ طحطاوی میں ہے۔

"لا يجوز مس مواضع القرآن منها؟ وله أن يمس غيرها بخلاف المصحف" (طحطاوی علی المراقی ص۱۴۳ دیوبند)

"وفيما عدا المصحف إنما يحرم مس الكتابة لا الحواشي. ويحرم الكل في المصحف؛ لأن الكل تبع له" (حوالہ بالا ص۱۴۳)

(ترجمہ) جس حصہ پر قرآن کی آیت ہے اس کا چھونا جائز نہیں اس کے علاوہ حصہ چھوا جاسکتا ہے بخلاف قرآن مجید (کتاب) کے کہ اس کو مطلقاً بلا وضو چھونا جائز نہیں۔ قرآن کے علاوہ میں یہ حکم ہے کہ قرآنی کتابت کے علاوہ باقی حواشی پر بلا وضو ہاتھ لگانا جائز ہے قرآن کے کنارہ کا حصہ قرآن کے تابع ہے اس کو بلا وضو چھونا صحیح نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسکرین پر قرآن پڑھنے کیلئے اسکرین چھونے کی بھی گنجائش ہوگی، کیونکہ قرآن اسکرین کے نیچے ہوتا ہے نہ کہ اسکرین کے اوپر البتہ ادب یہی ہے کہ مطلق تلاوت ہی بلا وضو نہ ہو۔ ☆☆☆

بغیر متن ترجمہ قرآن کی اشاعت وطباعت

مفتی سید باقر ارشد قاسمی بنگلوری[1]

بغیر متن ترجمۂ قرآن کی اشاعت وطباعت:

قرآن کریم کے عربی متن کی ایک الگ ہی خاصیت ہے اور اس کا ایک الگ ہی تاثر۔ وہ جو عربی الفاظ اور جملے ہیں وہ منزل من اللہ ہیں، کلام اللہ ہیں۔ اللہ نے قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا نزول فرمایا ہے۔ روحانی اور معنوی حیثیت سے ان کلمات اور ان آیات کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی بھی دوسری زبان مقابلہ نہیں کرسکتی اور نہ ہی ان الفاظ کے معنی ومفہوم کو بالکلیہ ادا کرسکتی ہے۔

دوسری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ سارا التقدس، سارا احترام قرآن کے عربی متن کے لئے ہے، دوسری زبان میں ترجمہ سے وہ احترام اور تقدس اس کو حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ دیا جاسکتا ہے۔ قرآن کا اطلاق عربی متن کی حامل آیات پر کیا جاتا ہے، اس کا مقام محض ترجمہ (کسی اور زبان میں) کو نہیں دیا جاسکتا ہے۔ متن کے جو احکام ہیں وہ ترجمہ پر مرتب نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ ترجمۃ القرآن الکریم میں ہے:

"وهو قول الإمام الآمدی؛ إن الكتاب ؛ هو القرآن المنزل... الخ... وقال الإمام البزدوی: أما الكتاب فالقرآن المنزل على رسول الله المكتوب فی المصاحف المنقول عن النبی ﷺ نقلًا متواترًا بلا شبهة وهو النظم و المعنى جميعًا فی قول عامة العلماء..." (ترجمة القرآن الكريم: ۱۲، ص ۸۳، موبائیل اپلیکیشن" المکتبة الشاملة)۔

قرآن میں کسی بھی طرح کی اور کسی بھی درجہ کی تحریف شریعت کو گوارہ نہیں چونکہ اس کے بعد کوئی دوسری کتاب آنے والی ہے اور نہ ہی کوئی نبی قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا، اور ارشاد فرمایا: "وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹)، اور اس کے لئے حفاظ وعلماء کو کھڑا کیا۔ چنانچہ قرآن کی حفاظت کا مطلب صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ اس کے معنی کی حفاظت مطلوب ہے۔ اب اس قرآن کے عربی متن کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو جو مفہوم اور جو ترکیب، جو اسلوب، جو ڈھنگ قرآن کے متن کا ہے ویسا من وعن اس ترجمہ میں نہیں آسکتا۔ مفہوم کی ادائیگی میں کچھ نہ کچھ تو فرق آ ہی جاتا ہے۔ لہٰذا معنی کے اعتبار سے قرآن کی حفاظت میں رخنہ پڑسکتا ہے۔ الفاظ میں قرآن کا اعجاز اور اس کی برکت کا حصول ہے تو اس کے معنی میں قرآن کا مقصد پورا ہوتا ہے دونوں میں کسی ایک میں بھی ذرا بھر بھی تحریف ہوجائے یا تبدل وتغیر ہوجائے تو تحفظ قرآن میں خلل واقع ہوجاتا ہے جو عند الشریعت ممنوع وسخت گناہ کا عمل ہے۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: "إنا أنزلناه قرآنا عربيا..." (سورۂ یوسف: ۲)...... ایک موقع پر ارشاد ہوا: "و كذالك انزلناه قرء انا عربيا..." (سورۂ طٰہٰ: ۱۱۳)

ایک جگہ ارشاد ہوا: إنا جعلناه قرء انا عربيا... (سورۂ زخرف: ۳)...... ایک اور جگہ ارشاد ہوا: "بلسانٍ عربيٍ مبين" (سورۂ شعراء: ۱۹۵)۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا۔

یہاں نزول سے مطلب لفظاً ومعناً دونوں مراد ہیں۔ نیز "الاتقان" میں ہے کہ:

قال الزركشی: لم أر فيه كلامًا لأحد من العلماء، قال: ويحتمل الجواز لانه قد يحسنه من يقرؤه بالعربية، و الأقرب المنع، كما تحرم قراء ته بغير لسان العرب، و لقولهم: القلم احد اللسانين. و العرب لاتعرف قلما غير العربي، و قد قال الله تعالى: بلسان عربيّ مبين" (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۲۱۸)۔

یعنی زرکشی نے کہا کہ انہوں نے اس بارے میں کسی عالم کا کوئی کلام نہیں دیکھا، مگر وہ کہتے ہیں کہ اس بات کا جواز کا احتمال ہے، کیونکہ جو شخص قرآن شریف

---

[1] سرپرست "المفتی ریسرچ، اسٹڈی سرکل اینڈ پبلی کیشنز"، چن پٹن، بنگلور۔

کو عربی زبان اور خط میں پڑھتا ہے وہ غیر عربی میں بھی اس کو اچھی طرح سے پڑھ سکے گا۔ لیکن اقرب اس کا منع ہے، جیسا کہ غیر عربی میں قرأت حرام ہے اسی طرح سے غیر عربی میں لکھنا بھی حرام ہے۔ اور علماء نے کہا کہ قلم یا کتابت زبان کی دو قسمیں ہیں، ایک کتابت اور دوسری قرأت۔ (غیر عربی میں جیسا قرأۃ ممنوع و حرام ہے ویسے ہی غیر عربی میں کتابت قرآن بھی ممنوع وحرام ہے) اور عرب بجز عربی قلم (خط) کے کسی دوسرے خط کو نہیں جانتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بلسان عربی مبین"۔

فتح القدیر میں ہے: "و فی الکافی: إن اعتاد القرأۃ بالفارسیۃ أو أراد أن یکتب مصحفًا بھا یمنع؛ و إن فعل فی آیۃ أو آیتین لا، فإن کتب القرآن و تفسیر کل حرف و ترجمتہ جاز…" (فتح القدیر ۱/ ۲۴۱، رد المحتار ۲/ ۱۸۶)۔

نیز "الفتاوی التاتارخانیہ" میں ہے: "و إن اعتاد القراءۃ بالفارسیۃ، أو أراد أن یکتب المصحف بالفارسیۃ منع من ذلک علی أشد المنع، وإن فعل ذلک فی آیۃ او آیتین لایمنع من ذلک. ذکر الشیخ الإمام شمس الأئمۃ السرخسی فی شرح الجامع الصغیر: و إن کتب القرآن و تفسیر کل حرف و ترجمتہ تحتہ روی عن الشیخ الفقیہ أبی جعفر أن لا بأس بہ فی دیارنا، و إنما یکرہ فی دیارھم لأن القرآن نزل بلغتھم…" (فتاوی تاتارخانیہ ۱/ ۲۸۴)۔

ان عبارات کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن کی تلاوت کی عادت بنالے یا فارسی میں لکھنے کا ارادہ کرے تو اس کو منع کیا جائے گا، ہاں اگر ایک دو آیت میں ایسا کرے تو اس کو روکا نہ جائے، البتہ اگر متن قرآن بھی لکھے اور ہر ہر لفظ کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو یہ جائز ہے۔

اور "الاتقان فی علوم القرآن" میں ہے: "وقال أشھب: سئل مالک: ھل یکتب المصحف علیٰ ما احدثہ الناس من الھجاء؟ فقال: لا الا علیٰ الکتبۃ الاولیٰ۔ رواہ الدانی فی المقنع ثم قال: ولا مخالف لہ من علماء الامۃ۔ وقال فی موضع آخر: سئل مالک عن الحروف فی القرآن مثل الواؤ و الالف أتریٰ أن یغیر من المصحف إذا وجد فیہ کذلک؟ قال: لا۔ قال أبوعمرو: یعنی الواو و الالف المزیدتین فی الرسم المعدومتین فی اللفظ نحو۔ اولوا۔ وقال الإمام أحمد: یحرم مخالفۃ خط مصحف عثمان فی واو أو یاء أو الف أو غیر ذلک۔ وقال البیھقی فی شعب الإیمان: من یکتب مصحفا فینبغی أن یحافظ علیٰ الھجاء الذی کتبوا بہ تلک المصاحف ولا یخالفھم فیہ ولا یغیر مما کتبوا شیئا۔ فانھم کانوا اکثر علماء و أصدق قلبا و لسانا و أعظم امانۃ منا، فلاینبغی أن نظن بأنفسنا استدراکا علیھم…" (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۲/ ۲۱۳، ۲۱۲)۔

فی الآخر! بغیر متن قرآن کے محض ترجمہ قرآن کی اشاعت کی اجازت نہیں ہے، محض ترجمہ شائع کرنا ممنوع ہے اور حرام ہے۔ اگر قرآن کے فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں ترجمے یا تفسیر کی اشاعت کی جارہی ہو تو اس کے ساتھ قرآن کے عربی متن کو بھی شامل اشاعت کرنا لازم وضروری ہے۔

اب صرف ترجمہ شائع کرنے کی جو بات ہے وہ ناقابل قبول اس لئے بھی ہے کہ اس سے قرآن کی اصل "متن" میں تحریف ہونے کے ساتھ ساتھ مفہوم میں تغیر وتبدل ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ اور ان کے ناپاک عزائم کے لئے راہ ہموار ہے جو درپردہ اسلام سے دشمنی اور قرآن کے غیر محرف ہونے سے حسد کی بناء پر قرآن فہمی کا شوشہ چھوڑتے ہیں۔

مصارف کی زیادتی کے خوف سے تنہا ترجمۂ قرآن کی اشاعت جائز نہیں ہے:

جہاں تک سوالنامے میں جن دو وجوہات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تنہا ترجمہ کی اشاعت میں مصارف کم آتے ہیں اور دوسرا یہ کہ مع المتن ترجمۂ قرآن غیر مسلموں کو دینے میں اندیشہ ہے کہ کہیں بے حرمتی نہ ہو۔

یہ دونوں وجوہات، قرآن کریم کی حفاظت جیسے عظیم فریضہ اور مقصد کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ جہاں تک مصارف کی بات ہے یہ ایک غیر اہم بات ہے کیونکہ قرآن کی اشاعت اچھی سے اچھی ہو اور بہترین ہو۔ اس میں یہ نہ دیکھا جائے کہ مصارف کتنے آتے ہیں۔ جب قرآن کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے تو اس کی خوبصورتی، حسن اور احسن طباعت کی طرف توجہ ہو اور دوسری اہم بات یہ کہ قرآن کی اشاعت کے دوران کوئی تحریف والا عمل نہ ہونے پائے (الاتقان فی علوم القران ۲/ ۲۱۸)۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محض مصارف کو کم کرنے کے لئے ایک ایسا عمل اختیار کیا جائے جو عند الشریعت جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس طرح کا

عموماً معمول ہے۔

عربی متن کا حامل ترجمہ قرآن غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے:

رہی بات غیر مسلموں کو قرآن دینے میں بے حرمتی کے اندیشہ سے بچنے کے لئے تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کی ہے، اس سلسلہ میں ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے کہ: قال ابوحنیفة رحمه الله تعالیٰ: ''أعلم النصرانی الفقه و القرآن لعله یهتدی ولا یمس المصحف و إن اغتسل ثم مس لا بأس، کذا فی الملتقط...'' (الفتاوی الهندیه ۵/ ۳۹۹)۔ یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ نصرانیوں (غیر مسلموں) کو فقہ و قرآن کی تعلیم دینے کے حق میں ہیں کہ ہوسکتا ہے اسی کی بدولت ان کو ہدایت نصیب ہوجائے، مگر مصحف کو نصرانی نہیں چھوئے گا، اور اگر اس نے غسل کر کے پھر چھوا تو کچھ ڈر نہیں، یہ ملتقط میں ہے۔

اب تعلیم دینے کے لئے لازمی بات ہے کہ قرآن بھی دینا پڑے گا اور وہ اس کو پڑھیں گے۔ معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کو قرآن دیا جاسکتا ہے اور وہ اس کو بغیر وضو پڑھ بھی سکتے ہیں، اس میں بے حرمتی کا کوئی سوال نہیں۔

البتہ اگر کوئی غیر مسلم ایسا ہے کہ جس سے قرآن کی بے حرمتی ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسے شخص کو قرآن دینا ہی نہیں چاہئے۔

ایسا غیر مسلم جس کے تعلق سے اطمینان ہو کہ وہ قرآن کریم کی بے حرمتی نہیں کرے گا تو ایسے غیر مسلم کو قرآن دینے میں کوئی قباحت نہیں، مگر احتیاطاً قرآن دیتے وقت اس کو یہ ہدایت کردی جائے کہ قرآن کریم چونکہ عظمت والی کتاب ہے، مقدس و بابرکت کتاب ہے، اس لئے اس کو ناپاکی کی حالت میں نہ چھوئے، بلکہ غسل کر کے یا کم از کم وضو کر کے اس کو ہاتھ لگایا جائے اور پڑھا جائے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: ''و یمنع النصرانی (وفی بعض النسخ الکافر) من مسه و جوزه محمد اذا اغتسل ولا بأس بتعلیم القرآن و الفقه عسی یهتدی...'' (ردالمحتار ۱/ ۱۶۳)۔

بغیر متن تنہا ترجمۂ قرآن کی خرید وفروخت کا حکم:

فی نفسہ قرآن کریم کی تجارت کا جواز بہ لحاظ رخصت چند قیود و شرائط کے ساتھ متصف ہے۔ منافع کمانے کے لئے، تجارت کی لائن سے، نیز قرآن کریم کو بیچ کر دولت کمانے کی غرض سے قرآن کریم کی خرید و فروخت کا جواز محل نظر ہے۔ ہاں اجر و ثواب کے ارادہ سے، قرآن کی اشاعت کی نیت سے، قرآن کریم کی حفاظت اور اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے، دور دور تک پہونچانے کی نیت سے قرآن کریم کی خرید وفروخت کی جارہی ہو تو یہ جائز ہے اور اس کا اخراجات کی حد تک ہدیہ لینا جائز ہے۔

لیکن جہاں تک قرآن کریم کے بلا متن عجمی زبانوں میں ترجمہ کی خرید وفروخت کا مسئلہ ہے، خود تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کے عدم جواز کی وجہ سے اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں ہے۔

چونکہ ترجمہ قرآن کی اشاعت قرآن کریم کی تحریف کا ایک بڑا سبب بن سکتا ہے، اور الفاظ قرآنی، متن قرآنی سے بے نیازی، بے التفاتی کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے اور عوام یکسر متن قرآنی کو نظر انداز کر کے محض ترجمہ پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں گے جس سے قرآن کی بے حرمتی کا امکان ہے۔ لہٰذا قرآن کی اشاعت سخت ممنوع ہے اور جب اس کی اشاعت ممنوع و حرام ہے تو پھر لازماً اس اشاعت کی خرید وفروخت، اس کو پھیلانے میں تعاون کرنا بھی حرام و ممنوع ہوگا۔ لہٰذا قرآن کریم کا عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں لکھ کر محض ترجمہ چھاپنا اور غیر عربی زبان، عجمی زبان میں قرآن شائع کر کے اس کا فروخت کرنا اور اس کو خریدنا درست نہیں ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ۱/ ۳۴۸، ردالمحتار ۲/ ۱۸۷، فتاوی تاتارخانیہ ۱/ ۲۸۴، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۲/ ۲۱۲)۔

بغیر متن تنہا ترجمۂ قرآن کا حکم:

متن قرآن کے بغیر محض ترجمہ قرآن؛ قرآن کریم کے حکم میں نہیں ہے۔ اس ترجمہ کی قرآن جیسی حرمت نہیں ہوگی۔ سارا تقدس، سارا احترام قرآن کے اس عربی متن کے لئے ہے، دوسری زبان میں ترجمہ سے وہ احترام اور تقدس اس کو حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ دیا جاسکتا ہے۔ قرآن کا اطلاق عربی متن کی حامل آیات پر کیا جاتا ہے، اس کا مقام محض ترجمہ (کسی اور زبان میں) کو نہیں دیا جاسکتا۔ متن کے جو احکام ہیں وہ ترجمہ پر مرتب نہیں ہوسکتے۔

چنانچہ صاحب ترجمۃ القرآن لکھتے ہیں: ''إن أجمع و أوضح ما قيل فى القرآن، وهو قول الإمام الامدى؛ أن الكتاب ؛ هو القرآن المنزل...الخ...قال الإمام البزدوى: أما الكتاب فالقرآن المنزل على رسول الله المكتوب فى المصاحف المنقول عن النبى ﷺ نقلًا متواترًا بلا شبهة وهو النظم و المعنى جميعًا فى قول عامة العلماء...'' (ترجمة القرآن ۱/۹۱ المكتبة الشامله)۔

ترجمہ قرآن صرف عوام کی رہنمائی اور ان کی افہام و تفہیم کے لئے ہے، فقہاء کرام قرآن کریم کے ترجمہ کی اجازت بھی محض عربی سے نابلد و ناواقف افراد کی تفہیم، قرآن کے پیغام کی تبلیغ کے لئے اور احکام قرآن کی اشاعت کے لئے دی ہے۔ چنانچہ یہ قرآن کے حکم میں نہیں ہے۔

چنانچہ صاحب ترجمۃ القرآن الکریم لکھتے ہیں: ''أن الترجمة لاتعتبر قرآنًا و إنما يقصد بها نقل معانى القرآن بحيث يتسنى للإنسانية الإطلاع عليها و الاهتداء بتعاليمها ...الخ ... والترجمة المقصودة هنا هى نقل لمعانى و أحكام القرآن إلى لغة أخرى أشبه ما يكون الأمر بالتفسير'' (حوالہ مذکور ۱/۹۱)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ''قاموس الفقہ'' میں قرآن کی اصطلاحی تعریف کے باب میں لکھتے ہیں: قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جس کے الفاظ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے ہیں جس کی چھوٹی سی چھوٹی سورت بھی حامل اعجاز ہے اور تواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، جس کی ابتداء سورہ فاتحہ سے ہوتی ہے، اور جس کی انتہاء سورۂ ناس پر ہوتی ہے......الخ۔ الفاظ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے کی قید سے حدیث کو نکالنا مقصود ہے، کیونکہ حدیث کے معانی من جانب اللہ ہیں نہ کہ الفاظ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے کی قید سے دوسری آسمانی کتابوں کا استثناء ہوگیا، عربی زبان کی قید نے اس کو مزید واضح بھی کر دیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قرآن کے معانی قرآن کے حکم میں نہیں ہیں...... (قاموس الفقہ ۴/ ۴۸۳، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/ ۲۱۲)۔

بغیر متن تنہا ترجمۂ قرآن کو بے وضو چھونے کا حکم:

چونکہ بغیر متن کے صرف ترجمہ قرآن قرآن کے حکم میں نہیں ہے، بلکہ وہ قرآن کو سمجھنے اور اس کے معنی و مفاہیم تک پہونچنے کا ذریعہ ہے، لہٰذا جب وہ وہ قرآن کے حکم میں نہیں ہے تو اس پر قرآن کے احکام کا ترتب بھی نہیں ہونا چاہئے، اس پر قرآن کے حقوق کا بھی اطلاق نہیں ہوگا۔

قرآن کی تعریف:

صاحب ترجمۃ القرآن لکھتے ہیں:

''إن أجمع و أوضح ما قيل فى القرآن، وهو قول الامام الآمدى؛ إن الكتاب ؛ هو القرآن المنزل...الخ...قال الإمام البزدوى: أما الكتاب فالقرآن المنزل على رسول الله المكتوب فى المصاحف المنقول عن النبى ﷺ نقلًا متواترًا بلا شبهة وهو النظم و المعنى جميعًا فى قول عامة العلماء''... (ترجمة القرآن ۱/ ۸۴)۔

المحرر فی علوم القرآن میں لکھا ہے: ''فا لقرآن كلام الله تعالى، و المصحف هو الصحف التى كتب فيها كلام الله تعالى''... (المحرر فى علوم القرآن ۱/ ۲۲۰)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ''قاموس الفقہ'' میں اصطلاحی تعریف کے باب میں لکھتے ہیں: قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جس کے الفاظ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے ہیں جس کی چھوٹی سی چھوٹی سورت بھی حامل اعجاز ہے اور تواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، جس کی ابتداء سورہ فاتحہ سے ہوتی ہے، اور جس کی انتہاء سورۂ ناس پر ہوتی ہے......الخ۔ پھر لکھتے ہیں کہ الفاظ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے کی قید سے حدیث کو نکالنا مقصود ہے، کیونکہ حدیث کے معانی من جانب اللہ ہیں نہ کہ الفاظ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے کی قید سے دوسری آسمانی کتابوں کا استثناء ہوگیا، عربی زبان کی قید نے اس کو مزید واضح بھی کر دیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قرآن کے معانی قرآن کے حکم میں نہیں ہیں...... (قاموس الفقہ ۴/ ۴۸۳)۔

علیٰ ہٰذا! بغیر عربی متن کے ترجمۂ قرآن کو چھونے اور اس کو پڑھنے کے لئے وضو لازم نہیں ہے، ہاں البتہ مستحب و مندوب ہے۔ لیکن اگر ترجمہ مع المتن کی اشاعت ہو تو وہ قرآن کے حکم میں ہے، اس کو چھونے اور پڑھنے کے لئے وضو ضروری و لازم ہے۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کا حکم:

قرآن کریم کا رسم الخط، اس کی اسکرپٹ قرن اول ہی سے متعین ہے، اور رسم الخط "خط مصحف عثمانی" ہے، مصحف عثمانی کے رسم الخط سے ہٹ کر کسی اور رسم الخط یا اسکرپٹ میں قرآن کریم کو لکھ کر شائع کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ رسم الخط "توفیقی" اور "الہامی" ہے۔

کما فی " موسوعة علوم القرآن: "أن الرسم توفيقي لا اجتهادي. و أنه لاتجوز مخالفته لأي سبب كان. سيما و أن الثقات من الأئمة قد شددوا على التزامه"...(موسوعة علوم القرآن ۱/ ۲۷۱)۔

وفی تحريم كتابة القرآن الكريم بحروف غير عربية... "ذهب الجمهور العلماء إلى أن رسم المصحف توفيقي، لاتجوز مخالفته..." (تحريم كتابة القرآن)۔

قرآن کریم کی کتابت اور اس کی اشاعت کے سلسلہ میں یہ بات بالکل طئے شدہ ہے کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کی اتباع کی جائے۔ مصحف عثمانی کو اصطلاحاً "امام" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ کا اس پر اجماع ہے اور بالاتفاق ائمہ مجتہدین نے رسم الخط میں امام کی اتباع کو واجب قرار دیا ہے۔

چنانچہ علامہ السیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں لکھا:

" وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا. إلا على الكتبة الأولى۔ رواه الداني في المقنع ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة۔ وقال في موضع آخر: سئل مالك عن الحروف في القرآن مثل الواو و الالف أترى أن يغير من المصحف إذا وجد فيه كذلك؟ قال: لا، قال أبوعمرو: يعني الواو و الالف المزيدتين في الرسم المعدومتين في اللفظ نحو۔ اولوا۔ وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء او الف أو غير ذلك۔ وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا. فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوا شيئا۔ فإنهم كانوا أكثر علماء و أصدق قلبا و لسانا و أعظم أمانة منا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم..." (الاتقان في علوم القرآن للسيوطي ۲/ ۲۱۳،۲۱۲)

(اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا قرآن کریم کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں، جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا؟ فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے۔ اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالکؒ کا اس بارہ میں مخالف نہیں۔ اس کے بعد ایک موقع پر لکھا کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت حرام ہے، واو، یا، الف (زائدہ) میں جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھے جاتے ہیں۔ اور بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن کریم کی کتابت کرے، تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر صحابہؓ نے مصاحف لکھے ہیں۔ ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور زیادہ سچے دل اور زبان والے اور زیادہ امانت دار تھے، تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں)۔

مزید آگے علامہ السیوطی لکھتے ہیں:

"وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي؟ قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء. قال: و يحتمل الجواز. لأنه قد يحسنه من يقرؤه بالعربيه، و الأقرب المنع كما تحرم قرأته بغير لسان العرب. و لقولهم القلم أحدًا اللسانين و العرب لاتعرف قلمًا غير العربي، وقال تعالى: بلسان عربي مبين..." (الاتقان في علوم القرآن)۔

یعنی کیا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت جائز ہے؟ علامہ الزرکشیؒ نے اس سلسلہ میں فرمایا کہ میں نے اس بارہ مین کسی عالم کی تصریح نہیں دیکھی اور احتمال جواز کا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات غیر عربی رسم الخط کو وہ عجمی لوگ اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں، جو عربی پڑھ تو لیتے ہیں، مگر لکھنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن اقرب التحقیق تو یہ ہے کہ غیر عربی رسم الخط کو منع کیا جاوے، جیسا کہ غیر عربی میں قراءت کو منع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ قلم بھی ایک قسم کی زبان ہے اور عرب بجز عربی رسم الخط کے اور کوئی رسم الخط نہیں جانتے اور حق تعالی نے فرمایا ہے: "بلسان عربی مبین"۔

ان عبارات سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ قرآن کریم کا جو عربی رسم الخط ہے اس کو نہ بدلا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور دوسرے رسم الخط میں قرآن کی

کتابت کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس سے اصل متن قرآن کے معدوم ہوجانے اور ختم ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اگر غیر عربی رسم الخط میں عربی کے علاوہ دوسری اسکرپٹ میں قرآن کی اشاعت کی اجازت دے دی جائے تو جو حال توریت، انجیل، زبور کا ہوا تھا وہی حال قرآن کا بھی ہوسکتا ہے۔

اس لئے تنہا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کی جاتی ہے تو یہ حرام ہے، سخت گناہ ہے، اور اس جیسی کتاب کا پڑھنا، اس کا خریدنا اور فروخت کرنا، ہدیہ کرنا، نیز اس کی اشاعت میں کسی بھی قسم کی معاونت کرنا بھی ناجائز اور سخت گناہ کا باعث ہے۔

رہی بات غیر عربی داں حضرات کو تلاوت قرآن میں سہولت کی، اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ محض غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت تو ناجائز ہے، لیکن ساتھ میں اگر عربی عبارت، اصل متن قرآن بھی شامل اشاعت ہو تو ایسی صورت میں ترجمہ مع المتن پر قیاس کرتے ہوئے اس کی کچھ گنجائش ہوسکتی ہے۔ اس میں اس بات کا اہتمام ہونا چاہئے کہ قرآن کی ترتیب نہ بدلے...... اس کے مخارج کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے، نیز جو بھی اسکرپٹ اختیار کی جائے اس کی وجہ سے اصل قرآن، یعنی متن عربی جو دائیں سے بائیں کی طرف لکھا جاتا ہو، اس میں تغیر و تبدل نہ ہونے پائے، بلکہ اس کی رعایت باقی رہے.... اسی طرح مصحف کے صفحات دائیں سے بائیں جانب کھلتے ہیں، اس کی رعایت بھی باقی رہے۔

ان تمام حدود و قیود کا لحاظ کرتے ہوئے سخت ضرورت کے موقع پر یا ایسے مقام پر جہاں عربی کا بالکل بھی چلن نہ ہو، پڑھنے پڑھانے والے نہ ہوں یا عربی سیکھنے کے مواقع نہ ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ اصل متن قرآنی بھی ساتھ ہو غیر عربی اسکرپٹ یا غیر عربی زبان کے رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کی گنجائش ہے۔ اوپر عثمانی رسم الخط میں متن قرآن موجود ہو اور تحت میں غیر عربی رسم الخط میں قرآن ہو، اس طرز پر شائع کرنے کی اجازت ہوگی۔

مگر اس سلسلہ میں ایک مشورہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی جائے کہ عربی زبان کو قرآن کی تلاوت، اس کے مطالعہ کی حد تک سیکھنے کی کوشش کی جائے۔ یا اسلامی ادارے اس طرح کے مختصر مدتی کورس کا اہتمام کریں جس میں تلاوت اور مطالعہ کرنے کی حد تک عربی زبان کو سیکھا سکھایا جاسکے، کیونکہ آج تعلیمی میدان میں جدید انداز ایجاد کئے گئے ہیں جس سے کہ مختصر مدت میں آدمی بہت کچھ سیکھ لیتا ہے، انٹرنیٹ اور اس سے متعلق بہت سے ذرائع ہیں جس سے آج تعلیم کا حصول آسان ہے۔ عربی زبان بھی سیکھی جاسکتی ہے اگر اس کا اہتمام کیا جاسکے۔

لیکن آج آدمی کے پاس جب کہ وہ دنیا میں منہمک ہے اور اسلام سے دور بھی، وقت بہت کم ہے اور مشغولیات و مصروفیات اتنی ہیں کہ فرصت معدوم ہے۔ ایسی صورت اسلام کی، قرآن کی بات سمجھنے کے لئے آدمی کے اس کہاں سے وقت نکلے گا۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ عربی کو سیکھے، لیکن اگر وہ ایک غیر مسلم ہے تو اس کو کیا ضرورت کہ قرآن کو پڑھنے کے لئے وقت نکالے۔ اس لئے ایسے افراد اور جو عربی سیکھنے کی بالکل ہی قابلیت یا مواقع نہ رکھتے ہوں ان کے استفادہ لئے مع المتن، عربی متن کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت کی جاسکتی ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت اور اس کے احکام:

بریل کوڈ 1821ء میں ایجاد ہوا، اس کو فرانسیسی شہری "لوئیس بریل" نے ایجاد کیا، نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ اسی کے نام سے موسوم ہے۔

بریل کوڈ (Braille Code) یا بریل متھڈ (Braille Method) زبان، لسان یا لنگویج نہیں ہے، بلکہ وہ ایک نابینا افراد کے لئے اختیار کیا گیا، ایجاد کیا گیا ایک تیکنیکی تحریری طریقہ ہے۔ یہ سسٹم آف رائٹنگ جو صرف نابینا افراد یا کمزور بینائی والے افراد کو کسی کتاب کے پڑھنے یا اس کو یاد کرنے میں سہولت دیتا ہے اور اس سسٹم آف رائٹنگ کی مدد سے وہ کسی بھی کتاب کا آسانی کے ساتھ ٹیکنیکلی طور پر مطالعہ کرسکتے ہیں۔

بریل کوڈ میں حروف و حرکات کی کوئی خاص شکل نہیں، بلکہ یہ موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطے ہوتے ہیں جن کو انگلیوں کی مدد سے چھو کر محسوس کیا جاتا ہے۔ بریل کوڈ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ماہرین نے لکھا ہے کہ:

This is accomplished through the concept of a Braille cell consisting of raised dots on thick sheet of paper. The protrusion of the dot is achieved through a process of embossing. A cell consists of six dots arranged in the form of a rectangular grid of two dots horizontally and three dots vertically. With six dots arranged this way. One can obtain sixty three different patterns of dots. . A visually Handicapped person is taught Bra'lle by training him or her in discerning the cells

by touch, accomplished through his or her fingertips. The image below shows how this is done.Each arrangement of dots is known as a cell and will consists of at least one raised dot and a maximum of six.[55]

Actually, the braille method isn't a language , rather, it is a universally accepected system of writing used by and for blind persons and consisting of a code of 63 characters, each made up of one to six raised dots arranged in a six-possition matrix or cell. These braille characters are embossed in lines on paper and read by passing the fingers lightly over the manuscript. [56]

''قال الشيخ عمر بن محمد السبيل: ''إمام طريقة برايل، فليست حروفًا، و إنما هي طريقة يتعرف من خلالها على الحروف من خلال اللمس ''...(من احكام مس القرآن الكريم دراسة فقهيه مقارنه بحواله الاسلام سوال وجواب الشيخ محمد صالح المنجد)۔

چونکہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت والی کتاب بنایا ہے، اور کئی مقامات پر اس کتاب کو پڑھنے، تلاوت کرنے، بغور مطالعہ کرنے، سمجھنے اور اس کے ذریعہ اشیاء کی، کائنات کی معنویت کو جاننے اور ان کی حقیقت تک پہونچنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن محفوظ کو پڑھنے کے لئے جائز حدود میں رہ کر ہر ممکن طریقہ کو اپنا کر قرآن کی افادیت اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اس سے استفادہ کرنا بالعموم ہر انسان کا اور بالخصوص ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ اب انسانوں کا ایک طبقہ ''نابینا'' افراد کا ہے۔ ان پر تقریباً وہی احکام وارد ہیں جو عام دوسرے انسانوں بالخصوص مسلمانوں پر ہیں۔ یہ بھی قرآن کو پڑھنے، بغور مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے کے مکلف ہیں۔ پڑھنے اور تلاوت کرنے کے لئے جو بھی طریقہ ہوسکتا ہو اپنا کر قرآن کریم کی تعلیم کو حاصل کرنا ان کے لئے بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ عربی سے نابلد افراد کے لئے قرآن کو پڑھنے اور اس کے معانی ومفاہیم کو جاننے کے لئے بجائے عربی متن کے دوسری زبان کے ترجمہ کو پڑھنے کے فقہاء کی ایک جماعت نے عربی زبان کو سیکھنا لازم وضروری قرار دیا۔ اسی طرح بصارت وبینائی سے محروم افراد کے لئے اس بات کی گنجائش، بلکہ ایک مستحسن امر ہے کہ وہ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے عالمی سطح پر مقبولیت کا حامل سسٹم آف رائٹنگ ''بریل کوڈ'' سے مدد لیں۔ یعنی قرآن کے اصل الفاظ ومتن کی تلاوت میں اجر وثواب بھی ہے اور وہ الفاظ منزل من اللہ بھی ہیں، ان کی تلاوت میں جو برکت اور افادیت ہے وہ دوسری زبان کے الفاظ میں نہیں۔ اسی لئے فقہاء نے عربی کو سیکھنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اور یہاں بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت، اسکرپٹ ورسم الخط تو ٹیکنیکلی ہے، مگر اس کی قرآت یا صوتی پیرائیہ عربی ہی کا ہے۔ لکھائی تو ڈاٹس میں، نقطوں میں ہوگی، مگر اس کو پڑھا عربی ہی میں جائے گا۔ لہٰذا ایسی اسکرپٹ میں قرآن کا شائع کرنا معذور افراد کے لئے ایک مستحسن اقدام ہی ہوگا۔

بینائی سے محروم افراد کے لئے بریل کوڈ ایک نعمۃ عظمیٰ ثابت ہوا ہے، کیونکہ اس سے قبل ان کے لئے کسی کتاب کے پڑھنے کا تصور نہیں تھا۔ زبانی واملائی تعلیم ان کے لئے بھی اور حفظ ہی ان کی تعلیم کا مرکز تھا، مگر ہر کوئی حافظہ میں تیز ہو اور محض حافظہ کے زور پر تعلیم کو حاصل کرے یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ مگر بریل کوڈ کی ایجاد نے اس طبقہ پر تعلیم کے، بلکہ پڑھنے ومطالعہ کرنے کے دروازے کھول دئے۔ لہٰذا اب کوئی بھی کتاب یا مواد نیز قرآن کی تلاوت اس کوڈ کی مدد سے بآسانی ایک نابینا شخص کرسکتا ہے۔

بریل قرآن کو چھونے اور پڑھنے کا حکم:

الشیخ محمد صالح المنجد لکھتے ہیں:

''طريقة ''برايل'' نسبة الى رجل فرنسي اسمه ''لويس برايل'' وهو نظام كتابي يساعد المكفوفين على القراءة عن طريق حاسة اللمس ... كتابة القرآن بطريقة ''برايل'' لاتأخذ حكم المصحف، من جهة وجوب الطهارة۔ فيجوز مسه مع الحدث۔ جاء في تقريرات الشيخ محمد إبراهيم آل الشيخ رحمه الله: ترجمة المصحف بغير العربية، لايثبت لها احكام المصحف من الحرمة، و كذالك ما يكتب للمكفوفين۔(انتهى من فتاوى و رسائل محمد إبراهيم ال الشيخ۔ فأجاب رحمه الله (الشيخ ابن باز رحمه الله) ليس بقرآن هذا هذا شبه ترجمة۔ فلا ينطبق عليه حكم المصحف يجوز لمسه للمحدث و الجنب...الخ ''(الاسلام سوال وجواب الشيخ محمد صالح المنجد)۔

جارڈن کے جنرل افتاء ڈیپارٹمنٹ کی ویب سائٹ پر اس سلسلہ کا فتویٰ موجود ہے..... چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ:

Based on the aforementioned, it is permissible to write the words of the Quran using Braille`s system of writing. Therefore, if you are actually reading the Quran through these inscriptions, then the rulings of the Noble Mushaf apply to it as it includes that which indicates the Quran as the Arabic characters drawn on it show. This way, the pages included in it make up the Mushaf, and so it takes the same rulings of the Quran with regard to the impermissibility of holding, or touching it by a ritually impure person; particularly since those inscriptions were made on those pages as a Quran. Imam Al-Qalubi said: "It is permissible to write it in a language other than Arabic, and it assumes the same rulings as regards holding, moving and touching ."{Hashiat`a Qalubi wa Omairah(1/41)}.However, if what is read through the raised dots of Braille`s writing system weren`t Quran such as non-Arabic words that reflect a translation of the Holy Quran, then the inscribed-upon pages don`t have the rulings of Mushaf.

We advise the people in charge of printing Mushafs in Braille`s writing system to dignify them, and provide them with hard covers. They should also indicate on both covers of the Mushaf that it contains chapters and verses of the Holy Quran, so that it is handled with care and respect. And Allah knows best.[61]

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ کتابت قرآن بطریق بریل وجوب طہارت کی جہت سے مصحف کے حکم میں نہیں آتا۔ چنانچہ اس کو بغیر وضو کے چھونا جائز ہے۔ مزید یہ کہ یہ ترجمہ سے مشابہ ہے۔ الشیخ صالح المنجد، الشیخ الصاوی اور الشیخ السبیل؛ تینوں نے یہاں جو حکم لگایا ہے وہ محض بریل کوڈ والے قرآن پر ہے، جس میں رسم عثمانی کی رعایت نہ کی گئی ہو۔ جب کہ جارڈن کے شعبۂ افتاء نے اپنے فتویٰ میں رسم عثمانی، یعنی الفاظ قرآنی اگر پڑھنے میں آتے ہوں تو وہ مصحف کے حکم میں ہے، اس کو بلا وضو چھوا اور پڑھا نہیں جاسکتا اور اگر بجائے عربی کے دوسری زبان کے الفاظ میں قرآن ہو اور عجمی الفاظ پڑھنے میں آتے ہوں تو وہ مصحف کے حکم میں نہیں ہے۔ اس کو بغیر وضو کے چھو سکتے ہیں اور پڑھ بھی سکتے ہیں۔

ان عبارات اور فتاویٰ کی روشنی میں اب بریل قرآن کے حکم سلسلہ میں تفصیل یہ ہے:

۱- قرآن "عربی بریل کوڈ" میں "رسم عثمانی" کے ساتھ ہو۔

۲- قرآن محض "عربی بریل کوڈ" میں یعنی "رسم عثمانی" کی رعایت کے بغیر ہو۔

۳- قرآن محض "بریل کوڈ" میں ہو۔

۴- قرآن کا ترجمہ "عجمی زبانوں" کے "بریل کوڈ" میں ہو۔

۱- عربی بریل کوڈ میں بہ رعایت رسم عثمانی تیار شدہ قرآن اصل قرآن کریم کے حکم میں ہے۔ اس پر وہی احکام مرتب ہوتے ہیں جو مصحف عثمانی پر ہیں۔ اس کو چھونے، اٹھانے اور پڑھنے کے لئے وضو لازم ہے۔

۲- بغیر رسم عثمانی کی رعایت کئے بریل قرآن (عربیک بریل ہی میں کیوں نہ ہو)، اصل قرآن کے حکم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کو چھونے، اٹھانے اور پڑھنے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں ہے۔

۳- قرآن محض بریل کوڈ میں ہو۔ عربی نہیں غیر عربی بریل کوڈ میں ہو تو ایسی صورت میں اس کا حکم ترجمہ سے مشابہ ہے۔ اس کو چھونے، اٹھانے اور پڑھنے وغیرہ

کے لئے وضو کی ضرورت نہیں۔

۴- اور اگر بریل کوڈ میں قرآن کا ترجمہ ہے، عربی بریل کے علاوہ عجمی زبانوں کی رعایت میں اس کو تیار کیا گیا ہے، اور عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں اس کو پڑھا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں وضو کی ضرورت نہیں۔

موبائیل کی اسکرین پر ابھرے ہوئے قرآن مجید کو چھونے کا حکم:

آج کل موبائیل کی دنیا میں ایک قسم آنرائڈ (android) کا بہت زیادہ رواج ہے۔ آئی فون، اسکرین ٹچ فون بہترین سے بہترین ایجاد ہو چکے ہیں۔ ان کا استعمال بھی عام ہو چکا ہے۔ اس کے استعمال میں قرآن مجید کو ڈاؤن لوڈ کرنا بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کے لئے یہ سہولت ہوگئی ہے کہ اپنے اپنے موبائیل میں قرآن کریم کو ڈاؤن لوڈ کریں، تاکہ دوران سفر کہیں بھی اس کی تلاوت کی جاسکے۔

قرآن کا اپلیکیشن ہوتا ہے جو موبائیل فون کی میموری میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس کو جب چاہے کھول کر قرآن کریم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ سوالنامے میں ذکر کردہ صورت، یعنی موبائیل فون کی اسکرین پر قرآن کریم موجود ہو، یعنی نمودار ہو تو اس کو ہاتھ لگانے کے لئے یا اس وقت فون کو ہاتھ میں لینے یا پکڑنے کے لئے کیا وضو کی ضرورت ہے؟

اس صورت میں قرآن کریم موبائیل کی میموری (Memory) میں موجود ہے، مگر اپلیکیشن آف (Application off) ہے، قرآن ڈیسپلے (Display) پر موجود نہیں ہے، اسکرین (Screen) پر نمودار نہیں ہے تو ایسی صورت میں فون کو بغیر وضو ہاتھ میں لیا اور استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور اس فون کو جیب وغیرہ میں رکھ کر بیت الخلاء وغیرہ بھی جایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ محض قرآن کو موبائیل میں محفوظ کر لینے سے وہ (موبائیل) قرآن کی تعریف میں نہیں آتا۔

چنانچہ صاحب ترجمۃ القرآن لکھتے ہیں:

إن أجمع و أوضح ما قيل فى القرآن، وهو قول الإمام الآمدى؛ إن الكتاب هو القرآن المنزل... الخ۔ قال الإمام البزدوى: أما الكتاب فالقرآن المنزل على رسول الله المكتوب فى المصاحف المنقول عن النبى ﷺ نقلا متواترًا بلا شبهة وهو النظم و المعنى جميعًا فى قول عامة العلماء... (ترجمة القرآن الكريم ا/ ۸۴)۔

البتہ جب قرآن اسکرین پر ابھرا ہوا ہو تو اس وقت فون کو ہاتھ میں لینے کے لئے تو وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب اسکرین کو چھونا ہو یا قرآن کی تلاوت کی نیت سے اسکرین کو ٹچ کیا جاتا ہو تو ایسی صورت میں وضو کی ضرورت ہے بغیر وضو اسکرین کو چھونا جائز نہیں ہے۔

كما فى الفقه الاسلامى: قال الحنفية: ''يحرم مس المصحف كله أو بعضه أى مس المكتوب منه، ولو آية على نقود (درهم ونحوه) أو جدار، كما يحرم مس الغلاف المصحف المتصل به، لأنه تبع له، فكان مسه مسًا للقرآن'' (الفقه الاسلامى وأدلته ۱/ ۲۹۶)۔

اسکرین کو ٹچ کئے بغیر بھی اگر تلاوت کی نیت سے قرآن کو پڑھا جائے، تب بھی وضو ضروری ہے۔ ہاں اسکرین کو ٹچ کئے بغیر قرآن کو دعا کے طور پر اگر پڑھا جاتا ہو تو ایسی صورت میں وضو کی ضرورت نہیں۔ كذا فى الفقه الاسلامى و ادلته: '' و أتفق الفقهاء على أن غير المتوضى يجوز له تلاوة القرآن أو النظر إليه دون لمسه... والفضل التوضوء...'' (حوالہ سابق)۔

موبائیل فون کی اسکرین پر قرآن نہ ابھرا ہو تب وہ (موبائیل فون) ایسے غلاف کے حکم میں ہوگا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن اگر قرآن اسکرین پر ابھرا ہوا ہو تب فون کو ہاتھ میں بغیر وضو کے چھونا تو جائز ہے، مگر اسکرین کو چھونا جائز نہیں۔ كذا فى الفقة الإسلامى و ادلته: ''ولا يحرم مس الغلاف عن القرآن كالكيس و الصندوق، ويجوز مسه بنحو عود أو قلم أو غلاف منفصل عنه... الخ'' (حواله مذكور)۔

☆☆☆

بغیر عربی متن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا محمد عثمان بستوی[1]

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز وحرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے، اور جبکہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گنہگار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا، لقولہ تعالیٰ "ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها" (سورۂ نساء:۸۵)۔

روایات جن سے حکم مذکور ثابت ہے حسب ذیل ہیں:

علامہ حسن شرنبلالی صاحب "نور الایضاح" کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر جس کا نام "النفحة القدسیة فی احکام قراءة القرآن وکتابته بالفارسیة" ہے، اس میں انہوں نے مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآن عربی کے لکھا جاوے جس کی عبارت یہ ہے:

"وأما کتابة القرآن بالفارسیة فقد نص علیها فی غیر ما کتاب من کتب أئمتنا الحنفیة المعتمدة منها ما قاله مؤلف الهدایة الإمام الأجل شیخ مشائخ الاسلام حجة الله تعالیٰ علی الأنام برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی الکبیر رحمه الله تعالیٰ فی کتابه "التجنیس والمزید" ما نص: ویمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالإجماع؛ لأنه یؤدی للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنی. فإنه دلالة علی النبوة: ولأنه ربما یؤدی الی التهاون بأمر القرآن انتهی" (جواہر الفقہ ۱/ ۹۵، مجموعہ رسائل لکھنوی رسالۃ اوامر الاذکار بلسان الفارس ۲/ ۵۱)۔

یہی رائے شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی بھی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: مجموعہ رسائل لکھنوی ۴/ ۸۴ ۳ رسالہ اداء الاذکار بلسان الفارس، ص ۵۲، مغنی مع الشرح الکبیر ۱/ ۵۲۶)۔

اور اسی سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کا ایک فتوی درج ذیل ہے جس سے حکم بالا کی تائید ہوتی ہے:

نصوص صحیحہ نے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے "من تشبہ بقوم فهو منهم" (ابوداؤد کتاب اللباس ۲/ ۵۵۹) میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو کفار میں سے شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا۔

دوسری حدیث "لتر کبن سنن من کان قبلکم" (ترمذی ابواب الفتن ۱/ ۱۴۱) میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا، اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے امر میں جو عرفا وعادۃ ان کے خصائص میں سے ہے، سر اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے، پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے، حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت: "یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" (سورۂ بقرہ:۲۰۸) نازل ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبتل اور ترہب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے' مشکوۃ کتاب النکاح و کتاب

[1] جامعہ ریاض العلوم، گوریни، جونپور۔

الاعتصاء "لاتشددوا علی أنفسکم" (الحدیث) اور اس میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ ہے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ذات الانواط کی درخواست پر کیسا زجر فرمایا تھا؟ یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے، اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ اس میں اور مفاسد مالیہ شدیدہ بھی محقق ہیں، مثلاً خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہو جانے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض اور اس کا اخلال حرام ہے، اور ترجمہ اور تفسیر کا اصل سے مجرد نہ ہونا مقدمہ اور سبب ہے حفاظت کا، اور اصل سے مجرد ہونا مقدمہ اور سبب ہے اخلال کا اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام ہے، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے، محققان دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں، حضرات شیخینؓ نے بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا، اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا، پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع تھا، اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے اور اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا، جیسا حدیث میں ہے:

"امتھوکون أنتم کما تھوکت الیھود والنصاری" (مشکوۃ ص۲۲)۔

نیز چنانچہ اس جواب کے لکھنے سے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی، بلکہ سب نے شدید انکار کیا، باوجودیکہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی، جس حاجت کی بناء پر اب ایسا کیا گیا ہے، تو باوجود اس کے تمام امت کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی، اس امر کے مذموم ومنکر ہونے پر جس میں یہ احادیث وارد ہیں:

"إن الله لایجمع أمتی علی الضلالة، وید الله علی الجماعة، ومن شذ شذ فی النار، واتبعوا السواد الأعظم" (مشکوۃ المصابیح)

اور مثلاً اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے، اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی انکے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں، اور پھر قرآن سے بالکل ہی بے تعلق ہو جاویں گے، اور بے ساختہ یہ آیت ان پر صادق آنے لگے گی:

"نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" (سورۃ البقرۃ:۱۰۱)۔

اور مثلاً اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے، اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں، تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہونچتا، اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جاویں گے، اور اصل نظروں سے غائب ہوگی، تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا، بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے، یہ اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے لے کر آپس میں لڑیں گے اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں، جو مدار ہو سکتا ہے فیصلہ کا، پس اس آیت کا مضمون ظاہر ہو جاوے گا:

"وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ" (سورۂ بقرۃ:۲۱۳)۔

اور مثلاً اب تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے، قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت وبلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں، اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے، نیز کسی مترجم کو ہمت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہو سکتی، کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا۔ اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے، کسی کا تابع نہ سمجھیں گے، اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی، خصوص مترجمین ہی کا مطبوع مستقل ہو جانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی، اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا۔ کیوں کہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی۔

کما قال اللہ تعالی: "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (سورۂ توبہ:۳۱)

اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں جن کو انشاء اللہ علماء ظاہر کریں گے، اس لئے جا بجا لفظ مثلاً لایا گیا ہے، اس وقت دس ہی وجوہ پر جس کو عشرۃ کاملہ کہا جا سکتا ہے، اکتفا کیا جا سکتا ہے، مگر کاملہ کا خاتمہ ہونا لازم نہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالی کا ارشاد ہے: "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورۂ مائدہ:۲)، اور فقہاء نے اسی قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے، کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام

ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے، اسی طرح ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو پھر ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جاوے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا۔ پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی۔ ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۱۱۲، امداد الفتاوی ۴/ ۳۹ تا ۴۲)۔

غیر عربی میں قرآن کریم کی کتابت:

قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توفیقی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے اس میں قراءت سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، لہذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے طریقہ یہ تھا کہ جب کلام پاک کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر لکھواتے اور ہر لفظ کا رسم الخط کاتب وحی کو تعلیم فرماتے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معرفت سیکھتے تھے جب خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے دور خلافت میں یہ طے ہوا کہ جو آیتیں اور سورتیں لکھی ہوئی مختلف حضرات کے پاس ہیں ان سب کو کتابی صورت میں ایک جگہ کر دیا جائے تو کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے بڑی احتیاط اور پوری توجہ سے اسی اصلی رسم الخط کے مطابق جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھا گیا تھا پورا قرآن شریف لکھا اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن لکھوایا تو انہی کاتب الوحی حضرت زید بن ثابتؓ کو وہ عظیم الشان خدمت سپرد ہوئی، جبکہ پچاس ہزار صحابہ موجود تھے، لہذا اس مصحف عثمانی کے رسم الخط کا خلاف کرنا جائز نہیں ہے، چاروں ائمہ اس رسم الخط کو ضروری مانتے ہیں، خدا پاک کا ارشاد ہے:

"إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (الحجر: ۹) (ہم ہی نے قرآن نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں)۔

مذکورہ ارشاد میں صرف قرآنی الفاظ کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ الفاظ معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا وعدہ اور پیشنگوئی ہے، لہذا اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، معانی اور علوم القرآن کی حفاظت میں علماء دین مشغول ہیں تو الفاظ عبارت اور طرز ادا کی حفاظت میں قراء منہمک ہیں اور رسم الخط کی حفاظت کاتبین قرآن کر رہے ہیں جن کی پیروی ہم پر لازم ہے (فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۲۱۳، ۲۱۸، ۲۲۶)۔

قرآن کریم کے رسم الخط میں قیاس کا دخل نہیں اس کی چند مثالیں:

جس وقت حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی قیادت میں مصحف قرآنی مرتب کرنے کے لئے صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، تو ان سے فرمایا تھا:

"إذا اختلفتم أنتم وزید بن ثابت في شئ من القرآن فاکتبوه بلسان قریش فإنما نزل بلسانهم"۔

اس ہدایت کے بعد صحابہؓ کی جماعت نے جب کتابت قرآن کا کام شروع کیا تو پورے قرآن کریم میں ان کے درمیان صرف ایک اختلاف پیش آیا، جس کا ذکر امام زہری نے اس طرح فرمایا ہے:

"واختلفوا یومئذ في التابوت والتابوة، فقال النفر القرشیون، التابوت، وقال زید بن ثابت: التابوة فرفع اختلافهم إلی عثمان فقال اکتبوه التابوت، فإنه بلسان قریش نزل" (علوم القرآن: ص ۱۴۳)۔

حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ کے پاس وحی لکھتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی املاء کرانے کے بعد فرماتے "پڑھ کر سناؤ" میں کچھ لکھا ہوتا، پڑھ کر سناتا، اگر کہیں چھوٹ جاتا تو آپ درست فرما دیتے، اس کے بعد میں اس کو لے کر لوگوں کے پاس آتا (مجمع الزوائد: ۸/ ۲۵۷)۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آیات نازل ہوتیں تو کاتبین وحی میں سے موجود بعض صحابہؓ کو بلاتے اور ان سے ارشاد فرماتے: اس آیت کو فلاں سورہ میں اس جگہ لکھو جہاں ایسا ذکر ہے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دو آیتیں نازل ہوتیں تب بھی ایسا فرماتے (ابوداؤد حدیث/ ص ۷۸۶، ترمذی حدیث ۳۰۸۶)۔

خلاصہ:

مذکورہ بالا تفصیل سے اچھی طرح یہ واضح ہوگیا کہ رسم عثمانی توقیفی ہے قیاسی نہیں اس کی اتباع باتفاق ائمہ اربعہ واجب ہے، لہذا اس کی مخالفت کسی بھی طرح جائز نہیں خواہ صرف ترجمہ کی اشاعت کرکے کی جائے یا زبان عربی کو ہندی انگریزی رسم الخط میں تبدیل کرکے کی جائے جیسا کہ اس فتنہ زا زمانہ میں اس کا بھی شیوع ہے کہیں انگریزی رسم خط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے کہیں ہندی اور گجراتی میں جو باجماع امت ناجائز ہے، خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم خط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہوگی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمت اسلام سمجھ کر کیا جارہا ہے اور اس کے لئے بہت سی مصالح دینیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ ضرورت، کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اس طرح حاصل ہوتی آئی ہیں کہ ہر ملک وقوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انہوں نے بدون رسم الخط تبدیل کرنے کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں اور ایسا پڑھا کہ انہیں اہل عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کی قراءت وتجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کئے جائیں تو ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماع امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا اور حفاظت قران کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمان اور دوسرے صحابہ کرام نے ان مصالح کی طرف نظر نہیں فرمائی حالانکہ یہ مصالح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں، کیونکہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا ہے، مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن نہ تھا، کیونکہ خود کاتب قرآن زید بن ثابتؓ مختلف زبانیں جانتے تھے، مگر اس کے باوجود کتابت قرآن میں خاص خاص ملکی مصالح کو نظر انداز کر کے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں بھیجے (جواہر الفقہ ۱/۱۱۰)۔

عربی متن قرآن کے ساتھ کسی دوسری زبان میں قرآن کی کتابت کا حکم:

اس سلسلہ میں حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ کا ایک فتوی درج کیا جاتا ہے، جس میں عربی رسم الخط کے ساتھ ملا کر دوسری رسم الخط میں لکھنے کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی گئی ہے وہ فتوی درج ذیل ہیں؛

''سیوطی نے ''اتقان'' میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی نے غیر عربی میں قران پاک کی کتابت کو جائز نہیں قرار دیا ہے:

''وفی الاتقان للسیوطی: لم یجوز أحد من الائمة الأربعة کتابة القرآن بغیر العربیة''.

البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں، ان کی تعلیم وتلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سرخوش وسرصفحہ نمایاں کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی عظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً: س، ث، اور ز، ذ، ظ، ض اور ہمزہ، ع وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً: حروف زوائد (الف لام) اور مد وجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے۔

ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہوجائے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کریم کے ساتھ تابع بن کر لکھ دی جاتی ہیں اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف ترجمہ قرآن یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۴۲۸-۴۲۹)۔

گنجائش کا پہلو حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ کے فتوی کے مطابق تبلیغی اور دعوتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ترجمہ قرآن کریم کی طرح عربی اور غیر عربی دونوں رسم الخط ملا کر لکھنے کی گنجائش ہے۔

''قال العلامة الکھنوی: لو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یحرم علی الجنب والحائض مسه بالإجماع وھو الصحیح، وتحی ھذه المسئلة بحث طویل کافی وشافی فی رسالة أداء الأذکار بلسان الفارس'' (مجموعہ رسائل لکھنوی ۴/۲۹)۔

ترجمہ قرآن یا غیر عربی رسم الخط والے قرآن کریم کا بغیر وضو چھونا:

قرآن کریم کا صرف ترجمہ ہو یا غیر عربی رسم الخط والا قرآن ہو کسی بھی بلاوضو ہاتھ لگانا شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے اپنے مفصلہ فتویٰ میں درج ذیل جزئیات سے استدلال کیا ہے:

"ولو كان القرآن مكتوبًا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح، هكذا في الخلاصة وفيه أيضًا: إذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا أخبر السامع أنه قرأ آية السجدة" (ہندیہ)۔

"وهذه الجزئية الثانية تؤيد الأولى حيث وجب سجدة التلاوة بقراءة القرآن بالفارسية فعلم منه أن الترجمة بالفارسية لاتخرج القرآن عن كونه قرآنا حكما فلا يجوز مسه للمحدث" (امداد الفتاوی، فتاوی رحیمیہ)۔

بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت:

نابینا کے تعلیم و تعلم کے لئے جو رسم الخط ایجاد کیا گیا ہے اس میں قرآن کریم کی کتابت کو "محمود الفتاوی" (۴؍۱۵۴) میں رسم الخط بدلنے اور رسم عثمانی کے ترک کی وجہ سے ناجائز کہا گیا ہے، لیکن بندہ کا رجحان جواز کی طرف ہے جس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- "الضرورات تبيح المحظورات" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم) کے ضابطہ سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ رسم عثمانی نقطہ اعراب اور تعشیر سے خالی تھی، لیکن عجمیوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر اس کو جائز کہا گیا ہے، چنانچہ "علوم القرآن" میں ہے کہ مصاحف عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے اور عمومی رواج کے علاوہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ اس رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما سکیں لیکن بعد میں عجمی اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی سہولت کے لئے قران کریم پر نقطے ڈالے گئے، نقطوں کی طرح شروع میں قران کریم پر حرکات (زیر زبر پیش) بھی نہیں تھیں بعد میں خلیل ابن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں

"وأول من وضع الهمز والتشديد والروم والاشمام الخليل" (الاتقان ۲؍۲۱۸)

اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحیٰی بن یعمر، نصر بن عاصم اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی موجودہ صورتیں (ـَ ـِ ـُ) مقرر کی گئیں تا کہ حروف کے ذاتی نقطوں سے ان کا التباس پیش نہ آئے۔

قرون اولی کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ خمس یا خ اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ عشر یا ع لکھ دیتے تھے پہلی قسم کی علامتوں کو اخماس اور دوسری قسم کی علامتوں کو اعشار کہا جاتا تھا، علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے۔

"واخرج ابن أبي داؤد عن الحسن ابن سيرين أنهما قال: لا بأس بنقط المصاحف وأخرج عن ربيعة بن أبي عبدالرحمن أنه قال: لا بأس بشكله، وقال النووي: نقط المصحف وشكله مستحب؛ لأنه صيانة له من اللحن والتحريف"۔

"وأخرج أبوعبيد عن النخعي أنه كره نقط المصاحف وعن ابن مسعود ومجاهد أنهما كرها التعشير وأخرج أبن ابي داؤد عن النخعي أنه كان يكره العواشر والفواتح" (الاتقان ۲؍۲۱۸)۔

۲- رسم عثمانی کے علاوہ دیگر رسوم کی ممانعت کی ایک اہم علت تحریف ہے اور ظاہر ہے کہ بریل کوڈ کو عرفاً تحریر سمجھا ہی نہیں جاتا، لہذا اس کے قرآن ہونے کا احتمال و شبہ بھی نہ ہوگا تو تحریف کا بھی شبہ نہ ہوگا۔

۳- اشارات کے لئے موضوع نقوش اور علامات کو الفاظ و عبارت کا حکم نہیں دیا جاسکتا ہے، جیسے ہندسے اور حرکات کو کسی نے بھی الفاظ کے قائم مقام نہیں مانا ہے، مثلاً ۷۸۶ کے نقش کو بسم اللہ کے لئے لکھا جاتا ہے، لیکن کسی نے بھی اس کو بسم اللہ کے قائم مقام نہیں مانا ہے، اسی طرح بریل کوڈ کو الفاظ کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

۴- بریل کوڈ یہ الفاظ نہیں، کیونکہ الفاظ وہ ہوتے ہیں جو لکھنے اور پڑھنے میں یکساں ہوں، یعنی جو لکھا جائے وہی پڑھا بھی جائے، جیسے الفاظ ہندی، انگریزی، عربی فارسی وغیرہ اور بریل کوڈ لکھنے اور پڑھنے میں یکساں نہیں اس کے لکھنے اور پڑھنے کی الگ الگ نوعیت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس کی لکھاوٹ ایک علامت ہوتی ہے، پس اس علامت کی مدد سے الفاظ ادا کئے اور پڑھے جاتے ہیں، اور جب یہ کوڈ الفاظ کا حکم نہیں رکھتے ہیں تو قرآن بھی نہیں بنیں گے اور جب قرآن نہیں بنیں گے تو اس کا لکھنا بھی جائز ہوگا۔

۵- بعض اقوال ضعیفہ کے مطابق رسم عثمانی کے علاوہ دوسری رسم الخط میں قرآن لکھنے کی اجازت ہے اور ضرورت ومجبوری کے وقت اقوال ضعیفہ پر بھی عمل کی گنجائش ہوتی ہے۔

'لکن ربما عدلوا عما اتفق علیه ائمتنا لضرورة ونحوها کما مر فی مسئلة الاستئجار علی تعلیم القرآن ونحوه من الطاعات، فحینئذ یجوز الافتاء بخلاف قولهم'' (شرح عقود رسم المفتی/ ص۱۱۹)۔

۶- مفتی نظام الدین صاحبؒ نے اگر عربی رسم الخط کے ساتھ دیگر رسم الخط میں پڑھنے کے لئے قرآن لکھا جائے تو اس کی اجازت دی ہے اسی طرح اگر نزاع اور اختلاف سے بچنے کے لئے اصل قرآن متن بھی لکھ دیا جائے تو اختلاف بھی ختم ہوسکتا ہے۔

حاصل یہ کہ بریل کوڈ درحقیقت الفاظ نہیں بلکہ علامات اور اشارات ہیں اور علامات واشارات پر قرآن ہونے کا حکم عائد نہ ہوگا، لہذا اس میں کتابت کی ممانعت نہ ہوگی۔

''اذ لایخرج بذلك عن کونه قرآنا والالم تحرم کتابته'' (جواہر الفقہ۱/ ۱۰۲ مجموعہ رسائل لکھنوی)۔

''والمفهوم منها أنه إذاخرج عن کونه قرآنا لم تحرم کتابته''، کیونکہ یہ صورت اختلافی اور نزاعی نہ رہے گی۔

''قال العلامة الشیخ الکهنوی فی رسالة أداء الأذکار بلسان الفارس''۔

''رجل لایقدر علی تعلیم القرآن بالنظم العربي ویقدر علیه بلغة أخری یفترض علیه تعلمه؛ لأن القرآن لایختص بالعربي عند أبي حنیفة وعندهما تجوز القرآن بغیر العربیة إذا کان لایحسن العربیه فیفترض علیه ذلك بالإجماع فی هذه الحالة'' (مجموع رسائل لکھنوی:۳۸۶)۔

موبائل میں لوڈ قرآن کریم سے متعلق احکام:

اس کا حکم لکھے جانے سے قبل چند اصولی باتیں لکھی جاتی ہیں:

۱- عکس وتصویر کی تعریف:

تصویر وہ ہوتی ہے جس کو کسی چیز پر علی صفت الدوام ثابت اور مستقر کر دیا جائے، عکس وہ ہوتا ہے جو کسی چیز پر علی صفت الدوام ثابت اور مستقر نہ ہو (درس ترمذی ۵/ ۳۵۱)۔

۲- میموری میں محفوظ پروگرام مکتوب ومنقوش نہیں ہوتے ہیں، میموری میں جو پروگرام لوڈ رہتے ہیں وہ مکتوب ومنقوش نہیں ہوتے اور اس کی مثال وی ڈیو کیسٹ جیسی ہے، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب ویڈیو کیسٹ کے پروگرام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ پروگرام جو ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ دکھائے جاتے ہیں، یعنی ایک تقریر اور اس کی تصاویر کے ذرات کو لے کر ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کرلیا پھر ان ذرات کو اسی ترتیب سے چھوڑا تو پھر وہی منظر اور تصویر نظر آنے لگی، میرے نزدیک اس کو تصویر کہنا مشکل ہے، اس لئے کہ جو چیز ویڈیو کیسٹ میں محفوظ ہوتی ہے وہ صورت نہیں ہوتی، بلکہ وہ برقی ذرات ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر ویڈیو کیسٹ کو خوردبین لگا کر بھی دیکھا جائے تو اس میں تصویر نظر نہیں آئے گی، اس لئے میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ قسم تصویر کے حکم میں نہیں آتی (درس ترمذی ۵/ ۳۵۲)۔

۳- میموری موبائل کے اندر لگی رہتی ہے اور موبائل کی باڈی کو بآسانی الگ کیا جاسکتا ہے، لہذا موبائل کی باڈی میموری کے لئے بکس اور صندوق کے مانند ہے

''ويحرم به أي بالأكبر وبالأصغر مس مصحف إلا بغلاف متجاف غير مشرز أو بصرة، به يفتى'' (الدر مع الرد ۱/ ۳۱۵)

۴- اگر کسی کاغذ تختی یا دیوار وغیرہ پر قرآن کریم کی کچھ آیتیں مکتوب اور لکھی ہوئی ہوں تو قرآن کریم کے الفاظ کے علاوہ بقیہ حصوں پر بغیر وضو کے ہاتھ لگانا شرعاً جائز ہے، ''لا يحرم في غير مصحف إلا بالمكتوب أي موضع الكتابة'' (۱/ ۳۱۵-۴۸۸)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے درج ذیل احکام معلوم ہوئے:

۱- موبائل کے پروگرام میں جو قرآن کریم لوڈ رہتا ہے جب تک اس کو اسکرین پر ظاہر نہ کیا جائے، اس وقت تک اس پر قرآن کا حکم عائد نہ ہوگا جیسا کہ ۲ کی تفصیل سے معلوم ہوا، لہٰذا وہ موبائل جس کی اسکرین پر قرآن ظاہر نہ اس کو بلا وضو ہاتھ لگانا اور استنجاء خانے وغیرہ میں لے کر جانا شرعاً جائز ہے، اسی طرح سے قرآن کریم والی میموری وغیرہ کا بھی یہی حکم ہوگا۔

۲- اگر قرآن کریم کی آیتیں اسکرین پر ظاہر ہوں تو اصولاً وہ عکس کے حکم میں ہیں، جیسا کہ ا سے معلوم ہوا، لہٰذا اسکرین پر ظاہر ہونے والی آیات کو اصولی اعتبار سے بلا وضو مس کی اجازت معلوم ہوتی ہے، نیز اگر اس کو قرآنی عکس نہ مان کر مکتوب قرآن مانا جائے تو موضع نقش وکتابت کو چھوڑ کر بقیہ حصہ کو بلا وضو چھونے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ ۳، ۴ سے معلوم ہوا۔

قرآن کریم کی عظمت کو قائم ودائم رکھنا ایک اسلامی ودینی وشرعی فریضہ ہے اور جو چیزیں قرآنی عظمت کے فوت ہونے کا سبب اور ذریعہ بن سکتی ہوں ان کو سد اللباب ناجائز ہی کہا جائے گا، کیونکہ حضرات فقہاء بہت سے جائز امور کو صرف سد اللباب ہی ممنوع قرار دیا ہے۔

''فإذا حرم رب العالمين شيئا وله طرق ووسائل تفضي إليه فإنه يحرمها ويمنع منها تحقيقا لتحريمه وتثبيتا له ومنعا أن يقرب حماه. ولو أباح الوسائل والذرائع المفضية إليه لكان ذلك نقضا للتحريم واغراء للنفوس به'' (اعلام الموقعین ۳/ ۱۳۵)۔

لہٰذا اگر اسکرین پر ظاہر ہونے والی آیات کو قرآن کریم کی طرح سے بلا وضو چھونے اور استنجاء خانہ وغیرہ میں لے جانے سے منع نہیں کیا گیا تو یہ سبب ہوگا قرآن کی عظمت کے فوت ہونے اور دلوں سے اہمیت کے نکل جانے کا، اس لئے اس مصلحت کے پیش نظر اسکرین پر ظاہر قرآن پر شرعاً بلا وضو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ ہوگی، اسی طرح کسی بھی طرح کی بے ادبی والی تمام چیزیں حرام وممنوع ہوں گی۔



قرآن مجید کے رسم و ترجمہ کے بعض مسائل واحکام

مفتی محمد حذیفہ داحودی[1]

۱- بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت

کسی زبان میں متن قرآن کے بغیر صرف ترجمۂ قرآن لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

شامی میں ہے: ''إن اعتاد القراءة بالفارسية وأراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز۔'' (الدر والرد، مطلب بيان المتواتر بالشاذ ۱۸/۲)

کیوں کہ:

☆ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کا نام ہے، جیسا کہ اصولیین کی تصریح ہے:

''هو اسم للنظم والمعنى جميعا۔'' (المنار مع شرحه نور الانوار: ۱۱)

اس لئے قرآن کے معانی کی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود اور اس کی حفاظت بھی فرض ہے، جبکہ صرف ترجمہ کی اشاعت سے الفاظ کی حفاظت میں خلل واقع ہوگا، چنانچہ اگر صرف ترجمہ شائع کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ الفاظ کی اہمیت باقی نہ رہے گی، دلوں سے نکل جائے گی اور اس کے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی، صرف ترجمہ ہی کو کافی سمجھا جائے گا، اس طرح آہستہ آہستہ قرآن کے الفاظ اس طرح غائب اور ضائع ہوجائیں گے جس طرح انجیل کے الفاظ غائب اور ضائع ہوگئے۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہوجانے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض اور اس کا اخلال حرام ہے اور ترجمہ وتفسیر کا اصل سے مجرد نہ ہونا مقدمہ اور سبب ہے حفاظت کا اور اصل سے مجرد ہونا مقدمہ اور سبب ہے اخلال کا اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام ہے'' (امداد الفتاوی: ۱/۴۰)۔

☆ خود رائی کرنے والوں کو اپنے مطلب کے مطابق الٹا سیدھا ترجمہ کرنے کا موقع مل جائے گا، جس سے تحریف کا ایسا دروازہ کھل جائے گا جس کو بند کرنا ممکن نہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ وتفسیر کا ملے گا، کیونکہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی۔'' (امداد الفتاوی: ۱/۴۰)

☆ اردو وغیرہ کتابوں کی طرح اسے سمجھ کر اس کا وہ احترام باقی نہ رہے گا جو عربی قرآن کا ہے۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''یقینی بات ہے کہ عامہ ناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لئے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک غیر مشروع کا اور سبب غیر مشروع کا غیر مشروع ہے'' (امداد الفتاوی: ۱/۴۰)۔

☆ حضرت تھانویؒ نے اس کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عادۃً ان کے خصائص میں سے ہے، جو مذموم ہے (امداد الفتاوی: ۱/۳۹)۔

نیز اس طرح کے ترجمہ کی خرید وفروخت اور اس کی تقسیم وبخشش بھی ناجائز ہے، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے، جو کہ از روئے کتاب وسنت ممنوع ہے۔

---

[1] ندی روڈ، نزد جمعہ مسجد، گھانچی واڑہ، داحود، گجرات۔

حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

"ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے" (امداد الفتاوی: ۱/۴۲)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی اصل نظم عربی اور اس کی خصوصیات کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اس کی عبارت ترجمہ کے ساتھ ضرور رہے، خالص ترجمہ کی اشاعت میں تغیر وتبدل کے امکانات زیادہ ہیں، اس لئے اس پر اقدام کرنا مسلمانوں کے لئے قرین صواب نہیں" (کفایۃ المفتی: ۱/۱۲۹، ۲/۱۴۳، ۹/۶۵)۔

حضرت مفتی شفیع صاحب کا اس مسئلہ پر مفصل فتوی "جواہر الفقہ" میں موجود ہے، جس میں علامہ حسن شرنبلالیؒ کے اس موضوع پر لکھے ہوئے رسالہ "النفحة القدسية في احكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية" اور دیگر کتابوں سے اس طرح کے ترجمہ کی ممانعت پر مذاہب اربعہ کی تصریحات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز وحرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گنہگار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا" (جواہر الفقہ: ۱/۹۷)۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ کے اس سلسلہ میں متعدد فتاوی موجود ہیں، "فتاوی محمودیہ" میں ہے: "قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا، اس کا ترجمہ وتفسیر ہر زبان میں درست ہے، مگر اصل متن عربی کا محفوظ رکھنا اور چھاپنا ضروری ہے" (جدید، میرٹھی: ۷/۲۱۹، ۲۱۴، ۲۱۵)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کے فتاوی میں ہے:

"پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کتاب کے متن کو نظر انداز کر دیا اور اس کے ترجمہ وتشریح کو مرکز توجہ بنالیا، اسی لئے فقہاء نے متن قرآن کے بغیر معنی ترجمہ لکھنے کو منع کیا ہے، قرآن مجید کی آیات لکھتے ہوئے ان کے ساتھ ترجمہ لکھنا چاہئے، یہ حکم اردو ترجمہ کے لئے بھی ہے اور انگریزی ترجمہ کے لئے بھی اور دوسری زبان کے تراجم کے لئے بھی، بغیر متن کے صرف ترجمہ لکھنا درست نہیں (کتاب الفتاوی: ۱/۴۷۳)۔

"خیر الفتاوی" میں ہے:

"قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے" (۱/۲۱۴، ۱/۲۱۷)۔

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت نادرست ہونے کے باوجود اگر کسی نے اس کو شائع کیا ہے تو اس ترجمہ کو بے وضو چھونا مکروہ ہوگا، کیونکہ ترجمہ قرآن بھی قرآن کے حکم میں ہے۔

"ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح" (الهندية ۱/۳۹، الدرالمختار مع رد المحتار: ۱/۲۸۸)۔

"امداد الفتاوی" میں ہے: "سوال: اردو کلام مجید کا مس بے وضوء جائز ہے یا نہیں؟ جواب: مکروہ ہے" (۱/۱۴۵)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اس سوال کے جواب میں کہ "قرآن شریف پورا ترجمہ کیا ہوا یا تھوڑا بغیر وضوء کے ہر فاسق وفاجر مسلمان کے ہاتھوں استعمال کرنا کیسا ہے؟" فرماتے ہیں:

"قرآن مجید کا ترجمہ مسلمان کے حق میں قرآن مجید کا حکم رکھتا ہے اور غیر مسلموں کو تبلیغ کے لئے دینا جائز ہے" (کفایۃ المفتی: ۱/۱۳۴)۔

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

"ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے، لہذا بلا وضوء نہ چھوئے، غیر مسلم کو تبلیغ کی غرض سے دے سکتے ہیں" (فتاوی رحیمیہ: ۱/۱۰۵)۔

"احسن الفتاوی" میں ہے:

"ترجمۂ قرآن کو بھی بے وضوء چھونے کے بارے میں فقہاء نے بحکم قرآن قرار دیا ہے" (۲/۳۶)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "قرآن مجید کا ترجمہ، خواہ کسی زبان میں ہو، مسلمان کے لئے اس کا بلا وضوء چھونا مکروہ ہے، اس لئے کہ گو کہ کلام الٰہی اصل عربی الفاظ ہیں، مگر مقصود تو یہی معانی اور مفاہیم ہیں" (جدید فقہی مسائل: ۱/۱۰۴)۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن کریم آسمانی کتاب ہے، جس کو رہتی دنیا تک کے انسانوں کی رہنمائی اور کامیابی کے لئے نازل کیا گیا ہے، اس لئے اس کو قیامت تک محفوظ رہنا ضروری ہے، اس بنا پر حق تعالی شانہ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون (الحجر: ۹)

قرآن چونکہ الفاظ اور معانی دونوں کا نام ہے، اس لئے من جانب اللہ ہر دو کی حفاظت ہر طرح کی گئی ہے، الفاظ کی حفاظت کا اہم حصہ یہ ہے کہ اس کے طریقۂ ادا کی بھی حفاظت ہو اور اس کے طرز تحریر کی بھی حفاظت ہو، ورنہ بصورت دیگر الفاظِ قرآنی کی حفاظت میں خلل واقع ہو جانا ظاہر ہے، بناءً علیہ طریقۂ ادا کی حفاظت کے لئے الفاظ کو عربی زبان ہی میں لکھنا ضروری ہوا اور طرز تحریر کی حفاظت کے لئے الفاظ کو اس رسم میں لکھنا ضروری ہوا جس میں اسے روز اول سے لکھا گیا ہے، یعنی رسم عثمانی میں، چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے جس عربی رسم الخط میں قرآن مجید کو تحریر کرایا تھا آج تک اسی کے مطابق قرآن مجید کی تحریر و کتابت کا سلسلہ جاری ہے اور خط عربی اور اس میں بھی رسم عثمانی ہی کتابت قرآن کے لئے متعین ہے، علامہ سیوطی نقل فرماتے ہیں:

"سئل مالك هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع. ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة... قال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أوياء أوالف أوغير ذلك" (الاتقان فی علوم القرآن: ۲/۳۶۷)

اور اسی طرح کرنا علماء نے واجب قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف کو ممنوع قرار دیا ہے:

"وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي؟ قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء قال: ويحتمل الجواز؛ لأنه قد يحسنه من يقرءه بالعربية والأقرب المنع، كما تحرم قراءته بغير لسان العرب، ولقولهم القلم أحد اللسانين والعرب لاتعرف قلما غير العربي" (الاتقان فی علوم القرآن: ۲/۳۷۶)

ظاہر ہے کہ عربی کے علاوہ کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن لکھنے کی صورت میں نہ اس واجب، یعنی رسم عثمانی کی اتباع کا التزام ہو سکتا ہے اور نہ ہی غیر عربی زبان میں عربی زبان کے حروف و کلمات کی مکمل رعایت ہو سکتی ہے، بلکہ اس طرح کرنے میں قرآن کے الفاظ میں تحریف و تغیر کی راہیں ہموار ہونے کے خطرات سامنے آتے ہیں، جبکہ عربی زبان کا تلفظ نہایت لطافت کا حامل ہونے کی وجہ سے الفاظ میں معمولی سی تبدیلی بھی معنی و مقصود کو بدل کر رکھ دیتی ہے، اس لئے جس طرح رسم عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم عربی میں قرآن لکھنا جائز نہیں، اسی طرح غیر عربی رسم الخط میں بھی متن قرآن کا لکھنا جائز نہیں ہے، یہ نہایت خطرناک اور نامناسب عمل ہے۔

"درمختار" میں ہے: "تجوز كتابة آية او آيتين بالفارسية لا أكثر" علامہ شامی لکھتے ہیں: "قوله (وتجوز... الخ): في الفتح عن الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية وأراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز" (الدر والرد، مطلب بیان المتواتر بالشاذ: ۲/۱۸۷)۔

"تاتارخانیة" میں ہے: "إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بالفارسية منع من ذلك على أشد المنع، وإن فعل ذلك في آية او آيتين لايمنع من ذلك" (۲/۷۷)۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: "متن قرآن مجید عربی ہی خط میں رکھنا چاہئے، ہندی رسم الخط میں کوئی ضرورت نہیں، بے پڑھائے تو ہندی میں ہونے سے بھی کوئی نہیں پڑھ سکے گا اور پڑھانے سے عربی حروف کا یاد کر لینا کچھ مشکل نہیں، علاوہ اس کے ہندی یا ناگری میں بعض حروف عربیہ کی شکل ہی نہیں جیسے: ق، ض، ط، ظ، ز، پس جب ان کو دوسری شکل میں لکھا جاوے گا تو ظاہر کہ اصلی حروف پڑھے بھی نہ جاویں گے، تو اس میں عمداً تحریف کا جائز رکھنا ہے

وھو حرام" (امداد الفتاوی: ۱/ ۴۲، کفایت المفتی ۹/ ۲۸۷، ۱۳۱، جواہر الفقہ ۱/ ۱۱۰، فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۳، فتاوی رحیمیہ ۱/ ۹۸-۱۰۰، منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۴۲۸، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/ ۷، ۲۳، فتاوی عثمانی ۱/ ۲۴۷)۔

حاصل: یہ ہے کہ جس طرح خط عربی ہو، مگر رسم عثمانی نہ ہو تو قرآن کی کتابت واشاعت جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر خط ہی عربی نہ ہو، بلکہ غیر عربی ہو تو بدرجۂ اولی اس طرح کے خط ورسم میں متن قرآن کا لکھنا اور شائع کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ اس کے نیچے کسی اور زبان کے رسم الخط میں بھی قرآن کو لکھا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے، تو مندرجہ ذیل شرطوں اور بندشوں کی پابندی کی صورت میں اس طرح کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے، ورنہ نہیں۔

پہلی شرط: یہ ہے کہ مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سرحوض وسر صفحہ نمایاں کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی عظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر دوسری زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً: س، ث، اور ز، ذ، ظ، ض اور ہمزہ، ع وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً: حروف زوائد (الف لام) اور مدوجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے، پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی۔

دوسری شرط: یہ ہے کہ دوسری زبان کی اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے، بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا اور کہا جائے کہ مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا انگریزی میں بنگلہ وغیرہ میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ یا مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف، صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے، اگر ذرا بھی کسی عمل میں یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی۔

ظاہر ہے کہ پہلی شرط کی پابندی نہایت ہی دشوار ہے، اس لئے اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو بھی باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ اس کے نیچے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے، تب بھی اس طرح کرنے کی گنجائش مشکل ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے ان احتیاطوں کے ساتھ اپنے فتوے میں اس کی اجازت دی ہے، جس فتوے کی تصحیح وتائید حضرت مفتی محمود صاحبؒ اور حضرت مفتی سید احمد علی سعید صاحبؒ نے کی ہے، لکھتے ہیں:

''ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں، ان کی تعلیم و تلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سرحوض وسر صفحہ نمایاں کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی عظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً: س، ث، اور ز، ذ، ظ، ض اور ہمزہ، ع وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً: حروف زوائد (الف لام) اور مدوجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے، پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی اور ان باتوں کے باوجود ایک بات اور پھر بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے، بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا اور کہا جائے کہ مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا انگیزی میں بنگلہ وغیرہ میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ یا مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف، صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے، اگر ذرا بھی کسی عمل میں یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی، ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہوجائے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کریم کے ساتھ تابع بن کر لکھ دی جاتی ہیں اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف

ترجمہ قرآن یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۴۲۸-۴۲۹)

۳- بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت:

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ قرآن کو عربی خط میں اور اس میں بھی رسم عثمانی کے مطابق لکھنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں اور ظاہر ہے کہ بریل کوڈ میں نہ تو عربی زبان کے سارے حروف کو اس کے طریقہ ادا کے مطابق لکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی رسم عثمانی کی پابندی ہو سکتی ہے، اس لئے بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت درست اور مستحسن نہیں ہے۔ تاہم اگر قرآن مجید کو اس طرح بریل کوڈ میں لکھا گیا تو اس کو چھونے کے لئے باوضوء ہونا ضروری ہوگا۔ جیسا کہ ''ہندیہ'' کے حوالہ سے گزرا:

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح''

(الهندية: ۱/۳۹، الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۴۸۸)۔

مفتی احمد خانپوری صاحب کے فتاویٰ میں ہے:

سوال: اندھوں کے قرآن پڑھنے کے لئے مخصوص تحریر آتی ہے، جس کے حروف عربی نہیں ہوتے، کیا ایسے قرآن کو بغیر وضوء پکڑ سکتے ہیں؟ جواب: قرآن شریف عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر او راجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرات سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی جا سکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس کا اتباع واجب ہے اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لئے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے (محمود الفتاوی: ۴/۱۵۴)۔

۴- موبائل پر قرآن مجید:

موبائل میں قرآن مجید ہونے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: یہ ہے کہ قرآن مجید موبائل میں موجود و محفوظ تو ہے، مگر وہ اسکرین پر نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس موبائل کو حالت حدث میں چھونا جائز ہوگا، کیونکہ اس صورت میں قرآن کوئی تحریر اور شیء مکتوب نہیں ہے اور اگر اسے تحریر مان لی جائے تب بھی موبائل کے ڈھانچے کو ایسا غلاف تصور کیا جائیگا جس کو بے وضوء چھونے کی گنجائش ہوتی ہے۔

فوٹو گراف میں بند کئے ہوئے قرآن کے متعلق کئے گئے سوال کے جواب میں حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

''ان نقوش میں جب تک پڑھے جانے کی صلاحیت ثابت نہ ہو حروف مکتوبہ کے حکم میں نہیں، اس لئے ان کا مس کرنا محدث وجنبی کے جائز ہے، جیسا دماغ میں ارتسام الفاظ قرآنیہ کا ہوتا ہے اور اس دماغ کا مس کرنا جائز ہے، البتہ اگر وہ پڑھے جانے لگیں تو اس وقت دلالت وضعیہ غیر لفظیہ کی وجہ سے ان کا حکم حروف مکتوبہ کا دیا جائیگا'' (امداد الفتاوی: ۱/۱۴۵)۔

حضرت مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''گراموفون کے جس ریکارڈ (پلیٹ) میں قرآن مجید کی کوئی آیت محفوظ ہو، اس کو بلا وضوء چھونا جائز ہے، کیونکہ وہ قرآن مجید کے حکم میں نہیں اور نہ آیات و کلمات اس میں اس طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح عام طور پر لکھا جاتا ہے اور اس کے اندر قطعۃً تو تیاپر جو کچھ حروف کے مخارج کندہ ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے ریکارڈ کو قرآن کا حکم نہیں دیا جا سکتا'' (جواہر الفقہ: ۵/۱۳۶)۔

دوسری صورت: یہ ہے کہ قرآن مجید موبائل کی اسکرین پر ہے، اس صورت میں اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے تو باوضوء ہونا ضروری ہوگا، کیونکہ وہ قرآن کے الفاظ مکتوبہ ہیں اور قرآن کہیں پر بھی لکھا ہوا ہو اس کو بلا طہارت چھونا درست نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ کے فتوی میں بھی اس کی وضاحت ہے۔

علامہ شرنبلالی لکھتے ہیں: ''ويحرم مسها أي الأية... سواء كان مكتوبا على قرطاس أو درهم أو حائط'' (امداد الفتاح: ۱۲۶)

لیکن اسکرین کے علاوہ موبائل کے مابقیہ ڈھانچے کو بے وضوء چھونے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ جس موبائل میں اوراس کی اسکرین پر قرآن مجید ہے، اسے موبائل ہی کہا جاتا ہے، یعنی وہ ایسی شیٔ کہلاتی ہے جو قرآن نہ ہو اور اس پر آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہو، بالفاظ دیگر وہ ایسی شیٔ ہے جس میں غیر قرآن عبارت قرآن پر غالب ہے اور فقہاء نے ایسی شیٔ کا، یعنی جو چیز مصحف نہ ہو، مگر اس میں قرآن کی آیات لکھی ہوئی ہو اس کا یہی حکم ذکر کیا ہے کہ مکتوب کو بلا طہارت چھونا جائز نہیں، اس کے ماسوا جگہ کو چھونا جائز ہے، اگرچہ بہتر یہ ہے کہ ازراہ تعظیم واحتیاط پورے موبائل کو وضوء کے ساتھ ہی چھوئے۔

''شامی'' میں ہے:

''ویمنع حل ...قراءة قرآن بقصده و مسه ولومکتوبا بالفارسية فی الأصح إلا بغلافه المنفصل. قوله ومسه:أی القرآن ولو فی لوح أو درهم أو حائط لکن لایمنع إلا من مس المکتوب بخلاف المصحف، فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه، وقال بعضهم: یجوز وهذا أقرب إلی القیاس والمنع أقرب إلی التعظیم کما فی البحر أی والصحیح المنع'' (الدر والرد:۱/۲۸۸)۔

''طحطاوی شرح مراقی'' میں ہے:

''وفیماعداالمصحف إنما یحرم مس الکتابة لاالحواشی ویحرم الکل فی المصحف، لأن الکل تبع له وفی الجوهرة: کتب التفسیروغیرها لایجوز مس مواضع القرآن منها، وله أن یمس غیرها بخلاف المصحف. قلت: وذلك هوالموافق لکلامهم؛ لأنهم جعلوا المحرم فی غیرالمصحف مس عین القرآن.'' (۷۷)

علامہ وہبہ زحیلیؒ صاحب فرماتے ہیں:

''قال الحنفية: یحرم مس المصحف کله أو بعضه أی مس المکتوب منه ولو آیة علی نقود (درهم ونحوه) أوجدار ... یحرم مس غلاف المصحف المتصل به؛ لأنه تبع له فکان مسه مسا للقرآن ولایحرم مس الغلاف المنفصل عن القرآن کالکیس والصندوق ویجوز مسه بنحوعودأو قلم أوغلاف منفصل عنه.'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ:۱/۳۸۶)۔

کیسٹ کے متعلق مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں:

''فیتہ کے اوپر جو پلاسٹک کا کیس ہے اس کی حیثیت غلاف کی ہوگی اور اس کے ساتھ چھونے میں کوئی مضائقہ نہیں'' (جدید فقہی مسائل: ۱/ ۱۰۲)۔

اسی طرح اسکرین کو قلم وغیرہ سے چھونا جائز ہوگا:

''ویجوز للمحدث تقلیب أوراق المصحف بنحو قلم وسکین لیقرأ فیه'' (امداد الفتاح:۱۴۷)۔



قرآن مجید کے متن وترجمہ اور بریل کوڈ سے متعلق مباحث

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی[1]

قرآن کریم اللہ کا آخری پیغام ہے جو آخری امت کے لئے خاتم الانبیاء پر نازل ہوا، اس کتاب الٰہی نے دنیا کو اپنے زبان وبیان اور اسلوب وادا سے حیران کردیا، حتی کہ میدان زبان وادب، اور فصاحت وبلاغت کے نامور سورماؤں نے اس کے اعجاز کے سامنے سر تسلیم خم کیا، بار بار قرآن چیلنج کرتا رہا، لیکن کسی مرد میدان کو سامنے آنے کی ہمت وجرأت نہ ہوسکی، اس کے اس اعجاز کے پیچھے جہاں معنوی تاثیر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، الفاظ واسلوب ادا کا بھی بہت اہم کردار ہے، اسی لئے اصولیین جب قرآن کریم کی تعریف کرتے ہیں تو آخر میں ذکر کرتے ہیں:

''هو اسم للنظم والمعنى جميعا'' (نور الانوار: ۹) (قرآن لفظ ومعنی کے مجموعے کا نام ہے)۔

یعنی جس طرح معانی ومضامین اللہ کی طرف سے ہیں الفاظ بھی من وعن من جانب اللہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے معانی کے ساتھ الفاظ کی حفاظت وصیانت بھی خود رب کریم نے لے رکھی ہے اسی لئے اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کے نقطہ وشوشہ میں بھی فرق واقع نہ ہوسکا، نیز اللہ نے اس کتاب کے لئے سب سے بہتر زبان عربی کو منتخب کیا جس کی اعجازی شان، وسعت وہمہ گیری، فصاحت وبلاغت اور اشارات وکنایات کی باریکی میں کوئی اور زبان خواہ کتنی بھی کوشش کی جائے ہمسری نہیں کرسکتی، اسی لئے پوری امت متفق ہے، قرآن کریم کو کسی دوسری زبان میں ڈھال کر اور صرف اس کے ترجمہ کو شائع نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ جو معانی قرآن کے مخصوص لب ولہجہ میں بیان کئے گئے ہیں وہ دوسری زبان میں کما حقہ ادا نہیں ہوسکتے، اس لئے نہ تو تنہا ترجمہ ہی شائع کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت کو جائز کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی تعاون علی الاثم ہے۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے ائمہ اربعہ کی کتابوں سے ان عبارتوں کو نقل کیا ہے جن سے تنہا ترجمہ کی حرمت واضح ہوتی ہے، یہاں ان ہی کے مقالے سے چند عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

تجنیس ومزید میں ہے: ''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن''

(قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ ومعنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے۔ دوسرے یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے)۔

''ومنها ما في المعراج: أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع، وأنه يكون معتمده زنديقا'' (جواهر النقه/ ۹۸ طبع مکتبہ سیرۃ النبی دیوبند)

(معراج الدرایہ میں ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنا سخت ترین ممنوع ہے اور قصداً ایسا کرنے والا زندیق ہے)۔

ہاں یہ حرمت وممانعت اس وقت ہے، جبکہ معتد بہ حصہ لکھا جائے اگر ایک دو آیت کا ترجمہ لکھا گیا یا آیت کے ساتھ تابع بنا کر ترجمہ کیا گیا جیسا کہ علمائے ہند کے یہاں رائج ہے تو حرج نہیں ہے، ''فتح القدیر'' میں ہے:

''إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، فإن فعل آية أو آيتين لا، فإن كتب

---

[1] استاذ حدیث مدرسہ حسینیہ، کایم کلم کیرالا۔

القرآن و تفسير كل حرف و ترجمة جاز۔ اھ'' (فتح القدیر ۱/ ۲۸۶ باب صفة الصلاة، طبع مصطفى البابي ۱۳۸۹ھ)۔

(اگر کوئی فارسی میں قرآن کریم کی تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے، تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے لیکن الفاظِ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے، تو جائز ہے)۔

درمختار میں ہے: ''تجوز كتابة آية أو آيتين بالفارسية لا أكثر'' (درمختار على ردالمحتار ۱/ ۳۵۹، کتاب الصلاة، حكم القراءة بالفارسية)

(ایک دو آیت فارسی میں لکھنا جائز ہے نہ کہ زیادہ)۔

شافعیہ کے یہاں بھی تنہا ترجمہ کی بابت حرم ہے:

''وقد أفاد شيخ الإسلام العلامة ابن حجر العسقلاني الشافعي في فتاواه تحريم الكتابة. وقد سئل هل تحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية كقراءته؟ فأجاب بقوله قضية ما في المجموع. الإجماع على التحريم''۔

(شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی شافعیؒ نے اپنے فتویٰ میں ایسے لکھنے کے حرام ہونے کو بیان فرمایا ہے، آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا تلاوت کی طرح غیر عربی زبان میں قرآن شریف کا لکھنا بھی حرام ہے تو جواب دیا کہ اس قضیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ حرام ہونے پر اجماع ہے) (جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۱)۔

دبستان مالکی وحنبلی میں بھی یہی ہے (دیکھئے: حوالہ مذکور ۱۰۴، ۱۰۵)۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مصارف کم آئیں گے تو اشاعت زیادہ ہوگی یہ بات کم از کم اس دور کے لحاظ سے بہت ہی نامناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ آج تو مال کی ریل پیل ہے کیا دینی کام کے لئے اور ایک فریضہ مسلمانی کو ادا کرنے کے لئے ایک مالدار مسلمان اتنی قربانی نہیں دے سکتا، یہ لیت ولعل سے زیادہ نہیں، جو لوگ اپنے گھروں کو سجاتے ہیں ایک سے ایک ساز وسامان سے دیدہ زیب بناتے ہیں، جسم وبدن کی آرائش وزیبائش میں خطیر رقم خرچ کرتے ہیں اور دنیا کی راحت کے لئے ہر طرح کی آسائش مہیا کرتے ہیں، کیا ان کے لئے ایمان ویقین کے ہوتے زیبا ہے کہ ایسے کام کو چھوڑ کر محض روپے پیسے کے خوف سے ایسا کام کریں جو شریعت کی نگاہ میں مذموم ہے، اگر اس کی اجازت ہوتی تو اس وقت ہوتی جبکہ صحابہ مفلوک الحال تھے، معمولی قسم کی خورد ونوش پر اکتفا کرتے، جسم چھپانے کے لئے مکمل لباس بھی دستیاب نہ ہوتا، اور محض اسلامی پرچم کو بلند کرنے کے لئے وطن سے دور بلاد عجم میں دعوتی منشور لئے پھر رہے ہوتے، اس وقت زیادہ ضرورت تھی کہ مقامی زبانوں میں صرف ترجمہ ان کو دیا جائے تاکہ ان کو ہدایت مل سکے، مگر اس کی تاریخ کوئی شہادت نہیں پیش کرسکتی کہ اکا دکا واقعہ بھی خواہ ناگہانی طور پر ہی پیش آیا ہو، حالانکہ ایسا بھی نہیں کہ ترجمہ کرنے والے موجود نہیں تھے، مختلف صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ دوسری زبانوں کو جانتے ہی نہیں مہارت بھی رکھتے تھے، پھر اس رسم بد کی ایجاد نہ ہوسکی جو بجائے خود ممانعت کی دلیل ہے۔

نیز دعوتی نقطہ نظر کا یہ حیلہ کہ جب قرآن سمجھتے نہیں تو ان کو دینے سے کیا فائدہ، اس لئے کہ قرون ماضیہ میں اسلام کی نشر واشاعت میں صاحب ایمان کے اخلاق وعادات نے جو اثر ڈالا، اور ان کی محنت وجدوجہد کا جو کردار رہا وہ سب پر فائق ہے، قرآن کریم کی آیات نے تو مہمیز کا کام کیا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عربی زبان سیکھنے کی ایسی سعی کی کہ اپنے آپ کو ہی نہیں ملک وقوم کی زبان کو بھی بدل ڈالا، ایسا نہیں ہوا کہ ایک مفروضہ کی خاطر اصل روح پر ہی نشتر چلا دیا ہو۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن جہاں تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے وہیں اپنے مقاصد میں سے تلاوت وآیات کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کو بتاتے ہوئے قرآن نے تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت، اور تزکیہ نفس کو خاص طور پر بیان کرتا ہے، اگر کوئی تلاوت آیات ہی کرتا رہے اور اس کو سمجھنے کے بجائے فقہ وحدیث کی شکل میں جو اس کے معنی ومفہوم موجود ہیں اسی کو خواہ کسی بھی زبان میں سمجھ لے تو اس کی ہدایت کے لئے ان شاء اللہ کافی ہوگا۔

قرآن کا پیغام پہنچانے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ ہی شائع کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی خطوط ہمارے سامنے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہان وقت کو تبلیغی خطوط ارسال فرمایا ہے، ان میں بعینہٖ آیات کریمہ بھی لکھی گئی ہیں اور اپنے الفاظ میں دعوت بھی موجود ہے، ظاہر بات ہے بے حرمتی کا خوف وہاں یہ بھی تھا، بلکہ کچھ زیادہ ہی تھا اور بے حرمتی کی بھی گئی، شاہ ایران نے آپ کے نامہ مبارک کو چاک تک کردیا جس کی پاداش میں اللہ نے ذلیل وخوار کردیا۔

پھر نظم قرآن کا جو نرالا اسلوب اور اس میں پنہاں معنی کی جامعیت۔ ۔دوسری زبان میں خواہ کتنی ہی فصیح کیوں نہ ہو پرونا مشکل امر ہے، شیخ محمد رشید رضا

مصری نے ایسے کئی واقعات لکھے ہیں جن میں یورپی سائنس دانوں نے الفاظ قرآن کی تاثیر کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا ہے (ترجمۃ القرآن/۱۶ طبع المنار مصر)۔

ترجمہ قرآن کے جو مفاسد ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں، حضرت تھانویؒ نے دس مفاسد ذکر فرما کر لکھا ہے: اس وقت دس ہی وجوہ پر جس کو عشرۃ کاملہ کہا جاسکتا ہے اکتفاء کیا جاتا ہے، مگر کاملہ کا خاتمہ ہونا لازم نہیں (جواہر الفقہ ۱/۱۱۵)۔

خالص ترجمہ کے مفاسد:

جن مفاسد پر حضرت تھانویؒ نے روشنی ڈالی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- تشبہ باہل الکتاب لازم آتا ہے اور تشبہ حرام ہے؛ کیونکہ آج تورات وانجیل کا اصل نسخہ کسی کے پاس موجود نہیں اگر ہوگا بھی تو اس کو سمجھنے والا کوئی نہیں، اس کی تحریف کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

۲- ترجمہ شائع کرنے میں اصل قرآن مجید کی حفاظت میں خلل آئے گا جو کہ فرض ہے، خلل حرام ہے اور حرام کا مقدمہ بھی حرام ہوتا ہے۔

۳- ترجمہ کا چھونا بھی حسب تصریح فقہاء جائز نہیں، لیکن عوام الناس اس کا لحاظ نہیں رکھ پائیں گے۔

۴- ان اوراق کا احترام بھی عوام الناس نہیں کرپائیں گے جن پر وہ ترجمہ لکھا ہوگا۔

۵- اجماع امت کی مخالفت لازم آئے گی۔

۶- متن والے ترجمہ کو دیکھنے کے وقت خواہی نہ خواہی انسان کچھ پڑھ ہی لیتا ہے، جبکہ ترجمہ ہوگا تو قرآن سے بالکل بے تعلق ہوجائیں گے، اور نتیجۃً "نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظهورهم کأنهم لا یعلمون" (سورۂ بقرۃ:۱۰۱) کے مصداق ہوں گے۔

۷- ہر مترجم اپنے لحاظ سے ترجمہ کرے گا جس کا نتیجہ ہوگا کہ اختلاف پایا جائے گا اور متن سامنے نہیں ہوگا تو ترجمہ کی تصحیح نہیں ہوپائے گی۔

۸- اہل زیغ وضلال کو بہ آسانی غلط ترجمہ وتفسیر کا موقع ملے گا۔

۹- جب تراجم میں اختلاف ہوگا اور متن سامنے نہیں ہے تو ''أمتهوکون أنتم کما تهوکت الیهود والنصاری'' (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ) جیسا معاملہ ہوگا۔

۱۰- اگر ترجمہ میں نقص ہے نیز قرآن سامنے ہے تو مترجم کا قصور باور کیا جاتا ہے، لیکن قرآن سامنے نہیں ہوگا، تو اصل قرآن سمجھ کر عقیدے کا فساد ہوگا (خلاصہ جواہر الفقہ ۱/۱۱۲-۱۱۵)۔

بے وضو تنہا ترجمہ کو مس کرنا:

قرآن کریم کا متن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنا ممنوع وحرام ہے، مگر کوئی ترجمہ اگر ایسا موجود ہے تو فقہاء نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اس کو مس کرنا جائز نہیں، ''عالمگیری'' میں ہے:

''ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یکره لهم مسه عند أبي حنیفة، وکذا عندهما علی الصحیح'' (عالمگیری ۱/ ۳۹، الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس طبع احیاء التراث العربی بیروت)

(اگر قرآن فارسی میں لکھا ہو تو لوگوں کے لئے اس کو مس کرنا مکروہ ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہی صاحبین کا صحیح مسلک ہے)۔

شیخ رشید رضا مصری اس نقطہ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے:

الفاظ من جانب اللہ ہیں جن میں معانی پنہاں ہیں، ان معانی کا نقش بشکل مکتوب ہے، نیز کتابی رسوم انسان کی وضع کردہ ہیں اس لئے اس کے قائم مقام دوسرا نقش ہوسکتا ہے، چھونے کا تعلق یا اٹھانے کا تعلق اسی نقش سے ہے، لہذا اس کو مس کرنا جائز نہیں، لیکن الفاظ ونظم جو من جانب اللہ ہیں اس کا بدل یا قائم مقام دوسرا لفظ نہیں کرسکتا، اس لئے اس کو قرآن نہیں کہہ سکتے اور نہ اس سے تعبد ہوسکتا ہے (ترجمۃ القرآن/ص ۲۳ رشید رضا مصری، طبع المنار مصر ۱۳۴۴ھ)۔

رسم عثمانی کی حفاظت قرآن کی حفاظت ہے:

دور عثمانی میں اللہ کی حکمت بالغہ کے تحت حضرت زید بن ثابتؓ اور ان کے تین قریشی رفقاء نے جو مصحف خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ کے حکم سے تیار کیا گیا اور اس میں جو خط اختیار کیا گیا اسی کو رسم عثمانی کہا جاتا ہے، اس رسم عثمانی کے سلسلے میں تین رائیں ملتی ہیں:

۱- یہ آیات وسورتوں کی طرح توقیفی ہے، یعنی من جانب اللہ کتابت قرآن کیلئے اسی طرز کتابت کا پابند کیا گیا ہے۔

۲- یہ رسم الخط توقیفی تو نہیں ہے، بلکہ حضرت عثمان نے ایک خط کو پسند کیا تھا جس کو ساری امت نے قبول کرلیا۔

۳- رسم عثمانی محض وقتی اصطلاح ہے اس کی پابندی کوئی ضروری نہیں، ہر ایسے خط میں قرآن کریم کو لکھا جاسکتا ہے جو عربی قواعد کے موافق ہو، تیسرے قول کی نسبت قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ عز الدین بن عبد السلام اور مورخ ابن خلدون کی طرف ہے (التفسیر المنیر للزحیلی ۱/ ۲۷، مباحث فی علوم القرآن لمناع القطان/ ۱۴۶-۱۴۸ طبع ریاض)۔

لیکن جمہور امت نے دوسری رائے پر اتفاق کیا اور یہی اس وقت سے آج تک چل رہا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اللہ تعالی نے حفاظت قرآن کا جو وعدہ کیا ہے اس وعدہ کا ظہور مصحف عثمانی کے ذریعہ کیا گیا، صحابہ کے اور بھی مصاحف تھے جو یقیناً کچھ نہ کچھ مختلف تھے، خواہ یہ اختلاف ترتیب کا تھا یا رسم الخط کا، لیکن سارے نسخے اللہ کی حکمت سے ناپید ہوگئے اور اللہ نے صرف ایک نسخہ پر امت کو متفق کردیا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کی حفاظت کا صرف ایک ذریعہ رہ گیا ہے اور وہ ہے مصحف عثمانی کی حفاظت اور رسم عثمانی کی پابندی، علامہ سیوطی اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قال الأشهب: سئل مالك هل يكتب المصاحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا إلا على الكتبة الأولى، رواه الداني في المقنع، ثم قال: لا مخالف له من علماء الأمة.

قال الإمام أحمد: يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو الف أو غير ذلك، وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف ولايخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا“ (الاتقان ۲/ ۴۰۳ النوع السادس والسبعون طبع فيصل ديوبند)۔

اشہب فرماتے ہیں: امام مالک سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کیا ہے اور فرمایا: علماء میں سے کوئی امام مالک کا اس بارہ میں مخالف نہیں ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں: مصحف عثمانی کی مخالفت واو یا الف وغیرہ (جو کہ تلفظ میں نہیں آتے ہیں) حرام ہے، امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں: جو شخص قرآن کریم کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر صحابہ نے مصاحف لکھے ہیں، ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے)۔

حنفیہ کے مشہور فقیہ ومفتی علامہ شرنبلالی نے اس موضوع پر ”النفحة القدسية في أحكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية“ نامی کتاب تصنیف فرمائی ہے، اس کتاب میں ائمہ اربعہ کے دبستان فقہ سے ان عبارتوں کو جمع کیا ہے جن سے مصحف عثمانی کی اتباع کا وجوب اور اس کے خلاف کرنے کی حرمت واضح ہوتی ہے، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے اس کتاب کی عبارتوں کو پورے شرح وبسط کے ساتھ نقل کیا ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۸۲-۸۵)۔

اس رسم الخط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وجوہ سبعہ اس میں سمودیئے گئے ہیں، اور قراءت وتلاوت میں جن اختلافات ونزاعات کا ظہور آرمینیہ وآذر بائیجان کے فوجی کیمپوں میں ہوا تھا ان کو مکمل طور پر ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، نیز ان تمام قراءتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، جو متواتر ہیں اب اگر تلاوت اس خط کے موافق ہوتی ہے، تو وہ قرآن کریم تصور کیا جائے گا، ورنہ خارج سمجھا جائے گا، اس طرح خلیفہ راشد نے اللہ کی طرف سے عطا کردہ حروف سبعہ کی سہولت کو باقی رکھتے ہوئے نزاعات کے دروازے کو بالکل بند کردیا ہے۔

اس لئے اس خط کی پیروی کرنا لازم وضروری ہے، دوسرے خط میں لکھنا خواہ وہ کوئی بھی خط ہو اجماع امت کے خلاف ہے، اس کی اشاعت بھی تعاون علی الاثم ہے اور حرام ہے، غیر عربی داں طبقے کو عربی سیکھنے کی تلقین کی جائے گی، بلکہ اگر کوشش کی جائے تو اللہ کا فضل بہت جلد متوجہ ہوتا ہے، اور تھوڑے عرصہ میں

قابو پالیا جاتا ہے، عثمانی رسم الخط کے علاوہ خط کا دروازہ کھولنا ان ہی اختلافات کو دعوت دینا ہے جن کو بڑی مشکل سے بند کیا گیا ہے، اس لئے خواہ تنہا غیر عربی رسم الخط ہو، یا رسم عثمانی کے ساتھ ہو دونوں ہی ممنوع ہیں۔

بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت:

یقیناً نابینا حضرات کی سہولت کے لئے بریل کوڈ کی ایجاد ایک کامیاب و مستحسن کوشش ہے اس سے ایک بڑا طبقہ جو بینائی کی دولت سے محروم ہیں ناخواندہ سے خواندہ ہو رہا ہے، شریعت کی تعلیم و تفہیم کی جس قدر حاجت بینا لوگوں کو ہے اتنی نہیں تو بھی فی نفسہ احتیاج اندھوں میں بھی موجود ہے، اس لئے بریل کوڈ میں کتابت قرآن کر کے اندھوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنا ناچیز کی رائے میں جائز ہونا چاہئے، ایسی کچھ نظیریں ہیں جو رسم قرآنی کے خلاف ہونے کے باوجود ضرورت کی وجہ سے جائز ہیں، مثال کے طور پر حائضہ کے لئے خاص طور پر تعلیم و تربیت کی خاطر اجازت ملتی ہے کہ وہ تقطیع کر کے قرآن کی تلاوت کر سکتی ہے، جبکہ یہ بھی رسم عثمانی کی خلاف ورزی ہے، اسی طرح قرآن کے طور پر نہیں، بلکہ دعاء وثناء کے طور پر اگر پڑھا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں سمجھا گیا ہے۔

''فلو قصد الدعاء أو انشاء أو افتتاح أمر أو التعليم ولقن كلمة كلمة حل في الأصح. فرق بعضهم بين الحائض والجنب بأن الحائض مضطرة؛ لأنها لاتقدر على رفع حدثها بخلاف الجنب والمكتار أنه لا فرق'' (درمختار علی ردالمحتار ۱/ ۱۲۷ کتاب الطهارة باب الغسل)

(پس اگر دعا یا ثنا یا کسی چیز کو شروع کرنے کا قصد ہو یا تعلیم کا ارادہ ہو اور ایک ایک کلمہ کی تلقین کرے تو صحیح قول کے مطابق جائز ہے، بعض حضرات نے حائضہ اور جنبی کے مابین فرق کیا کہ حائضہ مجبور ہے، اس لئے کہ حدث کو دور کرنے پر قادر نہیں ہے، برخلاف جنبی کے، صحیح قول یہ ہے کہ دونوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے)۔

عالمگیری میں ہے: ''إذا حاضت المعلمة، فينبغي لها أن تعلم الصبيان كلمة كلمة وتقطع بين الكلمتين ولايكره لها التهجي بالقرآن كذا في المحيط'' (عالمگیری ۱/ ۳۸ کتاب الحيض، الفصل الاربع في احكام الحيض، احياء التراث العربي) (جب معلمہ حائضہ ہو جائے تو مناسب ہے کہ بچوں کو ایک ایک کلمہ پڑھائے اور دو کلموں کے مابین تقطیع کرے اور اس کے لئے قرآن کو ہجے کر کے پڑھنا مکروہ نہیں ایسا ہی محیط میں ہے)۔

اسی طرح بچوں کی تعلیم کے لئے عم پارہ کی ترتیب بدل دی جاتی ہے جو کہ مصحف عثمانی کے خلاف ہے، لیکن بچوں کی ضرورت کے لئے اس کا کسی نے انکار نہیں کیا۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم:

خیال یوں ہوتا ہے کہ اس کا حکم قرآن کا حکم نہیں ہوگا، قرآن ہونے کے لئے رسم قرآنی کے مطابق ہونا ضروری ہے، بعض فقہاء نے حروف ہجا کے تلفظ کو نماز کی حالت میں قراءت کے لئے کافی نہیں سمجھتے ہیں اس لئے کہ وہ قرآن نہیں ہے، لیکن قرآن کے اوپر دلالت کرنے والے حروف ہیں، اس لئے نماز کو فاسد بھی نہیں کرتے ہیں۔

''قال الشرنبلالي في شرحها: صورتها شخص قال في صلاته س ب ه ا ن ال ل ه بالتهجي... لاتفسد.. لكن في البزازية خلافه حيث قال تفسد بتهجيته قدر القراءة؛ لأنه من كلام الناس... ونص في الإمداد... ولايجزئ عن القراءة في الصلاة؛ لأنه لم يقرأ القرآن ولاتفسد؛ لأنه الحروف التي في القرآن'' (شامی ۱/ ۳۵۹ کتاب الصلاة، مطلب في حكم القراءة بالفارسية)

(شرنبلالی نے شرح کرتے ہوئے کہا: اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نماز میں س، ب، ح، ا ن ال ل ھ ہجے کر کے پڑھا تو نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن بزازیہ میں اس کے خلاف ہے کہ قراءت کے بقدر ہجے کرنے سے فاسد ہو جائے گی، اس لئے کہ یہ کلام الناس ہے امداد میں تصریح ہے کہ قراءت کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ قرآن نہیں پڑھا، اور نماز فاسد نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ وہ حروف ہیں جو کہ قرآن میں ہیں)۔

البتہ اس کو چھونے وغیرہ میں احترام واکرام کا معاملہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ جس طرح قرآن کا مس جائز نہیں ہے اسی طرح توراۃ وانجیل، نیز منسوخ آیات کا چھونا بھی حالت حدث میں جائز نہیں ہے:

''مس القرآن وكذا سائر الكتب السماوية قال الشيخ إسماعيل: وفي المبتغى: ولا يجوز مس التوراة والإنجيل والزبور وكتب التفسير وبه علم أنه لايجوز مس القرآن المنسوخ تلاوة وإن لم يسم قرآنا متعبدا بتلاوته'' (شامی ۱/ ۱۲۷، کتاب الطهارة باب الغسل)۔

(قرآن کو اسی طرح دیگر آسمانی کتابوں کو چھونا (حالت حدیث میں جائز نہیں ہے) شیخ اسماعیل نے فرمایا: اور مبتغی میں ہے: تورات، انجیل، زبور، کتب تفسیر کا چھونا جائز نہیں، اسی سے معلوم ہوا کہ منسوخ التلاوۃ آیات قرآنی کو چھونا جائز نہیں ہے اگرچہ وہ ایسا قرآن نہیں ہے کہ اس کی تلاوت عبادت ہو)۔

اس لئے عام کتب دینیہ کے جو احکام و آداب ہوتے ہیں وہ احکام و آداب اس بریل کوڈ میں تیار کئے ہوئے قرآن کے ہوں گے۔

موبائل پر قرآن مجید:

موبائل میں قرآن کریم کبھی تو محفوظ ''میموری کارڈ'' میں کیا جاتا ہے اور کبھی ''فون میموری'' میں، میموری کارڈ میں اگر محفوظ کیا گیا تو جب تک میموری کسی موبائل میں ہے وہ قرآن اس میں ہے، اگر باہر نکال لیا جائے تو موبائل قرآن سے خالی ہو جاتا ہے، لیکن فون میں اگر محفوظ ہے تو عام طور پر فون میموری نکالی نہیں جاتی، اس لئے کہ نکالنے کی صورت میں موبائل کا سارا سسٹم فیل کر جاتا ہے۔

اگر میموری کارڈ میں ہے تب تو موبائل اس کے لئے ایسا کور اور غلاف ہے جس کو الگ کیا جا سکتا ہے، ایسے غلاف کو بلا وضو چھونے کی اجازت فقہاء دیتے ہیں۔

''فإذا كان غلافه منفصلا عنه كالمشمع ونحوه جاز دخول الخلاء به ومسه وحمله للجنب'' (شامی ۱/ ۳۱ کتاب الطهارة) (جب اس کا غلاف اس سے منفصل ہو شمعدان وغیرہ کی طرح تو جائز ہے، اس کے ساتھ بیت الخلاء میں داخل ہونا اور جنبی کے لئے اس کو چھونا اور اٹھانا)۔

اگر اسکرین پر قرآن کھلا ہوا ہے تو اس کو لے کر بیت الخلاء جانا سخت بے ادبی ہے، بلکہ پہلے موبائل بند کرے یا وہ پروگرام بند کرے پھر بیت الخلاء جائے۔

''فلو نقش اسمه تعالى أو اسم نبيه ﷺ استحب أن يجعل الفص فيه كمه إذا دخل الخلاء'' (شامی ۵/ ۲۵۴ کتاب الحظر والاباحة، باب اللبس) (پس اگر اللہ کا نام یا رسول اللہ ﷺ کا نام لکھا ہے تو بہتر ہے کہ نگ کو جیب میں رکھ لے جب بیت الخلاء جائے)۔

اس طرح اس کے اسکرین کو چھونا جائز نہیں ہوگا۔

''ومسه أي: القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط لكن لايمنع إلا من مس المكتوب بخلاف المصحف. فلا يجوز مس الجلد وموضع البياض منه'' (شامی ۱/ ۲۱۴، کتاب الحیض) (قرآن کا چھونا جائز نہیں ہے اگرچہ کسی تختی یا درہم یا دیوار پر ہو، لیکن صرف مکتوب کو چھونے سے منع کیا جائے گا برخلاف مصحف کے کہ جلد کا چھونا اسی طرح سے اس کی خالی جگہوں کو چھونا جائز نہیں ہے)۔

اگر قرآن فون میموری میں ہے اور قرآن اسکرین پر کھلا ہوا ہے تو اس کو بھی مس کرنا بغیر وضو جائز نہیں ہوگا، البتہ مکمل موبائل ہاتھ میں لینا، اسکرین چھوئے بغیر اس کو اٹھانا جائز ہوگا، کیونکہ اس کی جہت لوح اور درہم کی ہے اور اس میں مکتوب مقام کے ماسوا کو چھونا جائز ہوتا ہے اور اگر بند ہے تب تو اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جس کے سینہ میں قرآن موجود ہو، اس لئے کہ جب تک میموری میں ہے اس وقت تک اس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہوتا ہے، اس لئے اس موبائل کو بیت الخلاء میں لے کر جانا بھی جائز ہوگا اور جنبی کے لئے چھونا بھی جائز ہوگا۔



قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت-غور کے چند پہلو

مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری [1]

۱-بغیر متن کے ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت کا شرعی حکم:

عبرانی، سریانی، فارسی، انگریزی، چینی، روسی، فرانسیسی، ہسپانوی، ہندی، گجراتی، آسامی، بنگالی، پنجابی، سندھی، پشتو، اردو وغیرہ زبان میں متن قرآن مجید کے بغیر تنہا ترجمہ کی اشاعت شرعی نقطہ نظر سے ہرگز جائز نہیں ہے، یہ قرآن مجید کی خدمت نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کے ساتھ تمسخر واستخفاف ہے، اگر اس کی اشاعت کے جواز کا فتوی صادر کردیا جائے تو پھر حشر وہی ہوگا جو تورات، انجیل، زبور جیسی مقدس کتاب کا ہوا، اللہ تعالی ہماری صیانت وحفاظت فرمائے۔

ایسی تجاویز پاس کرنے سے گریز کیا جائے، اسی میں خیر وبھلائی ہے، اگر کوئی شخص اپنی ڈکٹیٹر شپ کی بنا پر اشاعت کرتا ہے تو اس کا وبال اس کے سر ہے، اس کو فروخت کرنا، خریدنا، تقسیم کرنا، ہدیہ کرنا بھی جائز نہیں ہے، برعظیم ہندوپاک کے اصحاب افتاء بھی تن تنہا ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتے ہیں، بلکہ اسی کے اوپر اٹل رہنے کی سعی بلیغ کی جائے اور عدم اشاعت پر تاقیامت اصحاب افتاء کو فتوی صادر کرتے رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

اشاعت کی تائید میں دو باتیں کہی جاتی ہیں: ۱-اس میں مصارف کم آتے ہیں، ۲-جو لوگ متن قرآن مجید کو نہیں پڑھ سکتے ہیں، انہیں متن والا ترجمہ قرآن مجید دینے سے کیا فائدہ؟ ترجمہ قرآن مجید بہت سے غیر مسلموں کو بھی دیا جاتا ہے، انہیں متن پر مشتمل ترجمہ قرآن مجید دینے میں قرآن مجید کی بے حرمتی کا بھی اندیشہ ہے، اس سے بچنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ انہیں متن کے بغیر صرف ترجمہ قرآن مجید دیا جائے، تاکہ ان تک قرآن کا پیغام پہنچ بھی جائے اور قرآن مجید کی بے حرمتی کا اندیشہ بھی نہ ہو، یہ عذر لنگ ہے اور یہ خیال سراسر ہباء منثورا کے مانند ہے، اس میں کوئی دم نہیں ہے۔

غیر مسلم بھی مسلم سے زیادہ قرآن مجید کا احترام واکرام اور اعزاز کرنا جانتے ہیں، اور کرتے ہیں اور کررہے ہیں (سورۂ حجر: ۹، اس کی تشریحات وتوضیحات کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۵/ ۲۸۱ تا ۲۸۴ ربانی بک ڈپو دہلی)۔

"قرآن وحدیث واسم الٰہی دوسری زبانوں میں تحریر ہوں تو وہ بھی واجب التعظیم ہیں۔

۱- اگر قرآن مجید یا حدیث شریف یا اسم الٰہی بعینہ انگریزی یا فارسی یا اردو میں لکھا ہوا ہو تو اس کی تعظیم وحرمت ضروری ہے یا نہیں؟

۲- اگر قرآن مجید یا حدیث شریف یا اسماء الٰہی کا ترجمہ انگریزی، فارسی، اردو میں ہو تو کیا حکم ہے؟

۳- مذکورہ ترجمہ بلا وضو چھو سکتے ہیں یا نہیں؟ اور غیر مسلم کے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: ہر زبان میں لکھا ہوا قرآن یا حدیث شریف یا اسم الٰہی واجب التعظیم ہے، گو پورے قرآن کا اور زبانوں میں لکھنا جائز نہیں، مگر اس کی بے ادبی بھی جائز نہیں، بلکہ اگر کسی نے پورا قرآن فارسی یا انگریزی میں لکھا ہو تو اس کو احتیاط سے ایک طرف جہاں پاؤں نہ پڑیں دفن کردیا جائے اور اوپر تختہ رکھ کر مٹی سے چھپادیا جائے، اور ایک دو آیت کا اردو یا فارسی وانگریزی رسم الخط میں لکھنا جائز ہے اور اس کا ادب واجب ہے۔

۲- ترجمہ گو اصل کے برابر تو نہیں، مگر بے حرمتی اس کی بھی جائز نہیں چاہے کسی زبان میں ہو (امداد الاحکام ۱/ ۲۴۳ تا ۲۴۴ زکریا بک ڈپو)۔

۳- ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے، لہذا بلا وضو کے نہ چھوئے غیر مسلم کو تبلیغ کی غرض سے دے سکتے ہیں (فتاوی رحیمیہ ۱/ ۱۰۴ تا ۱۰۵، موسوعہ فقہیہ ۳۸/ ۹ تا ۱۰)۔

---

[1] خادم مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھرواڑہ، دربھنگہ۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت کا شرعی حکم:

شرعی نقطہ نظر سے اس کی بھی کتابت و اشاعت حرام وممنوع ہے، ہم لوگ مسلمان ہیں ہم کو تو بہ درجہ اولی عربی سے محبت رکھنی چاہئے، کیونکہ ہماری مذہبی کتاب عربی زبان میں ہے اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عربی ہیں اور جنتی کی زبان بھی عربی ہوگی، مزید یہ قبر میں منکر نکیر سوال کریں گے عربی زبان میں اور صاحب قبر بھی عربی میں جواب دے گا، عربی زبان سے ہم اپنی گردن ہرگز نہیں چھڑا سکتے ہیں اور نہ کہیں روپوش ہو سکتے ہیں کہ عربی زبان سے ہم اپنا پیچھا چھڑا لیں خبردار ایسی تجاویز سے بالکلیہ اجتناب کیا جائے، قرآن مجید کی زبان عربی ہے، اس میں تلاوت کرنے کا حکم ہے، اس کے برعکس ایڑی چوٹی کا زور لگانا گویا وحی منزل من السماء کی خلاف ورزی ہے اور اللہ تعالی کی آخری کتاب جو خاتم الکتب ہے اس کے ساتھ جان بوجھ کر تمسخر واستخفاف کرنا ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۳/۳۸، ترجمۃ القرآن فقرہ/۲۰)۔

۱- ''کتب القرآن فی عهد عثمان علی شکل معین وعلی ید جماعة من الصحابة رضی الله عنهم ووزعت النسخ التی کتبوها علی العواصم الاسلامية وسميت هذه الطريقة الرسم العثمانی'' (موسوعہ فقہیہ ۲۲/ ۲۳ رسم المصحف فقرہ)

حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت میں قرآن مجید کو صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے دست مبارک سے ایک خاص شکل پر لکھوایا گیا اور ان لکھے گئے نسخوں کو اسلام کے مرکزی شہروں میں بھیج دیا گیا اور اسی خاص شکل پر کتابت کے طریقہ کو رسم عثمانی کا نام دیا گیا۔

۲- ''ذهب جمهور فقهاء الأمة إلى وجوب الاقتداء فی رسم المصاحف برسم مصحف عثمانی رضی الله عنه. لکونه قد أجمع الصحابة عليه'' (موسوعہ فقہیہ ۳۸/ ۱۲، اتباع رسم المصحف الامام فقرہ ۱۶)۔

(جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ قرآن مجید کے لکھنے میں حضرت عثمان غنیؓ کے مصحف ''رسم عثمانی'' کی پیروی کرنی لازم ہے کیونکہ حضرت صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہے)۔ اس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ عربی زبان، عربی رسم الخط، رسم عثمانی کی خلاف ورزی کرنا کسی بھی حال میں درست وجائز نہیں ہے۔

خط ناگری میں قرآن مجید لکھنے کا حکم:

انجمن نے جو طرز ترجمہ اور تفسیر کا اختیار کیا ہے وہ حسب ذیل ہے، پہلے اصل قرآن کو بہ خط عربی میں لکھا گیا ہے، پھر اسی کے بالمقابل اصل قرآن کو بہ خط ناگری لکھا گیا ہے، بعدہ ان دونوں کے نیچے قرآن مجید کا ترجمہ بہ زبان وخط ناگری لکھا گیا ہے، پھر اس کی تفسیر بہ خط ناگری ترجمہ کے نیچے کی گئی ہے، آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں، فقط۔

الجواب: ۱- ناگری ہو یا انگریزی ہر وہ خط جس میں رسم خط مصحف عثمانی کی رعایت نہ ہو سکے اس میں قرآن لکھنا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ کتابت مصحف میں رعایت رسم خط عثمانی واجب ہے۔

۲- رہے وہ خط جس میں رعایت رسم خط مذکور ہو سکتی ہے جیسے فارسی یا اردو نستعلیق وامثالہ ان میں قرآن کا لکھنا مختلف فیہ بین القولین ہے، مگر اقرب اور راجح یہ ہے کہ ایسے خطوط میں بھی پورا مصحف لکھنا ناجائز ہے، ایک دو آیت اتفاقیہ لکھنے کا مضائقہ نہیں، الغرض الفاظ قرآنی کو صرف عربی خط ہی میں لکھنا چاہئے، ترجمہ وتفسیر کی دوسری زبان میں اور دوسرے خط میں لکھنے کا مضائقہ نہیں (اس کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ۱/ ۲۴۰ تا ۲۴۱)۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ کا موقف:

۱- اتباع رسم مصاحف عثمانیہ کتابت قرآن میں باجماع ائمہ اربعہ واجب ہے، جس کی مخالفت گناہ ہے، مگر کفر نہیں، البتہ رسم خط عثمانی میں طعن کرنا اور اس کی تحقیر کرنا اندیشناک ہے، جس سے کفر کا اندیشہ ہے۔

۲- واؤ اور یا اور الف کا حذف کرنا ان مواقع میں واجب ہے جہاں مصحف عثمانیہ میں ان حروف کو حذف کیا گیا ہے، اور جہاں زیادہ کئے گئے ہیں وہاں زیادہ کرنا واجب ہے۔

اسی طرح جہاں تاء کو بہ صورت تاء مربوطہ لکھا گیا ہے وہاں اسی طرح لکھنا واجب ہے، اور جہاں بہ صورت تاء مجرورہ طویلہ لکھا گیا ہے وہاں جرو طویل کے ساتھ لکھنا واجب ہے (امداد الاحکام ۱/ ۲۳۵ تا ۲۳۶)۔

.......اردو میں جو سوال کیا گیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس مصحف کے ساتھ ترجمہ بھی شائع ہوگا جن کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ ایک ورق ہر ورق کے سامنے لگایا جائے گا اور اس دوسرے ورق میں محض ترجمہ ہی ترجمہ ہوگا، سو مستفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ترجمہ کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں ترجمہ کا انفصال قرآن سے ممکن ہے، اگر کوئی شخص اس کو قرآن بالکل علاحدہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے، حالانکہ ترجمہ قرآن اس طرح پر لکھنا جائز نہیں کہ وہ قرآن سے منفصل وعلاحدہ ہوسکے، بلکہ ترجمہ کو متن قرآن کے ساتھ ایسا ملحق ہونا چاہئے کہ اس سے جدا نہ کیا جاسکے، ورنہ بعض خریدار متن عربی کو الگ اور ترجمہ کو الگ رکھنا چاہیں گے جس سے وہ ترجمہ مثل انجیل وتورات کے غیر حامل المتن ہوگا اور اس سے اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں میں کتب سابقہ کی طرح لوگوں کے ہاتھ میں قرآن کا ترجمہ ہی رہ جائے، اور متن گم ہوجائے یا اس سے توجہ کم ہوجائے...... (امداد الاحکام ۱/ ۲۳۵ تا ۲۳۹)۔

مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلیؒ کا موقف:

"قرآن مجید کے رسم الخط میں مصحف امام کے مطابق رعایت کرنی چاہئے، اپنی طرف سے تغیر وتبدل جائز نہیں (فتاوی مولانا عبدالحیؒ: ۱۱۵ تا ۱۱۶ مکتبہ تھانوی دیوبند طبع اول)

مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ کا موقف:

قرآن مجید کو گجراتی حروف میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف لفظی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، مثلاً: "بسم اللہ" کو گجراتی حروف میں لکھا جائے تو لفظ "اللہ" لفظ "الرحمن" اور لفظ "الرحیم" کی ابتداء کے دو حروف (الف، لام) تحریر میں نہیں آئیں گے تو اس طرح لکھنے میں صرف "بسم اللہ" شریف میں چھ حروف کی کمی آجاتی ہے تو غور فرمائیے پورا قرآن مجید مثلاً گجراتی میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہوجائیں گے حالانکہ معانی کی طرح حروف بھی قرآن ہونے میں شامل ہیں، دوسری جانب صورت یہ ہے کہ بعض آیتوں میں حروف زائد ہوجائیں گے مثلاً "الٓمٓ" میں قرآنی رسم الخط کے بموجب صرف تین حروف ہیں، لیکن غیر عربی مثلاً گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہوجائیں گے اب حساب لگائیے پورے قرآن میں کتنی کمی بیشی ہوجائیگی، اس کے علاوہ حقیقت یہ ہیکہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے منزل من اللہ ہے تواتر اور اجماع سے ثابت ہے اعجازی ہے، اس میں قرأت سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی کی جاسکتی ہیں یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے۔

طریقہ یہ تھا کہ جب قرآن مجید کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر لکھواتے اور ہر لفظ کا رسم الخط کاتب وحی کو تعلیم فرماتے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معرفت سے سیکھتے تھے، خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں یہ بات طے ہوئی کہ جو آیتیں اور سورتیں مختلف حضرات کے پاس لکھی ہوئی شکل میں ہیں ان سب کو کتابی صورت میں ایک جگہ جمع کردیا جائے تو کاتبین وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے بڑی احتیاط اور پوری توجہ سے اسی اصلی رسم الخط کے مطابق جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھا گیا تھا پورا قرآن مجید لکھا، اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن مجید لکھوایا تو انہیں کاتبین وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو وہ عظیم الشان خدمت سپرد ہوئی، جبکہ پچاس ہزار صحابہ کرامؓ موجود تھے، لہٰذا اس مصحف عثمانی کے رسم الخط کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، چاروں ائمہ اس رسم الخط کو ضروری مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ} (الحجر: ۹) "ہم نے ہی قرآن مجید نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔"

مذکورہ ارشاد میں صرف قرآنی الفاظ کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ الفاظ معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا وعدہ اور پیشینگوئی ہے، لہٰذا اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، معانی اور علوم القرآن کی حفاظت میں علمائے دین مشغول ہیں تو الفاظ، عبارت اور طرز ادا کی حفاظت میں قراء منہمک ہیں اور رسم الخط کی حفاظت کاتبین قرآن کررہے ہیں، جن کی پیروی ہم پر لازم ہے (فتاوی رحیمیہ ۱/ ۹۸ تا ۹۹ مزید دیکھئے/ص ۹۹ تا ۱۰۳ مکتبہ رحیمیہ راندیر، سورت)۔

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی: حضرت ابوبکرؓ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق انہیں ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل کردیا گیا، پھر مروان بن حکم نے اپنے عہد حکومت میں حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفے طلب کئے تو انہوں نے دینے سے انکار کردیا، یہاں تک کہ جب حضرت حفصہؓ کی وفات ہوگئی تو مروان نے وہ صحیفے منگوائے اور انہیں اس خیال سے نذر آتش کردیا کہ اب اس بات پر اجماع منعقد ہوچکا تھا کہ رسم الخط اور ترتیب سور کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف کی اتباع لازمی ہے اور کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو ان کے رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو (علوم القرآن: ص ۱۸۶ تا ۱۸۷)۔

اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصحف تیار کرائے تھے، لیکن ابوحاتم سجستانیؒ کا ارشاد ہے کہ کل ساتھ نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا (علوم القرآن: ص ۱۹۰ تا ۱۹۱)۔

حضرت عثمانؓ کے مذکور بالا کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ وتابعینؒ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی (علوم القرآن/ص ۱۹۳، مولانا محمد تقی عثمانی کتب خانہ نعیمیہ دیوبند ۱۹۹۳ء)۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت کا شرعی حکم:

بریل کوڈ "بریل رسم الخط" اگرچہ حقیقی رسم الخط کی طرح نہیں ہے، بلکہ وہ عقود واشارات کی قبیل سے ہے، جس کے ذریعہ اصل مفہوم اور حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے، گویا کہ اس کی اپنی ایک مخصوص حقیقت ہے جس سے راہ فرار اختیار نہیں کیا جا سکتا ہے، جس طرح اسماء واصوات اور الوان کی اپنی کوئی خاص رسم الخط نہیں اس کے باوجود اس سے معلومات حاصل ہو جاتی ہے کوئی دشواری و پریشانی اور تشویش لاحق نہیں ہوتی ہے، اسی طرح بریل کوڈ کے سمجھنے اور پڑھنے میں کوئی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے اس کی باضابطہ پڑھائی اور لکھائی ہوتی ہے، اگرچہ بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی ہے، بلکہ اس کی استثنائی صورت ہے جن کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت کرنا بلاتذبذب وتردد کے درست وجائز ہے۔

عصر حاضر میں بریل کوڈ کی اہمیت اور قدر ومنزلت روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہے، کیونکہ بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہوگئی ہے وہ ہر قدم پر بینا افراد کے محتاج نہیں رہیں گے، حفظ کرنے والے نابینا افراد اس کی مدد سے قرآن مجید یاد کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں اس میں کوئی شک وشبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بھولنے کی صورت میں اس کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں، براہ راست قرآن مجید کا مطالعہ کر سکتے ہیں، اس لئے بریل رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت کرنا شرعی نقطۂ نگاہ سے بالکل درست وجائز ہے اس میں کوئی قباحت شناعت نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کی نشر واشاعت والے ادارے خوب دل کھول کر نابینا افراد کے افادہ واستفادہ کی خاطر اس کی وافر مقدار میں طباعت کر کے قرآن مجید کی وسیع پیمانے پر اشاعت کریں اور دارین کی سعادت حاصل کریں۔

"لیس علی الأعمی حرج" (سورۂ نور: ۶۱، سورہ فتح: ۱۷) (نہ تو اندھے آدمی کے لئے کچھ مضائقہ ہے)۔

"الضرورات تبیح المحظورات" (کشف الخفاء ۲/ ۴۵) (بہ وقت ضرورت ممنوع وحرام چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں)۔

"اخبرتني عائشة ان رسول الله ﷺ قال: من عمل عملا لیس علیه أمرنا فهو رد" (بخاری ۱/ ۲۸۷)

(راوی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے مجھ کو اطلاع دی کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص کوئی عمل کرتا ہے اور اس عمل کے سلسلے میں، ہماری جانب سے کوئی حکم منصوص نہ ہو تو وہ عمل ناقابل قبول ہے)۔

"عن عائشة قالت: قال النبي ﷺ: من أحدث في أمرنا هذا أما لیس منه فهو رد" (بخاری ۱/ ۳۷۱)

(حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص دین میں کوئی نئی بات پیدا کرے اور اس نئی بات کے سلسلے میں میری جانب سے کوئی حکم صادر نہ ہو تو وہ نئی گڑھی ہوئی چیز ناقابل قبول ہے)۔

تشریح: "احداث" کے لغوی معنی ہیں ایجاد کرنا، پیدا کرنا، پاخانہ کرنا، تلوار کو جلا دینا (مصباح اللغات/ص ۱۴۰، کالم ۳ مکتبہ برہان دہلی)۔

اصطلاحی معنی: دین میں کوئی نئی چیز پیدا کر دینا۔ احداث کی دو قسمیں: ۱- احداث فی الدین یہ حرام اور ممنوع ہے، ۲- احداث للدین: یہ جائز و درست ہے اور مستحسن ہے، بہرکیف بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت احداث فی الدین میں شامل نہیں ہے، اس لئے اس میں شک وتردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلاخوف وخطر اس کی اشاعت کی جائے۔

بریل کوڈ میں کتابت واشاعت شدہ قرآن مجید کا حکم اصل قرآن مجید کی طرح ہے، قرآن مجید کی تلاوت اور بلاوضو چھونے کے سلسلے میں جو مخصوص آداب و

احکام ہیں وہی بریل کوڈ میں چھپا ہوا قرآن مجید کے بھی آداب واحکام ہیں، بہر کیف اس کو چھونے اور تلاوت کے لئے باوضو ہونا ضروری ولازم ہے (التبیان/ ص ۹۷، الآداب الشرعیہ ۲/ ۳۲۵، ابن مفلح، الاتقان ۱/ ۳۲۸، موسوعہ فقہیہ ۳۳/ ۳۵)۔

بلاوضو کے اس کو چھوا نہیں جاسکتا ہے، مگر بلاوضو کے تلاوت کرنا جائز ہے، کیونکہ اس کے اوپر اجماع ہے، ارشاد ربانی ہے: "لا یمسہ إلا المطھرون" (سورۂ واقعہ: ۷۹) (پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا)۔

۴- آج کل موبائل میں بھی قرآن مجید کے متن اور اس کی تلاوت کو محفوظ کرنے کی آسانی پیدا ہوگئی ہے، اس طرح سفر وحضر میں کہیں بھی قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکتی ہے تو ایسی صورت میں اگر موبائل کی اسکرین پر قران مجید موجود ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا، قرآن مجید کی تقدس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ طہارت ونظافت کا اہتمام کیا جائے، تلاوت سے پہلے طہارت ونظافت کا پورا اہتمام کیجئے، بغیر وضو قرآن مجید چھونے سے پرہیز کیجئے اور پاک وصاف جگہ پر بیٹھ کر تلاوت کیجئے، موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور نہیں کیا جائے گا جس سے بے وضو چھونے کی گنجائش نکلتی ہو، جمیع پارٹ، پرزے، ڈھانچے کے مجموعے کا نام موبائل ہے اصل قران مجید کے چھونے اور تلاوت کے جو آداب واحکام منصوص ہیں وہی آداب واحکام موبائلی قرآن مجید کے ہیں جو اصل کا حکم ہوگا وہی فرع کا حکم ہوگا۔

دستانے پہن کر بلاوضو قرآن پاک چھونے کا شرعی حکم:

سوال:...... بغرض حفظ قرآن کو بار بار چھونا پڑتا ہے تو دستانہ پہن کر جو خاص قرآن شریف چھونے کے لئے مخصوص ہوں بلاوضو ہاتھ لگاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:...... "قال فی العالمگیریۃ: ولا یجوز لھم مس المصحف بالثیاب التی ھم لابسوہا" (۱/ ۳۴) چونکہ دستانہ بھی ملبوس ہے اس لئے اس سے مس مصحف جائز نہیں بلکہ رومال وغیرہ سے مس جائز ہے، جو بدن سے منفصل ہو۔

تشریح:...... اس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ موبائل کا ڈھانچہ بھی موبائل کا جثہ اور حصہ ہے، اس لئے اس سے بلاوضو مس جوال جائز نہیں، بلکہ باوضو جوال ہاتھ میں لینے کا اسکرین پر ہاتھ لگانے کی شرعی نقطہ نظر سے اجازت ہوگی ورنہ نہیں، رومال، دستی وغیرہ سے مس جوال (موبائل) جائز ہے جو بدن سے منفصل ہے۔

تاجر کتب کے لئے بلاوضو قرآن چھونے کا شرعی حکم:

سوال:...... میں کتابوں کی تجارت کرتا ہوں اور بسا اوقات بغیر وضو کے رہنا پڑتا ہے، اور قرآن شریف خریدار کو دکھانا پڑتا ہے، اگر کوئی کپڑا رکھتا ہوں تو جاہل خریداروں سے سابقہ پڑتا ہے، جو کہتے ہیں کہ ایک ایک ورق دکھاؤ، چنانچہ قرآن پاک کو چھونا پڑتا ہے، کیا ایسی صورت میں چھوسکتا ہوں یا نہیں؟

جواب:...... تاجروں کو بدون وضو کے قرآن کا بلا واسطہ چھونا کسی طرح جائز نہیں، رومال سے چھوئے اور چاقو یا قلم سے اوراق کھول کر دکھائے ہاتھ نہ لگائے (امداد الاحکام ۱/ ۲۴۱)۔

حمائل شریف جیب میں رکھ کر پیشاب وغیرہ کرنے کا شرعی حکم:

سوال:...... اگر جیب میں چھوٹی حمائل شریف ہو تو اسی حالت میں پیشاب کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

جواب:...... جیب میں حمائل شریف رکھ کر بیت الخلاء جانا یا کسی اور جگہ پیشاب کرنا جائز تو ہے، مگر خلاف اولی ہے، اور یہ حکم جب ہے کہ حمائل شریف جیب وغیرہ میں چھپ جائے، اور اگر جیب میں ہوتے ہوئے نظر آتی ہے تو ایسی حالت میں جیب سے نکال دینا ضروری ہے (امداد الاحکام ۱/ ۲۴۷، ۲۴۸)۔

یہی حکم اس موبائل کا ہوگا جس میں قرآن مجید کی میموری رکھی ہوئی ہو، جسے موبائلی قرآن مجید کہتے ہیں، ان تمام معروضات کی روشنی میں میری ذاتی رائے یہی ہے کہ بلاوضو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کی شرعاً اجازت نہ ہوگی، ہم شریعت کے تابع رہیں گے، شریعت ہمارے تابع نہیں رہے گی، ہمیں اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ شریعت کو بدل دیں ہم کو شوق وذوق ہے کہ موبائل میں قرآن مجید کی میموری رہنی چاہئے تو ہمیں بھی اس کا خیال بروقت رکھنا ہوگا کہ ہم باوضو رہیں گے تو اسکرین پر ہاتھ لگاسکتے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت خوب لطف اندوزی کے ساتھ کرسکتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ میرا سب کام خود بخود ہوجائے، کچھ محنت کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ☆☆☆

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کا حکم

مولانا ندیم احمد انصاری[1]

۱- ارشاد ربانی ہے: بلسان عربی مبین (سورۃ الشعراء:۱۹۵)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ''بلسان عربي مبين'' قال بلسان قريش، ولو كان غير عربي ما فهموه'' (الدر المنثور:۱۱/ ۲۹۸، مرکز للبحوث والدراسات العربية والاسلامية)۔

قرآن کریم قریش کی زبان (یعنی عربی) میں نازل کیا گیا (اور یہ اس لیے کہ جن پر قرآن نازل ہو رہا تھا وہ قریشی اور عربی تھے) اگر اسے عربی کے علاوہ کسی زبان میں نازل کیا جاتا تو وہ اسے نہیں سمجھ سکتے تھے، اس کے تحت مفسر قرآن، مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وہی ہے، جو عربی زبان میں ہو، کسی مضمون قرآن کا ترجمہ -- خواہ کسی زبان میں ہو -- وہ قرآن نہیں کہلائے گا..... جمہور امت کا عقیدہ ہے کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآن کا نام ہے، نہ صرف معانی قرآن کا۔ اگر کوئی شخص قرآن ہی کے الفاظ مختلف جگہوں سے چُن کر ایک عبارت بنالے مثلاً: "الحمد لله العزيز الرحيم۔ الذي له ملك السموت وهو رب العالمين خالق كل شيء وهو المستعان" یہ سارے الفاظ قرآن ہی کے ہیں، مگر اس عبارت کو کوئی قرآن نہیں کہہ سکتا، اسی طرح معانی قرآن، جو کسی دوسری زبان میں بیان کیے جائیں، وہ بھی قرآن نہیں، آگے فرماتے ہیں:

اسی طرح قرآن کا صرف ترجمہ کسی زبان میں بغیر عربی متن کے لکھا جائے، تو اس کو اس زبان کا قرآن کہنا جائز نہیں، جیسے آج کل بہت سے لوگ صرف اردو ترجمہ قرآن کو اردو کا قرآن اور انگریزی ترجمہ کو انگریزی کا قرآن کہہ دیتے ہیں، یہ ناجائز اور بے ادبی ہے۔ قرآن کو بغیر متن عربی کے کسی دوسری زبان میں بنام قرآن شائع کرنا اور اس کی خرید وفروخت؛ سب ناجائز ہے (دیکھئے: معارف القرآن:۶/ ۵۵۲، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

اس موضوع پر موصوف کا مستقل رسالہ بنام "صيانة القرآن عن تغيير الرسم واللسان" جواہر الفقہ، جلد اول میں موجود ہے، جس میں انھوں نے اس موضوع پر مدلل گفتگو کی ہے۔

لکھتے ہیں: قرآن مجید کا صرف ترجمہ، بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے..... اس کا ناجائز و حرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لیے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گنہگار ہوں گے، ان سب کا گناہ، اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔

"ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورۃ نساء:۸۵) (جواہر الفقہ:۱/ ۹۷، مکتبۃ تفسیر القرآن، دیوبند، بتغیر)۔

آگے تشریحاً علامہ محقق ابن ہمامؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، فإن فعل آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمة جاز۔ اھ''

اگر کوئی فارسی میں قرآن کریم کی تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے، تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے لیکن الفاظِ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے۔

---

[1] ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا۔

فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا، جو ممنوع ہے؛ ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتدبہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے، تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

پھر یہ حکم کچھ فارسی ہی کے ساتھ خاص نہیں، جیسا کہ علامہ شرنبلالیؒ نے وضاحت کی ہے: ''وانه إنما نص على الفارسية لإفادة المنع بغيرها بالطريق الأولى، لأن غيرها ليس مثلها في الفصاحة، و لذا كانت في الجنة مما يتكلم به كالعربية كما تقدم'' (النفحة القدسية في أحكام القراءة القرآن و كتابته بالفارسية: ۳۲، بحواله جواہر الفقه: ۱/ ۹۹)۔

فارسی کی تصریح اس لیے کی گئی ہے، تاکہ دوسری زبانوں میں ممنوع ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوجائے، کیونکہ کوئی اور زبان (عربی کے بعد) فارسی سے زیادہ فصیح نہیں۔

موصوف نے صراحت کی ہے کہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

تمام دلائل پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں: یہ سوال کوئی آج پیدا نہیں ہوا، ہندوستان میں مدت سے یہ رسم بدچل گئی ہے۔ (قریباً ایک صدی قبل) ۱۳۳۲ھ میں قطب عالم مجدد الملۃ سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ کے سامنے ایک ایسے ہی اردو ترجمہ بلا عربی عبارات کی اشاعت کے متعلق لکھا گیا، تو حضرت ممدوح نے اس کی ممانعت وحرمت پر ایک نہایت مفصل ومدلل فتویٰ تحریر فرمایا تھا، جو ''حوادث الفتاویٰ'' (حصہ دوم، ص: ۱۵۶) پر شائع ہو چکا ہے (آگے اس پورے فتوے کو بھی جواہر الفقہ میں درج کیا گیا ہے)۔

اب سوال ہے کہ اگر یہ اشاعت درست ہے تو بے وضو اسے چھونے کا کیا حکم ہے؟

اشاعت کے متعلق تو واضح حکم بیان ہوگیا، لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی چھاپ ہی دے، تو اسے چھونے کے متعلق حکم درج ذیل ہوگا:

ارشادِ ربانی ہے: "انه لقرآن كريمٌ في كتاب مكنون، لا يمسه الا المطهرون" (سورة الواقعة: ۷۷-۷۹)۔

یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے، جو محفوظ کتاب (لوحِ محفوظ) میں (لکھا ہوا ہے)، اس (قرآن) کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں، جو پاک ہیں۔

اور حضرت عمرو بن حزمؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لا يمس القرآن إلا طاهرا'' (سنن الدار قطني: ۲۲۳، موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان: ۷۹۳)۔

قرآن کریم کو کوئی ہاتھ نہ لگائے، حتیٰ کہ وہ پاک ہو۔

خیال رہے یہاں حدث اکبر وحدث اصغر دونوں سے پاک ہونا مراد ہے، جیسا کہ علماء نے صراحت کی ہے۔

قال السيوطي: ''مذهبنا و مذهب جمهور العلماء مس المصحف للمحدث، سواءً كان حدثًا أصغر أم أكبر'' (الاتقان في علوم القرآن: ۲۲۵۹)۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: ''كان أعظم التعظيم أن لايقرب منها الإنسان إلا بطهارة كاملة'' (حجة الله البالغة بحواله آثار التنزيل: ۲/ ۴۵، دار المعارف، لاہور)۔

قرآن کریم کی بڑی تعظیم یہ ہے کہ انسان بغیر پوری طہارت کے اس کے قریب نہ آئے۔

پھر "لا يمسه إلا المطهرون" (سورۂ واقعہ: ۷۹) میں چھونے کے دو مفہوم ہیں:

۱- جو لوگ صاف دل اور پاک اخلاق رکھتے ہیں، وہی اس کے علوم وحقائق تک ٹھیک رسائی پا سکتے ہیں، اس صورت میں مس کے معنی مجازی ہوں گے۔

۲- اس قرآن کو بغیر وضو کے ہاتھ لگانا جائز نہیں، اس صورت میں مس کے معنی حقیقی ہوں گے اور "مطهرون" سے طہارتِ کاملہ کے حاملین مراد ہوں گے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: ''إن فيه حمل المس على الحقيقة والأصل في الكلام الحقيقة واحتمال غيرها بلا دليل لايقدح في صحة الاستدلال فلا ينافي ذلك القطعية'' (رد المحتار: ۱/ ۱۶۶)۔

یہاں لفظ مس اپنے حقیقی معنوں پر محمول ہے اور کلام میں اصل یہی ہے کہ حقیقی معنی لیے جائیں، کسی دوسرے معنی کا احتمال، جس کے لیے کوئی دلیل بھی نہ ہو، اصل استدلال کی صحت پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتا۔ اھ (آثار التنزیل: ۲/ ۴۶-۴۸، دار المعارف، لاہور)۔

مذکورہ تفصیلات سے دو باتیں بہ طور خاص واضح ہوگئیں: (۱) قرآن کریم کا اطلاق محض ترجمہ پر نہیں ہوسکتا، اسے مضمون قرآن کا نام تو دیا جاسکتا ہے، لیکن بعینہ قرآن کریم کا اس پر اطلاق درست نہیں، اس لیے کہ قرآن تو وہ ہے، جو لوحِ محفوظ میں درج اور جو منزل من السماء ہے، اس لیے محض ترجمہ قرآن کو اس طرح موسوم کرنا کہ یہ ہندی قرآن اور یہ انگریزی قرآن ہے -- جائز نہیں۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ جب وہ قرآن کے حکم میں ہی نہیں تو اسے چھونے کے لیے وضو بھی ضروری نہیں۔

"فتاویٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء" میں ہے: "وعلى هذا يجوز للجنب والكفار مس ترجمة معاني القرآن بغير اللغة العربية كما يجوز مسهم تفسيره باللغة العربية" (فتوی رقم: ۸۳۲، السؤال: ۱۹۹۶، ۴/۱۳۳)۔

۲-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

رسول اللہ ﷺ کا مبارک خط بخاری شریف میں اس عبارت کے ساتھ موجود ہے:

"بسم الرحمٰن الرحيم، من محمد بن عبدالله و رسوله الى هرقل عظيم الروم. سلامٌ على من اتبع الهدى. أما بعد: فاني أدعوك بدعاية الاسلام، أسلم، تسلم، يؤتك الله أجرك مرتين. فان توليت فعليك اثم الأريسيين "ويآهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم ألا نعبدالا الله ولا نشرك به شيئًا. ولا يتخذ بعضُنا بعضًا آربابًا من دون الله، فان تولوا فقولوا اشهدوا بأنّا مسلمون" (سورة آل عمران: ۶۴)(صحيح البخاري: ۴۵۵۳، صحيح مسلم: ۱۷۷۳)۔

اس کے ذیل میں جو دو باتیں کہی جاتی ہیں، ان کا جواب یہ ہے:

(۱) اس میں مصارف کم آتے ہیں۔

جواب: یہ کوئی ایسی وجہ نہیں، جس پر شریعت کے ایسے اہم مسئلہ میں کوئی فرق پیدا ہوسکے، پھر اس کی ایک صورت یہ نکالی جاسکتی ہے کہ متن قرآن کچھ چھوٹے فونٹ میں شامل کیا جائے، اس طرح کی بعض اشاعت راقم الحروف کی نظروں سے بھی گزری ہیں۔

(۲-الف) جو لوگ متن قرآن کو نہیں پڑھ سکتے، انھیں متن والا ترجمہ قرآن دینے سے کیا فائدہ؟

جواب: جو لوگ متن قرآن نہیں پڑھ سکتے، انھیں متن والا ترجمہ قرآن دینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ انھیں اس بات کا ہمیشہ احساس رہے گا کہ وہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں، نہ کہ قرآن کریم، پھر یہ احساس ان میں قرآن کریم کو پڑھنے اور پڑھنا سیکھنے کا شوق پیدا کرنے میں بھی مدد و معاون ہوگا، ان شاء اللہ۔ ورنہ تو سہل پسند طبیعتیں اسی پر قناعت کرکے بیٹھ جائیں گی، جو کہ حفاظت قرآن کی شکل میں مسلمانوں پر واجب ہونے والی ذمہ داری میں مخل ہے۔

(۲-ب) ترجمہ قرآن بہت سے غیر مسلموں کو بھی دیا جاتا ہے، انھیں متن پر مشتمل ترجمہ قرآن دینے میں قرآن کی بے حرمتی کا بھی اندیشہ ہے، اس سے بچنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ انھیں متن کے بغیر ترجمہ قرآن دیا جائے، تاکہ قرآن کا پیغام بھی پہنچ جائے اور قرآن کی بے حرمتی کا اندیشہ بھی نہ ہو۔

جواب: راقم الحروف کے نزدیک اس مصلحت کے تحت اس بات کی گنجائش ہے، جبکہ یہ وضاحت کردی جائے کہ یہ اصل قرآن نہیں، بلکہ مضمونِ قرآن ہے اور یہ گنجائش حضرت تھانویؒ کے ملفوظ سے مستفاد ہے، جو کہ ابھی اوپر گزرا۔

اسے انگریزی میں ٹرانسلٹریشن (Transliteration) کہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کیا قرآن کو عربی اور خط عثمانی میں لکھنا واجب اور ضروری ہے یا مباح؟

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں: "للعلماء في رسم المصحف آراء ثلاثة: الرأى الاول: أنه توقيفي، لاتجوز مخالفته. وذلك مذهب الجمهور" (مناهل العرفان في علوم القرآن: ۲۱۰، دار الكتاب العربي)۔

جمہور علماء کے قول کے مطابق قرآن کریم کو عربی اور رسم عثمانی کے مطابق لکھنا واجب ہے، اس لیے کہ جس رسم عثمانی میں قرآن موجود ہے، وہ توقیفی ہے، نہ کہ اجتہادی۔

اسی طرح الدکتور عبدالقادر منصور بھی لکھتے ہیں:

''أن الرسم توقيفي لا اجتهادي۔ وأنه لايجوز مخالفته لأى سبب كان، سيما وأن الثقات من الائمة قد شددوا على التزامه'' (موسوعة علوم القرآن:۸۱، دار القلم العربي)۔

مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حدادؒ نے اپنے رسالہ ''خلاصة النصوص الجلية'' میں رسم خط میں مصحف عثمانی کی اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ثابت کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے:

''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان و منع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: و وجه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه وهو زهاء اثنتي عشر الفًا والإجماع حجة حسبما تقرر فی أصول الفقه'' (ص: ۲۵ بحوالہ جواہر الفقہ:۸۵، مکتبة تفسير القرآن، ديوبند)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ حکمت سے پُر ایک بات یوں ارشاد فرماتے ہیں:

متن میں قرآن مجید عربی ہی خط میں رکھنا چاہیے۔ ہندی (یا کسی بھی زبان کے) رسم الخط میں کوئی ضرورت نہیں، بے پڑھا (جب کسی نے ہندی بھی نہ پڑھی ہو) تو ہندی میں ہونے سے بھی کوئی نہیں پڑھ سکے گا اور پڑھانے سے عربی حروف کا یاد کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں...... ہندی یا ناگری میں بعض حروف عربیہ کی شکل ہی نہیں، جیسے: ق۔ ض۔ ط۔ ذ وغیرہ۔ پس جب ان کو (کسی) دوسری شکل میں لکھا جاوے گا، تو ظاہر ہے کہ اصلی حروف پڑھے بھی نہ جاویں گے (کیونکہ جب اصل حروف لکھے ہی نہیں گئے، تو بھلا پڑھے کیسے جاسکتے ہیں، پھر یہ قرآن کا پڑھنا کہاں ہوا، اس طرح تو) اس میں عمداً تحریف کا جائز رکھنا ہے، جو کہ حرام ہے (امداد الفتاویٰ: ۴/ ۴۴، زکریا بکڈپو، دیوبند، بتغیر)۔

حضرت مولانا محمد ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

ناگری ہو یا انگریزی، ہر دو خط؛ جس میں رسم خط مصحف عثمانی کی رعایت نہ ہوسکے، اس میں قرآن کا لکھنا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ کتابتِ مصحف میں رعایت رسم خط عثمانی واجب ہے، رہے وہ خط جن میں رعایت رسمِ خط مذکور ہوسکتی ہے، جیسے: فارسی یا اردو نستعلیق وامثالہ۔ ان میں قرآن کا لکھنا مختلف فیہ بین القولین ہے، مگر اقرب اور راجح یہ ہے کہ ایسے خطوط میں بھی پورا مصحف لکھنا جائز ہے، ایک دو آیت اتفاقیہ لکھنے کا مضائقہ نہیں، الغرض الفاظِ قرآنی کو صرف عربی خط ہی میں لکھنا چاہیے، ترجمہ و تفسیر کسی دوسری زبان میں اور دوسرے خط میں لکھنے کا مضائقہ نہیں (امداد الفتاویٰ: ۴/ ۴۴، زکریا)۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ نے اس موضوع پر بھی مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، جو جواہر الفقہ، جلد اول میں بنام ''تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط من مصحف الامام'' موجود ہے۔

موصوف تحریر فرماتے ہیں: باجماع صحابہ و تابعین اور باتفاق ائمۂ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحفِ عثمانی، جس کو اصطلاح میں 'امام' کہا جاتا ہے، اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصاً کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اُس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے، جس کی کوئی ملحد بھی صراحتاً تجویز نہیں کرسکتا۔

صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے طرز عمل سے واضح کردیا کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت ضروری اور لازم ہے، کسی عجمی زبان میں بدون قرآنی عربی عبارت کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم خط کی حفاظت بھی ضروری ہے، کسی دوسرے رسم خط میں لکھنا اُن کا جائز نہیں کہ اس میں رسم عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے، جو باجماع امت حرام ہے۔ خصوصاً ایسے رسم خط میں جن میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا، جیسے انگریزی رسم خط ہے کہ اس میں حرکات (زبر، زیر، پیش) کو بھی بشکل حروف لکھا جاتا ہے، ایسا لکھنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعاً تحریف قرآن ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے، اُس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگرچہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو، قرآن کی کتابت جائز نہیں۔ مثلاً اوائل سورت میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کو مصاحف عثمانی میں بحذف الف لکھا ہے اور ''اقرأ باسم ربك الذی خلق'' (سورۂ علق: ۱) میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے، اگرچہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں، مگر باجماع امت اسی کی نقل واتباع ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا عربی رسم

خط میں بھی جائز نہیں، تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ (جواہر الفقہ: ۱/ ۷۷-۷۴، مکتبۂ تفسیر القرآن، دیوبند، بتصرف)۔

ریاض اور سعودی عرب کے کونسل کے کبار علماء کی بھی یہی رائے ہے، ملاسوالیہ حظہ فرمائیں، ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں:

اسلامی فقہی کونسل نے اس خط کو ملاحظہ کیا، جسے شیخ ہاشم وہبۃ عبدالعال نے جدہ سے ارسال کیا ہے اور جس میں انھوں نے عثمانی رسم الخط کی املائی رسم الخط میں تبدیلی کے مسئلہ کا ذکر کیا ہے، تو کونسل نے اس موضوع پر گفتگو بھی کی اور اس موضوع سے متعلق کونسل کبار علماء، ریاض کی قرارداد نمبر: ۷۱ مجریہ ۲۱ /۱۰/ ۹۹ ۱۳ھ کو بھی ملاحظہ کیا، جس میں بتایا گیا ہے کہ درج ذیل اسباب کا تقاضا ہے کہ قرآن مجید کی عثمانی رسم الخط میں کتابت ہی کو باقی رکھا جائے:

یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید کی عثمانی رسم الخط میں کتابت حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوئی اور انھوں نے کاتبین مصحف کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کی کتابت ایک معین رسم الخط میں کریں۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ان کے بعد سے لے کر اب تک کے مسلمانوں کا بھی اسی رسم الخط پر اتفاق ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین من بعدي'' (ابوداؤد: ۴۶۰۷، معجم الکبیر للطبرانی: ۱۸/ ۲۴۷، مستدرک حاکم: ۱/ ۹۷)
(میری اور میرے بعد کے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرو)۔

سیدنا عثمان، سیدنا علی اور دیگر تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اقتداء اور ان کے اجماع کے مطابق عمل کی وجہ سے یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن مجید کی کتابت عثمانی رسم الخط ہی میں کی جائے (فتاوی اسلامیہ: ۴/ ۴۵-۴۶، دارالسلام، ریاض)۔

رہا عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھنے کا مسئلہ اس کے متعلق مندرجہ رائے سمجھ میں آتی ہے:

ایسا کرتے وقت اوپر عربی الفاظ خط عثمانی میں ہوں، اس کے نیچے دوسری زبان میں اس کا تلفظ تقریبی انداز میں تعلیم کی خاطر لکھ دیں، جبکہ شروع میں یہ بھی واضح کردیا جائے کہ یہ اصلاً قرآن کے الفاظ نہیں، بلکہ وقت کی اور تبلیغ کی خاطر اس کا تقریبی تلفظ ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی تک معلم کا، یا معلم تک ہر آدمی کا پہنچنا آسان و ممکن نہیں ہوتا اور تبلیغ الفاظ قرآن کی بھی ضروری اور واجب ہے، کیونکہ عبادات میں اس کا دخل ہے تو ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت اس کی گنجائش ہونی چاہیے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ اجازت خود قرآن کریم کے اس نص سے ماخوذ ہے: (إلا ما اضطررتم إلیه)، یعنی اضطرار شدید ضرورت کو کہا جاتا ہے اور جو امر شرعاً ممنوع قرار دیا گیا ہو، وہ بعض شدید ضرورت کے وقت مباح ہوجاتا ہے اور اس کے کرنے کی شریعت کی طرف سے رخصت دے دی جاتی ہے (مستفاد من الفوائد البہیۃ فی شرح القواعد الفقہیۃ: ۱۸۷، مکتبۃ الاتحاد، دیوبند)۔

اگر ماہر علماء اور ماہرین لسانیات کی نگرانی میں نصوص کے صحیح تلفظ کو مرتب کردیا جائے، تو یقیناً اس میں حفاظت کا مقصود زیادہ حد تک ملحوظ رہے گا، ہاں اس ترتیب کی غرض محض رسم عثمانی کی حفاظت کی ہوگی، جب کہ قرآن کی عربی عبارت کو بھی ساتھ میں اسی ٹرانسلٹریشن کے اوپر لکھ دیا جائے، اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ ہر آدمی اپنا اجتہاد نہیں چلاسکے گا۔ پھر تلفظ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں حفاظت ملحوظ رہتی ہے، کیوں کہ مقاصد بعثت میں سے تلاوت بھی ہے۔

قال الله تعالیٰ: "هو الذی بعث فی الأمیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة وإن کانوا من قبل لفی ضلال مبین" (سورۃ الجمعۃ: ۲)۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

تیسرا سوال بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت سے متعلق ہے۔ بریل کوڈ ابھرے ہوئے حروف کو پڑھنے کا ایک ایسا طریقہ ہے، جو نابینا حضرات کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ واقعی یہ فی نفسہ ایک قابل ستائش پیش رفت ہے، جس سے بصارت سے محروم لوگوں تک علم وفن کی رسائی بہت حد تک آسان ہوگئی ہے۔ اب تو اس کی مدد سے رسائل وجرائد بھی شروع ہوگئے ہیں، اس میں مزید ترقی بھی ہونی چاہیے اور یقیناً دینی معلومات کو اس کے ذریعہ پیش کرنا کار ثواب ہوگا۔

جہاں تک اس میں کتابت قرآن کا سوال ہے، تو ہماری معلومات کے مطابق یہ اصلاً حروف نہیں ہوتے، بلکہ چھ نقطوں کی مدد سے حروف اور ہندسوں کی علامتیں بنائی جاتی ہیں۔ حروف شناسی کا یہ طریقہ پیرس کے ایک مدرس لوئی بریل (۱۸۰۹-۱۸۵۲ء) نے ۱۸۴۳ء میں ایجاد کیا اور سوال میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ ''یہ نسبۃً موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نابینا افراد عموماً انگلیوں کے پوروں کے لمس سے اسے پڑھتے ہیں، یعنی جو کام بینا افراد اپنی نگاہوں سے لیتے ہیں، وہ کام بینائی سے محروم افراد انگلیوں کے پوروں کے لمس سے لیتے ہیں۔ پھر سوال یہ قائم کیا گیا ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا

درست ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی"۔

راقم الحروف کے مطابق اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس میں عربی اور رسم خط عثمانی کو محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔ رہی یہ بات کہ بریل کوڈ میں قرآن کی اشاعت سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہوجاتی ہے، وہ ہر قدم پر بینا افراد کے محتاج نہیں رہ جاتے، حفظ کرنے والے نابینا افراد اس کی مدد سے قرآن یاد کر سکتے ہیں، بھولنے کی صورت میں اس کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں، براہ راست قرآن کا مطالعہ کر سکتے ہیں، تو راقم کا خیال ہے کہ یہ کام رسم عثمانی کو قدرے ابھرے ہوئے انداز میں لکھ کر بھی لیا جا سکتا ہے (اس صورت میں وضو وغیرہ کے متعلق وہی احکام ہوں گے، جو کہ عامۃ قرآن کریم کے نسخے کو چھونے سے متعلق ہوتے ہیں)، ویسے بھی مشاہدہ یہ ہے کہ نابینا حضرات کی قوت لامسہ دیگر حضرات سے قوی تر ہوتی ہے، وہ بآسانی نوٹوں کو چھو کر معلوم کر لیتے ہیں کہ دس کا ہے یہ بیس کا وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں لگتا ہے اس جانب تھوڑی سی محنت اور توجہ سے اس میں خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ رہا حفظ قرآن کا مسئلہ تو اس کے لیے قرآن کی آڈیو ریکارڈنگ سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

نیز جب اس طرح قرآن لکھنے کا ہی جواز نہیں، تو ان سوالوں پر گفتگو کرنا لا حاصل ٹھہرا کہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم کیا اصل قرآن کی طرح ہے کہ اس کو چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے یا وضو کے بغیر بھی اسے چھوا جا سکتا ہے؟ اگر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے، تو کیا اس کے کچھ مخصوص آداب و احکام ہیں؟

۴- موبائل پر قرآن مجید:

اس کے جواب میں پہلی بات یہ کہ موبائل میں ریکارڈ (RECORD) قرآن کی آڈیو (AUDIO) فائل یا اس کا متن محفوظ کرنا تو بلا کراہت درست ہے، ہاں جس وقت موبائل کا یہ متن اسکرین پر ظاہر ہوگا اس وقت اس کا حکم قرآن کا ہوگا، جس وقت یہ بند پروگرام کی صورت میں فون میمری یا کارڈ میمری میں ہوگا، اس وقت اس پر بیت الخلاء وغیرہ میں لے جاتے وقت قرآن کا حکم نہیں لگایا جائے گا اور اگر یہ موبائل کی اسکرین پر نظر آتا ہو تو اس صورت میں اسے بیت الخلاء میں لے جانا جائز نہیں ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن موجود ہو تو کیا موبائل ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہوگا، یا موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا، جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے، تو اس کے جواب میں بادی النظر میں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کے لیے وضو ضروری قرار دیا جائے گا اور موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور نہیں کیا جائے گا، جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے، اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ قرآن کے وہ غلاف جو عموماً قرآن کریم کے ساتھ جڑے ہوئے آتے ہیں اور جنھیں بآسانی قرآن کریم سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا، انھیں چھونے کے لیے بھی وضو کو لازم و ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن تحقیق کے مطابق، موبائل پر اس طرح جو آیات نظر آتی ہیں، وہ اصلاً ایسے نقوش ہیں، جنھیں چھوا ہی نہیں جا سکتا، کیوں کہ وہ اصلاً ایک سافٹ ویئر ہوتے ہیں، جن کے متعلق ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ نقوش بھی موبائل کے شیشے پر نہیں بنتے، بلکہ ریم (RAM) پر بنتے ہیں اور شیشے کے اُس پار سے نظر آتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا، جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی غلاف منفصل اور اس طرح کے غلاف کو فقہاء کرامؒ نے بلا وضو چھونے کی اجازت دی ہے۔

"فتاویٰ عالمگیری" میں ہے: "حرمة مس المصحف لايجوز لهما و للجنب و المحدث مس للمصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخيطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به، هو الصحيح، هكذا في الهداية، وعليه الفتوىٰ، كذا في الجوهرة النيرة" (۱/ ۳۹، دار صادر، بیروت)۔

اگر قرآن کریم ایسے غلاف میں ہو، جو اس سے جدا ہو، جیسے کوئی تھیلی یا ایسی جلد، جو اس میں سلی ہوئی نہ ہو تو اسے بلا وضو چھونا جائز ہے، اگر وہ غلاف قرآن کریم سے جڑا ہوا ہو، تو اسے بلا وضو چھونا جائز نہیں۔ اسی پر فتویٰ ہے۔

اور موبائل کی اسکرین کی مثال اس طرح سمجھیے، جیسے قرآن کریم کی کوئی آیت کسی ورق پر تحریر کی گئی ہو اور اسے شیشے کے کسی بکس میں بند کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں اور اس شیشے پر بلا وضو ہاتھ لگانا سب کے نزدیک درست ہے، بس یہی حکم موبائل کی اسکرین پر ظاہر قرآن کریم کا ہوگا۔

موبائل اسکرین پر آیت قرآن چھونے کا حکم اور موبائل کی تباہ کاری

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی[1]

بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت:

قرآن مجید کو بغیر متن کے ساتھ شائع کرنے میں قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف لفظی لازم آتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرأت سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قرأتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی کسی دوسری زبان میں نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز ہوگی، طریقہ یہ تھا کہ جب قرآن مجید کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلاکر لکھواتے اور ہر لفظ کا رسم الخط کاتب وحی کو تعلیم فرماتے، جو آپ ﷺ وحی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معرفت سے سیکھتے تھے، خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں یہ بات طے ہوئی کہ جو آیتیں اور سورتیں مختلف حضرات کے پاس لکھی ہوئی شکل میں ہیں ان سب کو کتابی صورت میں ایک جگہ جمع کردیا جائے تو کاتبین وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے بڑی احتیاط اور پوری توجہ سے اسی اصلی رسم الخط کے مطابق جو آپ ﷺ کے ارشاد کے بموجب آپ کی موجودگی میں لکھا گیا تھا پورا قرآن مجید لکھا، اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن مجید لکھوایا تو انہیں کاتبین وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو وہ عظیم الشان خدمت سپرد ہوئی، جبکہ پچاس ہزار صحابہ کرامؓ موجود تھے، لہٰذا اس مصحف عثمانی کے رسم الخط کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، چاروں ائمہ اس رسم الخط کو ضروری مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (الحجر: ۹) "ہم نے ہی قرآن مجید نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"۔

مذکورہ ارشاد میں صرف قرآنی الفاظ کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ الفاظ معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا وعدہ اور پیشینگوئی ہے، لہٰذا اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، معانی اور علوم القرآن کی حفاظت میں علمائے دین مشغول ہیں تو الفاظ، عبارت اور طرز ادا کی حفاظت میں قراء منہمک ہیں اور رسم الخط کی حفاظت کاتبین قرآن کررہے ہیں، جن کی پیروی ہم پر لازم ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ عربی میں "ح" اور "ہ" "ق" اور "ك" "ت" اور "ط" "ء" اور "ع" "س" "ص" اور "ث" "ض" "ز" اور "ظ" میں فرق ہوتا ہے، دوسری زبان میں اگر علامتیں بھی مقرر کی جائیں پھر بھی ناقص رہتی ہے، جس میں تحریر اور رسم الخط کی تحریف کے ساتھ ساتھ ادائیگی میں نمایاں فرق ظاہر ہوگا، جس سے بیسیوں غلطیاں اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائے گا اور ثواب کی جگہ عقاب اور رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا، جیسا کہ مشہور فرمان ہے کہ "بہت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ جن پر قرآن لعنت کرتا ہے"۔

حضرت امام ابن قیم جوزیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جس طرح امت کے لیے مطلب قرآنی کا سمجھنا اور اس کے حدود کو قائم رکھنا عبادت ہے، اسی طرح صحیح پڑھنا اور حروف کو طریقہ کے مطابق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

"قراۃ القرآن بالالحان معصیۃ والتالی والسامع اثمان" (فتاوی بزازیۃ: ۱۰/۳۷۹)۔

"قرآن کا غلط اور بے قاعدہ پڑھنا معصیت ہے، تلاوت کرنے والا اور سننے والا دونوں گنہگار ہیں"۔

۱- پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کتاب کے متن کو نظر انداز کردیا اور اس کے ترجمہ وتشریح کو مرکز توجہ بنالیا،

---

[1] دار عرفات، رائے بریلی۔

اسی لیے فقہاء نے متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ لکھنے کو منع کیا ہے۔

''إن اعتاد القرأة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفًا بها يمنع، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (ردالمحتار: ا/ ۳۵۹)۔

قرآن مجید کی آیات لکھتے ہوئے ان کے ساتھ ترجمہ لکھنا چاہیے، یہ حکم ہر زبان کے ترجمہ کے لیے ہے، بغیر متن کے صرف ترجمہ لکھنا درست نہیں۔ البتہ ضرورت کے وقت اسے خریدنے اور تقسیم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسی طرح دعوت اسلام کے نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کو قرآن مجید یا اس کا ترجمہ دینا جائز ہے، قرآن مجید چھونے کے لیے وضو کرنے کا حکم مسلمانوں کے لیے ہے، جو لوگ دائرۂ ایمان میں داخل ہی نہیں ہوئے، وہ اس حکم کے مخاطب نہیں ہیں، کیونکہ غیر مسلم حضرات جب تک ایمان نہ لائیں شریعت کے فروعی احکام ان سے متعلق نہیں ہوتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو جو خطوط لکھے، ان خطوط میں بھی قرآن مجید کی آیات تھیں، حالانکہ وہ غیر مسلم تھے، البتہ اگر کسی غیر مسلم سے قرآن کی توہین کا اندیشہ ہو تو اسے قرآن نہ دینا چاہیے (کتاب الفتاوی: ا/ ۴۶۱)۔

دعوتی مقاصد کے تحت غیر مسلم کو قرآن مجید دے سکتے ہیں۔

''قال أبوحنيفة رحمة الله عليه: اعلم النصراني الفقه والقرآن لعله يهتدي ولايمس المصحف، وإن اغتسل ثم مس لابأس، كذا في الملتقط'' (ہندیہ ۵/ ۳۲۳)۔

''فتاوی ندوۃ العلماء'' میں ہے کہ: جب یہ یقین ہو کہ غیر مسلم قرآن کی بے حرمتی نہیں کرے گا اور یہ کہ اس قرآن کو پڑھ کر ہدایت پا سکتا ہے تو اسے قرآن مجید دے سکتے ہیں، اس لیے کہ قرآن مجید خود اپنے سلسلہ میں کہتا ہے کہ "ھدی للناس" (سورۂ بقرہ: ۱۸۵) ظاہر بات ہے کہ لفظ ناس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، لہٰذا جب قرآن کو پڑھیں گے اور سمجھیں گے نہیں تو قرآن ان کے لیے باعث ہدایت کیسے بن سکتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کو خط بھیجا تھا، اس میں قرآن کی آیتیں تھیں (فتاوی ندوۃ العلماء: ا/ ۱۰۰)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، جو عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس کے الفاظ من جانب اللہ ہیں، اس لیے جیسے اس کے معانی مقصود ہیں الفاظ بھی مقصود ہیں، اسی لیے قرآن کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے جو مصحف میں لکھی ہوئی ہے اور جو یقینی طور پر نقل ہوتی آئی ہے۔

اس لیے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت میں عربی رسم الخط کی تحریف لازم آئے گی، دوسری بات یہ کہ عربی زبان کے بہت سے ایسے حروف ہیں جن کی ادائیگی کسی دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے بغیر متن قرآن کے کسی دوسری زبان میں قرآن مجید کی اشاعت صحیح نہیں ہے، البتہ اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان میں قرآن مجید کی کتابت کر کے شائع کیا جائے تو اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: قرآن کریم کو رسم عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا باجماع ناجائز ہے، لوگوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لیے عربی رسم الخط سکھایا جائے، عجمی رسم الخط میں لکھنا درست نہیں (فتاوی عثمانی: ا/ ۲۴۷)۔

کسی دوسری زبان میں قرآن مجید لکھنے کے لیے اگر فرق کے لیے مخصوص علامتیں بنالی جائیں اور ان کو اسی طرح رائج کر لیا جائے تا کہ پڑھنے والا اصل مخرج سے ادا کر سکے تو صحیح ہو سکتا ہے، مطلق لکھنے میں تلفظ صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوا اور مسلمانوں نے عرب کی سرزمین سے باہر قدم نکالا اور باہر کی سرزمین میں بسنے والوں نے اس دین کو قبول کیا جس کا صحیفہ عربی زبان میں تھا، اور جس کے پہلے مخاطب تھے، وہ سب عرب تھے، تو پھر انہوں نے عربی زبان سیکھی، اس کے قواعد مرتب کئے، اور جیسے جیسے

اسلام پھیلتا گیا غیر عرب اسلام میں داخل ہوتے گئے اور ان کو خدائی احکام سمجھنے کے لیے صحیح زبان جاننے کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے قواعد کا سہارا لیا اس بنا پر بہت سے علوم ایجاد ہوئے، اور قرآنی الفاظ کے ادا کرنے والوں کے طریق قرأت کے مدارس بن گئے جو قرأت سبعہ اور قرأت عشرہ کے نام سے مشہور ہیں اور ان سب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منظوری حاصل تھی۔ اور بہت سے قبائل ایسے تھے جن سے کوئی خاص مخرج ادا نہیں ہوتا تھا، خود حضرت بلالؓ کے بارے میں ایک روایت ہے کہ وہ حرف ''ش'' زبان سے ادا نہیں کر پاتے، اسی طرح ساتھ مخارج کا مسئلہ تھا اور ہر مخرج کو قبول کر لیا گیا، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إن هذا القرآن أنزل على سبعة أحرف فاقرء، وأما تيسر من القرآن''۔

''فتاوی رحیمیہ'' کے حوالہ سے ''محمود الفتاوی'' میں مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب نابینا حضرات کے لیے قرآن پڑھنے کے لیے مخصوص تحریر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

قرآن مجید عربی زبان کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے، اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توفیقی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرأت سبعہ وغیرہ شامل ہیں، اور ساری قرأتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کا اتباع واجب ہے اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لیے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لیے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہوا تنا سیکھ لینا چاہیے (محمود الفتاوی: ۴/ ۱۵۴)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے اور نہ رسم عثمانی، لیکن ضرورت کے وقت جیسے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جاتا ہے اسی طرح نابینا حضرات کے حق میں بھی یہ ایک طرح کی ضرورت ہے، اس لیے بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا نابینا حضرات کے لیے درست ہونا چاہیے۔

یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ عربی میں ''ح'' اور ''ہ'' ''ق'' اور ''ک'' ''ت'' اور ''ط'' ''ء'' اور ''ع'' ''س'' ''ص'' اور ''ث'' ''ض'' ''ذ'' اور ''ظ'' میں فرق ہوتا ہے، دوسری زبان میں اگر علامتیں بھی مقرر کی جائیں پھر بھی ناقص رہتی ہے، اگر ان کی ادائیگی صحیح الفاظ سے ہوتب تو صحیح ہونا چاہیے، اور اگر ادائیگی میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے تو صحیح نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس سے رسم الخط کی ادائیگی میں بیسیوں غلطیاں اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائے گا اور ثواب کی جگہ عقاب اور رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا۔ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن کی طرح تو نہیں ہے، لیکن جس طرح اردو تفاسیر کے لیے وضو کرنے کے بارے میں کہا جاتا ہے اسی طرح اس کو چھونے کے لیے وضوء کا کرنا بہتر ہوگا، اس لیے کہ عام تفسیروں کی طرح بریل کوڈ بھی ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

موجودہ وقت میں کپڑوں، کھانے پینے کی چیزوں اور دیگر اشیاء ضروریہ کی طرح ''موبائل'' بھی زندگی کی ضرورت بن گیا ہے، اور ایسی ضرورت کہ انسان اس کے بنا خود کو اکیلا، معاشرے سے کٹا ہوا اور نا تمام تصور کرتا ہے، بعض حالات میں یہ تصور صحیح بھی ہے، مگر یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اسے برتنا جانتے ہیں اور اس کا مناسب طریقہ استعمال جانتے ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ زیادہ تر موبائل ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اس کا استعمال بھی نہیں جانتے، انہیں پتا ہی نہیں کے منافع اور مضرات کیا کیا ہے؟ کب اس کا استعمال مفید ہے اور کب مضر؟ نتیجتاً اس کی خرابیوں کے شکار ہو کر اپنا دین، ایمان، عزت، آبرو اور اللہ کی دی ہوئی عقلوں کو گھن لگا لیتے ہیں، بالخصوص بچے اس مرض کے زیادہ شکار ہیں۔

آج موبائل فون کا استعمال اس کے اصل مقصد میں کم اور دوسرے مقاصد کے لیے زیادہ سے زیادہ کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم محرمات ومنہیات کے دلدل میں پھنستے چلے جارہے ہیں، موبائل فون امراء، رؤساء، وزراء اور ساہو کاروں سے گزر کر عام انسانوں، بلکہ مزدور پیشہ طبقہ میں بڑی تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔

ایک وقت وہ تھا جب بیسک فون یا لینڈ لائن بھی ہر کس وناکس کے یہاں نہیں ہوتا تھا، پھر اس کا حاصل کرنا بھی بڑا دشوار کام تھا، گاؤں اور قصبات میں فون صرف چند بڑے لوگوں کے پاس ہوا کرتا تھا، لیکن آج حالت یہ ہے کہ موبائل کی دکانوں پر سم کارڈ فروخت ہوتے ہیں، یہ سم اتنے

سستے ہیں کہ معمولی انسان بھی خرید سکتا ہے، حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اسکولی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں موبائل ہوتا ہے، جبکہ پہلے کتابیں رکھنے کے لیے بستہ میسر نہیں ہوتا تھا، اور ایک وقت یہ ہے کہ اسکولی بچے بہترین قسم کا موبائل سیٹ رکھتے ہیں، اور سم کارڈ فروخت کرنے والی کمپنیوں نے اس کاروبار کی حالت یہ کردی ہے کہ اگر سم کی قیمت دس روپئے ہے تو اس میں دس ہی روپئے کا یا اس سے زیادہ کا ٹاک ٹائم ملتا ہے، اور اس پر بھی پابندی نہیں کہ ایک نام سے ایک ہی سم خریدا جاسکتا ہے، بلکہ جتنے چاہیں خرید سکتے ہیں، اور اب صورت حال یہ ہے کہ ہر ہفتہ ایک نیا سم خریدتے ہیں اور اس کا ٹاک ٹائم استعمال کر کے اسے پھینک دیتے ہیں۔

موبائل کمپنیاں طرح طرح سے نئی نسلوں کو گمراہ کررہی ہیں، مثال کے طور پر لڑکی لڑکے کو آمنے سامنے بات کرنے میں جھجک ہوتی ہے، بات کرنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں، لیکن اس موبائل فون اور ان کی کمپنیاں یہ سبق دے رہی ہیں کہ یہ جھجک موبائل فون دور کرسکتا ہے، اس لیے کہ موبائل فون پر آمنا سامنا نہیں ہوتا اور بہتر طور پر ایک دوسرے کو رام کہانی سنائی جاسکتی ہے۔

ان کمپنیوں نے اپنی زہرناکی اور اس قسم کے فحش اشتہارات پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ اپنے متعلقہ دفتروں اور برانچوں میں بھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ملازم رکھا، استقبالیہ پر انہیں کو مقرر کیا، دفتروں میں نو وارد کی رسائی کے لیے وہی مقرر ہیں، دفتروں میں آنے والے فون کو بھی وہی اٹھاتی ہیں، مردوں سے بغیر حجاب ونقاب کے گفتگو کا فریضہ وہی انجام دیتی ہیں، اور تہذیب جدید نے اسی کو آزادیٔ نسواں قرار دیا ہے۔

موبائل فون نے حالیہ دنوں میں کافی تباہی مچائی ہے، اس سے جہاں ایک طرف لڑکے اپنی گرل فرینڈز اور عاشق اپنی معشوقاؤں کی ننگی اور عریاں تصویریں کھینچ کر بلیک میل کرنے کی کوشش کررہے ہیں، تو دوسری طرف اس سے لوگوں کی نجی زندگیوں پر تانک جھانک کے لیے دریچوں کا کام لیا جارہا ہے۔

موبائل فون میں اگر یہ موازنہ کیا جائے کہ اس کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصانات تو آدمی یہ کہنے پر مجبور ہوجائے گا کہ اس کے فوائد سے کہیں زیادہ نقصانات ہیں، روپئے پیسے کی ناقدری، فضول خرچیوں کی کثرت، ایکسیڈنٹ کے آئے دن واقعات، اغوا اور زنا کاری کی بڑھتی ہوئی واردات، عشق ومحبت کے لیے ہری جھنڈی، رنگین اور سنگین تصویریں اور ان کی ارسال وترسیل، فحش اور گندے پیغامات، جھوٹ کی نئی نئی شکلیں اور اس کی کثرت، دھوکہ، فریب، ساز ونغمات، رنگین وسادہ فلمیں، فلمی ستاروں کی شرمناک تصویریں، گانوں اور مزامیر کی بھرمار، موبائل گھنٹیوں کے پس پردہ ہر کس وناکس کے کانوں تک گانوں کی رسائی ان جیسی بہت سی واہیات وخرافات سے مالامال موبائل فون نے بڑی برق رفتاری کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔

گانوں کو سننا اور سنانا ناجائز اور حرام ہے، چاہے اس کی آواز کو کتنا بدل دیا جائے، احادیث میں گانے بجانے والے سامانوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے:

حضرت بنانہؓ فرماتی ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس موجود تھی ایک عورت ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، وہ لڑکی جھانجن پہنے ہوئے تھی، جس سے آواز پیدا ہورہی تھی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: جب تک اس کے جھانجن نہ کاٹے جائیں میرے پاس اسے ہرگز نہ آنے دیا جائے، میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

''جس گھر میں بجنے والی چیز ہو اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے'' (ابوداؤد: ۴۲۳۱)۔

کوشش کی جائے کہ اپنی اولاد بالخصوص بچیوں کو موبائل کی وبا سے دور رکھا جائے، کیونکہ شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے، نوجوان نسلوں کے اخلاق کو برباد وتباہ کرنے میں موبائل کا بہت زیادہ دخل ہے۔

اسی طرح کالج میں پڑھنے والے طلباء وطالبات، مدرسوں اور اسکولوں میں زیر تعلیم بچوں اور بچیوں کے لیے موبائل بہت مہلک ثابت ہوا ہے، طلبہ کی زیادہ تر توجہ موبائل پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے، اور تعلیم کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔

سائنسی اعتبار سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ موبائل فون منشیات کی طرح صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے، اور مستقل ۲۰-۱۵ سال تک استعمال کرنے سے دماغ میں ٹیومر (رسولی) کے ہونے کا خطرہ پیدا ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ موبائل کی شعاعیں بھی بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں، اس کے علاوہ ذہنی اور اعصابی تناؤ، نیند کے اوقات میں تبدیلی، دماغی خلیات کو نقصان، سامنے کی جیب میں رکھنے سے براہ راست

دل میں اثر، پینٹ کے پیچھے والی جیب میں رکھنے سے ۳۰ رفیصد مادہ منویہ کے جراثیم میں کمی، حافظہ کی کمزوری، نسیان، قوت فکر کا متأثر ہونا اور اس قسم کے دیگر امراض کے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ اور خدشہ ہے۔

نوجوان نسل تو اب شاید اپنے مشغلے بدل چکی ہے، راستوں، راہوں پہ آتے جاتے، گھروں میں بیٹھے، سواروں میں، کالجز اور یونیورسٹیز کے احاطوں میں ٹہلتے، کھانا کھاتے، پانی پیتے، لیٹتے بیٹھتے، ہنستے بولتے بس انگوٹھے کی ایکسر سائز جاری رہتی ہے، پیغامات آرہے ہیں، پیغامات جارہے ہیں، خاص طور پر ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر سیکڑوں تک فارورڈ کرنے کا رجحان تو کچھ زیادہ ہی زور پکڑ گیا ہے۔

موبائل فون صرف بات کرنے کا ایک آلہ نہیں، بلکہ بیک وقت فون بھی ہے، کیمرہ، ریڈیو، ایف ایم، انٹرنیٹ سسٹم، ٹی وی، ڈائری، گھڑی، الارم، ریمائنڈر، کیلکولیٹر، ٹیپ ریکارڈ، گیم، مراسلت نیز انسانی طبائع کو جس چیز سے دلچسپی ہو اس کا سامان ایک چھوٹے سے موبائل میں فراہم ہے۔

• زنا، شراب، نغمہ ورقص، عیش ونشاط، ٹیلی ویزن، ڈش انٹینا، ٹی وی، وی سی آر، آڈیو، کیمپوٹر اور انٹرنیٹ کے شانہ بشانہ موبوئل کی ہولناکیاں اور ہلاکت آفرینیاں اپنی منزل کو تجاوز کر چکی ہے۔

اس لیے سنجیدہ فکر رکھنے والوں کو موبائل کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں کا سد باب کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ عوام الناس اس کی برائیوں اور بیماریوں سے اپنی حفاظت کر سکے۔

عام طور پر بہت سے مسلمان اپنے دینی مزاج کی وجہ سے موبائل فون میں قرآنی آیات وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں، اس سلسلہ میں فقہی عبارت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات، ذکر وتسبیح، درود شریف وغیرہ کے کلمات اور ایسی نظمیں یا نعتیں جو ذکر اللہ پر مشتمل ہوں اور ان سے مقصود ذکر اللہ ہو، مثلاً اسماء حسنیٰ پر مشتمل نظم وغیرہ ایسی تمام چیزوں کو ذکر کے علاوہ کسی اور جائز مقصد کے لیے استعمال کرنے کے جواز اور عدم جواز کا مدار اغراض ومقاصد پر ہے، اگر مقصد شرعاً درست ہو تو اس مقصد کے لیے ان کا استعمال جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔

وہ مقاصد دو قسم کے ہو سکتے ہیں: (۱) تذکیر لذکر اللہ۔ (۲) اعلام۔

مذکورہ بالا مقدس کلمات کو فون سننے کی گھنٹی کی جگہ استعمال کرنے سے اگر یہ مقصد ہو کہ کوئی شخص فون کرے تو جب تک فون نہ اٹھایا جائے اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام، ذکر اللہ یا دینی یا اصلاحی مضامین پر مشتمل نظموں یا نعتوں سے مستفید ہوتا رہے، تو اس مقصد کے لیے مذکورہ بالا مقدس کلمات کو فون سننے کی گھنٹی کی جگہ استعمال کرنے کی فی نفسہ گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن چونکہ مذکورہ بالا مقصد کے حصول میں شرعاً دو خرابیاں لازم آسکتی ہیں، اس لیے ان سے بچنا ضروری ہوگا۔

(۱) پہلی خرابی یہ لازم آتی ہے کہ اچانک فون اٹھانے کی صورت میں قرآنی آیات درمیان میں کٹ جائیں گی، اور اس میں ان آیات کی بے ادبی لازم آتی ہے، لہٰذا آیات اس مقصد کے لیے استعمال نہ کی جائیں، نہ سننے میں اور نہ سنانے میں۔

(۲) دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے کہ جس شخص کو فون کیا گیا ہے بعض اوقات وہ بیت الخلاء میں ہوتا ہے تو فون آنے پر ایسی حالت میں مذکورہ مقدس کلمات کے موبائل فون پر جاری ہونے میں بے ادبی ہوگی، لہٰذا مقدس کلمات فون سننے کی گھنٹی کی جگہ استعمال نہ کئے جائیں۔

اور اگر دوسرا مقصد ''اعلام'' پیش نظر ہو، یعنی مذکورہ مقدس کلمات کو اس لیے موبائل فون میں مقرر کیا جائے، تاکہ اس کے ذریعہ فون آنے کی اطلاع ملنے کا فائدہ حاصل ہو تو اس مقصد کے لیے مذکورہ بالا مقدس کلمات کو استعمال کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ مقدس کلمات کو عام دنیاوی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر خریدار کو کپڑے کی عمدگی بتانے کے لیے تاجر نے کپڑا دکھاتے ہوئے ''سبحان اللہ'' کہا یا ''درود شریف'' پڑھا، اور مقصود صرف خریدار کو عمدگی سے آگاہ کرنا ہے تو یہ مکروہ ہے (درمختار:۶/۳۶۱)۔

موبائل میں رنگ ٹون کی جگہ قرآنی آیات یا کلمات اذان وغیرہ فیڈ (feed) کرنے میں ابتذال وامتہان، یعنی تحقیر وتذلیل لازم آتی ہے، اس لیے یہ ناجائز ہے، اور فقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے (ہندیہ:۵/۵۱۶) الأمور بمقاصدها۔ (الاشباہ والنظائر: ۹۳)۔

موبائل کی اسکرین پر بہت سے لوگ قرآنی آیات، دعائیں یا اسماء حسنیٰ میں سے کوئی اسم یا خانہ کعبہ وغیرہ کی تصویر لگاتے ہیں، اس میں بھی

محبت کا جذبہ ہوتا ہے، لیکن اسکرین پر ان کو رکھنے میں بعض اوقات ان کی بے حرمتی ہو جاتی ہے، مثلاً بیت الخلاء میں اسکرین کی لائٹ جل جاتی ہے یا اچانک بیت الخلاء میں فون آجائے اور موبائل نکالنا پڑے، اسکرین پر رکھنے کی صورت میں بے حرمتی کا شبہ ہوتا ہے، اس لئے ان چیزوں کی حرمت وتقدس کے پیش نظر ان کو اسکرین پر نہیں لگانا چاہیے۔

قرآن کریم یا دینی چیزیں جو موبائل میں لوڈ کی جاتی ہیں وہ اس کی میموری میں الکٹرانک ذرات کی شکل میں موجود ہوتے ہیں اور غیر مرئی ہوتے ہیں، جب انہیں کھولا جاتا ہے تو اس وقت سسٹم ان ذرات کو مرئی شکل دے کر اسکرین پر لاتا ہے، اس اعتبار سے قرآن کریم یا دیگر دینی کتابوں کو موبائل میں رکھنا جائز ہے، اور اس موبائل کے ساتھ بیت الخلاء میں جانا بھی درست ہے، بشرطیکہ قرآن کریم کے صفحات اسکرین پر موجود نہ ہوں، البتہ ایسا موبائل بیت الخلاء میں لے جانے سے ممکنہ حد تک پرہیز کرنا بہتر ہے، تاکہ بے ادبی کا شائبہ نہ ہو۔

جس موبائل میں قرآن مجید ہو اس کو بغیر وضوء یا حالت جنابت میں چھونا جائز ہے، اگرچہ اس میں قرآن ہے، مگر قرآن کا وجود اس میں غیر مرئی اور الکٹرانک منتشر غیر مرئی ذرات میں ہے، جو کہ قرآن کے حکم میں نہیں ہے، البتہ اگر قرآن کے صفحات اسکرین پر موجود ہوں تو حالت جنابت میں یا بغیر وضوء اس اسکرین کو چھونا جائز نہیں ہے، کیونکہ قرآنی آیات چاہے کاغذ پر لکھی ہوں یا شیشہ پر یا کسی اور چیز پر ان کو بلا وضوء چھونا درست نہیں ہے۔

فقہاء لکھتے ہیں: ''لا یجوز له مس شئ مکتوب فیه شئ من القرآن من لوح أو درهم أو غیر ذالك إذا کان آیة تامة'' (شامی: ۱/ ۴۸۸)۔

''بے وضوء یا ناپاک انسان کے لیے کسی ایسی چیز کا چھونا جائز نہیں ہے جس میں قرآن کی کوئی آیت لکھی ہو، چاہے کسی تختی پر ہو یا کسی درہم پر یا اس کے علاوہ کسی اور چیز پر، بشرطیکہ پوری آیت ہو''۔

اگر میسیج میں قرآن کریم، احادیث اور اسلامی کلمات وغیرہ موصول ہوں اور ان کو مٹانے کی ضرورت درپیش ہو، تو اس کے مٹانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ میسیج کی تحریر کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کی طرح بھی نہیں ہے، جن کو پھاڑنے میں بے ادبی کا شائبہ بھی ہوتا ہے، جبکہ ضرورت کی صورت میں کاغذ پر سے بھی قرآنی آیات واحادیث کو مٹانے کی اجازت ہے۔

''درمختار'' میں ہے:

''الکتب التی لاینتفع بها یمحی عنها اسم الله وملائکته ورسوله ویحرق الباق'' (درالمختار: ۶/ ۴۲۲)۔

''وہ کتابیں جن سے فائدہ اٹھایا نہیں جاتا ہے ان سے اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کا نام مٹا دیا جائے اور بقیہ کاغذ کو جلا دیا جائے''۔

اس لیے معتبر اسلامی ایس ایم ایس بھیجنا اور بوقت ضرورت اس کو مٹانا درست ہے، البتہ کسی میسیج کو دوسرون تک بھیجنے سے پہلے ان کے صحیح اور معتبر ہونے کی تحقیق ضروری ہے، خاص طور سے اس میسیج کی تحقیق کر لی جائے جو قرآن وحدیث کی طرف منسوب ہو، کیونکہ کسی غلط بات کو اسلام کے نام پر پھیلانا یا کسی ایسی بات کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب کرنا جو آپ نے نہ کہی ہو سنگین جرم ہے۔

''کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے لوگوں کے بارے میں جہنم کی وعید بیان فرمائی ہے'' (بخاری، مسلم)۔

بذریعہ موبائل دینی بیانات اور نعتیہ نظموں وغیرہ کا سننا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں تصاویر، میوزک اور عورتوں کی آواز نہ ہو، نیز قوالی وغیرہ کا سننا جائز نہیں ہے (امداد الفتاوی: ۵/ ۲۴۹- کفایۃ المفتی: ۹/ ۲۰۷)۔

اسی طرح موبائل پر آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب ہو جائے گا، کیونکہ موبائل سے آنے والی آواز کا حکم لاؤڈ اسپیکر کی آواز کے مانند ہے (دینی مسائل اور ان کا حل: ۳۶۸، زبدۃ الفتاوی: ۱/ ۲۴۰)۔

☆☆☆

عربی متن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا عبدالباسط فیاض قاسمی شراوستی[1]

قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کی آخری کتاب ہے جسے اللہ نے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج نازل فرمایا۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں نازل کیا۔ قال تعالیٰ: "إنا جعلنه قرء انًا عربيًا لعلكم تعقلون" (سورۂ یوسف:)، وقال تعالیٰ: "قرء انا عربيا غيرَ ذي عوج لعلهم يتقون" (سورۂ زمر: ۲۸)، پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا اور انہیں یاد کرایا، ساتھ ہی قرآن کے احکام اس کے معانی و مفاہیم اور مراد خداوندی کو قولاً فعلاً اور تقریراً واضح کیا۔ نیز خطبۂ حجۃ الوداع میں "فليبلغ الشاهد منكم الغائب" (حدیث) کا اعلان عام فرمایا، اور ایک دوسری حدیث میں "بلغوا عني ولو آ ية" (حدیث) کا پیغام دیا۔ اور ظاہر ہے امت کے جمیع افراد تک تبلیغ دین عادۃً ان کی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو عجمی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا، تاکہ تبلیغ دین میں سہولت اور پیغام خداوندی کو پہونچانے میں آسانی ہو؛ چنانچہ تبلیغ دین کی خاطر آہستہ آہستہ مسلمانوں میں عجمی زبانوں کے سیکھنے کا رواج ہوگیا، مسلمانوں نے اہل عجم کے درمیان عجمی تحریر وتقریر کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا، تا آنکہ عجم میں بھی اسلام خوب مضبوط ہوگیا اور ان میں بڑے بڑے عباقرہ اور یگانہ روزگار علماء تیار ہوئے، پھر رفتہ رفتہ جہاں قرآن مجید کی عربی زبان میں تفسیریں لکھی گئیں وہیں علماء عجم نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے تراجم وتفاسیر لکھنے شروع کردیئے، تاکہ عوام الناس جو عربی زبان سے ناواقف تھے وہ ترجمہ وتفسیر کے ذریعہ قرآن کے پیغام اور اس کے معانی ومفاہیم کو آسانی سے سمجھ سکے۔ چنانچہ مختلف زبانوں میں قرآن کے ترجمے وتفسیر لکھے گئے اور انہیں خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابھی تک یہ ترجمے قرآن کریم کی اصل عبارت کے ساتھ لکھے جارہے تھے، کسی نے بھی محض ترجمہ قرآن لکھ کر شائع کرنے کی جرأت نہ کی، گویا ترجمہ قرآن کی متنِ قرآن کے ساتھ کتابت واشاعت پر عملاً امت کا اجماع رہا ہے۔

مگر ابھی چند سالوں سے بعض جگہ صرف ترجمہ قرآن کی کتابت واشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ اور بعض لوگ اسے بے دریغ جائز سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس طرح ہر ایک کے لیے قرآن سے استفادہ اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ تک پیغام قرآن کی رسائی آسان ہوجائے گی۔

لیکن امت کا سوادِ اعظم اور بڑا طبقہ اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس طرح بغیر متنِ قرآن کے محض ترجمہ کی کتابت واشاعت کو تحریف اور زندقہ سے تعبیر کرتا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ایسا عمل تحریف فی الدین اور اصل کے ضیاع کا مقدمہ اور سبب ہونے کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہے اور اس پر تمام ماہرین تفاسیر کا اجماع ہے، کیونکہ جب قرآن کا محض ترجمہ شائع کیا جائے گا یا بیان کیا جائے گا تو ہر شخص آسانی سے اپنے عقائد ونظریات کی روشنی میں جو چاہے گا اس میں ترمیم اور کمی بیشی کرسکے گا اور پڑھنے اور سننے والا یہی سمجھے گا کہ قرآن یہی ہے حالانکہ وہ قرآن نہ ہوگا اور تحریف کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجائیگا جو اصل قرآن کے ضائع ہونے کا باعث ہوگا۔

نیز اہل زیغ کو اس طرح قرآن کے حوالے سے لوگوں کو شکوک شبہات میں ڈالنے اور متنفر کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا، اور بہت آسانی سے گمراہ کرنے میں کامیابی مل جائے گی۔

نیز ایک غلط رواج چل پڑے گا کہ لوگ صرف تراجم کے پڑھنے پر اکتفاء کرلیا کریں گے اور اصل قرآن سے بے تعلق اور اجنبی ہوجائیں گے اور ان کی اولاد جب اپنے والدین کو صرف ترجمہ پڑھتے دیکھے گی تو لازماً والدین سے زیادہ اثر لے گی اور عربی تلاوت سے دور ہوتی چلی جائے گی، بعید نہیں کہ ایسے اشخاص کی تیسری چوتھی نسل تک عربی تلاوت اس خاندان سے بالکل ہی مفقود ہوجائے۔

---

[1] استاذ حدیث وفقہ جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ، میرٹھ یوپی۔

نیز صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت سے عربی متن والے قرآن شریف کی اشاعت آہستہ آہستہ کم ہونے کا بھی خطرہ ہے۔

نیز یہ طریقہ اہل کتاب یہود ونصاریٰ کا ایجاد کردہ ہے اور مسلمانوں کو ان کی مشابہت اختیار کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے سے متعلق سخت وعید آئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''من تشبه بقوم فهو منهم'' (ابوداؤد کتاب اللباس / ۵۵۹)۔

اسی طرح دوسرے موقع پر موضع تشنیع میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''لتركبن سنن من كان قبلكم'' (ترمذی ۲/ ۱۴۱)۔

مذکورہ مفاسد کے علاوہ اور بھی بہت سے مفاسد اور نقصانات ہیں جن کی وجہ سے علماء امت نے ہمیشہ اس طریق کو ناجائز سمجھا اور اس کی سختی سے نکیر کی اور اس کی شناعت وقباحت کو واضح کیا۔ اور بعض علماء نے اس موضوع پر مستقل رسالے تصنیف کیے جن میں سے علامہ حسن شرنبلالی کا رسالہ ''النفحة القدسية في أحكام قراءة القرآن بالفارسية'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، اسی طرح اردو میں حضرت تھانوی کا ایک مفصل فتویٰ اس موضوع پر ہے جس میں تقریباً دس مفاسد کی وجہ سے اس طریق کو ناجائز قرار دیا ہے۔

صاحب ہدایہ امام برہان الدین مرغینانی ''التجنيس'' میں لکھتے ہیں:

''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن؛ لأنا أمرنا بحفظ النظم والتكلم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن'' (جواهر الفقه بحواله النفحة القدسية: ۱/ ۹۸)۔

معراج الدرایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''ويمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع، وأنه يكون معتمده زنديقًا'' (حوالہ بالا، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۱/ ۲۹۱، درمختار ۲/ ۱۸۷، موسوعہ فقہیہ متعلقہ بحث)۔

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ متنِ قرآن کے بغیر محض ترجمہ قرآن کی کتابت واشاعت ناجائز ہے تو ظاہر ہے اس کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہوگی؛ کیونکہ یہ اعانت علی المعصیت ہے جو شرعاً ممنوع ہے: قال تعالیٰ: ''ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (سورۂ مائدہ: ۲)۔

۲- غیر عربی رسم خط میں قرآن کی اشاعت کا حکم:

اللہ رب العزت نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے مختلف کتابیں نازل کیں، اور سب سے آخر میں قرآن مجید نازل فرمایا۔ اور اسے رہتی دنیا تک کے تمام انس وجن کے لیے سرچشمہ ہدایت بنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی امتوں پر جو کتابیں نازل ہوئیں وہ کچھ ہی عرصہ کے بعد تحریف وتغییر سے محفوظ نہ رہ سکیں، لیکن قرآن وہ واحد کتاب ہے جو ہر طرح کی تحریف وتغییر سے بالکل پاک ہے، اور قیامت تک اس میں تحریف تغییر ممکن نہیں؛ اس لیے کہ اس کی جمع وترتیب اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ رب العزت نے لی ہے۔ ارشاد ہے: ''إن علينا جمعه وقرءانه'' (سورۂ قیامہ: ۱۷) وقال تعالیٰ: ''إنا له لحفظون'' (سورۂ حجر: ۹)، نیز امت کو اس قابل بنایا کہ وہ قرآن مجید کی مکمل طریقے سے حفاظت کر سکے۔

یہاں یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ حفاظت قرآن کا تعلق جس طرح اس کے معانی ومفہوم سے ہے، اسی طرح اس کی زبان اس کے کلمات کی ادائیگی، حروف کی تعداد اور رسم خط سے بھی ہے۔

نیز ہمارے سامنے جو قرآن مصحف عثمانی کی شکل میں موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا اور یہی قرآن محفوظ من اللہ ہے، اس کی اتباع ہر چیز میں لازم وضروری ہے، اس کی مخالفت اور ادنیٰ تمیز ناجائز اور حفاظتِ قرآن کے خلاف ہے؛ چنانچہ عہدِ صحابہ وتابعین سے اجماعی طور پر اس کی اتباع کو ضروری ولازم سمجھا گیا اور قرآن کے رسم خط کی مخالفت اور ایک حرف کی کمی بیشی اور تبدیلی کو بھی بالکل ناجائز قرار دیا گیا، اس کے بعد ائمہ متبوعین اور فقہاء ومجتہدین نے انہیں کی پیروی کی، اور اب تک جمہور علماء اہل السنۃ والجماعۃ کا اسی پر اجماع واتفاق رہا ہے۔

شواہد کے طور پر چند اقوال پیش کیے جاتے ہیں:

''سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلا على الكتبة الأولى- رواه الداني

في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة'' (الاتقان للسیوطی)۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: ''ویحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو، أو یاء، أو ألف، أو غیر ذلك'' (حوالہ بالا)

امام بیہقیؒ شعب الایمان میں لکھتے ہیں: ''من یکتب مصحفًا فینبغي أن یحافظ علی الهجاء الذي کتبوا به تلك المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئًا، فإنهم کانوا أکثر علمًا، وأصدق قلبًا ولسانًا، وأعظم أمانة فلا ینبغي أن نظن بأنفسنا استدراکًا علیهم'' (حوالہ بالا)۔

قاضی عیاض مالکیؒ شفاء میں لکھتے ہیں: ''وقد أجمع المسلمون أن القرآن المتلو في جمیع أقطار الأرض المکتوب في المصحف بأیدي المسلمین مما جمعه الدفتان من أول ''الحمد لله رب العلمین'' إلی آخر ''قل أعوذ برب الناس'' أنه کلام الله ووحیه المنزل علی نبیه محمد صلی الله علیه وسلم، وأن جمیع ما فیه حق، وأن من نقص حرفًا قاصدًا لذلك، أو بدله بحرف آخر مکانه، أو زاد حرفًا مما لم یشتمل علیه المصحف الذي وقع علیه الإجماع، وأجمع علی أنه لیس من القرآن عامدًا لکل هذا أنه کافر'' (رسم المصحف وضبطه: ص: ٦٧)۔

شیخ شعبان محمد اسماعیل رسم المصحف میں ''سمیر الطالبین'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں: ''ونقل الجعبری وغیره إجماع الأئمة الأربعة علی وجوب اتباع مرسوم المصحف العثماني'' (رسم المصحف وضبطه: ص: ٦٨)۔

''شرح طحاوی'' میں ہے: ''ینبغي لمن أراد کتابة القرآن أن ینظم الکلمات کما هي في مصحف عثمان رضي الله عنه، لإجماع الأمة علی ذلك'' (حوالہ بالا)

صاحب ''سمیر الطالبین'' علامہ زمخشری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قال الزمخشري في الکشاف في تفسیر قول الله تعالی: ''وقالوا مالِ هذا الرسول'': وقعت اللام في المصحف مفصولة عن ''هذا'' خارجة عن أوضاع الخط العربي، وخط المصحف سنة لا تغیر'' (رسم المصحف وضبطه: ص: ٦٨)۔

اس سے ثابت ہوا کہ باجماع امت مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت، ایک حرف کی بھی کمی زیادتی اور تبدیلی سراسر ناجائز وحرام ہے۔

اب جب یہ حالت ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کا عربی رسم خط بدل کر دوسری زبان کے رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، یہ تو سراسر حفاظت قرآن کی خلاف ورزی اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جس کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

الغرض صحابہ وتابعین کے طرز عمل سے بھی واضح ہوگیا کہ قرآن مجید میں رسم قرآن کی حفاظت بھی ضروری ہے کسی دوسرے رسم خط میں اس کا لکھنا جائز نہیں؛ کیونکہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے۔

مثلاً عربی زبان میں چند حروف ایسے ہیں کہ ہر حرف سے لفظ کے معنی بالکل جدا ہوجاتے ہیں، لیکن بہت سی عجمی زبانوں میں ان حروف میں کوئی فرق نہیں سب کو ایک ہی آواز سے پڑھا جاتا ہے ایک ہی شکل سے لکھا جاتا ہے مثلاً (ث، س، ص) اور ذال، ز، ض، ظ) وغیرہ تو جب قرآن کو اسی رسم خط میں لکھا جائے گا تو ان حروف کا کوئی امتیاز نہ رہے گا جو سخت ترین تحریف ہے۔

نیز قرآن مجید کی تلاوت اور الفاظ وکلمات کی ادائیگی کے کچھ خاص احکامات ہیں جو استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے بغیر صحیح طریقہ پر حاصل ہو ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ کہ حضرت عثمانؓ نے جہاں جہاں مصاحف کو بھیجا تھا وہاں پر لوگوں کی تعلیم قرآن کے لیے قراء کرام کو بھی بھیجا تھا، چنانچہ مدینہ میں حضرت زید بن ثابت کو، شام میں مغیرہ بن شہاب کو، بصرہ میں عامر بن عبد قیس کو، کوفہ میں ابوعبدالرحمن کو بھیجا اور انہیں یہ حکم دیا کہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں۔ اب جب اسے رسم عثمانی میں باقی رکھیں گے تو ایسی صورت میں مسلمان اسے کسی ماہر قاری سے حاصل کرنے اور سیکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر غیر عربی رسم خط میں لکھ دیا جائے گا تو یہ قوی اندیشہ ہے کہ مسلمان اسی پر تکیہ کرلیں، اور باقاعدہ کسی ماہر فن قاری سے قرآن سیکھنے کا رواج آہستہ آہستہ کم ہوجائے جس کے نتیجے میں آئندہ چل کر قراءت قرآن کے حوالے سے جو مفاسد پیدا ہوں گے وہ بالکل ظاہر ہیں۔

۲-عربی رسم خط کے ساتھ دوسرے رسم خط میں قرآن لکھنا:

اگر عربی رسم خط اور رسم عثمانی میں متنِ قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم خط میں لکھ دیا جائے اور دونوں کو ایک ساتھ شائع کیا جائے تو اس صورت میں گرچہ ترجمہ قرآن پر قیاس کر کے جواز کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے کہ جس طرح ترجمہ قرآن کو متن قرآن کے ساتھ شائع کرنا بالاجماع جائز و درست ہے اسی طرح عربی رسم خط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم خط میں لکھنا بھی جائز ہونا چاہیے؛ لیکن چونکہ اس صورت میں بھی قرآن کو صحیح طریقہ پر پڑھنا ممکن نہ ہوگا اور وہ تمام مفاسد پیدا ہوں گے جو سطور بالا میں ذکر کیے گئے ہیں؛ اس لیے اس طرح بھی قرآن کی اشاعت ہرگز جائز و درست نہ ہوگی۔

۳-بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کا حکم:

بریل کوڈ نابینا یا انتہائی کمزور بینائی والے افراد کی تعلیم کے لیے ایجاد کیا گیا ہے جو نسبۃً موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے، بنیادی طور پر چھ نقطے ہوتے ہیں، تین دائیں کی جانب اور تین بائیں جانب، اور پھر انہیں چھ نقطوں سے تمام حروف اور رموز وغیرہ وجود میں آتے ہیں، بعض مربع شکل میں ہوتے ہیں بعض غیر مربع شکلوں میں۔ اب ظاہر ہے یہ نہ تو عربی رسم الخط میں ہے نہ رسم عثمانی میں۔ بریل کوڈ کا طریقہ بہت تیزی سے نابینا افراد میں مقبول ہوتا جارہا ہے، اور بریل کوڈ کی مدد سے بڑے بڑے تعلیمی ادارے مختلف ممالک میں کھل چکے ہیں اور مختلف جرائد اور رسائل بریل کے طریق پر منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہاں تک کہ اردن، مصر، تاجکستان وغیرہ کئی ممالک میں بریل کوڈ کے ذریعہ لکھے گئے قرآن کا اجراء بھی ہو چکا ہے اور نابینا افراد اس سے خوب فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔

جہاں تک مسئلہ ہے بریل کوڈ کے ذریعہ قرآن تیار کرنے کے جواز وعدم جواز کا، تو اس سلسلے میں علماء اور اہل افتاء کے دو طرح کے نظریات ہیں:

ایک طبقہ تو یہ کہتا ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں رسم عثمانی کی مخالفت ہے، حالانکہ رسم عثمانی کی اتباع کا لازم ہونا اجماع سے ثابت ہے اور اس کی مخالفت باجماع ناجائز ہے۔

دوسرا طبقہ یہ کہتا ہے کہ بریل کوڈ کے ذریعہ قرآن تیار کرنا جائز و درست ہے، اور اس میں رسم عثمانی کی مخالفت نہیں ہے: کیونکہ رسم عثمانی کے التزام کا مسئلہ کتابت مرئیہ کے ساتھ خاص ہے اور بریل کوڈ کے طریقہ پر لکھے جانے والے خط کا تعلق دیکھنے سے نہیں، بلکہ چھونے سے ہے؛ چنانچہ ایک بینا شخص کے اعتبار سے اس کی حیثیت چند نقطوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں لیکن نابینا شخص جو بریل کوڈ سے واقف ہے وہ اسے چھو کر اندازہ لگالیگا کہ اسے کس طرح پڑھا جانا چاہیے، اور جب ایسی بات ہے تو دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔

احقر کے نزدیک بھی جواز کی صورت اس لیے راجح معلوم ہوتی ہے کہ علماء نے بچوں کی تعلیمی سہولت کے پیش نظر چند آیتوں کو رسم عثمانی کے خلاف عربی مستحدث رسم خط میں لکھنے کی اجازت دی ہے، اسی طرح رسائل وغیرہ میں بعض آیتوں کے محض ترجمے پر اکتفاء کرنے کو جائز قرار دیا ہے؛ لہذا ابناء علیہم وتیسیرًا للمکفوفین بریل کے طریق پر قرآن تیار کرنا بھی جائز و درست ہونا چاہیے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم آیا اصل قرآن کی طرح ہے کہ اس کو چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے یا وضو کے بغیر بھی اسے چھوا جاسکتا ہے؟ تو اس سلسلے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے:

ایک رائے یہ ہے کہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن کی طرح نہیں ہے۔

اس وجہ سے کہ مصحف اسے کہتے ہیں جو رسم عثمانی کے مطابق بین الدفتین لکھا ہوا ہو کما فی مقدمات الأساسیۃ (ص: ۱۵۴)، اور چونکہ بریل کوڈ کے طرز پر لکھے گئے قرآن پر مصحف کا اطلاق نہیں ہو سکتا؛ اس لیے اصل قرآن کے حوالے سے جو آداب واحکام جاری ہیں انہیں اس پر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ رسم عثمانی کے التزام کا واجب ہونا الگ چیز ہے اور بریل کوڈ یا کسی بھی طریقہ پر لکھے ہوئے قرآن پر مصحف کے احکام کا ثابت ہونا دوسری چیز ہے، رسم عثمانی کے التزام کے واجب ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس کے علاوہ رسم خط میں جو قرآن لکھا جائے گا اس پر مصحف کے احکام جاری نہیں ہوں گے؟

دوسری رائے یہ ہے کہ بریل کے طریقے پر یا جس طرح بھی قرآن لکھا گیا ہو اس کا حکم اصل قرآن کی طرح ہے، یعنی بے وضو اسے چھونا جائز نہیں اور جو آداب واحکام اصل قرآن کیواسطے ہیں وہی اسکے لیے بھی ہوں گے۔

ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس میں لکھے ہوئے حروف کلام منطوق پر دلالت کرنے والے رموز ہیں، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ رموز رسم عثمانی کے موافق نہیں، بلکہ بدلے ہوئے ہیں؛ لیکن کلام منطوق کا جہاں تک تعلق ہے تو اپنی حالت پر ہے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے؛ اور مصحف اور کلام منطوق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ عظمت واحترام کا معاملہ کیا جائے، خواہ وہ کسی بھی طریقہ پر لکھا ہوا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ خالص مصحف ہے، اس میں تفسیر وغیرہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے مصحف کی حد سے خارج کردے، اور جب ایسی بات ہے تو اس پر مصحف شرعی کے احکام ثابت ہوں گے۔

احقر کے نزدیک یہی دوسری رائے راجح معلوم ہوتی ہے، حنفیہ کے نزدیک فارسی میں لکھے ہوئے قرآن کو بھی چھونا مکروہ ہے کما فی العالمگیریۃ عن الخلاصۃ (۱/ ۹۳، اتحاد دیوبند)، تو ظاہر ہے جو قرآن رسم عثمانی کے خلاف لکھا ہو، لیکن کلام منطوق کے مطابق ہو تو اس کو چھونا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اسکرین پر قرآن موجود ہوتے ہوئے اسے بے وضو چھونے کا حکم:

قرآن مجید ایک مقدس کتاب الٰہی ہے، اس کی تعظیم اور احترام واجب ہے؛ یہاں تک کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''لا یمس القرآن إلا طاهر'' (معجم طبرانی: ۹ ۰ ۱۳) قرآن صرف وہی شخص چھوئے جو (حدث اصغر اور حدث اکبر سے) پاک ہو۔ جنابت اور بے وضو ہونے کی حالت میں چھونا جائز نہیں۔

یہ حکم اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب اسے مباشرۃً بغیر کسی حائل کے چھوا جائے، اور اگر کسی کپڑے یا غلاف وغیرہ کے واسطہ سے چھوا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ کپڑا یا غلاف قرآن شریف سے مستقل طور پر متصل نہ ہو بلکہ اس سے منفصل ہو۔ کیوں اگر متصل ہوگا تو اسے بھی چھونا جائز نہ ہوگا، چنانچہ فقہاء احناف نے یہ صراحت کی ہے کہ قرآن پر جو جلد بندھی ہوتی ہے اس کا چھونا جائز نہیں؛ کیونکہ اتصال کی وجہ سے وہ بھی قرآن کے تابع ہے۔

ہدایہ میں ہے: ''وليس لهم مس المصحف إلا بغلافه، ولا أخذ درهم فيه سورة من القرآن إلا بصُرَّته، وكذا المحدث لايمس المصحف إلا بغلافه؛ لقوله ﷺ: لايمس القرآن إلا طاهر (إلى أن قال:) وغلافه ما يكون متجافيا عنه دون ما هو متصل به كالجلد المشرز هو الصحيح'' (ہدایہ: ج: ۱، ص: ۶۴، ط: فیصل دیوبند)۔

ہندیہ میں ہے:

''لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجافٍ عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به، هو الصحيح، هكذا في الهداية۔ وعليه الفتوى، كذا في الجوهرة النَّيِّرَة'' (ہندیہ: ج: ۱، ص: ۹۳، ط: اتحاد دیوبند)۔

اسی طرح فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ جس طرح مصحف کو چھونا بغیر طہارت کے ناجائز ہے، اسی طرح اس درہم اور تختی وغیرہ کو بھی چھونا ناجائز ہے جس میں مکمل کوئی ایک آیت لکھی ہوئی ہو۔

''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''ولايجوز مس شيء مكتوب فيه شيء من القرآن في لوح أو دراهم أو غير ذلك إذا كان آيةً تامةً۔ هكذا في الجوهرة النيرة'' (ہندیہ: ج: ۱، ص: ۹۳، ط: اتحاد دیوبند)۔

البتہ مصحف اور تختی یا درہم جس پر مکمل آیت لکھی ہو دونوں کے چھونے میں فرق ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے:

''والتعبير بمس القرآن أولى من تعبير غيره بمس المصحف لِشُمول كلامه ما إذا مَسَّ لوحًا مكتوبًا عليه آية، وكذا الدرهم والحائط، وتقييده بالسورة في الهداية اتفاقي، بل المراد الآية، لكن لايجوز مس المصحف كله المكتوب وغيره بخلاف غيره، فإنه لايمنع إلا مس المكتوب، كذا ذكره في السِّرَاج الوهاج'' (۱/ ۲۲۹، ط: دار الكتاب ديوبند)۔

مذکورہ عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ مصحف کا ہر جزء خواہ وہ مکتوب ہو یا نہ ہو اس کا چھونا جائز نہیں، لیکن اگر مصحف نہ ہو، بلکہ صرف ایک دو آیت کہیں

لکھی ہوئی ہو تو صرف مکتوب حصہ کو چھونا ناجائز ہے اور غیر مکتوب حصہ کو چھونے میں کوئی حرج نہیں۔

جہاں تک مسئلہ موبائل میں قرآن کا ہے تو وہ کبھی خارجی میموری کارڈ میں یا موبائل کی داخلی میموری میں محفوظ کرلیا جاتا ہے، پھر اسے موبائل کی اسکرین پر کھولا جاتا ہے اور جب بند کردو تو اسکرین سے غائب بھی ہوجاتا ہے، تو غائب ہوجانے کی صورت میں اس کی حیثیت ایک الیکٹرانک ڈھانچے کی ہے، اسے بے وضو چھونا بلا کراہت جائز ودرست ہے۔ لیکن اگر اسکرین پر قرآن کھلا ہوا ہے اور نظر آرہا ہے تو اس کا حکم جاننے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ جو قرآن اسکرین پر نظر آرہا ہے اس کی حیثیت مصحف کی ہے یا اس تختی کی جس پر قرآن کی چند آیتیں لکھی ہوئی ہوں۔

اگر اس کی حیثیت مصحف کی ہے تو اس پر مصحف کے احکام جاری ہوں گے، یعنی اس کے مکتوب اور غیر مکتوب حصہ کے ساتھ اس سے جو بھی چیز حقیقی طور پر متصل ہوگی اس کا چھونا بھی ناجائز ہوگا، جیسے قرآن پر بندھی ہوئی جلد کو اتصال کی وجہ سے چھونا ناجائز ہوتا ہے۔ اور اگر یہ اس تختی کے مانند ہے جس پر قرآن کی چند آیتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں تو اس پر تختی والے احکام جاری ہوں گے، یعنی صرف اس کے مکتوب حصہ کو چھونا ناجائز ہوگا اور بقیہ حصہ کو چھونا درست ہوگا۔

غور کرنے کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب تک قرآن صرف خارجی میموری کارڈ یا موبائل کی داخلی میموری میں محفوظ ہو، اسکرین پر نظر نہ آرہا ہو تو اس داخلی اور خارجی میموری کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے، وہ تو موبائل کے دیگر پرزوں کے مانند ایک پرزہ ہوتا ہے؛ مگر جب اسی کو موبائل کے دیگر آلات کے سہارے اسکرین پر کھولا جاتا ہے تو قرآن کا صفحہ کھل کر دکھائی دینے لگتا ہے؛ لیکن قرآن کا صرف ایک صفحہ نظر آتا ہے پورا قرآن ایک ساتھ نہیں دکھائی دیتا ہے؛ چنانچہ جب اگلا صفحہ کھولتے ہیں تو اسکرین سے پہلا صفحہ مٹ جاتا ہے؛ لہذا یہ اس تختی کے مانند ہوگا جس میں قرآن کی چند آیتیں لکھ دی جاتی ہیں اور پھر جب چاہتے ہیں اسے مٹا کر دوسری آیت لکھ دیتے ہیں۔ اس لیے اس پر تختی والے احکام جاری ہوں گے، یعنی صرف مکتوب حصہ کو بلا طہارت چھونا ناجائز ہوگا۔ اس اعتبار سے اسکرین کے علاوہ موبائل کے بقیہ حصہ کو چھونے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔

اب مسئلہ صرف اس اسکرین کو چھونے کا ہے جس پر قرآن کا صفحہ کھلا ہوا ہے تو اس سلسلے میں علماء کی دو قسم کی آراء ہیں۔

ایک رائے یہ کہ جس اسکرین کو ہم چھوتے ہیں قرآن دراصل اس پر نہیں لکھا ہوا ہوتا ہے، بلکہ اس کے نیچے شیشے (display) کی ایک دوسری پلیٹ ہوتی ہے جو میموری سے اخذ کر کے قرآن کا صرف عکس دکھاتا ہے، اس پر نہ تو حروف منقش ہوتے ہیں اور نہ الفاظ ہوتے ہیں؛ اسی لیے اگر اس پلیٹ کو نکال دیا جائے تو اس پر کوئی مکتوب یا تحریر نظر نہیں آئے گی۔

ثانیاً: موبائل کی ظاہری اسکرین اور نیچے کی وہ پلیٹ (display) جس پر قرآن کا عکس نظر آتا ہے یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، اور ساتھ ہی ان میں اتحاد اور حقیقی اتصال بھی نہیں؛ چنانچہ اگر کسی موبائل کی اسکرین نکال دی جاتی ہے تب بھی اس شیشے (display) پر قرآن یا کوئی بھی کھلی ہوئی چیز نظر آتی ہے۔ اب ظاہر ہے اس صورت میں نہ قرآن کی عبارت کو چھونا لازم آئے گا اور درمیان میں اسکرین کے حائل ہونے کی وجہ سے نہ ہی بالذات اس شیشہ کو جو اس کے عکس کو ظاہر کر رہا ہے۔ اس لیے اس کا چھونا جائز ہوگا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اسکرین کو چھونا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اوپر والے شیشہ پر اگرچہ قرآن نہیں لکھا ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ غیر منفصل طریقہ پر اتصال ہے؛ لہذا اسے بھی چھونا جائز نہ ہوگا۔

مگر احقر کو اس میں تردد ہے؛ کیونکہ یہ اصول اس مصحف کے سلسلے میں ہے جس میں پورا قرآن لکھا ہوا ہوتا ہے، رہے وہ کاغذ یا تختی جس پر قرآن کی چند آیتیں لکھی ہوئی ہوں تو صرف اس کے مکتوب حصہ کو چھونا ناجائز ہے اور غیر مکتوب حصہ کو چھونا جائز ہے کما فی البحر۔ اور یہ بات اوپر آچکی ہے کہ موبائل میں جو قرآن کا صفحہ کھلتا ہے وہ اس تختی کے مانند ہے جس پر قرآن کی چند آیتیں لکھ دی گئی ہوں؛ لہذا اوپر والی اسکرین کا اگرچہ غیر منفصل طریقہ پر اتصال ہے، لیکن چونکہ وہ غیر مکتوب حصہ ہے اس لیے اسے چھونے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ اور جہاں تک افضلیت اور احتیاط کی بات ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ باوضو چھونا بہتر اور اقرب الی التنظیم ہے۔

☆☆☆

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی اشاعت وطباعت

مولانا اسماعیل لاجپوری[1]

امام مسلم نے عیاض ابن حماد کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

''أَنْزَلْتُ عَلَيْكَ قُرْآنًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ'' (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے تم پر ایک ایسا قرآن نازل کیا ہے جس کو پانی کبھی دھو نہیں سکتا)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تمام بنی نوع انسان مل کر فنا کرنے کی کوشش کریں تو بھی اسے فنا نہیں کر سکتے۔

غرض! قرآن مجید ایسا زندہ اور پائندہ معجزہ ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک اس میں کسی قسم کا ادنی تغیر بھی نہ ہوا، اللہ تعالی نے اس کو انسانی کلام سے ممتاز کیا، جس کی حفاظت کے لئے علماء پیدا کئے، جس کو پڑھنے پڑھانے، حفظ کرنے اور اس کی تشریحات اور تغیرات سے محفوظ رہنے کی پہلے ہی سے خبر دی گئی، قرآن مجید کے نزول کو چودہ سو سال سے زیادہ کا زمانہ ہو رہا ہے اور اس پیشین گوئی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی اس امت کے لئے ہر صدی کے شروع میں ایک ایسے شخص کو مقرر کرتا رہے گا، جو دین کی تجدید کریں (ابوداؤد)۔

صاحب ''روح البیان'' اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''وفي ماذكر إشارة إلى أن القرآن مادام بين الناس لايخلوا وجه الأرض عن المهرة من العلماء والقراء والحفاظ''

''اس حدیث میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ قرآن لوگوں کے درمیان ہمیشہ رہے گا اور روئے زمین پر قرآن کے علماء، قراء اور حفاظ ہر دور میں پائے جائیں گے'' (اسلام میں قرآن مجید کا مقام: قاری احمد اللہ صاحب قاسمی ص ۱۸-۱۹)، اس مختصر گفتگو کے بعد اصل مسئلہ کا رخ کرتے ہیں:

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کریم کی اشاعت:

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: نصوص صحیحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے، من تشبه بقوم فهو منهم'' میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو کفار میں سے شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا، دوسری حدیث ''لتركبن سنن من كان قبلكم'' (الحدیث) میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا، اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے امر میں جو عرفا وعادۃ ان کے خصائص میں سے ہے، سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے، پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ'' (سورۂ بقرہ: ۲۰۸) نازل ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبتل اور ترہب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے، مشکوۃ کتاب النکاح و کتاب الاعتصام ''لاتشددوا على أنفسكم'' (الحدیث)، اور اس میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ ہے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات الانواط کی درخواست پر کیسا زجر فرمایا تھا؟ یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے، اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ اس میں اور مفاسد مالیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں، مثلا خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہو جانے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض اور

[1] مرتب فتاوی بسم اللہ وخادم التدریس، جامعۃ القراءات کفلیتہ، سورت گجرات۔

اس کا اخلال حرام ہے، اور ترجمہ اور تفسیر کا اصل سے مجرد نہ ہونا مقدمہ اور سبب ہے حفاظت کا، اور اصل سے مجرد ہونا مقدمہ اور سبب ہے اخلال کا اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام ہے، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے، محققان دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں، حضرات شیخینؓ نے بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا، اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا، پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع تھا، اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے اور اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا، جیسا حدیث میں ہے:

''امتهوكون أنتم كما تهولت اليهود والنصارى'' (مشکوۃ ص۲۲)۔

اور مثلاً یہ مفسدہ ہوگا کہ حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز ہوگا۔

كما فى العالمگيرية: ''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند ابى حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح. هكذا فى الخلاصة'' (ج۱ص۲۴) ''وفيه أيضا إذا قرأ اية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة'' فهم السامع أم لا إذا اخبر السامع أنه قرأ اية السجدة (ص۸۵ج۱) ''وهذه الجزئية الثانيه تؤيد الأولى خيث وجب سجدة التلاوة بقرأة القرآن بالفارسية فعلم منه أن الترجمة بالفارسية لاتخرج القرآن عن كونه قرانا حكما. فلا يجوز مسه للمحدث''۔

اور یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کیلئے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک غیر مشروع کا، اور سبب غیر مشروع کا غیر مشروع ہے، اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہوجانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے، تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آوے گا، اور محذور کا سبب لامحالہ محذور ومحظور ہے، اور مثلاً آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا، اور جو کسی نے ایسا کیا تو اس پر انکار کیا گیا، چنانچہ میں نے محمد عبدالرحمن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی سے سنا ہے کہ کسی نے لکھنؤ میں ایسا ہی ایک پارہ چھاپا تھا، مگر علماء نے اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی، تو اس شخص نے اس کے اوراق کو قرآن مجید کی دفتیوں میں چسپاں کرا کر پوشیدہ کر دیا، اور اس وقت بھی ایسے ترجمے غیر حامل متن پر علماء کو انکار ہے، نیز اس جواب لکھنے سے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی، بلکہ سب نے شدید انکار کیا، باوجود یکہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی ہے، جس حاجت کی بناء پر اب ایسا کیا گیا ہے، تو باوجود اس کے تمام امت کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی، اس امر کے مذموم ومنکر ہونے پر جس میں یہ احادیث وارد ہیں۔

إن الله لايجمع أمتي على الضلالة، ويد الله على الجماعة، ومن شذ شذ فى النار، واتبعوا السواد الأعظم (مشكوة المصابيح)

اور مثلاً اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے، اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی انکے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں، اور پھر قرآن سے بالکل ہی بے تعلق ہوجاویں گے، اور بے ساختہ یہ آیت ان پر صادق آنے لگے گی:

"نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ" (سورۃ البقرۃ:۱۰۱)۔

اور مثلاً اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے، اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں، تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہونچتا، اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جاویں گے، اور اصل نظروں سے غائب ہوگی، تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا، بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے، یہ اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے لے کر آپس میں لڑیں گے اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں، جو مدار ہوسکتا ہے فیصلہ کا، پس اس آیت کا مضمون ظاہر ہوجاوے گا۔

"وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ" (سورۃ بقرۃ:۲۱۳)۔

اور مثلاً اب تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے، قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت وبلاغت سے

گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں، اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے، نیز کسی مترجم کو ہمت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہوسکتی، کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا۔ اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے، کسی کا تابع نہ سمجھیں گے، اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی، خصوص مترجمین ہی کا مطبوع مستقل ہوجانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی، اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا۔ کیونکہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی، کما قال اللہ تعالی: "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (سورۂ توبہ: ۳۱) اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں جن کو انشاء اللہ علماء ظاہر کریں گے، بہر حال ان شبہات کا قرآن کریم کے تعلق سے مکمل خاتمہ ہونا لازم ہے، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالی کا ارشاد ہے: "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورۂ مائدہ: ۲)، اور فقہاء نے اسی قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے، کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے گا، اسی طرح ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو پھر ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہوجاوے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا۔ پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (امداد الفتاوی، ج ۴ ص ۳۹ تا ۴۲)۔

مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہ فرماتے ہیں: قرآن صرف معانی کا نام نہیں، چند جملوں کی ترکیب وتنظیم کو قرآن نہیں کہا جاتا، عربی زبان اور اس کے معانی کے مجموعہ کا نام قرآن ہے، اگر کوئی شخص قرآن کریم کا ترجمہ بغیر عربی رسم الخط کے شائع کرے تو ممکن ہے کہ اس سے عامۃ المسلم یا غیر مسلم فی الحال یا مستقبل میں اسی ترجمہ کو قرآن کریم سمجھیں گے، اس طرح گجراتی، انگریزی اور اردو ترجمہ ہی کو قرآن سمجھنے سے قرآن کی قدر وقیمت وحیثیت کم ہوجائے گی، اور اہمیت کی حامل یہ حقیقت بھی بھلادی جائے گی کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔

اس لئے مکمل قرآن کریم کسی اور زبان میں بشکل ترجمہ شائع کرنا اور اسے قرآن کا نام نہ دینا چاہئے، خواہ وہ ترجمہ کیسے ہی بڑے عالم وفاضل کا کیا ہوا کیوں نہ ہو!

ساتھ ہی یہ بات بھی مدنظر رہے کہ قرآن سے پہلے کی کتب سماویہ میں تحریفات کے منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ ہوا کہ بعد والوں نے اصل زبان چھوڑ کر اس کے تراجم شائع کرنے شروع کردئے تھے، نتیجۃً بتدریج ان کی اصل مٹ گئی اور صرف ترجمہ ہی رہ گئے، آج بھی بائبل کی یہی گت جاری ہے، ہمیں بائبل سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو ایسے کام نہ کرنا چاہئے جس سے مذکورہ مفاسد کا اندیشہ ہو۔

اصل عربی کے ساتھ ترجمہ وتفسیر کسی بھی زبان میں شائع کی جاسکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، نہ صرف جائز، بلکہ ضروری ہے، مسلمانوں کا تو یہ کام ہی ہے جو نہایت ضروری ہے، اس میں تعاون کرنا کار ثواب ہے (فتاوی سنگرہ گجراتی ۵ / ۲۱۴)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تنہا ترجمۂ قرآن کی اشاعت جائز نہیں، جب اشاعت جائز نہیں تو خریدنا، ہدیہ اور تقسیم کرنا بھی جائز نہیں، تاہم تنہا ترجمۂ قرآن کو بلا وضو مس کرنا ناجائز ہوگا۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ناگری ہو یا انگریزی ہر دو خط جس میں رسم خط مصحف عثمانی کی رعایت نہ ہو سکے اس میں قرآن کا لکھنا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ کتابت مصحف میں رعایت رسم عثمانی واجب ہے، رہے وہ خط جن میں رعایت رسم خط مذکور ہوسکتی ہے، جیسے فارسی یا اردو نستعلیق وامثالہ، ان میں قرآن کا لکھنا مختلف فیہ بین القولین ہے، مگر اقرب اور راجح یہ ہے کہ ایسے خطوط میں پورا مصحف لکھنا ناجائز ہے، ایک دو آیت اتفاقیہ لکھنے کا مضائقہ نہیں، بغرض الفاظ قرآنی کو صرف عربی خط ہی میں لکھنا چاہیے، ترجمہ وتفسیر کسی دوسری زبان میں اور دوسرے خط میں لکھنے کا مضائقہ نہیں (امداد الفتاوی ۴ / ۴۴)۔

رسم عثمانی کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے کے سلسلہ میں عرض ہے کہ الفاظ قرآنی کو کسی اور رسم الخط میں لکھنا شرعاً ممنوع اور مصالح وقتی کے خلاف ہوگا، اس لئے کہ بعد میں یہ خرابی لاحق ہوگی کہ رسم عثمانی کو حذف کر کے تنہا غیر رسم عثمانی میں شائع کیا جانے لگے گا اور یہ ایک سبب ہوگا غیر مشروع کا۔

حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہ فرماتے ہیں: قرآن اپنے متعلق ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ "(بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ)" (سورۃ الشعراء: ۱۹۵)، اس آیت کے متعلق علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ "بلسان" سے مراد عربی رسم الخط ہے۔

"وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي؟قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء۔قال: ويحتمل الجواز، لأنه قد يستحسنه من يقرأ بالعربية، والأقرب المنع كما تحرم قراءته بغير لسان العرب، ولقولهم: القلم أحد اللسان، والعرب لاتعرف قلما غير العربي، وقد قال تعالى: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" (الاتقان فی علوم القرآن، فصل فی آداب كتابته، ص ۸۴۱)

تو جب عربی رسم الخط دوسرے رسم الخط میں لکھا جائے گا تو آیاتِ قرآنی کی شکلوں میں تبدیلی ہوگی، اس لئے ممنوع ہوگا۔

عربی رسم الخط کو غیر عربی رسم الخط میں لکھنے اور شائع کرنے میں، خواہ کتنی ہی احتیاط برتی جائے قرأت وتلفظ میں غلطی کا قوی امکان ہے، اس سے وہ مسلمان مرد وخواتین جو عربی سے ناواقف ہیں صحیح نہ پڑھ سکیں گے، ضرور غلط پڑھیں گے، اتنا غلط کہ بعض مقام پر معانی بھی بگڑ جائیں گے، اور یہ بدیہی بات ہے کہ اس کی ذمہ داری جرأت کر کے غیر عربی رسم الخط میں شائع کرنے والے ہی پر آنی چاہئے!

میں اپنے طویل تجربہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ میں حافظ قرآن ہوں، تاہم مجھے بھی کبھی کبھی گجراتی رسم الخط کے اخبار ورسائل اور آیات قرآنی پڑھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے، اکثر غلطی کر گیا ہوں، کبھی تو نہ پڑھ سکا، نہ ہی سمجھ سکا، اس کو ویسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اگر مجھ جیسے ادنیٰ حافظ قرآن کا یہ حال ہے تو عربی سے بالکل ناواقف عام بھائی بہنیں غیر عربی رسم الخط میں شائع ہونے والے قرآن کریم کو کس طرح پڑھ سکیں گے؟ وہ کیسی کیسی غلطیاں کرتے ہوں گے یہ اظہر من الشمس ہے۔

مرورِ زمانہ کے (۱۵-۲۰-۲۵/ سال) بعد کیا حال ہوگا؟ عربی رسم الخط میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ اگر چہ بالکل چھوٹ نہ جائے، لیکن نسبت بہت کم تو ہو ہی جائے گی، ہمارے مرد وخواتین غیر عربی زبان پڑھنے کے عادی بن جائیں گے، آج کی عارضی سہولت کو دائمی سہولت سمجھیں گے، خاص کر ہماری ناواقف عوام اسے ایک ضروری سہولت سمجھے گی، نتیجۃً عربی رسم الخط کی اہلیت ختم ہو جائے گی، اور قرآن عربی کی شان باقی نہ رہے گی۔

پھر دنیا کی سب سے زیادہ عظیم کتاب کی شان کیا رہے گی؟ سب سے زیادہ محفوظ آسمانی کتاب کی صحت کیونکر سالم رہ سکے گی؟ کم از کم ان رسم الخط والے علاقوں سے تو رخصت ہو ہی جائے گی۔ اور ایسا کبھی کوئی مسلمان سوچ بھی سکتا ہے؟ نہیں، اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اسلام کے مخالفین واعداءِ دین اس کا بڑا فائدہ اٹھائیں گے، ساتھ ہی ناواقف جاہل مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے بہکانے اور گمراہ کرنے کے راستے کتنے وسیع ہو جائیں گے، لہٰذا میرا مشورہ تو یہی ہے کہ یہ جرأت نہ کی جائے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر مسلمان مرد وعورت کے لئے بقدرِ ضرورت عربی سیکھنا ضروری ہے، تا کہ وہ اپنے مذہبی لٹریچر (کتاب) تلاوت قرآن، نماز دیگر عبادات، ادعیہ وغیرہ پڑھ کر یاد کر سکیں۔

المختصر اینکہ ایسے رسم الخط سے یقیناً بچنا چاہئے۔ گجراتی میں قرآن کریم شائع کرنے والے سے خرید کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا جائز نہیں، ایسے آدمی کا بائیکاٹ کرنا چاہئے، تا کہ آئندہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کرے، یہ کام تو قرآن کے استیصال کے مترادف ہے (فتاوی بسم اللہ ۲/ ۶۰)۔

"إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ" (سورۂ یوسف: ۲)

"إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع،، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز" (شامی، کتاب الصلاۃ، مطلب فی بیان المتواتر والشاذ ۲/ ۱۶۴) "وقال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما احدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا إلا على المصحف اذا وجد فيه كذلك؟قال لا۔قال أبوعمرو يعني الواو والألف والمزيدتين في اللفظ نحو الواو في اولوا، وقال الإمام أحمد يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك، وقال البيهقي في شعب الإيمان: من كتب مصحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف ولا يخالفهم فيه ولايغير مما كتبوه شيئاء فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة منا،

فلاينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم'' (الاتقان فی علوم القرآن ۴/ ۱۶۸، شاملہ)۔

چونکہ رسم قرآنی کا تعلق فن قراءات سے بھی ہے، اس لئے چند معروضات عرض ہے:

علامہ دانیؒ فرماتے ہیں علماء امت میں سے کوئی بھی اس بات کے خلاف نہیں کہ کلمات قرآنی کو طرف کتابت اولی کے موافق لکھا جائے، اور جمیع علماء ہدی نے اس رسم کو حرام قرار دیا (مقدمہ افضل الدرر)۔

قرآءت ورسم کے محقق عالم علی بن محمد سخاویؒ اپنی سند کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے قرآن شریف کو رسم قیاسی پر تحریر کیا جائے؟ فرمایا کہ میرے نزدیک یہ جائز نہیں قرآن صرف پہلی کتابت پر ہی تحریر ہونا چاہئے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں واؤ اور یاء وغیرہ میں مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے۔

''المنہج فی فقہ الشافعیہ'' کے حواشی میں ہے کہ لفظ ''الربا'' کو واؤ اور الف ہی کے ساتھ رسم عثمانی کے مطابق لکھنا ضروری ہے (یعنی الربوا) اور ''الربی'' یاء کے ساتھ یا ''الربا'' الف کے ساتھ لکھنا جائز نہیں، کیونکہ رسم سنت متبعہ ہے۔

فقہ حنفیہ کی مستند کتاب ''المحیط البرہانی'' میں ہے: مناسب یہ ہے کہ مصحف کو بغیر رسم عثمانی کے نہ لکھا جائے۔

علامہ نظام الدین نیشاپوریؒ کہتے ہیں: ائمہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ قراء، علماء اور اہل کتابت پر واجب ہے کہ مصحف میں رسم عثمانی کی اتباع کریں، کیونکہ یہ رسم حضرت زید بن ثابتؓ کی ہے جو حضرت رسول خدا ﷺ کے امین اور آپ کے کاتب وحی تھے۔

(ایضاح المقاصد شرح عقیلۃ اتراب القصائد/ ۱۵، قاری اظہار احمد تھانوی)۔

'' اعلم أنه ينبغي لكل ذى لب سليم أن يتلقى ماكتبه الصحابة بالقبول والتسليم، كيف لا، وقدأمرنا الشارع ﷺ بالاتباع، وزجرنا عن أنواع المخالفة، والابتداء، روى عنه ﷺ أنه قال: اقتدوا باللذين من بعدي: أبي بكروعمر۔ زاد السيوطي في الجامع الصغير: فإنهما حبل الله الممدود من تمسك بهما فقد تمسك بالعروة الوثقى۔ وقال ﷺ: أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم۔ فيلزمنا اتباعهم، اذ هم الأئمة القدوة والصحابة العمدة، فما فعله صحابي واحد وأمرنا به فلنا الأخذ عنه والاقتداء بفعله واتباع أمره كيف لا وقد اجتمع على كتابة المصحف حين كتبوه اثناعشر ألفا من الصحابة رضي الله عنهم، ونحن مأجورون على اتباعهم ومأثومون على مخالفتهم؟ فيجب على كل مسلم أن يقتدى بهم وبفعلهم، فما كتبوه بواو فواجب أى يكتب بواو، وماكتبوه بغير واو فواجب أن يكتب بغير واو.... الخ

قال الإمام أحمد بن حنبل: تحرم مخالفة خط المصحف العثماني في واو أو ياء أو الف أو غير ذلك۔

وفى شرح ابن غازي: وقد نقل الجعبرى وغيره إجماع الأئمة الأربعة على وجوب اتباع مرسوم المصحف العثماني، وأجمع أهل الأداء وأئمة القراء على لزوم تعلم مرسوم المصاحف فيما تدعو إليه الحاجة'' (نهاية القول المفيد فى علم تجويد القرآن المجيد، ص۱۸۷)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: غیر عربی رسم خط عثمانی میں قرآن کریم کو لکھنا بجز ایک یا دو آیت اتفاقیہ کے، خواہ تنہا ہو یا رسم عثمانی کے ساتھ ہونا جائز ہوگا۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

مفتی احمد صاحب خانپوری ''محمود الفتاوی ج ۴'' میں تحریر فرماتے ہیں: کہ قرآن شریف عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے، اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قراءات سبعہ وغیرہ شامل ہے، اور ساری قرائتیں جاری کی جا سکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کا اتباع واجب ہے، اور

تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لئے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے (محمود الفتاوی ۴/ ۱۵۴)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: بریل کوڈ میں قرآن کریم کو شائع کرنا جائز نہیں، اندھے کے لئے زبانی طور پر "ماتجوز به الصلاة" کے بقدر یا جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے، تاہم بریل کوڈ والے قرآن کریم کو چھونے کے لئے بھی وضوء لازمی ہوگا۔

۴- موبائل پر قرآ مجید:

مسئلہ: آج کل موبائل فون میں پورا قرآن محفوظ کرلیا جاتا ہے، اسے سن بھی سکتے ہیں اور اسکرین پر حروف دیکھ کر پڑھ بھی سکتے ہیں۔ اس طرح کے موبائل فون آن ہو اور قرآن کے حروف نظر آتے ہوں تو اس کا بلا وضو چھونا جائز نہیں۔ ہاں فون بند ہو یا کھلا ہو، مگر قرآن کریم کے حروف اسکرین پر نہ ہوں تو بلا وضو چھونے میں کوئی حرج نہیں۔ دلیل "الجوهرة النيرة" کی یہ عبارت ہے:

"لایجوز مس شئی مکتوب فیه شئی من القرآن من لوح أو دراهم أو غير ذلك إذا كانت آية تامة"۔

یعنی کسی ایسی چیز کا چھونا جائز نہیں ہے جس میں قرآن کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہو، جیسے تختی یا دراہم وغیرہ، بشرطیکہ مکمل ایک آیت ہو (جدید فقہی مسائل: ۱/ ۱۰۴)۔

حضرت اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں: "ان نقوش میں جب تک پڑھنے کی صلاحیت ثابت نہ ہو حروف مکتوبہ کے حکم میں نہیں، اس لئے اس کا مس کرنا محدث وجنب کو جائز ہے (امداد الفتاوی، ج ۱ ص ۱۹۲، ٹیلیفون کے آداب ومسائل، ص ۳۸۔ ۳۹ مفتی مرغوب احمد لاجپوری)۔

مسئلہ: جس وقت قرآن کریم کے حروف اسکرین (screen) پر لکھے ہوئے آرہے ہوں تو اس حالت میں محدث (بے وضوء شخص) اور جنبی (جس پر غسل واجب ہے) کے لئے اس کا چھونا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس پر قرآن کریم کی تعریف صادق آتی ہے (اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے، ج ۳ ص ۵۹)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: جس وقت قرآن کریم کے حروف اسکرین (screen) پر لکھے ہوئے آرہے ہوں تو اس حالت میں محدث (بے وضوء شخص) اور جنبی (جس پر غسل واجب ہے) کے لئے اس کا چھونا جائز نہیں ہے، اور موبائل کے ڈھانچہ اور اس کے ساتھ لاحق، پلاسٹک یا چمڑے کا کور کے ساتھ بھی چھونا جائز نہیں، کیونکہ یہ قرآن کریم کے ساتھ لاحق کپڑا اور کاغذ کے حکم میں ہوگا۔ یہ جزدان کے حکم میں نہیں ہوگا۔



قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی کی رعایت

مفتی عبدالرحیم الحسنی الکشمیری[۱]

۱- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی قدس سرہ اس سلسلے میں اصولی گفتگو فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(الف) پہلے ایک بات بطور مقدمہ سمجھ لی جاوے پھر اس سے سب سوالات کا جواب آسان ہوگا وہ یہ ہے کہ باجماع صحابہؓ وتابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں ''امام'' کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصاً کلمات قرآن کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحتاً تجویز نہیں کرسکتا۔

چنانچہ مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی الحداد نے اپنے رسالہ ''خلاصۃ النصوص الجلیہ'' میں رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع کو بارہ ہزار صحابہؓ کرام کے اجماع سے ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے:

'' أجمع المسلمون قاطبة علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان. ومنع مخالفتهم (ثم قال) قال العلامه ابن عاشر ووجه: وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثني عشر ألفا والإجماع حجة حسبما تقرر في أصول الفقه '' (نصوص جلیہ ص ۲۵)۔

مزید آگے لکھتے ہیں:

یہ قرآن اگر اس طرح طبع کیا جاوے کہ ایک صفحہ میں قرآن کا متن عربی، مگر رسم خط تامل میں لکھا جائے اور دوسرے صفحہ میں تامل زبان کا ترجمہ لکھا جائے تو یہ باجماع امت حرام وناجائز ہے اور تحریف قرآن کے حکم میں ہے بوجوہ ذیل:

(الف)...... اس لیے کہ ایسا کرنا مصحف عثمانی کے رسم خط کی تغییر وتبدیلی ہے جو باجماع حرام ہے۔

(ب)...... تامل زبان میں بہت سے ایسے حروف موجود نہیں جو قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں مثلاً (ذ، ز، ض، ظ) ان سب حروف کو (جہاں تک احقر کو معلوم ہوا) تامل زبان میں ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے، حالانکہ ان حروف کے بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں، اس لئے ایسا کرنا قرآن مجید کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔

(ج)...... اگر تامل رسم خط میں انگریزی کی طرح حرکات زیر وزبر کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے تو یہ ایک دوسری تحریف قرآن ہے کہ حروف کی زیادتی قرآن کے ہر کلمہ میں کی جائیگی۔

(د)...... اس وجہ سے بھی اس طرح قرآن کی کتابت واشاعت مکروہ ومذموم ہے کہ اس میں قرآن کو ترجمہ کا تابع بنادیا گیا ہے جو قلب موضوع اور خلاف ادب ہے

(ھ)...... ایک وجہ اس طرز کے عدم جواز کی یہ بھی ہے کہ اس میں تشبہ ہے کفار عجم کے ساتھ جنکا یہ مخصوص رسم خط ہے۔

(و)...... ایک وجہ یہ بھی کراہت کی ہے کہ بائیں جانب سے شروع کرنا علاوہ تشبہ بالکفار کے خود بھی خلاف سنت اور خلاف ادب ہے۔

نیز ۱۳۵۹ھ میں جب جمعیۃ تبلیغ الاسلام صوبہ متحدہ ناظر باغ کانپور سے قرآن مجید کو ہندی رسم خط میں شائع کرنے کی تجویز ہوئی تو علماء نے مخالفت کی۔

---

[۱] صدر مفتی ومہتمم دار العلوم المصطفویہ محلہ توحید گنج بارہ مولہ کشمیر۔

دار العلوم دیو بند میں بھی اس وقت استفتاء اس کے بارے میں آیا۔ اس وقت احقر دار العلوم کی خدمت فتویٰ انجام دیتا تھا۔ اس سوال کی اہمیت کے خیال سے احقر نے اس کو دار العلوم کی مجلس علمی کے مشورہ میں رکھا مجلس علمی کے صدر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے اپنے قلم سے اس پر مضمون ذیل تحریر فرمایا:

''ہندی رسم الخط میں بہت سے وہ حروف نہیں ہیں جو کہ عربی زبان اور قرآن میں پائے جاتے ہیں اور اسی لئے ہندی میں ان کے لئے کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی ہے مثلاً (ذ، ز، ظ، ض) کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بدل جاتے ہیں، اس لئے قرآن مجید کو رسم الخط ہندی میں لکھنا تحریف ہوگا جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے۔ ۱۴ شعبان ۵۹ ۱۳ھ''

یہ فتویٰ پوری مجلس علمی کے اتفاق سے لکھا گیا جس میں حضرات ذیل شریک تھے:۔ (۱) حضرت مولنا سید حسین احمد صاحب صدر مدرس دار العلوم دیو بند، (۲) حضرت مولنا سید اصغر حسین صاحب محدث دار العلوم دیو بند، (۳) حضرت مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث والتفسیر وصدر مہتمم دار العلوم دیو بند، (۴) حضرت مولنا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیو بند، (۵) حضرت مولنا اعزاز علی صاحب مدرس دار العلوم دیو بند، مذکور الصدر فتوی مسئلہ زیر بحث، یعنی تامل زبان میں قرآن مجید لکھنے پر بھی حاوی ہے کما لا یخفی (جواہر الفقہ ص ۷۴۔ ۸۹ ج ۱)۔

اسی مسئلہ پر حضرت مفتی سید عبد الرحیم لاجپوریؒ اپنے مشہور و مقبول فتاوی رحیمیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

گجراتی میں قرآن شریف لکھنا:

سوال نمبر ۸: گجراتی حروف میں پورا قرآن اس طرح لکھا جائے کہ زبان اور تلفظ عربی ہی رہے تو اس میں کوئی حرج ہے؟ ان پڑھ آدمی جو عربی میں قرآن شریف پڑھے ہوئے نہ ہوں وہ کلام پاک کی تلاوت کے ثواب سے محروم رہتے ہیں، ان کی سہولت اور خیر خواہی کے لئے مذکورہ طریقے پر پورا قرآن گجراتی حروف میں لکھنا اور اس میں تلاوت کرنا ثواب کا کام ہے یا نہیں؟ اس کو مع دلائل تفصیل سے سمجھائیں؟

(الجواب):۔ قرآن شریف گجراتی حروف میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے۔ مثلاً: بسم اللہ کو گجراتی حروف میں لکھا جائے تو لفظ اللہ اور لفظ رحمٰن اور لفظ رحیم کی ابتداء کے دو حروف (الف لام) تحریر میں نہیں آئیں گے بسم للہ رحمٰن رحیم لکھا جائیگا اس طرح لکھنے میں صرف بسم اللہ شریف میں چھ حروف کی کمی آجاتی ہے۔

تو غور فرمایئے! پورا قرآن شریف گجراتی میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہو جائیں گے، حالانکہ معانی کی طرح حروف بھی قرآن ہونے میں شامل ہیں۔ دوسری جانب صورت یہ ہے کہ بعض آیتوں میں حروف زائد ہو جائیں گے مثلاً الٓمٓ میں قرآنی رسم الخط کے بموجب صرف تین حروف ہیں، لیکن گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہو جائیں گے۔ اب حساب لگایئے پورے قرآن شریف میں کتنی کمی بیشی ہو جائیگی اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرآت سبع وغیرہ شامل ہیں، اور ساری قرآتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی گجراتی رسم الخط میں نہیں ہو سکتی، لہذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے۔ طریقہ یہ تھا کہ جب کلام پاک کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر لکھواتے اور ہر لفظ کا رسم الخط کاتب وحی کو تعلیم فرماتے جسے آنحضرت وحی اور حضرت جبریلؑ کی معرفت سے سیکھتے تھے۔ جب خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے دور خلافت میں یہ طے ہوا کہ جو آیتیں اور سورتیں لکھی ہوئی مختلف حضرات کے پاس ہیں ان سب کو کتابی صورت میں ایک جگہ کر دیا جائے تو کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے بڑی احتیاط اور پوری توجہ سے اسی اصلی رسم الخط کے مطابق جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھا گیا تھا پورا قرآن شریف لکھا، اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن لکھوایا تو انہیں کاتب الوحی حضرت زید بن ثابتؓ کو وہ عظیم الشان خدمت سپرد ہوئی، جب کہ پچاس ہزار صحابہؓ موجود تھے، لہذا اس مصحف عثمانی کے رسم الخط کا خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ چاروں ائمہؒ اس رسم الخط کو ضروری مانتے ہیں۔ خدائے پاک کا ارشاد ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (ترجمہ) ہم ہی نے قرآن نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں (سورۃ الحجر آیت ۹)۔

مذکورہ ارشاد میں صرف قرآنی الفاظ کے حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ الفاظ، معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا وعدہ اور پیشگوئی ہے۔ لہذا اسکا خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ معانی اور علوم قرآن کی حفاظت میں علمائے دین مشغول ہیں تو الفاظ، عبارت اور طرز ادا کی حفاظت میں قراء منہمک ہیں اور رسم الخط کی حفاظت کاتبین قرآن کر رہے ہیں جن کی پیروی ہم پر لازم ہے۔

مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ:۔

(۱) عربی میں "ح" اور "ہ" میں فرق ہے گجراتی میں نہیں۔ (۲) عربی میں "ق" اور "ک" میں فرق ہے گجراتی میں نہیں۔

(۳) عربی میں "ء" (ہمزہ)، "ع" الگ الگ ہیں گجراتی میں نہیں۔ (۴) عربی میں "ت" اور "ط" جدا جدا ہیں گجراتی میں نہیں۔

(۵) عربی میں "س" اور "ص" اور "ث" میں فرق ہوتا ہے گجراتی میں نہیں۔ (۶) عربی میں "ذ" "ض" "ز" اور "ظ" میں فرق ہوتا ہے گجراتی میں نہیں۔

مطلب یہ کہ عربی میں جس طرح ہ اور ح، ق اور ک، ع اور ء، اور ت، ط اور س، ص، ث اور ذ، ض، ز، ظ کے رسم الخط اور ادائیگی میں میں نمایاں فرق ہے، یہ فرق اور امتیاز گجراتی میں نہیں ہے، اگر علامتیں مقرر کی جائیں پھر بھی ناقص ہیں، جس میں تحریر اور رسم الخط کی تحریف کے ساتھ ساتھ ادائیگی میں نمایاں فرق ظاہر ہوگا، جس سے بیسیوں غلطیاں اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائیگا۔ اور ثواب کی جگہ عقاب اور رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا، جیسا کہ مشہور فرمان ہے: رُبَّ تالٍ یلعنه القرآن۔ (یعنی) بہت سے قرآن کے تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ جن پر قرآن لعنت کرتا ہے۔

حضرت امام ابن الجوزیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ بیشک جس طرح امت کے لئے مطلب قرآنی کا سمجھنا اور اس کے حدود کو قائم رکھنا عبادت ہے، اسی طرح صحیح پڑھنا اور حروف کو طریقے کے مطابق ٹھیک ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ قرآن شریف قابل استاد کے پاس صحیح تلفظ سے پڑھے بغیر عربی رسم الخط میں بھی صحیح پڑھنا دشوار ہے تو ان پڑھ آدمی گجراتی رسم الخط میں کس طرح صحیح پڑھ سکتا ہے؟ صحیح پڑھنا دشوار ہے، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ جو سورتیں زبانی صحیح یاد ہیں وہی پڑھا کرے، مگر گجراتی میں نہ پڑھے کیونکہ غلط پڑھنا حرام ہے۔ (اتقان، درمختار، شامی، فتاویٰ ابن تیمیہ شرح جزری ملا علی قاری وغیرہ) (بحوالہ فتاوی رحیمیہ ج ۳ ص ۱۶، ۱۷)۔

نیز علم تجوید کی معروف کتاب "فتح الرحمان فی شرح خلاصۃ البیان" میں مرقوم ہے:

اور امام خرازؒ رسم عثمانی کے خلاف قرآن کریم کی کتابت سے متعلق فرماتے ہیں:

وكيف لا يجب الاقتداء لما أتى نصابه الشفاء

إلى عياض أنه من غير احرفا من القرآن عمدا كفرا

زيادة أو نقصا أو أن يبدلا شيئا من الرسم الذي تأصلا

علامہ شاطبیؒ قصیدۂ رائیہ کی ابتداء میں رسم عثمانی کی اتباع کو ضروری و واجب قرار دیتے ہوئے امام مالکؒ سے متعلق فرماتے ہیں:

وقال مالك القرآن يكتب بال كتاب الأول لا مستحدثا سطرا

اتباع رسم کے اس وجوب اور اس کے خلاف عدم جواز کو متن میں "لا يجوز مخالفته كتابة ولا قراءة" سے بیان فرمایا۔

رسم الخط کی تعریف سے معلوم ہوا گیا کہ رسم الخط میں مصحف سیدنا عثمانؓ کی اتباع اصل ہے، اس لیے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی کتابت میں اس کا اہتمام بلیغ فرمایا ہے کہ قرآن کریم کا جو کلمہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق جیسا لکھا گیا ہے اس کو ویسا ہی لکھا جائے، اس لئے کہ لوح محفوظ سے بواسطہ جبریلؑ اسی انداز پر لکھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا تھا اس میں کسی کے اجتہاد اور عقل کو دخل نہ تھا یہی وجہ ہوئی کہ ائمہ امت نے رسم عثمانی کے خلاف قرآن کریم کے لکھنے کو ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ "صاحب نہایہ" فرماتے ہیں:

" قال الإمام أحمد بن حنبل: تحرم مخالفة خط المصحف العثماني في واو أو ياء أو الف أو غير ذالك، وفي شرح ابن غازي وقد نقل الجعبري وغيره: إجماع الأئمة الأربعة على وجوب اتباع مرسوم المصحف العثماني " (نهايه ۲۳۸) (فتح الرحمان في شرح خلاصة البيان. ص ۲۲۲، ۲۲۳)۔

فرانس کے دار الحکومت پیرس میں ۲۰ تا ۲۲ شوال ۱۴۰۸ھ (۶ تا ۸ جون ۱۹۸۸ء) ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کا مقصد تحریف قرآن کی کوششوں بالخصوص غیر عربی حروف میں کتابت قرآن پر پابندی لگانا تھا، کانفرنس میں فرانس کے علاوہ مکۃ المکرمہ، مدینہ منورہ، دمشق، اور انقرہ کے نامور علماء اور ممتاز دانشوروں نے شرکت کی۔

کانفرنس کے تمام شرکاء نے متفقہ طور پر یہ قرارداد پاس کی کہ حفظ و قرأت کی سہولت کے بہانے غیر عربی حروف میں قرآن کی اشاعت کسی طور پر بھی درست

نہیں قرار دیجاسکتی یہ دراصل تحریف کی ایک کوشش ہے ایسا کرنا مطلق حرام ہے، قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس کی کتابت وتلاوت صرف عربی زبان ہی میں ہونی چاہئے، (اخبار العالم الاسلامی مکۃ المکرمۃ، بحوالہ مجلہ ششماہی علوم قرآن علی گڑھ ۶ جون ۱۹۸۸ء ص ۱۵۳)۔

المجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کا اس مسئلہ میں حتمی فیصلہ

مصحف عثمانی کے رسم الخط میں تبدیلی:

(الف) اکیڈمی کے اجلاس میں جدہ کے شیخ ہاشم وہبہ عبدالعال کا وہ خط پیش ہوا جس میں انہوں نے "مصحف عثمانی کے رسم الخط کی املائی رسم الخط میں تبدیلی" کے موضوع کا ذکر کیا ہے، نیز اس بابت ھیئۃ کبار العلماء ریاض کی قرارداد نمبر (۷۱) مورخہ ۲۱/۱۰/۱۳۹۹ھ کو بھی پیش نظر رکھا جس مین عثمانی رسم الخط ہی میں قرآن شریف کو باقی رکھنے کے درج ذیل اسباب ذکر کئے گئے ہیں:

۱...... یہ ثابت ہے کہ عثمانی رسم الخط میں قرآن شریف کریم کی کتابت حضرت عثمانؓ کے عہد میں انجام پائی، انہوں نے کاتبین کو حکم دیا کہ قرآن کریم کی کتابت ایک مقررہ رسم الخط میں کریں، صحابہ کرامؓ نے ان سے اتفاق کیا، اور تابعین بھی اسی راہ پر گامزن رہے، اور آج تک ہر دور کے لوگوں نے اس کی پابندی کی، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم پر میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے"، لہذا حضرت عثمانؓ اور تمام صحابہ کرام کی پیروی اور ان کے اجماع پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں تحریر کرنا متعین ہوجاتا ہے۔

۲...... عثمانی رسم الخط کو چھوڑ کر موجودہ رائج املائی رسم الخط کو پڑھنے کی آسانی کی غرض سے اختیار کرنا دراصل پھر دوسری تبدیلی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ یہ املائی رسم الخط ایک نوع کی اصطلاح ہے جو آئندہ کسی دوسری اصطلاح میں بدل سکتی ہے، اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں قرآن کے بعض حروف میں کمی وزیادتی اور تبدیلی کی صورت میں قرآن کے اندر تحریف کا باعث بن جائیگی، اور گذرتے ایام کے ساتھ قرآن کے مختلف نسخوں میں فرق واقع ہوجائے گا، اور اسلام دشمنوں کو قرآن کریم پر انگشت نمائی کا موقع مل جائیگا، اسلام نے شر کے ذرائع اور فتنہ کے اسباب پر ممانعت وبندش لگائی ہے۔

۳...... قرآن کریم کی کتابت میں اگر عثمانی رسم الخط کی پابندی نہ کی جائے تو اللہ کی کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیگی کہ جب جب کسی انسان کو کوئی نیا خیال سمجھ میں آئے گا تو اسے بروئے کار لے آئیگا، کوئی اسے لاطینی زبان میں اور کوئی کسی اور زبان میں تحریر کرنے کی تجویز پیش کریگا، جو ایک خطرناک عمل ہے، اور مفاسد کا ازالہ مصالح کی حصولیابی سے زیادہ اہم ہے۔

اجلاس میں اس موضوع پر غور وخوض اور مذکورہ اسباب کے پیش نظر بالاتفاق فیصلہ کیا گیا کہ "ھیئۃ کبار العلماء سعودی عرب" کی اس قرارداد کی تائید کی جائے کہ قرآن کے عثمانی رسم الخط میں تبدیلی جائز نہیں ہے، اور موجودہ رسم الخط ہی میں اسے باقی رکھنا واجب ہے، تاکہ ایک دائمی دلیل وحجت اس بات کی ہو کہ قرآن کے متن میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس کی پابندی ہی میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ سلفؒ کی پیروی واتباع بھی ہے، جہاں تک بچوں کے لئے قرآن کریم کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کا سوال ہے جو موجودہ املائی رسم الخط کے عادی ہوتے ہیں، تو اس ضرورت کی تکمیل اساتذہ کی تلقین سے ہوجاتی ہے، کیونکہ قرآن کی تعلیم کے لئے اساتذہ کی ضرورت سے کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہوا جاسکتا ہے، وہ یہ طریقہ اپنا سکتے ہیں کہ بچوں کو تعلیم دیتے وقت عثمانی رسم الخط میں تحریر آیات کو املائی رسم الخط میں لکھ کر تعلیم دیں، بالخصوص جبکہ یہ محسوس کیا جائے کہ ایسے حروف کی تعداد تو کم ہے، لیکن وہ قرآن کریم میں بار بار آتے ہیں، جیسے لفظ صلوٰۃ (نماز)، سمٰوات (آسمانوں) وغیرہ، جب بچے ایسے بار بار آنے والے الفاظ کو عثمانی رسم الخط میں سیکھ لیں گے تو پڑھنا آسان ہوجائیگا، جیسا کہ "ھذا" اور "ذلک" کے رسم الخط میں ہوتا ہے (بحوالہ المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے (ص ۱۴۵ تا ۱۴۶)۔

۲- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ جواہر الفقہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے کلام فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرآن شریف کا فقط ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے شائع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا صرف ترجمہ چھاپنے والا ہی مجرم ہے یا دوسرے خرید وفروخت کرنے والے بھی، حال میں پنجاب میں ایک ترجمہ ایسا چھپا ہے جیسے انجیل وغیرہ کا صرف ترجمہ چھپا ہوا ہے۔

الجواب: قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام ہے اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایات

ذیل میں اس کا ناجائز وحرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا۔ اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا۔ اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہ گار ہونگے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا لقولہ تعالیٰ: "ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورۂ نساء: ۸۵)۔ روایات جن سے حکم مذکور ثابت ہے حسب ذیل ہیں۔

الف: حضرات احناف رحمہم اللہ کا فتویٰ

"ومنها ما في الكافي: أنه ولو أراد أن يكتب مصحفا بالفارسية يمنع"۔

کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا۔

"ومنها ما قال في شرح الهداية فتح القدير للمحقق الكمال ابن همام وفي الكافي: إن اعتاد القرأة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع. فإن فعل آية او آيتين لا. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز"۔

ہدایہ کی شرح کمال ابن ہمام کی تصنیف فتح القدیر اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے۔ لیکن اگر الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے۔

علامہ محقق ابن ہمامؒ کی عبارت سے اس تفصیل کی بھی تصریح ہوگئی کہ فارسی (یا کسی اور عجمی) زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

پھر عبارات مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا جس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کہ کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو اس لئے علامہ شرنبلالیؒ نے روایات مذکورہ بالا نقل کرنے کے بعد فرمایا:

" قدمنا حكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسية وأنه إنما نص على الفارسية لافادة المنع بغيرها بالطريق الأولى، لأن غيرها ليس مثلها في الفصاحة، ولذا كانت في الجنة مما يتكلم به كالعربية كما تقدم" (النفحة القدسية ص ٣٢)۔

ترجمہ:۔ قرآن شریف کو فارسی میں لکھنے کی ممانعت پر اجماع کو تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اب یہ ہے کہ فارسی کی تصریح اس لئے کی گئی ہے، تاکہ دوسری زبانوں میں ممنوع ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوجائے، کیونکہ کوئی اور زبان فارسی سے فصیح نہیں ہے یعنی عربی کی طرح جنت میں فارسی بھی بولا کریں گے، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

اسی مسئلہ پر مفتی کفایت اللہ صاحبؒ رقم طراز ہیں:

قرآن مجید کا بغیر متن کے محض ترجمہ شائع کرنا کیسا ہے؟

کیا قرآن شریف کا ایسا ترجمہ جس میں عربی عبارت بالکل نہ ہو اور بامحاورہ عبارت ہو شائع کرنا درست ہے۔

المستفتی:۔ ۱۱۹۸ نیاز احمد صاحب (لاہور) ۷ رجب ۱۳۵۵ھ م ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء

(جواب ۱۲۸) قرآن مجید کی اصل نظم عربی اور اس کی خصوصیات کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اس کی عبارت ترجمہ کے ساتھ ضرور ہے۔ خالص ترجمہ کی اشاعت میں تغیر وتبدیل کے امکانات زیادہ ہیں، اس لئے اس پر اقدام کرنا مسلمانوں کے لئے قریب صواب نہیں (۱) محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی۔

"إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع..." (الشامية: ١/٤٨٦، بحواله كفايت المفتى ج ١ ص ١٢٨)

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ مسئلہ زیر بحث پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

(سوال ۱۰) قرآن مجید کا ترجمہ انگلش وغیرہ زبانوں میں کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(الجواب) ہاں! تبلیغ کے مقصد سے کر سکتے ہیں فقط واللہ اعلم بالصواب۔

''قرآن مجید کا ترجمہ بلا وضو چھو سکتے ہیں''؟

(سوال ۱۱) مذکورہ ترجمہ کو بلا وضو چھو سکتے ہیں یا نہیں؟ اور غیر مسلم کے ہاتھوں میں دے سکتے یا نہیں؟

(الجواب) ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے، لہٰذا بلا وضو کے نہ چھوئے۔ غیر مسلم کو تبلیغ کی غرض سے دے سکتے ہیں۔

فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاوی رحیمیہ ج ۳ ص ۱۹)۔

نیز حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے اس مسئلہ کا جواب کچھ اس طرح لکھا ہے:

ترجمہ قرآن بغیر عربی عبارت کے:

سوال:۔(۱۱۳۷) : قرآن شریف کو بغیر عربی کے صرف اردو ترجمہ کے ساتھ چھاپنا کیسا ہے اور اس کو خریدنا اور پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب: حامدًا و مصليًا:

بغیر عربی کے محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف کو لکھنا چھاپنا منع ہے، اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل ہے (۱)۔

قال العلامة الشامي: '' في الفتح عن الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع. اهـ'' (شامی: ۱/۳۲۶)۔

اس سے خریدنے اور بیچنے کی بھی ممانعت معلوم ہوگئی۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ العبد محمود گنگوہی غفرلہ دار العلوم دیوبند۔ (فتاوی محمودیہ ج ۳ ص ۵۱۰ تا ۵۱۲)۔

۳- موبائل پر قرآن مجید:

اس مسئلہ پر پورے غور و خوض اور علمائے کرام و مفتیان عظام کے فتاویٰ کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ موبائل کے ڈھانچہ کو ''غلاف متجاف'' یعنی ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بغیر وضو چھونے کی شرعاً اجازت ہے، کیونکہ موبائل اب عوام و خواص کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن چکا ہے اور قرآن مجید و دینی کتب و معلومات اگر اس میں اسٹور ہوں اور ان سے استفادہ بھی کیا جائے تو غالب تعداد میں موجود ان لاکھوں ویب سائٹوں کے زہریلے و خوفناک اثرات سے انسانیت بالخصوص افراد ملت اسلامیہ بڑی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ تو اللہ ہی حافظ ہے:

''... لا يجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به هو الصحيح هكذا في الهداية، وعليه الفتوى، كذا في الجوهرة النيرة. و الصحيح منع مس حواشي المصحف والبياض الذي لا كتابة عليه هكذا في التبيين... ولا يجوز مس شيء مكتوب فيه شيئ من القرآن من لوح أو دراهم أو غير ذالك إذا كان آية تامة هكذا في الجوهرة النيرة'' (فتاوىٰ ہندیہ ص ۳۸-۳۹ ج ۱ دار الکتاب دیوبند)۔

۴- قرآنی آیات کے کیسٹ بے وضو چھونا:

لکھی ہوئی آیات کو ناپاکی کی حالت میں چھونا درست نہیں، اس پر سبھوں کا اتفاق ہے۔ کیسٹ، ظاہر ہے کہ تحریر نہیں ہے۔ اس لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ) نے اس کو بے وضو بھی چھونے کی اجازت دی ہے (امداد الفتاویٰ ۱/۱۴۵) اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ ''قرآن کی آواز'' ہے، اور قرآن کی آواز کے جسم سے مس ہونے کے لئے پاکی ضروری نہیں، ورنہ تو جنبی کے لئے قرآن کا سننا بھی درست نہیں ہوتا۔

لیکن مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ''قرآن'' کو چھونے کی ممانعت کا اصلی سبب اس کا ''مکتوب ہونا'' نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا احترام ہے۔ یہ تحریر الفاظ قرآنی کا نقش ہے۔ جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ''کیسٹ'' آواز قرآنی کا نقش ہے جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اگر کاغذ کا احترام واجب ہو جن میں الفاظ محفوظ کئے گئے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان فیتوں کا احترام واجب نہ ہو جن میں قرآن کی آواز کو محفوظ کیا گیا ہو۔ اس لئے آیات قرآنی کے کیسٹ بھی بلا وضو چھونا مناسب نہیں، اور کم سے کم احتیاط کے خلاف ہے۔ جنبی کے لئے سماعت قرآن کے جائز ہونے سے استدلال محل غور ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید سننے میں سننے والے کے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ آواز بے اختیار اس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے برخلاف کیسٹ چھونے میں خود چھونے

والا اپنے اختیار سے یہ کام کرتا ہے۔ البتہ فیتہ کے اوپر جو پلاسٹک کا کیس ہے اس کی حیثیت غلاف کی ہوگی اور اس کے ساتھ چھونے میں مضائقہ نہیں۔

۵- جنابت میں قرآن کی کتابت وٹائپ:

جنابت کی حالت میں قرآن مجید کا لکھنا درست نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر کاغذ اس طرح ہو کہ اس پر ہاتھ رکھنے کی نوبت نہ آئے تو بھی درست نہ ہوگا۔ چاہے ایک آیت سے بھی کم کیوں نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنبی کے لئے قرآن مجید کی کمپوزنگ اور اس کو ٹائپ کرنا بھی درست نہ ہوگا

''والجنب لايكتب القرآن وإن كانت الصحيفة على الأرض ولا يضع يده عليها وإن كان ما دون الآية'' (الفتاوىٰ الهنديه ۱ ص ۲۰)۔

جنبی قرآن مجید کی کتابت نہ کرے خواہ ایسا ہی کیوں نہ ہو کہ کاغذ زمین پر ہو اور وہ اس پر اپنا ہاتھ نہ رکھے، چاہے وہ ایک آیت سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

اگر وضو نہ ہو تو اس طرح لکھ سکتا ہے کہ ہاتھ کاغذ سے نہ لگے۔

''ولا تكره كتابة القرآن والصحيفة واللوح على الأرض'' (الدر المختار ج ۱ ص ۱۸)۔

بے وضو کے لئے قرآن کی کتابت اس طرح مکروہ نہیں ہے کہ کاغذ اور تختی زمین پر ہو۔

مگر اس میں بھی اختلاف ہے اس لئے احتراز بہتر ہے۔ یہ حکم جس طرح کتابت کے لئے ہے اسی طرح ٹائپ اور کمپوزنگ کے لئے بھی ہے۔

قرآن مجید کی غلاف نما جلد:

قرآن مجید کی ایک جلد تو وہ ہے جو جلد سازی میں قرآن کے اوراق کے ساتھ پیوستہ کردی جاتی ہے، اس کو الگ کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں ہو، تا کہ ان اوراق کو جس سلائی نے مربوط رکھا ہے اسے توڑ دیا جائے۔ ایسی جلد بجائے خود مصحف قرآنی کے حکم میں ہے۔ ناپاک آدمی کے لئے اس کا چھونا اور پکڑنا درست نہیں ہے۔ اور اگر ایسی جلد ہو جو بآسانی اس سے علاحدہ کی جاسکتی ہے، جیسا کہ آج کل بیگ نما جلدیں ہیں تو ان کو چھوا جاسکتا ہے۔ اور یہ غلاف کے حکم میں ہے جن کے ساتھ فقہاء نے بلا وضو بھی قرآن مجید کو چھونے کی اجازت دی ہے (الفتاوىٰ الهنديه ج ۱ ص ۲۰) (بحوالہ جدید فقہی مسائل ج ۱ ص ۱۰۱-۱۰۳)۔

اور مفتی محمد سلمان منصور پوری زید مجدہٗ نے یہ فتویٰ لکھا ہے:

قرآن کریم والے موبائل کو بلا وضو چھونا:

سوال:- بغیر وضو کے اپنے موبائل کا چھونا جس میں قرآن کریم یا احادیث شریفہ وغیر کو چلایا جا رہا ہو کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن یا احادیث شریفہ کے حروف دکھائی دے رہے ہوں تو ان حروف (اسکرین) پر بلا وضو ہاتھ رکھنا درست نہیں، لیکن اگر یہ پروگرام بند ہو تو ایسے موبائل کو بلا وضو چھونا منع نہیں۔

''يمنع دخول المسجد (إلى قوله) ومسه أي القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط'' (شامی زکریا ج ۱ ص ۴۸۸)۔

اسکرین پر قرآنی آیات کو بلا وضو چھونا:

سوال: موبائل کی اسکرین پر قرآنی آیت ہے، تو کیا بلا وضو اس اسکرین کو چھو سکتے ہیں؟

جواب: جس اسکرین پر قرآن کی آیت نمایاں ہو اس اسکرین کو بلا وضو چھونا احتیاط کے خلاف ہے۔

''ومسه أي القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط'' (شامی زکریا ج ۱ ص ۴۸۸، بحوالہ موبائل کے مسائل ص ۵۱)۔



قرآن مجید کے متن و ترجمہ سے متعلق احکام

مولانا عبد الرب عبد الوہاب خان وانی سعادتی[1]

۱- کسی بھی زبان میں ایسا ترجمہ قرآن مجید شائع کرنا جس میں متن قرآن مجید نہ ہو، ناجائز ہے اور اس پر امت کا اجماع اور اتفاق ہے، اور اس کی متعدد وجوہ ہیں، جن میں سے چند وجوہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

وجہ اول:...... معانی قرآن کی طرح الفاظ قرآن کی حفاظت فرض اور واجب ہے، ''کما ہو المقرر عند کافۃ الناس''، اور موجودہ زمانے میں طبائع دین مبین سے بے التفاتی اور سہل انگاری کا شکار ہیں، اگر اس قسم کے تراجم شائع ہو گئے تو الفاظ قرآن کی اہمیت قلوب سے قطعاً ختم ہو جائیگی اور اس کے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی، پس ہر کہ ومہ ترجمہ ہی کو کافی سمجھے گا، بالآخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ (العاذ باللہ) تلاوت قرآن مجید کرنے والا کوئی شخص مشکل ہی سے ملے گا، پس اس سبب کی بنا پر ایسے تراجم شائع کرنا ممنوع ہوگا۔

چنانچہ صاحب ہدایہ اپنی ''کتاب التجنیس والمزید میں لکھتے ہیں:

ویمنع من کتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدى إلى للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمر القرآن'' (کتاب التجنيس والمزيد ١/٢٧٤)۔

اسی طرح حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں: ''اور مثلاً اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسی بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں، اور پھر تو قرآن سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے، اور بے ساختہ یہ آیت ان پر صادق آنے لگے گی:

"نبذ فريق من الذين اوتوا الكتاب كتاب الله وراء ظهورهم كأنهم لايعلمون" (سورۂ بقرہ: ۱۰۱۔ امداد الفتاوی ۴/۴۱)۔

وجہ ثانی: اگر متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ کی اشاعت کو درست قرار دیا جائے تو پچھلی آسمانی کتابوں کی طرح بدرجہ اولی اصل قرآن مجید کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''أمتهوكون انتم كما تهوكت اليهودو النصارى'' (مشکوۃ/ص ۳۰، امداد الفتاوی ۴/۴۰)

وجہ ثالث: نیز بغیر متن قرآن مجید کے صرف ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت صراحۃ اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، اور اس کی مذمت نصوص من اظہر من الشمس ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "ولا تر كنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار" (سورۂ ہود: ۱۱۳)، اور علاوہ ازیں مشہور حدیث پاک ہے:

''من تشبه بقوم فهو منهم'' (ابوداؤد كتاب الادب، باب في لبس الشهرة، رقم الحديث ۴۰۳۱)

اور خاص طور سے اس لئے کہ یہ تشبہ امور دین سے متعلق ہے نہ کہ امور دنیویہ سے متعلق، اور امور دین میں تشبہ بہ نسبت امور دنیویہ کے زیادہ شنیع اور مذموم ہے۔

وجہ رابع:...... آج کل طبائع میں خودرائی اور خونمائی کا غلبہ ہے، جس نے بھی الٹے سیدھے چار حروف پڑھے ہیں، مدعی اجتہاد اور محقق بن رہا ہے، اجازت کی صورت میں نہ معلوم کن کن لوگوں کے تراجم شائع ہوں گے، اور ان میں بھی وہ کیا کیا گل کھلائیں گے اور افہام و تفہیم مستبعد اور احقا

[1] خادم جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات۔

قریب محال ہوجائے گا، اسی طرح کلام الٰہی کی مراد میں ایک ایسا چوپٹ دروازہ کھل جائے گا جس کا بند کرنا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔

وجہ خامس: ...... اگر بغیر متن قرآن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت ہو تو ایسے تراجم کو پرانے ہوجانے کی صورت میں ردی ٹوکری میں اس طرح ڈال دیا جائے گا، جیسے کہ کچرا (نعوذ باللہ) یا اس کے اوراق پھاڑ پھاڑ کر دیگر کاموں میں اس طرح استعمال کریں گے، جیسے معمولی کتابیں یا اس طرح فروخت کریں گے، جیسے پرانے اخبار کے صفحات (العاذ باللہ)۔

ان مذکورہ بالا مفاسد کو دیکھتے ہوئے تمام ہی فقہاء کرام نے قرآن مجید کا بغیر متن کے محض ترجمہ لکھنے کی صراحتاً ممانعت فرمائی ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ علامہ ابن الہمام فتح القدیر میں رقم طراز ہیں: ''وفيه (الكافي) إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (فتح القدیر مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان ۱/ ۲۴۸، ۲۴۹)، ''وكذا في الفتاوى الشامية في باب صفة الصلاة'' (شامی زکریا ۲/ ۱۸۵)۔

محقق ابن الہمام کی اس عبارت سے یہ وضاحت بھی ہوگئی کہ فارسی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے، تو ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں شامل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کے معتد بہ حصے کا لکھنا حرام ہے، علاوہ ازیں اگر اصل متن عربی میں لکھ کر اس کے نیچے یا حاشیہ میں ترجمہ یا تفسیر لکھی جائے تو جائز ہے۔

ان تمام فقہاء کرام اور مفتیان عظام کی عبارات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بغیر متن قرآن مجید کے محض ترجمہ قرآن کی اشاعت باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے۔

رہا یہ کہنا کہ غیر حامل متن تراجم قرآنیہ کی اشاعت میں مصارف کم آتے ہیں، یا غیر مسلمین کو دینے میں بے حرمتی کا اندیشہ نہیں ہے، اولاً تو ان مفاسد شدیدہ کے مقابلے میں ان کا کوئی اعتبار نہیں اور ثانیاً یہ تقریباً ایسا ہی عذر ہے جس کسی نے امام محمد بن فضل سے استفتا کیا تھا کہ ہمارے زمانے میں بچوں کو عربی میں قرآن پڑھنا شاق ہے، تو کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم اسے فارسی میں پڑھا دیا کریں؟ آپ نے سائل کو فرمایا کہ پھر آنا ذرا غور کرلیں اور آپ نے اس شخص کے حال کی تحقیق فرمائی، تو وہ فساد مذہب میں مشہور تھا، تو آپ نے خادم کے ذریعہ اس کو قتل کروادیا اور فرمایا کہ یہ شخص اللہ کی کتاب کو گم کرنا چاہتا تھا، اور فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص عمداً ایسا کرتا ہے وہ زندیق ہے یا مجنون ہے، اگر مجنون ہے تو اس کا علاج کیا جائے اور اگر زندیق ہے تو قتل کرایا جائے۔

واقعہ یہ کہ شیخ محمد بن الفضل کا یہ قصہ بڑا چشم کشا ہے، جس کو علامہ خوارزمی نے کفایہ شرح ہدایہ میں نقل کیا ہے: ''أما من تعمد ذلك يكون زنديقا أو مجنونا فالمجنون يداوى والزنديق يقتل'' (کفایہ مع فتح القدیر مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان ۱/ ۲۴۸، ۲۴۹)۔

ب- جب اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہے تو اس کا خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا بوجہ اعانت علی المعصیۃ کے ناجائز ہوگا۔

لقولہ تعالی: "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)۔

ج- قرآن مجید کا ترجمہ خواہ کسی زبان میں ہو مسلمان کے لئے بلا وضو چھونا مکروہ ہے، اس میں اردو، فارسی اور انگریزی وغیرہ سب داخل ہیں، اس لئے کہ گو کلام الٰہی اصل عربی الفاظ ہیں، مگر مقصود تو یہی معانی اور مفاہیم ہیں، چنانچہ ''فتاوی عالمگیریہ'' میں لکھا ہے:

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عن أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح'' (الفتاوی العالمگیریہ مطبوعہ مکتبہ رشید کوئٹہ پاکستان ۱/ ۱۳۹)۔

اور بعض فقہاء کے نزدیک ترجمہ قرآن قرآن کے حکم میں نہیں ہے، لہذا بلا وضو چھونا جائز ہے، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں لکھا ہے:

''أما ترجمة معاني القرآن باللغات الأعجمية فليست قرآنا، بل هي نوع من التفسير على ما صرح به المالكية وعليه فلا بأس أن يمسها المحدث عند من لا يمنع المس المحدث لكتب التفسير'' (موسوعہ فقہیہ، وزارات اوقاف، کویت)

تاہم ظاہر ہے کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ترجمہ قرآن کو چھونے کے لئے وضو کرلیا جائے۔

۲- مذکورہ سوال میں دو جزئیات حل طلب ہیں:

الف- غیر عربی داں حضرات کے لئے تلاوت قرآن میں سہولت کے لئے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کا حکم: چونکہ اس سوال کا جواب مبنی ہے ایک دوسرے مسئلے ''رسم عثمانی کے علاوہ قرآن کی کتابت'' پر اور وہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

قدیم زمانے سے اس میں اختلاف منقول چلا آرہا ہے اور علماء نے اس مسئلے پر مستقل تصانیف فرمائی ہیں، چنانچہ علامہ زرقانی نے ''مناہل العرفان'' (۳۰۶/۱) میں اور دکتور شعبان محمد اسماعیل استاذ جامعہ ازہر نے اپنی کتاب ''رسم المصحف وضبطه بين التوقيف والاصطلاحات الحديثة'' (ص ۶۳) میں علماء کے تین مذاہب وآراء کا ذکر کیا ہے:

مذہب اول:...... جمہور سلف وخلف کا مذہب یہ ہے کہ قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے، قرآن کی کتابت میں اس کا اتباع واجب ہے، اور اس میں تغییر اور اس کی مخالفت حرام ہے، بلکہ بہت سے علماء نے تو اس پر اجماع نقل کر دیا، کما سیاتی۔

دلائل جمہور:...... پہلے مذہب کے قائلین نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں:

۱- سنت قولیہ: قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے، اور یہ رسم آپ ﷺ کے حکم سے اختیار کیا گیا، جیسا کہ مسند فردوس دیلمی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کاتب وحی حضرت معاویہؓ سے ارشاد فرمایا:

''ألق الدوات وحرف القلم وانصب الياء وفرق السين ولا تعور الميم و حسن الله ومد الرحمن وجود الرحيم'' (الفردوس بماثور الخطاب للديلمي ۳۹۴/۵)، اور یہ بات مسلم ہے کہ آپ ﷺ کے اوامر کا اتباع واجب ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وما اٰتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا'' (سورۂ حشر: ۷)۔

فائدہ: لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ مذکورہ بالا روایت کی سند ثابت نہیں ہے (فتح الباری ۵۰۴/۷)۔

اس کے علاوہ ابن مبارک نے اپنے شیخ عبد العزیز الدباغ سے نقل کیا ہے:

''رسم القرآن سر من أسرار المشاهدة وكمال الرفعة، وهو صادر عن النبي ﷺ وليس للصحابة ولا لغيرهم في رسم القرآن ولا شعرة واحدة، وإنما هو بتوقيف من النبي ﷺ وهو الذى أمرهم أن يكتبوه على الهيئة المعروف لزيادة الألف ونقصانها ونحو ذلك لأسرار لاتهتدى إليها العقول إلا بفتح رباني. وهوسر من الأسرار التي خص الله به كتابه العزيز دون سائر الكتب السماوية. فكما أن نظمه معجز فرسمه معجز أيضا'' (الابريز للشيخ عبدالعزيز الدباغ: ص ۹۰، بحواله رسم المصحف وضبطه: ص ۶۵،۶۶)۔

۲- سنت تقریریہ: آپ ﷺ کے متعدد کاتبین وحی تھے، جن کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا، تو آپ کاتب وحی کو ہدایت فرماتے تھے کہ اس سے فلاں فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھ لیا جائے (فتح الباری ۱۸/۹)، چنانچہ اسے آپ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا، چونکہ اس زمانے میں عرب میں کاغذ کم یاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں (فتح الباری ۱۱/۹، عمدۃ القاری ۱۷۱/۲۰)۔

بہر حال علماء کے درمیان اس بات پر اتفاق ہے کہ پورا قرآن کریم آپ ﷺ کی زندگی میں متفرق اشیاء پر لکھوا لیا گیا تھا اور یہ کتاب جس رسم پر کی گئی تھی اس کی آپ نے تقریر فرمائی، یعنی اس کو برقرار رکھا اور تقریر بھی سنت کی ایک قسم ہے اور محدثین واصولیین کے نزدیک حجت ہے، اگر کتابت میں خطا ہوتی تو آپ ﷺ ہرگز ان کی تقریر نہ فرماتے، نیز یہ باری تعالیٰ کے ارشاد: ''انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون'' (سورۂ حجر: ۹) کے صریح معارض ہوتا (ابحاث فقہیہ مقارنہ/ص ۱۲۷، ۱۲۸، رسم المصحف وضبطہ/ص ۶۵)۔

۳- عمل صحابہ: جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور قرآن کریم کے منتشر حصوں کو یکجا محفوظ کرنے کا حکم دیا، تو کاتبین نے اسی ہیئت پر لکھا، جس ہیئت

ورسم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھا گیا تھا، پھر جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے اور مصحف ابی بکر کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کے کئی نسخے تیار کروائے، تو اسی رسم کو برقرار رکھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین من بعدی'' (اخرجه ابوداؤد فی کتاب السنة، باب فی لزوم السنة رقم الحدیث/ ص۴۶۰۷ واخرجه الترمذی فی کتاب العلم باب ماجاء فی الاخذ بالسنة والاجتناب البدع رقم الحدیث/ ص۲۶۷۶ واخرجه ابن ماجه فی مقدمة باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین رقم الحدیث/ ۴۲)۔ لہذا اب ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم خلفائے راشدین کے عمل کی مخالفت کریں، خاص طور پر جب کہ تمام صحابہ نے اس کو بنظر استحسان دیکھا اور کسی نے نکیر نہیں فرمائی۔

۴- اجماع امت: امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ کئی علماء نے اس پر اجماع نقل کیا اور کئی علماء نے رسم عثمانی کے اتباع کے وجوب کی صراحت کی، آئندہ سطور میں ان کی چند عبارتیں پیش کی جارہی ہیں:

علامہ سیوطی نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں رسم خط قرآن اور کتابت قرآن کے آداب پر مستقل فصل قائم کی ہے، جس کا عنوان ہے:

''النوع السادس والسبعون فی مرسوم الخط وآداب کتابته'' اس کے تحت لکھتے ہیں: ''قال أشهب: سئل مالك هل یکتب المصحف علی ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا. إلا علی الکتبة الأولی. رواه الدانی فی المقنع. ثم قال: لا مخالف له من علماء الأمة'' (الاتقان مطبوعة دار الکتاب العربی بیروت لبنان/ ص۸۳۰)۔

حافظ ابن حجر مکی ہیتمی امام مالک کا مذکورہ بالا کلام نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''وإذا وقع الإجماع کما تری علی منع ما أحدث الناس الیوم من مثل کتابة الربوا بالألف مع أنه موافق للفظ الهجاء فمنع ما لیس من جنس الهجاء الاولی'' (الفتاوی الفقهیه الکبری لابن حجر المکی، مطبوعه دار الکتاب العلمیه بیروت لبنان ۱/ ۶۰)۔

شرح طحاویہ میں لکھا ہے: ''ینبغی لمن أراد کتابة القرآن أن ینظم الکلمات کما هی فی مصحف عثمانی لإجماع الأمة علی ذلك'' (سمیر الطالبین للشیخ الضباع بحواله رسم المصحف وضبطه/ ص۶۸)۔

علاوہ ازیں علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نور الایضاح'' جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور مذہب حنفی کے معروف مفتی ہیں، ان کا ایک مستقل رسالہ ہے، جس کا نام ''النفحة القدسیة في أحکام قراءة القرآن وکتابته بالفارسیة'' اصل رسالہ تو احقر کو دستیاب نہ ہوسکا، البتہ اس کے کافی طویل اقتباسات مفتی شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''تحذیر الأنام عن تغییر رسم الخط من مصحف الامام'' میں نقل کئے ہیں جو جواہر الفقہ کا جز بن کر شائع ہو چکا ہے، اس میں مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں: ''اس (رسالہ صاحب نور الایضاح) میں مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے اور اس طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع اور ناجائز ہے (جواہر الفقہ مطبوعہ سلمان عثمان اینڈ کمپنی دیوبند ۲/ ۶۷تا۹۹)۔

مذہب ثانی: ......قرآن کریم کا رسم الخط توقیفی ہے اور جدید قواعد رسم کے مقتضاء کے موافق اس میں تبدیلی جائز ہے اور رسم عثمان کے علاوہ دیگر رسوم میں اس کی کتابت جائز ہے۔

علامہ ابن خلدون کا میلان اسی جانب ہے، چنانچہ وہ اپنی تاریخ کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''فکان الخط العربی أول الإسلام غیر مانع إلی الغایة من الأحکام و الاتقان والإجادة ولا إلی التوسط لمکان العربی من البداوة وبعدهم عن الصنائع وانظر ما وقع من أجل ذلك فی رسمهم المصحف حیث رسمه الصحابة بخطوطهم وکانت غیر مستحکمة فی الإجادة فخالف الکثیر من رسومهم ما اقتضته رسوم صناعة الخط عند أهلها ثم اقتفی التابعون من السلف رسمهم فیها تبرکا بمارسمه أصحاب رسول الله ﷺ وخیر الخلف من بعده الملتقون لوحیه من کتاب الله تعالی وکلامه ولا تلتفتن فی ذلك إلی ما یزعمه بعض المغفلین من أنهم کانوا محکمین

لصناعة الخط وماحملهم على ذلك إلا اعتقادهم أن في ذلك تنزيها للصحابة عن توهم النقص في قلة إجادة الخط. وحسبوا أن الخط كمال فنزهوهم عن نقصه ونصبوا إليهم الكمال بإجادته وطلبوا تعليل ماخالف الإجادة من رسمه وليس ذلك بصحيح'' (مقدمہ ابن خلدون، از تحقیق حامد الطاهر مطبوعہ دار النشر للتراث القاہرہ/ ص ۵۰۴)۔

نیز یہی رائے قاضی ابوبکر باقلانی کی ہے (دیکھئے: مناہل العرفان ۱/ ۳۰۹، مع تلخیص)، نیز یہی رجحان علامہ شوکانی کا ہے (دیکھئے: تفسیر فتح القدیر مطبوعہ عالم الکتب ۱/ ۲۹۴، ۲۹۵)، اس کے علاوہ بہت سے معاصر علماء کی بھی یہی رائے ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: رسم المصحف وضبطہ: ص ۶۳)۔

مذہب ثالث:......عوام الناس کے لئے قرآن مجید کی کتابت رسم عثمانی کے مطابق جائز نہیں، تاکہ جاہل لوگ قرآن میں تبدیلی کا شکار نہ ہو جائیں، بلکہ ان کے لئے تو قرآن کو ہر زمانے میں معروف رسم اور خط میں لکھا جائے، لیکن علماء وخواص کے لئے رسم عثمانی کی محافظت واجب ہے، بالفاظ دیگر دو طرح قرآن کریم کی کتابت کی جائے، خواص اور علماء کے لئے رسم عثمانی کے مطابق اور عوام الناس کے لئے رائج رسم الخط کے موافق (مناہل العرفان ۲/ ۳۱۲، رسم المصحف وضبطہ/ص ۶۳ تا ۸۷)۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام اور علامہ زرکشی کا رجحان یہی ہے، چنانچہ علامہ زرکشی ''البرہان فی علوم القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''وأما كتابته أي المصحف على ما أحدثه الناس الهجاء. فقد جرى عليه أهل المشرق. بناء على كونها أبعد من اللبس و تحاماه أهل المغرب بناء على قول الإمام مالك وقد سئل: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الاولى، قلت: وكان هذا في الصدر الأول، والعلم حيّ غض، وأما الآن فقد يخشى الالباس ولهذا قال الشيخ عز الدين بن عبدالسلام: لاتجوز كتابة المصحف الآن على الرسوم الأول باصطلاح الأئمة لئلايوقع في تغيير من الجهال، ولكن لاينبغي إجراء هذا على إطلاقه لئلا يؤدي إلى دروس العلم، وشئ قد أحكمته القدماء لايترك مراعاته لجهل الجاهلين، ولن تخلو الأرض من قائم لله بحجة'' (البرہان فی علوم القرآن للزرکشی مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ بیروت ۱/ ۳۶۰)۔

علامہ زرقانی اور صاحب تبیان کا میلان بھی اسی جانب ہے (مناہل العرفان: ص ۳۱۲، ۳۱۳)۔

علاوہ ازیں اگر رسم عثمانی کی اتباع کو واجب قرار نہ دیا جائے اور مختلف رسم الخط میں کتابت قرآن کو جائز قرار دیا جائے، تو ایسا فتنہ پیدا ہوگا جو اس فتنہ واختلاف کے مشابہ ہوگا جو حضرت عثمان کے زمانے میں پیدا ہوا تھا جس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کو از سر نو جمع کروایا، اس لئے کہ قواعد املاء اور اصول خط تو زمان ومکان کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں، تو اگر مختلف رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھا گیا تو بعض لوگ اختلاف کرتے ہوئے کہیں گے کہ میرا رسم الخط تمہارے رسم الخط سے بہتر ہے، یا میرا مصحف تمہارے مصحف سے بہتر ہے، یا میرا رسم الخط صحیح اور تمہارا غلط وغیرہ اور شریعت کا قاعدہ مسلمہ ہے:

''درأ المفاسد مقدم على جلب المصالح'' (مناہل العرفان ۱/ ۳۲۲، رسم المصحف وضبطہ/ ص ۷۷،۷۸)۔

قول راجح: ان تینوں مذاہب وآراء میں سے پہلا مذہب اور رائے ہی راجح ہے، اس لئے کہ جس طرح قرآن کے الفاظ ومعانی کی حفاظت من جانب اللہ کی گئی اسی طرح اس کے رسم الخط کی بھی من جانب اللہ حفاظت کی گئی ہے، چنانچہ آج تک رسم عثمانی کے مطابق قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ جاری ہے، اس لئے علماء امت نے اس رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت کو واجب قرار دیا ہے اور اس کے انحراف کو ممنوع قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے، اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں قرآن کی کتابت جائز نہیں اور جہاں تک غیر عربی داں حضرات کے لئے قرآن مجید کی تلاوت کو آسان کرنے کی ضرورت کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضرورت مدرسین کی رہنمائی سے پوری ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم قرآن کے سلسلے میں کبھی بھی انسان استاذ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ب- اوپر جو عبارات ائمہ کی نقل ذکر کی گئی ہیں، ان میں جس طرح غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا حکم معلوم ہو گیا کہ وہ حرام ہے، اسی طرح عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآنی کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ کر دونوں کو ایک ساتھ شائع کرنے کا

حکم بھی معلوم ہو گیا کہ وہ ناجائز ہے، اس لئے کہ اس میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کی تغییر ہے، جو بالاجماع حرام ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

''متن قرآن مجید عربی خط ہی میں لکھنا چاہئے، ہندی رسم الخط میں کوئی ضرورت نہیں، بے پڑھائے تو ہندی میں ہونے سے بھی کوئی نہیں پڑھ سکے گا اور پڑھانے سے عربی حروف کا یاد کر لینا کچھ مشکل نہیں...... علاوہ اس کے ہندی یا انگریزی میں ہو تو حروف عربیہ کی شکل میں نہیں جیسے ''ق، ض، ط، ظ، ز، ش'' پس جب ان کو دوسری شکل میں لکھا جاوے گا تو ظاہر ہے کہ اصل حروف پڑھے بھی نہ جاویں گے تو اس میں عمداً تحریف کا جائز رکھنا ہے، وھذا حرام'' (امداد الفتاوی ۴/ ۴۳، ۴۳، ۴۴)۔

۳- بریل کوڈ کے رسم الخط میں قرآن تیار کرنا:

یہ سوال چند جزئیات پر مشتمل ہے:

(اول) بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کے باوجود کیا نابیناؤں کی مجبوری کی بناء پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے؟

جواب: بریل ایک قسم کا ذریعہ ابلاغ ہے، جو کاغذ پر ابھارے گئے نقطوں پر مبنی ہے، جن کے ذریعہ ایک نابینا آدمی اپنی قوت لامسہ کا استعمال کرتے ہوئے پڑھنے کے قابل بن سکتا ہے، چنانچہ اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''خط برايل عبارة عن خط نقطي يتم تنقيطه عن طريق خلية صغيرة، تمثل شكلا مستطيلا يتكون ضلعه الرأسي من ثلاث نقط وضلعه الأفقي من نقطتين'' (ابحاث فقهيه مقارنة للدكتور عبدالله المطلق مطبوعة داركنوز اشبيليا، الرياض/ ص۱۳۷)۔

اب جہاں تک تعلق ہے بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے کے حکم کا، تو اس سلسلے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کی کتابت بریل کوڈ میں کتابت دو حال سے خالی نہیں ہے:

۱- قرآن کریم کی کتابت میں رسم عثمانی کے التزام کے ساتھ بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا مثلاً کلمہ ''الربوا'' کو واو کے ساتھ لکھائے، اور کلمہ ''العالمین'' کو عین کے بعد حذف الف کے ساتھ لکھا جائے، وغیرہ وغیرہ، البتہ چند کلمات میں رسم عثمانی کی موافقت ممکن نہیں ہوگی، تو با قاعدہ ''المشقة تجلب التيسر'' اس کو معفو عنہ قرار دیا جائے گا، نیز اس لئے بھی کہ تکلیف بقدر استطاعت ہوا کرتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''لا يكلف الله نفساً الا وسعها'' (سورہ بقرہ: ۲۸۶)، اور علمائے متقدمین سے جو رسم عثمانی کے اتباع کا تاکد منقول ہے، تو وہ ''ما أمکن'' کی شرط کے ساتھ ہے، چنانچہ امام بیہقی کے کلام میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''من كتب مصحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئاً'' (شعب الايمان للبيهقي ۲/ ۵۴۸)۔

۲- نابیناؤں کے لئے عثمانی رسم الخط کے بجائے رسم قیاسی کے مطابق قرآن مجید کو بریل کوڈ میں تیار کرنا، مثلاً ''العالمین'' کو الف کے ساتھ لکھنا، اور ''ربوا'' کو الف کے ساتھ لکھنا وغیرہ۔

چنانچہ ایسے قرآن مجید اردن، تیونس، مصر اور سعودیہ عرب سے شائع ہو چکے ہیں، ان کا اعتماد ان لوگوں کے قول پر ہے، جو رسم عثمانی کی موافقت کو واجب نہیں کہتے، مثلاً عزالدین بن عبدالسلام، ابن خلدون، قاضی ابوبکر باقلانی، شوکانی، علامہ زرقانی، صاحب مناہل العرفان وغیرہ، نیز شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''أما اتباع رسم الخط بحيث يكتبه بالكوفي فلا يجب عند أحد من المسلمين وكذلك اتباعه فيما كتبه بالواو والألف وحسن لمتابعة رسم الخط الصحابة'' (فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۴۲۰)۔

چنانچہ شیخ عبداللہ بن محمد المطلق اپنے مقالہ ''كتابة القرآن بخط برايل'' میں رقم طراز ہیں:

"أما عن كتابة المصحف بخط برايل للمكفوفين فلا يخلو الأمر فيه من حالين:

الاول: كتاب المصحف بخط برايل مع التزام الرسم العثماني في كتابة كلمات القرآن بحروفها الموجودة في رسم مصحف عثمان، فمثلا كلمة الربا تكتب بالواو، وكلمة غيابة تكتب التاء المفتوحة، وكلمة العالمين تحذف منها الالف بعد العين، وكلمة قرآن تكتب بهمزة على السطر ونحو ذلك وقد يستحيل تطبيق رسم القرآني في كلمات معدودة، فيعفى عن ذلك، لكشقته، ولأن التكليف مربوط بالاستطاعة كما قال تعالى "لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" (سورۂ بقرہ:۲۸۶)۔

راقم الحروف کے نزدیک ساری بحث کا مدار غالبا اس بات پر ہے کہ بریل رسم الخط ہے یا کوڈ ہے؟

الف-اگر بریل رسم الخط ہے تب تو بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کی وجہ سے بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنا درست نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ رسم عثمانی کا اتباع واجب ہے اور اس پر تمام صحابہ کا اجماع اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے الا یہ کہ نابیناؤں کی مجبوری کی بناء پر ان حضرات علماء (عزالدین بن عبدالسلام، ابن خلدون، قاضی ابوبکر باقلانی، شوکانی، زرقانی، صاحب مناہل العرفان، رشید رضا مصری وغیرہ) کے قول کو اختیار کیا جائے، تو رسم عثمانی کی اتباع کے وجوب کے قائل ہیں، تو گنجائش نکل سکتی ہے۔

ب-اور اگر بریل کوڈ کوئی مستقل رسم الخط نہیں، بلکہ کوڈ ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، تو بظاہر جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ سوالنامہ سے منسلک تحریر (جو ترکی میں منعقد ایک کانفرنس میں "قرآن بریل کوڈ" کے نام سے پیش کی گئی تھی) کے مطالعے سے میں اپنی ناقص فہم سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بریل کوڈ اور رسم الخط میں کئی اعتبار سے فرق ہے:

۱- رسم الخط مرئی یعنی قابل مشاہدہ ہوتا ہے اور یہ بینا افراد کے لئے ہوتا ہے، اس کے برخلاف بریل ایک کوڈ ہے، جو نابینا افراد کے لئے چھو کر پڑھنے کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔

۲- ایک بینا شخص کے لئے نگاہوں سے پڑھے جانے والے رسم الخط کو اندھیرے میں پڑھنا ممکن نہیں، البتہ ایک نابینا شخص بریل اندھیرے میں بھی پڑھ سکتا ہے۔

۳- ہم بینا حضرات ایک میز پر رکھی ہوئی مختلف رسم الکط میں لکھی ہوئی کتابوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر ان کے فرق کو جان سکتے ہیں اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی ہے اور یہ قرآن مقدس عربی زبان میں ہے اور وہ فلاں کتاب گجراتی زبان میں ہے، اس کے برخلاف بریل کوڈ پر مشتمل تمام کتابیں ایک جیسی نظر آتی ہیں، مثلاً انگریزی ادب کی کتاب، حساب کی بریل کی کتاب، اور قرآن کے عربی بریل کا ایک نسخہ، ایک میز پر رکھا جائے، تو ساری کتابوں میں بریل ایک جیسی ہی ہوگی۔

۴- طبع شدہ حروف کی بنیاد رسم الخط پر ہوتی ہے، اس کے برخلاف بریل حروف ہجاء کی بنیاد تلفظ اور آواز پر ہوتی ہے، اس لئے کہ بریل ایک کوڈ ہے اور یہ کوڈ ہر زبان کے حروف تہجی کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے کسی بھی زبان کے الفاظ، جن کا تلفظ یکساں ہے، وہ یکساں بریل علامتوں سے پہچانے جاتے ہیں، مثال کے طور پر عربی لفظ "ل" انگریزی لفظ "L" اور گجراتی لفظ "" کی بریل علامت یکساں ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان سب کا تلفظ یکساں ہے، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بنیادی طور پر بریل علامت تلفظ کی نمائندگی کرتی ہے، نہ کہ رسم الکط کے الفاظ کی اور بریل میں حروف کے تلفظ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، حروف کے رسم الخط کو نہیں کسی بھی رسم الخط میں شوشے یا گھماؤ پھراؤ ہوتے ہیں برخلاف بریل کوڈ کے، اس میں کسی رسم الخط کی طرف اس میں شوشے نہیں ہوتے۔

مذکورہ بالا نکات سے معلوم ہوتا ہے کہ بریل ایک کوڈ ہے، رسم الخط نہیں ہے، لہذا اب ظاہر بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنا نابیناؤں کی ضرورت کی بناء پر بظاہر جائز ہونا چاہئے۔

(ثانی) دوسرا جزیہ تھا کہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے یا وضو کے بغیر اسے چھوا جا سکتا ہے؟

بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی، لیکن اگر بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کیا جائے، تو اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، اس

لئے کہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر غیر عربی میں قرآن کو لکھا جائے تو اس کا بے وضو چھونا اور اٹھانا حرام ہوگا، کیونکہ غیر عربی میں لکھنے کی وجہ سے وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہوگا ورنہ پھر اس کا لکھنا بھی حرام نہ ہوتا۔

''ثم كتب عليه شيخ الأئمة الشافعية لعصرنا ومصرنا هو العلامة شمس الدين محمد الشوبرى الشافعي حفظ الله تعالى ورعاه ما صورته ''انه اذا كتب بغير العربي هل يحرم مسه وحمله اولا؟الأظهر في الجواب نعم، إذلايخرج بذلك عن كونه قرآنا وإلالم تحرم كتابته'' (جواہر الفقہ ۲/ ۱۱۰)۔

''وفي الدر المختار: ويمنع دخول المسجد (إلى قوله) ومسه لومكتوبا بالفارسية في الأصح'' (شامی زکریا ۱/ ۴۸۸)۔

''وفي العالمگيرية: ومنها حرمة مس المصحف لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه (الى قوله) ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما في الصحيح. هكذا في الخلاصة'' (فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۹)۔

(ثالث) اگر بریل کوڈ مین قرآن تیار کرنا درست ہے تو کیا اس کے کچھ مخصوص آداب واحکام ہیں؟

بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرتے وقت چند باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے:

قرآن مجید کی کتابت کے لئے اصل معیاری رسم تو عثمانی خط ہی ہے، لیکن جب ہم نابینا افراد کے لئے اس رسم الخط کو استعمال نہیں کر پاتے، تو فی الحال موجودہ بریل نظام کے علاوہ بظاہر ہمارے پاس کوئی ایسا متبادل نہیں، جس کے ذریعہ نابینا شخص قرآن کو لکھ پڑھ سکے، تو بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنا بظاہر درست ہونا چاہئے، خاصۃً اس لئے بھی کہ بعض علماء نے رسم عثمانی کی اتباع کو واجب قرار نہیں دیا ہے، جن میں متقدمین اور معاصرین علماء بھی شامل ہیں، لیکن اس کی حیثیت وہی ہونی چاہئے، جو پانی کے فقدان کے وقت حصول طہارت کے لئے مٹی کی ہوتی ہے۔

۴-موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کو چھونا:

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن کی آیت نمایاں ہو، تو ایسی حالت میں بغیر وضو کے اس اسکرین پر ہاتھ رکھنا یا اس موبائل کو پکڑنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر اسکرین پر نمایاں نہ ہو، بلکہ وہ پروگرام بند ہو تو ایسے موبائل کو بلا وضو چھونا ممنوع نہیں (موبائل کے مسائل، مفتی اسماعیل برہانپوری، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

''قال: في الدر المختار: ''يمنع دخول المسجد (إلى قوله) ومسه ولو مكتوبا بالفارسية في الاصح بغلاف المنفصل''۔

''قال ابن عابدين: قوله مسه أى القرآن ولو في لوح أودرهم أو حائط. لكن لايمنع إلا من مس المكتوب بخلاف المصحف فلايجوز مس الجلد وموضع البياض منه...قوله:إلا بغلاف منفصل اى كالجواب والخريطة دون المتصل كالجلد المشرز هو الصحيح، وعليه الفتوى. لكن الجلد تبع له'' (شامی زکریا کتاب الطہارۃ، باب الحیض ۱/ ۴۸۸)۔

''وفي العالمگيريه: ومنها حرمة مس المصحف لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به هو الصحيح هكذا في الهداية، وعليه الفتوى. كذا في الجوهرة النيرة: ولا يجوز مس شئ مكتوب فيه شئ من القرآن من لوگ أو دراهم أو غير ذلك إذا كان آية تامة. هكذا في الجوهرة النيرة'' (فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۸،۳۹)۔

☆☆☆

بغیر متن کے ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت

مولانا محمد اعظم ندوی [1]

۱- الف- قرآن کے اصل عربی متن کے بغیر صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ہر زمانہ میں علماء کرام منع کرتے آئے ہیں، اور عام طور پر اس کے ناجائز ہونے کے درج ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

☆ یہ اصل قرآن کے قائم مقام نہیں ہوسکتا، چونکہ قرآن کی زبان عربی ہے، اور صرف ترجمہ کے رواج سے ہی لوگ اسی ترجمہ کو پڑھنا چاہیں گے چونکہ وہ اپنی زبان میں اسے سمجھ سکیں گے، اور اس طرح اصل قرآن مجید سے تعلق کمزور ہوتا جائے گا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسی کو قرآن سمجھ بیٹھیں۔

☆ گذشتہ آسمانی کتابوں میں اسی ترجمہ بغیر متن کے رواج سے تحریف کا راستہ کھلا، اور آج ان کے اصل نسخے دنیا سے ناپید ہوگئے، یہی وجہ ہے کہ اصل بائبل آج دنیا سے غائب ہوچکی ہے کہ اس کا صرف ترجمہ ہی شائع ہوتا رہا، آج پوری دنیا میں ایک بھی نسخہ بائبل کا اصل زبان میں موجود نہیں، وجہ یہ کہ اصل متن کو چھوڑ کر صرف ترجمہ کو ہی کافی سمجھا گیا اور آج یہ حال کہ اصل متن ہی صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے، انجیل کی زبان سریانی، اور تورات کی عبرانی ہے (الیواقیت والجواہر للشعرانی/ص ۹۴، مکتبہ عباس بن عبدالسلام، مصر) اس کا کوئی نسخہ آج ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا اور اگر کہیں ہوگا بھی تو وہ بھی اصل کی بجائے ترجمہ در ترجمہ ہی کا چربہ ہوگا، قرآن کے ساتھ تو اللہ کے فضل سے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کی حفاظت کا خاص وعدہ ہے، لیکن ہم کیوں وہ غلطی دہرائیں جو ہم سے پہلے ایک قوم کر کے اپنی اصل کتاب سے ہی ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ ضرور کیا ہے اور اس نے ہمارے لئے قرآن مجید کو صدور و سطور میں محفوظ بھی فرمادیا ہے، لیکن حضور ﷺ کا شروع میں احادیث کی کتابت سے روکنا، عہد صدیقی اور عثمانی میں جمع قرآن کی دو الگ نوعیتوں کی کوششیں، رسم عثمانی کی پابندی کرنے کی علماء کی تقریباً متفقہ رائے، یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ امت پر بھی اپنی حد تک قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری ہے، اور حفاظت قرآن کے وعدہ میں ہماری کوششیں بھی شامل ہیں، صرف ترجمہ کی اشاعت سے عربی متن والے قرآن شریف کی اشاعت آہستہ آہستہ کم ہونے کا بھی خطرہ ہے۔

☆ ایسا نہیں ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں اس کی ضرورت پیش نہ آئی تھی، مختلف علاقوں کے غیر عربی داں افراد و اقوام اسلام میں داخل ہورہے تھے، لیکن اس کا حل تعلیم قرآن، تفہیم قرآن اور عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے راستوں سے نکالا گیا، دینی تعلیم کو عام کیا گیا اور اس طرح لوگوں میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قرآن فہمی پیدا ہوئی، پھر جب عجمی ممالک میں عربی دانی کے فقدان کی وجہ سے قرآن سے راست استفادہ نسبۃً کم لوگوں کے لئے ممکن رہ گیا تو متن قرآن کے ساتھ ساتھ بعض شرطوں کے ساتھ اس کے ترجمہ کی اجازت دی گئی، اور اس سے تعلیم قرآن کی اشاعت و تبلیغ کی ضرورت پوری ہورہی ہے اس لئے صرف ترجمہ کی اشاعت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

☆ ایسا کرنا صحابہ، تابعین کی روش اور اجماع امت کے خلاف ہوگا۔

☆ اس راستہ سے قرآن کی مدافعت کے بجائے قرآنی تعلیمات کو مسخ کرنے کی دشمنان اسلام کی مہم میں اس طرح گویا ہم ان کا تعاون کرنے والے ہوں گے، چونکہ بعض آیات کے ترجمہ میں مترجم کی غلطی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردی جائے گی، الفاظ سامنے ہوں گے تو بھی نادانستہ طور پر غلطی کا امکان موجود ہے، لیکن جب متن کے ساتھ ترجمہ پیش کرنا لازم نہ ہوگا تو اپنی پسند کا تشریحی ترجمہ کرنا ممکن ہوگا جس کے ذریعہ کسی

---

[1] استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

خاص نقطہ نظر کی تائید مقصود ہوگی، اور اگر اس سلسلہ میں کسی عالم سے مراجعت بھی کی جائے گی تو ضروری نہیں کہ وہ حافظ بھی ہو، یا ہو بھی تو بروقت ترجمہ میں کسی تکنیکی خامی کی طرف اس کا ذہن منتقل ہو سکے، اور اگر متن سامنے ہوگا تو خود مطالعہ کرنے والا اگر عربی نہ بھی جانتا ہوگا اور کسی عالم سے مراجعت کرے گا تو وہ الفاظ پر بروقت نظر کر کے اس کے صحیح معنی تک پہنچ سکتا ہے، یا اس سلسلہ میں اسے رہنمائی مل سکتی ہے۔

☆ یہ تو درست ہے کہ وہ طبقہ جو قرآن سے اس لئے دور ہے کہ قرآن کو ہاتھ لگانے کے لئے شرعی تیاری کرنا اسے بوجھ معلوم ہوتا ہے، اب وہ اسے ایک عام کتاب کی حیثیت سے کسی بھی وقت اٹھا کر مطالعہ کر سکتا ہے، لیکن اس سے پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ اسی کو کافی سمجھے گا، اور اس کی اولاد جب اپنے والدین کو صرف ترجمہ پڑھتے دیکھے گی تو لازماً والدین سے زیادہ اثر لے گی اور عربی تلاوت سے دور ہوتی جائے گی، بعید نہیں کہ ایسے شخص کی تیسری چوتھی نسل تک عربی تلاوت اس خاندان سے بالکل ہی مفقود ہو جائے۔

مفتی شفیع صاحبؒ نے ''تحذیر الأنام عن تغییر رسم الخط من مصحف الامام'' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر تفصیل سے اس کی ممانعت پر دلائل جمع کئے ہیں، جو ''جواہر الفقہ'' میں شامل ہے، مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ سے سوال کیا گیا: ''قرآن شریف کو بغیر عربی کے صرف اردو ترجمہ کے ساتھ چھاپنا کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بغیر عربی کے محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف کو لکھنا چھاپنا منع ہے، اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل ہے، اس سے خریدنے اور بیچنے کی بھی ممانعت معلوم ہوگئی'' (فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۱۰)۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت:

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت و اشاعت جائز نہیں، چونکہ چاروں فقہی مسالک کے علماء کا اتفاق ہے کہ رسم عثمانی کے مطابق قرآن مجید کی کتابت ضروری ہے، خواہ وہ عربی زبان ہی میں ہو، تو کسی دوسری زبان میں بدرجہ اولی جائز نہ ہوگی، اس طرح لکھنے پر ایک ناواقف شخص ''محمد'' کو ''مھمد'' اور ''خاتم النبیین'' کو ''خاتم ألنبیین'' پڑھ دے گا، اور نہ جانے اس قسم کی کیسی کیسی فاش غلطیاں کر بیٹھے گا، اس طرح کی غلطیاں تو تجوید سے ناواقفیت کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں، لیکن عربی رسم الخط میں پڑھتے ہوئے ایسے مقامات پر غلطی کا جو احساس رہتا ہے وہ بھی جاتا رہے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ بنیادی تجوید سیکھنے کی زحمت بھی نہ کی جائے گی، یہ اس لئے بھی منع ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں ہر ایسا تصرف حرام ہے جس سے اس کے حروف میں تحریف اور معنی میں تبدیلی کے راستے کھلتے ہیں اور اس طرز عمل میں اس کا قوی امکان ہے۔

اس لئے امام سیوطی نے امام مالکؒ سے سوال و جواب اس طرح نقل کیا ہے

''هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجا؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة'' (الاتقان: النوع السادس والسبعون: في مرسوم الخط وآداب كتابته ۴/ ۱۶۸)

(کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا: نہیں! بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے، اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی بھی اس سلسلہ میں امام مالک کا مخالف نہیں)، امام زرکشی نے بھی اس کی ممانعت کو ہی راجح قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

''هل تجوز كتابته بقلم غير عربي؟ هذا مما لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء، ويحتمل الجواز، لأنه قد يحسنه من يقرؤه بالعربية، والأقرب المنع'' (الاتقان: النوع السادس والسبعون: في مرسوم الخط وآداب كتابته ۴/ ۱۸۳)

امام احمد فرماتے ہیں: ''يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك'' (الاتقان ۴/ ۱۶۹)

(مصحف امام (نسخہ عثمان غنیؓ) کی مخالفت واو، یاء، الف وغیرہ میں بھی حرام ہے)۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: ''إن اعتاد القراءة بالفارسية، أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (فتح القدیر ۱/ ۲۶۸، ردالمحتار ۱/ ۸۶)

(اگر فارسی میں قراءت کی عادت بنالے، یا اس میں مصحف کو لکھنا چاہے تو اس سے منع کیا جائے گا، ہاں! اگر یہ کام ایک یا دو آیتوں میں کرے تو جائز ہے، ہاں اگر قرآن لکھے اور ہر لفظ کا ترجمہ و تفسیر بھی لکھے تو جائز ہے)۔

شیخ محمد عبدالعظیم زرقانیؒ رقم طراز ہیں:

''ونسترعي نظرك إلى أمور أولها أن علماء نا حظروا كتابة القرآن بحروف غير عربية وعلى هذا يجب عند ترجمة القرآن بهذا المعنى إلى أية لغة أن تكتب الآيات القرآنية إذ كتبت بالحروف العربية كيلا يقع إخلال وتحريف في لفظه فيتبعهما تغير وفساد في معناه'' (مناہل العرفان ۲/ ۱۳۴)

(ہم آپ کی توجہ چند اہم مسئلوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں، ان میں پہلی یہ ہے کہ علماء نے غیر عربی الفاظ میں قرآن مجید کی کتابت سے منع فرمایا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ جب بھی قرآنی آیات لکھی جائیں عربی الفاظ میں ہی لکھی جائیں، تاکہ اس کے لفظ میں کوئی خلل اور تحریف واقع نہ ہو، جو اس کے معنی میں تغیر وفساد تک پہنچادے)۔

انہوں نے اس کی ممانعت پر جامع ازہر کا فتویٰ بھی نقل کیا ہے، مکہ فقہ اکیڈمی کا بھی یہی فیصلہ ہے (دیکھئے: مکہ فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص ۱۷۷)۔

اس میں دو بنیادی خرابیاں ہیں: ایک عربی زبان کو مٹانے کی بالواسطہ کوشش، دوسرے رسم عثمانی کو ختم کرنے کی سازش، لاطینی یا کسی اور زبان میں قرآن ہو تو اس میں تحریف کو پکڑ پانا بھی مشکل ہے چونکہ ان زبانوں کے جاننے والوں میں قرآن مجید سے واقف کاروں کی تعداد نسبۃً کم ہے۔

اسی احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابن سیرینؒ نے قرآن کو مشتق یعنی تیز لکھنے سے بھی منع فرمایا ہے، ان سے پوچھا گیا: ایسا کیوں؟ انہوں نے کہا: چونکہ اس میں کمی کا امکان ہے (کتابت المصاحف: ابوبکر ابن ابی داؤد سجستانی/ص ۳۰۴)۔

علامہ رشید رضا مصریؒ نے اپنے مجلہ ''المنار'' میں اس مسئلہ پر بہت سخت موقف اپناتے ہوئے لکھا تھا جس میں اس ممانعت کی وجوہات بھی آگئی ہیں:

''فإذا كانت الحروف الأعجمية التي يراد كتابة القرآن بها لاتغني غناء الحروف الغربية لنقصها كحروف اللغة الإنكليزية فلا شك أنه يمتنع كتابة القرآن بها لما فيها من تحريف كلمه ومن رضي بتغيير كلام القرآن اختيارا فهو كافر... ولو أجاز المسلمون هذا للرومان والفرس والقبط والبربر والإفرنج وغيرهم من الشعوب التي دخلت في الإسلام لعلة العجز لكان لنا اليوم أنواع من القرآن كثيرة ولكان كل شعب من المسلمين لايفهم قرآن الشعب الآخر'' (مجلة المنار: يكم ربيع الثانی ۱۳۲۱ھ)

(اور جب وہ عجمی الفاظ جن میں قرآن لکھنا مقصود ہو، مثلاً انگریزی اپنے تعداد حروف وغیرہ میں کمی کی وجہ سے عربی الفاظ کی جگہ نہیں لے سکتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں قرآن کی کتابت جائز نہیں ہوگی، چونکہ اس میں اس کی آیات میں تحریف کی سنگین غلطی پائی جارہی ہے، اور جو کلام اللہ کو حالت اختیار میں بدلنے کے لئے تیار ہو جائے وہ کافر ہے، اگر مسلمانوں نے اسلام میں داخل ہونے والے رومیوں، اہل فارس، قبط وبربر، اور انگریزوں وغیرہ کو اس بنیاد پر اس کی اجازت دی ہوتی کہ نومسلموں کے لئے اصل قرآن پڑھنا دشوار ہے تو آج ہمارے سامنے قرآن کی بہت ساری قسمیں ہوتیں، اور مسلمانوں کا ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا قرآن نہ سمجھ پاتا)۔

اپنی تفسیر ''المنار'' میں بھی انہوں نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے (دیکھئے: تفسیر المنار، سورۂ اعراف ۱۵۸، کا حاشیہ ۲/ ۲۶۷)۔

ہندوستانی علماء نے بھی ہمیشہ سے اس مسئلہ میں ممانعت کا فیصلہ کن موقف اپنایا ہے، مفتی عبدالرحیم لاجپوری لکھتے ہیں: قرآن شریف گجراتی حروف میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے۔ مثلاً: بسم اللہ کو گجراتی حروف میں لکھا جائے تو لفظ اللہ اور لفظ رحمٰن اور لفظ رحیم کی ابتداء کے دو حروف (الف لام) تحریر میں نہیں آئیں گے "بسم لہ رحمٰن رحیم" لکھا جائیگا اس طرح لکھنے میں صرف بسم اللہ شریف میں چھ حروف کی کمی آجاتی ہے۔

تو غور فرمایئے! پورا قرآن شریف گجراتی میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہو جائیں گے، حالانکہ معانی کی طرح حروف بھی قرآن ہونے میں شامل ہیں۔ دوسری جانب صورت یہ ہے کہ بعض آیتوں میں حروف زائد ہو جائیں گے مثلاً: الٓمٓ میں قرآنی رسم الخط کے بموجب صرف تین حروف

ہیں، لیکن گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہو جائیں گے۔ اب حساب لگایئے پورے قرآن شریف میں کتنی کی بیشی ہو جائیگی'' (فتاوی رحیمیہ مرتبہ: مفتی صالح محمد دار الاشاعت، پاکستان ۳/۱۷)۔

مولانا محمود الحسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں: ''الفاظ قرآن کو عربی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے، ہندی یا کسی اور رسم الخط میں لکھنے کی اجازت نہیں، اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے، ہندی رسم الخط میں لکھنے سے عبارت مسخ ہو جائے گی، ح، ذ، ز، ض، ظ، میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہوگی، اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلاء، اطباق، استطالت سب کچھ ضائع کردیں گے'' (فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۱۱)۔

ابو سہل صالح علی العود نے ''تحریم کتابۃ القرآن بحروف غیر عربیۃ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ''وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعو والإرشاد'' سعودی عرب سے شائع ہوئی ہے، جس میں انہوں نے عربی کے سوا کسی اور رسم الخط میں قرآن کو لکھنے کی ممانعت پر قرآن و حدیث سے دلائل جمع کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے پچاس سے زائد علماء کے فتاوی بھی جمع کئے ہیں، سب اس کی حرمت پر متفق ہیں۔

یہ مصلحت کے بھی خلاف ہے، تقی الدین فاسی اپنی کتاب ''شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام'' (۱/۲۳۶) میں فرماتے ہیں: ''روایت کی جاتی ہے کہ خلیفہ ہارون رشید یا ان کے دادا منصور نے چاہا تھا کہ کعبہ کی ان تبدیلیوں کو بدل دیں جو حجاج نے کی تھیں، اور ابن زبیر کی وضع پہ واپس لے آئیں، لیکن امام مالکؒ نے اس سے منع فرماتے ہوئے کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اللہ کے گھر کو بادشاہوں کا کھلونہ مت بناؤ، کہ ان میں سے جس کا جی چاہے اس میں تبدیلی کردے حتی کہ لوگوں کے دلوں سے اس کا رعب ووقار جاتا رہے''۔

پھر فاسی لکھتے ہیں: ''وكأنه في ذلك لحظ أن درأ المفاسد أولى من جلب المصالح وهي قاعدة مشهورة معتمدة''

(گویا کہ انہوں نے یہ اشارہ دیا کہ مفاسد کو دور کرنا مصالح کو حاصل کرنے سے زیادہ ضروری ہے، اور یہ ایک مشہور اور معتبر قاعدہ ہے)، اس مسئلہ میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم کو کسی اور رسم الخط میں شائع کرنا مصلحت کے بھی خلاف ہے۔

رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان میں کتابت:

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں جو خرابیاں ہیں وہ اس صورت میں بھی پائی جارہی ہیں اس لئے یہ صورت بھی درست نہ ہوگی، یہ تو گویا قرآن کے عربی متن کو صرف تبرک کے لئے رکھنا ہوا، اگر پڑھنا کسی اور میڈیم سے ہے تو دونوں صورتوں میں فرق نہیں، اور اگر پڑھنا اصل عربی متن قرآن سے ہے تو کسی اور رسم الخط کی ضرورت نہیں۔

جس کو پڑھنا نہ آتا ہو اس کے لئے کسی معلم سے بہ تدریج سیکھنا اس کا شرعی، روایتی اور کامیاب حل ہے، یکبارگی پورے قرآن کا سیکھنا ضروری نہیں، اور دوسری زبان کے واسطہ سے درست تلاوت ممکن نہیں اس لئے یہ بھی جائز نہ ہوگا۔

غیر عربی رسم الخط والے قرآن کو چھونا:

جہاں تک اس طرح چھپے ہوئے قرآن کو چھونے کے لئے وضو کا مسئلہ ہے تو فقہی کتابوں میں صراحت سے یہ مسئلہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ اصل قرآن کے حکم میں ہے، اس لئے بلا وضو اس کو چھونا جائز نہیں، الموسوعۃ الفقہیہ کے مرتبین نقل کرتے ہیں:

''المصحف إن كتب على لفظه العربي بحروف غير عربية فهو مصحف، وله أحكام المصحف، وبهذا صرح الحنفية ففي الفتاوى الهندية وتنوير الأبصار: يكره عند أبي حنيفة لغير المتطهر مس المصحف ولو مكتوبا بالفارسية. وكذا عند الصاحبين على الصحيح، وعند الشافعية مثل ذلك'' (موسوعہ فقہیہ ۳۸/۱۰)

(قرآن مجید کو اگر اس کے عربی الفاظ کے مطابق کسی اور زبان میں لکھا جائے تو بھی وہ مصحف ہے، اور اس کے احکام مصحف جیسے ہیں، احناف نے اس کی وضاحت کی ہے، چنانچہ فتاوی ہندیہ اور تنویر الابصار میں ہے: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ناپاک کے لئے مصحف چھونا جائز نہیں، خواہ وہ فارسی زبان میں لکھا ہوا ہو، ایسے ہی صاحبین کے نزدیک بھی، شوافع کا بھی یہی مسلک ہے)۔

خلاصہ یہ کہ رسم الخط چونکہ انسان کا عمل ہے، اس لئے اس میں عربی اور غیر عربی زبان میں کوئی فرق نہیں، اس لئے اسے چھونے اور ہاتھ میں لینے کے سلسلہ میں ایک ہی حکم ہوگا، جبکہ الفاظ یعنی نظم قرآن اللہ تعالی کی طرف سے ہے، اور اس کا کلام ہے اس لئے اس کو قراءت اور تعبد میں اصل قرآن کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔

۳-بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل Braille تحریر ایک Tactile یعنی قوت لامسہ کے ذریعہ استعمال ہونے والا مخصوص نظام ہے جس سے قوت بینائی سے کلی طور پر محروم یا بہت ہی کمزور بینائی والے افراد استفادہ کرتے ہیں، پڑھ بھی سکتے ہیں، لکھ بھی سکتے ہیں، یہ اپنے نابینا موجد فرانسیسی نژاد موسوقی کارلوئس بریل کے نام سے مشہور ہوا، جس کو اس نے ابتدائی شکل میں ۱۸۲۹ میں متعارف کرایا، دراصل جب وہ نابینا ہونے کے بعد اسکول میں پڑھتا تھا اس وقت فارلس باربیر نے اس کے اسکول کا دورہ کیا تھا، جنہوں نے اپنے اس نظام کا تعارف کرایا جس کو وہ Night Writing (شبانہ کتابت) کا نام دیتے تھے اور جس کو ۱۲ ابھرے ہوئے نقطوں Raised dotes کی شکل میں انہوں نے فوجیوں کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ میدان جنگ میں الفاظ کا سہارا لئے بغیر اپنے رازہائے سربستہ ایک دوسرے کو ان نقطوں کی مدد سے منتقل کرسکیں، جس کو بریل نے ۶ میں سمیٹ دیا اور پھر اسے ۱۸۶۹ میں شائع کیا، یہ کوڈ چھ نقطوں پر مبنی ہوتا ہے، جو مختلف حروف، الفاظ، حروف علت، حرکات اور علامتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، ان چھ کی مدد سے ۶۳ یا ۶۴ مختلف شکلیں بنائی جاسکتی ہیں، یہ گویا خواندگی کی سواری Vehicle for Literacy ہے، اس میں عہد بہ عہد کافی تبدیلیاں ہوئیں، عربی زبان میں اس طریقہ کو محمد انسی نے انیسویں صدی کے وسط میں متعارف کریا، عربی حروف تہجی کے ۲۸ حروف پر مزید ۸ حروف اس نظام میں زائد ہیں، یعنی کل ۳۶، اس طریقہ پر قرآن مجید بھی مختلف مسلم ممالک سے شائع ہوتے رہے ہیں، سعودی عرب میں ۱۹۹۲ سے بریل خط میں قرآن مجید کی اشاعت کے لئے مستقل ادارہ قائم ہے، جس سے نہ صرف قرآن مجید، بلکہ ان کے لئے دینی کتابیں، اور مجلات بھی اسی خط میں شائع کئے جاتے ہیں، ترکی میں اس کے لئے مستقل ادارہ International Union of Braille Quran Services (IBQS) قائم ہے، جس کی ویب سائٹ ہے: www.braillequran.org اور قرآن کی اس طرز تعلیم پر مستقل تحقیق جاری ہے، مثلاً عبداللہ ایک ابوالکشک وخیر الدین قمر (کبنگسان یونیورسٹی ملیشیا) کا مقالہ Quran vibrations in Braille Codes using the Finite State Machine Technique جو اس سلسلہ میں نہایت چشم کشا ہے۔

الف-اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کی کتابت میں رسم عثمانی کی مخالفت درست نہیں، لیکن اس طرز پر قرآن مجید کی اشاعت سے ایک مخصوص طبقہ کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طرز تحریر کو اپنی ظاہری رسم اور شکل کے اعتبار سے پورے طور پر رسم عثمانی کے مطابق بنانا اب تک ممکن نہیں ہوسکا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے یہ ممکن نہیں کہ اسے املا کے عام طریقہ سے لکھا جائے لیکن مضمون کے اعتبار سے مکمل قرآن اس طریقہ پر لکھا جاسکتا ہے، یعنی اگرچہ رسم الخط کی پوری پابندی ممکن نہیں، لیکن قرآن کے سارے حروف اس نظام میں بھی لکھے جاتے ہیں، اس اعتبار سے اس کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا، مثلاً لفظ "غلیبت" کے ایک ایک حرف کا رمز اس نظام میں لکھا جائے گا، اور یہ اور بات ہے کہ مکمل لفظ لکھنا ممکن نہیں، جب کہ عام عربی املانویسی کے قاعدہ کے تحت اسے "غیابۃ" لکھا جائے گا، لیکن اس نظام میں گول تا کے بجائے لمبی تا کا رمز استعمال کیا جائے گا، اس طرح اس کو رسم عثمانی سے ایک گونہ مناسبت ہوجائے گی، کچھ علامات وحرکات وہ ہیں جن کا لکھنا اس طریقہ پر ممکن نہیں، جیسے "اسحٰق" کا کھڑا زبر، اور "داؤد" کا الٹا پیش وغیرہ، غالبا اس کے لئے واؤ کا ایک مزید رمز استعمال کرتے ہوں گے تاکہ "داؤد" کا قرآنی نطق "داوود، دوداؤ" سے ادا ہوسکے، گویا یہ ایسے رموز کا مجموعہ ہے جو قرآن کی آواز کو منتقل کرتا ہے، اور اس طرح عثمانی رسم الخط کی روح باقی رہتی ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں رسم عثمانی کی پابندی ضروری ہے ان کے نزدیک اس طریقہ پر قرآن مجید کی اشاعت ممنوع ہوگی، اور نابینا حضرات کے لئے تعلیم قرآن کا حل ان کے پاس یہی ہے کہ وہ کسی سے سن کر یاد کریں، جیسا کہ اب تک اس معذور طبقہ میں رائج رہا، لیکن صحیح بات ہے کہ اس مخصوص طبقہ کے لئے اس طریقہ پر زیادہ سے زیادہ قرآن کی اشاعت کی ضرورت ہے، چونکہ:

☆ ہر نابینا شخص کے لئے حفظ آسان نہیں ہوتا، اللہ تعالی نے صلاحیتیں مختلف رکھی ہیں۔

☆ ہر نابینا شخص کو جب وہ چاہے بینا ملقن (آیات بتانے والا) آسانی سے مل جائے ضروری نہیں۔

☆ بریل کوڈ میں چھپے ہوئے مصاحف اس طبقہ کو بڑی حد تک قرآن کی تلاوت اور اس کے حفظ میں کسی مستقل آدمی کے سہارے سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

☆ اس کی طباعت کی اجازت نہ دینا بصارت سے محروم ان ہزاروں افراد کے لئے محرومی کا باعث ہوگا جو تلاوت قرآن کی سعادت جب وہ چاہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر علماء اس پر پابندی لگا دیں، اور مسلم حکومتیں علماء کی راست نگرانی میں شائع نہ کریں تو جو احتیاط اس کی اشاعت میں ملحوظ رکھی جاتی ہے اس کا خیال نہیں رہ جائے گا، جس کے نتیجہ میں تحریف کا دروازہ کھلے گا۔

اور رموز کے سلسلہ میں سب سے بہتر بات یہ ہوگی کہ بریل قرآن کو منطوق کے مطابق رکھا جائے، یعنی قرآن کا جو لفظ جس طرح ادا کیا جاتا ہے ویسے ہی لکھا جائے، جیسے ''الرحمن'' کہ رسم عثمانی اور رسم املائی دونوں میں اسی طرح لکھا جاتا ہے، لیکن بریل میں ''م'' کو ایک نابینا کھینچ کر اسی وقت پڑھ سکتا ہے، جبکہ اس کو ''م'' کے بعد کوئی ایسا رمز ملے جو بتا سکے کہ یہاں کھینچنا ہے، چنانچہ وہاں الف بڑھانے کی ضرورت ہوگی، یہ ایسے ہی ہے، جیسے کسی بچہ کو سکھاتے ہوئے کسی لفظ کا صحیح نطق ادا کرنے کے لئے ضرورۃً قواعد سے ہٹ کر کچھ دوسرے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں، یہاں بھی ایک بڑی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ نابینا افراد کو التباس سے بچایا جاسکے۔

اس لئے بریل کوڈ میں قرآن مجید کی اشاعت جائز ہوگی، ہاں یہ ضروری ہے کہ رسم عثمانی کے مطابق لکھنے میں جہاں التباس نہ ہوتا ہو وہاں اسی رسم الخط میں لکھا جائے، بعض الفاظ واشارات جو عثمانی رسم الخط میں نہیں لکھے جاسکتے وہ معفو عنہ ہیں، یعنی ان پر انشاء اللہ مواخذہ نہیں ہوگا چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی کا مکلف بنایا ہے جو انسان کے بس میں ہے (بقرہ:۲۸۶)، اس کو قرآن مجید کی اس طریقہ پر اشاعت میں رکاوٹ نہیں بنانا چاہئے، چونکہ اس کی طباعت میں بے آنکھ والوں کے لئے بڑے فوائد ہیں جو آنکھ والوں سے پوشیدہ نہیں۔

ب- جہاں تک اس مصحف کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو کا مسئلہ ہے تو ظاہر ہے جب اس میں قرآنی حروف والفاظ نہیں بلکہ رموز پر مبنی نظام ہے تو اس کو چھونے کے لئے وضو کیوں کر ضروری ہوگا، البتہ قرآن سے اس کی راست نسبت کا خیال رکھتے ہوئے وضو کر لینا مستحب ہوگا، البتہ اس کو پڑھنے کے لئے جنابت وحیض ونفاس سے پاک ہونا ضروری ہوگا، چونکہ زبان تو قرآن ہی ادا ہوگا جس کے لئے حدث اکبر سے پاک ہونا ضروری ہے، اسی طرح مصاحف کے لئے جن آداب کو ملحوظ رکھنے کا حکم ہے ان کی رعایت اس صورت میں بھی ضروری ہوگی۔

سعودی عرب کی فتویٰ کمیٹی ''اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء'' کی طرف سے شیخ صالح فوزان نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''لا يظهر أن المصاحف المكتوبة بطريقة برايل لها حكم المصاحف المكتوبة بالحروف العربية'' (فتاوی اللجنة الدائمة المجموعة الثانية ۳/ ۴۱، جمع و ترتيب: احمد بن عبدالرزاق الدويش، رئاسة ادارة البحوث العلمية والافتاء ادارہ العامة للطبع رياض، فتاوی يسألونك ۱۱/ ۳۴، شائع شدہ: مكتبه دنديس، مغربی پٹی، فلسطين) کے مصنف ڈاکٹر حسام الدین بن موسیٰ عفانہ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے (فتاوی یسألونك ۱۱/ ۳۴)۔

ضرورت ہے کہ قرآن کے لئے ایک ایسا بریل نظام وجود میں آسکے جس کو پڑھتے ہوئے قرآن کی مخصوص تجوید کو ملحوظ رکھا جاسکے جیسے نون ساکن، اقلاب، ادغام، اظہار، اخفاء وغیرہ، ادراک کے لئے مخصوص رموز Symbols بریل میں تیار کئے جائیں۔

۴- موبائل پر قرآن مجید:

موبائل، ٹیبلٹ ڈوائس اور دیگر اسکرین ٹچ الیکٹرانک آلات پر قرآن کے اپلیکیشنز کے مثبت پہلو یہ ہیں کہ اس کو مطبوعہ قرآن کی طرح الگ سے کوئی جگہ نہیں چاہئے، اس میں نقل وحمل کا کوئی مسئلہ نہیں، چلتے پھرتے قرآن سے استفادہ شاید اتنا آسان کبھی نہ ہوا ہو، بعض اپلیکیشنز میں آپ کی

انگلیوں کے بھر پور لمس کے نیچے ترجمہ بھی موجود ہوتا ہے جو کم وقت میں منتخبہ آیت کے ترجمہ وتفسیر سے بھی واقف کراتا ہے، کسی کو کسی آیت کا حوالہ دینا ہو، کاپی اور پیسٹ کے نظام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم فوراً اسے شیئر کر سکتے ہیں، لیکن آسانی اپنے ساتھ تن آسانی بھی کھینچ لائے تو اس سے نقصان ہوتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں اس کے باوجود موبائل سے ہی تلاوت کی جارہی ہے، بیچ بیچ میں مختلف برقی پیغامات کے جوابات بھی جاری ہیں، ڈاؤن لوڈ بھی چل رہا ہے، اپ لوڈ بھی، اور بار بار اسکرین سے قرآن کا صفحہ ہٹانے کی ضرورت پڑ رہی ہے، اور اسی بیچ کسی کی کال آجائے تو خود بہ خود قرآن بند، اس سے تلاوت کی روح نکل جاتی ہے، اس لئے قرآن کے آداب کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر مطبوعہ قرآن موجود ہو تو اسی سے تلاوت کی جائے، موبائل سے کی جائے تو موبائل کو ایروپلین موڈ میں کر دیا جائے، تاکہ جتنی دیر تلاوت کرنی ہو یکسو ہو کر کی جائے، پھر اس سے متعلق جو اپنی جائز مصروفیات ہوں ان کا آغاز کیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ جب اسکرین پر قرآن کھلا ہوا ہو تو اسکرین کو چھونے کی ضرورت پڑتی ہے، اب یہ مس یا تو کسی آلہ کے ذریعہ ہوگا یا ہاتھ سے، جہاں تک کسی آلہ سے مس کرنے کا مسئلہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صورت میں اسکرین ٹچ کے لئے مخصوص اسٹک یا قلم کے ذریعہ اسکرین پر کھلے قرآن کو لمس کیا جائے تو بلا وضو اس کا چھونا جائز ہوگا، فقہاء نے وضاحت کی ہے:

''وحل قلبه يعود أي تقليب أوراق المصحف بعود ونحوه لعدم صدق المس عليه'' (ردالمحتار مع الدر المختار ۱/ ۱۷۳)

(لکڑی سے اس کا پلٹنا جائز ہے، یعنی مصحف کے اوراق کو لکڑی وغیرہ سے پلٹنا درست ہے، چونکہ اس پر چھونے کا اطلاق نہیں ہوتا)، شافعیہ اور حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے، مالکیہ کے نزدیک راجح قول کے مطابق جائز نہیں:

''ولو قلب غير المتطهر أوراق المصحف بعود في يده جاز عند كل من الحنفية والحنابلة، ولم يجز عند المالكية على الراجح، وعند الشافعية صحح النووي جواز ذلك؛ لأنه ليس بمس ولا حمل'' (موسوعہ فقہیہ ۳۸/ ۷ مادہ: مصحف)۔

لیکن جمہور کا مسلک اس سلسلہ میں زیادہ قرین صواب ہے چونکہ اس میں ہاتھ کا راست استعمال نہیں ہوتا۔

جہاں تک ہاتھ سے چھونے کا مسئلہ ہے تو دو باتیں ہیں: موبائل چھونا یا اسکرین کو اس حالت میں چھونا جبکہ اس پر قرآن کھلا ہوا ہو، موبائل چونکہ قرآن نہیں اس لئے اس کو چھونا تو بہر حال جائز ہے، خواہ اسکرین پر قرآن کھلا ہو یا بند، جہاں تک اسکرین کو اس حالت میں چھونے کا مسئلہ ہے جبکہ قرآن اس پر کھلا ہوا ہو تو ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ انگلی اسکرین پر لگتی ہے اور وہ شیشہ کی ہوتی ہے، اس کرین اور قرآن کے بیچ کئی تہیں Layers ہوتی ہیں، گویا قرآن اور اسے چھونے والے کے درمیان کوئی چیز حائل ہے، اور حائل کے ساتھ قرآن بلا وضو بھی چھونا جائز ہے۔

''فلو حمله بغلاف غير مخيط به، أو في خريطة وهي الكيس أو نحو ذلك لم يكره'' (موسوعہ فقہیہ ۳۸/ ۷ مادہ: مصحف)

کمپیوٹر یا جو موبائل اسکرین ٹچ نہ ہو اس پر اگر قرآن کھولا جائے تو اس پر ہاتھ رکھنے کے لئے وضو کو ضروری نہیں قرار دیا جاتا چونکہ ان میں اسکرین پر ہاتھ رکھنے سے کوئی حرکت نہیں ہوتی، اگر اسکرین ٹچ موبائل میں بھی یہ ثابت ہو جائے کہ اصل الفاظ قرآن پر ہاتھ نہیں لگتا، بلکہ اس میں یہ حرکت ایک دوسرے نظام کے تحت ہوتی ہے تو اس میں بھی وضو ضروری نہیں ہونا چاہئے، چونکہ جو قرآنی حروف ہمیں نظر آتے ہیں وہ الیکٹریکل کوڈ ہوتے ہیں، محض ''ذبذبات'' ہیں، یعنی ایک طرح کا ارتعاش اور اہتزاز Oscillation ہے، حفوف جس طرح پڑھنے میں آرہے ہیں حقیقت میں وہ ایسے نہیں، وہ ثابت حروف نہیں ہیں، اسی لئے ہم اسے موبائل کہتے ہیں، قرآن نہیں کہتے، عرفاً بھی وہ قرآن نہیں، اس لئے بلا وضو اس کا چھونا جائز ہوگا، شیخ صالح فوزان کی یہی رائے ہے

(دیکھئے: ویب سائٹس: ۱موقع منتديات الضويلة الرسمية، ۲موقع ملتقى أنصار الهدى، ۳المنتدى الإسلامي العام)۔

لیکن اب تک اس سلسلہ میں زیادہ تر آراء جو ہماری نظر سے گذریں ان سے اس پہلے خیال کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ ان کا حاصل یہ ہے کہ جب قرآن کریم موبائل یا میموری کارڈ کے اندر ہو اور اس کو اسکرین پر کھولا نہ گیا ہو تو اس وقت چونکہ وہ حروف ونقوش کی صورت میں موجود نہیں تو اس کو ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں، اور جب اسکرین پر کھول دیا جائے تو باوضو ہو کر اسے چھونا ضروری ہے، چونکہ اسکرین پر موجود نقوش قرآن کے الفاظ پر دلالت کرتے ہیں، اسکرین کے علاوہ موبائل کے بقیہ حصوں کو بلا وضو ہاتھ لگانا درست ہوگا۔

دار العلوم دیو بند کا ایک فتوی بھی اسی کے مطابق ہے: ''جس وقت موبائل کی اسکرین پر قرآن کی آیات نظر آ رہی ہوں اس وقت اسکرین کو بلا وضو ہاتھ نہ لگائیں'' (فتاوی دار العلوم دیو بند فتوی: ۶۴۰۰ ۳ ویب سائٹ دار العلوم دیو بند)۔

جو حضرات داؤد ظاہری کی خلاف اجماع رائے (المحلی: ابن حزم ۱/ ۸۲-۸۳) کے مطابق قرآن مجید کو چھونے کے لئے وضو کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ حدث اکبر سے پاکی کو ضروری قرار دیتے ہیں وہ بھی یہی فرق کرتے ہیں کہ جب اسکرین پر قرآن کھلا ہوا ہو تو ناپاکی کی حالت میں اسکرین پر ہاتھ نہیں لگا سکتے، اور پورے موبائل پر لگا سکتے ہیں، اور نہ کھلا ہوا ہو تو اسکرین پر بھی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو تختیوں پر لکھے ہوئے قرآن کے حکم میں مانا جائے، چونکہ اس میں چند آیات کے بعد چند دوسری آیات اسکرین پر ابھرتی ہیں جیسے تختیوں پر جب چند آیات کو محو کیا جائے تب دوسری چند آیات لکھی جاتی ہیں، اور تختیوں کا مسئلہ یہ ہے کہ جب ان پر قرآن کی آیات لکھی جائیں تو بلا وضو ان پر ہاتھ نہیں لگا سکتے (دیکھئے: المجموع: الامام النووی ۲/ ۷۰، المبسوط للسرخسی ۳/ ۱۵۲، وتحفة الفقهاء للسمرقندی ۱/ ۳۲، شرح فتح القدير: الكمال بن الهمام ۱/ ۳۳۳، الخرشي على مختصر سيدي خليل ۱/ ۱۶۰)۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی لکھی ہوئی چیز کے تحریر شمار ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالکل ثابت ہو، اپنی جگہ سے ہٹتی نہ ہو، بلکہ اعتبار اس کا ہے کہ پڑھنے میں آتی ہو، اگرچہ ہٹانے سے فوراً ہٹ جائے، جو تحریر الکٹرانک آلات کے ذریعہ ابھر کر آتی ہے وہ حقیقی تحریر ہے، یہ تحریر موبائل سے ایسے ہی متصل ہوتی ہے جیسے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کاغذ سے، اس لئے اسے قرآنی آیات ہی سمجھا جائے گا، ہاں جب تک وہ میموری میں ہے اس کا حکم قرآن کا نہیں، اس لئے کہ وہ کتابت نہیں۔

ایسی صورت میں اسکرین ٹچ موبائل میں قرآن کا فولڈر کھولنے کے لئے بھی وضو ضروری ہوگا۔

ڈاکٹر محمد جنید بن محمد نوری الدیرشوی نے اس موضوع پر ''مس الأجهزة الإلكترونية التي يحزن فيها القرآن وحملها'' کے نام سے ایک تحقیقی رسالہ لکھا ہے جو ''وزارة الشؤن الإسلامية، مجمع الملك فهد لطباعة القرآن الكريم'' مدینہ منورہ سے شائع ہوئی ہے، ان کی بھی یہی رائے ہے۔



قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت

جدید وقدیم فتاوی کی روشنی میں

مولانا محمد صادق مبارکپوری[1]

قرآن عزیز آخری آسمانی کتاب ہدایت ہے، جوحضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر ۲۳؍سال کے عرصہ میں نازل ہوا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خداوند قدوس نے لی ہے، "إنا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" (سورۂ حجر:۹)، دیگر آسمانی نوشتے تحریف وترمیم کا شکار ہوگئے، ان کا اصل متن محفوظ نہ رہ سکا، مگر قرآن مقدس اعدائے اسلام کی ناپاک سازشوں اور کوششوں کے باوجود تحریف وترمیم سے محفوظ رہا۔

اللہ تعالی نے حفاظت قرآن کریم کی جو ذمہ داری لی ہے، نوعمر بچوں اور بچیوں کے حفظ قرآن کے ذریعہ کرائی، ہر ملک میں لاکھوں حفاظ قرآن کریم موجود ہوتے ہیں، متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ کلام پاک کی اشاعت درست نہیں، اس کی خرید وفروخت، تقسیم اور ہدیہ کرنا ناجائز ہے "لا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ:۲)۔

ائمہ اربعہ اس کی حرمت وممانعت پر متفق ہیں کہ قرآن مجید کو کسی اور زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی لکھنا ممنوع اور حرام ہے۔

"نور الایضاح" کے مصنف علامہ حسن شرنبلالی حنفیؒ صاحب ہدایہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"فی کتابه التجنیس والمزید ما نصه ویمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالإجماع لأنه یؤدی للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنی، فانه دلالة علی النبوة؛ ولأنه ربما یؤدی إلی التهاون بأمر القرآن"

(ان کی کتاب التجنیس والمزید میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ یہ قرآن کریم کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے، اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ اور معنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے اور قرآن کے باب میں سستی تک پہنچائے گا)۔

"وفی معراج الهدایة: أنه یمنع کتابة المصحف بالفارسیة أشد المنع، وأنه یکون معتمده زندیقا، وفی الکافی: أنه لو أراد أن یکتب مصحفا بالفارسیة یمنع"

(معراج الهدایہ میں ہے کہ فارسی زبان میں قرآن کریم کی کتابت سخت ترین ممنوع ہے، اور قصدا ایسا کرنے والا زندیق ہے، اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا)۔

علامہ محقق ابن ہمامؒ فتح القدیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"وفیه أی الکافي: إن اعتاد القراءة بالفارسیة أو أراد أن یکتب مصحفا بها یمنع" (۲/۴۷ باب صفة الصلاة)

(اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اسے روک دیا جائے گا)۔

یہ فارسی میں لکھنے کی ممانعت کا تذکرہ بطور مثال ہے، دنیا کی کسی زبان میں بھی لکھنا ممنوع ہے، علامہ شرنبلالی حنفیؒ رقم طراز ہیں:

"قدمنا حکایة الإجماع علی منع کتابة القرآن العظیم بالفارسیة، وأنه إنما نص علی الفارسیة لإفادة المنع بغیرها بالطریق الأولی؛ لأن غیرها لیس مثلها فی الفصاحة" (النفحة القدسیة/ ص۳۲)

[1] استاذ حدیث، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور، اعظم گڑھ۔

(قرآن کریم کو فارسی میں لکھنے کی ممانعت پر اجماع تو ہم نقل کر چکے ہیں اور یہ کہ فارسی کی تصریح اس لئے کی گئی ہے، تاکہ دوسری زبانوں میں ممنوع ہونا بذریعہ اولیٰ ثابت ہوجائے کیونکہ اور کوئی زبان فارسی سے فصیح نہیں ہے)۔

فقہ حنفی کے مشہور متن درمختار میں ہے:

"وتجوز كتابة آية او آيتين بالفارسية لا أكثر. قال في الشامي: والظاهر أن الفارسية غير قيد" (۱/ ۵۴۴ فصل اذا أراد الشروع في الصلاة، كتاب الصلاة) (قرآن مجید کی ایک دو آیت کی کتابت تو فارسی زبان میں جائز ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں ہے (علامہ ابن عابدین) نے شامی میں فرمایا کہ یہ بات ظاہر ہے کہ فارسی زبان کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ مطلق عجمی زبان مراد ہے)۔

اور کفایہ شرح ہدایہ میں ہے:

"قال الإمام المحبوبي: أما لو اعتاد قراءة القرآن أو كتابة المصحف بالفارسية، ويمنع منه أشد المنع" (بامش فتح القدير ۱/ ۲۴۹) (امام محبوبی نے بیان کیا کہ اگر فارسی میں قرآن شریف کی تلاوت یا کتابت کی عادت کرلیں تو اس کو شدت سے منع کیا جائے گا)۔

سطور بالا میں ائمہ حنفیہ کی روایات معتبر کتب حنفیہ سے نقل کی گئی ہیں، اب امام شافعیؒ، امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ کے مسالک کی روایات درج کی جاتی ہیں:

"أما عند الشافعية فقد منا عن الزركشي احتمال الجواز وأن الأقرب المنع من كتابة القرآن بالفارسية كما تحريم قراءته بغير لسان العرب" (اور ائمہ شافعیہ کے نزدیک کیا حکم ہے تو ہم نے پہلے امام زرکشی سے جواز کا احتمال نقل کردیا ہے اور حق کے قریب یہی ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنے کی ایسی ممانعت ہے جیسے کہ غیر عربی زبان میں تلاوت حرام ہے)۔

"وقد أفاد شيخ الإسلام العلامة ابن حجر العسقلاني الشافعي في فتاواه تحريم الكتابة، وقد سئل هل تحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية كقراءته فأجاب بقوله قضية ما في المجموع الإجماع على التحريم. وذكر التوجيه له. وقال في محل آخر: ... ويحرم أيضا كتابته بقلم غير العربي" (شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی نے شافعیؒ سے اپنے فتویٰ میں ایسے لکھنے کے حرام ہونے کو بیان فرمایا ہے آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا تلاوت کی طرح غیر عربی زبان میں قرآن شریف کا لکھنا بھی حرام ہے تو جواب دیا کہ اس کل کا فیصلہ یہ ہے کہ حرام ہونے پر اجماع ہے اور پھر اس کے دلائل بیان فرمائے، اور ایک دوسری جگہ میں فرمایا...... غیر عربی قلم میں لکھنا بھی حرام ہے)۔

"ثم كتب عليه شيخ الائمة الشافعية بعصرنا ابو العلامة شمس الدين محمد الشوبرى الشافعي ... ماصورته أنه إذا كتب بغير العربية هل يحرم مسه وحمله أولا؟ الأظهر في الجواب نعم إذ لا يخرج بذلك عن كونه قرآنا وإلا لم تحرم كتابته فليراجع" (پھر اس ہمارے ہم عصر شہر شیخ الائمہ الشافعیہ علامہ شمس الدین شوبری شافعیؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ باقی رہی یہ بات کہ اگر غیر عربی میں لکھ لیا جائے تو اس کا (بے وضو) چھونا اور اٹھانا حرام ہوگا یا نہیں تو جواب میں زیادہ ظاہر یہی ہے کہ ہاں کیوں کہ اس فعل سے وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہوگا ورنہ پھر اس کا لکھنا ہی حرام ہوتا)۔

"وأما عند المالكية فلما نقل العلامة ابن حجر في فتاواه أن الإمام ما لكا سئل هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، الا على الكتبة الاولى أي كتبها الإمام هو المصحف العثماني قال بعض ائمة القراء ونسبته إلى الإمام مالك لأنه المسئول عن المسئلة وإلا فهو مذهب الأئمة الأربعة وبمثله قال أبو عمرو" (إعانة الطالبين ۱/ ۶۴)

(اور ائمہ مالکیہ کے نزدیک اس لئے کہ علامہ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ لوگوں نے جو یہ نیا طریقہ نکالا ہے الگ الگ حروف کر کے لکھنے کا کیا اس طرح لکھا جاسکتا ہے، فرمایا نہیں سوائے اس پہلے طریقہ یعنی امام کے جو مصحف عثمانی کا ہے اور کوئی طرز جائز نہیں، قرأت کے بعض ائمہ نے بیان کیا ہے کہ اس مسئلہ کی نسبت امام مالک کی طرف اس بنا پر ہے کہ ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تھا ورنہ یہ تو ائمہ اربعہ کا مذہب ہے اور ایسا ہی العمرو نے بھی فرمایا)۔

"وأما عند الأئمة الحنابلة: فقد قدمنا عن الدراية ما نصه وعند الشافعي تفسد الصلوة بالقراءة بالفارسية. وبه قال مالك وأحمد عند العجز وعدمه" (النفحة القدسية/ ص ۳۵) (اور ائمہ حنابلہ کے نزدیک تو ہم پہلے درایہ سے نقل کر چکے ہیں کہ جس کے الفاظ یہ ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک فارسی میں قرآءت کرنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے اور یہی امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے عجز وعدم عجز کے وقت کے لئے فرمایا ہے)۔

فقہ حنبلی کی "کتاب المغنی" میں ہے:

"استمر الإجماع العملي على قراءة جميع المسلمين القرآن في الصلاة وغيرها بالعربية كأذكارها وسائر الأذكار والأدعية المأثورة على كثرة الأعاجم حتى قام بعض المرتدين من أعاجم هذا العصر يدعون إلى ترجمة القرآن وغيرها من الأذكار والتعبد بالترجمة... ولم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي ﷺ كتبه إلى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذى علل به" (المغنی ۲/ ۱۶۴)

(اس پر اجماع قرار پایا ہے کہ تمام مسلمان نماز میں بھی اور نماز کے علاوہ بھی قرآن شریف کی تلاوت عربی ہی میں کریں، جیسے نماز کی دعائیں اور ذکر اور سب ادعیہ ماثورہ بھی عربی میں پڑھی جاتی ہیں، اور یہ اجماع عجمیوں کی کثرت کے باوجود ہے، لیکن اس زمانہ کے عجمیوں میں سے بعض مرتد لوگ اٹھے ہیں اور لوگوں کو ترجمہ قرآن اور ترجمہ اذکار کی اور تراجم کو بطور عبادت تلاوت کرنے کی دعوت دینے لگے ہیں، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی ترجمہ خود کر کے بھیجا نہ ترجمہ کر کے بھیجنے کی اجازت دی، نہ صحابہ کرام اور خلفائے مسلمین اور شاہان اسلام نے ایسا کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر، کسری اور مقوقس کو جو خطوط لکھوائے ہیں اگر وہ ان کی زبانوں میں لکھواتے تو اس فعل کو علت بنانا صحیح ہوتا)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

تاریخ اسلام میں کوئی ایک بھی ایسا واقعہ درج نہیں ہے کہ کسی عجمی رسم الخط میں قرآن مجید لکھوا کر بھیجا گیا ہو یا اس کی اجازت دی گئی ہو، اس دور میں حضرات صحابہ کرامؓ کا تعامل وہ تھا، جو بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے منقول ہے:

حضرت حذیفہ بن یمان ملک شام کے جہاد اور آرمینیہ، آزربائی جان کی فتح میں شریک تھے، وہاں اہل عراج کو قرآن کی مختلف قراءتوں میں اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر سخت تشویش کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"أدرك الأمة قبل أن يختلفوا اختلاف اليهود والنصارى" (روح المعانی ۲۶/ ۴۴)

(اے امیر المؤمنین! آپ امت کی خبر لیں، اس سے پہلے کہ ان میں یہود و نصاری، جیسا اختلاف واقع ہو جائے)۔

حضرت عثمان غنیؓ نے تمام اجلہ صحابہ کرام، حضرت علی، زید بن ثابت، عبد اللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبد الرحمن بن حارث وغیرہم کے مشورے سے طے کیا کہ قبائل عرب کی سات لغات جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے، اگرچہ سب وحی اور حق ہیں، لیکن ان کے لفظ اختلاف سے اب اندیشہ ہے کہ معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ نہ نکل آئے، اس لئے اب صرف لغت قریش پر قرآن لکھا جائے، دوسری لغات کو موقوف کر دیا جائے (یہ اختلاف حرف لفظی تھا، معنی پر کوئی اثر نہ تھا)۔

باجماع صحابہؓ لغت قریش پر قرآن کریم کے بہت سے نسخے لکھوائے گئے اور ایک جماعت صحابہؓ کے سامنے ان کو پڑھا گیا، اور صحیح کیا گیا، اس کے بعد وہ نسخے مختلف ممالک عجم میں بھیج دیئے گئے، اور باجماع امت ان کا اتباع ہر چیز میں لازم و ضروری سمجھا گیا۔

عربی رسم الخط میں حرکات اگرچہ کلمات سے بالکل ممتاز ہوتی ہیں، مگر احتیاط کی بنا پر علماء امت نے اس سے بھی اختلاف کیا ہے کہ قرآن کریم کی نظم پر یہ حرکات لگانا جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے اس کو بھی مکروہ قرار دیا ہے اور بعض علماء نے مواضع مشکلہ میں بضرورت اس کی اجازت دی ہے۔

عربی رسم الخط میں حرکات اور نقطوں کا کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہونا ثابت ہونے کے باوجود سلف صالحین کو ان کی کتابت فی المصاحف میں اختلاف پیش آیا تو جس رسم الخط، مثلاً انگریزی میں یہ حرکات خود کلمات کے درمیان بشکل حروف لکھی جاتی ہوں، ان کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں چند ایسے حروف ہیں کہ ہر حرف سے لفظ کے معنی بالکل جدا ہو جاتے ہیں، لیکن بہت سی عجمی زبانوں میں ان حروف میں کوئی فرق نہیں ہے، سب کو ایک ہی آواز سے پڑھا جاتا ہے، مثلاً س، ث، ص، اور ذ، ز، ظ وغیرہ تو جب قرآن کو اس رسم الخط میں لکھا جائے گا تو ان حروف کو کوئی امتیاز نہ رہے گا۔

حاصل کلام رسم خط عثمانی کا اتباع لازم و واجب ہے، اس کے سوا کسی دوسرے رسم الخط میں اگرچہ عربی ہی کیوں نہ ہو، قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں، کیونکہ باجماع امت اسی کی نقل و اتباع ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا عربی رسم الخط میں بھی جب جائز نہیں ہے تو سرے سے دوسرا رسم الخط غیر عربی میں بدل

دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

اگلی سطور میں قرآن کریم کے عربی ہونے، اجماع امت، ائمہ اربعہ کا اتفاق مختلف فقہ اکیڈمی کے فیصلے اور مراکز افتاء کے فتاوی نقل کئے جاتے ہیں:

رسم خط عثمانی پر قرآن کریم کی کتابت پر حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین کرام کا اجماع ہے:

''إجماع الصحابة ثم إجماع الأمة عليه بعد ذلك في عهد التابعين والأئمة المجتهدين'' (تحریم کتاب القرآن کریم ۱/ ۳۹)
(صحابہ کرام کا اجماع ہے، اس کے بعد پھر حضرات تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں اس پر اجماع ہے)۔

بلکہ امت محمدیہ کا قرآن کریم کے رسم عثمانی پر کتابت میں اجماع ہو چکا ہے:

''إجماع الأمة الإسلامية على ما كتب الخليفة عثمان رضي الله عنه'' (تحريم كتابة القرآن بحروف غير عربية ۱/ ۲۷)
(امت اسلامیہ کا اس رسم الخط پر اجماع ہے، جس پر خلیفہ (ثالث) حضرت عثمانؓ نے تحریر کرایا تھا)۔

''وقال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء قال: لا، إلا على الكتبة الأولى'' (الاتقان ۲/ ۲۱۳، النوع السادس والسبعون) (اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو لوگوں نے ایجاد کیا ہے فرمایا: نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر)۔

فقہ حنفی کی طویل تصنیف محیط برہانی میں ہے:

''أنه ينبغي ألا يكتب المصحف بغير الرسم العثماني'' (تحريم كتابة القرآن الكريم بحروف غير عربية ۱/ ۴۴)
(مناسب ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے علاوہ میں نہ کتابت کیا جائے)۔

مسلک امام احمد بن حنبلؒ کی وضاحت ان کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

''قال الإمام أحمد تحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو الف أو ياء أو غير ذلك'' (تحريم كتابة القرآن / ۴۲)
(امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے، واو یا، الف (زائدہ) میں (جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے میں آتے ہیں)

اور فقہ شافعی کی کتاب ''حواشی منہاج'' میں ہے:

''كلمة الربا تكتب بالواو والالف كما جاء في الرسم العثماني ولا تكتب في القرآن بالياء والالف؛ لأن رسمه سنة متبعة'' (مناہل العرفان ۱/ ۳۷۹) (کلمہ ربا واو اور الف کے ساتھ لکھا جائے گا، جیسا کہ رسم عثمانی میں وارد ہوا ہے، قرآن میں یا اور الف کے ساتھ نہیں لکھا جائے گا، کیونکہ اس کی رسم قابل اتباع سنت ہے)۔

مختلف فقہ اکیڈمی کے فیصلوں سے پہلے چند محدثین وفقہاء کے اقوال بھی ملاحظہ فرماتے چلیں:

امام بغویؒ اپنی تصنیف ''شرح السنہ'' میں رقم طراز ہیں:

''المصحف الذي استقر عليه الأمر هو آخر العوضات على رسول الله ﷺ فأمر عثمان ب بنسخه في المصاحف وجمع الناس عليه، وأذهب ماسوى ذلك قطعا لمادة الخلاف فصار ما يخالف خط المصحف في حكم المنسوخ والمرفوع كسائر ما نسخ ورفع'' (تحريم كتابة القرآن بحروف غير عربية ۱/ ۴۶)
(وہ مصحف ہے جس پر معاملہ ٹھہر گیا،...... حضرت عثمانؓ نے اس کو مصاحف میں لکھنے کا حکم دیا، اس پر لوگوں کو جمع کیا اور اختلاف کو ختم کرنے کے لئے اس کے علاوہ کو زائل کرنے کا حکم دیا پس جو مصحف عثمانی کے خلاف ہے منسوخ اور مرفوع کے حکم میں ہے، تمام منسوخات ومرفوعات کے درجہ میں ہے)۔

علامہ نظام الدین نیساپوری تحریر فرماتے ہیں:

''قال جماعة من الأئمة أن الواجب على القراء والعلماء وأهل الكتابة أن يتبعوا هذا الرسم في خط المصحف، فإنه رسم زيد ابن ثابت، وكان أمين رسول الله ﷺ وكاتب وحيه'' (تحريم كتابة القرآن الكريم بحروف غير عربية ۱/ ۴۷)

(ائمہ کی ایک جماعت نے فرمایا کہ قراء علماء، کاتبین پر ضروری ہے کہ قرآن کریم کی کتابت میں اس رسم الخط کی اتباع کریں، کیونکہ یہ زید بن ثابت کا رسم الخط تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امین اور کاتب وحی تھے)۔

امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: ''من یکتب مصحفا، فینبغی أن یحافظ علی الهجاء الذی کتبوا به تلك المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئا. فإنهم کانوا أکثر علماء وأصدق قلبا ولسانا أعظم أمانة. فلا ینبغي أن نظن بأنفسا استدراکا علیهم'' (الاتقان ۲/۲۱۳، النو السادس والسبعون فی مرسوم الخط)

(جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اس طرز کی حفاظت کرے جس پر صحابہ کرام نے مصاحف میں لکھا ہے، ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اس میں کچھ تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے، زیادہ سچے دل اور زبان والے اور زیادہ امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں)۔

سعودی عرب کی ''ہیئۃ کبار العلماء'' کا فیصلہ ہے:

''ثبت أن کتابة المصحف بالرسم العثماني کانت في عهد عثمان رضی الله عنه وأنه أمر کتبة المصحف أن یکتبوه علی رسم معین ووافقه الصحابة وتابعهم التابعون ومن بعدهم إلی عصرنا هذا. وثبت أن النبي صلی الله علیه وسلم قال علیکم، سنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین من بعدی فالمحافظة علی کتابة المصحف بهذا الرسم هو المتعین اقتداء بعثمان وعلی وسائر الصحابة وعملا بإجماعهم'' (قرارات هیئة کبار العلماء)

(ثابت ہے کہ عثمانی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت حضرت عثمانؓ کے عہد میں انجام پائی، انہوں نے کاتبین کو حکم دیا کہ قرآن کریم کی کتابت ایک مقررہ رسم الخط میں کریں، صحابہ کرام نے ان سے اتفاق کیا اور تابعین بھی اسی راہ پر گامزن رہے اور آج تک ہر دور کے لوگوں نے اس کی پابندی کی، اور ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے، لہذا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور تمام صحابہ کی پیروی اور ان کے اجماع پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں تحریر کرنا متعین ہو جاتا ہے)۔

دمشق کی مجلس الاقراء کا فیصلہ:

''أن کتابة القرآن العظیم بالأحرف اللاتینیة أمر خطیر بالغ الخطورة وهو غیر جائز؛ لأن الأحرف العربي لایوجد کثیر منها باللاتینیة وهو تحریف للقرآن وتغییر له عن العربیة المنزل بها'' (حوالہ سابق)

(قرآن عظیم کی کتابت لاطینی زبان میں نہایت خطرناک عمل ہے، اور جائز نہیں ہے، اس لئے کہ عربی زبان کے بہت سے حروف لاطینی زبان میں موجود نہیں ہیں، اور یہ قرآن کی تحریف ہے اور اس کو نازل شدہ عربی سے بدلنا ہے)۔

''الھیئۃ العلمیہ للفتوی کویت'' کا فیصلہ:

''لایجوز کتابة القرآن الکریم (المصحف) بغیر اللغة العربیة وبغیر الرسم العثماني حتی ولوکان بقصد تیسیر قراءة القرآن الکریم لغیر العرب أو للمسلمین الجدد لما یترتب علی ذلك من تحریف للقرآن الکریم وتبدیل بعض الحروف، ولأنه کتب بالرسم العثماني الذي یستوعب القراءات السبع کلها سد للذرائع وصیانة للقرآن الکریم من محاولات التغییر والتبدیل التی یحرص علیها أعداء الإسلام''

(قرآن کریم کی کتابت عربی زبان اور عثمانی رسم الخط کے علاوہ میں جائز نہیں ہے، اگرچہ غیر عرب اور نئے مسلمانوں کی آسانی کے لئے ہو، کیونکہ اس سے قرآن کریم کی تحریف اور بعض حروف کی تبدیلی ہوگی اور اس لئے کہ اس رسم عثمانی میں لکھا گیا ہے جو قرأت سبعہ کو جامع ہے قرآن کریم میں تغیر و تبدیلی کی ان کوششوں کو روکنے اور اس کی حفاظت کا ذریعہ ہے، جس کے دشمنان اسلام خواہش مند ہیں)۔

دار الافتاء عمان کا فیصلہ ہے:

''فلوکتب القرآن الکریم بالحروف اللاتینیة علی طریقة النظم العربي لوقع الإخلال والتحریف في لفظه

وتبعها تغير المعنى وفساده وقد قضت نصوص الشريعة الاسلامية بأن يصان القرآن الكريم عن كل ما يعرضه للتبديل والتحريف'' (فتوى دار الافتاء عمان)

(اگر قرآن کریم کو لاطینی حروف میں اس کے عربی نظم کے طریقہ پر لکھا جائے تو خلل اور تحریف اس کے الفاظ میں پیش آئے گی، معنی کی تبدیلی اور بگاڑ پیدا ہوگا، اسلامی شریعت کی نصوص نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ قرآن کریم کو ان تمام چیزوں سے محفوظ رکھا جائے گا جو تبدیلی اور تحریف کا باعث بنے)۔

اور آگے اسی فیصلے میں ہے:

''وبذلك أجمع علماء الإسلام سلفا وخلفا على أن كل تصرف فى القرآن الكريم يؤدى إلى تحريف لفظه أو تغيير في معناه ممنوع منعاباتاومحرم تحريما قاطعا'' (حوالہ بالا) (اسی وجہ سے سلف وخلف علمائے اسلام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ قرآن کریم میں ہر قسم کا تصرف جو تحریف لفظی اور تبدیلی معنی کا باعث ہو سختی سے منع ہے اور قطعی طور پر حرام ہے)۔

''وزارت اوقاف ادارہ جامع بنی امیہ سوریہ'' کا فیصلہ ہے:

''ان فكرة كتابة القرآن الكريم بالأحرف اللاتينية فكرة هدامة يجب محاربتها بكل الوسائل على أن علماء الأمة الاسلامية وعلماء القراء ا ت لم يجيزوا كتابته إلا بالرسم به في زمن الخليفة الثالث سيدنا عثمان وحافظوا على هذا الرسم حتى وصلنا بطريق التواتر والآيات القرآنية شاهدة على ذلك'' (قرارات جامع بنو اميه سوريه)

(لاطینی حروف میں قرآن کریم کی کتابت کا خیال ایک تباہ کن خیال ہے، تمام وسائل کے ذریعہ اس سے جنگ کرنا ضروری ہے، اس بنا پر کہ امت اسلامیہ کے علماء اور قراء نے خلیفہ ثالث سیدنا عثمانؓ کے زمانہ میں اسی رسم الخط کی اجازت دی، اور اسی رسم الخط کی محافظت کی، یہاں تک کہ تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا اور آیات قرآنیہ اس پر گواہ ہیں)۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے ہندوستانی اکابر علماء کے فتاوی (فتاوی رحیمیہ ۳/۱۶، فتاوی عثمانی ۱/۲۱۸، فتاوی محمودیہ ۳/۵۰۸)۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

قرآن کریم کو بریل کوڈ میں لکھنا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسا کرنے میں قرآنی رسم الخط جو قرآن عظیم کا ایک رکن ہے، اس کا ترک اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر واجماع سے ثابت ہے، نظم قرآن میں جو اعجاز ہے، وہ جاتا رہے گا، لہذا قرآنی رسم الخط کی اتباع لازم ہے، تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لئے نابینا لوگ کے لئے بریل کوڈ کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، دور قدیم سے نابینا افراد کے لئے جو صرف زبانی تلقین کا طریقہ ہے، اس طریقہ کو دور حاضر میں اختیار کرنا چاہئے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے کے لئے وضو کا ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ موبائل کا ڈھانچہ ایسا غلاف ہے جس کو بلا وضو چھونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

اور اسکرین پر قرآن مجید دکھائی دے رہا ہے تو ان حروف (اسکرین) پر بلا وضو ہاتھ رکھنا جائز نہیں ہے، شامی میں ہے:

''يمنع دخول مسجد (إلى قوله) ومسه أى القرآن ولو فى لوح أودرهم أوحائط'' (۱/۲۱۶ باب الحيض)۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت

مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی[1]

ارشاد خداوندی ہے: "إنا أنزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون" (سورۂ یوسف:۲) (ہم نے اس کو اتارا ہے عربی زبان کا قرآن تاکہ تم سمجھ لو)، "وانه لتنزيل رب العالمين" (سورۂ شعراء:۱۹۲) (یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا)، "بلسان عربی مبین" (ترجمہ شیخ الہند: ص ۵۰۹) (عربی زبان میں ہے)۔

یعنی اتارا نہایت فصیح واضح اور شگفتہ عربی زبان میں اور یہ عربی زبان جو تمام زبانوں میں زیادہ فصیح وسیع اور منضبط و پرشوکت زبان ہے، نزول قرآن کے لئے منتخب کی گئی (فوائد عثمانی/ص ۳۱۱)۔

قرآن کریم نام ہے خاص اس کلام الٰہی کا جو عربی زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوا جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل متواتر کے طریقے پر منقول ہے۔

''أماالكتاب فالقرآن المنزل على الرسول ﷺ المكتوب في المصاحف المنقول عنه نقلا متواترا بلاشبهة'' (منار الانوار/۹،۱۰،۱۱)۔

مذکورہ آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم عربی زبان کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''لأن المامور به قرأة القرآن وهو إسم للمنزل باللفظ العربي، المنظوم هذا النظم الخاص المكتوب في المصاحف المنقول إلينا نقلا متواترا ولا عجمي إنما يسمى قرآن مجازا، ولذا يصح نفي إسم القرآن عنه ولقوة دليلها رجع إليه'' (شامی زکریا ۲/ ۱۸۴ باب صفة الصلوة)۔

مراقی الفلاح میں ''لأن القرآن للنظم والمعنى جميعا'' (مراقی الفلاح: ص ۱۵۳، البحر الرائق ۱/ ۳۲۴) میں ہے:

''لأن القرآن باللام إنما هو العربي في عرف الشرع'' (البحر الرائق ۱/ ۳۲۴)

جب قرآن کی زبان خالص عربی ہے تو غیر عربی میں لکھے ہوئے قرآن کو قرآن نہیں کہا جائے گا۔

''قال شامي: وذلك إن الفارسي ليس قرآنا أصلا لانتصرافه في الشرع إلى العربي'' (شامی زکریا ۱/ ۱۸۴)۔

نزول قرآن کے وقت طریقہ یہ تھا کہ جب کلام پاک کی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر لکھواتے اور ہر لفظ کا رسم الخط کاتب وحی کو تعلیم فرماتے، جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے معرفت سیکھتے تھے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے مبارک عہد میں کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے بڑی احتیاط اور پوری توجہ سے اسی اصل رسم الخط کے مطابق پورا قرآن شریف لکھا، لہٰذا اس مصحف عثمانی کے خلاف کرنا جائز نہیں اس کی اتباع واجب ہے اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن کے حکم میں ہے چاروں ائمہ کرام اس رسم الخط کو ضروری مانتے ہیں۔

مزید یہ کہ عہد صحابہ میں جب اسلام مشرق ومغرب کے عجمی ممالک میں قرآن مجید کے ساتھ پھیلا تو اس وقت قرآن کریم کے پڑھنے و پڑھانے والے بہت کم تھے مثال کے طور پر عراق وخراسانی ہندوستانی وترکستان وغیرہ کے رہنے والے نومسلم نہ عربی رسم الخط پڑھ سکتے تھے، نہ کوئی ان کے ملکی زبان میں ترجمہ کرنے والا تھا ظاہر ہے اس وقت اس قدر ضرورت تھی کہ ہر ملک کے رسم الخط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجا جائے، تاکہ وہ آسانی

[1] مدرسہ معراج العلوم ممبئی۔

سے پڑھ سکیں، لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ اس کا قرون مشہود لہا بالخیر میں ثابت نہیں کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم الخط میں قرآن لکھوایا ہو یا اسکی اجازت دی ہو۔

الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا، بلکہ تقریباً تیرہ سو برس پہلے پہنچا ہوا ہے اور عجمیوں کو عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات آج پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اسی وقت سے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو اُس وقت مشکلات زیادہ ہونی چاہئے کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی پھر ان میں لکھے پڑھے کم تھے خصوصاً قرآن پڑھانے والا کوئی عرب ہی ہوسکتا تھا، جس کا ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر بستی میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا، لیکن ان سب مشکلات مزعومہ کے باوجود صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ جائز نہیں کیا کہ قرآن کو ملکی رسم الخط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جاوے بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا (مستفاد جواہر الفقہ ۱/۷۵-۷۶)۔

غیر عربی کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنا جس میں قرآنی رسم الکط وتلفظ واداء کی خصوصیات محفوظ نہ رہیں اور پھر اس کو اس زبان کی طرف منسوب کر کے ہندی یا انگریزی کا قرآن کہنا قرآن کریم وکلام الٰہی کی توہین ہے کہ وہ اس قسم کی خرابیوں کی روک تھام کریں اور اس کی اصلاح کرنے کی ہر مناسب تدبیر اختیار کریں اور پوری کوشش کریں (مستفاد منتخبات نظام الفتاوی ۲/۳۱۲)۔

شیخ الاسلام حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' رسم خط عثمانی کے بارے میں فرمایا ہے:

''وقال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى، رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة''۔

اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر پر لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالکؒ کا اس بارے میں مخالف نہیں ہے۔

اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کریم کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو یہ چند شرطوں کے ساتھ جائز ہوگا، اس کے بارے میں مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحبؒ کی ایک وقیع تحریر نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، آپ فرماتے ہیں:

''ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں، ان کی تعلیم وتلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سرحوض وسرصفحہ نمایاں کر کے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی عظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً: س، ث، اور ز، ذ، ظ، ض اور ہمزہ، ع وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً: حروف زوائد (الف لام) اور مد وجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کر کے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے، پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی اور ان باتوں کے باوجود ایک بات اور پھر بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے، بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا اور کہا جائے کہ مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا انگیزی میں بنگلہ وغیرہ میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ یا مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف، صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے، اگر ذرا بھی کسی عمل میں یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی، ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہوجائے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کریم کے ساتھ تابع بن کر لکھ دی جاتی ہیں اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف ترجمہ

قرآن یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۲/ ۳۱۴)۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا اسی طرح اس کی حرمت ومخالفت بھی ثابت ہوگی کہ زبان تو عربی ہی رہے لیکن رسم الخط غیر عربی کردی جائے اس کے لئے بہت سی مصالح دینیہ ودنیویہ پیش کی جاتی ہو جن کے جوابات قدرے دیئے جاچکے ہیں۔

قرآنی بریل کوڈ:

بریل کوڈ میں تیار کردہ مجموعہ کو نابینا حضرات کے قرآن کریم پڑھنے کے لئے درست کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کو قرآن کریم کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے، نہ اس کو اصل قرآن کا درجہ دیا جائے گا، اس لئے کہ اصلی قرآن تو وہی ہے جس کے بارے میں خود قرآن کریم میں وارد ہے: "بلسان عربی مبین" (سورۂ شعراء: ۱۹۵) اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وہی ہے جو عربی زبان میں ہو (معارف القرآن ۶/ ۵۰۱) اس کو زیادہ سے زیادہ غیر عربی رسم الخط میں لکھے ہوئے قرآن کریم کہا جائے گا، اسی طرح بریل کوڈ میں تیار قرآن کو بریل کوڈ کا قرآن نہیں کہا جائے گا، ایسا کہنا ناجائز اور بے ادبی ہے (مستفاد از معارف القرآن ۶/ ۵۵۲)، البتہ اس کو مفتاح القرآن یا رہنمائے قرآن جیسا کوئی نام دیا جاسکتا ہے، ہاں بریل کوڈ میں تیار قرآن کو مجازاً قرآن کہا جائے گا، لہذا اس کو بے وضو ہاتھ لگانا درست نہ ہوگا۔

''وذلك ان الفارسی لیس قرآن أصل والأعجمی إنما سمی قرآن مجازا وسمه أی القرآن ولو مکتوبا بالفارسیة فی الأصح'' (درمختار مع شامی زکریا ۱/ ۴۸۸، شامی زکریا ۲/ ۱۸۴)۔

علامہ شوبری شافعیؒ سے غیر عربی میں لکھے گئے قرآن کے بارے میں پوچھا گیا کہ بے وضو ہاتھ لگانا کیسا ہے؟ فرمایا زیادہ ظاہر یہی ہے کہ اس فعل سے اس کو روکا جائے گا وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہوگا، ورنہ پھر اس کا لکھنا بھی حرام نہ ہوتا۔

''قال العلامة الشوبری الشافعی إذا کتب بغیرالعربیة هل یحرم مسه وحمله أولا؟ الأظهر فی الجواب نعم اذ لایجوز بذلك عن کونه قرآنا والا لم محترم کتابة'' (بحواله جواہر الفقه ۱/ ۱۰۳)، جیسا کہ شامی عالمگیری (۱/ ۳۹) میں ہے: ''ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یکره لهم مسه عند أبی حنیفة، وکذا عندهما علی الصحیح هٰکذا فی الخلاصة، ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یحرم علی الجنب والحائض مسه بالإجماع وهو الصحیح'' (البحر الرائق ۱/ ۲۰۲)۔

اس کے اوراق کے بوسیدہ ہوجانے کی صورت میں احترام کے ساتھ دفن کردینا ہوگا۔

''المصحف إذا صار بحال لایقرأ فیه یدفن کالمسلم أی یجعل فی خرقة طاهرة ویدفن فی محل غیر ممتهن له یوطا'' (درمختار مع شامی زکریا ۱/ ۲۲۰، کذا فی عالمگیری ۵/ ۳۲۳، کذا فی البحر الرائق ۱/ ۲۰۲)۔

موبائل اسکرین پر قرآن:

ایسے موبائل جن کی اسکرین پر قرآن کریم موجود ہو تو نمایاں ہونے کی حالت میں ان دراہم اور اس تختی کے حکم میں ہیں جن پر آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہیں ان کو حدث اصغر واکبر سے پاک ہونے کی حالت میں چھونا درست ہوگا، بغیر ان کے ممنوع ہوگا۔

''ومسه أی القرآن ولو فی لوح أو دراهم أو حائط'' (شامی زکریا ۱/ ۴۸۸، کذا فی مسائل موبائل/ ص ۵۱)۔

لیکن یہ پروگرام اگر بند ہو تو چھونا منع نہیں ہوگا، ''وله یجوز مس شئ مکتوب فیه شئ من القرآن من لوح أو دراهم أو غیر ذلك إذا کان آیة تامة، هٰکذا فی الجوهرة النیرة'' (عالمگیری ۱/ ۳۱، الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس)۔

موبائل کا ڈھانچہ ایسا غلاف تصور نہیں کیا جاسکتا جس غلاف کے ہوتے ہوئے محدث کے لئے قرآن کریم کو چھونا یا اٹھانا جائز ہوتا ہو، اس لئے کہ وہ غلاف غلاف منفصل تصور کیا جائے گا جو قرآن کریم سے جزء متصل کے طور پر نہ ہو خرید وفروخت میں نہ آتا ہو، بلکہ اس سے علاحدہ ایک شئ جو بغرض حفاظت ہو جس کو اس پر لپیٹا جاتا ہو قرآن کریم کو اس میں رکھا جاتا ہو، موبائل کے ڈھانچہ میں یہ باتیں نہیں ہے، علامہ شامیؒ نے وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''ويحرم به أي بالأكبر وبالأصغر مس مصحف أي ما فيه آية كدرهم وجدار. . .إلا بغلاف متجاف غيرمشرز'' (درمختار)، ''قوله غير مشرز محيط به وهو تفسير المتجافي قال في المغرب: مصحف مشرز اجزاءه مشدودبعضها إلى بعض الخ. فالمراد بالغلاف فما كان منفصلا كالخريطة وهي اليكس ونحوها؛ لأن المتصل بالمصحف منه حتى يدخل في بيعه بلا ذكر'' (شامی زکریا۱/۳۱۵)۔

''وقيل: المراد به الجلد المشرز وصححه في المحيط والكافي وصح الأول في الهدايه، وكثير من الكتب وزاد في السراج أن عليه الفتوى'' (فتاوى شامي زكريا۱/ ۳۱۵. وفي السراج وعليه الفتوى وفي البحر انه اقرب الى التعظيم'' شامي زكريا۱/ ۳۱۵. كذا في البحر الرائق ۱/ ۲۰۱).

البتہ موبائل اسکرین پر جب قرآن موجود ہوتو اس اسکرین پر ہاتھ لگانا چھونا ممنوع ہوگا اس کے علاوہ کے حصہ کو پکڑنا منع نہیں رہے گا اس موبائل کو مصحف جیسا تصور نہیں کیا جائے گا، مصحف میں کہیں بھی ہاتھ بغیر غلاف کے لگانا جائز نہیں ہے، چاہے خالی جگہ ہو یا وہاں پر آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہوں یہ حکم غیر مصحف کا نہیں ہے، غیر مصحف میں صرف آیت لکھی ہوئی جگہ کو بلا وضو ہاتھ لگانا ممنوع ہوگا اس کے علاوہ پر نہیں۔

''ولا يجوز مس المصحف المكتوب أوغيره بخلاف غيره، فإنه لايمنع إلامس المكتوب، كذا ذكر في السراج'' (البحر الرائق۱/ ۲۰۱)

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

''قوله اى ما فيه أي المراد مطلق ما كتب فيه قرآن مجازا لكن لايحرم في غير المصحف إلا بالمكتوب أي موضع الكتابة، كذا في باب الحيض من البحر'' (شامی زکریا۱/ ۳۱۵)۔

خلاصہ یہ کہ اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم موجود ہوتو صرف اس اسکرین کو بلا وضو چھونا ممنوع ہوگا، موبائل کے دیگر حصے کو چھونا پکڑنا منع نہیں رہے گا موبائل کے ڈھانچہ کو غلاف متجافی نہیں تصور کیا جائے گا۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت

مولانا عبدالباسط پالنپوری[1]

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

مصحف عثمانی کے رسم الخط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے، اور اس کے خلاف لکھنا اگرچہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علماء امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا، پھر غیر عربی دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ اس میں تو جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے طاء، حاء، ض، ظ، وغیرہ، یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے، ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے نہ شکل وصورت ہے، تو محالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے، اور یہ عمداً تحریف وتغیر ہے جو کہ حرام ہے۔

ا- مفتی شفیع صاحب اس قسم کے سوالات کے جوابات میں نقل فرماتے ہیں کہ پہلے ایک بات بطور مقدمہ سمجھ لی جاوے، پھر اس سے سب سوالات کا جواب آسان ہوگا، یہ وہ ہے کہ باجماع صحابہ وتابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے، اور خصوصاً کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحۃً تجویز نہیں کرسکتا۔

اور علامہ شرنبلالی نے ''النفحۃ القدسیہ فی احکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ'' میں مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے، کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے، اور اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے۔

''وأما كتابة القرآن بالفارسية فقد نص عليها في غير ما كتاب من كتب أئمتنا الحنفية المعتمدة منها ما قاله مؤلف الهداية الإمام الأجل شيخ مشائخ الإسلام حجة الله تعالى على الأنام برهان الدين أبوالحسن على بن أبي بكر المرغيناني الكبير رحمه الله تعالى في كتابه ''التجنيس والمزيد'' ما نص ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمر القرآن انتهى''۔

لیکن قرآن مجید کی فارسی زبان میں سو کسی ایک کتاب میں نہیں (بلکہ بہت سی کتب میں جو ہمارے ائمہ حنفیہ کے نزدیک مستند ہیں اس کی تصریح موجود ہے منجملہ ان کے وہ ہے جو صاحب ''ہدایہ'' نے اپنی کتاب ''تجنیس'' اور ''مزید'' میں فرمایا ہے، جس کی عبارت یہ ہے: اور فارسی میں کتاب قرآن سے باجماع منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ حفاظت قرآن میں خلل ڈالنے کا ذریعہ ہے کیونکہ ہم قرآن مجید کے الفاظ اور معنی دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں، کیونکہ الفاظ بھی ثبوت نبوت کی دلیل ہیں، اور الفاظ کے بدلنے سے (اگرچہ معنی نہ بدلیں) قرآن مجید کی حفاظت میں سستی پیدا ہوتی ہے۔

''ومنها ما في معراج الدراية أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع، وأنه يكون معتمده زنديقا... وزعم أن كتابته بالعجمة فيما سهولة للتعليم كذب مخالف للواقع والمشاهد فلا يلتفت لذلك على أنه لوسلم صدقه لم يكن مبيحا الإخراج ألفاظ القرآن عما كتب عليه، وأجمع عليه السلف والخلف''۔

(اور منجملہ ان کے وہ ہے جو معراج الدرایہ میں ہے کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کرنا چاہئے اور یہ کہ ایسا کرنے والا زندیق

---

[1] مدرسہ کنز مرغوب، پٹن، شمالی گجرات۔

(بے دین) ہے......اور یہ گمان کرنا کہ عجمی (زبان یا رسم الخط) میں تعلیم کی سہولت ہے تو یہ غلط اور مخالف واقع ہے اور خلاف مشاہدہ ہے، اس کی طرف التفات نہ کیا جاوے، علاوہ ازیں اگر اس کا سچ ہونا بھی تسلیم کرلیا جائے تو تب بھی قرآن کے الفاظ کا ان کی اجماعی صورت اور قدیم طرز کتابت سے نکالنا اس مصلحت کی وجہ سے جائز نہیں ہوسکتا)۔

علامہ ابن حجرؒ کی اس تقریر میں ان تمام شبہات کا بھی پورا جواب ہے جو رسم خط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں کہ اس میں عجمیوں کے لئے قرآن پڑھنے میں سہولت ہے، حافظ نے واضح کردیا کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے اور اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سہولت کی خاطر قرآن کی تبدیل وتغیر جائز نہیں ہوسکتی۔

اور حنابلہ کے مشہور فقیہ ابن قدامہ کی کتاب "المغنی" کے حواشی میں اس کو اور بھی واضح کردیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں آیا اور رسول اکرم ﷺ نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک واقعہ بھی اس کا مذکور نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کرکے بھیجا ہو یا عجمی رسم الخط میں لکھوایا ہو، آپ ﷺ کے مکاتیب جو ملوک عجم کسری وقیصر ومقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے جن میں سے بعض کے فوٹو بھی چھپ گئے ہیں اور آج تک محفوظ ہیں ان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ ان میں عجمی زبان اختیار کی گئی ہے نہ عجمی رسم خط اختیار کیا گیا ہے، حواشی مذکورہ کے چند جملے یہ ہیں:

"وهو إنما نزل باللسان العربي كماهو مصرح في الآيات المتعددة وإنما كان تبليغه والدعوة إلى الإسلام والإنذار به كما أنزل الله تعالى لم يترجم النبي ﷺ ولا أذن بترجمته ولم يفعل ذلك الصحابة ولاخلفاء المسلمين وملوكهم- ولو كتب النبي ﷺ كتبه إلى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذى علل به" (مغنی مع الشرح الکبیر:۱/ ۵۳۰)۔

(اور قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا جیسا کہ متعدد آیات قرآن میں صراحت ہے اور اسی عربی زبان میں قرآن کی تبلیغ اور دعوت وانداز عمل میں آیا نبی کریم ﷺ نے امت کو اس کا ترجمہ کرکے نہیں پہنچایا، اور نہ ترجمہ کرکے پہنچانے کی اجازت دی اور نہ حضرات صحابہ نے ایسا کیا اور نہ خلفائے اسلام اور سلاطین اسلام نے ایسا کیا، اور اگر نبی کریم ﷺ اپنے خطوط قیصر وکسری اور مقوقس وغیرہ کو ان ہی کی زبانوں میں لکھواتے تو یہ دلیل صحیح مانی جاسکتی تھی کہ عجم کو عجمی زبان میں پہنچانا زیادہ مفید ہے)۔

عبارات منقولہ بالا سے معلوم ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگر چہ وہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علمائے امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا، پھر غیر عربی بنگلہ وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، اس میں جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، لہذا صورت مسئولہ بالا جماع ناجائز ہے، بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے طاء، حاء، ض، ظ، ذ، ز وغیرہ یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے، ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے، نہ شکل وصورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے جو کہ بنگلہ میں مستعمل ہیں اور یہ عمداً تحریف وتغییر ہے جو کہ حرام ہے، البتہ اگر متن قرآن کریم تو عربی اصل رسم خط میں ہو، اور اس کا ترجمہ وتفسیر بنگلہ زبان میں تو شرعاً مضائقہ نہیں (فتاوی محمودیہ جلد ۳/ ۵۰۷ مطبوعہ ادارہ صدیق ڈابھیل)۔

اسی قسم کے فتوی کے بارے میں مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

چونکہ ہندی رسم الخط میں عربی کے کئی حروف نہیں ہیں، اور نہ ان کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی قطعی علامات ہیں اس لئے متن قرآن اور نظم فرقان کو ہندی رسم الخط میں شائع کرنا جائز نہیں، ہندی ترجمہ ہندی رسم الخط میں شائع کیا جاسکتا ہے، مگر نظم قرآن کو عربی رسم الخط میں ہی لکھا جائے (کفایت المفتی ۱/ ۱۲۸، ھکذا فی فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۵۸، مکتبہ احسان دیوبند)۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ صاحب فرماتے ہیں:

۱- اگر ترجمہ اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ بطور خود مطالعہ کیا کریں گے تو اس طور سے مطالعہ کرنے میں تجربہ سے سخت غلط فہمیوں کا احتمال ہے، اور اگر اس غرض سے ہے کہ کسی عالم سے پڑھ لیا کریں تو بہت مفید ہے۔

۲- مترجم اگر جامع اور متدین عالم ہیں تو مستقل ترجمہ کا مضائقہ نہیں، و نہ تراجم مقبولہ میں سے کسی بزرگ کے ترجمہ کی صرف زبان بدلنا کافی ہے، مستقل

ترجمہ مناسب نہیں۔

۳- متن میں قرآن مجید عربی خط میں رکھنا چاہئے، ہندی رسم الخط میں کوئی ضرورت نہیں، بے پڑھائے تو ہندی میں ہونے سے بھی کوئی نہیں پڑھ سکے گا، اور پڑھانے سے عربی حروف کا یاد کرلینا بھی کچھ مشکل نہیں، اور جو اصل مقصود ترجمہ کے متعلق ہے، یعنی ارتداد سے بچانا اور اسلام کی طرف لانا، اس میں عربی و ناگری رسم الخط داخل نہ ہونے میں برابر ہے، علاوہ اس کے ہندی یا انگریزی میں بعض حروف عربیہ کی شکل ہی نہیں، جیسے ق، ض، ط، ظ، ز مثلاً پس جب ان کو دوسری شکل میں لکھا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اصلی حروف پڑھے نہیں جائیں گے، تو اس میں عمداً تحریف کا جائز رکھنا ہے، وھو حرام۔

جواب مجمل از مولوی ظفر احمد صاحب مقیم خانقاہ امدادیہ

الجواب: ناگری ہو یا انگریزی، ہر دو خط؛ جس میں رسم خط مصحف عثمانی کی رعایت نہ ہو سکے، اس میں قرآن کا لکھنا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ کتابت مصحف میں رعایت رسم خط عثمانی واجب ہے، رہے وہ خط جن میں رعایت رسم خط مذکور ہو سکتی ہے، جیسے: فارسی یا اردو نستعلیق وامثالہ ---ان میں قرآن کا لکھنا مختلف فیہ بین القولین ہے، مگر اقرب اور راجح یہ ہے کہ ایسے خطوط میں بھی پورا مصحف لکھنا ناجائز ہے، ایک دو آیت اتفاقیہ لکھنے کا مضائقہ نہیں، الغرض الفاظ قرآنی کو صرف عربی خط ہی میں لکھنا چاہیے، ترجمہ وتفسیر کسی دوسری زبان میں اور دوسرے خط میں لکھنے کا مضائقہ نہیں، اس کے بعد الاتقان کی عبارت منقول ہے (امداد الفتاوی ۴/ ۴۳، ۴۴، ھکذا فی امداد الاحکام ۱/ ۲۳۲ تا ۲۴۰، ھکذا فی فتاوی ریاض العلوم ۲/ ۸۱، وھکذا فی فتاوی عثمانی /ص ۲۴۶)۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا:

قرآن شریف عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے، اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قراءت سبعہ وغیرہ شامل ہیں، اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہو سکتی، لہذا اس کا اتباع واجب ہے، اور تبدیلی ناجائز وحرام ہے، اس لئے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے (محمود الفتاوی ۴/ ۱۵۴)۔

نیز یہ بات واضح ہے کہ بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسمی عثمانی، تو صرف نابیناؤں کی مجبوری کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست نہ ہونا چاہئے، نیز نابینا حتی المقدور مکلف ہے، اس لئے نماز میں قراءت کرسکے اور جتنا یاد کرسکے استاد دوسروں سے مدد لینا چاہئے، اور بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن حکماً قرآن ہونے کی وجہ سے بلا وضو چھونا درست نہ ہوگا۔

۴- موبائل میں موجود قرآن مجید کو چھونے کا حکم:

اس طرح کے موبائل آن ہو اور قرآن کے حروف اسکرین پر نظر آتے ہو تو اس کا بلا وضو چھونا جائز نہیں ہوگا، ہاں فون بند ہو یا کھلا ہو، مگر قرآن کریم کے حروف اسکرین پر نہ ہو تو بلا وضو چھونے میں کوئی حرج نہیں، دلیل الجوہرۃ النیرۃ کی یہ عبارت ہے:

"لایجوز مس شئ من القرآن من لوح أو دراھم أو غیر ذلك إذا كانت آیة تامة".

یعنی کسی ایسی چیز کا چھونا جائز نہیں ہے، جس میں قرآن کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہو جیسے تختی یا درہم وغیرہ بشرطیکہ مکمل ایک آیت ہو (جدید فقہی مسائل ۱/ ۱۰۳)۔

ہاں اگر موبائل پر پلاسٹک یا چمڑے کا کور لگا ہو تو ہر حالت میں اس کا چھونا جائز ہے، اسکرین پر ہاتھ لگانا جائز نہیں اس لئے کہ اگر قرآن کی ایسی جلد ہو جو بآسانی اس سے علاحدہ کی جاسکتی ہو جیسا کہ آج کل بیگ نما جلدیں میں تو اس کو چھوا سکتا ہے اور یہ غلاف کے حکم میں ہے جن کے ساتھ فقہاء نے بلا وضوء بھی قرآن مجید کو چھونے کی اجازت دی ہے، کما فی الفتاوی الھندیہ:

"(منها) حرمة المصحف لایجوز لهما وللجنب والمحدث من المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به هو الصحيح، هٰكذا في الهداية، وعليه الفتوى، كذا في الجوهرة النيرة" (الفتاوی الھندیہ ۱/ ۳۸ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، وھکذا فی جدید فقھی مسائل ۱/ ۱۰۲)۔ ☆☆☆

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت

قاضی محمد ریاض ارمان القاسمی [1]

متن قرآن کے بغیر کسی بھی زبان میں تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کسی بھی حال اور کسی بھی عذر مزعومہ کے پائے جانے کی صورت میں درست نہیں ہے اور نہ اس کا خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا جائز ہے۔

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت اس لئے درست نہیں ہے کہ اس کی حرمت اجماع امت اور باتفاق ائمہ اربعہ ثابت ہے، نیز عدم جواز کی متعدد وجوہ ہیں جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) معانی قرآن کریم کی طرح اس کے الفاظ کی بھی حفاظت فرض وواجب ہے ''کما ھو المقرر عند کافة الناس و جماھیر العلماء''، اور موجودہ زمانے میں طبائع دین متین سے بے التفاتی اور سہل انگاری کا شکار ہیں، اگر اس قسم کے تراجم شائع ہو گئے تو الفاظ قرآن کی اہمیت قلوب سے قطعاً ختم ہو جائے گی اور اس کے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی، اور رفتہ رفتہ ترجمہ ہی کو کافی سمجھا جانے لگے گا، بالآخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ (العیاذ باللہ) تلاوت قرآن مجید کرنے والا کوئی شخص مشکل ہی سے ملے گا، اس لئے ایسے تراجم شائع کرنا ممنوع ہوگا۔

(۲) طبائع میں خودرائی وخودنمائی کا غلبہ ہے جس نے بھی الٹے سیدھے چار حرف پڑھ لئے ہیں مدعیٔ اجتہاد اور محقق بن رہا ہے، اجازت کی صورت میں نہ معلوم کن کن لوگوں کے تراجم شائع ہونگے اور ان میں بھی وہ کیا کیا گل کھلائیں گے اور افہام وتفہیم مستبعد اور احقاق حق قریب قریب محال ہو جائیگا تو اس طرح تحریف مراد خداوندی کا ایک ایسا دروازہ کھل جائے گا جس کا بند کرنا بس سے باہر ہوگا، اگر ترجمہ حامل للمتن ہو تو اس میں یہ مفسدہ نہیں، کیونکہ مشتری ترجمہ کے لئے قرآن مجید نہیں خریدتا، بلکہ محض تلاوت کے لئے خریدتا ہے، تلاوت کرنے سے اس کا مقصد حاصل رہے گا اور ترجمہ پڑھنے کی نوبت بہت کم آئے گی، اور غلط ترجمہ کا مفسدہ ایسے خریدار پر بہت کم اثر انداز ہوگا۔

(۳) ایسے تراجم پرانے ہو جانے کی صورت میں ردی میں اس طرح سے فروخت ہونگے، جیسا کہ عام اردو کی کتابیں کیونکہ عربی خط کا جو ایک بڑا بھاری فرق تھا اور ہر شخص دیکھتے ہی بادی النظر میں قرآن کریم اور اردو کی کتب میں فرق کر لیتا ہے، یہ فرق وامتیاز ختم ہو جائے گا تو اس طرح سے یہ ترجمہ قرآن کی بے حرمتی کا سبب بنے گا اور یہ ظاہر ہے کہ سبب معصیت بھی معصیت ہوتا ہے۔

(۴) بہت سے لوگ اسے بلا وضو چھوئیں گے، حالانکہ احتراما اس کا بلا وضو چھونا درست نہیں تو لاعلمی کی بناء پر اس گناہ میں مبتلاء ہوں گے اس طرح سے بھی اس کا سبب معصیت ہونا ظاہر ہے۔

(۵) حضرات فقہاء کرامؒ نے ایسے تراجم ومصاحف کی صراحۃ ممانعت فرمائی ہے اور ایسی حرکت کو قانون اسلام کی خلاف ورزی قرار دیا ہے ''کما فی الشامیة عن الفتح عن الکافی: إن اعتاد القرأة بالفارسیة أو أراد أن یکتب مصحفا بھا یمنع'' (رد المحتار ۱؍ ص ۴۵۴)

واضح رہے کہ ایسے تراجم کی اشاعت نیچریت اور فتنہ کمالی کا شاخسانہ ہے مصطفی کمال نے یہودیت سے متاثر ہو کر دین کے بارے میں کیا کیا گل کھلائے تھے وہ کسی اہل بصیرت سے مخفی نہیں، افسوس ہے کہ اسلام کے یہ نادان دوست اپنی اس حرکت سے اسلام کی بنظیر خصوصیت پر ہاتھ

---

[1] قاضی شریعت دارالقضاء ہریانہ (آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)۔

صاف کرنا چاہتے ہیں کہ جیسے دیگر مذاہب اپنی الہامی کتب کے الفاظ سے محروم ہو گئے، اسی طرح اسلام کو بھی اس سے تہی دست کر دیا جائے۔

(۲) ایسے تراجم کی طباعت واشاعت وغیرہ جائز نہیں، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے۔

قال اللّٰہ تعالی: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۃ المائدۃ:۲)(خیر الفتاوی ج/ اص/ ۲۱۷/ ۲۱۸ باب ما یتعلق بالقرآن)۔

اسی طرح ممانعت کی چند وجہیں جو اسی طرح کے سوال کے جواب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ذکر کیا ہے اس کو نقل کیا جاتا ہے:

نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے

''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرۃ ص/ ۵۵۹)

میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو کفار میں شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا، دوسری حدیث:

''لترکبن سنن من کان قبلکم'' (ترمذی شریف جلد ۲/ ص/ ۴۱ ابواب الفتن، باب لترکبن سنن من کان قبلکم)

میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل للمتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے امر میں جو عرفاً وعادتاً ان کے خصائل میں سے ہے سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے، پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت:

"یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطن" (سورۃ البقرۃ:۲۰۸)

نازل ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ''تبتل'' اور ''ترھیب'' کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے،

''مشکوۃ کتاب النکاح وکتاب الاعتصام'' ''لا تشدوا علی أنفسکم (مشکوۃ شریف، باب الاعتصام ص/ ۳۱)

اور اس میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ذات الانواط'' کی درخواست پر کیسا زجر فرمایا تھا یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ اس میں مفاسد مآلیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں، مثلاً خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام ہوتا ہے، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے محققان دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنھما نے بعض قراء کی شہادت کے وقت، بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا، پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے، اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا جیسا حدیث میں ہے:

''امتھوکون أنتم کما تھوکت الیھود والنصاری'' (مشکوۃ شریف، باب الاعتصام ص/ ۳۰)

اور مثلاً یہ مفسدہ ہوگا کہ حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضوء مس کرنا جائز نہ ہوگا، کما فی العالمگیریۃ ''ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیۃ یکرہ لھم مسہ عند ابی حنیفۃ، وکذا عندھما علی الصحیح'' (ھکذا فی الخلاصۃ ۱۲/ ۲۴)۔

اسی طرح علامہ حسن شرنبلالی: ''صاحب نور الایضاح'' نے ایک رسالہ "النفحۃ القدسیۃ فی احکام قرآ ۃ القرآ ن وکتابتہ بالفارسیۃ" لکھی جس میں مذاہب ائمہ اربعہ سے اس بات کی حرمت اور ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن کریم کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی لکھا جاوے۔

علامہ حسن شرنبلالی: ''صاحب نور الایضاح'' رقمطراز ہیں: ''وأما کتابۃ القرآن بالفارسیۃ فقد نص علیھا فی غیر ما کتاب کتب ائمتنا الحنفیۃ المعتمدۃ منھا ما قالہ مؤلف الھدایۃ الإمام الأجل شیخ مشائخ الاسلام حجۃ اللہ تعالیٰ علی الانام برھان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی الکبیر رحمہ اللہ تعالیٰ فی کتابہ التجنیس والمزید ما نص

ویمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالإجماع؛ لأنه یؤدی للاخلال بحفظ القرآن لأنا امرنا بحفظ النظم والمعنی، فإنه دلالة علی النبوة؛ ولأنه ربما یؤدی إلی التهاون بأمرالقرآن انتهی‘‘۔

’’ ومنها ما فی معراج الدرایة: أنه یمنع من کتابة المصحف بالفارسیة أشد المنع، وأنه یکون معتمده زندیقاوسنذکره تمامه‘‘

امام شافعیؒ کے مذہب کی روایتیں: ’’أما عند الائمة الشافعیة فقد قدمنا عن الامام الزرکشی رحمه الله احتمال الجواز، وأن الأقرب المنع من کتابة القرآن بالفارسیة کما تحرم قراء ته بغیر لسان العرب‘‘۔

امام مالکؒ کے مذہب کی روایتیں:

’’فلما نقل العلامة ابن حجر فی فتاواه أن الإمام مالکا سئل هل یکتب المصحف علی ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا علی الکتبة الأولی أی کتب الإمام وهو المصحف العثمانی، قال بعض أئمة القراء ة: نسبته إلی الإمام مالك؛ لأنه المسئول عن المسئلة، وإلا فهو مذهب الأئمة الأربعة و بمثله قال أبوعمرو‘‘۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کی روایتیں

’’وأما عند الأئمة الحنابلة فقد قدمنا عن الدرایة ما نصه و عندالشافعی تفسد الصلوٰة بالقرأة بالفارسیة، و به قال مالك و أحمد عند العجز وعدمه انتهیٰ (النفحة القدسیة ص۳۵)۔

’’و فی حاشیة المغنی لابن قدامة الحنبلی: ما نصه استمر الإجماع علی قراء ة جمیع المسلمین القرآن فی الصلوٰة و غیرها بالعربیة کا ذکارها و سائر الاذکار والأدعیة الماثورة علی کثرة الأعاجم حتی قام بعض المرتدین من أعاجم هذا العصر یدعون إلی ترجمة القرآن و غیره من الأذکار وبطریق التعبد، وإنما مرادهم التوسل بذالك إلی تسهیل الردة علی قومهم‘‘ (مغنی مع الشرح الکبیر ۱۲/ ص۵۳۰)، ان تمام عبارتوں سے بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کا عدم جواز بالاجماع اور ائمہ اربعہ کے مذاہب سے پوری طرح ثابت ہے۔

عدم جواز سے متعلق فقہاء کی مزید صراحت:

’’أجمع المسلمون قاطبة علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة علیه وهم زهاء اثنی عشر الفا والإجماع حجة حسبما تقرر فی أصول الفقه، ثم ذکر معزیا للمحکم بسنده إلی عبدالله بن الحکم قال، قال أشهب: سئل مالك فقیل له: أرئیت من یکتب مصحفا الیوم أتری أن یکتب علی ما أحدثه الناس من الهجاء الیوم؟ فقال: لا أری ذالك، ولکن یکتب علی الکتبة الأولی۔ قال العلامة السخاوی: والذی ذهب إلیه مالك هو الحق، وقال الجعبری: وهذا مذهب الأئمة الأربعة وخص مالکا؛ لأنه صاحب فتیاه ومستندهم ومستند الخلفاء الأربعة رضوان الله تعالیٰ علیهم‘‘۔

’’وقال البیهقی: من کتب مصحفا، فینبغی أن یحافظ علی الهجاء الذی کتبوا به تلك المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئا، فإنهم کانوا (ای الصحابة) أکثر علما واصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة. فلا ینبغی أن نظن بأنفسنا استدراکا علیهم. کما فی الاتقان لشیخ مشائخنا الجلال السیوطی، ثم قال العلامة الحداد: فثبت بما ذکر من النقول الصحیحة والنصوص الصریحة أنه قد انعقد إجماع سائر الأمة من الصحابة و غیرهم علی تلك الرسوم وأنه لایجوز بحال من الأحوال العدول عن کتابة القرآن الکریم ولا نشره بصورة تخالف رسم المصاحف العثمانیة. والله الموفق والمعین انتهی‘‘ (رساله النصوص الجلیة ص/ ۲۵. مزید عبارت کے لئے دیکھئے: حافظ ابن کثیر، فضائل قرآن/ ص ۵ مفتی محمد شفیع صاحب، جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۶ تا ۱۱۰)۔

اور جب اشاعت ناجائز ہے تو اس کا خریدنا، تقسیم کرنا ہدیہ کرنا بھی ناجائز ہوگا، اس لیے کہ اس میں تعاون علی الاثم ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ

کے فتاوی سے ظاہر ہو چکا، حضرت اقدس کی تحریر ملاحظہ ہو"۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (القرآن) اور فقہاء نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جائے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہو گی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ: ۱۱۲ تا ۱۱۵)۔

عدم جواز کے باوجود اگر بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کر دے تو اسے بلا وضو چھونے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لیے کہ وہ قرآن کے حکم میں ہوگا جیسا کہ خلاصہ نامی کتاب میں ہے "ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح هكذا في الخلاصة" (جلد ۱/ ۲۴، بحوالہ جواہر الفقہ جلد ۱/ ۱۱۳)۔

رہی بات بغیر متن کے ترجمہ چھاپنے میں صرفہ کا کم آنا، جو لوگ متن قرآن کو نہیں پڑھ سکتے، انہیں متن والا ترجمہ قرآن دینے سے کیا فائدہ؟ ترجمہ بہت سے غیر مسلموں کو بھی دیا جاتا ہے، انہیں متن پر مشتمل قرآن دینے میں قرآن کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے اور اگر انہیں متن کے بغیر صرف ترجمہ قرآن دیا جائے، تاکہ ان تک قرآن کا پیغام پہنچ بھی جائے اور قرآن کی بے حرمتی کا اندیشہ بھی نہ رہے، مذکورہ بالا تینوں باتیں صرفہ کا کم آنا، متن کے پڑھنے سے جاہل ہونا اور غیر مسلم کو دینے میں بے ادبی قرآن یہ ساری چیزیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لے کر اب تک رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی، لیکن کبھی بھی کسی نے ان وجہوں کو قرآن کی حفاظت کے مقابلے میں اور اجماع سلف وخلف کے بعد قابل اعتناء نہیں سمجھا ہے جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ کا فتوی نقل کیا گیا۔

"علی أنه لو سلم صدقه لم يكن مبيحا لإخراج ألفاظ القرآن عما كتب عليه وأجمع عليه السلف والخلف"۔

اسی طرح ماقبل میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے تعلیمی سہولت کے لیے جب غیر عربی میں قرآن کا ترجمہ لکھنے کی اجازت مانگی تو امام ابو بکر محمد بن الفضل نے مستفتی کو اپنے ایک خادم سے قتل کروا دیا اور بادشاہ نے قتل کا قصاص لینے کے بجائے انعام واکرام سے نوازا صرف اس وجہ سے کہ قرآن کریم میں تحریف کا دروازہ نہ کھل جائے، لہذا ان وجہوں اور دلیلوں کی وجہ سے بغیر متن کے ترجمہ قرآن کریم کی اشاعت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

غیر عربی رسم الخط (ہندی، انگریزی، وغیرہ) میں قرآن کا چھاپنا درست نہیں ہے اس سلسلہ میں جواہر الفقہ سے ایک جواب نقل کیا جاتا ہے جو اس سلسلہ میں کافی وشافی ہے" اجماع صحابہ وتابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصا کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحۃ تجویز نہیں کر سکتا۔

خصوصا ایسے رسم خط جن میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا پڑے، جیسے انگریزی رسم خط ہے کہ اس میں حرکات (زبر زیر، پیش) کو بھی بشکل حروف لکھا جاتا ہے، ایسا لکھنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعا تحریف قرآن ہے۔

عربی رسم خط میں زیر زبر وغیرہ حرکات اگر چہ کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہوتی ہیں، مگر اس کے باوجود علمائے سلف کو اس میں بھی اختلاف کی نوبت پیش آئی کہ قرآن کی عبارت پر یہ حرکات لکھنا جائز ہے یا نہیں، بعض حضرات نے اس کو بھی مکروہ سمجھا، بعض نے صرف مواضع مشکلہ میں بضرورت اجازت دی علامہ دانی جنہوں نے رسم خط قرآن پر مستقل کتاب تصنیف کی ہے، اس میں فیصلہ کرتے ہیں کہ اعراب (حرکات، زیر، زبر وغیرہ) اور نقطے سرخی سے لکھے جاویں، تاکہ قرآن کی اصل عبارت سے ممتاز رہیں۔

علامہ نووی اور جمہور فقہاء نے اس کی مطلقا اجازت دی، کیونکہ عربی رسم خط میں اعراب مستقل جداگانہ چیز ہے اس کا اختلاط کلمات وحروف کے ساتھ نہیں ہو سکتا (کذا ذکرہ السیوطی فی الاتقان ج / ۲ ص / ۱۷۱)۔

الغرض عربی رسم خط میں حرکات اور نقطوں کا کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہونا ثابت ہونے کے باوجود سلف صالحین کو ان کی کتابت فی المصاحف میں اختلاف پیش آیا تو جس رسم خط (مثلاً انگریزی) میں یہ حرکات خود کلمات کے درمیان بشکل حروف لکھی جاتی ہوں اس کی اجازت کیسے متصور ہوسکتی ہے۔

علاوہ ازیں عربی زبان میں چند حروف ایسے ہیں کہ ہر حرف سے لفظ کے معنی بالکل جدا ہو جاتے ہیں، لیکن بہت سی عجمی زبانوں میں ان حروف میں کوئی فرق نہیں سب کو ایک ہی آواز سے پڑھا جاتا ہے ایک ہی شکل سے لکھا جاتا ہے، مثلاً (س، ث، ص) اور (ذ، ز، ظ) وغیرہ تو جب قرآن کو اس رسم خط میں لکھا جائے گا تو ان حروف کا کوئی امتیاز نہ رہیگا جو سخت ترین تحریف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگر چہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں، مثلاً اوائل سورت میں "بسم اللہ" کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے اور "اقرأ باسم ربك" میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگر چہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں، مگر باجماع امت اسی کی نقل واتباع کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟۔

مضمون مذکورہ کے شواہد اصول تفسیر اور تفسیر کی کتب میں نیز کتب فقہ میں بیشمار ہیں ان میں سے چند بقدر ضرورت اس جگہ لکھے جاتے ہیں۔

علامہ سیوطی نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں رسم خط قرآنی اور کتابت قرآنی کے آداب پر مستقل فصل بعنوان (النوع السادس والسبعون) رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے:

"وقال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولامخالف له من علماء الأمة۔

اسکے بعد لکھا ہے:

"وقال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أوألف أو غير ذالك" (اتقان ص/۱۶۷ج/۲)

"وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف ولايخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئافانهم كانوا أكثر علما واصدق قلباولسانا وأعظم امانة فلاينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم"

اس کے چند صفحہ بعد تحریر فرمایا ہے:

"وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء قال: ويحتمل الجواز؛ لأنه قد يحسنه من يقرء بالعربية، والأقرب المنع كما تحرم قرائته بغير لسان العرب ولقولهم القلم أحد اللسانين والعرب لاتعرف قلماغير العربي، وقال تعالى: "بلسان عربي مبين" (اتقان ص/۱۷۱ج/ ۲. مزید تفصیل اور عربی عبارتوں کے لئے دیکھئے: مغنی مع الشرح الکبیرا/ ۸۳۰، نیز ا/ ۵۳۰، جواہر الفقہ ا/ ۸۵)۔

" ومنها ما في معراج الدراية: أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية اشد المنع... ويحرم أيضا كتابته بقلم غير العربي انتهى"۔

" ثم قال الحافظ ابن حجر: وفي كتابة القران العظيم بالعجمي تصرف في اللفظ المعجز الذي حصل التحدي به بما لم يرو (الى قوله)، لأن الألفاظ العجمية فيها تقديم المضاف إليه على المضاف ونحو ذالك مما يخل بالنظم ويشوش الفهم"۔

حافظ الدنیا شیخ الاسلام علامہ ابن حجرؒ کی اس تقریر میں ان تمام شبہات کا بھی پورا پورا جواب ہے جو رسم خط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں کہ اس میں عجمیوں کے لئے قرآن پڑھنے میں سہولت ہے حافظ نے واضح کر دیا کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے اور اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو

اس سہولت کی خاطر قرآن کی تبدیل وتغیر جائز نہیں ہوسکتی۔

اور حنابلہ کے مشہور فقیہ وامام ابن قدامہ کی کتاب مغنی کے حواشی میں اس کو اور بھی زیادہ واضح کردیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں آیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک واقعہ بھی اس کا مذکور نہیں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کرکے بھیجا ہو، یا عجمی رسم خط میں لکھوایا ہو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب جو ملوک عجم کسریٰ وقیصر ومقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے جن میں سے بعض کے فوٹو بھی چھپ گئے ہیں اور آج تک محفوظ ہیں ان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ ان میں عجمی زبان اختیار کی گئی ہے نہ عجمی رسم خط اختیار کیا گیا ہے (حواشی مذکورہ کے چند جملے یہ ہیں)۔

غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی کتابت واشاعت کا عدم جواز مذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہو چکا ہے، اب رہ گئی بات کہ عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھنا اور دونوں کو ایک ساتھ شائع کرنا جائز ہوگا یا نہیں تو اس میں بھی عدم جواز کا پہلو ہی غالب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تحریف کا دروازہ کھولنا ہوگا، اس لیے کہ لوگ دھیرے دھیرے قرآن شریف سے بے تعلق ہو جائیں گے، نیز جس زبان میں ہم عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے قرآن کی کتابت کی اجازت دیں گے اس میں مذکورہ خرابی لازم آئے گی جس کا فقہاء نے تذکرہ کیا ہے "فتاوی محمودیہ" میں ہے "عبارات منقولہ بالا سے معلوم ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگر چہ وہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علمائے امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا، پھر غیر عربی بنگلہ وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، اس میں جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، لہذا صورت مسئولہ بالا جماع ناجائز ہے، بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے طاء، حا، ض، ظ، ذ، ز وغیرہ یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے، ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے، نہ شکل وصورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے جو کہ بنگلہ میں مستعمل ہیں اور یہ عمدا تحریف وتغیر ہے جو کہ حرام ہے (فتاوی محمودیہ جلد ۳/ ۵۰۸) چونکہ جس زبان میں ہم عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے قرآن کی کتابت کریں گے اس میں بھی حروف کے نہ ہونے اور اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کرنے کی وجہ سے استعلاء، اطباق، اور استطالت وغیرہ کو ضائع کردیں گے نیز عربی میں اعراب کو لفظوں سے جدا لکھا جاتا ہے، لیکن ہندی انگریزی وغیرہ میں لفظوں کے اندر لکھا جاتا ہے اس سے بھی تحریف کی شکل پیدا ہوگی، لہذا مذکورہ بالا وجہوں کی وجہ سے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے قرآن کی کتابت کرنا اور اشاعت کرنا دونوں ناجائز ہوگا۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت درست نہیں ہے، اس لیے کہ بریل کوڈ جو نسبتا موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نابینا افراد عموما انگلیوں کے پوروں کے لمس سے اسے پڑھتے ہیں، بریل کوڈ کی اس وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نہ تو رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی جس رسم عثمانی کی کسی بھی صورت میں مخالفت کی اجازت نہیں دی گئی ہے خواہ وہ رسم الخط عربی ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ مفتی شفیع صاحبؒ اپنے فتوی میں تحریر فرماتے ہیں "خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگر چہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں مثلا اوائل سورت میں "بسم اللہ" کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے اور "اقرأ باسم ربك" (سورۃ العلق: ۱) میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگر چہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں، مگر باجماع امت اسی کی نقل واتباع کرنا ضروری ہے اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے" جب کسی بھی طرح رسم عثمانی کی مخالفت جائز نہیں ہے تو پھر بریل کوڈ جو رسم الخط ہی نہیں ہے اس میں قرآن کی اشاعت کی کیسے اجازت دی جاسکتی ہے، لہذا بریل کوڈ میں قرآن کی اشاعت ناجائز ہوگی۔

بریل کوڈ میں نابیناؤں کے لیے سہولت، اور ان کا بیناؤں کا ہر قدم پر محتاج نہ ہونا، حفظ قرآن میں آسانی، بھولنے کی صورت میں مراجعت، براہ راست قرآن کا مطالعہ، اور ان کی دوسری مجبوری، اور ان کے ساتھ جذبہ ہمدردی یہ ساری چیزیں قابل تحسین ہیں، لیکن ان سب کے باوجود قرآن کی حفاظت زیادہ اہم ہے اور نابیناؤں کی مجبوری تو اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ نابینا حفاظ نے قرآن کی خدمت میں جس طرح شہرت وعزت

حاصل کی ہے وہ بیناؤں سے نہیں بن سکا، اور آسانی کی بات تو سہل انگاری ہی امت محمدیہ کا وہ زخم ہے جس کے رساؤ نے امت کو اس حد تک پہنچا دیا۔

اگر بریل کوڈ میں قرآن مجید چھاپ دیا گیا تو وہ حکماً قرآن ہوگا اس کو چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہوگا، جیسا کہ خلاصہ نامی کتاب میں ہے:

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح'' (هكذا في الخلاصة جلد ۱/ ۲۴، بحواله جواہر الفقه جلد ۱/ ۱۱۳)

چھاپنا درست نہیں، لیکن ایسا کر لیا گیا تو اس کا ادب واحترام ہر حال میں قرآن جیسا ہی ہوگا اس کی بے ادبی جائز نہ ہوگی۔

''ثم كتب عليه شيخ الأئمة الشافعية بعصرنا و مصرنا هو العلامة شمس الدين محمد شوبري الشافعي حفظه الله تعالى ما صورته أنه إذا كتب بغير العربية هل يحرم مسه و حمله أولا؟ الأظهر في الجواب نعم، إذ لا يخرج بذالك عن كونه قرآنا، وإلا لم تحرم كتابته فليراجع انتهى''۔

خط کشیدہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ چھاپنا جائز نہیں ہے، لیکن چھاپنے سے وہ قرآن ہونے سے نہیں نکل جائے گا، بلکہ حکماً قرآن ہی رہے گا اور اس کا قرآن جیسا ہی ادب کرنا لازم ہوگا۔

موبائل پر قرآن مجید:

موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کے حروف دکھائی دے رہے ہوں تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے

''يمنع دخول مسجد (الى قوله) مسه أي القرآن، ولو في لوح أو درهم أو حائط

(شامی زکریا ۱/ ۴۸۸، بحوالہ مسائل موبائل ص/ ۳۴، از حضرت مولانا مفتی سلمان صاحب منصورپوری مدظلہ العالی)

عبارت کے ظاہر ہونے کی صورت میں موبائل کو غلاف تصور نہیں کیا جائے گا، البتہ جب وہ پروگرام بند ہو یا موبائل بند ہو تو پھر موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوگی

''فلو نقش اسمه تعالى أو اسم نبيه ﷺ استحب أن يجعل الفص في كمه إذا دخل الخلاء (شامي زكريا ۹/ ۵۱۹) بحوالہ مسائل موبائل ص/ ۳۴، از حضرت مولانا مفتی سلمان صاحب منصورپوری مدظلہ العالی)۔



قرآن کریم سے متعلق بعض مسائل کی تحقیق

مولانا روح الامین (جھابوا، ایم۔ پی۔) [1]

بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت:

متن کے بغیر تنہا قرآن مجید کا ترجمہ شائع کرنے میں دو محظور کا ارتکاب لازم آتا ہے:

ا- اہل کتاب کے ساتھ مشابہت:

تشبہ باہل الکتاب کی مذمت بلکہ ممانعت نصوص صحیحہ وصریحہ سے ثابت ہے، قرآن مجید میں نصاری کے بارے میں وارد ہے:

"ولا تتبعوا أهواء قوم قد ضلوا من قبل وأضلوا كثيرا وضلوا عن سواء السبيل" (سورۂ مائدہ: ۷۷)

صحیحین میں ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے: ''لتتبعن سنن من كان قبلكم شبرا بشبر وذراعا بذراع حتى لو سلكوا جحر ضب لسلكتموه، قالوا: يا رسول الله! اليهود والنصارى؟ قال: فمن؟'' (بخاری: ۳۴۵۶، مسلم ۲۶۶۹)۔

ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غيروا الشيب و لا تشبهوا باليهود'' (ترمذی: ۱۷۵۳)

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے: ''خالفوا المشركين احفوا الشارب واعفوا اللحي'' (مسلم: ۲۵۹)۔

صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے:

''فصل ما بين صيامنا وصيام أهل الكتاب أكلة السحر'' (مسلم: ۱۰۹۶)

عمرو بن شعیبؓ سے ترمذی کی روایت ہے: ''ليس منا من تشبه بغيرنا لا تشبهوا باليهود و لا بالنصارى فإن تسليم اليهود الإشارة بالأصابع وتسليم النصارى الإشارة بالأكف'' (ترمذی: ۲۶۹۵)۔

الغرض عبادات، معاملات، معاشرت اور عادات واطوار میں غیروں کے ساتھ مشابہت کی ممانعت اور ان کی مخالفت کے باب میں متعدد روایات موجود ہیں، اسی لیے اس باب میں ائمۂ اربعہ کا اجماع ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن تیمیہ کی کتاب: اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ اصحاب الجحیم)۔

یہ امر تقریباً یقینی ہے کہ کتاب الٰہی کا تنہا ترجمہ جداگانہ شائع کرنا عرفاً وعادۃً اہل کتاب کے خصائص میں سے ہے، کیونکہ امت مسلمہ نے ہمیشہ اس سے اجتناب کیا ہے، بلکہ اس طرح کی پیش قدمی پر بالغ نظر علماء دین نے نکیر بھی فرمائی، لہذا یہ اقدام اور اس کی اجازت دینی امور میں غیروں کی مشابہت کے ساتھ ساتھ امت کے تعامل کے بھی خلاف ہے۔

تنہا ترجمۂ قرآن مجید کی اشاعت میں مزید مندرجۂ ذیل مفاسد شدیدہ کا اندیشہ ہے۔

(**الف**) اس طریقہ کی ترویج پر قوی احتمال ہے کہ اصل قرآن مجید توریت وانجیل کے مثل ضائع ہوجائے، جبکہ اصل قرآن مجید کی حفاظت فرض ہے، اور اس کا اخلال حرام ہے، اسی بناء پر حضرات شیخینؓ نے جمع قرآن کے اہتمام کو ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ وہ متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کے انقطاع کا احتمال بعید تھا، لہذا جیسا کہ اس وقت عدم کتابت میں ضیاع کا احتمال تھا، اور اس احتمال کی بناء پر جمع کا اہتمام فرمایا، اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں بھی ضیاع کا احتمال ہے، اس لیے یہ احتمال اجازت سے مانع ہوگا۔

---

[1] خادم تدریس جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، بھروچ، گجرات۔

(ب) قرآن مجید کی عظمت اور اس کے ساتھ احترام وتقدس کا معاملہ اس کے حامل متن ہونے ہی کی وجہ سے ہے، مذکورہ صورت میں اس طرح وہ قابل عظمت واحترام نہ سمجھا جائے گا اور اس کے ساتھ عام کتب کا سا معاملہ کیا جائے گا، حالانکہ یہ بھی حکمًا قرآن ہونے کی وجہ سے عام دینی کتب سے زیادہ لائق عظمت واحترام ہے، ''البحر الرائق'' میں ہے:

''ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة لحرم علی الجنب والحائض مسه بالإجماع وهو الصحیح'' (البحر الرائق ۱/ ۲۱۲)

(ج) مسلمانوں میں آج بھی تلاوت وقرأت قرآن کا اہتمام ہے، اگر ترجمہ سے مدد لیتے ہیں تو اصل قرآن بھی ہاتھ میں ہوتا ہے، اور اس طرح عقیدت وعظمت کے ساتھ کچھ پڑھنے کی بھی توفیق ہوجاتی ہے، مذکورہ صورت میں اندیشہ ہے کہ قرآن سے بالکل ہی بے تعلق واجنبی ہوجائیں اور اس آیت کا مصداق بن جائیں، "نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب کتب الله وراء ظهورهم کأنهم لا یعلمون" (سورۂ بقرہ: ۱۰۱)۔

(د) موجودہ صورت میں اگر تراجم میں باہم اختلاف ہے، تو اصل قرآن مجید (جو تمام نسخوں میں متحد ہیں) سامنے ہونے کی وجہ سے یہ خیال نہیں آتا کہ کلام اللہ میں اختلاف ہے، جبکہ مذکورہ صورت کے شیوع کی صورت میں یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اصل میں اختلاف ہے، جس سے اعتقاد میں خلل واقع ہوگا اور باہمی نزاع کا بھی سبب بنے گا، اور اصل کتاب کی وہ مذموم صورت پیش آئے گی، جس کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

"وما اختلف فیه إلا الذین أوتوه من بعد ما جاءتهم البینٰت بغیا بینهم" (سورۂ بقرہ: ۲۱۲)۔

(ھ) موجودہ صورت میں ترجمہ کو مستقل کتاب خیال نہیں کیا جاتا، بلکہ قرآن کا تابع سمجھا جاتا ہے، اگر کہیں مطلب سمجھ میں نہیں آتا یا غلط سمجھ لیا جاتا ہے یا فصاحت وبلاغت کے معیار سے ادنیٰ پایا جاتا ہے تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھا جاتا ہے، جس کے متعلق اصل صاحب کلام ہونے کا اعتقاد نہیں ہوتا، جبکہ مذکورہ صورت میں یہ عملی یا اعتقادی خرابی لازم آسکتی ہے۔

(و) اصل قرآن مجید سامنے ہونے کی وجہ سے مترجم کے لیے تحریف معنوی مشکل ہے، کیونکہ ہر طالب علم کے لیے اس پر گرفت ممکن ہے، جب کہ مذکورہ صورت میں اس طرح کی تحریف کا قوی اندیشہ ہے، کیونکہ ہر مطالعہ کرنے والا حافظ نہیں اور نہ ہر وقت اصل کی طرف مراجعت آسان ہوتی ہے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر، بہت سے مفاسد پیش آسکتے ہیں، اس لیے متن کے بغیر تنہا ترجمۂ قرآن کو شائع کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اور اس طرح اس کی خرید وفروخت کرنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ ناجائز امر میں اعانت ہے (مستفاد من امداد الفتاوی ۴/ ۴۰)۔

اشکال: مذکورہ ممانعت سدّ ذریعہ کے قبیل سے ہے فی نفسہ نہیں، کیونکہ فی نفسہ حرمت پر کوئی دلیل نہیں اور جو ممانعت سدّ ذریعہ کی بناء پر ہو وہ مصالح کی بناء پر مرتفع ہوجاتی ہے، جیسے اجنبیہ کو دیکھنے کی ممانعت فساد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، لیکن علاج، خطبہ وغیرہ مصالح کی خاطر اجازت ہے، لہٰذا سوال میں درج مصالح کی بناء پر اجازت ہونی چاہیے؟

جواب: سدّ ذریعہ سے ناشی ممانعت اس وقت مرتفع ہوتی ہے، جبکہ اس کے مدمقابل مصلحت راجحہ موجود ہو، چنانچہ اصولیین نے یہ قاعدہ بھی ذکر کیا ہے:

''النهي إذا کان لسدّ الذریعة أبیح للمصلحة الراجحة'' یعنی مفسدہ کے مقابلہ میں مصلحت غالب ہو تو ممانعت مرتفع ہوجائے گی (القواعد الفقهیة وتطبیقاتها في المذاهب الاربعة للدکتور وهبه الزحیلی رحمه الله)۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ مفاسد کے مقابلہ میں یہ چند مصالح (مصارف کا کم آنا، غیر مسلمین کی طرف سے بے حرمتی کا اندیشہ نہ ہونا) شرعًا کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں، کیونکہ تعلیم وتبلیغ کے لیے طالب صادق کو قرآن مجید دینا فقہاء کے نزدیک جائز ہے،

''والحاصل مما سبق إن وقوع المصحف بأیدي الکفار إنما یمنع منه إذا خیف منهم إهانته، أما إذا لم یکن مثل هذا الخوف، فلا بأس بذلك لا سیما لتعلیم القرآن وتبلیغه'' (تکمله فتح الملهم باب النهی أن یسافر بالمصحف ۳/ ۳۸۶)۔

لہٰذا اس موقع پر تو "درء المفاسد أولی من جلب المصالح"، اصول کے پیش نظر عدم جواز کا قول کرنا ہوگا۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن کریم اہل اسلام کے لیے اپنے عقائد، عبادات اور معاملات میں ایک مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، اور اللہ تعالی نے اس کی تلاوت، اس کی آیات میں تدبّر، اس سے احکام مستنبط کرنے کا حکم دیا اور اس کے تعلم وتعلیم اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی، لیکن یہ سب کچھ اہل عرب کے لیے یا عربی زبان سے واقف شخص کے لیے تو آسان ہے، البتہ جن کی زبان عربی نہیں اور وہ عربیت سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ان کے لیے دشوار ہے، اس لیے متن قرآن ان کی زبان (ہندی، انگریزی وغیرہ) اور ان کے رسم الخط میں لکھ دیا جائے، تاکہ تلاوت وقرأت ان کے لیے آسان ہو جائے اور یہ ان کے حق میں قرآن مجید کے فہم اور اس کے معانی کی معرفت میں پیش خیمہ ثابت ہو تو کیا حرج ہے؟ جب کہ تسہیل اور رفع حرج مقاصد شریعت میں سے ہیں، اور یہ کوئی بدعت بھی نہیں، بلکہ اس کے نظائر موجود ہیں، چنانچہ ابوبکر صدیق ؓ نے قرآن مجید کو یکجا کروایا، حضرت عثمان غنیؓ نے حروف سبعہ میں سے ایک حرف پر مرتب کروایا، بنوامیہ کے دور میں ان کے کلمات کو منقوط ومشکل کیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تسہیل اور حفاظت ہی کی غرض سے کیا گیا۔

نیز قرآن مجید عربی یا غیر عربی میں لکھا ہوا نازل نہیں ہوا کہ ان حروف کا التزام ضروری ہو، بلکہ وہ تو ایک وحی متلو ہے، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کاتبین سے املاء کروایا، جبکہ خود آپ امّی تھے، اور کاتبین نے اپنے درمیان معہود طریقہ پر اس کی کتابت کی، چنانچہ اس باب میں کوئی نص صحیح موجود نہیں کہ انہیں کسی خاص طریقۂ کتابت کا مکلّف بنایا گیا ہو، لہذا اگر غیر عربی یا رسم عثمانی کے علاوہ رسم الخط میں کتابت کی جائے تو اس کا جواز کیوں نہیں؟ جبکہ یہ سب کچھ اس کے محرکات موجود ہیں اور ضرر کچھ بھی نہیں۔

یہ جدید دور کے تجدّد پسند لوگوں کا مطالبہ ہے، لیکن کیا اس مطالبہ کو پورا کرنے میں شرعا کوئی مانع یا قباحت نہیں، جیسا کہ باور کرایا جارہا ہے، اس کی حقیقت جاننے کے لیے چند امور کی تحقیق ضروری ہے۔

(۱) کیا رسم عثمانی کی مخالفت جائز ہے؟

(۲) کیا عربی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں قرآن کی کتابت ممکن ہے؟

(۳) کیا اس اجازت کے بعد تصحیف وتحریف، ترمیم وتبدیل اور دیگر مفاسد کے درآنے کا خطرہ لاحق نہیں؟

مصحف کی کتابت میں رسم عثمانی کا التزام:

اس سلسلے میں صاحب ''مناہل العرفان'' نے علماء کے تین مذاہب نقل کئے ہیں۔

قول اوّل: ......رسم عثمانی توقیفی ہے، اس کی اتباع لازم ہے، اور مخالفت جائز نہیں، حضرت امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، ابوبکر بیہقیؒ، امام بغویؒ، شمس الدین سخاویؒ، ابوبکر بن العربیؒ، ابوالحسن بن بطال مالکیؒ سے یہی منقول ہے، بلکہ ابوعمرو الدانیؒ اور ابن العربی مالکیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، اور ابن حجر ہیتمیؒ نے اسے ائمۂ اربعہ کا مذہب قرار دیا ہے، علامہ حسن شرنبلالیؒ نے اپنے رسالہ ''النفحة القدسية في أحكام قرأة القرآن وكتابته بالفارسية'' میں مذاہب اربعہ کی مستند کتب سے ائمۂ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے (مناهل العرفان ۱/ ۳۶۹، رسم المصحف وضبطه بين التوقيف والاصطلاحات الحديثة، تاليف شعبان محمد اسماعيل/ ۶۳)۔

قول ثانی: ......رسم عثمانی توقیفی نہیں، بلکہ اصطلاحی ہے، لہذا اس کی مخالفت جائز ہے، ابن خلدون اور قاضی ابوبکر باقلانیؒ کا میلان اسی طرف ہے۔

قول ثالث: ......مخالفت جائز ہے، لیکن مطلقا نہیں، بلکہ اس طرح کہ رسم عثمانی پر مصاحف محفوظ وباقی رہیں، بالکلیہ مہجور یا ناپید نہ ہو جائیں، یہ عزالدین بن عبدالسلام اور بدرالدین زرکشیؒ کی رائے ہے۔

جمہور نے جس قول کو اختیار کیا ہے اس کی مندرجۂ ذیل بنیادیں ہیں:

(۱) قرآن مجید لفظ ومعنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، لہذا حفاظت موعود میں دونوں کی حفاظت شامل ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حفاظت ابتداء ہی سے ہوئی، اس لیے ابتداءً کتابت جس رسم پر ہوئی اس میں تغیر جائز نہ ہوگا، خصوصا جبکہ یہ کتابت دین کے محافظ حضرات صحابۂ کرامؓ کے ذریعہ ہوئی۔

علامہ نظام الدین نیشاپوریؒ فرماتے ہیں: ''قال جماعة من الأئمة: إن الواجب على القراء والعلماء وأهل الكتابة أن يتبعوا هذا الرسم في خط المصحف، فإنه رسم زيد بن ثابت رضي الله عنه، وكان أمين رسول الله وكاتب وحيه'' (تفسیر نیشاپوری ۱/ ۴۲)۔

علامہ بیہقی فرماتے ہیں: '' من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على هجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف، ولا يخالفهم فيه، ولا يغير مما كتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة. فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم'' (مناہل العرفان ۱/ ۳۸۰)۔

کیونکہ رسم کی تبدیلی بسا اوقات الفاظ اور اس کے تلفظ کی تبدیلی کو متضمن ہوتی ہے، اور یہ معنی کی تبدیلی کا سبب ہوتی ہے۔

علامہ شرنبلالیؒ نے ''التجنيس والمزيد'' کے حوالہ سے علامہ مرغینانیؒ کی عبارت نقل کی ہے: ''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى الخ'' (جواهر الفقه ۴/ ۸۲۱)۔

(۲) حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں جو کتابت عمل میں آئی اس پر اس وقت موجود صحابہؓ وتابعین کا اجماع ہے، لہٰذا اس میں کسی طرح کی تبدیلی اجماع کی مخالفت ہے۔

مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد اپنے رسالہ: ''خلاصة النصوص الجلية'' میں فرماتے ہیں: ''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم عثمان رضي الله عنه ومنع مخالفته... قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه، وهم زهاء اثني عشر ألفا. والإجماع حجة حسبما تقرر في أصول الفقه'' (نصوص الجليہ/ ۲۵۱، کذا فی جواہر الفقہ ۲/ ۸۷)۔

(۳) حضرات صحابہؓ وتابعین اس رسم کی مخالفت کو گوارہ نہیں کرتے تھے، چنانچہ زید بن ثابتؓ کے متعلق منقول ہے:

''أنه كان يكره أن تكتب (بسم الله الرحمن الرحيم) ليس لها سين''۔

ایک مرتبہ عمرو بن العاصؓ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا اور بسم اللہ میں شوشہ والی سین نہیں لکھی، تو حضرت عمرؓ نے ان کی پٹائی کی، کسی نے ان سے پوچھا: ''فيم ضربک أمير المؤمنين؟''، ان کا جواب تھا: ''ضربني في سين''۔

ابن سیرینؒ سے منقول ہے: ''إنه كان يكره أن تمد الباء إلى الميم حتى تكتب السين''

اور ابن ابی داؤدؒ نے مصاحف میں نقل کیا ہے: ''عن ابن سيرين أنه كان يكره أن يكتب المصحف مشقا، قيل: لم؟ قال: لأن فيه نقصا، ومعنى المشق: سرعة الكتابة'' (تحريم كتابة الكريم بحروف غيرعربية، مولف ابوسهل صالح على العود: ۳۶)

(۴) رسم عثمانی کی کچھ خصوصیات ہیں، جن کا لحاظ دیگر رسم الخط میں مشکل ہے، مثلاً متنوع قرأت پر دلالت، مختلف معانی کا افادہ، دقیق وخفی معانی کی طرف اشارہ، کلمہ کی اصل حرکت پر دلالت، بعض لغات فصیحہ کا افادہ وغیرہ (مناہل العرفان ۱/ ۳۷۵)۔

(۵) مصحف عثمانی کے علاوہ کسی مصحف کی سند متصل ومتواتر نہیں، حتی کہ قرأت متواترہ کا ایک رکن رسم عثمانی کی موافقت ہے، جو قرأت رسم عثمانی کے موافق نہ ہو وہ قرأت متواتر نہیں۔

یہ اور اس کے علاوہ چند بنیادیں ہیں، جن کی بناء پر محققین کے نزدیک رسم عثمانی کی مخالفت جائز نہیں، خواہ وہ عربی ہی رسم الخط کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ کسی عجمی رسم الخط میں اس کی کتابت کی جائے۔

جن حضرات نے اس کے علاوہ قول کو اختیار کیا ان کے پیش نظر یہ ہے کہ رسم عثمانی کی موافقت کے وجوب پر اور اس کی مخالفت کی ممانعت پر کوئی دلیل نہیں، لیکن مذکورہ تحقیق سے اس دعوی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اس لیے یہ اقوال قابل اعتناء نہیں، راجح، بلکہ صحیح موقف وہی ہے، جو جمہور نے اختیار کیا۔

بریل (Braille) کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

نابینا افراد کی تعلیم کے لیے معروف یہ ہے کہ ایک فرانسی "لوئس بریل ۱۸۰۹ (Liuis Braille ء میں اس کی ولادت ہوئی اور ۱۸۵۲ء میں اس کا انتقال ہوا)" نے تقریباً ۱۸۵۰ء میں ایک مخصوص طریقۂ کتابت ایجاد کیا، جو اسی کے نام "برایل کوڈ" سے مشہور ہے، لیکن ابو محمد بن حزمؒ نے اندلس کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ مجھے میرے مؤدب احمد بن محمد بن عبدالوارثؒ نے بتلایا کہ ان کے والد نے ایک نابینا بچے کے لیے قیر (تارکول یا اس جیسے کوئی مسالہ) سے حروف ہجاء تیار کئے، اور پھر اس بچے کو مس کرواکر بتدریج سکھانا شروع کیا، حتی کہ وہ بچہ خود مس کر کے کتاب پڑھنے لگا۔ (التقریب لحد المنطق والمدخل إليه بالفاظ العلمية والأمثلة الفقهية لابن حزم الاندلسي المتوفى ۴۵۶ھ/ص ۱۹۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ کا موجد ایک اندلسی مسلمان عالم دین ہے، اور یہ صدیوں پہلے کی ایجاد ہے (افادهٰذا الشيخ ملتقى أهل التفسير الشامل في المكتبة الشاملة)۔

بہر حال تحقیق طلب امر یہ ہے کہ قرآن کریم جس کی کتابت رسم عربی عثمانی میں ضروری ہے، بریل کوڈ میں نابیناؤں کے لیے اس کی کتابت واشاعت درست ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ جن اہل تحقیق نے رسم عثمانی کی موافقت کو ضروری اور اس کی مخالفت کو ممنوع قرار نہیں دیا ہے ان کے نزدیک برایل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت وطباعت میں کوئی اشکال نہیں، لیکن جمہور نے رسم عثمانی کی موافقت کو ضروری قرار دیا ہے، اور وہی صواب بھی ہے، ان کے نزدیک یہ امر قابل غور ہے۔

مندرجۂ ذیل امور کی بناء پر غور وفکر کے بعد اس میں شرعاً کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

(۱) رسم عثمانی ایک اصطلاحی رسم الخط ہے جن پر حضرات صحابہؓ نے اتفاق کیا، اگر چہ اسے توقیفی کہا گیا ہے، لیکن اس کا توقیفی ہونا اس پر موقوف ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کو یہ طریقہ تعلیم کیا ہو، حالانکہ صحیح روایت سے اس کا ثبوت نہیں، اس سلسلہ میں یہ روایت: "ألق الدواة وحرف القلم الخ" (رواه الدیلمی حدیث نمبر: ۸۵۳۳)، بقول حافظؒ ثابت نہیں، ہاں! قاضی عیاضؒ نے اجمالاً یہ بات کہی ہے کہ جب آپ کو ہر چیز کا علم دیا گیا تھا تو کتابت کا علم بھی دیا گیا ہوگا (فتح الباری باب عمرة القضاء/۵۰۴)، حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "أنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب، الحديث" (مسلم حدیث: ۱۰۸۰) اس کے منافی ہے، نیز حضرت عثمانؓ کا ایک حرف پر کتابت کروانا، بعض کلمات کی کتابت میں اختلاف ہونا، اور اس رسم کو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کرنا وغیرہ امور دال ہیں کہ یہ حضرات صحابہؓ کی اصطلاح ہے، تاہم اس کی موافقت ان امور کی بناء پر ضروری ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی۔

جب یہ ایک اصطلاحی رسم ہے جو حفاظت قرآن ہی کے لیے اختیار کی گئی اور اسی حفاظت کی غرض سے اس کے التزام کو ضروری قرار دیا گیا تو اب اگر اس مقصود میں نہ فی الحال اور نہ فی المآل کوئی خلل ہے، تو اس سے جزوی طور پر ضرورت کے تحت سہولت کے خاطر عدول کی اجازت ہونا چاہئے، اور برایل کوڈ میں ضرورت کے تحت جزوی عدول ہی ہے، کیونکہ ماہرین کے مطابق بہت حد تک اس مین رسم عثمانی کی رعایت ممکن ہے۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ مصاحف کا حکم:

اس سلسلہ میں کچھ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ رسم عثمانی میں مکتوب نہ ہونے کی وجہ سے مصحف عادی کے حکم میں نہیں، بلکہ تفسیر یا مترجم قرآن کے حکم میں ہے، لہذا بلاوضوء اس کو چھونا جائز ہے، لیکن اہل تحقیق کی رائے مین یہ بھی مصحف عادی کے حکم میں ہے، محض رسم عثمانی کی مخالفت سے اس کی قرآنیت ختم نہیں ہوجاتی، لہذا اس کے وہی آداب واحکام ہوں گے جو عام مصاحف کے ہیں، اور بلاوضوء اس کو چھونے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اور اس کی وجہ یہ ہے:

قرآن کی حقیقت منزل من اللہ الفاظ ومعانی کا مجموعہ ہے، اور جن اوراق میں ان پر دلالت کرنے والے نقوش مرتب انداز میں ثبت ہوں، اس کے مجموعہ کو مصحف کہا جاتا ہے، لہذا رسم عثمانی قرآن کی ماہیت میں داخل نہیں ہے، اسی لیے اس کی موافقت ومخالفت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور جب

بریل کوڈ میں تیار کردہ مصحف میں وہی کلمات، آیات وسور اسی ترتیب کے ساتھ ہیں اور انہیں قراءات کے ساتھ اسے پڑھا جاتا ہے، اور اس میں کلام اللہ کے علاوہ نہ ترجمہ ہے نہ تفسیر، اور عرف میں اسے قرآن ہی کہا جاتا ہے، اگرچہ وہ مخصوص لوگوں کے لیے تیار کیا گیا ہے، تو محض نقوش معروف نہ ہونے کی وجہ سے اس کو قرآن کے حکم سے خارج کرنا درست نہیں۔

موبائل میں محفوظ قرآن:

یہ تو ظاہر ہے کہ موبائل میں محفوظ قرآن بہر حال مصحف ورقی کے حکم میں نہیں، لہذا جب اسکرین پر قرآنی آیات ظاہر نہ ہوں تو وہ وضع وحمل اور لمس ومس میں مصحف کے حکم میں نہیں، لیکن اگر اسکرین پر جب ظاہر ہو تو بعض فقہائے معاصرین اس حالت میں بھی اسے مصحف کے حکم میں شمار نہیں کرتے، کیونکہ وہ مصحف ورقی کی خصوصیات پر مشتمل نہیں۔

مگر صحیح یہ ہے کہ مرتب آیات وسور پر مشتمل اور مکتوبہ صورت میں ہونے کی وجہ سے وہ بھی مصحف ورقی کے حکم میں ہے، لیکن یہ مکتوبہ صورت اسکرین پر ظہور کے وقت ہے، اس سے پہلے ماہرین کے بقول 01 کی شکل ہوتی ہے، جو قرآن پر دلالت کرنے والے نقوش نہیں ہیں، کیونکہ کتابت کی حقیقت وہ نقوش ہیں جو حروف ہجائیہ پر مشتمل الفاظ وکلمات کے مجموع پر دلالت کریں، اس لیے جب مستور ہو تو وہ مصحف ورقی کے حکم میں نہ ہوگا۔

البتہ سوال یہ ہے کہ اسکرین پر ظہور کے وقت اسکرین کے علاوہ موبائل کا ڈھانچہ آیا ایسا غلاف ہے جس کے ساتھ بلا وضوء مس کی گنجائش ہو؟

اس سلسلہ میں دو چیزیں قابل تحقیق ہیں:

(۱) مصحف کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) مصحف اور اس کے علاوہ مکتوب قرآن مجید کے درمیان حکم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

مصحف کی حقیقت:

علامہ ازہریؒ فرماتے ہیں: ''إنما سمي المصحف مصحفا لأنه أصحف، أي جعل جامعا للصحف المكتوبة بين الدفتين'' (الموسوعة الفقهيه۵/۳۸)۔

یعنی لکھے ہوئے صحائف جنہیں دو گتوں کے درمیان جمع کرلیا گیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ لکھا ہوا ایک ورق لغت کے اعتبار سے مصحف نہیں ہے، کیونکہ اس کے معنی لغوی میں دفتین ملحوظ ہے۔

عبدالعظیم زرقانیؒ فرماتے ہیں:

''فكأن المصحف ملحوظ في معناه اللغوي دفتاه وهما جانباه أو جلداه اللذان يتخذان جامعا لأوراقه ضابطا لصحفه حافظا لها''۔

گویا اس کے لغوی معنی میں ملحوظ ہے اس کے دفتین، یعنی دونوں جانب یا دو جلد جس نے اس کے اوراق کو جمع، اس کے صفحات کو ضبط اور محفوظ رکھا ہو (مناہل العرفان ۱/۴۵۱)۔

اسی لیے اس کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''اسم للمكتوب فيه كلام الله تعالى بين الدفتين. ويصدق المصحف على ما كان حاويا للقرآن كله. أو كان مما يسمى مصحفا عرفا ولو قليلا كحزب، على ما صرح به القليوبي'' (الموسوعة الفقهيه۵/۳۸)۔

دفتین کے درمیان لکھے ہوئے کلام اللہ کا نام ہے، اور مصحف کا مصداق وہ ہوگا جو پورے قرآن کو حاوی ہو، یا جسے عرف میں مصحف کہا جائے خواہ وہ قلیل ہو، جیسے جزء، جیسا کہ قلیوبی نے تصریح کی ہے۔

اگرچہ ابن حبیب مالکیؒ نے کہا ہے کہ وہ روق یا تختی یا ہڈی جس میں کسی سورت کا بعض حصہ لکھا ہوا ہو وہ بھی مصحف ہے۔

لیکن فقہاء کے کلام سے کل اور بعض کے درمیان حکم کے اعتبار سے فرق ہی ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ آئندہ ہم ذکر کریں گے۔

مصحف اور غیر مصحف کے مابین فرق:

فقہاء نے دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، چنانچہ ''بحر الرائق'' میں ہے:

''لا یجوز مس المصحف كله المكتوب وغيره بخلاف غيره فإنه لايمنع إلا مس المكتوب، كذا ذكره في السراج الوهاج مع أن في الأول اختلافا، فقال في غاية البيان: وقال بعض مشائخنا: المعتبر حقيقة المكتوب حتى إن مس الجلد ومس مواضع البياض لايكره، لأنه لم يمس القرآن، وهذا أقرب إلى القياس، والمنع أقرب إلى التعظيم. اه'' (حاشیہ دسوقی علی الشرح الکبیر کذا فی الموسوعہ)۔

مصحف کے تمام اجزاء مکتوب وغیر مکتوب کو چھونا جائز نہیں ہے، بخلاف اس کے علاوہ کہ اس کے فقط مکتوب حصہ کو چھونا جائز نہیں، سراج الوہاج میں اسی طرح مذکور ہے، باوجود یہ کہ پہلی صورت میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ ''غایۃ البیان'' میں ہے: بعض مشائخ نے کہا کہ اعتبار حقیقی لکھے ہوئے حصہ کا ہے، حتی کہ بیاض حصہ کو چھونا مکروہ نہیں، اس لیے کہ یہ قرآن کو چھونا نہیں ہے، یہ قیاس کے زیادہ قریب ہے، اور ممانعت تعظیم کے لحاظ سے اقرب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مصحف کے تمام اجزاء کو بلا وضوء چھونا ممنوع ہے، مکتوب حصہ کو تو اصلاً اور غیر مکتوب بیاض کو تعظیماً، لیکن مصحف کے علاوہ تختی وغیرہ پر قرآن مجید لکھا ہوا ہو، تو فقط اس کے مکتوب حصہ کو چھونا ممنوع ہے۔

اسکرین کو چھونا:

جب موبائل کی اسکرین پر قرآن کی آیات یا سور ظاہر ہوں تو بلا وضوء مس جائز ہونا چاہئے، کیونکہ یہ مس اسکرین پر لگے ہوئے شیشہ کے واسطے سے ہے، براہ راست نہیں، تاہم تعظیم وحرمت کا تقاضہ یہ ہے کہ مکروہ ہو، اور احتیاطاً منع ہی کیا جائے گا۔ اور مصحف کی مذکورہ تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ موبائل میں محفوظ قرآن مستور ہونے کی حالت میں مصحف نہیں، اور جب اسکرین پر ظاہر ہو تو وہ تختی یا ورق پر لکھی ہوئی آیات کے مثل ہے، لہذا اسکرین کے علاوہ موبائل کے جثہ کو چھونا اور اس کو پکڑنا اور اٹھانا جائز ہوگا۔



بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

قاضی حسین احمد قاسمی[1]

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جو قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے راہ ہدایت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب قیامت تک علی حالہ بلا تحریف رہے گی، نیز اس کا پیغام دنیا میں آباد تمام انسانوں کیلئے چاہے وہ کسی زبان یا خطہ سے تعلق رکھنے والے ہوں، عام ہے، یعنی یہ کتاب ابدی بھی ہے اور آفاقی بھی، لہذا قرآن کریم کے حوالہ سے ہر ایسا قدم ناجائز ہوگا جو اس کے مذکورہ دونوں صفتوں میں سے کسی کے تقاضے کے خلاف ہو، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کی جدید کاری روا نہ ہو، اسی وجہ سے علماء امت نے رسم عثمانی کی مخالفت کو ناجائز قرار دیا ہے، اور ابتداء میں تو کسی دوسری زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ کے جواز کا مسئلہ بھی مختلف فیہ رہا ہے، لیکن علماء ہند کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فارسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کرکے اور ان کے گرامی قدر صاحبزادگان حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبانؒ نے اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کرکے برصغیر کے علمی حلقوں کو ترجمہ قرآن کے جواز وعدم جواز کی بحث سے بہت پہلے فارغ کردیا تھا، لیکن برصغیر ہندو پاک میں ماضی قریب تک یہ التزام رہا کہ ترجمہ قرآن کو متن قرآن کے بغیر تنہا شائع نہ کیا جائے اور اصحاب افتاء تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتے رہے۔

لیکن ادھر ماضی قریب سے بعض افراد یا ادارے کی طرف سے ترجمہ قرآن بلا متن کی اشاعت ہونے لگی، اور اب یہ رجحان تقریبا عام ہو چکا ہے۔ اسلئے اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ موجودہ حالات کے پس منظر میں اس طرح ترجمہ قرآن بلا متن کی کتابت واشاعت درست ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں ایک نظریہ عدم جواز کا ہے، چنانچہ ماضی قریب کے اکثر اکابرین نے اس طرح ترجمہ قرآن بلا متن کی اشاعت کو ممنوع اور ناجائز قرار دیا۔ عدم جواز پر بنیادی طور پر جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر بلا متن ترجمے رائج ہوگئے تو دیگر کتب سماوی کی طرح قرآن کریم کا متن بھی ضائع ہو جائے گا، کیونکہ سابقہ آسمانی کتابوں میں تحریف وترمیم ہونے اور پھر ان کے دنیا سے ناپید ہو جانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ان کتابوں کو ماننے والی قوموں نے کتاب کے اصل متن کو نظر انداز کردیا اور اس کے ترجمہ اور تشریح ہی کو مرکز بنالیا۔ اور رفتہ رفتہ ان کتابوں کا اصل متن دنیا سے ناپید ہوگیا، نیز یہ اندیشہ بھی ہے کہ صرف ترجمہ کی اشاعت سے الفاظ قرآن سے بے توجہی پیدا ہوگی اور الفاظ قرآن کی اہمیت قلوب سے ختم ہو جائے گی، ان جیسی وجوہات کی بنیاد پر ترجمہ قرآن بلا متن کی اشاعت کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی تائید کتب فقہیہ کی عبارت سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ صاحب "ہدایہ" اپنی کتاب "التجنیس والمزید" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ویمنع من کتابه القرآن بالفارسیة بالإجماع، لأنه یؤدی للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنی، فإنه دلالة علی النبوة، ولأنه ربما یؤدی إلی التهاون بأمر القرآن" (التجنیس والمزید: ۴۷۸)۔

(قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے، کیونکہ یہ قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ ومعنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے، اور اسلئے کہ یہ قرآن کے معاملے میں لوگوں میں سستی پیدا کردیتی ہے)۔

صاحب "ہدایہ" کی مذکورہ عبارت سے ترجمہ قرآن کے متعلق مطلقا عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کی تفصیل نہیں کہ ترجمہ متن کے ساتھ ہو یا بلا متن کے ہو، لیکن شارح ہدایہ علامہ ابن ہمام نے: الکافی کے حوالے سے: فتح القدیر: میں جو عبارت نقل کی ہے اس میں اس تفصیل کی بھی صراحت ہے۔ عبارت حسب ذیل ہے:

---

[1] مرکزی دار القضا امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

''وفي الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أوأراد أن يكتب مصحفابهايمنع، فإن فعل في آية أوآيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (فتح القدير ۱/ ۲۹۱زکریا)۔

(کافی میں ہے اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت بنالے یا فارسی میں قرآن لکھنے کا ارادہ کرے تو اس کو روک دیا جائے، البتہ اگر ایک آیت یا دو آیت میں ایسا کرے تو نہ روکا جائے۔لیکن اگر قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے)۔

علامہ ابن ہمام کی عبارت سے اس بات کی تصریح ہوگئی کہ اگر اصل عربی عبارت کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ وتفسیر لکھی جائے تو وہ ممنوع نہیں ہے۔درحقیقت اس مسئلہ میں صاحب تجنیس اور صاحب کافی کے مابین اختلاف ہے۔صاحب تجنیس اسکو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں کہ متن قرآن کے ساتھ حاشیہ وغیرہ میں ترجمہ لکھا جائے، جبکہ صاحب کافی اس کو جائز قرار دیتے ہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام مصطفی صبری اپنے رسالہ :مسئلۃ ترجمۃ القرآن الکریم: میں لکھتے ہیں:

''أما كتابة المصحف بالفارسية عندفقهاء مذهب الإمام على مانقل عنهم فهي ممنوعة بالإجماع أشد المنع، إن كان منفصلاومجرداعن النص العربي، ومع النص العربي على الخلاف فصاحب التجنيس منعهاأيضا، وصاحب الكافي أجازهابشرط أن يكتب القرآن ويكتب تحته تفسير كل حرف'' (مسئلۃ ترجمۃ القرآن-۲۶)۔

بہرحال فقہاء مذہب سے جو قول منقول ہے اس کے مطابق فقہاء مذہب کے نزدیک قرآن کریم کو فارسی میں لکھنا سخت منع ہے بالاجماع اگر وہ مستقل ہو اور عربی لفظ سے خالی ہو، اور عربی لفظ کے ساتھ ہو اختلاف ہے صاحب تجنیس نے اس کو بھی ممنوع قرار دیا، اور صاحب کافی نے اس کو جائز قرار دیا اس شرط کے ساتھ کہ اصل قرآن لکھا جائے اور اس کے نیچے ہر حرف کی تفسیر لکھی جائے۔

اس عبارت میں اس بات کی بھی صراحت ہے کہ اگر متن قرآن کے بغیر ترجمہ قرآن تنہا مستقل لکھا جائے تو یہ ممنوع ہے اور اس میں فقہاء مذہب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ جب کہ متن عربی کے ساتھ ترجمہ لکھا جائے، صاحب تجنیس اس کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں، جبکہ صاحب کافی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ گفتگو یہ ہوا کہ ترجمہ قرآن بلا متن کی اشاعت کے تعلق سے دو نقطہ نظر سامنے آئے۔ایک نظریہ عدم جواز کا جس کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ اگر اس طرح کے تراجم رائج ہو گئے تو متن قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا، حالانکہ اس کی حفاظت ہم پر فرض ہے، اور ترجمہ بلا متن کی اشاعت اس فرض کی تعمیل میں خلل اندازی کا باعث ہے، اس لئے یہ ناجائز ہوگا۔دوسرا نقطہ نظر جواز کا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ ترجمہ قرآن غیر مسلموں کو بھی دیا جاتا ہے اور متن پر مشتمل ترجمہ قرآن دینے سے بے حرمتی کا اندیشہ ہے، اسلئے ان کو ترجمہ قرآن بلا متن دیئے جائیں۔ان دونوں نقطہ نظر اور ان کے دلائل کو سامنے رکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خصوصا غیر مسلموں کی ضرورت وطلب کے پیش نظر ترجمہ قرآن بلا متن شائع کرنے کی گنجائش موجود ہے۔اور یہ رائے چند وجوہ سے قائم کی گئی ہے:

(۱) ترجمہ قرآن بلا متن کی کتابت واشاعت کے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے۔

(۲) ترجمہ کے ساتھ پورا متن قرآن غیر مسلموں کے ہاتھوں میں دینا احترام قرآن سے پہلو کے نامناسب ہے۔

(۳) عدم جواز پر جو بنیادی دلیل دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر بلا متن ترجمے رائج ہو گئے تو دیگر کتب سماویہ کی طرح قرآن کا متن بھی نعوذ باللہ دنیا سے غائب ہوجائے گا اور صرف تراجم ہی باقی رہ جائیں گے، قرآن کے بارے میں یہ اندیشہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ قرآن کریم کو کتب سابقہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالی نے خود اپنے اوپر لی ہے اور قیامت تک اس کو باقی رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے، کتب سابقہ کے سلسلے میں اللہ کا یہ وعدہ نہیں تھا۔

(۴) اور ایک اندیشہ یہ ہے کہ صرف ترجمہ کی اشاعت سے الفاظ قرآن سے بے توجہی پیدا ہوگی اور اسکی اہمیت کم ہوجائے گی، یہ اندیشہ بھی صحیح نہیں ہے، جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے امید ہے کہ وہ ترجمہ پڑھ کر قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کی اہمیت ان کے دلوں میں قائم ہوگی اور فطری طور پر وہ قرآن کی عظمت واہمیت کے قائل ہوجائیں گے، باقی رہے مسلمان جو قرآن پڑھنا نہیں جانتے تو انہیں ترجمہ پڑھ کر قرآن کی توجہ ہوگی اور اس کے الفاظ سیکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا، یہ وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ترجمہ قرآن بلا متن خصوصیت کے ساتھ غیر مسلموں کی ضرورت وطلب کے پیش نظر شائع کرنے کی

گنجائش معلوم ہوتی ہے، ترجمہ قرآن کو بے وضو چھونا مکروہ ہے۔ "فتاوی ہندیہ" میں ہے:

"ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح" (الہندیہ ج ۱ ص ۳۹)

البتہ یہ حکم صرف مسلمانوں کے لئے ہے:،، جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے وہ اس حکم کے مخاطب نہیں ہیں، کیونکہ غیر مسلم جب تک ایمان نہ لائیں شریعت کے فروعی احکام ان سے متعلق نہیں ہوتے (کتاب الفتاوی ۱/ ۴۷۴)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

دور حاضر میں قرآن کریم کی کتابت کا یہ طریقہ تقریبا عام ہو چکا ہے اسلئے ارباب افتاء اور فقہ وفتاوی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ مسئلہ توجہ طلب ہے، تاکہ اس کی شرعی حیثیت واضح ہو کر سامنے آجائے

رسم عثمانی کی شرعی حیثیت:

اس مسئلہ پر جواز یا عدم جواز کا حکم لگانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم کا رسم الخط جو رسم عثمانی کے مطابق ہے اسکی شرعی حیثیت کیا ہے اس کی مخالفت جائز ہے یا نہیں؟

رسم عثمانی سے مراد وہ طریقہ تحریر ہے جس کو حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن کریم کی کتابت کے لئے منتخب فرمایا جس کا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت میں آپ کو یہ اطلاع ملی کہ لوگ قرآن کریم کی قراتوں میں آپس میں اختلاف کرنے لگے ہیں اور ایک دوسرے کو غلط اور کافر قرار دینے لگے ہیں، حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ کرام کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ قبائل عرب کے سات لغات جن پر قرآن نازل ہوا ہے اگرچہ وہ سب حق ہے، لیکن ان کے لفظی اختلاف سے کہیں معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ نہ نکل آئے، ان لغات میں صرف لغت قریش پر قرآن کریم کو مرتب کیا جائے، اسکے لئے آپ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت بنائی، صحابہ کرام کی اس جماعت نے حضرت غنیؓ کی ہدایت کے مطابق مخصوص رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت کا کام انجام دیا، اس کے متعدد نسخے تیار کئے گئے اور مختلف ممالک میں بھیج دئے گئے، اور حضرت عثمان غنیؓ کے حکم سے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش کردئے گئے جو مختلف صحابہ کرام کے پاس موجود تھے، اور یہ پابندی عائد کردی گئی کہ آئندہ جتنے مصاحف لکھے جائیں وہ مصحف عثمانی کے مطابق ہونے چاہئے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے اس کارنامے کو پوری امت نے بہ نظر استحسان دیکھا اور اس وقت موجود تمام صحابہ کرام نے آپ کی تائید اور حمایت فرمائی، حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

"لا تقولوا في عثمان إلا خيرا، فوالله ما فعل الذي فعل في المصاحف الا عن ملا منا" (فتح الباری ج ۹ ص ۲۲)

حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم انہوں نے مصاحف کے معاملے میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا۔

حضرت علیؓ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ کے اس عمل پر تمام صحابہ کرامؓ متفق تھے اور صحابہ کرام کا اس پر اجماع تھا، چنانچہ اس کے بعد صحابہ وتابعین نے مصاحف عثمانیہ کی نقول تیار کرکے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی، صحابہ کرام کے اجماع کی پیروی کرتے ہوئے ائمہ اربعہ اور پوری امت کا اس بات پر اجماع ہوگیا کہ قرآن کریم کی کتابت میں رسم الخط عثمانی کی اتباع واجب ہے اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کے شواہد اصول تفسیر کی کتابوں میں نیز کتب فقہیہ میں بھی موجود ہے چنانچہ علامہ سیوطی نے: "الاتقان فی علوم القرآن" میں امام مالک اور امام احمد کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

"قال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلا على الكتبة الأولى. رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة" (الاتقان ۱/ ۱۲۲۷ النوع السادس والسبعون، مکتبہ شاملہ)۔

) اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید کو اس طرز پر لکھ سکتے ہیں جس کو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اس پہلی طرز پر لکھنا ضروری ہے علامہ دانی نے: المقنع: میں اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا کہ علماء میں سے کوئی اس بارے میں امام مالک کا مخالف نہیں ہے)۔

امام احمد کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

"قال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط عثمان في واو او الف أو غير ذلك" (حوالہ سابق)۔

(امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت حرام ہے واو، یاء اور الف وغیرہ میں)۔

اسی طرح فقہ شافعی کی کتاب ''المنہج'' کے حاشیہ میں ہے:

''كلمة الربا تكتب بالواو والالف كماجاء فى الرسم العثمانى ولاتكتب فى القرآن بالياء أوالالف فتكتب الواو ولافى الباء والالف بعدها وهٰذه طريقة المصحف العثمانى... لأن رسمه سنة متبعة'' (حاشية الجمل على المنهج ۵/ ۲۹۲)۔

(لفظ رباء کو واو اور الف کے ساتھ لکھا جائے گا، جیسا کہ رسم عثمانی میں آیا ہے، اس کو قرآن میں یاء الف کے ساتھ نہیں لکھا جائے گا، لہٰذا باء کے ساتھ پہلے واو لکھا جائے گا اس کے بعد الف لکھا جائے گا، یہی مصحف عثمانی کا طریقہ ہے، اس لئے کہ اس کا رسم الخط ایسی سنت ہے جس کی اتباع کی جاتی رہی ہے)۔

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ لفظ ربا کو تین طریقہ سے لکھا جاسکتا ہے یاء پر، الف مدہ ہو، یعنی ربی، الف کے ساتھ ربا، اور واو کے ساتھ ربو۔ ان تین طریقوں میں سے ایک ہی طریقہ واو کے ساتھ ربو مصحف عثمانی میں استعمال کیا گیا ہے، لہٰذا اس رسم الخط کی اتباع ضروری قرار دے کر باقی دو طریقوں سے لفظ ربو کی کتابت کو ممنوع قرار دیا گیا:

''وفى المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى: أنه ينبغى أن لايكتب المصحف بغيرالرسم العثمانى'' (منابل العرفان ج ۱ ص ۲۶۲ بیروت شاملہ)۔

(محیط برہانی میں ہے کہ مناسب ہے کہ مصحف کو رسم عثمانی کے علاوہ میں نہ لکھا جائے)۔

امام بیہقی شعب الایمان میں تحریر فرماتے ہیں:

''من يكتب مصحفا فينبغى أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولايخالفهم فيه ولايغير مماكتبوه شيئا. فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا وأعظم أمانة. فلاينبغى أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم'' (شعب الایمان ۱/ ۲۱۲)۔

''جو شخص قرآن کریم کی کتابت کرے ضروری ہے کہ اس طریقہ کی پابندی کرے جن پر حضرات صحابہ نے ان مصاحف کو لکھا، اس میں انکی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے، سچ دل اور سچ زبان والے اور زیادہ امانت دار تھے، لہٰذا ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم ان کی کمی کو پورا کرنے کا گمان رکھیں''۔

امام بغویؒ اپنی کتاب شرح السنۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

''فأمر عثمان بنسخه فى المصاحف وجمع القوم عليه وأمر بتحريق ماسواه قطع المواد الخلاف فكان مايخالف الخط المتفق عليه فى حكم المنسوخ والمرفوع فليس لأحد فى اللفظ إلى ماهو خارج من رسم الكتابة'' (شرح السنة للامام البغوی ۴/ ۵۱۱ المكتبة الاسلامى دمشق بیروت شاملہ)۔

(حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن کو مصاحف میں نقل کرنے کا حکم فرمایا اور امت کو اس پر جمع کردیا ان کے علاوہ نسخوں کو جلانے کا حکم فرمایا اختلاف کے راستہ کو ختم کرنے کے لئے، لہٰذا جو اس متفق علیہ خط کے خلاف تھا وہ منسوخ ہوگیا، لہٰذا کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ تجاوز کرے ایسے لفظ کی طرف جو کتابت کے اس طریقہ سے خارج ہے)۔

فقہاء و محدثین کے اقوال اور انکی عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ باجماع صحابہ وتابعین وباجماع امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی کتابت میں رسم عثمانی کی اتباع واجب ہے اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔

زیر موضوع بحث مسئلہ کا حکم شرعی:

ان تفصیلات کی روشنی میں زیر بحث مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ غیر عربی داں حضرات کی سہولت کے لئے قرآن کریم کے متن کو ان کی زبان ہندی وانگریزی وغیرہ کے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں ہے، خواہ عربی رسم الخط کو باقی رکھتے ہوئے اس کے ساتھ لکھا جائے یا تنہا مستقل لکھا جائے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کتابت:

نابینا افراد کی تعلیم کے لئے بریل کوڈ کو ایجاد کیا گیا اور اس میں قرآن مجید کی کتابت بھی ہونے لگی، بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے اور نہ رسم عثمانی، ایسے میں ایک اہم سوال یہ ابھرا ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت اور اشاعت درست ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے، البتہ یہ التزام رہے کہ پہلے قرآن کریم کو عربی رسم عثمانی میں اس طرح نمایاں کرکے لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا معلوم ہو اور اس کے تابع بنا کر بریل کوڈ کو لکھا جائے، وجہ یہ ہے کہ بریل سسٹم میں قرآن کریم میں پائے جانے والے تمام حروف، بلکہ حرکات، اور مدہ وغیرہ پوری رعایت ہوسکتی ہو، کیونکہ ہر ایک کے لئے الگ الگ علامتیں وضع کی گئی ہیں۔ اور اس طرح کے رسم الخط میں رسم عثمانی کے تابع بنا کر قرآن مجید کو لکھنے کی گنجائش ہے۔

اس بات کی تائید میں حضرت مولانا ومفتی نظام الدین صاحبؒ کے فتوی کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں، حضرت فرماتے ہیں:، جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے ہیں اور وہ تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں ان کی تعلیم وتلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے، پہلے قرآن کریم سر حوص وسر صفحہ نمایا کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی متبوعات وعظمت اور اس کا پورا ادب واحترام ملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً س، ص، ث اور ز، ذ، ظ، ض، ہمزہ اور ع وغیرہ اس کے تمام فروق وامتیازات نیز تمام خصوصیات کتابت واو وغیرہ مثلاً زوائد (الف لام) اور مد وجزم تشدید وآسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب ان تمام خصوصیات کے لئے جامع مانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہیں ہوگی (منتخبات نظام الفتاوی ج ۳ ص ۴۲۸) مذکورہ فتوی میں جن امور کی رعایت مطلوب ہے بریل سسٹم میں، بہت حد تک ان امور کی رعایت پائی جاتی ہے۔

نیز چونکہ بریل کوڈ میں قرآن کی اشاعت سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہوجاتی ہے اسکے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ وہ بغیر کسی مدد اور سہورے کے خود قرآن کی تلاوت اور اس کا مطالعہ کرسکیں، بلکہ ہر قدم پر وہ بینا افراد کے محتاج رہتے ہیں جس میں ان کے لئے حرج اور مشقت ہے اور حرج اور عسر ان اسباب میں سے ہیں جن کی وجہ سے احکام میں تخفیف ہوجاتی ہے (الاشباہ)۔

بریل کوڈ کی مدد سے نابینا افراد براہ راست قرآن کی تلاوت کرسکتے ہیں، حفظ کرنے والے اس کی مدد سے قرآن یاد رکھ سکتے ہیں، لہذا نابیناؤں کی مجبوری اور حرج اور مشقت کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے، بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن کی طرح اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے۔ "موسوعۃ الفقہیہ" میں ہے:

''المصحف إن كتب على لفظه العربي بحروف غير عربية فهو مصحف وله أحكام المصحف'' (الموسوعة الفقهيه ۳۸/۲ ص۱۰)
(اگر مصحف لفظ عربی کے مطابق غیر عربی حروف کے ذریعہ لکھا جائے تو وہ مصحف ہے اور اس کے لئے مصحف کے احکام ہوں گے)۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ آیات قرآنی بھی چونکہ الفاظ عربی کے مطابق ہی تحریر کئے جاتے ہیں، اسلئے اس کا حکم اصل متن قرآن کا حکم ہوگا اور اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ نابینا افراد کی تعلیم وتعلم کی سہولت کے پیش نظر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے۔ البتہ یہ التزام رہے کہ پہلے متن عربی کو لکھا جائے پھر اس کے نیچے تابع بنا کر بریل کوڈ میں آیات کو لکھا جائے، بریل میں تیار کردہ قرآن کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

• قرآن مجید کو ہاتھ لگانے کے لئے حدث اصغر وحدث اکبر سے پاک ہونا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لا يمسه إلا المطهرون" (الواقعہ ۷۹)

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "لا يمسه القرآن الا الطاهر" (الدار قطنی ج ۱ ص ۲۸) جمہور فقہاء کرام کا یہی مذہب ہے، علامہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں:

''لایمس المصحف إلا طاهر یعني طاهرا من الحدثین جمیعا...... وهو قول مالك والشافعي وأصحاب الرائي۔ ولا نعلم خلافا لهم إلا داؤد'' (المغنی ۱/۱۳۷)۔

(مصحف کو نہ چھوئے مگر پاک شخص یعنی جو دونوں حدث سے پاک ہو، اور یہ امام مالک امام شافعی اور اصحاب رائے کا قول ہے ہمیں ان کے خلاف کا علم کا نہیں ہے سوائے داود ظاہری کے)۔

نیز فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے غلاف کے ساتھ بے وضو شخص قرآن مجید کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔

''وکذا المحدث لایمس المصحف إلا بغلافه'' (الهدایه مع الفتح ۱/۱۷۰)

سوال یہ ہے کہ موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو کیا اس موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا، یا موبائل کے ڈھانچے کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے؟

اس مسئلہ میں دو باتیں لائق بحث ہیں۔ اول یہ ہے کہ جب موبائل کی اسکرین پر قرآنی آیات موجود ہوں تو اس موبائل کے ڈھانچے کو ہاتھ میں لینے کے لئے کیا وضو ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کے مارکیٹ میں عام طور پر دو طرح کے موبائل دستیاب ہیں ایک موبائل جو بٹن سسٹم ہوتا ہے، یعنی جو بٹن کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے، اور دوسرا موبائل اسکرین ٹچ ہوتا ہے جو اسکرین پر انگلیوں کی مس کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے بٹن کا سہارا نہیں لیا جاتا ہے، دونوں طرح کے موبائل میں دو اسکرین ہوتی ہے، ایک اسکرین اندرونی سطح پر ہوتی ہے اور دوسری اسکرین موبائل کے ڈھانچے کے ساتھ اوپر ہوتی ہے، موبائل پر جو بھی تحریر نظر آتی ہے دراصل وہ اندر والی اسکرین پر ہوتی ہے، اس لئے اس پر جبکہ قرآن کی آیات نمایاں ہو تو اس کی حیثیت اس ورق کی ہوگی جس پر قرآن کی آیات تحریر ہوں، لہذا اس کو بلا غلاف بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہوگا۔

مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اوپر والی اسکرین جو موبائل کے ڈھانچے کے ساتھ لگی ہوتی ہے، کیا اس کے ایسا غلاف تصور کیا جاسکتا ہے جسکو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے؟

مشاہدہ اور تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جو بٹن سسٹم ہوتے ہیں ان میں دونوں اسکرینوں کے درمیان کافی فاصلہ ہوتا ہے اوپر والی اسکرین ایک مستقل شئی کے مانند ہوتی ہے جس کا اندرونی والی اسکرین کے ساتھ کوئی ربط اور اتصال نہیں ہوتا، اور نہ یہی چھونے والے شخص کے ساتھ اس کا کوئی ربط، لہذا بٹن سسٹم موبائل کے اوپر والی اسکرین کو غلاف تصور کیا جاسکتا ہے اور اس کو بے وضو ہاتھ لگانے کی گنجائش ہوگی، اس کی تائید صاحب عنایہ کی عبارت سے ہوتی ہے، صاحب عنایہ غلاف کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

''وغلافه ماکان متجافیا عنه ای متباعد، ابأن یکون شیئا ثالثا بین الماس والممسوس'' (عنایة مع الفتح ۱/۱۴۳)

(اس کا غلاف ایسا ہو جو اس سے جدا ہو، یعنی الگ ہو اس طور پر کہ وہ چھونے والے شخص اور شئی ممسوس کے درمیان ایک تیسری چیز ہو)۔

غلاف کا یہ معنی اس اسکرین پر بھی صادق آتا ہے جو بٹن سسٹم موبائل میں ڈھانچے کے ساتھ اوپر لگی ہوتی ہے، لہذا اس کو غلاف قرار دیا جائے گا، اور اسے بے وضو ہاتھ لگانے کی گنجائش ہوگی، اور جو موبائل اسکرین ٹچ سسٹم ہوتے ہیں، ان میں دونوں اسکرین کے درمیان فاصلہ بہت کم، بلکہ نہ کے برابر ہوتا ہے۔ دونوں اسکرین شئی واحد کے مانند ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ کافی حد تک مربوط اور متصل ہوتے ہیں، لہذا اس کو غلاف منفصل تصور نہیں کیا جاسکتا اس کی حیثیت اس غلاف کی ہوگی جو شئی ممسوس کے ساتھ متصل اور اس کے تابع ہوتا ہے اور ایسے غلاف کو ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''لایجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه۔ لا بما هو متصل به هو الصحیح'' (الهندیه ۱/ص ۳۸)

(جائز نہیں ہے حائض اور نفساء کے لئے اور جنبی اور محدث کے لئے مصحف کا چھونا مگر ایسے غلاف کے ساتھ جو اس سے الگ ہو نہ کہ ایسے غلاف کے ساتھ جو اس سے متصل ہو یہی صحیح ہے)۔

لہذا اسکرین ٹچ موبائل کی اوپر اسکرین کو ایسا غلاف تصور نہیں کیا جاسکتا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے، بلکہ یہ اس غلاف کے مانند ہوگی جو شئی ممسوس کے ساتھ متصل اور تابع ہوتی ہے، لہذا اس طرح کی اسکرین کو بے وضو ہاتھ لگانے کی گنجائش نہیں ہوگی۔ ☆☆☆

عربی متن کے بغیر ترجمہ قرآن کی اشاعت

مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی[1]

ترجمہ قرآن:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عرب قوم میں ہوئی، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازہ شدہ کتاب ''قرآن مجید'' کی زبان عربی ہے، اور ہمیشہ سے اللہ کا یہی ضابطہ رہا ہے، سورہ ابراہیم میں پاک ارشاد ہے: "وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه ليبين لهم" (سورۂ ابراہیم: ۴)۔

تبیین دین کے اغراض کے پیش نظر ہی ہر نبی کو ان کی قومی زبان میں کتاب یا صحیفے دیئے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے اور قیامت تک آنے والی نسلیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہیں، ان تک پیغام حق پہنچانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علماء امت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "قل يا ايها الناس اني رسول الله جميعا" (سورۂ اعراف: ۱۵۸)، ایک جگہ ارشاد ہے: "وما أرسلناك إلا كافة للناس بشيرا و نذيرا" (سبا: ۲۸)، اور صحیحین کی روایت ہے:

''وكان النبي صلى الله عليه وسلم يبعث إلى قومي خاصة وبعثت إلى الناس كافة'' (متفق عليه)۔

اس لئے کتاب ہدایت کے پیغام کو دنیا کی زندہ قوموں تک ان کی قومی اور عرفی زبان میں پہنچانا، دعوت دین کے نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے اور بعثت محمدی کے تقاضوں میں سے ایک تقاضہ بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے باتفاق آراء عالمی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم کو جائز قرار دیا ہے، علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

''إن ترجمة القرآن على الوجه الاول يعني النظر إلى معانيه الأصلية۔ ممكن ومن جهته صح تفسير القرآن وبيان معانيه للعامة ومن ليس لهم فهم يقوى على تحصيل معانيه، وكان ذلك جائزًا باتفاق أهل الإسلام، فصار هذا الاتفاق حجة في صحة الترجمة على المعنى الأصلي'' (مباحث فی علوم القرآن/ ص ۳۱۵)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''وأما مخاطبة أهل الاصطلاح باصطلاحهم ولغتهم فليس بمكروه إذا احتيج إلى ذلك وكانت المعاني صحيحة كمخاطبة العجم من الروم والفرس والترك بلغتهم وعرفهم، فإن هذا جائز حسن للحاجة، وإنما كره الأئمة إذا لم يحتج إليه ولذلك يترجم القرآن والحديث لمن يحتاج إلى تفهمه إياه بالترجمة'' (مباحث فی علوم القرآن/ ص ۳۱۷)۔

ترجمہ قرآن کی حیثیت:

عجمی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ایک اہم دینی ضرورت کی تکمیل ہے، تاکہ غیر عرف اقوام عالم تک ان کی زبان میں قرآن کا پیغام پہنچانا ممکن ہو اور اسلام میں داخلے کا راستہ آسان ہو، یا وہ مسلمان جو عربی زبان میں مہارت نہیں رکھتے، انہیں مادری زبان میں ترجمہ کے ذریعہ مراد ربانی کو سمجھنے اور احکام الہی پر عمل کا ذوق وجذبہ حاصل ہو۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام تر حزم واحتیاط اور زبان وبیان کی نزاکتوں کی رعایت کے باوجود ترجمہ قرآن (جو انسانی الفاظ کا مجموعہ ہے) قرآن مجید (جو الفاظ ربانی کا بے نظیر گلدستہ ہے) کا بدل نہیں ہوسکتا، نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ کما حقہ اللہ کی مراد ومنشاء کا غماز ہے، اسی لئے علمائے اسلام نے اس بات پر

[1] شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعۃ انوار الہدی، حیدر آباد۔

اتفاق کا اظہار کیا ہے کہ ترجمہ کی حیثیت اصل قرآن کی نہیں ہے، "وھم متفقون علی أن الترجمة لاتسمی قرآنا" (مباحث فی علوم القرآن/ص ۳۲۰)۔

ترجمہ قرآن کی اشاعت:

اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے یہ بات واضح اور عیاں ہوجاتی ہے کہ ترجمہ قرآن "قرآن" کا متبادل نہیں اور نہ ہی دونوں کا رتبہ ایک ہے، خاص مقاصد کے تحت شرائط وآداب کی رعایت کے ساتھ قرآن مجید کے متن کا ترجمہ کرنے کی اجازت علماء اسلام نے دی ہے۔

اس لئے قرآن کے متبادل کے طور پر مصحف کی شکل میں تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت جسے عرف عام میں اردو قرآن سمجھا جائے یا مستقل اس کی تلاوت کی جائے درست نہیں ہوگی۔

"وفی الفتح عن الکافی: إن اعتاد القرأة بالفارسية أوأراد أن يكتب مصحفا بها يمنع" (ردالمحتار ۲/۱۸۷)۔

اس لئے بھی کہ ترجمہ قرآن کو قرآن کا درجہ حاصل نہیں ہے اور نہ ہی اس پر قرآن حکیم کا اطلاق درست ہے، جبکہ تنہا اشاعت کی صورت میں اس پر قرآن مجید کا اطلاق لازم آئے گا، جو حق بجانب نہیں۔

متن قرآن کے ساتھ ترجمہ کی اشاعت:

البتہ متن قرآن کے ساتھ ترجمہ شائع کرنے میں وہ قباحتیں نہیں پائی جاتیں جو محض ترجمہ شائع کرنے میں ہیں، اس لئے مع متن ترجمہ کی اشاعت جائز ہوگی۔

اسی طرح کسی تصنیف میں دو چند آیتوں کا ترجمہ شامل کیا جائے تو یہ بھی درست ہوگا، غیر مسلمین کو دعوت دین پیش کرنے کے لئے آیتوں کا ان کی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت علماء نے دی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"فمن دخل الإسلام أو أراد الدخول فيه فقرئ عليه القرآن فلم يفهمه فلا بأس أن يعرف له لتعريفه أحكامه أو لتقوم عليه الحجة فيدخل فيه" (فتح الباری، باب ما يجوس من تفسير التوراة وكتب الله بالعربية)۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وإن فعل فی آية او آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز" (ردالمحتار ۲/۱۸۷)۔

ترجمہ قرآن خریدنا، تقسیم یا ہدیہ کرنا:

مصحف کی شکل میں محض ترجمہ کی اشاعت جب درست نہیں، تو اسے خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ وہبہ بھی درست نہ ہوگا، کیونکہ ایسا کرنا اشاعت کی حوصلہ افزائی اور اس کی ترویج کا ذریعہ ہوگا، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا: "محض اردو میں قرآن شریف لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں، اصل عربی متن کے ساتھ اگر ترجمہ بھی ہو تو درست ہے، یہی رائے حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند کی بھی ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۴/۳۱)۔

ترجمہ قرآن کو بے وضو چھونا:

اگر تنہا ترجمہ قرآن کتابی شکل میں چھپا ہو تو تعظیماً بلا وضو اسے چھونا جائز نہ ہوگا، صاحب بحر لکھتے ہیں: "ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يحرم على الجنب والحائض مسه بالإجماع وهو الصحيح، أما عند أبي حنيفة فظاهر وكذلك عندهما، لأنه قرآن عندهما حتى يتعلق به جواز الصلاة فی حق من لايحسن العربية" (البحر الرائق ۱/۲۰۲)۔

لیکن اس جزئیہ سے تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کے جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ نفس ترجمہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ اس کی تنہا اشاعت ممنوع ہے، اور یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ ترجمہ قرآن کو "قرآن" نماز کی صحت کے لئے مجازاً تسلیم کیا گیا ہے، نہ کہ حقیقتاً، علامہ شامیؒ نے اس کی وضاحت کی ہے۔

"وإنما يسمى قرآنا مجازًا، ولذا يصح نفی اسم القرآن عليه" (ردالمحتار ۲/۱۸۴)۔

غیر مسلمین کو دینے کے لئے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

جو حضرات صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کے قائل ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ غیر مسلموں کو اصل قرآن دینے میں بے حرمتی کا اندیشہ ہے، اس لئے صرف ترجمہ پر اکتفا کرنا بہتر ہے، تاکہ دعوت کے مقاصد بھی حاصل ہوں اور بے حرمتی بھی نہ ہو۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ غیر مسلموں کو ہدایت کی امید سے قرآن مجید دینے یا پڑھانے کی اجازت فقہاء نے دی ہے، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ناپاک حالت میں وہ قرآن نہ چھوئیں، ابن نجیم مصری تحریر فرماتے ہیں:

''النصرانی إذا تعلم القرآن یعلم والفقه كذلك، لأنه عسى يهتدى لكن لا يمس المصحف وإذا اغتسل ثم مس لا بأس به فی قول محمد'' (البحر الرائق ۱/ ۲۰۲)۔

حضرت عمر فاروقؓ کے ایمان قبول کرنے کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، بے حرمتی کے خواہ سے ہی فقہاء نے اس بات سے منع کیا ہے کہ کوئی شخص دارالحرب کے سفر میں اپنے ساتھ قرآن رکھے۔

''وفی التوشیح: وتكره المسافرة بالقرآن إلى دار الحرب صونا عن وقوعه فی أيدی الكفرة واستخافه (البحر الرائق ۱/ ۲۰۲)

قرآن مجید کو بے احترامی سے بچانے کے لئے بظاہر یہ خیال عمدہ ہے، لیکن یہ بات حتمی اور یقینی نہیں کہ وہ لوگ قرآن کی بے حرمتی کریں گے بطور خاص ایسے افراد جو اسلام میں دلچسپی رکھتے ہیں، اور یہ صورت ناگزیر بھی نہیں ہے کہ تنہا ترجمہ کی اشاعت کی اجازت دی جائے، بلکہ یہ مقاصد دوسرے ذرائع سے حاصل ہو سکتے ہیں اور دوسری جائز شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

مگر غیر مسلمین کو اصل قرآن دینے میں بے حرمتی کا جو اندیشہ ہے وہ ان اندیشوں کے مقابلے ہلکا اور کمتر ہے جو اندیشے تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، لہذا فقہی اصول "اذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما"۔ نیز "من ابتلى ببليتين وهما متساويان يأخذ بأيتهما شاء وان اختلفا يختار اهونهما" (الاشباہ والنظائر / ص ۱۴۵) کی روشنی میں تنہا قرآن مجید کے ترجمہ کی اشاعت ناجائز قرار پائے گی اور اصل قرآن مع ترجمہ بدرجہ مجبوری غیر مسلمین کو دینا جائز ہوگا۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں زید بن ثابتؓ اور صحابہ کی ایک جماعت نے خلیفۃ المسلمین کے حکم پر قرآن مجید کو لغت قریش پر مرتب کیا، یہی رسم الخط "رسم عثمانی" سے مشہور ہوا، یہ رسم الخط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونے کی بنا پر توقیفی ہو یا عثمان غنیؓ کے طے کرنے سے عثمانی اصطلاح ہو (جس پر پچاس ہزار سے زائد صحابہ کا اتفاق اور امت کی طرف سے تلقی بالقبول حاصل ہونے سے اجماع ہو) قرآن مجید کی تحریر و کتابت کے لئے لازم وضروری ہے، اس کے خلاف کسی اور رسم الخط میں قرآنی متن کو لکھنا جائز نہیں اور نہ ہی اس کی اشاعت وتلاوت درست ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے اور علماء اسلام نے اسی پر فتوی دیا ہے۔

(انظر: الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۱۶۷، والبرهان للزرکشی ۱/ ۳۷۹)۔

صاحب "مباحث فی علوم القرآن" لکھتے ہیں: ''والذی أراه أن الرأی الثانی هو الرأی الراجح، وأنه يجب كتابة القرآن بالرسم العثمانی المعهود فی المصحف'' (مباحث فی علوم القرآن/ ۱۴۹)۔

نیز علامہ سیوطیؒ نے امام بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے: ''من يكتب مصحفا فينبغی أن يحافظ على الهجاء الذی كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبًا ولسانًا وأعظم أمانة منا فلا ينبغی أن، تظن بأنفسنا استدراكا عليهم'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۱۶۷)۔

عثمانی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کے لزوم کا ایک اہم مقصد قرآن مجید کو ہر تحریف سے بچانا ہے، دوسری زبان کے رسم الخط میں کتابت سے ان گنت مقامات پر قرآن مجید کے حروف کم ہوں گے اور حروف کی کمی سے معنی کا زور بھی کم ہوگا اس طرح کلمات قرآن کا اعجاز بھی متاثر ہوگا اور ایسا کرنا کسی صورت درست

نہیں ہے۔

چنانچہ صاحب ''مباحث فی علوم القرآن'' لکھتے ہیں:

''فهو الرسم الاصطلاحی الذی توارثته الأمة منذ عهد عثمان والحفاظ علیه ضمان قوی لصیانة القرآن من التغیر والتبدل فی حروفه'' (مباحث فی علوم القرآن/ ص۱۴۹)۔

جہاں تک ان حضرات کا سوال ہے جو عربی قرآن نہیں پڑھ سکتے یا عمدہ طور پر پڑھنے سے قاصر ہیں، تو انہیں یہ مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ عربی عبارت پڑھنے کے لئے اعلی قابلیت یا زبان کی مہارت ضروری نہیں ہے، اگر معنی ومطلب نہ سمجھیں اور صرف عربی حروف والفاظ کا تلفظ بھی سیکھ لیں تو کافی ہے، کیونکہ عربی قرآن کی تلاوت کے لئے عربی کا اتنا جاننا کافی ہے، انسانی تجربہ اس پر شاہد ہے کہ وہ معصوم بچے جنہیں مادری زبان میں مکمل بات کرنا نہیں آتا، ناظرہ قرآن پڑھنے کا عمدہ اور قابل رشک سلیقہ رکھتے ہیں تو وہ حضرات جنہیں دوسری زبانوں میں مہارت حاصل ہے بدرجہ اتم معمولی محنت سے قرآن عربی میں پڑھ سکتے ہیں، لہذا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کے ذریعہ ان حضرات کو اللہ کے پاک کلام کی تلاوت سے محروم رکھنا مناسب نہیں۔

بطور خاص اس پس منظر میں کہ علماء نے مسلمانوں کے لئے عربی زبان سیکھنا ضروری قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''وأیضا فإن نفس اللغة العربیة من الدین ومعرفتها فرض واجب، فإن فهم الکتاب والسنة فرض ولا یفهمان إلا بفهم اللغة العربیة، ومالا یتم الواجب إلا به فهو واجب'' (بحوالہ مباحث فی علوم القرآن/ ص۳۲۰)۔

عثمانی اور غیر عربی رسم الخط میں ایک ساتھ قرآن کی اشاعت:

اور اگر واقعی کسی کے لئے ایسے حالات ہوں کہ وہ عربی نہیں پڑھ سکتا، یا پڑھنے میں شدید دشواری ہوتی ہو تو قرآن مجید کو اصل عربی متن کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے اور شائع کرنے کی شرعا اجازت ہوگی، تاکہ غیر عربی رسم الخط کی مدد سے عربی قرآن ٹھیک ٹھیک پڑھ سکے۔

اس کی نظیر مصحف عثمانی پر نقطے اور تشکیل عبارت کا مسئلہ ہے کہ ابتداء میں عبداللہ بن مسعودؓ کے فرمان ''جردوا القرآن ولا تخلطوه بشیٔ'' (حدیث) کے پیش نظر اور عدم احتیاج کی بنا پر صحابہ اور تابعین نے اس کی اجازت نہیں دی اور کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔

لیکن بعد کو جب عجمی مسلمانوں کے لئے بغیر نقط واعراب قرآن مجید کی تلاوت دشوار ہوئی تو نقطے اور تشکیل عبارت کا اہتمام کیا گیا، تاکہ عجمی مسلمانوں کے لئے قرآن پڑھنا آسان ہوجائے۔

لہذا فی زمانہ تلاوت میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے عثمانی رسم الخط میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن لکھا اور شائع کیا جائے تو درست ہوگا۔

صاحب اتقان لکھتے ہیں: ''ثم انتهى الأمر فی ذلك إلى الإباحة والاستحباب، أخرج ابن ابی داؤد عن الحسن وابن سیرین انهما قالا: لابأس بنقط المصاحف، وأخرج عن ربیعة بن أبی ربیعة بن أبی عبدالرحمن أنه قال: لابأس بشکله، و قال النووی: نقط المصحف وشکله مستحب؛ لأنه صیانة له من اللحن والتحریف'' (انظر: الاتقان فی علوم القرآن ۲/۱۷۱)

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

عثمانی رسم الخط سے صرف نظر کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت عمومی احوال میں اس لئے درست نہیں ہے کہ یہ توقیفی یا اجماعی رسم الخط کے خلاف ہے، ایسا کرنے میں رسمی تحریف کا اندیشہ ہے اور یہ عمل کوئی لازمی ضرورت بھی نہیں ہے کہ اس کی اجازت دی جائے۔

ہاں اگر امت میں کسی طبقہ کے لئے خاص حالات میں رسم عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت ناگزیر ضرورت بن جائے اور حد درجہ احتیاط کی وجہ سے تحریف کا امکانی اندیشہ بھی ہو تو شرعا اس کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ شرعی اصولوں کا تقاضا یہی ہے۔

''الضرورات تبیح المحذورات'' (الاشباہ والنظائر: ص۱۴۰)، ''المشقة تجلب التیسیر'' (الاشباہ والنظائر: ص۱۳۵)، ''الضرر یزال'' (الاشباہ والنظائر: ص۱۳۹)، جیسے فقہی قواعد اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

چنانچہ نابینا افراد کے لئے بریل کوڈ میں قرآن مجید کی تیاری چونکہ وقت کی ضرورت اور مسعود کوشش ہے، اس لئے شرعا جائز ہوگی۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو بے وضو چھونا:

جس طرح ترجمہ وتفسیر اصل قرآن کا درجہ نہیں رکھتے اسی طرح بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل عربی قرآن جیسا نہ ہوگا، کیونکہ قرآن آسمان سے نازل نظم ومعنی کے مجموعہ کا نام ہے، لیکن قرآن مجید کا تقدس اس بات کا متقاضی ہے کہ بریل کوڈ میں تیار کئے گئے قرآن کو بلا وضو چھونے کی گنجائش نہ ہو، اسی احترام وتقدس کا لحاظ فقہاء کے اس جزئیہ میں جھلکتا ہے کہ انہوں نے فارسی قرآن کو جنابت، حیض یا نفاس کی حالت میں چھونے سے منع کیا ہے۔

ابن نجیم مصری لکھتے ہیں: ''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يحرم على الجنب والحائض مسه بالإجماع وهو الصحيح، أما عند أبي حنيفة فظاهر وكذلك عندهما، لأنه قرآن عندهما حتى يتعلق به جواز الصلاة في حق من لايحسن العربية'' (البحر الرائق ۱/ ۲۰۲)۔

ناپاکی کی حالت میں بیاض (خالی جگہ) یا قرآن کو غلاف سے چھونا حنفیہ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے، یہی قول قرین قیاس اور معتبر ہے، لیکن فقہاء نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ اگر تعظیم قرآن کا خیال رکھا جائے تو بیاض اور غلاف کو چھونا بھی درست نہ ہو۔

علامہ ابن نجیم مصری تحریر فرماتے ہیں:

''وقال بعض مشائخنا: المعتبر حقيقة المكتوب حتى أن مس الجلد ومس مواضع البياض لايكره، لأنه لم يمس القرآن، هذا أقرب إلى القياس والمنع أقرب إلى التعظيم'' (البحر الرائق ۱/ ۲۰۱)۔

اس وضاحت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بریل کوڈ میں مکمل قرآن مکتوب ہو تو بلا وضو اسے چھونا تعظیما ممنوع ہو۔

موبائل پر قرآن:

پورا قرآن یا کوئی آیت خواہ کسی چیز پر لکھی ہوئی ہو، اسے بے وضو چھونا جائز نہیں ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''ويمنع دخول مسجد (إلى قوله) ومسه أي القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط'' (ردالمحتار ۱/ ۴۸۸)۔

فی زمانہ قرآن مجید کو محفوظ کرنے کی جدید شکل یہ پیدا ہوگئی ہے کہ موبائل فون میں قرآن کے نقوش کو ڈاؤن لوڈ کیا جاتا ہے اور ضرورت پر بآسانی پڑھا جاتا ہے ایک ہی اسکرین پر حروف مٹتے اور بنتے ہیں اوراق کی طرح پلٹتے نہیں اور نہ ہی مکتوب کی طرح یہ نقوش دائمی ہوتے ہیں اور انہیں ثبات وقرار بھی نہیں ہوتا، اسکرین میں موجود شعاعیں یہ کمال دکھاتی ہیں۔

لہذا اسکرین پر واضح ہونے والی عبارت کی حیثیت سایہ کی ہوگی نہ کہ حقیقت کی، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب ''تکملہ فتح الملہم'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''أما الصورة التي ليس لها ثبات واستقرار وليست منقوشة على شئ بصفة دائمة فإنها بالظل أشبه منها بالصورة'' (تکملہ فتح الملہم ۴/ ۱۶۴)۔

اس لئے موبائل فون کو مصحف کا مرتبہ نہیں دیا جاسکتا اور بغیر وضو اسے موبائل کو چھونا یا اسکرین کو ہاتھ لگانا جائز ہوگا۔

مگر تقدیس قرآن کا تقاضا ہے کہ جب اسکرین پر لائٹ آن ہو اور قرآن کے نقوش نمایاں ہوں تو اس وقت بلا وضو اسکرین کو نہ چھوئیں، البتہ فون کو اب بھی ہاتھ میں لینا جائز ہوگا، کیونکہ فقہاء نے اس بارے میں مکتوب کا اعتبار کیا ہے اور فون کے ڈبلے پر ابھرنے والے حروف ونقوش کو تحریر نہیں کیا جاسکتا۔

صاحب بحر تحریر فرماتے ہیں: ''المعتبر حقيقة المكتوب حتى أن مس الجلد ومس مواضع البياض لايكره، لأنه لم يمس القرآن'' (البحر الرائق ۱/ ۱۲۰)، اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ موبائل میں محفوظ قرآن جب مصحف نہیں ہے تو فون کی باڈی کو غلاف ماننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔



باب چہارم- مختصر تحریریں

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی اشاعت

مولانا زبیر احمد قاسمی [1]

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

قرآن شریف کی حفاظت فرض ہے، اور اس کے الفاظ ومعانی دونوں کی حفاظت کے ہم مامور ہیں، لہذا قرآن کریم کے تعلق سے ہر ایسا کام جس کی وجہ سے حفاظت قرآن کا مسئلہ خطرے میں پڑ جائے ناجائز وحرام ہوگا، متن کے بغیر دوسری زبان میں ترجمہ قرآن کی اشاعت کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے، اسی وجہ سے اس کے حرام ہونے پر علماء کرام کا اجماع ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی سے جب اس سلسلے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''قصية ما في المجموع الإجماع على التحريم'' اور صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدي للاخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة'' (التجنیس والمزید بحوالہ جواہر الفقہ ۱/ ۹۸)۔

''إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية وأيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (فتح القدیر)۔

ماضی کے ہمارے علماء ہند نے بھی اس کی شدید مخالفت کی ہے، جن میں سرفہرست حضرت تھانوی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی شفیع صاحب دیوبندی، مولانا ادریس کاندھلوی اور مفتی محمود حسن گنگوہی (رحمہم اللہ) ہیں، حضرت تھانویؒ نے اپنے ایک فتوے میں اس کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس کے دس مفاسد کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- مجرد ترجمہ کی اشاعت میں اہل کتاب سے مشابہت ہے جس کا ممنوع ہونا نص صریح سے ثابت ہے۔

۲- مجرد ترجمہ کی اشاعت کا اگر رواج ہو گیا تو رفتہ رفتہ متن قرآنی کے ضائع ہونے کا قوی احتمال ہے، جیسا کہ دیگر آسمانی کتابوں کے ساتھ ہوا کہ ان کے ماننے والوں نے مجرد ترجمہ پر اکتفا کیا جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ اصل متن زبانی دنیا سے ناپید ہو گیا۔

۳- متن کے ساتھ ترجمہ شائع ہونے کی صورت میں لوگوں کا کسی نہ کسی درجہ میں متن سے تعلق ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ ضرور تلاوت کی توفیق مل جاتی ہے، اس کے برخلاف اگر صرف ترجمہ شائع کرنے کا رواج ہو گیا تو متن قرآن سے لوگوں کا تعلق ختم ہو جائے گا اور تھوڑا بہت جو تلاوت کی توفیق مل جاتی تھی اس سے بھی محرومی ہو جائیگی۔

۴- اصل کے ساتھ ترجمہ شائع ہونے کی صورت میں اگر ترجمہ میں کچھ اختلاف ہوتا ہے تو وہ اصل کی طرف منسوب نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اصل کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں، اس کے برخلاف جب صرف ترجمہ ہی ترجمہ رہ جائے گا تو اس اختلاف کے اصل کی طرف منسوب ہونے کا اندیشہ ہے۔

۵- اصل کی موجودگی میں کسی مترجم کو تحریف معنوی کی بھی ہمت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اصل کی موجودگی میں کوئی بھی طالب علم آسانی کے ساتھ گرفت کر سکتا ہے، اس کے برخلاف جب صرف ترجمہ ہی ترجمہ رہ جائے گا تو اہل باطل کو آسانی کے ساتھ تحریف معنوی کا موقع مل جائے گا، کیونکہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں اور ہر وقت اصل کی طرف مراجعت آسان نہیں۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ اشرف العلوم، کنہواں، سیتامڑھی، بہار۔

اب ذرا ان باتوں کا بھی جائزہ لیا جائے جو اس کے جواز کی تائید میں پیش کی جاتی ہے کہ ان مذکورہ بالا مفاسد کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

۱- اس میں سے پہلی بات یعنی مجرد ترجمہ کی اشاعت میں مصارف کا کم آنا، تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی مصلحت نہیں کہ اس کے لئے ضیاع قرآن اور تحریف معنوی جیسے مفسدہ کو برداشت کرلیا جائے اور ایک ایسے حکم کی خلاف ورزی کی جائے جس پر امت کے علماء کا قریب قریب اجماع ہے۔

۲- دوسری بات، یعنی ایسے لوگوں کو متن والا ترجمہ دینے کا کیا فائدہ جو اس کو پڑھ نہیں سکتے ہیں؟

واقعی یہ بات اس وقت معقول ہوتی، جبکہ ترجمہ کے ساتھ متن کو شائع کرنے کا فائدہ صرف تلاوت ہی ہوتا، لیکن جیسا کہ ماقبل سے معلوم ہوا کہ ترجمہ کے ساتھ متن کے التزام کا اصل مقصد حفاظت قرآن ہے اور تلاوتی نقطہ نظر سے زیادہ حفاظتی نقطہ نظر سے متن کے ساتھ ترجمہ شائع کرنے کو لازم قرار دیا جاتا ہے، لہٰذا متن کے ساتھ ترجمہ کو شائع کرنا کسی حال میں فائدہ سے خالی نہیں، بلکہ ہر حال میں ضروری ہے۔

۳- تیسری بات یعنی غیر مسلموں کی طرف سے بے حرمتی کا اندیشہ، واقعی یہ ایک ایسا مفسدہ ہے جس سے بچنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ غیر مسلموں کو متن کے بغیر صرف ترجمہ دیا جائے، لیکن اس صورت میں جو ضیاع قرآن اور تحریف معنوی کا مفسدہ ہے وہ پہلی صورت کے مفسدہ سے کہیں زیادہ اشد ہے، اور اخف سے بچنے کے لئے اشد کو برداشت کرلینا شرعاً عقلاً کسی اعتبار سے بھی درست نہیں، خصوصاً اب جبکہ غیر مسلموں تک قرآنی پیغام کو پہنچانے کی اور بھی بہت ساری صورتیں موجود ہیں۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت:

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت دو وجہوں سے جائز نہیں: ۱- پہلی وجہ رسم عثمانی کی مخالفت ہے، جس کی اتباع باجماع امت واجب ہے، چنانچہ مصر کے شیخ القراء محمد بن علی حداد اپنے رسالہ "نصوص جلیہ" میں فرماتے ہیں:

"أجمع المسلمون قاطبة علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته ثم قال: قال العلامة ابن عاشر: ووجه ماتقدم من إجماع الصحابة علیه وهم زهاء اثنی عشر ألفا والإجماع حجة حسبما تقرر فی أصول الفقه" (نصوص جلیہ/ ص۲۵، بحوالہ جواہر الفقہ ۱/ ۹۸)۔

دوسری وجہ لزوم تحریف ہے، کیونکہ قرآن مجید میں بہت سے حروف مثلاً "ذ، ز، ض، ظ" وغیرہ ایسے ہیں کہ دوسری زبانوں میں ان سب کی ادائیگی کے لئے الگ الگ حروف نہیں ہیں، بلکہ ان سب کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے، حالانکہ ان حروف کے بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں، لہٰذا ایسا کرنا قرآن شریف کی کھلی ہوئی تحریف ہے، نیز بہت سی عجمی زبان مثلاً انگریزی وغیرہ میں اعراب وحرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اب اگر اس رسم الخط میں قرآن کی کتابت کی جائے تو قرآن کے حروف میں زیادتی لازم آئے گی، اسی طرح دوسری زبانوں میں قرآن کے صرف وہی حروف لکھے جائیں گے جو پڑھے جاتے ہیں اور وہ حروف زوائد جو صرف لکھے جاتے ہیں، لیکن پڑھے نہیں جاتے مثلاً "واؤ، الف" وغیرہ اسے نہیں لکھا جائے گا، جس کی وجہ سے قرآن شریف کے بہت سے حروف کم ہوجائیں گے، اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے حروف کی کمی زیادتی یہ بھی ایک قسم کی تحریف ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت:

جن دو وجہوں سے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، بریل کوڈ میں قرآن شریف تیار کرنے کی صورت میں بھی وہ دونوں خرابیاں پائی جاتی ہیں، لہٰذا بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت جائز نہیں ہونا چاہئے، رہی بات نابینا حضرات کی آسانی اور سہولت تو ظاہر ہے کہ اگر غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کی اجازت دی جائے تو اس صورت میں امت کے ایک بڑے طبقہ کو جو عربی زبان نہیں جانتے آسانی وسہولت میسر ہوجاتی، لیکن اس کے باوجود اس کو جائز قرار نہیں دیا گیا تو معدودے چند افراد، یعنی نابینا حضرات کی سہولت وآسانی کے لئے اجماع کی خلاف ورزی اور تحریف کا راستہ کھولنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر موبائل اسکرین پر قرآن مجید ہو تو میرے خیال سے موبائل ہاتھ میں لینے کے لئے تو وضو شرط نہیں، البتہ اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا۔ ☆☆☆

قرآن مجید سے متعلق بعض مسائل کا شرعی حل

مفتی حبیب اللہ قاسمی[1]

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم آسمانی کتابوں میں سے وہ اہم کتاب ہے جس کی حفاظت وصیانت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جس کی شہادت یہ آیت کریمہ دیتی ہے "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر:۹)، لیکن یہ خداوند قدوس کا اس امت پر احسان عظیم ہے کہ اس نے اس امت کے نونہالوں کے سینوں اور زبانوں کو اپنے پاک کلام کی تحفیظ کے لئے قبول فرمایا اور اس کی قبولیت عامہ کا یہ فیض ہے کہ تحفیظ قرآن کی درسگاہوں اور مراکز میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان درسگاہوں سے منسلک ہو کر امت کے نونہال پہلے کے مقابلہ میں آج زیادہ اپنے سینوں میں قرآن کریم محفوظ کر رہے ہیں، یہ خوش آئند بات ہے جس کی حوصلہ افزائی جتنی بھی کی جائے کم ہے جو چیز جتنی عام ہوتی چلی جاتی ہے اس سے متعلق نئی نئی صورتوں کا پیدا ہونا بھی لازمی بات ہے، قرآن کریم کی تلاوت ہو یا اس کی تحفیظ، اس کی کتابت ہو یا اس کی اشاعت، متن کے ساتھ ہو یا بغیر متن کے، صرف عربی زبان میں ہو یا دیگر زبانوں میں یہ وہ مسائل ہیں جو ماضی میں بھی پیدا ہو چکے ہیں اور تا حال باقی ہیں، بلکہ ان مسائل سے ہٹ کر اب بریل کوڈ میں قرآن پاک کی کتابت اور موبائل میں قرآن کریم محفوظ کرنے کا رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے، اس لئے ان مسائل کا شرعی حل امت کے سامنے پیش کرنا اور صحیح راہ کی نشاندہی کرنا علماء وفقہاء امت کا اہم فریضہ ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب سوال نامے میں مذکور سوالات کے جوابات بالترتیب سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔

۱- بغیر متن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کا رواج اگرچہ عام ہوتا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا رجحان بھی بڑھنے لگا ہے، لیکن حضرات متقدمین واسلاف کی عبارات، تحریرات اور فتاوی میں بہت واضح انداز میں اس کی ممانعت موجود ہے، چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ "تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط من مصحف الامام" اور "صیانة القرآن عن تغییر الرسم واللسان" جو "جواہر الفقہ" جلد اول کا ایک حصہ ہے، انہوں نے تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔

اسی طرح مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے اس کی ممانعت پر اتقان کے حوالے سے ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے، نیز "خیر الفتاوی" میں بھی اس امر کو باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع قرار دیا ہے، اور صاحب ہدایہ کی "کتاب التجنیس والمزید" سے "ویمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالاجماع" (۱/ ۹۸ بحوالہ جواہر الفقہ) سے بھی استدلال کیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ متقدمین واسلاف کی تحریرات وفتاوی اس امر میں بہت واضح ہیں کہ بغیر متن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت درست نہیں ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۷۳-۱۱۱، فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۱۰، خیر الفتاوی ۱/ ۲۱۴)۔

بغیر متن والے قرآن پاک کی طباعت واشاعت ممنوع ہے، لیکن ایسا قرآن اگر کسی کو حاصل ہو جائے جس میں صرف ترجمہ ہو تو اس کو تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم میں داخل ہو جائے گا، البتہ بلا وضو اس کو چھونے میں کوئی مضائقہ نہیں، کما صرح بہ صاحب (الدر المختار ۱/ ۱۷۷) "قد جوز أصحابنا مس کتب التفسیر للمحدث"۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں مثلاً انگلش یا ہندی یا کسی دوسری زبان میں قرآن کریم کو لکھنے کی ممانعت بھی متفقہ طور پر اکابر فقہاء واسلاف کی تحریرات میں موجود ہے، ایک تحریر جو "جواہر الفقہ" میں ہے، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب، علامہ شبیر احمد

[1] صدر مفتی، بانی ومہتمم وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڑھ۔

صاحب عثمانی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے دستخط ہیں جس میں صراحتاً یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ قرآن مجید کو رسم الخط ہندی میں لکھنا تحریف ہوگا، جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی کی اس عبارت سے بھی استدلال کیا گیا ہے:

''قدمنا حكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسية وأنه إنما نص على الفارسية لإفادة المنع بغيرها بالطريق الأولى؛ لأن غيرها ليس مثلها في الفصاحة ومنها ما في معراج الدراية أنه يمنع بكتابة المصحف بالفارسية أشد المنع'' (النفخة القدسية للشرنبلالي ص ۲۲ بحواله جواہر الفقه).

نیز عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں عربیت کو باقی رکھنا ممکن نہیں ہے جس کا مشاہدہ ان لوگوں کی زبانوں سے بھی ہوتا ہے جو اردو سے واقف نہیں ہیں وہ صرف انگلش یا ہندی داں ہیں جب وہ اردو کے کسی لفظ کو ادا کرتے ہیں تو ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں ''ج'' بول رہا ہوں یا ''زاء''، الغرض اصل مخارج اور صفات کے ساتھ قرآن کریم کے الفاظ کی ادائیگی پھر ممکن نہیں ہوگی، حاصل کلام یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں صرف قرآن کریم کی اشاعت پر تقریباً حضرات فقہاء واسلاف کا اجماع ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، تفصیلات اور دلائل کے لئے سوال نمبر (۱) کے جواب میں دیئے گئے حوالے دیکھے جاسکتے ہیں۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت بھی اب عام ہوتی جارہی ہے، لیکن پہلے اور دوسرے سوال کے جواب میں اسلاف اور فقہاء کی جو تحریرات ہیں اس کے تناظر میں بریل کوڈ میں بھی قرآن کریم کی کتابت کی اجازت معلوم نہیں ہوتی، لیکن ایسا قرآن اگر کسی کے پاس ہو تو اس کو چھونے کے لئے بہر حال وضو کا ہونا ضروری ہے۔

۴- موبائل میں قرآن مجید کے متن کو محفوظ کرنے کا بھی عام رواج ہوتا جارہا ہے تو یہ ایسا عمل ہے جس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ موبائل میں صرف قرآن ہی نہیں ہوتا بلکہ دنیا بھر کی نجاست وغلاظت بھی ہوتی ہے، اب اس صورت میں اس موبائل میں قرآن شریف کو بھی انہیں مضامین کے ساتھ رکھنا کس حد تک کے درست ہوسکتا ہے، اہل علم حضرات کے لئے یہ لمحہ فکریہ ضرور ہے، ذاتی طور پر میرے نزدیک ایسا کرنا ناپسندیدہ ہے، لیکن اگر کسی نے اپنے موبائل میں قرآن کریم محفوظ کررکھا ہے تو اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے اس کا باوضو ہونا ضروری ہوگا، باقی موبائل کے ڈھانچے کو غلاف تصور کیا جائے گا، جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوگی۔



قرآن مجید کے متن و ترجمہ کی کتابت واشاعت

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی[1]

بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت:

مندرجۂ ذیل سوال وجواب سے اس کا حکم واضح ہے۔

سوال نمبر ۱۱۳۷: -قرآن شریف کو بغیر عربی کے صرف اردو ترجمہ کے ساتھ چھاپنا کیسا ہے اور اس کو خریدنا اور پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیا: -بغیر عربی کے محض اردو یا کسی زبان میں قرآن شریف کو لکھنا اور چھاپنا منع ہے۔ ''اتقان'' میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل ہے۔

''قال العلامة الشامي۔في الفتح عن الكافي: إن اعتادالقرآن بالفارسية أوأرادأن يكتب مصحفابها يمنع'' (شامی ۱/۳۲۶)
اس سے خریدنے اور بیچنے کی بھی ممانعت معلوم ہوگئی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (حررہٗ العبد محمود حسن گنگوہی غفرلہ دار العلوم دیوبند)

اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں ہے: ''محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں۔ اصل عربی کے ساتھ ترجمہ بھی ہو تو درست ہے۔ فقط واللہ اعلم (فتاویٰ محمودیہ ص ۵۰۹، ۵۱۰ ج ۳ مکتبہ شیخ الاسلام دیوبند)

حررہٗ العبد محمود حسن گنگوہی غفرلہ دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ دار العلوم دیوبند ۸۵،۱۱،۲۳

صرف ترجمہ کی مدد سے قرآن مجید کو سمجھنا آسان نہیں ہے، بلکہ اس سے بعض مرتبہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرانس کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر مورس بوکائیے کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ میری ڈسپنسری میں جو لوگ آتے تھے میں ان کو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے بارے میں شبہ میں ڈال دیتا تھا۔ ایک مرتبہ میری ڈسپنسری میں سعودیہ عربیہ کے شاہ فیصل مرحوم داخل ہوئے۔ میں نے ان کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہا کہ قرآن مجید کلام الٰہی نہیں ہے۔ انھوں نے میری دکھتی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ پوچھا۔ آپ قرآن مجید صرف انگلش ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں یا اس کی اصل عربی زبان میں۔ میں نے اعتراف کیا کہ ٹرانسلیٹ (ترجمہ) سے پڑھتا ہوں۔ انھوں نے کہا جائیے پہلے قرآن کو قرآن کی زبان میں پڑھیے، پھر اعتراض ہو تو بتائیے۔ مورس بوکائیے کہتے ہیں کہ میں نے ایک عربی کا ٹیوٹر مقرر کیا اور اس سے ۳۰۷ سبق عربی کے پڑھے اور عربی میں سمجھ پیدا ہوگئی تو مجھ پر قرآن کا معجزہ ہونا ظاہر ہو گیا۔ پھر انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''قرآن بائبل اور سائنس'' لکھی جس میں تقابلی مطالعہ کی روشنی میں قرآن پاک کے معجزہ اور وحی الٰہی ہونے کے دلائل کے ذریعہ عظمت قرآن کو ثابت کیا۔

رہ گیا صرف ترجمۂ قرآن والے قرآن کو چھونا تو ظاہر ہے کہ یہ قرآن نہیں ہے، اس لئے اس کا چھونا درست ہے۔ کیونکہ اس میں الفاظ قرآن نہیں ہیں جس کا مس ممنوع ہو۔ البتہ احتیاطاً نہ چھونا بہتر ہے، کیونکہ ترجمہ کی نسبت بھی تو قرآن ہی کی طرف ہے۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن مجید کی اشاعت عربی رسم الخط العثمانی کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں، خواہ اصل عربی متن کے ساتھ ہو یا تنہا کسی اور رسم الخط میں بہر صورت ناجائز ہے۔ اس بات پر ائمہ اربعہ اور امت کا اجماع ہے۔

[1] شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ یوپی۔

’’قال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى۔ رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولامخالف له من علماء الأمة۔ وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان رضي الله عنه في ’’و‘‘ أو ’’يا‘‘ أو ’’الف‘‘ وغيره ذالك۔ وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفًاينبغي أن يحافظ على الهجاء التي كتبوابه تلك المصاحف۔ ولا يخالفهم ولا يغيرمماكتبوه شيئًافإنهم كانوا أكثرعلماوأصدق قلباولساناوأعظم أمانة منا۔ فلاينبغي ان نظن بأنفسنا استدرًاكاعليهم‘‘ (الاتقان، النوع السادس والسبعون ۱/ ۱۹۶)۔

وصرح بتحريم كتابته بالعجمية ’’في الفتاوى الكبرى (ص۳۸ج۱)۔ وقال بعض أئمة القرأة ونسبته إلى مالك؛ لأنه المسئول عن المسئلة وإلافهومذهب الأئمة الأربعة. وقال أبوعمروولامخالف له في ذالك من علماء الأمة۔ وقال بعضهم الذى ذهب إليه مالك: هوالحق۔ إذفيه بقاء الحالة الأولى إلى أن يتعلم الآخرون وفي خلافهاتجهيل آخرالأمة أولهم۔ وإذاوقع الإجماع كما ترى على منع ماأحدث الناس اليوم من مثل كتابته ’’الربوا‘‘ بالالف مع أنه موافق للفظ الهجاء۔ فمنع ماليس من جنس الهجاء أولى۔ وزعم أنه كتابته بالعجمية فيهاسهولة للتعليم كذب مخالف للواقع والمشاهدة فلايلتفت لذالك على أنه لوسلم صدقه لم يكن مبيحًاالإخراج ألفاظ القرآن عماكتبت عليه، وأجمع عليه السلف والخلف والمسئلة مذكورة في ’’آكام النفائس‘‘ (ايضًاص۳۴)۔

(حضرت اشہبؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا، کیا قرآن شریف کو اس اسلوب پر لکھا جاسکتا ہے جو لوگوں نے از خود ایجاد کرلیا ہے۔ فرمایا نہیں، مگر پہلی ہی کتابت پر۔ دارمی نے ’’المقنع‘‘ میں اس کی روایت کی ہے۔ پھر اشہب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علمائے امت میں سے کوئی بھی اس مسئلہ میں امام مالکؒ کا مخالف نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت حرام ہے۔ واو، یا، الف وغیرہ میں بھی۔ اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں فرمایا کہ جو شخص بھی قرآن کو لکھے اس کے لئے مناسب ہے کہ اسی اسلوب کی پابندی کرے جس طرز میں ان حضرات نے قرآن لکھا ہے۔ اور جس رسم خط میں انھوں نے لکھا ہے اس میں ان کی ادنیٰ مخالفت بھی نہ کرے، کیونکہ وہ حضرات ہم سے زیادہ علم والے اور دل وزبان کے بہت زیادہ سچے اور ہم سے کہیں زیادہ امانت دار تھے۔ اور عجمی زبانوں (تمام غیر عربی زبانوں) میں قرآن کی کتابت کے حرام ہونے کی ’’الفتاویٰ الکبریٰ الفقہیہ‘‘ (ص ۳۸ ج ۱) میں صراحت ہے۔ اور بعض ائمۂ قرأت نے حرمت کے قول کی نسبت امام مالکؒ کی طرف کی ہے، کیونکہ اس مسئلہ کو انہیں سے پوچھا گیا تھا ورنہ تو حقیقت میں یہی چاروں اماموں (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد) کا مذہب ہے۔ اور ابوعمرو نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں علمائے امت میں سے کوئی بھی ان کا مخالف نہیں ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ امام مالک کا قول حق ہے، اس لئے کہ اس میں کتابت قرآن کی پہلی حالت کو باقی رکھا گیا ہے، تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس رسم الخط کو سیکھیں۔ اور اس کے خلاف کرنے میں بعد والوں کا اپنے پہلے بزرگوں کو جاہل قرار دینا لازم آتا ہے۔

اور جب اجماع منعقد ہو چکا ہے اس طرز کتابت کی ممانعت پر جسے آج کے لوگوں نے نو ایجاد کرلیا ہے جیسے ’’الربوٰ‘‘ الف کے ساتھ لکھنا باوجودیکہ یہ ’’ربا‘‘ کے تلفظ اور لہجے کے موافق ہے تو دوسری زبانیں جو لہجۂ قرآن کی جنس سے بھی نہیں ہیں ان کو بدرجہ اولیٰ منع کیا جائے گا۔

اور جو لوگ یہ پھس پھسی بات کہتے ہیں کہ قرآن کی عجمی (غیر عربی) زبانوں میں کتابت سے قرآن سیکھنے میں سہولت ہوگی وہ نرا جھوٹ ہے جو واقعہ اور مشاہدہ کے سراسر خلاف ہے۔ اس کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔ اور اگر ان کی بات سچ بھی مان لی جائے تب بھی کتابت شدہ رسم الخط العثمانی سے الفاظ قرآن کے نکالنے کو مباح نہیں کرسکتی جس پر سلف اور خلف کا اجماع ہو چکا ہے۔ اور یہ مسئلہ ’’آکام النفائس‘‘ ص ۳۴ میں بھی مذکور ہے)۔

حضرت مفتی محمود حسن قدس سرہٗ لکھتے ہیں:

’’عبارت منقولہ بالا سے معلوم ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگر چہ وہ عربی رسم

خط میں ہی کیوں نہ ہونا جائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علمائے امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں۔ تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا۔ پھر غیر عربی بنگلہ وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ اس میں تو جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، لہٰذا صورت مسئلہ بالا جماع ناجائز ہے۔ بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے طا، حا، ض، ظ وغیرہ۔ یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے نہ شکل وصورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے لکھے جائیں گے جو کہ بنگلہ میں مستعمل ہیں۔ اور یہ تحریف وتغیر ہے جو کہ حرام ہے۔ البتہ اگر قرآن کریم تو عربی اصلی رسم خط میں ہو اور اس کا ترجمہ وتفسیر بنگلہ زبان میں تو شرعاً مضائقہ نہیں (فتاوی محمودیہ ص ۵۰۷ تا ۵۰۹ مطبوعہ دیوبند) واللہ سبحانہ اعلم

حررہٗ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ معین مفتی مظاہر علوم سہارنپور

الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہ مفتی مظاہر علوم سہارنپور ۳۰/جمادی الاولی ۷۰ھ

صحیح: عبد اللطیف ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کیم جمادی الثانیہ ۷۰ھ

الجواب صحیح: بندہ منظور احمد سلف صالح کا اتباع ضروری ہے۔ زکریا قدوسی

الجواب صحیح: بندہ ظہور الحق، ہذا الجواب ہو الحق وبالاتباع احق، امیر احمد کاندھلوی

الجواب صحیح: عبد الرحمن غفرلہ، احقر علیم اللہ مظاہری

ان تفصیلات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ رسم خط عثمانی میں قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم خط میں قرآن کو لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے، جیسا کہ تنہا غیر عربی رسم خط میں شائع کرنا ناجائز ہے۔ دلائل اوپر مذکور ہیں۔ المجمع الفقہ الاسلامی (رابطہ عالم اسلامی) کے اجلاس منعقدہ ۱۱ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ میں باتفاق رائے رسم قرآنی میں کسی بھی تغیر کو ناجائز قرار دیا ہے (جدید فقہی مسائل ۱/۷۱)۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ میں جو نقطے کاغذ پر ابھار کر حروف بنائے جاتے ہیں ان میں بھی عربی کے بعض حروف کی صوت وشکل موجود نہیں ہے۔ اگر ان کے علاوہ اشاراتی نقطے بھی متعین شکل میں ابھارے جائیں تب بھی قرآنی حروف کو قواعد تجوید کی رعایت سے پڑھنا مشکل ہے۔ اس کے لئے پھر بھی پرانے طریقۂ تعلیم ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ لہٰذا نابیناؤں کے لئے بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا ناجائز ہوگا۔ اوپر کے جواب میں اس کی تفصیلات آچکی ہیں۔

حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ نے ''گجراتی زبان میں قرآن'' کے سلسلے میں سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہی بریل کوڈ پر جاری ہوتا ہے۔ مثلاً الٓم میں رسم خط عثمانی کے مطابق کل تین حروف ہیں اور گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہوجائیں گے (غالباً انگلش حروف میں یہی ہوگا) عربی میں ح اور ہ، ق اور ک، ہمزہ اور ع، ت اور ط، اور س، ص، ث اسی طرح ذ، ض، ز، ظ میں فرق ہے۔ گجراتی میں نہیں۔ (دوسری زبانوں کا بھی یہی حال ہے) اگر علامتیں مقرر کی جائیں پھر بھی ناقص ہیں، جس میں تحریر اور رسم خط کی تحریف کے ساتھ ساتھ ادائیگی میں نمایاں فرق ظاہر ہوگا۔ جس سے بیسویوں غلطیاں اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائے گا۔ اور قرآن کو غلط پڑھنا حرام ہے (فتاوی رحیمیہ ص ۹۹، ۱۰۰ ج ۱، مطبوعہ راندیر بحوالہ اتقان، درمختار، شامی، فتاوی ابن تیمیہ، شرح جزری، ملا علی قاری وغیرہ)۔

اور جب بریل کوڈ میں تیار شدہ قرآن اصل قرآن نہیں ہوگا تو اس کا چھونا بھی جائز ہوگا اور قرآن مجید کی طرح اس کے مخصوص آداب واحکام بھی نہیں ہوں گے۔

موبائل پر قرآن مجید:

موبائل میں قرآن پاک کو لوڈ کرنا جائز ہے۔ اور اس کو سفر حضر میں ساتھ رکھنا بھی درست ہے۔ قرآن مجید کی اصل عبارت تو موبائل کے میموری کارڈ میں محفوظ ہے جو موبائل کے ڈھانچہ سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا موبائل کا ڈھانچہ غلاف کے درجہ میں ہے جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہے،

اور موبائل اون کرنے سے اسکرین پر میموری کارڈ میں فیڈ تحریر کا عکس (فوکس) دکھائی دیتا ہے جو اون کرنے پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اوف کرنے پر غائب ہو جاتا ہے اور جب چاہے اسے ڈی لیٹ یعنی بالکل محو کیا جا سکتا ہے۔ اس کو قرآن مکتوب نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا اس کا بے وضو چھونا بھی جائز ہوگا۔ البتہ جب موبائل کے اسکرین پر قرآن کی عبارت کا عکس موجود ہو تو احتیاطاً اس کو بے وضو نہیں چھونا چاہئے۔

''قال العلامة الحلبي رحمة الله عليه۔ وذكر في الجامع الصغير المنسوب إلى قاضي خان: لا بأس للجنب أن يكتب القرآن والصحيفة أو اللوح على الأرض أو الوسادة عند أبي يوسف رحمة الله عليه۔ خلافا لمحمد رحمه الله تعالى لانه ليس فيه مس القرآن، ولذا قيل: المكروه مس المكتوب لا مواضع البياض۔ ذكره الإمام التمرتاشي رحمه الله تعالى. وينبغي أن يفصل، فإن كان لا يمس الصحيفه بأن وضع عليها بينها وبين يده يؤخذ بقول أبي يوسف؛ لأنه لم يمس المكتوب ولا الكتاب والا فبقول محمد فقد مس الكتاب۔ وقال القدوري: يجوز قال في الفتح؛ وهو أقيس؛ لأنه ماس بالقلم وهو واسطة منفصل فكان كثوب منفصل إلا أن يمسه بيده'' (رسائل ابن عابدين ۱/ ۱۱۳، احسن الفتاوىٰ ۸/ ۲۶)۔

(علامہ حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جامع صغیر میں قاضی خاں کی طرف منسوب کر کے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جنبی کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ قرآن یا مقدس کتاب کو لکھے یا زمین کی تختی یا تکیے پر قرآن وصحیفہ لکھے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک (یہ جائز ہے) لیکن محمدؒ اس کے خلاف ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کتابت کرنے سے قرآن کو چھونا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے مکروہ ''مکتوب'' کو چھونا ہے نہ کہ کتاب کی سفید جگہ کو۔ امام تمرتاشی نے دونوں اماموں کے دو قول کو جمع کرتے ہوئے کہا کہ دونوں اقوال میں فرق رکھا جائے کہ اگر لکھنے والا براہ راست صحیفہ یا قرآن کو مس نہیں کر رہا بلکہ صحیفہ اور لکھنے والے کے ہاتھ کے درمیان کسی چیز (مثلاً قلم) کا واسطہ ہے تو امام ابو یوسفؒ کا قول جواز اختیار کیا جائے گا۔ اور اگر وہ براہ راست یعنی خود کاغذ کو ہاتھ میں لے کر لکھ رہا ہے تو امام محمدؒ کے قول عدم جواز کو لیا جائے گا۔ اس لئے کہ اگر چہ وہ لکھنے والا ''مکتوب'' لکھی ہوئی چیز کو نہیں چھو رہا ہے مگر کتاب کو تو چھو رہا ہے)۔

امام قدوریؒ نے لکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور محقق ابن الہمام نے فتح القدیر میں فرمایا کہ قدوری کی بات سب سے زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والا کتاب کو قلم سے چھو رہا ہے جو کتاب اور لکھنے والے کے درمیان واسطہ منفصلہ ہے۔ جیسے ثوب منفصل یا غلاف۔ لیکن اگر وہ خود اپنے ہاتھ سے چھوئے گا تو جائز نہیں ہوگا۔

اس تحریر سے ظاہر ہوا کہ قرآن فیڈ کئے ہوئے موبائل کو بلا وضو چھونا جائز ہے، کیونکہ یہ مس ثوب منفصل کی طرح ہے جس میں اصل مکتوب کو چھونا لازم نہیں آتا۔ جبکہ ناجائز ''مکتوب'' کو چھونا ہے نہ کہ موبائل کے ڈھانچے کو جو ثوب منفصل کے ہم معنی ہے۔ پھر بھی پڑھتے وقت چونکہ اسکرین کو ہاتھ سے گھمانا پڑتا ہے جہاں عکس قرآن مکتوب کی شکل میں دکھائی دیتا ہے بایں معنی بے وضو چھونے سے بچنا ہی احتیاط کا تقاضا ہے۔

☆☆☆

قرآنِ کریم کی کتابت وطباعت اور چھونے سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی[1]

قرآن کریم فصیح عربی زبان میں "ھدیً للعٰلمین" بنا کر نازل کیا گیا؛ لیکن دنیا کے بہت سارے ممالک میں یہ زبان بولی اور سمجھی نہیں جاتی، جبکہ "ھدیً للعٰلمین" کا تقاضہ ہے کہ اس کے معانی ومفاہیم، اس کے احکام وہدایات، اس کے قصص وامثال سے امتِ دعوت اور امت اجابت دونوں واقف ہوں، اس کا حل صرف یہ تھا کہ قرآن کریم کے تراجم مختلف زبانوں میں کیے جائیں، اور ان کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہو، لیکن خدشہ یہ تھا کہ تراجم کی وجہ سے اصل الفاظ قرآنی کی طرف سے غفلت نہ ہو جائے، اور معانی کی تفہیم وترسیل میں کمی وبیشی کی وجہ سے اصل معنی ومفہوم میں تبدیلی نہ پیدا ہو جائے، کیونکہ تبدیل وتحریف کا دروازہ اسی سے کھلتا ہے، یہ وہ احساسات تھے جن کی وجہ سے ایک زمانہ تک فقہاء متردد رہے کہ ترجمہ کیا جائے یا نہیں، تردد کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قرآن کریم کے ترجمہ میں اس کے الفاظ کا اعجاز اور اس کے اعلیٰ اشارات کا منتقل کرنا ممکن نہیں ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ واقعہ ہے کہ ہم "الکتاب" کے "ال" تک کے ترجمہ پر کلی طور پر قادر نہیں ہیں۔

بعد کے دنوں میں ترجمہ کی ضرورت کا احساس شدید ہونے لگا اور یک گونہ اطمینان بھی رہا کہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ رب العزت نے خود لی ہے، اس لیے ترجمہ سے اس کے الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی نہیں ہوگی، نیز حفاظ کرام جن کا مشغلہ ہر دور میں الفاظ قرآنی کو سینے میں محفوظ کرنا رہا ہے، سبب کے درجہ میں حفاظت قرآن کے لیے موجود ہیں۔

ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فارسی زبان میں اور ان کے نامور صاحب زادگان حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ نے اردو زبان میں ترجمہ کرکے اس بحث کا دروازہ بند کر دیا، اور ہندوستان کی حد تک مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے نے رواج پالیا، البتہ ان تراجم کی اشاعت اصل الفاظ قرآن اور متن کلام الٰہی کے ساتھ ہوتا رہا، اور دھیرے دھیرے علماء کا اس پر اتفاق ہوتا چلا گیا، علامہ ابن ہمام نے "الکافی" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

"فإن کتب القرآن وتفسیر کل حرف وترجمته جاز" (فتح القدیر ۱/۲۹۱)۔

(اگر قرآن کریم لکھے اور ہر حرف کی تفسیر وترجمہ بھی لکھے تو جائز ہے)۔

شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے بھی "مسئلة ترجمة القرآن الکریم" میں صاحب کافی کی اس مشروط اجازت کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

"وصاحب الکافي أجازها بشرط أن یکتب القرآن ویکتب تحته تفسیر کل حرف (۲۶)"

صاحب کافی نے اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے کہ قرآن کریم لکھے اور اس کے تحت ہر حرف کی تفسیر لکھے۔

بغیر عربی متن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت:

لیکن موجودہ دور میں بغیر متن قرآن کے خالی ترجمہ وتفسیر کی اشاعت کا رجحان بڑھا ہے، اس رجحان کے پیچھے غیر مسلموں کو قرآن کریم دینے کی شکل میں احترام قرآن کی بقا اور طباعت کے مصارف میں کمی کار فرما ہے، آخر الذکر، یعنی طباعت کے مصارف میں کمی کا معاملہ تو قابل اعتنا نہیں ہے، جہاں تک احترام قرآن کا تعلق ہے اس کا مطالبہ غیر مسلموں سے ہے ہی نہیں، کیونکہ سارے احکام ایمان کے بعد ہی ان کی طرف متوجہ ہوں گے، دینے والا احترام کو اپنے اوپر لازم رکھ کر دے گا اور ظاہر ہے جس کو قرآن کریم مع ترجمہ کے دینا چاہ رہا ہوگا اس کے بارے میں یہ یقین ضرور ہوگا کہ وہ بادی النظر میں قرآن کریم کی اہانت نہیں، جبکہ

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ و ناظم وفاق المدارس الاسلامیہ بہار۔

کہ معمولاً دیکھا جاتا رہا ہے، اہانت موہوم ہے۔ اور الفاظ قرآن کے فیوض و برکات اور اعجاز یقینی ہیں۔ خود حضور اکرم ﷺ نے غیر مسلم بادشاہوں کو جو خطوط لکھے اس میں ''والسلام علی من اتبع الھدیٰ'' قرآنی آیت موجود ہے، حضرت عمرؓ کو ان کی بہن نے بھی قرآن کریم کفر کی حالت میں پیش کر دیا تھا، یہ اور اس قسم کے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم اصل عربی میں کافروں کو دیا جا سکتا ہے اور صرف اہانت کے خدشہ کی وجہ سے انہیں اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے بغیر متن کے قرآن کریم کی اشاعت درست نہیں ہے۔ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے ''مسئلہ ترجمۃ القرآن'' میں بالاجماع بغیر متن قرآن کے ترجمہ کی اشاعت کو سخت ممنوع قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''أما كتابة المصحف بالفارسية عند فقهاء مذهب الإمام على ما نقل عنهم فهى ممنوعة بالإجماع أشد المنع إن كان مستقلا فمجردا عن النص العربى (۲۶)''

فقہاء مذہب امام سے قرآن کریم کے فارسی میں لکھنے کے بارے میں جو منقول ہے وہ بالاجماع سخت ممنوع ہونے کا ہے اگر وہ مستقل ہو اور عربی متن سے خالی ہو۔

جو لوگ بغیر عربی متن کے قرآن کریم کی اشاعت کو درست قرار دیتے ہیں، ان کا استدلال بخاری شریف کی اس حدیث سے ہے جس میں قرآن کریم کیساتھ دشمن ملک کی طرف سفر کو اہانت قرآن کے خوف سے ممنوع قرار دیا گیا ہے (صحیح بخاری ۱/۴۲۰ حدیث: ۲۹۹۰) اور اسی کو بنیاد بنا کر حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں کافروں کے ہاتھ قرآن کریم کی بیع کو ممنوع قرار دینے پر استدلال کیا ہے، یقیناً یہ مسئلہ درست ہے، کیونکہ دشمن سے احترام قرآن کریم کی توقع نہیں کی جا سکتی، لیکن قرآن کریم اس دور میں جن لوگوں کو دیا جاتا ہے وہ نسبتاً مسلمان اور قرآن کریم کے سلسلے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں، نیز کم از کم اسلام کو سمجھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، ایسے لوگوں سے قرآن کریم کی اہانت کی امید رکھنا عوتی نقطۂ نظر سے بھی صحیح نہیں ہے، ترجمہ کے ساتھ اصل الفاظ قرآن کا دیکھنا بھی ان کے دل کے دروازے کھولنے کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے بغیر قرآن کریم کے صرف ترجمہ کی اشاعت درست نہیں معلوم ہوتی اور ایسے ترجمہ قرآن کے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے سے احتراز لازم ہے۔ اس کے باوجود اگر قرآن کریم کا صرف ترجمہ مطبوع ہو تو احناف کے یہاں مسلمانوں کے لیے اس کا بغیر وضو چھونا مکروہ ہے، عالمگیری میں ہے۔

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبى حنيفة. وكذا عندهما على الصحيح (۱/ ۲۰)''

(اگر قرآن کریم کا ترجمہ فارسی میں لکھا ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا چھونا مکروہ ہے، صاحبینؒ کا بھی صحیح قول یہی ہے)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت:

ترجمہ و تفسیر کے ساتھ قرآن کریم کی طباعت تو ہو رہی ہے؛ لیکن متن قرآن کو، ان لوگوں کے لیے جو عربی رسم الخط سے واقف نہیں ہیں، دوسری زبانوں میں لکھا جائے؛ بایں طور کہ الفاظ تو عربی ہی کے رہیں، صرف رسم الخط ہندی، انگریزی وغیرہ کر دیا جائے تا کہ غیر عربی داں حضرات کے لیے اصل متن قرآن پڑھنے میں سہولت ہو، میری ناقص رائے یہ ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ حضرت عثمان غنیؓ نے جس رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت کرائی اور جو آج رسم عثمانی سے معروف و مشہور ہے، اس رسم الخط میں قرآن کریم کے لکھنے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع منقول ہے، اور اسی وجہ سے ائمہ اربعہ نے قرآن کریم کو رسم عثمانی کے علاوہ لکھنے کو ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ ''شرح السنۃ'' میں علامہ بغویؒ نے لکھا ہے:

''فأمر عثمان بنسخه فى المصاحف وجمع القوم عليه وأمر بتحريق ما سواه قطعا لمواد الخلاف فكان ما يخالف الخط المتفق عليه فى حكم المنسوخ والمرفوع فليس لأحد أن يعدو فى اللفظ إلى ما هو خارج من رسم الكتابة'' (شرح السنة ۴/ ۵۱۱)۔

(حضرت عثمانؓ نے مصاحف میں قرآن کریم کے نقل کا حکم دیا اور امت کو اس پر متفق کر دیا، اس نسخے کے علاوہ کو اختلاف کے خاتمہ کے لیے جلانے کا حکم دیا، چنانچہ جو اس متفق علیہ خط سے الگ تھا وہ منسوخ ہو گیا، اور اٹھا لیا گیا، اس لیے کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ لکھنے میں ایسا طریقہ اختیار کرے جو اس رسم الخط کے علاوہ ہو)۔

''مناہل العرفان'' میں محیط برہانی کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ کا مذہب نقلاً کیا ہے کہ مناسب ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے علاوہ نہ لکھا جائے۔

''أنه ينبغي أن لايكتب المصحف بغير الرسم العثماني'' (۱/ ۲۶۲)۔

امام احمد بن حنبلؒ نے خط عثمانی کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے:

''قال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط عثمان في واو او الف أو غير ذلك'' (الاتقان ۱/ ۴۲۷ النوع السادس والسبعون)۔

امام احمد نے فرمایا: خط عثمانی کی مخالفت حرام ہے واو الف وغیرہ (تک) میں یہی رائے امام شافعیؒ کی ہے کہ کسی قسم کی تبدیلی قرآن کریم کے عثمانی رسم الخط میں نہیں کی جاسکتی، مثلاً ربوٰ کا لفظ قرآن کریم میں واو اور الف کے ساتھ ہے تو اسے یا اور الف کے ساتھ نہیں لکھا جائے گا بلکہ واو اور الف کے ساتھ ہی لکھا جائے گا، کیونکہ مصحف عثمانی میں ایسا ہی لکھا ہے اور مصحف عثمانی کی اتباع کی جاتی رہی ہے، ''المنہج'' میں ہے:

''كلمة الربوا تكتب بالواو والالف كما جاء في الرسم العثماني ولا تكتب في القرآن بالياء أو الالف فتكتب الواو أولا في الياء والألف بعدها. وهذه طريقة الصحف العثماني۔ لأن رسمه سنة متبعة'' (حاشية الجمل على المنهج ۵/ ۲۹۲)۔

کلمہ ربوا کو واو اور الف کے ساتھ لکھا جائے گا جیسا کہ رسم عثمانی میں ہے، یا اور الف کے ساتھ نہیں لکھا جائے گا، باواو کے بعد پہلے واو پھر الف لکھا جائے گا، مصحف عثمانی کا یہی طریقہ ہے اور اس کے رسم الخط کے طریقہ کی اتباع کی جاتی رہی ہے۔

علامہ سیوطی نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں اشہب کے حوالہ سے امام مالکؒ سے اس سوال کا جواب نقل کیا ہے کہ کیا قرآن کریم کو آج کل کے مروجہ رسم الخط میں لکھ سکتے ہیں تو فرمایا:

''لا، إلا على الكتبة الأولى، رواه الداني في المقنع ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة'' (۱/ ۴۲۷ النوع السادس والسبعون)۔

نہیں، پہلے سے رائج طریقہ پر لکھنا ضروری ہے، دانی نے مقنع میں روایت کیا، پھر فرمایا: علماء امت میں کسی کا اس مسئلے میں اختلاف نہیں ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں صراحت کی ہے کہ جو کوئی مصحف شریف کی کتابت کرے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس طریقہ پر کتابت کرے جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے لکھا، اس میں تغیر وتبدل نہ کرے، اس لیے کہ وہ زیادہ علم، سچے دل وزبان والے اور زیادہ امین تھے، ہمیں انکی کمی کے پورا کرنے کا وہم وگمان بھی نہیں ہونا چاہیے (۱/ ۴۱۲)۔

اگر دوسری زبانوں کے رسم الخط میں قرآن کریم لکھا جائے گا تو جمہور کے مذہب کی مخالفت لازم آئے گی؛ کیونکہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کے بارے میں توقیفی اور سماعی ہونے پر اجماع ہے، نیز ایسا کرنا امت کے تعامل کے بھی خلاف ہے واقعہ یہ ہے کہ عربی کے بہت سارے حروف کا بدل دوسری زبانوں میں موجود نہیں ہے، اور اس کی کی وجہ سے قرآن کریم کے عربی رسم الخط کو دوسری زبانوں میں منتقل نہیں کیا جاسکتا، اور منتقل کرنے کی کوئی بھی کوشش تغیر وتبدل کا دروازہ کھول دے گی، مخارج الفاظ، مدات، غنہ، اخفا، وقف، الفاظ کی صفات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جائے گی، مخارج کی عدم رعایت سے معنوی تحریف کا اندیشہ اور امکان ہی نہیں یقین ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں حافظ ابن حجرؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے اور اس خیال کو کہ دیگر رسم الخط میں مصحف کے لکھنے کی وجہ سے عجمیوں کے لئے تعلیم میں سہولت ہوگی، بالکلیہ رد کردیا ہے اور ان مصلحتوں کی وجہ سے رسم عثمانی کے خلاف کتابت قرآن کو ناقابل التفات قرار دیا ہے۔

''وزعم أن كتابته بالعجمية فيها سهولة للتعليم، كذب مخالف للواقع والمشاهدة فلا يلتفت لذلك على أنه لو سلم صدقه لم يكن مبيحا لإخراج ألفاظ القرآن لو كتب عليه وأجمع عليه السلف والخلف'' (۱۷/ ۸۳)۔

(اور عجمی زبانوں میں کتابت کی وجہ سے تعلیم میں سہولت کا خیال غلط اور خلاف واقعہ اور مشاہدہ ہے، اس لیے اس کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے اگر اس کی صداقت کو تسلیم کرلیا جائے تو بھی الفاظ قرآن کے اس طرز تحریر سے الگ ہونے کی وجہ سے جس پر سلف وخلف کا اجماع ہے، یہ جائز نہیں ہوگا)۔

اس لیے احقر کے نزدیک یہ کام مفاسد سے بھرا ہوا ہے اور مصالح جن کا ذکر کیا جاتا ہے، ناقابل التفات ہیں اور اصول یہ ہے کہ مفاسد کا ازالہ مصالح کے

حصول کی بہ نسبت مقدم ہوتا ہے، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ "درء المفاسد أولی من جلب المصالح" (الاشباہ) اور جن حضرات نے متن عربی کے نیچے تابع بنا کر دوسرے رسم الخط میں مشروط لکھنے کی اجازت دی ہے وہ ایسی شرطوں پر مشتمل ہے جن کا وقوع متحقق نہیں ہے، اس لیے خلاصہ اس کا بھی یہی ہے کہ متن قرآن کو غیر عربی رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت وطباعت:

بریل کوڈ میں لکھے گئے قرآن کریم بھی رسم عثمانی کے خلاف ہیں، اور درج بالا اصول وضوابط کے مطابق اس کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہیے، لیکن یہاں نابیناؤں کے لیے شدید ضرورت ہے، اس کے بغیر ان کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کی کوئی شکل نہیں ہے، اس کے علاوہ بریل کوڈ میں عربی کے حروف تہجی، اعراب، حرکات وسکنات کے لیے ایسی علامتیں مقرر ہیں، کہ اس کو پڑھنے والا عثمانی رسم الخط میں لکھے قرآن کریم کی طرح ہی مخارج کے ساتھ حروف کی ادائیگی، مد لازم، عارض، وقف لازم عارض اور تجوید کے دوسرے اصول کی رعایت کے ساتھ تلاوت کرسکتا ہے، اس لیے بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت وطباعت درست ہے، البتہ ترجمہ قرآن کی طرح اس کے ساتھ بھی اصل الفاظ قرآنی اوپر لکھے جائیں اور پھر بریل کوڈ میں اسے درج کیا جائے، تو یہ شکل زیادہ مناسب ہوگی۔

بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن کریم، خواہ متن عربی کے ساتھ ہو یا صرف بریل کوڈ میں، بہر صورت اس کو چھونے کے لیے وضو کا ہونا ضروری ہوگا اور اس کا حکم اصل قرآن کریم کا ہوگا، "الموسوعۃ الفقہیہ" میں صراحت ہے کہ:

"المصحف إن كتب على لفظه العربي بحرف غير عربية فهو مصحف وله أحكام المصحف" (۳۸/ ۱۰)۔

قرآن کریم کے الفاظ کو اگر غیر عربی حرف کے ذریعہ لکھا جائے تو بھی وہ مصحف کہلائے گا اور اس پر مصحف کے احکام لاگو ہوں گے۔

موبائل پر قرآن کریم کی آیات کا بلا وضو چھونا:

ان دنوں موبائل، لیپ ٹوپ وغیرہ کا استعمال قرآن کریم کی تلاوت اور سننے کے لیے بھی کیا جاتا ہے، سنتے وقت اگر صرف آواز آرہی ہو، اسکرین پر قرآن کریم کی عربی میں آیات موجود نہ ہو تو اس کا چھونا، سننا، واٹس اپ پر ڈالنا صرف آواز کو لوڈ کرنا بلا وضو جائز ہے اور اس کا حکم بکس میں بند قرآن کریم جیسا ہے، لیکن قرآن کریم پڑھنے کے لئے آیات قرآنی مکتوب شکل میں موبائل کے اسکرین پر موجود ہو تو اس کا بلا وضو چھونا جائز نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس صورت میں موبائل کا اسکرین ورق قرآن کریم کے قائم مقام ہوگا، اور قرآنی اوراق کا بلا وضو چھونا اللہ تعالی کے قول "لا یمسہ الا المطہرون" (سورۂ واقعہ:۷۹) کے بموجب درست نہیں ہے، کیونکہ اس مسئلے میں داؤد ظاہری کے علاوہ کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے کہ قرآن کریم کے چھونے کے لیے حدث اصغر اور حدث اکبر سے پاک ہونا ضروری ہے۔

البتہ موبائل کے اوپر ایسا کور ہو جو موبائل سے الگ ہو اور اوپر سے اسکرین پر نظر آنے والی آیات کا پڑھنا ممکن ہو تو یہ کور غلاف کے قائم مقام سمجھا جائے گا اور اس کور کے ساتھ اس کا چھونا بغیر وضو بھی جائز ہوگا، البتہ احوط اور انسب یہی ہے کہ باوضو چھوا جائے، اگر کسی نے ایسے کور کے ساتھ بلا وضو چھوا اور پڑھا تو اس کی گنجائش ہے۔

"وكذا المحدث لا يمس المصحف إلا بغلافه" (الهداية مع الفتح ۱/ ۱۷۰)۔

(محدث شخص قرآن کریم کو بغیر غلاف کے نہیں چھو سکتا)۔

اور غلاف بھی ایسا ہونا چاہیے جو چھونے والے اور موبائل کی اسکرین پر موجود قرآن کریم کے علاوہ تیسری چیز ہو، عنایۃ میں ہے۔

"وغلافه ما كان متجافيا عنه أي متباعدا بأن يكون شيئا ثالثا بين الماس والممسوس" (عناية مع الفتح ۱/ ۱۴۳)۔

(اور اس کا غلاف قرآن کریم سے اس طرح الگ ہو کہ چھونے والے اور چھوئی جانے والی چیز (قرآن کریم) سے الگ تیسری چیز معلوم ہو)۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن مقدس کی اشاعت

مفتی شبیر احمد قاسمی[1]

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

متن کے بغیر دوسری کسی بھی زبان میں قرآن کریم کا خالص ترجمہ شائع کیا جائے، تو ایسی صورت میں اس ترجمہ کو قرآن کریم کے اصل متن کی حیثیت ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی، نہ ہی اسے پڑھنے کو تلاوت قرآن قرار دیا جائیگا اور نہ ہی اسے پڑھنے والوں کو تلاوت قرآن کا ثواب ملے گا، نہ ہی نماز میں قرآۃ کی جگہ اسے پڑھنا جائز ہوگا، ان احکامات کے علاوہ مزید خالص ترجمہ شائع کرنے کی صورت میں پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں یہ بات بھی بیٹھ سکتی ہے کہ یہی اصل قرآن مقدس ہے اور پھر اس ترجمہ کو آہستہ آہستہ اصل قرآن کی حیثیت دینے لگیں گے، سوال نامہ میں اس کے جو فوائد بیان کئے گئے ہیں، ان فوائد کے مقابلہ میں نقصان زیادہ ہونے کا خطرہ ہے؛ اسی لئے بغیر متن کے صرف ترجمہ کی اشاعت مصالح شرعیہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے؛ لہٰذا متن کے بغیر کسی بھی زبان میں قرآن مقدس کا صرف ترجمہ شائع کرنا ہمارے نزدیک جواز کے دائرے میں نہیں آسکتا اور اسے خرید کر تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا بھی کار ثواب نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ اس میں فائدہ کے بجائے نقصان زیادہ ہے اور اس کے عدم جواز کی بات ''حاشیۃ المغنی لابن قدامہ'' کی اس عبارت سے مستفاد ہوتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیے: ''وهو إنما نزل باللسان العربي كماهو مصرح به في الآيات المتعددة، وإنما كان تبليغه والدعوة إلى الإسلام والإنذار به كما أنزل الله تعالى، ولم يترجمه النبي ﷺ، ولا أذن بترجمته، ولم يفعل ذلك الصحابة، ولاخلفاء المسلمين، وملوكهم ولو كتب النبي ﷺ كتبه إلى قيصر و كسرى ومقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذي علل به'' (حاشية المغني بيروت ۱/۲۸۹)۔

۲- متن کے ساتھ ترجمہ قرآن کی اشاعت:

قرآن کریم کی اصل عربی متن کے ساتھ جوڑ کر اس کا ترجمہ دوسری کسی بھی زبان میں کر کے شائع کیا جائے مثلاً اردو، انگریزی، ہندی، فارسی، فرانسیسی، مراٹھی، تامل اور کیرل الغرض کسی بھی زبان میں اصلی متن کے ساتھ جوڑ کر ترجمہ کر کے شائع کیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ اور تردد نہیں بشرطیکہ مترجم قرآن کریم کا ترجمہ دوسری زبان میں صحیح طور پر کرتا ہو، قرآن کے معانی اور مقصد اس ترجمہ میں صاف طور پر واضح ہو اور عربی محاورہ میں آیت قرآنی کے مقصد کے خلاف ترجمہ میں کوئی بات نہ آنے پائے، تو اس طریقے سے قرآن کا ترجمہ متن کے ساتھ جوڑ کر شائع کرنا بلاشبہ جائز ہے، چاہے متن کے نیچے ترجمہ لکھا جائے یا دو کالموں میں کر کے ایک کالم میں قرآن کا متن اور دوسرے کالم میں اس کا ترجمہ ہو دونوں طرح جائز ہے جیسا کہ فقہاء کی درج ذیل عبارات سے جواز کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''ذكر الشيخ الإمام شمس الأئمة السرخسي في شرح الجامع الصغير: وإن كتب القرآن وتفسير كل حرف و ترجمته تحته۔ زوي عن الشيخ الفقيه أبي جعفر: أنه لابأس به في ديارنا'' (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني القرأة، زكريا ۲/۷۵، رقم: ۱۷۹۲، المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في الفرائض، المجلس العلمي ۲/۵۲، رقم: ۱۲۱۸)

فتح القدیر اور شامی میں ''کافی'' کے حوالہ سے اس کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''فإن كتب القرآن و التفسير كل حرف و ترجمته جاز'' (شامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، زكريا ۲/۱۸۶،

[1] خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو- پی)۔

کراچي ۳۸۶/۱، فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، زكريا ۲۹۱/۱، كوئٹه ۲۴۸/۱، دار الفكر مصري ۳۸۶/۱)۔

۳-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

جو لوگ شروع ہی سے دینی تعلیم سے دور ہیں اور قرآن کریم ناظرہ پڑھنے کا بھی ان کے اندر احساس پیدا نہیں ہوا اور ماں باپ نے کبھی نہیں سوچا کہ بچوں میں قرآن کریم کی تعلیم دینا اسلامی فریضہ ہے، بعد میں ان بچوں میں شعور آجانے کے بعد احساس پیدا ہوجاتا ہے کہ ہمیں قرآن پڑھنا چاہئے اور قرآن سے لگاؤ ہونا چاہئے، مگر قرآن کے ایک حرف پڑھنے پر بھی قادر نہیں ہوتے ہیں، پھر ان کے دلوں میں یہ داعیہ پیدا ہوجاتا ہے کہ جو زبان ہم نے پڑھ رکھی ہے، اسی زبان کی رسم الخط میں اصل قرآن کی کتابت ہوجانی چاہئے تاکہ ہم بھی اصل قرآن مقدس کی تلاوت کرسکیں اور یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ اسلامی تعلیم حاصل کرنا ہمارے اوپر لازم ہے، کم سے کم قرآن کریم ناظرہ پڑھنے کے ہم لائق بن جائیں؛ بلکہ قرآن کریم کو اپنی پڑھی ہوئی زبان کے تابع بناکر پڑھنے کی سوچ ان کے اوپر غالب آجاتی ہے؛ چنانچہ اپنی اس سوچ اور فکر کی وجہ سے قرآن کریم کو غیر عربی رسم الخط میں لکھنے کے لئے ایک مشن چلایا جاتا ہے اور چونکہ دینی تعلیم حاصل کرنیوالے علماء اور دینی ذمہ داروں کے مقابلہ میں اس طرح کے لوگ زیادہ پیسے والے ہوتے ہے، اپنے پیسوں کے زور سے ان کا یہ مشن جلدی نمایاں ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کے مشن سے متعلق علماء کو غور کرنا پڑ جاتا ہے؛ لہٰذا اس سلسلے میں ہر اہل قلم کو غور کرنا ہے، کیا ایسا ممکن ہے کہ قرآن کریم کے ہر حرف کے متبادل دوسری زبان میں بھی حروف ہوں، یہ بڑا مشکل مسئلہ ہے مثلاً ج، ذ، ز، ظ ان کے متبادل حروف انگریزی، ہندی، فارسی، بنگالی، مراٹھی، تامل، فرانسیسی اور کرل زبان میں ہرگز نہیں ہے، اسی طرح ص، س اور ث ان کے متبادل حروف بھی دیگر زبانوں میں نہیں ہے کہ جو ان کا معنی ادا کرسکے، ابھی ہم سعودی عرب سے سفر حج سے واپس آرہے تھے کہ جہاز کے اسکرین پر انگریزی حروف میں ''ل'' سے ''Jeddah'' لکھا ہوا آرہا تھا اور پھر ''ڈی'' سے ''Deddah'' لکھا ہوا آرہا تھا صرف جدہ کی ادائے گی میں انگریزی زبان میں تردد ہے کہ ''ل'' لکھا جائے یا ''D'' سے لکھیں تو اسی طرح لفظ ''ضلالۃ'' اگر لفظ ''ل'' سے لکھیں تو ''جلالۃ'' ہوجائے گا۔ اور اگر ''Z'' سے لکھیں تو ''زلالۃ'' ہوجائیگا۔ معلوم ہوا ''ض'' کے متبادل ان کے یہاں کوئی حرف نہیں، اسی طرح ہندی زبان میں بھی لفظ ''ج، ذ، ز، ض، ظ اور س، ص، ث'' ان تمام حروف کے متبادل نہیں ہے انہیں وجوہات کی بناپر حضرات علماء کرام نے غیر عربی رسم الخط میں قرآن لکھنے سے منع فرمایا ہے؛ اس لئے ہم بھی غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کا متن لکھنے کو قطعی طور پر ناجائز سمجھتے ہیں۔

علماء کرام کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''قال الإمام المحبوبي: أما لو اعتاد قرأة القرآن، أو كتابة المصحف بالفارسية منه يمنع أشد المنع حتى أن واحدا من أهل الهواء. في زمان الشيخ الإمام الجليل أبي بكر محمد بن الفضل كتب فتوى و بعثها إليه أن الصبيان في زماننا يشقّ عليهم التعلم باللغة العربية، هل يجوز لنا أن نعلمهم بالفارسية. قال للمستقي: ارجع حتى نتامل: ثم استخبر من حاله، فإذا هو كان معروفًا بفساد مذهبه فأعطي لواحدٍ من خدامه سكينا، فقال: أقتله بهذا ومن أخذك به، فقل: إن فلانًا أمرني به ففعل، فجاء الشرطي إليه وقال: ان الأمير يدعوك فذهب الشيخ إليه فقص القصة، وقال: إن هذا كان يريد أن يبطل كتاب الله فخلع له الأمير وجازاه بالخير. ثم وقوله: وكان الشيخ أبوبكر محمد بن الفضل يقول: أما من تعمد ذالك يكون زنديقًا، أو مجنونًا. فالمجنون يداوى الزنديق يقتل'' (الكفاية مع الفتح، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كوئٹه ۲۴۸/۱، ۹۱/۱)۔

اسی سے متعلق شعب الایمان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''من يكتب مصحفًا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوابه تلك المصاحف ولايخالفهم فيه ولايغير مما كتبوه شيئًا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا، و لسانا، وأعظم أمانة، فلاينبغي أن نظن بأنفسنا استدركا عليهم'' (شعب الإيمان للبيهقي، دار الكتب العلمية بيروت ۵۴۸/۲)۔

اس سے متعلق ''الاتقان'' للسیوطی کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''وقال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واؤ، أو ياء، أو الف، أو غير ذلك (الإتفاق للسيوطي ۲/۱۷۱، ۱۷۰)

اسی سے متعلق ''حاشية المغني لابن قدامه'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''أما عند الأئمة الشافعية قدمنا عن الإمام الزركشي احتمال الجواز، وأن الأقرب المنع من كتابة القرآن بالفارسية كما تحرم قرأته بغير لسان العربية'' (المغني، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، باب صفة الصلاة، ۱/۲۸۹)۔

اور اس مسئلہ سے متعلق ''کفایہ، فتح القدیر'' اور ''شامی'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''وفي الكافي: ان اعتاد القرأة بالفارسية، أو أراد أن يكتب مصحفًا بها يمنع'' (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، زكريا ۱/۲۹۱، كوئته ۱/۲۴۸، دار الفكر مصري، ۱/۲۸۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، اشرفية ۱/۹۱، كوئته ۱/۲۴۸ شامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، زكريا ۲/۱۸۷، كراچي ۱/۲۸۶)۔

۴- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

نابینا مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے اگر بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت کردی جائیں اور اس سے نابینا لوگ قرآن کریم کی تلاوت پر قادر ہوجائیں، تو ایسی صورت میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا؛ کیونکہ اس میں آئندہ چل کر کے کسی قسم کی شرعی خرابی کا اندیشہ نہیں ہے؛ بلکہ نابیناؤں کے علاوہ گونگوں کے لئے بھی قرآن سکھانے کی کوئی بھی بہتر شکل ہو تو اس شکل کو اختیار کرنا بھی بلا شبہ جائز ہوگا، بعض روایات سے اس کی جواز کی بات معلوم ہوتی ہے؛ چنانچہ امام بیہقیؒ کی شعب الایمان کی ایک عبارت سے اس کے جواز کی بات مستفاد ہوتی ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''قال الحليمي: ولأن النقطة ليست بمقروة فيتوهم لأجلها ما ليس بقرآن قرآنا، وإنما هي دلالات على هيئة القرآن، فلا يضر إثباتها لمن يحتاج إليها'' (شعب الإيمان، دار الكتب العلمية بيروت ۲/۵۴۸، رقم: ۲۶۷۷)۔

۵- موبائل پر قرآن مجید:

موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم کے حروف نمایاں طور پر صاف نظر آتے ہیں اور اس پر آسانی کے ساتھ تلاوت بھی کرسکتے ہیں، اب اس بارے میں دو مسئلے زیر غور ہیں۔

(۱) جس موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم آتے ہیں، اس کو بے وضو پکڑنے اور چھونے کا مسئلہ ہے۔

(۲) اور اس کو جیب میں لے کر بیت الخلاء میں داخل ہونے کا مسئلہ ہے۔

پہلا مسئلہ: قرآن کریم جب موبائل کی اسکرین پر نمایاں طور پر ظاہر ہوجائے تو اس کو چھونے اور پکڑنے کے بارے میں موبائل کی دو شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔

۱- بے وضوء اسکرین والے موبائل پر قرآن مجید کو پکڑنا:

اس موبائل پر کوئی ایسا غلاف یا کور چڑھا ہوا ہو جو موبائل سے بالکل الگ ہو، جب چاہے اس کور کو موبائل سے الگ کیا جاسکتا ہو، تو ایسی صورت مین یہ کور قرآن کریم کے جزدان کے درجے میں ہوگا اور اس کور کے لگے ہوئے ہونے کی حالت میں اس موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم نمایاں طور پر صاف ظاہر ہوجائے تو بلا وضوء کور کے اوپر سے اس موبائل کو پکڑنا جائز اور درست ہوگا اور اسے پکڑنے کے لئے باوضو ہونا لازم نہیں، جیسا کہ حسب ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''يحرم مسها: أي الآية لقوله تعالى: لايمسه إلا لمطهرون سواء كتب على قرطاس، أو درهم، أو حائط إلا بغلاف متجاف عن القرآن والحائل كالخريطة في الصحيح، ويكره بالكم تحريمًا لتبعية للابس۔ وفي الطحطاوية: قوله يكره بالكم تحريمًا صححه۔ في الهداية، وفي المحيط، وجامع التمرتاشي: لايكره مسه بالكم عند العامة؛ لأن المحرم المس، وذلك بالمباشرة باليد بلاحا‌ئل'' (طحطاوي على المراقي، كاب الطهارة، باب الحيض و النفاس

والإستحاضة، دار الكتاب ١٤٣)۔

اور "ملتقي الأبحر" میں اس کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"لايجوز لمحدث مس مصحف إلا بغلافه المنفصل لا المتصل في الصحيح۔ وفي در المنتقى: قوله في الصحيح: وعليه الفتوى. وكره المس بالكم، أو بشئ من الثوب الذي على الماس؛ لأنه تبع وقيل: لايكره۔ وجعله في المحيط قول الجمهور" (الدر المنتقى على الملتقى الأبحر، كتاب الطهارة، دار الكتب العلمية بيروت ١/٣٢)۔

اور شامی میں ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"ومسه ولو مكتوبًا بالفارسية في الأصح إلا بغلافه المنفصل۔ وفي الشامية قوله: إلا بغلافه المنفصل: أي كالجراب والخريطة دون المتصل كالجلد المشرز هو الصحيح، وعليه الفتوى؛ لأن الجلد تبع له" (شامي، كتاب الطهارة، باب الحيض، زكريا ١/٣٨٨، كراچي ١٧٣)۔

۲- اسکرین پر قرآن کے حروف ظاہر ہونے کی حالت میں چھونا:

جس موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم کے حروف نمایاں طور پر ہوتے ہوں اور اس کے اوپر کور چڑھا ہوا نہ ہو، تو ایسی صورت میں جب اس موبائل کی اسکرین پر قرآن مقدس کے حروف نمایاں طور پر ظاہر ہو جائیں تو اس وقت اس موبائل کو بغیر وضوء کے چھونا اور پکڑنا جائز نہیں ہوگا اور اس کی دوسری پشت کا حکم ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایسی جلد ہو جو اس کے جز لاینفک اور متصل ہو اور وہ اس سے الگ نہیں ہوتی ہو تو جس طرح قرآن کریم کی جلد کے اوپر سے بلا وضوء پکڑنا ممنوع ہے، اسی طرح یہ حکم قرآن کریم کے حروف نمایاں ہونے کی حالت میں موبائل کی دوسری پشت سے پکڑنے کا ہوگا، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔ جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

"ومسه ولو مكتوبا بالفارسية في الأصح إلا بغلافه المنفصل. وكذا يمنع حمله كلوح وورق فيه آية۔ وفي الشامية قوله: ومسه أي القرآن ولو في لوح، أو درهم، أو حائط؛ لكن لايمنع إلا من مس المكتوب بخلاف المصحف، فلا يجوز مس الجلد وموضع البياض منه۔ وقال: بعضهم يجوز، وهذا أقرب إلى القياس، والمنع أقرب إلى التعظيم كما في البحر: أي والصحيح المنع، وقوله: إلا بغلافه المنفصل: أي كالجراب، والخرقة دون المتصل كالجلد المشرز هو الصحيح، وعليه الفتوى؛ لأن الجلد تبع له" (شامي، كتاب الطهارة، باب الحيض، زكريا ١/٣٨٨، كراچي ١/٢٩٣)۔

"ہدایہ مع فتح القدیر" میں اس کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"وليس لهم مس المصحف إلا بغلافه، ولا أخذ درهم فيه سورة من القرآن إلا بصرته، وكذا المحدث لايمس المصحف إلا بغلافه۔ لقوله عليه السلام "لايمس القرآن إلا طاهر" ثم الحدث، والجنابة. حلا اليد فيستويان في حكم المس، والجنابة حلت الفم دون الحدث، فيفترقان في حكم القرأة، وغلافه ما يكون متجافيًا عنه دون ما هو متصل به الجلد المشرز هو الصحيح۔ وفي الفتح قوله: وغلافه مايكون متجافيا عنه: أي منفصلا وهو الخريطة خلافا لمن قال: هو الجلد، أو الكم؛ لأن الجلد الملصق تابع له حتى يدخل في بيعه بغير شرط، فلمسه حكم مسه والكم تابع للماس، فالمس به كالمس بيده والمراد بقوله: يكره مسه بالكم كراهة التحريم" (فتح القدير، كاب الطهارة، باب الحيض والإستحاضة، زكريا ١/١٦٢، كوئٹہ ١/١٣٩)۔

اور "ملتقی الابحر" میں اس کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"لايجوز مس مصحف إلا بغلافه المنفصل لا المتصل في الصحيح، وكره المس بالكم ولا مس درهم فيه سورة۔ وفي در المنتقي في الصحيح وعليه الفتوى، وكره المس بالكم، أو بشئ من الثوب الذي على الماس؛ لأنه تبع له، وقيل: لايكره و جعله في المحيط قول الجمهور: وتبعه الدرر والتنوير ولا يجوز مس درهم فيه سورة. أي آية إلا بصرته؛

لأنها كالغلاف'' (در المنتقي، كتاب الطهارة، دارالكتب العلمية بيروت ۴۳/۱)۔

۶- اسکرین والے موبائل کو لے کر بیت الخلاء میں داخل ہونا:

جس موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم نظر آتا ہو، اس موبائل کو جیب میں لے کر بیت الخلاء وغیرہ میں داخل ہونا جائز نہیں ہوگا اور اسکرین پر قرآن کریم ظاہر نہ ہونے کی حالت میں اس کو جیب میں محفوظ کر کے بیت الخلاء وغیرہ میں داخل ہونا جائز اور درست ہوگا؛ کیونکہ ایسی صورت میں قرآن کریم کی بے ادبی نہیں ہے اور اسکرین پر ظاہر نہ ہونے کی حالت میں بظاہر ایسا ہے کہ اس موبائل میں قرآن کریم ہے ہی نہیں؛ بلکہ قرآن کریم موبائل پر اس وقت آتا ہے، جب موبائل کھول کر قرآن والے پروگرام کو چالو کیا جائے گا تب قرآن کے حروف اسکرین پر دکھائی دیتے ہیں؛ لہٰذا اس کا حکم ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ آیت لکھی ہوئی سکہ وغیرہ کو جیب میں لے کر داخل ہونا بلا کراہت جائز ہوتا ہے۔

جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

''وفي فتاوى آهو لا بأس بالتسمية على الدراهم أن قصد صاحبه العلامة لا التهاون. قال القاضي الإمام علي السغدي: وهذه المسئلة نظير الرجل إذا كان له خاتم مكتوب عليه إسم من أسماء الله، فأراد أن يدخل الخلاء والخاتم في إصبعه أنه لا يكره'' (الفتاوى التاتار خانية، كتاب الكراهية، الفصل الخامس في المسجد والقبلة وغيرها، زكريا ۱۸/۶۲، رقم: ۲۸۰۵۳)۔

اور اس مسئلہ کو ''مجمع الانہر'' میں ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

''وكذا دخول الخلاء وفي أصبعه خاتم فيه شئ من القرآن، أو من أسماء الله تعالى لما فيه من ترك التعظيم، وقيل: لا يكره أن جعل فصه إلى باطن الكف، ولو كان ما فيه شئ من القرآن، أو من أسماء الله تعالى في جيبه لا بأس به، وكذا لو ملفوفًا في شئ؛ لكن التحرز أولى'' (مجمع الأنهر، كتاب الطهارة، دارالكتب العلمية بيروت ۴۳/۱)۔

اور ''فتح القدیر'' میں اس کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

''ولو كانت رقية في غلاف متجاف عنه لم يكره دخول الخلاء به والاحتراز عن مثله أفضل الخ'' (فتح القدير، كتاب الطهارة، باب الحيض والإستحاضة، زكريا ۱/۱۷۳، كوئٹه ۱/۱۴۹)۔



قرآن مجید کے متن و ترجمہ کی کتابت و اشاعت سے متعلق بعض مسائل

مولانا محمد مصطفیٰ عبد القدوس ندوی [1]

ہمارے اکابر اصحاب افتاء کی رائے درست ہے کہ تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ممنوع ہے، ایسا اس لئے ہے تاکہ قرآن پڑھنے والوں کا رشتہ قرآن مجید سے قائم رہے، نیز قرآن پڑھنے والا قرآنی عربی الفاظ کے برکات سے محروم نہ رہے، اور اللہ تعالیٰ نے عربی متن قرآن میں جو تاثیر و سحر انگیزی رکھی ہے، اور جو اس میں حلاوت و مٹھاس، ایک خاص قسم کا سرور و کیف، خوش قراءت اور خوش سماع پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں ترجمہ میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

نیز تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت سے لوگوں کی توجہ اصل قرآن سے آہستہ آہستہ ہٹنے لگے گی اور قرآن کے عربی الفاظ جس کی تعلیم اسلام کی اساسیات میں سے ہے، مقصود بالذات عبادت ہے، جس کے ضیاع کے اندیشہ کی بناء پر اس کی تعلیم پر اجرت کو ان فقہاء نے بھی جائز قرار دیا ہے، جو طاعت پر اجرت کو اصلا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ پس سد ذریعہ اصول کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کے عربی متن کو چھوڑ کر تنہا ترجمہ کی اشاعت ناجائز ہو ورنہ ترجمہ کے راستہ سے آہستہ آہستہ ترجمہ سے ترجمہ شروع ہو جائے گا (دیکھئے: لغۃ القرآن الکریم ۷۵۳، مناہل العرفان للزرقانی ۲/ ۹۳، ۱۰۸، ۱۳۳، مباحث فی علوم القرآن از مناع القطان: ۳۲۵، مباحث فی الترجمۃ لمعانی القرآن الکریم از دکتور راشد نسیم ندوی: ۷۹)، اور ترجمہ سے ترجمہ کرنا فساد سے خالی نہیں، کیونکہ اس سے تحریف معنوی کا قوی اندیشہ ہے۔

شریعت اسلامیہ کا ایک اصول یہ ہے کہ جس کا کام کرنا ممنوع ہو تو اس کام کے کرنے کا دوسرے سے مطالبہ کرنا بھی ممنوع ہوتا ہے، "ما حرم فعله حرم طلبه" (الاشباہ/۱۵۵)، جیسے شراب کا پینا حرام ہے تو دوسروں سے شراب پینے کا مطالبہ کرنا یا دوسروں کو شراب پلانا بھی حرام ہوگا، اسی بناء پر فقہاء نے لکھا ہے کہ قبلہ رخ ہو کر پیشاب و پاخانہ کرنا خلاف ادب ہے، بچے کو قبلہ رخ کر کے پیشاب و پاخانہ کرنا بھی خلاف ادب ہوگا، پس اس فقہی قاعدہ کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ جب بغیر عربی متن کے تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ممنوع قرار پائی تو اسے دوسروں سے بیچنا، ہدیہ کرنا اور مفت تقسیم کرنا بھی ممنوع و ناجائز قرار پائے گا۔

جو عمل کسی بھی وجہ سے شرعاً ممنوع ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ معصیت ہے، اس کام کو نہیں کرنا چاہئے، اور تنہا ترجمہ کلام پاک کی اشاعت ممنوع ہے، اس لئے اس کی اشاعت میں شرکت، کسی طرح معاونت، اسے خرید و فروخت کرنا، تقسیم کرنا اور دوسروں کو ہدیہ دینا معصیت پر مدد کرنا لازم آئے گا، اور معصیت پر مدد کی ممانعت نص قرآنی سے ثابت ہے، "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲) (گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد مت کرو)۔

بے وضو تنہا ترجمہ قرآن مجید چھونے کا حکم:

اگر تنہا ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت عمل میں آگئی، تو آیا اسے بلا وضو چھونے کی شرعاً گنجائش ہوگی یا نہیں؟ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ترجمہ قرآن مجید قرآن کے حکم میں نہیں ہے، جب قرآن کے حکم میں نہیں تو اسے بے وضو چھونا بھی جائز نہیں، البتہ مستحب و مستحسن ہوگا کہ وضو کر کے اسے چھوا جائے، اس لئے کہ عام دینی کتب اور تفسیر کی کتابوں کو چھونے کے لئے فقہاء نے وضو کو مستحب قرار دیا ہے۔

غیر عربی رسم الخط میں متن قرآن کی کتابت:

غیر عربی رسم الخط میں متن قرآن کی کتابت و اشاعت کا حکم بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسم عثمانی کے بارے میں گفتگو کی جائے، اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ آیا رسم عثمانی توقیفی ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں علماء کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: رسم عثمانی توقیفی ہے:

---

[1] استاذ جامعۃ الصالحات، کڑپہ، آندھرا پردیش۔

رسم عثمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے منقول چلا آرہا ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، جسے اصطلاح میں توقیفی کہا جاتا ہے، اس میں کسی انسان کے اجتہاد وقیاس کا ذرہ برابر دخل نہیں ہے، جیسے جیسے اور جب بھی قرآن نازل ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی صحابہ کرامؓ کو قلم بند کرنے کا حکم فرماتے، اور وہ ضبط تحریر فرمالیتے، پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ کر سناتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تائید فرماتے، اس کے بعد صحابہ کرامؓ اسے زبانی بھی یاد کر لیتے، اس طرح سینہ بہ سینہ اور سفینہ در سفینہ پھیل جاتا اور صحابہؓ کے درمیان مشہور ومعروف ہو جاتا، اس لئے رسم عثمانی کی مخالفت حرام وناجائز ہوگی، رسم عثمانی کو چھوڑ کر کسی اور رسم الخط میں قرآن کو لکھنا درست نہیں ہوگا، یہی جمہور علماء متقدمین ومتاخرین کا مذہب ہے، بہت سے علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، علامہ زرقانی نے اس پر صحابہؓ کا اجماع نقل کیا ہے اس کے بعد عہد تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں امت کا اجماع نقل کیا ہے (مناہل العرفان ۱/ ۳۱۰)۔

دوسرا قول، رسم عثمانی توقیفی نہیں ہے:

ہر زمانہ میں مروجہ رسم الخط میں قرآن کا لکھا جانا اور طبع کرانا درست ہے، کیونکہ رسم عثمانی توقیفی نہیں ہے، اس لئے اس کی مخالفت کی جاسکتی ہے، تاکہ لوگوں کو قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو، یہ قول بہت سے علماء سلف وخلف کا ہے، جن میں علامہ ابوبکر باقلانیؒ اور علامہ ابن خلدونؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں (ملاحظہ ہو: تاریخ ابن خلدون ۱/ ۵۲۷، مناہل العرفان للزرقانی ۱/ ۳۱۰)۔

تیسرا قول: بین بین:

عوام کے لئے مروجہ رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت وطباعت درست ہے، خواص کے لئے نہیں، تاکہ رسم عثمانی کی حفاظت ہوسکے، یہ قول علامہ عزالدین عبد السلام اور شیخ بدر الدین زرکشی کا ہے (البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ۱/ ۳۷۹)۔

پہلے قول کی دلیلیں:

جمہور علماء نے رسم عثمانی کے توقیفی ہونے پر نقلی اور عقلی دونوں طرح کے دلائل سے استدلال کیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

۱- حدیث شریف: حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لکھتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی املاء کرانے کے بعد فرماتے: پڑھ کر سناؤ، میں جو کچھ لکھا ہوتا، پڑھ کر اسے سناتا، اگر کہیں چھوٹ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم درست فرمادیتے، اس کے بعد میں اس کو لے کر لوگوں کے پاس آتا (امام ہیثمیؒ نے امام طبرانیؒ کے حوالہ سے دو سندوں سے روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا: "رجال أحدهما ثقات" (مجمع الزوائد ۸/ ۲۵۷)۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آیات نازل ہوتیں تو کاتبین وحی میں موجود بعض صحابہؓ کو بلاتے اور ان سے ارشاد فرماتے: "اس آیت کو فلاں سورہ میں اس جگہ لکھو، جہاں ایسا ایسا ذکر ہے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دو آیتیں نازل ہوتیں تب بھی ایسا ہی فرماتے (ابوداؤد، صلاۃ، باب من جہر بہا ۷۸۶، ترمذی، تفسیر، سورہ توبہ ۳۰۸۶، امام ترمذی کا بیان ہے یہ حدیث حسن اور صحیح ہے)۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی آیات کی حفاظت وصیانت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، خود بھی ان آیات کو حفظ فرمالیتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتیں، اس کے بعد صحابہ کرامؓ کو سکھاتے اور ان کو حفظ اور مذاکرہ کا حکم فرماتے تھے، کاتبین وحی سے لکھوانے کے بعد دوبارہ پڑھوا کر سنتے اور غلطیوں کی تصحیح کے بعد تصدیق فرماتے، اس کے بعد دوسرے صحابہؓ کے پاس لے جانیکی اجازت ہوگی، اس طرح وہ ان کے درمیان عام ہوجاتیں۔

علماء بلکہ پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پورا قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں قلم بند ہوا اور جس رسم الخط میں لکھا گیا اس پر تمام صحابہ کرامؓ کے اتفاق کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق وتوثیق فرمائی، معلوم ہونا چاہئے کہ حدیث کی قسموں میں سے ایک قسم حدیث تقریری بھی ہے، اور حدیث تقریر محدثین اور فقہاء اصولیین کے نزدیک حجت ہے، اگر قرآن کی کتاب میں کسی طرح کی غلطی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز اس کی تصدیق وتوثیق نہیں فرماتے، اس لئے کہ یہ شان نبوت کے خلاف ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے صریح قول کے مغائر عمل ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (حجر ۹)، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت سے ایسا دور دور تک خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۲- عمل صحابہؓ: حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب خلافت کی باگ ڈور کو سنبھالا تو جمع قرآن کا حکم دیا اور کاتبوں کو اسی طریقہ پر لکھنے کا حکم دیا، جس طریقہ پر عہد رسالت میں لکھا گیا تھا، تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں جب قراءت میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہونے لگا، تو آپؓ نے

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مرتب شدہ صحیفہ کے کئے نسخے تیار کرنے کا حکم دیا (مناہل العرفان ۱/۳۱۰)۔

۳- اجماع: پھر حضرت عثمان بن عفانؓ نے ان نسخوں کو مختلف اہم اسلامی شہروں میں روانہ کر دیا، اس وقت بارہ ہزار صحابہ کرامؓ موجود تھے، سبھوں نے بخوشی اس نسخہ کو قبول کیا، کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا، ان کے بعد تابعین، ائمہ مجتہدین اور ائمہ قراء نے اپنے اپنے زمانے اور شہروں میں صحابہ کرامؓ کی اتباع کیں اور کسی نے اختلاف نہیں کیا، اسی وجہ سے قاضی عیاض، ابوعمرو دانی اور شیخ محمد بن علی حداد مصری وغیرہ نے رسم عثمانی کے اتباع کے وجوب پر حضرات صحابہؓ کا اتفاق اور امت مسلمہ کا اجماع نقل کیا ہے، اور اجماع حجت شرعی ہے (الشفاء ۲/۳۰۵، سمیر الطالبین للشیخ الضباع/۱۹، خلاصۃ النصوص الجلیۃ للشیخ محمد بن علی الحداد/۲۵، مناہل العرفان ۱/۳۱۱، ۲، ۱۰۸/، المجلد السابع من مجلۃ الازہر/ص ۱۰۸)۔

۴- قیاس: املاء کے اصول وقواعد تغیر زمانہ کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے ہیں اور ملک وشہر کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ جداگانہ ہوتے ہیں، اس لئے اگر قرآن رسم قیاسی کے مطابق لکھا جاتا اور اس کے رسم کو ہر زمانہ کے مروجہ اصول املاء کے تابع کیا جاتا تو قرآنی نسخوں میں زبردست اختلاف ہوجاتا، جس کے نتیجہ میں قرآنی الفاظ وکلمات میں جوہری تبدیلی واقع کرنے کی راہ دشمنوں کے لئے ہموار ہوجاتی، اور آئندہ دشمنان اسلام کی طرف سے قرآن تصحیف وتحریف اور کتر بیونت سے محفوظ نہیں رہ پاتا، اور اسلام کے بنیادی اصولوں میں ایک سد الذرائع ہے، یعنی جو شی کسی فساد کا ذریعہ بنے وہ شرعاً ممنوع ہوتی ہے، لہذا ہر وہ عمل جو قرآن کے تقدس اور بقاء رسم عثمانی کے خلاف ہو وہ ناجائز وحرام ہوگا (تاریخ المصحف الشریف للشیخ القاضی/۸۶)۔

۵- رسم عثمانی کی خصوصیات وامتیازات: رسم عثمانی کی بعض ایسی خصوصیات وامتیازات ہیں جو دیگر رسم املائی میں نہیں پائی جاتیں، جن کا تقاضا یہ ہے کہ رسم عثمانی عربی رسم الخط کے علاوہ کسی اور زبان میں قرآن کی کتابت عمل میں نہ آئے، کیونکہ ان خصوصیات کی رعایت دوسری زبانوں میں نہیں ہوسکتی۔

رسم عثمانی کی بابت تجاویز

۱- مجمع البحوث الاسلامیہ ازہر کی تجاویز:

۱- قرآن کی قراءتیں اجتہادی وقیاسی نہیں ہیں، بلکہ توقیفی ہیں، ان کا انحصار متواتر روایات پر ہے۔

۲- کانفرنس اپیل کرتی ہے کہ مسلمان قرآن شریف کی رسم عثمانی پر بھروسہ واعتماد کریں، تاکہ قرآن مجید تحریف سے محفوظ رہ سکے (مجمع البحوث الاسلامیہ تاریخہ وتطورہ/۴۲۵-۴۲۶، ۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء)۔

۲- ہیئۃ کبار العلماء مملکت سعودی عرب کی تجویز:

ہیئۃ کبار العلماء مملکت سعودی عرب کی قرارداد یہ ہے کہ مصحف کی رسم الخط رسم عثمانی کے مطابق باقی رہے، اس میں تغیر وتبدل جائز نہیں، کہ جدید رائج املائی رسم الخط کے قواعد کے موافق ہوجائے، ایسا اس لئے تاکہ اللہ کی کتاب تحریف سے محفوظ رہ سکے اور صحابہ وائمہ سلف کی سنت کی پیروی ہوجائے۔

۳- رابطہ اسلامی کے ماتحت قائم اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کی تجاویز:

۱- یہ ثابت ہے کہ عثمانی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت حضرت عثمانؓ کے عہد میں انجام پائی، انہوں نے کاتبین کو حکم دیا کہ قرآن کریم کی کتابت ایک متررہ رسم الخط میں کریں، صحابہ کرام نے ان سے اتفاق کیا اور تابعین بھی اسی راہ پر گامزن رہے اور آج تک ہر دور کے لوگوں نے اس کی پابندی کی، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم پر میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے"، لہذا حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور تمام صحابہ کرامؓ کی پیروی اور ان کے اجماع پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں تحریر کرنا متعین ہوجاتا ہے۔

۲- عثمانی رسم الخط کو چھوڑ کر موجودہ رائج املائی رسم الخط کو پڑھنے کی آسانی کی غرض سے اختیار کرنا دراصل پھر دوسری تبدیلی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ یہ املائی رسم الخط ایک نوع کی اصطلاح ہے جو آئندہ کسی دوسری اصطلاح میں بدل سکتی ہے اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں قرآن کے بعض حروف میں کمی وزیادتی اور تبدیلی کی صورت میں قرآن کے اندر تحریف کا باعث بن جائے گی اور گذرتے ایام کے ساتھ قرآن کے مختلف نسخوں میں فرق واقع ہوجائے گا اور اسلام دشمنوں کو قرآن کریم پر انگشت نمائی کا موقع مل جائے گا، اسلام نے شر کے ذرائع اور فتنہ کے اسباب کا سدباب کیا ہے اور ان پر بندش لگائی ہے۔

۳- قرآن کریم کی کتابت میں اگر عثمانی رسم الخط کی پابندی نہ کی جائے تو اللہ کی کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائے گی کہ جب جب کسی انسان کو کوئی نیا خیال سمجھ میں آئے گا تو اسے بروئے کار لے آئے گا، کوئی اسے لاطینی زبان میں اور کوئی کسی اور زبان میں تحریر کرنے کی تجویز پیش کرے گا جو ایک خطرناک عمل ہے اور ''مفاسد کا ازالہ مصالح کے حصول سے زیادہ اہم ہے''۔

اجلاس میں اس موضوع پر غور وخوض کے بعد بالاتفاق فیصلہ کیا گیا کہ ''هيئة كبار العلماء سعودی عرب'' کی اس قرارداد کی تائید کی جائے کہ قرآن کے عثمانی رسم الخط میں تبدیلی جائز نہیں ہے اور موجودہ رسم الخط ہی میں اسے باقی رکھنا واجب ہے تا کہ ایک دائمی دلیل وحجت اس بات کی ہو کہ قرآن کے متن میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس کی پابندی ہی میں صحابہ کرام اور ائمہ سلف ؒ کی پیروی واتباع بھی ہے (مجلۃ المجمع الفقہی الإسلامی، العدد الرابع، السنۃ الثانیۃ/ ص ۴۸۵-۴۸۶، ۱۴۱۰ھ)۔

ان مذکورہ بالا تفصیلات وتجاویز کے بعد اصل سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں کہ کیا غیر عربی رسم الخط (رسم عثمانی) میں قرآن کی کتابت درست ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے، اور وہ یہ کہ گذشتہ تحریر سے ثابت ہو گیا کہ عثمانی رسم الخط میں قرآن کی کتابت توقیفی ہے، قیاسی واجتہادی نہیں، اس لئے عربی رسم الخط کو چھوڑ کر دوسری زبانوں میں جیسے: انگریزی، ہندی، فرنچ، لاطینی، تلگو اور تامل وغیرہ میں قرآن کے عربی متن کی کتابت کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں، بلکہ یہ ناجائز وحرام عمل ہوگا، خواہ حروف وکلمات کی تقدیم وتاخیر یا تقلیل وتکثیر یا بعض حروف وکلمات کو بدلنے کی نوبت آئے یا نہ آئے، کیونکہ عثمانی رسم الخط جو کہ توقیفی ہے، کی مخالفت لازم آئے گی، مزید برآں قرآنی کلمات وحروف میں تغیر وتبدل لازم آنا ناگزیر ہے، اور یہ قرآن میں ایک گونہ تحریف ہے، اور تحریف بالاجماع حرام ہے (المجلد السابع من مجلة الأزهر / ص ۴۵، مناهل العرفان للزرقانی ۲/ ۱۰۸)۔

اور یہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے خلاف بھی لازم آتا ہے: ''انا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون'' (حجر: ۹) (رہا یہ نصیحت نامہ، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)، ''لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد'' (فصلت: ۴۲) (یہ ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے، نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے)۔

اسی وجہ سے عربی رسم الخط (رسم عثمانی) کے علاوہ کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو چاروں اماموں میں سے کسی نے جائز قرار نہیں دیا (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۲/ ۱۷۱)۔

یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ بعض زبانوں میں قرآن کے بعض حروف (ذ، ز، ظ، ض) کے بدل حروف موجود نہیں ہیں، انگریزی، ہندی، تامل اور گجراتی وغیرہ زبانوں میں یہ حروف صرف ایک ہی طریقہ سے ادا کئے جاتے ہیں، حالانکہ ان حروف کے درمیان بڑا فرق ہے، ان کے باہم اختلاف سے معانی ومفاہیم میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے، لہذا جب یہ حروف ایک طریقہ پر ادا کئے جائیں گے تو لازماً قرآن میں لفظی اور معنوی تحریف لازم آئے گی، اور قرآن میں تحریف حرام ہے۔

نیز انگریزی زبان کے حرکات حروف کی شکل میں لکھے جاتے ہیں، ایسی صورت میں قرآن کے حروف میں اضافہ کرنا لازم آئے گا اور یہ زیادتی قطعاً حرام ہے، اس لئے کہ اس سے بھی قرآن میں تحریف واقع ہوگا۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت:

غیر عربی زبانوں میں جب قرآن کی کتابت ناجائز وحرام ہے تو اس کی طباعت اور اشاعت بھی حرام ہوگی، فقہی قاعدہ ہے: ''ما حرم فعله حرم طلبه'' (الأشباه مع الحموی ۱/ ۳۹۲) خواہ عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں کیوں نہ قرآن لکھا گیا ہو، اور دونوں ایک ساتھ شائع کیا گیا ہو اس طور پر کہ قرآن کا متن ایک جانب عربی میں ہو دوسری طرف دوسری زبانوں میں ہو، یا اوپر نیچے ہو، یا تحت اللفظ، یعنی عربی عبارت کے نیچے دوسری زبانوں میں قرآن کا متن لکھا ہو، یا غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت عمل میں آئی ہو، کیونکہ مزید اس کی اشاعت ناجائز عمل کو عام کرنا اور گناہ پر تعاون ہے، لہذا راست ایسا کرنے والا اور اس پر کسی طرح کی مدد کرنے والا دونوں گنہگار ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (مائدہ: ۲) (گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

پس قرآن کا ترجمہ و تفسیر کسی بھی زبان میں کیا جائے، جائز ہے، البتہ عربی رسم الخط رسم عثمانی ہی میں قرآن کا متن لکھا جائے گا، نہ کہ ترجمہ والی زبان میں۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

حقیقت تو یہی ہے کہ جب بریل کوڈ عربی رسم الخط رسم عثمانی نہیں ہے، تو اس میں قرآن کی کتابت ناجائز و حرام ہو، کیونکہ رسم عثمانی کی مخالفت پائی جا رہی ہے، جو کہ جمہور علماء کا قول ہے اور دلائل کے اعتبار سے راجح بھی ہے، لیکن چونکہ قرآن جس طرح بینا لوگوں کے لئے ہے اسی طرح اندھوں کے لئے بھی ہے، اب جبکہ اندھوں کے لئے راست قرآن کا پڑھنا ممکن ہو گیا تو خیال ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت کے بارے میں علماء کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علامہ عز الدین بن عبد السلام اور شیخ بدر الدین زرکشی کے قول ''رسم عثمانی میں قرآن کی کتابت خواص کے لئے لازم اور مروجہ رسم الخط میں عوام کے لئے قرآن کی کتابت کا جواز'' پر کہا جا سکتا ہے کہ نابیناؤں کے لئے بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہو، نیز جمہور علماء کے قول ''رسم عثمانی توقیفی ہے اس کی مخالفت ناجائز و حرام ہے'' پر ازراہ ضرورت و مجبوری اندھوں کے لئے بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے، فقہ اسلامی کا مشہور قاعدہ ہے:

''الحاجة تنزل منزلة الضرورة، عامة كانت أو خاصة'' (الأشباه والنظائر لابن نجیم ۱/ ۹۳)۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم:

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو جمہور علماء کے مذہب کے مطابق اصل قرآن کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن عربی رسم الخط رسم عثمانی میں نہیں ہے، البتہ تیسرے قول علامہ عز الدین بن عبد السلام اور علامہ بدر الدین زرکشی کا ہے، کے مطابق اصل قرآن کا درجہ حاصل ہوگا، کیونکہ ان کے نزدیک مروجہ رسم الخط میں قرآن کی کتابت درست ہے، اور چونکہ پڑھے جاتے وقت قراءت حفصی کے مطابق ہی تلاوت کی آواز آتی ہے، اس لئے بر بناء احتیاط بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن اصل قرآن در جہ و حکم میں ہوگا، پس بر بناء احتیاط اسے چھونے کے لئے طہارت و وضو ضروری ہوگا۔

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کی بابت آداب و احکام:

۱- بریل کوڈ کے کاغذ پاک ہوں، اور جس شئی سے نقطوں کی شکل میں قرآن کے حروف ابھارے جائیں وہ بھی پاک وصاف ہو۔

۲- بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت کرنے والا جنابت سے پاک ہو اور باوضو ہو کر کتابت کرے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر صرف موبائل سے تلاوت کی آواز آئے اس کی اسکرین پر قرآن ظاہر نہ ہو تو ایسے موبائل کو ہاتھ لگانے کے لئے وضو کرنا ضروری نہیں ہوگا۔

ہاں اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو تو جس وقت اسکرین پر قرآنی آیات ظاہر ہوتی ہوں تو اس اسکرین کا بلا وضو چھونا درست نہیں ہوگا، البتہ اسکرین کے علاوہ موبائل کے دوسرے حصے کو چھونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ قرآنی آیات کے مقابلہ میں موبائل کے دوسرے حصے زیادہ ہیں، جیسا کہ فقہاء نے ان تفسیری کتابوں کو چھونے کو جائز قرار دیا ہے، جن کے اکثر حصے تفسیر کے ہوں،

''وقد جوز أصحابنا مس كتب التفسير للمحدث ولم يفصلوا بين كون الأكثر تفسيرا أو قرآنا. ولو قيل به اعتبار للغالب لكان حسنا'' (الأشباه والنظائر لابن نجیم ۱/ ۱۱۲)۔

اور اگر اسکرین کا حصہ موبائل کے دوسرے حصے کے مقابلہ بڑا ہو تو پورے موبائل کو بلا وضو چھونا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ دوسرے حصہ کم ہونے کی وجہ سے اسکرین کے تابع ہو جائیں گے، لہذا اس کا حکم بھی ہی ہوگا جو اسکرین کا ہوگا، یعنی آیات کے ظہور کے وقت پورا موبائل قرآن کے حکم میں ہوگا، فقہ اسلامی کا مشہور قاعدہ ہے، ''التابع تابع'' (حوالہ سابق ۱/ ۱۲۰)۔

☆☆☆

غیر عربی زبان میں متن قرآن کی کتابت

مولانا سید قمر الدین محمود بروڈوی [1]

۱- اللہ تعالی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ قرآن نازل فرمایا اور اسے تمام انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی آیات کو محفوظ فرمالیا اور صحابہ کرامؓ کے سینوں تک اسے منتقل فرمایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی وہ دو قسم کی تھی ایک تو قرآن کریم کی آیات جن کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالی کی طرف سے تھے اور جو قرآن میں ہمیشہ کے لئے اس طرح محفوظ کردیئے گئے کہ ان کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی نہ بدلا جاسکا ہے اور نہ آئندہ کبھی تبدیل کیا جاسکتا ہے، اسی وحی کو علماء کرام کی اصلاح میں وحی متلو کہا جاتا ہے، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔

دوسری قسم اس وحی کی ہے جو قرآن کریم کا جز نہیں ہے، لیکن اس کے ذریعہ آپ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے ہیں اس وحی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، عموماً وحی متلو، یعنی قرآن کریم میں اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفاء کیا گیا ہے، ان تعلیمات کی تفصیل اور جزوی مسائل زیادہ تر وحی غیر متلو کے ذریعہ عطا فرمائے گئے ہیں، و یہ وحی غیر متلو صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس دوسری قسم میں تو عموماً یہ ہوا ہے کہ صرف مضامین اللہ کی طرف سے ہوتے تھے اور انہیں تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب حضرت جبرئیل علیہ السلام یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ نہیں وہ لفظاً و معنیً پورا کا پورا اللہ کا کلام ہے جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالی کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی من و عن اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوئے ہیں اور ان کے انتخاب یا ترکیب و انشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن شریف کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوئے ہیں اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں:

۱- قرآن کریم نے جابجا اپنی ایک صفت عربی بیان فرمائی ہے، یعنی یہ کہ اسے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا ہوتا تو "إنا أنزلناه قرآنا عربيا" (سورۂ یوسف:۲) کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں۔

۲- قرآن کریم میں کئی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض منصبی بیان فرمائے گئے ہیں: "يتلو عليهم آياته ويعلمهم الكتب والحكمة ويزكيهم" (سورۂ جمعہ:۲) اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ و فرائض الگ الگ تھے ایک آیات کتاب اللہ کی صرف تلاوت اور دوسرے ان کی تعلیم، ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معنی کی نہیں، لہذا آپ کے سب سے پہلے فریضہ منصبی کا تعلق صرف الفاظ قرآنی سے ہے، معانی سے نہیں۔

۳- قرآن کریم جابجا اپنے لئے "الکتاب" کا لفظ استعمال کرتا ہے، اور لفظ کتاب کا اطلاق صرف ذہنی مضامین پر نہیں ہوتا، بلکہ جب ان مضامین کو الفاظ کا جامہ پہنایا جاتا ہے تب اسے کتاب کہتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں منزل من اللہ ہیں۔

۴- سورہ قیامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی الفاظ دہراتے تھے، اس پر باری تعالی نے حکم دیا کہ "لا تحرك به لسانك لتعجل به إن علينا جمعه وقرآنه. فاذا قرء ناه فاتبع قرآنه ثم ان عليه بيانه" (سورۂ قیامہ:۱۶-۱۹)۔

یہ آیت صراحۃً دلالت کررہی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو الفاظ لے کر آتے تھے وہ اللہ جل شانہ کا کلام ہوتا تھا اسی لئے اسکے الفاظ یاد کرنے اس کی تلاوت کرنے کا طریقہ سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے یہ تینوں کام اللہ تعالی نے اپنے ذمہ لئے ہیں۔

---

[1] ناظم اعلی اصلاح المسلمین، بڑودہ، گجرات۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں بالاتفاق بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں اور قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت کس طرح کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ قرآن کی زبان اصلی عربی ہے، لہذا قرآن کی کتابت عربی زبان میں ہی کرنے کا حکم دیا جائے گا، عربی زبان کے علاوہ دوسری کسی بھی زبان میں قرآن کی کتابت جائز نہ ہوگی، اور چونکہ اس پر اجماع ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جس طرح قرآن کی کتابت کرائی اس کے خلاف کتابت جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کتابت میں ''انزل القرآن علی سبعة احرف'' کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

اور قرآن کو غیر عربی زبان کسی اور زبان میں کتابت کرنے کرانے میں ''انزل القرآن علی سبعة احرف'' کی رعایت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں قرآن کی کتابت کی جائے تو قرآن کا صحیح تلفظ دشوار بلکہ ناممکن سا ہوگا، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے جس مصحف کی کتابت کرائی وہ رسم الخط تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اور اعجازی ہے اور اس سے رسم مصحف عثمانی کی خلاف ورزی ہوگی جو جائز نہیں ہے، نیز کسی بھی دوسری زبان میں قرآن کو لکھا جائے گا تو عربی کے جو الفاظ وحروف ہیں ان کی ادائیگی اور تلفظ مشکل ہے، جیسے عربی میں س، ص، اور ث میں فرق ہے، دوسری کسی زبان میں یہ نہیں ہے، اسی طرح عربی میں ت اور ط میں فرق ہے، نیز ذ، ز اور ظ میں فرق ہے جو کسی دوسری زبان میں اس طرح نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح غیر عربی میں کتابت قرآن کی صورت میں حروف کی کمی بیشی بھی لازم آئے گی، مثلاً: الم، میں تین حروف ہیں، دوسری زبان میں لکھا جائے گا تو حروف زیادہ ہو جائیں گے، اس طرح قرآن کے حروف میں کمی بیشی ہو جائے گی۔

غیر عربی زبان میں سیکھا ہوا قرآن اگر نماز میں پڑھے گا تو حروف کی تبدیلی کی وجہ سے اگر معانی میں فساد ہو گیا یا معنی بدل گئے تو نماز بھی فاسد ہو جائے گی، اور ثواب کے بجائے عقاب اور رحمت کے بجائے لعنت کا حقدار ہو جائیگا۔

قرآن مجید خالص عربی اور نہایت فصیح وبلیغ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، لہذا اس زبان کے اصول اس کے خصائص وامتیازات اور اس کی ادائیگی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ورتل القرآن ترتیلا'' (قرآن کو ترتیل سے پڑھو) (سورۂ مزمل)، ترتیل کی تفسیر حضرت علیؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ حروف کو تجوید، یعنی ان کے مخارج اور صفات سے ادا کرنا، نیز وقف اور اس کے اصول جان کر ان پر عمل کرنا۔

عربی کتابت والے قرآن میں بھی جب تک ماہر استاذ سے نہ پڑھے اور سیکھے تب بھی صحیح طور پر ادائیگی نہیں ہو سکتی، تو غیر عربی رسم الخط میں تو قرآن کو صحیح طور پر پڑھ لینا ناممکن ہے۔

اب رہا یہ عذر کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے اور عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے تو وہ قرآن کی تلاوت کیسے کریں گے تو یہ عذر عذر لنگ ہے، قرآن مجید کو صحیح طور پر سیکھنا فرض ہے، کیونکہ قرآن کی تلاوت نماز میں مشروع ہے، اس لئے بھی قرآن کا سیکھنا فرض ہے اور قرآن کی تلاوت کا غیر نماز میں بھی حکم ہے اور اس پر بیشمار اجر وثواب کا وعدہ ہے، لہذا ایسے عذر لنگ کی صورت میں غیر عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی، کیا دنیا میں دوسری زبانیں ہندی، انگریزی اردو وغیرہ نہیں سیکھی جاتیں اور جو محنت ان پر کی جاتی ہے کیا ایسی محنت عربی رسم الخط والے قرآن کو سیکھنے کے لئے نہیں کی جاسکتی؟ اصل میں یہ جہالت اور دین سے بے اعتنائی کی کا نتیجہ ہے۔

اب رہا کہ عربی رسم الخط والا قرآن بھی لکھا جائے اور اس کے ساتھ دوسری زبان میں بھی قرآن لکھا جائے اور دونوں کو یکجا شائع کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو کہا جائے گا کہ یہ بھی ممنوع ہے کیونکہ اس میں رسم مصحف عثمانی کی مخالفت ہے اور جب عربی زبان کے ساتھ دوسری زبان میں لکھا ہوا اس کے سامنے ہوگا تو وہ عربی والے قرآن کو سیکھنے کی محنت بھی نہ کرے گا اور غیر عربی زبان والے قرآن سے ہی وہ تلاوت کرے گا اور اسمیں جو وجوہ اوپر لکھی گئی ہیں ان کی وجہ سے ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔

قرآن مجید کا صرف ترجمہ شائع کرنا کسی بھی زبان میں بغیر عربی الفاظ اور رسم الخط کے جائز نہیں ہے، ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ممنوع ہے، علامہ حسن شرنبلالیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ہے: ''النفحة القدسية فی أحكام قراءة القرآن و كتابته بالفارسية''، اس میں ائمہ اربعہ سے اسکی مخالفت نقل کی گئی ہے، نیز اس میں صاحب ہدایہ کی ''کتاب التجنیس والمزید'' سے منقول ہے:

''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع'' (ماخوذ از خیر الفتاوی ۱/ ۲۱۴)۔

بغیر عربی متن کے تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست نہیں ہے، اور اس کے لئے یہ وجہ جواز تلاش کرنا کہ صرف ترجمہ کی طباعت واشاعت میں مصارف کم

آتے ہیں، اور متن عربی کے ساتھ طباعت میں اخراجات بڑھ جاتے ہیں یہ عذر نا معقول ہے، انسان اپنی دنیوی حاجات کے لئے کتنا خرچ کرتا ہے، اور پھر دنیوی حاجات وضروریات کی اشیاء کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اسے بھی وہ برداشت کرتا ہے، بلکہ بہت سی غیر ضروری اشیاء خرید کر اپنی خواہش نفس کو پورا کرنے میں اور اپنے مال کو بڑھانے میں اسے ذرا بھی جھجک اور تنگی محسوس نہیں ہوتی صرف دین کے معاملہ میں ہی اسے تنگی محسوس ہوتی ہے اور عربی متن والے مع ترجمہ قرآن اور صرف ترجمہ والے قرآن کے ہدیہ میں اتنا تفاوت بھی نہیں ہو، تا کہ وہ اس کو برداشت نہ کرسکے درحقیقت یہ دین کے احکام کی عدم اہمیت اور دین سے بیزاری وبے اعتنائی کی بات ہے۔

اور قرآن کا تنہا ترجمہ جو کتابی شکل میں چھاپا گیا وہ درحقیقت قرآن نہیں اسے قرآن کے نام سے موسوم کرنا جائز نہیں کیونکہ قرآن کریم عربی زبان کے ساتھ مختص ہے، علامہ شامیؒ ایک مقام پر کہتے ہیں کہ:

''لأن المامور به قراءة القرآن وهو اسم للمنزل باللفظ العربي المنظوم هذا النظم الخاص المكتوب فى المصاحف المنقول الينا نقلا متواترا والعجمى إنما يسمى قرآنا مجازا، ولذا يصح نفى اسم القرآن عنه فلقوة دليل قولهما رجع إليه'' (ردالمحتار ۱/ ۲۸۴)..... ''مراقی الفلاح'' میں ہے: ''لأن القرآن اسم للنظم والمعنى جميعا''..... ''بحر الرائق'' میں ہے: ''لأن المفهوم من القرآن باللام إنما هو العربي فى عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالى: ''فاقرء وماتيسر من القرآن'' (۱/ ۳۰۷)۔

''نہر الفائق'' میں ہے: ''كما فى الشامية: لكن فى النهر حيث قال: عندى بينهما (اى القراءة الشاذة والقراءة الفارسية) فرق، وذلك أن الفارسى ليس قرآنا أصلا لانصوافه فى عرب الشرع إلى العربي'' (۱/ ۴۸۵)۔

۵- مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں: کہ قرآن نام اس کلام خاص اور عبارت خاص کا ہے جو مکتوب فی المصاحف ہے اور عربی زبان میں ہے:

''قال الله تعالى: انا انزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون'' (سورۂ یوسف: ۲)

پس جو نظم عربی نہیں وہ قرآن نہیں قرآن نام نظم عربی کا ہے ترجمہ کو قرآن نہیں کہا جاتا مجازا (فتاوی دار العلوم ۲/ ۲۳۲)۔

ان تمام عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کا صرف ترجمہ حقیقتا قرآن نہیں اب تمام امت کا اسی پر اتفاق ہے، امام صاحبؒ سے بھی رجوع ثابت ہے:

''لو قرأ بالفارسية حالة العجز عن العربية، فإنه يصح، وهذا بالاتفاق. قيد بالعجز؛ لأنه لو كان قادرا فإنه لايصح اتفاقا على الصحيح وكان أبوحنيفة أو لايقول بالصحة نظر إلى عدم أخذ العربية فى مفهوم القرآن، ولذا قال تعالى: ولو جعلناه قرآنا أعجميا فإنه يستلزم تسميته قرآنا أيضا. لو كان أعجميا ثم رجع عن هذا القول ووافقهما فى عدم الجواز وهو الحق؛ لأن المفهوم من القرآن باللام إنما هو العربي فى عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالى: ''فاقرأوا ما تيسر من القرآن'' (البحر الرائق ۱/ ۳۰۷)۔

عربی متن قرآن کے علاوہ صرف ترجمہ کی اشاعت کے عدم جواز کے متعدد اسباب ووجوہ ہیں مثلاً:

۱- معانی قرآن کی طرح اس کے الفاظ کی بھی حفاظت فرض وواجب ہے، اور موجودہ زمانہ میں طبائع دین متین سے بے التفاتی اور سہل انگاری کا شکار ہیں اگر اس قسم کے صرف تراجم شائع ہو گئے تو الفاظ قرآن کی اہمیت قلوب سے قطعاً ختم ہوجائے گی، بالآخر یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ العیاذ باللہ تلاوت قرآن کریم کی طرف سے بے اعتنائی ہوجائے گی، لہذا ایسے تراجم محضہ شائع کرنا ممنوع ہے۔

۲- اجازت کی صورت میں نہ معلوم کن کن لوگوں کے تراجم شائع ہوں گے، اور ان میں وہ کیا کیا گل کھلائیں گے، انہام وتفہیم مستبعد اور احقاق حق تقریبا محال ہوجائے گا تو اس طرح تحریف مراد خداوندی کا ایک ایسا دروازہ کھل جائے گا جس کا بند کرنا بس سے باہر ہوجائے گا۔

۳- ایسے تراجم محضہ پرانے ہوجانے کی صورت میں ردی میں اس طرح فروخت ہوں گے، جیسا کہ عام اردو کتابیں، کیونکہ عربی خط کا جو ایک بڑا بھاری فرق تھا اور ہر شخص دیکھتے ہی بادی النظر میں قرآن کریم اور اردو کی کتابوں میں فرق کرلیتا ہے یہ فرق وامتیاز ختم ہوجائے گا اس طرح یہ ترجمہ قرآن کی بے حرمتی کا

سبب بنے گا اور یہ ظاہر ہے کہ سبب معصیت بھی معصیت ہوتا ہے۔

۴- حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم اور احادیث کی دعائیں اصل عربی رسم الخط میں لکھ کر ان کا ترجمہ اور تفسیر وتشریح اپنی زبان اڑیہ میں کر سکتے ہیں، فتح القدیر اور دیگر کتب فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے، محض اڑیہ یا اور کسی زبان میں عربی کے علاوہ قرآن پاک کو لکھنا بالاجماع ناجائز ہے، کذا فی الاتقان واللہ اعلم (فتاویٰ محمودیہ ۱۲/۲۱)۔

۵- حضرات فقہاء کرام نے ایسے تراجم ومصاحف کی صراحۃ ممانعت فرمائی ہے، "كما في الشامية في الفتح عن الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع" (ردالمحتار ۱/۴۸۶)۔

۶- ایسے تراجم محضہ کی طباعت واشاعت وغیرہ جائز نہیں کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے،" قال اللہ تعالیٰ: ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)۔

ان تمام اسباب ووجوہ کی بنا پر صرف تراجم کی طباعت واشاعت جائز نہیں ہے۔

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر متن عربی کے اگر چھپا ہوا ہو تو بلا وضو اس کو چھو سکتے ہیں یا نہیں؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے جیسا کہ ماقبل میں مذکور ہوا کہ اس ترجمہ کو مجازاً قرآن کہا جائے گا، لہٰذا بغیر وضو کے اس کو چھونا مکروہ ہے، "ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة. وكذا عندهما على الصحيح. هكذا في الخلاصة" (فتاوی عالمگیری ۱/۹۳)۔

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے یا نہیں؟

بریل کوڈ میں نابینا حضرات کے لئے اگر قرآن تیار کیا جائے تو بغرض تعلیم وتعلیم اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ ان اشارات سے الفاظ قرآنی کو صحیح تلفظ اور تجوید کی رعایت سے کوئی ماہر استاذ جو اشارات اور ان سے جو حروف بنتے ہیں اس سے پورے طور پر واقف ہو وہ صحیح تلفظ کے ساتھ تجوید کی رعایت کے ساتھ پڑھائے، اس لئے کہ قرآن کو تجوید سے پڑھنا واجب ہے، جیسا کہ علامہ جزریؒ فرماتے ہیں:

والاخذ بالتجويد حتم لازم من لم يجود القرآن آثم ... لأنه به إلا له انزلا وهكذا منه إلينا وصلا"

اگر بریل کوڈ کے اشارات سے حروف کے مخارج اور صفات کی رعایت کرتے ہوئے صحیح تلفظ کے ساتھ نابینا حضرات کو تعلیم دی جائے تو اس کی اجازت ہوگی۔

بریل کوڈ میں عربی حروف تہجی کے مخصوص اشارات سے قرآن تیار کیا گیا ہے تو چونکہ وہ اصل قرآن نہیں ہے، لہٰذا جیسے ترجمہ محضہ کو بغیر وضو چھونا مکروہ ہے اس کو بھی اسی طرح بغیر وضو کے چھونا مکروہ ہوگا۔

موبائل پر جو قرآن ہوتا ہے اس کو جب اسکرین پر لایا جائے تو اس وقت بغیر وضو کے اسکرین پر ہاتھ لگانا یا اس کو چھونا جائز نہیں ہوگا، موبائل میں قرآن کریم کے علاوہ دیگر بہت سی چیزیں ہیں، لہٰذا جس موبائل میں قرآن کریم ہو اس کے ڈھانچہ کو بغیر وضو کے مس کرنے میں بڑی دقت اور دشواری ہے، اس لئے جب اسکرین پر قرآن لایا جائے اس وقت اس موبائل کے ڈھانچہ کو پکڑ کر اس کی تلاوت بغیر وضو کے کی جاسکتی ہے، مگر اس کے اسکرین پر قرآن ہو تو اسکرین والے حصہ پر بغیر وضو مس کرنے اور ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

سوال: اگر غیر مسلم قرآن شریف مطالعہ کے لئے مانگے تو دینا جائز ہے اور اس کے لئے کیا شرط ہے؟

جواب: غیر مسلم کو اگر وہ مطالبہ کرے تو تبلیغ کی نیت سے اور اس کی ہدایت کی نیت سے اس کو قرآن شریف ترجمہ والا دینا جائز ہوگا، بشرطیکہ اس کے دل میں قرآن مجید کی عظمت ہو اور اس کی طرف سے اطمینان ہو کہ وہ بے ادبی نہیں کرے گا، مگر اس کو یہ ہدایت دی جائے کہ یہ اللہ کا مقدس کلام ہے ناپاکی کی حالت میں ہو تو وہ غسل کرلے اور عام حالات میں وضو کر کے قرآن کریم کو ہاتھ لگائے اس سے اس کے دل میں عظمت پیدا ہوگی اور ممکن ہے کہ یہ اس کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔

درمختار میں ہے: "ويمنع النصراني (وفي بعض النسخ الكافر) من مسه وجوزه محمد إذا اغتسل ولا بأس بتعليمه القرآن وأنه عسى يهتدي" (درمختار مع الشامی ۱/۱۶۴)۔

☆☆☆

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

مفتی عبدالمنان[1]

رسم خط عثمانی کا اتباع واجب ولازم ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگر چہ وہ عربی ہی نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں، مثلاً اوائل سور میں "بسم اللہ" کو مصحف عثمانیہ میں بحرف الف لکھا ہے اور "اقرا باسم ربک" میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگر چہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں، مگر باجماع امت اس کی نقل واتباع ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا عربی رسم الخط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "ازالۃ الخفاء" کے مقدمہ میں فرمایا کہ حق تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ قرآن کی جمع وترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے، قال تعالیٰ: "ان علینا جمعہ وقرآنہ" (سورۂ قیامہ: ۱۷)، وقال تعالیٰ: "انا لہ لحافظون" (سورۂ حجر: ۹)۔

لیکن اس وعدۂ الٰہیہ کے ظہور اور حفاظت الٰہیہ کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے، اور نہ اس طرح ہے کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہوجاتا جو مٹانے سے مٹ نہ سکے، بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع اور تدوین کی خدمت انجام دیں، اور تمام دنیا کے مسلمان "ایک نسخہ قرآنی" پر مجتمع اور متفق ہوجائیں، اور ہمیشہ جماعت عظیمہ اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہے، تاکہ سلسلۂ تواتر نہ ٹوٹے، اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی میں بمشورہ واجماع صحابہؓ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا، جس میں قرأت شاذہ نہیں لی گئیں، بلکہ قرأت متواترہ لی گئیں، اور قبائل عرب کی سات زبانوں میں جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، ایک قریش کی لغت لی گئی، اور باقی لغات کے مصاحف متروک کردیئے گئے جنکا بعد میں کہیں نام ونشان نہیں رہا۔

اس واقعہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوگیا کہ قرآن مجید جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا، وہ یہی مصحف عثمانی تھا اور ہے، اور یہی قرآن مجید محفوظ من اللہ ہے، ورنہ اگر حفاظت خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی تو دوسرے لغات کے مصاحف کا تلف کردینا کسی مخلوق کی قدرت میں نہ ہوتا، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم محفوظ صرف وہی ہے جو "مصحف امام" اور مصحف عثمانی کہلاتا ہے، جو چیز اس میں نہیں ہے وہ قرآن کریم نہیں ہے، اور جو چیز اس میں ہے وہ مٹائی نہیں جاسکتی، اور نہ اس میں کوئی ادنیٰ تغیر کرنا جائز ہوسکتا ہے، یہی راز ہے اس اجماع کا جو اوپر نقل ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی حفاظت بھی واجب ہے (ازالۃ الخفاء ۱/۲۵)۔

علامہ سیوطی نے "اتقان فی علوم القرآن" میں رسم خط قرآنی اور کتابت قرآنی کے آداب پر مستقل فصل رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے:

"وقال اشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الاولى رواه الداني في المقنع" ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة"۔

(اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر پر لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کرکے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالکؒ کا اس بارے میں مخالف نہیں ہے)۔ اس کے بعد لکھا ہے: "وقال أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك"۔

(اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے واو، یاء اور الف (زائدہ) میں جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے

---

[1] مفتی دار الحدیث، برمائی، آسام۔

میں آتے ہیں)(الاتقان فی علوم القرآن: ۲/ ۴۰۳ مکتبہ فیصل دیوبند)۔

پھر لکھا ہے: ''وقال البیهقی فی شعب الإیمان: من یکتب مصحفا فینبغی أن یحافظ علی الهجاء الذی کتبوبه هذه المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئًا. فإنهم کانوا أکثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة منّا. فلا ینبغی أن نظن بأنفسنا استدراکا علیهم''۔

(امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہؓ نے لکھے ہیں ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کر سکتے ہیں)(الاتقان فی علوم القرآن: ۲/ ۴۰۳ مکتبہ فیصل دیوبند)۔

اس کے چند صفحات کے بعد تحریر فرمایا ہے: ''وهل تجوز کتابته بقلم غیر العربی. قال الزرکشی: لم أر فیه کلاما لأحد من العلماء، قال: ویحتمل الجواز؛ لأنه قد یحسنه من یقرأه بالعربیة والأقرب المنع کما تحرم قرائته بغیر لسان العرب ولقولهم القلم أحد اللسانین والعرب لاتعرف قلما غیر العربی. وقد قال تعالی ''(بلسان عربی مبین)''

اور علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نورالایضاح'' کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر جس کا نام ''النفحة القدسية في أحكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية'' ہے، اس میں مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارت میں اس کا لکھنا حرام ہے اور اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع و ناجائز ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۸۳-۷۴)۔

مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حدادؒ نے اپنے رسالہ ''خلاصة النصوص الجلية'' میں رسم خط میں مصحف عثمانی کی اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ثابت کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے:

''أجمع المسلمون قاطبة علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان و منع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: و وجه ما تقدم من إجماع الصحابة علیه وهو زهاء اثنتي عشر ألفًا والإجماع حجة حسبما تقرر فی أصول الفقه'' (نصوص جلیہ/ ص ۲۵. جواہر الفقہ ۱/ ۸۵)۔

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ رحمہم اللہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز و حرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے، اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت ناجائز ہوگی

"وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (سورۂ مائدہ: ۲)

اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے وہ اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا۔

لقوله تعالی: "ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها" (سورہ نساء: ۸۵)

علامہ حسن شرنبلالیؒ صاحب ''نورالایضاح'' جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور مفتی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے جس کا نام: ''النفحة القدسیه في احکام قراءة القرآن و کتابته بالفارسیه'' ہے اس میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بالنظم قرآنی عربی کے لکھا جائے، جس کی عبارت یہ ہے:

''ویمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالاجماع لأنه یؤدی للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنی. فإنه دلالة علی النبوة، ولأنه ربما یؤدی إلی التهاون بأمر القرآن انتهی''۔

'' ومنها ما فی معراج الدرایة انه یمنع من کتاب المصحف بالفارسیة أشد المنع. وأنه یکون معتمده زندیقاوسنذکر تمامه''

''ومنها مافي الكافي: أنه لو أراد أن يكتب مصحف بالفارسية يمنع''

''ومنها ماقال في شرح الهداية فتح القدير للمحقق الكمال ابن الهمام وفي الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، فان فعل آية او آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز- اھ''

علامہ محقق ابن ہمام کی عبارت سے اس تفصیل کی بھی تصریح ہوگئی کہ فارسی (یا کسی اور عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا ممنوع ہے ایک دو آیت کا لکھنا اس میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کو کوئی معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز یہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

پھر عبارت مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا جس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کہ کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو، اس لئے علامہ شرنبلالی نے روایات مذکورہ بالا نقل کرنے کے بعد فرمایا:

''قدمنا حكاية الإجماع على منع كتابة القرآن العظيم بالفارسية وأنه إنما نص على الفارسية لإفادة المنع بغيرها بالطريق الأولى؛ لأن غيرها ليس مثلها في الفصاحة'' (النفخة القدسية للشرنبلالی ص ۲۲ بحوالہ جواہر الفقہ)۔

اور درمختار میں ہے: ''تجوز كتابة آية او آيتين بالفارسية لأكثر (قال الشامي) والظاهر أن الفارسية غير قيد'' (شامی ۱/ ۴۵۳)۔

اور کفایہ شرح ہدایہ میں ہے: ''قال الإمام المحبوبي: أما لو اعتاد قرأة أو كتابة المصحف بالفارسية يمنع منه أشد المنع'' (بامش فتح القدیر ۱/ ۲۴۹)۔

یہاں تک یہ سب روایات ائمہ حنفیہ اور معتبر کتب حنفیہ کی تھیں اس کے بعد امام شافعی، مالک، احمد بن حنبلؒ کے مذاہب کی روایات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: (النفحۃ القدسیہ/ص ۳۵، مغنی مع الشرح الکبیر ج ۱/ص ۵۳۰، رسالۃ النصوص الجلیہ/ص ۲۵، جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۹-۹۷)۔

نیز حضرت اشرف علی تھانویؒ کے فتاوی سے ظاہر ہو چکا، جس کا اختتام اس آیت سے استدلال پر ہوا "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) اور فقہاء نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے، اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جائے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۱۱۵)۔

نیز حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا- کما فی العالمگیریہ ''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند ابي حنيفة وكذا عندهما على الصحيح (هكذا في الخلاصة جلد ۱/ ۲۴)'' وفيه أيضا إذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا أخبر السامع أنه قرء آية السجدة'' (۱/ ۸۵)، ''وهذه الجزئية الثانية تؤيد الأولى حيث وجب سجدة التلاوة بقرأة القرآن بالفارسية فعلم منه أن الترجمة بالفارسية لاتخرج القرآن عن كونه قرآنا حكما فلا يجوز مسه للمحدث''۔

اور یہ یقینی بات ہے عامۃ الناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لیے وضو کا اہتمام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا، اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے، اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہو جانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے، تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آوے گا، اور محذور کا سبب لامحالہ محذور ومحظور ہے۔

اور اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں، اور پھر تو قرآن سے بالکل بے تعلق اور اجنبی ہو جائیں گے اور بے ساختہ ان پر یہ آیت صادق آنے لگی گی:

"نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" (سورۃ البقرۃ:۱۰۱)۔

اور مثلاً اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے، اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں، تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہنچتا، اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جاویں گے، اور اصل نظروں سے غائب ہوگی، تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا، بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے، یہ اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے کر آپس میں لڑیں گے اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں، جو مدار ہو سکتا ہے فیصلہ کا، پس اس آیت کا مضمون ظاہر ہو جاوے گا:

"وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ أُوْتُوْهُ مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا م بَيْنَهُمْ" (سورۃ بقرہ:۲۱۳)۔

اور مثلاً اب تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے، قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں، اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے، نیز کسی مترجم کو ہمت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہو سکتی، کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا۔ اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے، کسی کا تابع نہ سمجھیں گے، اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی، خصوص مترجمین ہی کا مطبوع مستقل ہو جانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی، اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا۔ کیونکہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی،

کما قال اللہ تعالی: "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (سورۂ توبہ:۳۱)

اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں جن کو انشاء اللہ علماء ظاہر کریں گے (جواہر الفقہ:۱۱۵-۱۱۳)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم الخط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارت میں اس کا لکھنا حرام ہے، اور اسی طرح غیر عربی رسم الخط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے، جس کی تفصیل "النفحۃ القدسیۃ فی احکام القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ" میں علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح مدلل بیان کر چکے ہیں، جو پہلے گذر چکا ہے۔

نیز علامہ سیوطیؒ نے "اتقان فی علوم القرآن" (ص ۶۷ تا ۱۷۱) تک جلد دوم میں بیان کیا ہے، نیز "نصوص جلیہ" کے (صفحہ ۲۵) کے حوالہ سے بھی مدلل بات آچکی ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

قرآن مجید عربی رسم الخط اور رسم خط عثمانی میں لکھنا واجب ولازم ہے، مذاہب اربعہ، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ وحنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم الخط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارت میں اس کا لکھنا حرام ہے، اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے "النفحۃ القدسیۃ فی احکام القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ" میں علامہ حسن شرنبلالیؒ نے تفصیلی بحث کی ہے۔

لہذا بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہوگا، پھر مخصوص احکام وآداب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو موبائل کے ڈھانچہ کو غلاف تصور کیا جائے اور بلاوضو چھونے کی گنجائش ہوگی۔



قرآن کریم کے متن وترجمہ کی کتابت

مولانا محمد یوسف علی[1]

۱- قرآن کریم کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے۔ اور جب بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا، شائع کرنا ممنوع ہے۔ تب اسے خریدنا، تقسیم اور ہدیہ کرنا بھی ناجائز ہوگا۔ کیونکہ اس میں اعانت معصیت ہے۔ اور اعانت معصیت ناجائز اور ممنوع ہے لقولہ تعالیٰ۔

"تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ:۲)۔

"وفی موضع اخر ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها" (سورۂ نساء:۸۵)۔

ممنوع کی دلائل:

(۱) "النفحة القدسیة فی احکام قرائة القرآن و کتابته بالفارسیة" کتاب میں مذاہب اربعہ سے اسکی حرمت اور سخت ممانعت ثابت ہے کہ قرآن مجید کو عجمی زبان میں محض ترجمہ بالنظم قرآنی عربی کے لکھا جائے۔

(۲) صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغنانی نے اپنی کتاب "التجنیس والمزید" میں لکھا ہے:

"یمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالإجماع، لأنه یؤدی للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بالحفظ النظم والمعنی، فإنه دلالة علی النبوة، ولأنه ربما یؤدی إلی التهاون بامر القرآن"

(۳) "ومنها ما فی معراج الدرایة: أنه یمنع من کتابة المصحف بالفارسیة أشد المنع وأنه یکون معتمده زندیقا۔"

(۴) "ومنها ما فی الکافی: أنه لو أراد أن یکتب المصحف بالفارسیة یمنع"۔

(۵) "ومنها ما قال فی شرح الهدایة فتح القدیر للمحقق الکمال ابن همام: إن اعتاد القرأة بالفارسیة أو أراد أن یکتب مصحفا بها یمنع، فإن فعل أیة أو أیتین لایمنع، فإن کتب القرآن وتفسیر کل حرف وترجمته جاز"

صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام کی عبارت سے تصریح ہوگی کہ فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا ممنوع۔ ایک یا دو آیت کا ترجمہ لکھنا ممنوع نہیں، بلکہ پورا قرآن مجید یا انکا کوئی معتد حصہ لکھنا حرام ہے۔ نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھیں تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

پھر عبارت مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا جس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو اسلئے علامہ شرمبلالی نے روایۃ مذکورہ بالا نقل کرنے کے بعد فرمایا:

" قدمنا حکایة الإجماع علی منع کتابة القرآن العظیم بالفارسیة، وإنه انما نص علی الفارسیة لافادة المنع بغیرها بالطریق الأولی، لأن غیرها لیس مثلها فی الفصاحة، ولذا کانت فی الجنة مما یتکلم به کالعربیة کما تقدم" (النفحة القدسیة ص۳۲)۔

[1] ناظم عمومی، شمال مشرق ہند امارت شرعیہ وندوۃ التامیر شیخ الحدیث دیوائیل دارالحدیث، بدرپور، کریم گنج آسام۔

(۶) ''درمختار'' میں ہے: '' وتجوز كتابة آية أو آيتين بالفارسية لا أكثر والظاهر أن الفارسية غير قيد '' (شامی ۱/ ۵۴)۔

(۷) اور ''کفایہ شرح ہدایہ'' میں ہے: '' قال الإمام المحبوبي أما لو إعتاد قرائة القرآن أو كتابة المصحف بالفارسية يمنع منه أشد المنع '' (هامش فتح القدير ۱/ ۲۲۹)۔

قرآن کریم کا اردو ترجمہ بلا عربی عبارت کی اشاعت کے متعلق حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے ۱۳۳۲ھ میں اس اشاعت کی ممانعت اور حرمت پر ایک نہایت مفصل ومدلل فتوی 'حوادث الفتوی' کے نام سے جو صفحہ ۱۵۶ پر مشتمل ہے شائع کئے تھے۔

قرآن کریم کو کسی زبان میں (متن قرآن کے بغیر) اشاعت کرنا اگر چہ درست نہیں تب بھی ایسی اشاعت کردہ قرآن کریم کو بے وضوء چھونا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ قرآن شریف ہونے سے خارج نہ ہوگا ورنہ پھر اسکا بغیر عربی زبان کے لکھنا حرام نہیں ہوتا۔

۲- بریل کوڈ

بریل کوڈ عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کے باوجود نابیناؤں کی مجبوری کی بناء پر بریل کوڈ میں قرآن کریم کو تیار کرنا درست ہوگا۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کریم کا حکم اصل قرآن کی طرح ہے۔ کیونکہ بریل کوڈ مصحف مکتوب کے مانند اور حروف بھی عربی ہے۔ اور بریل کوڈ یہ مصحف معروف جو روشنائی (کالی) سے لکھا ہوا ہے اسکے مقابلہ میں بریل کوڈ میں لکھا ہوا ہے۔

بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن کریم خالص مصحف ہے جسمیں نہ کوئی تفسیر ہے اور اسمیں ایسی چیز ہے جو اسکو مصحف سے خارج کردے، لھذا اسکے لئے مصحف شرعیہ کا حکم جاری کیا جائیگا۔ قرآن کریم کو مصحف عثمانی کی صورت میں شائع کرنے سے پہلے ہڈی، پتھر اور چمڑے پر لکھی ہوئی جو صورت تھی اس کا حکم مصحف قرآن کا حکم تھا۔

اس کو چھونے کیلئے باوضوء ہونا ضروری ہے اصلی قرآن کریم کیلئے جو آداب واحکام ضروری وہی بریل کوڈ کیلئے بھی ضروری ہے۔

۳- موبائل اسکرین پر قرآن مجید چھونا:

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضوء ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ موبائل کا ڈھانچہ ایک غلاف اور پردہ ہے جس کو بے وضو چھونے میں گنجائش ہے۔

چونکہ موبائل کے اسکرین میں جو قرآن کریم داخل کیا جاتا ہے اسکا حکم مصحف قرآن کے حکم کے مانند نہیں ہے۔ کیونکہ مصحف کو چھونے کیلئے مطلقا طھارت اور وضوء شرط ہے لقولہ تعالی "لایمسه الا المطهرون" (سورۂ واقعہ: ۷۹) اور حدیث مشہورہ میں ہے "لا يمس القرآن إلا طاهر" (دارقطنی ۱/ ۴۳۳، ۲۸، موارد الظمان الی زوائد ابی حبان/ ۷۹۳) ایسا ہی صحابہ کرام تابعین اور جمہور علماء کرام کا مذہب ہے کہ بغیر وضوء کے قرآن کریم چھونا حرام ہے چاہے تلاوت کیلئے ہو یا دوسرے کسی غرض سے ہو اس طرح یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ موبائل کے اسکرین میں جو قرآن کریم داخل کیا جاتا ہے اسکا حکم مصحف قرآن کے حکم میں نہیں ہے۔ کیونکہ موبائل کے اسکرین میں جس حروف قرآن کا وجود ہے وہ مصحف قرآن کے حروف سے علیحدہ اور مختلف ہے۔ لہذا مصحف قرآن کی صفت مقدوّہ موبائل میں نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ موبائل میں معلق صفت ہوتی ہے جو طلب کے وقت حروف کی صفت ظاہر ہوتی ہے پھر چلی جاتی ہے۔

لہذا موبائل کی اسکرین میں جو حروف ہیں یہ مصحف قرآن کے حروف کے مانند نہیں، فلذا مصحف قرآن کو چھونے کے وقت وضوء شرط ہوگا اور موبائل میں جو قرآن کریم ہوگا اسکے چھونے کیلئے طھارت اور وضوء شرط نہ ہوگا۔

۴- عربی رسم رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھدیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو اسکا کیا حکم ہے؟ اور غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: قرآن کریم کو عربی رسم الخط میں لکھنا واجب ہے کسی عجمی رسم الخط جیسے ہندی انگریزی وغیرہ زبانکے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں۔ عربی زبان کے الفاظ کا تلفظ دوسری زبان کے حروف والفاظ سے کرنا ممکن نہیں قرآن کریم کو عربی تلفظ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے تلفظ کی غلطی سے معانی فاسد ہوجاتے ہیں۔ لہذا قرآن حکیم کو رسم القرآن اور رسم عثمانی میں ہی لکھنا واجب ہے اور دوسرے کسی رسم الخط میں لکھنا حرام اور گناہ ہے۔

دلائل:

(۱) سورہ حجر میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: "إنا نحن نزلنا الذكر وإناله لحافظون" (سورۂ حجر:۹)، میں آیۃ کریمہ اپنے عموم واطلاق کے لحاظ سے قرآن کریم کے نظم ورسم دونوں کی حفاظت کو شامل ہے۔

(۲) عہد صحابہ تک سلفا خلفاء اس امر پر اجماع امت قائم رہا ہے مصحف شریف میں خط قرآن سے قرآن ہی لکھا جاتا ہے غیر قرآن نہیں لکھا جاتا اس لئے مصحف شریف میں خط قرآن ہے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ قرآن ہے علماء دین اور فقہاء میں سے کسی نے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم لکھنے کو جائز نہیں کہا۔ علامہ سیوطیؒ متوفی ۹۱۱ھ نے الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ صفحہ ۱۷ میں لکھا ہے "لم يجوز أحد من الائمة الأربعة كتابة القرآن بغير العربی"۔

(۳) قرآن کریم کو غیر عربی رسم الخط سے لکھنے میں تحریف اور تبدیل قرآن لازم ایگا جو بہت بڑا گناہ ہے۔

(۴) عربی رسم الخط کے علاوہ دوسرے رسم الخط سے قرآن کریم لکھنے میں عربی رسم الخط اور عربی حروف کا حق ادا نہ ہوگا کیونکہ عربی حروف کا تلفظ دوسرے زبان کے حروف سے ادا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ تحریف حروف لازم اتا ہے اور کلام اللہ میں تغیر اور تبدیل کفر ہے، لہذا دوسرے رسم الخط سے لکھے ہوئے قرآن پورے حکم قرآن میں نہیں رہیگا، کیونکہ قرآن لفظ اور معنی دونوں کو شامل ہے صرف معنی نہیں پھر جب بھی حروف کے تلفظ میں خلل آئے گا تو معنی میں فساد ایگا اور ہر دو حرام اور گناہ ہے

صحابہ سے لیکر اج تک مصحف قرآن رسم عثمانی کے سوا لکھنا جائز نہیں ہے اسپر تمام علماء کا اتفاق ہے امام احمد بن حنبل کا قول خط مصحف عثمانی کا خلاف کرنا حرام ہے۔

علامہ زرکشی کا قول ہے قرآن کریم کو غیر عربی قلم میں لکھنا حرام ہے۔

امام مالکؒ سے جب پوچھا گیا تھا قرآن کریم کو غیر عربی میں لکھنے کے بارے میں تو اپ نے جواب میں فرمائے تھے مصحف عثمانی کے سوا دوسرے طریقے پر لکھنا جائز نہیں۔ لہذا با جماع امت قرآن کریم کو عربی کے سوا دوسرے رسم الخط میں لکھنا نا جائز ہے (بحوالہ جواہر الفقہ لمفتی شفیع صاحبؒ)۔

اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھدیا جائے اور دونوں کا ایک، ساتھ شائع کردیا جائے تو غیر عربی دان کی سہولت کے لئے مجبوراً جائز ہوجایگا اور تنہا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت جائز نہ ہوگا، بلکہ حرام ہوگا۔

☆☆☆

ترجمہ قرآن پاک بغیر متن کے شائع کرنے کا حکم

مفتی سعید الرحمن فاروقی [1]

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ''علوم القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ کے مذکورہ کارنامے کے بعد امت کا اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے اور صحابہ اور تابعین نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی (علوم القرآن/ص ۱۹۲)۔

قرآن کریم کا فقط ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے شائع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا صرف ترجمہ چھاپنے والا ہی مجرم ہے یا دوسرے خرید و فروخت کرنے والے بھی؟

اس سوال کے جواب میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام ہے اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایت ذیل میں اس کا ناجائز اور حرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوگا تو اس کی خرید و فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کے خرید و فروخت کی وجہ سے گنہگار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

حضرت مفتی صاحب نے علامہ شرنبلالی کی ''النفحۃ القدسیہ'' (جو اس وقت انٹرنیٹ پر موجود ہے) کا حوالہ، اسی طرح صاحب ہدایہ کی تصنیف ''التجنیس والمزید'' کا ''معراج الدرایہ''، ''کافی''، ''کفایہ''، ''رسالہ النصوص الجلیہ'' اور ''فضائل القرآن لابن کثیر'' وغیرہ کی عبارت سے اپنے فتوے پر استدلال فرمایا ہے اور اخیر میں بہت جامع تنبیہ لکھی ہے، جس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کریم کا صرف ترجمہ شائع کرنا جس طرح منع ہے کسی اور رسم الخط ہندی انگریزی وغیرہ میں لکھنا ممنوع و حرام اور اجماع امت کے خلاف ہے۔

تنبیہ میں جو نصوص نقل کی گئی ہیں ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت و مخالفت ثابت ہوگئی کہ زبان تو عربی ہی رہے، لیکن رسم الخط انگریزی، یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی ناگری وغیرہ کردی جائے، جیسا کہ اس فتنے کے زمانے میں اس کا بھی شیوع ہے کہیں انگریزی رسم الخط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے، کہیں ہندی اور گجراتی میں جو باجماع امت ناجائز ہے، خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم الخط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہوگی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے، اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمت اسلام سمجھ کر کیا جارہا ہے اور اس کے لئے بہت سی مصالح دینیہ بیان کی جاتی ہے۔ جن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ ضرورت، کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم الخط بدلنے کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اسی طرح حاصل ہوتی آئی ہیں کہ ہر ملک و قوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انہوں نے بدون رسم خط تبدیل کرنے کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں، اور ایسا پڑھا کہ انہیں اہل عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کریم کی قرأت و تجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کئے جائیں تو ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماع امت کا فیصلہ نہیں بدلہ جاسکتا اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرام نے ان مصالح کی طرف نظر نہیں فرمائی، حالانکہ یہ مصالح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں کیونکہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا ہے مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن

[1] مفتی دار العلوم امدادیہ، ممبئی۔

نہ تھا، کیونکہ خود کاتب قرآن حضرت زید بن ثابتؓ مختلف زبانیں جانتے تھے، مگر اس کے باوجود کتاب قرآن میں خاص خاص ملکی مصالح کو نظر انداز کر کے صرف عربی زبان عربی رسم الخط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے گئے اور تمام ممالک میں بھیجے (جواہر الفقہ/ص ۱۱۰، ۱۱۱)۔

اس تفصیل سے جس طرح دو سوالوں کا واضح جواب مل گیا اکیڈمی کی طرف سے سوالنامہ میں درج مصالح کا بے حقیقت اور نا قابل توجہ ہونا بھی ظاہر ہو گیا۔

مصارف کم آنے والی بات تو بڑی حیرت ناک ہے اگر اس کا کار خیر ہونا ثابت ہوتا تو مصارف خیر میں کمی کی ترغیب و ترجیح کے بجائے زیادتی مستحسن و مطلوب ہوتی کہ ''تعاون علی البر'' کے بروخیر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور اسلامی حکومتوں نے اس کار خیر میں بے دریغ خرچ کیا ہے، اور خصوصاً خدمت قرآن بڑی ترجیحات میں ہمیشہ شامل رہی ہیں اور آج تک ہے، خادم الحرمین الشریفین کا خدمت قرآن کا کارنامہ امت مسلمہ پر مخفی نہیں ہے، اس لئے مصارف میں کمی کا عذر اور کار خیر میں کم صرفہ کی ترغیب و ترجیح ایمانی و اسلامی محبت اور روح ایمان کے خلاف ہے، ایسے ہی لوگ جہاں کمی کرنا چاہئے زیادہ فضول خرچی کرتے ہیں، تو مسئلہ مصارف کی بیشی کا نہیں، بلکہ کار خیر ہونے یا ممنوع و نا جائز ہونے کا ہے، امت نے ہمیشہ اس کو (یعنی صرف بغیر عربی الفاظ کے ترجمہ شائع کرنا) نا جائز و ممنوع سمجھا، اس لئے اس جہت میں نہ خرچ کیا اور نہ اس کی گنجائش ہے، ثواب کے بجائے یہ امر موجب اثم و گناہ ہے، اس لئے امت نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے اور یہی حکم آج بھی لازم ہے۔

سوال مذکور دوسری مصلحت کے دو اجزاء ہیں، جو پڑھ نہ سکیں متن سے ان کا کیا فائدہ؟ اس کا آسان اور معقول جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ کیا نقصان ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ بلا شبہ فائدہ ہے وہ یہ کہ اصل اور ترجمے کا فرق پیش نظر رہے، تا کہ دیکھنے والا ہر ایک کے امتیاز کو مد نظر رکھ سکے اور ترجمے کو اصل سمجھنے کا ممکنہ احتمال باقی نہ رہے، جن لوگوں سے بے حرمتی کا اندیشہ ہے ان کو جس طرح متن دینا جائز نہیں ترجمہ کرنا بھی کسی طرح درست نہیں کیونکہ اس کا احترام بھی بہر حال ہے کیا ترجمے کی بے حرمتی قابل برداشت ہے؟ اگر نہیں تو اصل اور ترجمہ دونوں اسی کے سپرد کیا جانا درست ہوگا جس سے بے حرمتی کا اندیشہ ہو، پھر دونوں کے علاحدہ کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ احترام کرنے والے کے لئے موثر مفید اور باعث تسکین اطمینان ہوگا، اس لئے صرف ترجمہ شائع کرنا مذکورہ فوائد کی وجہ سے نہ شرعی ضرورت ہے، نہ عقلی اور نہ اس کی کبھی اجازت دی گئی اور نہ دی جا سکتی ہے، اس لئے حسب تحقیق اکابر علماء کرام نے صرف ترجمہ یا متن عربی الفاظ میں شائع کرنا روا اور درست قرار نہیں دیا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے محض ترجمہ چھاپنے کی تقریباً دس دلائل سے تردید فرمائی ہے، حضرت والا کی تحریر اس صورت مسئولہ پر نہایت بصیرت افروز ہے، اس لئے اس کو بھی نقل کر دیا جاتا ہے:

نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرۃ ص: ۵۵۹) میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو کفار میں شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا، دوسری حدیث: ''لترکبن سنن من کان قبلکم'' (ترمذی شریف جلد ۲/ص/۴۱ ابواب الفتن، باب لترکبن سنن من کان قبلکم) میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل للمتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً و عادتاً ان کے خصائل میں سے ہے سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت ''یٰأیھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن'' (سورۃ البقرۃ: ۲۰۸) نازل ہونا اور رسول اللہ ﷺ کا تبتل اور ترہیب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے، مشکوٰۃ کتاب النکاح و کتاب الاعتصام ''لا تشددوا علی أنفسکم'' (مشکوٰۃ شریف، باب الاعتصام ص: ۳۱) اور امر میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ''ذات الانواط'' کی درخواست پر کیسا زجر فرمایا تھا یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی چہ جائیکہ اس میں مفاسد مآلیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں، مثلاً خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات و انجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام اور

شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے محققان دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنھما نے بعض قراء کی شہادت کے وقت، بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا، جیسا حدیث میں ہے "امتھوکون انتم کما تہوکت الیھود والنصاری" (مشکوٰۃ شریف، باب الاعتصام ص/ ۳۰) اور مثلاً یہ مفسدہ ہوگا کہ حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا کما في العالمگیریۃ "ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یکرہ لھم مسه الخ" (۱/ ۲۴)، "وفیه ایضا إذا قرأ آیة السجدة بالفارسیة فعلیه وعلی من سمعھا الخ" (۱/ ۸۵)، "وھذہ الجزئیة الثانیة تؤید الأولی... فعلم منه أن الترجمة بالفارسیة لا تخرج القرآن أن کونه قرآنا حکیما الخ" اور یہ یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمے کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لئے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے، اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہو جانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے، تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آئے گا اور محذور کا سبب لامحالہ محذور ہے، اور مثلاً آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا جو کسی نے ایسا کیا تو اس پر انکار کیا گیا۔

چنانچہ میں نے محمد عبد الرحمن خان صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی سے یہ سنا ہے کہ کسی نے لکھنؤ میں ایسا ہی ایک پارہ چھاپا تھا، مگر علماء نے اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی، تو اس شخص نے اس کے اوراق کو قرآن مجید کی دفتیوں میں چسپاں کرا کے پوشیدہ کر دیا اور چنانچہ اس وقت بھی ایسے ترجمے غیر حامل متن پر علماء کو انکار ہے۔

اس جواب کے لکھنے کے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی بلکہ سب نے شدید انکار کیا باوجودیکہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی جس حاجت کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے، تو باوجود داعی کے تمام علماء کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی اس امر کے مضموم ومنکر ہونے پر جس میں یہ احادیث وارد ہیں

"إن اللہ لا یجمع أمتي علی الضلالة، ویداللہ علی الجماعة، ومن شذ شذ إلی النار واتبعوا السواد الأعظم" (مشکوۃ)۔

اور اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمے سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس بہانے بہت کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر تو قرآن سے بالکل بے تعلق اور اجنبی ہو جائیں گے اور بیساختہ ان پر یہ آیت صادق آنے لگے گی

"نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب اللہ الخ" (سورۂ بقرہ: ۱۰۱)۔

اور مثلاً اب اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہنچتا اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جائیں گے اور اصل نظروں سے غائب ہوگی تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا، بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے یہ تو اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے کر آپس میں لڑیں گے اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں جو مدار ہو سکتا ہے فیصلے کا بس اس آیت کا مضمون ظاہر ہو جائے گا "وما اختلف فیه إلا الذین أوتوہ من بعد الخ" (سورۂ بقرہ: ۲۱۳)۔

اور مثلاً اب تو ترجمے کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت وبلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے، نیز کسی مترجم کو ہمت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہو سکتی کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا، اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے کسی کا تابع نہ سمجھیں گے اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی خصوص مترجم کا مطبوع مستقل ہو جانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمے اور تفسیر کا ملے گا، کیونکہ ہر دیکھنے والے حافظ نہیں ہوتے اور اصل کی طرف مراجعت ہر وقت آسانی نہیں ہوتی کما قال: "اتخذوا أحبارھم ورھبانھم أربابا من دون اللہ" (سورۂ بقرۃ: ۳۱)۔

اور پھر اسی طرح کے بہت سے مفاسد ہیں جن کو انشاء اللہ علماء ظاہر کریں گے اسی لئے جا بجا لفظ مثلاً لایا گیا ہے اس وقت دس ہی وجوہ پر جس کو عشرہ کاملہ کہا جاسکتا ہے اکتفا کیا جاتا ہے، مگر کاملہ کا خاتمہ ہونا لازم نہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالی کا رشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)، فقہاء نے اس قاعدے پر یہاں تک تفریع کی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے اسی طرح اس ترجمے کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمے کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جائے، اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا پس ایسے ترجمے کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ ۱ / ۱۱۲، ۱۱۵)۔

ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ اس قدر الفاظ و معانی کی حفاظت و نگرانی، تجوید و قرأت کے اہتمام والتزام، علوم القرآن، علوم تفسیر کے ضوابط مرتب کرنے کے باوجود موجودہ دور کے مسلمانوں اور بعض اہل علم کا حال اہل فکر و فن پر مخفی نہیں کہ نہ تو لوگوں کا قرآن قرأت و تجوید کے مطابق درست ہے نہ ہی معانی معتبرہ علوم تفسیر کی رعایت پوری طرح اور مکمل ہر جہت سے لوگوں کو ملحوظ خاطر ہے، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، بلکہ غالب اکثریت قرآن شریف کے عربی الفاظ کی شناخت رکھتی ہے، مگر تجوید قرأت کی رعایت نہیں رکھتی بسا اوقات ما یجوز بہ الصلوۃ پر قدرت نہیں رکھتی، مگر فکر ضرور رکھتی ہے تفاسیر و تراجم لکھنے والے اپنے منشاء فکر کے مطابق ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں، تحریف تک پہنچ جاتے ہیں من مانی تفسیر سے باز نہیں رہتے تفسیر بالرائے کر ڈالتے ہیں ظاہر ہے ان امور کی کیسے گنجائش ہو سکتی ہے۔

حرمت و ممانعت کی ان تصریحات کے باوجود جب فساد امت ظاہر ہے تو کسی اور زبان میں متن قرآن کی اجازت کی صورت میں اور خرابیوں کے سوا تجوید قرأت کا فن "ورتل القرآن ترتیلا" (سورۂ مزمل: ۴) کا حکم بے مقصد و بے معنی ہو کر رہ جائے گا، اور تفاسیر و تراجم کی بے راہ روی کا ایسا دروازہ کھل جائے گا جس کے روک تھام کی صورت نہیں ہوگی اور یہ سرچشمہ ہدایت اور نقطہ اتحاد امت اختلاف و انتشار کا مرکز بن جائے گا۔

ایسی صورت میں سہولت تو کیا ہوتی امت کے مشکلات میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا، اس لئے متن کے بغیر صرف ترجمہ اور متن قرآن کریم غیر عربی زبان میں لکھنے، چھاپنے، خریدنے، ہدیہ کرنے اور کسی طرح بڑھاوا دینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ مستقل ایک فتنے کا دروازہ کھل سکتا ہے جس کا انسداد بہر حال فرض ہے، غیر عربی متن کے شائع کرنے کی اجازت دینا بھی کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ایسی صورت میں لوگ اپنی زبان کی مدد سے عربی تلفظ کریں گے اور تجوید قرأت کی ضرورت محسوس نہ کریں گے، واضح رہے کہ عربی زبان و حروف کا تلفظ کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے اور اگر تلفظ درست کر کے ایسا کرنے پر رضامند ہوں تو غیر عربی غیر مفید اور فضول ہی ہے، اور اس صورت میں بہر حال اس نقطہ نظر کو تقویت مل جائے گی جو لوگ تجوید قرأت سے قرآن پاک پڑھنے کے منکر ہیں، اور مجمع علیہ و متفق علیہ مسلم اصول و قواعد شریعت کے خلاف کا نقطہ نظر بلاشبہ باطل ہے، لہذا اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ، معانی کے تحفظ کے لئے اس کا ابطال و تردید کریں۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

جس طرح صرف قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنا اور کسی زبان اور رسم الخط میں کتابت کرنا ممنوع ہے اسی طرح بریل کوڈ میں بھی قرآن کریم کی منتقلی کی ممانعت ہی اصل معلوم ہوتی ہے۔ بریل کوڈ کی آمد و شہرت تک نابینہ اور معذورین چشم نے جیسے اپنی دیگر ضروریات کی تکمیل کی دینی ضروریات بھی مکمل کرتے رہے۔ تاہم دیکھنے اور تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی، انگریزی زبانوں کے جاننے والوں کے لئے ہندی اور انگریزی زبان میں لکھے ہوئے قرآن کریم کو پڑھنے کیلئے استاذ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ قرآن کریم بغیر استاذ کے بھی اپنی یافت کی زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔ البتہ تجوید قرأت کی رعایت نہیں کر سکتے۔ جس سے تحریفِ لفظی و معنوی پیدا ہو جانا ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے ان زبانوں میں قرآن کریم کی منتقلی ناجائز و حرام ہے۔

بریل کوڈ میں خاص فرق یہ سمجھ میں آیا کہ نابینہ حضرات بریل کوڈ میں قرآن کریم پڑھ ہی نہیں سکتے، خواہ وہ بریل کوڈ کا جانکار ہی کیوں نہ ہو جب تک عربی بریل کوڈ بتلانے وسکھلانے والا معلم موجود نہ ہو۔ کیونکہ کوڈ میں چھ دائرے ہوتے ہیں جو مختلف زبانوں پر رہنمائی کے لئے قائم کئے گئے ہے اور حروف میں امتیاز پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً الف کیلئے 1 نمبر۔ عربی زبان والوں کیلئے۔ اور یہی انگریزی والوں کیلئے A کا اور ہندی والوں

کیلئے De کا۔ ان تینوں کا تلفظ جدا گانہ ہے، لہٰذا معلم کی رہنمائی کے بغیر انکا امتیاز اور تکلم نہیں ہوسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بریل کوڈ مستقل زبان اور رسم الخط نہیں ہے، بلکہ مختلف زبانوں کی رہنمائی کا ذریعہ ووسیلہ ہے۔ جس کو بریل ڈائری کوڈ میں معذورین اور نابینہ کی سہولت ویسر اور انکو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کیلئے مخصوص کوڈ میں محفوظ کردیا گیا ہے۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ بریل کوڈ کے لئے معلم کی شرط اور ضرورت دیگر علوم کیلئے معلم سے جدا گانہ ہے۔ کیونکہ ایک ہی شکل میں اس ڈائری کوڈ میں مختلف زبانیں سمادی گئی ہیں۔ اور کسی ایک زبان کے معلم کیلئے دوسری زبان کا بھی علم ہونا ضروری ہے۔ بریل کوڈ کا حروف کی علامت وسیلہ و سبب ہونا واضح ہوگیا، اس لئے یہ کوئی مستقل رسم الخط نہیں ہے۔ تو قرآن کریم لکھنے اور پڑھنے میں اس وسیلہ کے استعمال میں بظاہر کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے، البتہ معلم ہونا ضروری ہے اور اس کا صرف بریل کوڈ کا ماہر ہونا ضروری نہیں، بلکہ تجوید وقرأت کی بھی مہارت ہو۔ کیونکہ تجوید وقرأت کے حکم میں بنیاد وغیر بنیاد دونوں برابر ہیں۔

بریل کوڈ کو رسم الخط مجازاً کہنے کی بات سمجھ میں آتی ہے حقیقتاً رسم الخط کا اطلاق ہماری معلومات میں درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور چونکہ بریل کوڈ مجازاً ہی صحیح، مگر تحریر اور کوڈ ورڈ میں آنے والا علم قرآن کریم ہے۔ اس لئے اسکے آداب ورعایات مثل حقیقی قرآن کریم ہی ہے، لہٰذا طہارت کی شرط بھی مثل مصحف اسکے لئے بھی ہونی چاہئے۔

چند معذورین نے ہمیں بھی قرآنِ کریم سنایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ اسکوڈ ورڈ تحریر سے فائدہ اور سہولت ضرور ہے۔ اور "وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (سورۂ حج: ۷۸) کا مصداق اور رسم امام ومصحف عثمانی سے معارض نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مستقل اور حقیقی رسم الخط نہیں ہے اسلئے جواز واجازت میں شبہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ

۱- بریل کوڈ مستقل رسم الخط اور زبان نہیں ہے، بلکہ مستقل تک پہنچنے کا ذریعہ ووسیلہ ہے اور مجازاً اس پر رسم الخط کا اطلاق ہے۔

۲- بریل کوڈ جاننے والے کیلئے ماہر فن تجوید ہونا بھی ضروری ہے تاکہ لفظی یا معنوی تحریف کا شائبہ نہ ہو۔

۳- قرآن کریم کی طرح بریل کوڈ میں منتقل کئے گئے مصحف کا ادب واحترام، طہارت وغیرہ کا التزام اصل ہی کی طرح واجب ہے۔

موبائل اسکرین پر قرآن کریم:

موبائل کی اسکرین پر ابھرے ہوئے الفاظ قرآن کی تلاوت کیلئے باوضو ہونا ضروری نہیں ہے۔ موبائل ایک بند غلاف ہے ابھرے ہوئے نقوش مستقل صنعت کا نتیجہ ہے وہ مصحف اور قرآنِ کریم کی طرح مستقل نہیں ہے، بلکہ تابع اور بسا اوقات تابع در تابع ہیں، لہٰذا اسکے لئے طہارت کی شرط نہیں ہے۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت

مولانا محمد ثوبان اعظم القاسمی [1]

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ رحمہم اللہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز وحرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے، اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت ناجائز ہوگی۔ اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہ گار ہونگے وہ اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا۔

لقوله تعالى: "ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورہ نساء: ۸۵)۔

(اور جو کوئی شفارش کرے بری بات میں اس پر بھی ہے ایک بوجھ اس میں سے) (ترجمہ شیخ الہند۔ ص: ۱۱۹)۔

ولقوله تعالى: "وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)۔

(اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر) (ترجمہ شیخ الہند: ص۔ ۱۴۰)۔

حضرت علامہ حسن شرنبلالیؒ صاحب ''نور الایضاح'' جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور مفتی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے جس کا نام ''النفحة القدسية في أحكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية'' ہے، اس میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی کے لکھا جائے۔

دوسرا رسالہ ''صيانة القرآن عن تغيير الرسم واللسان'' کیا قرآن مجید کا صرف ترجمہ شائع کیا جاسکتا ہے؟ کے عنوان سے مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے جو ''جواهر الفقه'' جلد اول کا حصہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ: ''بغیر متن کے ترجمۂ قرآن شائع شدہ کی تقسیم اور ہدیہ کرنے کا حکم بھی ناجائز ہوگا، اس لئے کہ تعاون على الشر والعدوان'' کا کوئی جواز نہیں، اس کی مزید تفصیلات فقہ وفتاوی کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، مثلاً: فتح القدیر (۱/ ۲۱۰ طبع مصریہ باب کیفیۃ الصلوۃ)، شامی (۱/ ۴۵۳)، المغنی مع الشرح الکبیر (۱/ ۵۳۰) وغیرہ۔

الحاصل مصالح مزعومہ اور وھمیہ کی وجہ سے اجماع امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا، اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر ہر مصلحت قربان کردی جائے گی، خود حضرت عثمان غنیؓ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم نے ان مصالح کی طرف نظر نہیں فرمائی، جبکہ اس وقت شیوع تعلیم السنہ کا زمانہ نہ تھا، بلکہ حضرت زید بن ثابتؓ کاتب قرآن خود مختلف زبانیں جانتے تھے، مگر پھر بھی ملکی مصالح کو نظر انداز کر کے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں ارسال فرمائے:

''حوادث الفتاوی'' حصہ دوم صفحہ (۱۵۶) میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے دس دلیلوں سے بغیر نظم قرآنی کے صرف خالی ترجمہ چھاپنے، تقسیم کرنے، ہدیۃً لین دین کو امر ممنوع اور شدید ناجائز فرمایا ہے، نیز خالی ترجمہ کے چھونے کا حکم تحریر فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں: کہ حسب تصریح فقہاء رحمھم اللہ اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا۔

كما في العالگيرية: '' ولوكان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وكذاعند هما على

[1] مولانا محمد ثوبان اعظم القاسمی

الصحیح، ھٰکذا فی الخلاصۃ ''(ج:اول۔ ص:۸۵)۔

'' وفیه ایضًا: إذا قرأ آیة السجدة بالفارسیة فعلیه وعلی من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا اخبر السامع أنه قرأ آیة السجدة ''(جلد اول ص:۸۵)۔

''وھٰذہ الجزئیة الثانیة تؤید الاولیٰ حیث وجب سجدة التلاوة بقرآة القرآن بالفارسیة فعلم منه أن الترجمة بالفارسیة لاتخرج القرآن عندکونه قرآناحکمًا، فلایجوز مسه للمحدث''۔

اور یہ یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کیلئے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے، اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہوجانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا بھی استعمال کریں گے تو اس سے یہ بھی ایک محذور کا سبب ہے جو لامحالہ محذور ومحظور ہے۔ انتہیٰ ملخصاً۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

باجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وتابعین رحمہم اللہ اور باتفاق ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ پوری امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت ''مصحف عثمانی''، جس کو اصطلاح میں ''امام'' کہا جاتا ہے، اس کی پیروی اور اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا ''تحریف قرآن'' اور زندقہ کے حکم میں ہے، اور خصوصاً کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے، جس کو کوئی ''ملحد'' بھی صراحۃً تجویز نہیں کرسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں جب اسلام مشرق ومغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے ساتھ پھیلا، اس وقت قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے والے گنے چنے حضرات تھے، عراق وخراسان اور ہندوستان وترکستان وغیرہ کے رہنے والے نومسلم نہ عربی رسم خط پڑھ سکتے تھے، نہ ان کے ممالک میں ابتداءً کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر ان کی ملکی زبان میں اس کی ترجمانی با آسانی کرسکے اور قرآن ان کو پڑھا سکے، ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہوگی، کہ ہر ملک کے رسم خط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجا جائے، تاکہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں، لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ بھی اس کا قرون مشہود لھا بالخیر میں ثابت نہیں، کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم خط میں قرآن کریم لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو، بلکہ تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اس وقت بھی وہ ہوا جو صحیح بخاریؒ میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ ملک شام کے جہاد اور آرمینیہ، آذربائیجان کی فتح میں شریک تھے وہاں اہل عراق کو قرآن کی مختلف قرائتوں میں اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت کے خلیفۂ اسلام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سخت تشویش کا اظہار کیا اور یہ الفاظ کہے:۔

''أدرك الأمة قبل أن یختلفوا اختلاف الیهود والنصاریٰ''

(اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ آپ امت کی خبر لیں اس سے پہلے کہ ان میں یہود ونصاریٰ جیسا اختلاف واقع ہوجائے)

حضرت عثمان غنیؓ نے تمام اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارثؓ وغیرہم کے مشورہ سے طے کرلیا کہ قبائل عرب کے سات لغات جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے اگرچہ وہ سب وحی اور حق ہیں، لیکن ان کے لفظی اختلاف سے اب یہ اندیشہ ہے کہ کہیں معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ نہ نکل آوے، اس لئے اب صرف قریش کی لغت پر قرآن کریم پڑھا جائے، دوسرے لغات کو موقوف کردیا جائے، کیونکہ یہ اختلاف صرف لفظی تھا معنی پر اس کا کوئی اثر نہ تھا جو قبائل کی آسانی کیلئے جاری ہوا تھا، اس کی مثال اردو میں ایسی ہے جیسے دہلی اور لکھنؤ کی اردو میں باہمی کچھ فرق ہیں، مثلاً ''آپ کو'' اور ''آپ کے تئیں'' وغیرہ کہ جس کا معنی پر کوئی اثر نہیں۔

باجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین لغت قریش پر قرآن کریم کے بہت سے نسخے لکھوائے گئے، اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے

سامنے ان کو پڑھایا گیا صحیح کیا گیا، اس کے بعد وہ نسخے مختلف ممالک عرب وعجم، مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں بھیج دیئے گئے، اور باجماع امت ان کا اتباع ہر چیز میں لازم وضروری ہوگیا، اور سمجھا گیا (کذافی روح المعانی، ص:۲۰)۔

حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب ''فضائل القرآن'' میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جامع دمشق'' میں اس کا ایک نسخہ اب تک موجود ہے، جو بڑے وزنی اوراق پر لکھا ہوا ہے۔

الغرض صحابہ کرام وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ جس طرح قرآن کریم میں زبان عربی کی حفاظت ضروری اور لازم ہے، کسی عجمی زبان میں بدوں قرآنی عبارت کے قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم خط کی حفاظت بھی ضروری ہے، کسی دوسرے رسم خط میں ان کا لکھنا جائز نہیں، کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے، جو باجماع امت حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے رسم خط میں اگرچہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں، مثلاً اوائل سورت میں بسم اللہ کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے، اور اقراء باسم ربک میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے، اگرچہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں مگر باجماع امت اس کی نقل واتباع کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں، تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

اور حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں ایک مہتم بالشان مقدمہ میں بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ قرآن کریم کی جمع وترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔

قال تعالیٰ: "إن علینا جمعہ وقرآنہ" (سورۂ قیامہ: ۱۷)، وقال تعالیٰ: "انا نحن نزلنا الذکر وإنالہ لحافظون" (سورۂ حجر: ۹)۔

لیکن اس وعدۂ الٰہیہ کے ظہور اور حفاظت الٰہیہ کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے، اور نہ اس طرح ہے کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہوجاتا جو مٹانے سے مٹ نہ سکے، بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع اور تدوین کی خدمت انجام دیں، اور تمام دنیا کے مسلمان ''ایک نسخہ قرآنی'' پر مجتمع اور متفق ہوجائیں، اور ہمیشہ جماعت عظیمہ اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہیں، تاکہ سلسلہ تواتر نہ ٹوٹے، اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی میں بمشورہ واجماع صحابہؓ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا، جس میں قرأت شاذہ نہیں لی گئیں، بلکہ قرأت متواترہ لی گئیں، اور قبائل عرب کی سات زبانوں میں جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، ایک قریش کی لغت لی گئی، اور باقی لغات کے مصاحف متروک کردیئے گئے جن کا بعد میں کہیں نام ونشان نہیں رہا۔

اس واقعہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوگیا کہ قرآن مجید جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا، وہ یہی مصحف عثمانی تھا اور ہے، اور یہی قرآن مجید محفوظ من اللہ ہے، ورنہ اگر حفاظت خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی تو دوسرے لغات کے مصاحف کا تلف کردینا کسی مخلوق کی قدرت میں نہ ہوتا، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم محفوظ صرف وہی ہے جو ''مصحف امام'' اور مصحف عثمانی کہلاتا ہے، جو چیز اس میں نہیں ہے وہ قرآن کریم نہیں ہے، اور جو چیز اس میں ہے وہ مٹائی نہیں جاسکتی، اور نہ اس میں کوئی ادنیٰ تغیر کرنا جائز ہوسکتا ہے، یہی راز ہے اس اجماع کا جو اوپر نقل ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی حفاظت بھی واجب ہے (ازالۃ الخفاء، ج۱، ص۲۵، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ۳/ ۳۵۱، اتقان ۲/ ۱۶۷، ۱۷۱)۔

بریل کوڈ:

فقہاء اصولیینؒ نے مراتب احکام کی بحث میں ضرورت، حاجت، اور تحسین سے تعرض فرمایا ہے:۔

ضرورت وحاجت مختلف شرائط کے ساتھ احکام میں اثر انداز ہوتی ہے۔

لیکن تحسین، کسی ممنوع چیز کو جائز ہونے میں اثر انداز ہو اسکی نظیر موجود نہیں ہے۔

بریل کوڈ نابینا انسانوں کیلئے ضرور اچھی چیز ہے، لیکن مذکورہ دلائل کی بنیاد پر یقینی طور پر کہا جائے گا کہ قرآن کریم ''بریل کوڈ'' میں اس لئے منتقل

کیا جائے گا کہ نابینا افراد کیلئے قرآن کریم سے استفادہ میں سہولت ہوگی، یہ رسم الخط تحسین کے درجہ کی چیز ہے، مگر اس کی وجہ سے امت کے اجماعی حکم سے سرتابی کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور یقیناً حکم لگایا جائے گا کہ قرآن مجید کو ''بریل کوڈ رسم خط میں منتقل کرنا جائز نہیں، اسلئے کہ رسم خط عثمانی سے انحراف جائز نہیں، اور خرق اجماع کا کوئی جواز نہیں، اس لئے بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا جائز نہیں۔

دلیلوں سے ثابت کردیا گیا ہے کہ کسی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ جو متن قرآنی سے خالی ہو گرچہ ایسا ترجمہ چھاپنا ناجائز ہو، اگر کوئی کم نصیب ایسا کرہی لے تو اس کو بھی بے وضو چھونا جائز نہ ہوگا، جیسا کہ ''فتاویٰ عالمگیری'' کی عبارت پیچھے گزر چکی ہے، یہی حکم بریل کوڈ والے رسم الخط پر بھی نافذ ہوگا اور بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنا سخت ناجائز ہے۔

حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

''لم يجوز أحد من الأئمه الأربعة كتابة القرآن بغير العربية'' (الاتقان فی علوم القرآن: ج۲، ص:۱۷۱)۔

فی العالمگیریہ: ''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وكذا عندهما على الصحيح'' (فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۳۰)۔

''لا يمسه إلا المطهرون'' (سورۂ واقعہ:۷۹)۔

موبائل پر قرآن کریم:

موبائل میں قرآن کریم کے متن وترجمہ کو اسطرح رکھنا کہ ٹچنگ کے ذریعہ نظم ومعانی قرآن پر ہاتھ پڑے یا ارادی طور پر ہاتھ لگایا جائے تو بے وضو اسکرین کو چھونا جائز نہ ہوگا۔

البتہ میموری میں موجود قرآن شریف کیلئے فون کا ڈھانچہ غلاف کے حکم میں ہوگا۔

لیکن بٹن سسٹم موبائل میں قرآن شریف، جیسے ہی اسکرین پر نمودار ہوگا بے وضو موبائل کی اسکرین کو چھونا جائز نہ ہوگا۔

البتہ نظم ومعانی قرآن موبائل میں ڈالنا ہی بے احترامی اور بے ادبی ہے۔

چونکہ موبائل کی میموری پر صحیح اور غلط آواز وحروف کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے، تو قرآن شریف کو لفظاً اور معناً موبائل کی میموری میں رکھنا سوء ادب اور بے احترامی سے ناشی ہے، نیز موبائل کے استعمال میں جس قسم کی بے فکری مشاہدہ میں آتی ہے یا لوگوں کو موبائل سے جس درجہ شغف ہے قرآن شریف کی بے احترامی لازمی محسوس ہوتی ہے، اس لئے موبائل میں قرآن شریف کے نظم ومعانی کو محفوظ رکھنا مکروہ ہے، موبائل کا ڈھانچہ اسکرین پر ڈیجیٹل حروف کیلئے نمودار شکل میں جلد قرآن مجید کے حکم میں ہے:

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وكذا عندهما على االصحيح'' (۱/ ۳۰)۔



قرآن کریم سے متعلق بعض مسائل

مولانا محمد منصف بدایونی [1]

۱- عربی متن کے بغیر صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز نہیں ہے۔

۱- صرف ترجمہ شائع کرنے میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ لوگ صرف ترجمہ پر اکتفا کریں اور متن قرآن کو پڑھنے سے محروم ہو جائیں گے۔

۲- صرف ترجمہ شائع کرنے میں یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ ترجمہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔

۳- اور پھر نعوذ باللہ قرآن کریم کا وہی حال ہوگا کہ اصل قرآن کریم چھپنا بند ہو جائے گا اور صرف ترجمہ شائع کیا جائے اور پھر اس میں ردوبدل کرنا آسان ہوگا، جو تورات وانجیل کا ہے کہ ان دونوں کتابوں کا متن نایاب ہے صرف ترجمہ ہی ترجمہ ملتا ہے۔

۴- ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کا خیال ہے کہ عربی متن پڑھنے سے کیا فائدہ جب سمجھ میں ہی نہ آئے، ایسے لوگ تو عربی متن کو چھاپنا باعث سمجھیں گے جس سے اصل قرآن کی حفاظت خطرے میں آجائے گی۔

مذکورہ خرابیوں کی وجہ سے صرف ترجمہ کی اشاعت جائز نہیں ہے، صرف ترجمہ کی اشاعت کے لئے جو وجہیں ذکر کی جاتی ہیں وہ نا قابل توجہ ہیں، اس لئے کہ اپنے نفع کی خاطر قرآن کریم کی حفاظت کو خطرے میں ڈالنا کوئی عقل مندی نہیں ہے لہذا یہ وجہ کہ اس میں مصارف کم آتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔

دوسری وجہ کہ جو لوگ متن قرآن کو نہیں پڑھ سکتے، انہیں متن قرآن دینے سے کیا فائدہ، تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انہیں یہ احساس ہوگا کہ وہ قرآن کریم کو پڑھنے کی ایک عظیم دولت سے محروم ہیں اور پھر یہ احساس اور ایمانی جذبہ انہیں متن عربی پڑھنے کے لئے اور اس کو سیکھنے کے لئے اکسائے گا اور آمادہ کرے گا۔

اور صرف ترجمہ دینے میں وہ یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ ہم نے قرآن پڑھ لیا حالانکہ ترجمہ قرآن، اصل قرآن نہیں ہے کہ جس کے ایک حرف کے پڑھنے پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو اس طرح وہ تلاوت قرآن کے ثواب سے محروم رہ جائیں گے۔

غیر مسلموں کو قرآن دینا تبلیغ کی غرض سے یہ قرون مشہود لہا بالخیر کے خلاف ہے:

تبلیغ اور غیر مسلموں تک پیغام پہنچانے کی ضرورت قرون مشہود لہا بالخیر میں آج سے زیادہ تھی کہ اس وقت اشاعت اسلام کا مسئلہ آج سے زیادہ اہم تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا حالانکہ صحابہ کرام میں مختلف زبانیں جاننے والے افراد موجود تھے، حضرت سلمان فارسیؓ سے فارسی ترجمہ کرایا جاتا، حضرت صہیب رومیؓ سے رومی میں ترجمہ کرالیا جاتا، حضرت بلال حبشیؓ سے حبشی زبان میں، اور ان ممالک میں بھیج دیا جاتا، تاکہ اس ملک والے اس پیغام کو سمجھتے، لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ اصل قرآن کو ہی پہنچایا گیا اور اس کا مطلب وترجمہ سمجھایا گیا، تاکہ اصل قرآن کی حفاظت میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو۔

جہاں تک بے حرمتی کا تعلق ہے تو وہ تو ترجمہ کے ساتھ بھی متحقق ہوگی، کیونکہ عرف میں یعنی عوام ترجمہ قرآن کو بھی قرآن سمجھیں گے، لہذا اس کی بے حرمتی کو قرآن کی بے حرمتی ہی تصور کیا جائے گا اور اگر کسی کو قرآن کریم کی نعوذ باللہ بے حرمتی کرنی ہی مقصود ہوگی تو وہ تو کہیں سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔

لہذا سوال مذکور مصالح مزعومہ قابل التفات نہیں ہیں، کیونکہ ان کی وجہ سے اجماع امت کو نہیں چھوڑا جا سکتا اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی، ''إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع وان كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (شامی ۲/ ۱۸۶ مکتبہ زکریا، فتح القدیر ۱/ ۲۹۱ مکتبہ زکریا)۔

[1] مفتی واستاذ حدیث: جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ۔

صرف ترجمہ کی اشاعت، اس کی خرید وفروخت اور تقسیم وہدیہ ناجائز ہے:

یہ بات پہلے ثابت کی جاچکی ہے کہ صرف ترجمہ کی اشاعت ناجائز ہے، تو اب ظاہر بات ہے کہ اس کی خرید وفروخت اور تقسیم وہدیہ کرنا سب ناجائز ہوگا، اس لئے کہ یہ اعانت علی المعصیۃ ہے (فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۱۴، جواہر الفقہ ۱/ ۹۷)۔

۲-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں ہے:

قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا آج سے تقریبا ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے پہنچا ہوا ہے، اور عجمیوں کو عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات ظاہر ہے کہ اسی وقت سے ہیں، بلکہ یہ مشکلات اس وقت آج سے کہیں زیادہ تھیں کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی پڑھے لکھے حضرات ان میں بہت کم تھے خصوصا قرآن پڑھانے والا تو کوئی عربی داں ہی ہو سکتا تھا جسا کا ہر شہر، ہر گاؤں میں میسر ہونا نہایت مشکل تھا اتنی مشکلات کے باوجود صحابہ کرامؓ نے ملکی رسم الخط میں قرآن کے لکھنے لکھوانے کو روا نہ سمجھا۔

بلکہ یوں کہا جائے کہ جس طرح اللہ تعالی نے قرآن کریم کے الفاظ ومعانی کی حفاظت فرمائی ہے اسی طرح منجانب اللہ اس کے رسم الخط کی بھی حفاظت کی گئی ہے، حضرت عثمان غنیؓ نے جس رسم الخط میں قرآن کریم کو تحریر فرمایا تھا آج تک اسی کے مطابق قرآن کریم کی کتابت کا سلسلہ جاری ہے اور یہی ''علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين الحديث'' (ابوداؤد باب لزوم السنہ حدیث نمبر: ۴۶۰۷، ترمذی کتاب العلم حدیث نمبر: ۲۶۷۶) کا تقاضا ہے اسی لئے علماء کرام نے اسی رسم الخط میں کتابت قرآن کو واجب قرار دیا ہے اور اس سے انحراف کو منع فرمایا ہے۔

''ذهب جمهور العلماء إلى أن رسم المصحف الذي كتب في زمن عثمان على يدي كاتب الوحي زيد بن ثابت توقيفي لاتجوز مخالفته في كتابة المصحف وطبعها'' (اصول التفسیر وقواعدہ/ ص ۴۵۱ بحوالہ جدید فقہی مسائل)۔

یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ کرامؓ میں جب اسلام مشرق ومغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے ساتھ پھیلا، اس وقت قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے والے گنے چنے حضرات تھے، عراق وخراسان اور ہندوستان وترکستان وغیرہ کے رہنے والے نو مسلم نہ عربی رسم خط پڑھ سکتے تھے نہ ان کے ممالک میں ابتداءً کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر ان کی ملکی زبان میں اس کی ترجمانی با آسانی کر سکے اور قرآن ان کو پڑھا سکے، ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہوگی، کہ ہر ملک کے رسم خط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجا جائے، تا کہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں، لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ بھی اس کا قرون مشہود لھا بالخیر میں ثابت نہیں، کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم خط میں قرآن کریم لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو (جواہر الفقہ ۱/ ۷۴)۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندی، انگریزی رسم الخط میں عربی کے کئی حروف نہیں ہیں اور نہ ان کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی قطعی علامات ہیں اس لئے متن قرآن اور نظم قرآن کو ہندی میں (ہندی رسم الخط) کے ساتھ شائع کرنا جائز نہیں ہے (کفایت المفتی ۱/ ۱۷۱)۔

نیز ہندی وغیرہ رسم الخط مین لکھنے سے عبارت مسخ ہوجائے گی، اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلاء اطباق، استطالت سب کچھ ضائع کردیں گے (محمودیہ ۷/ ۲۲۳)۔

''قال أشهب سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال لا: إلا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة ... ''وقال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذالك'' (اتقان طبع اول فیصل ۲/ ۴۰۵)۔

عربی کے ساتھ دوسرے رسم الخط میں قرآن لکھنا:

عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں قرآن کریم کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں لکھ دیا جائے اور دونوں کو ایک ساتھ شائع کیا جائے تب بھی شائع کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ عربی نہ پڑھنے والوں کے خاطر اس طرح کیا جارہا ہے اور وہ لوگ عربی رسم الکط کے پڑھنے پر قادر نہیں ہیں تو غیر عربی رسم الخط کے ساتھ عربی رسم الخط کو شائع کرنے سے کیا فائدہ ہے وہ لوگ تو غیر عربی رسم الخط مثلاً ہندی، انگریزی وغیرہ رسم الخط کے ساتھ پڑھیں گے اور اس طرح قرآن کو صحیح طریقہ سے نہیں پڑھا جاسکتا ہے، کیونکہ عربی میں ''ح'' اور ''ہ'' میں فرق ہے، عربی میں ''ق'' اور ''ک'' میں فرق ہے، مطلب یہ ہے کہ عربی رسم الخط اور دیگر رسم الخط

میں نمایاں فرق ہے اگر علامتیں مقرر کی جائیں پھر بھی ناقص ہیں جس سے بیسیوں غلطیاں ہوں گی اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائے گا اور ثواب کی جگہ عقاب، رحمت کی لعنت کا مستحق ہوگا۔

حضرت امام جوزیؒ فرماتے ہیں کہ بے شک جس طرح امت کیلئے مطالب قرآنی کا سمجھنا اور اسکے حدود کو قائم رکھنا عبادت ہے اسی طرح صحیح پڑھنا اور حروف کو طریقہ کے مطابق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی عبادت ہے، قرآن کریم قابل استاذ کے پاس پڑھے بغیر صحیح پڑھنا دشوار ہے تو ان ان پڑھ لوگوں کے لئے کس طرح غیر عربی رسم الخط میں صحیح پڑھنا ممکن ہوگا اس سے بہتر ہے کہ جو سورتیں زبانی یاد ہیں صحیح طریقہ سے وہی پڑھا کریں، مگر غیر عربی رسم الخط میں نہ پڑھیں، کیونکہ غلط پڑھنا حرام ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۲/ ۱۷)۔

''وقال البيهقى فى شعب الايمان: من يكتب مصحفًا فينبغى أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئًا۔ فإنهم كانوا أكثر علما و أصدق قلبًا و لسانًا و اعظم امانةً منا. فلا ينبغى أن نظن بأنفسنا استدراكًا عليهم'' (بیہقی ۲/ ۵۴۸ بحوالہ الاتقان)۔

۳- حروف تہجی کا ہی بریل کوڈ تیار کیا جائے:

بریل کوڈ اس طرح ہو کہ اس میں رسم عثمانی کو موٹے کاغذ میں ابھرے ہوئے نقطوں میں لکھا گیا ہو اور انگلیوں سے مس کر کے الفاظ کی پہچان کرائی جاتی ہو اور اس طرح تعلیم دی جاتی ہو تو پھر شائع کرنا جائز ہوگا کیونکہ اس میں نہ رسم عربی کی مخالفت ہے اور نہ رسم عثمانی کی، اور یہ بات ظاہر بھی ظاہر ہے کہ جب نابینا افراد رسم عثمانی کے علاوہ بریل کوڈ کو سمجھ سکتے ہیں تو وہ بریل کوڈ بھی سمجھ سکتے ہیں، جو رسم عثمانی کے مطابق تیار کیا جائے، تا کہ اس صورت میں اجماع کی مخالفت بھی نہ ہو، اور ذکر کردہ سہولتیں بھی حاصل ہو جائے کیونکہ رسم عثمانی کی مخالفت اجماع کی مخالفت ہے:

''قال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلاعلى الكتبة الأولى رواه الدانى فى المقنع، ثم قال: ولامخالف له من علماء الامة''، ''قال الإمام أحمد: ويحرم مخالفة خط عثمان فى واواوالف أوغيرذلك'' (الاتقان طبع اول فیصل ۲/ ۴۰۳)۔

''ذهب جمهور العلماء إلى أن رسم المصحف الذي كتب في زمن عثمان على يدى كاتب الوحى ''زيد بن ثابت'' توقيفي لاتجوز مخالفته في كتابة المصحف وطبعها'' (اصول التفسیر وقواعدہ/ ص ۴۵۱ بحوالہ جدید فقہی مسائل)۔

بریل کوڈ اگر رسم عثمانی کے خلاف ہو تو وہ پڑھانے والے پر موقوف ہوگا کہ وہ کسی کو کس حرف کی علامت قرار دے اور بہت ممکن ہے کہ ایک ایمان رکھنے والا ایک بریل کوڈ کو ایک حرف کی علامت بتلائے اور مستشرق اس کو دوسرے حرف کی علامت قرار دے اس طرح اختلاف ہوگا اور یہ اختلاف قرآن کریم کے نسخوں کے اختلاف تک پہنچائے گا کوئی بھی بآسانی کہہ دیگا کہ ان کے قرآن میں نعوذ باللہ اختلاف ہے، بیناؤں کا قرآن الگ اور نابیناؤں کا الگ اور دونوں کے تلفظ میں بھی فرق ہے، اس لئے خیر اسی میں ہے کہ رسم عثمانی کا بریل کوڈ تیار کیا جائے اور کسی دوسرے بریل کوڈ کو قبول نہ کیا جائے۔

موبائل اسکرین پر قرآن کو چھونا:

اگر موبائل کی اسکرین شیشہ سے متصل ہے تو اسکرین پر قرآن کے موجود ہونے کے وقت بغیر وضو کے ہاتھ لگانا جائز نہیں ہوگا اور بقیہ موبائل کو بغیر وضو کے چھونا جائز ہوگا اور اگر اسکرین شیشہ سے متصل نہیں ہے تو پھر اسکرین کے اوپر والے شیشے کو بھی بغیر وضو کے چھونا جائز ہے۔

''ويمنع حل دخول مسجد... ومسه أى القرآن ولو في لوح أودرهم أو حائط لكن لايمنع إلا من مس المكتوب'' (شامی زکریا ۱/ ۴۸۸)۔

''إذا مس لوحا مكتوبا عليه آية، وكذا الدرهم والحائط لكن لايجوز مس المصحف كله المكتوب وغيره بخلاف غيره فإنه لايمنع إلا مس المكتوب'' (البحر الرائق ۱/ ۳۴۹)۔

''ولا يحرم مس الغلاف المنفصل عن القرآن كالمكيس والصندوق، ويجوز مسه بنحوعود أو قلم أو غلاف منفصل عنه'' (الفقه الاسلامى ۱/ ۳۸۶)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت واشاعت

مفتی ریاست علی قاسمی رامپوری[1]

غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی کتابت کا حکم:

قرآن کریم کو عربی کے علاوہ کسی بھی رسم الخط میں لکھنا باجماع امت حرام اور ناجائز ہے، خواہ تنہا غیر عربی رسم الخط میں لکھا جائے یا غیر عربی رسم الخط کے ساتھ عربی رسم الخط کو بھی شامل کرلیا جائے، بہر صورت ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ قرآنی رسم الخط توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ ہے، قرآن کا رسم الخط منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے اس میں قرأت سبعہ اور ساری قرأتیں جاری ہوسکتی ہیں یہ کمال اور خوبی کسی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہے، لہذا اس کی اتباع واجب اور اس میں تغیر اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی آیت یا سورہ قرآن کریم کی نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر لکھواتے تھے اور ہر لفظ کا رسم الخط بھی کاتب وحی کو تلقین فرماتے تھے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی زبانی سے سیکھتے تھے، جب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں صحابہ کرام کے مشورہ سے کتابت قرآن اور جمع قرآن کا مسئلہ طے ہوا، تو حضرت زید بن ثابتؓ نے مکمل احتیاط اور پوری توجہ سے اس رسم الخط کے مطابق جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی الہی کے مطابق تجویز ہوا تھا مکمل قرآن شریف کی کتابت فرمائی، پھر خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں حضرت عثمان غنیؓ کے حکم سے قرآن کریم لکھا گیا تو اس وقت بھی کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ عظیم خدمت تفویض کی گئی جبکہ ہزاروں صحابہ کرام موجود تھے، لہذا اس مصحف عثمانی اور رسم عثمانی کی اتباع لازم اور ضروری ہے، اس کی مخالفت ناجائز اور حرام ہے، ائمہ اربعہ کا رسم عثمانی کو لازم اور ضروری قرار دینے پر اجماع اور اتفاق ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹) میں اللہ رب العالمین نے صرف الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا ہے، بلکہ الفاظ، معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا اس میں وعدہ کیا گیا ہے، معانی اور علوم قرآن کی حفاظت میں علماء دین مشغول ہیں، الفاظ، عبارت، لہجہ اور طرز ادا کی حفاظت میں حضرات قراء کرام مشغول اور منہمک ہیں اور رسم الخط کی حفاظت خطاط اور کاتبین کرام کررہے ہیں، لہذا مصحف عثمانی اور رسم عثمانی کا اتباع لازم اور ضروری ہے، اور اس کے خلاف کرنا اگرچہ وہ عربی رسم الخط ہی کیوں نہ ہو ناجائز اور حرام ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں:

"وقال أشهب سئل مالك هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا، إلا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولامخالف له من علماء الأمة۔ وقال الامام احمد: يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو الف أو غير ذلك (۲/ ۳۰۲ فی مرسوم الخط وآداب كتابته)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عربی رسم الخط میں بھی رسم عثمانی کی اتباع لازم اور ضروری ہے، یعنی رسم عثمانی میں جو الف، یاء اور واؤ زائد ہیں جن کو پڑھا نہیں جاتا صرف وہ لکھنے میں آتے ہیں، اس طرح کے حروف کو حذف کرکے اگر کوئی شخص عربی عبارت میں قرآن لکھے تب بھی درست نہیں ہے، کیونکہ یہ رسم عثمانی کی مخالفت ہے اور رسم عثمانی کی مخالفت درست نہیں ہے۔

---

[1] مفتی واستاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ۔

علامہ سیوطیؒ امام بیہقیؒ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وقال البیهقی فی شعب الایمان: من یکتب مصحفا فینبغی أن یحافظ الذی کتبوا به هذه المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئا، فإنهم کانوا أکثر علماء واصدق قلبا ولسانا واعظم أمانة منا. فلا ینبغی أن نظن بأنفسنا استدراکا علیهم'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۴۰۳ مطبوعہ فیصل دیوبند)۔

امام بیہقیؒ کے قول کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جس انداز اور رسم الخط میں قرآن کریم کو تحریر کیا تھا اس میں ذرہ برابر بھی تغیر اور ترمیم درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا ایک رسالہ ''تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط من مصحف الانامؒ'' کے نام سے ''جواہر الفقہ'' میں موجود ہے، جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس کے چند اقتباسات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

باجماع صحابہ اور تابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب اور ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصا کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے جس کی کوئی ملحد بھی صراحۃ تجویز نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں جب اسلام مشرق اور مغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے ساتھ پھیلا اس وقت قرآن کریم کے پڑھنے والے گنے چنے افراد تھے، عراق وخراسان اور ہندوستان وترکستان وغیرہ کے رہنے والے نو مسلم نہ عربی رسم الخط پڑھ سکتے تھے، نہ ان کے ممالک میں کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر ان کی ملکی زبان میں اس کی ترجمانی بہ آسانی کرسکے اور قرآن کو پڑھا سکے، ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہوگی کہ ہر ملک کے رسم الخط میں قرآن کریم لکھوا کر ان کے پاس بھیجا جائے، تاکہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں، لیکن پوری تاریخ اسلامی میں ایک بھی واقعہ اس طرح کا قرون مشہود لہا بالخیر میں ثابت نہیں ہے کہ ان حضرات نے کسی عجمی (غیر عربی) رسم الخط میں قرآن کریم لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو (جواہر الفقہ ۱/ ۷۴، ۷۵)۔

اس کے بعد آئندہ صفحہ پر رقم طراز ہیں:

الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا، بلکہ تقریبا تیرہ سو برس پہلے پہنچا ہوا ہے اور عجمیوں کو عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات آج پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اسی وقت سے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو اُس وقت مشکلات زیادہ ہونی چاہئے کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی پھر ان میں لکھے پڑھے کم تھے خصوصا قرآن پڑھانے والا کوئی عرب ہی ہوسکتا تھا، جس کا ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر بستی میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا، لیکن ان سب مشکلات مزعومہ کے باوجود صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ جائز نہیں کیا کہ قرآن کو ملکی رسم الخط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جاوے بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم الخط کی بھی مصحف عثمانی کے موافق حفاظت کرنا ضروری سمجھا اور ان مشکلات کو حفاظت مذکورہ کے مقابلے میں ناقابل التفات قرار دیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ میں دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات محض خیالی تھیں (ماخوذ از جواہر الفقہ ۱/ ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷ مکتبہ تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند)۔

اس پورے مضمون کا خلاصہ یہی ہے کہ کتابت قرآن میں رسم عثمانی کی اتباع واجب ہے اور اس کے برخلاف کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن کریم لکھنا ناجائز اور حرام ہے۔

عثمانی رسم الخط کے ساتھ دوسرے رسم الخط میں کتابت:

عربی رسم الخط اور عثمانی رسم الخط میں قرآن کریم کو باقی رکھتے ہوئے کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم لکھنا اور دونوں کو ایک ساتھ شائع کرنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ جن لوگوں کی سہولت کے لئے یہ عمل کیا جارہا ہے وہ لوگ عربی رسم الخط کے پڑھنے پر قادر نہیں ہیں تو عربی رسم الخط کو غیر عربی رسم الخط کے ساتھ شائع کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ وہ لوگ تو غیر عربی رسم الخط، مثلاً ہندی، انگریزی رسم الخط کے ساتھ پڑھیں گے اور اس

طرح قرآن کریم کو صحیح طریقہ سے نہیں پڑھا جاسکتا، کیونکہ عربی زبان میں ح، ہ، ق، ک، ع اور غ علاحدہ علاحدہ حروف ہیں اور ان کے رسم الخط میں نمایاں اور واضح فرق ہے، یہ فرق اور امتیاز کسی اور زبان میں نہیں ہے اگر علامات مقرر کی جاتیں پھر بھی ناقص ہیں جس میں تحریر اور رسم الخط کی غلطی کے ساتھ تلفظ اور ادائیگی میں واضح فرق ہوگا جس کے نتیجہ میں حروف کی تبدیلی کے ساتھ معنی اور مطلب بھی بدل جائے گا، اور ثواب کی جگہ عقاب اور رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا، امام ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ بلاشبہ امت کے لئے جس طرح قرآن کریم کے معانی اور مطالب کو سمجھنا اور اس کے حدود قائم رکھنا عبادت ہے، اسی طرح الفاظ قرآنی کو صحیح پڑھنا اور صحیح تلفظ کرنا بھی عبادت ہے، اور یہ تمام کام رسم عثمانی کے مطابق قرآن کریم کو لکھنے اور پڑھنے ہی سے مکمل ہوسکتے ہیں، اس لئے رسم عثمانی کی اتباع واجب ہے، اور اس کی مخالفت حرام اور ناجائز ہے۔

غیر عربی زبان مثلاً ہندی، انگریزی میں کتابت قرآن کی ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہندی زبان میں عربی کے کئی حروف نہیں ہیں، بلکہ وہ حروف عربی ہی کے ساتھ خاص ہیں کسی دوسری زبان میں اس کا تلفظ نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی ان کو ظاہر کرنے کی کوئی قطعی علامت ہے جیسے ظاء، حاء، ضاد، زاء، قاف، ذال وغیرہ ایسے حروف ہیں جن کو دوسری زبان میں صحیح ادا کرنے کی کوئی شکل وصورت نہیں ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے جو ہندی اور انگریزی وغیرہ میں مستعمل ہیں اور یہ عمداً تحریف اور تغیر ہے جو کہ حرام ہے، نیز ہندی رسم الخط میں لکھنے سے عبارت مسخ ہوجائے گی اصل مخارج اور صفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلاء، اطباق، استطاعت وغیرہ جیسی صفات ضائع ہوجائیں گی، اس لئے متن قرآن اور نظم قرآن ہندی رسم الخط میں لکھنا یا انگریزی رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں (فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۵۱۰، ۵۱۱ مطبوعہ ڈابھیل)۔

غیر عربی زبان کے رسم الخط میں کتابت قرآن کے عدم جواز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر قرآن کریم کی کتابت میں عثمانی رسم الخط کی پابندی نہ کی جائے تو کتاب الٰہی لوگوں کے ہاتھ میں بازیچہ اطفال اور کھلونا بن کر رہ جائے گی، کہ جب جب کسی انسان کے دل میں کوئی نیا خیال آئے گا تو اس کو بروئے کار لائے گا، کوئی اسے لاطینی زبان میں اور کوئی اسے کسی دوسری زبان میں تحریر کرنے کی تجویز پیش کرے گا جو ایک خطرناک عمل ہے اور مفاسد کا ازالہ مصالح کے حصول سے زیادہ اہم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کتابت قرآن میں رسم عثمانی کا اتباع لازم اور ضروری ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں خواہ عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کریم کی کتابت درست نہیں ہے، مثلاً بسم اللہ کو مصحف عثمانی بحذف الف اور اقرأ باسم ربک میں بشکل الف لکھا گیا ہے، اگرچہ پڑھنے میں دونوں یکساں پڑھے جاتے ہیں، مگر باجماع اس رسم عثمانی کی نقل واتباع لازم اور ضروری ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت کا حکم:

سوال میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ بریل کوڈ نہ تو عربی رسم الخط ہے اور نہ رسم عثمانی ہے اس لئے قرآن کریم بریل کوڈ میں لکھنا اور تیار کرنا ناجائز اور حرام ہوگا، کیونکہ اس میں رسم عثمانی اور عربی رسم الخط کی مخالفت ہے، جبکہ کتابت قرآن میں عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کی اتباع لازم اور ضروری ہے، اور حدیث نبوی: "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين" (ابوداؤد باب لزوم السنه حديث نمبر ۴۶۰۷، ترمذی حديث ۲۶۷۶ كتاب العلم) کا تقاضا بھی یہی ہے اسی لئے علماء امت نے رسم عثمانی سے انحراف کو کتابت قرآن میں ناجائز قرار دیا ہے، اس کے دلائل بھی وہی ہیں جو گذشتہ صفحات میں تحریر کئے جاچکے ہیں، البتہ اگر قرآن کریم کو ابھرتے ہوئے حروف میں رسم عثمانی کے ساتھ اس طرح شائع کیا جائے کہ نابینا حضرات اسے چھوکر حروف کو پہچان کرلیں اور اس کی تلاوت اس طرح کرلیں جس طرح بینا حضرات قرآن کریم دیکھ کر کرتے ہیں تو شرعاً اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس صورت میں نابینا حضرات تلاوت بھی کرلیں گے، اور کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آئے گی البتہ اتنا ضرور ہے کہ اگر نابینا حضرات کے لئے ہمارے ذکر کردہ طریقہ کے مطابق قرآن کریم کی اشاعت کی جائے تو قرآن کریم کو بلا وضو چھونا اور ہاتھ لگانا درست نہیں ہوگا۔

موبائل پر قرآن مجید کا مسئلہ:

دور حاضر میں موبائل کے اندر قرآن مجید کے متن کو محفوظ کرنے اور اس کے ذریعہ قرآن کریم کی تلاوت کی سہولت پیدا ہوگئی ہے تو موبائل کی

اسکرین پر قرآن کریم نظر آتے وقت اس کو بلا وضو چھونا درست ہوگا یا نہیں تو اس سلسلہ میں تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اسکرین موبائل کے شیشہ سے متصل ہوتی ہے یا علاحدہ اور جدا ہوتی ہے تو اس سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جو موبائل اسکرین ٹچ ہوتے ہیں ان میں اس کرین شیشہ سے متصل ہوتی ہے اور جو موبائل اسکرین ٹچ نہیں ہوتے ہیں ان میں اسکرین شیشہ سے جدا ہوتی ہے، تو جو موبائل اسکرین ٹچ ہیں ان میں اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے بغیر وضو کے اسکرین پر ہاتھ لگانا جائز نہیں ہوگا، لیکن جو موبائل اسکرین ٹچ نہیں ہوتے ہیں، ان میں اسکرین پر بلا وضو ہاتھ لگانا درست ہوگا، لیکن خلاف ادب تصور کیا جائے گا، لیکن موبائل کو دونوں صورتوں میں ہاتھ میں نہیں لینا درست ہوگا، کیونکہ اس صورت میں موبائل کے ڈھانچہ کو غلاف کے درجہ میں مانا جائے گا جس کو بلا وضو چھونا درست ہوگا، علامہ ابن عابدین شامیؒ ردالمحتار میں تحریر فرماتے ہیں:

''ومسه ای القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط لكن لا يمنع الا من مس المكتوب بخلاف المصحف. فلا يجوز مس الجلد وموضع البياض منه...إلا بخلافه المنفصل أى كالجراب والخريطة دون المتصل كالجلد المشرز هو الصحيح، وعليه الفتوى؛ لأن الجلد تبع له'' (ردالمحتار ۱/۴۸۸ باب الحیض مطبوعہ زکریا دیوبند)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا يحرم مس الغلاف المنفصل عن القرآن كالكيس والصندوق، ويجوز مسه بنحو عود أو قلم أو غلاف منفصل عنه'' (الفقه الاسلامی وادلته ۱/۲۸۶)۔

صاحب ''البحر الرائق'' ارشاد فرماتے ہیں:

''لكن لا يجوز مس المصحف كله المكتوب وغيره بخلاف غيره فانه لا يمنع الا مس المكتوب'' (البحر الرائق ۱/۳۲۹ باب الحیض مطبوعہ زکریا)۔

ان تمام عبارات کا خلاصہ اور حاصل یہی ہے کہ اگر قرآن مکمل لکھا ہوا ہے تو اس مصحف کے کسی بھی جزء کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے، لیکن اگر چند آیات کسی جگہ مکتوب ہوں، مثلاً سکہ، دیوار یا تختی وغیرہ پر تو اس شئ کو بالکلیہ مس کرنا ناجائز نہ ہوگا، بلکہ مخصوص آیت پر ہاتھ لگانا ممنوع ہوگا۔

☆☆☆

قرآن مجید کے ترجمہ کی طباعت کے مروجہ طریقے

مفتی محمد ارشد فاروقی [1]

قرآن کریم کے ترجمے کی طباعت کے تین طریقے رائج ہیں:

(۱) عربی متن قرآن کے بالکل نیچے ترجمہ، ہر سطر کا ترجمہ اسی سطر کے نیچے مکتوب ہے، اس مترجم قرآن سے اہل علم کے لئے استفادہ ممکن ہے، لیکن عوام کے لئے دشوار ہے۔

(۲) ایک صفحے پر متن قرآن، دوسرے مقابل صفحے پر ترجمہ۔ اس طرز سے ہر ایک کے لئے فائدہ اٹھانا آسان ہے۔

(۳) عربی قرآنی متن کے بغیر صرف ترجمہ۔

آخری اور تیسری صورت ایفاء کے سیمینار کے سوال نامے میں درج ہے۔

سوال نامے میں اس کے بارے میں فقہاء اور ارباب افتاء کی طرف ممانعت کی نسبت کی گئی ہے۔ سوال نامے کی عبارت درج ہے: ''اور اصحاب افتاء فقہاء ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتے رہے''۔

سوال نامے کا یہ اسلوب عدم جواز کے رجحان کا تعین مباحثہ سے پہلے ہی کر رہا ہے۔

اس جزئیہ کے سلسلے میں فقہاء نے جو رائے دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے: ''صرف ترجمہ شائع کرنا ممنوع ہے''

فقہاء کے اقوال ودلائل

علامہ مرغینانی لکھتے ہیں: ''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن''

(قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ یہ قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے۔ دوسرے یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے)''التجنیس والمزید'' (بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۹۸)۔

☆ معراج الدرایہ میں ہے: ''أنه يمنع من كتاب المصحف بالفارسية أشد المنع، وأنه يكون متعمده زنديقا''

(فارسی میں قرآن شریف لکھنا سخت ممنوع ہے اور قصداً ایسا کرنے والا زندیق ہے) (بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۹۸)۔

☆ الکافی میں ہے: ''أنه لو أراد أن يكتب مصحفا بالفارسية يمنع''۔

(اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا)۔

☆ فتح القدیر میں ہے: ''وفي الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع. فإن فعل آية او آيتين لا. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز''۔

---

[1] دار العلوم زکریا دیوبند۔

(اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے، لیکن اگر الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر حرف کا ترجمہ و تفسیر لکھے تو جائز ہے) (بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۹۹)۔

☆ درمختار میں ہے: ''و تجوز کتابة آیة أو آیتین بالفارسیة لا أکثر''۔
(قرآن مجید کی ایک دو آیت کی کتابت تو فارسی زبان میں جائز ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں)۔
علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: ''والظاهر أن الفارسیة غیر قید''۔ (یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں فارسی زبان کی کوئی قید نہیں)۔

☆ کفایہ شرح ہدایہ میں ہے: ''قال الإمام المحبوبي: أما لو اعتاد قراءة القرآن أو کتابة المصحف بالفارسیة یمنع منه أشد المنع'' (بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۱۰۰)۔
(امام محبوبی نے فرمایا اگر فارسی میں قرآن شریف کی تلاوت یا کتابت کی عادت کر لیں تو اس کو شدت سے منع کیا جائے گا)۔
اور امام محمد بن فضل کے زمانے میں ایک بد دین نے بچوں کو فارسی میں قرآن پڑھانے کی اجازت چاہی تو محمد بن فضل نے تحقیق کے بعد اسے قتل کرا دیا۔

☆ امام زرکشی سے منقول ہے ''وأن الأقرب المنع من کتابة القرآن بالفارسیة کما تحرم قراءته بغیر لسان العرب''
(حق کے قریب یہی ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنے کی ایسی ممانعت ہے جیسے غیر عربی زبان میں تلاوت حرام ہے) (بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۱۵۱)۔

☆ علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی نے فتاویٰ میں لکھا ہے: ''قضیة ما في المجموع الإجماع علی التحریم''۔
جب علامہ سے پوچھا گیا کہ قرآن کریم عجمی زبان میں لکھنا کیا پڑھنے کی طرح حرام ہے تو یہ جواب دیا اس بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ حرام ہونے پر اجماع ہے

☆ امام مالکؒ سے سوال کیا گیا: ''هل یکتب المصحف علی ما أحدثه الناس من الهجاء؛ فقال: لا، إلا علی الکتبة الأولی أی کتب الإمام''۔
(لوگوں نے جو یہ نیا طریقہ نکالا ہے الگ الگ حروف کر کے لکھنے کا کیا اس طرح لکھا جا سکتا ہے؟ فرمایا نہیں، سوائے اس پہلے طریقہ یعنی امام کے جو مصحف عثمانی کا ہے اور کوئی طرز جائز نہیں)۔

☆ ابن قدامہ نے لکھا ہے: ''استمر الإجماع علی قراءة جمع المسلمین القرآن في الصلاة و غیرها بالعربیة کأذکار و سائر الأذکار والأدعیة المأثورة علی کثرة الأعاجم حتی قام بعض المرتدین من أعاجم هذا العصر یدعون إلی ترجمة القرآن وغیره من الأذکار و بطریق التعبد، وإنما مرادهم التوسل بذلك إلی تسهیل الردة علی قومهم''
(حاشیہ المغنی بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۱۰۴)۔
(اجماع قرار پایا ہے کہ تمام مسلمان نماز میں بھی اور نماز کے علاوہ بھی قرآن کریم کی تلاوت عربی ہی میں کریں، جیسے نماز کی اور دعائیں اور ذکر اور سب ادعیہ ماثورہ بھی عربی میں پڑھی جاتی ہیں اور یہ اجماع عجمیوں کی کثرت کے باوجود ہے لیکن اس زمانہ کے عجمیوں میں سے بعض مرتد لوگ اٹھے ہیں اور لوگوں کو ترجمہ قرآن اور ترجمہ اذکار کی اور تراجم کو بطور عبادت تلاوت کرنے کی دعوت دینے لگے ہیں اور اس سے ان لوگوں کی غرض اپنی مقدم پر مرتد ہونے کو سہل کر دینا ہے)۔

☆ علامہ حسن شرنبلالی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''النفحة القدسیه في أحکام قراءة القرآن و کتابته بالفارسیة'' ہے۔ اس میں انہوں

نے قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآن عربی کے لکھا جانے کی حرمت ثابت کی ہے اور یہ مذہب ائمہ اربعہ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ چاروں مکاتب فکر کے مشہور فقہاء کی عبارتیں نقل کی گئیں ہیں۔

راقم سطور نے تنہا ترجمہ قرآن کی طباعت واشاعت کے متعلق چاروں مذاہب فقیہ کے بڑے علماء کی رایوں کا تذکرہ کیا اور آراء میں اجماع امت کی بات بار بار نقل کی گئی ہے۔

برصغیر کے دو مشہور اکابر علماء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے فتاویٰ میں حرام قرار دیا ہے اور ان کی تحریروں کو دارالعلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور اور اس وقت کے مشاہیر کی تائید حاصل ہے۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مختلف فقہی عبارتوں میں جو اجماع، اتفاق ائمہ اربعہ جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا منشاء کیا ہے؟ پھر اجماع کے مدلولات بھی مختلف ہیں۔

دوسری بات زیادہ اہم ہے کہ ان فقہاء نے ممانعت کی بنیادی وجوہات کے تذکرے میں فرمایا:

(۱) قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے۔ ہم قرآن کے الفاظ ومعانی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں۔

(۲) یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے۔

☆ ''لانه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن'' (مرغيناني)۔

☆ ''ربما يؤدي التهاون بأمر القرآن'' (مرغيناني)۔

(۳) اپنی قوم کو مرتد ہونے کو سہل کر دینا ہے (ابن قدامہ)۔ ''تسهيل الردة على قومهم''

(۴) تشبہ ہے اہل کتاب کے ساتھ (تھانوی)۔

مانعین کے دلائل کا تجزیہ:

تنہا ترجمے کی اشاعت:

☆ قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے۔

یہ وجہ شاید دور قدیم میں لائق اعتناء رہی ہو، جب قرآنی نسخے کم یاب تھے۔ اس دور میں الحمد للہ قرآن کریم کی اشاعت، بلکہ حسن اشاعت کا جو حسن انتظام ہے وہ بہت عام ہے، ہر جگہ وافر مقدار میں دستیاب ہیں بلکہ اب حافظی قرآن کا اہتمام بھی خوب کیا جا رہا ہے اور اس دینی مہم کے فروغ میں جہاں تجارتی ادارے سرگرم ہیں وہیں رفاہی ادارے، شخصی وعوامی بھی فعال ہیں۔

اس کے علاوہ الیکٹرانک ذرائع بھی ہیں۔ اس لئے اس دور میں اگر تنہا ترجمہ قرآن طبع ہو تو اس کی وجہ سے ایسا کوئی شخص تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا جو قرآن یاد نہ کر سکے۔

اس لئے اب یہ وجہ متحقق نہیں ہے، صرف احتمال ناشی اصطلاح میں ہے۔ اب یہ ایک خیالی بات رہ گئی ہے۔

قدیم فقہاء کا ادب واحترام ملحوظ خاطر ہے اور صرف یہ عرض ہے:

☆۱ لفاظ ومعانی دونوں کی حفاظت کے ہم مامور ہیں۔ تنہا ترجمے کی طباعت واشاعت کی وجہ سے قرآن کے الفاظ ومعانی کو کوئی خدشہ نہیں ہے۔

حفاظ قرآن کے سینے میں اور بے شمار سفینے میں الفاظ موجود ہیں۔

پھر نظم ومعنی کی حفاظت ایک ہی قرطاس، ایک ہی مصحف میں مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے؟ دونوں کی حفاظت الگ الگ بھی حفاظت کے زمرے میں داخل ہے۔ جیسے حفاظ نظم قرآن کے محافظ اور علماء معانی قرآن کے نگراں اور قرآن کریم کی بڑے پیمانے پر اشاعت دونوں کی ضامن

ہے۔

اس لئے تنہا ترجمہ کی طباعت سے الفاظ ونظم قرآن کی حفاظت کو کوئی خدشہ نہیں ہے۔

☆ تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے۔

تنہا ترجمہ کی اشاعت کی وجہ سے لوگوں کے اندر تلاوت قرآن میں سستی پیدا ہونے کی بات بھی کہی گئی ہے۔

یہ بھی اسی وقت متصور ہے جب قرآنی نسخے نایاب یا کمیاب ہوں، ورنہ قرآنی نسخوں کی کثرت اور برکت کے ہوتے ہوئے غفلت بے معنی ہے۔

☆ اپنی قوم کو مرتد ہونے کو سہل کر دیتا ہے۔

یہ وجہ ایک خاص شخص کے ساتھ مخصوص ہے، اسے علت عامہ قرار دینا مشکل ہے۔

☆ تشبہ اہل کتاب کے ساتھ۔

اسرار و رموز شریعت کے ماہرین اور فقہاء نے جس تشبہ کو ممنوع قرار دیا ہے اس کا تعلق مقاصد اور دینی امور سے ہے۔ ذرائع اسباب اور عام زندگی سے نہیں۔

ہمارا احساس ہے کہ عیسائی انجیل کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرتے ہیں۔ اس کا شمار ذرائع واسباب میں کیا جانا چاہئے۔

نتیجہ:

اس تجزیہ کے بعد جو احساس ہے وہ یہ ہے کہ فقہاء نے جو اجماع کی بات کہی ہے اور اجماع جن بنیادوں پر قائم ہے اس پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وجوہ ممانعت اس دور میں موجود نہیں ہیں، اس لئے معتبر و معتمد تراجم قرآن کی تنہا اشاعت کی افادیت اس دور میں دو چند ہو جاتی ہے۔ اگر پاسبانِ حرم و فقیہانِ تازہ دم اجازت دیں۔

تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک خدشہ یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ متن کی عدم موجودگی میں ترجمے کی غلطیوں کی نشاندہی نہیں ہوسکتی۔

سو اس کا تعلق تو علماء سے ہے کہ وہ نشاندہی کریں اور موازنہ کریں اور موازنہ کا کام قرآن کریم کے نسخے کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے اور جو ترجمہ اشاعت کے لئے تیار کیا جائے وہ علماء کی نظر سے ضرور گذرے، تا کہ معتبر ہو۔

تنہا ترجمے کی افادیت:

قرآن سارے انسانوں کے لئے ہدایت نامہ ہے، جو ایمان لائے ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔

جو لوگ ابھی تک اسلام نہیں لائے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کی طرف متوجہ ہوں۔

جب کہ داعیان اسلام کا فریضہ ہے کہ دعوتی عمل تیز کریں۔

دعوت کے لئے سب سے پر اثر کلام الٰہی ہے۔ داعیانِ اسلام عجمیوں کو فرمانِ الٰہی پڑھ کر سناتے ہیں اور ترجمہ کرتے ہیں۔ نظم قرآن سے جہاں لوگ مسحور ہوتے ہیں وہاں ترجمہ قرآن کو سمجھنے کے بعد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، ایسے میں اگر صرف ترجمہ قرآن عجمیوں کو دیا جائے تو مقصد تک رسائی آسان ہو اور بڑی تعداد میں انسانوں تک پہنچانا سہل ہو اور "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" (سورہ قمر: ۱۷)، میں نظم و معنی قرآن دونوں میں داخل ہیں اور عجمیوں تک ہدایت کی کتاب ترجمے کے واسطے سے پہنچ سکتی ہے، جب دل کو چھولے پھر وہ نظم قرآن تک پہنچے گا۔

سوال نامہ میں جواز کے قائلین کے اسباب میں قرآن کو بے حرمتی کے اندیشہ سے بچانا، پیغام پہنچانا، تنہا ترجمہ کی طباعت میں مصارف کا کم آنا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن کریم کی کتابت مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

علامہ ابن عاشر لکھتے ہیں: ''و وجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه و هم زهاء اثني عشر الفا والإجماع حجة'' (نصوص جلیہ/۲۵)۔

مزید وضاحت اس عبارت سے ہوتی ہے:

''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان'' (حوالہ مذکور)۔

امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ قرآن شریف کی کتابت مصحف عثمانی کے طرز ہی پر درست ہے۔

مفتی شفیع علیہ الرحمہ نے رسالہ نصوص جلیلہ، فضائل القرآن، ابن کثیر اور امام زرکشی کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ''ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت ومخالفت بھی ثابت ہوگئی کہ زبان تو عربی ہی رہے، لیکن رسم الخط انگریزی یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی ناگری وغیرہ کردیا جائے باجماع امت ناجائز ہے۔ چند جزیات درج ذیل ہیں:

(الف) اس لئے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت درست نہیں۔

(ب) عربی متن کے ساتھ کسی زبان انگریزی وغیرہ رسم الخط میں لکھنا بھی درست نہیں۔

(ج) عربی متن مکمل ہو اور کسی زبان کی رسم الخط میں قرآن بطور معاون تعلیم لکھا جائے تو تعلیمی ذریعہ کے طور پر گنجائش ہوسکتی ہے۔

مقصد تعلیم قرآن ہو ''خیر کم من تعلّم القرآ ن و علّمهٗ'' (حدیث)،

تعلیم قرآن مقصد ہے، ذرائع تعلیم زمانے کے حساب سے اپنائے جاسکتے ہیں۔

(د) عربی متن کے ساتھ کسی زبان کی رسم الخط میں قرآن موجود ہو تو اسی کو ذریعہ تلاوت بنانا درست نہیں ہوگا، بلکہ کسی معلم کی مدد ضروری ہوگی اور عربی متن کی تلاوت ہی لازمی ہوگی۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

نابینا افراد بھی احکام دین کے حسب استطاعت مکلف اور پابند ہیں، اس لئے قرآن سیکھنا، قرآن کی تلاوت ان کے لئے جہاں ضروری ہے وہیں حفظ قرآن بھی باعث فضیلت ہے۔ عام طور پر نابینا قرآن سن کر محفوظ کرتے ہیں، لیکن تعلیمی وسائنسی ترقیاتی دور نے نابیناؤں کو ''بریل کوڈ'' کا عظیم تحفہ دیا ہے۔

تعارف بریل کوڈ:

لوی بریل کوڈ نامی شخص نے حرف شناسی کا یہ طریقہ نابیناؤں کے لئے ایجاد کیا ہے۔ ابھرے ہوئے حروف کو پڑھنے کا ایک طریقہ ہے، یہ حروف چھوکر پڑھے جاتے ہیں اور دراصل یہ حروف نہیں ہوتے، بلکہ چھ نقطوں کی مدد سے حروف اور ہندسوں کی علامت بنائی جاتی ہے (انٹرنیٹ بریل سسٹم)۔

بریل کوڈ کے تعارف سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی رسم الخط نہیں ہے، بلکہ اشارات ہیں تو بریل کوڈ میں تیار شدہ قرآن کریم پر رسم الخط کی تعریف صادق نہیں آتی، بلکہ قرآنی کلمات پر دلالت کرنے والے اشارات کا نام دیا جاسکتا ہے، کیونکہ بریل کوڈ رسم الخط نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے دو لفظ ہیں (۱) بریل (۲) کوڈ۔ یہ لفظ بتاتا ہے کہ یہ اشاروں کی زبان ہے۔

جب کہ ''خط'' کی تعریف یہ ہے ''تصویر اللفظ بحروف هجائية'' (کتاب التعریفات۔ قواعد الفقہ ص ۲۷۷)۔

''حروف تہجی سے لفظ کا تشکیل پانا''، خط کی یہ تعریف بریل کوڈ پر منطبق نہیں ہوتی۔

اور فقہاء نے قرآن کی کتابت مصحف عثمانی کے رسم الخط کے علاوہ کسی رسم الخط میں لکھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس لئے ''بریل کوڈ'' میں قرآن کی کتابت ممنوع نہیں ہوگی، بلکہ نابیناؤں کی سہولت کے لئے مہیا کرنا دینی تعاون ہوگا۔

نوٹ: نابینا افراد بریل کوڈ کے ذریعہ قرآن پڑھنے کے ساتھ حروف کی صحیح ادائیگی کے لئے قاری ومعلم قرآن کی شاگردی ضرور کریں، اپنے طور پر بریل کوڈ کی مدد سے قرآن پڑھنا کافی نہ ہوگا۔

موبائل پر قرآن مجید:

''ایفا'' کے سوال نامے میں ''موبائل پر قرآن مجید'' عنوان موجود ہے اور اسکرین پر قرآن کی موجودگی کی صورت میں بلا وضو چھونے، نہ چھونے کو بحث کا عنوان بنانا اس بات کی وضاحت ہے کہ موبائل پر قرآن مجید کی تلاوت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس جزئیہ کی صراحت راقم اس مقصد کے تحت کررہا ہے۔ بہت سے لوگ موبائل اسکرین سے تلاوت کرنے میں حرج محسوس کرتے ہیں، جبکہ اس میں شرعی قباحت نہ ہونے کی وجہ سے درست ہے، البتہ یہ شرط ملحوظ رہے گی کہ پڑھنے والے نے معتمد ذرائع کا استعمال قرآن محفوظ کرنے میں کیا ہو۔

اب رہی بات اسکرین پر قرآن موجود ہو تو کیا موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہوگا یا موبائل کے ڈھانچہ کو غلاف تصور کرکے بے وضو چھونا درست مانا جائے۔

ایک سوال موبائل جس میں قرآن اسکرین پر موجود ہو تو موبائل کو بلا وضو چھونا درست ہے کہ نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حالت میں اسکرین پر قرآن موجود ہے، موبائل چھونا بغیر وضو کے درست ہوگا کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی لوح (تختی) پر آیات لکھی ہوں تو اس تختی کو بغیر وضو چھو سکتے ہیں۔

''لكن لا يحرم في غير المصحف إلا بالمكتوب أي موضع الكتابة'' (۱/ ۲۸۲ رد المحتار)۔

دوسرا سوال اسکرین پر قرآن موجود ہو تو اسکرین کو بغیر وضو نہیں چھو سکتے، چونکہ اسکرین پر آیات قرآن کی موجودگی ایسی ہے کہ موجود رہتے ہوئے اسکرین پر دوسری چیز نہیں آسکتی، اس لئے آیات اور اسکرین کا تعلق اس غلاف کی طرح ہوگیا جس غلاف کو علیحدہ نہ کیا جاسکے تو اس غلاف کو بغیر وضو نہیں چھو سکتے۔

''والجلد الغير المشرز'' (ایسا چمڑہ جو قرآن کے ساتھ لگادیا گیا ہو) (۱/ ۲۸۳/ رد المحتار)

اسکرین کو قرآن کی موجودگی میں بغیر وضو چھونا منع ہے۔



بغیر متن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کا حکم

مولانا محمد ممتاز خان ندوی[1]

پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ لوگوں نے کتابوں کے متن کو نظر انداز کر دیا، اور ترجمہ وتشریح کو مرکز توجہ بنالیا، یہی چیز صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت میں بھی ممکن ہے کہ لوگ متن قرآن کو نظر انداز کر دیں، اور اس کے ترجمہ کو اپنا مقصود بنالیں، لہذا صرف قرآن کے ترجمہ کی اشاعت راقم کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس کی تائید درج ذیل فقہی عبارتوں سے بھی ہوتی ہے، فقہ حنفی کی مشہور کتاب کافی میں ہے:

''ومنها ما في الكافي: أنه لو أراد أن يكتب مصحفا بالفارسية يمنع'' (فتح القدير باب صفة الصلاة ۱/ ۲۴۸)

(کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا)۔

فقہ حنفی کی مشہور ومستند کتاب ''فتح القدیر شرح ہدایہ'' میں ہے:

''إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، فإن فعل آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف و ترجمه جاز'' (فتح القدير ۱/ ۲۶۶)

(اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے، لیکن اگر الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے)۔

فقہ حنبلی کی مایہ ناز کتاب المغنی کی درج ذیل عبارت اس بابت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے:

''وهو إنما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة وإنما كان تبليغه والدعوة إلى الاسلام والإنذار به كما أنزل الله تعالى لم يترجم ﷺ ولا أذن بترجمته ولم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء المسلمين وملوكهم، ولو كتب النبي ﷺ كتبه إلى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذى علل به'' (المغنى مع الشرح الكبير ۱/ ۵۲۰)

(حالانکہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے جیسا کہ بہت آیتوں میں ہے اور تبلیغ اس کی اور اسلام کی طرف دعوت اور انداز اسی سے ہے، جیسے اس کو اللہ تعالی نے نازل کیا ہے، اللہ نبی ﷺ نے نہ کبھی ترجمہ خود کر کے بھیجا نہ ترجمہ بھیجنے کی اجازت دی نہ صحابہ اور خلفائے مسلمین اور شاہان اسلام نے ایسا کیا، اور حضور ﷺ نے قیصر وکسری اور مقوقس کو جو خطوط لکھوائے ہیں اگر وہ ان کی زبانوں میں لکھواتے تو اس فعل کی اس کو علت بنانا صحیح بھی ہوتا)۔

مستند فقہاء کرام کے فتاوی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ قرآن کے متن کے بغیر صرف قرآن کے ترجمہ کی اشاعت جائز نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا ایک فتوی اس بابت ملاحظہ فرمائیں، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں:

سوال (۱۸۳) قرآن مجید کے بغیر اس کا ترجمہ اردو یا انگریزی میں شائع کرنا کیسا ہے؟ اس کے جواب میں موصوف تحریر فرماتے ہیں:

جواب: پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کتاب کے متن کو نظر انداز کر دیا، اور اس کے ترجمہ وتشریح کو اپنا مقصود بنالیا، اسی لئے فقہاء نے متن کے بغیر معری ترجمہ لکھنے کو منع کیا ہے، قرآن مجید کی آیات لکھتے ہوئے ان کے ساتھ ترجمہ لکھنا چاہئے یہ حکم اردو ترجمہ کے لئے بھی ہے، اور

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

انگریزی ترجمہ کے لئے بھی، اور دوسری زبان کے تراجم کے لئے بھی، بغیر متن کے صرف ترجمہ لکھنا درست نہیں (کتاب الفتاوی)۔

حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال: ترجمہ قرآن مجید بلا متن شائع کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: ائمہ اربعہ ممنوع ہے، علامہ شرنبلالی نے اس موضوع پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے: ''النفحة القدسية في أحكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية'' جس کا نام ہے: اس میں ائمہ اربعہ سے اس کی مخالفت نقل کی گئی ہے، اس میں صاحب ہدایہ کی کتاب التجنیس والمزید سے منقول ہے:

''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع'' (خیر الفتاوی ۱/ ۲۱۴)۔

معلوم یہ ہوا کہ جب صرف قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنا درست نہیں ہے، تو اس کا خریدنا اور ہبہ کرنا بھی راقم کے نزدیک جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ اعانت علی الاثم ہے اور قرآن کریم میں اعانت علی الاثم سے منع کیا گیا ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ہے:

"ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) (اور تم لوگ گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے الفاظ اور معانی کی حفاظت فرمائی ہے، اسی طرح من جانب اللہ اس کے رسم الخط کی بھی حفاظت کی گئی ہے، حضرت عثمان غنیؓ نے جس رسم الخط میں قرآن مجید تحریر کر دیا تھا آج تک اسی کے مطابق قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ جاری ہے، اور یہی ''عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي'' (ابوداؤد باب لزوم السنہ حدیث نمبر: ۴۶۰۷، ترمذی کتاب العلم حدیث: ۲۶۷۶) کا تقاضا ہے، اسی لئے علماء نے اس رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو واجب قرار دیا ہے۔

''ذهب جمهور العلماء إلى أن رسم المصحف الذي كتب في زمن عثمان على يدي كاتب الوحي زيد بن ثابت توقيفي لاتجوز مخالفته في كتابة المصحف وطبعها'' (اصول التفسير وقواعده ۴۵۱، دار النفائس بیروت)

(جمہور علماء کہتے ہیں کہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں جس رسم الخط پر قرآن کی کتابت ہوئی وہ توفیقی ہے، قرآن کی کتابت وطباعت میں اس کی مخالفت جائز نہیں ہے)۔

لہٰذا راقم کے نزدیک عثمانی رسم الخط کے علاوہ دوسرے رسم الخط میں جیسے کہ ہندی انگریزی وغیرہ میں قرآن کی کتابت جائز نہیں ہوگی، اور جب یہ جائز نہیں ہے تو اس کی اشاعت بھی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ اعانت علی الاثم ہے اور قرآن کریم میں اعانت علی الاثم سے منع کیا گیا ہے، سورہ مائدہ کی آیت ہے: "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)۔

علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نور الایضاح'' جو دسویں صدی عیسوی کے مشہور فقیہ اور مذہب حنفی کے معروف مفتی ہیں ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ''النفحة القدسية في أحكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية'' اس میں مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ سے اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت کے رسم الخط کا اتباع لازم وواجب ہے، غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے اور اس طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے، اس کی ایک عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنا أمرنا بحفظ اللفظ والمعنى، فانه دلالة على النبوة، ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن'' (النفحة القدسية: ص ۳۲)

(قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے، کیونکہ یہ قرآن کریم کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ ومعنی دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے، دوسری بات یہ کہ تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے)۔

حنابلہ کے مشہور فقیہ وامام علامہ ابن قدامہ کی کتاب ''المغنی'' کے حواشی میں اس کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں آیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی، کہیں ایک واقعہ بھی اس کا مذکور نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کر کے بھجایا

عجمی رسم الخط میں لکھوانا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب جو ملوک عجم کسری وقیصر ومقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے گئے جس میں سے بعض کے فوٹو بھی چھپ گئے ہیں، اور آج تک محفوظ ہیں، ان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ ان میں عجمی زبان اختیار کی گئی ہے نہ عجمی رسم الخط اختیار کیا گیا ہے۔

"وهو إنما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة، وإنما كان تبتليه والدعوه إلى الاسلام والانذاربه، كما أنزل الله تعالى لم يترجم النبي ﷺ ولا اذن بترجمته ولم يقبل الصحابة والخلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي ﷺ كتبه الى قيصر وكسرى و مقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذى علل به" (المغنى مع الشرح الكبير ا/ ۵۳۰)

(حالانکہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے، جیسا کہ بہت آیتوں میں ہے، اور تبلیغ اس کی اور اسلام کی طرف دعوت اور انذار اسی سے ہے جیسے اس کو اللہ تعالی نے نازل کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی ترجمہ خود کر کے بھیجا نہ ترجمہ بھیجنے کی اجازت دی، نہ صحابہ اور خلفائے مسلمین اور شاہان اسلام نے ایسا کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر وکسری اور مقوقس کو جو خطوط لکھوائے ہیں اگر وہ ان کی زبانوں میں لکھواتے تو اس فعل کی اس کو علت بنانا صحیح بھی ہوتا)۔

مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد نے اپنے رسالہ "خلاصۃ النصوص الجلیۃ" میں رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت کیا ہے، اور فرمایا:

"أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصحف عثمان ومنع مخالفة (ثم قال) قال العلامه ابن عاشر: ووجه وجوبه ماتقدم من إجماع الصحابه عليه، وهم زهاء اثنى عشر الفا والإجماع حجة حسما تقرر فى أصول الفقه" (نصوص جلية/ ص ۲۵)

(مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع کے واجب ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے، علامہ ابن عاشر کا بیان ہے کہ واجب ہونے کی وجہ وہی ہے جو گزر چکی ہے، یعنی حضرات صحابہ کا اجماع اور یہ حضرات تقریباً بارہ ہزار تھے اور جیسے اصول فقہ میں ثابت ہو چکا ہے)۔

اس بابت چند مستند ومعتبر فقہاء کرام کے فتاوی بھی ملاحظہ فرمائیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں ہے۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

قرآن کریم کو رسم عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا باجماع ناجائز ہے، لوگوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لئے عربی رسم الخط سکھایا جائے، عجمی رسم الخط میں لکھنا درست نہیں (فتاوی عثمانی ا/ ۲۱۸)۔

۲- مفتی عبد الرحیم لاجپوری نے گجراتی زبان میں قرآن کی کتابت کو ناجائز قرار دیا ہے، فتوی چونکہ طویل ہے، لہذا اس کے نقل سے احتراز کیا جاتا ہے۔

۳- حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صاحب ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں، استفتاء کو طوالت کی وجہ سے چھوڑا جاتا ہے۔

جواب: قرآن کریم کا رسم الخط متعین ہے، اس رسم الخط کو چھوڑ کر دوسرے رسم الخط میں قرآن کریم کو چھاپنا جائز نہیں، اور یہ عذر کہ لوگ عربی نہیں پڑھ سکتے، فضول ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/ ۷ ۲۳) اگر تھوڑی محنت کی جائے تو آدمی قرآن کریم کو سیکھ سکتا ہے۔

۴- حضرت مولانا خیر محمد جالندھری ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں:

قرآن کریم کا رسم الخط وہی ضروری ہے، جو عثمان کے زمانہ میں تھا، یا اس میں تبدیلی کر سکتے ہیں؟

جواب: کتابت قرآن میں مصاحف عثمانیہ رسم الخط کی اتباع ضروری ہے، اسے بدلنا جائز نہیں۔

وقدنبه على وجوبه العلامه ملا على القارى فى منح الفكرى (خير الفتاوى ا/ ۲۲۵)۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی یہ تحریر بھی سامنے رہے تو بہتر ہے: ہندی رسم الخط میں بہت سے وہ حروف نہیں ہیں جو کہ عربی زبان اور قرآن میں پائے جاتے ہیں، اور اسی لئے ہندی میں ان کے لئے کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی ہے، مثلاً (ذ، ز، ظ، ض) کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے، حالانکہ ان حروف کے فرق سے معنی بدل جاتے ہیں، اس لئے قرآن مجید کو رسم الخط ہندی میں لکھنا تحریف ہوگا، جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے (جواہر

الفقہ ۱/۸۹)۔

عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان میں قرآن لکھ کر شائع کرنا:

عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ کر شائع کرنا راقم کے نزدیک جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسی صورت میں وہی خرابی (عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں تبدیلی) لازم آرہی ہے، جس کو علماء وفقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے، لہذا یہ شکل بھی درست نہیں ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا:

بریل کوڈ میں قرآن لکھنے سے پرانی رسم الخط جو قرآن کا ایک اہم رکن ہے چھوٹ جاتا ہے، اور تحریف لازم آتی ہے، لہذا بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا راقم کے نزدیک جائز نہیں ہے، نابینا حضرات کو قرآن مجید زبانی پڑھایا جائے یا کوئی ایسی کوشش کی جائے جس سے قرآن کریم لکھنے میں عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کی مخالفت نظر نہ آئے۔ اس کی تائید درج ذیل عبارتوں سے ہوتی ہے:

''رسالۃ النصوص الجلیۃ'' میں ہے: ''وقال البيهقي: من كتب مصحفا ينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير ما يكتبوه شيئا، فإنهم كانوا أى (الصحابة) اكثر علما و أصدق قلبا ولسانا أعظم أمانة، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم كما في الاتقان لشيخ مشائخنا الجلال السيوطي، ثم قال العلامة الحداد: فثبت بما ذكر من النقول الصحيحة والنصوص الصريحة أنه أنعقد إجماع سائر الأمة من الصحابة وغيرهم على تلك الرسوم، وأنه لايجوز بحال من الأحوال العدول من كتابة القرآن الكريم ولا نسرع بصورة تخالف رسم المصاحف العثمانية'' (رسالۃ النصوص الجلیۃ/ ص ۲۵)

(امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ جو شخص قرآن شریف کی کتابت کرنا چاہے تو اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ حرفوں کے اس جوڑ توڑ کی حفاظت کرے جس پر وہ مصحف لکھے گئے ہیں اور ان کے خلاف نہ کرے اور جیسے جیسے انہوں نے لکھا ہے سر مونہ بدلے کیونکہ صحابہؓ علم میں سب سے زیادہ کامل، صدق قلبی ولسانی میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں اور تدین وامانت میں سب سے زیادہ اعلی تھے، ہم کو روا نہیں ہے کہ اپنے دلوں میں ان کی طرف سے کوئی شبہ قائم کریں یہ اتقان میں ہے جو ہمارے شیخ المشائخ جلال الدین سیوطیؒ کی ہے، پھر علامہ حداد نے لکھا ہے کہ جو نقول صحیحہ اور نصوص صریحہ ذکر کی گئی ہیں ان سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس رسم الخط کے وجوب پر اور اس پر کہ قرآن شریف کی کتابت میں کسی حال میں بھی اس رسم الخط سے عدول جائز نہیں اور نہ کسی ایسی صورت سے جو مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کے خلاف ہو قرآن شریف کا شائع کرنا جائز ہے)۔

قرآن والے موبائل کو بلا وضو چھونا:

اگر موبائل میں قرآن مجید موجود ہے، اگر وہ بند ہے یا وہ پروگرام بند ہے جس میں آیت وغیرہ محفوظ ہے، تو بند ہونے کی حالت میں موبائل اور اس کی اسکرین کو بلاوضو چھوا جاسکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر موبائل کے اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو موبائل کو چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ راقم کے نزدیک ایسے غلاف کے حکم میں ہے جس کو بغیر وضو کے چھوا جاسکتا ہے۔ اس کی تائید درج ذیل فقہی عبارتوں سے ہوتی ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' میں ہے:

''وكذا المحدث لايمس المصحف إلا بغلافه لقوله عليه السلام القرآن الا طاهر'' (ہدایہ مع الفتح ۱/ ۱۷۱)

(اور اس طرح محدث بغیر غلاف کے قرآن کو نہیں چھوئے گا ہمارے نزدیک مگر غلاف کے ساتھ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے قرآن کو صرف پاک ہی شخص چھوئے)۔

اسی سے ملتی جلتی عبارتیں فقہ حنفی کی مشہور و معتمد دیگر کتابوں میں بھی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع ۱/ ۱۴۰، شامی زکریا ۱/ ۴۸۸)۔

☆☆☆

غیر عربی زبان میں قرآن کی اشاعت اور حفاظت

مفتی نذیر احمد کشمیری

انسان کے خالق نے اپنی رحمت، مشیت اور حکمت سے جیسے انسان کی جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لئے یہ ساری کائنات بنائی اور پھر اسمیں زندگی کی آسائشوں سے پرسکون بنانے کے لئے ہر قسم کی چیزیں پیدا فرمائی جو انسان کے لئے ضروری تھیں اسی طرح انسان کو ہدایت اور صراحت مستقیم پر قائم کرنے کے لئے سلسلہ نبوت بھی جاری فرمایا اور ہدایت کے استوار کے لئے کتابیں بھی نازل فرمائیں، انبیاء علیہم السلام سے انسانوں کو معاشی ضروریات پورا کرنے کے لئے تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت سکھانے کا کام نہیں لیا گیا، بلکہ اس عظیم جماعت کو انسانوں کی ہدایت، حق وصداقت اور زندگی کو خالق حیات کے منشاء ومشیت کے مطابق گذارنے کے اصول وضوابط عطا کرنے کا کام تفویض کیا گیا اس کے لئے انبیاء علیہم السلام کی اپنی زندگی بھی ایک کامل اسوہ ہوتی ہے، جو انسانوں کے لئے ہدایت کا قطعی اور حقیقی سرچشمہ ہے، سلسلہ نبوت کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار امتیازات میں سے دو اہم امتیاز یہ بھی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو صراط مستقیم پر چلانے کے لئے جو احکام، ارشادات، تعلیمات ارشاد فرمائے وہ سب محفوظ ہیں اور ان کو حدیث کہا جاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء میں سے کسی نبی کے اعمال افعال احکام اور ارشادات محفوظ نہیں ہیں دوسرا اہم امتیاز آپ کا یہ ہے کہ آپ پر نازل ہونے والی کتاب، یعنی قرآن مجید مکمل طور پر محفوظ ہر طرح کی تحریف، تبدیلی اور ہر قسم کے خردبرد سے پاک ہے اس کے متعلق خود قرآن نازل کرنے والے قادر مطلق نے فرمایا:

"إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹) (ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)، یہ چونکہ تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اس لئے تا قیام قیامت جب تک انسان رہیں گے اس کے وجود اور اپنی اس صفت ''کہ اس میں کوئی رد وبدل نہیں ہوسکتا'' کے ساتھ باقی رہے گا، جب اس کو قیامت تک محفوظ رکھنا اللہ کی مشیت اور انسانوں کو صراط مستقیم پر چلانے کے لئے امر الابدی ہے تو اس کی حفاظت کے لئے اور اس کی ہر قسم کی تحریفات سے محفوظ رکھنے کے وہ اسباب اور وسائل استعمال کئے گئے جو اس کی حفاظت کے لئے لازم ہوسکتے تھے چنانچہ اسی کے الفاظ وکلمات کو محفوظ کرنے کے لئے حفظ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اس کی قرأت ولہجوں کو محفوظ رکھنے کے لئے علم وتجوید قرأت وجود میں آیا اس کے معانی کو محفوظ رکھنے کے لئے سلسلہ تفسیر شروع ہوا، اور اس طرح قرآن ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔

ٹھیک اسی طرح اس کے رسم الخط کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک مخصوص خط اختیار کیا گیا اور ابتداء عہد اسلامی سے آج تک اسی رسم الخط میں قرآن کریم لکھا جاتا رہا ہے، یہ خط رسم عثمانی کہلاتا ہے، جو دراصل رسم قریش ہے، دراصل یہ وہ خط ہے جو لوح محفوظ کے صحیفہ مبارکہ کا خط ہے، اس لئے یہ توقیفی ہے، قرآن کریم کو جمع کرنے اور مدون کرنے کا ایک کام تو وہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ بننے پر ہوا اور دوسرا اہم کام جو حضرات عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں ہوا۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی تجویز پر حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن زید، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص، حضرت عبدالرحمن بن حارثؓ وغیرہ سے مشورہ کر کے لغت قریش کے مطابق متعدد نسخے تیار کرائے اور وہ مملکت اسلامیہ کے مختلف علاقوں میں ارسال فرمائے، خود حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے پاس جو صحیفہ رکھا اس کو ''امام'' کہا جاتا تھا، اور مختلف علاقوں میں جو صحائف بھیجے گئے انہی کے مطابق

مزید نسخے تیار کرنے کا حکم دیا، اس سے پہلے قرآن کریم کے جو صحیفے جہاں جہاں تھے ان سب کو جمع کر کے حضرت عثمانؓ کے حکم سے نذر آتش کیا گیا، حضرت عثمان غنیؓ کے حکم سے جو نسخے تیار کئے گئے وہ پانچ یا سات یا چودہ نسخے تھے اور ان میں سے چار نسخے ابھی بھی دنیا میں موجود ہیں، ایک تاشقند میں، دوسرا استنبول میں، تیسرا دمشق میں، چوتھا غالباطرابلس میں، استنبول کے نسخے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمان خلیفہ ثالث شہید کئے گئے اور ان کا خون اس صحیفے پر گرا تھا اس کے تمام تفصیلات ''الاتقان اور مناہل العرفان'' وغیرہ میں ہیں۔

حضرت حذیفہؓ کی تجویز پر حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابی بن کعب کو نئے صحیفے تیار کرنے کا حکم دیا گیا تو حضرت عثمانؓ نے رسم الخط اور ہجا کے متعلق چند ہدایات دیں اور حکم دیا کہ اگر کسی لفظ کے متعلق اختلاف ہو جائے تو قریش کے رسم الخط کے مطابق لکھا جائے، چنانچہ اس کی مثال تابوت ہے جو تاء مدورہ (تابوۃ) کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے اور یہ اہل مدینہ کا رسم الخط تھا جب کہ اہل مکہ اس کو تاء مطولہ (تابوت) لکھا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں تاء مطولہ (تابوت) کے ساتھ لکھنے کا حکم دیا، کیونکہ یہی لغت قریش کے مطابق تھا، آج بھی قرآن کریم میں اکثر مقامات پر ''قال'' ہے، جبکہ کچھ مقامات پر ''قل'' بھی ہے یہ دراصل اسی رسم عثمانی کا اتباع ہے کہ جہاں جیسے لکھا گیا وہ آج تک باقی ہے، اسی طرح پوری عربی زبان میں لفظ کتاب لکھا جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم میں یہ لفظ ''کتٰب'' یعنی الف مقصورہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے، ایسا کیوں، وجہ یہ ہے کہ یہ رسم عثمانی ہے اور اس کی پابندی لازم تھی یہ آج بھی قائم ہے اس رسم عثمانی کے متعلق امت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ اس کی پابندی لازم ہے اس سے ہٹ کر کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی گئی، چنانچہ اسمٰعیل کو اسماعیل یا سلیمٰن کو سلیمان نہیں لکھا گیا، اسی طرح موسیٰ یحییٰ، عیسیٰ کو بھی موسا، یحیا، عیسا نہیں لکھا گیا، اس سلسلے میں فقہاء نے جو لکھا ہے وہ یہ ہے:

''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته ثم قال قال: العلامه ابن عاشروجه وجوبه ماتقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زها اثنى عشر ألفا والإجماع حجة حسبما تقرر فى أصول الفقه'' (جواہر الفقہ/ ۸۵)

(مسلمانوں کا اس پر قطعی طور پر اجماع ہے کہ مصاحف عثمانی کے رسم الخط کا اتباع لازم ہے اس کے خلاف کرنے کے ممنوع ہونے پر بھی اجماع ہے علامہ ابن عاشر نے یہ بیان کیا ہے کہ رسم عثمانی کے اتباع کے واجب ہونے کی وجہ حضرات صحابہ جن کی تعداد تقریبا بارہ ہزار تھی کا اجماع ہے اور اجماع حجت قطعی ہے جیسا کہ اصول فقہ کا یہ ضابطہ ہے)۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے رسم عثمانی کے اتباع کے لازم ہونے کے متعلق لکھا ہے:

''قال الاشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا إلا على الكتبة الاولى رواه الدانى فى المقنع، ثم قال: لا مخالف له من علماء الأمه'' (الاتقان ۲/ ۳۶۶، ومناہل العرفان)

(اشہب کا بیان ہے کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل دوسری کتابوں کے لئے اختیار کیا گیا ہے فرمایا نہیں، قرآن کی کتابت اسی پہلی طرز کتابت کے مطابق ہونا چاہئے، علامہ دانی نے المقنع میں فرمایا کہ علماء امت میں سے کوئی بھی اس رائے کے خلاف اپنی رائے نہیں رکھتا)۔

علامہ سیوطی نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی رائے اس طرح لکھی کہ:

''وقال الامام أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف فى واو، أو ياء أو الف أو غير ذلك'' (حوالہ مذکور)

(امام احمد فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت حرام ہے، واو- یاء- اور الف جو لکھنے میں آئیں مگر پڑھنے میں نہ آئیں ان کو اسی طرح لکھا جائے یعنی باقی رکھا جائے)۔

علامہ سیوطی نے آگے یہ بھی لکھا: ''وقال البيهقى فى شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغى أن يحافظ على الهجاء الذى كتابه تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغيرمما كتبواشيئا، فانهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم

أمانة، قال ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم" (الاتقان ۲/۴۶۷)
(امام بیہقی نے شعب الایمان میں فرمایا جو شخص قرآن کریم کی کتابت کرے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس طرز تحریر کی پابندی کرے جو حضرات صحابہ نے مصاحف میں اختیار فرمایا ہے اور ہرگز اس کی خلاف ورزی نہ کرے اور جو طرز انہوں نے اختیار کیا ہے اس میں کوئی تغیر نہ کرے اس لئے کہ وہ زیادہ علم والے سچے دل والے سچی زبان والے اور زیادہ امانت دار تھے، پس ہمارے لئے ہرگز یہ مناسب نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کرنے لگیں کہ ہم ان کے کسی خامی یا کمی کو دور کریں گے)۔

یعنی کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کریں اور یہ گمان کریں کہ ہم نے ان سے بہتر طریقہ اختیار کر لیا، ٹھیک یہی رائے حنفیہ کی بھی ہے، چنانچہ علامہ حسن شرنبلالی نے صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین کی کتاب "التجنیس" کے حوالے سے لکھا ہے۔

"ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدي للأخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فانه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يودي إلى التهاون بأمر القرآن" (بحواله جواہر الفقه)
(فارسی میں کتابت قرآن سے بالاجماع منع کیا گیا ہے اس لئے کہ اس سے حفاظت قرآن میں خلل واقع ہوگا، کیونکہ ہم قرآن کریم کے الفاظ و معانی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں اور یہ الفاظ قرآن تو ثبوت نبوت کی دلیل ہے اور الفاظ قرآن کے بدل دینے سے حفاظت قرآن میں یہ تہاون پیدا ہوگا)۔

حنفیہ کے یہاں اس سے زیادہ سخت موقف بھی پایا جاتا ہے چنانچہ "معراج الدرایہ" کے حوالہ سے لکھا:

"يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع وأنه يكون معتمده زنديقا" (ایضا)
(صحیفہ قرآنی کی کتابت فارسی میں کرنے کو سختی سے منع کیا گیا ہے اور جو شخص ایسا کرے وہ زندیق ہے)۔

شافعیہ کے عظیم ستون علامہ ابن حجر عسقلانی نے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے:

"قد سئل هل تحرم كتابة القرآن بالعجمية كقراءته، فأجاب بقوله قضية ما في المجموع الإجماع على التحريم" (بحواله مناهل العرفان) (علامہ ابن حجر سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن کریم کسی عجمی زبان میں لکھنا ویسا ہی حرام ہے جیسے کسی عجمی زبان میں اس کی قراءت حرام ہے، تو جواب میں فرمایا کہ کتاب مجموع کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے حرام ہونے پر اجماع ہے)۔

اب جب چاروں فقہاء کا اس پر اجماع ہے تو فقہ اکیڈمی کی طرف سے مرتب کردہ نہایت برمحل اور جامع سوالات کے جواب درج ذیل ہیں؛

۱- ایسا کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں، اس لئے کہ قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے، صرف ترجمہ کا نام قرآن ہرگز نہیں اور جب صرف ترجمہ اشاعت پذیر ہوگا تو رفتہ رفتہ اسی ترجمے کو لوگ قرآن قرار دینے لگیں گے، دوسرے یہ اقدام متن قرآن سے اعراض کا یقینی سبب ہوگا، اس لئے کہ آج امت کا اکثر طبقہ قرآن سے دور ہوتا جا رہا ہے، اور جب ان کے ہاتھوں میں وہ ترجمہ پہنچے گا تو وہ متن قرآن جو دراصل منزل من اللہ کلام ہے سے محروم ہو جائیں گے، تیسری یہ کہ جو مصالح تنہا ترجمہ قرآن شائع کرنے کے متعلق پیش کئے جا رہے ہیں یہ مصالح ہر دور میں اس سے کہیں زیادہ پیمانے پر پائے جاتے رہے ہیں، بلکہ خود صاحب قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں جب دین عجمی ممالک میں داخل ہو رہا تھا اور یقینا مقامی زبانوں میں خالص ترجمہ قرآن کی واقعی ضرورت تھی، مگر اس طرح کا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا، علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس طرح کی پیش کردہ وجوہات کو اس طرح رد کیا۔

"وزعم أن كتابته بالعجمية فلها سهولة للتعليم كذب مخالف للواقع والمشاهدة فلا يلتفت للذلك على أنه لو سلم صدقه لم يكن مبيحا لاخراج ألفاظ القرآن عما كتب عليه وأجمع عليه السلف والخلف" (مناہل العرفان)
(یہ گمان کرنا کہ عجمی زبان میں قرآن کریم کی کتابت تعلیم کی سہولت اور آسانی کا ذریعہ ہے یہ غلط اور واقع اور مشاہدہ کے خلاف ہے اس کی

طرف ہرگز التفات نہ کیا جائے اگر بالفرض یہ درست بھی ہو تو بھی یہ قرآن کے اس طرز کتابت کے ترک کرنے کا وجہ جواز نہیں بن سکتا اس پر سلف و خلف کا اجماع ہے)۔

مشہور فقیہ اور محدث امام ابن قدامہ کی شہرہ آفاق کتاب ''المغنی'' میں ہے:

''وهو إنما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة، وإنما كان تبليغه والدعوة إلى الاسلام والانذار به كما أنزل الله تعالى لم يترجم النبي ﷺ ولا أذن بترجمته، ولم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي ﷺ كتابه إلى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذي علل به'' (المغنی)

(قرآن کریم عربی میں نازل ہوا جبکہ متعدد آیات قرآنی میں صراحتہ یہ موجود ہے اور اسلام کی دعوت وتبلیغ اور انذار اسی عربی زبان میں جاری رہی، حضرت نبی علیہ السلام نے عجمیوں کے لئے نہ خود ترجمہ کرایا نہ کسی کو ترجمہ کرنے کا حکم ہی دیا نہ ہی حضرات صحابہ نے ایسا کیا اور امت مسلمہ کے خلفاء وسلاطین نے بھی ایسا نہیں کیا، اگر حضرت نبی علیہ السلام نے اپنے مکاتب قیصر وکسری اور مقوقس کی زبانوں میں لکھواتے تو یہ وجہ قابل توجہ ہوتی کہ عجمی اقوام کو قرآن عجمی زبان میں پہنچایا جائے)۔

چوتھی وجہ جو حضرت تھانویؒ کے فتوی میں بھی موجود ہے کہ یہ اقدام قرآن کریم کو اس سطح پر پہنچانے کا سبب بنے گا جو تورات وانجیل کا حال ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے: اگر خدانخواستہ یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن کے ضائع ہونے کا ہے اور قرآن مجید کے اصل کی حفاظت فرض اور اس میں اخلال حرام ہے۔

خلاصہ یہ کہ متن قرآن کے بغیر خالص ترجمہ شائع کرنا جائز نہیں اس کو خرید کرنے تقسیم کرنے اور اشاعت کرنے کا اقدام اجماع امت کے خلاف اور قرآن ضائع کرنے کا غیر شرعی اقدام ہے

(مزید اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے اکابر کے فتاوی: امداد الفتاوی ۱/ ۲۹، کفایۃ المفتی ۲/ ۱۰۶، جواہر الفقہ ۲/ ۱۰۳، فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۱۰، فتاوی حقانیہ ۲/ ۱۷۲)۔

☆☆☆

متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ کی اشاعت

مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی[1]

امت کے چاروں فقہاء متبوعین کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور اسے شائع کرنا ناجائز اور گناہ ہے اور جب یہ عمل ناجائز ہے تو اس کی خرید وفروخت اور ہدیہ بھی گناہ اور معصیت پر تعاون ہوگا۔

علامہ برہان الدین سپرد قرطاس کرتے ہیں:

''وإن اعتاد القراءة بالفارسية، أو أراد أن يكتب المصحف بالفارسية منع من ذلك على أشد المنع، وإن فعل ذلك في آية او آيتين لايمنع من ذلك، ذكر الشيخ الامام شمس الائمة السرخسي في شرح الجامع الصغير: و إن كتب القرآن و تفسير كل حرف و ترجمته تحته روى عن الشيخ الفقيه أبي جعفر رحمه الله لا بأس به في ديارنا؛ لأن معاني القرآن وفوائدها لايضبطها القوم إلا بهذا'' (المحيط البرهاني ۲/ ۵۲ الفصل الثاني طبع ادارة القرآن كراچی)۔

علامہ عالم بن علی انصاری دہلوی نے بھی یہی عبارت زیب قرطاس کی ہے (دیکھئے: فتاوی تاتارخانیہ ۲/ ۷۵ الفصل الثانی طبع زکریا دیوبند)۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام نے حاکم شہید کی ''الکافی'' سے تقریباً یہی عبارت نقل کی ہے (دیکھئے: فتح القدیر ۱/ ۲۸۴ باب صفۃ الصلاۃ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ ابن عابدین نے حافظ ابن ہمام کی عبارت سپرد قلم کی ہے (دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۱۸۷ باب صفۃ الصلاۃ طبع زکریا دیوبند)۔

علامہ علاء الدین حصکفی اسی کی تلخیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وتجوز كتابة آية أو أيتين بالفارسية لا أكثر'' (الدر المختار مع كشف الأستار/ ۷۴ طبع زكريا ديوبند)۔

شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانی کا اثر خامہ ہے: ''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة؛ ولأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمر القرآن'' (التجنيس والمزيد بحواله جواهر الفقه ۱/ ۹۸ طبع مكتبه سيرت النبي ديوبند)۔

(فارسی زبان میں قرآن لکھنا بالاتفاق ممنوع ہے، کیونکہ یہ حفاظت قرآن میں خلل انداز ہوگا اس لئے کہ ہمیں الفاظ اور معانی دونوں کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہے، کیونکہ قرآن کریم آپ ﷺ کی نبوت کا معجزہ ہے اور اس لئے بھی ممنوع ہے کہ یہ قرآن کی عظمت کو ہلکا کرنے کا باعث ہوگا)۔

علامہ مرغینانی نے جن دو وجوہات کی صراحت کی ہے وہ بہت ہی اہم ہیں، ان سے کسی بھی وقت صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے، ساتھ ساتھ انہوں نے اجماع کا بھی دعوی کیا ہے، جو بجائے خود مستقل دلیل ہے۔

علامہ جلال الدین خوارزمی شرح ہدایہ میں امام محبوبی کا قول نقل کرتے ہیں:

''أما لو اعتاد قراءة القرآن أو كتابة المصحف بالفارسية يمنع منه أشد المنع'' (الكفاية شرح الدراية على هامش فتح القدير ۱/ ۲۴۷ طبع رشيديه كوئٹه)۔

اس موقع پر علامہ خوارزمی نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ امام محمد بن فضل نے فارسی زبان میں قرآن کی کتابت کے سلسلہ میں فتوی معلوم

---

[1] دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمانی، گجرات۔

کرنے پر اپنے شاگرد کے ذریعہ مستفتی کو قتل کرادیا (دیکھئے: کفایہ: ۱/ ۲۴۸)۔

ماضی قریب کے اکابر علماء کی بھی یہی رائے ہے کہ عربی کے علاوہ کسی بھی زبان میں صرف ترجمہ کی اشاعت جائز نہیں ہے، ہاں اگر اوپر عربی قرآن ہو اور اس کے نیچے ہر ہر سطر میں یا آدھے صفحے پر اس کا کسی زبان میں ترجمہ ہو، تو یہ جائز ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ وجوہ ذیل صرف ترجمہ کی اشاعت کو ناجائز کہا ہے: ۱- اہل کتاب کے ساتھ مشابہت ہے، ۲- اصل قرآن کے ضائع ہوجانے کا قوی احتمال ہے، ۳- لوگ بلاوضو غیر قرآن سمجھ کر چھوئیں گے، جبکہ بلاوضو ترجمہ چھونا بھی مکروہ ہے، ۴- احترام جیسے اصل قرآن کا ہے، ترجمہ کا نہیں کریں گے، ۵- جمہور امت کا تعامل یہی چلا آرہا ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے اور جس نے ایسا کرنے کی جسارت کی بھی، اس پر سخت نکیر کی گئی (امداد الفتاوی ۴/ ۴۳، زکریا دیوبند)۔

مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی بھی رائے یہی ہے (دیکھئے: امداد الاحکام ۱/ ۲۳۹ طبع زکریا دیوبند)۔

مفتی محمد شفیع صاحب رقم طراز ہیں: ''قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، اور جبکہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا، تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی (جواہر الفقہ: ۱/ ۹۷ مکتبہ سیرت النبی دیوبند)۔

علامہ شرنبلالی نے بھی مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت نقل کی ہے (النفحات القدسیة فی احکام قراءة القران و کتابتة بالفارسیة)۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں: محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں، اصل عربی کے ساتھ ترجمہ بھی ہو تو درست ہے (فتاوی محمودیہ: ۳/ ۵۰۶ طبع ادارہ صدیق ڈابھیل گجرات)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے (دیکھئے: کتاب الفتاوی: ۱/ ۳۷۴ طبع نعیمیہ دیوبند)۔

فقہاء حنفیہ کے علاوہ دیگر مذاہب کے فقہاء اور ان کے ائمہ کا بھی اس پر اتفاق ہے، چنانچہ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

''وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا. إلا على الكتبة الأولى. رواه الداني في المقنع. ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة'' (اتقان فی علوم القرآن ۱/ ۳۶۷ النوع السابع والسبعون طبع ادارة الرشید دیوبند)۔

امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں: ''من يكتب مصحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا'' (الاتقان ۱/ ۳۶۷)۔

علامہ زرکشیؒ لکھتے ہیں: ''والأقرب المنع كما تحرم قراءته بغير لسان العرب'' (الاتقان فی علوم القرآن ۱/ ۳۷۶ طبع ادارة الرشید دیوبند) دیگر عبارتوں کے لئے دیکھئے: (جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۱، ۱۱۱ طبع مکتبہ سیرت النبی دیوبند)، دیگر عبارتوں کے لئے دیکھئے: (جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۱، ۱۱۱ طبع مکتبہ سیرت النبی دیوبند)۔

ان ترجمہ کی اشاعت کی تائید میں جو وجوہات ذکر کی جاتی ہیں وہ انتہائی لغو اور مہمل ہیں، کیونکہ اصل متن اور ترجمہ دونوں ملا کر چھاپنے میں مصارف کو لاکھ دو لاکھ نہیں آتے کہ اس کی وجہ سے فقہاء کی اس قدر صریح نصوص کو ٹھکرا دیا جائے اور امت کے تعامل توارث کو نظر انداز کردیا جائے، زیادہ سے زیادہ سو پچاس کا فرق آتا ہے، جو قابل التفات نہیں۔

اور جو لوگ متن قرآن نہیں پڑھ سکتے انہیں بھی متن قرآن دینے کا فائدہ یہ ہے کہ ان کی رغبت اور شوق بڑھے گا کہ وہ بھی عربی سیکھیں، کیا صحابہ کرام نے اسلام قبول کیا تو سب بچے تھے اور کیا ان کے لئے کسی دیگر زبان میں عربی کے علاوہ ترجمہ کرکے دیا گیا؟ نہیں، بلکہ عمر کے جس مرحلہ میں بھی وہ تھے انہیں عربی قرآن ہی کی تعلیم دی گئی، اور غیر مسلموں میں سے صرف ان حضرات کو قرآن کریم دینا شرعا مطلوب ہے، جن سے یہ توقع ہو کہ وہ اس کا احترام کریں گے، کسی بھی طرح اس کی بے حرمتی نہیں کریں گے، رہے وہ لوگ جن سے بے حرمتی کا اندیشہ ہے انہیں ترجمہ قرآن بھی دینا بے حرمتی سے خالی نہیں۔

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"والحاصل مما سبق أن وقوع المصحف بأيدي الكفار إنما يمنع منه إذا خيف منهم إهانته. أما اذا لم يكن مثل هذا الخوف فلا باس بذلك لاسيما لتعليم القرآن"۔

اس قسم کے شبہات کا جواب دیتے ہوئے حافظ ابن حجر شافعی فرماتے ہیں: "وزعم أن كتابته بالعجمية فيها سهولة للتعليم كذب مخالف للواقع المشاهدة فلا يلتفت لذلك، على أنه لو سلم صدقه. لم يكن مبيحا لإخراج ألفاظ القرآن عما كتب عليه. وأجمع عليه السلف والخلف" (الفتاوى الكبرى ۱/ ۳۸ طبع المكتبه الاسلاميه)۔

اور یہ گمان کہ غیر عربی میں لکھنے میں تعلیم کی سہولت ہے، کذب محض ہے واقعہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، اس لئے یہ قابل التفات نہیں، بالفرض اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ الفاظ قرآن کو اس نہج سے جس پر کتابت ہوتی ہے اور اس پر اسلاف و اخلاف کا اجماع ہے، نکالنے کو جائز نہیں کرسکتے (جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۳ طبع مکتبہ سیرت النبی دیوبند)۔

آخر میں ہم علامہ فخر الدین عثمان بن علی زیلعی کی یہ صراحت رقم کر دیتے ہیں کہ قرآن صحیح قول کے مطابق لفظ اور معنی دونوں کا مجموعہ ہے، کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے اور اعجاز لفظ اور معنی دونوں سے واقع ہوتا ہے، اس لئے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت ہرگز جائز نہیں ہوسکتی۔

"والصحيح أن القرآن هو النظم والمعنى جميعا عنده. لأنه معجز للنبي ﷺ والإعجاز وقع بهما جميعا"

(تبيين الحقائق ۱/ ۲۸۸ طبع دار الكتب العلميه)۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے دو مقام پر تحریر کیا ہے کہ اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے (دیکھئے: فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۱۰، ۵۱۱)،

مگر راقم کو یہ حوالہ دستیاب نہیں ہوسکا، البتہ "النفحات القدسيه" میں علامہ شرنبلالی نے اجماع ائمہ نقل کیا ہے (تکملہ فتح الملہم ۳/ ۳۸۶ اشرفیہ دیوبند)

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

اس کی دو صورتیں سوال میں درج کی گئی ہیں:

الف- رسم عثمانی کے ساتھ کسی دوسرے رسم الخط میں تحریر کرنا۔

ب- صرف دوسرے رسم الخط میں تحریر کرنا، دوسری صورت تو بالاتفاق ناجائز ہے اور اس پر جمہور امت کا اجماع ہے، اور پہلی صورت کو بعض معاصر مفتیان کرام نے جائز کہا ہے اور اس کے لئے کچھ شرائط لگائی ہیں۔

اس کے دلائل وہی ہیں، جو صرف ترجمہ کی اشاعت کے ذیل میں تحریر کئے گئے ہیں، مزید چند دلائل سپرد قلم کئے جاتے ہیں:

امام احمد کا ارشاد ہے:

"ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك" (الاتقان في علوم القرآن ۱/ ۳۶۷)۔

یہی رائے امام مالک کی ہے (دیکھئے: الاتقان ۱/ ۳۶۷، ۶ طبع رشیدیہ دیوبند)۔

معراج الدرایہ میں ہے: "يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع. وأنه يكون معتمده زنديقا" (جواهر الفقه ۱/ ۸۲ طبع سيرت النبي ديوبند)۔

حافظ ابن حجر نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے: "وفي كتابة القران العظيم بالعجمي تصرف في اللفظ المعجز الذي حصل التحدى به بما لم يرو" (جواهر الفقه ۱/ ۸۳)۔

مفتی شفیع صاحب طویل بحث کے بعد لکھتے ہیں: الغرض مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ذکر کردہ مقدمہ میں صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت لازم اور ضروری ہے کسی عجمی زبان میں بدون عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری ہے کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں، کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت

اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۷۷)۔

مولانا ظفر احمد تھانویؒ لکھتے ہیں: ناگری ہو یا انگریزی ہر وہ خط جس میں رسم خط مصحف عثمانی کی رعایت نہ ہو سکے، اس میں قرآن لکھنا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ کتابت مصحف میں رعایت رسم خط عثمانی واجب ہے (امداد الاحکام ۱/ ۲۴۰)۔

دوسری جگہ رقم طراز ہیں: اتباع رسم مصاحف عثمانی کتابت قرآن میں باجماع ائمہ اربعہ واجب ہے، جس کی مخالفت گناہ ہے (امداد الاحکام ۱/ ۲۲۵)

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں: قرآن غیر عربی خط میں لکھنا جائز نہیں (امداد الفتاوی ۴/ ۴۳)۔

اس پر مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے کافی بسط وتفصیل سے کلام کیا ہے اور بہت ہی شد ومد کے ساتھ اس کو ناجائز کہا ہے (دیکھئے: فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۹ طبع دار الاشاعت کراچی)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر کرتے ہیں: قرآن کریم کو رسم عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا باجماع ناجائز ہے لوگوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لئے عربی رسم خط لکھا یا جائے، عجمی رسم الخط میں لکھنا درست نہیں (فتاوی عثمانی ۱/ ۷ ۲۴ طبع نعیمیہ دیوبند)۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے اسی رائے کا مدلل اظہار کرنے کے بعد اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے (دیکھئے: فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۰۷-۵۱۲ طبع ادارہ صدیق ڈابھیل گجرات)۔

مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحبؒ نے صرف غیر عربی رسم الخط میں لکھنے کی سخت مخالفت کی ہے، البتہ اس صورت کو چند شرائط کے ساتھ جائز کہا ہے کہ اصل عربی متن اوپر تحریر کیا جائے اور اس کے نیچے غیر عربی رسم الخط میں اس کو تحریر کیا جائے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۴۲۵-۴۲۹ طبع ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی)

مگر راقم کی رائے یہ ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر صرف غیر عربی رسم الخط میں شائع کرنا جائز نہیں ان میں یہ وجہ بھی بہت سے حضرات مفتیان کرام نے تحریر کی ہے کہ عربی زبان میں بعض حروف ایسے ہیں، جن کا متبادل دوسری زبانوں میں نہیں ہے، مثلاً زاء، جیم، ظ، ض وغیرہ عربی زبان میں الگ الگ حروف ہیں اور دیگر زبانوں میں ان کے لئے صرف ایک یا دو لفظ ہے، اگر اس کے الگ الگ اصطلاحات وضع کی جائیں پھر بھی غیر عربی زبان میں اس کا فرق مشکل ہے، کیونکہ اس کا تعلق صورت سے ہے، اسی طرح بعض زبانوں میں اعراب کی جگہ حروف مستعمل ہوئے ہیں اور قرآن کریم میں بعض ایسے حروف ہیں جو لکھے جاتے ہیں، مگر پڑھے نہیں جاتے ہیں، دیگر زبانوں میں جب اسے لکھا جائے گا تو صرف وہ حروف لکھے جائیں گے جو پڑھے جاتے ہیں اور جو حروف لکھے جاتے ہیں پڑھے نہیں جاتے ہیں وہ دیگر زبان میں قید تحریر میں نہیں آئیں گے اس طرح قرآن کریم میں بے شمار حروف زائد ہو جائیں گے اور متعدد کم ہو جائیں گے، ہر چند کہ تحریر ہی میں سہی اور یہ سراسر تحریف ہے او کیا یہ بات دائرہ جواز میں آسکتی ہے کہ ایک شخص ایک مرتبہ ایک کام صحیح طریقے پر کرے اور پھر اس کام کو ناجائز طریقے پر کرے؟ کیا ایک مرتبہ جائز طریقہ اختیار کرنے سے دوسرا طریقہ جو کہ ناجائز ہے اسے جائز کہنا قرین عقل قیاس ہے۔

اصل بات یہی ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ قرآن کو عربی زبان میں ہی پڑھنا سکیں اور اس کے لئے محنت ومشقت برداشت کریں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ نے اپنے ساتویں سیمینار منعقدہ ۱۱-۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ کے دوسرے فیصلے میں تین وجوہات کی بنیاد پر اس کو ناجائز کہا ہے:

۱- یہ صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف کے اجماع کے خلاف ہے۔ ۲- قرآن کے بعد حروف کم اور بعض زیادہ ہو جائیں گے اور یہ سراسر تحریف ہے۔

۳- قرآن کریم لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جائے گا (اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے/ص ۱۷۶-۱۷۸)۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

نابینا افراد کے لئے اس قسم کی جو پیش رفت ہوئی ہے، وہ انتہائی مستحسن اور مبارک عمل ہے، رہا یہ سوال کہ کیا قرآن کریم کو بھی اس کوڈ میں ضبط کیا جا سکتا ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ بریل کوڈ کوئی رسم الخط نہیں ہے، بلکہ رموز ہیں جو حروف کی طرف اشارہ کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، اس لئے اسمیں قرآن کریم تیار کرنا حد جواز میں آنا چاہئے، اس سلسلے میں علامہ سیوطی کی مندرجہ ذیل عبارت مفید مطلب ہو سکتی ہے:

''وأما النقط فيجوز، لأنه ليس له صورة فيتوهم لأجلها ما ليس بقرآن قرآنا وإنما هي دلالات على هيئة المقروء فلا يضر إثباتها لمن يحتاج إليها'' (اتقان فی علوم القرآن ۱/ ۲۷۷ طبع ادارہ رشید دیوبند)۔

نیز ان حضرات کی بے بصارتی منجانب اللہ ہے، اس لئے ان سے مشقت وحرج کو دفع کر کے سیر وسہولت ان کو بہم پہنچانے کی قواعد شریعت اجازت دیتی ہے ''الضرورات تبيح المحظورات'' (الاشباہ مع شرح الحموی ۱/ ۲۷۵ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

''الضرر يزال'' (الاشباہ مع شرح الحموی ۱/ ۲۷۸)۔

''المشقة تجلب التيسير'' (الأشباہ ۱/ ۲۴۵ وقواعد الفقہ / ص ۱۲۲ طبع دار الکتاب دیوبند)۔

اور چونکہ یہ رسم الخط نہیں ہے، اس لئے تحریف قرآن کی خرابی بھی لازم نہیں آتی ہے، اور اسے بے وضو چھونا احتیاط کے خلاف معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ ترجمہ قرآن کو بلا وضو چھونا مکروہ قرار دیا گیا ہے،

''لو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح، هكذا في الخلاصة'' (فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۲۹، مزید دیکھئے: فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۱۹ طبع دار الاشاعت کراچی)۔

موبائل پر قرآن مجید کو چھونا:

محدث اور جنبی وغیرہ کے لئے قرآن مجید بلا غلاف چھونا جائز نہیں ہے اور اگر اس پر غلاف لگا ہوا ہو، تو چھونا جائز ہے اور غلاف سے مراد وہ ہے جو اس سے الگ ہو، یا بہ سہولت الگ ہوسکتا ہے اگر غلاف کو اس کے ساتھ جڑ دیا جائے تو اس پر ہاتھ لگانا درست نہیں اور ظاہر ہے کہ موبائل کا کور ایسا ہوتا ہے، جو اس سے بہ سہولت جدا ہوسکتا ہے، جیسا کہ وقتاً فوقتاً اس کو جدا کرنا لوگوں کے معمولی میں بھی ہے، اس لئے جب اسکرین پر قرآن کے حروف نمایاں ہوں، تو بھی اس کو چھونا جائز ہونا چاہئے، البتہ اوپر کا غلاف موبائل میں شیشے کی شکل میں ہوتا ہے جس سے حروف اس طرح جھلکتے ہیں، جس طرح کہ اوپر غلاف پر لکھا ہوا ہو، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ اسکرین پر جب قرآنی حروف ظاہر ہوں، تو اس پر بلا وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

علامہ مرغینانی رقم کرتے ہیں: ''وليس لهم مس المصحف إلا بغلافه ولا أخذ درهم فيه سورة من القرآن إلا بصرته (إلى إن قال) وغلافه ما يكون متجافيا عنه، دون ما هو متصل به كالجلد المشرز، هو الصحيح'' (الہدایۃ فی شرح البدایۃ ۱/ ۴۸ باب الحیض والاستحاضہ، اتحاد بکڈپو دیوبند)۔

علامہ عالم بن علاء لکھتے ہیں: ''ولا يمس المصحف ولا اللوح المكتوب عليه آية تامة من القرآن ولا الدرهم المكتوب عليه سورة الإخلاص'' (الفتاوی التاتار خانیہ ۱/ ۲۹۱ الفصل الثالث طبع زکریا دیوبند)۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: ''ومسه أي القرآن ولو في لوح، أو درهم أو حائط'' (الدر المختار مع رد المحتار ۱/ ۴۸۸ باب الحیض طبع زکریا دیوبند)۔

مفتی محمد سلمان پالنپوری لکھتے ہیں: اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن یا احادیث شریفہ کے حروف دکھائی دے رہے ہوں، تو ان حروف پر بلا وضو ہاتھ رکھنا درست نہیں، لیکن اگر یہ پروگرام بند ہو، تو ایسے موبائل کو بلا وضو چھونا منع نہیں (دینی مسائل اور ان کا حل/ ص ۳۶۵ طبع نعیمیہ دیوبند)۔

ایک دوسرے مقام پر تحریر کرتے ہیں: جس اسکرین پر قرآن کی آیت نمایاں ہو، تو اس اسکرین کو بلا وضو چھونا احتیاط کے خلاف ہے (دینی مسائل اور ان کا حل/ ص ۳۶۹)۔

☆☆☆

قرآن کریم کے متن و ترجمہ سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد روح اللہ قاسمی[1]

غیر حامل المتن ترجمہ قرآن درحقیقت الفاظ قرآنی سے بے نیازی اور اس کے انوار وتجلیات سے محرومی کا سبب بنے گا، پھر حفاظت قرآن میں اس سے خلل آئے گا، اس لئے ''قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے......اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا۔ اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہگار ہونگے وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائیگا۔ لقولہ تعالیٰ: ''من یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها'' (سورۂ نساء: ۸۵) (جواہر الفقہ، ۲/ ۱۰۳، ۱۰۴)۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے ''صاحب نور الایضاح'' علامہ حسن شرنبلالی کے حوالے سے مذاہب اربعہ سے اس کی ''حرمت اور سخت ممانعت'' پر دلالت کرنے والے بعض نصوص کو اپنے درج بالا مقام میں ذکر فرمایا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے، کیونکہ ''یہ قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے''۔

''ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ ومعنی دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے''۔

''یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے''۔

''حضرات صحابہ کرام کا اجماع ہے جن کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تھی''۔

فارسی کی تصریح اس لئے کی گئی، تاکہ دوسری زبانوں میں ممنوع ہونا بدرجہ اولی ثابت ہو، کیونکہ کوئی اور زبان فارسی سے فصیح نہیں ہے (ایضاً)۔

اکابرین دیوبند میں بھی جن بزرگوں کو اس مسئلہ میں خامہ فرسائی کا موقع ملا ہے سبھوں نے تقریباً اس کی حرمت وممانعت کو ہی بیان فرمایا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسباب وعلل کا تذکرہ کیا ہے جس کا ذکر خالی از فائدہ نہیں ہوگا۔

مولانا تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ باہل باطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے......اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً وعادتاً ان کے خصائص میں سے ہے سو اولاً ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے۔

پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیاوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے۔ اس میں بھی خاص کر جب ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جائے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے۔

رسم عثمانی کا التزام:

چند بزرگوں، یعنی عز الدین بن عبد السلام، ابوبکر باقلانی، ابن خلدون اور قاضی شوکانی وغیرہ کو چھوڑ کر ائمہ اربعہ سمیت جمہور سلف وخلف کا اس پر

[1] استاذ مدرسہ فلاح المسلمین، گوا پوکھر بھوارہ مدھوبنی بہار۔

اجماع ہے کہ رسم عثمانی کا التزام واجب اور ضروری ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔ سعودیہ کی "ہیئۃ کبار العلماء" نے اپنے چودہویں سمینار میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ "رسم مصحف کو اس کی اصلی شکل پر باقی رکھا جائیگا اور قواعد املاء کے موافقت میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں جائیگی" اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے کہ:

(۱) رسم عثمانی پر صحابہ وتابعین سے عصر حاضر تک سب کا اتفاق چلا آرہا ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي" (ابوداؤد باب لزوم السنہ حدیث نمبر: ۴۶۰۷، ترمذی کتاب العلم حدیث نمبر: ۲۶۷۶)، لہذا رسم عثمانی کی اتباع، تمام صحابہ اور اجماع امت کی اتباع ہے اور ان کے اجماع پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں تحریر کرنا متعین ہے۔

(۲) رسم عثمانی کے برخلاف قرآن کریم میں املاء کے قواعد کی رعایت میں تبدیل وتحریف کا دروازہ کھلے گا؛ کیونکہ ضروری نہیں کہ املاء کے جو قواعد ابھی رائج ہیں وہ مرور ایام کے ساتھ باقی رہیں؛ اس لئے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم کی اپنی اصطلاح ہوا کرتی ہے اس طرح مرور زمانہ کے ساتھ قرآنی نسخوں میں اختلاف ہوسکتا ہے جو دشمنان دین کو لب کشائی کا موقع فراہم کرے گا۔

(۳) اگر رسم عثمانی کا التزام نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ قرآن بازیچہ اطفال بن جائیگا، کیونکہ ہر قوم وجماعت کی اپنی اپنی اصطلاح ہوا کرتی ہے وہ اپنے قواعد املاء کے مطابق قرآن کریم کو تختۂ مشق بنانے کی کوشش کرے گی؛ لہذا "درء المفاسد أولى من جلب المنافع"۔

یہ قرارداد اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے ساتویں سیمینار میں پیش ہوا، اور غور وخوض کے بعد بالاتفاق اس فیصلہ کی تائید کی گئی (دیکھئے: اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے/ص ۱۷۶، ۱۷۷)۔

رسم عثمانی میں جو حروف جیسے لکھے ہیں انہیں ویسا ہی لکھا جائیگا۔ جیسے بسم اللہ سورہ فاتحہ کے شروع میں بغیر الف اور سورہ علق میں الف کے ساتھ ہے تو اس کی پابندی لازم ہوگی۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "واؤ"، "یا" اور "الف" وغیرہ کو جہاں جیسا لکھا گیا ہے اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تبدیلی حرام ہے۔ اور علامہ سیوطی "همع الهوامع" میں تحریر کرتے ہیں: اس طرز تحریر پر دوسرے کو قیاس نہیں کیا جائیگا، بلکہ اگر یہی الفاظ غیر قرآن میں آجائیں تو اصول املاء کے مطابق تحریر کیا جائیگا۔

"لايقاس عليه خارجه، بل إذا وقعت هذه الألفاظ ونحوها في غير القرآن لم تكتب إلا على القوانين السابقة" (ہمع الہوامع فی شرح الجوامع ۳/۲۸۶)۔

غیر عربی رسم الخط میں رسم عثمانی کی خوبیاں نہیں ہوسکتیں:

جب صورتحال یہ ہے کہ رسم عثمانی توقیفی ہے، خود ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس طرز تحریر میں بے شمار فوائد اور نکتے موجود ہیں اور اس میں جو خوبیاں ہیں اسے کسی اور زبان کے رسم الخط میں ادا نہیں کیا جاسکتا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے بہت ساری ضروری چیزوں کی رعایت بھی دوسری زبانوں کے رسم الخط میں نہیں ہو پائیگی۔ "س" اور "ش"، "ق" اور "ک"، "ع"، "ء"، "ض" اور "ظ" اور اس جیسے دوسرے ابجدی حروف جو عربی میں ایک بدیہی حقیقت ہیں غیر عربی میں یا تو سرے سے موجود نہیں ہیں، یا اس کی رعایت ایک دشوار امر ہے۔ نیز اس کی مخالفت بالاجماع جائز نہیں ہے؛ پس قرآن کریم کو رسم عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنے سے جہاں رسم عثمانی میں موجود خوبیوں کی رعایت نہیں ہو پائیگی، صحابہ کرام سمیت پوری امت کے اتفاق سے اختلاف بھی لازم آئیگا۔ لہذا ایسے تمام رسم الخط جس میں رسم عثمانی کی رعایت نہیں ہوسکے اس میں قرآن کے لکھنے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ "رہی وہ خط جن میں رعایت رسم خط مذکور ہوسکتی ہے جیسے فارسی یا اردو نستعلیق وامثالہ ان میں قرآن کا لکھنا مختلف فیہ بین القولین ہے، مگر اقرب اور راجح یہ ہے کہ ایسے خطوط میں بھی پورا مصحف لکھنا ناجائز ہے ایک دو آیت اتفاقیہ لکھنے میں مضائقہ نہیں" (امداد الاحکام ج ۱/ص ۲۴۰)۔

اسی طرح "اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھدیا جائے اور دونوں ساتھ شائع کیا جائے" اس کے جواز کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اور اس پر "ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور" والی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ اس کے بھی وہی نتائج وثمرات ہونگے جو "غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت" کے ہیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ اس کے عدم جواز کے اسباب میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں قرآن کو تابع بنانا لازم آئیگا جو خلاف ادب ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۹۰)۔ کیونکہ اس صورت میں لوگ قرآن کریم سے نگاہیں پھیر لیں گے اور ان کی پوری توجہ اپنے رسم الخط میں لکھی ہوئی عبارتوں پر ہوگی۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت کی وکالت اس لئے کیجاتی ہے کہ ہر شخص کا عربی زبان جاننا کوئی ضروری نہیں ہے، جبکہ مادری زبان سے عام طور سے لوگ واقف ہوتے ہیں۔ ایسے جو لوگ قرآن کریم کو عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے وہ اپنی زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کی تلاوت کرلیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کتنی بڑی ضرورت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ”عہد صحابہ میں جب اسلام مشرق ومغرب کے ممالک میں اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے ساتھ پھیلا۔ اس وقت قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے والے گنے چنے حضرات تھے۔ عراق وخراسان اور ہندستان وترکستان وغیرہ کے رہنے والے نومسلم نہ عربی رسم خط پڑھ سکتے تھے نہ ان ممالک میں ابتداءً کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر ان کی ملکی زبان میں اس کی ترجمانی کر سکے اور قرآن ان کو پڑھا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہوگی کہ ہر ملک کے رسم خط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجا جائے، تاکہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں۔ لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ اس کا قرون مشہود لہا بالخیر میں ثابت نہیں کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم خط میں قرآن لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو (جواہر الفقہ / ۲/ص ۷۱، ۷۲)۔

علامہ ابن حجر تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ ”یہ گمان کرنا کہ عجمی (زبان یا رسم خط) میں تعلیم کی سہولت ہے تو یہ غلط اور مخالف واقعہ ہے، اور خلاف مشاہدہ ہے۔ اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں اگر اس کا سچ ہونا بھی تسلیم کرلیا جائے، تب بھی قرآن کریم کے الفاظ کا ان کی اجماعی صورت اور قدیم طرز کتابت سے نکالنا جائز نہیں ہے“ (جواہر الفقہ ، ۲/ص ۸۴)۔

الغرض جتنی ضرورت قرون مشہود لہا بالخیر میں کسی عجمی رسم الخط میں قرآن لکھوانے کی تھی کم از کم اتنی ضرورت تو آج موجود نہیں ہے۔ علم اور آلہ علم کی کثرت ہوگئی، علم السنۃ کا وجود ہے، ایک شخص مختلف زبانوں کا جاننے والا اور ایک سے زیادہ زبانوں کا ماہر ہوتا ہے۔ کسی زبان کو سیکھنا بالخصوص عربی زبان کو جس کے بارے میں ”ولقد یسرنا القرآن للذکر“ (سورۂ قمر: ۲۲) کی بشارت ہے کچھ مشکل نہیں۔ اور اگر یہ خیالی مشکلات تسلیم بھی کرلئے جائیں تو ہر مشکل کا ازالہ ضروری تو نہیں۔ یوں تو نماز روزہ وغیرہ ارکان اسلام سب ہی کچھ نہ کچھ مشکل ہے۔ اس لئے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے کہ قرآن کریم کو غیر رسم عثمانی میں اشاعت کی اجازت دیجائے، چاہے اسکے ساتھ رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھا جائے یا نہیں۔ ہاں سیکھنے کی حد تک کچھ حصوں کی فقہاء نے اجازت خود ہی دے رکھی ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ وہ ابھرے ہوئے نقوش ہیں جن کی مدد سے بصارت سے محروم افراد بذات خود کچھ پڑھنے اور سمجھنے پر قادر ہوجاتے ہیں اور دوسروں کے محتاج نہیں رہتے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ نابینا افراد کی تعلیم وتعلّم کے لئے یہ ایک کامیاب طریقہ ہے۔

بریل کوڈ میں سب سے پہلی مرتبہ قرآن کریم کو مصر اور اردن نے ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں شائع کیا، پھر مصر نے دوسرا ایڈیشن ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں شائع کیا اور اس میں اس کی وضاحت کی کہ اس کی طباعت میں رسم املائی کا انتخاب کیا گیا ہے، کیونکہ بعض فقہاء نے اس رسم الخط میں اس کے جواز کا فیصلہ دیا ہے۔ اردن نے بھی اسی رسم الخط میں اسے شائع کیا تھا۔ مصری ایڈیشن میں اعراب اور نقطے بریل حروف کے اوپر اس کے ٹھیک سامنے لگے ہوئے تھے، جبکہ اردنی نسخے میں عام طور سے حروف کے بعد اور بعض حروف میں پہلے لگے تھے۔ یہ طریقہ مبتدیوں کے لئے زیادہ سہولت کا باعث تھا، جبکہ پہلا طریقہ ان حضرات کے زیادہ مناسب تھا جنھیں اس میں شد بد حاصل ہو۔ (انٹرنٹ پر موجود مواد سے یہ تھوڑی معلومات تیار کی گئی ہے)۔

کتابت قرآن میں چونکہ رسم عثمانی واجب اور ضروری ہے جبکہ بریل کوڈ نہ رسم عثمانی ہے نہ رسم املائی؛ اسلئے عام اصول کے مطابق بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں ہونی چاہئے۔ حضرت مفتی احمد خان پوری صاحب دامت برکاتھم نے فتاویٰ رحیمیہ کے حوالے سے اسے ناجائز ہی لکھا ہے اور لکھتے ہیں: اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے (محمود الفتاویٰ ج ۴/ص ۱۵۴)۔

لیکن بریل کوڈ میں اگر چہ رسم عثمانی کو پورے طور سے برتنا ممکن نہیں ہے، نیز من حیث الرسم بریل کوڈ میں کتابت ممکن بھی نہیں ہے؛ کیونکہ وہ مستقل اشارات اور علامتیں ہیں جو کسی مضمون پر دال ہوا کرتے ہیں جس طرح نقوش الفاظ پر اور الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہیں؛ لیکن مضمون کی حیثیت سے رسم عثمانی کے اکثر حصوں کو بریل کوڈ میں لکھا اور برتا جاسکتا ہے اور جہاں اسے برتنے کی گنجائش نہیں ہو وہاں رسم املائی سے مدد لی جاسکتی ہے۔جیسے لفظ رحمن ہے۔ یہ رسم املاو عثمانی دونوں میں بغیر الف کے لکھا جاتا ہے اور رسم عثمانی میں الف متروکہ کے لئے بطور علامت کے کھڑا زبر ہوتا ہے۔اسے بریل میں الف کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے۔

لہذا ایسا ممکن ہے جہاں تک رسم عثمانی کی رعایت ہو اسے برتا جائے اور جہاں اسے برتنا ممکن نہیں ہو وہاں رسم املائی کو برتا جائے اور اس کی شرعا گنجائش ہو۔جس کی حسب ذیل وجوہات ہیں۔

بریل کوڈ میں اگر چہ رسم عثمانی کو مکمل طور سے نہیں برتا جاسکتا ہے؛ مگر اس میں من حیث المضمون رسم عثمانی کی رعایت ہو جاتی ہے۔اور کمی کی بھرپائی دوسرے طریقے سے ہوسکتی ہے، لہذا رسم عثمانی کے بعض تقاضوں کا نہ پایا جانا معفو عنہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا۔"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها" (سورۂ بقرہ:۲۸۶)، اسی طرح وہ تمام اصول جو حالت مجبوری کی رعایت کی طرف مشیر ہیں جیسے "الضرر یزال" یا جیسے "المشقة تجلب التيسير" ان قاعدوں کا تقاضہ یہ ہے اس میں گنجائش ہو۔اور نابیناؤں کے حق میں اسے درست و مستحسن قدم مانا جائے۔ایسے کرنے میں نابیناؤں کے لئے غیر معمولی سہولت اور آسانی ہے اور دنیا میں ان کی بھی بڑی تعداد ہے جن کی رعایت ضروری ہے۔اس طرح سے ایک بڑی تعداد کو قرآن کریم سے جڑنے اور استفادہ کا موقع مل سکے گا۔اور ہر نابینا شخص حافظ کا مالک ہو،ضروری نہیں ہے یہ منجاب اللہ ایک نعمت ہے۔

وہ ہر قدم پر بینا افراد کے محتاج نہیں رہیں گے، بلکہ براہ راست اس سے قرآن کی تلاوت اور حفظ کرسکیں گے، بھولنے کی شکل میں اس کی طرف مراجعت کرسکیں گے؛ کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نابینا کو کوئی تلقین کرانے والا فرد مل جائے لہذا اس معاملہ میں اسے وسعت ملنی چاہئے کسی ملقن کے انتظار میں رہیگا تو قرآن نہیں پڑھیگا۔اس طرح بہت سے لوگ قرآن سے محروم ہوجائیں گے۔

سعودیہ عربیہ سمیت بعض اسلامی ممالک نے بریل کوڈ میں قرآن کو شائع کیا ہے۔ان ممالک کا یہ اقدام ان کے علماء کی راہنمائی کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ خالص دینی معاملہ ہے؛ لہذا "لایجتمع امتي على الضلالة" (الحدیث) کا تقاضہ ہے کہ اس کی گنجائش نکلے؛ کیونکہ یہ ایسا معاملہ نہیں ہے جس کا حکم مکان وجغرافیہ کے بدلنے سے بدل جائے۔

بریل کوڈ میں تحریر قرآن کا حکم:

اس کوڈ میں تحریر قرآن کریم کے قرآن ہونے میں شبہ نہیں ہے۔کیونکہ اس میں رسم عثمانی کی رعایت بہت حد تک ہوسکتی ہے۔اور اگر رسم عثمانی کی رعایت کو تسلیم نہ بھی کیا جائے تو کم از کم یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ غیر رسم عثمانی میں تحریر کردہ قرآن ہے۔چنانچہ اسے عرف عام میں مصحف اور قرآن ہی سمجھا جاتا ہے۔یہ ترجمہ یا الگ سے کوئی چیز نہیں ہے؛ لہذا اس پر وہ تمام احکام نافذ ہونگے جو قرآن کریم کے ہیں۔اس سلسلے میں چاروں مسالک کا اتفاق سمجھ میں آتا ہے۔کیونکہ اگر اس میں رسم عثمانی کی زیادہ سے زیادہ رعایت موجو ہے تو "للاکثر حکم الکل" کے تحت اسے مصحف ہی گردانا جائیگا۔اور اگر رسم عثمانی میں تحریر مصحف نہ بھی مانا جائے تب بھی اس پر مصحف کے احکام ہی نافذ ہونگے۔

موبائل پر قرآن مجید:

جب قرآن کریم کیسیٹ، میموری کارڈ، ہاردسک، موبائل یا اسطرح کی چیزوں میں لوڈ ہو جس سے براہ راست قرآن پڑھنا ممکن نہیں ہو تو اسے قرآن کا حکم حاصل نہیں ہوگا اور اسے مصحف نہیں کہا جائیگا؛ لہذا حدث اصغر واکبر کے ساتھ اس کا چھونا جائز ہوگا۔

" اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء " کا فتویٰ بھی یہی ہے۔"لا حرج في حمل أو لمس الشريطة المسجل عليه القرآن لمن كان عليه جنابة ونحوها" (المكتبة الشاملة/ فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء)۔

لیکن جب قرآن موبائل یا کمپیوٹر اور اس طرح کے آلات پر ظاہر ہو تو اس کے قرآن ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ اور قرآن پاک یا اس کے کسی حصہ کو حدث اصغر و اکبر کے ساتھ چھونے کی ممانعت پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

محدث کے لئے قرآن کریم مس کرنے میں ائمہ اربعہ کا موقف:

بے وضو اور جنبی کو قرآن کریم کا چھونا حرام اور ناجائز ہے۔ اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ پھر مسئلہ کی شروط و تفصیل میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کے یہاں مصحف یا اس کے کسی حصہ کو براہ راست یا غلاف متصل سے چھونا حرام ہے۔ اگر غلاف منفصل ہو یا قلم یا اور کسی ذرائع سے چھوئے جو محدث کے تابع نہیں ہو، اس سے چھونے میں حرج نہیں۔

مالکیہ کے یہاں قرآن کریم یا اس کے کسی بھی حصہ کو خواہ پورا قرآن ایک ساتھ ہو یا کچھ حصہ ہو، حائل یا بلا حائل مس کرنا یا اٹھانا حرام ہے، اگرچہ قرآن پاک تکیہ وغیرہ پر ہو۔ البتہ وہ معلم یا متعلم جو حدث کے ازالہ پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے جائز ہے۔ جیسے حائض و نفساء۔

شوافع کے یہاں محدث کو قرآن کریم کا مس کرنا، اٹھانا حائل و بلا حائل حرام ہے خواہ نفس سطر کو چھوئے یا سطر کے درمیانی حصہ کو یا حواشی کو یا جلد کو، نیز اگر قرآن کریم کسی صندوق و خریطہ وغیرہ میں ہے تو بھی اس کا اٹھانا حرام ہے اور مس میں صحیح قول یہی ہے کہ یہ بھی حرام ہے۔

حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ حروف یا حواشی یا جلد کو مس کرنا حرام ہے اور کسی حائل سے چھونا جائز ہے۔

(تفصیل دیکھئے: موسوعہ/مس/مس المحدث والجنب المصحف)۔

جب قرآن پاک موبائل کے اسکرین پر ظاہر ہو تو چونکہ وہ قرآن ہی ہے، لہذا یہ مان کر کہ وہ کاغذ پر ثبت نقوش اور مکتوب نہیں، ریڈیائی لہر ہے حکم قرآن سے خارج نہیں ہوگا اور بے وضو و غسل اس کا چھونا ناجائز اور اس کی عظمت کے خلاف ہوگا۔ موبائل کے اسکرین کو اگر غلاف مان بھی لیا جائے تو یہ غلاف متصل کے حکم میں ہوگا؛ لہذا مذکورہ تفصیل کی روشنی میں احناف سمیت دیگر ائمہ ثلثہ کے یہاں بھی یہی حکم ہوگا اور اسے براہ راست مس کرنا بالاتفاق حرام ہوگا، البتہ کسی لکڑی یا اور دوسری چیزوں سے مثلاً موبائل کے لئے بعض اوقات قلم نما ایک آلہ الگ سے ہوتا ہے اس سے چھونے میں احناف و حنابلہ کے مسلک کے مطابق حرج نہیں ہونا چاہئے۔ جبکہ مالکیہ اور شوافع کے اصول کے مطابق نہ صرف یہ صورت بھی ناجائز ہوگی، بلکہ خود موبائل کا چھونا بھی اس صورت (جبکہ قرآن موبائل کے اسکرین پر نمایاں ہو) میں ناجائز ہونا چاہئے؛ کیونکہ ان کے یہاں قرآن کریم کو حدث کے ساتھ براہ راست یا حائل سے ہر طرح مس کرنا حرام ہے حتی کہ اگر قرآن پاک تکیہ یا صندوق میں ہو تو بھی جائز نہیں ہے۔

جامعہ بنوریہ کراچی کے دارالافتاء کے فتوی نمبر ۱۴۸۲۹ مجریہ ۲ / جولائی ۲۰۱۲ء میں بھی اس کی صراحت ہے۔ چنانچہ درج ہے: "موبائل کی اسکرین پر اگر دیکھ کر پڑھا جائے تو اس صورت میں اسکرین کو ہاتھ لگانے اور صفحہ پلٹنے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، الا یہ کہ کسی دوسری چیز سے صفحہ پلٹیں"۔

☆☆☆

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت کے مسائل

مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیرآبادی[1]

۱- قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر متن قرآن کے باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، جیسا کہ فقہی مراجع سے پوری طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے، اور اس کا خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا تعاون علی الاثم ہے، "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ یوسف: ۲) کے ضابطے سے ناجائز ہوگا

(مزید تفصیل کے لئے فقہاء کی تصریحات مندرجہ ذیل کتب میں ملاحظہ کی جائیں: الکفایۃ شرح الھدایہ ۱/ ۲۲۸ طباعت اول مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر پاکستان، فتح القدیر شرح الھدایہ ۱/ ۲۲۸ مکتبہ نوریہ پاکستان، منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۱/ ۵۳۵-۵۳۶، البحر الرائق ۱/ ۵۳۶ زکریا بک ڈپو، جواہر الفقہ ۱/ ۹۷-۱۱۰، مراقی الفلاح/ ص ۱۵۳، ناشر سلیمان مصطفی، ردالمحتار ۲/ ۱۸۷، زکریا بک ڈپو دیوبند سہارنپور، فتاوی شامی ۲/ ۱۸۷ از زکریا بکڈپو)۔

نصوص فقہیہ سے صرف ترجمہ شائع کرنے کی ممانعت کی چند وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔

نیز آیات قرآنی: "إنا انزلناہ قرآناً عربیا لعلکم تعقلون" (سورۂ یوسف: ۲)، "وانہ لتنزیل رب العالمین" (سورۂ شعراء: ۱۹۲)، "بلسان عربی مبین" (سورۂ شعراء: ۱۹۵)۔

- یہود ونصاری سے مشابہت ہے اور حدیث ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (ابوداؤد کتاب اللباس/ ۵۵۹)

اور حدیث: ''لترکبن سنن من کان قبلکم'' (ترمذی ۲/ ۱۴۱، ابواب الفتن) اور حدیث ''أمتھوکون أنتم کما تھوکت الیھود والنصاری'' (مشکوۃ/ ص ۲۲) سے ان کی مشابہت ممنوع سمجھ میں آتی ہے۔

۲- عربی رسم الخط رسم عثمانی کے علاوہ میں کتابت:

قرآن پاک کے الفاظ بھی منزل من اللہ ہیں، لہذا قرآن پاک کے الفاظ کو عربی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے، کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں، اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، اس طرح رسم مصحف عثمانی میں لکھنا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ سب توقیفی ہے، اسمیں قراءت سبعہ متواترہ کا اجماع ہے، بہت سے حروف ایسے ہیں جو کہ غیر عربی میں نہیں پائے جاتے، جیسے ح، ذ، ز، ض، ظ، دوسرے رسم الخط میں لکھنے میں یہ نمایاں فرق نہیں رہ جائے گا، جس کی وجہ سے تحریف لازم آئے گی، اور بہت سی حرکتوں کو دوسری زبان میں حروف میں ادا کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے حروف قرآن میں کمی یا زیادتی لازم آتی ہے، پھر رسم عثمانی بھی عام عربی رسم الخط سے الگ ایک توقیفی رسم الخط ہے جسمیں بہت سی جگہ الف کا اضافہ یا کمی، اور امراۃ، رحمۃ وغیرہ الفاظ کہیں لمبی تا، کہیں گول تا کے ساتھ لکھا جاتا ہے، جو قیاس سے بالاتر ہے، اب اگر رسم عثمانی کے علاوہ پر لکھا جائے تو تحریف وترمیم کا لازم آنا ضروری ہے، جو حرام ہے۔

جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان میں لکھا ہے: ''قال أشھب سئل مالك ھل یکتب المصحف علی ما أحدثہ الناس من الھجاء؟، فقال: لا، إلا علی الکتبۃ الأولی رواہ الدانی فی المقنع ثم قال: ولا مخالف لہ عن علماء الأمۃ. وقال الإمام أحمد: یحرم مخالفۃ خط مصحف عثمان فی واو أو یاء أو ألف أو غیر ذلك'' (الاتقان/ ص ۱۶۷، النوع السادس والسبعون فی رسوم الخط وآداب کتابتہ، سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان)۔

''إن اعتاد القراءۃ بالفارسیۃ أو أراد ان یکتب مصحفا بھا یمنع، وإن فعل فی آیۃ أو آیتین لا'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۱۸۷ زکریا بکڈپو سہارنپور. الکفایۃ شرح الھدایہ ۲/ ۲۲۸، طباعت اول مکتبہ نوریہ سکھر. فتح القدیر شرح الھدایہ

[1] مدرسہ منبع العلوم، خیرآباد، مئو۔

۱/ ۲۲۸ مکتبہ نوریہ سکھر، فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۱۸ ناشر مکتبہ محمودیہ میرٹھ، جواہر الفقہ۱/ ۴۹۰، الاتقان ۲/ ۱۷۱، ھکذا فی امداد الفتاوی۴/ ۴۴، امداد الاحکام/ ص۱۴۸، اتقان علوم القرآن ۲/ ۱٦۷)۔

-غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا حکم تو تفصیل سے آ گیا، رہا رسم عثمانی میں قرآن کو باقی رکھتے ہوئے دوسرے رسم الخط میں بھی لکھ کر دونوں کو ایک ساتھ شائع کرنا بھی درست نہیں ہے، اس لئے کہ طبیعتیں سہولت پسند واقع ہوئی ہیں اور اسی درجہ سے دوسرے رسم الخط کو اختیار بھی کیا گیا ہے، لہذا یہ لوگوں کے اصل قرآن کے پڑھنے پر اور زبان سے ایک حرف کے ادا کرنے پر دس نیکی کی بشارت ہے، اور لکنت کے باوجود پڑھنے پر دوگنا ثواب ہے۔

''والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیه وهو علیه شاق له أجران'' (الحدیث)

اور نفس تلاوت قرآن پر ایفاء اجر اور زیادتی فضل کا وعدہ ہو،

''إن الذین یتلون کتاب الله... لیوفیهم أجورهم ویزیدهم من فضله'' (سورۂ فاطر ۲۹،۳۰)۔

۳-بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

رسم مصحف عثمانی کے علاوہ کسی خط میں قرآن لکھنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ عربی رسم الخط ہی کیوں نہ ہو، اور بریل کوڈ تو کوئی مستقل خط ہی نہیں ہے، بلکہ اشارہ اور کوڈ ہے، لہذا اس میں تو قرآن مجید کی اشاعت بدرجہ اولی ناجائز اور حرام ہوگی، نیز بریل کوڈ میں تیار قرآن اصل قرآن کی طرح نہیں ہے، اس کو بغیر وضو چھونا جائز ہے، البتہ باوضو چھونا بہتر ہے۔

اور یہ سب اس لئے ہے کہ رسم عثمانی توقیفی، الہامی اور لوح محفوظ میں مکتوب قرآن کے مطابق ہے، اس میں قراءت سبعہ متواترہ کا اجتماع ہے، اور اس رسم الخط کا عہد صحابہ سے اب تک بغیر ترمیم و تحریف کے باقی رہنا اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ ارشاد باری ہے: "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون'' (سورۂ حجر: ۹) اور جب باری تعالی نے خود قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور دیگر کتب سماویہ کی حفاظت ان کے حاملین کے ذمہ رکھی، جس کے نتیجے میں وہ ترمیم و تحریف کا شکار ہوگئیں، اور دنیا میں صرف ایک ہی کتاب تحریف سے بری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی قرآن اور رسم عثمانی ہے، اور قرآن الفاظ اور معانی کے مجموعے کا نام ہے، جو کہ رسم عثمانی کے مطابق لکھا ہوا ہے، اس میں ایک حرف اور ایک نقطے کا فرق نہیں آیا، اور نہ تا قیامت آ سکتا ہے، قرآن کی تعریف یہ ہے:

''المنزل علی الرسول، المکتوب فی المصاحف، المنقول إلینا نقلا متواترا بلاشبهة'' (نفحات العبیرا/ ۲۴)۔

''محمود الفتاوی'' (۴/ ۱۵۴) پر مفتی احمد خانپوری صاحب نے بریل کوڈ میں کتابت قرآن سے متعلق سوال کے جواب میں لکھا ہے: قرآن مجید عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرات سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہذا اس کا اتباع واجب ہے اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لئے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے

(محمود الفتاوی: ۴/ ۱۵۴)۔

فتاوی رحیمیہ میں بھی قرآنی رسم الخط کے سلسلے میں تقریبا یہی جواب ہے، اور بہت تفصیلی ہے (فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱٦-۱۷، دارالاشاعت کراچی، پاکستان)، اسی طرح قدیم نصوص فقہیہ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔

بعض لوگ ''الضرورات تبیح المحظورات'' سے استدلال کرکے اجازت دیتے ہیں، لیکن یہ ضرورت میں داخل نہیں ہے، بلکہ تلقی اور سماع کے ذریعہ جیسے پہلے قرآن یاد کیا جاتا تھا، اس دور میں اس کے مقابلے میں سہولت سے یاد کیا جاسکتا ہے، مثلاً کیسٹوں کے ذریعہ سنکر یاد کرنا وغیرہ۔

قدیم نصوص فقہیہ:

۱-''لأن المفهوم من القرآن باللام إنما هو العربي فی عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالی: {فاقرء وا ما

تیسر من القرآن }'' (البحر الرائق ۱/ ۵۳۶، زکریا بکڈپو سہارنپور)۔

۲- ''إنا أنزلناه قرآنا عربيا'' (سورۂ یوسف: ۲)۔

۳-''وإنه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الأمين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين'' (سورۂ شعراء: ۱۹۵، ۱۹۲، مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے: الإتقان فی علوم القرآن ۲/ ۱۶۷، سہیل اکیڈمی لاہور، الإتقان فی علوم القرآن ۲/ ۱۷۱)۔

اسی طرح جن نصوص فقہیہ سے غیر رسم عثمانی میں قرآن لکھنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، ان ہی نصوص سے اس موضوع پر بھی مکمل روشنی پڑتی ہے۔

۴- اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن یا احادیث شریف کے حروف دکھائی دے رہے ہوں تو ان حروف پر بلا وضو ہاتھ رکھنا درست نہیں، لیکن اگر یہ پروگرام بند ہو تو ایسے موبائل کو بلا وضو چھونا منع نہیں۔

''يمنع دخول المسجد (الی قوله) ومسه أي القرآن ولو في لو درهم أو حائط''
(شامی زکریا بکڈپو ۱/ ۴۸۷، موبائل کے مسائل/ ص ۳۳ مفتی سلمان منصور پوری)۔

''ومنها: حرمة مس المصحف لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجد الغير المشرز لا بما هو متصل به هو الصحيح، هكذا في الهداية، وعليه الفتوى، كذا في الجوهره'' (عالمگیری ۱/ ۳۸۹، رشیدیہ کوئٹہ پاکستان)۔

نقوش میں جب تک پڑھے جانے کی صلاحیت ثابت نہ ہو حروف مکتوبہ کے حکم میں نہیں ہیں، اس لئے ان کا مس کرنا محدث وجنب کو جائز ہے، البتہ اگر وہ پڑھے جانے لگیں تو اس وقت دلالت وضعیہ پر لفظیہ کی وجہ سے ان کو حروف مکتوبہ کا دیا جائے گا (امداد الفتاوی ۴/ ۲۴۵، زکریا بکڈپو دیوبند)۔

''ونقل العلامة نوح عن الجوهرة والسراج: أن كتب التفسير لايجوز مس موضع القرآن منها وله أن يمس غيرها بخلاف المصحف؛ لأن جميع ذلك تبع له'' (مراقی الفلاح/ ص ۴۶)۔

''قال ﷺ لاصلوة إلا بوضوء ولا مس المصحف إلا بغلاف عندنا'' (بدائع الصنائع ۱/ ۱۴۰، زکریا بکڈپو دیوبند)۔

''وكذا الوضوء فرض (لمس القرآن ولو آية) مكتوبة على درهم أو حائط لقوله تعالى لايمسه إلا المطهرون وقال بعض مشائخنا: إنما يكره للمحدث مس الموضع المكتوب دون الحواشي؛ لأنه لم يمس القرآن حقيقة والصحيح أن مسها كمس المكتوب ولو بالفارسية يحرم مسه اتفاقا على الصحيح'' (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح/ ص ۴۵ ناشر سليمان مصطفی مامو دمشق ۱۳۸۹ھ)۔

مفتی محمود حسنؒ نے فرمایا کہ ''لايمسه إلا المطهرون'' (سورۂ واقعہ: ۷۹) میں ''لايمسه'' کو اگر خبر مانا جائے تو ''مطهرون'' سے مراد فرشتے ہوں گے، اور اگر اس کو نہی مانا جائے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ قرآن کو بلا طہارت مس نہ کیا جائے، اور امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں اسی کو ترجیح دیا ہے، اور حدیث عمرو بن حزم سے استدلال پیش کیا ہے:

''لا يمس القرآن إلا طاهر فوجب أن يكون نهيه بالآية'' (فتاوی محمودیہ ۷/ ۱۱۸ ناشر مکتبہ محمودیہ میرٹھ ہاپوڑ)۔

مندرجہ نصوص فقہیہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ آیات مکتوبہ دکھائی دینے کی صورت میں اسکرین کو چھونا جائز نہیں ہے، اور اسکرین کے علاوہ موبائل کا پورا ڈھانچہ اس سے علاحدہ ہے، لیکن چونکہ ڈھانچہ کو اسکرین سے الگ نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا وہ قرآن مجید کے کور کی طرح ہو گیا، جس کا چھونا قرآن مانا جاتا ہے، پھر آج کل ٹچ اسکرین موبائل ہوتا ہے، ایسی صورت مین تو بغیر مس کے اسکرین پر حروف آتے بھی نہیں، لہٰذا خلاصہ یہ نکلا کہ موبائل پر آیات مکتوبہ دکھائی دینے کی صورت میں اس کا ایسا ڈھانچہ تصور نہیں کیا جاسکتا جس کو بغیر وضو چھونا جائز ہو، کیونکہ اسکرین سے علاحدہ نہیں ہوسکتا۔

البتہ جب آیات مکتوبہ دکھائی نہ دیں تب اس کو چھوا جاسکتا ہے، لہٰذا بغیر وضو کے موبائل پر آیات مکتوبہ نکالنا جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

متن کے بغیر قرآن مجید شائع کرنے کا حکم

مفتی غلام اللہ کاوی والا[1]

الف-تنہا ترجمہ قرآن (متن قرآن کے بغیر) شائع کرنا جائز ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اپنی کتاب ''کتاب الفتاویٰ'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کتاب کے متن کو نظر انداز کر دیا اور اس کے ترجمہ وتشریح کو مرکز توجہ بنا لیا، اسی لئے فقہاء نے متن قرآن کے بغیر معنی ترجمہ لکھنے کو منع کیا ہے، قرآن مجید کی آیات لکھتے ہوئے ان کے ساتھ ترجمہ لکھنا چاہئے (کتاب الفتاویٰ: ۱/ ۴۷۴)۔

''إن اعتاد القراءة بالفارسية، وأراد أن يكتب مصحفا بها يمنع'' (ردالمحتار ۱/ ۳۵۹)۔

مجوزین کی دلیل کہ ان میں مصارف کم آتے ہیں، کم مصارف سے زیادہ مضرت ''تحریف قرآن'' کا خطرہ ہے، اور فقہاء نے قاعدہ بتلایا ہے: ''البليتان فاختر ماهو أيسرهما'' سمجھ دار بھی اپنی روزمرہ زندگی میں دو مصیبتوں میں گرفتار ہو، اس سے دستگاری ممکن نہ ہو، کوئی بھی صورت اختیار کریں تو دو ضرر میں سے کوئی ایک ضرر میں ضرور مبتلا ہوگا، تو وہ بھی اقل ضرر والی صورت اختیار کرے گا، تحریف قرآن اشد ضرر ہے جبکہ کثرت مصارف قابل برداشت اقل ضرر ہے۔

مجوزین کی دوسری دلیل: جو لوگ متن قرآن نہیں پڑھ سکتے ہیں انہیں، متن کے ساتھ ترجمہ والا قرآن دینے سے کیا فائدہ؟

مفتی شفیع صاحبؒ نے ''جواہر الفقہ'' میں تحریر فرمایا ہے، پہلے ایک بات بطور مقدمہ سمجھ لی جائے، پھر اس سے سب سوالات کے جواب آسان ہو جائیں گے۔

وہ یہ ہے کہ باجماع صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے، اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے، اور خصوصا کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس سے کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا کھلی تحریف ہے، جس کو کوئی ملحد بھی صراحۃ تجویز نہیں کر سکتا۔

الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا، بلکہ تقریبا تیرہ سو برس پہلے پہنچا ہوا ہے اور عجمیوں کو عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات آج پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اسی وقت سے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو اُس وقت مشکلات زیادہ ہونی چاہئے کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی پھر ان میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے خصوصا قرآن پڑھانے والا کوئی عرب ہی ہو سکتا تھا، جس کا ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر بستی میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا، لیکن ان سب مشکلات مزعومہ کے باوجود صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ جائز نہیں کیا کہ قرآن کو ملکی رسم الخط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جاوے، بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم الخط کی بھی مصحف عثمانی کے موافق حفاظت کرنا ضروری سمجھا اور ان مشکلات کو حفاظت مذکورہ کے مقابلے میں ناقابل التفات قرار دیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ میں دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات محض خیالی تھیں۔

خداوند تعالی نے قراءت قرآن کے آسان کر دینے کا کھلے لفظوں میں جو خود اعلان فرمایا ہے: ''ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر'' (سورۂ قمر: ۱۷، ۲۲) اس کا مشاہدہ سب کی آنکھوں کے سامنے آ گیا، کہ ہر ملک ہر زبان والے قرآن کو ایسا پڑھنے لگے کہ اپنی اپنی مادری

---

[1] دارالافتاء دارالعلوم عربیہ، کنتھاریہ، بھروچ، گجرات۔

زبانوں کی کتابوں کو ایسا نہیں پڑھ سکتے، انہیں اہل عجم میں سینکڑوں ایسے حضرات ہوئے جو تجوید قرآن اور دیگر علوم قرآنیہ کے امام مانے گئے۔

الغرض اول تو یہ مشکلات محض خیالی ہیں، ان کو مشکل تسلیم کرنا ہی غلطی ہے اور بالفرض تسلیم بھی کیا جائے تو ہر مشکل کا ازالہ ضروری نہیں، یوں تو نماز و روزہ وغیرہ ارکان اسلام سب ہی کچھ نہ کچھ اپنے اندر مشقت رکھتے ہیں۔

الغرض صحابہ کرام وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ جس طرح قرآن کریم میں زبان عربی کی حفاظت ضروری اور لازم ہے، کسی عجمی زبان میں بدون قرآنی عبارت کے قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم خط کی حفاظت بھی ضروری ہے، کسی دوسرے رسم خط میں ان کا لکھنا جائز نہیں، کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے، جو باجماع امت حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے، اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط مین اگر چہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں، مثلا اول سورت میں ''بسم اللہ'' بحذف الف لکھا ہے، اور ''اقرء باسم ربک'' میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے، گرچہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں، مگر باجماع امت اسی کی نقل واتباع کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟۔

مضمون مذکور کے شواہد، اصول تفسیر اور تفسیر کی کتب میں بے شمار ہیں، ان میں سے چند بقدر ضرورت لکھے جاتے ہیں۔

علامہ سیوطیؒ نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں رسم خط قرآنی اور کتاب قرآنی کے آداب پر مستقل فصل (النوع السادس والسبعون) رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے:

''وقال اشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف علىٰ ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا علىٰ الكتبة الاولىٰ. رواه الداني في المقنع. ثم قال: ولا مخالف له من علماء الامة''۔

اس کے بعد لکھا ہے:

''وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو الف أو غير ذلك'' (الاتقان ۲/۱۶۷)۔

''وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا. فإنهم كانوا أكثر علما و أصدق قلبا و لسانا و أعظم أمانة منا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم...''۔

اس کے چند صفحات کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي، قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء، قال: ويحتمل الجواز، لأنه قد يحسنه من يقرأه بالعربية والأقرب المنع كما تحرم قرائته بغير لسان العرب ولقولهم القلم أحد اللسانين والعرب لاتعرف قلما غير العربي، وقد قال تعالى: { بلسان عربي مبين } '' (اتقان ۲/۱۷۱)۔

الغرض سلفا وخلفا کسی فقیہ سے (متن قرآن کے بغیر) ترجمہ یا قرآن کا متن مصحف عثمانی رسم الخط کے سواء کے جواز کا قائل ہو، اور آج بھی مابین المشرق والمغرب کے فقیہ سے جواز کا علم ہوا ہو یہ ہماری اطلاع میں نہیں ہے۔

ب- اگر یہ اشاعت ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے، اور ہدیہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

یہ اشاعت حرام ہے مفصلا بالا عبارتوں سے واضح ہے، جواہر الفقہ میں مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، جیسا کہ روایات ذیل میں ان کا ناجائز وحرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ

ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گنہگار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا'' (جواہر الفقہ: ۱/ ۹۷)۔

"ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (سورۂ نساء: ۸۵)۔

حدیث شریف میں ہے: ''الدال على الخير كفاعله. تعرف الأشياء باضدادها'' کے مطابق ''الدال على الشر كفاعله بھی ہوگا۔

نیز حدیث میں ہے: ''من عمل عملا صالحا فله أجرها وأجر من عمل بها، ومن عمل عملا سيئا فله وزرها ووزر من عمل بها'' (الحدیث)۔

نیز نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ اہل باطل خصوصاً غیر مسلم پھر خصوصاً اہل کتاب کے تشبہ کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے۔

حدیث شریف میں ہے: ''من تشبه بقوم فهو منهم'' (ابوداؤد کتاب اللباس/ ۵۵۹)

وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ ہونے کو کفار میں شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا ہے۔

دوسری حدیث: ''لتركبن سنن من كان قبلكم'' (ترمذی ۲/ ۱۴۱ ابواب الفتن) میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا ہے، اور بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے امر میں جو عرفاً وعادۃً ان کے خصائص میں سے ہے، سواول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہوتا کہ تشبہ فی الامر الدنیوی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے۔

حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت "يا ايها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطن" (سورۃ البقرۃ: ۲۰۸) نازل ہونا اور رسول اللہ ﷺ کا تبتل اور ترہیب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے، مشکوۃ کتاب النکاح وکتاب الاعتصام ''لا تشددوا على أنفسكم'' (مشکوۃ شریف، باب الاعتصام ص/ ۳۱) اور اس میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے (جواہر الفقہ)۔

فقہ کی کتابوں میں اس کی ممانعت پر صراحۃ عبارات موجود ہیں، ابن ہمام فتح القدیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''وفي الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها. يمنع. فإن فعل آية أو آيتين لا. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف و ترجمته جاز'' (فتح القدیر ۱/ ۲۴۸ باب صفة الصلاة)۔

علامہ ابن ہمام کی عبارت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے، ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ لکھنا حرام ہے، نیز اصل قرآن کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

جواہر الفقہ میں ہے:۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) اور فقہاء نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جائے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ ص/ ۱۱۲ تا ۱۱۵، کتاب الفتاوی ۱/ ۷۸ ۴، فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۵۸، جواہر الفقہ ۱/ ۲۴)۔

ج- غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا کیا حکم ہے؟

قرآن کریم نام ہے، اور علم ہے، خاص اس کلام الٰہی کا جو عربی زبان میں بذریعہ جبرئیل علیہ السلام جناب رسول اللہ ﷺ پر منجانب خدا نازل کیا گیا ہے، اور تلاوت کیا گیا ہے، اور اس کے تمام کلمات وحروف زیر زبر، مدولین، جزم وتشدید وغیرہ سب ہی چیزیں متعین ومعلوم ہیں، اس کا رسم الخط بھی علاحدہ ومتعین ہے، ایک خاص انداز سے مکتوب ہے، اس کا نطق، تکلم بھی نرالی شان رکھتا ہے، ان تمام کیفیات وخصوصیات کے ساتھ لوح محفوظ

میں موجود محفوظ ہے، اور اس کے تمام احکام الگ وممتاز ہیں، اس کو کسی شخص کا بغیر طہارت چھونا بھی جائز نہیں، چنانچہ ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"الم تلك آيات الكتاب المبين، إنا انزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون" (سورۂ یوسف: ۲)۔

اور ایک مقام پر اس طرح مذکور ہے:

"إنه القرآن كريم في كتاب مكنون، لا يمسه إلا المطهرون، تنزيل من رب العالمين" (سورۂ واقعہ: ۸۰،۷۷)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: "بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ" (سورۂ بروج: ۲۱،۲۲)۔

ان آیات کریمہ، نیز دوسرے محققین کے کلام وروایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں (قرآن پاک کے کلمات وحروف زیر و زبر وغیرہ) امور توقیفی ہیں، ان میں ایک زبر و زیر، بلکہ ایک نقطہ کی بھی کمی وبیشی جائز نہیں۔

اور ان قرآ توں کے علاوہ جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں کسی نوع کا تغیر وتبدل جائز نہیں ہے، اگرچہ عربی زبان اور عربی عبارت باقی رہے، پھر ایسی تبدیلی وتغیر جس میں عربی زبان یا عربی رسم الخط وغیرہ تک متغیر ومتبدل ہو جائے، کب اور کیوں کر درست ومباح ہو سکتا ہے۔

"وفي الاتقان للسيوطي لم يجوز أحد من الأئمة الأربعة كتابة القرآن بغير العربيه"

لہذا ہندی یا انگریزی، بنگلہ، برمی یا چینی رسم الخط غرض کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن شریف کو لکھنا، جس میں قرآنی رسم الخط وتلفظ وادا کی خصوصیات محفوظ نہ رہیں، پھر اس کو اس زبان کی طرف منسوب کر کے ہندی قرآن یا انگریزی قرآن یا بنگلہ یا برمی یا چینی قرآن کہنا قرآن کریم وکلام الٰہی کی توہین وتحقیر ہے، اور تحریف کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، لہذا مصحف عثمانی کے رسم الخط کے سواء کی بالکل اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔

د- موبائل پر قرآن:

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن کے حروف دکھائی دے رہے ہوں تو ان حروف (اسکرین پر) بلا وضو ہاتھ رکھنا درست نہیں، لیکن یہ قرآن اسکرین پر نہ ہو تو چھونے میں کوئی حرج نہیں۔

"يمنع مسه القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط، ولكن لايمنع إلا من مس المكتوب بخلاف المصحف فلا يجوز مس الجلد وموض البيا من منه" (شامی ۱/ ۳۲۳)۔

"ويكره مس الدرهم واللوح إذا كان فيهما كتابة شي من القرآن" (زیلعی ۱/ ۱۶۶)۔

"المحدث لايمس المصحف ولا الدرهم التي كتب عليهم القرآن" (الفتاوی التاتارخانیہ ۱/ ۲۷۰)۔

"ويحرم مس المصحف كله أو بعضه أى مس المكتوب منه، ولو آية على نقود (درهم ونحوه اوجدار، كما يحرم مس غلاف المصحف المتصل به، لأنه تبع له وكان مسه مس للقرآن" (الفقه الاسلامی وادلته ۱/ ۲۹۶)۔

ھ- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ قرآن نظر سے نہیں گذرا، نیز حقیقت وکیفیات سے واقف نہیں بالا معلوم ہو چکا کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کے سواء اور رسم الخط کی بالکل اجازت نہیں ہے، چاہے عربی ہی کیوں نہ ہو، اگر مصحف عثمانی کے رسم الخط ہے تو جواز میں کوئی شبہ نہیں، اگر حروف ابھرے ہوئے ہوں تو عدم جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، نیز بے وضو مس نہ کریں، احوط یہی ہے۔



بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا عبید اللہ ندوی [1]

قرآن پاک کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے، چنانچہ ''فتح القدیر'' میں علامہ کمال بن الہمام تحریر فرماتے ہیں:

''وفي الكافي: إن اعتاد القرأة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القران وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (فتح القدير ا/ ۲۴۸،۲۴۹)

(اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی آدمی فارسی میں تلاوت کی عادت بنائے یا فارسی میں (قرآن) لکھنے کا قصد کرے تو اس کو منع کیا جائے گا اور روک دیا جائے گا، ہاں! اگر ایک دو آیت کرے تو منع نہیں کیا جائے گا، اور اگر قرآن شریف کے الفاظ بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے)۔

علامہ ابن ہمام کی اس عبارت سے اس تفصیل کی صراحت ہوگئی کہ فارسی (یا کسی عجمی) زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں ہے، بلکہ پورا قرآن یا اس کا معتدبہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ وتفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی ممنوع نہیں ہے۔

اور درمختار میں ہے:

''وتجوز كتابة آية أو آيتين بالفارسية لا أكثر (قال الشامي) والظاهر أن الفارسية غير قيد'' (درمختار ا/ ۳۵۲)

(قرآن مجید کی ایک دو آیت کی کتابت تو فارسی زبان میں جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں، علامہ شامیؒ اس پر لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے اس میں فارسی زبان کی کوئی قید نہیں (بلکہ مطلق عجمی زبان مراد ہے فارسی، ہندی، اردو وغیرہ)۔

اور کفایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''قال الإمام المحبوبي... أما لو اعتاد قرأة القرآن، أو كتابة المصحف بالفارسية منه يمنع أشد المنع''۔

اس کے بعد آگے لکھتے ہیں: '' وكان الشيخ أبوبكر محمد بن الفضل يقول: أما من تعمد ذالك يكون زنديقًا، أو مجنونًا. فالمجنون يداوى الذنديق يقتل''

(کہ شیخ محمد بن فضل فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص عمدًا ایسا کرتا ہے وہ یا تو زندیق ہے یا مجنون ہے، اگر مجنون ہے تو اسکا علاج کیا جائے اور اگر زندیق ہے تو قتل کردیا جائے)۔

ممانعت کی وجوہات:

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اردو ترجمہ بغیر عربی متن کی اشاعت کے متعلق ایک تفصیلی فتوی تحریر فرمایا ہے جس میں اس کی ممانعت اور حرمت کی تقریبا دس وجوہات بیان کی ہیں، جن میں سے چند اختصار کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

---

[1] استاذ حدیث وادب دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

۱- کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً وعادۃً ان کے خصائص میں سے ہے سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے، پھر خاص طور سے تشبہ بأمر الدین تو اشد ہے۔

۲- ''خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے۔

۳- اور مثلاً یہ مفسدہ ہوگا کہ حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلاوضو مس کرنا جائز نہ ہوگا، جیسا کہ ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

''إذا کتب تفسیر القرآن بالفارسیة عند أبي حنیفة رحمه الله تعالی یکره مسه للحائض والجنب'' (فتاوی عالمگیری ۱/ ۸۶)

(اگر کسی نے قرآن کریم کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی تو امام صاحب کے نزدیک حائضہ اور جنبی کے لئے اس کا چھونا مکروہ ہے)

آگے لکھتے ہیں: ''ولقرأة السجدة بالفارسیة علی قول علی حنیفة رحمه الله تعالی یجب علیه وعلی من سمعها السجدة علم السامع انها آیة السجدة أو لم یعلم وعلی التالي أن یخبر السامع أنها آیة السجدة'' (حوالہ سابق/ ص ۸۶،۸۷)

(اگر کسی نے فارسی زبان میں آیت سجدہ تلاوت کی تو امام صاحب کے نزدیک تلاوت کرنے والے اور سامع دونوں پر سجدہ واجب ہوگا چاہے سامع کو یہ معلوم ہو کہ یہ آیت سجدہ ہے یا نہ معلوم ہو، اور تلاوت کرنے والے پر ضروری ہے کہ وہ سامع کو بتائے کہ یہ آیت سجدہ ہے)

اور یہ یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمہ کو عام کتب کی طرح ایک کتاب سمجھیں گے اور ہرگز اس کے مس کے لئے وضو کا اہتمام نہ کریں گے۔

۴- ترجمہ مع عربی متن کے شائع کرنے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ اسی بہانہ سے کچھ قرآن بھی پڑھ لیں گے اور اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہونچتا اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جائیں گے اور اصل نظروں سے غائب ہوگی تو اس وقت یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا، بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے یہ تو اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے کر آپس میں لڑیں گے۔

۵- اہل زیغ وباطل کو غلط ترجمہ اور تفسیر کا موقع ملے گا، کیونکہ ہر دیکھنے والے حافظ نہیں ہوتے اور اصل کی طرف مراجعت بروقت آسان نہیں ہوتی۔

۶- غیر عربی زبان مثلاً اردو، فارسی، ہندی، گجراتی وغیرہ میں قرآن شریف لکھنا اس کے معجزہ نہ ہونے کا وہم پیدا کرتا ہے، نیز قرآن کریم میں کلام کی ترتیب بھی معجزہ ہے جو دوسری زبان میں ظاہری بات نہیں رہ سکتی ہے، مثلاً مضاف ومضاف الیہ موصوف وصفت وغیرہ کہ عربی میں مضاف اور موصوف پہلے آتے ہیں پھر مضاف الیہ اور صفت بعد میں، جبکہ اردو میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قائلین جواز کے دلائل کا جائزہ:

مجوزین اس کے جواز کی تائید میں جو باتیں کہتے مثلاً خرچ کم آنا، وہ زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوتی ہیں، کیونکہ صرفہ کم کرنے کے لئے قرآن میں تحریف کا دروازہ نہیں کھولا جاسکتا ہے، نیز اگر متن کے ساتھ شائع کرنے میں زیادہ صرفہ آتا ہے تو دنیا میں بہت سے اہل خیر ہیں جو اس کو برداشت کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں، لہذا یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔

رہ گئی بات یہ کہ جو لوگ عربی نہیں پڑھ سکتے ہیں ان کو عربی سیکھنے اور پڑھنے کی تاکید کی جائے، عربی زبان کے فضائل بیان کئے جائیں، کیونکہ بعض ائمہ کے نزدیک عربی زبان سیکھنا فرض ہے، نیز جب ترجمہ مع عربی متن ہوگا تو اسی بہانے پڑھنے کا شوق بھی ہوگا اور الفاظ کی شد بد ہوگی، البتہ غیر مسلموں کو قرآن دینے میں اس کی بے حرمتی کا مسئلہ ضرور ہے، لیکن قرآن کو تحریف سے بچانا اس سے زیادہ ضروری ہے اور فقہ کا اصول ہے:

''درأ المفاسد أولی من جلب المصالح'' (مفاسد کو روکنا منافع کے حصول سے زیادہ بہتر ہے)۔

نیز قرآن کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانے کے اس کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں ان کو اختیار کیا جائے مثلاً کانفرنسیں اور سمینار منعقد کئے جائیں اور اس میں خاص طور پر پڑھے لکھے غیر مسلموں کو مدعو کیا جائے اور انہیں سمجھایا جائے کہ قرآن کیا کہتا ہے، نیز افراد اور جماعتیں تیار کی جائیں جو غیر

مسلموں سے ملاقاتیں کریں اور قرآن وحدیث کے پیغام انہیں سنائیں، میرے خیال میں یہ طریقہ زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہوگا، کیونکہ بغیر متن کے قرآن دینے میں علامۃ دیکھا گیا ہے کہ لوگ اسے لے تو لیتے ہیں، مگر اکثریت اسے پڑھتی نہیں ہے۔

بغیر متن کے صرف ترجمہ والے قرآن کی خرید وفروخت، ہدیہ اور مس کا حکم:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) (اور گناہ وزیادتی کے کاموں پر ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو)، اور فقہاء کرام نے اس قاعدہ پر تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کے لئے بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے نہ دیں تو مانگنے والا چھوڑ دے، اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت (ہدیہ) تو ایسے تراجم کا سلسلہ خود بخود بند ہو جائے گا اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا، ہدیہ میں قبول کرنا ایک امر ناجائز کی اعانت ہوگی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (حوادث الفتاوی ۲/ ۱۵۶)۔

نیز بلا وضو اس کو چھونا مکروہ ہوگا، جیسا کہ فتاوی ہندیہ کی عبارت سابق میں گذر چکی ہے، نیز ائمہ شافعیہ کے شیخ علامہ شمس الدین نے لکھا ہے:

"أنه إذا کتب بغير العربية هل يحرم مسه وحمله أولا. الأظهر في الجواب نعم إذ لا يخرج بذلك عن كونه قرآنا وإلا لم تحرم كتابته" (جواهر الفقه ۱/ ۱۰۳)

(اگر عربی زبان کے علاوہ کسی زبان میں لکھ لیا جائے تو اس کا بے وضو چھونا اور اٹھانا حرام ہوگا یا نہیں، تو جواب میں زیادہ ظاہر یہی ہے کہ ہاں، کیونکہ اس عمل سے وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہوگا ورنہ پھر تو اس کا لکھنا ہی حرام نہ ہوگا)۔

بریل کا تعارف: بریل کیا ہے؟

بریل ایک قسم کا ذریعہ ابلاغ ہے جو نسبۃً موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نابینا افراد عموماً انگلیوں کے پوروں کے لمس سے اسے پڑھتے ہیں، یعنی جو کام بینا افراد اپنی نگاہوں سے لیتے ہیں وہ کام بینائی سے محروم افراد انگلیوں کے پوروں کے لمس سے لیتے ہیں، بریل کوڈ (Brail Code) چھ نقطوں پر مبنی ہوتا ہے، یہ ان کے لئے تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، ان چھ نقطوں کے مختلف نمونے نشانات اور شکلوں کی تبدیلی سے بنتے ہیں اور وہ مختلف حروف، الفاظ، حروف علت، حرکات اور علامتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، ان چھ نقطوں سے 63 مختلف شکلیں بنائی جاسکتی ہیں، بریل اپنے بانی لوئس بریل کے نام سے موسوم ہے جو 1842ء میں متعارف ہوا۔

العمیدی کا حصہ:

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک نابینا عرب مسلم علی بن یوسف بن خضر العمیدی متوفی ۱۳۱۴ھ نابینا لوگوں کے لئے چھو کر پڑھنے کے سب سے پہلے نظام کے موجد وبانی ہیں، اور یہ لوئس بریل کے ذریعہ بریل کے طریقہ کے ایجاد ہونے کے چھ سو سال قبل کا واقع ہے۔

بریل علامات کا استعمال:

بریل علامات زبان وادب کے اظہار کے موقع پر حروف کے لئے استعمال ہوتی ہیں اور حساب کرتے وقت یہی علامات نمبرات کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، نیز کمپیوٹر اور سائنس کے مطالعہ کے دوران یہ علامتوں اور اکائیوں وغیرہ کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔

چونکہ بریل ایک قسم کے کوڈ پر مبنی ہے، اس لئے کسی بھی زبان کے حروف کو بریل میں منتقل کرنا ممکن ہے، بنیادی کوڈ کو "گریڈ ون" بریل کہا جاتا ہے، مذکورہ بریل حروف عام حروف ہجاء کا بدل ہیں، عملی طور پر زیادہ تر بریل استعمال کرنے والے "گریڈ ٹو" استعمال کرتے ہیں، یہ شارٹ ہینڈ یا مخففات کی ایک شکل ہے جس نسبتاً تیز لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، گریڈ ٹو میں کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور وہ نسبتاً کم ضخیم ہوتی ہیں۔

عربی بریل کوڈ:

اس وقت اہل الجبیر یا بالکل مختلف عربی بریل کوڈ کو اختیار کرتے ہیں، حالانکہ عرب ممالک کی اغلبیت مشہور عربی بریل کوڈ کی علامتوں کو اختیار

کرتے ہیں جو بحرین سے وابستہ ہے اور سب سے تازہ ترین کوڈ ریاض میں ۲۰۰۲ء میں اختیار کیا گیا، نیز اس وقت دنیا بھر کے مختلف اداروں کے درمیان جو قرآن پاک کو طبع کرواتے ہیں، قرآن کریم کے لئے متفقہ عربی بریل کے سلسلے میں کوئی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا ہے۔

عربی حروف تہجی ۲۸ /حروف پر مشتمل ہے، عربی بریل میں آٹھ حروف زائد ہیں، جس سے یہ تعداد ۳۶ تک پہنچ جاتی ہے۔

بریل رسم الخط ہے یا کوڈ:

بریل رسم الخط نہیں ہے، کیونکہ کسی رسم الخط کی طرح اس میں شوشے اور گھماؤ پھراؤ نہیں ہوتے ہیں، بریل کو دیکھنے سے نقطے نظر آئیں گے، بریل ابتداء میں جنگ کے دوران میدان جنگ میں ذریعہ ابلاغ کے طور پر ترتیب دیا گیا تھا۔

بریل اور رسم الخط میں فرق یہ ہے کہ رسم الخط مرئی، یعنی قابل مشاہدہ ہوتا ہے اور یہ بینا لوگوں کے لئے ہوتا ہے اسے دیکھا جا سکتا ہے، اس کے برخلاف بریل نقطوں کا ایک کوڈ ہے جسے نابینا لوگوں کے لئے تشکیل دیا گیا ہے، ان لوگوں کے لئے جو پڑھنے کے لئے قوت لمس کا سہارا لیتے ہیں، بریل دیکھ کر پڑھنے کے لئے نہیں مرتب کیا گیا ہے، بلکہ یہ چھو کر پڑھنے کے لئے بنایا گیا ہے، ایک نابینا شخص کے لئے ابھرے ہوئے نقطوں کا پہچاننا اور محسوس کرنا آسان ہے، ایک نابینا شخص پرنٹ شدہ نقطہ کو محسوس نہیں کر سکتا، بینا شخص کے لئے نظروں سے پڑھے جانے والے رسم الخط کو اندھیرے میں پڑھنا ممکن نہیں ہے، جبکہ ایک نابینا شخص بریل (Brail) اندھیرے میں بھی پڑھ سکتا ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت کا حکم:

دور قدیم میں نابینا افراد کی تعلیم کا طریقہ صرف زبانی تلقین کا تھا، بصارت سے محرومی کی بنا پر ان کے لئے یہ بات متصور نہیں تھی کہ وہ لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھیں، لیکن قریبی ایک دوصدی میں اس کے لئے مخلصانہ کوششیں ہوئیں کہ بینائی سے محروم افراد کی تعلیم کے لئے پیش رفت کی جائے، چنانچہ بریل کوڈ ایجاد کیا گیا، اور رفتہ رفتہ بریل کوڈ میں کتابیں تیار ہوگئیں رسالے نکلنے لگے اور نابینا افراد کے پڑھنے لکھنے کی ایک وسیع دنیا کھل گئی، نابینا افراد کے لئے اس پیش رفت کو اسلام نہ صرف پسند کرتا ہے، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی بھی کرتا ہے، لیکن جہاں تک بریل میں قرآن شریف تیار کرنے کی بات ہے تو انتہائی غور وخوض کے بعد اس کوتاہ بیں، کم علم کو جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ مندرجہ ذیل وجوہات سے بریل میں کتابت و طباعت قرآن کی اجازت نہیں ہونی چاہئے:

۱- امت نے کتابت قرآن کے لئے رسم عثمانی کی شکل میں جو معیار متعین کیا ہے اسکے خلاف ہے۔

۲- دیگر امور میں یہ پیش رفت یقینا قابل قدر ہے، مگر قرآن شریف میں مناسب معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ نابینوں کا یہ مسئلہ نیا نہیں، بلکہ پرانا ہے اور صدر اول سے لے کر آج تک لاکھوں نابینا حفاظ ہوئے ہیں، جبکہ بریل کا وجود بھی نہیں ہوا تھا میرے خیال میں اس پہلے طریقہ حفظ کا نہ کوئی بدل ہے اور نہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش ہے۔

۳- بریل کوڈ کا معاملہ بڑا نازک اور سنگین ہے ذرا سی چوک سے کچھ کا کچھ ہو سکتا ہے ایک واحد زائد نقطہ یا کسی نقطہ کی کمی لفظ کے معنی ومفہوم تبدیل کردیتی ہے۔

۴- مختلف بریل میں پاروں کی تقسیم میں اختلاف ہے مثلاً عرب بریل قران میں ساتواں پارہ 'إذا سمعوا' (سورۂ مائدہ: ۸۳) کے 'لتجدن أشد الناس' (سورۂ مائدہ: ۸۲) سے شروع ہوتا ہے جو صحیح نہیں، اور مصحف عثمانی کے خلاف ہے۔

۵- بریل کوڈ میں مکتوب قرآن نقطوں پر مبنی ہے، حالانکہ قرآن کریم کے الفاظ معجزہ ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالی نے کفار کو تحدی کی تھی، نیز بریل قرآن کو قرآن کہنا بھی درست ہے یا نہیں؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔

۶- بریل علامت تلفظ کی نمائندگی کرتی ہے نہ کہ رسم الخط کی، اور بریل میں حروف کے تلفظ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، حروف کے رسم الخط کو نہیں، جبکہ قرآن کے لئے تلفظ اور رسم الخط دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔

۷- بریل کے سلسلہ میں ابھی تک کوئی متفقہ رائے نہیں پائی جاتی ہے، مختلف ممالک کے مختلف انداز میں۔

۸- عربی دائیں طرف سے لکھی اور پڑھی جاتی ہے جبکہ بریل قران میں دونوں کام الٹی سمت سے ہوتے ہیں جو خلاف حدیث "إن اللّٰہ یحب التیامن في کل شيء حتی التنعل والترجل" (نصب الرایہ ۱/ ۳۴، بخاری کتاب الصلاۃ، باب التیمن فی دخول المسجد وغیرہ رقم: ۴۲۶) کے خلاف ہے۔

۹- عربی بریل کے طرز تحریر میں باہم کافی فرق پایا جاتا ہے حتی کہ قرآن میں لفظ "اللہ" لکھنے میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔

۱۰- بریل میں اگر ہم "الف" کی آواز کے بدلے میں عثمانی رسم الخط کے ضابطہ کے مطابق "واؤ" لکھیں تو یہ الفاظ نابینا قاری کے ذریعہ غلط تلفظ کے ساتھ ادا ہوں گے، اس سے بچنے کے لئے "الصلوۃ"، "الزکوۃ" وغیرہ الفاظ "الف" کے ساتھ "الصلاۃ"، "الزکاۃ" لکھے جاتے ہیں، جو رسم عثمانی کے خلاف ہیں۔

۱۱- اور آخری بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالی بندے سے کوئی نعمت سلب کرتے ہیں تو اس کا بدل ضرور عطا فرماتے ہیں، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ نابینا افراد کا حافظہ عموماً تیز ہوتا ہے جو چیز ایک بار یاد کرلی وہ محفوظ ہوجاتی ہے، اس لئے احتیاط اسی میں رہے کہ وہی پرانہ طریقہ ہی ان کے حفظ کے لئے باقی رکھا جائے، تاکہ قرآن محفوظ رہے، اور تحریف کا دروازہ نہ کھلے۔

موبائل پر قرآن مجید کے مسائل واحکام:

لکھی ہوئی آیات قرآنیہ کو ناپاکی کی حالت میں چھونا درست نہیں، اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے، البتہ ایسی اشیاء جو بظاہر تحریر نہیں ہیں، مثلاً کیسٹ وغیرہ تو مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کو بے وضو بھی چھونے کی اجازت دی ہے، اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ "قرآن کی آواز" ہے اور قرآن کی آواز کے جسم سے مس ہونے کے لئے پاکی ضروری نہیں ہے، ورنہ تو جنبی کے لئے قرآن کا سننا بھی درست نہیں ہوتا (امداد الفتاوی ۱/ ۱۴۵)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے مولانا تھانویؒ کا قول نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

"لیکن مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ "قرآن" کو چھونے کی ممانعت کا اصلی سبب اس کا "مکتوب ہونا" نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا احترام ہے، یہ تحریر الفاظ قرآنی کا نقش ہے۔ جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح "کیسٹ" آواز قرآنی کا نقش ہے جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے، اس لئے اگر کاغذ کا احترام واجب ہو جن میں الفاظ محفوظ کئے گئے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان فیتوں کا احترام واجب نہ ہو جن میں قرآن کی آواز کو محفوظ کیا گیا ہو۔ اس لئے آیات قرآنی کے کیسٹ بھی بلا وضو چھونا مناسب نہیں، اور کم سے کم احتیاط کے خلاف ہے۔ جنبی کے لئے سماعت قرآن کے جائز ہونے سے استدلال محل غور ہے، اس لئے کہ قرآن مجید سننے میں سننے والے کے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ آواز بے اختیار اس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے برخلاف کیسٹ چھونے میں خود چھونے والا اپنے اختیار سے یہ کام کرتا ہے، البتہ فیتہ کے اوپر جو پلاسٹک کا کیس ہے اس کی حیثیت غلاف کی ہوگی اور اس کے ساتھ چھونے میں مضائقہ نہیں (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۳)۔

☆☆☆

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت

مولانا محمد اقبال قاسمی[1]

جو لوگ قرآن پاک کی عبارت کو عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے یا اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کے لئے متن قرآن کو ان کی زبان ہندی، انگریزی وغیرہ کے رسم الخط میں لکھنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے بچنا ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، یہ رسم الخط منزل من اللہ ہے، تو اتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرأت سبعہ وغیرہ سب شامل ہیں اور ساری قرأتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی ہندی، انگریزی اور دیگر رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے کاتبین وحی سے وحی قرآنی لکھواتے اور ہر لفظ کا رسم الخط کاتب وحی کو تعلیم فرماتے جس کا علم آپ کو وحی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا، اور یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے حضرت زید بن ثابتؓ سے لیا اور جب خلیفہ اول کے زمانہ میں جمع قرآن کا فیصلہ ہوا تو حضرت زید بن ثابت سے یہ کام لیا گیا اور جب حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں اس کی تدوین کا ارادہ کیا تو یہ عظیم الشان کام حضرت زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا، جبکہ اس وقت میں پچاس ہزار صحابہؓ موجود تھے، لہذا اس مصحف عثمانی کے رسم الخط کے خلاف کرنا جائز نہیں، چاروں ائمہ اس رسم الخط کو لازم قرار دیتے ہیں، ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں علامہ جلال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں:

''امام احمدؒ نے فرمایا کہ واؤ، یا اور الف وغیرہ کے بارے میں مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے، بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں بیان کیا ہے کہ جو شخص مصحف کو لکھے اس کے لیے سزاوار ہے کہ وہ انہی حروف تہجی کی حفاظت کرے جس کے ساتھ صحابہؓ نے ان مصاحف کو لکھا ہے اور اس میں ان سے اختلاف نہ کرے اور ان کی لکھی ہوئی چیز میں سے کسی شئی کو متغیر نہ کرے اور اس واسطے کہ وہ لوگ بہ نسبت ہمارے زیادہ علم رکھتے تھے، ان کے قلوب اور ان کی زبانیں بہت ہی صادق تھیں'' (الاتقان فی علوم القرآن مترجم ۲/ ۴۰۸)۔

''فتاوی رحیمیہ'' میں مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اس مصحف عثمانی کے رسم الخط کے خلاف کرنا جائز نہیں، چاروں ائمہ اس رسم الخط کو ضروری جانتے ہیں، ارشاد ہے:

"إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹) مذکورہ ارشاد میں صرف الفاظ قرآن کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ الفاظ، معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا وعدہ اور پیشن گوئی ہے، لہذا اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے (فتاوی رحیمیہ ۱/ ۹۸)۔

حدیث پاک میں ہے: "علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین" (ابوداؤد باب لزوم السنہ حدیث نمبر: ۴۶۰۷، ترمذی کتاب العلم حدیث نمبر ۲۶۷۶، ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۲) (کہ تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع لازم ہے) اور مصحف عثمانی کے رسم الخط کی اتباع میں سنت نبوی اور خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع ہے اگر اس رسم الخط کی اتباع لازم نہیں ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے کاتبین وحی سے قرآن کی کتابت نہیں کراتے اور نہ خلفائے راشدین حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی کو جمع قرآن اور تدوین قرآن کا حکم دیتے، لہذا اس رسم الخط کی خلاف ورزی سنت سے انحراف ہے، اور جب رسم عثمانی کی مخالفت جائز ہی نہیں تو پھر یہ بھی درست نہیں کہ غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن شائع کیا جائے، یا رسم عثمانی کے ساتھ دوسری زبان کے رسم الخط میں، ہاں عربی رسم الخط کے قریب اردو اور فارسی رسم الخط ہے، لہذا اگر کسی نے آیت قرآنی اردو رسم الخط میں لکھا تو اس سے مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مکمل خلاف ورزی

[1] شکر پور بھروارہ، دربھنگہ بہار۔

لازم نہیں آتی لیکن احوط اور انسب یہی ہے کہ عربی رسم الخط ہی میں قرآن یا اس کی سورتیں لکھی جائیں، تاکہ اول وہلہ میں معلوم ہوجائے کہ یہ قرآن ہے اور کلام الٰہی اور دوسرے کے کلام میں امتیاز اور فصل برقرار رہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا اگرچہ اصلاً جائز اور درست نہیں ہونا چاہئے، چونکہ عربی رسم الخط اور عثمانی رسم الخط باتفاق ائمہ اربعہ لازم ہے، لیکن "یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (سورۂ بقرہ:۱۸۵)، اور الحرج مدفوع "المشقة تجلب التيسير" (الاشباہ والنظائر) وغیرہ کی بنا پر اس کو درست قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہوجاتی ہے، وہ قدم بقدم بیناؤں کے محتاج نہیں رہتے، نابینا افراد اس کی مدد سے قرآن یاد کرسکتے ہیں اور بھولنے کی صورت میں اس کی طرف مراجعت کرسکتے ہیں، براہ راست قرآن کا مطالعہ کرسکتے ہیں، یہ سب امور وہ ہیں جو اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہیں، اس کی وجہ سے نابینا افراد بینا افراد پر بوجھ نہیں بنتے اور اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قرآن کے ساتھ اشتغال رکھ سکتے ہیں، قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعذار کی وجہ سے بہت سے بندوں کے ذمے سے بہت سے فرائض ساقط ہوجاتے ہیں، جیسے نابینا، مریض اور پیر سے معذور کے ذمہ سے جہاد کا وجوب ارشاد باری ہے: "لیس علی الأعمی حرج ولا علی الأعرج حرج ولا علی المریض حرج" (سورۂ نور:۶۱) اور نابینا، پیر سے معذور اور مریض میں سب سے زیادہ معذور نابینا ہے، اس لئے اس کو مقدم کیا اور اعذار کی بنیاد پر بہت سی ناجائز چیزیں مباح ہوجاتی ہیں، مثلاً حقوق کی حفاظت کی غرض سے بچوں کی گواہی کا قابل قبول ہونا، حفاظت نسل کی بنا پر قابلہ کی گواہی کا درست ہونا، بحالت اضطرار میتہ اور لحم خنزیر کا مباح ہونا، فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ احکام جن کی تطبیق سے مکلف پر حرج اور مشقت لاحق ہوتی ہو تو شریعت ان احکام میں تخفیف کرتی ہے اور حرج اور مشقت کا اعتبار ایسے امور میں ہوگا جن میں کوئی نص موجود نہ ہو اور حرج اور مشقت کے اعتبار کرنے سے مقاصد شریعت فوت نہ ہوں، "قواعد فقہیہ محمودہ" میں ہے:

"الأحكام التي ينشأ عن تطبيقها حرج على المكلف ومشقة في نفسه أو ماله فالشريعة تخفف في تلك الأحكام هذا ويعتبر الحرج والمشقة في موضع لانص فيه، وأما مع النص بخلافه فلا يعتبر" (القواعد الفقهيه المحمودة/ص۵۰)

(وہ احکام جن کی تطبیق سے مکلف پر تنگی اور اس کی جان ومال میں مشقت واقع ہوتی ہے تو شریعت ان احکام میں تخفیف پیدا کرتی ہے اور حرج اور مشقت کا اعتبار ایسی جگہ میں ہوگا جس میں نص نہ ہو اور اگر نص ہو تو پھر اس میں اس کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

اب ظاہر ہے کہ نابینا افراد آنکھ کے نہ ہونے کی وجہ سے براہ راست قرآن ودیگر دینی کتابوں کے مطالعہ سے محروم ہیں اور ہر قدم پر بینا افراد کے محتاج ہوتے ہیں تو اگر کسی نے بریل کوڈ کا ایجاد کیا اور تعلیم وتعلم میں اس کو بینا افراد کے درجہ میں کرکے اس کی پریشانی میں تخفیف پیدا کردی تو یہ عین شریعت کے منشا اور مزاج کے مطابق ہے، لہٰذا بریل کوڈ میں اگر قرآن تیار کیا جائے اور اس سے نابینا براہ راست استفادہ کرلے اور اپنے علم کے دامن کو وسیع کرے تو اس میں میری ناقص رائے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کی اجازت مشقت کی بنیاد پر ہونی چاہئے، فقہاء کے یہاں مسلمہ قاعدہ ہے "المشقة تجلب التيسر" (الاشباہ) (کہ مشقت آسانی لاتی ہے)۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن کا حکم رکھتا ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی حکم بیان کرنا مشکل ہے، کیونکہ بریل کوڈ اگر واقعتاً کوڈ اور اشاریہ ہے وہ باقاعدہ کوئی تحریر اور کتابت نہیں ہے تو اس کو اصل قرآن کا حکم نہیں دیا جاسکتا اور اس کو بلا وضو چھونا درست ہونا چاہئے جس طرح "بسم الله الرحمن الرحیم" کا کوڈ ۷۸۶ ہے یا (قطع نظر اس کے کہ یہ درست ہے یا نہیں) اعمال قرآنی اور تعویذ کی کتابوں میں مختلف سورتوں "سورہ یٰس، فاتحہ، بقرہ، رحمٰن، مزمل" وغیرہ کے اعداد ہیں تو ان اعداد اور اشاریہ کو اصل سورت اور قرآن کا حکم نہیں دیا جاسکتا اور بغیر وضو کے چھونے کو جائز قرار دیا جائے گا، ہاں بہتر یہ ہے کہ اس کو باوضو چھوا جائے، چونکہ وہ قرآن کے کوڈ ہیں اور قرآن اور اس کے متعلقات سب قابل احترام ہیں، اور اگر بریل کوڈ باقاعدہ ایک رسم الخط ہے اور قرآن اس رسم الخط میں لکھا جاتا ہے تو پھر اس کو بلا وضو چھونا جائز نہیں، چونکہ وہ الفاظ قرآنی ہیں، اگرچہ عربی رسم الخط میں نہیں ہے، رسم الخط کے بدل جانے سے قرآن غیر قرآن نہیں ہوتا، یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی ہندی، انگریزی اور گجراتی رسم الخط میں قرآنی آیت یا سورت لکھے تو یہ لکھنا اگرچہ ناجائز ہے، لیکن اس کے باوجود اس کو بلا وضو چھونا جائز نہیں ہے اور وہ اصل قرآن ہے۔

"ويمنع من قرأة القران بقصده ومسه ولو مكتوبا بالفارسية في الاصح" (درمختار ۱/ ۲۱۲ مطبوعہ رشیدیہ)

(میرے نزدیک بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن اصل قرآن کی طرح ہے صرف رسم الخط بدلا ہوا ہے، اس لئے اس کو بلا وضو چھونا جائز نہیں)۔

مدرسہ کی لائبریری میں بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن شریف موجود ہے جو بالکل قرآن کی طرح مجلد ہے اور معری ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو قرآن کی طرح بے وضو نہیں چھو سکتے۔

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کے آداب:

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کے آداب وہی ہیں جو عربی رسم الخط میں قرآن تیار کرنے کے آداب ہیں، کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے میں اگر کمپیوٹر کی طرح کسی مشین سے مدد لی جائے تو اس کے لئے باوضو ہونا بہتر ہے لازم اور ضروری نہیں، شرط یہ ہے کہ اسکرین اور پلیٹ پر ہاتھ نہ پڑے اور اس کو ہاتھ سے نہ چھوئے اسکرین اور پلیٹ پر ہاتھ رکھنے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے، اور اگر بریل کوڈ میں ہاتھ کی مدد سے قرآن تیار کیا جائے تو پھر باوضو ہونا ضروری ہے، پھر بریل کوڈ سے ہر پڑھا لکھا آدمی واقف نہیں ہوتا، اس لئے اس میں اغلاط کثرت سے واقع ہوں گے، اس لئے اغلاط سے بچنے کے لئے ایک کمیٹی کا ہونا ضروری ہے جس میں بریل کوڈ کے ماہرین ہوں اور وہ دیندار حافظ و عالم ہوں وہ تصحیح کا کام کریں تا کہ ہر طرح کے اغلاط سے پاک صاف ہو کر لوگوں کے سامنے قرآن آئے اور وہی قرآن معتبر مانا جائے جو معتمد مستند کمیٹی کی تصحیح کے ساتھ منظر عام پر آئے۔

موبائل پر قرآن مجید:

موبائل کی اسکرین پر اگر قرآن مجید موجود ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں، بشرطیکہ ہاتھ لگاتے وقت آیت قرآنی اسکرین پر لکھی ہوئی نہ آرہی ہو، بلکہ قرآن موبائل کی میموری میں محفوظ ہو، کیونکہ موبائل کی اسکرین پر ظاہر ہونے والی آیت کو آیت قرآنی تو کہا جائے گا لیکن اس موبائل کو یا اس کی میموری کو قرآن نہیں کہا جائے گا جس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے وہ تو ایک برقی مشین ہے جس میں مختلف چیزوں کو محفوظ کرنے کی صلاحیت ہے، وہ بعینہ نہ تو قرآن ہے اور نہ قرآن کا جز ہے، اسی طرح اس کے اسکرین کو بلا وضو چھونا جائز ہے، ہاں جس وقت اسکرین پر قرآن لکھا ہوا آرہا ہو اس وقت اس کو بغیر وضو کے چھونا درست نہیں، چونکہ اسکرین پر ظاہر ہونے والی تحریر آیت قرآنیہ ہے اور آیت قرآنیہ کو بغیر وضو کے چھونا جائز نہیں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص کوئی آیت کسی دیوار، تختہ یا درہم یا دینار پر لکھ دے تو دیوار یا تختہ وغیرہ کو بلا وضو چھونا جائز ہے، لیکن آیت قرآنی کو بلا وضو نہ چھوئے، علامہ شامی نے حائضہ اور جنبی کو قرآن چھونے سے منع کیا ہے، نیز اس مسئلہ کے تحت لکھا ہے:

"قوله ومسه اى القرآن ولو فى لوح أو درهم أو حائط لكن لايمنع الا من مس المكتوب بخلاف المصحف فلا يجوز من الجلد و موضع البياض" (ردالمحتار على الدر المختار ۱/ ۲۱۴)

(حائضہ کو قرآن چھونے سے منع کیا جائے گا اگر چہ وہ قرآن تختی، درہم یا دیوار میں لکھا ہوا ہو، لیکن منع کیا جائے گا صرف اس کو چھونے سے جو لکھا ہوا ہے برخلاف قرآن شریف کے کہ اس کی جلد اور غیر مکتوبہ حصے کو بھی چھونا جائز نہیں)۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر قرآن کریم کسی صندوق میں رکھا ہوا ہو تو جنبی اس صندوق کو اٹھا سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"لو كان المصحف فى صندوق فلا بأس للجنب أن يحمله" (ایضاً/ ۲۱۵)

(اگر قرآن پاک صندوق میں ہو تو جنبی کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ اس کو اٹھائے)۔

مفتی شفیع احمد "آلات جدیدہ کے شرعی احکام" نامی کتاب میں گرامو فون سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"گراموفون کے جن ریکارڈ میں (پلیٹ میں) قرآن مجید کی کوئی آیت محفوظ ہو تو اس کو بلا وضو چھونا جائز ہے، کیونکہ وہ قرآن مجید کے حکم میں نہیں اور نہ آیات و کلمات اس میں اس طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح عام طور پر لکھا جاتا ہے اور اس کے اندر قطعہ تو تیار پر جو کچھ حروف کے مخارج کندہ ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ریکارڈ کو قرآن کا حکم نہیں دیا جا سکتا" (آلات جدیدہ کے شرعی احکام/ص ۱۳۶)۔

احوط اور افضل ہے کہ جب موبائل کی اسکرین سے تلاوت کا قصد کرے تو پہلے وضو کر لے، تا کہ موبائل کو ہاتھ لگانا بھی بے وضو نہ ہو

☆☆☆

بغیر متن کی قرآن مجید شائع کرنا

مفتی محمد ارشاد پالنپوری[1]

(الف) قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی عبارت کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا ناجائز اور حرام ہے، اس کے بارے میں دلائل عقلیہ اور نقلیہ دونوں موجود ہیں۔ چنانچہ محقق ابن ہمام اپنی کتاب ''فتح القدیر'' جو ''ھدایہ'' کی شرح ہے اس میں فرماتے ہیں:

''وفي الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها- يمنع. فإن فعل آية او آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كلّ حرف و ترجمته جاز'' (فتح القدير: ۱/ ۲۹۱ مكتبه زكريا ديوبند)۔

علامہ ابن ہمام کی عبارت سے اس بات کی صراحت ہوگئی کہ فارسی یا کسی عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا اور شائع کرنا ممنوع ہے، ہاں البتہ ایک دو آیتوں کا ترجمہ لکھنا اس ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ بغیر متن کے لکھنا حرام ہے۔ محقق کی بات سے اس بات کا بھی پتہ چل رہا ہے کہ اصل عربی عبارت کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھ دی جاوے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور درمختار میں ہے: ''وتجوز كتابة آية اوآيتين بالفارسية لاأكثر (قال الشامي) والظاهر أن الفارسية غير قيد'' (در المختار مع شامي: ۲/ ۱۶۴ مكتبه دار الكتاب ديوبند)۔

(قرآن مجید کی ایک دو آیتوں کی کتابت فارسی زبان میں جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں۔ علامہ شامی اس پر لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں فارسی زبان کی کوئی قید نہیں) (بلکہ مطلق عجمی زبان مراد ہے فارسی ہو یا ہندی، انگریزی وغیرہ)۔

(ب) متن قرآن کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

ایک بات بطور مقدمہ کے سمجھ لی جائے جس کو مفتی اعظم پاکستان نے اپنی کتاب ''جواہر الفقہ'' میں لکھا ہے وہ یہ ہے کہ باجماع صحابہ وتابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے، یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں اسلام مشرق ومغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب قرآن کے ساتھ پھیلا اس وقت قرآن کے پڑھنے پڑھانے والے گنے چنے حضرات تھے، ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کتنی ضرورت ہوگی کہ ہر ملک کے رسم الخط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجوایا جائے، تاکہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں، لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ اس قرون مشہود لہا بالخیر میں ثابت نہیں کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم الخط میں قرآن لکھوایا ہو یا اس کی اجازت، بلکہ تعامل صحابہ کا اس وقت بھی وہ ہوا جو صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت حذیفہ ابن یمان ملک شام کے جہاد اور آرمینیہ اور آذربائجان کی فتح میں شریک تھے وہاں اہل عراق کو قرآن کی مختلف قرأتوں میں اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت کے خلیفہ اسلام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر سخت تشویش کا اظہار کیا اور یہ الفاظ کہے:

''أدرك الأمة قبل أن يختلفوا اختلاف اليهود والنصارى''۔

(اے امیر المؤمنین آپ امت کی خبر لیں اس سے پہلے کہ ان میں یہود ونصاری جیسا اختلاف واقع ہوجائے)، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام اجل صحابہؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہم کے مشورے سے طے کرلیا کہ قبائل عرب کے سات لغات جن پر قرآن نازل ہوا ہے اگرچہ وہ سب وحی اور حق ہیں، لیکن ان کے لفظی اختلاف سے اب یہ اندیشہ ہے کہ کہیں معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ نہ نکل آوے، اس

---

[1] استاذ مدرسہ جامع العلوم۔ دساڑہ ضلع سریندرنگر (کاٹھیاواڑ) گجرات۔

لئے اب صرف قریش کی لغت پر قرآن پڑھا جاوے، دوسرے لغات کو موقوف کر دیا جاوے، کیونکہ یہ اختلاف لغات صرف لفظی تھا معنی پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا جو قبائل کی آسانی کے لئے جاری ہوا تھا، لہذا باجماع صحابہ لغت قریش پر بہت سے قرآن کریم کے نسخے لکھوائے گئے اور ایک جماعت صحابہ کے سامنے ان کو پڑھا گیا اور صحیح کیا گیا، اس کے بعد وہ نسخے مختلف ممالک عرب و عجم مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ میں بھیج دیئے گئے اور باجماع امت ان کا اتباع ہر چیز میں لازم اور ضروری سمجھا گیا۔

الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا، بلکہ تقریبا تیرہ سو برس پہلے پہنچا ہوا ہے اور عجمیوں کو عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات آج پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اسی وقت سے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو اُس وقت مشکلات زیادہ ہونی چاہئے کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، پھر ان میں لکھے پڑھے کم تھے خصوصاً قرآن پڑھانے والا کوئی عرب ہی ہوسکتا تھا، جس کا ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر بستی میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا، لیکن ان سب مشکلات مزعومہ کے باوجود صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ جائز نہیں کیا کہ قرآن کو ملکی رسم الخط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جاوے، بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم الخط کی بھی مصحف عثمانی کے موافق حفاظت کرنا ضروری سمجھا اور ان مشکلات کو حفاظت مذکورہ کے مقابلے میں ناقابل التفات قرار دیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ میں دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات محض خیالی تھیں (ماخوذ از جواہر الفقہ :۱/ ۷۴، ۷۵، ۷۶، مکتبہ تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند)۔

الغرض مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ذکر کردہ مقدمہ میں صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت لازم اور ضروری ہے، کسی عجمی زبان میں بدون عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری ہے کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں، کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم اور واجب ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم الخط میں اگرچہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو، قرآن کی کتابت جائز نہیں۔

مذکورہ مضمون کے دلائل کتب تفسیر اور کتب فقہ میں بے شمار ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

علامہ سیوطی نے "اتقان فی علوم القرآن" میں رسم خط قرآنی اور کتابت قرآنی کے آداب پر مستقل فصل رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے:

"وقال اشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء فقال: لا، إلّا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع. ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة" (الاتقان ۲/ ۳۲۹ مناہل العرفان ۲/ ۳۷۹)۔

اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر پر لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالکؒ کا اس بارے میں مخالف نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے: "وقال أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك"۔

اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے واو، یاء اور الف (زائدہ) میں جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے میں آتے ہیں۔ (الاتقان فی علوم القرآن: ۲/ ۴۰۳ مکتبہ فیصل دیوبند)

پھر لکھا ہے: "وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئًا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة منّا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم" (الاتقان في علوم القرآن: ۲/ ۴۰۲ مكتبه فيصل ديوبند)۔

(امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہؓ نے لکھے ہیں ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں)۔

اس کے چند صفحات کے بعد تحریر فرمایا ہے: "وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي، قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء، قال: ويحتمل الجواز؛ لأنه قد يحسنه من يقرأه بالعربية والأقرب المنع. كما تحرم قرائته بغير لسان

العرب ولقولهم القلم أحد اللسانين والعرب لاتعرف قلما غير العربي، وقد قال تعالى: '' بلسان عربي مبين ''(الاتقان في علوم القرآن: ۲/ ۴۱۸ مكتبه فيصل ديوبند)۔

(کیا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت جائز ہے علامہ زرکشی نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ میں نے اس بارے میں کسی عالم کی تصریح نہیں دیکھی اور احتمال جواز کا ہے، کیونکہ بعض مرتبہ غیر عربی رسم الخط کو وہ (عجمی لوگ) اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں جو عربی تو پڑھ لیتے ہیں (لیکن لکھنے کی قدرت نہیں) لیکن اقرب التحقیق یہ ہیکہ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے کو منع کیا جاوے، جیسا کہ غیر عربی میں قرأت کو منع کیا جاتا ہے، کیونکہ مشہور ہے کہ قلم بھی ایک قسم کی زبان ہے اور عرب بجز عربی رسم خط کے اور رسم خط نہیں جانتے اور حق تعالی نے فرمایا ہے: "بلسان عربی مبین"۔

نیز غیر عربی میں قرآن لکھنے میں قرآن کے حروف میں کمی بیشی کرنا لازم آتا ہے مثلاً: "بسم اللہ" کو گجراتی حروف میں لکھا جائے تو لفظ "اللہ" لفظ "الرحمن" اور لفظ "الرحیم" کی ابتداء کے دو حروف (الف، لام) تحریر میں نہیں آئیں گے تو اس طرح لکھنے میں صرف "بسم اللہ" شریف میں چھ حروف کی کمی آجاتی ہے تو غور فرمایئے پورا قرآن مجید مثلاً گجراتی میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہوجائیں گے، حالانکہ معانی کی طرح حروف بھی قرآن ہونے میں شامل ہیں، دوسری جانب صورت یہ ہیکہ بعض آیتوں میں حروف زائد ہوجائیں گے مثلاً "الم" میں قرآنی رسم الخط کے بموجب صرف تین حروف ہیں، لیکن غیر عربی مثلاً گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہوجائیں گے اب حساب لگایئے پورے قرآن میں کتنی کمی بیشی ہوجائیگی، اس کے علاوہ حقیقت یہ ہیکہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے اعجازی ہے، اس میں قرأت سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی۔

مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ (۱) عربی میں ح اور ہ میں فرق ہے اور بہت سی زبانوں میں یہ فرق نہیں ہوتا ہے (۲) عربی میں ق اور ک میں فرق ہے اور بہت سی زبانوں میں فرق نہیں ہوتا (۳) عربی میں ء اور ع میں فرق ہے اور بہت سی زبانوں میں فرق نہیں ہوتا (۴) عربی میں ت اور ط جدا جدا ہیں اور بہت سی زبانوں میں یہ فرق نہیں ہوتا (۵) عربی میں س۔ص اور ث میں فرق ہوتا ہے اور بہت سی زبانوں میں فرق نہیں ہوتا (۶) عربی میں ذ،ض، ز اور ظ میں فرق ہوتا ہے اور بہت سی زبانوں میں فرق نہیں ہوتا (ماخوذ از فتاوی رحیمیہ: ۳/۱۷)۔

مذکورہ بالا تمام دلائل کی روشنی میں اور اسلاف کی اتباع میں بندہ بھی یہی رائے قائم کرتا ہے کہ قرآن کو رسم عثمانی کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں الگ سے شائع کرنا اور رسم عثمانی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو قرآنی اور عربی رسم خط کو نہیں پڑھ سکتے ان کو ترغیب دی جائے کہ وہ جس طرح ضرورت پڑنے پر دوسری زبانیں سیکھتے ہیں اسی طرح عربی بھی سیکھیں، تاکہ قرآن مجید پڑھ سکیں۔

(ج) نابینا افراد کی سہولت کے خاطر قرآنی بریل کوڈ تیار کرنا:

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے منزل من اللہ ہے تواتر اور اجماع سے ثابت ہے اعجازی ہے اس میں قرأۃ سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں یہ کمال اور خوبی کسی بھی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہذا اس کا اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، لہذا بندہ کی یہی رائے ہے کہ اندھوں کے لئے بریل کوڈ میں قرآن شریف تیار کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اندھے لوگ بینا لوگوں سے سن کر جتنا سیکھ سکیں اتنا سیکھ لیوے اور پڑھتے رہیں۔ (ماخوذ از محمود الفتاوی: ۴/ ۱۵۴)

(د) موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کو ہاتھ لگانا:

اس کا جواب یہ ہے کہ جس اسکرین پر قرآن کی آیت نمایاں اور ظاہر ہو تو اس اسکرین کو بلا وضوء چھونا احتیاط کے خلاف ہے، ہاں جب موبائل کی اسکرین پر قرآن کی آیت دکھائی دیتی ہو اس وقت کوئی آدمی بلا وضوء موبائل کو نیچے سے چھوتا ہے، اسکرین پر ہاتھ نہیں لگاتا ہے تو چونکہ بیچ میں بیٹری کا فصل ہوتا ہے، اس لئے نیچے سے بلا وضوء چھونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے تب بھی بہتر یہ ہے کہ نیچے بھی باوضوء چھویا جاوے۔

''وواجب للطواف قبل و مس المصحف يعني أنه قبل بأنها واجبة لمس المصحف ؛لأن قوله تعالى لايمسه إلا المطهرون ''(واقعة) (در المختار مع الشامي: ۱/ ۱۷۹مكتبه دار الكتاب ديوبند)

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

مفتی محمد حنیف غفرلہ[1]

۱- کسی بھی زبان میں متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز اور حرام ہے، جیسا کہ اس پر ''الاتقان'' میں علامہ سیوطیؒ نے ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے اور ''کفایہ شرح ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص فارسی زبان میں قراءت قرآن یا کتابت قرآن کی عادت بنالے تو اسے سختی سے منع کیا جائیگا، پھر آگے ایک واقعہ منقول ہے کہ شیخ امام محمد بن فضل کے زمانہ میں اہل بدعت میں سے ایک شخص نے استفتاء لکھا اور اسکو شیخ کے پاس بھیجا کہ ہمارے زمانہ میں بچوں کو عربی زبان میں قرآن پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے تو کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم انکو فارسی میں پڑھا دیا کریں؟ آپ نے سائل کو فرمایا کہ بعد میں آنا ذرا غور کرلیں اور اس شخص کے حال کی تحقیق وتفتیش فرمائی تو وہ فساد مذہب میں مشہور تھا، آپ نے اپنے خادم کو چُھرا دیا اور فرمایا کہ اس شخص کو قتل کردو اور تجھ کو کوئی پکڑے تو کہہ دینا کہ فلاں شخص نے مجھے اسکا حکم دیا تھا، خادم نے شیخ کے حکم کی تعمیل کی تو سپاہی شیخ کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین نے آپ کو بلایا ہے شیخ گئے اور سارا ماجرا بیان کیا اور فرمایا کہ یہ شخص کتاب اللہ کو مٹانا چاہتا تھا امیر المؤمنین نے آپ کو خلعت عطاء کیا اور نیک صلہ دیا، پھر آگے لکھا ہے کہ شیخ محمد بن فضل فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص عمداً ایسا کرتا ہے وہ یا تو زندیق ہے یا مجنون ہے، اگر مجنون ہے تو اسکا علاج کیا جائے اور اگر زندیق ہے تو قتل کردیا جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے: ہامش فتح القدیر ۱/ ۲۴۸، ۲۴۹ بیروت)۔

اس واقعہ سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ بغیر متن قرآن کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز اور حرام ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ نے بھی ''امداد الفتاویٰ'' میں بلا متن عربی کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ناجائز قرار دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کا صرف ترجمہ بغیر متن عربی کے شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے جو موجب وعید ہے، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' نیز یہ تشبہ اس لئے بھی ممنوع ہے کہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو اصل قرآن مجید اسی طرح ضائع ہو جائیگا، جیسا کہ تورات اور انجیل ضائع ہوگئی اور اصل قرآن کی حفاظت فرض ہے اور اسکا اخلال حرام ہے، حضرات شیخین نے جنگ یمامہ کے بعد ضیاع قرآن کے اندیشہ سے قرآن کریم جمع کرنے کا اہتمام فرمایا حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اسکے ناقلین اس کثرت سے موجود تھے کہ اسکا تواتر منقطع نہیں ہوسکتا تھا، لیکن پھر بھی جمع قرآن کا اہتمام کیا گیا، اسی طرح موجودہ زمانہ میں بغیر متن عربی کے صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت میں بھی اصل قرآن مجید کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے، نیز عامۃ الناس ترجمہ قرآن کو چھونے کے لئے وضوء کا اہتمام نہ کریں گے اور اسکا زیادہ احترام بھی نہ کریں گے اور اسکے اوراق کا ناقابل انتفاع ہوجانے کی صورت میں دیگر معمولی کتابوں کے اوراق کی طرح استعمال کرنے لگیں گے، لہذا ایسا ترجمہ شائع کرنا ایک امر غیر مشروع ہے، اسی طرح آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا اور جس کسی نے ایسا کیا تو اس پر شدت سے انکار کیا گیا، اور یہ بھی خطرہ ہے کہ اصل قرآن مجید کے ساتھ تھوڑا بہت جو تعلق ہے تو صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کی صورت میں اصل قرآن مجید سے لوگ بالکل بے تعلق اور اجنبی ہوجائیں گے اور آیت کریمہ ''نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کأنھم لایعلمون'' (سورۂ بقرہ:۱۰۱) کا مصداق بن جائیں گے، اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ جب قرآن مجید کے صرف تراجم شائع کئے جائیں گے اور متن قرآن نظروں سے اوجھل ہوگا اور پھر تراجم میں کچھ اختلاف پایا گیا تو اس وقت یہ اختلاف سیدھا کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا جسکی وجہ سے اعتقاد پر اثر پڑیگا اور لوگ تراجم کو لے لے کر آپس میں لڑیں گے اور اصل قرآن مجید کی طرف مراجعت کی کسی کو توفیق نہ ہوگی اسکے برخلاف اگر متن قرآن کے ساتھ تراجم ہوں گے اور پھر تراجم میں اختلاف ہوگا تو یہ اختلاف کلام اللہ کی طرف منسوب نہ ہوگا، بلکہ فہم یا مترجم کا قصور سمجھا جائیگا اور سب سے بھیانک خطرہ

[1] جامعہ تعلیم الدین سیڈوکرو یراول۔

یہ ہے کہ دشمنان اسلام کو بہت آسانی سے غلط ترجمہ وتفسیر کا موقع ہاتھ لگ جائیگا کیونکہ ہر دیکھنے والے حافظ نہیں ہوتے اور اصل کی طرف رجوع ہر وقت آسان نہیں ہوتا، بنا بریں صرف ترجمۂ قرآن کی اشاعت بالکل جائز نہیں ایسے تراجم کو کوئی شخص نہ قیمۃً لے نہ بلا قیمت، تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جائیگا اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہیگا پس ایسے ترجموں کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا ایک امر ناجائز کی اعانت ہوگی ارشاد ربانی ہے "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (ماخوذ از امداد الفتاوی زکریا ۴/ از ۳۹ تا ۴۲)۔

ہاں اگر متن قرآن لکھا جائے اور اسکا ترجمہ اسکے نیچے یا حاشیہ پر لکھا جائے تو اسکی گنجائش ہے، جیسا کہ "مناہل العرفان، روح المعانی، شامی اور فتح القدیر" وغیرہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے۔

اور جہاں تک ترجمۂ قرآن کو بلا وضو چھونے کا مسئلہ ہے تو حسب تصریح فقہاء اسے بلا وضو چھونا جائز نہیں شامی میں ہے:

"و یمنع دخول مسجد إلی قولہ و مسہ أي القرآن ولو کان مکتوبا بالفارسیة في الأصح" (شامی دار الکتاب ۱/ ۲۲۳)

اور "ہندیہ" میں ہے: "ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یکرہ لہم مسہ عند أبي حنیفة، وکذا عندہما علی الصحیح، ہکذا في الخلاصة" (ہندیہ زکریا ۱/ ۳۹)، "و فیہ أیضا: إذا قرأ آیة، السجدة بالفارسیة فعلیہ وعلی من سمعہا السجدة فہم السامع أولا إذا أخبر السامع أنہ قرأ آیة السجدة" (ہندیہ زکریا ۱/ ۱۳۳)

یہ دوسرا جزئیہ پہلے جزئیہ کی تائید وتوثیق کرتا ہے کہ فارسی زبان میں آیت سجدہ تلاوت کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ فارسی یا کسی بھی زبان کا ترجمۂ قرآن حکماً قرآن کے درجہ میں ہے، لہذا اسے بلا وضو چھونا جائز نہیں ہے نیز "روح المعانی" کی عبارت:

"حرمة کتابة القرآن بالفارسیة... و حرمة مسہ لغیر الطاہر اتفاقا کقراءتہ" (روح المعانی بیروت ۶/ ۳۶۵)

سے بھی یہی حکم واضح ہوتا ہے اسی طرح (امداد الفتاوی زکریا ۴/ ۴۰) اور (جواہر الفقہ فرید بک ڈیپو: ۱/ ۱۱۳) میں بھی بلا وضو ترجمۂ قرآن کے مس کو ناجائز لکھا ہے، بنا بریں ترجمۂ قرآن کو بلا وضو چھونا جائز نہیں۔

۲-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

اسی طرح شروع میں جو تفصیلات اور دلائل ذکر کئے گئے ان سے غیر عربی رسم الخط میں کتابت قرآن کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ غیر عربی رسم الخط، مثلاً ہندی، انگریزی یا کسی بھی زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت ہے جس کی اتباع بالاجماع واجب اور لازم ہے اور مخالفت کی صورت میں تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے بچنا ضروری ہے، جیسا کہ پیچھے شواہد گذر چکے، نیز غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم لکھنے سے حروف کی کمی بیشی لازم آئیگی تو غور فرمایئے پورا قرآن مجید غیر عربی رسم الخط میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہو جائیں گے، اسی طرح عربی میں ح اور ہ میں فرق ہے کسی اور زبان میں یہ فرق نہیں، عربی میں 'ق' اور 'ک' میں فرق ہے کسی اور زبان میں یہ فرق نہیں، عربی میں ء (ہمزہ) اور ع الگ الگ ہیں جبکہ دوسری زبانوں میں یہ فرق نہیں، عربی میں ت اور ط جدا جدا ہیں، جبکہ دوسری زبانوں میں یہ فرق نہیں عربی میں س، ص اور ث میں فرق ہے دوسری زبانوں میں یہ فرق نہیں، مقصد و مطلب یہ ہے کہ جس طرح عربی میں ھ اور ح، ق اور ک، ء اور ع، ت اور ط، س، ص اور ث کی ادائیگی میں نمایاں فرق ہے یہ فرق اور امتیاز کسی دوسری زبان میں نہیں پایا جاتا جس سے بیسیوں غلطیاں وجود میں آئیگی اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائیگا، لہذا جو لوگ عربی رسم الخط میں قرآن مجید نہیں پڑھ سکتے یا اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے انکے لئے بہتر یہ ہے کہ جو سورتیں زبانی صحیح یاد ہیں وہی پڑھا کریں، مگر غیر عربی رسم الخط میں نہ پڑھے جو کہ حرام ہے (مستفاد فتاوی رحیمیہ ۱/ از ۹۸ تا ۱۰۰ مکتبہ رحیمیہ سورت گجرات، جواہر الفقہ فرید بک ڈیپو ۱/ ۸۷، امداد الفتاوی زکریا ۱/ ۴۳)

بنا بریں غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید لکھنا، تا کہ غیر عربی داں حضرات کو تلاوت قرآن میں سہولت ہو شرعاً ایسا کرنا درست نہیں ہے، ہاں دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے، یعنی پہلے متن قرآن پھر اس کے نیچے غیر عربی رسم الخط تو یہ بشکل شامی، روح المعانی، فتح القدیر اور مناہل العرفان کی عبارات پر

قیاس کر کے جائز ہو سکتی ہے کہ پہلے عربی رسم الخط میں آیات قرآنیہ پھر اس کے نیچے ترجمہ پھر اس کے نیچے تفسیر قرآن ترجمہ تفسیر تو اس پر قیاس کر کے عربی رسم الخط میں آیات قرآنیہ پھر اس کے نیچے غیر عربی رسم الخط میں آیات قرآنیہ کو لکھا جا سکتا ہے۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت

اسی طرح بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لہذا اسکا اتباع واجب ہے اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، لہذا اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا یاد کرلے کیونکہ ارشاد ربانی ہے: "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا" (سورۂ بقرہ: ۲۸۶) (مستفاد محمود الفتاوی ۴ / ۱۵۴ مکتبہ محمودیہ ڈابھیل گجرات، فتاوی رحیمیہ ۱ / ۹۸ مکتبہ رحیمیہ سورت گجرات)۔

رہا یہ سوال کہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو بلا وضو چھو سکتے ہیں یا نہیں؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ اگر بریل کوڈ بھی دیگر زبانوں کی طرح ایک زبان شمار کی جائے تو بریل کوڈ میں تیار شدہ قرآن کو بلا وضو چھونا جائز نہیں، جیسا کہ بغیر متن عربی کے صرف ترجمۂ قرآن کو بلا وضو چھونا جائز نہیں جسکے دلائل گذر چکے اور اگر بریل کوڈ دیگر زبانوں کی طرح کوئی مستقل زبان نہیں ہے تو پھر بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن مجید کو بلا وضو چھونا جائز ہے۔

۴- موبائل پر قرآن مجید:

اور رہا یہ سوال کہ موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو کیا اسے بلا وضو چھو سکتے ہیں؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ موبائل کو بلا وضو ہاتھ میں لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اسکرین پر موجود حروف کو ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے بلا وضو چھونا جائز نہیں، اسکی مثال ایسی ہی ہے، جیسا کہ کسی تختی پر یا درہم پر یا دیوار پر قرآن مکتوب ہو تو صرف مس مکتوب سے روکا جائیگا اسی طرح موبائل میں مس اسکرین سے منع کیا جائیگا جس پر الفاظ قرآن کا ظہور ہوا ہے نہ کہ مس موبائل سے، جیسا کہ درج ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

"یمنع دخول مسجد إلی قوله و مسه أی القرآن، ولو فی لوح أو درهم أو حائط لکن لایمنع إلا من مس المکتوب" (شامی دار الکتاب ۱/ ۴۲۳) "فقال الحنفیة: الوضوء خمسة أنواع الأول فرض... لأجل لمس القرآن ولو آیة مکتوبة علی ورق أو حائط أو نقود لقوله تعالی: (لا یمسه إلا المطهرون) "(الفقه الاسلامی و ادلته ۱/ ۲۱۱ مکتبه ہدی دیوبند)۔



بغیر قرآن مجید کے متن کے ترجمہ کی کتابت واشاعت

مولانا محمد عبید اللہ ابوبکر ندوی (شافعی) کنڈلوری

۱-بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

متن قرآن کے بغیر ترجمہ قرآن کریم کی اشاعت اردو یا کسی اور زبان میں جائز ہے، اس لئے کہ قرآن کریم ایک آفاقی کتاب ہے، اگر چہ اس کا نزول عرب میں ہوا، لیکن اس کے احکام اور اس کی تعلیمات دنیا کے تمام لوگوں کے لئے ہے، اور قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے کسی عجمی زبان میں اس کا ترجمہ ضروری ہے، چاہے اس کا ترجمہ متن قرآن کے ساتھ ہو یا متن قرآن کے بغیر ہو دونوں ہی صورتوں میں اصل مقصد یہی ہے کہ اس آفاقی کتاب کا پیغام عام ہو جائے، لہذا نفس ترجمہ یا اس کی تفسیر کی اشاعت درست ہے، اس لئے کہ اس صورت میں دعوت کے کام میں آسانی پیدا ہوگی، اس لئے نفس ترجمہ قرآن کا قرآن نہ ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے، اور اصل قرآن کو اٹھانے اور چھونے کے لئے وضو ضروری ہے اس بناء پر اور قرآن کی بے حرمتی کے سبب کسی کافر کے ہاتھ میں اس کا دینا، بیچنا، ہدیہ دینا درست نہیں ہے اور نہ کافر کے ہاتھ اس کی بیع جائز ہے، لہذا غیر مسلموں تک اسلام اور قرآن کے پیغام کو پہنچانے کے لئے نفس ترجمہ کی اشاعت ہی شریعت کا عین تقاضہ ہے، اس لئے کہ جب یہ قرآن نہیں ہے تو اس کو چھونے، اٹھانے کے لئے نہ وضو کی ضرورت ہے اور نہ بغیر طہارت کے اٹھانے میں اس کی بے حرمتی ہے۔ مذکورہ تفصیل سے جب یہ بات واضح ہوگئی کہ نفس ترجمہ کی اشاعت شرعی مصالح کے پیش نظر جائز ہی نہیں، بلکہ ایک امر مستحسن بھی ہے، اور خرید وفروخت کے موانع میں سے کوئی بھی مانع یہاں پایا نہیں جا رہا ہے، اس لئے اس کی خرید وفروخت درست ہے۔

علامہ زحیلیؒ فرماتے ہیں: ''يجوز ترجمة معاني النصوص القرآنية إلى اللغات الأجنبية لحاجة الناس إلى معرفة أحكام الإسلام ورسالته العامة للبشرية، اذ أنه يتعذر على كل فرد غير عربي تعلم اللغة العربية لما في ذلك من حرج وعسر'' (موسوعة الفقه الاسلامي وادلته للزحيلي: ۱۰/ ۵۹۳)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''ترجمة القرآن ليست قرآنا، لأن القرآن هو هذا النظم المعجز وبالترجمة يزول الإعجاز، وكما أن الشعر يخرجه ترجمته عن كونه شعرا، فكذا القرآن...فنقول بعد هذا التمهيد: ترجمة القرآن ليست قرآنا بإجماع المسلمين...فليس لأحد يخالف في أن من تكلم بمعنى القرآن بالهندية ليست قرآنا...ومن خالف في هذا كان مراغما جاحدا، وتفسير شعر امرئ القيس ليس شعره، فكيف يكون تفسير القرآن قرآنا'' (المجموع: ۳/ ۲۳۱)۔

علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں: ''ولا يصح شراء الكافر ولو مرتدا لنفسه المصحف كله أو بعضه ولا يتملكه بسلم ولا بهبة ولا وصية...لما في ذلك من الإهانة لها'' (مغني المحتاج: ۲/ ۸) ''يجوز إعطاء ترجمة معاني القرآن الكريم لغير المسلم من أجل البلاغ ودعوة إلى الإسلام وتغليبا لجانب الترجمة'' (فتاوى اللجنة: ۴/ ۴۲)

شیخ ابن باز نفس ترجمہ اور تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ولا يسمى ذلك التفسير قرآنا، وعلى هذا يجوز للجنب والكفار مس ترجمة معاني القرآن بغير اللغة العربية كما يجوز مسهم تفسيره باللغة العربية'' (فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء ۴/ ۱۶۳)۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

اس سلسلہ میں علماء شوافع میں دو قسم کا رجحان ملتا ہے، علماء کی ایک جماعت غیر عربی میں کتابت قرآن کے مطلقا عدم جواز کی قائل ہے۔

علامہ ابوبکر بن محمد شطا الدمیاطی: ''وکتابته بالعجمية... أي ويحرم كتابته بالعجمية ورأيت في فتاوى العلامه ابن حجر أنه سئل هل يحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية لقراء ته؟ فأجاب بقوله: ''قضية مافي المجموع عن الأصحاب التحريم'' (اعانة الطالبین: ۱/ ۱۱۰)۔

لیکن دوسری ایک جماعت غیر عربی زبان میں کتابت قرآن کے جواز کی قائل ہے۔

شیخ سلیمان جملؒ فرماتے ہیں: ''سئل الإمام الشهاب الرملي هل تحرم كتابة القرآن العزيز بالقلم الهندي أو غيره؟۔ فأجاب بأنه لايحرم؛ لأنها دالة على لفظة العزيز وليس فيها تغيير له...وعبارة الاتقان للسيوطي: هل يحرم كتابته بقلم غير العربي؟، قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء ويحتمل الجواز؛ لأنه قد يحسنه من يقرأه والأقرب المنع والمعتمد الأول'' (حاشية الجمل على شرح المنهج للجمل: ۱/ ۱۲۳)۔

صاحب بجیر میؒ فرماتے ہیں: ''وأفتى شيخنا م ر (الرملي) بجواز كتابة القرآن بالقلم الهندي وقياسه جوازه بنحو التركي أيضا'' (حاشية البجيرمي: ۱/ ۳۷۴)۔

مذکورہ عبارتوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ معتمد قول کے مطابق غیر عربی زبان میں کتابت قرآن جائز ہے، اور اس کا حکم چھونے اور اٹھانے میں اصل قرآن کی طرح ہوگا۔ لیکن غیر عربی زبان میں لکھے ہوئے قرآن کی تلاوت وقراءت کو تمام فقہاء نے ممنوع قرار دیا ہے، اس لئے کہ غیر عربی، یعنی مراٹھی، فارسی یا کنڑ میں حروف کی ادائیگی اس طرح نہیں ہوسکتی جس طرح عربی میں ہے۔

نیز غیر عربی زبان میں قرآن کریم کی تلاوت کے دوران تجوید کی رعایت بھی قدرے مشکل ہے، اسی لئے امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''مذهبنا أنه لايجوز قراءة القرآن بغيرا للسان العربي سواء أمكنه العربية أو عجز عنها سواء كان في الصلاة أو غيرها'' (المجموع: ۳/ ۳۳۱)۔

چنانچہ علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں: ''لا يجوز أن يقرأ بالفارسية ولابلغة غير العربية'' (الحاوي الكبير: ۲/ ۱۳-۱۱۵)

علامہ قلیوبیؒ فرماتے ہیں: ''يجوز كتابته لا قراءته بغير العربية، ولها حكم المصحف في المس والحمل'' (حاشیہ قلیوبی وعمیرہ: ۱/ ۱۰۸)

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب غیر عربی زبان میں لکھے ہوئے قرآن سے تلاوت قرآن جائز نہیں ہے تو پھر قرآن کو غیر عربی میں لکھنے کے جواز کا کیا فائدہ؟ اس سلسلہ میں فقہاء فرماتے ہیں کہ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو شخص قرآن کو عربی میں اچھی طرح پڑھ سکتا ہے وہ غیر عربی قرآن کو صحیح طریقہ سے پڑھ لے گا، چنانچہ علامہ بجیر میؒ فرماتے ہیں:

''فائدة كتابته بغير العربية مع حرمة القراءة بها أنه قد يحسنها من يقرأوه بالعربية'' (حاشية البجيرمي: ۱/ ۳۷۴)

اس سے پتہ چلا کہ ہندی یا انگریزی زبان میں لکھے ہوئے قرآن کی تلاوت اس شخص کے لئے جائز ہے جو اسے عربی قرآن کی طرح پڑھ سکتا ہو، آج امت کا بڑا طبقہ ایسا ہے جو عربی سے ناواقف ہے، لہذا اس کے لئے عربی کے علاوہ اپنی ملکی یا علاقائی زبان میں قرآن کی تلاوت کرنا ناگزیر ہے، لہذا ایسے لوگوں کو اس بات کا مکلف بنایا جائے کہ وہ قرآن کو صحیح پڑھ لے، دوسری طرف جو لوگ عربی میں تلاوت قرآن کے عادی ہیں ان کا حال بھی بہت برا ہے کہ وہ بھی قرآن کو صحیح اور تجوید کی رعایت کے ساتھ نہیں پڑھ پاتے تو پھر جب صحیح پڑھنے والے کے لئے غیر عربی قرآن کی تلاوت درست ہوسکتی ہے اور صحیح نہ پڑھنے والوں کے لئے غیر عربی، یعنی ہندی وغیرہ میں زبان میں لکھے ہوئے قرآن کی تلاوت درست نہیں ہوسکتی تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن صحیح نہ پڑھنے والوں کو عربی میں بھی تلاوت قرآن درست نہیں ہونا چاہئے، اس اعتبار سے غیر عربی یا عربی قرآن کی تلاوت میں بنیادی فرق اس کے صحیح پڑھنے اور نہ پڑھنے کا ہے، اس لئے غیر عربی اور عربی قرآن کی تلاوت میں فرق کرنے کے بجائے یہ فیصلہ کیا جائے کہ جو صحیح طور پر تلاوت کے اداب اور اصول کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرسکتا ہو اس کے لئے جائز ہے، چاہے وہ کسی بھی زبان میں کرے اور اس کے برعکس صورت میں تلاوت درست نہیں ہوگی چاہے، وہ تلاوت عربی قرآن ہی سے کیوں

نہ کرے، اس لئے کہ عربی زبان میں صحیح طور پر تلاوت نہ کرنے کی صورت میں بھی قرآن کریم کے معنی میں بگاڑ اور فساد لازم آتا ہے، جیسے کہ غیر عربی زبان میں معانی کے فساد کا اور ادائیگی کا معاملہ ہے۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت

نابینا افراد کی تعلیم کے لئے بریل کوڈ کو ذریعہ بنانا وسائل تعلیم میں سے ایک وسیلہ ہے، گرچہ یہ طریقہ نہ ظاہراً قرآن ہے اور نہ حکماً۔ اس کے باوجود نابینا افراد اپنے انداز میں قرآن کریم بریل کوڈ کے ذریعہ سیکھ جاتے ہیں اور پڑھ لیتے ہیں، خود جناب نبی کریم ﷺ نے تعلیم کی خاطر وسائل کو اختیار کیا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی پھر فرمایا کہ "هذا سبيل الله" پھر آپ ﷺ نے دائیں اور بائیں جانب لکیر کھینچی اور فرمایا: "هذه سبل على كل سبيل منها شيطان يدعو اليه" کہ یہ سب متفرق راستہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے (مسند احمد)، حدیث پاک میں آپ ﷺ نے سیدھے راستہ کو ایک لکیر کے ذریعہ سمجھایا، بریل کوڈ میں بھی قرآن کو سیکھنے کا تعلق اسی طرح کے نشانات اور علامات سے ہے، جیسا کہ آج مختلف مدارس ومکاتب میں بینا لوگوں کے لئے الیکٹرانک بورڈ لگائے جاتے ہیں جن میں حروف نظر آتے ہیں اور ان حروف کو دیکھ کر بچے اپنے ذہن میں نقش کر لیتے ہیں اور یہ طریقہ صرف پڑھنے کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہوتا ہے، نیز ایک معلم جب بینا شخص کو قرآن کریم سکھاتا ہے تو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کو الگ الگ کر کے سکھاتا ہے، جبکہ معنی کے اعتبار سے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، لیکن تعلیم کے لئے اس عمل کی گنجائش ہے، چنانچہ صاحب بجیرمیؒ فرماتے ہیں:

"الوجه جواز تقطيع حروف القرآن في القراءة في التعليم للحاجة إلى ذلك" (حاشية البجيرمي: ۱/ ۳۷۴)۔

نیز ابتداء زمانہ میں قرآن کریم پر اعراب اور نقطہ نہیں تھے، لیکن لوگوں کی تعلیم کے لئے اعراب اور نقطوں کو وضع کیا گیا، اسی لئے قرآن کریم کی تعلیم اور اس کی صحیح تلاوت کے لئے نقطوں اور اعراب کا اہتمام مندوب اور مستحسن ہے، چنانچہ صاحب بجیرمی فرماتے ہیں:

"يندب كتبه وإيضاحه ونقطه وشكله أي صيانة له من اللحن والتحريف" (حاشية البجيرمي: ۱/ ۳۷۴)

مذکورہ نظائر کی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا امر مستحسن ہے، اس لئے کہ اس صورت میں بہت سے نابینا افراد کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کرنے کا موقع نصیب ہوگا بصورت دیگر صرف سماعت کے ذریعہ بہت ہی کم افراد کو قرآن کی تلاوت نصیب ہوگی، البتہ اس میں چونکہ نہ قرآن کے حروف پائے جاتے ہیں نہ ظاہراً نظر آتے ہیں، اس لئے اس کو چھونے اور اٹھانے کے سلسلہ میں ظاہراً مصحف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، لیکن شریعت کے اکثر احکام کا مدار نیت پر ہے اور جس طرح بینا افراد کے لئے قرآن اصل کا درجہ رکھتا ہے اسی طرح نابینا افراد کے لئے بریل کوڈ کی شکل میں تیار کردہ قرآن قرآن کے حکم میں ہے، چونکہ انھوں نے قرآن کو دیکھا نہیں ہے، اس لئے وہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو حقیقی قرآن کی طرح سمجھتے ہیں، اس لئے کم سے کم ان کے حق میں تو اسے چھونے اور اٹھانے کے لئے وضو واجب ہونا چاہئے، جیسا کہ غیر عربی زبان میں لکھا ہوا قرآن چھونے اور اٹھانے کے مسئلہ میں قرآن کی طرح ہے۔

علامہ قلیوبیؒ فرماتے ہیں:

"يجوز كتابته لا قراء ته بغير العربية، ولها حكم المصحف في المس والحمل" (حاشيه قليوبي وعميره: ۱/ ۱۰۸)

، جیسا کہ کوئی شخص کسی عام کتاب کو اپنے گمان کے مطابق قرآن سمجھ رہا ہو تو اس کے حق میں اس کتاب کو بغیر وضو کے اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح جو قرآن دراسہ، یعنی پڑھنے کی نیت سے بنایا جاتا ہے اگرچہ اسے بعد میں پڑھا نہیں جاتا ہے، بلکہ کہیں تبرکاً لٹکایا جاتا ہو، لیکن نیت کی بنیاد پر اسے بھی قرآن کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کو چھونے کے لئے وضو ضروری ہے، اس کے برخلاف قرآن کی کوئی آیت تعویذ یا برکت کے لئے لکھی گئی ہے تو اسے چھونے کے لئے وضو ضروری نہیں ہے، لہٰذا یہ فرق نیت کی بنیاد پر ہے۔

علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں:

"أما ما كتب لغير الدراسة كالتميمة وهي ورقة يكتب فيها شيء من القرآن وتعلقت على الرأس مثلا للتبرك، والثياب التي يكتب عليها، والدراهم كما سيأتي، فلا يحرم مسها ولا حملها، لأنه ﷺ كتب كتابا إلى هرقل وفيه: "يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة" ولم يأمر حامله بالمحافظة على الطهارة" (مغني المحتاج: ۱/ ۳۶)۔

۴-موبائل پر قرآن مجید

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لا یمسہ إلا المطھرون" (الواقعہ:۷۹) کہ قرآن مجید کو صرف پاک لوگ ہی چھوئے، حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم کو لکھ بھیجا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نجران بھیجا تھا کہ تم مصحف کو مت پکڑو، مگر یہ کہ تم پاکی کی حالت میں ہو (سنن بیہقی:۱/۸۸)، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بغیر طہارت کے مصحف کو نہ چھوو (طبرانی فی الصغیر:۹/۲۳۹)، مذکورہ دلائل کی بنیاد پر فقہاء نے قرآن کریم کو بے وضو اور جنابت کی حالت میں چھونے کو حرام لکھا ہے، اور قرآن کریم کو اس حالت میں چھونے کے تعلق سے شریعت میں بہت ہی سخت موقف اپنایا گیا ہے کہ نہ اصل مصحف کو چھونا ہے نہ اسے کپڑے کے ساتھ چھونا ہے جس میں اسے لپیٹا گیا ہے، اور نہ اس قرآن صندوق کو چھونا ہے جو خاص طور پر قرآن رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اسی طرح قرآن کی کوئی آیت پڑھنے کی نیت سے کسی تختی پر لکھی جائے تو اسے بھی بغیر وضو کے چھونا درست نہیں ہے، البتہ جو قرآن کسی ایسے صندوق میں ہو جس میں قرآن بھی ہو اور دیگر اشیاء بھی ہو یا ماضی میں دراہم اور دنانیر پر قرآن کی آیت لکھی ہوتی تھی، لیکن چونکہ وہاں نیت قرآن کو اٹھانے کی نہیں ہوتی، اس لئے اس کو بغیر وضو کے ہاتھ لگانا اور اٹھانا جائز ہے، اسی طرح جن موبائل میں قرآن محفوظ ہو اسے بغیر وضو کے اٹھانا تو درست اور جائز ہے، لیکن جب قرآن موبائل کی اسکرین پر نظر آرہا ہو تو اس وقت اس کو چھونا اور انگلی لگانا عین قرآن کو چھونے کی طرح ہے تو جس طرح بغیر وضو قرآن کے کسی صفحہ پر کانچ کا ٹکڑا رکھ کر یا کپڑا بچھا کر اسے چھونا درست نہیں ہے اسی طرح موبائل کی اسکرین کے اوپر سے قرآن کو چھونا درست نہیں ہوگا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"ویحرم بالحدث الصلاة والطواف وحمل المصحف ومس ورقه، وكذا جلده على الصحيح وخريطة وصندوق فيهما مصحف وما كتب لدرس قرآن كلوح في الأصح" (منہاج مع السراج الوہاج:۱۲)۔

شیخ سلیمان جملؒ فرماتے ہیں:

"ومس جلده المتصل به؛ لأنه كالجزء منه، فإن انفصل عنه قضية تفصيله في الجلد بين الانفصال وعدمه وسكوته عن الورق أنه يحرم مسه مطلقا متصلا أو منفصلا ولو هوامشه" (حاشية الجمل: ۱/ ۱۲۰)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"يحرم على المحدث مس المصحف وحمله سواء أن حمله بعلاقته أو في كمه أو على رأسه۔ قال أصحابنا: وسواء مس نفس الأسطر أو ما بينهما، أوالحواشي، أوالجلد، فكل ذلك حرام...وفي مس العلاقة والخريطة والصندوق إذا كان المصحف فيها وجهان مشهوران: أصحهمايحرم...وأما حمل الصندوق وفيه المصحف، فاتفقوا على تحريمه...ولو لف كمه على يده وقلب الأوراق بها فهو حرام" (المجموع:۲/ ۸۵)۔

امام ماوردیؒ فرماتے ہیں:

"فأما حمل الدراهم والدنانير التي عليها القرآن فهي ضربان؛ أحدهما: مالا يتداوله كثيرا ولا يتعاملون به غالبا...الثاني: ما يتداوله الناس كثيرا ويتعاملون به غالبا۔ ففي جواز حملها وجهان: الثاني: يجوز لما يلحق به من المشقة الغالبة من التحرز منها" (الحاوي الكبير:۱/ ۱۴۶)۔

امام سیوطیؒ نے فرماتے ہیں:

جب کسی چیز میں مشقت پیدا ہوتی ہے اور اس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا تو اس وقت آسانی پر عمل کیا جاسکتا ہے چنانچہ بطور دلیل یہ قاعدہ ہے:

"المشقة تجلب التيسير" (الاشباه والنظائر:۱/ ۱۵۷)۔



غیر عربی زبان میں قرآن کی کتابت واشاعت

مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی[1]

فارسی زبان میں عربی سے کافی مماثلت ہونے کے باوجود اشاعت قرآن کی ممانعت ہے۔ دوسری زبانیں جو عربی کے مماثل ہونے کے بجائے مغائر ہیں۔ عربی رسم الخط کے خلاف بائیں جانب سے لکھی جاتی ہیں۔ ان کے کچھ حروف، عربی کے الگ الگ حروف کی طرح ممتاز اور متفرق آوازیں نہیں دیتے ہیں، جیسے کہ س، ث، ص، اور ذ، ز، ظ۔ ان حروف کی تحریری شکلیں الگ الگ ہیں اور کلموں کے ساتھ ان کے الگ الگ معانی ہوتے ہیں۔ اگر ص کی جگہ س، یا ث یا ز کے بجائے ظ اور ج لکھا اور پڑھا جائے تو کلموں کے معانی ومفاہیم میں زمین آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ انگریزی میں ذ، ز، ظ، کے لئے ''Z'' اور س، ص ث ''S'' کے ہوسکتے ہیں جن سے اصل معنی کے برخلاف متضاد معانی پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں میں عربی کو تحریر کرنے سے ہوگا۔ جس سے عربی الفاظ کے معانی صحیح طور پر واضح نہیں ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں مختلف کلمات ایسے ہیں جن کی کتابت کے مطابق قرأت نہیں ہوتی ہے، بلکہ تلاوت کے وقت ان کے کچھ حروف چھوٹ جاتے ہیں جیسے: "بئس الاسم الفسوق بعد الإیمان..." (سورہ الحجرات:) اور "لا نتم أشد رهبة..." (سورہ الحشر)۔

اسی طرح اسماء موصولہ اور دوسرے موقعوں کے الف لام تعریف اور حروف مدہ ا، ی، و، اور حروف مدہ کی شکلوں میں ء، لام تاکید کے بعد الف، وغیرہ کی آوازیں قرأت میں نہیں آتی ہیں۔ دوسری زبان میں ان کی کتابت کے وقت تلفظ کی رعایت ہوگی تو یہ سب چھوٹ جائیں گے اور اگر ان حروف کی رعایت میں کتابت کی جاتی ہے تو ایک قرأت اور نیا تلفظ الفاظ قرآنی کی ادائیگی میں آجائیں گے۔ جو کہ اصول تلاوت وتجوید قرأت کے خلاف ہوگا۔ انگریزی میں کسی لفظ کے تلفظ کی رعایت میں اردو یا کسی اور زبان میں اس کی کتابت کی جائے تو اسی لفظ سے ملتے جلتے دوسرے الفاظ سے وہ متشابہ ہونے کی وجہ سے اپنا معنی صحیح طور سے دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ اور اس لفظ کا متعین مصداق اور مراد سمجھنے کے لئے اس لفظ کے حروف جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اصل زبان میں اس لفظ کے حروف کے ذریعہ ہی اس کا مقررہ معنی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہ حال عربی کا بھی ہے، محض تلفظ سے PRONUNCIATION کا درست معنی نہیں معلوم ہوسکتا ہے، بلکہ اس لفظ میں موجود عربی حروف سے متعین معنی معلوم ہوسکتا ہے۔ دوسری زبان میں اس کی کتابت کے بعد اس کے معنی اور مقصود کی تعیین کے لئے لفظوں کی اصل حروف کی طرف مراجعت کی برابر ضرورت پڑتی رہے گی۔ اس لئے شرعی نقطہ نظر کے علاوہ عقلی طور پر بھی قرآن دوسری زبان کے رسم الخط میں شائع کرنا غلط ہے۔

انگریزی زبان کے الفاظ کو جب ہم اردو یا دوسری زبان میں لکھتے ہیں تو ان الفاظ کے تلفظ اصل انگریزی عبارات سے مختلف ادا ہوتے ہیں اور انگریزی زبان سے انسیت رکھنے والے انگریزی کے علاوہ دوسری زبان کے رسم الخط میں پڑھنے کے بجائے انگریزی کو انگریزی رسم الخط ہی میں پڑھنے میں سہولت اور بہتری سمجھتے ہیں۔ اور انگریزی کیا؟ بلکہ دنیا میں شاید کوئی ایسی زبان ہو جس کی کتابت اس کے اصل رسم الخط کے علاوہ دوسری زبان کے رسم الخط میں ہوتی ہو (اس عموم سے اردو کو مستثنیٰ رکھا جائے، کیونکہ سرکاری اور غیر سرکاری عاشقان ہندی کی کوشش ہے کہ اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھا جائے۔ یہ ان کی طرف سے مسلمانوں کے لئے قابل ستائش کوشش ہے۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو بالکل ختم ہو جائے گی اور اس راستے سے اردو داں افراد ہندی سیکھتے اور سمجھتے ہوئے اردو سے آزاد ہو جائیں گے اور اگر دینی بیداری ہوگی تو پھر دین کے نام پر اردو سیکھنے کے بجائے براہ راست قرآن اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ''عربی'' سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے عربی زبان میں بات کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی سنت ہے، نیز مخاطب اقوام کو ان کی زبان میں احکام الٰہی کی تعلیم کرنا بھی مقصد ثبوت رہا ہے، سلسلہ نبوت کے خاتمہ کے بعد یہ ذمہ

[1] صدر مفتی دارالافتاء شہر مہدپور ضلع اجین ایم پی۔

داری امتِ مسلمہ کے سر ڈالی گئی ہے۔ اردو کی وجہ سے مسلمانان ہندان دونوں (عربی بول چال اور دعوت الی الاسلام جیسی) عظیم سنتوں کے تارک ہیں، جب تک اردو زندہ ہے اس وقت تک مسلمان اسلامی اور دعوتی دونوں زبانوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتے ہیں) یہ ایک فطری بات ہے کہ کوئی زبان اس کی اصل رسم الخط میں پڑھی جائے، اسی طرح قرآن کو پڑھنے کے لئے عربی زبان میں لکھنا ضروری ہے۔

تعلیم اور غیر عربی افراد کو قرأت قرآن میں سہولت کے پیش نظر جب اعراب لگانے کا خیال ہوا تو اس کی بھی مخالفت ہوئی اور ضرورت کے تحت اعراب ونقاط اور کچھ نشانات کے لگانے کی اجازت دی گئی۔

''ویکرہ التعشیر(۱) والنقط فی المصحف، بقول(۲) عبدالله بن مسعود رضی الله عنه، و قال المتأخرون: هو فی زمانناحسن، خصوصًا للعجم۔ و فی الحاشیه: (۱) التعشیر هو جعل العواشر فی المصحف، و هو کتابة العلامات عند منتهی عشر آیات (رد المحتار مع الدر جلد ۹ / ص ۵۵۴ فصل البیع) (۲) و هو هکذا'' جردو القرآن، لاتلبسوا به ما لیس منه (مصنف عبدالرزاق، الصیام، باب ما یکره ان یصنع فی المصاحف ۴ / ۳۲۳)'' (مختارات النوازل جلد ۲ ص ۴۷، مطبوعه ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی)۔

و فی الدر مع الرد: ''تحلیة المصحف و تعشیره و نقطه، أی إظهار إعرابه، به یحصل الرفق جدًا خصوصًا للعجم فیستحسن، وعلی هذا لا بأس بکتابة أسامی السور و عدّ الآی وعلامات الوقف و نحوها، و یکره تصغیر مصحف و کتابته بقلم دقیق یعنی تنزیهًا، وفی الشامیه: وقوله أی إظهار إعرابه، تفسیر للنقط، قال فی القاموس: لا یظهر به الإعراب إنما یظهر بالشکل فکأنهم أرادوا ما یعمه، قوله وبه یحصل الرفق أشارا إلی ماروی عن ابن مسعود 'جردو القرآن' کان فی زمنهم' کم من شیئٍ یختلف باختلاف الزمان والمکان کما بسطه الزیلعی و غیره، و قوله: وعلی هذا أی علی اعتبار حصول الرفق، قوله و نحوها کالسجدة و رموز التجوید'' (شامی جلد ۹/ ص ۵۵۴/ کتاب الحظر والاباحة. فصل فی البیع۔ زکریا)

اعراب کے اظہار کی گنجائش اور اجازت کے ساتھ بعض لوگوں نے ان نشانات، یعنی اعراب کو قرآنی کلمات میں انضمام سے بچانے کے لئے یہ بھی کہا ہے کہ ان نشانات کو قرآنی عبارات والی روشنائی کے بجائے کسی دوسری روشنائی سے لکھا جائے۔

مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''عربی رسم خط میں زیر زبر وغیرہ حرکات اگر چہ کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہوتی ہیں، مگر اس کے باوجود علمائے سلف کو اس میں بھی اختلاف کی نوبت پیش آئی کہ قرآن کی عبارت پر یہ حرکات لکھنا بھی جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے اس کو بھی مکروہ سمجھا۔ بعض نے صرف مواضع مشکلہ میں بضرورت اجازت دی علامہ دانی جنھوں نے رسم خط قرآن پر مستقل کتاب تصنیف کی اس میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اعراب (حرکات زیر زبر وغیرہ) اور نقطے سُرخی سے لکھے جاویں، تاکہ قرآن کی اصل عبارت سے ممتاز رہیں۔

علامہ نوویؒ اور جمہور فقہاء نے اس کی مطلقًا اجازت دی، کیونکہ عربی رسم خط میں اعراب مستقل جداگانہ چیز ہے اُس کا اختلاط کلمات وحروف کے ساتھ نہیں ہوسکتا (کذا ذکرہ السیوطی فی الاتقان مفصلاً ص ۱۷۱ / جلد ۲)'' (حضرت مفتی محمد شفیعؒ۔ جواهر الفقہ ص ۷۷ جلد ا رسالہ تحذیر الاانام عن تغییر رسم من مصحف الامام)۔

دوسری زبان میں قرآن کتابت کے وقت اعراب بھی کلمات کا حصہ بن سکتے ہیں، جیسے کہ انگریزی اور ہندی میں اعراب حروف کی شکل میں آتے ہیں، اس طرح اعراب بھی کلام کا حصہ بن جائیں گے جو کہ قرآن میں زیادتی اور اضافہ ہوں گے، یہ بھی قرآن پر بہت ظلم ہوگا۔

قرآن کو دوسرے رسم الخط میں شائع کرنے کی سوچنے سے بھی پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا قرآنی کلمات اور الفاظ وعبارات جن کی کتابت حضرت عثمان کے دور میں ہوئی ہے ان کو کچھ بھی تبدیل کر سکتے ہیں؟ قرآن میں بہت سے مقامات پر ایسے کلمات آتے ہیں جن میں ت ی ب ث کا شوشہ نکلا رہتا ہے اور کوئی نقطہ وغیرہ نہیں ہوتا اور مروجہ قرأت (بروایت امام أبو حنص) میں انھیں پڑھا بھی نہیں جاتا ہے پھر بھی یہ شوشے چودہ سوسال سے لکھے

جارہے ہیں۔ ان شوشوں کا ترک گوارہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ حضرت عثمان غنی رضی تعالی عنہ کے ذریعہ جو مصحف تیار ہوا اس میں ادنی درجے کا ردوبدل کرنا بھی تحریف قرآن ہی ہے اس لئے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت بھی ممنوع ہے قرآن کی کتابت تو دور کی بات! قرآن میں حضرت عثمانؓ کے ذریعہ مقرر کردہ حرفوں کی ترتیب میں کمی بیشی اور حک وفک بھی گناہ عظیم ہے۔ مصحف عثمانی کے خلاف قرآن کی کتابت سے متعلق علامہ شرنبلائیؒ صاحب ''نورالایضاح'' کی ایک کتاب: ''النفحة القدسية فی أحكام قرأة القرآن و كتابته بالفارسية'' کے حوالے سے حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے عدم جواز کی تفصیلات ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اس میں مذاہب اربعہ، حنفیہ شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمۂ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے اور اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع وناجائز ہے اس کے چند جملے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں:

''... ومنها ما فی الدراية أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع، وأنه يكون معتمدًا زنديقًا.... ويحرم أيضا كتابته بقلم غير العربی انتهی (ثم قال الحافظ ابن الحجر) وفی كتابة القرآن العظيم بالعجمی تصرف فی اللفظ المعجز الذی حصل التحدی به بما لم يرو (إلی قوله)، لأن الألفاظ العجمية فيها تقديم المضاف إليه علی المضاف، ونحو ذالك مما يخل بالنظم ويشوش الفهم، وقد صرحوا بأن الترتيب من مناط الإعجاز وهو ظاهر فی حرمة تقديم آية علی آية يعنی كلمة كتقديم المضاف إليه علی المضاف ونحوه مما يحرم ذالك قرأة فقد صرحوا بان الكتابة بعكس السور مكروهة وبعكس الآيات محرمة (نصوص الجليلة ص ۲۵، جواهر الفقه جلد اول ص ۸۱/ ۸۲/ ۸۳/ ۸۴/ ۸۵/ رساله تحذير الانام عن تغيير رسم الخط من مصحف الامام)۔

ان اقتباسات سے ان تمام شبہات کا بھی پورا جواب ہوگیا جو رسم خط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں۔ کہ اس میں عجمیوں کے لئے قرآن پڑھنے میں سہولت ہے۔ خداوند سبحانہ نے قرأت قرآن کے آسان کردینے کا کھلے لفظوں میں خود اعلان فرمایا ہے: "ولقد يسرن القرآن للذ كر فهل من مد كر" (سورۂ قمر: ۱۷)، اس کا مشاہدہ سب کی آنکھوں کے سامنے آگیا کہ ہر ملک اور ہر زبان والے قرآن کو ایسا پڑھنے لگے کہ اپنی مادری زبان کی کتابوں کو بھی ایسا نہیں پڑھ سکتے۔ اور انھیں اہل عجم میں ایسے سیکڑوں حضرات ہوئے جو تجوید قرآن اور دیگر علوم قرآنیہ کے امام بن گئے۔ اس لئے تعلیم کی غرض سے بھی پورے قرآن کو عربی عبارت کے ساتھ یا تنہا کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں ہے۔ پورے قرآن کو غیر عربی میں لکھنے کا مطلب اصلی زبان عربی سے فرصت اور گلوخلاصی حاصل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اس لئے نہ غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت درست ہے اور نہ ہی عربی عبارت کے ساتھ۔

بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت:

قرآن کی کتابت سے متعلق کچھ آداب علامہ ابن عابدین شامی نے تحریر فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہے:

'' قوله ويكره تصغيره: أی تصغير حجمه وينبغی أن يكتبه بأحسن خط وابنيه علی أحسن ورق وأبيضه بأفخم قلم وأبرق مداد، ويفرج السطور ويفخم المصحف '' (شاميه ردالمحتار مع الدرالمختار كتاب الحظر ولا باحة فصل فی البيع۔ جلد ۹/ ص ۵۵۴/ زکریا)۔

بریل کوڈ کی ایجاد ایک خدائی نعمت ہے۔ اس کی ترقی اور ترویج میں مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔ یہ صرف نابینا افراد کے لئے ہی مفید نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ذریعہ نابینوں کی تعلیمی صورت حال کی اصلاح اور ترقی سے بینا افراد کو بھی اپنے بہت سے کاموں میں مدد حاصل ہوگی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بریل کوڈ قابل قدر تعلیمی ذریعہ ہے۔ اس میں قرآن کی اشاعت سے متعلق بھی مسائل قابل توجہ ہیں۔ بریل کوڈ چونکہ کوئی مستقل تحریر نہیں ہے، بلکہ نقطے کو حروف کے قائم مقام ٹھہرا کر انھیں سے مفرد اور مرکب حروف فرض کئے جاتے ہیں۔ ان مرکب حروف سے الفاظ اور کلمات مقرر ہوتے ہیں۔ اگر اس میں مزید کوشش کی جائے تو عام حروف والفاظ اور جملے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کی کامیابی حاصل کرنا اب کوئی مشکل نہیں ہے، کیونکہ مروجہ بریل کوڈ میں حروف نہیں ہوتے ہیں، بلکہ محض نقطوں کے جوڑ توڑ سے لٹریچر اور نصابی کتب تیار کرلی گئیں۔ تو پہلے سے موجود اور قائم حروف کو بدرجہ اولی نابینا افراد کے لئے مفید بنایا جاسکتا ہے۔ وہ دینی تعلیمی ادارے جو بریل کوڈ کی مدد سے نابینا افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ کررہے

ہیں۔وہ اس عظیم اختراعی کام میں سبقت حاصل کر سکتے ہیں۔اس لئے انھیں اللہ کا نام لے کر اس کام کو عملی شکل دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔اللہ تعالی کسی مسلمان کو اس کی توفیق دے جو بریل کوڈ کو زمین بنا کر نقطوں کے بجائے حروف کے ابھار اور لمس سے نابینا افراد کی تعلیم کا سلسلہ شروع کرے۔ امین ثم آمین۔اگر ایسا ہو جائے کہ نابینا کو پڑھنے کے لئے بالکل اسی طرح حروف جوڑے جائیں اور اُن کے فہم وادراک کے لئے بریل کوڈ کی طرح کاغذ پر ابھار رکھا جائے۔تو پھر اس کی کتابت میں ابھار کی پوری اجازت کے ساتھ حروف اور تحریر میں مصحف عثمانی کا اہتمام اور اتباع کرنا ضروری ہے۔

چونکہ بریل کوڈ حروف ہی نہیں ہیں۔اس لئے اس میں مصحف عثمانی کی اتباع تو دور کی بات! اس کو عربی تحریروں سے بھی مربوط نہیں کیا جاسکتا ہے۔جس کے متعلق کوئی شرعی حکم لگایا جاسکے ایسی غیر واضح تحریروں سے متعلق علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

"ومستبين غير مرسوم كالكتابة على الجدران و أوراق الأشجار أوعلى الكاغذ لا على وجه المعتاد. فلا يكون حجة إلا بانضمام شيئي أخر إليه...... لأن الكتابة قد تكون للتجربة ونحوها و بهذه الأشياء تتعين الجهة... و غير مستبين كالكتابة على الهواء أوالماء و هو بمنزلة كلام غير مسموع ولا تثبت به شيئي من الأحكام. وإن نوى اه" (شامی جلد ۱۰/ص۴۶۱/ زکریا)۔

حروف تہجی پر احکام جاری ہوتے ہیں۔

" قوله كالتهجي قال في الوهبانية: وليس التهجي في الصلاة بمفسد ولا مجزئ عن واجب الذكر فاذكروا والمسئلة في القنية: قال الشرنبلالي في شرحها صورتها شخص قال في صلاته س ب ح ا ن ال ل ه بالتهجي أو قال أ ع ذ ب ا ل ل ه م ن ال ش ط أن لاتفسد. لكن في البزازية خلافه حيث قال: تفسد بتهجية قدر القرأة. لأنه من كلام الناس: ولا يجزئ عن القرأة في الصلاة؛ لأنه لم يقرأ القرآن ولا يفسد؛ لأنه الحروف التي في القرآن اه "(شامی جلد۲/۱۸۶/ زکریا)۔

لیکن عربی حروف اور حرفوں کی ترکیب اور اس سے الفاظ وکلمات کی وضع کے لئے بھی بریل کوڈ کے نقطے مقرر ہیں۔اس لئے قرآن کو بریل کوڈ میں لکھنے کے لئے سب سے پہلی بات ترتیب قرآنی کا التزام ضروری ہے۔تاکہ تلاوت اور ورق گردانی کی ترتیب درست رہے۔یہ نقطے چونکہ اپنی ذات میں حروف کی کرامت سے خالی ہیں، اس لئے ان نقطوں کو قرآنی عظمت نہیں حاصل ہوگی، البتہ یہ اعراب قرآنی کے درجے میں ہوسکتے ہیں، کیونکہ غیر عربی داں، جس طرح اعراب کی مدد سے قرآن پڑھتا ہے اور اسی طرح یہاں، نابینا ان نقطوں کی مدد سے! جس طرح عجمی بینا کے لئے اعراب، قرأت قرآن میں معاون ومددگار ہیں اسی طرح یہ نقطے نابینا کے لئے۔اعراب اور نقطوں میں مزید فرق یہ ہے کہ اعراب، قرآنی حروف کے ساتھ ہوتے ہیں اور نقطے قرآنی حروف کے ساتھ نہیں ہوتے ہیں، اس لئے ان کا احترام تو کرنا چاہئے اور کتب فقہ اور دوسرے دینی رسائل اور کتابوں کی طرح ان کا اکرام کرنا ضروری ہے، لیکن قرآن کی طرح انھیں چھونے کے لئے وضو کا اہتمام کرنا لازم نہیں ہونا چاہئے، البتہ تلاوت کے لئے باوضو ہونے کی جو فضیلت ہے اس کا التزام کرنا چاہئے (الردمع شامی ۱/۳۲۱ زکریا)۔

موبائل میں قرآن مجید:

موبائل میں قرآن درحقیقت اسی طرح ہوتا جس طرح انسان کے دماغ اور سینے میں ہوتا ہے اور یہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔وہ خواہ کسی بھی (پاک، ناپاک) حالت میں ہو۔اس لئے موبائل میں قرآن کی صوتی ریکارڈنگ اور تلاوت کے لئے قرآنی تحریروں کو محفوظ کرنا درست ہے۔یہ ریکارڈنگ یا تو موبائل میں ہوتی، یا پھر چپ میں۔دونوں کے احکام ایک ہی ہیں۔جب تک ان کو جاری On Or Open نہ کیا جائے اس وقت تک ان کی آواز یا تحریر دکھائی اور سنائی نہیں پڑتی ہے۔کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت اسکرین پر کرلی جاتی ہے۔اس کو باوضو اور بے مس کرنے سے متعلق مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔لیکن چونکہ یہ اصل کتابت کانچ کے اندر، بلکہ میموری میں ہے، اس لئے اوپر ہاتھ لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اس طرح تحریروں کو اس طور پر چھونے سے متعلق متعدد نظائر کتب فقہ موجود ہیں۔بغیر وضو کتابت قرآن سے متعلق مسئلہ بیان کرتے ہوئے "ردالمحتار" کی ایک عبارت پر علامہ شامی کی تشریح درج ذیل ہے:

”ولا تكره كتابة القرآن والصحيفة أو اللوح على الأرض عند الثاني و قوله على الصحيفة قيد بها، لأن نحو اللوح لا يعطى حكم الصحيفة؛ لأنه لا يحرم إلا مس المكتوب“ (شامية جلد ۱/ ۳۱۷/ زكريا)۔

موبائل کے اسکرین پر قرآن کی آیت دکھتی تو ہے لیکن اس کے اوپر کانچ GLASS ہوتا ہے وہ مکتوب سے اگرچہ جڑا ہوتا ہے، لیکن یہ کتابت، کتابت الصحیفہ نہیں ہے، اس لئے اوپر کانچ کو بلا وضو چھوا جاسکتا ہے۔ نیز ایک اور جزئیہ سے اس کو تقویت ملتی ہے کہ تعویذ جس میں آیت قرآنی لکھی ہو۔ اس پر موم لگایا ہو۔ اس کو کسی غلاف میں رکھا جائے تو وہ غلاف اگرچہ اس سے متصل ہے، لیکن درمیان میں موم کی وجہ سے غلاف کو منفصل مانا جائے گا۔ اور اس کو اس دوسرے غلاف سے چھونا اور اس کے ساتھ بیت الخلا میں داخل ہونا جائز ہے۔

”قوله رقية والظاهر المراد بها ما يسمونه الآن بالهيكل والحمائل المشتمل على الآيات القرآنية، فإذا كان غلافه منفصلًا عنه كالمشمع ونحوه جاز دخول الخلاء به ومسه وحمله لكتب، ويستفاد منه ما كتب من الآيات الدعا والثناء، لا يخرج عن كونه قرآنًا بخلاف قرأته بهذه النية، فإن النية تعمل في تفسير المنطوق المكتوب“ (الرد مع الشامية جلد اول ص ۳۲۱/ ۳۲۲/ زكريا)۔

موبائل اسکرین پر مکتوب آیات اور سورت کو انگوٹھی پر تحریر، اسم الٰہی کے مسئلہ سے بھی مربوط کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ موبائیل فون، ہر وقت لوگ پاس ہی میں رکھتے ہیں اس لئے قرآن کو بیگ وغیرہ میں رکھنے کے جو احکام ہیں وہ بھی ایسے موبائیل کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اسکرین کو چھونے اور ایسے موبائل کو بیگ وغیرہ میں رکھنے سے متعلق فتاویٰ بزازیہ کی درج ذیل عبارت کافی واضح ہے:

”ويكره وضع قرطاس عليه اسم الله تعالى تحت الطُّنفُسَة والجلوس عليها وقيل: لا يكره كما لو وضعه في بيت وجلس على سطحه ولو وضع المصحف على الخُرْج ركب عليه في السفر لا بأس كوضع المصحف تحت رأسه للحفظ ولغيره يكره... دخل الخلاء وفي جيبه درهم عليه اسم لله تعالى أو آية من القرآن لا بأس به ولو على خاتمه اسم الله تعالى يجعل الفص باطن الكف“ (الفتاوى البزازية جلد اول على هامش الهندية الجزأ الرابع ص ۴۳ مطبوعه دار الكتاب ديو بند نيز ديكهئے: ا رات النوازل جلد ۳ ص ۷۵/ ايفا پبليكيشنز دہلی)۔

موبائل کے باڈی کو غلاف مان کر اسکرین پر موجود قرآنی عبارتوں کو بلا وضو چھوا جاسکتا ہے۔ لیکن عام حالات میں جس طرح قرآن کو بلا وجہ کھلا نہیں رکھنا چاہئے اسی طرح اسکرین پر عام حالات میں بلا وجہ قرآن کی عبارت نہ رکھی جائے، تا کہ بے ادبی سے حفاظت رہے۔



قرآن مجید کے متن و ترجمہ کی کتابت و اشاعت

مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی[1]

۱- متن قرآن کے بغیر کسی بھی زبان میں تنہاء ترجمہ قرآن کی اشاعت کسی بھی حال اور کسی بھی عذر مزعومہ کے پائے جانے کی صورت میں درست نہیں ہے اور نہ اس کا خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا جائز ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی: ''صاحب نور الایضاح'' رقمطراز ہیں

''وأما كتابة القرآن بالفارسية فقد نص عليها فى غير ما كتاب من كتب ائمتنا الحنفية المعتمدة منها ما قاله مؤلف الهداية الإمام الأجل شيخ مشائخ الاسلام حجة الله تعالى على الأنام برهان الدين أبوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى الكبير رحمه الله تعالى فى كتابه التجنيس والمزيد ما نص: ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمرالقرآن انتهى''۔

عدم جواز کہ باوجود اگر بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کردے تو اسے بلا وضو چھونے کی اجازت نہیں ہوگی اس لیے کہ وہ قرآن کے حکم میں ہوگا، جیسا کہ خلاصہ نامی کتاب میں ہے۔

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبى حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح هكذا فى الخلاصة (جلد ۱/ ۲۲، بحواله جواہر الفقه جلد ۱/ ۱۱۳)۔

۲- غیر عربی رسم الخط (ہندی، انگریزی، وغیرہ) میں قرآن کا چھاپنا درست نہیں ہے ''اجماع صحابہ و تابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصا کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحۃً تجویز نہیں کر سکتا۔

''وقال اشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء قال: لا، إلا على الكتبة الأولى رواه الدانى فى المقنع، ثم قال: ولامخالف له من علماء الأمة''۔

اسکے بعد لکھا ہے:

''وقال الإمام احمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان فى واو أو ياء أوالف أو غير ذلك'' (اتقان ص ۱۶۷، ج ۲)

''وقال البيهقى فى شعب الإيمان: من يكتب مصحفا فينبغى أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولايخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلباولسانا وأعظم أمانة فلاينبغى أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم''

[1] مفتی دار الافتاء مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم، خانقاہ بوڑیہ 135101 ضلع یمنا نگر، ہریانہ۔

اس کے چند صفحہ بعد تحریر فرمایا ہے:

''وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء قال ويحتمل الجواز؛ لأنه قد يحسنه من يقرأ بالعربية والأقرب المنع كما تحرم قرائته بغير لسان العرب ولقولهم القلم أحد اللسانين والعرب لاتعرف قلماغير العربي وقال تعالى: بلسان عربي مبين'' (اتقان ص/ ۱۷۱/ج/ ۲ بحوالہ جواہر الفقہ ۱/۸۵)۔

جس زبان میں ہم عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے قرآن کی کتابت کریں گے اس میں بھی عربی حروف کے نہ ہونے اور اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کرنے کی وجہ سے استعلاء، اطباق، اور استطالت وغیرہ کو ضائع کردیں گے، نیز عربی میں اعراب کو لفظوں سے جدا لکھا جاتا ہے، لیکن ہندی انگریزی وغیرہ میں لفظوں کے اندر لکھا جاتا ہے اس سے بھی تحریف کی شکل پیدا ہوگی، لہٰذا مذکورہ بالا وجہوں کی وجہ سے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے قرآن کی کتابت دوسری زبان میں کرنا اور دونوں کا ساتھ اشاعت کرنا یا الگ اشاعت کرنا دونوں ناجائز ہوگا۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت درست نہیں ہے، کیونکہ یہ نہ تو رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی جس رسم عثمانی کی کسی بھی صورت میں مخالفت کی اجازت نہیں دی گئی ہے خواہ وہ رسم الخط عربی ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ مفتی شفیع صاحبؒ اپنے فتوی میں تحریر فرماتے ہیں'' خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم وواجب ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگر چہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں، مثلا اوائل سورت میں "بسم الله" کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے اور "اقرأباسم ربك" میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگر چہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں مگر باجماع امت اسی کی نقل واتباع کرنا ضروری ہے اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے''۔

۴- اگر بریل کوڈ میں قرآن مجید چھاپ دیا گیا تو وہ حکما قرآن ہوگا اس کو چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہوگا، جیسا کہ خلاصہ نامی کتاب میں ہے

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح (هكذا في الخلاصة (جلد ۱/ ۳۲) بحوالہ جواہر الفقہ جلد ۱/ ۱۱۳)

چھاپنا درست نہیں، لیکن ایسا کرلیا گیا تو اس کا ادب واحترام ہر حال میں قرآن جیسا ہی ہوگا اس کی بے ادبی جائز نہ ہوگی۔

''ثم كتب عليه شيخ الأئمة الشافعية بعصرنا و مصرنا هو العلامة شمس الدين محمد شوبري الشافعي حفظه الله تعالى ما صورته أنه إذا كتب بغير العربية هل يحرم مسه و حمله أولا، إلأظهر في الجواب نعم، إذلا يخرج بذالك عن كونه قرانا، وإلا لم تحرم كتابته فليراجع انتهى''۔

۵- موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کے حروف دکھائی دے رہے ہوں تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہے۔

''يمنع دخول مسجد (الى قوله) مسه أي القرآن، ولوفي لوح أو درهم أو حائط'' (شامی زکریا ۱/ ۴۸۸)

جب وہ پروگرام بند ہو یا موبائل بند ہو تو پھر موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوگی

''فلو نقش اسمه تعالى او اسم نبيه ﷺ استحب أن يجعل الفص في كمه إذا دخل الخلاء'' (شامی زکریا ۹/ ۵۱۹)۔

☆☆☆

بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت

مولانا عبدالعظیم ندوی[1]

قرآن پاک نظم و معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے، کہ "ھو النظم والمعنی جمیعًا" اس لئے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پر ان دونوں کی حفاظت لازم اور ضروری ہے، اور تنہا ترجمۂ قرآن متن سے منفصل کر کے شائع کرنے سے بہت سے مفاسد حالیہ ومآلیہ پیش آنے کا امکان ہے۔ جن مفاسد کی طرف بہت سے فقہاء اسلام نے اشارہ فرمایا ہے، ہم ان ہی فقہاء میں سے فقیہ بے مثال حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے فتوی میں موجود چند مفاسد کو اختصاراً پیش کرتے ہیں۔

۱- تشبہ باہل کتاب لازم آتا ہے اور وعید "من تشبہ بقوم فھو منھم" (ابوداؤد کتاب اللباس/۵۵۹) کی وعید کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

۲- غیر حامل المتن ترجمہ کی اشاعت سے احتمال قوی مثل تورات وانجیل کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے۔ اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام۔

۳- عامۃ الناس ایسے ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اسکے لئے وضوء کا انتظام نہ کرینگے، یہ بھی ایک ناجائز امر کا سبب ہوگا، حالانکہ ترجمۂ قرآن کو بھی بلا وضوء چھونا بصراحت فقہاء کرام جائز نہیں۔ "عالمگیری" میں ہے:

"ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة. وكذا عندهما على الصحيح" (۱/۳۹)۔

۴- غیر قابل انتفاع ہونے کی صورت میں ایسے ترجمہ کے اوراق کو دیگر اوراق کی طرح استعمال کرینگے، جیسا کہ اسکا مشاہدہ ہم اپنے زمانہ میں کرتے ہیں کہ اخبارات میں چھپی ہوئی مترجم آیات واحادیث والے ورق کو عامۃ الناس عموماً اپنے استعمالات میں لاتے ہیں۔

۵- ترجمہ علحدہ ہونے کی صورت میں اصل سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات ترجموں کا اختلاف قرآن پاک کے اختلاف کی طرف منسوب ہوگا، اور اصل سامنے ہونے کی صورت میں یہ اختلاف مترجمین کی طرف منسوب ہوگا۔

صاحب ہدایہ شیخ برہان الدین نے اپنی "کتاب التجنیس والمزید" میں ارقام فرمایا ہے:

"ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع. لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة. ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن" (جواہر الفقہ ج ۲ ص ۱۰۴ زکریا بکڈپو دیوبند)۔

ہاں ایک دو آیتوں کا ترجمہ کسی زبان میں تنہا شائع کرنے کی اجازت فقہاء کے یہاں ملتی ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

"وفي الكافي: إن اعتاد القرائة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفًا بها يمنع. فانه فعل أية او ايتين لا. فان كتب القرآن وتفسير كل حرف و ترجمته جاز" (فتح القدیر ا/۲۹۱)۔

۲- مولانا ظفر احمد عثمانی ترجمۂ قرآن کو تنہا شائع کرنے کے سلسلہ میں اپنے فتوی میں رقم طراز ہیں:

کہ ترجمہ کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں ترجمہ کا انفصال قرآن سے ممکن ہے، اگر کوئی شخص اس کو قرآن سے بالکل علحدہ رکھنا

---

[1] مدرسہ جامع العلوم، دساڈا، ضلع سریندر نگر، گجرات۔

چاہے تو رکھ سکتا ہے، حالانکہ ترجمۂ قرآن اس طرح پر لکھنا جائز نہیں کہ وہ قرآن سے منفصل وعلحدہ ہوسکے، بلکہ ترجمہ کو متن کے ساتھ ایسا ملحق ہونا چاہئے کہ اس سے جدا نہ کیا جاسکے، ورنہ بعض خریدار متن عربی کو الگ اور ترجمہ کو الگ رکھنا چاہیں گے جس سے وہ ترجمہ مثل انجیل وتورات کے غیر حامل المتن ہوگا اور اس سے اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں میں کتب سابقہ کی طرح لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن کا ترجمہ ہی رہ جاوے، اور متن گم ہوجائے یا اس سے توجہ کم ہوجاوے (امدادالاحکام ۱/۲۳۹ زکریا بکڈ پو دیوبند)۔

فقہاء حنفیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے یہاں بھی اس کی حرام اور ناجائز ہونے کی صراحت ملتی ہے مثال کے طور پر ہم فقہ شافعی کے مشہور عالم ومحدث کبیر حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کے فتاوی کی عبارت نقل کرتے ہیں:

"وقد سئل (ابن حجر) هل تحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية كقرائته ؟ فأجاب بقوله قضية ما فى المجموع، الإجماع على التحريم"

اسی طرح فقہ حنبلی کے مشہور فقیہ علامہ ابن قدامہ حنبلی علیہ الرحمہ نے المغنی کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے:

"استمر الإجماع على قرائة جميع المسلمين القرآن فى الصلوة وغيرها بالعربية كأذكارها وسائر الأذكار والأدعية المأثورة على كثرة الأعاجم"

الحاصل فقہاء کرام کی مذکورہ بالا عبارات صریحہ کی روشنی میں یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ترجمۂ قرآن غیر حامل المتن کی اشاعت بہت سے مفاسد کا پیش خیمہ ہے، اس لئے اس کو شائع کرنا بالکل ناجائز اور حرام ہے اور کیوں ناجائز نہ ہو جبکہ صحابۂ کرامؓ کے دور مقدس میں جب حضرت عثمانؓ نے جمع قرآن کا ارادہ فرمایا اور حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی کو جمع کا حکم دیا اور حضرت زیدؓ کئی زبانیں جانتے تھے اسکے باوجود قرآن کو دوسری زبانوں میں تراجم کی شکل میں نہیں لکھوایا۔ جبکہ اس زمانہ میں زیادہ ضرورت تھی آج سے۔

خلاصہ یہ کہ ترجمۂ قرآن غیر حامل المتن کی اشاعت، لکھنا، لکھوانا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے اور جب اس کا شائع کرنا حرام ہوا تو اس کو خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا تعاون علی الاثم کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔

"ولا تعاونوا على الأثم والعدوان" (سورة المائدة:۲)۔

۳- ترجمۂ قرآن غیر حامل المتن کی اشاعت ناجائز اور حرام ہے، تاہم اگر کوئی شائع کرے تو اس کو بے وضوء ہاتھ لگانا احتیاط کے خلاف ہے، اور مکروہ ہے اسلئے کہ کلام الٰہی کا اصل مقصود یہی معانی ومفاہیم ہیں۔

"ولو كان القرآن مكتوبًا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وكذا عندهما على الصحيح" (الفتاوى الهنديه ۱/۳۹)

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت

کتب سماویہ میں قرآن کریم ہی کا یہ امتیاز اور خصوصیت ہے، کہ نزول وحی کے برسہا برس گذرنے کے باوجود ادنی سی تحریف لفظی ومعنوی سے محفوظ رہا، ارشاد ربانی: "إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحفظون" (سورۂ حجر:۹) کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ خدائے وحدہ لاشریک لہ نے ہر دور اور ہر قرن میں امت میں ایسے افراد کو کھڑا کردیا جنہوں نے حفاظت قرآن کا مہتم بالشان فریضہ مختلف طرق سے کما حقہ انجام دیا۔

حتی کہ رسم الخط عثمانی کی بھی حفاظت فرمائی، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا لغت قریش پر تحریر فرمایا ہوا قرآن جسکو اصطلاح میں "مصحف امام" سے تعبیر کرتے ہیں تا حال امت کا ہر فرد بشر اس کی اتباع کرتا رہا۔ اور یہی تقاضا تھا ارشاد نبوی ﷺ "عليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين"، "المهديين من بعدى" (ترمذی، ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۶۰۷، طبرانی ۱۸/۲۴۷) کا۔

آج کی اس سائنسی وترقی پذیر دنیا میں جبکہ تعلیم وتعلم اور نشر واشاعت کا دور دورہ ہے، قرآن پاک کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کئے جارہے ہیں، یقینا یہ ایک مستحسن اور پسندیدہ اقدام ہے، لیکن ہمارے بعض ناواقف مسلمان عربی رسم الخط کو دوسری زبانوں انگریزی، ہندی، اردو وغیرہ میں بدلنے کی آواز اٹھارہے ہیں، جو نہایت ہی خطرناک اور نامناسب عمل ہے، اس لئے کہ عربی زبان بڑی نزاکت ولطافت کی حامل زبان ہے، معمولی حرکت کے فرق سے بھی معنی ومقصود بدل جاتے ہیں۔

سوال نامہ میں دو سوالات اس سے متعلق ہیں ایک تنہا دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کا، دوسرا رسم عثمانی کے ساتھ اس کو شائع کرنے کا؟

دونوں سوالوں کا جواب تقریباً ایک ہی ہے اسلئے ہم دونوں کے متعلق ساتھ میں تحریر کئے دیتے ہیں:

قرآن پاک کی عربی عبارت کو غیر عربی رسم الخط میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو ایک رکن ہے، اس کا ترک لازم آتا ہے، اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے، اسلئے کہ قرآنی رسم الخط توقیفی اور سماعی ہے، نیز امت کا عمل تواتر کے ساتھ اسی سے وابستہ رہا ہے، اسکی مخالفت لازم آتی ہے، اور بائیں جانب سے شروع کرنا خلاف سنت اور خلاف ادب ہے اسکا ارتکاب ہوتا ہے۔

اس قدر مفاسد کے ساتھ قرآن پاک کو دیگر رسم الخط میں تحریر کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دی جاسکتی، جبکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اسلامی فتوحات کی وجہ سے مسلمان کئی عجمی ممالک میں اسلامی پرچم لہرارہے تھے، اسکے باوجود حضرت عثمانؓ نے صرف عربی زبان ہی میں قرآن جمع کروایا، اور اس کے نسخے مختلف ممالک میں بھیجے، نیز آج کے دور کے مقابلے میں اس دور میں تعلیم کا شیوع اتنا نہیں تھا کہ مختلف زبانیں سیکھی جائیں۔ اسکے باوجود دوسری زبانوں میں نہ لکھوانا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ یہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ اور اسکی وجہ سے قرآن کے بعض حروف ذ ز ض ظ وغیرہ کا وجود دوسری زبانوں میں نہیں ہے، ان زبانوں میں سب کا تلفظ یکساں ہوتا ہے۔

اس طرح قرآن میں بعض حروف کی کمی، اور کبھی بعض حروف میں اضافہ لازم آتا ہے، جیسے انگریزی میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے۔ اور قرآن میں کمی یا بیشی تحریف کا مترادف ہے۔ اس سلسلہ میں سلف کی عبارت ملاحظہ ہوں:

۴- علامہ سیوطی علیہ الرحمہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''الاتقان'' میں لکھتے ہیں:

'' القاعدة العربية أن اللفظ يكتب بحروف هجائية مع مراعاة الابتداء به والوقف عليه وقد مهد النحاة له أصولا وقواعد، وقد خالفها فى بعض الحروف خط مصحف الإمام۔ وقال اشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ماأحدثه الناس من الهجاء ؟فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى۔ رواه الدانى فى '' المقنع '' ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة۔ وقال فى موضع اخر: سئل مالك عن الحروف فى القرآن مثل الواو و الألف. أترى أن يغير من المصحف اذ وجد فيه كذلك ؟ قال : لا۔ قال أبوعمرو: يعنى الواو و الألف المزيد تين فى الرسم الممدود تين فى اللفظ نحو : (اولو)۔

وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة مصحف الإمام فى واو أو يا أو ألف أو غير ذلك۔

وقال البيهقى فى شعب الايمان: من يكتب مصحفا، فينبغى أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف، ولا يخالفهم فيه، ولا يغير مما كتبوه شيئًا، فإنهم كانوا اكثر علمًا، وأصدق قلبًا ولسانًا، وأعظم أمانةً منا۔ فلاينبغى أن نظن بأنفسنا استدراكًا عليهم '' (الاتقان ۲/ ۴۰۳ فیصل بکڈپو دیوبند)۔

مذکورہ نصوص صریحہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسم عثمانی سے ہٹ کر کسی بھی کمی بیشی کو علماء امت نے کبھی سند جواز نہیں دیا۔ علاوہ ازیں ائمہ اربعہ اور امت کا اجماع بھی اسکے عدم جواز پر ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الاتقان میں اسکی صراحت فرمائی ہے۔

''لم يجوز احدٌ من الأئمة الأربعة كتابة القرآن بغير العربية ''۔

نیز حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی کتاب جواہر الفقہ میں بھی مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد کے حوالہ سے رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع کو بارہ ہزار صحابۂ کرامؓ کے اجماع سے ثابت کیا ہے، اور فرمایا ہے۔

''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ماتقدم من إجماع الصحابة عليه، وهم زهاء اثنى عشر الفًا والإجماع حجة حسبما تقرر فى اصول الفقه (۲ / ۸۶) وفى شرح ابن غازى وقد نقل الجعبرى وغيره إجماع الأئمة الأربعة على وجوب اتباع مرسوم المصحف

العثمانی (ص ۱۴۳) وقلت: نبه علی وجوبه من علمائنا الحنفیة العلامة الملاعلی القاری فی المنح الفکریة'' (ص ۸۵) (امداد الاحکام ۱/ ۲۲۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ رسم عثمانی کو بدل کر دوسری کسی بھی زبان میں قرآن پاک کو لکھنا باجماع امت وائمۂ اربعہ ناجائز اور حرام ہے۔

۵- غیر عربی داں حضرات کی سہولت کا جو عذر پیش کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں علامہ ابن حجر کے فتوی کی عبارت تحریر کرنا کافی ہوگا، فرماتے ہیں:

''وفی کتابة القرآن العظیم بالعجمی تصرف فی اللفظ المعجز الذی حصل التحدی به بما لم یرو، لأن الألفاظ العجمیة فیها تقدیم المضاف إلیه علی المضاف ونحو ذلك مما یخل بالنظم ویشوش الفهم''۔ اسکے بعد فرماتے ہیں: ''وزعم أن کتابته بالعجمیة فیها سهولة للتعلیم کذب مخالف للواقع والمشاهدة فلایلتفت لذلك علی أنه لو سلم صدقه لم یکن مبیحا لإخراج ألفاظ القرآن عما کتب علیه وأجمع علیه السلف والخلف'' (جواہر الفقہ ۲/ ۸۳)۔

الغرض قرآن پاک کو دیگر رسم الخط میں لکھنے سے گریز کیا جائے اس لئے کہ قرآن پاک کے پڑھنے اور تلاوت پر جو فضائل وارد ہوئے ہیں وہ سب عربی زبان کے پڑھنے کے سلسلہ میں ہیں بصورت دیگر وہ شخص فضائل سے محروم ہوگا، اور بسا اوقات تحریف کی وجہ سے بجائے ثواب کے عقاب کا مستحق ہوگا، اور حدیث پاک ''رب تال للقرآن والقرآن یلعنه'' کا مصداق ہو جائے گا۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

نابیناؤں کی تعلیم کی سہولت کے خاطر بریل کوڈ جیسی مخلصانہ کوششوں کا اسلام خیر مقدم کرتا ہے، بشرطیکہ حدود شریعت کے دائرہ میں ہو۔ بریل کوڈ جیسا کہ اس کی کیفیت سوال نامہ میں مذکور ہے اور بندہ نے اسکا خود مشاہدہ بھی کیا ہے، کہ وہ موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے، جسکو نابینا لوگ اپنی انگلیوں کے لمس سے پڑھتے ہیں، اس لئے اسطرح قرآن پاک کو تیار کرنا عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کی مخالفت کا سبب نہیں ہوسکتا، چونکہ رسم الخط حروف وسکنات کے مجموعہ کا نام ہے اور بریل کوڈ کی حیثیت ایک علامت اور اشارہ کی ہے، اس لئے رسم عثمانی کے مفاسد رسم الخط سے متعلق سوال کے جواب میں جو مذکور ہیں وہ یہاں پیش نہیں آسکتے، نیز یہ قرآن ضرورۃً صرف نابیناؤں کے لئے ہوتا ہے اس لئے اس طرح لکھنے سے اصل قرآن کے ضائع ہونے کا مفسدہ لازم نہیں آتا ہے، اس لئے بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کی ایسے محتاج نابیناؤں کے لئے گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

بریل کوڈ میں تیار کئے ہوئے قرآن کو چھونے کے لئے باوضوء ہونا ضروری ہے یا وضوء کے بغیر بھی اسکو چھوا جاسکتا ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے قرآن کے کیسٹ کو چھونے کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے ''مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ''قرآن'' کو چھونے کی ممانعت کا اصل سبب اسکا ''مکتوب ہونا'' نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کا احترام ہے، یہ تحریر الفاظ قرآنی کا نقش ہے جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے ٹھیک اسی طرح ''کیسٹ'' آواز قرآنی کا نقش ہے جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے، اس لئے اگر کاغذ کا احترام واجب ہو جن میں الفاظ محفوظ کئے گئے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان آیتوں کا احترام واجب نہ ہو جن میں قرآن کی آواز کو محفوظ کیا ہو۔ اس لئے آیات قرآنی کے کیسٹ بھی باوضوء چھونا مناسب نہیں ہے اور کم سے کم احتیاط کے خلاف ہے''۔

مولانا کے اس فتوی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بریل کوڈ کی حیثیت ایک علامت کی ہے نابیناؤں کے لئے جس کے سہارے وہ قرآن پاک کو پڑھ سکتے ہیں؛ تاہم اس کو فی معنی الکلمۃ قرآن مقدس نہیں کہا جاسکتا اسلئے کہ قرآن کی تعریف اصولیین نے ''هو النظم والمعنی جمیعا'' سے کی ہے اور یہاں کوئی عبارت موجود نہیں ہے، اس لئے ایسے قرآن کو بلاوضوء چھونا احتیاط کے خلاف ہے، اقرب الی التعظیم یہی ہے کہ اسکو بے وضوء نہ چھوا جائے، اس لئے کہ یہ ذریعہ اور سبب ہے مقدس قرآن کے پڑھنے کا تو جس طرح قرآن کی تعظیم ضروری اس طرح لہ کی بھی کرنی چاہئے۔ مخصوص آداب واحکام کا جہاں تک تعلق ہے تو جس طرح تمام ذرائع علم کے احترام کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایسے قرآن کا بھی احترام کرنا چاہئے۔ اور اس کو بلا حائل

سیدھا زمین پر نہیں رکھنا چاہئے اسی طرح ناقابل انتفاع ہونے کی صورت میں اس کو عام استعمالات میں استعمال نہیں کرنا چاہئے، نیز اس قرآن کو صرف وہی لوگ استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں جو بصارت سے محروم ہیں۔

بقیہ لوگ رسم عثمانی والے قرآن پاک ہی کی تلاوت فرمائیں۔

موبائل پر قرآن مجید:

موبائل کی اسکرین پر اگر قرآن مجید نمایاں ہوں تو فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکو بے وضوء چھونا احتیاط کے خلاف ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"(ومسه) أي القرآن ولو في لوح أو حائط أو درهم أو حائط لكن لايمنع إلا من مس المكتوب" (۱/۴۸۸ شامی زکریا)

ہماری اس بات کی تائید وتوثیق مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری کے فتوی سے ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں

"جس اسکرین پر قرآن کی آیات نمایاں ہوں تو اسکرین کو بلا وضوء چھونا احتیاط کے خلاف ہے" (بحوالہ مسائل موبائل صفحہ ۵۱)۔

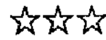
اور موبائل کو ہاتھ میں لینے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سلسلہ میں فقہی جزئیات کی روشنی میں بعض فقہاء کی رائے کے مطابق بلا وضوء ہاتھ میں لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے،

"(ومسه) أي القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط لكن لايمنع إلا من مس المكتوب"

لیکن اقرب الی التعظیم کے پیش نظر بلا وضوء ہاتھ نہ لگانا تقاضائے احتیاط ہے۔

"والمنع أقرب إلى التعظيم كما في البحر أي والصحيح كما تذكره" (شامی زکریا ۱/ ۴۸۸)۔

البتہ موبائل پر ایک زائد کور اسکی حفاظت کے لئے لگایا جاتا ہے اسکو بلا وضوء چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی حیثیت غلاف کی ہے، جو انفصال کا حکم رکھتا ہے، جس طرح قرآن شریف پر منفصل غلاف ہو تو اس کو بے وضوء ہاتھ لگایا جاسکتا ہے، اسی طرح اسکو بھی ہاتھ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔



عربی متن کے بغیر ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا اسرار احمد آبادی[1]

بغیر عربی متن کے خالص قرآن کریم کا ترجمہ لکھنا، لکھوانا، شائع کرنا باجماع امت اور باتفاق ائمۂ اربعہ ممنوع اور حرام ہے، اور جب لکھنا اور شائع کرنا حرام ہے تو اس کی خرید وفروخت اور ہدیہ دینا وغیرہ بھی اعانت علی المعصیت کے سبب ممنوع اور حرام ہوگا۔

علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نورالایضاح'' نے ایک مستقل رسالہ بنام ''النفحۃ القدسیۃ فی احکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ'' لکھا ہے، جس میں احناف کی متعدد کتب معتبرہ اور ائمہ ثلاثہ کی کتب سے بلانظم قرآنی محض ترجمہ لکھنے کی حرمت ثابت کی ہے، جس کی عبارت کے اقتباسات یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

''وأما كتابة القرآن بالفارسية، فقد نص عليها فى غير ماكتاب من كتب ائمتنا الحنفية المعتمدة۔ منها ماقاله مؤ لف الهداية... فى كتابه التجنيس والمزيد: ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع ،لأنه يؤدى للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة. ولأنه ربما يؤدى إلى التهاون بأمر القرآن۔

ومنها مافى معراج الدراية: أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع وأنه معتمده زنديقا۔

ومنها مافى الكافى: أنه لو أراد أن يكتب مصحف بالفارسية يمنع۔

ومنها ماقال فى شرح الهداية فتح القدير للمحقق الكمال ابن الهمام وفى الكافى: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع. فإن فعل آية او آيتين لا. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز.

أماعندالأئمة الشافعية فقد قدمنا عن الإمام الزركشى احتمال الجواز وإن الأقرب المنع من كتابة القرآن بالفارسية كماتحرم قراء ته بغير لسان العرب، وقد أفاد شيخ الإسلام العلامة ابن حجر العسقلانى الشافعى فى فتاواه تحريم الكتابة، وقد سئل هل تحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية كقراء ته ؟ فأجاب بقوله قضية ما فى المجموع، الإجماع على التحريم۔

وأماعند الأئمة المالكية فلما نقل العلامة ابن حجر فى فتاواه أن الامام مالك اسئل هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟فقال: لا، إلاعلى الكتبة الأولى أى كتب الإمام وهو المصحف العثمانى۔

وأما عند الأئمة الحنابلة فقد قدمنا عن الدراية ما نصه، و عند الشافعى تفسد الصلوٰة بالقرائة بالفارسية، وبه قال مالك و أحمد عند العجز وعدمه المنتهى''(النفحة القدسية/۳۵ بحوالۂ جواہر الفقہ ۲/۱۰۳)۔

ابن قدامہ حنبلیؒ کی کتاب ''المغنی'' کے حاشیہ پر بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں ترجمہ قرآن کو مرتدین کا طریقہ، لوگوں کو ارتداد تک پہنچانے کا راستہ اور منزلہ قرآن کو پس پشت ڈالنا قرار دیا گیا ہے۔

''وفى حاشية المغنى لابن قدامة الحنبلى مانصه: استمر الإجماع على قراءة جميع المسلمين القرآن فى الصلوٰة وغيرها بالعربية كأذكارها و سائر الأذكار و الأدعية الماثورة على كثرة الأعاجم حتى قام بعض المرتدين من أعاجم هذا

[1] خادم تدریس وافتاء، جامعہ دارالقرآن سرخیز، احمد آباد، گجرات۔

العصر يدعون إلى ترجمة القرآن وغيره من الأذكار وبطريق التعبدوإنما مرادهم التوسل بذالك إلى تسهيل الردةعلى قومهم ونبذ القرآن المنزل من عند الله وراء ظهورهم و هو إنما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة'' (مغنی مع الشرح الکبیر ص:۵۳ ج:۱ بحوالہ سابقہ)۔

صاحب ''درمختار'' نے بھی عدم جواز ہی کو بیان کیا ہے، جیسا کہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

'' وتجوز كتابة آية أو آيتين بالفارسية لا أكثر'' (درمختار علی الشامی ۲/۱۸۷)۔

نیز ''هداية'' کی ''شرح كفاية'' میں بھی اس کے عدم جواز کو بیان کیا گیا ہے:

''قال الإمام المجبوبي: أما لو اعتادقراءة القرآن أوكتابة المصحف بالفارسية يمنع منه أشد المنع'' (كفاية لهامش فتح القدير ۱/۲۴۸)۔

نیز مصر کے شیخ القراء محمد بن علی شداد نے اپنے رسالہ خلاصۃ النصوص الجلیلۃ میں مصحف عثمانی کے رسم کی اتباع کے واجب ہونے پر اور اس کی مخالفت کے ممنوع ہونے پر تقریباً بارہ ہزار صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے۔

''أجمع المسلمون قاطبةعلى وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان و منع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ماتقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثني عشر ألفا و الإجماع حجة حسبما تقرر في أصول الفقه'' (رسالہ النصوص الجلیلۃ ۲۵ بحوالہ جواہر الفقہ ۶/۱۱۶)۔

نیز ہمارے اکابر علمائے دیوبند نے بھی بغیر عربی متن کے صرف ترجمۂ قرآن کریم شائع کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، جس کے حوالے درج ذیل ہیں۔

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس بارے میں ایک مفصل و مدلل فتویٰ تحریر کیا ہے جو امداد الفتاویٰ (۴/۳۹) پر موجود ہے، جس میں بچند وجوہ اس کی ممانعت کو ثابت کیا ہے، جس میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(الف) اس میں اہل کتاب کے ساتھ تشبہ لازم آتا ہے کہ وہ تورات وانجیل کے محض ترجمے شائع کرتے ہیں۔

(ب) اگر یہ طریقہ مروج ہو گیا تو مثل تورات وانجیل کے اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا قوی احتمال ہے۔

(ج) فقہاء کی تصریح کے مطابق اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہیں ہے اور لوگ ترجمہ کے مس میں وضو کا اہتمام نہیں کریں گے، جس کی وجہ سے وہ ایک امر ممنوع کے مرتکب ہو کر گناہ گار ہوں گے۔

(د) غیر قابل انتفاع ہونے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے، اس کے اوراق کا بھی استعمال کریں گے۔

(ھ) ضرورت کے باوجود تمام علما کا انکار کرنا اس امر کے مذموم ومنکر ہونے پر اجماع کی دلیل ہے۔

(و) اہل زیغ کو بہت آسانی سے تحریف معنوی کرنے اور غلط ترجمہ کرنے کا موقع فراہم ہو جائے گا۔

(۲) حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے بھی اس کے متعلق ایک مفصل جواب تحریر کیا ہے جو جواہر الفقہ (۲/۱۰۲) پر درج ہے، جس کے اخیر میں گیارہ مفتیان کرام کی تصویب بھی موجود ہے۔

(۳) امداد الاحکام (۱/۲۴۲) (۴) کتاب الفتاویٰ (۱/۳۷۴)۔

(۵) خیر الفتاویٰ (۱/۲۱۵) (۶) فتاویٰ حقانیہ (۲/۱۳۸)۔

(۷) کفایۃ المفتی (۱/۱۲۰) (۸) فتاویٰ محمودیہ (۳/۵۱۰)۔

قرآن کریم کے تنہا ترجمہ کو خریدنے اور ہدیہ وغیرہ کرنے کے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں، حق تعالیٰ کا

ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ:۲) اور فقہاء نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے، اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت، تو ایسے ترجمہ کا سلسلہ بند ہو جائے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خرید نا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (امداد الفتاویٰ ۴۲ /۴)۔

قرآن کریم کے تنہا ترجمہ کو بے وضو چھونے کا حکم:

"ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یکره لهم مسه عند أبي حنیفة، وکذا عندهما علی الصحیح، هکذا فی الخلاصة" (فتاویٰ عالمگیری ۱/۳۹)

جزئیۂ مذکورہ کی بنا پر قرآن کے تنہا ترجمہ کو بلا وضو چھونا جائز نہیں ہے (کذا فی فتاویٰ رحیمیہ ۱۹ /۳ و امداد الفتاویٰ ۴۰ /۴ و خیر الفتاویٰ ۱/۲۱۸)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن کریم کو عثمانی رسم الخط میں لکھنا باجماع صحابہ و تابعین اور ائمۂ مجتہدین لازم اور ضروری ہے، اور اس کی مخالفت کرنا تحریف قرآن کے حکم میں ہے لہذا غیر عثمانی رسم الخط میں قرآن کا لکھنا اور شائع کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، خصوصاً ایسے رسم الخط جس میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا پڑے، جیسے انگریزی رسم الخط کہ اس میں حرکات (زبر، زیر، پیش) کو بھی بشکل حروف لکھا جاتا ہے، ایسا کرنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعی طور پر تحریف قرآن ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں متعدد علمائے کبار سے عثمانی رسم الخط کے واجب الاتباع ہونے اور اس کی مخالفت کے حرام ہونے کو نقل کیا ہے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"وقال أشهب: سئل مالك هل یکتب المصحف علی ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال: لا الا علی الکتبة الأولی رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة۔ وقال الإمام احمد: ویحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو یاء أو ألف أو غیر ذلك۔ وقال البیهقي في شعب الإیمان: من یکتب مصحفا، فینبغي أن یحافظ علی الهجاء الذي کتبوا به تلك المصاحف، ولا یخالفهم فیه، ولا یغیر مما کتبوه شیئا، فإنهم کانوا أکثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة، فلا ینبغي أن نظن بأنفسنا استدراکا علیهم" (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۲۱۲)۔

نیز صاحب "نور الایضاح" علامہ حسن شرنبلالیؒ کے رسالہ "النفحة القدسیة" کے اقتباسات ماقبل میں ذکر کئے گئے ہیں جس سے بھی عثمانی رسم الخط کی مخالفت باجماع امت وائمہ اربعہ ممنوع ہونا ثابت ہو رہا ہے، نیز اس رسالہ میں علامہ ابن حجرؒ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

"قال الحافظ ابن حجر: "وفي کتابة القرآن العظیم بالعجمي تصرف في اللفظ المعجز الذي حصل التحدي به بما لم یرو...وزعم أن کتابته بالعجمیة، فیها سهولة للتعلیم کذب: مخالف للواقع والمشاهدة، فلا یلتفت لذلك، علی أنه لو سلم صدقه لم یکن مبیحا لإخراج ألفاظ القرآن عما کتب علیه وأجمع علیه السلف والخلف" (النفحة القدسیة بحوالہ جواہر الفقہ ۲/ ۸۲)۔

علامہ ابن حجرؒ کی اس تقریر میں ان تمام شبہات کا بھی پورا جواب ہے، جو رسم الخط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں کہ اس میں عجمیوں کے لئے قرآن پڑھنے میں سہولت ہے، حافظ ابن حجرؒ نے واضح کر دیا کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے، اور اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سہولت کی خاطر قرآن کے رسم الخط کی تبدیل و تغییر جائز نہیں ہو سکتی۔

نیز "خلاصة النصوص الجلیلة" کے اقتباس سے ماقبل میں یہ بات بھی گزر گئی ہے کہ مصاحف عثمانی کے رسم الخط کی اتباع کرنا صحابہؓ کے اجماع کی بناء پر ہے جو تقریباً بارہ ہزار تھے، لہذا کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت قطعاً جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔

نیز یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ عثمانی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں ہوئی اور اس پر تمام صحابہ نے اتفاق کیا، ان کے بعد تابعین، تبع تابعین اور آج تک کے علمانے اس رسم الخط کی پابندی کی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم پر میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے" لہذا حضرت عثمانؓ اور تمام صحابہؓ کی پیروی اور اجماع پر عمل کرتے ہوئے عثمانی رسم الخط کے علاوہ میں قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں ہوگی۔

نیز رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم "المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ" کے ساتویں سمینار (منعقدہ ۱۶۱۱۔ ربیع الثانی ۱۴۰۴ء) میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا جس میں بالاتفاق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قرآن کے عثمانی رسم الخط میں تبدیلی جائز نہیں ہے اور موجودہ رسم الخط ہی میں اس کو باقی رکھنا واجب ہے، تاکہ ایک دائمی دلیل اور حجت اس بات کی ہو کہ قرآن کے متن میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس کی پابندی ہی میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ سلفؒ کی پیروی واتباع بھی ہے (المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے ۱۷۶)۔

نیز غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت کی جائے تو اس میں اور بھی بہت سی خرابیاں لازم آتی ہیں مثلاً قرآن کریم میں بہت سے ایسے حروف بھی ہیں جن کے درمیان فرق ہے جن کے بدلنے سے معنی ومطلب بھی بدل جاتا ہے جبکہ دیگر زبانوں میں ان کے درمیان فرق نہیں پایا جاتا، جیسے "ح" اور "ہ"، "ق" اور "ک"، "ء" اور "ع"، "ت" اور "ط"، "س" اور "ص" اور "ث"، "ض" اور "ز" اور "ظ" جس کی بنا پر تحریف لازم آئے گی اور پڑھنے والا ان کے درمیان امتیاز اور فرق نہیں کرسکے گا اور "رب تال للقرآن والقرآن یلعنہ" کا مصداق ہوکر رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا، نیز بعض زبانوں میں "زبر، زیر" کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے جس کی بنا پر قرآنی حروف میں زیادتی کرنا لازم آئے گا، نیز دیگر زبانوں کو بائیں جانب سے شروع کیا جاتا ہے جو خلاف سنت اور خلاف ادب ہے۔

ہمارے اکابر دیوبند بھی اس کی عدم مشروعیت پر متفق نظر آتے ہیں، جیسا کہ ان کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے جن کے حوالے درج ذیل ہیں:

(۱) جواہر الفقہ ۲/۶۹ جس میں مفتی شفیع صاحبؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل مقالہ تحریر کیا ہے جس پر کئیں علماء ومفتیان کرام کی دستخط ثبت ہیں:

(۲) امداد الفتاویٰ ۴۴۴ / (۳) امداد الاحکام ۱/۲۳۲

(۴) فتاویٰ عثمانی ۱/۲۴۶ (۵) فتاویٰ محمودیہ ۳/۵۰۷

(۶) فتاویٰ رحیمیہ ۳/۱۶ (۷) فتاویٰ ریاض العلوم ۲/۱۸

(۸) خیر الفتاویٰ ۱/۲۲۵ (۹) فتاویٰ حقانیہ ۲/۱۳۱

(۱۰) کفایۃ المفتی ۹/۲۹۳۔

تنبیہ:...... ماقبل کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ رسم عثمانی کے علاوہ کسی بھی زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنا جائز نہیں ہے اور جب لکھنا ہی جائز نہیں ہے تو چاہے تنہا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت کی جائے یا متن قرآن کو رسم عثمانی میں باقی رکھتے ہوئے غیر عربی رسم الخط کو ساتھ میں شائع کیا جائے دونوں ہی ممنوع ہوگا۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ بھی دوسری زبانوں کے مانند ایک زبان ہے جو ایک مخصوص طبقہ، یعنی نابیناؤں کے لئے ایجاد کی گئی ہے، اور ماقبل میں یہ بات تفصیل سے گذر گئی ہے کہ قرآن کریم کی کتابت رسم عثمانی کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں جائز نہیں ہے، لہذا بریل کوڈ میں بھی قرآن کی اشاعت جائز نہیں ہوگی، چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کے فتوی کو بعینہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال:۔ اندھوں کے قرآن پڑھنے کے لئے مخصوص تحریر آتی ہے، جس کے حروف عربی نہیں ہوتے، کیا ایسے قرآن کو بغیر وضو پکڑ سکتے ہیں؟

الجواب:۔ حامدا و مصلیا و مسلما: قرآن شریف عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے، اور تحریفِ رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قراءت سبعہ وغیرہ شامل ہیں، اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسری رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہذا اس کا اتباع واجب ہے، اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لئے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے (محمود الفتاوی ۱۵۴)۔

موبائل پر قرآن مجید:

''المراد بالغلاف ما كان منفصلا كالخريطة، وهي الكيس ونحوها، لأن المتصل بالمصحف منه حتى يدخل في بيعه بلا ذكر. وقيل: المراد به الجلد المشرز، وصححه في المحيط والكافي. وصحح الأول في الهداية وكثير من الكتب وزاد في السراج أن عليه الفتوىٰ، وفي البحر: أنه أقرب إلى التعظيم'' (شامی ۱/ ۳۱۵)۔

''والصحيح أنه الغلاف المنفصل عن المصحف وهو الذي يجعل فيه المصحف، وقد يكون من الجلد، وقد يكون من الثوب وهو الخريطة، لأن المتصل به تبع له فكان مسه مسا للقرآن ...فأما المنفصل فليس بتبع'' (بدائع الصنائع ۱/ ۱۴۱)۔

''لايجوز لهما وللجنب وللمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة، والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به هو الصحيح، هكذا في الهداية، وعليه الفتوىٰ كذا في الجوهرة النيرة'' (فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۳۹)۔

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صحیح اور مفتی بہ قول کے مطابق ایسا غلاف جو قرآن کریم سے متصل ہو تو اسے بھی قرآن کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کو بھی مس کرنا درست نہیں ہوتا ''لأن المتصل بالمصحف منه'' اور جو غلاف قرآن کریم سے منفصل اور جدا ہو اس سے قرآن کریم کا مس جائز ہے، اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ جب موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو تو موبائل کی اسکرین اور ڈھانچہ کو قرآن کریم سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے لہذا جب موبائل کی اسکرین پر قرآن کریم موجود ہو تو موبائل کے ڈھانچہ کو غلافِ متصل کے حکم میں رکھا جائے گا اور اس کا مس جائز نہیں ہوگا، اور اسی حکم میں قرآن کریم کی تعظیم بھی ہے، ''وفي البحر: أنه أقرب إلى التعظيم'' اور اسی میں زیادہ احتیاط بھی ہے۔

مفتی احمد صاحب خانپوری کے فتویٰ میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، چنانچہ آپ تحریر کرتے ہیں کہ ''بعض لوگ موبائل کی اسکرین پر وال پیپر کی جگہ میں قرآن شریف کی آیت رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی وہ آیت چوبیس گھنٹے موبائل کی اسکرین پر رہتی ہے ایسی حالت میں بغیر وضو کے اس موبائل کو پکڑنا جائز نہیں ہے'' (موبائل کے مسائل/ ۴۷)۔

☆☆☆

بغیر عربی متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا عبدالرشید نعمانی[1]

۱- قرآن مجید کا تنہا ترجمہ، عربی متن قرآنی کے بغیر لکھنا اور لکھوانا اس کی اشاعت، اسکی خرید و فروخت، اس کا ہدیہ تمام امور ممنوع اور ناجائز ہیں۔

مذاہب ائمہ اربعہ میں اسکے عدم جواز کی تصریحات موجود ہیں، علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نورالایضاح'' کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر جس کا نام ''النفحۃ القدسیۃ فی أحکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ'' ہے، اس میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی کے لکھا جاوے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

''وأما کتابۃ القرآن بالفارسیۃ، فقد نص علیھا فی غیر ما کتاب من کتب ائمتنا الحنفیۃ المعتمدۃ منھا ما قالہ مؤلف الھدایۃ الإمام الأجل شیخ المشائخ الإسلام حجۃ اللہ تعالیٰ علی الأنام برھان الدین أبوالحسن علی بن أبی بکر المرغینانی الکبیر رحمہ اللہ تعالیٰ فی کتابہ التجنیس والمزید، مانصہ: ویمنع من کتابۃ القرآن بالفارسیۃ بالإجماع، لأنہ یؤدی للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنی، فإنہ دلالۃ علی النبوۃ، ولأنہ ربما یؤدی إلی التھاون بأمر القرآن۔ انتھی''۔

حضرت تھانویؒ نے عجیب اجتہادی انداز میں اسکی حرمت ثابت فرمائی ہے جس کا خلاصہ نمبروار درج ذیل ہے:

(الف) تنہا ترجمہ قرآن بغیر عربی متن قرآنی میں اہل کتاب کے ساتھ تشبہ فی الامر الدینی ہے جو تشبہ فی الامر الدنیاوی سے اشد ہے، جبکہ نصوص صریحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے: ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (ابوداؤد کتاب اللباس/۵۵۹)، ''لترکبن سنن من کان قبلکم'' (کتاب العلم ۲/۱۴۱، ابواب الفتن)، اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً وعادتاً ان کے خصائل میں سے ہے۔

(ب) تنہا ترجمہ قرآن بغیر عربی متن قرآنی کی ترویج واشاعت میں تورات وانجیل کی طرح اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا قوی احتمال ہے، جبکہ حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام ہوتا ہے۔

(ج) تنہا ترجمہ قرآن بغیر عربی متن قرآنی کی اشاعت میں عامۃ الناس سے امور غیر شرعیہ کے ارتکاب کا احتمال ہے مثلاً بغیر وضو چھونا، جبکہ مسلمانوں کیلئے صرف ترجمہ قرآن کو بھی باوضو چھونا ضروری ہے (کمافی العالمگیریہ ۱۲۶)، نیز غیر قابل انتفاع ہوجانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال کرنا جو کہ ایک محذور ہے اور محذور کا سبب لامحالہ محذور ومحظور ہے۔

(د) شروع سے زمانۂ حال تک باوجود دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت پیش ہونے کے، ہر زمانہ میں علماء کرام نے اس طرز عمل پر شدید انکار کیا جو اس عمل کے مذموم ومنکر ہونے پر علماء امت کے اجماع کی دلیل ہے، اور تمام مسلمان اجماع کی اتباع پر مامور ہیں۔

''إن اللہ لایجمع أمتی علی الضلالۃ یداللہ علی الجماعۃ، ومن شذ شذ فی النار، واتبعوا السواد الأعظم'' (مشکوۃ)

(ھ) تنہا ترجمہ قرآن بغیر عربی متن قرآن کے اختیار کرنے میں اصل قرآن سے بےتعلقی پیدا ہونے کا غلبۂ ظن ہے جس کی بناء پر ان حضرات پر بےساختہ یہ آیت صادق آئے گی جس میں اہل کتاب کے ایک فریق کو کتاب اللہ کے پس پشت ڈالنے کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] دارالافتاء والارشاد، گپتا کمپاؤنڈ، سبھاش نگر، نزد سپرز، گیٹ نمبر (۱)، اندھیری (ایسٹ) ممبئی ۹۳۔

"نبذ فريق من الذين اوتوا الكتاب كتاب الله وراء ظهورهم كأنهم لايعلمون" (سورۂ بقرۃ:۱۰۱)۔

(و) تراجم کا اختلاف، اصل متن قرآن کے نظروں سے غائب ہونے کی وجہ سے، اصل قرآن کی طرف منسوب ہوگا جس کی بناء پر اصل حکم کے مختلف ہونے کا گمان ہونے لگے گا تو اعتقاد پر اسکا اثر ہوگا اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے کر آپس میں لڑائی ہوگی اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں جو مدار ہوسکتا ہے فیصلہ کا، بس اس آیت کا مضمون ظاہر ہوجاوے گا

"وما اختلف فيه إلا الذين أوتوه من بعد ما جاء تهم البينات بغيًا بينهم" (سورۂ بقرۃ:۲۱۳)۔

(ز) تنہا ترجمہ قرآن بغیر عربی متن قرآنی کے رواج پانے کی صورت میں تحریف معنوی کے احتمالات قوی ہیں، چنانچہ اہل زیغ کو غلط ترجمہ وتفسیر کا موقع مل جائے گا جسے ہر پڑھنے والے کا سمجھ لینا آسان نہ ہوگا، جبکہ اصل قرآن کے سامنے ہوتے ہوئے کسی مترجم کو تحریف معنوی کی ہمت نہیں ہوسکے گی، کیونکہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کرسکے گا، وغیرہ وغیرہ۔

(ح) چونکہ قرآن کریم میں اعانت علی المعصیت سے بایں الفاظ "ولاتعاونوا على الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ:۲) منع کیا گیا ہے، اسلئے اسکی خرید وفروخت اور بطور ہدیہ لین دین میں ایک امر ناجائز کی اعانت ہے، اسلئے یہ سب امور بھی ناجائز رہیں گے۔

جہاں تک ترجمۂ قرآن کو بے وضو چھونے کا معاملہ ہے تو چونکہ ترجمہ قرآن بھی بحکم قرآن ہے، اسلئے بے وضو چھونے کی اجازت نہیں۔

"ثم كتب عليه شيخ الائمة الشافعيه بعصرنا ومصرنا هو العلامة شمس الدين محمد الشوبرى الشافعي حفظه الله تعالىٰ ما صورته أنه إذا كتب بغير العربية هل يحرم مسه وحمله أولا؟ الأظهر في الجواب نعم إذ لايخرج بذلك عن كونه قرآنًا وإلا تحرم كتابته. فليراجع انتهى" (جواہر الفقہ ۲/۱۱۰، محمودیہ ۳/۵۷۶)۔

خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، چنانچہ غیر مسلموں کو دینے سے پہلے ہی قرآن کریم کا یہ ادب سکھلا دیا جائے، لہذا انہیں اسکے چھونے سے پہلے غسل کرنے کی تلقین کی جائے۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے اس میں قراءت سبعہ وغیرہ شامل ہیں اور ساری قرأتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی عربی قرآنی رسم الخط کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں ہے، لہذا اسی کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "انا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر:۹) میں صرف قرآنی الفاظ کی حفاظت کا وعدہ نہیں ہے بلکہ الفاظ معانی اور رسم الخط سب ہی کی حفاظت کا وعدہ اور پیشینگوئی ہے، لہذا اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔

معانی اور علوم قرآن کی حفاظت میں علمائے دین مشغول ہیں تو الفاظ، عبارت اور طرزِ ادا کی حفاظت میں قراء منہمک ہیں اور رسم الخط کی حفاظت کاتبین قرآن کررہے ہیں جن کی پیروی ہم پر لازم ہے۔

نیز قرآن مجید خالص عربی اور نہایت فصیح وبلیغ عربی زبان میں نازل ہوا، لہذا اس زبان کے اصول اس کے امتیازات اور اس کی ادائیگی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، فرمانِ خداوندی ہے: "ورتل القرآن ترتيلًا" (سورۂ مزمل:۴) (ترجمہ) قرآن کو ترتیل سے پڑھو۔ ترتیل کی تفسیر حضرت علیؓ نے یہ بیان فرمائی ہے: حروف کو تجوید، یعنی ان کے مخارج اور صفات سے ادا کرنا نیز وقف اور اس کے اصول جان کر ان پر عمل کرنا (شرح جزری)۔

اس کے متعلق علامہ جزریؒ کا ایک شعر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجوید سیکھنا، یعنی قرآن صحیح پڑھنے کے قوانین کا سمجھنا اور انہیں اختیار کرنا ان پر عمل کرنا ضروری اور لازمی ہے جو آدمی قرآن مجید کو صحیح طریقہ سے اس کے اصول کے مطابق نہ پڑھے وہ گنہگار ہے۔

"والأخذ بالتجويد حتم لازم من لم يجود القرآن آثم"

چونکہ عربی میں ح اور ہ، ق اور ک، ع اور ء، ت اور ط، س، ص اور ث، ذ، ض، ز اور ظ میں فرق ہوتا ہے اور یہ فرق رسم الخط اور ادائیگی دونوں میں ہے، اور یہ فرق عموماً دیگر رسم الخط میں نہیں ہے، جس کی وجہ سے تحریر اور رسم الخط کی تحریف کے ساتھ ساتھ ادائیگی میں نمایاں فرق ظاہر ہوگا جس سے بیسیوں غلطیاں اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائے گا اور ثواب کی جگہ عقاب اور رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا، جیسا کہ مشہور فرمانِ رسول ﷺ ہے: ''رب تالٍ للقرآن والقرآن یلعنہ'' یعنی بہت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے ایسے ہیں جن پر قرآن لعنت کرتا ہے۔

حضرت امام جوزیؒ فرماتے ہیں کہ بے شک جس طرح امت کیلئے مطالب قرآنی کا سمجھنا اور اسکے حدود کو قائم رکھنا عبادت ہے اسی طرح صحیح پڑھنا اور حروف کو طریقہ کے مطابق ٹھیک ادا کرنا بھی عبادت ہے، قرآن کریم قابل استاد کے پاس صحیح تلفظ سے پڑھے بغیر عربی رسم الخط میں بھی پڑھنا دشوار ہے تو غیر عربی رسم الخط میں کس طرح صحیح پڑھا جا سکتا ہے (رحیمیہ ۱/ ۹۸ تا ۱۰۳)۔

لہذا جو حضرات عربی رسم الخط میں قرآن کریم نہ پڑھ سکتے ہوں ان کیلئے ان کی اپنی زبان میں اور اس زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم لکھنا قطعاً درست نہیں ہے اسطرح کرنا ان حضرات کے حق میں ہمدردی نہیں ظلم ہے، یہی وہ غلط روش ہے جو بعض مطابع اور مکتبات نے اختیار کی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک بڑا طبقہ صلاحیت اور اہلیت ہونے کے باوجود قرآن کریم سیکھنے سے گریز کئے ہوئے ہے اور قرآنی رسم الخط کو سمجھنے سیکھنے اور تجوید کے ساتھ درست پڑھنے کو غیر ضروری قرار دئے ہوئے ہے، اور ''رب تالٍ للقرآن والقرآن یلعنہ'' کا مصداق بنے ہوئے ہے۔

چونکہ مندرجہ بالا مضرات عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کو باقی رکھتے ہوئے بھی بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں، اس لئے اس کی اجازت نہ ہوگی۔

۳- تقریباً جو وجوہات عدم جواز غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کے لکھنے کے سلسلہ میں تحریر کی گئی ہیں وہ بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت میں بھی موجود ہیں، اسلئے اس کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

زمانہ نبوت سے لے کر اب تک بے شمار افراد باوجود نابینا ہونے کے حافظ قرآن ہوتے رہے ہیں، حالانکہ اسطرح بریل کوڈ کی سہولت ان حضرات کو حاصل نہ تھی جو اس بات کی کافی وافی شہادت ہے کہ نابینا حضرات کو حفظِ قرآن وغیرہ کیلئے بریل کوڈ کی سہولت دینے کی ضرورت نہیں ہے، بریل کوڈ میں رسم عثمانی و رسم قرآنی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تحریف لفظی و تحریف رسمی کا مرتکب بن کر قرآن تیار کرنے کے مقابلہ میں نابینا حضرات کا زبانی طور پر جتنا یاد کرنا کرانا ممکن ہو اس کی سعی و کوشش کرنا لازم ہے۔

چونکہ بریل کوڈ موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے جو کسی بھی طرح عربی حروف کے مشابہ نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ نابیناؤں کی اپنی معرفت کا ایک جدید رسم الخط ہے اسلئے بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن اصل قرآن کے حکم میں نہیں ہے، لہذا اس کو چھونے کیلئے وضو ضروری نہیں ہے۔

۴- موبائل کی میموری میں قرآن لوڈ ہوا اسکرین پر نہ ہو تو موبائل سیٹ چھونے کیلئے وضو ضروری نہیں ہے، اسکرین کو بھی بے وضو چھویا جا سکتا ہے، البتہ اگر قرآن اسکرین پر موجود ہو تو اسکرین پر ہاتھ لگانے کیلئے وضو ضروری ہوگا، لیکن اسکرین کے سوا دیگر حصوں کو با وضو بھی چھویا جا سکتا ہے۔



بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا محمد عمر بن یوسف کوکنی[1]

۱- اس ترجمۂ قرآن کے جواز کے لئے شرعاً چند شرائط ہیں ان میں سے ایک یہ کہ ''اولاً قرآن کریم کے متن کو لکھا جائے پھر اس کے بعد اس کے ترجمہ کو لکھا جائے'' یعنی ترجمہ کے ساتھ متن قرآن مجید کا لکھنا ضروری ہے، لہذا متن کے بغیر محض قرآن مجید کا ترجمہ لکھنا اور شائع کرنا درست نہیں، کیونکہ اسمیں قوی اندیشہ ہے کہ لوگ اصلی متن سے غافل ہو کر اپنی علاقائی زبان کے ترجمہ میں ہی مشغول ہو جائیں گے، اور اسی کو حقیقی قرآن تصور کر بیٹھیں گے اور فقط اسی کے پڑھنے کو باعث اجر سمجھ کر غور و تدبر کے لئے بھی اسی ترجمۂ قرآن کو ہی مرکز بنائیں گے۔ یہ صورت حال نہایت ہی خطرناک ہے، اس لئے کہ غور و تدبر کا اصل محل حقیقی الفاظ قرآن کریم ہیں۔

جواز ترجمہ کی شرط اہم کو ذکر کرتے ہوئے ''دکتور محمد حسین الذہبی'' رقمطراز ہیں

''أن يكتب القرآن أولا، ثم يؤتى بعده بتفسيره، ثم يتبع هذا بترجمته التفسيرية حتى لايتوهم متوهم إن هذا الترجمة ترجمة حرفية للقرآن'' (التفسير المفسرون ۱/ ۳۰)۔

نیز بعینہ صورت حال کا سوال مفتی اعظم ہند فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ سے کیا گیا، چنانچہ سوال اور حضرت مفتی صاحبؒ کا جواب ملاحظہ کیجئے

سوال (۱۷۳۶): قرآن شریف کو بغیر عربی عبارت کے صرف اردو ترجمہ کے ساتھ چھاپنا کیسا ہے؟ اور اس کو خریدنا اور پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامدًا ومصليًا:

بغیر عربی کے محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف کو لکھنا، چھاپنا منع ہے۔ ''اتقان'' میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے۔

''في الفتح عن الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع''... (شامی ۲/ ۳۲۶)۔

اس سے خریدنے اور بیچنے کی بھی ممانعت معلوم ہوگئی۔ فقط اللہ سبحانہ وتعالی اعلم (فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۱۵، نیز دیکھئے: الاتقان فی علوم القرآن ۴/ ۱۴۹)۔

خلاصۂ کلام:...... مذکورہ وضاحت اور شریعت کی اصل ''سد ذرائع'' کی روشنی میں راقم سطور کی رائے یہ ہے کہ متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمۂ قرآن کی اشاعت درست نہیں، جب اس طرح لکھنا اور چھاپنا ہی جائز نہیں تو اسے خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا بھی شرعاً درست نہیں۔

تنہا ترجمۂ قرآن کے جواز کیلئے جو وجوہ پیش کی جاتی ہیں وہ اصل قرآن مجید کو تحریف وتغیر سے محفوظ رکھنے کے اہم مقصد کے پیش نظر قابل التفات ہی نہیں، بلکہ کوئی فرد یا جماعت اس پر خطر صورت پر اقدام کی جرأت کرے یا ارادہ کرے تو اسے حکمت ومصلحت کے ساتھ اس صورت حال سے جملہ مفاسد ومضرات سے آگاہ کرنا اور اس مشقت بلا فائدہ سے باز رکھنا مصلحین امت کی ذمہ داری ہے۔

☆ سوالنامہ میں مذکور سوال سے مترشح ہوتا ہے کہ لغت عربی سے دوری کی بناء پر امت کا ایک بڑا طبقہ قرآن کریم کی تلاوت سے محروم رہتا ہے، تو کیوں نہ علاقائی لغت کے حروف (خط) میں قرآنی آیات کو لکھا جائے، تاکہ اس محروم طبقہ کیلئے بھی قرآن کریم کی تلاوت آسان ہو۔ اسی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے ماضی قریب کے مشہور محقق ''شیخ سید محمد رشید رضا'' نے اس موضوع پر عمدہ بحث کی ہے، اسکا خلاصہ یہاں زیب قرطاس ہے:

[1] جامعہ حسینیہ عربیہ شری وردھن، رائے گڈھ، مہاراشٹرا۔

''کتابت سے مقصود اس کلام کی قرأت اور اس کا تلفظ ہے، اور عجمی لغت کے حروف قلت ونقصان کی وجہ سے عربی حروف کی کما حقہ ادائیگی سے مستغنی نہیں کر سکتے ہیں، اور ان ''حروف عجمیہ'' کے ذریعہ حروف عربیہ کا صحیح تلفظ نہیں ہو سکتا، تو ایسے حروف میں کتابت کی اجازت دینے سے کلام میں تحریف اور تغییر لازم آئے گی۔ اور اختیار تغییر کلام قرآن پر راضی ہونا کفر ہے، عجمی حروف میں لکھے ہوئے ''محمد'' کو پڑھنے والا ''مھمد'' اور ''خاتم النبیین'' کو ''کاتم النبیین'' پڑھے گا، اور اس طرح کے تلفظ پر زمانہ بھر کبھی بھی وہ شخص قرآن کو درست نہیں پڑھ سکتا۔۔۔ نیز مختلف اللغات قبائل مثلاً رومی، فرنسی، قبطی، بربری اور افرنجی وغیرہ کو اپنی اپنی لغت میں کتابت کر کے پڑھنے کی اجازت دی گئی تو مختلف الانواع قرآن کریم منظر عام پر آئیگا، کہ مسلمانوں کا ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ وخاندان یا ایک ملک والا دوسرے ملک والے کے قرآن کو نہ پڑھ سکے گا اور نہ سمجھ سکے گا، چنانچہ خط واحد پر اتفاق اسلام کی روح ہے اسی وجہ سے ہر زمانہ میں مسلمان کتابت قرآن کے بارے میں ایک ہی خط پر متحد رہے جسمیں ''رسم مصحف امام'' کی موافقت ہو۔ یہ رسم بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے لئے محفوظ کیا ہے، لہذا یہ (رسم مصحف امام) میرے نزدیک واجب ہے، اور کثیر ائمہ کرام کی تصریح ہے کہ ''خط مصحف'' توقیفی ہے۔

نیز اس موضوع پر بلاد عرب میں بہت ''مجامع فقہیہ'' ہیں بحث ومناقشہ ہوا، اور وہاں کے مخلص محقق اہل علم نے قول فیصل کے طور پر قرارات بھی منظور کی ہیں۔ یقیناً وہ عصر حاضر میں جمیع علمائے امت یا کم از کم اکثر علمائے امت کے اتفاق واجماع کی واضح مثال ہے۔

☆ جملہ قرارات کا حاصل یہی ہے کہ کتابت قرآن میں کتابت کو ''رسم عثمانی'' پر ہی باقی رکھا جائے اور اس کے علاوہ کسی بھی عجمی حروف میں اس کی کتابت جائز نہیں۔

☆ قرار مجمع البحوث الاسلامية بالأزهر الشريف:

''يوصي المؤتمر بأن يعتمد المسلمون على الرسم العثماني للمصحف الشريف حفظًا من التحريف'' (مجمع البحوث العلمية تاريخة وتطوره/ ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ بحواله رسم المصحف)۔

☆ قرار هيئة كبار العلماء بالمملكة العربية السعودية رقم (۶۸) تاريخ ۲۱/ ۱۰/ ۱۳۹۹ هـ۔

''قرار المجلس بالإجماع: تحريم كتابة القرآن بالحروف اللاتينية أو غيرها من حروف اللغات الأخرى، وذلك للاسباب التالية۔'' (ابحاث هيئة كبار العلماء/۷/ ۴۰۶)۔

★ قرار المجمع الفقهي الإسلامي التابع لرابطة العالم الإسلامي بمكة المكرمة

''وبعد اطلاع مجلس المجمع الفقهي الإسلامي على ذلك كله قرر بالإجماع تائيد ماجاء في قرار مجلس هيئة كبار العلماء في المملكة العربية السعودية من عدم جواز تغيير رسم المصحف العثماني ووجوب بقاء رسم المصحف العثماني على ما هو عليه ليكون حجة خالدة على عدم تسرب اي تغيير أو تحريف في النص القرآني، واتباعًا لما كان عليه الصحابة وأئمة السلف رضوان الله عليهم أجمعين'' (موسوعة القضايا الفقهية المعاصرة الباب السابع/ ۶۲۵)۔

خلاصہ کلام:...... ''غیر عربی رسم الخط'' میں کتابت قرآن کے عدم جواز کی واضح وصریح نصوص کے پیش نظر راقم سطور کی رائے یہ ہے کہ رسم عثمانی کے علاوہ کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کی کتابت جائز نہیں، چاہے اس کے ساتھ اصل متن قرآن کو باقی رکھا جائے یا تنہا غیر عربی رسم الخط میں ہی لکھا جائے، بلکہ غیر عربی داں مسلمان بھائیوں کو بھی اصل رسم عثمانی کی حالت میں ہی قرآن کریم پڑھنے پر ابھارا جائے، بصورت دیگر جو مفاسد ہیں ان کا ذکر سامنے آچکا، اس تعلیم قرآن کا بہترین وسیلہ، گاؤں گاؤں، محلہ محلہ مکاتب کے نظام کو مضبوط ومستحکم کرنا ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ نہ عربی لفظ ہے اور نہ غیر عربی خط، یہ محض علامات واشارات ہیں جو محض کلمات پر دلالت کرتے ہیں، اس لئے گذشتہ تفصیل کی روشنی

میں ''رسم عثمانی کی اہمیت'' کے تحت یہی معلوم ہوتا ہے کہ بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت کا تکلف نہ کیا جائے، اس لئے جن مصالح کی بناء پر اس کتابت کا سوال پیدا ہوا ہے، نابینا حضرات شرعاً ان کی رعایت کے مکلف ہی نہیں۔ اس لئے نابینا حضرات کے لئے قدیم طریقہ تعلیم اختیار کرتے ہوئے قرآن کریم کو اپنے اصلی رسم وکیفیت پر باقی رکھنا ہی مبنی بر مصلحت ہے۔

تاہم سوال میں ذکر کردہ اعذار و مجبوریاں بھی قابل غور ہیں، اس لئے نابیناؤں کی مجبوری کی بناء پر بقدر ضرورت قاعدہ فقہیہ: ''الضرورات تبیح المحظورات'' اور ''الضرورة تتقدر بقدرها'' سے استفادہ کرتے ہوئے بریل کوڈ میں کتابت قرآن کی گنجائش ہوسکتی ہے، بشرطیکہ بریل کوڈ میں لکھے ہوئے کلمات قرآن کا تلفظ ''قرأت رسم عثمانی'' کے موافق ہو۔ اگر رسم عثمانی میں لکھے ہوئے کلمات کی طرح پڑھنے میں تلفظ نہ ہوتا ہو تو پھر وہی مفاسد و مضرات لازم آئیں گے جن کا ذکر ''غیر عربی رسم الخط'' میں ہوا، پھر اجازت نہ ہوگی۔

اگر بدرجۂ مجبوری ''بریل کوڈ'' میں قرآن مجید تیار کیا گیا تو اس کا حکم اصل قرآن کی طرح نہیں ہے، بلکہ ایسا مجموعہ حقیقۃ قرآن ہی نہیں، جیسا کہ سید محمد رشید رضاؒ نے کتب مالکیہ کے حوالہ سے نقل کیا: ''إن ما کتب بغیر العربیة لیس بقرآ ن بل یعتبر تفسیرًا له''

جب ایسا مجموعہ اصلاً قرآن ہی نہیں تو اصل قرآن کے احکام اس سے متعلق نہیں ہونگے۔ البتہ اس میں قرآن کریم کی مشابہت پائی جاتی ہے اس لئے جملہ احکام وآداب میں قرآن کی رعایت کرنا بہتر ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر موبائل میں قرآن مجید کو محفوظ کیا گیا ہو تو چونکہ موبائل میں صرف قرآن مجید ہی محفوظ کرنے کا قصد نہیں ہوتا، اس لئے موبائل میں محفوظ قرآن کریم کی حیثیت سامان میں رکھے ہوئے قرآن کریم کی طرح ہے جس طرح سامان میں رکھے قرآن کو سامان کے ضمن میں بغیر طہارت کے اٹھانا جائز ہے، اسی طرح ایسے موبائل کو بھی اٹھانے پکڑنے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں۔ بغیر طہارت کے چھونا، اٹھانا جائز ہے۔ جیسا کہ علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''وأما إذا حمل المصحف فی متاع فوجهان، حكاهما الماوردی، والخراسانيون، أصحهما وبه قطع المصنف والجمهور، ونقله الماوردی والبغوی عن نص الشافعی يجوز، لأنه غيرمقصود'' (المجموع شرح المهذب ۲/ ۶۸، مغنی المحتاج ۱/ ۷۲، روضة الطالبين ۱/ ۱۹۱، البيان ۱/ ۳۰۴)۔

البتہ موبائل کی اسکرین پر آیات قرآنی موجود ہوں تو موبائل کو اس طرح اٹھانا چاہیے کہ اسکرین پر ظاہر ہونے والی آیات کا مس (چھونا) نہ ہونے پائے، اسکرین پر ظاہر ہونے والی آیات کو بغیر وضو کے چھونا درست نہیں، کیونکہ وہ بھی کلمات قرآن ہیں، اور قرآن کریم کو بلاوضو کسی حائل کے ساتھ بھی چھونا درست نہیں اور مذکورہ صورت میں عرفاً چھونا ہی سمجھا جاتا ہے، چنانچہ توضیح کے لئے شیخ سلیمان بن عمر جمل الشافعی کا کلام ملاحظہ ہو:

''وحرم بها أی بالأحداث... ومس مصحف أی بسائر أجزاء البدن ولو بحائل... ودخل فی المس مالو كان بحائل ولو ثخينا حيث يعد ماسًّا له عرفًا. لانه يخل بالتعظيم'' (حاشية الجمل على شرح المنهج ۱/ ۱۱۹)۔



قرآن کریم کے متن وترجمہ کی اشاعت اور بریل کوڈ

مولانا طاہر حسین قاسمی [1]

۱- قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے۔ اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی۔ اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا۔ اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کریں گے اس کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔

لقولہ تعالی: "ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها الخ" (سورۂ نساء: ۸۵)۔

وہ روایات جن سے حکم مذکور ثابت ہے حسب ذیل ہیں: علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور مفتی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر جس کا نام "النفخة القدسیه فی احکام قراۃ القرآن و کتابة بالفارسیة" ہے: اس میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی کے لکھا جاوے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

" وأماکتا بته القرآن بالفاسیة فقد نص علیها فی غیر ما کتا ب من کتب ائمتنا الحنفیة المحتمدة منها ما قاله مولف الهدایة الإمام الأجل شیخ الإسلام حجة الله تعالی علی الأنام بر هان الدین أبوالحسن علی بن أبی بکر المرغینانی الکبیر رحمه الله تعالی فی کتابة التجنیس والمزید ما نصه: ویمنع من کتا بة القرآن با لفاسیة بالإجماع، لأنه یؤدی للإ خلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنی، فإنه دلالة علی النبوة، ولأنه ربما یؤدی إلی التهاون بأمر القرآن انتهی۔

اور رہا قرآن شریف کو فارسی میں لکھنا، ہمارے حنفی اماموں کی بہت سی معتبر کتابوں میں اس کے متعلق تصریح ہے۔

(۱) (ہدایہ کے مصنف امام اجل اسلام کے شیخ المشائخ حجۃ اللہ علی الخلوق برہان الدین بن علی ابی بکر مرغینانی کبیر رحمہ اللہ تعالی علیہ اپنی کتاب التجنیس والمزید میں یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے، کیونکہ یہ قرآن کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن مجید کے الفاظ ومعنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے: دوسرے یہ کہ یہ تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے)۔

"و منها ماقی معراج الدرایة: یمنع من کتابة المصحف با لفارسیه أشد المنع، وأنه یکون معتمده زندیقاوسنذکره تمامه"، نیز" و منها ما فی الکافی انه لو أراد أن یکتب مصحفا با لفارسیة یمنع"

(کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا)۔

"و منها ماقا ل فی شرح الهدایة فتح القدیر للمحقق الکمال ابن همام رحمه الله: و فی الکافی: ان اعتاد القراة با لفارسیة او اراد ان یکتب مصحفا بها یمنع، فان فعل آیة او آیتیں لا، فان کتب القرآن وتفسیر کل

[1] قاضی شریعت مرکزی دار القضاء، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، پونے۔

حرف و ترجمتة جاز اه''،

(ہدایہ کی شرح کمال بن ہمام کی تصنیف فتح القدیر اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے، یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے۔ ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے۔ لیکن اگر الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے)۔

علامہ محقق ابن ہمام کی عبارت سے اس تفصیل کی بھی تصریح ہوگئی کہ فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے، ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے۔ نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ ممنوع نہیں ہے۔ پھر عبارات مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا۔ جس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کہ کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو اس لئے علامہ حسن شرنبلالی نے روایات مذکورہ بالا نقل کرنے کے بعد فرمایا:

''قدمنا حكاية الإجماع على كتا بة القرآن العظيم با لفارسية، و أنه إنما نص على الفار سية لإفادة المنع بغيرها با لطريق الأولى، لأن غيرها ليس مثلها في الفصاحة. ولذا كانت في الجنة مما يتكلم به كا لعر بية كما تقدم'' (النفحة القدسية ۳۲)۔

(قرآن شریف کو فارسی میں لکھنے کی ممانعت پر اجماع کو تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ اب یہ ہے کہ فارسی کی تصریح اس لئے کی گئی ہے تاکہ دوسری زبانوں میں ممنوع ہونا بدرجہ اولی ثابت ہوجائے کیونکہ کوئی اور زبان فارسی سے فصیح نہیں ہے یعنی عربی کی طرح جنت میں فارسی بھی بولا کریں گے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے)۔

اور درمختار میں ہے:'' و تجوز كتا بة آية او آيتيں با لفارسية لا أكثر (قال ا لشامي) و الظاهر أن الفارسية غير قيد'' (شامی ص ۵۳/ جلد ۱)

(قرآن مجید کی ایک دو آیت کی کتابت تو فارسی زبان میں جائز ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی اس پر لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں فارسی کی زبان کی کوئی قید نہیں ہے)۔ بلکہ مطلق عجمی زبان مراد ہے۔ فارسی ہو یا ہندی، اردو وغیرہ شامل ہے، اور یہی موقف ائمہ شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا ہے (دیکھئے: النفحۃ القدسیہ: ص ۳۵، مغنی مع الشرح الکبیر: ۸۳۰/۱)۔

لہذا قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ روایات مذکورہ میں اس کا ناجائز ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے۔ اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی۔ اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا۔ اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کریں گے اس کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں ایک مہتم بالشان مقدمہ میں بیان فرمایا ہے کہ حق تعالی نے وعدہ فرمایا تھا کہ قرآن کی جمع وترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے،

قال تعالی: ''إن علینا جمعه و قرآنه'' (سورۂ قیامہ: ۱۷)، وقال تعالی: ''إنا نحن نزلنا الذکر وله لحافظون'' (سورۂ حجر: ۹)

لیکن اس وعدہ الہیہ کا ظہور اور حفاظت الہیہ کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا، جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے، اور نہ اس طرح کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہوجاتا ہے، جو مٹانے سے نہ مٹ سکے۔ بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع اور تدوین کی خدمت انجام دیں، اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہ قرآنی پر مجتمع اور متفق ہوجاویں۔ اور ہمیشہ جماعات عظیمہ اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہیں، تاکہ سلسلہ تواتر نہ ٹوٹ جاوے اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی میں بمشورہ و اجماع صحابہ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا، جس میں قرات شاذہ نہیں لی گئیں، بلکہ قرات متواترہ لی گئی اور ایک قریش کی لغت لی گئی

اور باقی لغات کے مصاحف متروک کردیئے گئے جن کا بعد میں کہیں نام ونشان نہیں رہا۔ اس واقعہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو گیا کہ قرآن جس کی حفاظت کا حق تعالی نے وعدہ فرمایا تھا، وہ یہی مصحف عثمانی ہے اور یہی قرآن محفوظ من اللہ ہے۔ ورنہ اگر حفاظت خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی، تو دوسرے لغات کے مصاحف کا تلف کردینا کسی مخلوق کی قدرت میں نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن محفوظ صرف وہ ہی ہے، جو مصحف امام اور مصحف عثمانی کہلاتا ہے۔ جو چیز اس میں نہیں وہ قرآن نہیں، اور جو چیز اس میں ہے وہ نہ مٹائی جاسکتی ہے، اور نہ اس میں کوئی ادنی تغیر کرنا جائز ہوسکتا ہے۔ یہی راز ہے اس اجماع کا ہے جو اوپر نقل کیا گیا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی بھی حفاظت واجب ہے (ازلۃ الخفا ص ۲۴، ج ۱)۔

اسی طرح علامہ سیوطی نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں رسم خط قرآنی اور کتابت قرآنی کے آداب پر مستقل فصل بعنوان (النوع السادس والسبعون) رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے۔

''وقال اشهب: سئل مالك ما يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ قال لا إلا على الكتبة الأولى۔ رواه الدارني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة''

(اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید کو اس خاص طرز میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں۔ بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے، اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں کوئی امام مالک کا اس بارہ میں مخالف نہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے:

''وقال الإمام احمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو الف او غير ذالك'' (اتقان ص ۱۶۷ ج ۲)

اور حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے واو، یاء، الف (زائدہ) ہیں (جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے میں آتے ہیں)۔

پھر لکھا ہے: ''وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف۔ ولا يخالفهم فيه۔ ولا يغير مما كتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علماء وأصدق قلبا ولسانا وأعظم أمانة. فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم''

اور امام بیہقی؛ شعب الایمان میں فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے، تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہ نے مصاحف لکھے ہیں۔ ان کی مخالفت نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور زیادہ سچے دل اور زیادہ زبان والے اور زیادہ امانت دار تھے، تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں۔ اس کے چند صفحہ بعد تحریر فرماتے ہیں:

''وهل تجوز كتابته غير العربي؟ قال الزركشي: لم أر فيه كلاما لأحد من العلماء، قال: ويحتمل الجواز، لأنه قد يحسنه من يقرأ بالعربية، والأقرب المنع كما تحرم قرأته بغير لسان العرب۔ ولقولهم: القلم أحد اللسانين: والعرب لايعرف قلما غير العربي. وقال تعالى: بلسان عربي مبين (اتقان ۲/ ۱۷۱)۔

کیا غیر عربی رسم خط میں قرآن کریم کی کتابت جائز ہے؟

علامہ زرکشی نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ میں نے اس بارہ میں کسی عالم کی تصریح نہیں دیکھی اور احتمال جواز کا ہے، کیونکہ بعض اوقات غیر عربی رسم خط کو وہ عجمی لوگ اچھی طرح ادا کرسکتے ہیں، جو عربی پڑھ تو لیتے ہیں۔ (لیکن لکھنے کی قدرت نہیں) لیکن اقرب التحقیق یہ ہے کہ غیر عربی رسم خط میں لکھنے کو منع کیا جاوے۔ جیسا کہ غیر عربی میں قرات کو منع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ قلم بھی ایک قسم کی زبان ہے اور عرب بجز عربی رسم خط کے اور کوئی رسم خط نہیں جانتے، اور حق تعالی نے فرمایا ہے: بلسان عربی مبین: اور علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نورالایضاح'' جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ مصنف تصانیف کثیرہ اور مذہب حنفی کے معروف مفتی ہیں۔ ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے۔ بنام ''النفحة القدسية في أحكام قراة القرآن وكتابته بالفارسية'': اس میں مذاہب اربعہ، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارات میں اس کا لکھنا حرام ہے اور اسی طرح غیر عربی خط میں

اس کی کتابت ممنوع و ناجائز ہے۔

"أما كتابة القرآن بالفارسة، فقد نص عليها في غير ما كتاب من كتب ائمتنا الحنفية المعتمدة منها ما قاله مولف الهداية الامام المرغيناني في كتابه التجنيس و المزيد ما نصه: و يمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع۔ لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن"

"و منها ما في معراج الدراية: أنه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية أشد المنع، و أنه يكون معتمده زنديقا، ثم ذكر مثله من الكافي و فتح القدير للمحقق ابن الهمام"

لیکن قرآن مجید کی کتابت فارسی زبان میں سو کسی ایک کتاب میں نہیں (بلکہ بہت سی کتب میں) جو ہمارے ائمہ حنفیہ کے نزدیک مستند ہیں، اس کی تصریح موجود ہے۔ منجملہ ان کے وہ ہے جو صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب تجنیس اور مزید میں فرمایا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے: اور فارسی میں کتابت قرآن سے باجماع منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ حفاظت قرآن میں خلل ڈالنے کا ذریعہ ہے، کیونکہ ہم قرآن مجید کے الفاظ اور معنی دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن مجید اگر اس طرح طبع کیا جاوے کہ متن قرآن کو ان کی زبان (ہندی، انگریزی، وغیرہ) اور ان کے رسم الخط میں لکھ دیا جائے، یعنی عبارت قرآن کی ہو اور رسم خط غیر عربی میں ہو، تا کہ غیر عربی داں حضرات کو تلاوت میں سہولت ہو شرعا ایسا کرنا باجماع امت حرام ہے اور تحریف قرآن کے حکم میں ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا مصحف عثمانی کے رسم خط کی تغییر و تبدیل ہے جو باجماع حرام ہے۔ نیز غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن مجید کی اشاعت و کتابت قطعاً جائز نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ سے بتدریج خدانخواستہ قرآن مجید میں تحریف و تغیر کی سازش کرنے والوں کے لئے راستہ ہموار ہونے کا خطرہ ہے۔ نیز اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ دیا جائے تو یہ بھی صورت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ عربی زبان کا تلفظ نہایت لطافت کا حامل ہے، جس میں معمولی سی تبدیلی معنی و مقصود کو بدل کر رکھ دیتی ہے، اس لئے علماء نے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو منع کیا ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے۔

"لم يجوز أحد من الائمة الأربعة كتابة القرآن بغير العربية" (الاتقان في علوم القرآن ص ۲/۱۷۱)۔

۳-بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بریل کوڈ نہ عربی رسم الخط ہے اور نہ رسم عثمانی جس میں قرآن مجید کا لکھنا لازم قرار دیا گیا اور فقہاء نے عربی رسم الخط کے علاوہ اور رسم خط عثمانی کے علاوہ میں قرآن مجید کی کتابت کو ممنوع قرار دیا ہے، جیسا کہ میں نے جواب نمبر ا۔ اور ۲ میں وضاحت کیا ہے۔ لیکن بریل کوڈ میں قرآن مجید کی اشاعت سے نابیناؤں کو غیر معمولی سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہر قدم پر بینا افراد کے محتاج نہیں رہ جاتے، حفظ کرنے والے نابینا افراد اس کی مدد سے قرآن یاد کر سکتے ہیں، بھولنے کی صورت میں اس کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں، براہ راست قرآن کا مطالعہ کر سکتے ہیں، نابیناؤں کی ان مجبوریوں کے پیش نظر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہونا چاہئے، نیز اس سلسلہ میں فقہاء کا کوئی جزیہ نظر سے نہیں گذرا ہے، لیکن یہاں مجبوری ہے اور یہ حاجت ہے اور حاجت ضرورت کے درجہ میں آکر ناجائز چیزوں کے لئے وقتی اور عارضی طور پر وجہ جواز بن جاتی ہے تو کیا یہ مجبوری وجہ جواز نہیں بنے گی جو ایک مستقل مجبوری ہے اور "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" اور "الضرورات تبيح المحظورات"، کے درجہ میں نہیں ہوگی، لہذا میری رائے یہ ہے کہ مذکورہ اصول کے پیش نظر بریل کوڈ میں قرآن مجید جو کہ نہ عربی رسم الخط اور نہ رسم عثمانی ہے جائز ہونا چاہئے، البتہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن مجید کا حکم اصل قرآن کا ہی ہوگا اس کو بلا وضو نہ چھوئے، نیز اس کے لئے وہی آداب و احکام رہیں گے جو اصل قرآن مجید کے ہیں۔

۴- اس سلسلہ میں فقہاء کی نہ تو کوئی عبارت اور نہ کوئی جزیہ نظر سے گذرا ہے، اور چونکہ یہ ایک نیا مسئلہ ہے، اس لئے اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

☆☆☆

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت

ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری[1]

۱- صرف ترجمہ قرآن کی متن قرآن کے بغیر اشاعت دعوت وتعلیم کی غرض سے درست ہے، یہ مصحف کے حکم میں نہیں، اس لئے بغیر وضو کے چھونا درست ہے، اس کا حکم تفاسیر ودینی کتابوں کا حکم ہوگا جن کا ادب لازمی ہے۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت درست نہیں۔

ب-متن قرآن کو غیر عربی زبان میں لکھنا صرف تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے درست ہے، ورنہ درست نہیں، نیز اسے تنہا غیر عربی رسم الخط میں نشر کرنا بھی درست نہیں، اسے مکمل قرآن کی شکل میں مستقل طور پر چھاپنا بھی جائز نہیں، اس طرح غیر عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی چیز پر مصحف کا اطلاق نہیں ہوگا، وہ تو صرف شرح وتفسیر الفاظ ہے غیر عربی میں، جسے تعلیمی کتابوں میں ضرورت کے تحت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عربی میں قرآن کو پڑھنا سیکھنا ضروری ہے جو بنسبت دوسری زبان کے آسان ہے، اس لئے دوسری زبان میں لکھنے کے بجائے عربی میں قرآن پڑھنے اور سیکھنے پر توجہ دینا ضروری ہے۔

ج-عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو صرف تعلیمی ضرورت شدیدہ کو پورا کرنے کے لئے ایک ساتھ شائع کرنا درست ہے، مگر استاذ کی نگرانی میں اسے صحیح طور پر تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، اور اس پر مصحف کا اطلاق نہیں ہوگا، بلکہ تفسیر وغیرہ کی کتابوں کا حکم ہوگا۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا نابیناؤں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے درست ومستحسن ہے، نیز اسے صحیح طور پر تجوید سے پڑھنے کے لئے مشق ضروری ہے، اس پر مکمل طور پر مصحف کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن مصحف کے آداب لازمی ہوں گے۔

۴- موبائل میں محفوظ قرآن کا حکم الکٹرونک مصحف کا حکم ہے، اس کے بارے میں معاصرین فقہاء کی مختلف آراء ہیں، ان میں سے مشہور وہ ہیں:

۱-الکٹرونک مصحف، اصل مصحف کے حکم میں نہیں، وہ صرف ایک آلہ ہے جس سے تذکر آیات پر مدد حاصل کی جاتی ہے، چونکہ آلہ یا پروگرام کے بند کرتے ہی آیات چھپ جاتی ہیں پھر دکھنا ممکن نہیں۔

۲-قرآن کے پروگرام کے جاری ہونے کے وقت میں ہی صرف وہ مصحف کے حکم میں ہے، چونکہ اس حالت میں آیات ظاہر ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہور فقہاء کے نزدیک مصحف کو چھونے کے لئے حدث اصغر واکبر سے پاک ہونا ضروری ہے، لیکن میرے نزدیک الکٹرونک مصحف مکمل طور پر ہر اعتبار سے اصل مصحف کے حکم میں نہیں، اس لئے آلہ اور مشین کو خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو (موبائل، قرص، کمپیوٹر، ہارڈ ویئر وغیرہ) اس میں اصل مصحف کی طرح اس میں مکتوب الفاظ حروف اور رسوم کو بغیر کسی حائل کے ڈائریکٹ چھونا ممکن نہیں، چونکہ اسکرین پر جو قرآنی کلمات وحروف نظر آتے ہیں وہ تو صرف الکٹرونک وائبریشنس اور حرکات ہوتی ہیں جو ایک متعین پروگرام کے تحت وجود میں آکر اسکرین پر نظر آتی ہیں اور وہ صرف رفلیکشن کے وقت ہی دکھتی ہیں، اس کے ختم ہوتے ہی اسکرین پر نظر نہیں آتیں، اس لئے شیشہ یا کسی اور دھات سے تیار اسکرین کو چھونا مصحف کے چھونے کے حکم میں نہیں۔ البتہ اسکرین پر قرآن کریم کے ظاہر ہونے کے وقت اسے گندگی سے چھونا، گندگی میں رکھنا، یا اسے اس حالت میں بیت الخلاء میں جانا درست نہیں، یہ اس کی حرمت کے خلاف ہے، جس پر فقہاء کا اتفاق ہے، موبائل کے بند ہونے یا پروگرام کے بند ہونے کی صورت میں کوئی حرج نہیں۔

اس سے یہ بات واضح رہے کہ موبائل کی اسکرین پر اگر قرآن مجید ظاہر ہو تو آپ موبائل کو بغیر وضو کے چھو سکتے ہیں، البتہ اگر باوضو رہیں تو افضل ہے۔

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، کے اے نظامی سینٹر فار قرآنک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

قرآن مجید سے متعلق چند اہم مباحث

مولانا محمد شکیل اسلامپوری[1]

۱-متن قرآنی کے بغیر محض ترجمہ کا عدم جواز:

چونکہ متن قرآن کے بغیر محض ترجمہ یہ بھی کبھی ضیاع کا سبب بن سکتا ہے، اس لئے باجماع امت یہ امر کسی بھی حال میں جائز نہیں، خواہ کتنی ہی بڑی مصلحت پیش نظر کیوں نہ ہو، لیکن حفاظت قرآن سے بڑھ کر کوئی مصلحت نہیں ہوسکتی، اس لئے محض ترجمہ کو شائع کرنا جائز نہیں، جس پر ائمہ احناف کی معتبر کتب، نیز دیگر مسالک فقہ کی کتب میں صریح جزئیات موجود ہیں۔

۱- چنانچہ مؤلف ہدایہ علی بن ابی بکر الفرغانی المرغینانی اپنی کتاب "التجنیس والمزید" میں فرماتے ہیں:

ویمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع، لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن، لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى، فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمرالقرآن" (كتاب التجنيس والمزيد/ ٢٧٧، نیز دیکھئے: فتح القدیر ١/ ٢٣٨، فتاوی محمودیہ ٢/ ٥١٠، کفایۃ المفتی ١/ ١٦٩ زکریا، فتاوی رشیدیہ/ ٧٥، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

۲-"أما عند الإمام الشافعي فقد قدمنا عن الإمام الزركشي إحتمال الجواز، وأن الأقرب المنع من كتابة القرآن بالفارسية كما تحرم قراءته بغير لسان العرب" (النفحة القدسية)۔

علامہ زرکشی نے احتمال جواز کے بعد فارسی زبان میں تلاوت پر قیاس کرکے کتابت بالفارسیہ کی حرمت کا فتوی دیا۔

۳- اسی طرح علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنے فتاوی میں حرمت کا فتوی دیتے ہوئے فرمایا:

"وقد سئل هل تحرم كتابة القرآن الكريم بالعجمية كقراءته؟ فأجاب بقوله قضية ما في المجموع، الإجماع على التحريم، وقال في محل آخر: "قال الزركشي: وليس تطيبه، وجعله على الكرسي وتقبيله، ويحرم مد الرجل إلى شيء من القرآن أو كتب العلم يحرم أيضا كتابته بقلم غير العربي" (فتاوی ابن حجر)۔

عبارت مذکورہ علامہ ابن حجرؒ نے نفس تحریم کو بیان فرمایا ہے، پھر آگے اس کی علتیں بیان کرتے ہیں:

۱-"وفي كتابة القرآن العظيم بالعجمي تصرف في اللفظ المعجز الذى حصل التحدي به بما لم يرو" (حوالہ سابق) (کہ عجمی زبان میں لکھنے کی صورت میں عربی کلمات جو کہ معجز اور چیلنج ہیں ان کو بدلنا لازم آتا ہے ان کلمات سے جو معجز وارد نہیں ہوئے ہیں)۔

۲-"ربما يوهم عدم الإعجاز، بل الركاكة؛ لأن الألفاظ العجمية فيها تقديم المضاف إليه على المضاف، ونحو ذلك مما يخل بالنظم ويشوش الفهم وقد صرحوا بأن الترتيب مناط الإعجاز" (حوالہ مذکور)۔

حاصل عبارت کا یہ ہے کہ نظم قرآنی خود معجز ہے، اب اگر کسی اور زبان میں نقل کیا جائے تو اس میں خلل آجائے گا، اس لئے کہ عربی میں تراکیب کی ترتیب الگ ہوتی ہے۔

۳-"وأما عند الأئمة المالكية فكما نقل العلامة ابن حجر في فتاواه: أن الإمام مالكا سئل، هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى" (حوالہ سابق)۔

---

[1] خادم جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات۔

(ائمہ مالکیہ کے نزدیک بھی یہ چیز جائز نہیں جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ نے اپنے فتاوی میں اس کا ذکر کیا ہے کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ لوگوں نے جو حروف ہجاء کی ترتیب پر لکھنے کا نیا طریقہ ایجاد کیا ہے، کیا یہ طریقہ جائز ہے؟ آپ نے سختی سے ممانعت فرماتے ہوئے مصحف عثمانی کی اتباع کو ضرور قرار دیا)۔

چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی شافعیؒ ''اتقان'' میں فرماتے ہیں:

''قال أشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال لا إلا على الكتبة الأولى. رواه الداني في المقنع. ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة'' (الاتقان فی علوم القرآن)۔

اسی طرح مسلک حنابلہ میں علامہ ابن قدامہ حنبلی اپنی کتاب ''المغنی'' میں فرماتے ہیں: ''ولا تجزئه القراءة بغير العربية ولا إبدال لفظها بلفظ عربي سواء أحسن قراء تها بالعربية أو لم يحسن. وبه قال الشافعي وأبويوسف و محمد. وقال أبوحنيفة: يجوز ذلك، وقال بعض أصحابه: إنما يجوز لمن لم يحسن العربية'' (المغنی لابن قدامہ)۔

مذکورہ عبارت سے واضح ہوگیا کہ غیر عربی میں قراءت کے عدم جواز پر سوائے امام اعظمؒ کے سبھی کا اجماع ہے، خواہ اچھی طرح عربی پڑھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، اور امام اعظمؒ کا اختلاف بھی اسی وقت ہے جب کہ اچھی عربی نہ پڑھ سکتا ہو۔

نیز متن قرآنی کے بغیر محض ترجمہ کو شائع کرنا اور چھاپنا بالکل ہی ممنوع ہے، لہذا اس ترجمہ کو خریدنا، بیچنا، ہدیہ دینا، ہدیہ میں قبول کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ اگر یہ تصرفات کئے جاتے رہے تو اس کو فروغ ملے گا، حالانکہ اس کو تو نا پید کرنا ہے اس لئے خریدنا، بیچنا، ہدیہ قبول کرنا کچھ بھی جائز نہیں، جیسے کسی کے لئے بھیک مانگنا، سوال کرنا جائز نہیں تو اس کو دینا بھی جائز نہیں اس لئے کہ جب اس کو لوگ دینا بند کردیں گے تو وہ خود بخود مانگنا بند کردے گا، تو اس طرح محض ترجمہ چھاپا گیا اور لوگ اس کو لینا دینا اور خریدنا بند کردیں گے تو لازمی طور پر وہ خود بخود بند ہوجائے گا اور اگر لیں گے تو اس کو فروغ ملے گا حالانکہ یہ معاونت علی الاثم ہے جس کی قرآن پاک میں صراحۃ ممانعت آئی ہے، ''ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (مائدہ: ۲، امداد الفتاوی ۴/ ۴۲، جواہر الفقہ ۲/ ۱۰۳)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

رسم مصحف عثمانی کا اتباع ہر حال میں واجب ہے، اس کے خلاف کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں، اس پر تمام علماء امت کا اجماع ہے۔

''وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء ؟ فقال: لا. إلا على الكتبة الأولى. رواه الداني في المقنع. ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة. وقال في موضع آخر: سئل مالك عن الحروف في القرآن مثل الواو والألف: أترى أن يغير من المصحف إذ وجد فيه كذلك ؟ قال: لا. قال أبوعمرو: يعني الواو والألف المزيديتين في الرسم المعدومتين في اللفظ نحو: (أولوا). وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك. وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفًا. فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف، ولا يخالفهم فيه. ولا يغير مما كتبوه شيئًا. فإنهم كانوا أكثر علمًا. وأصدق قلبًا ولسانًا. وأعظم أمانةً. فلا ينبغي أن نظنّ بأنفسنا استدراكًا عليهم '' (الاتقان فی علوم القرآن)۔

(اس مذکورہ عبارت سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مصحف عثمانی میں اگر کچھ حروف زائد ہیں جو صرف لکھنے میں تو آتے ہیں، پڑھنے میں نہیں آتے تو ان کو بھی ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ سے اسی کا اتباع ثابت ہے، حالانکہ ہم سب کا ایمان ہے کہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین باعتبار علم کے ہم سے بڑھے ہوئے، قلب ولسان کے اعتبار سے ہم سے زیادہ سچے، اور امانت و دیانت میں ہم سے عظیم تھے، لیکن اس کے باوجود مصحف امام میں کسی بھی طرح کی ترمیم ان کی طرف سے ثابت نہیں بلکہ پوری طرح اسی کا اتباع کیا تو پھر اب اس میں ترمیم کر کے ہم ان اسلاف پر استدراک کی کوشش کریں کہ شاید یہ بات ان سے رہ گئی تھی جس کو ہم پورا کررہے ہیں یہ استدراک کسی بھی طرح صحیح اور مناسب نہیں)۔

حضرت امام ابن جوزیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ بے شک جس طرح امت کے لئے مطلب قرآن کو سمجھنا اور اس کے حدود کو قائم رکھنا عبادت ہے، اسی طرح صحیح پڑھنا، اور حروف کو طریقہ کے مطابق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی عبادت ہے، قرآن شریف قابل استاذ کے پاس صحیح تلفظ سے پڑھے بغیر عربی رسم الخط کے بھی صحیح پڑھنا دشوار ہے، تو پھر ان پڑھ آدمی گجراتی رسم الخط میں کس طرح صحیح پڑھ سکتا ہے؟ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ جو سورتیں زبانی صحیح یاد ہیں وہی پڑھا کرے، مگر گجراتی میں نہ پڑھے کیونکہ غلط پڑھنا حرام ہے (اتقان، درمختار، شامی، فتاوی ابن تیمیہ، شرح جزری، ملاعلی قاری، بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۳/۱۶)۔

الفاظ قرآن کو عربی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے، ہندی یا کسی اور رسم الخط میں لکھنے کی اجازت نہیں (شامی وفتح القدیر بحوالہ بالا)۔

اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے، جیسا کہ پہلے ''اتقان'' کے حوالہ سے کئی جگہ یہ عبارت گذر چکی ہے، ہندی رسم الخط میں عبارت مسخ ہوجائے گی، ''ح، ذ، ز، ض، ظ'' میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہوگی، اصل مخارج وصفات سے ادا خہ کیا جائے گا، استعلاء، اطباق، استطالت، سب کچھ ضائع کردیں گے (فتاوی محمودیہ کراچی ۳/۵۱۰)۔

اسی طرح مولانا ظفر احمد تھانویؒ چند عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ان تصریحات سے چند امور معلوم ہوئے:

۱- باجماع ائمہ اربعہ کتابت قرآن میں مصحف عثمانی کا اتباع واجب ہے جس کی مخالفت گناہ ہے، مگر کفر نہیں، البتہ رسم الخط عثمانی میں طعن کرنا اور اس کی تحقیر کرنا تشویش ناک ہے جس سے کفر کا اندیشہ ہے۔

۲- واو، یاء اور الف کا حذف ان مواقع میں واجب ہے جہاں مصحف عثمانی میں ان حروف کو حذف کیا گیا ہے اور جہاں زیادہ کئے گئے ہیں وہاں زیادہ کرنا واجب ہے۔

۳- اسی طرح جہاں تاء کو بصورت تاء مربوطہ لکھا گیا ہے وہاں اسی طرح لکھنا واجب ہے اور جہاں بصورت تاء مجرورہ طویلہ لکھا گیا ہے وہاں جروطول کے ساتھ لکھنا واجب ہے۔

''قال الشیخ المحقق المقری محمد صدیق الأفغانی ناقلا عن کتب الأئمة القدماء المشهورین فی رسالة زبدة ترتیل القرآن ''مانصه وماکتبوه بغیر ألف فواجب أن یکتب بغیر ألف، وقرئ نحو ''الله، الرحمن، العالمین و مالك وذلك ورزقناهم، وهٰذا وآیت، ویقوم، وساحر، وقل، وصادقین، وکاذبین، وکافرین، وکاسرین، والسماوات والقیامة وأمثالها علامتها الفتح الخنجریة یطول الصفحة لایرضها (۹۳) وفیه أیضا (۹۷) وما کتبوه بتاء طویلة فواجب أن یکتب بتاء طویلة وماکتبوه بتاء مدورة فواجب أن یکتب بتاء مدورة''۔

پس جس طرح الفاظ (العالمین، صالحین، صابرین، صاغرین، کافرین، شاکرین، جناب، آیات، ملائکہ) کو سوال میں بطور مثال لکھا گیا ہے ان میں بھی مصحف عثمانی کا اتباع واجب ہے، اور وہ بھی داخل رسم عثمانی ہیں، ان کو الف سے لکھنا مصحف میں جائز نہیں (امداد الاحکام ۱/۲۳۵)۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ جب اس معمولی درجہ کی تغییر بھی جائز نہیں تو پھر پورا قرآن پاک دوسری زبان میں لکھنا جس میں کئی حروف کی زیادتی اور کمی لازم آتی ہے وہ بدرجہ اولی جائز نہ ہوگا۔

اسی طرح مفتی شفیع صاحبؒ نے بحوالہ فتاوی ابن حجر نقل کیا ہے:

''وزعم أن کتابته بالعجمیة فیها سهولة لتعلیم کذب مخالف للواقع والمشاهدة، فلا یلتفت لذلك علی أنه لوسلم صدقه لم یکن مبیحا لإخراج ألفاظ القرآن عما کتب علیه، وأجمع علیه السلف والخلف''۔

اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے مفتی شفیع فرماتے ہیں: خداوند قدوس نے ''قراءۃ'' قرآن کے آسان کردینے کا جو کھلے الفاظ میں ''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ'' (سورۂ قمر: ۱۷) کہہ کر اعلان فرمایا، اس کا مشاہدہ سب کی آنکھوں کے سامنے آگیا کہ ہر ملک اور ہر زبان والے قرآن کو ایسا پڑھتے ہیں کہ اپنی مادری زبان کی کتابوں کو بھی ایسا نہیں پڑھ سکتے، اور انہیں اہل عجم میں سینکڑوں ایسے حضرات ہوئے جو تجوید قرآن اور دیگر علوم قرآنیہ میں امام مانے گئے''۔

الغرض اول تو یہ مشکلات محض خیالی ہیں، ان کو مشکل تسلیم کرنا ہی غلط ہے، اور بالفرض اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہر مشکل کا ازالہ یہ بھی تو کوئی ضروری نہیں، یوں تو روزہ، نماز بھی ارکان اسلام اپنے اندر کچھ نہ کچھ مشکل رکھتے ہیں۔

الغرض صحابہؓ وتابعینؒ کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت ضروری ولازم ہے، کسی عجمی زبان میں بدون قرآنی عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری ہے، کسی دوسرے رسم الخط میں اس کو لکھنا، اس لئے جائز نہیں کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت کے ساتھ تحریف قرآن کا راستہ بھی کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے۔

عربی متن کے ساتھ دوسری زبان میں کتابت قرآن:

ظاہر ہے کہ جب اس طرح کا قرآن ہوگا تو اس کا مطمح نظر وہی قرآن ہوگا جو دوسری زبان میں لکھا ہوا ہے، اور یہ بھی مذکورہ ترمیم وتحریف سے خالی تو نہیں ہے، اس لئے خواہ متن عربی کے ساتھ دوسری زبان میں قرآن لکھا جائے یا بغیر متن عربی کے محض دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھا جائے کوئی بھی صورت جائز نہیں۔

موبائل میں محفوظ قرآن پاک کا حکم:

چند متفق علیہ امور: ۱- مصحف ورقی کو بلا طہارت مس کا عدم جواز متفق علیہ ہے، ۲- قرآن پاک اگر موبائل میں محفوظ ہے اور پروگرام بند ہے تو اس موبائل کو بھی بلاوضو مس کرنا جائز ہے، ۳- اگر اسکرین پر قرآنی آیات ظاہر ہو تو اسکرین کو چھوڑ کر مابقیہ ڈھانچہ بمنزلہ غلاف کے ہے، جیسا کہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے کیسٹ کی کیس جو اس فیتہ پر رہتی ہے جس فیتہ میں قرآن پاک محفوظ ہوتا ہے کو بمنزلہ غلاف قرار دے کر بلا طہارت مس کو جائز کہا ہے (جدید فقہی مسائل ۱/ ۱۰۳)، اسی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسکرین پر آیات ظاہر ہو تو اسکرین چھوڑ کر مابقیہ جثہ (غلاف کے درجہ میں ہونے کی وجہ سے) کو چھونا جائز ہونا چاہئے (آگے دلائل سے اس کو ثابت کیا جائے گا) اس لئے کہ یہ بھی مانند اس کیس کے ہے جو فیتے پر لگی رہتی ہے۔

اسکرین پر ظاہر آیات کا حکم:

البتہ سوال یہ ہے کہ مذکورہ حالت میں خود اسکرین کو بلاوضو مس کیا جاسکتا ہے یا نہیں اس باب میں دو چیز تحقیق طلب ہے:

۱- مصحف کی حقیقت کیا ہے، ۲- مصحف اور اس کے علاوہ مکتوب قرآن مجید میں فرق ہے یا نہیں۔

۱- مصحف کی لغوی حقیقت:

علامہ جوہری فرماتے ہیں کہ ''أصحف أی جمعت فیه الصحفة'' (لسان العرب ۸/ ۲۰۴)۔

اسی طرح صاحب ''معجم تہذیب اللغۃ'' فرماتے ہیں کہ ''قال اللیث: إنما سمی المصحف مصحفا؛ لأنه أصحف أی جعل جامعا للصحف المکتوبة بین الدفتین'' (معجم تهذیب اللغة ۲/ ۱۹۸)

یعنی مصحف کو مصحف اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں لکھے ہوئے مصاحف کو دوگتوں کے مابین جمع کردیا گیا ہے۔

چونکہ مصحف کے لغوی معنی میں دفتین کے معنی ملحوظ ہیں، اس لئے ایک دو ورق لکھے ہوئے ہوں تو اس کو مصحف نہیں کہا جائے گا، چنانچہ شیخ عبدالعظیم زرقانی فرماتے ہیں کہ ''فکان المصحف ملحوظا فی معناه اللغوی دفتاه ای جانباه أی جلداه اللذان یتخذان جامعا لأوراقه ضابطا لصحفه حافظا لها'' (مناہل العرفان ۱/ ۳۲۴) یعنی مصحف کی تعریف میں دفتین کی قید ملحوظ ہے اور دفتین وہ دو جانب اور دو طرف ہے جو اوراق مصحف کے لئے جامع، اس کے صحیفوں کے ضابط ومحافظ ہے۔

۲- مصحف کی اصطلاحی تعریف:

اسی لئے مصحف کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے: ''یصدق المصحف علی ما کان حاویا للقرآن کله أو کان مما یسمی مصحفا عرفا ولو قلیلا کحزب علی ما صرح به القیوبی، وقال ابن حبیب: یشمل ما کان مصحفا جامعا أو جزء

أو ورقته فيها بعض سورة، أو لوحا أو كتفا'' (مكتوبه موسوعه فقهيه ۵/ ۳۸)

مصحف کا لفظ اس چیز پر صادق آئے گا جو پورے قرآن کو حاوی ہو یا پھر جس کو عرف میں مصحف کہا جاسکتا ہو اگر چہ قلیل مقدار ہی کیوں نہ ہو، جیسے کوئی خاص حصہ، جیسا کہ قلیوبی نے صراحت فرمائی ہے۔

اگر چہ ابن حبیب نے یہ کہا ہے کہ مصحف اس کو بھی کہتے ہیں جو کل یا بعض حصے پر مشتمل ہو، نیز اس کاغذ، تختی یا ہڈی کو بھی کہتے ہیں جس پر کچھ حصہ قرآن لکھا ہوا ہو (حاشیہ دسوقی ۱/ ۱۲۵ بحوالہ موسوعہ فقہیہ)، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کرام کے کلام سے کل مصحف اور بعض مصحف کے مابین باعتبار حکم کے فرق ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے، لہٰذا دونوں کو ایک ہی طرح شمار کرنا صحیح نہیں۔

مصحف وغیر مصحف کے مابین فرق: فقہاء نے دونوں کے مابین فرق کیا ہے، چنانچہ صاحب بحر فرماتے ہیں:

''يمنع مس المصحف كله المكتوب وغيره بخلاف غير، فإنه لا يمنع إلا مس المكتوب، كذا ذكره في السراج الوهاج مع أن في الأول اختلافا فقال في غاية البيان: وقال بعض مشائخنا: المعتبر حقيقة المكتوب حتى أن مس الجلد ومس مواضع البياض لايكره؛ لأنه لم يمس القرآن، وهذا أقرب إلى القياس، والمنع أقرب إلى التعظيم'' (البحر الرائق ۱/ ۳۴۹)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مصحف میں کسی بھی حصے کو چھونا جائز نہیں نہ تو مکتوب کو اور نہ ہی غیر مکتوب کو برخلاف غیر مصحف میں صرف مکتوب کو بلا وضو چھونے کی ممانعت ہے، الگ بات ہے کہ پہلی صورت میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ ''غاية البيان'' میں بعض مشائخ نے فرمایا کہ مصحف میں بھی اصل مکتوب ہی کا اعتبار ہے حتی کہ جلد اور بیاض کو چھونا مکروہ نہیں ہے، اس لئے کہ اس کو قرآن چھونا نہیں کہتے، یہ حکم باعتبار قیاس کے اقرب ہے، لیکن ممانعت کا حکم باعتبار تعظیم کے اقرب ہے معلوم ہوا کہ مصحف کی کسی بھی چیز کو چھونا جائز نہیں، مکتوب حصے کو اصالۃً اور غیر مکتوب کو تعظیما، جبکہ غیر مصحف میں صرف مکتوب حصے کو چھونا ممنوع ہے۔

بوقت ظہور قرآن اسکرین کو چھونا: جب موبائل کی اسکرین پر آیات قرآنی ظاہر ہو تو مذکورہ عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا وجو اس کا چھونا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ مس اسکرین پر لگے ہوئے شیشے کے توسط سے ہے نہ کہ براہ راست مکتوب کو مس کیا جارہا ہے۔ لیکن تعظیم اور احترام کا تقاضا یہی ہے کہ مکروہ ہو اور احتیاطاً منع ہی کیا جاوے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں، البتہ اگر وہ پڑھا جانے لگے تو اس وقت دلالت وضعیہ غیر لفظیہ کی وجہ سے ان کا حکم حروف مکتوبہ کا دیا جاوے گا (اس لئے کہ کتابت کی اصل وہ نقوش ہیں جو حروف ہجائیہ پر مشتمل الفاظ وکلمات کے مجموعے پر دلالت کریں (دستور العلماء ۳/ ۸۴)، یہ حکم تو نقوش کا ہے (امداد الفتاوی ۱/ ۱۴۵)۔

اسی طرح مفتی سلمان صاحب منصور پوری کے حوالے سے مولانا اسماعیل صاحب برہانپوری نے اپنی کتاب ''موبائل کے مسائل'' میں لکھا ہے کہ جس اسکرین پر قرآن کی آیت نمایاں ہو تو اس اسکرین کو بلا وضو چھونا احتیاط کے خلاف ہے، نیز علامہ شامی فرماتے ہیں:

''ويمنع... مسه أي القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط'' (شامی ۱/ ۴۸۸)

نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آیات قرآنی اسکرین پر ظاہر ہونے کی صورت میں تختی یا ورق پر لکھی ہوئی آیات کے درجے میں ہے، لہٰذا اس حالت میں موبائل کے ڈھانچے کو پکڑنا جائز ہے۔

☆☆☆

قرآن مجید کا ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنا

مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی مفتاحی [1]

۱-بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کا مسئلہ:

قرآنی کتاب ہدایت ہے اور اس کی ہدایت اس کے الفاظ و متن کی تفہیم کے ساتھ ہے، نیز الفاظ قرآن میں اللہ نور رکھا ہے، اس لئے کہ یہ کلام الٰہی ہے، اصل حق اس کا تو یہی ہے کہ عربی زبان سے اس قدر واقفیت حاصل کی جائے جس سے قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے، ہمارے اکابرین نے جب یہ دیکھا کہ دینی و اسلامی تعلیم سے امت کا بڑا طبقہ دور ہونے لگا ہے اور قرآن مجید کی صرف تلاوت تک ہی وہ محدود رہ گئے اس سے ہدایت کے نور کو جو اصل کی تفہیم کے بغیر مشکل ہے دور ہونے لگے تو اس کا دوسری زبان میں متن کے ساتھ ترجمہ بھی شائع کیا، الحمد للہ اس سے عوام تو عوام خواص کو بھی بے حد مسرت ہوئی۔

لیکن بغیر متن کے قرآن پاک کا صرف ترجمہ شائع کرنا اس میں دو بڑی قباحت ہے۔

۱- اس سے آزادروی کو قوت ملے گی اور ترجمہ میں تحریف کر کے معانی کے مفہوم کو بگاڑا جا سکتا ہے۔

۲- احترام قرآن کا پہلو ختم ہو جائے گا، اور اس سے ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور اللہ تعالی نے "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹) میں جس قرآن کی حفاظت کا اعلان فرمایا ہے اس سے متن قرآن مراد ہے نہ کہ معانی قرآن، صرف ترجمہ شائع کرنے کا ماحول یا حوصلہ افزائی بہت بڑے شر کو جنم دینا ہوگا۔

۲-غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

تنہا غیر عربی رسم الخط میں قرآنی الفاظ کو شائع کرنا یہ میرے نزدیک درست نہیں اس سے بھی تحریف قرآن گندے ذہن والوں کو حوصلہ ملے گا، البتہ اگر عربی رسم الخط کے ساتھ غیر عربی میں شائع کیا جائے تو درست ہوگا، لیکن احترام دونوں حروف کا برابر لازم ہوگا، باوجودیکہ عربی رسم الخط میں جو نور اور روحانیت اور غلطی سے جو حفاظت ہے وہ غیر عربی رسم الخط میں نہیں اور تلفظ کی ادائیگی میں بھی بڑی غلطی ہوتی ہے، اس کے لئے اچھے معلم سے تعلیم کو لازم کرنا ضروری ہوگا۔

۳-بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی اشاعت دور جدید کی نعمت عظمی ہے، اس سے نابینا حضرات کے لئے بڑی سہولت اور بینا حضرات سے کافی حد تک محتاجی ختم ہو گئی، البتہ ابتدائی تعلیم کسی اچھے قاری وحافظ کی لازم ہے تاکہ وہ مخارج اور الفاظ کی ادائیگی کو سیکھ لیں۔ اندور میں میرے قیام گاہ کے قریب ہی نابیناؤں کا مدرسہ ہے الحمد للہ بے حد کامیاب ہے، طلباء پڑھ بھی لیتے ہیں اور قدیم طلباء سوئی کے ذریعہ سخت کاغذ پر لکھ بھی لیتے ہیں۔

اس کی کتابت صرف چھ نقطوں کے ذریعہ ہوتی ہے، ۶۳ قسم کے ڈیزائن یعنی حروف اس سے بنتے ہیں یہ لکھا سیدھی جانب سے ہے اور پڑھا الٹے جانب سے (یعنی بائیں طرف سے) ابتداء ماربل تختی جس میں نقطے چھ بیں تعلیم دی جاتی ہے، اسی طرح گیند اور زمین میں چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا کر سمجھایا جاتا ہے، لیکن شروع سے ہی بچوں کو قرآن کی تلاوت میں باوضو ہو کر تلاوت کی تعلیم دی جاتی ہے، ویسے میرے نزدیک شرعاً اس کو چھونے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں، یہ حکم میرے نزدیک موبائل اسکرین کا بھی ہے۔ ☆☆☆

---

[1] خطیب جامع مسجد قاضی شریعت، دار القضاء اندور۔

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت

مفتی عبداللہ کاوی والا[1]

۱- کسی بھی زبان میں متن قرآن کے بغیر تنہا قرآن کے ترجمہ کی اشاعت درست نہیں، کیونکہ متن قرآن میں جو جامعیت وفصاحت وبلاغت و معانی ہیں، وہ تمام خوبیاں کسی اور زبان کے ترجمہ میں پایا جانا مشکل ہے، بلکہ آئندہ چل کر اسی کو قرآن سمجھنے میں تحریف کا خطرہ ہے، جب اس کی اشاعت درست نہیں ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنا بھی درست نہیں، چونکہ وہ قرآن کا حکم نہیں رکھتا اور اس کی اشاعت ہی درست نہیں ہے تو اسے بے وضو چھونے کا سوال ہی نہیں، پھر بھی درست نہ ہونے کے باوجود کسی نے اشاعت کی تو مکمل اصل قرآن کا حکم نہ ہونے کی وجہ سے بلاوضو چھونے والا گنہگار نہ ہوگا، معانی اور مفہوم کی وجہ سے ادب واحترام کے طور پر باوضو چھوئے یہ بہتر ہے۔

جو لوگ قرآن پاک کی عبارت کو عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے ہیں، یا اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ہیں، ان کے لئے متن قرآن کو ان کی زبان (ہندی، انگریزی وغیرہ) اور ان کے رسم الخط میں لکھنا اور عبارت قرآن کی ہو اور رسم الخط غیر عربی: دتا کہ غیر عربی داں حضرات کو تلاوت قرآن میں سہولت ہو ایسا کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ عربی رسم الخط نہ ہونے کی وجہ سے عربی حروف، مثلاً س، ث، ص، ث ایسے ہی د، ض، ج، ذ، ظ، ز اور ک، ق، اور ط، ت اور ح، ھ وغیرہ میں تمیز کرنا مشکل ہے، اس لئے کہ دوسری، یعنی غیر عربی زبان میں یہ حروف نہیں ہیں اور قرآن مجید کے مطلب ومعانی کے بدل جانے کا یقین ہے یہ بھی تحریف ہی ہے جو حرام ہے، ہاں اگر غیر رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے تو درست رہے گا، کیونکہ پڑھنے والا عربی رسم الخط مدنظر رکھتے ہوئے صحیح پڑھ لے گا، اور غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت درست نہیں، ممنوع ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا نابینا جو بینائی سے بالکل محروم ہیں، یا انتہائی کمزور بینائی والے افراد کے لئے کہ وہ قرآن پڑھ سکیں، سمجھ سکیں اس بڑی نعمت سے محروم نہ رہیں، ان کی اس مجبوری کی وجہ سے ان کے لئے درست ہے اور مستحسن ہے، البتہ بریل کوڈ میں تیار کیا ہوا قرآن کا حکم اصل قرآن کی طرح نہیں ہے، اس کے چھونے کے لئے باوضو ہونا ضرور نہیں ہے، وضو کے بغیر بھی اسے چھوا جا سکتا ہے، ہاں معانی قرآن کی طرح اس کے آداب واحترام اصل قرآن کی طرح رہے گا، جیسا کہ قرآن کی تفسیر کے آداب واحترام ہیں باوضو چھونا گو ضروری نہیں، مگر ادب واحترام کے لئے وضو کرنا چاہئے، دیگر قرآن کے آداب کی طرح بریل کوڈ میں کتابت کئے ہوئے قرآن کے آداب واحترام کرنا ہوگا۔

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے باوضو ہونا ضروری رہے گا، قرآن کے رسم الخط عربی میں اسکرین پر ظاہر ہونے کی وجہ سے موبائل کے ڈھانچہ کو غلاف تصور نہیں کیا جائے گا، اس لئے اسے بے وضو چھونے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

☆☆☆

---

[1] دار العلوم عربیہ اسلامیہ، بھروچ، گجرات۔

قرآن کریم کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت

مولانا اویس بن صالح بنگ [1]

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

بغیر متن عربی کے کسی بھی زبان میں صرف قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنا درست نہیں ہے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: "چونکہ نظم عربی اور اس کی خصوصیات کی حفاظت ضروری ہے، اور خالص ترجمہ کی اشاعت میں تغیر اور تبدیلی کے امکانات زیادہ ہیں" (کفایت المفتی ۱/ ۱۲۷-۱۲۸، ۱۳۰، کتاب العقائد پانچواں باب قرآن مجید اور دیگر کتب سماوی)، نیز دیگر اکابر کے فتاوی میں بھی عدم جواز کی تصریح موجود ہے (فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۰۷ تا ۵۱۰ باب ما یتعلق بالقرآن، خیر الفتاوی ۱/ ۲۱۴، ۲۱۵، کفایۃ المفتی ۹/ ۶۵-۶۶ کتاب الحضر والاباحۃ، بوادر النوادر ۱/ ۳۱۷، چھیاسٹھویں حکمت عدم جواز کتابت ترجمہ قرآن مجرد از قرآن، حضرت نے اس موقع پر بڑی تفصیل کی ہے فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۵۸، ادب قرآن کا بیان)۔

جب اس کی اشاعت ناجائز ہے تو اس کے ذرائع بیچنا، خریدنا، تقسیم کرنا اور ہدیہ کرنا بھی ناجائز ہی کہلائے گا (فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۰۷ تا ۵۰۹ باب ما یتعلق بالقرآن)۔

فانی دنیا میں موجود تمام مختلف لغات اور زبانیں اللہ تعالی کی پیدا کردہ ہیں، اور یہ لغات کا اختلاف اللہ تعالی کی قدرت کا مظہر ہے مثل دنیا کے جیسا کہ سورہ روم کی آیت نمبر ۲۲ میں مذکور ہے ظاہر ہے کہ مثال کے طور پر فقط ایک مضمون مزاج پرسی کا مختلف زبانوں میں مختلف لب ولہجہ کے ساتھ بولا جانا مثلاً "کیف انت" عربی میں (آپ کیسے ہیں؟)، اردو میں، "How are you" انگریزی میں، "وغیرہا فی اللغات المختلفۃ المنتشرۃ فی الہند وغیرہا فی العالم کلہا" یہ اللہ تعالی کی قدرت ہی سے ہوسکتا ہے۔

اصول تفصیل:

جس طرح اللہ تعالی نے دیگر چیزوں میں اصول تفصیل کے پیش نظر کسی کو افضل اور کسی کو مفضول بنایا ہے اسی طرح یہ اصول لغات اور زبانوں میں بھی جاری ہوا ہے اسی بنا پر عربی زبان کو دیگر زبانوں پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ افضل کتب کو افضل لغات، یعنی عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، نیز یہی وجہ ہے کہ عربی زبان کو بقاء حاصل ہے برخلاف دیگر زبانوں کے کہ ان میں سے بہت سی زبانیں فنا ہو چکی ہیں، اور جو زبانیں عربی کے علاوہ اس دنیا میں موجود ہیں وہ بھی آئندہ فنا ہو جائیں گی۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

متن قرآن کو عربی کے علاوہ کسی بھی زبان کے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں (فتاوی عثمانی ۱/ ۲۱۸) جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

الف- قرآن کریم عربی زبان ہی میں نازل ہوا ہے، کما قال تعالی: "قرآنا عربیا" (سورۂ یوسف: ۲)۔

ب- قرآن کریم کا رسم الخط عام عربی رسم الخط سے بھی مخصوص ہے اور قرآن کریم کی رسم الخط کی مخالفت کی حرمت پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، جیسا کہ "الاتقان" میں ہے: وقال أشہب: سئل مالک: ہل یکتب المصحف علی ما أحدثہ الناس من الہجاء؟ فقال: لا إلا علی الکتبۃ الاولی۔ رواہ الدانی فی المقنع ثم قال: ولا مخالف لہ من علماء الامۃ ... وقال البیہقی فی شعب الإیمان: من یکتب مصحفا فینبغی أن یحافظ علی الہجاء الذی کتبوا بہ تلک المصاحف ولا یخالفہم فیہ ولا یغیر مما کتبوہ شیئا.

---

[1] جامعہ دار الاحسان بارڈولی، سورت، گجرات۔

فانہم کانوا أکثر علماء و أصدق قلبا و لسانا و أعظم أمانة منا. فلا ینبغی أن نظن بأنفسنا استدراکا علیہم۔۔۔'' (الاتقان النوع السادس والسبعون فی مرسوم الخط وآداب کتابتہ ۲/ ۲۲۸۳۲۹)۔

ج- قرآن کریم کا رسم الخط توقیفی ہے:

د- اس کے رسم الخط میں بھی اعجاز ہے، لہٰذا غیر عربی میں اس کی کتابت اس کے وصف اعجاز کو ختم کرنے کے مرادف ہوگا۔

ھ- اوپر عربی زبان کے خواص عنوان کے ماتحت ذکر کردہ امور کے پیش نظر قرآن کریم کی تلاوت کرنا صحیح طریقے پر غیر عربی رسم الخط میں بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔

و- قرآن کریم کے مخصوص رسم الخط کا اثر تلاوت قرآن پر بھی واقع ہوتا ہے، مثلاً تاء مطولہ مجرورہ پر تاء کے ساتھ اور تاء مدورہ پر ہاء کے ساتھ وقف کرنا اسی طرح موصول اور مفصول کلمہ پر وقف کے قاعدے کی رعایت کرنا ضروری ہے، جیسے "فیما فعلن" میں "فیما" سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۳۴ میں موصولاً لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے "فی" پر وقف ناجائز ہے، جبکہ یہی لفظ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۴۰ میں "فی ما" "مفصولاً" لکھا گیا ہے تو وہاں "فی" پر وقف کرنا جائز ہے۔

آخر الذکر دو وجہ کے اعتبار سے بھی غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنے کا عدم جواز ہی معلوم ہوتا ہے۔

ز- حرف ضاد جو عربی زبان ہی کے ساتھ خاص ہے غیر عربی رسم الخط میں اس کو لکھنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

قرآن کریم عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے تواتر اور اجماع سے ثابت ہے اعجازی ہے اس میں قراءت سبعہ وغیرہ شامل ہے اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کا اتباع واجب ہے اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے اس لئے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے اندھے کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے (ماخوذ فتاوی رحیمیہ)۔

اس سوال کا جواب بندہ نے بعینہ مفتی احمد صاحب خانپوری صاحب کے فتاوی سے نقل کیا ہے (دیکھئے: محمود الفتاوی ۴/ ۱۵۴، باب ما یتعلق بالقرآن من کتاب العلم)۔

موبائل پر قرآن مجید:

اس کے ذیل میں چند مسائل ہیں:

۱- جس وقت موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو، اس وقت اسکرین کو بلا وضو ہاتھ لگانا بالکل ممنوع ہوگا، جیسا کہ کسی ورق پر قرآن لکھا ہوا ہو۔
(مسائل موبائل، مفتی سلمان صاحب: ص ۳۳)۔

۲- ٹچ اسکرین موبائل کو تلاوت وغیرہ کے وقت ورق پلٹانے کے لئے بلا وضو چھونا بھی جائز نہیں ہوگا۔

۳- اگر ورق پلٹانا کی پیڈ (key pad) کے نمبر کے ذریعہ ہو تو اس کے متعلق یہ متعین کرنا ہوگا کہ اس کو اسکرین سے متصلا شمار کیا جاوے یا منفصلا (حکم کے اعتبار سے) جیسے عام قرآن میں ورق پلٹانے کے لئے قلم یا لکڑی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے دونوں میں سے جو شق بھی متعین ہو جائے تو اس کے ذریعہ حکم تک رسائی بآسانی ممکن ہوگی۔

۴- اگر موبائل پر الگ سے کور لگا ہوا ہو تو یہ اس غلاف کی طرح ہوگا جس میں خود قرآن کریم کو احترام اور حفاظت کے خاطر رکھا جاتا ہے۔

''ویحرم بہ أی بالأکبر وبالأصغر مس مصحف أی ما فیہ آیة کدرھم وجدار۔۔۔إلا بغلاف متجاف غیر مشرز أو بصرة بہ یفتی'' (ھذا فی الدر) ''(شامی زکریا ۱/ ۳۱۵)۔ ☆☆☆

عربی متن کے بغیر کسی زبان میں ترجمہ شائع کرنا

مفتی جنید بن محمد پالنپوری[1]

۱- عربی متن کے بغیر محض کسی اور زبان میں ترجمہ شائع کرنا جائز نہیں، ''اتقان'' میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے،

''قال العلامة الشامي: فی الفتح عن الکافی: إن اعتاد القرآن بالفارسیة أو أراد أن یکتب مصحفا بها یمنع'' (مستفاد از فتاوی محمودیه ۲/ ۵۱۰، کفایت المفتی ۲/ ۱۳۲)۔

حضرت تھانویؒ نے اس پر مفصل فتوی تحریر فرمایا ہے، نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے ''من تشبه بقوم فهو منهم'' (ابوداؤد کتاب اللباس حدیث نمبر: ۵۵۹) میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے۔

دوسری حدیث ''لتر کبن سنن من کان قبلکم'' (ترمذی ابواب الفتن ۲/ ۱۴۱) میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے امر میں جو عرفا وعادتا ان کے خصائص میں سے ہے، سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی الأمر الدنیاوی سے تشبہ فی الأمر الدینی اشد ہے، حضرت عبداللہ بن السلامؓ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت "یأیها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطان" (سورۃ البقرہ: ۲۰۸) نازل ہونا اور رسول اللہ ﷺ کا تبتل اور ترہیب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے۔

یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ اس میں اور مفاسد مالکیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں، مثلاً خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہوجانے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض اور اس کا اخلال حرام ہے اور ترجمہ وتفسیر کا اصل سے مجرد نہ ہونا مقدمہ اور سبب ہے حفاظت کا، اور اصل سے مجرد ہونا مقدمہ اور سبب ہے اخلال کا اور فرض کا مقدمہ فرض اور حرام کا مقدمہ حرام ہے۔

یہ مفسدہ بھی ہوسکتا ہے کہ حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلاوضو مس کرنا جائز نہ ہوگا (ہندیہ ۱/ ۲۴) اور یقینی بات ہے کہ عامۃ الناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کا مس کے لئے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک غیر مشروع کا اور سبب غیر مشروع کا غیر مشروع ہے۔

یہ مفسدہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہوجانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا بھی استعمال کریں گے تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آئے گا اور محذور کا سبب لامحالہ محذور ومحظور ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ابھی تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر تو قرآن سے بالکل لاتعلق ہوجائیں گے اور بے ساختہ یہ آیت ان پر صادق آنے لگے گی۔

"نبذ فریق من الذین أوتوا الکتاب کتاب الله وراء ظهورهم کأنهم لایعلمون" (سورۂ بقرہ: ۱۰۱)۔

اسی طرح ترجمہ کو کوئی مستقل کتاب نہیں سمجھتا، قرآن کا تابع سمجھتے ہیں، اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت وبلاغت سے

---

[1] دار الافتاء والارشاد مدرسہ انوار محمدی، ملاڈ، ممبئی۔

گراہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے، نیز کسی مترجم کو ہمت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہوسکتی، کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا اور اگر صرف ترجمہ ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے، کسی کا تابع نہ سمجھیں گے اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی، خصوص مترجمین ہی کا مطبوع مستقل ہوجانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی، اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا، کیونکہ ہر دیکھنے والا حافظ نہیں اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی۔

"کما قال تعالیٰ: اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله" (سورۂ توبہ: ۳۱، مستفاد از امداد الفتاویٰ ۴/ ۴۲)۔

صرف مصارف کم آنے کی بنیاد پر محض ترجمہ کی اشاعت کو جائز کہنا یا جواز تلاش کرنا عقل سے بہت دور، بلکہ مہمل دلیل معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات عربی متن کے ساتھ غیر مسلموں کو دینے میں بے حرمتی کا اندیشہ یہ صرف اندیشہ ہے۔

آج کے دور میں پڑھا لکھا طبقہ اور خاص کردہ حضرات جو دیگر مذاہب کی کتب کا مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں وہ احترام اور ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں، نیز اس کے آداب شروع صفحہ پر ارقام کردیئے جائیں۔

لہذا اس کی اشاعت خرید وفروخت اور بہ طور ہدیہ تقسیم کرنا ناجائز ہوگا، البتہ اگر کسی نے صرف ترجمہ شائع کردیا تو اسے بھی بلا وضو چھونا درست نہ ہوگا،

"ولوكان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وعندهما على الصحيح، هكذا في الخلاصة" (ہندیہ ۱/ ۳۹، امداد الفتاویٰ ۴/ ۴۲، فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۱۹)۔

۲- قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگرچہ وہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علماء امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا، پھر غیر عربی ہندی وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، اس میں تو جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، لہذا صورت مسئولہ بالا جماع ناجائز ہے، بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے ظ، ح، ض، ط وغیرہ، یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے، ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے نہ شکل و صورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے جو کہ ہندی میں مستعمل ہیں اور یہ عمداً تحریف وتغییر ہے جو کہ حرام ہے۔

"وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الاولى- رواه الداني في المقنع ثم قال: ولا مخالف له من علماء الامة- ....وقال البيهقي في شعب الايمان: من يكتب مصحفا، فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا- فإنهم كانوا أكثر علماء و أصدق قلبا و لسانا و أعظم امانة منا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم..." (الاتقان النوع السادس والسبعون في مرسوم الخط وآداب كتابته ۲/ ۳۲۸۳۲۹)۔

حضرت عبد الرحیم صاحب لاجپوری فرماتے ہیں:

قرآن شریف گجراتی حروف میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے۔ مثلاً: "بسم الله" کو گجراتی حروف میں لکھا جائے تو لفظ "الله" اور لفظ "رحمٰن" اور لفظ "رحیم" کی ابتداء کے دو حروف (الف لام) تحریر میں نہیں آئیں گے، "بسم للہ رحمٰن رحیم" لکھا جائیگا اس طرح لکھنے میں صرف "بسم الله" میں چھ حروف کی کمی آجاتی ہے۔

تو غور فرمایئے! پورا قرآن شریف گجراتی میں لکھا جائے تو کتنے حروف کم ہوجائیں گے، حالانکہ معانی کی طرح حروف بھی قرآن ہونے میں شامل ہیں۔ دوسری جانب صورت یہ ہے کہ بعض آیتوں میں حروف زائد ہوجائیں گے مثلاً: "الم" میں قرآنی رسم الخط کے بموجب صرف تین حروف ہیں، لیکن گجراتی میں لکھا جائے تو نو حروف ہوجائیں گے۔ اب حساب لگایئے پورے قرآن شریف میں کتنی کمی بیشی ہوجائیگی اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قرآت سبع وغیرہ شامل ہیں۔ اور ساری قرآتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی گجراتی رسم الخط میں

نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے (فتاوی رحیمیہ ۳/۱۶ملخصا)۔

یہی کمی بیشی ہندی اور انگریزی و دیگر زبانوں میں ہوگی لہٰذا مصحف عثمانی کے رسم خط کے علاوہ ہندی و انگریزی و دیگر زبانوں میں لکھنا ناجائز ہوگا، چاہے مصحف عثمانی کے رسم خط کے ساتھ ہو۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید تحریر کرنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے چھوٹ جاتا ہے اور تحریف رسمی لازم آتی ہے جس سے احتراز ضروری ہے (تفصیل جواب نمبر ۲ میں گذری)۔

لہٰذا بریل کوڈ میں قرآن مجید لکھنا درست نہ ہوگا، نابیناؤں کے لئے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہوا تنا سیکھ لینا چاہئے (مستفاد از محمود الفتاوی ۴/ ۱۵۴)۔

۴- ''(قوله:كتب الطلاق) قال في الهندية: الكتابة على نوعين: فرسومة وغير مرسومة، ومعنى بالمرسومة أن يكون مصدرا ومعنونا مثل ما يكتب إلى الغائب وغير المرسومة أن لايكون مصدرا ومعنونا وهو على وجهين: مستبينة وغير مستبينة، فالمستبينة ما يكتب على الصحيفة و الحائط والأرض على وجه يمكن فهمه وقرآته وغير مستبينة ما يكتب على الهواء والماء وشئ لا يمكنه فهمه وقرأته'' (شامی)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ موبائل کی اسکرین پر جو آیتیں لکھی ہوئی ہیں ان کا حکم قرآن کے حکم میں ہے، لہٰذا جس وقت قرآن اسکرین پر کھلا ہوا ہوگا، بلا وضو چھونا یا ہاتھ میں لینا درست نہ ہوگا،

''وفي الشامية تحت قوله: (للقول) يعني أنه قيل: بأن الطهارة واجبة لمس المصحف لا فرض إلى قولي؛ لأن قوله تعالى: لايمسه إلا المطهرون'' (۱/ ۸۹)۔

البتہ اگر موبائل کے اوپر کوئی کور چڑھا ہوا ہے جو موبائل کی حفاظت کی خاطر لگایا جاتا ہے کہ جب چاہیں موبائل سے جدا کردیں تو اس صورت میں وہ جزدان کے حکم میں ہوگا کہ اسکرین پر قرآن کھلا ہونے کی حالت میں بھی بلا وضو موبائل کو اٹھانا درست ہوگا۔



متن کے بغیر شائع شدہ ترجمہ قرآن کی خرید وفروخت اور ہدیہ

مولانا مشبر مصطفی امروہوی قاسمی [1]

۱- متن کے بغیر قرآن کریم کے محض ترجمہ کو شائع کرنے میں بہت سی خرابیوں کے یقینی اندیشے اور دینی نقصانات ہیں، جن میں ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ آئندہ اس کا رواج بڑھ جانے کی وجہ سے لوگ ترجمہ ہی پر اکتفا کرنے لگیں گے اور عربی متن کی طرف التفات کم اور رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوجائے گا یہاں تک کہ لوگ عربی متن رکھنا بھی چھوڑ دیں گے اگر کسی کے پاس ہوگا بھی تو وہ اس کو دیکھنے کی زحمت بھی نہ کرے گا، نتیجتاً صحیح اور غلط کا امتیاز تک نہ ہوسکے گا اور باطل کو اپنے ناپاک خیالات ترجمہ کے راستہ قرآن میں داخل کرنے کا موقع ملے گا جو معانی قرآن اور پیغام خداوندی کے لئے بڑے خطرے کی چیز ہوگی۔

غالباً ان ہی جیسے خطرات کے سدباب کے لئے اس کے عدم جواز پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے، جس کو علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب "الإتقان فی علوم القرآن" میں نقل فرمایا ہے۔

پس متن کے بغیر تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت درست نہ ہوگا۔

"فی الفتح عن الکافي: إن اعتاد القرآن بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن و تفسير كل حرف وترجمته جاز" (ردالمحتار ۲/ ۱۸۷، فتح القدیر ۱/ ۲۸۶)۔

رہیں جواز کی تائید میں پیش کی جانے والی وجوہات تو وہ کوئی وجہیں نہیں ہیں، اول تو اس لئے کہ محض مصرف کی تھوڑی سی بچت کی خاطر دین کے اتنے بڑے نقصان کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، جبکہ فقہ کا قاعدہ ہے "الضرر یزال" (قواعد الفقہ)۔

دوسری وجہ بھی درست نہیں، کیونکہ متن والا ترجمہ دینے سے اگر چہ کچھ فائدہ نہیں، لیکن صرف ترجمہ دینے میں قرآنی الفاظ اور اس کے صحیح معانی کو شدید نقصان پہنچنے کے قوی امکان ہیں، نیز جس طرح غیر مسلموں سے متن قرآن کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے تو اس اندیشہ سے محض ترجمہ قرآن بھی محفوظ نہیں، جبکہ ترجمہ بھی من وجہ قرآن ہی کا حکم رکھتا ہے۔

۲- تنہا ترجمہ کی خرید و تقسیم اور ہدیہ کا حکم:

ان امور کے ذریعہ چونکہ تنہا ترجمہ قرآن کی تائید اور اس کے تعاون و اشاعت میں حصہ داری لازم آتی ہے، لہٰذا یہ امور بھی حکم خداوندی "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) کی وجہ سے جائز نہ ہوں گے۔

۳- غیر عربی رسم الخط میں کتابت قرآن:

قرآن کریم کا رسم الخط توفیقی طور پر متعین نیز اللہ اور اس کے رسول کی منشاء کے عین مطابق ہے، لہٰذا عربی زبان میں رہتے ہوئے بھی اس کے رسم الخط میں تغیر و تبدیلی جائز نہیں، کیونکہ اس سے قرآن کے اس متواتر اور مجمع علیہ رسم الخط سے احتراز ہوگا جو اعجازی طور پر قرأت سبعہ کو جامع ہے۔

تو غیر عربی زبان میں لکھنا تو بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا، کیونکہ دوسری زبان میں قرآن کریم کو لکھنے سے نہ تو الفاظ قرآن کو مکمل طور سے لکھا جاسکتا

---

[1] خادم التفسیر والفقہ جامعہ عربیہ فیض سبحانیہ فیروز پور نمک میوات، ہریانہ۔

ہے، کیونکہ قرآن میں بہت سے حروف ایسے ہیں جو لکھے تو جاتے ہیں، لیکن پڑھے نہیں جاتے، غیر عربی میں لکھنے کی صورت میں ان کو باقی رکھنے کی کوئی صورت نہیں، جبکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم کی ہر طرح سے حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اور نہ ہی دوسری زبان میں لکھے گئے قرآن کو پڑھنے میں الفاظ قرآن کی ادائیگی ہی ہوسکتی ہے، کیونکہ قرآن عظیم کے بہت سے حروف مثلاً ح، ط، ظ، ص، ض، ع، غ ایسے ہیں کہ کسی دوسری زبان میں ان کا بدل اور مثل ہزار کوششوں کے باوجود نہیں ہوسکتا، حالانکہ قرآن جس طرح معانی کا نام ہے اس سے پہلے وہ الفاظ کا نام ہے۔

لہذا قرآن کریم کو رسم عثمانی ہی میں لکھنا واجب اور ضروری ہے اس کی عبارت کو کسی بھی غیر عربی رسم الخط میں لکھنا بالاجماع ناجائز ہے، رہا یہ عذر کہ لوگ عربی میں پڑھ نہیں سکتے تو یہ عذر فضول اور غیر معتبر ہے (مستفاد فتاوی رحیمیہ ۳/۱۶-۱۹، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/ ۲۷۳)۔

''ذهب جمهور العلماء إلى أن رسم المصحف الذى كتب فى زمن عثمان على يدى كاتب الوحى'' زيد بن ثابت'' توفيقي لاتجوز مخالفته في كتابة المصحف وطبعها'' (أصول التفسير وقواعده)۔

''قرأة القرآن بالألحان معصية، والتالي والسامع آثمان'' (بزازیہ ۳/ ۳۴۹)۔

۴-عربی کے ساتھ دوسرے رسم الخط میں اشاعت قرآن:

جو خرابیاں اور نقصانات تنہا غیر عربی رسم الخط میں پائے جارہے ہیں وہ سب اعذار اس صورت میں بھی پائے جائیں گے، عثمانی رسم الخط کو ساتھ میں لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ غیر عربی پڑھنے والا تو اپنی زبان والے قرآن ہی کو پڑھے گا اور مذکورہ تمام غلطیوں کا مرتکب ہوگا، وہ عربی تو جانتا ہی نہیں ہے تو اسے عربی رسم الخط سے کیا مطلب اور کیا فائدہ، لہذا یہ صورت بھی حد جواز میں داخل نہیں ہوسکتی، ''رب تال للقرآن والقرآن بلعنه'' (العقد الفرید بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۹)۔

۵-بریل کوڈ میں طباعت قرآن:

بریل کوڈ کے ذریعہ نابینا افراد کے لئے تعلیم قرآن اور قرأت قرآن کے سلسلہ میں مہیا ہونے والی سہولتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ امر بھی واجبی طور پر قابل اعتناء ہے کہ قرآن کا عربی رسم الخط اپنی اصل حالت میں باقی رہے، لہذا اگر بریل کوڈ کا رسم الخط رسم عثمانی کے علاوہ ایسا ہے جس سے قرآن کریم کے توقیفی اور متواتر رسم الخط کی مخالفت لازم آتی ہے تو بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنے کی یہ صورت درست نہ ہوگی، کیونکہ قرآن کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی کی حفاظت واجب اور ضروری ہے، اس کی مخالفت جائز نہیں۔

''ذهب جمهور العلماء إلى أن رسم المصحف الذي كتب في زمن عثمان على يدي كاتب الوحي'' زيد بن ثابت'' توفيقي لاتجوز مخالفته في كتابة المصحف وطبعها'' (اصول التفسير وقواعده)۔

لیکن اگر بریل کوڈ عربی رسم الخط ہی کے ابھرے ہوئے الفاظ ہیں تو اس میں مضائقہ نہیں، کیونکہ اس صورت میں قرآن اپنی اپنی اصل (رسم عثمانی) پر باقی ہے۔

۶-بریل کوڈ میں لکھے گئے قرآن کا حکم:

بریل کوڈ میں لکھے گئے الفاظ وحروف اگر عربی رسم الخط میں ہیں یا کسی دوسری زبان کے بھی حروف ہیں تو اس کا حکم قرآن ہی کی طرح ہوگا، اگرچہ دوسری زبان میں لکھنا جائز نہیں، حکم خداوندی ہے: ''لا يمسه إلا المطهرون'' (سورۂ واقعہ: ۷۹)، حضرت مفتی عبد الرحیم لاجپوریؒ فرماتے ہیں: ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے، لہذا بلا وضو نہ چھوئے (فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۹)۔

اور اگر بریل کوڈ کسی زبان کے حروف نہیں ہیں، بلکہ نقطوں وغیرہ کی شکلوں میں محض اشاریات ہیں تو ان کا لکھنا ہی جائز نہیں اگر لکھ دیا جائے تو اس پر قرآن کے احکام بھی نافذ نہیں ہوں گے۔

۷-موبائل میں محفوظ متن قرآن کو چھونے کا حکم:

اس طرح کے موبائل کو ہاتھ میں لینا تو بہر صورت جائز ہے، کیونکہ موبائل کا ڈھانچہ اس کے لئے غلاف غیر مشرز کے حکم میں ہے۔

"إلا بغلاف غير مشرز أو بصرة، به يفتي" (الدر المختار مع الرد المحتار ا/ ۲۸۲)۔

رہا مسئلہ اسکرین پر قرآن موجود ہوتے ہوئے اسکرین پر ہاتھ لگانے کا تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر موبائل اسکرین ٹچ ہے تو اس کو بلا وضو چھونا جائز نہیں، کیونکہ اس طرح کے موبائل میں اسکرین کا شیشہ چونکہ نیچے سے متصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسکرین کا شیشہ اس جلد مشرز اور چولی کے حکم میں ہوگا جس کو قرآن کریم سے استقلالی اتصال حاصل ہوتا ہے۔

"وكذا لمحدث لايمس المصحف إلا بغلافه: لقوله عليه السلام: لا يمس القرآن إلا طاهر... وغلافه متجافيا عنه دون ما هو متصل به كالجلد المشرز هو الصحيح" (ہدایہ ا/ ۶۳)۔

اور اگر موبائل اسکرین ٹچ نہیں ہے تو اس پر بلا وضو ہاتھ لگانا جائز ہوگا، کیونکہ اسے موبائل میں اسکرین نیچے سے منفصل اور جدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے اسکرین کا شیشہ اس غلاف متجاف کے حکم میں ہوگا جس کو بلا وضو چھونا جائز ہے۔

"ومنها حرمة مس المصحف: لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به هو الصحيح، هكذا في الهداية، وعليه الفتوى، كذا في الجوهرة النيرة" (ہندیہ ا/ ۳۸، البحر الرائق ا/ ۳۴۹، رد المحتار ا/ ۴۸۸)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ متن قرآن سے الگ کر کے تنہا چھاپنا اور اس کو شائع کرنا درست نہیں اسی وجہ سے اس طرح مطبوعہ ترجمہ کی خرید وفروخت اور اس کی تقسیم اور ہدیہ وغیرہ بھی جائز نہ ہوگا، قرآن کریم کو موجودہ متواتر عربی رسم الخط کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا بھی جائز نہیں چاہے عربی رسم الخط اس کے ساتھ شائع کیا جائے یا نہ کیا جائے دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے، بریل کوڈ میں اشاعت قرآن کے سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ عربی رسم الخط ہی کے ابھرے ہوئے الفاظ ہیں تو یہ جائز ہے اور اس پر قرآن کے احکامات بھی جاری ہوں گے، اور اگر یہ کوڈ عربی رسم الخط کے مخالف ہیں تو نہ ہی اس طرح قرآن تیار کرنا درست ہے اور نہ ہی اس پر احکامات قرآن لاگو ہوں گے، رہا آخری مسئلہ یعنی موبائل کی اسکرین پر موجود قرآن کریم کو چھونے کا تو اگر موبائل اسکرین ٹچ ہے تو اس کو بلا وضو چھونا جائز نہیں اور اگر موبائل اسکرین ٹچ نہیں ہے تو اس کو بلا وضو چھونے کی اجازت ہے۔

☆☆☆

قرآن مجید کی کتابت واشاعت - شرعی نقطہ نظر سے

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی[1]

۱- بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

قرآن کے متن کے بغیر صرف ترجمہ لکھنا، لکھوانا، شائع کرنا، تقسیم کرنا، باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع اور ناجائز ہے، اور اس کا شائع کرنے والا گنہگار ہے، نیز خرید وفروخت کرنے والا بھی، نیز ہدیہ دینے والا بھی، بوجہ اعانت علی المعصیت کے گنہگار ہوگا، ہاں! قرآن کریم کی آیت لکھتے ہوئے اس کے ساتھ ترجمہ لکھنے کی اجازت ہوگی، اسی طرح قرآن کریم کی ایک یا دو آیت کا ترجمہ لکھنا معصیت میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ قرآن کریم کا معتد بہ حصہ اس طرح متن کے بغیر لکھنا اور شائع کرنا حرام اور ناجائز ہوگا۔

اور اگر باوجود حرام اور معصیت کے کسی فرد یا ادارے نے اس طرح ترجمہ شائع کردیا تو بھی بلا وضو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوگی، اس کا یہ فعل اس کو قرآن سے خارج نہیں کرے گا، وضو ضروری ہوگا اور ترجمہ قرآن کو بعینہ قرآن کے حکم میں رکھا جائے گا۔

''محیط برہانی'' میں ہے: ''وإن اعتاد القراءة بالفارسية، فأراد أن يكتب المصحف بالفارسية منع من ذلك على أشد المنع، وإن فعل ذلك في آية أيتين لايمنع من ذلك، ذكره الشيخ الإمام شمس الأئمة السرخسي رحمة الله عليه في شرح الجامع الصغير، فإن كتب القرآن، وتفسير كل حرف و ترجمته تحته جاز'' (۲/ ۵۲)۔

علامہ ابن ہمامؒ نے بھی بعینہ اس مذکورہ عبارت کو اپنی کتاب ''فتح القدیر ۱/ ۲۹۱'' میں نقل فرمایا ہے:

حضرت مفتی شفیعؒ نے اپنی کتاب ''جواہر الفقہ'' میں عالمگیری کے حوالہ سے ایک عبارت نقل فرمائی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ قرآن کو بھی بلاوضو مس کی اجازت نہیں ہوگی، عبارت ملاحظہ ہو: ''ولو كان القرآن مكتوبًا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح، هكذا في الخلاصة۔ وفيه أيضًا: إذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا أخبر السامع أنه قرأ آية السجدة۔ وهذه الجزئية الثانية تؤيد الأولى حيث وجب سجدة التلاوة بقراءة القرآن بالفارسية فعلم منه أن الترجمة بالفارسية لاتخرج القرآن عن كونه قرآنا حكما، فلا يجوز مسه للمحدث'' (جواہر الفقہ ۱/ ۱۱۳)۔

''فتاویٰ محمودیہ'' میں ہے: محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں، اصل عربی کے ساتھ ترجمہ بھی ہو تو درست ہے (۳/ ۵۰۹)۔

۲- غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی بھی زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھا جائے اور دونوں کو ساتھ ساتھ شائع کیا جائے یا صرف غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کی جائے، دونوں صورتیں ناجائز اور نادرست ہیں۔

جمہور صحابہ اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب اور لازم ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن کے حکم میں ہے، غیر عربی عبارت میں اس کا لکھنا ممنوع ہے، اور اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع اور ناجائز ہے، نیز رسم

[1] ہیلنگٹن ہاؤس، نیسٹر کمپاؤنڈ، بلڈنگ نمبر ۷، سانتا کروز، ممبئی۔

عثمانی خط کے علاوہ کسی دوسرے رسم خط میں اگر چہ وہ بھی عربی کیوں نہ ہو قرآن کریم کی کتابت جائز نہیں۔

حضرت مفتی شفیعؒ نے مصر کے شیخ القراء محمد بن علی حداد کی کتاب "خلاصۃ النصوص الجلیۃ" کے حوالہ سے یہ نقل فرمایا ہے کہ رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع پر بارہ ہزار صحابہ کرامؓ اجمعین کا اجماع ہے۔

شیخ القراء تحریر فرماتے ہیں: "أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصحف عثمان ومنع مخالف (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر: ووجه وجوبه ماتقدم من إجماع الصحابة عليهم وهم زهاء اثني عشر الفا والإجماع حجة" (بحوالہ جواہر الفقہ ا/۸۵)۔

نیز علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان" میں ائمہ اربعہ کا رسم خط مصحف عثمانی کی متابعت پر اجماع نقل فرمایا ہے، علامہ کی عبارت اس بارے میں ملاحظہ فرمائی جائے:

"وقال اشهب: سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا. إلّا على الكتبة الأولى رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة"۔

اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر پر لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالکؒ کا اس بارے میں مخالف نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے: "وقال أحمد: ويحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك"۔

اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے واو، یاء اور الف (زائدہ) میں جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے میں آتے ہیں۔

پھر لکھا ہے: "وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئا، فإنهم كانوا أكثر علما وأصدق قلبا ولسانا وأعظم امانة منا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكا عليهم"۔

(امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہؓ نے لکھے ہیں ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں) (مستفاد جواہر الفقہ ا/۸۰)۔

حضرت فقیہ الامت رسم عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم خط میں قرآن کریم کی کتابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ الفاظ قرآن کو عربی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے، ہندی یا کسی اور رسم الخط میں لکھنے کی اجازت نہیں، "اتقان" میں اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے، ہندی رسم الخط میں لکھنے سے عبارت غلط ہو جائے گی، ح، ذ، ز، ص، ظ میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہو جائے گی، اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلا، اطباق، استطالت سب کچھ ضائع کر دیں گے (فتاوی محمودیہ ۳/۵۱۰)۔

اور یہ ایک شبہ جو پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں عجمیوں کے لئے قرآن پڑھنے میں بہت زیادہ سہولت ہے اس بنا پر غیر عربی رسم الخط میں لکھنے اور چھاپنے کی اجازت ہونی چاہئے، تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ قرآن کریم سے فائدہ اٹھا سکیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے امام ابن قدامہ کی مشہور اور محقق کتاب "المغنی" کے حوالہ سے بہت بہتر اور عمدہ جواب تحریر فرمایا ہے: کہ جب سے قرآن کریم دنیا میں آیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک واقعہ بھی مذکور نہیں کہ حضور ﷺ نے عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کر کے بھیجا ہو یا عجمی رسم خط میں لکھوایا ہو، تو حضور ﷺ کے مکاتیب جو ملوک عجم کسری وقیصر ومقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے گئے جن میں سے بعض کے فوٹو بھی چھپ گئے ہیں اور آج تک محفوظ ہیں ان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ ان میں عجمی زبان اختیار کی گئی ہے، نہ عجمی رسم خط اختیار کیا گیا ہے (جواہر الفقہ ا/۸۴)۔

۳-موبائل پر قرآن مجید:

اگر موبائل میں قرآن کریم محفوظ ہے، لیکن اسکرین پر اس کے حروف نہیں دکھائی دے رہے ہیں تو اس موبائل کو بلا وضو ہاتھ لگانے اور پکڑنے میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن اگر موبائل میں محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حروف اسکرین پر بھی دکھائی دے رہے ہیں تو اس اسکرین کو بلا وضو ہاتھ لگانا جائز نہ ہوگا، البتہ اس وقت بھی اس موبائل کو پکڑنے اور ہاتھ لگانے کی اجازت ہوگی، عالمگیری کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ولایجوز مس شئ مکتوب فیه شئ من القرآن من لوح أو درهم أو غیره إلا إذا کان آیة تامة هکذا فی الجوهرة النیرة'' (۱/ ۳۹)۔

فتاوی شامی میں ہے:

''ومسه القرآن ولو فی لوح أو درهم أو حائط لکن لا یمنع إلا من مس المکتوب... کما فی البحر آی والصحیح المنع'' (۱/ ۳۲۳)۔

۴-بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا اعلان ہے: "ولقد یسرنا القرآن للذکر"، اور یہ خود قرآن کریم کا ایک زبردست معجزہ ہے کہ جہاں بینا لوگ باسانی اس کی تلاوت کرلیتے ہیں اور قرآن کریم کو اپنے سینے میں محفوظ کرلیتے ہیں وہیں نابیناؤں کی ایک بڑی تعداد بھی اس کی تلاوت کرنے اور اپنے سینے میں محفوظ کرنے سے محروم نہیں رکھی گئی اور تھوڑی سی کاوش سے اس عظیم شرف کو حاصل کرلیتے ہیں۔

ابتداء میں نابیناؤں کے لئے قرآن کریم کے سیکھنے اور محفوظ کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ جس طرح استاذ سے سنتے بعینہ نابینا طلبائے کرام اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتے، رفتہ رفتہ استاذ عالی سے سننے کی برکت سے ان کے سینے میں قرآن کریم محفوظ ہوجاتا اور وہ باسانی اس کی تلاوت کرنے لگتے، تاریخ کے اوراق میں حضرت امام شاطبی کی مثال محفوظ ہے، آپ نابینا تھے، لیکن اللہ پاک نے تجوید وقراءت کے میدان میں بیناؤں کے استاذ کے شرف سے نوازدیا، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کردیں۔

لیکن تقریباً ایک دوصدی سے ایک ایسا کوڈ "چھ نقطوں پر مبنی" ایجاد کیا گیا جس نے نابینا شخص کو قرآن کریم کے پڑھنے کے لئے خود کفیل بنادیا، ''کوڈ'' کی تفصیل مختصر تحریر میں ملاحظہ ہو۔

بریل کوڈ کیا ہے؟

بریل ایک قسم کا ذریعہ ابلاغ ہے جو کاغذ پر ابھارے گئے نقطوں پر مبنی ہے جن کے ذریعہ ایک نابینا آدمی اپنی قوت لمس کا استعمال کرتے ہوئے پڑھنے کے قابل بن سکتا ہے، بریل کوڈ چھ نقطوں پر مبنی ہوتا ہے یہ ان کے لئے تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، ان چھ نقطوں کے مختلف نمونے، نشانات اور شکلوں کی تبدیلی سے بنتے ہیں اور وہ مختلف حروف، الفاظ، حروف علت حرکات اور علامتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان چھ نقطوں سے ۶۳ مختلف شکلیں بنائی جاسکتی ہیں۔

اور ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی متفق علیہ ہے کہ جو شخص بھی قرآن کریم کو تحریر کرنا چاہتا ہو اس کے لئے عثمانی رسم الخط کی اتباع واجب ہے، صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہے اور ائمہ اربعہ کے نزدیک مسلم ہے، اس کے باوجود بریل کوڈ میں قرآن کریم کی اشاعت کی اجازت ہے یا نہیں تو اس بارے میں ہم مختصر تفصیل پیش کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ بریل کوڈ میں قرآن کریم کو پیش کرنے میں ''رسم عثمانی'' کی مخالفت لازم نہیں آتی ہے اور اس میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ بریل کوئی رسم الخط نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن پاک کو بریل میں منتقل کرنا مستحسن اور پسندیدہ ہے باعث اجر وثواب اور عثمانی رسم الخط کی مخالفت لازم نہیں آتی (مستفاد از مقالہ بریل کوڈ کی حقیقت شرعی نقطہ نظر سے، مصنف شیخ عبدالقادر حسن)۔

نیز بریل میں تیارشدہ قرآن کریم کا حکم بھی اصل قرآن کی طرح ہوگا اور اس قرآن کو چھونے کے لئے بھی وضو ضروری ہوگا، اور جو آداب واحکام مصحف عثمانی کے ہوں گے وہی آداب بریل میں نقل کردہ قرآن کریم کے ہوں گے۔

اور جس طرح کوئی شخص فارسی زبان میں قرآن تحریر کرے تو فقہاء کرام کے نزدیک اس قرآن کو بھی ہاتھ لگانے کے لئے وضو کرنا ہے تو اس کے لئے بھی وضو ضروری ہوگا۔

فتاوی عالمگیری کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى، وكذا عندهما على الصحيح، هكذا في الخلاصة'' (۱/ ۳۹)۔

ردالمحتار میں ہے:

''(ومسه) أي مس القرآن، وكذا سائر الكتب السماوية، قال الشيخ اسماعيل: وفي المبتغى: ولا يجوز مس التوراة والإنجيل والزبور وكتب التفسير وبه علم أنه لا يجوز مس القرآن المنسوخ تلاوة وإن لم يسم قرآنا متعبدا بتلاوته'' (۱/ ۲۸۲)۔

''درمختار'' میں ہے:

''ومسه ولو مكتوبا بالفارسية في الأصح'' (۱/ ۲۲۳)۔

حضرت فقیہ الامت اپنے ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر ایک استاد کے پاس چند نابینا طلبا قرآن سیکھ رہے ہیں تو بالغ طلبا کو تو وضو کرنا ضروری ہوگا البتہ چھوٹے نابالغ کو بلا وضو قرآن کریم چھونے کی گنجائش ہے، البتہ انہیں بھی اگر وضو کرنے کا عادی بنادیا جائے تو زیادہ بہتر اور مناسب ہے (مستفاد از فتاوی محمودیہ ۳/ ۵۲۲)۔

''قال في الدر:

ولا بأس بدفعه إليه وطلبه منه للضرورة اذا الحفظ في الصغر كالنقش في الحجر'' (۱/ ۲۸۲)۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت

مولانا قاضی محمد حسن ندوی [1]

جب قرآن کی اشاعت عربی رسم الخط کے بجائے ہندی، انگریزی اور دوسری عجمی زبانوں میں شروع ہوجائے گی تو ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی خصوصیت باقی نہیں رہے گی، اور عربی زبان میں معجز ہونے کا جو اعجاز ہے وہ بھی باقی نہیں رہے گا، نیز یہ کہ جہاں قرآن کے معانی ومفاہیم کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا نزول کا مقصد ہے وہیں اصل قرآن اور اصل رسم الخط اور نظم قرآن کی حفاظت بھی اہم مقصد میں داخل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کے ایک ایک حرف کی ادائیگی میں فرق ہے، مثلاً عربی زبان میں س، ث، ص، ظ، ض، ز، ت، نیز ھ، ہ، وغیرہ الفاظ میں تلفظ آواز کا جو فرق کیا گیا ہے وہ کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں اظہار ممکن نہیں ہے۔

اسی وجہ سے تیسری مرتبہ عہد عثمانی میں قریش کی زبان میں قرآن پاک جمع کیا گیا، اور حضرت عثمانؓ کے حکم سے حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث اس کام کو بحسن وخوبی انجام دیا (البرہان فی علوم القرآن ۱/ ۲۴۱)۔

امام حاکم رقم طراز ہیں: ''إن جمع القرآن لم يكن مرة واحدة فقد جمع بعضه بحضرة رسول الله ثم جمع بعضه بحضرة أبي بكر والجمع الثالث كان في خلافة امير المومنين عثمان بن عفان'' (المستدرک للحاکم ۲/ ۲۲۹)۔

مفتی شفیع صاحب عہد عثمانی میں جمع قرآن کا جو کام ہوا اس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

باجماع صحابہ لغت قریش پر قرآن کریم کے بہت سے نسخے لکھوائے گئے، اس کے بعد نسخے مختلف ممالک میں بھیج دیئے گئے، اور باجماع امت ان کا اتباع ہر چیز میں لازم وضروری سمجھا گیا (کذا فی روح المعانی بحوالہ جواہر الفقہ ۱/ ۷۶)۔

مولانا تقی عثمانی صاحب جمع قرآن کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ عہد عثمانی میں درج ذیل کام انجام دیئے گئے:

۱- حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔

۲- قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرأتیں سماجائیں۔

۳- قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا تھا وہ صرف ایک تھا، مگر عہد عثمانی میں پانچ یا سات نسخے تیار کئے گئے تھے اور تمام ملکوں میں بھیج دیئے گئے اور ایک مدینہ میں محفوظ رکھا گیا (فتح الباری ۹/ ۱۷، بحوالہ جواہر الفقہ ۱/ ۱۹۰)۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع کے واجب ہونے پر صحابہ کا اجماع ہوچکا ہے۔

''أجمع المسلمون على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته'' (جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۶)

(مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع کے واجب ہونے پر اور اس کے خلاف کے ممنوع ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے)۔

تھوڑی وضاحت کے ساتھ صاحب رسالۃ النصوص الجلیہ رقم طراز ہیں:

''قد انعقد إجماع سائر الامة من الصحابة وغيرهم على تلك الرسوم، وأنه لا يجوز بحال من الأحوال العدول عن كتابة القرآن الكريم ولا نشره بصورة تخالف رسوم المصاحف العثمانيه'' (حوالہ سابق: ص ۲۵ بحوالہ جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۸)۔

[1] استاذ دار العلوم ماٹلی والا بھروچ۔

علامہ زرکشی نے اسی نظریئے کی تائید کی ہے،

''والأقرب المنع کما تحرم قراءته بغیر لسان العرب'' (البرہان ۱/ ۳۸۰)۔

تمام صحابہ اور دوسرے علماء کا اس رسم الخط پر اجماع ہو چکا ہے، اس لئے قرآن شریف کی کتابت میں کسی بھی صورت میں رسم الخط سے عدول جائز نہیں ہے اور کسی ایسی صورت سے جو مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کے خلاف ہو۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے فتاوی میں خوب واضح فرمایا ہے:

الغرض صحابہ وتابعین کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ جس طرح قرآن میں عربی زبان کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح عربی رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس لئے کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن مجید کا لکھنا جائز نہیں اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے۔

''وقال الإمام أحمد: ویحرم مخالفة خط مصحف عثمان'' (اتقان ۲/ ۱۶۷)۔

الغرض مذکورہ بالا بحث اور صحابہ وتابعین کا عربی رسم الخط اور مصاحف عثمانی کے رسم الخط پر اجماع ہونے کی وجہ سے راقم کی بھی یہی رائے ہے کہ غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن شائع کرنا درست نہیں۔

جہاں تک کہ یہ عذر پیش کرنا کہ بہت سے لوگ قرآن پاک کی عبارت کو عربی رسم الخط میں پڑھنے پر قادر نہیں ہیں تو شریعت میں یہ عذر نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے قرآن پاک کے رسم الخط میں ترمیم وتبدیلی کی گنجائش دی جائے۔

عہد صحابہ میں بعض عجمی ممالک کے مسلمان کے لئے قرآن مجید عربی رسم الخط میں پڑھنا بڑا ہی دشوار تھا، لیکن انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی، اب تو اس زمانہ میں تعلیم وتعلم کے شعبہ میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے، حتی کہ نابینا کے لئے قرآن پاک پڑھنا آسان ہوگیا ہے اور ان کے لئے بریل کوڈ میں قرآن تیار کیا جارہا ہے اور نابینا حضرات بھی قرآن پاک پڑھنے اور اس سے استفادہ کرنے پر قادر ہوگئے ہیں تو بینا کے لئے اور زیادہ آسان ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان پر جس طرح ضرورت کے مطابق دینی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح قرآن مجید کو عربی اور مصحف عثمانی رسم الخط میں پڑھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے، اسی وجہ سے حدیث کی کتابوں میں فضائل قرآن کا مستقل ایک باب ہے اس میں بے شمار احادیث ہیں جن میں حفظ قرآن کے ساتھ ناظرہ قرآن عربی رسم الخط میں پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، اور قرآن نہ پڑھنے والوں کو منافقین کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

''ومثل المنافق الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة لیس لها ریح وطعمها مر'' (مشکوۃ شریف ۲/ ۱۸۴)

اور منافق کی مثال حنظلہ پھل کی طرح ہے (جو قرآن نہیں پڑھتا ہے) جس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی اور مزہ کڑوا ہوتا ہے، اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ اصول میں لکھا ہے کہ پوری امت پر عربی زبان کی تعلیم ضروری ہے۔

''إن الله تعالی فرض علی جمیع الأمم تعلیم اللسان العربي لمخاطبهم بالقرآن'' (مغنی مع الشرح الکبیر بحوالہ جواہر الفقہ ۱/ ۱۰۵)۔

یقیناً اللہ تعالی نے قرآن کے مخاطب ہونے کی وجہ سے پوری امت پر عربی زبان کی تعلیم ضروری قرار دیا ہے، شریعت میں کسی کے حق میں عدم علم عذر نہیں ہے، اس کی ایک مثال یہاں پیش کی جارہی ہے۔

جس طرح کسی آزاد لڑکی کا نکاح بلوغ سے پہلے کسی ولی ابعد نے کردیا، بلوغ کے بعد اسے خیار بلوغ کا حق حاصل تھا لیکن وہ بلوغ کے بعد کئی مہینے تک خاموش رہی، اب یہ عذر پیش کرے کہ مجھے مسئلہ معلوم نہیں تھا تو اس کے حق میں یہ عذر قابل قبول نہ ہوگا، جبکہ وہ آزاد ہو، اسی طرح عام مسلمان کے حق میں یہ عذر معتبر نہیں کہ عربی رسم الخط میں قرآن پڑھنا نہیں جانتے۔

اس لئے دوسرے رسم الخط میں قرآن پاک کو شائع کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

البتہ اس کی گنجائش ہوگی کہ عربی رسم الخط میں باقی رکھتے ہوئے دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ میں شائع کیا جائے، جیسے کہ علماء نے اصل متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے ترجمہ قرآن کی اجازت دی ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنے کا حکم:

بلاشبہ اس وقت سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے، بہت سے ایسے امور کا بجالانا آسان ہوگیا جو آج سے سو سال پہلے محال تھا، بریل کوڈ میں قرآن مجید کا تیار کرنا دراصل سائنس اور ٹکنالوجی کی قابل رشک پیش رفت ہے، جس کے ذریعہ نابینا افراد کے لئے بغیر کسی محتاجی کے اس کا پڑھنا اور استفادہ کرنا آسان ہوگیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا درست ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں، دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دینے میں سہولت ہوگی۔

ایک پہلو یہ ہے کہ عہد عثمانی میں لغت قریش میں قرآن مجید جمع کیا گیا، جس پر صحابہ اور تابعین کا اتفاق ہے، اس سے عدول کر کے قرآن مجید تیار کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

''قد انعقد أجماء سائر الامة وغيرهم على تلك الرسوم، وأنه لايجوز بحال من الأحوال العدول عن كتابة القرآن'' (رسالة النصوص الجلية/ ص ۳۵)۔

ظاہر بات ہے یہ قرآن جو بریل کوڈ میں تیار کیا جائے گا رسم عثمانی اور رسم عربی الخط کے خلاف ہوگا اور ایک اجماعی مسئلہ سے عدول کرنا ہوگا اور شرعاً یہ درست نہیں ہے۔

۲- دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس طرح بینا حروف تہجی کو پہچان کر کے قرآن پڑھنے پر قادر ہوتے ہیں اسی طرح نابینا کو بھی برے بڑے نقطے کو ہاتھوں سے محسوس کر کے قرآن مجید پڑھنے پر قدرت ہوگی ہے، اس طریقہ کو ناجائز قرار دینا ان کو قرأت قرآن جیسی نعمت سے محروم کرنا لازم آئے گا، یہ باعث ضرر اور باعث گناہ ہے۔

آپ دونوں صورتوں میں یہ موازنہ کرنا ہوگا کہ کس صورت میں کم ضرر ہے اور کس صورت میں زیادہ، اور فقہاء کے قاعدہ کے مطابق اشد ضرر والی صورت سے بچنے کے لئے اخف ضرر والی صورت اختیار کرنے کی گنجائش ہوگی، صاحب ''شرح المجلہ'' نے لکھا ہے:

''الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف'' (۱/ ۳۲) (کم تر ضرر کا ارتکاب کر کے بڑے ضرر سے بچا جائے)۔

اس لئے نابینا کی ضرورت ومصلحت اور اشد ضرر سے بچنے کے لئے بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا شرعاً درست ہوگا، لیکن اس کے لئے حسب ذیل آداب کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا۔

۱- بریل کوڈ تیار کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں کو دی جائے جو صوم وصلاۃ کے پابند ہوں، امانت دار ہوں، متقی اور پرہیزگار ہوں اور ان کی تعداد کم سے کم تین ہو، نیز وہ قرأت اور تجوید کے فنون سے واقف ہوں، لیکن اگر صورت حال یہ ہے کہ اس کو غیر مسلم تیار کرتے ہیں تو اس کو اصل مصحف قرآن سے موازنہ کی ذمہ داری مذکورہ صفات کے حاملین کو دی جائے۔

حضرت عثمانؓ نے ان چار صحابہ کرام کو عربی رسم الخط اور قریش کی زبان میں قرآن پاک لکھنے کی ذمہ داری دی جو ایک طرف حافظ قرآن تو دوسری طرف لغت قریش اور لہجہ سے بھی واقف تھے، اور معانی ومفاہیم پر گہری نظر تھی (مشکوۃ شریف ۲/ ۱۹۲)۔

۲- جس طرح اعداد سے حروف کی تعیین کرتے ہیں تو وہاں اعداد سے حروف کی تعیین ضروری ہوتا ہے، لہذا اسی طرح شروع میں اس کی وضاحت کردو کہ کس نقطہ سے حروف تہجی میں سے کون حرف مراد ہے، تاکہ اشتباہ نہ ہو، کیونکہ ایک نقطہ سے جو حرف قرآنی مراد ہے تو دوسرا حرف بھی مراد ہوسکتا ہے، اس لئے تعیین ضروری ہے۔

۳- چونکہ عربی رسم الخط اور رسم عثمانی پر اجماع ہے، اس لئے اصل متن قرآن کے ساتھ بریل کوڈ میں قرآن تیار کیا جائے تاکہ مخالفت لازم نہ آئے،

اور اصل قرآن سے بھی تعلق قائم رہے، کیونکہ اصل قرآن کو پڑھنا، دیکھنا باعث ثواب ہے اسی طرح اسے باوضو چھونا بھی عبادت ہے، جب اصل متن میں قرآن ایک طرف ہوگا تو نابینا افراد باوضو عظمت کی نیت سے اسے ہاتھ میں لیں گے۔ اور اس کے اثرات ظاہر ہوں گے، کیونکہ یہ نقطے دوسرے حروف اور جملے کے بھی ہو سکتے ہیں۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کو چھونے کے لئے وضو:

قرآن پاک جو اللہ کا کلام ہے رسول اللہ ﷺ سے متواتر صورت پر منقول ہے، صاحب "نفحات العبیر" نے ارشاد الفحول کے حوالہ سے قرآن کی اس طرح تعریف کی ہے:

"وأما القرآن اصطلاحا فهو كلام الله المنزل على محمد ﷺ، المنقول إلينا نقلا متواترا بلا شبهة وزاد بعضهم المكتوب في المصاحف المحفوظ في القلوب المقروء بألسنة المسموع بالأذان." (نفحات العبیر ا/ ۲۴)

لیکن بریل کوڈ میں قرآن مجید جو تیار کیا جاتا ہے وہ نہ عربی رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی، بلکہ وہ موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نابینا افراد انگلیوں کے پوروں کے لمس سے اسے پڑھتے ہیں، اس لئے اسے اصل قرآن کی حیثیت حاصل نہیں، کیونکہ یہ نقطے اور نقوش کسی دوسرے جملے کے بھی ہو سکتے ہیں، لہذا اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جس طرح قرآن کو چھونے کے لئے باوضو ہونے کی شرط عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں مکتوب ہونا ضروری ہے، اسی طرح یہ شرط قرآن مجید کے احترام کی وجہ سے بھی ہے، گرچہ بریل کوڈ میں نقطے الفاظ قرآن کی طرح نہیں ہیں، لیکن وہ نابینا کے لئے قرآن مجید سے استفادہ کے لئے ذریعہ ہیں اور علم ذرائع علم دونوں کا احترام ضروری ہے، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سے جن حروف و الفاظ اور اوراق کی نسبت ہوگئی قرآن کی طرح ان کا بھی احترام کرنا چاہئے اس لئے تفاسیر کی طرح بریل کوڈ میں تیار شدہ قرآن کو باوضو چھونا اولی و افضل ہوگا، فتاوی عالمگیری میں ہے:

"ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند ابي حنيفة، وكذا عندهما على الصحيح" (ا/ ۲۰)۔

موبائل پر قرآن مجید کا حکم:

جیسا کہ بریل کوڈ کے تحت یہ بحث آچکی ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، رسول اللہ پر اترا ہے جو سینوں میں محفوظ کیا جاتا ہے، زبان سے پڑھا جاتا ہے، اور کانوں سے سنا جاتا ہے۔

یہ صفات و میزات موبائل پر صادق نہیں آتی، کیونکہ موبائل کو وضع کرنے کا اصلا مقصد یہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے دو اشخاص کے مابین دور رہتے ہوئے بات ہو جائے، ایک دوسرے کو اپنا پیغام کم وقت میں پہنچا سکے، یہ الگ بات ہے اس سے ضمنا اور بھی فوائد حاصل ہو رہے ہیں، چنانچہ اس کے اسکرین پر قرآن کے پارے آجاتے ہیں، دینی کتابیں آجاتی ہیں، ان سے استفادہ کا موقع مل جاتا ہے، لیکن یہ اصلا اس کا مقصد نہیں ہے اور ان امور میں مقصد کے اعتبار سے حکم ہوتا ہے، لہذا اسے آلات ذرائع ابلاغ کے قبیل سے شمار کیا جائے گا نہ اسے قرآن شمار کیا جائے گا اور نہ اسے قرآن کی حیثیت حاصل ہوگی۔

علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے: "الأمور لمقاصدها" (ا/ ۱۱۳) (امور و افعال پر مقصد کے اعتبار سے حکم ہوتا ہے)۔

"قالوا: إن القرآن يخرج عن كونه قرآنا بالقصد" (الاشباہ ا/ ۱۰۸)

علماء نے کہا ہے قرآن اپنے قرآن سے خالی قرآن کے قصد کی وجہ سے نکل جاتا ہے۔

اگرچہ موبائل میں پورا قرآن بھی ہوتا ہے، لیکن اس کو بنانے کا مقصد قرآن محفوظ کرنے کا نہیں ہوتا، نہ کسی خریدنے والے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ موبائل پر اصلا قرآن پڑھنا ہے، اس وجہ سے موبائل کو قرآن کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت سی چیزوں میں اکثریت کے اعتبار سے حکم ہوتا "للاکثر حکم الکل" کہ اکثر کل کے قائم مقام ہوتا ہے، لیکن موبائل میں

اکثر پروگرام قرآن کے علاوہ ہوتے ہیں، میموری کے ایک حصہ میں قرآن ہوتا ہے، مثلاً تفسیر اور ترجمہ قرآن ہے، اس میں متن قرآن بھی ہوتا ہے، مگر اسے قرآن کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی، یہی صورت حال موبائل کی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید پر جو جلد ہوتی ہے وہ دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ ہوتی ہے کہ قرآن کے اوراق کے متصل ہوتی ہے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا یہ جلد قرآن کے حکم میں ہوتا ہے، البتہ دوسری جلد وہ ہوتی ہے جو غلاف کی طرف ہوتی ہے اسے الگ کرنا ممکن ہوتا ہے، اسی طرح موبائل پر جلد (Cover) ہوتی ہے وہ قرآن کے حکم میں نہیں ہوتا، جیسا کہ قدوری میں ہے:

''ولا یجوز للمحدث مس المصحف إلا أن یأخذه بغلاف'' (قدوری ۱/ ۲۹)

اور الجوہرہ میں ہے:

''الا بغلاف متجاف عنه کالخریطة والجلد المشرز'' (۱/ ۲۹)۔

الغرض مذکورہ تینوں وجوہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ موبائل کو بلا وضو چھونا درست ہے، البتہ جب اسکرین پر قرآن ہو تو موبائل کو ہاتھ میں بغیر وضو کے لے سکتے ہیں، لیکن اسکرین پر ہاتھ رکھنے کے لئے باوضو ہونا شرط ہے۔

چنانچہ صاحب ''الجوہرة'' قلم بند کرتے ہیں:

''لا یجوز مس شئ مکتوب فیه شئ من القرآن من لوح أو دراهم إذا کانت أیة تامة'' (الجوہرة النیرہ ۱/ ۲۹)۔



بلا متن ترجمہ کی اشاعت علاحدہ کسی اور نام سے اشاعت

مولانا مقیم احمد ندوی[1]

مسلمانوں کو قرآن کی ہدایت وتعلیمات اور احکام وقوانین کا جاننا برائے عمل بھی ضروری ہے اور برائے تبلیغ بھی، کیونکہ غیر مسلموں کو قرآن کی تعلیم دینے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں کی ہی ہے تو اس کے لئے قرآنی تعلیمات مسلمان کس طرح حاصل کرے، تا کہ اپنے عملی اور تبلیغی فریضہ کو سرانجام دے سکے، چنانچہ غور کرنے سے برائے عمل حصول احکام کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- عربی علوم کا حصول تمام مسلمانوں کے لئے لازم قرار دیا جائے۔

۲- ان کے لئے صرف قرآن کی تلاوت کافی سمجھی جائے اور اس کے احکام پر ملک کی زبان میں قرآن سے الگ احکام پر مشتمل کتابیں لکھی اور پڑھائی جائیں۔

۳- حامل المتن ترجمہ کئے جائیں جیسا کہ شاہ ولی اللہؒ نے کیا اور اسے شائع کئے جائیں، مذکورہ تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت کے وجوب پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، تیسری صورت میں کوئی کلام نہیں اور بچی دوسری صورت تو یہ عقلاً صحیح سمجھ میں آتی ہے، اس لئے کہ اس میں نہ تو ترجمہ کو قرآن کہنا لازم آتا ہے اور نہ ہی ترجمہ کو بنام قرآن شائع کرنا لازم آتا ہے، نیز غیر مسلموں کو برائے تعلیم دینے میں بھی کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ترجمہ کو قرآن سے الگ دوسرے نام سے شائع کیا جائے اور اس کو قرآن کا نام نہ دیا جائے

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت:

اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ غور کرنا ضروری ہے کہ آیا رسم عثمانی توقیفی ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس مسئلہ پر فقہاء کی عبارت میں غور کرنے سے تین رائیں ملتی ہیں: ۱- عوام الناس کے لئے کسی بھی زمانہ کے جدید رسم الخط کے ضابطہ کے مطابق قرآن لکھنا درست ہے، بشرطیکہ رسم عثمانی باقی رہے اس قول کے قائلین شیخ عزالدین بن عبدالسلام اور شیخ بدرالدین زرکشی ہیں۔

۲- قرآن کا رسم الخط نہ ہی توقیفی ہے اور نہ ہی اسے جدید رسم الخط کے مطابق لکھنا ممنوع ہے، اس قول کے قائلین ابوبکر باقلانی، ابن خلدون اور بیشتر معاصر علماء ہیں، اور یہ بہت سے لوگوں کے عمل میں بھی رہا ہے، جیسا کہ ابو سہیل صالح علی العود لکھتے ہیں کہ "اس پر عمل کرنے والوں میں برغواطہ کا رہنے والا المتنبی صالح بن طریف نامی ایک شخص ہے جس نے دوسری صدی ہجری مطابق آٹھویں صدی عیسوی میں بربری زبان میں قرآن کو لکھا، اسی طرح فرانس میں فرانسیسی زبان میں پارہ عم کا مکتوب شائع ہوا، اسی طرح انڈونیشیا میں انڈونیشیائی زبان میں قرآن شائع کیا گیا، اسی طرح انگلینڈ میں ہوا، اور غیا میں تو ایک شخص کا لاطینی زبان میں قرآن لکھنا پیشہ ہی ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی طرح رسم الخط بھی توقیفی ہے، لہٰذا جس طرح سورتوں میں تقدیم وتاخیر ناروا ہے اسی طرح اس میں بھی تغیر وتبدیلی ناجائز ہے اور اس کی مخالفت حرام ہے، اور یہ مذہب سلف وخلف میں جمہور امت کا ہے، اور یہی رائے علامہ نظام الدین نیسا پوریؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، صاحب ہدایہ، صاحب معراج الدرایہ کی ہے، حتی کہ صاحب معراج الدرایہ نے تو ایسا کرنے والے کو زندیق تک کہہ دیا ہے، نیز یہی فتوی مجمع البحوث الاسلامیہ ازہر نے 1391 ھ میں دیا تھا، اور یہی فتوی 1399 میں سعودی حکومت کے علماء نے دیا تھا اسی

[1] جامعہ اسلامیہ شانتاپورم کیرالا۔

وجہ سے بہت سے علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

اگر چہ ان حضرات کی عبارتوں میں کچھ استثنائی شکل بھی موجود ہے، جیسا کہ دور حاضر کے مشہور فقیہہ علامہ یوسف قرضاوی نے پوری مجلس بحوث و فتاوی کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نماز میں نومسلم کے لئے یا بچہ کے لئے جتنی اور جب تک ضرورت ہو وہ مستثنی ہے جیسے قصار مفصل وغیرہ جب تک کہ وہ صحیح سے نہ سیکھ لے، خلاصہ یہ ہے کہ رسم عثمانی توقیفی ہے شروع سے لے کر آج تک مسلمانوں کا اہتمام والتزام اور اجماع ہے کہ اس کو اسی صورت پر باقی رکھا جائے، لہذا اس میں تبدیلی کر کے رسم عثمانی کے ساتھ یا علاحدہ شائع کرنا کسی بھی زبان میں درست نہ ہوگا، کیونکہ قرآن مرضی کے مطابق تغیر کرنے والے کے ہاتھ کا کھلونا نہیں، بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ ہم خود کو بدلنے کی کوشش کریں اور یہ قرآن کی تبدیلی سے آسان ہے۔

اس لئے کہ قرآن کا اسلوب ولہجہ کچھ اس طرح ہے جو دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں مثلاً لفظ ''اللہ'' سے پہلے زبر ہو تو وہ پر ہوگا اسی طرح پیش ہو تو پر ہوگا کر کے مگر زیر ہو تو باریک ہوگا یہ تفخیم وترقیق دوسری زبان میں کیسے ممکن ہے، اسی طرح غنہ، مد، اظہار، ادغام وغیرہ، شاید اسی واسطہ امام جلیل ابوبکر محمد بن فضل نے اس کے متعلق فتوی پوچھنے والے کے لئے سخت رویہ اختیار کیا تھا جس کے متعلق ایک مکمل واقعہ صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام نے نقل کیا ہے، نیز فقہ کا ایک مشہور ضابطہ بھی ہے، کہ سبب مفسدہ کو دور کرنا حصول منفعت سے اولی ہے ''درأالمفاسد مقدم علی جلب المنفعة'' (الاشباہ)

اور پورے قرآن غیر عربی میں لکھنے کی ضرورت نہیں اگر کوئی ضرورت پیش کرے تو اس سلسلہ میں علامہ ابو سہل صالح نے لکھا ہے کہ ''وہ سچ کے آڑ میں باطل ہے''،

''كلمة حق أريد بها الباطل'' (تحريم كتابة القرآن الكريم بحروف غير عربية أعجمية أولا تينية/ ص۲۷).

حوالہ اور عبارتیں بالترتیب ملاحظہ فرمائیں:

''وللعلماء فى هٰذه المسئلة ثلثة مذاهب (الف) أن رسم المصحف توقيفى لايجوز تغيره وتحرم مخالفته شأنه فى ذلك شأن ترتيب سور القرأوآياته لايجوز لنا أن نقدم أو نوخر منها شيئا وهذا مذهب جمهور الأمة سلفا وخلفا ونقل كثير من العلماء الإجماع على ذلك'' (حوالہ سابق)۔

''أن رسم المصحف ليس توقيفيا وأنه لا مانع من تغير هٰذالرسم حسبما تقتضيه قواعد الرسم الحديثة، وممن ناصر هٰذالمذهب: أبوبكر الباقلانى وابن خلدون وكثير من العلماء المعاصرين'' (مصدر سابق)۔

''جواز كتابته بالرسم الحديث لعامة الناس حسب قواعد الخط فى أى عصر مع الإبقاء على الرسم العثمانى والمحافظه عليه. وممن ناصر هٰذالمذهب: الشيخ عز الدين بن عبدالسلام وبدرالدين الزركشى'' (رسم المصحف وضبطه بين التوقيف والإصطلاحات الحديثة ۱/ ۳۸)۔

''فمثلا المتنبى صالح بن طريف من (برغواطة) فى القرن الثانى للهجرى (الثامن الميلادى كتب (قرآنه) باللغة البربرية'' (تحريم كتابة القرآن الكريم بحروف غير عربية أعجمية أولاتينية/ ص۸)

''ففى فرنسة صدر الجزء الأخير من القرآن الكريم، جزء عم، بأكملة بالحروف الفرنسية وفى الإندونيسية يدالمسلم طهرت فيه، وفى غيار جل مسلم له نشاط غريب فى هٰذالميدان كان يقوم ولا يزال بكتابة القرآن بالحروف اللاتينية'' (حوالہ مذکور/ ص۲۱۲۲)۔

''قال العلامه نظام الدين النيسابورى قال: جماعة من الائمة: إن الواجب على القراء والعلماء وأهل الكتابة أن يتبعوا هٰذالرسم فى خط المصحف، فإنه رسم زيد بن ثابت وكان أمين رسول الله ﷺ وكاتب وحيه'' (حوالہ مذکور/ ص۴۷)۔

''الإمام أحمد بن حنبل (المتوفى ۲۴۱ھ) قال: تحرم مخالفة خط مصحف عثمان فى واو أو ألف أو ياء أو غير ذلك''

(حوالہ مذکور/ ص۴۳)۔

''عن أشهب أن الإمام مالك بن أنس سئل: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟(من الرسم والإملاء)فقال: لا، الا على الكتبة الأولى'' (فتاوی معاصرہ للقرضاوی ۴/ ۵۹، دیکھئے: تجنیس والمزید/ ص ۶۰، فتح القدیر ا/ ۲۲۹)۔

۳- جہاں تک سوال ہے بریل کوڈ کا تعلق ہے تو اس کے لئے پہلے ضروری یہ ہے کہ ہم یہ طے کرلیں کہ بریل کوڈ الفاظ ہے یا اشارہ، پھر یہ کہ عربی ہے یا نہیں، کیونکہ یہ بات قرآن کی تعریف میں سوال نمبر ا کے ضمن میں گذر چکی ہے کہ قرآن الفاظ ومعانی کا مجموعہ ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ وہ اصل قرآن کی طرح نہیں ہے، اس لئے اس کے احکام قرآن کی طرح نہیں ہوں گے، کیونکہ پہلی شرط ہی مفقود ہے، بلکہ وہ ابرو کی طرح ہے جس سے ان پڑھ شخص بھی وہ کام لے لیتا ہے جو ایک پڑھا لکھا انسان اس پر دلالت کرنے والے الفاظ سے لیتا ہے، اسی لئے اس نماز میں اسے دیکھ کر اس کا مطلب سمجھ لے تو نماز نہیں فاسد ہوگی اس کے برعکس الفاظ دیکھ کر پڑھ لیا اور سمجھ لیا تو نماز فاسد ہوجائے گی، اور یہ کام فی نفسہ بہت عمدہ ہے اور مستحسن ہے، اس لئے اس کو تیار کرنا اور سہولت پیدا کرنا شرعی ذوق کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ مشہور ضابطہ ہے: ''الضرر یزال'' (ضرر دور کیا جائے گا)، اسی طرح دوسرا ضابطہ ''الحرج مدفوع'' (الأشباہ والنظائر لابن نجیم مصری/ ص ۷۲)۔

اس لئے کہ یہ ضابطہ ہر اس جگہ جاری ہوتا ہے جہاں نص موجود نہ ہو اور یہاں بھی کوئی نص موجود نہیں، اس لئے یہاں بھی اسی ضابطہ کے مطابق نابینا کے لئے سہولت کی شکل نکالی جائے گی اور چونکہ اس پر تعریف قرآن صادق نہیں آتی ہے، اس لئے اس کا حکم قرآن کی طرح نہ ہوگا۔

۴- رہا سوال نمبر ۴ موبائل پر قرآن کا متن رکھنا تو اولا یہ یاد رہے کہ یہ مسئلہ خالص اجتہادی ہے اور قیاسی ہے، کیونکہ کچھ دہائی پہلے بذات خود موبائل ہی نہیں تھا، اس لئے اس مسئلہ میں کسی نظیر پر قیاس کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، لہٰذا احقر کا اس مسئلہ میں خیال یہ ہے کہ موبائل کی اسکرین پر اگر قرآن ہو تو موبائل لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے وضو شرط نہ ہو، بلکہ اسکرین کو ہی ایسا غلاف تصور کیا جائے جس کے ساتھ قرآن چھونا جائز ہوتا ہے، اور اس کی نظیر فقہاء کا وہ مسئلہ ہے جس میں وہ حائضہ، جنبی اور نفساء کے لئے جس طرح بغیر غلاف قرآن چھونا درست نہیں مانتے اسی طرح قرآن لکھا ہوا اگر درہم ہو تو اسے بھی بغیر تھیلی کے چھونا درست نہیں مانتے اور فی الجملہ تھیلی اور جزدان دونوں کے اندر ان دونوں کا قرآن سے علاحدہ ہونا پایا جارہا ہے، کیونکہ اگر دونوں میں جدا ہونے کی علت نہ ہوتی تو ان کے ساتھ بھی قرآن کو چھونا درست نہ ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح تھیلی کی حیثیت ہے کہ قرآن سے وہ الگ ہوسکتی ہے، موبائل سے بذات خود قرآن الگ، بلکہ سوخت بھی ہوجاتا ہے، نیز اگر وضو کو لازم کیا جائے تو حرج عظیم بھی ہوگا، جبکہ شرعی ضابطہ ہے ''الحرج مدفوع'' حرج ختم کردیا گیا، اس مسئلہ کی نظیر بچے کو ضرورت کی وجہ سے قرآن دینا بھی ہے، کیونکہ قرآن رکھنے کا مقصد بھی عموماً بغرض استفادہ ہوتا ہے اگر اس میں وضو کی قید لگائی جائے تو استعمال اور استفادہ دونوں میں خلل پیدا ہوگا۔

(ہدایہ شرح البدایہ ا/ ۳۳)۔



عربی کے علاوہ دوسرے رسم الخط میں گنجائش کا مسئلہ

مولانا عبدالعظیم قاسمی[1]

بغیر متن کے قرآن کو چھاپنا اور اس کی اشاعت فقہاء کرام کے نزدیک جائز نہیں، چنانچہ امہات الکتب شامی و دیگر کتابوں میں اس کی وضاحت منقول ہے، نیز اس پر اجماع بھی ہے اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی صاحب ''نور الایضاح'' مشہور فقیہ اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''النفحۃ القدسیہ فی احکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیہ'' میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت نقل کی اور سخت ممانعت ثابت کی ہے۔

نیز معراج الدرایہ میں فارسی زبان میں قرآن شریف لکھنا سخت ترین ممنوع کیا گیا ہے اور قصداً ایسا کرنے والا زندیق ہے۔

''ومنها ما في الكافي: أن لو أراد أن يكتب مصحفا بالفارسية يمنع'' (فتح القدير باب صفة الصلاة / ۲۸۶)

(اگر فارسی میں قرآن لکھنے کا ارادہ کرے روک دیا جائے گا)۔

علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں فارسی زبان میں پڑھنا اور لکھنا منع فرمایا ہے، ہاں قرآن کریم کے الفاظ لکھے اور ترجمہ کرے تو درست ہے۔

فارسی عربی نہیں عجمی زبان ہے اور یہی حال غیر عربی زبان کا ہے۔

علماء احناف کے علاوہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالکؒ کے نزدیک بھی صرف ترجمہ کر کے شائع کرنا ممنوع ہے، نیز ماضی قریب کے معتمد علیہ علماء میں سے مولانا تھانویؒ، مولانا سعید احمد صاحبؒ مفتی مظاہر علوم سہارنپور، مولانا فاروق احمدؒ مفتی دار العلوم دیوبند اور تقریباً ایک درجن علماء کرام نے بلا متن محض قرآن مقدس کا ترجمہ چھاپنا ناجائز بتلایا ہے، اس کا پڑھنا اور خریدنا بھی غلط کیا ہے اور مسلمانوں کو اس سلسلہ میں کوشش کرنا چاہئے کہ بغیر متن کے صرف ترجمہ شائع نہ ہو۔

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہوئی کہ محض ترجمہ کا لکھنا درست نہیں ہے، لہٰذا اس کی خرید و فروخت اعانت علی المعصیت کے قبیل سے ہو کر ناجائز ہوگی، اور ہدیہ لینے اور دینے کا عدم جواز بھی ہوگا، ہاں اگر متن قرآن کے بغیر صرف ترجمہ یا کسی سورت کی وضاحت یا منظوم سورت، ہو تو وہ قرآن کریم نہیں، کیونکہ قرآن کریم تو "إنا انزلناه قرآنا عربيا" (سورۂ یوسف) ہے، جو منزل من اللہ ہے، جسے مصحف عثمانی کہا جاتا ہے، غیر عربی قرآن نہیں ہے۔

اصول فقہ کی مشہور کتاب حسامی میں ہے، ''وهو اسم للنظم والمعنى جميعا'' کی وضاحت اہل علم حضرات پر مخفی نہیں ہے کہ بڑے امام صاحبؒ کا اپنے قول قراۃ بالفارسیہ سے رجوع ثابت ہے، یعنی عربی متن ہی قرآن ہے، لہٰذا ترجمہ اور وضاحت کو بغیر وضو ہاتھ لگانا جائز اور درست ہوگا، نیز غیر مسلموں کو مع متن بشرط طہارت دینے کا جواز بھی موجود ہے۔

صرف ترجمہ یا اس کی شرح شائع کرنا یہ الگ مسئلہ ہے، تشریح یا وضاحت یا منظوم قرآن کی سورہ یا آیات ہیں تو اس کو بغیر وضو کے چھونا یہ الگ مسئلہ ہے۔

---

[1] استاذ مدرسہ وصیۃ العلوم، کوپا گنج، مئو۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن مقدس کی کتابت:

پہلے ایک بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اجماع صحابہ وتابعین اور اتفاق ائمہ مجتہدین قرآن شریف کی کتابت اور مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کی اتباع لازم اور ضروری ہے اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ عہد صحابہ میں جب اسلام مشرق ومغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب کے ساتھ پھیلا تو اس وقت قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے والے حضرات بہت مختصر تھے، عراق، ایران، ترکمستان، ہندوستان میں نہ کوئی عربی پڑھ سکتا تھا اور نہ کوئی ان کو پڑھانے والا میسر تھا، ظاہر ہے کہ اس کی کس قدر ضرورت رہی ہوگی۔

لیکن پوری تاریخ اسلامی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ کسی نے بھی عجمی رسم الخط میں قرآن لکھوایا ہو۔

بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ ملک شام کے جہاد اور آرمینیہ آذربائیجان کی فتح میں شریک تھے تو لوگوں کو قرآن کی قرأت میں اختلاف کرتے ہوئے پایا۔

تو اس میں وقت کے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ سے اپنی تشویش کا اظہار فرمایا اور کہا:

''ادرك الامة قبل أن يختلفوا اختلاف اليهود والنصارى''

(امیر المومنین امت کی خبر لیں اس سے پہلے ان میں یہود ونصاری جیسا اختلاف واقع ہو جائے)۔

حضرت عثمان غنیؓ تمام صحابہ مثلاً حضرت علیؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، سعد بن وقاصؓ، عبدالرحمن بن حارثؓ وغیرہ کے مشورہ سے لغت قریش میں قرآن کریم کے چند نسخے تیار کرائے، اور فتح مکہ، شام، یمن، بحرین، کوفہ، بصرہ بھیجے گئے، اور اس کی اتباع ہر چیز میں لازم قرار دی گئی، جیسا کہ ''روح المعانی'' میں مرقوم ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ لغت قریش میں اور دوسری لغت میں معنی کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں ہے، جیسے دلی اور لکھنؤ کے لوگ ''آپ کو'' اور ''آپ کے'' تئیں بولتے ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں۔

اگر اعتراض کیا جائے کہ مصحف عثمانی کا رسم الخط تو کوفی تھا، اور آج جو کتابت ہو رہی ہے وہ نسخہ کے نام سے موسوم ہے، اس میں تفاوت ہے۔

اس کا جواب اور حل یہ ہے کہ اس میں تفاوت کی مثال ایسی ہے، جیسے اردو میں ایک رواں خط ہوتا ہے جو عام طور پر خط وکتابت میں مستعمل ہے، اور ایک خط وہ حوار اور خوشخط کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کو نستعلیق کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں میں فرق نہیں ہے، ایسے ہی خط کوفی اور نسخ کا حال ہے۔ الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا، بلکہ چودہ سو سال پہلے پہنچا ہے، آج کے مقابلہ میں اس وقت دقتیں اور مشکلات زیادہ تھیں، مسلمانوں کی تعداد میں لکھے پڑھے کم تھے، ان تمام مشکلات اور ضرورتوں کے باوجود غیر عربی میں اس کو منتقل کرنا، لکھنا، لکھوانا درست نہیں سمجھا گیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات خیالی تھیں۔

اور خود اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"ولقد يسرنا القرآن للذكر" (سورۂ قمر: ۱۷)

اور اس کا مشاہدہ بینا، نابینا اپنے پرائے سب کر رہے ہیں۔

اب جو لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے یہ مشکلات محض خیالی ہیں، ان کو مشکل تسلیم کرنا ہی غلطی ہے، اور اگر مشکل تسلیم کر ہی لیا جائے تو ہر مشکل کا ازالہ ضروری نہیں ہے، ورنہ نماز، روزہ حج وغیرہ سبھی اپنے اندر کچھ نہ کچھ مشکلات رکھتے ہیں۔

عربی کے علاوہ دوسرے رسم الخط میں گنجائش کا مسئلہ:

موجودہ دور میں اگر کوئی شخص عربی متن نہیں پڑھ سکتا، وہ ہندی، انگریزی رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو پڑھ سکتا ہے، تو اس سوال کا جواب خود سوال

میں ہے، ہندی، انگریزی، تامل، زبان میں پڑھ سکتا ہے تو عربی زبان میں کیوں نہیں پڑھ سکتا، کیا عربی پڑھنے کے لئے زبان پر بندش لگ جاتی ہے گونگا ہو جاتا ہے، سوال یہ بھی ہے کہ صحیح تلفظ نہیں نکال سکتا، تو کون کہتا ہے کہ جب تک مصریوں جیسی تلاوت نہیں ہوگی تو اس کی نماز نہیں ہوگی اور اس کے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہا جائے گا۔

بلاشبہ قرآن کی تلاوت احسن طریقہ سے ہونی چاہئے، لیکن بسیار مشقت اور کوشش کے باوجود نہ پڑھ سکے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، یا معذور ہے، اور: "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها" (سورۂ بقرہ: ۲۸۶) کا مصداق ہوگا۔

بالفرض سہولت اور آسانی کے پیش نظر غیر عربی رسم الخط میں کتابت ہو جائے (ہندی، انگریزی، تامل، مراٹھی وغیرہ میں تو معنی بدل جائے گا، مثلاً ص، ز، ذ، ض، ش وگیرہ اور بہت سے حروف کہ ان کو ہندی، انگریزی میں کر دیا جائے تو اس کا صحیح تلفظ نہیں ہوگا، اور انگریزی میں زبر زیر پیش کی جگہ مستقل حروف کا استعمال ہے، لہذا حروف کا امتیاز بھی ختم ہو جائے گا، جو سخت تحریف کے مترادف ہے، جیسا کہ اس کی صراحت بھی منقول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم اور ضروری ہے، اس کے علاوہ خط میں کتابت قرآن صحیح نہیں ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن کو سمجھنے کے لئے اشاریہ:

بریل کوڈ سے متعلق صحیح بات یہ ہے کہ ابھی اس کی واضح تصویر سامنے نہیں آئی ہے، تاہم سوال سے اتنی بات متصور ہوتی ہے کہ بہت سے الفاظ کے لئے بہت سے اشاریئے ہوتے ہیں جو نقطے کی شکل میں ہوتے ہیں ان کی مدد سے نابینا افراد کے لئے قرآن پڑھنے میں مدد ملے گی یا اس کی وجہ سے قرآن پڑھنا آسان ہو جائے گا، سوال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ حرف ہے نہ عبارت، لہذا اگر یہ صحیح ہے، جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے تو ایسے اشاریہ کو یا ابھری ہوئی علامت کو نہ قرآن کہا جا سکتا ہے، اور نہ اس کو قرآن کا درجہ دیا جا سکتا ہے، بریل کوڈ کے اشاریہ کی نہ تلاوت ہے اور نہ اس کو نماز میں پڑھنا ہے۔

پس بریل کوڈ کی حیثیت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے معصوم اور ننھے بچوں کے لئے بغدادی قاعدہ، کہ اس کی مدد سے حروف شناسی بعدہ قرآن خوانی آسان ہو جاتی ہے، تو ابھرے ہوئے اشاریہ کو چھاپنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، قاعدہ بغدادی نہ قرآن ہے نہ اس کو پڑھنے اور چھونے کے لئے وضو کی ضرورت ہے، "لا یمسه إلا المطهرون" (سورۂ واقعہ: ۷۹) کا حکم تو صرف قرآن پاک کے لئے ہے۔

لہذا بریل کوڈ کے ابھرے ہوئے حصہ یا نقطوں کا بغیر وضو چھونا درست معلوم ہوتا ہے۔

موبائل پر قرآن کریم:

موبائل پر لگی ہوئی چپس جس میں قرآن، حدیث وغیرہ محفوظ ہوں آن کرنے کے بعد قرآن کے حروف نظر آتے ہیں، موبائل کو ہاتھ میں لے کر بغیر وضو تلاوت کرنا درست اور صحیح ہے۔

چپس کے ذریعہ ابھرنے والے حروف اور نقوش انتہائی اندرون خانہ ہوتے ہیں، لہذا اوپر کا حصہ غلاف کے مانند ہوگا، نیز اس سے اور بھی مسائل تخریج کئے جا سکتے ہیں۔

☆☆☆

بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا

مفتی شبیر یعقوب ذیولوی[1]

بریل کوڈ کے متعلق سوال نامہ میں کچھ باتیں ذکر کی گئی ہیں، اس کے علاوہ بریل کوڈ سے متعلق مزید کچھ تحقیق ملاحظ ہو تا کہ اصل زبان کے سمجھنے میں آسانی ہو، اس کی ایجاد کچھ اس طرح ہوئی کہ ایک شخص بریل نامی فرانس کے ایک علاقہ کوورے نامی گاؤں میں ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا، ۱۵/برس کی عمر میں نابینا لوگوں سے متعلق ایک پروگرام میں شریک ہوا جو اس لئے منعقد کیا گیا کہ نابینا کس طرح تعلیمی چیزوں سے مستفید ہوسکیں، اس پروگرام میں شرکت کے بعد اسمیں یہ جذبہ موجزن ہوا کہ نابیناؤں کی آسانی کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا چاہئے، چنانچہ چارلر باربر کا طریقہ کتابت اس کے ہاتھ لگا، اس کا طریقہ یہ تھا کہ اس نے فوجیوں کے لئے کچھ ابھرے ہوئے نقطوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے اندھیرے میں انگشت کے ذریعہ پڑھا جاسکے اس کے بعد بریل نے بھی اسے اختیار کیا، معلوم ہوا کہ اس کی ایجاد فرانس میں ہوئی، پھر رفتہ رفتہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں منتقل ہوا اس کا طریقہ یہ ہے کہ اولا چھ نقطے اس طرح بنائے جاتے ہیں ان میں جو حرف صرف ایک نقطہ سے بنتا ہے تو اس میں ایک نقطہ ابھار دیا جاتا ہے باقی نقطوں کو حذف کر دیا جاتا ہے، اسی طرح دو حروف تین حروف وغیرہ کبھی دو تین حرف ایک ہی تعداد کے نقطوں سے بنتے ہیں تو ان میں مخالف سمتوں سے یا اوپر نیچے یا دائیں بائیں سے نقطے ابھارے جاتے ہیں تا کہ ان میں فرق ہو سکے اس طرح ان چھ نقطوں سے 64 شکلیں بنائی جاتی ہیں، ان نقطوں میں با قاعدہ کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مثلاً ایک نقطہ فلاں جگہ ہو تو اس سے 8 مراد ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ نقطے خالی رمز ہیں با قاعدہ کوئی حرف نہیں ہے۔

قرآن پاک میں جو بریل کوڈ میں تیار کیا گیا، اس میں 6 نقطے حرف کے لئے اور 6 نقطے حرکات کے لئے ہیں اور عربی کے لئے با قاعدہ کوئی الگ رمز تیار نہیں کیا گیا، بلکہ انگریزی میں جو A کا رمز تھا اس کو 'الف' تصور کیا گیا علی ھذا القیاس۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس کو نہ رسم الخط کہہ سکتے ہیں نہ رسم عثمانی، اس لئے کہ رسم عثمانی کہتے ہیں کلمہ کو حروف ہجاء کی ترکیب سے رسم عثمانی کے مطابق لکھنا (فتح الرحمن از قاری صدیق صاحب)، جبکہ یہاں پر تو صرف حروف ہجاء کا رمز ہے چہ جائیکہ رسم عثمانی کی توافقت پائی جائے، اسی طرح رسم میں مصحف امام کی اقتداء کو ضروری قرار دیا گیا ہے، چنانچہ صاحب "خلاصۃ البیان" قاری ضیاء الدین احمد اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

"ومرسوم الخط قد أجمع الأمة أن لا يجوز مخالفته كتابة ولا قراءة" (خلاصة البيان)

لیکن بریل کوڈ میں جو قرآن تیار کیا گیا ہے اس میں تو رسم الخط ہی نہیں چہ جائے کہ مصحف عثمانی کی اقتدا پائی جائے ان تمام اصولوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس طرح کا قرآن چھاپنے کی اجازت ہی نہیں ہونا چاہئے، لیکن ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کی اجازت ملنی چاہئے، جیسا کہ ان ضرورتوں کا ذکر سوال میں بھی کیا گیا ہے، نیز دین اسلام میں جہاں پابندی کا التزام کیا گیا ہے وہیں ضرورت کے موقع پر آسانی بھی دی گئی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: "الدین یسر"، اسی طرح غیر عربی رسم الخط میں جو مفاسد فقہاء نے ذکر کئے ہیں وہ اسمیں نہیں پائے جاتے، مثلاً یہ کہ غیر عربی رسم میں حرکات حروف میں تبدیلی ہو جاتی ہیں، تو تحریف ہے، لیکن یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی، اس لئے کہ حروف کا رمز الگ ہے اور حرکات کا رمز

[1] دارالافتاء جامعہ قاسمیہ کھروڈ بھروچ، گجرات۔

الگ ہے فقہاء نے یہ بھی مفسدہ ذکر کیا ہے کہ عجمی زبان میں بعض حروف میں فرق نہیں ہوتا، مثلاً ذ، ز، وغیرہ۔ یہ بات بریل کوڈ میں نہیں پائی جاتی اس لئے کہ یہ رمز اگرچہ انگریزی زبان میں ہے، لیکن عربی حروف ہجا کے اعتبار سے اس کی تخصیص کرلی گئی ہے، اسی طرح فقہاء نے ایک وجہ سے یہ بھی ذکر کی ہے، غیر عربی میں چھاپنے کی ضرورت تسلیم کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ صحیح معنی میں ضرورت تو صحابہ کرام کے بعد جب اسلام کی اشاعت مختلف ملکوں میں ہوئی اس وقت ضرورت تھی جب اس وقت اس بارے میں توجہ نہیں کی گئی تو ابھی تو بدرجہ اولی ضرورت نہیں پائی جانی چاہئے، اس لئے کہ اب تو عجمی بھی قرآن پڑھنا سیکھ گئے ہیں، بلکہ اتنی محنت کی کہ ائمہ سبعہ میں سے کئی امام عجمی ہیں، لیکن یہ بات تو بینا لوگوں کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن نابینا لوگوں میں اس کو ضرورت تسلیم کیا جاسکتا ہے، نیز اس کا دائرہ صرف نابیناؤں اور ان کے معلمین تک ہی محدود رہتا ہے، کسی اور تک نہیں پہنچتا، لہذا بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہونا چاہئے۔

لیکن بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن بالکلیہ اصل قرآن پاک نہیں ہے، اس لئے کہ ''موسوعۃ الفقہیہ'' میں قرآن کی یہ تعریف کی گئی ہے:

''ھو إسم لکلام اللہ تعالی المنزل علی رسولہ محمد ﷺ المتعبد بتلاوتہ المکتوب فی المصاحف المنقول إلینا نقلا متواترا'' (موسوعہ فقھیہ ۵/ ۳۸)

(یہ تعریف بالکلیہ بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن پر صادق نہیں آتی ہے، البتہ اس کو عرفاً قرآن پاک کہا جاتا ہے، اسی طرح ایک مخصوص و معذور طبقہ اس سے اس طرح فائدہ حاصل کرتا ہے جس طرح اصل قرآن سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، لہذا اس کو بے وضو چھونا تو جائز نہ ہوگا۔

''ویصدق المصحف علی ما کان حاویا للقرآن کلہ، أو کان مما یسمی مصحفا عرفا'' (موسوعہ فقھیہ ۵/ ۳۸)

اس کی نظیر ملاحظہ ہو کہ عجمی حروف اور زبان عربی ہو تو اس کو بے وضو چھونا جائز نہیں (فتاوی ہندیہ ۱/ ۲۹)

، اسی طرح محض ترجمہ قرآن کو بے وضو چھونا جائز نہیں ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۱۱۳)۔

البتہ کچھ باتیں ضرور ایسی ہیں کہ اگر ان کو ملحوظ رکھا جائے تو بہتر ہوگا، مثلاً مصحف امام میں جو قرآن لکھا گیا اس میں نقط و حرکات وغیرہ نہیں لکھے گئے، تا کہ وہ سب قراءت کو شامل ہو، مثلاً "یعلمون" کے بغیر نقطوں کے لکھا گیا، "تعلمون" تا کہ یہ خطاب و غائب دونوں کو شامل ہو بعد کے زمانہ میں نقط و حرکات لگادی گئیں، لیکن تب بھی رسم اس طرح ہے کہ دوسری قراءت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن بریل کوڈ میں یہ بات ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ جو ابھرے ہوئے نقطے ہوتے ہیں وہ ایک خاص حرف پر دلالت کرتے ہیں جس مین دوسرے کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کوئی ایسی شکل اختیار کی جائے کہ اس میں دوسری قراءتوں کا بھی احتمال ہو، نیز نابیناؤں کے سامنے اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ یہ اصل قرآن نہیں ہے، تا کہ اگر لکھائی میں غلطی ہو تو ان کا خیال اصل قرآن کی طرف نہ جائے۔

اسی طرح بریل کوڈ میں قرآن کی اشاعت اور اس کو چھونے سے متعلق ایک بات یہ بھی ہے کہ بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن نا نقش جس کو قرآن کہا جاتا ہے اس پر قرآن کی شرعی اور اصطلاحی تعریف صادق نہیں آتی محض قرآن کا رمزی نقش ہونے کی وجہ سے اس کو قرآن کہا جاتا ہے، حقیقتاً وہ قرآن نہیں ہے، لہذا اس رمز قرآن کو چھاپنا قرآن کریم کو عربی رسم الخط کے علاوہ میں چھاپنا بھی نہیں کہا جائے گا جس کی وجہ سے اس کی طباعت کو ناجائز کہا جائے اسی طرح اس رمز کو چھونا قرآن کو چھونا بھی نہیں کہا جائے گا ہاں عرفاً چونکہ اس رمز کو قرآن کہا جاتا ہے اور قرآن کی تلاوت میں اس سے قرآن پاک کی مانند مدد لی جاتی ہے، اس لئے اس کا ادب و احترام کرنا چاہئے اور اچھا یہ ہے کہ اس کو بے وضو نہ چھوا جائے جیسے قرآن سے متعلق چیزوں کا احترام کیا جاتا ہے۔

موبائل اسکرین پر قرآن کو چھونے کا مسئلہ:

موبائل پر قرآن کی تلاوت کے احکام کا مدار اس بات پر موقوف ہے کہ موبائل کو مصحف کہہ سکتے ہیں یا نہیں، اگر موبائل پر مصحف کا اطلاق ہوتا ہے تو اس کے احکام بھی وہی رہیں گے جو مصحف کے ہیں، ورنہ اس کے حکم میں فرق ہوگا، اس لئے سب سے پہلے مصحف کی تعریف ملاحظہ ہو۔

"موسوعہ فقہیہ" میں ہے: "المصحف فی الإصلاح إسم للمکتوب فیه کلام الله تعالی بین الدفتین"

یعنی مصحف اس شئ کا نام ہے جس میں دو دفتوں کے درمیان اللہ کا کلام لکھا ہوا ہو، یہ تعریف موبائل پر صادق نہیں آتی، اسی طرح اس کو عرفاً بھی مصحف نہیں کہتے ہیں، لہذا اس پر مصحف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اور مصحف کے احکام فقہاء نے یہ ذکر کئے ہیں کہ صفحہ کے کنارے جو بیاض ہے اسی طرح دونوں دفتیاں ان کو بھی بلا وضو چھونا جائز نہیں ہے، بلکہ موبائل کا حکم اس لوح، درہم وغیرہ کا ہے جس میں قرآن کی آیت لکھی ہوئی ہو اور اس طرح کی چیزوں کا فقہاء نے یہ حکم بیان کیا ہے کہ جہاں آیت لکھی ہو صرف اس کو چھونا ممنوع ہوگا اس کے علاوہ کو چھونا جائز ہوگا اسی طرح موبائل کا حکم ہوگا کہ صرف اس کی اسکرین کو چھونا ممنوع ہوگا کنارے والا حصہ اور نیچے والے حصے کو چھونا جائز ہوگا۔

"(ومسه) ای القرآن ولو فی دراهم أو حائط لکن لا یمنع إلا من مس المکتوب. بخلاف المصحف فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه، وقال بعضهم: یجوز وهذا أقرب إلی القیاس. والمنع أقرب إلی التعظیم کما فی البحر: أی والصحیح المنع کما فذکره" (شامی سعید ا/۲۹۳)۔

مزید وضاحت کے لئے "المسائل المہمۃ" کی عبارت ملاحظہ ہو: موبائل فون میں قرآن کریم کا ڈاؤن لوڈ کرنا اور اس قرآن کریم کو پڑھنا اور سننا شرعاً جائز ہے، اور جس وقت اس کی اسکرین پر قرآن کریم کے حروف نہ آرہے ہوں اپنے بے وضو ہونے کی حالت میں اپنے پاس رکھنا یا بیت الخلاء وغیرہ میں لے جانا جائز ہے، کیونکہ اس حالت میں اس پر قرآن کریم کی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔

ہاں البتہ جس وقت قرآن کریم کے حروف اسکرین پر لکھے ہوئے آرہے ہوں تو اس وقت میں محدث (بے وضو شخص) اور جنبی کے لئے اس کا چھونا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس وقت اس پر قرآن کریم کی تعریف صادق آتی ہے۔

(المسائل المہمۃ ۳/ ۲۵۹،۶۰ مطبوعه اشاعت العلوم اکل کوا)۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت

مولانا عبدالحکیم پالنپوری ؒ

غیر عربی زبانوں میں جب کتابت قرآن کی حرمت ثابت ہوگئی تو اس کی طباعت واشاعت مرحلہ ثانیہ ہے جو بدرجہ اولی حرام اور ناجائز ہوگا، خواہ قرآن پاک کا متن عربی ایک جانب ہو اور دوسری جانب دوسری زبانوں میں، یا تحت اللفظ، یعنی متن عربی کے نیچے دوسری زبان میں قرآن کا متن لکھا ہو؛ کیونکہ ایسے قرآن کریم کی اشاعت میں مزید ناجائز عمل کو عام کرنا اور گناہ پر تعاون کرنا ہے جس کی ممانعت پر قرآن کریم میں صراحت ہے "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲ بحث ونظر شمارہ: ۹۱، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۷ تا ۱۵، امداد الأحکام ۱/۲۴۰، فتاوی محمودیہ ۷/۲۲۱ مکتبہ محمودیہ میرٹھ)۔

فقہ حنبلی کی مشہور ومعروف کتاب "المغنی" میں ہے: "ویقول أبوطاهر: لقد كان للمحافظ على لغة القرآن وتدبر الناس إياه بهذه، اللغة العربية، أعظم الأثر في الوحدة الإسلامية وقوتها بحيث لم يكن يستطيع عدوان يتسرب إلى أي ناحية، حتى هجر المسلمون كتاب ربهم ولغته العربية وشغلوا بكتب الأعاجم التي صرفتهم عن الخير كله ولاحول ولاقوة إلا بالله" (المغنی ۱/۲۸۴۳۸۴، مکتبہ الریاض الحدیثہ)۔

ویسے تو علامہ کی مذکورہ بالا عبارت میں عربی زبان کی فضیلت واہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، مگر ہمارے لئے اس میں نکتے کی بات یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کا قرآن مجید سے تعلق مضبوط رہا کسی دشمن کو قرآن کریم میں دخل گیری کی ہمت نہ ہوسکی، لیکن جب سے مسلمانوں نے کلام الٰہی اور اس کی زبان (عربی) کو چھوڑ کر عجمی حضرات کی کتابوں کو اپنا مشغلہ بنایا تب سے وہ خیر کثیر، بلکہ خیر کل سے محروم ہوگئے۔

موضوع بحث مسئلہ کے استدلال میں اسے نتیجۃً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کتابت قرآن میں عربی رسم الخط کو چھوڑ کر مروجہ رسم الخط میں لکھنے کی اجازت دینا ایک بہت بڑے شر کا دروازہ کھولنے سے عبارت ہوگا، نیز اس سے اسلام دشمنوں کو قرآن کریم پر انگشت نمائی کا موقع ہاتھ آئے گا، واضح رہے کہ یہ عبارت اس طویل عبارت کے ضمن مین جس میں فارسی میں کتابت قرآن کے عدم جواز کی صراحت ہے۔

ترجمہ قرآن کی اشاعت کا مسئلہ:

جہاں تک خالصۃً ترجمہ قرآن کو لکھنے اور چھاپنے کی بات ہے تو اس سلسلہ میں جواب یہ ہے کہ وہ ناجائز اور ممنوع ہی ہوگا (اور یہی احقر کی رائے ہے) کیونکہ اس طرح کرنے میں متعدد خرابیاں ہیں، بطریق استقراء کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

اصل قرآن کریم کے جو انوار وبرکات اور فضائل وخصائص ہیں یقیناً وہ محض ترجمہ قرآن میں حاصل نہیں ہوسکتے، اسی طریقے سے آج اصل قرآن کے ساتھ نہیں رہ سکتا، نیز موجودہ زمانے میں دن بہ دن سہل انگاری اور تن آسانی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اس کے پیش نظر ترجمہ قرآن کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے لوگ صرف ترجمہ پڑھ لیا کریں گے، اور عربی قرآن کریم سے اپنی توجہ ہٹادیں گے، پھر اس عربی کا چھپنا رفتہ رفتہ بند ہوجائے گا، اور عربی ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے صحت وسقم کا اندازہ بھی مشکل ہوجائے گا، یہاں تک کہ قرآن پاک کا وہ حال ہوجائے گا (معاذ اللہ) جو کہ آج توریت و

ؒ جامعہ نذیریہ کاکوسی، گجرات۔

انجیل کا حال ہے کہ اصل تک رسائی بہت دشوار ہے، ترجمہ ہی ترجمہ سب جگہ پھیل رہا ہے، خدانخواستہ عربی متن کا رواج نہ رہے اور سب کے پاس ترجمہ ہی ترجمہ ہو تو مسلمانان عالم اپنے مذہب اسلام کی معتمد کتاب قرآن پاک سے محروم ہو جائیں گے، نیز ایک بہت بڑی خرابی یہ بھی ہوگی کہ علماء امت اپنے زمانے اور موقع وضرورت کے لحاظ سے عربی متن میں غور وفکر کر کے کئی ایک مسائل کا استخراج واستنباط کرتے ہیں ترجمہ قرآن کی وجہ سے اس نعمت عظمی سے محروم ہو جائیں گے، بلکہ فکر ونظر کی وسیع دنیا تنگ اور محدود بن کر رہ جائے گی، ہوتے ہوتے اصل دین کی حقیقت عنقاء ہو جائے گی، مذکورہ بالا خرابیوں کی بناء پر بغیر عربی کے محض ترجمہ قرآن کو چھاپنا ناجائز اور ممنوع عمل ہوگا، علامہ شامیؒ ''فتح القدیر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''في الفتح عن الكافي: إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين. فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز'' (شامی ۱/ ۳۵۳، فتاوی محمودیہ ۷)۔

اسی طرح حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے ''جواہر الفقہ'' میں صاحب ہدایہؒ کی کتاب ''تجنیس ومزید'' کے حوالہ سے رقم کیا ہے:

''ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالإجماع؛ لأنه يؤدي للإخلال بحفظ القرآن لأنا أمرنا بحفظ النظم والمعنى. فإنه دلالة على النبوة، ولأنه ربما يؤدي إلى التهاون بأمر القرآن'' (جواہر الفقہ ۱/ ۹۸)۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا محض ترجمہ قرآن کی کتابت کے عدم جواز پر ایک مفصل فتوی ہے جس کا ضروری اقتباس مندرجہ ذیل ہے، لکھتے ہیں:

''من تشبه بقوم فهو منهم. لتركبن سنن من كان قبلكم'' (ترمذی ابواب الفتن ۲/ ۱۴۱)

ان نصوص صریحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تشبہ باہل الباطل واہل الکتاب عند الشرع ایک مذموم اور قابل تردید عمل ہے، اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جدا گانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، پھر تشبہ فی الامر الدین تو اور زیادہ سخت اور ناپسندیدہ ہے، بریں بناء ترجمہ قرآن کو چھاپنا ناجائز ہوگا، نیز عہد صدیقی میں عدم کتابت قرآن میں قرآن کریم کے ضائع ہو جانے کا احتمال تھا، بعینہ آج محض ترجمہ قرآن چھاپنے میں بھی وہی احتمال قوی ہو جاتا ہے، اس لئے منع ضروری ہے، اور وہ سارے مفاسد پیدا ہوں گے جن کو شق دوم کی بحث میں لکھ دیا گیا ہے۔

اور محض ترجمہ قرآن چھاپنے کے جواز کا رجحان رکھنے والے حضرات کا یہ کہنا کہ اس میں مصارف کم آتے ہیں، یہ انتہائی ضعیف اور بے وزن بات ہے جس کی طرف التفات نہیں کیا جاسکتا، اور جہاں تک متن پر مشتمل ترجمہ قرآن غیر مسلموں کو دینے میں بے حرمتی کا مسئلہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بالعموم غیر مسلم حضرات جو تعلیم یافتہ اور گریجویٹ طبقہ سے متعلق ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کی ہدایت کی وجہ سے مطالعہ قرآن کے دوران بے حرمتی کے بجائے قرآن کریم مذہبی کتاب ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ حد درجہ تعظیم وتکریم کا معاملہ ہی کرتے ہیں، اور وہ کچھ غیر مسلم حضرات جو قرآن کریم کے ساتھ حرمت وعظمت کا معاملہ نہیں کرتے ہیں ان کی وجہ سے محض ترجمہ قرآن چھاپنے کی اجازت ایک نامعقول بات ہے، چونکہ اس سے مفاسد کثیرہ کا قوی امکان بھی ہے، اس لئے ''درأ المفاسد أولى من جلب المصالح'' (الاشباہ والنظائر) کے پیش نظر مطلقا عدم جواز کا قول اختیار کرنا ہوگا۔

مذکورہ بالا تحریر سے یہ بات اچھی طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ رسم عثمانی توقیفی (سماعی) اور منزل من اللہ تعالی ہے، اس کی مخالفت کسی طرح روا نہیں ہے، مگر مسئلہ یہاں یہ ہے کہ کیا بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے سے رسم عثمانی کی اس درجے کی مخالفت لازم آتی ہے کہ جس سے مفاسد کا ایک بڑا دروازہ کھل جاتا ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقینا اس سے وہ خرابیاں لازم نہیں آئے گی جو مروجہ رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنے سے لازم آتی ہیں۔

اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ بالیقین بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کریم میں حروف وحرکات وسکنات نہیں ہوتے ہیں کہ جس سے تصحیف وتحریف، تقدیم وتاخیر، تغیر وتبدل لازم آئیں، بلکہ اس کی شکل صرف ابھرے ہوئے نقطوں کی ہوتی ہے، جیسا کہ سوالنامہ میں اس کی صراحت ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اس پیش رفت کو تسلیم کرتے ہوئے ایسے بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے، خاص نابینا حضرات کی ضرورت اور مجبوری کے پیش نظر ''المشقة تجلب التيسير'' فقہی ضابطے کی رو سے یہ ضابطے کی رو سے یہ

گنجائش خلاف شرع نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مروجہ رسم الخط کے عدم جواز کے عوامل ومحرکات اس طرح کے قرآن کریم میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

ہاں: اس طرح کے قرآن کریم کو اصل قرآن کی حیثیت نہیں دی جاسکتی ہے؛ کیونکہ لوح محفوظ میں موجود قرآن مجید وہی ہے جو ہمارے پاس ہے، اور بریل کوڈ والے قرآن کو اسے کسی درجے میں مماثلت نہیں پائی جاتی ہے، لہٰذا اصل قرآن کا اس پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

جہاں تک چھونے کا مسئلہ ہے تو آیت کریمہ "فی کتب مکنون لا یمسہ إلا المطھرون" (سورۂ واقعہ: ۷۸، ۷۹) تحت بریل کوڈ والا قرآن کریم داخل تو نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس کو چھونے کے لئے وجوب وضو کی بات بعد از قیاس ہے، لیکن کسی درجے میں قرآن کریم سے مناسبت کی وجہ سے اقرب الی التعظیم والاحترام کے پیش نظر وضو کا حکم ہونا چاہئے۔

موبائل اسکرین پر قرآن کو بلاوضو چھونا:

جس موبائل کی اسکرین پر قرآنی آیت نمایاں ہو تو صرف اس اسکرین کو بلاوضو چھونا احتیاط کے خلاف ہے، البتہ موبائل کو پکڑنا اور ہاتھ میں لینا درست ہے، اور اگر آیت دکھائی نہ دے رہی ہو تو ایسے موبائل کو اور اس کی اسکرین کو بلاوضو چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

"ویمنع دخول مسجد ومسه أی القرآن ولو في لوح أو درهم أو حائط؛ لكن لا يمنع إلا من مس المكتوب بخلاف المصحف، فلا يجوز مس الجلد وموضع البياض منه؛ وقال بعضهم: يجوز. وهٰذا أقرب إلى القياس، والمنع أقرب إلى التعظيم" (شامی ۱/۴۸۸، زکریا دیوبند)۔

☆☆☆

غیر عربی میں قرآن کی اشاعت اور بریل کوڈ

مفتی سلمان قاسمی پالنپوری[1]

۱- غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن مجید کی اشاعت۔

۲- عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی غیر عربی رسم الخط میں قرآن کو لکھ کر دونوں کو ساتھ شائع کرنا۔

یہ دونوں صورتیں جائز نہیں، کیونکہ رسم خط عثمانی کی مخالفت دونوں صورتوں میں لازم آتی ہے جو باجماع امت حرام ہے، اور رسم الخط بدلنے کے سلسلہ میں جو عذر پیش کیا جارہا ہے (یعنی تاکہ غیر عربی داں حضرات کو تلاوت قرآن میں سہولت ہو)، اس کو اسلاف نے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، نیز دونوں صورتوں میں قرآن مجید کی تلاوت غیر عربی رسم الخط کو دیکھ کر کی جائے گی، اس صورت میں ان پڑھ آدمی غیر عربی رسم الخط میں کس طرح صحیح پڑھ سکتا ہے؟ پڑھنے والا بیسیوں غلطی کا مرتکب ہوکر فرمان نبوی ﷺ: "رب تال للقرآن والقرآن یلعنه" کے مطابق قرآنی لعنت اور پھٹکار کا مستحق ہوگا۔

۳- بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ جونسبۃً موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نابینا افراد عموماً انگلیوں کے پوروں کے لمس سے اسے پڑھتے ہیں، بریل کوڈ میں، قرآن مجید کی آیات یا حروف کو کسی غیر عربی زبان میں لکھا نہیں جاتا، بلکہ مصحف عثمانی ہی تلاوت اور تلفظ کے لئے ہر ہر حرف کی شناخت کے واسطے بطور علامت (کوڈ) کے ابھرے ہوئے نقطے مقرر کئے ہیں تاکہ نابینا حضرات انگلیوں کے لمس سے مصحف عثمانی کی تلاوت کرسکیں، مثلاً الف کی جگہ ایک نقطہ، اور ب کی جگہ دو نقطے: وغیرہ، پس الف بتانے کے لئے ایک نقطہ لکھنا، یہ الف کے رسم الخط کی تبدیلی نہیں، کیونکہ نقطے کسی غیر عربی زبان کے حرف نہیں ہیں، بلکہ نابیناؤں کی رہنمائی کے لئے ایک کوڈ (علامت) ہے کہ ایک نقطہ سے الف سمجھیں، البتہ الف کی جگہ انگریزی زبان میں ALIF لکھنا یہ رسم الخط کی تبدیلی ہے جو جائز نہیں، بالفاظ دیگر قرآن مجید کی کتابت غیر عربی رسم الخط میں ممنوع ہے، اور بریل کوڈ میں قرآن مجید تیار کرنا غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت ہے ہی نہیں، جو کہ ممنوع ہے، کیونکہ بریل کوڈ حروف نہیں ہیں، بلکہ عربی حروف کے کوڈ ہیں، لہذا اس سے غیر عربی زبان میں قرآن کی کتابت لازم نہیں آتی ہے۔

حاصل یہ کہ بریل کوڈ میں تیار کردہ مصحف، مصحف عثمانی کے مطابق تلاوت اور تلفظ کے لئے بطور کوڈ تیار کیا جاتا ہے، اس سے مصحف عثمانی کے رسم الخط کی نہ تبدیلی لازم آتی ہے اور نہ مخالفت، اور صحابہ کرام اور ائمہ سلف نے جن مفاسد کی وجہ سے غیر عربی رسم الخط مین قرآن مجید کی کتابت منع فرمائی ہے، میرے خیال میں وہ مفاسد بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن میں موجود نہیں ہیں، لہذا نابیناؤں کی مجبوری کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا بلاشبہ درست ہے۔

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم:

بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم اصل قرآن مجید کی طرح تو نہیں کہ اس کو چھونے کے لئے باوضو ہونا ضروری ہو، بلکہ اسے وضو کے بغیر بھی چھوا جاسکتا ہے، کیونکہ بریل کوڈ والے قرآن میں نہ تو قرآنی آیات لکھی ہوئی ہوتی ہیں اور نہ تو ان کے معانی، تاہم کہنے کو تو وہ مصحف ہے، لہذا اس کو باوضو چھونا بہتر ہے، اسی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ حقیقی مصحف کے لئے جو آداب واحکام ثابت ہیں، وہ سب بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کے لئے

[1] مفتی جامعہ خلیلیہ ماہی پالنپور، گجرات۔

ثابت نہیں ہوں گے، البتہ اس کا ادب کیا جائے گا، کیونکہ مصحف حقیقی کے ساتھ اس کو نسبت حاصل ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید کی آیات موجود ہوں، اس کے حروف دکھائی دے رہے ہوں، تو ان حروف (اسکرین) پر بلا وضو ہاتھ رکھنا درست نہیں، البتہ اسکرین کے علاوہ موبائل کے باقی حصہ کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہے، کیونکہ موبائل کی اسکرین پر چند آیات (پورا قرآن بیک وقت موبائل کی اسکرین پر موجود نہیں ہوسکتا) کے موجود ہونے سے، موبائل مصحف نہیں بن جاتا، کہ اس کے کسی حصہ کو بے وضو چھونا منع ہو، بلکہ یہ اس تختی یا دیوار کے مثل ہے جس پر چند قرآنی آیات لکھی ہوئی ہوں، اور اس صورت میں موضع کتابت کے علاوہ تختی یا دیوار کے باقی حصہ کو بے وضو چھونا منع نہیں ہے، یہی حکم موبائل کا بھی ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''یمنع دخول المسجد (الی قولہ) مسہ أی القرآن و لو فی لوح أو درہم أو حائط''

''لکن لا یحرم فی غیر المصحف إلا بالمکتوب أی موضع الکتابۃ کذا فی باب الحیض من البحر (شامی ۱/ ۲۹۳، مطلب یطلق الدعاء علی ما یشمل الثناء)۔

البتہ موبائل کے باقی حصہ کو بھی باوضو چھونا بہتر ہے۔



قرآن مجید کے متن وترجمہ اور بریل کوڈ میں کتابت

مولانا حیدر علی قاسمی [1]

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت، اس کی خرید وفروخت کرنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے کا حکم:

دنیا کے تمام مذاہب میں مذہب اسلام کامل ومکمل، انسانی مزاج سے ہم آہنگ اور اللہ تعالی کے نزدیک مقبول اور معتبر ہے، اس مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب میں کامیابی نہیں ہے، رضائے الٰہی اور معرفت خداوندی کا واحد ذریعہ مذہب اسلام کو اپنانا اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنا ہے، اسلام کو جاننے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنے کے لئے قرآن کریم کو پڑھنا سمجھنا اور اپنانا ضروری ہے۔

قرآن کریم عربی زبان میں ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "انا أنزلناہ قرآنا عربیا" (سورۂ یوسف:۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے: "إنا جعلناہ قرآنا عربیا" (سورۂ زخرف:۲)۔

قرآن کریم محض معانی وتراجم کا نام نہیں ہے، بلکہ الفاظ وعبارات اور معانی وتراجم کے مجموعہ کا نام ہے، جیسا کہ صاحب "نور الانوار" نے تعریف کی ہے:

"ان القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعا" (نور الانوار/۹)۔

احادیث نبویہ میں بھی عربی زبان کی اہمیت اور فضیلت وارد ہوئی ہے، چنانچہ طبرانی مستدرک حاکم اور شعب الایمان بیہقی میں بروایت عبداللہ بن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أحبوا العرب لثلاث لأني عربي والقرآن عربي وكلام أهل الجنة عربي" (بحوالہ معارف القرآن ۵/۲۲۶)

(تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ وآیات میں ایسا اعجاز وایجاز اور ایسی جامعیت وکشش ہے کہ دوسری زبان میں اس کی ادائیگی ممکن نہیں، چنانچہ تجربات شاہد ہیں کہ بہت سارے ایسے لوگ جو ایمان کی روشنی اور اسلام کی حلاوت سے دور تھے، محض قرآنی آیات والفاظ سن کر ان کے اعجاز اور جامعیت اور اس کی تاثیر وکشش سے نور ایمانی اور حلاوت اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ محض ترجمہ کی اشاعت کی صورت میں لوگوں کی توجہ متن قرآن سے ہٹ جائے اور لوگ ترجمہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوجائیں، جس کی وجہ سے امت اصل قرآن کی برکتوں اور رحمتوں سے محروم ہوجائے اور رفتہ رفتہ الفاظ قرآن کی حفاظت کا مسئلہ خطرہ میں پڑجائے اور تحریف وترمیم کا سبب بن جائے، جیسا کہ پچھلی آسمانی کتابوں میں ہوا ہے۔

نیز فقہاء کرام اور علماء امت نے بغیر متن کے محض ترجمہ قرآن کی اشاعت سے منع فرمایا ہے، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"ان اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها منع" (شامی ۱/۳۲۶)

(اگر کوئی فارسی میں قراءت کا عادی ہوجائے یا فارسی میں قرآن لکھنا چاہے تو منع کیا جائے گا)۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی، گوپال نگر، نوگاؤں، آسام۔

اس سلسلہ میں مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں: قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے (جواہر الفقہ ۱/۹۷)۔

اور صاحب فتاوی محمودیہ ارقام فرماتے ہیں: بغیر عربی محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف کو چھاپنا منع ہے (فتاوی محمودیہ ۷/۲۱۵)۔

اسی طرح مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے ''کتاب الفتاوی'' میں لکھا ہے:

''پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کتاب کے متن کو نظر انداز کردیا اور اس کے ترجمہ وتشریح کو مرکز توجہ بنا لیا، اسی لئے فقہاء نے متن قرآن کے بغیر معنی ترجمہ لکھنے کو منع کیا ہے، قرآن مجید کی آیات لکھتے ہوئے ان کے ساتھ ترجمہ لکھنا چاہئے، یہ حکم اردو ترجمہ کے لئے بھی ہے اور انگریزی ترجمہ کے لئے بھی اور دوسری زبان کے تراجم کے لئے بھی، بغیر متن کے صرف ترجمہ لکھنا درست نہیں (کتاب الفتاوی: ۱/۴۷۴)۔

نیز صاحب ''اتقان'' تحریر فرماتے ہیں:

سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟، فقال: لا. إلّا على الكتبة الاولى'' (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۴/۱۳۶)۔

(امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر پر لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے)۔

مذکورہ امور ووجوہ کے پیش نظر راقم السطور کے خیال کے مطابق متن قرآن کے بغیر محض ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز نہیں ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ محض ترجمہ قرآن کی اشاعت جائز اور درست نہیں ہے، تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ متن کے بغیر محض ترجمہ قرآن کی خرید وفروخت، تقسیم اور ہدیہ کرنا بھی جائز اور درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی خرید وفروخت، تقسیم اور ہدیہ کرنا تعاون علی الاثم کے قبیل سے ہے، حالانکہ تعاون علی الاثم جائز نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)۔

نیز جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو اس کے لوازمات بھی ثابت ہوجاتے ہیں، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے:

''اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه'' اور دوسرا قاعدہ ہے: ''يثبت التبع بثبوت الأصل'' (قواعد الفقہ/۱۳۹)

لہذا جب اس اشاعت کا عدم جواز ثابت ہوا تو اس کے لوازمات یعنی خرید وفروخت تقسیم اور ہدیہ کرنے کا عدم جواز بھی ثابت ہورہا ہے۔

اس سلسلہ میں ''فتاوی محمودیہ'' میں مذکور ہے، اس سے خریدنے اور بیچنے کی بھی ممانعت معلوم ہوگئی (فتاوی محمودیہ ۷/۲۱۵)۔

اور مفتی شفیع صاحبؒ رقم طراز ہیں: جب اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لیے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گنہگار ہوگا اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گنہگار ہوں گے، ان سب کا گناہ، اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا (جواہر الفقہ ۱/۹۷)۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی، اس لئے یہ بھی ناجائز ہے (جواہر الفقہ ۱/۱۱۵)۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

خالق کائنات اور رب ذو الجلال والاکرام نے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور اعلان فرمایا: "إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر: ۹)، یہاں حفاظت سے مراد صرف الفاظ یا عبارات نہیں ہیں، بلکہ الفاظ، معانی اور رسم الخط وغیرہ سب کی حفاظت کا وعدہ اور پیشن گوئی ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں مخصوص حضرات کے علاوہ اکثر حضرات قرآن کریم کو عربی رسم الخط میں پڑھنے پر قادر نہیں تھے، ایسی صورت میں قرآن کریم کی اشاعت اور اس کے احکام وتعلیمات کو عام کرنے کے لئے کسی عجمی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کی شدید ضرورت تھی، اس کے باوجود قرون مشہور لہابالخیر میں کسی عجمی زبان ورسم الخط میں قرآن لکھنے کا ثبوت نہیں ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ عربی زبان کے بعض حروف ایسے ہیں جو عربی کے ساتھ خاص ہیں، دوسری زبان میں ان کا استعمال نہیں ہوتا ہے، ان کے لئے دوسری زبان میں نہ صوت ہے نہ شکل اور نہ ہی کوئی صورت، ایسی صورت میں دوسری زبان ورسم الخط میں ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے جو تحریف وتغیر کے مرادف ہے، حالانکہ تحریف وتغیر جائز نہیں ہے۔

ان چیزوں کے ساتھ علماء امت اور فقہاء کرام نے بھی غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو منع فرمایا ہے، چنانچہ اتقان میں مذکور ہے:

"سئل مالك هل يكتب على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا. إلا على الكتبة الأولى" (الاتقان ۲/ ۱۶۷)

(امام مالک سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے)۔

"فتاوی کبری" میں اس سلسلہ میں مذکور ہے: "وصرح بتحريم كتابته بالعجمية في الفتاوى الكبرى" (۱/ ۳۱)

(فتاوی کبری میں عجمی میں قرآن کی کتابت کے بارے میں حرمت کی صراحت کی)۔

صاحب "فتاوی محمودیہ" ارقام فرماتے ہیں: مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگر چہ وہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، بلکہ علمائے امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا، پھر غیر عربی بنگلہ وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ اس میں جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں، لہذا صورت مسئولہ بالاجماع ناجائز ہے، بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے طاء، حاء، ض، ظ، ذ، ز وغیرہ یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے، ان کے لئے ان زبانوں میں نہ صوت ہے، نہ شکل وصورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے جو کہ بنگلہ میں مستعمل ہیں اور یہ عمداً تحریف وتغیر ہے جو کہ حرام ہے (فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۱۸-۲۱۹)۔

اسی طرح صاحب "فتاوی رحیمیہ" فرماتے ہیں: قرآن شریف گجراتی حروف میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے اور تحریفِ رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے (چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں) اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے، بلکہ توقیفی اور سماعی ہے لوح محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، لہذا اس کی اتباع واجب اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے (فتاوی رحیمیہ ۱/ ۹۸)۔

حضرت مولانا یوسف صاحبؒ لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں: قرآن کریم کا رسم الخط متعین ہے، اس رسم الخط کو چھوڑ کر کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن کریم چھاپنا جائز نہیں ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۴/ ۹۲ء)۔

نیز حضرت مفتی شفیع صاحبؒ ارقام فرماتے ہیں: جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت لازم اور ضروری ہے کسی عجمی زبان میں بدون عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں، اسی طرح عربی رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری ہے کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا جائز نہیں، کہ اس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۷۷)۔

دوسری جگہ حضرت تحریر فرماتے ہیں: ۱۳۵۹ھ میں جب جمعیۃ تبلیغ الاسلام صوبہ متحدہ ناظر باغ کانپور سے قرآن مجید کو ہندی رسم خط میں شائع کرنے کی تجویز ہوئی تو علماء نے مخالفت کی۔ دار العلوم دیوبند میں بھی اس وقت استفتاء اس کے بارے میں آیا۔ اس وقت احقر دار العلوم کی خدمت فتویٰ انجام دیتا تھا۔ اس سوال کی اہمیت کے خیال سے احقر نے اس کو دار العلوم کی مجلس علمی کے مشورہ میں رکھا مجلس علمی کے صدر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے اپنے قلم سے اس پر مضمون ذیل تحریر فرمایا:

''ہندی رسم الخط میں بہت سے وہ حروف نہیں ہیں جو کہ عربی زبان اور قرآن میں پائے جاتے ہیں اور اسی لئے ہندی میں ان کے لئے کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی ہے مثلاً (ذ، ز، ظ، ض) کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بدل جاتے ہیں، اس لئے قرآن مجید کو رسم الخط ہندی میں لکھنا تحریف ہوگا جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے (۱۴ رشعبان ۵۹ ۱۳ھ، جواہر الفقہ ۱/۸۹)۔

اور ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''وينبغي لمن أراد كتابة القرآن أن يكتبه بأحسن خط كما هو مصحف الإمام عثمان بن عفان'' (ہندیہ ۵/ ۳۲۵) (جو آدمی قرآن کی کتابت کا ارادہ کرے تو اس کو مصحف امام عثمان بن عفان کی طرح اچھے خط میں لکھنا چاہئے)۔

مذکورہ دلائل اور شواہد کی بناء پر بندہ کے نزدیک غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی کتابت جائز نہیں ہے۔

اسی طرح غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ تعاون علی الاثم ہے، جو ناجائز ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

"لا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) اور فقہی قاعدہ ہے: ''إذا ثبت الشيئ ثبت بلوازمه'' (الاشباہ والنظائر)۔

دوسرا قاعدہ ہے: ''يثبت التبع بثبوت الأصل'' (حوالہ سابق)۔

نیز اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متن قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن لکھ دیا جائے اور دونوں کو ایک ساتھ شائع کیا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے ان دلائل اور شواہد کی بنا پر جو غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کے سلسلہ میں پیش کئے گئے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

اللہ رب العزت کے بے شمار انعامات و احسانات ہیں کہ ہر دور اور زمانہ کے لحاظ سے ضروریات کی تکمیل فرماتے ہیں اور فرمائیں گے، جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، اس وقت اس کا انتظام بھی کرتے ہیں، بہت ساری چیزیں جو پہلے موجود نہیں تھیں، آج کے دور میں موجود ہوگئیں، اللہ نے پہلے ہی اعلان فرمایا ہے: "ويخلق لكم مالا تعلمون" (سورۂ نحل: ۸)۔

ایسی صورت میں ان کی قیمتی نعمتوں سے استفادہ کرنا، ان کا شکر ادا کرنے ان کے رضا و معرفت کے لئے کام کرنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا ہر ایک انسان کا فریضہ بنتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ خالق کائنات کی رضا و معرفت کے لئے علم نبوی ایک عظیم سبب اور وسیلہ ہے، اس کے بغیر کما حقہ سعادت دارین اور رضائے الہی کا حصول ممکن نہیں ہے، علوم نبویہ کی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر سب سے پہلی وحی تعلیم کے بارے میں نازل ہوئی، جیسا کہ ''سورہ اقراء'' سے واضح ہے، نیز خدائے پاک نے "الرحمن، علم القرآن، خلق الانسان" (سورۂ رحمن ۱-۳) میں تعلیم قرآن کو مقدم کر کے علم کی اہمیت اور اس کی عظمت کا اظہار فرمایا۔

ہر انسان اسلامی زندگی گزارنے اور اس کی تعلیمات کو اپنانے کے لئے قدم قدم اور ہر ہر لحہ میں علم نبوی کا محتاج ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ہر آدمی کے لئے بقدر ضرورت علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا، چنانچہ حدیث ہے: ''طلب العلم فريضة على كل مسلم'' (مسلم کتاب العلم)

یہ بھی ہر آدمی جانتا ہے کہ پہلے کی بہ نسبت آج کے دور میں لوگوں کے افکار و خیالات کی کثرت اور دیگر وسائل کی فروانی کی وجہ سے علوم نبویہ کی طرف توجہ کم ہونے لگی ہے خاص طور سے نابینا لوگ تو اور توجہ کم دیتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ میں ہر ہر فرد کا لحاظ کیا گیا، اس لئے یہ مذہب ہر ایک انسان کے مزاج کے موافق اور معتدل مزاج رکھنے والے انسان کے دل و دماغ تک اثر کرنیوالا ہے، اس مذہب میں تنگی اور عسرت سے دور رہنے اور سہولت و آسانی پیدا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "وما جعل عليكم في الدين من حرج" (سورۂ حج: ۷۸)، دوسری جگہ ارشاد ہے: "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورۂ بقرہ: ۱۸۵)، اور

حدیث شریف میں مذکور ہے: "الدین یسر" (بخاری شریف: ۱۰/۱)۔

شریعت مطہرہ میں ضرورت کی بنیاد پر غیر مباح چیز مباح ہوجاتی ہے، جیسا کہ شدید بھوک کی وجہ سے دوسری حلال چیز نہ ملنے کی صورت میں مردار وغیرہ مباح ہوجانا، اور پیاس کی شدت کی صورت میں خمر وغیرہ کا جائز ہوجانا، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" (قواعد الفقہ/۸۹)۔

تعلیم ایک ایسی ضروری چیز ہے جس کے بغیر جائز، ناجائز اور حلال وحرام کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہے، اس کے بغیر انسان قرآن وحدیث کے مطابق زندگی نہیں گذار سکتا۔

اللہ کی نعمتوں کی قدر کرتے ہوئے، نابینا لوگوں کے پڑھنے، یاد کرنے، بھولنے کی صورت میں مراجعت کرنے پر قدرت حاصل ہونے، براہ راست قرآن کریم کے مطالعہ کرنے کی سہولیات کے لئے اور نابینا لوگوں کی مجبوری کی بناء پر بریل کوڈ میں قرآن کریم تیار کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے، اگرچہ بریل کوڈ میں قرآن عربی رسم الخط اور رسم عثمان میں نہیں ہے۔

واضح رہے کہ بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا یہ بعینہ قرآن بھی نہیں ہے اور قرآن کریم کے حکم میں بھی نہیں ہے، بلکہ یہ موٹے کاغذ پر ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتا ہے، لہذا اس کو چھونے کے لئے مخصوص آداب واحکام نہیں ہیں، اور وضو بھی ضروری نہیں ہے، البتہ قرآن مجید کے کمال احترام کے ثواب حاصل کرنے کے لئے باوضو ہونا مستحسن ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

قرآن کریم کو چھونے کے لئے باوضو ہونا شرط اور ضروری ہے، اس کے علاوہ دیگر رسائل وکتابیں چھونے کے لئے باوضو اور پاک ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح جو چیز بعینہ قرآن کریم نہیں ہے یا قرآن کے حکم میں نہیں ہے، اس کو چھونے کے لئے بھی وضو ہونا ضروری نہیں ہے۔

یہ بھی معلوم ہے کہ موبائل ایک مشنری شئ ہے، جس میں آواز، حروف اور رسم الخط وغیرہ محفوظ کر سکتے ہیں، یہ بعینہ قرآن نہیں ہے اور نہ ہی قرآن کے حکم میں ہے، لہذا اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لئے وضو ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ موبائل کے ڈھانچہ کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بغیر وضو کے چھونے کی گنجائش ہے، جیسا کہ صاحب شرح وقایہ لکھتے ہیں:

"ولا یمس هؤلاء أي الحائض والجنب والنفساء والمحدث مصحفا إلا بغلاف متجاف عنه" (شرح وقایہ ۱/۱۱۷)
(اور یہ لوگ یعنی حائضہ، جنبی اور نفاس والی اور بے وضو قرآن کو نہ چھوئے، مگر ایسے غلاف کے ذریعہ جو اس سے جدا ہو)۔

اور صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں: "وکذا المحدث لا یمس المصحف إلا بغلاف" (ہدایہ ۱/ ۶۴)
(اور اسی طرح محدث (بے وضو) قرآن نہ چھوئے مگر غلاف کے ذریعہ۔

نیز طحطاوی میں مذکور ہے: "وفیما عدا المصحف إنما یحرم من الکتابة لا الحواشي" (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۱۱۴)
(اور قرآن کے علاوہ کی صورت میں کتابت کا حصہ (چھونا) حرام ہے نہ کہ حاشیہ)۔

صاحب البحر الرائق کا ارشاد ہے:

"لا یجوز مس المصحف کله المکتوب وغیره بخلاف غیره، فإنه لا یمنع إلا مس المکتوب" (البحر الرائق ۱/ ۲۰۱)
(پورا قرآن لکھا ہوا وغیرہ کو چھونا جائز نہیں ہے، برخلاف قرآن کے علاوہ کا اس لئے کہ قرآن کے علاوہ میں صرف لکھا ہوا حصہ چھونا منع ہے)۔



غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت

مولانا عبدالشکور قاسمی[1]

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت:

اسلام دشمن قوتوں کی تمام تر سازشوں کے باوجود قرآن شریف کے نہ الفاظ میں تحریف ہوسکی نہ معانی میں تو تحریف کے لئے نئی شکل بغیر متن کے ترجمہ قرآن جیسی تحریک شروع ہوئی، فقہاء امت اس کی طرف متوجہ ہوئے، جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''جواہر الفقہ'' میں تحریر فرمایا کہ صاحب ''نورالایضاح'' نے مذاہب اربعہ سے اس کی سخت ممانعت اور حرمت کو ثابت کیا ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ نے ''التجنیس والمزید'' میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے، اور ہم لوگ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں، کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے، دوسرے یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے، اسی طرح ہدایہ کی شرح ''فتح القدیر'' کے حوالہ سے تحریر فرمایا کہ:

''وفی الکافی: إن اعتاد القراۃ بالفارسیۃ أوأراد أن یکتب مصحفابھایمنع، فإن فعل فی آیۃ أوآیتین لا، فإن کتب القرآن وتفسیر کل حرف وترجمتہ جاز'' (فتح القدیر ۱/ ۲۹۱ زکریا)۔

(کافی میں ہے اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت بنالے یا فارسی میں قرآن لکھنے کا ارادہ کرے تو اس کو روک دیا جائے، البتہ اگر ایک آیت یا دو آیت میں ایسا کرے تو نہ روکا جائے۔ لیکن اگر قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ وتفسیر لکھے تو جائز ہے)۔

اس عبارت سے اس کی تصریح ہوگئی کہ فارسی (یا اور کسی عجمی) زبان میں قرآن شریف کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے، ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں، بلکہ پورا قرآن یا اس کا معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی کے تعلق سے تحریر فرمایا ہے ان سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا تلاوت کی طرح غیر عربی زبان میں قرآن شریف کا لکھنا بھی حرام ہے، تو جواب دیا کہ یہ کل کا فیصلہ ہے، اور حرام ہونے پر اجماع ہے، دوسری جگہ جواب میں یہ بھی کہا ہے، قرآن شریف کو عجمی زبان میں لکھنا ان الفاظ کو جو خود معجزہ ہیں اور ان سے مقابلہ کا چیلنج ہے۔

ایسے لفظوں سے متغیر کرنا ہے جو وارد نہیں ہوتے، بلکہ بسا اوقات ان سے معجزنہ ہونے کا وہم ہونے لگتا ہے، کیونکہ غیر عربی لفظوں میں مضاف الیہ مضاف پر مقدم ہوتا ہے، اور ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جو کلام کی ترتیب کو مختل اور ذہن میں تشویش پیدا کرتی ہیں، اور علماء نے اس کی تصریح کی ہے، ترتیب مدار اعجاز ہے، نیز آگے مزید تحریر فرمایا ہے کہ یہ گمان کہ غیر عربی میں لکھنے کی سہولت ہے کذب محض ہے، واقعہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، اس لئے یہ قابل التفات نہیں، بالفرض اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے، تو یہ الفاظ قرآن کو اس نہج سے جس پر کتابت ہوتی ہے اور اس پر اسلاف اور اخلاف کا اجماع ہے، نکالنے کو جائز نہیں کرسکتے، رہی یہ بات کہ اگر غیر عربی میں لکھ دیا جائے تو اس کا (بے وضو) چھونا اور اٹھانا حرام ہوگا یا نہیں تو جواب میں زیادہ ظاہر یہی ہے، ہاں، کیونکہ اس فعل سے وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہوگا، ورنہ پھر اس کا لکھنا حرام نہ ہوتا۔

امام مالکؒ سے سوال کیا لوگوں نے یہ جو نیا طریقہ نکالا ہے، الگ الگ حروف کرکے لکھنے کا کیا اس طرح لکھا جاسکتا ہے، فرمایا نہیں، سوائے اس پہلے طریقہ امام کے جو مصحف عثمانی کا ہے۔

---

[1] ضلع آکولہ، مہاراشٹر۔

غیر عربی رسم الخط:

قبائل عرب کے سات لغات جن پر قرآن نازل ہوا ہے، اگر چہ وسب وحی اور حق ہیں، لیکن ان کے لفظی اختلاف سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ نہ نکل آوے دوسرے لغات کو موقوف کر دیا جائے۔

باجماع صحابہ لغت قریش پر قرآن کریم کے بہت سے نسخے لکھائے گئے، اور ایک جماعت صحابہ کے سامنے ان کو پڑھ کر سنایا گیا، صحیح کیا گیا، اس کے بعد وہ نسخے مختلف ممالک، عرب وعجم، مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں بھیج دیئے گئے، اور باجماع امت ان کا اتباع ہر چیز میں لازم و ضروری سمجھا گیا (جواہر الفقہ)۔

صحابہ کرام کے بعد محدثین عظام نے جو والذین اتبعوہم باحسان کا صحیح مصداق تھے اجماع صحابہ پر سختی سے عمل پیرا رہے، چنانچہ اشہب فرماتے ہیں: امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز پر تحریر میں لاسکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے، فرمایا نہیں، بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہئے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے، واؤ یا الف (زائد) میں (جو کہ تلفظ میں نہیں آتے محض لکھنے میں آتے ہیں)۔

امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں: جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہؓ نے لکھے ہیں ان کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے، کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں۔

صاحب نور الایضاح نے اپنے ایک رسالہ میں اس میں مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا کہ قرآن کی کتابت میں صحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے، غیر عربی عبارت میں اس کا لکھنا حرام ہے، اور اسی طرح غیر عربی خط میں اس کی کتابت ممنوع ونا جائز ہے۔

غرض یہ کہ قرآن کا عربی رسم خط اجماعی مسئلہ ہے، اور خیر القرون سے آج تک تواتر کے ساتھ پوری امت اس پر عمل پیرا ہے، نیز اس کے ساتھ ائمہ اربعہ کا متفق علیہ مسلک ہے کہ نماز بغیر عربی زبان کے دوسری زبان میں فاسد ہو جاتی ہے تو جس طرح نماز اور دعاؤں کی حد تک عربی زبان میں قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہے اس سے زائد قرآن شریف سیکھنے کی شریعت اس درجہ تاکید ہی نہیں کرتی کہ اجماعی مسئلہ میں تغیر پیدا کیا جائے۔

مصارف کے کمی کا لحاظ اور بے حرمتی کا اندیشہ تو دور صحابہؓ میں یہ مشکلات بہت زیادہ تھیں، اس لئے کہ پہلے تو مسلمانوں کی تعداد کم ان میں بھی پڑھے لکھے حضرات کی تعداد بہت ہی کم، لیکن ان سب مشکلات کے باوجود صحابہ کرامؓ نے غیر عثمانی کے مطابق ہر کچے اور پکے مکان میں پہنچ گیا، اور اس طرح کے مزعومہ خیالات اور اعذار ہنوز موضوع گفتگو بنے ہوتے ہیں، جن کے دور کرنے کے لئے اجماعی مسئلہ میں گنجائش کا تصور بھی محل نظر ہے۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

قرآن شریف کی کتابت کے لئے نہ صرف عربی رسم خط ضروری ہے، بلکہ وہ رسم خط ہی ضروری ہے اور اجماعی مسئلہ جو مصحف عثمانی کے مطابق ہو، اس لئے بریل کوڈ کی شکل سے بھی رسم خط عثمانی کی مخالفت لازم آتی ہے، اس لئے اس میں قرآن شریف تیار کرنا درست نہیں، نابینا افراد مجبوری کی صورت میں جتنا قرآن شریف یاد ہو اسی کی بار بار تلاوت کرتے رہے اور اسی پر اکتفا کرتے رہیں اور عربی میں سیکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔

موبائل پر قرآن مجید:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لا یمسہ الا المطہرون" (سورۂ واقعہ:۷۹)، آیت کا مطلب مفسرین نے بیان کیا کہ قرآن کو چھونا بغیر طہارت کے جائز

نہیں، اور طہارت کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ ظاہری نجاست سے بھی ہاتھ پاک ہو اور بے وضو بھی نہ ہو، اور حدث اکبر، یعنی جنابت بھی نہ ہو، قرطبی نے اس تفسیر کو اظہر فرمایا، اور تفسیر مظہری میں بھی اسی کی ترجیح پر زور دیا ہے۔

اسی طرح طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا یمس القرآن الا طاھر''

امام مالکؒ نے مؤطا میں حضور ﷺ کا مکتوب نقل فرمایا جس میں یہ بھی ہے: ''لا یمس القرآن الا طاھر''۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی بہن کو قرآن شریف پڑھتے ہوئے پایا تو اوراق قرآن کو دیکھنا چاہا ان کی بہن نے یہی آیت: "لا یمسه الا المطھرون" (سورۂ واقعہ:۷۹) پڑھ کر وہ اوراق ان کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر کیا اور کہا کہ اس کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا، فاروق اعظمؓ نے غسل کیا، پھر یہ اوراق پڑھے۔

آیت حدیث اور حضرت عمرؓ کے عمل سے مصحف قرآن کو چھونے کی ممانعت ہے، کیسٹ اور موبائل کے اندر جو آواز ہے وہ نہ صرف آواز ہی نہیں، بلکہ آواز کا عکس ہے۔

حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ مفتی اول دار العلوم دیوبند اور حضرت تھانویؒ نے اس کو چھونے کا جواز لکھا ہے، اور بقول مفتی سلمان صاحب اگر موبائل کے اسکرین پر آیات نظر آ رہی ہوں تو اس کو چھونا جائز نہ ہوگا۔

☆☆☆

غیر عربی رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت

مولانا محمد فاروق دربھنگوی[1]

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن مقدس کی جملہ ترتیب جس طرح توقیفی ہے، جس میں سر موترمیم وتبدیل کی کوئی گنجائش نہیں، اسی طرح رسم عثمانی کے مطابق اس کی تحریر بھی واجب وضروری ہے، حتی کہ جو"واؤ"،"الف"وغیرہ حروف زائد ہیں لکھنے میں آتے ہیں، پڑھنے میں نہیں آتے، مثلاً"اولوا"جیسے کلمہ میں، ان کو بھی رسم عثمانی کے مطابق لکھنا ضروری ہے، اور یہ حضرات ائمہ اربعہؒ کا اجماعی مسئلہ ہے، چنانچہ علامہ سیوطیؒ اتقان میں تحریر کرتے ہیں:

"سئل مالك هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا، إلا على الكتبة الأولى، رواه الداني في المقنع، ثم قال: لا مخالف له من علماء الأمة" (الاتقان للسيوطی)۔

یعنی حضرت امام مالک سے سوال کیا گیا کہ قرآن مقدس ان حروف ہجائیہ کے مطابق لکھا جاسکتا ہے، جیسے لوگوں نے ایجاد کرلیا ہے، تو آپ نے فرمایا نہیں، مگر اسی طرز تحریر کے مطابق لکھنا ہوگا جس پر مصحف عثمانی ہے۔

علامہ فرنگی محلی"آکام النفائس"میں بعض ائمہ قرأت سے نقل کرتے ہیں کہ اس قول کی نسبت حضرت امام مالکؒ کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ آپ سے اس کا سوال کیا گیا ہے، ورنہ یہی ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے، جیسا کہ نقل کرتے ہیں:

"قال بعض أئمة القراءة: ونسبته إلى الإمام مالك، لأنه مسئول عن المسألة، وإلا فهو مذهب الائمة الأربعه، وقال ابوعمرو: لامخالف له في ذلك من علماء الأمة" (مجموعة رسائل الكنوی ۴/ ۵۳، اكام النفائس في اداء الاذكار بلسان الفارس)

اسی لئے علامہ سیوطیؒ نے اس رسم کے خلاف کرنے پر حضرت امام احمد بن حنبل سے حرمت کا قول نقل کیا ہے چنانچہ نقل فرماتے ہیں:

"وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة مصحف الإمام في واؤ أو ياء، أو ألف أو غير ذلك" (اتقان ۲/ ۲۲۹)۔

مذکورہ اقتباسات سے معلوم ہوگیا کہ جب قرآن مقدس کو عربی زبان میں مصحف عثمانی کے خلاف لکھنا جائز نہیں ہے، تو بھلا انگریزی، ہندی، گجراتی وغیرہ غیر عربی زبان میں لکھنا کیسے جائز ہوگا؟ جبکہ قرآن مقدس کے بعض حروف ایسے بھی ہیں جو عربی کے ساتھ خاص ہیں، عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں نہیں ہیں، جیسے ثاء، حاء، ذال، طاء، ظاء، ض، وغیرہ اور ان الفاظ وحروف کی تبدیلی سے معنی کی تبدیلی ایک امر لابدی اور لازمی شئ ہے، جس سے قرآن مقدس کی تحریف وتغیر لازم آتی ہے، اور اس طرح دیدہ ودانستہ تحریف کرنے والا سخت ترین وعید کا حقدار ہوتا ہے، تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ قرآن مقدس کو دوسری کسی ایسی زبان میں منتقل کرنے کی اجازت دے دی جائے جس میں یہ خصوصیت فوت ہوکر وبال انسان کا ذریعہ بنے، چنانچہ علامہ ظفر عثمانی فرماتے ہیں:

"قلت: ولا يمكن رعاية ذلك في خط الهنود ولا في الخط الانكليزي فغاية ما يمكن فيها أن يكتب الحروف المتلفظ بها فقط، ولا يمكن رعاية الزوائد أصلا، وأيضا فبعض ما يتلفظ به من الحروف في العربي لاتوجد في هذين اللسانين أصلا، مثل الضاد، والقاف، ونحوهما، فيعبر عنها بحروف مشترك بينها وبين غيرها ولا يخفى ما فيه من لزوم التحريف في القرآن" (امداد الاحکام ۱/ ۲۴۰)۔

نیز قرآن مقدس ایک ایسی موجز کتاب ہے جس کی نظیر ومثیل پیش کئے جانے کا چیلنج تا قیامت باقی ہے، اور امت کے ہر طبقہ سے متعلق ہے،

---

[1] جامعہ دار الاحسان، مکی مسجد، بارڈولی، سورت، گجرات۔

اور اس کا اعجاز قاضی ابوبکر عربی کے مطابق نظم وترکیب کے ایسے مرتبہ فصاحت وبلاغت پر فائز ہونے کی وجہ سے ہے جو طاقت بشریہ سے خارج، اور اہل عرب کے اسلوب خطابات کے مبائن ہے، اور ظاہری بات ہے کہ یہ اعجاز اسی وقت بخوبی ظاہر ہوگا جبکہ وہ اپنے حقیقی رسم الخط میں محفوظ ہو، لہذا اس کی دوسری زبان میں اس کی تبدیلی کسی بھی طرح درست نہیں۔

''قال القاضي أبوبكر: وجه إعجازه ما فيه من النظم والتاليف والترصيف، وأنه خارج عن جميع وجوه النظم المعتاد في كلام العرب ومباين لأساليب خطاباتهم، ولهذا لم يمكنهم معارضته'' (اتقان ۲/۲۲۱)۔

اسی طرح دوسری زبان میں کتابت کرنے سے فساد تجوید بھی لازم آئے گا، اس لئے کہ قرآن مقدس کی قراءت عام کتابوں کی قراءت کے مساوی نہیں ہے، بلکہ قرآنی اصول وضوابط کے مطابق مخارج سے ادائیگی صفات کی رعایت، وقف کی معرفت وغیرہ وغیرہ قواعد کی رعایت کے ساتھ تلاوت ضروری ہے، جیسا کہ علامہ جزریؒ فرماتے ہیں:

''والأخذ بالتجويد حتم لازم من لم يجود القرآن آثم''

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان امور کی رعایت اس وقت ممکن نہیں ہوگی، جبکہ غیر عربی زبان میں قرآن مقدس کی کتابت واقع ہوگی، بلکہ بہت سی غلطیوں کا ارتکاب، جابجا معانی کا انقلاب، اور فرمان نبوی ﷺ ''رب تالی للقرآن والقرآن یلعنہ'' کا مصداق ہوگا، لہذا قرآن مقدس کو کسی دوسری زبان میں نقل کرنے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی (فتاوی رحیمیہ ۳/۱۶۱ مبوب جدید)۔

حاصل کلام:

حاصل یہ ہے کہ دوسری زبان میں قرآن مقدس کی کتابت کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں جن میں سے قدر قلیل کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے:

الف- رسم عثمانی جو ایک حتمی اور ضروری شئی ہے اس کی تفویت کرنا

ب- بعض حروف جو عربیت کے ساتھ خاص ہیں، ان کی عدم ادائیگی سے قرآن مقدس میں لفظی ومعنوی تحریف وتغیر کا لازم آنا۔

ج- اعجاز قرآنی جو نظم وتراکیب کے ساتھ خاص ہے اس کا ختم کرنا۔

د- قواعد تجوید جن کی رعایت بوقت تلاوت ضروری ہے ان کا اتلاف کرنا۔

ھ- مختلف قراءت متواترہ جو اسی رسم عثمانی میں وارد ہوئی ہیں، ان کا ضیاع۔

و- حضرات ائمہ اربعہؒ کی نہیں، بلکہ علماء امت کے اجماع کی مخالفت۔

ز- امام احمد بن حنبلؒ کے قول کے مطابق حرمت کا ارتکاب۔

ح- "إنا أنزلناه قرآنا عربيا" (سورۂ یوسف: ۲) سے ظاہراً بے اعتنائی، وغیرہ بہت سے امور غیر مشروعہ کے لزوم کی وجہ سے اس طرح کی کتابت ناجائز وحرام ہوگی۔

بریل کوڈ میں قرآن کا حکم:

بریل کوڈ (Braille Code) یعنی نابینا کا نظام تحریر وطباعت میں قرآن مقدس کی کتابت بھی جائز نہیں، اس لئے کہ جس طرح غیر عربی زبان میں قرآن مقدس کی کتابت کرنے میں خرابیاں اور مفاسد مندرج ہوئے وہ سارے مفاسد یہاں بھی موجود ہیں، اس لئے نابیناؤں کے لئے یہی ضروری ہے کہ قرآن مقدس کی بقدر ضرورت تعلیم بالمشافہ حاصل کریں، اور اس کی محافظت کے لئے باہم دور کریں، اور نمازوں میں اہتمام کے ساتھ پڑھیں اور اگر صبر وہمت ساتھ دے تو مکمل حفظ قرآن سے بھی مشرف ہوں، جیسا کہ زمانہ میں اس کی بہتیرے مثالیں موجود ہیں، رہی بات بریل کوڈ میں لکھے ہوئے قرآن پاک چھونے کی، تو اس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ:

نقوش میں جب تک پڑھے جانے کی صلاحیت نہ ہو، وہ حروف مکتوبہ کے حکم میں نہیں ہوں گے، اس لئے ایسے نقوش کو محدث وغیرہ کے لئے مس کرنا جائز ہوگا، البتہ اگر وہ نقوش پڑھے جانے لگیں تو اس وقت دلالت وضعیہ غیر لفظیہ کی وجہ سے ان کا حکم حروف مکتوبہ ہوگا (امداد الفتاوی ۱/ ۱۴۵)۔

لہذا جب بریل کوڈ میں قرآن مقدس لکھ دیا گیا اور اس کو بعض لوگ مثلاً نابینا پڑھتے ہیں تو وہ بھی دلالت وضعیہ غیر لفظیہ کی وجہ سے حروف مکتوبہ کے حکم میں ہوں گے، اور اس کو محدث وجنبی کے لئے مس کرنا جائز نہ ہوگا، چنانچہ فارسی زبان میں لکھے ہوئے قرآن کو مس کرنے کے سلسلے میں علامہ علاء الدین فرماتے ہیں:

''ویمنع مسه ولو مکتوبا بالفارسیة فی الأصح'' (درمختار مع الشامی ۱/ ۴۸۸)۔

موبائل پر قرآن مجید:

جب موبائل کی اسکرین پر قرآن مقدس اپنے پڑھے جانے والے الفاظ وحروف کے ساتھ ظاہر ہو تو وہ بھی عام قرآن مقدس کے حکم میں ہے، البتہ یہ موبائل کے ڈھانچے اور غلاف سے مستور ہے، اس لئے بلا وضو اس کو مس کرنے نہ کرنے کا مسئلہ قابل تحقیق ہے، لہذا اس سلسلہ میں ہمیں عام قرآن مقدس کو غلاف وڈھانچہ کے ساتھ بلا وضو مس کرنے کے ضابطہ شرعیہ پر نظر کرنا ہوگی، تاکہ قرآنی موبائل تک رسائی ممکن ہو۔

تحقیق ضابطہ:

چنانچہ حائضہ، نفساء، جنبی اور محدث کے لئے قرآن مقدس کو چھونے کا ضابطہ شرعیہ یہ ہے کہ اگر قرآن مقدس کسی غلاف منفصل کے بغیر ہے تو اس کو بغیر وضو اور طہارت شرعیہ کے یہ لوگ مس نہیں کر سکتے، اور اگر غلاف منفصل کے ساتھ ہے تو ان لوگوں کے لئے طہارت شرعیہ کے بغیر مس کرنا جائز ہے۔

رہی بات یہ کہ غلاف منفصل سے کیا مراد ہے؟ تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ ماس اور محسوس کے مابین ایسا امر ثالث ہو جو ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ سلے یا چپکے ہونے کی وجہ سے تابع نہ ہو، جیسے کوئی انسان اپنی آستین سے قرآن کو مس کرے تو جائز نہیں، اس لئے کہ یہ ماس پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کے تابع ہے، ماس اور محسوس کے مابین امر ثالث نہیں ہے، اسی طرح اگر قرآن پاک کو اس کی جلد کے ساتھ مس کرے تو یہ بھی جائز نہیں، اس لئے کہ وہ جلد قرآن پاک سے سلی ہونے کی وجہ سے اسی کے تابع ہے، امر ثالث نہیں ہے، البتہ کوئی ہاتھ میں رومال لے کر مس کرے تو جائز ہے، اس لئے کہ یہ ایک ایسا امر ثالث ہے جو نہ تو ماس کے تابع ہے اور نہ ممسوس کے تابع ہے، اسی طرح اگر قرآن مقدس کسی تھیلا یا صندوق میں رکھا ہو تو اس کو بھی مس کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ ایسا امر ثالث ہے جو نہ تو ممسوس کے تابع ہے اور نہ ماس کے، بلکہ دونوں سے علاحدہ تیسری چیز ہے۔

حاصل یہ کہ غلاف اگر قرآن مقدس سے اس طرح سلا یا چپکا نہ ہو کہ اس کے تابع ہو اور قرآن مقدس کی بیع میں بلا ذکر از خود داخل ہو جاتا ہو تو اس کے ساتھ حائضہ جنبی نفسا اور محدث کے لئے چھونا جائز ہے، ورنہ نہیں، جیسا کہ مذکورہ ضابطہ کی تحقیق حسب ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

چنانچہ ''شرح وقایہ'' اور اس کے حاشیہ میں ہے: ''ولا یمس ہولاء الحائض والجنب والنفساء والمحدث مصحفا الابغلاف متجاف، ای منفصل عنه، وفی الحاشیة بأن یکون شیاثالثابین الماس والممسوس، ولا یکون تبعا ولأحدهما کالکم فی حق الناس، والجلد فی حق الممسوس'' (شرح قایہ للصدر الشرعیہ)۔

اور ''درمختار'' اور اس کے حاشیہ میں شامی میں ہے:

''إلا بغلاف متجاف غیر مشرز، أی غیر مخیط به، وهو تسیر للمتجاف، فالمراد بالغلاف، ما کان منفصلا کالخریطة، وهی الکیس ونحوها، لأن المتصل بالمصحف منه، حتی یدخل فی بیعه بلاذکر'' (درمختار مع الشامی زکریا ۱/ ۳۱۵)۔

قرآنی موبائل کا ضابطہ پر انطباق:

لہذا آج کل موبائل میں جو قرآن مجید محفوظ ہے، جب تک اسکرین پر نہ آئے اس کو بلا وضو چھونے میں کوئی کلام نہیں، تاہم جب اسکرین پر آجائے تو اس کو بلا وضو چھونے اور ہاتھ لگانے کے لئے ضابطہ مذکورہ کی رعایت ضروری ہوگی، کہ اگر اس موبائل کا کوئی خارجی غلاف ہو جس میں وہ

رکھا، اور اس سے نکالا جاتا ہو، اور موبائل سے حقیقۃً یا حکماً سلا ہوا نہ ہو، بلکہ موبائل سے بالکل علاحدہ رہ سکتا ہو، تو اس غلاف کے ساتھ بلا وضو چھونا جائز ہے، کیونکہ اس کی حیثیت امر ثالث کی ہے، تابع ہونے کی نہیں۔

لیکن موبائل کا وہ غلاف اور ڈھانچہ جس کی حیثیت جسم اور باڈی کی ہے وہ چونکہ قرآنی اسکرین کے ساتھ بند ہے اور سلے ہوئے کے حکم میں ہے، اس لئے وہ قرآنی موبائل کے تابع ہے، اس لئے اس غلاف کے ساتھ بلا وضو مس کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح آج کل رائج موبائل پر جلد کے مانند جو دوورقی غلاف ہوتا ہے اس کے اوپر سے بھی چھونا جائز نہیں، کیونکہ اس کی حیثیت قرآن مقدس کی سلی ہوئی جلد پر کاغذ چپکانے کی ہے، نیز یہ غلاف اس کے ساتھ بندھے ہونے کی وجہ سے اس کے تابع بھی ہے،

''وفي تبيين الحقائق: وغلافه: ما يكون منفصلا عنه دون ما يكون متصلا به في الصحيح'' (تبیین ۱/ ۱۶۵)، ''وفي المحيط: الغلاف الجلد الذي عليه المتصل عند بعض المشائخ، وعن بعضهم المنفصل كالخريطة ونحوها؛ لأن المتصل بالمصحف من المصحف'' (المحیط البرہانی ۱/ ۱۸۰)۔

دفع مظنہ:

رہا یہ مظنہ کہ جب قرآن مقدس اسکرین پر ہے، اور اسکرین کا حصہ ایک بکس کے غلاف میں ہے، تو پورے غلاف کی حیثیت صندوق کی ہوگی، اور قرآن مقدس اگر صندوق میں ہو تو ہر کوئی اسے اٹھا سکتا ہے اس کے لئے وضو ضروری نہیں؟

تو اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ صندوق محض محل حفاظت ہوتا ہے، جہاں سے شئ محترم کو استعمال کے لئے نکالا جاتا ہے اور پھر اس میں رکھ دیا جاتا ہے، جبکہ اسکرین جس پر قرآن مقدس موجود ہے، کبھی بھی اپنے غلاف سے اس طرح علاحدہ کر کے نہ پڑھا جاتا ہے اور نہ اس کو جو چاہے جب چاہے نکال سکتا ہے، یہی اس کے صندوق نہ ہونے کے لئے کافی ہے۔

دوسرا تحقیقی جواب یہ ہے کہ قرآن مقدس کو بلا وضو چھونے کے لئے حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے ''بغلاف متجاف غير مشرز'' (غیر بندھا ہوا) کی قید لگائی ہے، اور ''متجاف'' کہتے ہیں کہ وہ غلاف جو قرآن سے علاحدہ ہو، اس کے ساتھ سلا ہوا نہ ہو، جیسا کہ ''متجاف'' کی تفسیر ''غیر مخیط بہ'' اس کی واضح دلیل ہے، اور علامہ شامی کی تفسیر ''المراد بالغلاف ما كان منفصلا كالخريطة''، اور حاشیہ شرح وقایہ کی عبارت ''بأن يكون شيئا ثالثا بين الماس والممسوس''، اس مظنہ کے دفعیہ کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ جو غلاف موبائل پر لگا ہوتا ہے وہ اسکرین قرآنی کے حصہ سے اس طرح فٹ ہوتا ہے جو سلے ہوئے کے درجہ میں ہے، اسی لئے موبائل خریدتے وقت اس پورے مجموعہ مرکب کو موبائل کہا جاتا ہے، اور از خود اس کی بیع میں داخل ہو جاتا ہے یا یہی اس کے جز اور تابعیت کی دلیل ہے۔

☆☆☆

عہد جدید میں قرآن مجید کے متن و ترجمہ کی اشاعت

مولانا محمد نثار عالم ندوی [1]

قرآن کریم کا ترجمہ کسی بھی زبان میں جو دشوار کن امر ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، کلام الٰہی کی ترجمانی الفاظ انسانی میں سمانا مشکل ہے، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، اس لئے علماء امت ہمیشہ اس کار خیر سے کتراتے رہے ہیں، پہلی مرتبہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کا غیر عربی فارسی ترجمہ کر کے امت کو جواز کا پیغام دیا اور ان کے بعد ان کے فرزند شاہ اسحاقؒ و شاہ عبد اللہؒ نے پہلی مرتبہ اردو میں ترجمہ کر کے اس جواز کو تقویت دی ان حضرات کے بعد اور بعد کے حضرات کے ترجمہ کا طریقہ تھا کہ متن کے نیچے عربی عبارت کے سطر کے نیچے اس کا ترجمہ ہوتا تھا اور یہی تعامل امت میں آج تک چلا آرہا ہے اور یہ سب ترجمہ و تفسیر قرآن کے پیغام کو عام کرنے کے پیش نظر ہے۔

دور حاضر میں قرآن کا بغیر عربی متن کے صرف ترجمہ کا نشر و اشاعت کرنا یہ ایک دعوتی ضرورت کے تحت ہو رہا ہے اور قرآنی پیغام کو عام و سہل بنا کر تمام برادران امت تک پہنچانے کی سعی ہے جس میں قرآن کی حرمت کا پہلو بھی شامل ہے، لہذا جائز ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں ان دلائل کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔

۱- اگر ایک شخص عربی پڑھنے پر قادر نہیں ہے وہ نماز میں تلاوت قرآن کے بجائے فارسی ترجمہ پڑھ لیتا ہے تو یہ امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے، جبکہ صاحبین اس کا انکار کرتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے تین دلائل ذکر کئے جاتے ہیں، "فاقرؤا ما تيسر من القرآن" (سورۂ مزمل: ۲۰) "وإنه لفي زبر الأولين" (سورۂ شعراء: ۱۹۶) اور ایک عقلی دلیل کہ حالت عجز میں ایماء ہی رکوع کا قائم مقام بن جاتا ہے پر قیاس کرتے ہوئے جائز کا حکم لگاتے ہیں۔

پس امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق جب فارسی ترجمہ آیت قرآن کے تلاوت کا قائم مقام بن سکتا ہے تو معانی قرآن کی اشاعت میں کیا حرج ہوسکتا ہے؟

"فإن افتتح الصلاة بالفارسية أو قرأفيها بالفارسية أو ذبح وسمي بالفارسية وهو يحسن العربية أجزاه عند أبي حنيفة وقالا: لا يجزيه إلا في الذبيحة، وإن لم يحسن العربية اجزاه" (شرح فتح القدير/ ۲۹۰)۔

۲- ہدایہ جلد اربعہ میں کتاب الکراہیۃ میں مسائل متفرقہ کے ضمن میں مسئلہ مذکور ہے کہ قرآن میں اعراب و نقطہ اور ہر دس آیت پر ایک علامت لگانا مکروہ ہے، نیز فقہاء نے اس مسئلہ میں صراحت کی ہے کہ یہ عرب والوں کے لئے ہے، رہا مسئلہ اہل عجم کا تو یہی چیز ان کے لئے حسن ہے۔

"ويكره التعشير والنقط في المصحف لقول ابن مسعود جردوا القرآن ويروى جردوا المصحف وفي التعشير والنقط ترك التجريد، ولأن التعشير يخل بحفظ الآي والنقط بحفظ الإعراب اتكالا عليه. فيكره قالوا في زماننا لابد للعجم من دلالة فترك ذلك اخلال بالحفظ وهجران القرآن. فيكون حسنا" (بداية كتاب الكراهية: ۴۵۸)

(قرآن میں تعشیر و نقطہ مکروہ ہے، دلیل کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن کو خالص رکھو، ایک روایت ہے کہ مصحف کو خالص رکھو، تعشیر اور نقطہ لگانے میں خالص رکھنے کے حکم کو چھوڑنا لازم آتا ہے، نیز وہ آیات کو حفظ کرنے میں بھی مخل ہے، نقطہ میں ضیاع اعراب کا اندیشہ ہے اس اعتماد کر لئے جانے کی وجہ سے، پس مکروہ ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں مذکورہ چیزیں عجم والوں کے لئے ضروری ہے، ان چیزوں کا چھوڑنا حفظ میں مخل ہوگا اور پھر ترک قرآن لازم آئے گا، پس یہ چیز حسن ہوگی۔

مسئلہ مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعشیر و نقطہ و اعراب اہل عرب کے لئے مکروہ ہے کہ وہ مخل حفظ ہے، لیکن بالکل یہی چیز اہل عجم کے لئے حسن ہو رہی ہے

---

[1] الجامعۃ الکوثریہ، کیرالا۔

اور مقوی حفظ ہورہی ہے۔

چنانچہ مسئلہ بالا پر قیاس کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بغیر متن کے ترجمہ عام مسلمانوں کے حق میں مکروہ ہو کہ وہ مخل حفظ اور ضیاع قرآن کا سبب ہوگا، لیکن یہی چیز غیر مسلمین برادران کو بغرض دعوت دینا نہ صرف جائز، بلکہ حسن ہوگا۔

۳- تیسری دلیل ہے کہ علماء امت کسی بھی زبان میں مطلقا ترجمہ کے عدم جواز کے قائل تھے اور شاہ صاحبؒ سے پہلے کا کوئی ترجمہ بھی شاید موجود نہیں ہے، لیکن بعد کے دور میں شاہ صاحب نے خود اس کا ترجمہ کر کے جواز کا فتوی دیا اور علماء امت نے زمان ومکان کی تبدیلی کی وجہ سے اس کو جائز سمجھا، پس اس کو ہی آج کی ضرورت سمجھ کر زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ جواز کا فتوی دینا بہتر ہے۔

نیز جب ترجمہ قرآن جائز ہے تو صرف ترجمہ قرآن کی اشاعت کیوں کر جائز ہوگی، جبکہ اس کے خلاف کوئی نص بھی موجود نہیں ہے۔

۴- "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" (سورۂ حجر:۹) آیت کریمہ کے مصداق میں حفاظت قرآن کا وعدہ خداوندی تا قیامت ہے، اور الحمد للہ عصر حاضر میں حفاظت قرآن کے لئے پہلے کے بنسبت ان گنت طریقہ موجود ہیں، فی زمانہ ضیاع قرآن کا اندیشہ بعید ہے، پس موہوم خیال کی بنیاد پر عدم جواز کا قول بعید معلوم ہوتا ہے۔

۵- بدون متن ترجمہ کا ایک اہم مقصد بیان کیا جاتا ہے وہ دعوتی نقطہ نظر سے ہے کہ غیر مسلمین کو متن قرآن دینے کی شکل میں قرآن کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے، پس بے حرمتی سے قرآن کی حفاظت کرنا اور قرآن کو ان تک پہنچانا یہ دونوں ہی باتیں حفاظت قرآن میں شامل ہے، قرآن کے معانی کا تعارف بھی حفاظت قرآن کا مصداق قرار پائے گا۔

۶- کتب سابقہ تورات، زبور، انجیل کے تحریفات کے وجوہات میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے تراجم پر اعتماد کرلیا اور متن کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اس وجہ کا انکار نہیں، لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے علماء کے تشریحی اقوال متن میں ضم ہوگئے، جیسا کہ قرین قیاس بھی ہے، پس یہ کہنا کہ بدون متن ترجمہ تشبہ بالیہود والنصاری ہے، ٹھیک نہیں لگتا ہے اس کے برعکس اگر دوسری توجیہ کو لے لیں تو ترجمہ وتفسیر بھی تشبہ بالیہود والنصاری کا مصداق بن سکتا ہے۔

۷- حضرات شیخینؓ کے زمانہ میں اختلاف قراءت کی بنیاد پر ضیاع قرآن کے اندیشہ کی بنا پر جمع قرآن کا کام ہوا ہے نہ کہ معانی کے اختلاف کی بنا پر پس اختلاف قراءت کا عام ہونا ضیاع کا سبب تو بن سکتا ہے، لیکن ترجمہ قرآن کی اشاعت ضیاع کا سبب بننا بعید معلوم ہوتا ہے۔

۸- "الضرورات تبیح المحظورات" (قواعد الفقہ /ص ۸۹) فقہ کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے اور دعوت وتبلیغ بھی نہ صرف ایک ضرورت ہے، بلکہ فریضہ ہے اس کی بنیاد پر بھی اس کے جواز کا امکان نظر آتا ہے، مذکورہ بالا دلائل کی بنیاد پر احقر کی رائے میں بدون متن قرآن کی اشاعت کا مسئلہ جواز کے دائرہ میں نظر آتا ہے۔

غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت:

قرآن اللہ کی آخری کتاب ہدایت ہے اور وہ کلام الہی ہے اس کے اندر جو تاثیر ہے، آیت میں بیان ہے:

"لو انزلنا هٰذا القرآن علی جبل لرأیته خاشعا متصدعا من خشیة الله" (سورۂ حشر:۲۱)

لیکن اللہ نے انسانوں کی آسانی کے لئے اس تاثیر کو ختم نہیں کیا ہے، بلکہ چھپا دیا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے وقت اس کے اثرات نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر، بلکہ اونٹنی تک پر پڑتے تھے، لیکن فضل خداوندی یہی ہے کہ اس قدر موثر کلام انسان اپنی زبان سے ادا کر لیتا ہے اور اس کو دل میں سمو لیتا ہے، ورنہ کہاں یہ پر اثر کلام اور کہاں یہ کمزور انسان، لیکن اللہ نے اس زبان کو اس قدر آسان بنا دیا ہے کہ دوسری ہر زبان کے مقابلے میں اس کا پڑھنا مشاہدہ سے آسان نظر آتا ہے اور یہ "ولقد یسرنا القرآن" (سورۂ قمر:۳۲) "وخیر کم من تعلم القرآن وعلمه"، حدیث کا مصداق ہے اسی وجہ سے ہر زمانہ میں کیا عرب وعجم حبشی وغیر عربی پڑھنے پڑھانے میں ماہر ہی نہیں، بلکہ اس فن کے امام ہی پیدا ہوتے آرہے ہیں، ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں نے قرآن کے لئے اپنی لغت وزبان بھی بدل لی، لیکن ایسا شاید کبھی نہیں ہوا ہے کہ قرآن کو اپنی لغت کے مطابق بدل لیا ہو اور یہی امت میں آج تک تعامل چلا آرہا ہے، لیکن

بعد کے دور میں خصوصاً آج کل ایک نئی بدعت ایجاد ہوتی جارہی ہے کہ لوگ اپنی اپنی زبان میں قرآن کی عربی عبارت کوڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں صرف اور صرف اپنی آسانی کے لئے ہم دیکھنا ہے کہ کیا یہ مسئلہ قرآن حدیث کی روشنی میں صحیح بھی ہے یا نہیں، تو جواب یہ ہے کہ:

قرآن کو کسی دوسری زبان کی عبارت میں اس طرح سے لکھنا کہ عبارت قرآن کی ہو، لیکن رسم الخط عجمی ہو یہ ناجائز ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے کہ عربی الفاظ کے بہت سے الفاظ عجمی زبان میں اس کو صحیح طور پر ادا ہو ہی نہیں سکتا ہے، پھر یہ طریقہ حفاظت قرآن کے بھی مخل ہوگا لوگوں کا اس پر اعتماد کر لینے کی بناپر، نیز امت کا رسم مصحف عثمانی جو کہ من جانب اللہ توقیفی ہے اس پر عمل چلا آرہا ہے کسی نے اس کی مخالفت آج تک نہیں کی ہے، اس کے سلسلے میں یہ جوبات کہی جاتی ہے کہ سہولت ہوگی امت کے لئے پڑھنا آسان ہوگا، تجربہ بھی اس کے خلاف ہے۔

یہ چند وجوہات ہیں جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ حفاظت قرآن کا اولین مصداق اس کے الفاظ ہیں، پس اس کے خلاف کرنا ناجائز ہوگا اس پر قدغن لگانا از حد ضروری ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: مغنی مع الشرح الکبیر ۱/ ۸۳۰، مناہل العرفان فی علوم القرآن، جواہر الفقہ ۱/ ۸۵، اتقان ۲/ ۱۶۷)۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت کرنا نابیناؤں کی تعلیمی سہولت کے لئے نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہوگا اور مسئلہ ھذا کے لئے ان دلائل سے سہارا لیا جاسکتا ہے:

۱- رسم مصحف عثمانی کا لزوم بغرض حفاظت ہے اور اس کا ترک کرنا مخل حفاظت قرآن ہے، جیسا کہ مفتی شفیع صاحبؒ نے علامہ حسن شرنبلالی کی کتاب "النفحة القدسية فی أحكام قراءة القرآن وكتابته بالفارسية" کے حوالے سے ائمہ اربعہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قرآن کو فارسی میں لکھنا اجماع کی وجہ سے ممنوع ہے، کیونکہ وہ حفاظت قرآن میں مخل ہے"، لہذا جس علت کی بنیاد پر ترک رسم مصحف عثمانی ممنوع قرار پاتا ہے وہ علت بریل کوڈ کی شکل میں لکھنے میں موجود نہیں ہے، پس جائز ہونا چاہئے۔

۲- بریل کوڈ کی شکل کچھ مخصوص افراد کے لئے اس سے استفادہ انگلیوں کے پوروں کی لمس سے ان کے لئے جتنا آسان ہے دوسرے احباب کے لئے اتنا ہی مشکل و دشوار ہوتا ہے، من جانب اللہ بعض امور میں ان کی ذہانت وفطانت دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ بھی ہے، چنانچہ بریل کوڈ کا تحفہ دے کر ان کو بھی محافظ قرآن کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے، جبکہ بریل کوڈ کا نسخہ دوسرے عام حضرات کے لئے سیکھنا پڑھنا اصل قرآن کو چھوڑنا غفلت برتنا اور بریل کوڈ پر اعتماد کرنا بعید چیز نظر آتی ہے۔ پس بریل کوڈ سے اصل قرآن میں کوئی کوتاہی کا سبب نہیں ہوگا۔

۳- شریعت اسلامیہ میں نابینا حضرات کے لئے کچھ مخصوص احکام بھی ہیں، لہذا ان کو عذر شرعی کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ فقہ شافعی کی کتاب "اللباب" میں مذکور ہے، "الأعمى كالبصير في جميع الأحكام إلا في سبعة مسائل لا جهاد عليه وكره إمامته الخ" (اللباب فی الفقہ الشافعی ۱/ ۶۳۶) (نابینا، بینا کے مانند ہے تمام احکام میں سوائے سات احکام کے مثلاً ان پر جہاد نہیں ہے ان کی امامت مکروہ ہے)۔

اسی طرح فقہ حنفی میں بھی ہے:

"لا تجب الجمعة على مسافر ولا امرأة ولا مريض ولا أعمى" (العنایۃ شرح الہدایہ ۲/ ۶۳)۔

لہذا جس طرح شریعت نے ان کی مجبوری کا خیال کرتے ہوئے ان کو بعض مسائل میں مستثنیٰ قرار دیا ہے ان کو ان کی مجبوری کا خیال کرتے ہوئے اس مسئلہ پر بھی مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔

۴- رسم المصحف توقیفی ہے جس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی، "مناہل العرفان" میں ہے۔

"الرأي الأول أنه توقيفي لا تجوز مخالفته عند الجمهور" (مناہل العرفان فی علوم القرآن ۱/ ۳۷۷)

رسم المصحف کے بارے میں تین قول میں سے پہلا جمہور کا قول ہے کہ وہ توقیفی ہے مخالفت جائز نہیں ہے، لیکن بریل کوڈ جو کہ ابھرے ہوئے نقطوں کی شکل میں ہوتے ہیں وہ کوئی رسم نہیں ہے وہ صرف علامت ہے کیونکہ اس میں سب نقطہ ایک ہی شکل میں ہوتے ہیں بس اوپر نیچے آگے پیچھے کا فرق رہتا ہے وہ عام الفاظ کی طرح سے نہیں ہوتے، پس وہ ایسے ہی ہیں جیسے کہ کمپیوٹر کے بٹن جس طرح بٹن علامت ہوتے ہیں الفاظ کے لئے اسی طرح وہ علامت ہوگا رسم مصحف کا۔

۵- شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ کے اندر عذاب قبر کی امکانی شکلوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جس طرح سونے والا خواب میں تکلیف دہ امور کو دیکھتا ہے اور اس کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن سونے والا جاگنے کے بعد اس پر حقیقت حال منکشف ہوتی ہے، لیکن میت کو تو حشر تک جاگنا ہی نہیں ہے پس اس کے حق میں یہ عذاب ہوگا، اور یہ عذاب اس کے لئے دائمی اصل ثابت ہوگی (حجۃ اللہ البالغہ مترجم اردو ۱/ ۹۸)۔

اس پر قیاس کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ رسم مصحف اور بریل کوڈ نابیناؤں کے لئے برابر ہے دونوں میں فرق نہ کرسکنے کی وجہ سے پس بریل کوڈ علامت سمجھی جائیگی، رسم مصحف عثمانی کی۔

۶- مجرد تلاوت قرآن بھی ایک عبادت ہے اور مطلوب ہے، اور نابیناؤں کے لئے مصحف عثمانی میں جو دشواری ہے اور بریل کوڈ میں جو آسانی ہے وہ عقلی ہے، چنانچہ ان حضرات کے لئے بریل کوڈ کی شکل میں قرآن مہیا کرانا ان کی عبادت میں آسانی پیدا کرنا ہے۔

۷- جس طرح رکوع سے عاجز انسان کے لئے ایماء ہی رکوع کے قائم مقام ہے اسی طرح مصحف عثمانی کے رسم سے شرعی عاجز کے لئے نابیناؤں کے لئے بریل کوڈ ہی اس کے قائم مقام ہے پس جائز ہونا چاہئے۔

مذکورہ دلائل وشواہد سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نابیناؤں کی مجبوری کی بنا پر رسم مصحف عثمانی کو چھوڑ کر بریل کوڈ کا سہارا لینا نہ صرف درست بلکہ مستحسن ہوگا۔

قرآن بشکل بریل کوڈ کو چھونا:

رسم مصحف عثمانی جو اصل قرآن کا درجہ رکھتا ہے اور قرآن بشکل بریل کوڈ یہ دونوں ہی نابینا کے حق میں برابر ہیں، دونوں میں فرق نہ کرسکنے کی وجہ سے، اس لئے نابینا کے حق میں بریل کوڈ ہی اصل سمجھا جائے گا اور پھر اس کے احکام مصحف عثمانی کے حکم جیسا ہوگا پس اس کو چھونے کے لئے وضو شرط ہوگا، نابیناؤں کے لئے قرآن بریل کوڈ میں تبدیل کرنے سے حکما قرآن تبدیل نہ ہوگا، اس کے وہی احکام ہوں گے جو اصل قرآن کے احکام میں ہیں۔

فقہاء حنفیہ سے منقول ہے:

"لو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۵)۔

لیکن عام انسان کے لئے بریل کوڈ کا نسخہ کتب تفسیر کے حکم ہوگا رسم مصحف کا التزام نہ ہونے کی بنا پر پس بغیر وضو چھونا جائز ہوگا، البتہ کراہت سے خالی نہ ہوگا، جس کے دلائل ترجمہ قرآن کے مسئلہ میں گزر چکا ہے۔

موبائل میں قرآن مجید کا حکم؟

سائنس اور ٹکنالوجی نے جو ترقی کی ہے ان ترقیات میں سے ایک ترقی یہ بھی ہے کہ قرآن کریم جو کبھی دفتین کے درمیان لکھا رہتا تھا وہ ایک موبائل نہ صرف موبائل، بلکہ موبائل کے ایک چھوٹے سے پردہ "چپ" میں اس طرح سے سما جاتا ہے کہ باہر سے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ اندر کیا کچھ ہے ایسے میں مسئلہ درپیش آجاتا ہے کہ قرآن لوڈ موبائل یا میموری اور کمپیوٹر وموبائل کے اسکرین پر ظاہر ہوتے قرآنی آیات کو چھونے کے لئے وضو کا کیا حکم ہوگا؟۔

مختصر اجواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں موبائل یا اسکرین پر موجود قرآنی آیت کو بلا وضو چھونا بلا کراہت جائز ہونا چاہئے مندرجہ ذیل دلائل کی وجہ سے۔

۱- قرآن کی تعریف کے سلسلہ میں جو اقوال مذکور ہیں اس کے تتبع سے دو شرطیں سامنے آتی ہیں:

۱- "ما بین الدفتین" کا ہونا، ۲- رسم مصحف عثمانی میں ہونا یہ دونوں شرط پائے جانے پر وہ قرآن کا مصداق ہوگا، جیسا کہ مذکور ہے:

"اجمع المسلمون على أن ما بين الدفتين كلام الله" (روح المعانی ۱/ ۱۴)۔

"المراد بالكتاب ما بين الدفتين" (روح المعانی ۲/ ۷۹)

اسی طرح رسم مصحف عثمانی کا لزوم واجب ہے، "مناہل العرفان" میں ایک سوال وجواب کی شکل میں مذکور ہے۔

''هل رسم المصحف توقيفي، فللعلماء في رسم المصحف آراء ثلاثة: الرأي الأول أنه توقيفي لاتجوز مخالفته وذلك مذهب الجمهور'' (مناہل العرفان فی علوم القرآن ۱/ ۳۷۷)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسم المصحف توقیفی ہے اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

قرآن کے مذکورہ شرائط وتعریف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر موبائل میں قرآن لوڈ ہو تو یہ دونوں شرطیں اس کے اندر مفقود پائی جاتی ہیں پس اس کو قرآن کے حکم میں لانا قرین قیاس نہیں ہوگا۔

۲- موبائل کے اندر قرآن رسم عثمانی کی شکل میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک نقطہ کے برابر چھوٹی سی چپ میں میموری میں اس طرح رہتا ہے کہ اگر اس کو کھول کر دیکھا جائے تو کچھ نظر نہیں آتا، پس اس کا حکم حافظ قرآن کے قلب کے مانند ہوگا، اور جس طرح حافظ قرآن کو چھونے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں تو موبائل کو بھی چھونے کے لئے وضو کی شرط نہ ہوگی۔

۳- قرآنی آیت موبائل کی میموری میں ہوتا ہے، پس اس کی مثال اس صندوق کی سی ہے جس میں قرآن رکھا ہوا ہے، اور فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ قرآن رکھا ہوا صندوق کو چھونے کے لئے طہارت و وضو شرط نہیں ہے، چنانچہ درمختار میں موجود ہے:

''لو كان المصحف في صندوق فلا بأس للجنب أن يحمله'' (درمختار ۱/ ۲۹۳)

اگر قرآن صندوق کے اندر ہو تو جنبی شخص کے لئے اس کو اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اسکرین پر نظر آنے والی آیات کا حکم:

موبائل یا کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر آنے والی آیات کریمہ کو بلاوضو چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس کے اوپر جو غلاف ہے وہ مانع ہے، حائل ہے، اور وہ غلاف منفصل کے حکم میں ہے کہ اس کو الگ کیا جاسکتا ہے، اور غلاف منفصل کے بارے میں کتب تفسیر وفقہ میں مسئلہ صراحۃ مذکور ہے کہ ''غلاف متصل'' یعنی جس کو الگ کرنا ممکن نہ ہو کو چھونے کے لئے وضو شرط ہے کہ وہ بھی قرآن کے حکم میں ہے اور غلاف منفصل جس کو الگ کرنا ممکن ہو کو چھونے کے لئے وضو شرط نہیں ہے، کہ وہ خارج قرآن ہے، چنانچہ ''الفتاوی الھندیہ'' میں مذکور ہے:

''حرمة مس المصحف لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلاف متجاف عنه كالخريطة والجلد الغير المشرز لا بما هو متصل به، وهو الصحيح'' (الفتاوى الهنديه ۱/ ۳۹)

(حیض نفاس والی عورت، نیز ناپاک بے وضو شخص کے لئے قرآن کا چھونا حرام ہے، مگر ہاں الگ کئے جاسکنے والے غلاف کے ساتھ جو کہ پشہ چمڑا کا ہو اس طرح سے کہ وہ الگ کئے جاسکتے ہوں متصل نہ ہوں، یہی صحیح قول ہے۔

اسی طرح ''مجمع الانہر'' میں ہے:

''لايجوز لمحدث مس المصحف إلا بغلافه المنفصل'' (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الابحر ۱/ ۴۲)

نیز تبیین الحقائق میں ہے:

''ومسه إلا بغلافه... وغلافه ما يكون منفصلا عنه دون متصلا به في الصحيح'' (تبيين الحقائق ۱/ ۱۶۵)

(حیض قرآن کو چھونے میں مانع ہے، مگر غلاف کے ساتھ اور غلاف کی تفصیل یہ ہے کہ وہ منفصل ہونے کے متصل)۔

مسئلہ بالا سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ موبائل کا اسکرین غلاف منفصل کے حکم میں ہے جو مانع ہے، پس قرآنی آیات کو اسکرین پر چھونے کے لئے وضو شرط نہیں ہونا چاہئے، بلکہ بلا کراہت چھونا جائز ہونا چاہئے۔

☆☆☆

بغیر متن کے ترجمہ قرآن کی اشاعت

مولانا وحید الدین ترکیسر[1]

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

اس تیز رفتار زمانہ میں جبکہ دنیا کی ہر قوم مختلف میدانوں میں اپنی سرگرمیاں دکھا رہی ہیں وہیں دوسری طرف ایک ڈیڑھ صدی سے تعلیمی میدانوں میں بھی بڑی تیزی آئی ہے، تعلیمی سہولت کے لئے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے، بچوں کے لئے، بچیوں کے لئے، جوانوں کے لئے، غرض ہر طرح کے لوگوں کے لئے جداگانہ نصاب تیار کیا جارہا ہے، تعلیم کے فروغ کے لئے جدید ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا جارہا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی بریل کوڈ کی شکل میں رموز قرآن کی اشاعت کا مبارک کام بھی ہے، یقیناوہ حضرات قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے اس مبارک کام میں حصہ لیا، لیکن شرعی اعتبار سے یہ جاننا بھی بہت اہم وضروری ہے کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کو شرعاً قرآن کہا جاسکتا ہے؟ جس کی بنیاد پر اس پر بھی قرآن کے احکام عائد ہوں یا نہیں؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی حقیقت معلوم کرلی جائے، تاکہ شرعی اعتبار سے اس پر کیا احکام عائد ہوتے ہیں ان کے جاننے میں سہولت ہو۔

اس کی ایجاد ایک بریل نامی شخص کے ذریعہ ہوئی جو فرانس کے ایک علاقہ کوک ورے نامی گاؤں میں ۱۸۰۹ء کو پیدا ہوا، پندرہ سال کی عمر میں نابینا افراد سے متعلق ایک پروگرام میں وہ شریک ہوا، جو اس لئے منعقد کیا گیا تھا کہ نابینا افراد کس طرح تعلیمی چیزوں سے مستفید ہوسکیں، اس پروگرام میں شرکت کے بعد اس میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ نابیناؤں کی آسانی کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا چاہئے، چنانچہ چارلس باربر کا طریقہ کتابت اس کے ہاتھ لگا اس کا طریقہ کتابت یہ تھا کہ اس نے فوجیوں کے لئے کچھ ابھرے ہوئے نقطوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے اندھیرے میں انگشت کے ذریعہ پڑھا جاسکے اس کے بعد بریل نے بھی اسے اختیار کیا، پھر رفتہ رفتہ انگریزی ودیگر زبانوں میں منتقل ہوا اس کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً چھ نقطہ بنائے جاتے ہیں ان میں جو حرف صرف ایک نقطہ سے بنتا ہے تو اس میں ایک نقطہ ابھار دیا جاتا ہے باقی نقطوں کو حذف کردیا جاتا ہے، اسی طرح دو حرف تین حرف وغیرہ کبھی دو تین حرف ایک ہی تعداد کے نقطوں سے بنتے ہیں تو ان میں مخالف سمتوں سے یا اوپر نیچے یا دائیں بائیں سے نقطے ابھارے جاتے ہیں، تاکہ ان میں فرق ہوسکے، اسی طرح ان چھ نقطوں سے ۶۴ شکلیں بنائی جاتی ہیں، ان نقطوں میں باقاعدہ کوئی حرف نہیں ہوتا، بلکہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مثلاً ایک نقطہ فلاں جگہ ہوتو {A} اس سے معلوم ہوا کہ یہ چھ نقطے خالی رمز ہیں باقاعدہ کوئی حرف نہیں ہے قرآن پاک کو جو بریل کوڈ میں تیار کیا گیا اس میں چھ نقطے حرف کے لئے اور چھ نقطے حرکات کے لئے ہیں، اور عربی کے لئے باقاعدہ کوئی الگ رمز نہیں تیار کیا گیا، بلکہ انگریزی میں جو {A} کا رمز تھا اس کو الف تصور کیا گیا علی ھذا القیاس۔

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوا کہ نہ یہ رسم الخط ہے نہ رسم عثمانی، بلکہ اس کی حیثیت صرف رموز قرآن کی ہے، اس لئے کہ رسم عثمانی تو کہتے ہیں کلمہ کو حروف ہجاء کی ترکیب سے رسم عثمانی کے مطابق لکھنا (فتح الرحمن از قاری محمد صدیق/ص ۴۲۲)۔

جبکہ یہاں پر تو حروف ہجا کا تو صرف رمز ہے چہ جائیکہ رسم عثمانی کی موافقت پائی جائے، نیز اس پر قرآن کی شرعی اور اصطلاحی تعریف بھی صادق نہیں آتی موسوعہ میں قرآن کی یہ تعریف ذکر کی گئی ہے:

"ھو اسم لکلام اللہ تعالی المنزل علی رسولہ محمد المتعبد بتلاوتہ المکتوب فی المصاحف المنقول إلینا نقلا

[1] دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات۔

متواترا'' (۵/ ۳۸)۔

جب یہ شرعاً قرآن پاک نہیں ہے، بلکہ محض قرآن کا رمز ہے تو اس کو قرآن کے ساتھ موسوم نہیں کرنا چاہئے، بلکہ رمز قرآن وغیرہ کے ساتھ ہی موسوم کرنا چاہئے، ورنہ غیر قرآن کو قرآن کہنا لازم آئے گا۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یہ شرعاً قرآن پاک نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت صرف اور صرف رمز کی ہے تو اس کے چھاپنے کو یوں نہیں کہا جائے گا کہ یہ رسم الخط کے علاوہ میں چھاپا گیا اور اس کا چھاپنا اس لئے بھی جائز ہونا چاہئے کہ اس میں وہ خرابیاں لازم نہیں آتیں جو غیر عربی رسم الخط میں پائی جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ غیر عربی رسم الخط میں حرکات وحروف تبدیل ہو جاتے ہیں، جو تحریف ہے، لیکن یہاں یہ بات لازم نہیں آتی، اس لئے کہ حروف کا رمز الگ الگ ہے اور حرکات کا رمز الگ ہے، نیز فقہاء نے یہ بھی مفسدہ ذکر کیا ہے کہ عجمی زبان میں بعض حروف میں فرق نہیں ہوتا، مثلاً (ذ-ز) وغیرہ یہ بات اس میں نہیں پائی جاتی، اس لئے کہ یہ رمز اگرچہ انگریزی زبان میں ہے، لیکن عربی حروف ہجا کے اعتبار سے اس کی تخصیص کر لی گئی ہے۔

اسی طرح اس بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن پاک چونکہ رمز قرآن ہے تو اس رمز قرآن کو بلا وضو چھونا جائز ہونا چاہئے، لیکن اس وجہ سے کہ اس سے تلاوت قرآن میں قرآن کے مانند مدد لی جاتی ہے اور ایک خاص معذورین کا طبقہ اس سے اسی طرح فائدہ حاصل کرتا ہے، جیسا کہ اصل قرآن سے کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا ادب واحترام کرنا چاہئے اور اچھا یہ ہے کہ اس کو بلا وضو نہ چھوا جائے۔

کچھ باتیں ایسی ضرور ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے:

۱- بریل کوڈ کے سرورق پر لکھ دیا جائے کہ رمز قرآن یا اس کے مانند عبارت اس پر قرآن مجید ہرگز نہ لکھا جائے۔

۲- جن نابیناؤں کو یہ پڑھایا جاتا ہے ان کے سامنے یہ وضاحت کر دی جائے کہ یہ قرآن مجید نہیں ہے، بلکہ اسے ''حفص عن عاصم'' کی قرأت کے مطابق رمز کی شکل میں تیار کیا گیا ہے۔

۳- ایسے رموز کی ایجاد میں مزید محنت کی ضرورت ہے کہ جس سے ایک کلمہ مصدر بھی بن سکتا ہو فعل ماضی بھی وغیرہ یعنی رموز ایسا ہو کہ اس میں قرأت سبعہ اور ثلاثہ کی گنجائش ہو۔

خلاصہ کلام:

بریل کوڈ میں لکھا ہوا قرآن کا رمز جس کو رمز قرآن کہا جاتا ہے اس پر قران کی شرعی واصطلاحی تعریف صادق نہیں آتی، لہذا اس کو قرآن نہیں کہنا چاہئے، نیز اس رمز قرآن کو چھاپنا یہ قران کریم کو عربی رسم الخط کے علاوہ میں چھاپنا بھی نہیں کہا جائے گا جس کی وجہ سے اس کی طباعت کو ناجائز کہا جائے، اسی طرح اس رمز قرآن کو چھونا، قرآن کو چھونا بھی نہیں کہا جائے گا، ہاں! اس وجہ سے کہ یہ رمز قران ہے اور قرآن کی تلاوت میں اس سے قرآن پاک کے مانند مدد لی جاتی ہے اس لئے اس کا ادب واحترام کرنا چاہئے اور اچھا یہ ہے کہ اس کو بلا وضو نہ چھوا جائے، جیسا کہ قران مجید سے متعلق چیزوں کا ادب واحترام کیا جاتا ہے۔

موبائل پر قرآن مجید:

تلاوت کلام پاک کو مزید رواج دینے کے لئے قرآن پاک کو موبائل میں محفوظ کیا گیا، تاکہ ہر شخص بہ آسانی سفر وحضر میں اس کی تلاوت کر سکے، لیکن اس سلسلہ میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں غور وخوض ضروری ہے، موبائل پر قرآن کریم کی تلاوت کا مدار اس بات پر موقوف ہے کہ موبائل کو مصحف کہہ سکتے یا نہیں، اگر موبائل پر مصحف کا اطلاق ہوتا ہے تو اس کے احکام بھی وہی رہیں گے جو مصحف کے ہیں، ورنہ اس کے حکم میں فرق ہوگا، اس لئے سب سے پہلے مصحف کی تعریف ملاحظہ ہو، موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"والمصحف فی الاصطلاح اسم للمکتوب فیه کلام الله تعالی بین الدفتین" (موسوعہ فقہیہ طبع کویت)

یعنی مصحف اس شئ کا نام ہے جس میں دو دفتیوں کے درمیان اللہ کا کلام لکھا ہوا ہو، یہ تعریف موبائل پر صادق نہیں آتی، اس طرح اس کو عرفا بھی مصحف نہیں کہتے، لہذا اس پر مصحف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اور مصحف کے احکام حضرات فقہاء نے یہ ذکر کئے ہیں کہ صفحہ کے کنارے جو بیاض ہے اسی طرح دونوں دفتیاں ان کو بھی بلا وضو چھونا جائز نہیں ہے، بلکہ موبائل کا حکم اس لوح اور درہم وغیرہ کی طرح ہے جس میں قرآن کی آیت لکھی ہوئی ہو اور اس طرح کی چیزوں کا حکم حضرات فقہاءؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ جہاں آیت لکھی ہوئی ہو صرف اس کو چھونا ممنوع ہوگا، اس کے علاوہ کو چھونا جائز ہوگا اسی طرح موبائل کا حکم ہوگا کہ اس کی صرف اسکرین کو چھونا ممنوع ہوگا کنارہ والا حصہ اور نیچے والے حصے کو چھونا جائز ہوگا۔

"(ومسه)ای القرآن ولو فی لوح أودرهم أوحائط لكن لايمنع إلا من مس المكتوب بخلاف المصحف فلا يجوزمس الجلد وموضع البياض منه، وقال بعضهم يجوز، وهٰذا أقرب إلى القياس والمنع أقرب إلى التعظيم كما فى البحر ای والصحيح المنع كما تذكره" (شامی ۱/ ۲۹۳ سعید، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۱/ ۲۲۹ دار الکتاب دیوبند)۔

گرچہ اسکرین پر جو قرآن نظر آتا ہے وہ دراصل قرآن نہیں ہے اصل قرآن تو چپ وغیرہ میں محفوظ ہے، اسکرین پر تو قرآن کا عکس پڑتا ہے، لیکن اس کو بھی تعظیما قرآن ہی کے حکم میں مانا جائے گا، اکثر علماء کی یہی رائے ہے، ہاں اگر کوئی ایسی شکل ہو کہ قرآن کا عکس براہ راست اسکرین پر نہ پڑتا ہو، بلکہ اس ظاہری اسکرین کے علاوہ کسی اور چیز پر عکس پڑتا ہو اور اس چیز اور اس ظاہری اسکرین کے درمیان کسی کثیف چیز کے حائل نہ ہونے کی وجہ سے اس اسکرین پر نظر آتا ہو تو اس اسکرین کو بھی بلا وضو چھونا جائز ہوگا، یہ اسکرین غلاف کے درجہ میں ہوگی۔

☆☆☆

غیر رسم عثمانی میں قرآن کریم کی کتابت

مولانا محمد موسی القاسمی

رسم عثمانی کی اتباع واجب ہے یا اس کے خلاف رسم قیاسی میں قرآن کریم کی کتابت ہوسکتی ہے، حالات اور زمانہ کے بدل جانے کی وجہ سے کیا رسم عثمانی میں ترمیم وتغیر کیا جاسکتا ہے؟ عربی زبان سے ناواقف طبقہ کے لئے ان کی رعایت میں قرآن کریم کو کسی دوسری زبان میں لکھا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں علماء کرام کی مختلف رائیں ہیں:

رائے اول:

علماء کرام کی ایک رائے یہ ہے کہ رسم عثمانی ہی کی اتباع واجب ہے اور اس سے اختلاف کرنے کی کسی کو گنجائش نہیں ہے، یہی اکثر علماء بلکہ جمہور امت کی رائے ہے، حضرت مفتی شفیع عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''باجماع صحابہ وتابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے نزدیک قران مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں ''امام'' کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصا کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحتا تجویز نہیں کرسکتا (جواہر الفقہ ۲/ ۷۱)۔

علامہ نظام الدین نیشاپوریؒ لکھتے ہیں:

''قال جماعة من الائمة أن الواجب على القراء والصلحاء وأهل الكتابة أن يتبعوا هذا الرسم فى خط المصحف، فإنه رسم زيد بن ثابت وكان أمين رسول الله ﷺ وكاتب وحيه'' (مناهل العرفان فى علوم القرآن ۱/ ۲۶۳)

سیوطی علیہ الرحمہ کی اتقان میں حضرت امام احمدؒ سے منقول ہے:

''واو یا یاء یا الف یا اس کے علاوہ کسی بھی حرف کی کتابت میں مصحف عثمانی کی مخالفت حرام ہے'' (الاتقان ۲/ ۲۱۳)۔

حضرت امام مالکؒ سے کسی نے سوال کیا کہ رسم عثمانی کے علاوہ کسی نئی طرز کتابت پر قرآن کریم کا لکھنا جائز ہے؟ حضرت نے فرمایا جس طرز پر ابتدائی مرحلہ میں صحابہ کرامؓ نے لکھا تھا اسی پر لکھنا واجب ہے (الاتقان ۲/ ۲۱۳)۔

علامہ سیوطی ہی نے ''الاتقان'' میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

''الأقرب المنع كما تحرم قرأته بغير لسان العرب'' (الاتقان ۲/ ۲۱۸)۔

عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں قرآن کریم کی کتابت کے بارے میں قریب ترین تحقیق یہ ہے کہ اس سے روکا جائے گا جس طرح غیر عربی زبان میں اس کا پڑھنا حرام ہے۔

''النفحۃ القدسیۃ'' میں حافظ ابن حجرؒ کے فتاوی سے منقول ہے: ''يحرم أيضا كتابته بقلم غير العربي'' (جواهر الفقه ۲/ ۸۳)۔

جس طرح عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بدون متن ترجمہ حرام ہے اسی طرح غیر عربی زبان میں اس کی کتابت بھی حرام ہے۔

دلائل دوم:

مذکورہ بالا عبارت سے فریق اول کا مذہب بالکل واضح ہے کہ رسم عثمانی کی متابعت واجب ہے اب اس سلسلے میں دلائل ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں:

۱- مصحف عثمانی بارہ ہزار صحابہ کرام کے متفقہ رائے اور مشورہ سے تیار کیا گیا اس لئے رسم عثمانی پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہوا اور اجماع کی متابعت واجب اور مخالفت حرام ہے۔

شیخ القراء شیخ محمد بن علی حدادؒ کے رسالہ خلاصۃ النصوص الجلیہ میں ہے:

''أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته (ثم قال) قال العلامه ابن عاشر: ووجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثني عشر الفا والإجماع صجة جسما تقرر في اصول الفقه''

اس عبارت سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

۱-رسم عثمانی کی اتباع کے واجب ہونے پر اور اس کی مخالفت کے عدم جواز پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔

۲-رسم عثمانی پر بارہ ہزار صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

۳-اجماع دلیل قطعی ہے، جیسا کہ اصول فقہ سے ثابت ہوا ہے۔

''شرح الطحاوی'' میں ہے:

''ينبغي لمن أراد كتابة القرآن أن ينظم الكلمات كما هي في مصحف عثمان رضى الله عنه لإجماع الأمة على ذلك'' (مرسوم الخط ا/۱۶)۔

جو شخص قرآن کریم کو لکھنا چاہتا ہو اس پر واجب ہے کہ کلمات قرآن کو اسی طرز پر لکھے جس طرز پر مصحف عثمانی میں ہے کیونکہ امت محمدیہ کا اس پر اجماع ہو چکا ہے۔

قاضی عیاض مالکیؒ نے اپنی کتاب ''شفاء'' کے آخر میں لکھا ہے:

مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس قرآن کریم کی تلاوت اطراف عالم میں کی جاتی ہے اور جو مصحف میں مکتوب ہو کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اور جو دفتین میں الحمد للہ رب العالمین سے سورہ الناس تک جمع ہے وہ اللہ کا وہ کلام ہے جس کی وحی اس نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کی ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ حق ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ جس نے قصد و ارادہ کے ساتھ اس کے کسی حرف کو کم کیا یا اس کے بدلہ کوئی دوسرا حرف لایا کسی حرف کو بڑھا دیا، حالانکہ وہ مجمع علیہ مصحف عثمانی میں موجود نہیں ہے اور وہ قرآن میں سے نہیں ہے اور یہ سب اس نے قصداً کیا ہو تو ایسا شخص کافر ہے کتاب مذکور کے شارحین بالخصوص ملا علی قاری اور شہاب الخفاجی فرماتے ہیں کہ کسی حرف کو زیادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کتابت میں بھی زیادہ کرے اور پڑھنے میں بھی زیادہ کرے (مرسوم الخطا ا/۱۶)۔

۲- رسم عثمانی کا وجود صحابہؓ کے ذریعہ ہوا اور ان میں سے خلیفہ ثالث عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت میں ان کی سربراہی میں ہوا ہے اور صحابہ کرام کی اتباع کا حکم امت کو دیا گیا ہے، حدیث پاک میں ہے:

''فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ'' (رواه احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجه، مشكوة)

میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو اور اس کو دانتوں کے نیچے دبالو) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (مرسوم الخطا ا/۱۴)۔

۳- قرآن کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا، جیسا کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں مصرح ہے: "بلسان عربي مبين (سورۂ شعراء:۱۹۵)، و كذلك أوحينا إليك قرانا عربيا" (سورۂ شوریٰ:۷)، وهذا لسان عربي مبين" (سورۂ نحل:۱۰۳) اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو کتابت کرائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں ان کے حکم سے قرآن کو حضرت زید بن ثابتؓ نے عربی ہی میں لکھا اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں عربی ہی میں لکھا گیا اور اسی طرح تابعین، تبع تابعین، اسلاف و اکابرین امت اور تمام مسلمان عربی ہی میں پڑھتے آرہے ہیں، حالانکہ ان ادوار میں اسلام خطہ عرب سے نکل کر دنیا کے دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا عجم کے بڑے حصے میں اسلام کے درخشندہ ستارے جلوہ گر ہو چکے تھے، تاہم بھی عجمیت کی غیر عربی میں کتابت نہ ہوئی یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ رسم عثمانی عربی کے علاوہ کسی غیر زبان میں قرآن لکھنا جائز نہیں ہے۔

۴- کسی غیر زبان میں قرآن کریم کی کتابت موجب طعن ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ زبانوں کے کلمات وحروف اصطلاح سے متعلق ہوتے ہیں، اس لئے اس میں مسلسل تغیر ہوتا رہتا ہے اگر دوسرے رسم الخط میں یا دوسری زبان میں کتابت کو جائز قرار دے دیا جائے تو تغیر وتبدیلی کا دروازہ کھل جائے گا جب اصطلاحات بدلیں گے الفاظ وحروف بھی اس سے متاثر ہوں گے اور ایسی صورت میں قوی اندیشہ ہے کہ اس کے تابع ہوکر قراءت بھی بدلے گی، اور اس طرح رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ تخلیط وتشکیک پیدا ہوگی اور اختلاف واضطراب کی وجہ سے دشمنان اسلام قرآن کریم کو ہدف طعن وتشنیع بنائیں گے (تحریم کتابۃ القرآن بحروف غیر عربیۃ/ص ۳۷)۔

۵- عربی زبان کے علاوہ دیگر زبان میں رسم عثمانی کی رعایت ممکن نہیں ہے، کیونکہ وہ حروف جو رسم عثمانی میں ہیں، مگر وہ قراءت میں نہیں آتے ہیں دیگر زبانیں ہندی وانگریزی وغیرہ میں ان کے متبادل نہیں ہیں۔

۶- غیر عربی میں قرآن کریم کی کتابت اس وجہ سے بھی جائز نہیں کہ بعض حروف مختلفہ کے لئے ہندی وانگریزی میں ایک ہی حرف ہے، مثلاً ت اور ط، ظ اور ذ اور زاء وغیرہ پس اس کی وجہ سے لحن جلی لازم آئے گا جو حرام ہے، اور نیز یہ تحریف لفظی وتحریف معنوی کا سبب ہے اور سلف وخلف کے علماء اسلام کا اجماع ہے کہ قرآن میں ہر وہ تصرف جو تحریف لفظی یا تغیر معنوی کا داعی اور سبب ہو وہ ممنوع قطعی اور حرام باشد تحریم ہے۔

۷- رسم عثمانی توقیفی ہے نزول کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے باضابطہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنے کا طریقہ بھی بتایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طریقہ سے کاتبین وحی کو لکھوائی تھی اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہؓ کو تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

''ألق الدواة وحرف القلم وانصب الباء وفرق السين ولا تعور الميم وحسن الله و... الرحمن وجود الرحيم وضع قلمك على أذنك اليسرى، فإنه أذكر لك'' (مرسوم الخط/۲۰)۔

پھر اسی اسلوب واسی طرز کتابت پر حضرت زید بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں اولا اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں دوسری مرتبہ لکھا تھا اور وہی بعد میں چل کر رسم عثمانی کے نام سے منسوب ہوا اس لئے یہ طرز تحریر واسلوب کتابت توقیفی ہے۔

دوسری رائے:

بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ رسم قیاسی میں قرآن کریم کا لکھنا جائز ہے۔

دلائل:

۱- ان حضرات کی طرف سے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ عوام الناس رسم عثمانی کو جانتی نہیں ہے ان کے نہ جاننے کے باوجود اگر رسم عثمانی والا قرآن پیش کیا جائے تو ان کو اس وقت پریشانی ہوگی، جبکہ وہ اس کو دیکھ کر پڑھیں گے۔

۲- ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتابت کے سلسلہ میں امت پر کسی خاص طریقہ کو فرض نہیں کیا ہے کیونکہ کتاب وسنت میں ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے جس سے کسی خاص طریقہ پر کتابت کو واجب قرار دیا جاسکے اور نہ اجماع امت میں اس طرح کا حکم آیا ہے اور نہ اس پر قیاسات شرعیہ دلیل ہیں، بلکہ سنت تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ کتابت کا جو طریقہ آسان ہو اسی میں کتابت کی جائے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کا حکم دیا ہے یہ تو حدیث کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، لیکن اس پر صراحت نہیں کہ کسی خاص طریقہ پر لکھنے کا حکم دیا ہو اور اس کے علاوہ سے روک دیا ہو۔

دلائل پر ایک نظر:

مذکورہ دلائل کی سطحیت اہل علم ودانش سے مخفی نہیں ہے، کیونکہ پہلی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ عوام الناس رسم عثمانی کو جانتے نہیں ہے ظاہر ہے کہ یہ عذر بے جا ہے جہالت وعدم واقفیت کی وجہ سے اگر احکام شرعیہ میں تبدیل ہونے لگے تو شریعت ایک مذاق بن کر رہ جائے گی آخر علم کی تحصیل کو فرض کیوں قرار دیا گیا ہے عوام الناس نہیں جانتے ہیں تو اس کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو تعلیم دینے اور سکھانے کا اہتمام کیا جائے، نہ یہ کہ اس کی وجہ سے اجماعی مسائل کو بدل دیا جائے۔

دوسری دلیل یہ پیش کی گئی کہ کتاب وسنت میں اس کی خاص ہدایت نہیں دی گئی ہے اور نہ اجماع امت میں اس کی رہنمائی ہے اور نہ قیاسات شرعیہ میں تخصیص کی کوئی وجہ ہے، بلکہ سنت عموم پر دلالت کرتی ہے اس میں کوئی واقعیت نہیں، کیونکہ فریق کے دلائل میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ رسم عثمانی پر صحابہ کرام کا اجماع

ہے اور ہر چیز کا حکم کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ موجود ہو ایسا نہیں ہے، بلکہ بہت سی چیزیں اجماع امت سے معلوم ہوتی ہیں اور جو حکم اجماع سے ثابت ہوتا ہے وہ ایسا ہی ہوتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہوتا ہے، کیونکہ وارد ہے: "فما راٰہ المومنون حسنا فھو عند اللہ حسن" (حدیث)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص طریقہ سے خاموش رہنا اگر عموم کی دلیل ہوتا تو پوری امت رسم عثمانی کے وجوب پر اتباع پر متفق نظر نہ آتی، علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتابت کی تعلیم دینا ثابت ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ بن سفیانؓ کو تعلیم دی:

"الق الدواۃ وحرف القلم... الخ"۔

تیسری رائے:

تیسری رائے یہ ہے کہ عوام الناس جو رسم عثمانی سے ناواقف ہے اس کے لئے قرآن کریم کا اسی زبان واصطلاح میں لکھنا واجب ہے جو ان کے نزدیک مشہور اور رواج پذیر ہے اور رسم عثمانی میں لکھنا جائز نہیں ہے، تاکہ غیر اختیاری طور پر عدم واقفیت کی وجہ سے قرآن کریم کسی بھی قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہے، لیکن ساتھ ساتھ رسم عثمانی کی حفاظت وصیانت بھی ضروری ہے، تاکہ سلف صالحین کے عمدہ آثار ونقوش ہمارے ہاتھ سے فوت نہ ہوجائیں حاصل یہ ہے کہ جاہلوں کی رعایت اس درجہ نہ کی جائے کہ قرآن کریم کی خصوصیات متروک ہوجائیں، بلکہ اس کو اہل عرفان وخواص کے نزدیک باقی رہنا چاہئے۔

یہ رائے صاحب تبیان وصاحب برہان نے اختیار کیا ہے جس کو انہوں نے عز الدین بن سلامؒ کے کلام سے اخذ کیا ہے۔

تیسری رائے پر ایک نظر:

تیسری رائے میں درحقیقت پہلے دونوں اقوال کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عوام الناس کی رعایت میں جو زبان بھی ان کے سہل الحصول ہو اس میں لکھا جائے، مگر اہل علم وخواص کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسم عثمانی کو لازم پکڑیں، تاکہ سلف کے آثار محفوظ رہیں، اس رائے کے مطابق رسم عثمانی کے مطابق قرآن کریم کا بقاء تو ہوجائے گا مگر ساتھ ساتھ عوام الناس کو دیگر زبانوں میں قرآن کریم دینے کی وجہ سے دوسرے فسادات تاہم باقی ہیں، کیونکہ عربی زبان کے تمام حروف دیگر زبانوں میں موجود نہیں ہیں جس کی وجہ سے لحن جلی کا سبب ہوگا۔

حاصل بحث:

حاصل بحث یہ ہے کہ اخیر کے دونوں اقوال میں رسم عثمانی جس کے اتباع پر امت کا اجماع ہے اس کی مخالفت لازم آتی ہے اور دیگر زبانوں میں رسم عثمانی کی خصوصیات کی حفاظت نہیں ہو پاتی ہے اور اسی طرح دیگر مفاسد کے ساتھ ساتھ لحن جلی کا سبب بن جاتا ہے، البتہ اگر رسم عثمانی کے ساتھ ساتھ کسی ایسی زبان میں جس میں عربی زبان کے تمام حروف کے متبادل موجود ہوں اس میں عوام الناس کی رعایت میں قرآن کریم لکھ دیا جائے تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے جس طرح خالص ترجمہ کی اشاعت تو جائز نہیں، مگر متن کے ساتھ ساتھ جائز ہے، کیونکہ دو صورتوں میں کوئی مفسدہ نہیں، مگر ایسی زبان جس میں عربی کے تمام حروف کے متبادل نہ ہوں تو اس میں قرآن کی کتابت جائز نہیں۔

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت:

بریل کوڈ ایک قسم کی زبان ہے جو روز بروز شاہ راہ ترقی پر گامزن ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کتابوں کا ایک بڑا حصہ اس سے آراستہ ہوکر صفحہ عالم پر جلوہ گر ہوچکا ہے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی کل کائنات چھ نقطے ہیں اور یہی کاغذوں پر جسیم وابھرتے ہوئے جسم کے ساتھ منقش ہوتے ہیں جن کو نابینا حضرات انگلیوں کے لمس سے پڑھتے ہیں انہی چھ نقطوں میں عربی زبان کے تمام حروف کے متبادل ہوتے ہیں ان کے اجتماع وانفراد اور تبدیلی کیفیات کے مختلف حالات سے مختلف حروف بنتے ہیں، مثلاً عربی زبان میں سین مہملہ اور شین معجمہ دونوں دو مختلف حقیقت والے حروف ہیں، مگر بریل کوڈ میں دونوں کے متبادل تین نقطے ہیں، البتہ مگر کیفیات سے دونوں میں امتیاز ہوجاتا ہے۔

احقر کے علم کے مطابق بریل کوڈ کے یہ چھ نقطے عربی زبان کی طرح دیگر زبانوں کے حروف کے بھی متبادل ہوتے ہیں گویا یہ ایک قسم کے رموز ہیں اور کلمات قرآن کی طرف مشیر اور دلیل ہیں جس طرح اور کسی چیز کی معرفت نابینا کو چھونے سے ہوتی ہے اسی طرح کلمات قرآن کی معرفت چھو کر ہوتی ہے،

یہ اشارہ ہی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کا فائدہ انسان کے ایک محدود طبقہ کو ہوتا ہے اور انسان کی ایک خاص جماعت ہی اس سے استفادہ کرتی ہے اس سے ایک بات کا مزید علم ہوتا ہے وہ یہ کہ کوئی مستقل زبان نہیں ہے، کیونکہ زبان تو وہ ہوتی ہے جس کے مخصوص حروف تہجی ہوں جن سے الفاظ کی ترکیب ہوتی ہو اور ان کے معانی بھی ہوتے ہوں اور ان کو ادا کرنے کی خاص ادا اور اسلوب ہو اور اس میں کلام ہوتا ہو اور اس کے ذریعہ مافی الضمیر کی ترجمانی کلام و گفتگو اور تقرو خطابت سے ہوسکتی ہو اور اس پر کلام کا اطلاق ہوسکتا ہو، چنانچہ لغت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے: "الکلام المصطلح علیه بین کل قوم" (المنجد) لغت وہ کلام ہے جس پر کوئی قوم متفق ہو جائے۔

واضح رہے کہ احقر کو بعض نابینا قاریوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت کے باوجود رسم عثمانی کی تمام خصوصیات و امتیازات کی مکمل رعایت ہوجاتی ہے اور جیسا کہ معلوم ہوا کہ عربی حروف کے متبادل بھی اس میں موجود رہیں جن کی وجہ سے تمام حروف کو ان کے صحیح مخارج ومقامات سے ادا کرنا اور ان کے صفات کی رعایت بھی ممکن ہو۔

زبان وبریل کوڈ میں فرق:

بریل کوڈ اور غیر عربی زبان میں دو وجہ سے فرق ہے ایک تو یہ کہ بریل کوڈ مستقل زبان نہیں، بلکہ رموز واشارات ہیں اور دوسرا فرق یہ ہے کہ بریل کوڈ میں رسم عثمانی کی کامل رعایت ہوتی ہے، جبکہ اور زبانوں میں تفصیل ہے بعض میں تو رعایت ہوسکتی ہے جیسے فارسی و اردو، اسی وجہ سے فقہاء نے ایک دو آیت کو ایسی زبان میں لکھنے کی اجازت دی ہے "وان فعل فی أیة أو أیتین لا" (فتح القدیر ۱/۲۹۱)

اور بعض زبان ایسی ہے جس میں رسم عثمانی کی رعایت مطلق نہیں ہوسکتی ہے، جیسے ہندی وانگریزی وغیرہ (امداد الاحکام ۱/۲۴۰)۔

بریل کوڈ میں قرآن کی کتابت کا حکم:

احقر کی ناچیز وحقیر رائے یہ ہے کہ بریل کوڈ کا حکم وہی ہے جو اس زبان غیر عربی کا حکم ہے، جس میں رسم عثمانی کی رعایت وحفاظت ممکن ہوسکتی ہے، یعنی اردو وفارسی کی طرح ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رسم عربی کے ساتھ ساتھ بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت کردی جائے تو جائز ہے جہاں تک بغیر رسم عربی کے بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت کا مسئلہ ہے تو اس میں خرق اجماع لازم آتا ہے اور خلاف اجماع جائز نہیں ہے اور یہ اگرچہ مستقل زبان نہیں ہے تاہم زبان کے مانند ضرور ہے کیونکہ دونوں رسم عربی کو ادا کرنے میں برابر ہیں اور دونوں صورتوں میں رسم عربی کی صورت مفقود ہوجاتی ہے اور اگرچہ عدم بینائی کا عذر رسم عربی کی جہالت والے عذر سے اشد ہے جس کی وجہ سے بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت کے جواز کو تقویت مل سکتی ہے، مگر اشکال اس وقت پیش آتا ہے جب خرق اجماع کے تحقیق کی جانب ذہن مبذول ہوتا ہے، اور یہ کہنا کہ بریل کوڈ میں قرآن کریم کی افادیت کا دائرہ اس معنی کر محدود ہے کہ اس سے ایک طبقہ خاص ہی منقطع ہوتا ہے یہ بھی خلاف اجماع کے لئے مرخص ومجیز نہیں الا یہ کہ اس کے بغیر استفادہ محال ہوجائے، مگر یہاں محال کی بجائے ممکن ہے وہ اس طرح کہ تلقین کے ذریعہ اس کا حفظ کیا جائے اور حفظ نہ ہونے کی صورت میں دیکھ کر پڑھنے کے لئے یہ صورت اہون ہے کہ رسم عثمانی کے ساتھ بریل کوڈ میں قرآن کریم کی کتابت کی جائے، تاکہ کسی قسم کا کوئی مفسدہ وخرابی لازم نہ آئے۔

تمت